فی ظلالِ القرآن

پارہ ۱۳ تا ۱۹

جلد چہارم

سیّد قطب شہیدؒ

ترجمہ

سیّد معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

عرض ناشر

شہید اسلام سید قطب ؒ ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۲ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دار العلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دار العلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دار العلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۴ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشر و اشاعت کے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبد السلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

تفسیر فی ظلال القرآن ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی' جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ اسلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے 'الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے' اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مترجم سید معروف شاہ شیرازی۔ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ہروڑی میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی' جبکہ ۱۹۶۴ میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا' اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ گورنمنٹ ہائی سکول بٹل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ "اسوہ" راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمہ کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودیؒ سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودیؒ کے ساتھ بھی رہے' جبکہ مولانا مودودیؒ اکثر انھیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے' ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے' قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے۔ موصوف آجکل نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوریٰ کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب "حرمت سود" "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غربت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اب فی ظلال القرآن کی چوتھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۲ جلدیں جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

تفسیر	-------	فی ظلال القرآن
مصنف	-------	سید قطب شہید ؒ
مترجم	-------	سید معروف شاہ شیرازی
ناشر	-------	سید عارف شیرازی
جلد چہارم	-------	پارہ ۱۳ تا ۱۹
اشاعت اول	-------	اگست ۱۹۹۶ء
تعداد	-------	۱۰۰۰
اشاعت دوم	....	دسمبر ۱۹۹۷ء
تعداد	-------	۱۱۰۰
مطبع	-------	محمود رضا پرنٹرز لاہور
ھدیہ	-------	۳۵۰ روپے

---ООО---

جلد چہارم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

فہرست جلد چہارم

پارہ نمبر- ۱۳ -------- سورہ یوسف - ۱۲

سورہ الرعد - ۱۳

سورہ ابراھیم - ۱۴

پارہ نمبر- ۱۴ -------- سورہ الحجر-۱۵

سورۃ النحل - ۱۶

پارہ نمبر- ۱۵--------- سورہ بنی اسرائیل - ۱۷

سورۃ الکھف - ۱۸

پارہ - ۱۶

سورۃ مریم ۔ ۱۹

سورۃ طٰہٰ ۔ ۲۰

پارہ نمبر۔ ۱۷ ------- سورہ الانبیاء ۔ ۲۱

سورۃ الحج - ۲۲

پارہ نمبر- ۱۸-------- سورہ المومنون - ۲۳

سورۃ النور - ۲۴

سورۃ الفرقان ـ ۲۵

پارہ ـ ۱۹

سورۃ الشعراء ـ ۲۶

سورۃ النمل – ۲۷

---OOO---

☆

فی ظلال القرآن

جلد چہارم

پارہ --- ۱۳

سورۃ یوسف - ۱۲

۵۳ --- تا --- ۱۱۱

سورۃ الرعد ۔ ۱۳

۱ --- تا --- ۴۳

سورۃ ابراہیم ۔ ۱۴

۱ --- تا --- ۵۲

پارہ ۱۳ ایک نظر میں

یہ پارہ سورہ یوسف کے بقیہ حصے اور سورہ رعد اور سورہ ابراہیم پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں سورتیں بھی مکی ہیں۔ گویا یہ پورا پارہ مکی قرآن پر مشتمل ہے اور اس میں مکی سورتوں کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔

سورہ رعد اور سورہ ابراہیم پر تبصرے ہم آئندہ پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ رہی سورہ یوسف تو اس کے بقیہ حصے کے مطالعہ سے قبل امید ہے کہ قارئین گذشتہ پارے میں سورہ یوسف پر کیے گئے تبصرہ کو ذہن میں رکھیں گے۔

اس پارے میں سورہ یوسف کا باقی حصہ ہے اور اس کے اندر جابجا تبصرے ہیں۔ اور آخر میں اس پوری سورہ پر ایک تبصرہ ہے۔ اس حصے میں ہم قصے کے مرکزی کردار حضرت یوسف علیہ السلام کی ذاتی زندگی اور ان کی شخصیت کے بعض نئے پہلوؤں سے متعارف ہوتے ہیں یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت اب ذرا مختلف روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس شخصیت کے ان بنیادی عناصر ترکیبی کے ساتھ ساتھ جن کا ذکر ہم نے اس قصے کے کرداروں کے بیان کے ضمن میں کیا ہے' یہاں اس جدید مرحلے میں ان کی شخصیت کے کچھ نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ شخصیت آغاز سے لے کر آخر تک ایک ہی سے خدوخال رکھتی ہے لیکن اس نئے مرحلے میں اس کی کچھ نئی خوبیاں سامنے آتی ہیں اور بظاہر یہ نئی خصوصیات کی نظر آتی ہیں۔

حضرت یوسف کی شخصیت اپنے نشوونما اور بلت اور واقعات اور ان مشکلات کی وجہ سے جو ان کو پیش آتی رہیں اب ایک مکمل شخصیت ہے۔ شخصیت کی یہ تکمیل خالص ربانی تربیت کے تحت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک بندہ صالح بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس بندہ صالح کو تیاری اس لیے کیا جارہا ہے کہ زمین میں اس کو تمکن حاصل ہو اور مشرق وسطیٰ کے ایک ایسے ملک میں اسے اقتدار ملے جہاں سے ہر چیز ہر طرف سپلائی ہوتی ہے۔

اس شخصیت کے نئے خدوخال کیا ہیں؟ سب سے پہلے یہ کہ ان کا تعلق باللہ بہت گہرا ہے اور وہ راضی برضا ہیں۔ وہ اللہ کے ہوگئے ہیں اور ان کو اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ انہوں نے تمام دنیاوی اقدار کا لبادہ اتار دیا ہے' زمین کے تمام بندھنوں سے آزاد ہوگئے ہیں۔ وہ اس دنیا کے حکمرانوں سے بے نیاز ہیں۔ یہ دنیاوی قدریں اور یہ قوتیں اس شخصیت کے ہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ اس شخصیت نے اب صرف اللہ سے لو لگائی ہے۔

حضرت یوسف ؑ کی شخصیت میں یہ اوصاف اس وقت سامنے آتے ہیں جب بادشاہ مصر کے فرستادے قید خانے میں ان کے پاس آتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ بادشاہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ تو حضرت یوسف ؑ اس موقع پر آپے سے باہر نہیں ہوجاتے۔ نہ وہ اس قید خانے کی تاریکیوں سے نکلنے اور بادشاہ وقت سے ملاقات کرنے کے لیے کسی بے تابی کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ ایسے مواقع پر بے تابی اور جلد بازی کا اظہار ہو ہی جاتا ہے خصوصاً جبکہ ایک شخص قید خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو۔

حضرت یوسف ؑ کے کردار میں اس تبدیلی کو تب ہی سمجھا جاسکتا ہے جب ہم ذرا چند سال پیچھے ہٹ کر حالات کا مطالعہ کریں۔ چند سال پیشتر خود انہوں نے اس شخص سے جو رہا ہونے والا تھا' درخواست کی تھی کہ بادشاہ کے سامنے ان کے کیس کو پیش کریں۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس طرح اس شخصیت کی قدریں بدل گئی ہیں' ایمان تو اپنی جگہ پہلے کی طرح موجود ہے' لیکن اب ان کی شخصیت میں ایک طمانیت ہے۔ وہ اب بھی اللہ کی تقدیر پر راضی ہیں اور تقدیر کے ساتھ چل رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ تقدیر اپنا کام کیسے کرتی ہے۔ ان کو وہ اطمینان حاصل ہے جس کے طلبگار ان کے جد اعلیٰ تھے جنہوں نے خدا سے مطالبہ کیا تھا "اے رب' مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟" تو رب تعالیٰ نے فرمایا "کیا تجھے یقین نہیں ہے؟" لیکن انہوں نے کہا "یقین تو ہے لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں"۔

یہ ہے وہ اطمینان جو ربانی تربیت نے اس بندۂ مختار کی دل میں انڈیل دیا ہے۔ ابتلاؤں سے گزار کر' مشکلات میں مبتلا کر کے' مختلف حالات اور مشاہدوں سے گزار کر اور علم و معرفت اور یقین و اطمینان عطا کر کے وہ اس مقام تک پہنچے ہیں۔

اس مرحلے کے بعد حضرت یوسف ؑ کے کردار میں یہ صفت بہت واضح ہے۔ یہاں تک اس سورہ کے آخری تبصرے ہیں۔ وہ جب اپنے رب کے ساتھ مناجات میں ہیں تو وہ تمام دنیاوی قدروں سے بے نیاز نہیں۔ فرماتے ہیں :

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۰۱)

"اے رب تو نے مجھے مملکت عطا کر دی ہے' بات کی تہہ تک پہنچنا سکھا دیا ہے۔ دنیا و آخرت میں تو ہی میرا ولی ہے۔ مجھے ایک مسلمان کی طرح موت دے اور صالحین کے ساتھ ملا دے"۔

اب رہیں وہ تعقیبات اور تبصرے جو اس سورہ میں آئے ہیں ان کے بارے میں ہم بہت کچھ کہہ آئے ہیں اور مزید تشریحات تفسیر آیات میں آئیں گی۔ یہاں تو فقط اس تبدیلی کا تذکرہ مطلوب تھا جو اس بندۂ مختار کی شخصیت میں پیدا ہوئی جو اس قصے میں بڑا کردار ہیں۔ اس تبدیلی کے ساتھ دراصل ان کی شخصیت اب ایک مکمل شخصیت ہے۔ نیز یہ خصوصیت وہ ہے جسے اس پورے حصے میں ابھار کرنا مطلوب ہے کیونکہ حضرت یوسف ؑ نے احیائے اسلام کا کام کرنا ہے اور یہی قرآن کا منہاج انقلاب ہے کہ وہ قارئین کے ذہن میں اصل مقصد بٹھا دیتا ہے۔

اب ہم آیات کی تشریح و تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

---()()()---

فی ظلال القرآن

جلد چہارم

پارہ ----- ۱۳

سورۂ یوسف - ۱۲

۵۳ --- تا --- ۱۱۱

درس نمبر۱۰۹ ایک نظر میں

اس سبق میں قصہ یوسف علیہ السلام ذرا آگے بڑھ رہا ہے۔ اس قصے کے چار بڑے مناظر میں سے یہ چوتھا منظر ہے۔ پچھلے پارے میں اس قصے کی تین کڑیاں ختم ہوگئی تھیں۔ اب حضرت یوسف ؑ قید خانے سے باہر آگئے ہیں۔ بادشاہ نے خود درخواست کی ہے کہ وہ انہیں ایک اہم منصب سپرد کرنے والے ہیں۔ ان کے اس نئے منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں یہاں اب بات ہوگی۔

یہ سبق سابقہ منظر کے آخری فقرے سے شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ منظر کی آخری کڑی یہ تھی کہ اس میں حضرت یوسف ؑ کی خواہش کے مطابق بادشاہ نے ان عورتوں سے حضرت یوسف ؑ کے بارے میں انکوائری کی تھی جنہوں نے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اسباب نکھر کر سامنے آجائیں جن کی وجہ سے حضرت یوسف ؑ کو ناحق جیل جانا پڑا تھا تاکہ ان کی بے گناہی کا اعلان ہو جائے اور یہ بات ان کے نئے منصب کے لیے ضروری تھی تاکہ وہ اپنی نئی ذمہ داریاں نہایت اطمینان ' نہایت وثوق اور اعتماد سے پوری کریں۔ ان کا نفس مطمئن ہو اور وہ اعتماد کے ساتھ امور مملکت سرانجام دیں۔ اب ان کی دعوتی زندگی دو قسم کی سرگرمیوں پر مشتمل تھی۔ ایک مملکت کی ذمہ داریاں اور ایک دعوت اسلامی کی ذمہ داریاں۔ لہٰذا مناسب یہ تھا کہ ان دہری ذمہ داریوں کے اس دور میں وہ ماضی کے گرد و غبار کو جھاڑ کر اور ہلکے پھلکے ہو کر سامنے آئیں۔

ان کی شرافت یہ تھی کہ انہوں نے اس مرحلے پر عزیز مصر کی عورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا' بلکہ اس کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ بادشاہ کو ان عورتوں کے معاملے میں تحقیق کرنا چاہیے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ لیکن عزیز مصر کی بیوی خود سامنے آتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ حقیقت کیا تھی اور ہوا کیا تھا؟

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (۵۲) وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) یوسف ۵۱ تا ۵۳ "اب حق کھل چکا ہے' وہ میں ہی تھی جس نے اسے

پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے' اس سے میری غرض یہ تھی کہ یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس سے خیانت نہیں کی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں اللہ ان کی چالوں کو کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کرتی۔ نفس بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہاں آکر حضرت یوسفؑ کا المناک ماضی ختم ہو جاتا ہے اور اب خوشحالی' عزت اور اقتدار کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۱۰۹ تشریح آیات

۵۳ --- تا --- ۵۷

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

۷ ع ۸ ا

”میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کرتی۔ نفس بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو‘ بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔ بادشاہ نے کہا ”انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں“۔ جب یوسف نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا ”اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ہمیں آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے“۔ یوسف ؑ نے کہا ”ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے‘ میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں“۔

اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف ؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ اسی طرح ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں ‘نوازتے ہیں‘ نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا‘ اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے“۔

بادشاہ کے ہاں یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی سب عیاں ہو گئی‘ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خواب کی تعبیر بھی معلوم ہو گئی‘ بادشاہ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ حضرت یوسف ؑ نے عورتوں کے معاملے کی چھان بین کس طرح کرائی۔ نیز ان کی

شرافت اور عزت نفس بھی اس کے سامنے مکمل کر ثابت ہوگئی کہ یہ شخص براءت کے بغیر جیل خانے سے بھی باہر آنا گوارا نہیں کرتا' نہ ہی وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے بے تاب ہے۔ بادشاہ بھی کوئی معمولی بادشاہ نہ تھا بلکہ مصر جیسے بڑے ملک کا بادشاہ تھا۔ انہوں نے اس موقعے پر نہایت ہی شریف اور کریم شخص کا موقف اختیار کیا جو الزام کے ہوتے ہوئے جیل سے باہر آنا گوارا نہیں کرتا۔ وہ حصول مناصب' بادشاہ سے ملاقات اور جیل کی مشکلات سے رہائی سے قبل اپنی عزت اور شہرت پر سے داغ ہٹانا چاہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ بادشاہ کے دربار میں قدم رکھنے سے قبل چاہتا ہے۔ ان تمام امور نے بادشاہ کے دل میں ان کی وقعت اور اہمیت کو اور بڑھا دیا اس لیے اس نے کہا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي (۱۲:۵۴) بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں"۔ بادشاہ وقت حضرت یوسف ؑ کو محض رہائی کے لیے طلب نہیں فرماتے یا محض اس لیے نہیں بلا رہے کہ وہ نفسیات اور تعبیر خواب کے ماہر ہیں' نہ اس لیے بلا رہے ہیں کہ ان کو بادشاہ سلامت کی رضامندی کی اطلاع دے دیں اور حضرت یوسف ؑ پھولے نہ سمائیں۔ ان مقاصد کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بادشاہ کے مخصوص مشیر اور ذاتی دوست اور معتمد علیہ ہوں۔

ہمیں ان لوگوں کی حالت پر رونا آتا ہے جو اپنی عزت اور شرافت کو بادشاہوں کے قدموں میں نچھاور کرتے ہیں۔ یہ لوگ آزاد اور بری الذمہ ہیں لیکن یہ خود غلامی کا جوا اپنے ہاتھ سے لے کر اپنی گردنوں میں ڈالتے ہیں اور بڑوں کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں یا ان کی طرف سے تعریف کا ایک لفظ سن کر خوش ہوتے ہیں اور پھر نہایت ہی مطیع فرمان بن کر رہتے ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو بڑوں کے سامنے ذلیل کرتے ہیں اور بچھے جاتے ہیں۔ کاش اس قسم کے لوگ سورہ یوسف پڑھتے اور معلوم کرتے کہ خودداری' عزت نفس اور شرافت اور سنجیدگی میں کیا مزہ ہے۔ حالانکہ خودداری' عزت نفس اور کرامت کے فائدے چاپلوسی' غلامی اور ذلت کی زندگی سے زیادہ ہیں۔ بہرحال بادشاہ نے یہ حکم دیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي (۱۲:۵۴) بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں"۔

اب یہاں سیاق کلام میں حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی وغیرہ کی کڑیاں حذف کر دی گئی ہیں اور انسانی تخیل پر چھوڑ دی گئی ہیں۔

فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۱۲:۵۴) "جب یوسف ؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ہمیں آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے"۔ جب یوسف ؑ نے بادشاہ سے گفتگو کی تو اسے معلوم ہوگیا کہ یوسف ؑ کی علامات جو کچھ بتا رہی تھیں وہ ان کے مطابق سچے ہیں تو بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ یوسف ؑ ہماری مملکت میں اب صاحب قدر و منزلت ہیں۔ اب یوسف ؑ عبرانی غلام نہیں ہیں' نہ ہی وہ اس تہمت میں گرفتار ملزم ہیں جو عزیز مصر کی بیوی نے ان پر لگائی تھی۔ اب وہ ایک باعزت شخصیت ہیں اور بادشاہ کے ہاں انہیں اونچا مقام حاصل ہے اور وہ بہت ہی امانت دار شخص ہیں۔

بادشاہ کی طرف سے اس اعلان کے بعد حضرت یوسف ؑ کا رویہ کیا رہا۔ انہوں نے بادشاہ کے سامنے سجدۂ شکر ادا نہیں کیا۔ جیسا کہ عموماً بادشاہوں کے مصاحب سجدے کرتے ہیں۔ نہ انہوں نے تملق اور چاپلوسی سے کہا اے میرے آقا!

تم زندہ رہو اور یہ غلام تمہارا خادم رہے گا۔ یا یہ کہ میں تمہارا امین' خادم اور غلام ہوں۔ بلکہ تملق اور چاپلوسی کے بجائے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مملکت کو پیش آنے والی مشکلات میں وہ جو خدمات کر سکتے ہیں اس کے لئے وہ حاضر ہیں آنے والے حالات کے مطابق جو تعبیر خواب کے نتیجے میں لازماً آنے والے ہیں کیونکہ حضرت یوسف کو پختہ یقین تھا کہ آنے والی مشکلات کو صرف وہی دیکھ رہے ہیں اور صرف وہی ان کے لیے تیاری اور پیش بندی کر سکتے ہیں ورنہ لوگ قحط کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ صرف یوسف ہی تھے جو اپنی دیانت و امانت کی وجہ سے ملک کو بچا سکتے تھے۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۱۲:۵۵) یوسف نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے' میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔

عہدہ کی مہم کا خلاصہ یہ ہے کہ سات سال سرسبزی کے ہیں اور ان میں اس بات کی ضرورت ہے کہ پیداوار کے ایک ایک دانے کو بچایا جائے' امور مملکت کو اچھے طریقے سے چلایا جائے' مملکت کے تمام شعبوں کو درست کیا جائے اور خوشحالی کے دور میں ایسی پلاننگ کی جائے کہ بدحالی اور خشک سالی میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اسی لیے حضرت یوسف نے ایسی ہی صلاحیتوں کا ذکر کیا اور جو ایسے حالات کے لیے ضروری تھیں یعنی حفیظ و علیم۔ اور مصر اور تمام علاقائی ممالک کے لیے یہ انتظام مفید تھا۔ اس لیے کہا اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ.(۱۲:۵۵) حضرت یوسف کا یہ مطالبہ اس لیے نہ تھا کہ وہ وزارت خزانہ لے کر اپنے لیے کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ایک صاحب رائے دانشور تھے اور انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس ڈیوٹی کے لیے ان سے زیادہ اور کوئی موزوں شخص نہیں ہے۔ آنے والا دور ایک بحرانی دور ہو گا کیونکہ پوری مصری قوم اور پڑوسی اقوام کے لیے غلے اور دوسری رسد کے انتظام کا عظیم مسئلہ درپیش ہو گا۔ سات اچھے سالوں میں کفایت شعاری اور سات مشکل سالوں میں سپلائی کو بحال رکھنے کا عظیم انتظام درپیش تھا۔ حضرت یوسف اپنی ذات کے لیے یہ طلب نہ فرماتے تھے بلکہ یہ تو وہ عظیم ذمہ داری تھی جس سے ہر ایک بھاگ رہا تھا' کوئی شخص بھی خوشی سے غنیمت سمجھ کر اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ شاہی نظام میں گردن زدنی کا بھی خطرہ تھا' دوسرے یہ کہ عوام الناس کو بھوک اور افلاس کی حالت میں کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب عوام بھوکے ہوں تو وہ مجنون کی طرح اہلکاروں کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ یہ تمام امکانات حضرت یوسف کے پیش نظر تھے۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف نے جو یہ فرمایا اور مطالبہ کیا کہ "مجھے زمین کے خزانوں پر نگراں کر دیجئے' میں حفیظ و علیم ہوں"۔ کیا ان کی طرف سے یہ منصب کا مطالبہ نہیں ہے جو اسلامی نظام میں سخت معیوب ہوتا ہے۔ جبکہ یہ تو کسی منصب پر مقرر کرنے کا صریح مطالبہ ہے' اور حدیث میں آتا ہے (خدا کی قسم ہم اس معاملے کو اس شخص کے حوالے نہیں کرتے جو اس کا مطالبہ کرے) (متفق علیہ)۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت یوسف نے یہاں خود بتایا ہے کہ وہ حفیظ اور علیم ہیں۔ یہ ایک گونہ اعلان تزکیہ نفس ہے اور خود قرآن میں آتا ہے۔ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ "اپنی پاکی داماں کی حمایت مت کرو"۔ اس کا آسان جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ انتظامی اصول حضور اکرم کے دور میں تو نافذ ہوئے لیکن ضروری نہیں ہے کہ حضرت یوسف کے دور میں بھی یہ ممنوع ہوں۔ کیونکہ تمام پیغمبروں کا اصول دین پر تو اتفاق رہا ہے لیکن انتظامی امور اور شرعی

قوانین ہر ایک کے ہاں جدا تھے۔

لیکن ہم یہ سرسری جواب نہیں دیتے کیونکہ اس مسئلے کو ذرا گہرائی کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس کے نتائج نہایت گہرے اور دور رس ہیں۔ اس کے کچھ اور پہلو اور اعتبارات ہیں' اسے ان پہلوؤں سے وسیع تناظر میں دیکھنا ضروری ہے تاکہ ہم احکام فقہیہ کے استنباط میں اس وسیع نقطہ نظر سے مسائل کا استنباط کر سکیں اور فقہی احکام کو بھی تحریکی انداز دے سکیں۔ کیونکہ فقہی احکام' ان کے استنباط کا طریق کار اور اصول فقہ بھی مسلمانوں کے دور جمود اور زوال میں منجمد ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کو بھی تحریکی Dynamic انداز دینا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فقہ محض خلاء میں وجود میں نہیں آئی نہ اسے محض خلاء میں سمجھا یا نافذ کیا جا سکتا ہے۔ فقہ اسلامی کا ارتقاء ایک ارتقاء پذیر اسلامی معاشرے کے اندر ہوا ہے۔ اس معاشرے کو اپنے ارتقائی دور میں اسلامی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ یہ فقہ اسلامی نہ تھی جس نے کسی اسلامی معاشرے کو جنم دیا ہو' بلکہ ایک اسلامی معاشرہ کے اندر اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اسلامی فقہ ارتقاء پذیر ہوئی۔ یہ دو عظیم حقائق ہیں اور اسلامی تاریخ ان پر گواہ ہے۔ اسلامی معاشرے اور تخلیق فقہ کے باہم تعلق کو جب تک نہ سمجھیں گے اس وقت تک ہم اسلامی فقہ کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور نہ اسلامی فقہ کی تحریکی اور ارتقائی حیثیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو آج ان نصوص کو پڑھتے اور فقہ کے مدون احکام کو لیتے ہیں اور ان کے پیش نظر یہ حقیقت نہیں ہوتی کہ پہلے اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تھا اور پھر فقہ وجود میں آئی اور وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ نصوص کن حالات میں نازل ہوئیں اور اسلامی فقہی مسائل کس طرح مرتب ہوئے' خصوصاً وہ ماحول' وہ معاشرہ اور وہ مزاج جن میں یہ نصوص نازل ہوئیں ان کو بھی پیش نظر نہیں رکھتے تو اس قسم کے لوگ اس قانون کو محض خلاء میں نافذ کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ کوئی قانونی نظام کسی خلاء میں نافذ نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ معاشرے میں نافذ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دراصل فقہاء نہیں ہیں نہ یہ لوگ ماہرین قانون اسلامی ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت اسلامی نظام کے مزاج ہی کو نہیں سمجھے نہ اس دین کی حقیقت کو سمجھے ہیں۔

تحریکی فقہ دراصل اس فقہ سے مختلف ہے جو کتابوں کے اوراق میں ہے' اگرچہ فقہ تحریکی بھی ان اصول اور نصوص پر مبنی ہوتا ہے جن پر فقہ اوراق مبنی ہے۔ تحریکی فقہ ان حالات پر بھی نظر رکھتی ہے جن میں نصوص قرآن و سنت کا نزول ہوا۔ ایک عملی فقیہ کو نظر آتا ہے کہ شان نزول اور حالات نزول دونوں کو اصل نصوص سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی نص کو ہم ان حالات سے علیحدہ کر کے اس پر غور کریں گے جن میں وہ نازل ہوئی تھی تو ہمارا استنباط اور اجتہاد غلط ہو جائے گا۔ اور اس طرح جو فقہ مرتب ہو گی وہ درست نہ ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی فقہی حکم خداوندی ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ مستقلاً خلاء میں آیا ہو اور جس میں اس وقت کے ماحول اور معاشرے کے اثرات نہ ہوں جن میں وہ پہلی مرتبہ وارد ہوا۔ کوئی فقہی حکم اور اجتہاد چونکہ خلاء میں نہیں ہوا اس لیے وہ خلاء میں نہیں رہ سکتا۔

یہ اصول جو اوپر ہم نے بیان کیا اس کی مثال وہ احکام ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو اپنی پاکی داماں کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے یا کسی شخص کو اپنے آپ کو کسی منصب کے لیے پیش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ احکام اس آیت فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ "اپنے نفسوں کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو" اور حضور کی حدیث سے ماخوذ ہیں۔ انا واللہ لا نولی ھذا العمل

حدا اساله "ہم خدا کی قسم یہ منصب اس شخص کو نہیں دیتے جو اسے مانگتا ہے"۔

یہ احکام اس معاشرے میں آئے تھے جو ایک اسلامی معاشرہ تھا اور اس اسلامی معاشرے میں ان احکام کو عملاً نافذ بھی کر دیا گیا تھا۔ یہ احکام تھے ہی ایسے معاشرے کے لیے' تاکہ قائم اسلامی معاشرے کی ضرورت کو پورا کریں' اس وقت کا قائم اسلامی معاشرہ اپنا ایک تاریخی پس منظر اور اپنا ایک مخصوص عضویاتی ترکیب کا حامل تھا' اس معاشرے کی اپنی مخصوص اور ذاتی صورت حال تھی۔ یہ دونوں احکام ایسے احکام تھے جنہوں نے ایک مکمل قائم شدہ اسلامی معاشرے کے اندر نافذ ہونا تھا' انہی حالات میں وہ نازل ہوئے۔ یہ خلاء میں نازل نہیں ہوئے تھے' لہٰذا ان دونوں احکام کو ہم ایک قائم شدہ اسلامی معاشرے میں نافذ کر سکتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جس کی ترکیب' جس کی اٹھان اور جس کی عضویاتی تحریک اسلامی ہو۔ جب بھی ایسا معاشرہ قائم ہو گا اس میں ایسے احکام اور ان کے مطابق نظام قائم ہو جائے گا۔ اگر کہیں اسلامی معاشرے کا نام و نشان ہی نہ ہو تو ان میں یہ احکام نافذ نہیں ہو سکتے' محض خلاء میں۔

یہی معاملہ تمام اسلامی احکام کا ہے لیکن ہم اسلام کے دوسرے احکام کے بارے میں یہاں تفصیلات دینا مناسب نہیں سمجھتے۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں لوگ خود اپنے منہ میاں مٹھو کیوں نہیں بنیں گے اور خود اپنے آپ کو امیدوار کیوں نہ بنائیں گے اور وہ اپنے پسندیدہ افراد کے لیے یہ پروپیگنڈہ کیوں نہ کر سکیں گے کہ ان کو مجلس شوریٰ گورنر یا کسی اور منصب کے لیے منتخب کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گا تو لوگوں کو اپنی صلاحیت اور افضلیت کے اظہار کے لیے کسی پروپیگنڈے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔ نیز اسلامی معاشرے میں منصب ایک قسم کی ذمہ داری ہے اور کوئی بے وقوف ہی ہو گا جو خواہ مخواہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے جدوجہد کرے گا الا یہ کہ اللہ کی رضامندی کے حصول' خدمت خلق کے ذریعہ حصول ثواب یا معاشرے کے اندر اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اس منصب کی خواہش ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی اس طرح کہ کوئی یہ منصب اور ذمہ داری کسی پر ڈال دے۔ جو لوگ خود مطالبہ کرتے ہیں اور مناصب کے پیچھے دوڑتے ہیں یہ ہلکے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر ان مناصب سے کچھ اور اغراض حاصل کرنی ہوتی ہیں لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کو یہ مناصب ہرگز پیش نہ کیے جائیں۔

لیکن یہ حقیقت صرف اس وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب اسلامی معاشرے کے قیام اور اس کے مزاج کو سمجھا جائے اور اس کی تشکیل کی نوعیت ذہن میں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حرکت اور تحریک کسی بھی اسلامی معاشرے کی جان ہے۔ اسلامی معاشرہ دراصل تحریک اسلامی کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے' کس طرح؟

۱۔ مثلاً اللہ کی جانب سے ایک پیغام اور عقیدہ نازل ہوتا ہے۔ ایک رسول اس کی تبلیغ کرتا ہے۔ زمانہ نبوت میں تو رسول بذات خود تبلیغ کرتا تھا' جبکہ زمانہ نبوت کے بعد اب رسول کی جگہ کوئی داعی اسی عقیدے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس دعوت کو کچھ لوگ قبول کرتے ہیں جبکہ دعوت کے ابتدائی ایام میں نظام حکومت جاہلی ہوتا ہے اور یہ جاہلی نظام حکومت اور یہ جاہلی معاشرہ اس تحریک پر ظلم کرتا ہے اور تشدد اور فتنے اور آزمائش کے دور میں کچھ لوگ تحریک کا ساتھ چھوڑ کر مرتد ہو جاتے ہیں جبکہ بعض لوگ مقابلہ کر کے شہید ہو جاتے ہیں اور بعض انتظار کرتے ہیں اور کام جاری رکھتے ہیں۔

جو لوگ مشکلات برداشت کر کے کام جاری رکھتے ہیں 'اللہ ان کو فتح نصیب کرتا ہے 'یہ لوگ پھر دست قدرت کا آلہ ہوتے ہیں' ان کو اللہ تعالیٰ تمکن فی الارض اور غلبہ اور اقتدار عطا کرتا ہے کیونکہ یہ اس کا مستقل وعدہ ہے۔ اس طرح یہ لوگ زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرتے ہیں اور اس میں اللہ کے احکام نافذ کرتے ہیں۔ یہ اقتدار اور تمکن فی الارض ان لوگوں کی ذات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ نصرت اور غلبہ اللہ کے دین کے لیے ہوتا ہے اور زمین پر اللہ کا نظام ربوبیت قائم کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

دین کا یہ ہراول دستہ دین کو لے کر پھر کسی ارضی حدود پر ٹھہرتا نہیں 'نہ کسی قوم اور نسل کی حدود کے اندر اپنے آپ کو محدود کرتا ہے۔ نہ کسی رنگ اور نسل تک محدود ہوتا ہے نہ کسی زبان اور شکل تک محدود ہوتا ہے 'یہ تو بہت ہی کچے اور ناپائیدار عناصر اور محدود دائرے ہیں 'بلکہ یہ ہراول دستہ اس پیغام کو لے کر اطراف عالم میں پھیلتا چلا جاتا ہے اور پورے کرۂ ارض سے تمام انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کرتا ہے۔ تمام طاغوتی قوتوں سے ٹکراتا ہے اور پورے کرۂ ارض پر اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرتا ہے۔

اس تحریکی عمل کے دوران اس دین کو لے کر تحریک برپا کرنے والے کسی ایک علاقے میں حکومت برپا کر کے رک نہیں جاتے۔ نہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا قومی حدود پر وہ رکتے ہیں۔ یہ تحریک لوگوں کی قدریں بدل دیتی ہے۔ معاشرے کے اندر لوگوں کے مرتبہ و مقام کا از سرنو تعین ہوتا ہے۔ تمام اقدار ایمانی پیمانے کے اوپر استوار ہوتی ہیں۔ لوگوں کا معاشرے میں تعارف ان جدید اقدار پر ہوتا ہے اور ہر فرد کی قیمت از سرنو متعین ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں افراد کی قدر و قیمت اس پر ہوتی ہے کہ انہوں نے اقامت دین کے لیے کس قدر جدوجہد کی 'کس قدر آزمائشیں ان پر آئیں' تقویٰ' خدا خوفی' اخلاق اور صلاحیت کے اعتبار سے وہ کیسے ہیں۔ یہ وہ اقدار ہوتی ہیں جو واقعات کی صورت میں متعین ہوتی ہیں اور اسلامی تحریک ان کا اظہار کرتی ہے اور تمام اسلامی معاشرہ اور اسلامی تحریک ایسے افراد سے واقف ہوتی ہے۔ لہذا ایسے افراد کو اس بات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی تعریف خود کریں یا کسی منصب اور ذمہ داری کا مطالبہ کریں' ایک تو ان کو اس بات کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ ان کا تزکیہ اور تربیت اس قدر ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔

بعض اوقات 'بعض لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ یہ پہلے اسلامی معاشرے کی خصوصیت تھی کیونکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قرن اول کے ان لوگوں کی بہترین انداز میں تربیت فرمائی گئی تھی لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے کہ کوئی ایسا معاشرہ بھی اس وقت وجود میں نہیں آسکتا جب تک اس کے لیے اس قسم کی تحریک برپا نہ کی جائے اور صحابہ کرام کی طرح ان کی تربیت کر کے اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد نہ کی جائے۔ جب بھی ہم کوئی ایسا معاشرہ قائم کریں گے ہمیں ایسی ہی راہوں سے گزرنا ہو گا۔ ایک تحریک برپا ہو گی' وہ لوگوں کو از سرنو دین اسلام کے اپنانے کی دعوت دے گی اور اس طرح لوگوں کو جاہلیت سے نکالنے کی سعی کی جائے گی۔ پھر اہل جاہلیت اسی طرح ان کارکنوں پر تشدد کریں گے۔ کچھ لوگ تحریک سے بھاگ نکلیں گے اور ارتداد کی راہ اختیار کریں گے لیکن بعض لوگ اپنی راہ پر جم جائیں گے۔ ان کے لیے دعوت اور تحریک کو چھوڑنا ایسا ہی ہو گا جس طرح کسی کو آگ میں ڈال دیا جائے۔ پھر اس کشمکش کا فیصلہ ہو گا' اللہ تحریک کو فتح دے گا اور کسی ایک جگہ اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس مرکز سے اسلامی انقلاب کا پھیلاؤ شروع ہو گا۔ اس وقت مجاہدین

اور متحرکین بالکل سامنے آچکے ہوں گے۔ اس وقت ایمانی اقدار اور اوصاف واضح ہو چکے ہوں گے اور کسی کو ضرورت نہ ہوگی کہ وہ کوئی درخواست کسی منصب کے لیے پیش کرے کیونکہ ایسے لوگ تو معاشرے کے خدوخال ہوں گے اور وہ خود ان کا تزکیہ کرے گا اور ان کو کوئی ذمہ داری سپرد کرے گا۔

بعض اوقات یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس ابتدائی مرحلے کے بعد پھر ایسا ہو گا لیکن جب اسلامی معاشرہ مستقلاً قائم ہو گیا تو پھر کیا صورت ہوگی۔ یہ سوال وہی لوگ کرتے ہیں جو اس دین کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ یہ دین ہمیشہ ایک تحریک کی شکل میں رہتا ہے۔ یہ کسی وقت بھی ٹھہرتا نہیں۔ اس کی تحریک اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے رہا کر کے اللہ کی بندگی اور غلامی میں داخل کیا جائے۔ یہ آزادی اور قربت تمام کرۂ ارض کے مکینوں کو حاصل ہو اور لوگ طاغوت کی بندگی کے بجائے اللہ کی بندگی کریں اور تحریک مسلسل جاری رہے۔ رنگ 'نسل اور جغرافیہ کی حدود و قیود کے بغیر۔

جب یہ تحریک مسلسل جاری رہے گی تو اس میں ثابت قدم 'مخلص ' قربانی دینے والے لوگ ممتاز ہو کر خود بخود اوپر آتے جائیں گے۔ چونکہ یہ تحریک جاری رہے گی اس لیے یہ معاشرہ کبھی بھی رک کر منجمد اور بدمزہ نہ ہو گا الا یہ کہ یہ معاشرہ اسلامی راہ سے منحرف ہو جائے۔ غرض اپنی صفات کے بارے میں خاموش رہنے اور تزکیہ نفس اور عدم امیدواری کا حکم اپنی جگہ قائم رہے گا جس طرح کہ آغاز میں ایک دائرے میں یہ حکم آیا۔ ایسے ہی دائرے میں یہ اپنی جگہ قائم رہے گا اور کام کرتا رہے گا۔

یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب سوسائٹی میں وسعت ہوتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور شخصیتوں سے متعارف ہی نہیں ہوتے تو پھر باصلاحیت لوگوں کو مجبوراً اپنی صلاحیت کے بارے میں اشتہار دینا پڑے گا اور یہ جتانا پڑے گا کہ ان کا یہ اخلاق و کردار ہے اور وہ اس طرح کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

یہ سوال بھی ایک وہم پر مبنی ہے اور یہ موجودہ جاہلیتوں کی عملی صورت حالات پر مبنی ہے۔ لیکن اسلامی معاشرے کی یہ صورت حال نہیں ہوتی۔ اسلامی معاشرہ میں اہل محلہ ایک دوسرے سے متعارف اور باہم متکافل ہوتے ہیں کیونکہ اسلامی تربیت 'اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کے رخ اور اس کے التزامات کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کے لوگ ایک دوسرے سے بہت ہی اچھا طرح متعارف ہوں۔ لہٰذا کسی بھی اسلامی معاشرے میں لوگ ایک دوسرے سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور باہم متعارف ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی ان صلاحیتوں کی جان پہچان ایمانی اقدار میں کرتے ہیں اس لیے یہ بات کوئی مشکل بات نہ ہوگی کہ اسلامی معاشرہ میں اچھے لوگوں کو مجلس شوریٰ یا انفرادی اور اجتماعی سروسز کے لیے منتخب نہ کر سکے۔ رہے بڑے عہدے مثلاً گورنر اور حاکم تو امام خود ان کے لیے آدمی تلاش کر سکتا ہے۔ جو اہل حل و عقد میں سے ہوتے ہیں۔ امام کے اہل شوریٰ بھی اس میں امداد کر سکتے ہیں اور اچھے افراد کو تلاش کرتے میں امیر اور امام کی مدد کر سکتے ہیں۔ پھر جس طرح ہم نے کہا اسلام تو ایک تحریک ہے اور جہاد تو یوم القیامت تک جاری رہے گا۔ لہٰذا تحریک اور جہاد کے ہوتے ہوئے کوئی صاحب صلاحیت کس طرح پوشیدہ رہ سکتا ہے؟

جو لوگ آج اسلامی نظام حیات اور اس کی مفصل تنظیم کے بارے میں سوچتے ہیں یا اس موضوع پر لکھتے ہیں وہ ایک حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اسلامی نظام حیات کے مدون فقہی اصولوں کو ایک خلاء میں نافذ کرنا چاہتے ہیں 'پھر

وہ اس جاہلی معاشرے میں ان احکام کا نفاذ چاہتے ہیں جو عملاً قائم اور غالب ہے ۔اس جاہلی معاشرے کی اپنی ایک مخصوص عضویاتی ترکیب ہے اور یہ عملاً قائم جاہلی معاشرہ اسلامی نقطہ نظر سے اور اسلام کے فقہی احکام کے نقطہ نظر سے ایک خلاء ہے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس کے اندر اسلامی شریعت نافذ ہو کیونکہ موجودہ جاہلی معاشرے کی عضویاتی ترکیب سو فیصد اسلامی معاشرے کی عضویاتی ترکیب کے خلاف ہے ۔جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بتایا کہ اسلامی معاشرے کی عضویاتی تشکیل ان شخصیات' ان گروہوں اور ان لوگوں سے ہوتی ہے جنہوں نے اسلامی نظام کے لیے تحریک چلائی' جاہلیت کے خلاف جدوجہد کی اور عالم اسلام کو عملی صورت میں نافذ کیا اور انہوں نے جاہلیت کے خلاف عملی جدوجہد کی تاکہ لوگوں کو جاہلیت سے نکال کر اسلام میں داخل کیا جائے ۔اس سلسلے میں انہوں نے جاہلیت کے تمام دباؤ برداشت کیے' جاہلیت کی جانب سے ہر قسم کے تشدد اور ایذا رسانی کو انگیز کیا اور تحریک اسلامی کے ساتھ جاہلیت کی ہمہ گیر جنگ میں وہ اسلام کے ثابت قدم سپاہی رہے اور آغاز سے انتہاء تک وہ اس جدوجہد میں شریک رہے ۔رہا موجودہ جاہلی معاشرہ' تو وہ ایک ٹھہرا ہوا معاشرہ ہے اور ایسی اقدار پر قائم ہے جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' نہ اس معاشرے کا ایمانی اصولوں کے ساتھ تعلق ہے ۔اس لیے اسلامی شریعت کے زاویہ سے یہ معاشرہ اسلام کے لیے ایک خلاء ہے ۔اور ظاہر ہے کہ اس خلاء میں اسلامی نظام جڑ نہیں پکڑ سکتا۔

اس قسم کے محقق اور لکھنے والے جب اسلامی احکامات کو عملی شکل دینے لگتے ہیں تو وہ قدم قدم پر پریشانی اور حیرانی سے دوچار ہوتے ہیں ۔ان کو پہلی پریشانی یہ لاحق ہو جاتی ہے کہ اہل حل و عقد یا مجلس شوریٰ کو کس طرح چنا جائے ۔یعنی ایسا طریقہ کس طرح وضع کیا جائے کہ لوگ خود اپنے آپ کو امیدوار بھی نہ بنائیں اور خود اپنے منہ میاں مٹھو بھی نہ بنیں اور اچھے لوگ اوپر بھی آ جائیں ۔ایسے لوگوں کو اس معاملے میں مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ موجودہ معاشرے جن میں ہم زندہ رہتے ہیں' لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہی نہیں ہیں ۔نیز موجودہ دور میں ایسے لوگ بھی ناپید ہیں جو صلاحیت' پاکدامنی اور امانت و دیانت کے نوں پر پورے اترتے ہوں ۔اسی طرح امام اور خلیفہ کے انتخاب کے طریقے میں بھی یہ لوگ سخت پریشان ہیں ۔آیا خلیفہ کا انتخاب عوام الناس کریں گے یا اہل حل و عقد کریں گے ۔اگر اہل حل و عقد خود امیدوار نہ ہوں گے اور نہ اپنا تزکیہ کریں گے اور ان کا انتخاب امام کرے گا تو پھر وہ کس طرح امام کا انتخاب کریں گے ۔کیا اس کا اہل حل و عقد پر اثر نہ پڑے گا ۔پھر اگر یہ لوگ امام کو نامزد کریں گے تو کیا یہ لوگ امام کے مقابلے میں برتر نہ ہوں گے' حالانکہ امام برتر امام ہوتا ہے اور امام اگر اہل حل و عقد کو منتخب کرتا ہے یا نامزد کرتا ہے تو یہ لوگ اس کے پسندیدہ نہ ہوں گے اور ان کے انتخاب میں یہ بات سرفہرست نہ ہوگی کہ وہ اس کے وفادار ہوں ـــ یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب ضروری ہے اور ان محققین کی سطحی سوچ کی وجہ سے وہ اس کا کوئی جواب نہیں پا رہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسے محققین اسی نکتے سے غلط راہ میں پڑ گئے ہیں ۔ان لوگوں کی غلط روی اس نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہمارے موجودہ معاشروں کو اسلامی معاشرہ سمجھتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے اصول و فروع موجودہ جاہلی معاشروں پر نافذ ہوں گے ۔موجودہ معاشروں اور سوسائٹیوں کی عضویاتی تشکیل اور ان کی اخلاقی اقدار کے ہوتے ہوئے ان میں اسلام نافذ ہو جائے گا ۔ایں خیال است و محال است و جنوں۔

ان لوگوں کی حماقت اور پریشانی اس نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ یہ لوگ موجودہ جاہلی معاشرے کو بھی ایک اسلامی معاشرہ سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ اسلامی احکام اور قواعد اس معاشرے میں منطبق ہوں گے اور اس معاشرے کی عضویاتی ترکیب اور اخلاقی حالت جوں کی توں رہے گی۔

ان لوگوں کی حیرانی و پریشانی کا یہ نقطہ آغاز ہے اور جب یہ لوگ سوچ اور تحقیق شروع کرتے ہیں تو ہم خلاء میں ہوتے ہیں اور اس خلاء میں یہ لوگ اس قدر دور چلے جاتے ہیں اور ان کا مدار اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ پھر ان سے اپنی راہ ہی گم ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جاہلی معاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں' کوئی اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ شریعت نافذ ہو سکتی ہے اور نہ اس میں فقہی دستور نافذ ہو سکتا ہے اور یہ اسی وجہ سے نافذ نہیں ہو سکتے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی دستور کبھی بھی خلا میں نافذ نہیں ہوتے کیونکہ اسلامی نظام ایک عملی نظام ہے اور یہ کسی اسلامی معاشرے ہی میں نافذ ہو سکتا ہے' خلا میں نافذ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی معاشرے کی عضویاتی تشکیل ہی دراصل موجودہ جاہلی معاشرے کی نظریاتی تشکیل سے مختلف ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے کے افراد اور گروہ وہ نہیں ہوتے جو موجودہ معاشرے کے ہیں۔ اس کے افراد بالکل مختلف اور اس کے گروہ بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ اس کے افراد اور گروہوں کی اخلاقی قدریں تحریک کے دوران وجود میں آتی ہیں اور وہ بہت ہی مختلف اور عملی ہوتی ہیں۔

یہ ایک جدید اور نیا معاشرہ ہوتا ہے۔ یہ دائماً حرکت میں رہتا ہے۔ ترقی پذیر ہوتا ہے اور اس کے انسان' پورے کرۂ ارض کے مقابلے میں آزاد انسان ہوتے ہیں۔ وہ اس کرۂ ارض پر کسی کے غلام نہیں ہوتے اور اس معاشرے سے طاغوتی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

یہ مسئلہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل مثلاً اپنے آپ کو کسی منصب کا اہل بتانا' منصب طلب کرنا' امام کا انتخاب' اہل شوریٰ کا انتخاب اور اس جیسے دوسرے مسائل کے بارے میں لوگ عموماً خلا میں سوچتے ہیں۔ یہ مسائل اور جاہلی معاشروں میں ان کا نفاذ' یہ سوچ ہی متضاد ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ جاہلی معاشرہ اپنی عضویاتی ترکیب میں اسلامی معاشرے سے بالکل متضاد ہو۔ اس کی اقدار' اخلاقی پیمانے' تصورات اور سوچیں سب کی سب اسلامی معاشرے سے الٹ ہوں۔

موجودہ دور کے بینک اور ان کی تمام سرگرمیاں' انشورنس اور اس کے قواعد و ضوابط' ضبط تولید کے مسائل اور اس قسم کے دوسرے عقدے جن کو یہ محققین کھولنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کے بارے میں صحیح حل موجودہ سوسائٹی میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ان موضوعات پر آغاز بحث ہی سے محقق پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی سعی یہ ہوتی ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے قواعد و قوانین کو موجودہ جاہلی اور گندے معاشرے میں نافذ اور جاری کرنے کے بارے میں سوچتا ہے اور یہ معاشرہ سو فیصد اسلامی احکام سے متضاد ہے۔ اس لیے ایسے محققین کو ان میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ اسلامی قوانین کو نافذ کر کے یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ جاہلی معاشرے اسلامی بن جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت ہی مضحکہ خیز سوچ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کو فقہ اسلامی نے وجود نہیں بخشا بلکہ اسلامی معاشرے کی تحریکی جدوجہد اور تحریک

اسلامی اور جاہلیت کے درمیان طویل کشمکش کے نتیجے میں اسلامی معاشرے کے وجود میں آنے کے بعد اور ایک اسلامی معاشرے کی عملی ضروریات سامنے آنے کے بعد اسلامی فقہ اس کے احکام اور اس کے اصول وجود میں آئے۔ لہٰذا دور جدید میں بھی فقہ اسلامی کا وجود اس طرح آسکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے ذریعے اسلامی سوسائٹی وجود میں لائی جائے۔ اس کے برعکس ممکن ہی نہیں ہے۔

یاد رکھیے کہ فقہ اسلامی اور اسلامی شریعت کا نفاذ خلاء میں ممکن نہیں ہے' نہ خلاء میں کوئی بھی قانون قائم رہ سکتا ہے۔ اسلامی شریعت دماغوں اور کتابوں میں قائم نہیں ہو سکتی' یہ تو ایک عملی زندگی کا عملی ضابطہ ہے اور ضابطہ بھی برعملی زندگی کا نہیں بلکہ ایک اسلامی زندگی کا ضابطہ ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی کی فضا ہی میں اسلامی نظام زندگی اور اسلامی قانون نافذ ہو سکتا ہے۔

جس وقت اسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا اور وہ بھی ایک تحریکی شکل میں وجود میں آئے گا تو اس وقت اسے بینکوں اور تجارتی اداروں کی ضرورت درپیش ہو گی یا نہ ہو گی' یہ سوال اس وقت پیدا ہو گا۔ اب جبکہ اسلامی معاشرہ سرے سے وجود میں بھی نہیں ہے' وقت سے پہلے ہم اس معاشرے کی ضروریات کو کس طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ نہ اس وقت کے معاشرے کی شکل یا اس کے حجم کے بارے میں کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ وقت سے قبل ہم کسی معاشرے کے لیے قانون سازی کیسے کر سکتے ہیں۔ اس وقت اسلامی شریعت کے جو احکام مدون ہیں' وہ ایک جاہلی اور کافرانہ معاشرے میں نافذ ہی نہیں ہو سکتے' کیونکہ اسلامی شریعت موجودہ جاہلی اور کافرانہ سوسائٹیوں کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی' اسے ان جاہلی سوسائٹیوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔

اس قسم کے محققین جس مصیبت میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ یہ لوگ موجودہ جاہلی معاشروں کو اصل سمجھتے ہیں اور دین اسلام کو ان کے تابع سمجھتے ہوئے' اسے ان کے مطابق بنانے کی سعی کرتے ہیں لیکن حقیقی صورت حالات اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام اصل ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم جدید سوسائٹی کو دین اسلام کے تابع بناتے چلے جائیں۔ یہ کام صرف ایک ہی ذریعے سے ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے تحریک برپا کی جائے۔ یہ تحریک اس کرۂ ارض پر اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے ہو۔ اللہ کی حاکمیت کا نظام ہوتا ہی وہ ہے جس میں لوگ اللہ کے سوا کسی کے تابع فرمان نہیں ہوتے۔ وہ کسی طاغوت کے تابع نہ ہوں اور ان کی زندگیوں میں صرف شریعت کی حکمرانی ہو۔ جب بھی کوئی یہ تحریک برپا کرے گا اسے فتنوں' آزمائشوں اور تشدد کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جب اس قسم کی تحریک پر تشدد ہو گا تو کچھ لوگ ان مشکلات کو برداشت کریں گے' کچھ لوگ الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور کچھ لوگ اللہ کے پیغام کی تصدیق کرتے ہوئے مقام شہادت پر فائز ہوں گے جبکہ کچھ لوگ یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک اللہ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان صحیح فیصلہ نہیں فرما دیتے۔ جب اللہ ان انقلابیوں اور ان کی اقوام کے درمیان فیصلہ کر دے گا تو ان کو تمکن فی الارض نصیب ہو گا اور اس وقت ہی اسلامی نظام زندگی صحیح معنوں میں قائم ہو گا۔ اس وقت تمام لوگ اسلام میں رنگے ہوں گے اور وہ اسلامی اقدار کو لے کر اس دنیا میں ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوں گے۔ اس وقت پھر اس سوسائٹی کی کچھ ضروریات اور تقاضے ہوں گے اور یہ ضروریت اور تقاضے دوسری جاہلی سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہوں گے۔ ان ضروریات اور تقاضوں کے پورے کرنے کے انداز بھی مختلف

ہوں گے۔ اس وقت اسلامی نظام زندگی کے احکام کا استنباط ایک قائم سوسائٹی کے لیے ہو گا' ایک اسلامی فقہ اور شریعت وجود میں آئے گی۔ یہ شریعت خلاء میں نہ ہو گی بلکہ یہ شریعت ایک متعین اور موجود سوسائٹی میں نافذ ہو گی اور اس سوسائٹی کے مقاصد اور ضروریات بھی متعین ہوں گی۔

ہمیں کوئی بتائے کہ وہ سوسائٹی اس دنیا میں کہاں ہے جس میں نظام زکوۃ نافذ ہو اور زکوۃ لی جاتی ہو اور اسے اپنے حقیقی مصارف پر خرچ کیا جاتا ہو اور جس کے ہر محلے میں باہم محبت' رحمت اور نظام تکافل قائم ہو' پھر پوری سوسائٹی میں تکافل (Social Security) کا نظام قائم ہو اور اس سوسائٹی کا مالی نظام اسراف' تعیش' خود نمائی اور زر اندوزی پر قائم نہ ہو۔ اس کا مالی نظام صحیح اسلامی خطوط پر قائم ہو' پھر اگر ایسا کوئی نظام قائم ہو جائے اور ایسی سوسائٹی وجود میں آ جائے تو ثابت کیا جائے کہ اس میں انشورنس کی ضرورت ہو گی اور انشورنس کے یہ ضابطے پھر اسلامی سوسائٹی کے حالات' اس کی اقدار اور مالی تصورات کے مطابق ہوں گے۔ اگر اسلامی سوسائٹی کو کسی انشورنس کی ضرورت بھی پڑے تو ثابت کیا جائے کہ اسے بعینہٖ اسی طرح ہونا لازمی ہے جس طرح کہ موجودہ جاہلی معاشروں میں انشورنس کا نظام موجود ہے۔ جو موجودہ جاہلی سوسائٹی جاہلی تصورات اور اقدار پر مبنی ہے اور اسے جاہلی سوسائٹی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔

پھر یہ ثابت کیا جائے کہ ایک متحرک اسلامی معاشرہ تحدید نسل اور ضبط تولید کا محتاج ہو گا جس طرح موجودہ غیر اسلامی معاشرہ ہے۔

جب ہم موجودہ حالات میں ایک اسلامی سوسائٹی کی ضروریات کا تعین ہی نہیں کر سکتے' نہ اس کی سوسائٹی کے حجم اور شکل کی کوئی متعین صورت ہمارے سامنے ہے' اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ ایک اسلامی سوسائٹی کی عضویاتی ترکیب ہی موجودہ جاہلی سوسائٹی سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ اس کی سوچ' اس کی قدریں اور اس کے تے ہی مختلف ہوتے ہیں لہٰذا اس وقت جو لوگ ایک غیر موجود سوسائٹی کے لیے احکام مدون کرنے کی سعی کر رہے ہیں ان کی یہ سعی نامشکور ہو گی' اس لیے کہ جس طرح اسلامی سوسائٹی اس وقت ہوا میں ہے اسی طرح ان لوگوں کی یہ مساعی بھی ہوا میں ہیں اور لاحاصل ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ اس معاملے میں غلطی کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ یہ محققین موجودہ معاشروں کو اسلامی معاشرے سمجھتے ہیں اور وہ اسلامی فقہ کے اوراق سے احکام نکال کر ان معاشروں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ موجودہ معاشروں کے اجزاء ترکیبی کو وہ نہیں چھیڑتے اور ان معاشروں کی اقدار اور تصورات اور نوں کو بھی جوں کا توں رہنے دیتے ہیں۔

پھر ان حضرات کے شعور اور لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ موجودہ جاہلی معاشرے اصل اور قائم حقیقت ہیں اور یہ دین اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی لا کر اپنے آپ کو ان کے مطابق کر لے۔ یہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں اس طرح دین اسلام کا فرض ہے کہ وہ جدید جاہلی سوسائٹی کے تقاضے پورے کرے۔ حالانکہ جدید جاہلی سوسائٹی کے تقاضے سراسر اسلام کے خلاف ہیں اور یہ تقاضے ایک مسلمان کو سرے سے اسلام سے خارج کرنا چاہتے ہیں"۔

میرا خیال یہ ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ اب اسلام لئل اسلام کے دل و دماغ میں سربلند ہو جائے۔ اب لئل اسلام یہ روش ترک کر دیں کہ اسلام جاہلی سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کرتا پھرے۔ داعیان اسلام کو اب یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ لوگو! تم اسلام کے مطیع فرمان بن جاؤ' اس کے احکام کو دل و جان سے تسلیم کرو' بلکہ یہ کہ لوگو! سب سے پہلے تم دین اسلام

میں داخل ہو جاؤ' اعلان کر دو کہ تم اب صرف اللہ کے بندے ہو' اور کلمہ طیبہ کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دو' بایں معنی کہ اللہ کے سوا اس کرۂ ارض پر کوئی اور حاکم نہیں ہے۔ صرف وہی رب اور خالق' مالک اور رازق ہے۔ تمام لوگوں کی زندگی پر اسی کے احکام چلیں گے۔ آئندہ کوئی انسان انسان کا غلام نہ ہو گا اور کوئی انسان کسی انسان کے لیے اب قانون نہیں بنائے گا۔

جب لوگ یہ اعلان کر دیں گے تو اسلامی معاشرے کا پودا کونپل نکالے گا اور جب اس اعلان کی اساس پر کوئی سوسائٹی وجود میں آ جائے گی تو اس میں پھر فقہ اسلامی کا اجراء ہو گا۔ اس وقت پھر فقہ اسلامی اس سوسائٹی کی تمام ضروریات کو پورا کرے گا اور عملاً اسلامی شریعت نافذ ہو گی۔

جب تک اسلامی انقلاب کے نتیجے میں اسلامی سوسائٹی قائم نہیں ہو جاتی اسلام کے دستوری اور انتظامی احکامات کے بارے میں دماغ سوزی کرنا محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ محض ہوا اور خلاء میں تخم ریزی کرنا ہے جبکہ کوئی قانون کبھی کسی خلاء میں نہیں اگتا جیسا کہ ہوا میں کوئی فصل نہیں اگتی۔

---ooo---

اسلامی فقہ کے فکری میدان میں کام کرنا نہایت ہی دلچسپ کام ہے' کیونکہ اس میں کوئی خطرہ اور ابتلاء نہیں ہے۔ لیکن یہ اسلامی کام نہیں ہے یعنی اسلام کے لیے نہیں ہے' نہ یہ اس دین کے مزاج کے مطابق ہے نہ یہ اسلامی منہاج کار ہے' اور یہ طریقہ صرف ان لوگوں کا ہے جو خیر و عافیت کی زندگی بسر کرتے ہوئے محض علمی اور فنی امور میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں' لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تحریک کے اس مرحلے میں اسلامی فقہ کے موضوعات پر دماغ سوزی کرنا عمر ضائع کرنا ہے۔ موجودہ سوسائٹی کے ہوتے ہوئے میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی اجراء ضروری نہ ہو گا۔

دین اسلامی جاہلیت کے لیے نوکری کا کام نہیں کرتا' نہ وہ جاہلیت کا بندہ فرمان بننا قبول کرتا ہے' جس کا مشن صرف یہ ہو کہ جاہلیت کی خواہشات کے لیے ہر وقت وجہ جواز فراہم کرتا پھرے۔ جبکہ یہ جاہلی سوسائٹی دین سے متنفر' دین سے دور اور دین پر فقدان ہو اور دین کی اطاعت نہ کرتے ہوئے یہ سوسائٹی دین سے اپنے اعمال کے لیے وجہ جواز مانگتی ہو۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ اس دین کی فقہ اور اس کے احکام نہ خلاء میں ترقی کرتے ہیں اور نہ ہی خلاء میں روبعمل آتے ہیں۔ اسلامی سوسائٹی ابتداءً اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے والی ہوتی ہے۔ یہی سوسائٹی دراصل فقہ کو وجود بخشتی ہے اور یہی سوسائٹی اس کو ترقی دیتی ہے' یہ نہیں ہے کہ کوئی فقہی نظام سوسائٹی کو وجود بخشے۔

احیائے اسلام کے مراحل اور اس کا طریقہ کار آغاز ہی سے ایک ہی ہیں۔ جاہلیت سے کسی سوسائٹی کا اسلام کی طرف منقلب ہونا تو سہل امر نہیں ہوتا اور یہ اس طرح نہیں ہوتا کہ پہلے فقہی احکام کا کوئی سانچہ ڈھالا جائے اور اس کے مطابق انسان تیار ہوتے جائیں اور یہ سانچہ پہلے سے خلاء میں تیار کر دیا گیا ہو اور جب اسلامی انقلاب کے بعد اسلامی سوسائٹی تیار ہو تو اس میں اسے نافذ کر دیا جائے۔ جاہلیت سے کسی سوسائٹی کا اسلام کی طرف منقلب ہونا کسی قانونی نظام کی وجہ سے نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ شاید قانونی نظام مفصل طور پر تیار نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آ رہا ہے۔ بعض لوگ اس معاملے میں غلط فہمی کا شکار ہوا کرتے ہیں اور بعض اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی وجود میں اس لیے نہیں آ رہی ہے کہ کچھ طاغوتی قوتیں اس کی راہ روکے کھڑی

ہیں۔ یہ طاغوتی قوتیں اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اس سے کسی بھی اسلامی ملک میں اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت پر مبنی نظام وجود میں نہیں آ رہا ہے۔ ان طاغوتی قوتوں نے دراصل لوگوں کو اپنا بندہ اور غلام بنا لیا ہے اور اس طرح یہ قوتیں اور ان کے تحت تمام جمہور عوام شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقی شرک ہے اور اس شرک کا تعلق اللہ رب العالمین کے مخصوص اختیارات کے ساتھ ہے۔

اس نظریہ کی اساس پر جاہلیت زمین پر اپنا ایک مستقل نظام برپا کرتی ہے۔ یہ نظام بھی ان جاہلی تصورات کی اساس پر قائم کرتی ہے اور اس میں جاہلی تصورات کے ساتھ ساتھ مادی قوتوں پر بھی بھروسہ کرتی ہے۔

اس قائم نظام کا مقابلہ احکام فقہیہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ نہ احکام فقہیہ اس جاہلی نظام اور اس کے تصورات کے لیے برابر کی قوت ہوتے ہیں۔ اس جاہلیت کا مقابلہ صرف اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو از سرنو اسلام میں داخل ہونے کی طرف دعوت دی جائے۔ اور پھر اسلامی تصورات کے ساتھ تمام قوتوں کو لے کر جاہلیت کا مقابلہ کیا جائے۔ اس میدان کے اندر اسلام اور جاہلیت کی کھلی کشمکش کے بعد جو نتیجہ بھی ہو گا وہ سامنے آ جائے گا۔ کچھ لوگ صحیح طرح اسلام کے حامل ہوں گے اور باقی قوم ان کے مخالف ہو گی اور اس کشمکش کے نتیجے میں پھر تحریک اسلامی اور اس کی قوم کے درمیان اللہ اپنا فیصلہ لاتا ہے۔ جب تحریک اسلامی غالب آکر اسلامی سوسائٹی قائم کر دیتی ہے تو پھر فقہی احکام کی تدوین کا وقت آتا ہے۔ اس طرح جو قانونی نظام برپا ہوتا ہے وہ نظام اپنی حقیقی فضا میں نہایت ہی قدرتی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک زندہ اسلامی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اور اس نئی سوسائٹی کی حقیقی ضروریات کے لیے قانون سازی ہوتی ہے۔ اور اس میں قانون کا حجم اور اس کی شکل قدرتی ہوتی ہے۔ اب یہ سوسائٹی اور اس کی ضروریات ہمارے پیش نظر موجود نہیں ہیں اور انقلاب کے بعد وجود میں آنے والی سوسائٹی کے بارے میں ابھی تک ہم کوئی پیشین گوئی بھی نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اس کی ضروریات کو ہم متعین کر سکتے ہیں۔ لہٰذا قبل از وقت اسلامی قانون کی تدوین و ترتیب کے کام میں ابھی سے مشغول ہونا یا اس کا مطالبہ کرنا، دین اسلام کی سنجیدگی اور متانت کے منافی ہے۔

میرے اس نکتے کے بیان کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرآن اور سنت میں جو قائم منصوص احکام ہیں وہ اس وقت قانوناً نافذ نہیں ہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام اسلامی سوسائٹی کے لیے نازل ہوئے تھے اور ان کو ایک اسلامی معاشرے کے اندر ہی نافذ بھی ہونا ہے۔ یہ احکام اس وقت عملاً نافذ نہیں ہیں۔ یہ احکام عملاً تب ہی نافذ ہو سکتے ہیں جب کوئی اسلامی معاشرہ قائم ہو اور اسلامی معاشرے کا قیام ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو اس وقت جاہلی معاشرے میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے تاکہ اس میں اسلام کا قانونی نظام نافذ ہو سکے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دین کو لے کر ایک تحریک کی شکل میں اٹھیں اور ان طاغوتی قوتوں کو کریں جنھوں نے اس طاغوتی نظام کو قائم کر رکھا ہے اور لوگ اللہ وحدہ کی اطاعت کے بجائے مشرک ہو کر ان طاغوتی قوتوں کی اطاعت میں مبتلا ہیں۔

احیائے دین کے سلسلے میں اس نکتے کو جب لوگ پالیں گے کہ جب جاہلی نظام قائم ہو تو اس کے مقابلے میں اسلامی تحریک کا برپا کرنا ضروری ہے تو اس ادراک کے نتیجے ہی میں اسلامی انقلاب کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر لوگ احیائے اسلام کی تعمیری جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے اسلامی قانون کی جگہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نے لی ہے، اسلامی نظام قائم نہیں رہا ہے اور یہ کرۂ ارض حقیقی اسلام سے خالی ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس ان

خانے باقی ہیں اور مساجد باقی ہیں ' دعائیں ہو رہی ہیں اور نمازیں ادا ہو رہی ہیں ۔ گزشتہ دو سو سال سے یہی صورت حال ہے ۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس دین کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ ہے اور یہ نماز اور یہ دعا ان کے اندر یہ تسکین پیدا کر دیتی ہے کہ اسلام بخیر و عافیت ہے ' حالانکہ اس کرۂ ارض سے طاغوتی قوتیں اس کا وجود مٹانے کے درپے ہیں ۔

میں کہتا ہوں ' اسلامی عبادات سے بھی قبل اسلامی معاشرہ وجود میں آگیا تھا ۔ مساجد سے بھی قبل اسلامی معاشرہ وجود میں آگیا تھا ۔ یہ معاشرہ اور یہ سوسائٹی اس وقت وجود میں آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا تھا اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "اللہ ہی کی بندگی کرو ' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی الہ نہیں ہے" ۔ یاد رہے کہ یہ لوگ جو ان بتوں کی بندگی کرتے تھے تو یہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے تو نہ رکھتے تھے ' نماز اور روزہ تو اس آیت کے نزول کے وقت فرض ہی نہ تھے ۔ صرف اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ صرف اللہ کو اپنا حاکم تصور کرو ' اور اس وقت کوئی اسلامی قانونی نظام بھی نہ تھا ۔ اور جب لوگوں نے اللہ کو اس زمین پر اپنا حاکم تسلیم کر لیا تو پھر حاکم کی طرف سے شریعت آگئی ۔ یہ شریعت بھی اس طرح آئی کہ جب بھی اس اسلامی سوسائٹی کو کسی قانون کی حقیقی ضرورت درپیش ہوئی تو قانون نازل ہو گیا یا انہوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں خود اپنے لیے قانون کا استنباط کر لیا ۔۔۔ یہی ہے واحد منہاج کار اور قیامت تک کے لیے یہی منہاج رہے گا ۔

اسلامی انقلاب کا اس سے آسان طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک داعی ایک تقریر کرے ' اسلام کے احکام بیان کر دے اور اسلامی قانون کی تشریح کر دے ۔ لوگ یکدم اسلام میں داخل ہو جائیں اور قصہ تمام شد ۔ لیکن یہ طریقہ کار محض تمنا ہے ۔ ایک اچھی خواہش ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ عوام الناس طاغوتی قوتوں اور جاہلیت کو چھوڑ کر اسلامی نظام میں صرف اسی طریقہ کار کے مطابق ہی داخل ہو سکتے ہیں اور وہ طریقہ کار ایک دیرپا ' تدریجی اور دعوت اسلامی کا طریقہ کار ہے ۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک فرد دعوت اسلامی کا آغاز کرتا ہے ' ایک ہراول دستہ اس کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے ۔ یہ ہراول دستہ موجود اور قائم نظام جاہلیت کو کرتا ہے اور اس کے بعد اس کے اور اس نظام جاہلیت کے درمیان کشمکش برپا ہو جاتی ہے ۔ ایک قوم بلکہ معاشرے کی پوری قوم کے ساتھ اسی قوم سے اٹھے ہوئے ان داعیوں کی جنگ شروع ہوتی ہے ۔ اللہ اس ہراول دستے کو فتح دیتا ہے اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور یہ دین اسلام کیا ہے ؟ یہ اللہ کا وہ نظام ہے جس کے سوا اللہ کسی نظام کو برداشت نہیں کرتا ۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ "اور جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی نظام زندگی کی تابع داری کرے گا ' اس سے یہ تابع داری قبول نہ کی جائے گی" ۔

شاید یہ طویل بیان حضرت یوسف ؑ کے موقف کو اچھی طرح واضح کر دے گا ۔ یہ کہ حضرت یوسف ؑ کسی اسلامی سوسائٹی میں نہیں تھے جس میں کسی شخص کے لیے طلب عہدہ کا کوئی موقعہ نہ ہو ' اور اس میں کوئی شخص کوئی منصب نہ طلب کر سکتا ہو ۔ دوسری جانب وہ دیکھ رہے تھے کہ اس غیر اسلامی نظام میں انہیں ایک ایسا منصب مل رہا ہے جس میں تمام اختیارات ان کے ہاتھ آ رہے ہیں اور وہ اس میں حاکم مطاع ہوں گے ' اس طرح انہیں موقعہ ملے گا کہ وہ اپنے عقائد پورے مصر میں پھیلا دیں ۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا کہ ان کے دور اقتدار میں پورے مصر میں عقیدۂ توحید پھیل گیا ۔ اس دور میں حضرت یوسف ؑ

مصری سوسائٹی پر اس طرح چھاگئے کہ اعیان مصر اور بادشاہ مصر دونوں پس منظر میں چلے گئے۔

---000---

اب ہم سیاق کلام میں اصل مضمون اور قصے کی طرف واپس ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق کلام میں یہ نہیں کہا جاتا کہ حضرت یوسف کی درخواست منظور ہوگئی بلکہ ان کی جانب سے درخواست بذات خود منظوری تھی۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان لوگوں کے ہاں اب حضرت یوسف بہت ہی عظیم المرتبہ انسان تھے۔ چنانچہ جواب درخواست کی جگہ اس پر ایک تبصرہ کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے منصب کا چارج بھی لے لیا ہے۔ کہا جاتا ہے :

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (٥٦) وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (٥٧) (١٢: ٥٦ - ٥٧) "اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں 'نوازتے ہیں' نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا' اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے"۔

"اس طرح"، یعنی اسے غلط الزام سے بری کر کے 'بادشاہ مصر کو ان کا گرویدہ کر کے اور پھر ان کو ان کے طلب کردہ عظیم منصب پر فائز کر کے 'یوں ہم نے ان کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی 'ان کے قدموں کو مضبوط کر دیا اور انہوں نے اس سرزمین پر ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔ اس سرزمین پر کہ مصر ان دنوں ایک عظیم اور ترقی یافتہ ملک تھا گویا وہی ملک تھا۔ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (١٢: ٥٦) "وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے"۔ جہاں چاہے چلا جائے 'جہاں چاہے رہے 'جو عہدہ چاہے لے' ذرا اس حالت کو اس حالت کے تناظر میں دیکھو کہ وہ اندھے کنوئیں میں تھے اور ہر لمحہ جان کی پڑی تھی 'پھر ذرا اس حالت سے مقابلہ کرو کہ وہ قید وبند کی سختیاں جھیل رہے تھے۔

نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ (١٢: ٥٦) "ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں"۔ اسے مشکلات سے نکال کر آسانیوں میں لاتے ہیں 'پریشانیوں کے بدلے اسے خوشیاں دیتے ہیں۔ خوف کے بدلے امن دیتے ہیں 'قید کے بدلے آزادی دیتے ہیں 'لوگوں کی نظروں میں ہلکے پن کے بدلے مقام بلند دیتے ہیں۔

وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (١٢: ٥٦) "اور نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا"۔ جو لوگ اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہیں 'اس پر توکل کرتے ہیں 'اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں 'اس کے حوالے سے اپنے طرز عمل ' اپنے معاملات اور لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو درست کرتے ہیں۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (١٢: ٥٧) "اور آخرت کا اجر

ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے" - لہذا ان کا بنیادی اجر بھی کم نہ ہو گا اگرچہ آخرت کا اجر دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے بشرطیکہ انسان ایمان اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائے اور اپنی سری اور ظاہری زندگی کو خدا ترسی کی راہ پر استوار کر دے۔

یوں اللہ نے حضرت یوسف ؑ کی مشکلات دور کر دیں' انہیں زمین میں بلند مرتبہ دیا۔ آخرت میں ان کو خوشخبری دی 'صبر اور احسان کرنے والوں کی یہی مناسب جزاء ہے۔

---ooo---

زمانے کی گاڑی چلتی رہی - سرسبزی و شادابی کے سات سال گزر گئے۔ قرآن کریم نے ان سات سالوں کی تفصیلات کو حذف کر دیا ہے کہ ان سالوں میں لوگ کیا کرتے رہے اور حضرت یوسف ؑ نے ان سالوں میں کیا تدابیر اختیار کیں - ملک کا نظم و نسق کس طرح چلایا' کیونکہ ان امور نے تو بطریق احسن چلنا ہی تھا کیونکہ حضرت یوسف ؑ نے کہہ دیا تھا۔ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ قرآن نے ملک میں قحط آنے کا تذکرہ کرنا بھی ضروری نہ سمجھا کہ ان میں لوگوں پر کیا گزری' کس طرح خشک سالی آئی اور کس طرح گئی۔ کیونکہ حضرت یوسف ؑ کی تعبیر خواب نے یہ تفصیلات گویا بتا دی ہیں - وہ فرماتے ہیں :

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ

"اس کے بعد سات سخت آئیں گی' یہ کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے جمع کر رکھا تھا' مگر تھوڑا سا وہ جو تم نے بچایا"۔ (۱۲:۴۸) سیاق کلام میں اب نہ بادشاہ سامنے آتا ہے نہ کوئی اور شاہی کارندہ۔ گویا اب یوسف ؑ ہی سب کچھ ہیں' جو اس خوفناک دور میں پوری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اب اسٹیج پر صرف حضرت یوسف ؑ ہیں۔ ہر طرف سے روشنی کی زد میں ہیں - یہ وہ حقیقت ہے جسے اس قصے میں فنی طور پر بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

جہاں تک خشک سالی کا تعلق ہے حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں کی آمد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خشک سالی سینائی سے اس طرف کنعان تک پھیل گئی ہے اس لیے یہ لوگ غلے کی تلاش میں مصر تک پہنچ گئے ہیں۔ اور علاقے میں مصری حکومت ہی حضرت یوسف ؑ کی تدابیر کے نتیجے میں ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہے۔ تمام پڑوسی ممالک کی نظریں مصر پر ہیں' تمام ممالک کے لیے مصر اب غلہ کا گودام ہے۔ ایسے حالات میں حضرت یوسف ؑ کی کہانی میں اب ان کے بھائی نمودار ہوتے ہیں اور اس میں فنی خصوصیت کے ساتھ ساتھ اب دینی مقاصد بھی سامنے آتے ہیں۔

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿٥٩﴾ فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ

لِفِتْيَٰنِهِ ٱجْعَلُوا۟ بِضَٰعَتَهُمْ فِى رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَآ إِذَا ٱنقَلَبُوٓا۟ إِلَىٰٓ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

"یوسف ؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا"۔ انہوں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں، اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ یوسف ؑ نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ "ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو"۔ یہ یوسف ؑ نے اس امید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں گے (یا اس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں"۔

خشک سالی اور قحط نے سرزمین کنعان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ چنانچہ برادران یوسف بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ عازم مصر ہوئے تھے کیونکہ مصر نے اپنے غلے کے ذخائر دوسرے ممالک کے لیے کھول دیئے تھے۔ یہ ذخائر اس نے شادابی کے زمانے میں جمع کر رکھے تھے۔ ہمارے سامنے اب منظر یہ ہے کہ یہ لوگ اب حضرت یوسف ؑ کے مہمان ہیں، ایسے حالات میں کہ اپنے فرمان کو نہیں جانتے جبکہ وہ انہیں خوب جانتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر کوئی زیادہ تبدیلی نہیں ہے اور حضرت یوسف ؑ تبدیل ہو گئے ہیں، پھر ان کے خیال میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ یوسف ؑ یہ مقام حاصل کر سکیں گے، ایک عبرانی لڑکا جسے انہوں نے اندھے کنویں میں ڈال دیا ہے وہ یہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اور اس پر تقریباً بیس سال بھی گزر گئے ہیں۔ پھر وہ ہے بھی عزیز مصر کی صورت میں خدم و حشم اور نوکر شاکر اور منصب عالیہ کا رعب داب کس طرح ان کے تخیل کو اس طرف رخ کرنے دیتا ہے؟

ادھر حضرت یوسف ؑ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ وہ مناسب سمجھتے ہیں کہ انہیں ذرا مزید سبق پڑھایا جائے۔

وَ جَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهُ مُنْكِرُوْنَ (۱۲:۵۸)

"یوسف ؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے"۔

سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے ان کو عزت و احترام سے بٹھایا اور ان کو اس طرح سبق پڑھانا شروع کیا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ (۱۲:۵۹) "پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ حضرت یوسف ؑ کے ساتھ بے تکلف ہو گئے تھے، اس طرح انہوں نے عزیز مصر کو بتا دیا کہ وہ کون ہیں اور یہ کہ ان کا ایک سوتیلا بھائی بھی ہے جسے ہمارا باپ اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ نہیں آیا۔ جب ان

لوگوں کا سامان تیار ہو گیا تو حضرت یوسف ؑ نے کہہ دیا کہ وہ تمہارے اس بھائی سے ملنا چاہتے ہیں - تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں خریداروں کو ٹھیک ٹھیک حق دیتا ہوں 'اگر تمہارا بھائی آ جائے تو اس کا حصہ بھی ادا کر دوں گا - اور دوسروں کی طرح تمہاری قدر و منزلت کروں گا -

اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۵۹) فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ (۶۰) (۱۲ : ۵۹ - ۶۰) "دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں - اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے - بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا" -

ان کو تو معلوم تھا کہ حضرت یعقوب ؑ حضرت یوسف ؑ کی گمشدگی کے بعد یوسف ؑ کے بھائی کو ہر وقت ساتھ رکھتے تھے اس لیے انہوں نے کہہ دیا کہ اسے لانا ان کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہے - ان کے باپ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں 'بہرحال وہ کوشش کریں گے کہ وہ دوسری بار ان کے ساتھ آ جائے -

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ (۱۲ : ۶۱) "انہوں نے کہا" ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں 'اور ہم ایسا ضرور کریں گے" - (نراود) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کام کے لیے انہیں بہت ہی سعی کرنی ہوگی -

یوسف ؑ نے اپنے ملازمین کو حکم دے دیا کہ جو درشن یا سامان وہ غلے کے مبادلے میں لائے تھے وہ بھی انہیں ان کے بار میں رکھ کر لوٹا دیا جائے 'ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ نقدی ہو یا کوئی صحراوی قیمتی قلات ہوں یا چمڑے اور دوسری چیزیں مثلاً اون وغیرہ جو شہروں میں اچھی قیمت پر بکتے ہیں - مقصد یہ تھا کہ جب یہ اپنے بار کھولیں گے تو یہ اپنی چیزیں دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور پہچان لیں گے کہ یہ تو ان کی اشیاء ہیں -

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۲ : ۶۲) "یوسف ؑ نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ" ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو" - یہ یوسف ؑ نے اس امید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں گے (یا اس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں" -

--- ooo ---

اب حضرت یوسف ؑ مصر میں رہ جاتے ہیں اور کنعان میں حضرت یعقوب ؑ اور برادران یوسف ؑ منظر پر ہیں - ان کی واپسی کے بارے میں قرآن خاموش ہے -

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓی اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۶۳ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۝۶۴ وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ۝۶۵ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ۝۶۶

"جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا "ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ باپ نے جواب دیا "کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملہ میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان' اور ہمیں کیا چاہئے' دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے کر آئیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے' اتنے غلہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔ ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا۔ جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو ن نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم گھیر ہی لیے جاؤ"۔ جب انہوں نے اس کو اپنے اپنے ن دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو' ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سیدھے باپ کے سلام کو حاضر ہوئے۔ سامان کھولنے سے بھی پہلے انہوں نے باپ کو یہ بتانا ضروری خیال کیا کہ ہمارے بارے میں تو فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ جب تک ہم اپنے چھوٹے بھائی کو عزیز مصر کے سامنے پیش نہ کریں گے ہمیں مزید کوئی غلہ نہ دیا جائے گا۔ چنانچہ پہنچتے ہی انہوں نے باپ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ چھوٹے بھائی کو ساتھ بھیجیں تاکہ ایک اونٹ بار غلہ بھی مل جائے اور وہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لیتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ

لَحٰفِظُوْنَ (۱۲ : ۶۳) "جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا" ابا جان ' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے ' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں ۔ اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ اب حضرت یعقوب ؑ کے خفیہ خدشات سامنے آجاتے ہیں۔ حضرت یوسف ؑ کے بارے میں بھی انہوں نے ایسا ہی پختہ عہد کیا تھا۔ چنانچہ آپ ؑ اپنے درد کا اظہار کر دیتے ہیں۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓي اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ (۱۲ : ۶۴) "باپ نے جواب دیا" کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملہ کر چکا ہوں؟" چھوڑو ' یہ جھوٹے وعدے اور اپنے پاس رکھو اپنی حفاظت ' میں اللہ کی حفاظت اور اللہ کی رحمت کا طالب ہوں۔ صرف وہی حفاظت کرنے والا ہے۔

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۲ : ۶۴) "اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ جانوروں کو سنبھالنے اور سفر سے ستانے کے بعد جب انہوں نے اپنے سامانوں کو کھولا تاکہ لائے ہوئے غلے کو ٹھکانے لگائیں ' تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا وہ پورا سامان انہیں واپس کر دیا گیا ہے جو وہ غلہ خریدنے کے لیے لے گئے تھے اور ان کے غلے کے ساتھ خود ان کا اپنا سامان دے دیا گیا۔

حضرت یوسف ؑ نے انہیں گندم دینے کے ساتھ خود ان کا سامان بھی ان کے باروں میں رکھ دیا ' تو جب سامان کھولا تو انہوں نے اپنا سامان پایا۔ اس لیے انہوں نے کہا اے باپ ہم سے گندم روک لی گئی اور یہ اس لیے کیا گیا تاکہ وہ مجبور ہو جائیں اور بھائی کو لے کر جائیں ۔ حضرت یوسف ؑ ان لوگوں کو جو سبق دینا چاہتے تھے یہ اس کا ایک حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامان کی واپسی کو اس بات کے لیے بطور دلیل پیش کیا کہ وہ بھائی کو ساتھ لے جانے کے مطالبے میں زیادتی نہیں کر رہے اور نہ ظلم کر رہے ہیں۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ

(۱۲ : ۶۵) "پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے ۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان ' اور ہمیں کیا چاہیے ' دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے ۔ اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے کر آئیں گے ' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے ' اتنے غلہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔

ان کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ صرف خاندان کا بھلا چاہتے ہیں ' جب خاندان کے لیے ہم زاد راہ کی تلاش میں جا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ بھائی کی حفاظت کریں گے ۔ بھائی کی وجہ سے ایک بار شتر غلہ اور زیادہ مل جائے گا ۔ جب بھائی ساتھ ہو گا تو اس کا حصہ رسد بھی لازماً ملے گا۔

ان کی اس بات سے کہ ہم ایک بار شتر غلہ زیادہ لائیں گے' یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ ہر شخص کو ایک بار شتر غلہ دیتے تھے۔ کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ جس قدر غلہ چاہے لے جائے۔ کیونکہ خشک سالی کے دور میں کنٹرول کرنے میں حکمت تھی تاکہ سب کو تھوڑا تھوڑا غلہ ملتا رہے۔

حضرت یعقوبؑ نے مجبور ہو کر ان کے اس مطالبے کو تسلیم کیا لیکن ایک شرط لگا دی اور بہت ہی کڑی شرط۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتّٰي تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (۱۲: ۶۶) ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا۔ جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم گھیر ہی لیے جاؤ"۔

یعنی تم اللہ کی قسم اٹھا کر یہ یقین دلاؤ گے کہ تم اسے لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم سب کے سب گھیر لیے جاؤ اور تمہارے نکل آنے کی کوئی تدبیر نہ رہے اور ایسے حالات ہوں کہ تم بے بس ہو جاؤ۔

فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ (۱۲: ۶۶) "جب انہوں نے اس کو اپنے اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔ یعنی نہایت تاکید کے طور پر اور بات کو پختہ کرنے کے لیے اور زیادہ نصیحت اور خدا خوفی کے لیے خدا کو شاہد کر دیا۔ اس تاکید مزید کے بعد اب حضرت یعقوبؑ ان کو زیادہ نصیحت کرتے ہیں کہ مصر کی مملکت میں داخلے کے وقت احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

پھر اس نے کہا "میرے بچو! مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا' اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہو' اسی پر کرے"۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ) اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس بات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے تقدیری اور جبری احکام اس کائنات میں اس طرح رواں اور دواں ہیں کہ ان کے اندر کوئی انفکاک ممکن نہیں ہے۔ کوئی تخلف نہیں ہے۔ ان احکام سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اور امنت باللہ میں و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالٰی کا یہی مطلب ہے۔

اللہ کے تکوینی اور تقدیری احکام اس دنیا میں لوگوں پر نافذ ہوتے ہیں اور ان کا اجراء خود لوگوں کی مرضی اور ارادے پر موقوف نہیں ہے۔ ان جبری اور تقدیری احکام الہیہ کے ساتھ ساتھ ایسے الٰہی احکام بھی ہوتے ہیں جو انسانوں کے دائرہ اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور یہ شرعی احکام ہیں جو قرآن اور سنت میں امر و نہی کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ احکام بھی صرف اللہ ہی کی جانب سے ہو سکتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی بھی از خود امر و نہی صادر نہیں کر سکتا۔ ان احکام کا حکم بھی تقدیری اور تکوینی احکام کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شرعی احکام میں لوگ مختار ہیں ' ان کو نافذ کریں یا نہ کریں ' اور اسی پر دنیا اور آخرت میں ان کی زندگی کے اعمال پر نتائج اور احکام مرتب ہوتے ہیں اور ہوں گے۔ اور سزا اور جزاء کا فیصلہ ہو گا۔ لیکن لوگ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اللہ کے شرعی احکام کو بھی اپنی پوری زندگیوں میں نافذ نہ کریں۔

غرض اب یہ قافلہ چلتا ہے اور وہ اپنے والد کی وصیت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

۸ ع ۱۱ ۲

"اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں (متفرق دروازوں سے) داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی۔ ہاں بس یعقوب ؑ کے دل میں جو ایک کھٹک تھی اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کر لی۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا مگر اکثر لوگ معاملہ کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں"۔

سوال یہ ہے کہ حضرت یعقوب ؑ نے ان کو یہ وصیت کیوں فرمائی۔ اس موقعہ پر ان کے باپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق ابواب سے داخل ہونا۔

روایات اور تفاسیر نے اس سلسلے میں دور دراز کی باتیں کی ہیں جبکہ ان کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی۔ بعض مفسرین نے تو ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جو سیاق قرآن کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم اگر اس کا کوئی سبب بتانا چاہتا تو ضرور بتا دیتا لیکن قرآن مجید نے تو صرف اس قدر کہا

إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا (۱۲ : ۶۸) "یعقوب ؑ کے دل میں ایک کھٹک تھی اسے دور کرنے کی انہوں نے اپنی سی کوشش کی"۔ لہذا مفسرین کو چاہئے تھا کہ بس وہ اسی بات پر توقف کرتے جو قرآن کریم نے کہہ دی۔ اور اپنی رائے کو اس ماحول اور فضا تک محدود کرتے جس میں یہ وصیت کی گئی اور جس ماحول میں یہ بات ہو رہی تھی اس میں حضرت یعقوب اپنے بیٹوں کی سلامتی کے بارے میں خدشات رکھتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ متفرق

دروازوں سے غیر محسوس طور پر داخل ہو گئے تو جس خطرے کے بارے میں وہ سوچتے تھے وہ شاید ٹل جاتا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہہ دیا کہ میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ حکم اس کے سوا کسی کا نہیں چلتا۔ صرف اسی پر بھروسہ ہونا چاہئے۔ البتہ ان کے دل میں ایک کھٹک تھی اور ان کا وجدان کسی خطرے کو محسوس کر رہا تھا اور اس کا فیصلہ انہوں نے اس وصیت کے ذریعے کیا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اللہ کا ارادہ نافذ ہونے والا ہے اور یہ بات ان کو اللہ نے سمجھائی تھی اور یہ ان کے پیغمبرانہ علم میں تھی۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲:۶۸) "مگر اکثر لوگ معاملہ کی حقیقت کو جانتے نہیں"۔ اب اس کا حقیقی سبب کیا تھا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ان کو حاسدوں کی آنکھوں سے بچانا چاہتے تھے یا یہ بات بھی ہو سکتی تھی کہ اگر وہ جتھے کی شکل میں جاتے تو مصر کی مملکت اپنے لیے اس کو سیکورٹی کا مسئلہ بنا لیتی۔ یا ان کو اس کی شان و شوکت سے داخل ہونے سے غیرت آ جاتی۔ یا یہ کہ ان کو کوئی ڈاکو نہ سمجھے یا جو بھی ہو' یہاں اس کی وضاحت و صراحت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں ایک قاری اور مفسر کو یہ نقصان ضرور ہوتا کہ وہ اصل قرآنی موضوع اور غرض و غایت سے ذرا ہٹ کر ان اسباب پر کلام کرتا اور قال و قیل کا سلسلہ چل نکلتا۔ اس قسم کے قال و قیل پر مشتمل مباحث بسا اوقات بحث کو خالص قرآنی فضا اور موضوع سے دور لے جاتے ہیں۔

مناسب یہ ہے کہ ہم اس وصیت اور اس سفر کو اسی طرح لکھیں جس طرح قرآن کریم نے اسے لیا ہے۔ اب برادران یوسفؑ کے ساتھ اگلے منظر میں ہم یوں ملتے ہیں:

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۹

"یہ لوگ یوسفؑ کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ "میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھویا گیا تھا) اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں"۔

اس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ اور ان کے حقیقی بھائی کی ملاقات جلدی سے کرا دی جاتی ہے۔ پھر حضرت یوسفؑ کسی تمہید کے بغیر بھائی کو اطلاع دے دیتے ہیں کہ میں تمہارا بھائی یوسفؑ ہوں اور یہ مشورہ بھی ان کو دیتے ہیں کہ دوسرے بھائیوں نے ان کے ساتھ اس سے قبل جو سلوک کیا اس کو بھول جائیں۔ ماضی کی پریشان کن یادیں بہرحال کسی شخص کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں اور وہ چونکہ کنعان میں اسی خاندان میں رہتے تھے جن میں یہ واقعات رونما ہوئے تھے تو لازماً یہ ان کے لیے ہر وقت پریشان کن تھے اور تکلیف دہ تھے۔

سیاق کلام نے کیوں اس بات کو پہلے بیان کر دیا؟ حالانکہ قدرتی امر یہ ہے کہ برادران کے درمیان یہ مکالمہ عین اس وقت نہ ہوا ہو گا جب یہ وفد حضرت یوسفؑ حاکم مصر سے ملا ہو گا' بلکہ یہ اس وقت ہوا ہو گا جب یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی تنہا ہوئے ہوں گے۔ ہاں جب یہ لوگ حضرت یوسفؑ کو ملے ہوں گے اور انہوں نے اس طویل جدائی کے

بعد اپنے بھائی کو دیکھا ہو گا تو ان کے دل میں یہ خیال سب سے پہلے آ گیا ہو گا کہ میں بھائی کو یہ اطلاع کر دوں۔

یہ چونکہ پہلا خیال تھا اس لیے اس منظر میں اسے خیال یوسف ؑ کی شکل میں دے دیا گیا اور یہ قرآن کریم کا ایک نہایت ہی لطیف اور خوبصورت اسلوب بیان ہے اور اس سے لطف اندوز وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو کلام کی فنی باریکیوں کو جانتے ہیں۔

اس منظر میں بھی بعض واقعات کے بیان کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے کاٹ دیا جاتا ہے۔ مثلاً برادران یوسف ؑ کی مہمانداری اور اس دوران ان کے درمیان ہونے والی گفتگو 'اور برادران یوسف ؑ کی روانگی کا منظر لے لیا جاتا ہے۔ اس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف ؑ اپنے بھائی کو اپنے ہاں روکنے کے لیے ایک خاص تدبیر کرتے ہیں تاکہ ان کے بھائیوں کو سبق دیا جائے بلکہ بہت سے سبق دیئے جائیں جو ان کے لیے ضروری تھے اور قیامت تک آنے والے لوگ بھی اس سے عبرت لیتے ہیں۔ چنانچہ اس تدبیر کو ابدی کتاب کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿٧٣﴾ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٧٤﴾ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾ قَالُوا إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُ مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿٧٧﴾ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ

اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۞

”جب یوسف ؑ ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا ”اے قافلے والو' تم لوگ چور ہو“۔ انہوں نے پلٹ کر پوچھ ”تمہاری کیا چیز کھوئی گئی؟“ سرکاری ملازموں نے کہا ”بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا“۔ (اور ان کے جمعدار نے کہا) ”جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے' اس کا میں ذمہ لیتا ہوں“۔ ان بھائیوں نے کہا ”خدا کی قسم' تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں“۔ انہوں نے کہا ”اچھا' اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟“ انہوں نے کہا ”اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے' ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے“۔ تب یوسف ؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی' پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی۔ اس طرح ہم نے یوسف ؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں' بلند کر دیتے ہیں' اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالا تر ہے۔

ان بھائیوں نے کہا ”یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں' اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف ؑ) بھی چوری کر چکا ہے“۔ یوسف ؑ ان کی یہ بات سن کر پی گیا' حقیقت ان پر نہ کھولی' بس (زیرلب) اتنا کہہ کر رہ گیا کہ ”بڑے ہی برے ہو تم لوگ' (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے“۔

انہوں نے کہا ”اے سردار ذی اقتدار (عزیز) اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے' اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے' ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں“۔

یہ ایک نہایت ہی دلچسپ منظر ہے۔ اس میں متنوع حرکات' تاثرات' سرپرائز شامل ہیں۔ جیسا کہ کوئی نہایت ہی موثر' جذباتی اور زندگی سے بھرپور کوئی ڈرامائی منظر ہو سکتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ قرآن کریم زندہ اور حقیقی واقعات کو نہایت ہی موثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

پس پردہ حرکت یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ بادشاہ کے پیمانے یا پیالے کو ان کے سامان میں رکھوا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پیالہ بیک وقت پینے کے کام بھی آتا تھا اور غلہ ماپنے کا پیمانہ بھی تھا۔ اس دور میں گندم کو سونے کے پیمانے میں ناپنا تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اس قحط کے دور میں سونے کے مقابلے میں گندم کی اہمیت زیادہ تھی۔ حضرت یوسف ؑ پس منظر میں اس پیالے کو اپنے بھائی کے بار میں رکھوا رہے ہیں تاکہ اللہ کی ہدایت کے مطابق اس تدبیر سے بھائی کو پکڑا جا سکے۔ تفصیلات ابھی آ رہی ہیں۔

اب جبکہ یہ قافلہ بار لدوا کر واپس عازم کنعان ہو چکا تو ایک منادی نمودار ہوتا ہے اور وہ اعلان عام کی شکل میں آواز دیتا ہے اور یہ اعلان پورے قافلے کے لیے ہے۔

أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ (۱۲ : ۷۰) "اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو"۔ برادران یوسف ڈر سے کانپ اٹھتے ہیں کیونکہ چوری کا الزام پورے قافلے پر لگ چکا ہے۔ ان کے لیے اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ وہ حضرت یعقوب "ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام کے بیٹے ہیں۔ یہ لوگ اپنے جانور اور بار واپس کر دیتے ہیں تا کہ اس الزام کی تحقیقات کی جا سکے۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ (۱۲ : ۷۱) "انہوں نے پلٹ کر پوچھا تمہاری کیا چیز کھوئی گئی؟" چنانچہ ان ملازمین نے 'جن کی ڈیوٹی تھی کہ وہ ان کے بار تیار کریں' کہا چوکیداروں نے کہا جن میں سے یہ اعلان کنندہ بھی تھا۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ (۱۲ : ۷۲) "سرکاری ملازمین نے کہا بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں مل رہا"۔ اس دوران ایک دوسرا شخص منظر پر آتا ہے اور وہ انعام' انعام کی ایک بڑی رقم کا اعلان کرتا ہے کہ اگر کوئی رضاکارانہ طور پر واپس کر دے تو یہ قیمتی انعام دیا جائے گا۔ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ (۱۲ : ۷۲) "جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے اور اس کا میں ذمہ دار ہوں"۔ زعیم یعنی ضامن کہ اسے ایک بار شتر گندم دوں گا۔

لیکن ان حضرات کو تو پورا یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہیں کیونکہ انہوں نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی وہ اس لیے آئے تھے کہ ایسی حرکتیں کریں 'جس سے باہم اعتماد تباہ ہو جائے اور مختلف ممالک کے بین الاقوامی تعلقات خراب ہوں۔ چنانچہ وہ قسمیہ بیان دیتے ہیں :

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ (۱۲ : ۷۳) "ان بھائیوں نے کہا خدا کی قسم' تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں"۔ تمہیں ہماری تاریخ کا بھی علم ہے' ہمارے نسب وحسب کا بھی علم ہے اور ہماری ظاہری پوزیشن بھی نظر آتی ہیں۔

وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ (۱۲ : ۷۳) "اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں"۔ ہم سے یہ برا فعل ہرگز صادر نہیں ہو سکتا' ہرگز نہیں۔ بادشاہ کے کارندوں اور چوکیداروں نے کہا۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۲ : ۷۴) "اچھا' اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو پھر چور کی سزا کیا ہے؟" اس سے وہ حکمت معلوم ہوتی ہے جو اس تدبیر کی شکل میں اللہ نے حضرت یوسف ؑ کو سجھائی۔ دین یعقوب ؑ میں قانون یہ تھا کہ چور کو چوری کے مال اور جرم کے بدلے رہن قیدی یا غلام بنا لیا جائے۔ برادران یوسف ؑ کو چونکہ اپنی بے گناہی کا پورا پورا یقین تھا' تو وہ خوشی خوشی اس پر راضی ہو گئے کہ دین یعقوبی کے مطابق فیصلہ ہو جائے جو بھی مجرم ہو۔ یوں اللہ نے حضرت یوسف ؑ اور ان کے بھائی کے لیے جو اسکیم تیار کی وہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ

”انہوں نے کہا اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے۔ ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے“۔

یہ سب گفتگو حضرت یوسف ؑ کی موجودگی میں ہو رہی تھی اور وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے تلاشی کا حکم دیا اور ان کی دانش مندی نے انہیں یہ سمجھایا کہ دوسرے بھائیوں کے باروں کی تلاشی پہلے لی جائے تاکہ تحقیق اور تدبیر کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ (۱۲ : ۷۶) ”تب یوسف ؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی“۔

اس مرحلے پر قرآن اس دہشت اور پریشانی کو بیان نہیں کرتا جس سے برادران یوسف اچانک دوچار ہو گئے۔ ان کو تو سو فیصدی یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ انہوں نے بیان حلفی بھی دے دیا تھا اور بیک آواز دے دیا تھا۔ قرآن کریم نے منظر کا یہ حصہ انسانی تخیل پر چھوڑ دیا کیونکہ ایسے مواقع پر ایسے تاثرات خود بخود ظاہر ہوتے ہیں۔ اس تاثر کو انسانی خیال پر چھوڑ دیا گیا اور واقعہ پر ایک تبصرہ کر دیا گیا تاکہ ابنائے یعقوب ؑ جس دہشت اور شرمندگی سے دوچار تھے 'ایک قاری اس سے ذرا نکل آئے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (۱۲ : ۷۶) ”اس طرح ہم نے یوسف ؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی جو نہایت ہی گہری تدبیر تھی۔

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (۱۲ : ۷۶) ”اس کو دین شاہی میں اپنے بھائی کو پکڑنے کا حق نہ تھا“۔ یعنی اگر اس کیس کا فیصلہ شاہی قانون کے مطابق کیا جاتا تو حضرت یوسف ؑ بھائی کو شخصی طور پر نہیں روک سکتے تھے۔ صرف اسے چوری کی سزا دے سکتے تھے۔ لیکن بھائیوں نے یہ تجویز دی کہ ان کے اپنے دین کے مطابق چور کا فیصلہ ہونا چاہئے۔ یہ ہے وہ تدبیر جس کے اسباب اللہ نے حضرت یوسف ؑ کو سجھائے۔ یہ ہے اللہ کی جانب سے یوسف ؑ کے حق میں تدبیر۔ لفظ ”کید“ عربی میں خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال لغت میں خیر اور شر دونوں معنوں میں ہوتا ہے۔ لیکن عموماً اس کا استعمال شر میں ذرا زیادہ ہو گیا۔ بظاہر تو یہاں اس کے بھائی کے لیے بھی واقعہ شر ہی کا ہو رہا ہے' بھائیوں کے لیے بھی یہ بظاہر شر ہے کیونکہ ان کو والد کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر حضرت یعقوب ؑ کے لیے بھی یہ وقتی طور پر تکلیف دہ امر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے واقعہ کے ظاہری پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے ”کید“ کا لفظ استعمال کیا جو قرآن کریم کا ایک نہایت ہی لطیف اسلوب بیان ہے۔

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۱۲ : ۷۶) ”وہ بادشاہ کے قانون میں اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتے تھے الا یہ کہ اللہ ایسا چاہتا“۔ جیسا کہ اللہ نے ان کے لیے زیر نظر تدبیر کی۔

اس آخری تبصرے میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو اللہ نے بہت ہی رفعتیں' بہت ہی علم' عطا فرما دیا تھا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۱۲ : ۷۶) ”ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں لیکن ساتھ

ہی ساتھ یہ تنبیہ بھی کر دی جاتی ہے کہ اللہ کا علم سب سے اونچا اور اعلیٰ ہے۔

وَ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (۷۶:۱۲) "اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالا تر ہے"۔ یہ ایک لطیف احتیاط ہے۔

یہاں قرآن مجید نے اس آیت

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ (۷۶:۱۲) "ہم نے یوسف ؑ کے لیے یوں تدبیر کی .... وہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانونی نظام میں گرفتار نہ کر سکتے تھے" میں لفظ "دین" کو ایک مخصوص مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ نہایت ہی ٹیکنیکل اصطلاحی استعمال ہے۔ یعنی نظام اور شریعت کے مفہوم میں کیونکہ مصر کے قانونی نظام میں چور کے لیے یہ سزا نہ تھی کہ اسے جرم کے عوض رکھ ہی لیا جائے۔ یہ سزا صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے شرعی اور قانونی نظام میں تھی۔ برادران یوسف اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ کیس کا فیصلہ ان کے قانون کے مطابق کیا جائے۔ جب ۔۔۔ نہ اس کے بھائی کی خرجی سے نکلا تو حضرت یوسف ؑ نے ان پر انہی کا قانون نافذ کر دیا۔ یہاں قرآن کریم نے نظام اور قانون پر "الدین" کا اطلاق فرمایا ہے۔

دین کا یہ نہایت ہی واضح اور صریح مفہوم ہے' اور بیسویں صدی کی جاہلیت میں سب کے ذہن سے یہ مفہوم غائب ہے۔ ان لوگوں کے ذہن سے بھی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کے ذہن سے بھی جو اس جاہلیت کے داعی اور پیروکار ہیں۔

ان لوگوں نے دین کا مفہوم عبادات اور مراسم مذہبی تک محدود کر دیا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی وحدانیت پر اعتقاد رکھتا ہو' رسول کو سچا سمجھتا ہو' ملائکہ اور کتب پر ایمان رکھتا ہو' تمام رسولوں کو مانتا ہو' آخرت پر یقین رکھتا ہو' اور اچھی اور بری تقدیر کے من جانب اللہ ہونے کا قائل ہو اور پھر وہ فرائض و عبادات پر عمل پیرا ہو' بس وہ پکا دین دار ہے۔ اگرچہ زندگی کے دوسرے معاملات میں وہ دوسرے ارباب اور دوسرے حاکموں کی اطاعت کرتا ہے اور دوسروں کے قانون اور شریعت کے مطابق فیصلے کرتا ہو حالانکہ اس آیت میں صریح طور پر کہا گیا ہے کہ نظام قانون اور شریعت دین کا مسئلہ ہے اور اللہ کے دین کا مفہوم اللہ کا پورا نظام زندگی ہے۔

"الدین" کے مفہوم کو اس قدر محدود کر دیا گیا ہے اور اس قدر سکیڑ دیا گیا ہے کہ وہ عبادات اور اعتقادات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ؐ تک تمام انبیاء نے جو دین پیش کیا اس کا مفہوم اس طرح محدود نہ تھا۔

دین کا مفہوم ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی کی جائے۔ ان تمام امور پر عمل کیا جائے جو شریعت کا حصہ ہیں۔ اور ان تمام امور کو ترک کیا جائے جو شریعت کے خلاف ہیں۔ جس طرح اللہ وحدہ آسمانوں میں حاکم ہیں اسی طرح زمین پر بھی اللہ وحدہ کی حکومت قائم کی جائے اور اللہ وحدہ کو تمام انسانوں کا رب سمجھ جائے یعنی وہی حاکم ہو' وہی قانون ساز ہو' اور اسی کے احکام و نواہی چلیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کون لوگ اللہ کے دین میں ہیں اور کون لوگ بادشاہ کے دین میں ہیں؟ اس مفہوم کے اعتبار سے جو لوگ اللہ کے نظام' اللہ کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں وہ دین الٰہی میں ہیں اور جو لوگ

بادشاہ کے نظام اور قانون کو مانتے ہیں وہ بادشاہ کے دین میں ہیں۔ یہ لوگ اگر شرک بھی کرتے ہیں تو پھر یہ اعتقادات و نظریات میں بھی شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور نظام اور قانون اور دستور میں بھی شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

دین کے مفہوم کے یہ منطقی اور بدیہی نتائج ہیں اور اسلامی نظریۂ حیات کے بدیہیات میں سے ہیں۔

آج کل عوام الناس کے بعض ہمدرد عوام کی طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ یہ لوگ "دین اللہ" کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے اس لیے ایسے لوگ نہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اسلامی قانون اور دستور کو نافذ کیا جائے اور نہ اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ پھر کیا ان لوگوں کی یہ جہالت اور دین کے حقیقی مفہوم سے لاعلمی ان کے لیے معافی کا عذر بن جائے گی؟

میں تو یہ نہیں سمجھتا کہ دین کے مفہوم کو نہ جاننا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہونا کسی کو دین دار بناتا ہے۔ کسی حقیقت پر یقین اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کسی کو وہ حقیقت معلوم ہو۔ اگر لوگ کسی عقیدے کا علم ہی نہیں رکھتے تو وہ اس کے معتقد کیسے ہو سکتے ہیں اور کس طرح انہیں اس عقیدے والا کہا جاسکتا ہے جبکہ وہ اس عقیدے کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے۔

ہو سکتا ہے کہ دین کی حقیقت سے بے خبری آخرت میں ان کے حساب و کتاب میں کسی نرمی کا باعث ہو' یا عذاب میں کمی ہو جائے' اور یہ حساب ان سے لیا جائے جنہوں نے ان کو دین سکھایا نہیں جبکہ وہ دین کے حقیقی مفہوم سے واقف تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق اخروی حساب سے ہے' اور تمام اہل جاہلیت کی سزا کا مسئلہ جن تک دعوت نہ پہنچی ہو۔ اس میں بحث و مباحثہ کرنا ہمارے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہے نہ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہمارا فریضہ تو یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور ایک ایک تک پہنچائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ بھی فریضہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان کے موجودہ دین کی حقیقت سمجھائیں۔ یہ کہ یہ دین اللہ کا دین قطعاً نہیں ہے۔ اللہ کا دین تو وہ ہے جو اس کے نصوص کی صورت میں بطور نظام زندگی اور نظام قانون کے موجود ہے۔ اس طرح اسلامی عقائد کے ساتھ جو شخص اللہ کے نظام اور قانون کو بھی رائج اور نافذ کرے گا وہی دین اسلام میں ہو گا۔ جو شخص کسی بادشاہ یا دوسرے شخص کا نظام رائج کرے گا وہ اس کے نظام اور دین میں ہو گا۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں ہے۔

وہ لوگ جو اس دین کے مفہوم ہی سے ناواقف ہیں' ان کے بارے میں اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ اس دین کا اعتقاد رکھتے ہوں۔ کیونکہ ان کی جہالت کا تعلق دین کی بنیاد سے وابستہ ہے اور جو شخص کسی چیز کی حقیقت کا علم نہ رکھتا ہو وہ عقلاً اور واقعتاً اس چیز پر اعتقاد رکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ عقیدہ علم کے بعد آتا ہے۔ یہ بات بداہتہً ثابت ہے کہ علم کے بغیر عقیدہ ممکن نہیں ہے۔

پس ہمارے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے دین کے اصل مفہوم اور دین کی حقیقت ظاہر کریں۔ بجائے اس کے کہ ہم ان کی جانب سے بے جا مدافعت کریں' ان کے لیے عذرات تلاش کریں' ان کے لیے ہم اللہ کریم سے بھی زیادہ رحم دل ہو جائیں۔ جبکہ وہ درحقیقت اللہ کے دین میں داخل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں پالیسی یہ ہونا چاہئے کہ انہیں صاف صاف بتا دیا جائے کہ ان کی یہ پوزیشن ہے چاہے وہ دین کو اپنائیں یا چھوڑ دیں۔

یہ پالیسی ہمارے لیے بھی مفید ہے اور ان عوام الناس کے لیے بھی مفید ہے۔ اس طرح ہم ان جاہلوں کی گمراہی کے نتائج بھگتنے سے بھی بچ جائیں گے کیونکہ یہ لوگ دین کے مفہوم کو نہ پانے کی وجہ سے دین کے معتقد ہی نہیں رہے۔ اگر ہم ان لوگوں کے سامنے دین کی اصل حقیقت پیش کر دیں جو دراصل دین اسلام میں داخل نہیں ہیں بلکہ دین شاہ وغیرہ میں

ہیں تو ممکن ہے کہ ان کا ضمیر بیدار ہو جائے اور وہ درحقیقت دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔

یہی پالیسی نبی کریم کی رہی ہے اور یہی پالیسی تمام داعیان حق کی ہونی چاہئے' ہر زمان و مکان میں ہونی چاہئے' تمام جاہلوں اور جاہلیت پرستوں کے مقابلے میں۔

اس مختصر سبق آموز تبصرے کے بعد اب ہم برادران یوسف ؑ کی طرف لوٹتے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ اس مشکل مرحلے سے دوچار ہو کر یوسف ؑ اور ان کے بھائی کے خلاف ان کے دل میں چھپی ہوئی عداوت اور بغض و حسد ابل پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو اس جرم سے بری قرار دے کر' اس کا ذمہ دار حضرت یعقوب ؑ کی دوسری بیوی کی اولاد کو ٹھہراتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (۱۲ : ۷۷) ان بھائیوں نے کہا" یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں' اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف ؑ) بھی چوری کر چکا ہے"۔ ہمارے تفاسیر کے ذخیرے میں اس الزام پر طویل تبصرے' حکایات اور روایات بیان کی گئی ہیں' جو سب کی سب اسرائیلیات پر مشتمل ہیں۔ یہ کہ اس کی طرف سے سرقہ قابل تعجب نہیں ہے۔ اس سے قبل اس کے بھائی (یوسف ؑ) اس جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ گویا انہوں نے تو یوسف ؑ کے بارے میں باپ کے سامنے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ کیا وہ اب عزیز مصر کے سامنے جھوٹ نہیں بول رہے کہ اپنے آپ کو اس شرمندگی سے نکالیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو یوسف ؑ اور اس کے بھائی سے قدرے علیحدہ کر دیں۔ اس طرح یوسف ؑ اور ان کے بھائی کے حق میں اپنے قدیمی بغض اور حسد کو ظاہر کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف ؑ پر یہ بالکل ناحق اور جھوٹا الزام لگایا۔

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ (۱۲ : ۷۷) "یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا اور یہ بات ان پر نہ کھولی"۔ یوسف ؑ نے ان کو اس الزام کے جواب میں' اپنی حقیقت ان پر نہ کھولی' بات کو پی گئے اور اپنے تاثرات کا اظہار نہ کیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اور ان کے بھائی دونوں بری الذمہ ہیں۔ البتہ انہوں نے صرف اتنا کہا:

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا (۱۲ : ۷۷) "تم بہت ہی برے لوگ ہو"۔ یعنی تم یہ جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جس پر تم الزام لگا رہے ہو' اس کے مقابلے میں تم تو بہت ہی برے ہو"۔

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا (۱۲ : ۷۷) "یوسف ؑ نے کہا' تم بہت ہی برے ہو"۔ یعنی تم جس پر الزام سرقہ لگا رہے ہو اس کے مقابلے میں اللہ کے نزدیک تم خود بہت ہی برے ہو' اور حضرت یوسف ؑ نے جو کچھ کہا۔ یہ محض گالی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۷۷) "جو الزام تم لگا رہے ہو' اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔ اور اس واقعہ کی حقیقت بھی اور تمہارے الزام کی حقیقت بھی۔ یوں اللہ پر چھوڑ کر حضرت یوسف ؑ نے بات کو

یہاں ہی ختم کر دیا کیونکہ یہاں مطلب و موضوع کے ساتھ اس واقعہ کا تعلق نہیں ہے۔
اب یہ لوگ اس پریشان کن صورت حال پر غور کرنے لگے جس میں وہ گرفتار ہو گئے تھے۔ سوچنے لگے کہ والد نے تو پہلے ہی یہ کہا تھا کہ

لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (۱۲:۶۶) "تم ضرور اسے لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم سب گھر جاؤ"۔ اب وہ حضرت یوسفؑ سے رحم کی اپیل کرنے لگے۔ اس نوجوان بھائی کے بہت ہی بوڑھے باپ کا واسطہ دینے لگے، یہ پیش کرنے لگے کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو گرفتار کر لے۔ یہ ان کو یاد دلا رہے ہیں کہ یوسف "تم بہت محسن، نیک نفس انسان ہو اور اس کے باپ ہی کی خاطر اسے رہا کر دو۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲:۷۸) "انہوں نے کہا "اے سردار ذی اقتدار (عزیز) اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے، اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں"۔ لیکن حضرت یوسف "تو انہیں مزید سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ وہ ان کو اس اچانک خوشی کے لیے تیار کر رہے تھے، جو ان کے لیے، ان کے والد کے لیے اور سب رشتہ داروں کے لیے آ رہی تھی تاکہ وہ بے حد خوش ہوں اور ان پر اس کا گہرا اثر ہو۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

یوسف نے کہا "پناہ بخدا، دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں، جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے"۔
حضرت یوسفؑ نے یہ نہیں کہا کہ پناہ خدا کی، کہ ہم کسی چور کے بدلے ایک بے گناہ کو پکڑ لیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بھائی چور نہیں ہے، اس لیے انہوں نے نہایت ہی ٹیکنیکل انداز تعبیر اختیار کیا۔ اگرچہ حضرت یوسفؑ کی زبان مصری ہو گی لیکن قرآن نے ان کی جو حالت بتائی ہے ظاہر ہے وہ اصل کے مطابق ہے۔ "جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا"۔ ان الفاظ میں بالکل سادہ حقیقت کا اظہار ہے، نہ الزام ہے اور اس کی طرف اشارہ کہ مال رکھا کس نے۔

اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ "اگر ہم دوسرے کو گرفتار کریں تو ہم ظالم ہوں گے"۔ بس یہ آخری بات تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ سوچنے لگے کہ والد کو کس طرح منہ دکھائیں گے۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۱۱۰ تشریح آیات

۸۰ --- تا --- ۱۰۱

برادران یوسف ؑ اب برادر خورد کے چھڑانے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یوسف ؑ کے دربار سے ذرا ہٹ کر وہ ایک مجلس مشاورت منعقد کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب منظر ہے۔ سیاق کلام میں سب کے اقوال و تجاویز کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ البتہ اس مشاورت کا آخری قول اور فیصلہ کن تجویز یہاں دے دی گئی۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

”جب وہ یوسف ؑ سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا ”تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے چکے ہیں؟ اور اس سے پہلے یوسف ؑ کے معاملہ میں جو تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت نہ دیں‘ یا پھر اللہ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ فرمادے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جا کر اپنے والد سے کہو کہ ابا جان‘ آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے۔ ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں‘ اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجئے جہاں ہم تھے۔ اس قافلے سے دریافت کر لیجئے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں“۔

برادران یوسف ؑ میں سے بڑے بھائی سب سے پہلے ان کو یاد دلاتے ہیں کہ والد نے تم سے پختہ عہد لیا ہے اور یہ کہ

اس سے پہلے تم یوسفؑ کے ساتھ بھی زیادتی کر چکے ہو' اور وہ اس کا اقرار کر لیتے ہیں۔ پھر وہ فیصلہ کن تجویز دیتے ہیں کہ وہ مصر کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک ان کے والد اجازت نہیں دیتے یا اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نہیں فرماتے' اللہ کے فیصلے کے وہ بہر حال پابند ہیں۔

وہ کیا کریں؟ تو ان سے انہوں نے کہا کہ تم جاؤ اور باپ سے صاف صاف کہو کہ آپ کے بیٹے نے چوری کا ارتکاب کیا ہے۔ پکڑا گیا' یہ ہے ان کا علم اور مشاہدہ۔ اگر وہ بری الذمہ اور بے گناہ ہے اور اصل حقیقت کچھ اور ہے تو اس سے وہ بے خبر ہیں۔ ان کو بالکل یہ توقع نہ تھی کہ ان کو ایسا حادثہ پیش آئے گا۔ یہ تو ہے اس معاملے کا ظاہری پہلو' اگر اصل بات کوئی اور ہو تو وہ امر غیبی ہوگی اور ہم اس کو نہیں جانتے۔ نہ جاننے کے مکلف ہیں اور یہ بات ان کی نسبت غیب ہی تھی اور کوئی شخص غیبی واقعات کا دفاع نہیں کر سکتا۔ اور یہ کہ اگر آپ کو ہماری بات پر یقین نہیں آتا تو آپ 'شہر کے دوسرے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں اور پھر مصر سے ہم جس قافلے کے ساتھ آئے ہیں' اس سے بھی پوچھ سکتے ہیں کیونکہ وہ اکیلے تو نہ تھے' آج کل مصر کو قافلے پر قافلہ جا رہا ہے اور وہاں سے لوگ غلہ لے کر آتے ہیں۔ مصر کے گرد تمام علاقے قحط کی لپیٹ میں ہیں' سخت خشک سالی ہے۔

--- ○○○ ---

اب وہ کس حال میں واپس آئے 'سفر کس طرح طے ہوا' یہاں ان تفصیلات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اب غم زدہ باپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ انہوں نے ماجرا سنا دیا۔ غم زدہ باپ کا صرف ایک مختصر جواب سیاق کلام میں نقل کر دیا جاتا ہے۔ نہایت ہی اندوہناک الفاظ میں۔ لیکن ان کے کلام میں اب بھی امید کی ایک کرن باقی ہے۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ خدا دونوں بچے ان کو واپس کر دے گا۔ بلکہ تینوں کو واپس کر دے گا۔ کیونکہ تیسرا بھی مصر میں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ اس بوڑھے باپ کے شکستہ دل میں اب بھی ایک عجیب امید ہے۔ یہ ہے پیغمبرانہ بصیرت!

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

"باپ نے یہ داستان سن کر کہا "دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا۔ اچھا میں اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید کہ اللہ ان سب کو مجھ سے لا ملائے' وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں"۔

تمہارے نفوس نے بہت ہی بڑے گناہ کو سہل بنا دیا ہے۔ تم بھائیوں کے خلاف سازش کرتے ہو۔ میں اس پر صبر ہی کر سکتا ہوں۔ یہ الفاظ حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کی گمشدگی کے وقت بھی کہے تھے۔ لیکن اس بار یہاں وہ ایک امید بھی ظاہر کرتے ہیں کہ شاید اللہ ان سب کو واپس دلا دے۔ بے شک اللہ ہی علیم و حکیم ہے۔ وہ میرے حالات سے بھی واقف ہے اور پسران کے بیانات کی حقیقت بھی جانتا ہے۔ واقعات و امتحانات کی حقیقت بھی وہ جانتا ہے اور جب بھی اللہ

کی حکمت کا تقاضا ہوگا تمام واقعات و حقائق سامنے آجائیں گے۔

امید کی یہ کرن اس بوڑھے کے دل میں کہاں سے آئی۔ یہ خدا تعالیٰ سے امید کی کرن تھی' ذات باری سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اللہ اور اس کی رحمت کے وجود کا پختہ یقین تھا۔ اور یہ یقین اللہ کے برگزیدہ بندوں کے قلوب میں صاف نظر آیا کرتا ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ یقین اس قدر حساس ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں حواس خمسہ کا احساس کم نظر آتا ہے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾

"پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ "ہائے یوسف!" اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا"۔ یہ ایک غم زدہ والد کی نہایت ہی موثر تصویر کشی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس غم کو جھیلنے کے لیے وہ تنہا ہیں' اس میں ان کے اہل و عیال کے دل شریک نہیں ہیں۔ نہ وہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور نہ یک جہتی کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ علیحدگی میں تنہا ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس سے قبل انہیں ایک صدمہ حضرت یوسفؑ کی گمشدگی کی صورت میں پہنچ چکا تھا' وہ اسے بھول نہ سکے۔ اور طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس صدمے میں بھی کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اب تازہ صدمہ یوسفؑ کے چھوٹے بھائی کی گرفتاری کی صورت میں پیش آیا ہے' اور اس کی وجہ سے سابقہ زخم بھی تازہ ہو گئے ہیں۔ اب ان کے صبر جمیل کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے۔

يٰاَسَفٰي عَلٰي يُوْسُفَ (١٢ : ٨٤) "ہائے یوسف!" انسان اپنے غموں کو چھپاتا ہے' برداشت کرتا ہے' اس کے اعضاء ٹوٹ جاتے ہیں اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو جاتی ہیں اور یہ غم انہیں اندر ہی اندر میں گھلا رہا ہے۔

وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (١٢ : ٨٤) "اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں غم کھائے جا رہا تھا"۔

لیکن اس کے دوسرے بیٹوں کے دل حضرت یوسفؑ کے حسد سے اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ انہیں اپنے بوڑھے باپ کے حال پر بھی رحم نہ آ رہا تھا' ان کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ ان کے والد کی یہ بے پناہ محبت بھی ان پر اثر انداز نہ ہو رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ تعزیت کرتے' ان کے دل میں شمع امید روشن کرتے وہ ان کو اور مایوس کرتے اور امید کی آخری کرن کو بھی بجھانے کی سعی کرتے ہیں۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾

"بیٹوں نے کہا" خدارا! آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔

یہ نہایت ہی مکروہ اور بغض و حسد سے زہر آلود بات ہے' خدا کی قسم آپ اپنے آپ کو یوسفؑ کی یاد میں ہلاک کر رہے ہیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آپ پگھل کر رہ گئے ہیں۔ آخر اس غم و اندوہ اور ماتم کا اب کیا فائدہ؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یوسفؑ تو اب گیا وہ تو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

لیکن والد ان کی اس بات کو رد فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس چھوڑ دو مجھے۔ میرا غم اور میرا شکوہ اللہ ہی سے ہے۔ میرا میرے رب کے ساتھ تعلق ہے اور میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۶

"اس نے کہا" میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا' اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں' تم نہیں ہو"۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیغمبر کے دل میں اللہ کی حاکمیت اور اقتدار مطلق کا کس قدر گہرا شعور ہوتا ہے۔ خدا رسیدہ لوگوں کو اللہ کے انعامات کا بھی احساس ہوتا ہے اور اللہ کی جلالت شان کا گہرا شعور بھی۔

حضرت یوسفؑ کے متعلق جو ظاہری صورت حالات تھی وہ نہایت ہی مایوس کن تھی اور ایک طویل عرصہ بھی گزر چکا تھا۔ ان کی تو زندگی کی امید ہی قطع ہو چکی تھی چہ جائیکہ یہ امید ہو کہ وہ اپنے والد کو اپنے پاس آنے کی دعوت دیں گے اور اس مایوس کن صورت حال ہی کے نتیجے میں ان کے بیٹوں نے ان کے اس تازہ تجسس پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ لیکن یہ تمام حالات اس اللہ کے بندے کی اس پختہ امید کو متاثر نہ کر سکے جو وہ اللہ سے رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کا اپنے رب سے گہرا رابطہ تھا اور وہ اپنے رب کے بارے میں وہ کچھ جانتے تھے جو وہ دوسرے لوگ نہ جانتے تھے کیونکہ وہ حقائق ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ خصوصاً اس واقعہ کے بارے میں۔

یہ ہے حقیقی ایمان کی قدر و قیمت اور اللہ کی حقیقی معرفت کی شان۔ جب اللہ کے بندوں کو معرفت حاصل ہوتی ہے تو ان پر تجلیات ہوتی ہیں۔ اور وہ عالم شہود میں ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی قدرت اور اللہ کی تقدیر سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی نگرانی اور اس کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ اپنے صالح بندوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

یہ الفاظ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۸۶) "اور میں اللہ کی طرف سے جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے" ایسے ہیں جن سے یہ حقیقت اس قدر عیاں ہے کہ ہم اس کو کسی طرح اپنے جملے میں ادا نہیں کر سکتے۔ اس بات کو وہی شخص جان سکتا ہے جس کو حضرت یعقوبؑ کی طرح صبر کا ذوق خاص دیا گیا ہو' ایسے ہی لوگ جان سکتے ہیں کہ ان کلمات کا مفہوم کیا ہے؟

اور جن قلوب کے اندر اس قسم کا ذوق پیدا ہو گیا ہو' یعنی معرفت الٰہی کا ذوق' ان پر اگر مشکلات اور شدائد کی بارش ہو جائے تو بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا' سوائے اس کے کہ ان شدائد سے ایسے قلوب کا تعلق باللہ' ذوق معرفت اور مشاہدۂ حق مزید قوی ہو جاتا ہے۔

میں اس کے سوا اور کچھ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا' لیکن میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کا مجھ پر بہت ہی بڑا کرم ہے۔ اس کا میرے ساتھ جو تعلق ہے اسے وہ جانتا ہے یا میں۔ وہ تو علیم و خبیر ہے۔

اب حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف اور اس کے بھائیوں کی تلاش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور لڑکوں کو کہتے ہیں کہ وہ مایوس نہ ہوں اللہ کی رحمت بہت ہی وسیع ہے' اس بات کا امکان ہے کہ وہ سب مل جائیں۔ رحمت الٰہی کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

"میرے بچو' جا کر یوسف" اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

یہ ہے اس دل کی آواز جو اللہ تک پہنچا ہوا ہے!!۔۔۔ "میرے بچو جا کر یوسف" اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو"۔ اپنے پورے حواس کو استعمال کرو' نہایت رقت سے' گہری نظروں سے اور مستقل مزاجی سے تلاش کرو۔ اللہ کے فضل و کرم سے کسی بھی وقت مایوسی کا اظہار نہ کرو۔ یہاں اللہ کے کرم کے لیے (روح) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت پر گہرائی سے دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ مشکلات کے بعد اب آسانیوں کا دور آنے والا ہے کیونکہ جان کن مشکلات کے بعد اب اللہ کی رحمت کی شبنم سے روح کو تراوت ملنے والی ہے۔

وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

(۱۲ : ۸۷) "اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔ رہے وہ مومن جن کے دل اللہ تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں جن کی روح پر معرفت الٰہی کی شبنم گرتی ہے جن کے اوپر رحمت الٰہی کی روح پرور خوشگوار ہوا کے جھونکے چلتے ہیں' وہ کبھی بھی اللہ کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہوتے اگرچہ مشکلات ناقابل برداشت ہو جائیں اور ان کا کلیجہ منہ کو آ جائے۔ مومن ہمیشہ ایمان کی چھاؤں میں ہوتا ہے' وہ تعلق باللہ کی وجہ سے اللہ سے مربوط ہوتا ہے۔ اپنے مولا پر اسے بھروسہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھروسہ انتہائی کرب و الم میں بھی زندہ رہتا ہے۔

--- ○○○ ---

اب تیسری مرتبہ برادران یوسف مصر کے شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ قحط نے ان کا برا حال کر رکھا ہے۔ نقدی ختم ہے' اب وہ ردی قسم کا مال اور روپیہ لے کر آئے ہیں اور اس کے سوا ان کے پاس کچھ بچا بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ اس حال میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کی شخصیت ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے' اب وہ پرانی باتیں کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس

موقعے پر انہوں نے اپنی بدحالی کا جو شکوہ کیا اس سے ان کا حال اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾

"جب یہ لوگ مصر جاکر یوسف ؑ کی پیشی میں داخل ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ "اے سردار بااقتدار، ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، اور ہم کچھ حقیری سی پونجی لے کر آئے ہیں، آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں، اللہ خیرات دینے والوں کو جزا دیتا ہے"۔

یوسف ؑ نے جب دیکھا کہ اس کے بھائی اس قدر خستہ حال ہو گئے ہیں اور ان کے اندر اس قدر انکسار آگیا ہے اور وہ رحم کی اپیلیں کر رہے ہیں تو وہ اپنے مرتبے اور مقام کا مزید مظاہرہ جاری نہ رکھ سکے۔ اب ان کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ اپنی شخصیت کو ان سے چھپا سکیں۔ جو سبق ان کو دینا مقصود تھا وہ دے چکے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کو وہ عظیم سرپرائز دیا جائے جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھے۔ ان کو تصور ہی نہ تھا کہ وہ یوسف ؑ کے دربار میں کھڑے ہیں۔ چنانچہ وہ براہ کرم ان پر اپنی حقیقت ظاہر فرماتے ہیں۔ وہ اشارہ کرتے ہیں کہ دیکھو تم نے ماضی میں وہ کیا کرتوت کیا تھا؟ یہ تو ان کی زندگی کا راز تھے۔ اس کے بارے میں انہوں نے کسی کو بتایا ہی نہ تھا۔ صرف اللہ جانتا تھا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾

("یہ سن کر یوسف ؑ سے نہ رہا گیا) اس نے کہا "تمہیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسف ؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب کہ تم نادان تھے"۔ اب ان کے کانوں میں ایک ایسی آواز پڑی جو انہیں مانوس نظر آئی۔ انہیں حضرت یوسف ؑ کے چہرے کے خدوخال اب ایسے نظر آئے کہ وہ دیکھا ہوا چہرہ ہے۔ اس سے قبل وہ اپنے آپ کو بظاہر عزیز مصر کے سامنے پاتے تھے اور یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ یہ شخص یوسف ؑ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ شاہی دربار کے رعب کے نیچے تھے لیکن اب دور ہی سے انہیں نظر آگیا کہ یہ تو بھائی کا چہرہ ہے۔

قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾

"وہ چونک کر بولے "ہائیں! کیا تم یوسف ؑ ہو؟" اس نے کہا "ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں

جاتا"۔ اب ان کو یقین ہو گیا اور کہا کہ تم ہی یوسفؑ ہو۔ اگرچہ یوسفؑ اب ایک معمر آدمی ہیں۔ اس کے بچپن کے خدوخال صاف صاف نظر آنے لگے۔

حضرت یوسفؑ نے اچانک اپنے آپ کو ظاہر کیا اور اجمالاً وہ ان کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے جہالت میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بس وہ صرف یہی بات کہتے ہیں اور اللہ کے ان احسانات کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان پر اور ان کے بھائی پر ہوئے۔ اور یہ احسانات اس لیے ہوئے کہ ہم نے تقویٰ اور صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور یہ سب کچھ اللہ کے نظام عدل کا نتیجہ ہے۔ وہ متقین و صابرین کو جزائے خیر دیتا ہے۔

لیکن اس اچانک انکشاف کا اثر ان بھائیوں پر کیا ہوا؟ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ پوری گھناؤنی صورت حال مجسم ہو گئی جو وہ یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ یہ بے حد شرمندہ ہیں۔ جس کے ساتھ انہوں نے برا کیا وہ بطور محسن کھڑا ہے' جس کے ساتھ انہوں نے سنگدلی کی وہ نہایت ہی حلیم ہے اور جس کے ساتھ انہوں نے ظلم کیا وہ کریم اور محسن ہے۔ اب اس کے سوا وہ کہہ کیا سکتے تھے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

"انہوں نے کہا" بخدا کہ تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطاکار تھے"۔

انہوں نے اپنی غلطی کا صاف صاف اقرار کر لیا۔ گناہ کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے جان لیا کہ اللہ نے ان پر اسے ترجیح دے دی ہے کیونکہ وہ حلیم الطبع' متقی اور محسن تھے۔ اور ان کے اس صاف صاف اعتراف کے جواب میں حضرت یوسفؑ ان کو تہ دل سے معاف فرماتے ہیں۔ اس طرح ان کی شرمندگی میں کمی آتی ہے اور اہل کرم کا شیوہ ہی عفو و درگزر ہوتا ہے۔ یوسفؑ جس طرح مشکلات میں کامیاب ہوئے تھے' اسی طرح اقتدار کی آزمائش میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ محسنین میں سے ایک تھے۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

"اس نے جواب دیا" آج تم پر کوئی گرفت نہیں' اللہ تمہیں معاف کرے' وہ ارحم الراحمین ہے"۔

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں' کوئی انتقام نہیں اور تمہیں شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمام کدورتوں کو دل سے نکال دیا ہے۔ اللہ بھی تمہیں معاف کر دے۔ بے شک وہ ارحم الراحمین ہے۔ اب روئے سخن ایک دوسرے اہم معاملے کی طرف پھر جاتا ہے۔ اب اس باپ کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے جن کی آنکھیں یوسفؑ کے انتظار میں سفید ہو گئی ہیں۔ سب سے پہلے انہیں خوشخبری دینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ان سے ملنا فرض ہے۔ ان کے دل کی کدورتوں کو دور کرنا ضروری ہے اور وہ جس جسمانی اور روحانی اذیت میں ہیں' اس سے ان کو جلد از جلد نکالنا ضروری ہے اور سب سے پہلے ان کی بینائی!

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾

۱۰ ۱۴ع ۴

"جاؤ' میری یہ قمیض لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو' ان کی بینائی پلٹ آئے گی اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ"۔

سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان کی قمیض کی بو سے ان کے والد کی گئی ہوئی بینائی لوٹ آئے گی؟ یہ ہے وہ علم جو انہیں اللہ نے دیا تھا۔اور اچانک خوشی اور اچانک غم میں بعض اوقات ایسے معجزات صادر ہو جاتے ہیں جبکہ حضرت یوسف ؑ نبی' رسول ہیں اور حضرت یعقوب ؑ بھی نبی اور رسول ہیں۔

---ooo---

اب دوسری جانب کنعان کے منظر میں بھی غیر متوقع انکشافات ہو رہے ہیں اور کنعان کے مناظر اب یوسف ؑ کے اس خواب کی آخری تعبیر پر ختم ہوتے ہیں جو انہوں نے بچپن میں دیکھا تھا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

"جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں' تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں"۔گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"۔

یوسف ؑ کی خوشبو! یہ کیا کہہ رہے ہیں' کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ اس قدر طویل عرصہ کے بعد بھی یوسف ؑ زندہ ہو گا اور یہ بوڑھا اس کی بو سونگھ رہا ہو گا!--- یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے میں یوسف ؑ کی خوشبو پا رہا ہوں' اگر تم میرا مذاق نہ اڑاؤ' در حقیقت میں یہ خوشبو پا رہا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ ادھر مصر سے قافلہ چلا' ادھر کنعان میں حضرت یوسف ؑ کی بو پا رہے ہیں۔یہ کیونکر ہو گیا' کیا یہ قافلہ مصر سے چلا تو ان کو بو آنے لگی۔بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قافلہ مصر سے چلا اور انہوں نے بو کو سونگھ لیا۔اس قدر دور سے۔لیکن آیت میں مصر کی تصریح نہیں ہے' ہو سکتا ہے کہ قافلہ کنعان کے قریب کسی دوراہے سے جب جدا ہوا تو حضرت یعقوب ؑ کے مقام رہائش کے قریب انہیں یہ خوشبو آ گئی ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مصر کی دوری سے بطور معجزہ اس بو کو محسوس کرنے کو مستبعد سمجھتے ہیں۔یہ ممکن ہے کہ یہ معجزہ ہوا ہو۔کیونکہ حضرت یوسف ؑ اور حضرت یعقوب ؑ دونوں نبی ہیں۔ہمارا مقصد اور طریقہ یہ ہے کہ آیت قرآن

جس قدر مفہوم دیتی ہیں ہم اسی پر توقف کریں۔ خصوصاً جبکہ آیت پر اضافی مفہوم کے لیے سند صحیح کے ساتھ کوئی روایت بھی مروی نہ ہو۔ یہاں بھی اس بات پر صحیح سند سے مروی کوئی روایت نہیں ہے کہ یہ خوشبو مصر سے آئی۔ محض قیاس اور دلالۃ النص سے ایسے مفہوم کو اخذ نہیں کرنا چاہیے۔

لیکن حضرت یعقوب ؑ کے ارد گرد جو لوگ بیٹھے تھے ان کے اندر وہ احساس نہ تھا جو رب نے ان کو عطا کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت یوسف ؑ کی خوشبو کو نہ پایا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۱۲: ۹۵) "انہوں نے کہا خدا کی قسم بے شک آپ اپنی پرانی غلط فہمی میں پڑے ہیں"۔ آپ اپنی پرانی غلط فہمی میں مبتلا ہیں ' اب بھی یوسف ؑ کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ وہ ان راستوں پر چل نکلا ہے جن سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس پوری کہانی میں جگہ جگہ معجزات اور مناجات ہیں۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ

"پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کا قمیض یعقوب ؑ کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی"۔ اچانک ان کے چہرے پر قمیض ڈال دی جاتی ہے ' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے ساتھ ملاقات اب بہت ہی قریب ہے۔ اچانک معجزانہ طور پر بینائی لوٹ آتی ہے۔ یہاں حضرت یعقوب ؑ اپنے حاشیہ نشینوں کو بتاتے ہیں کہ یہ ہے وہ چیز جس کا علم ان کو تھا۔ اور رب کی طرف سے تھا اور اسی علم کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِــِٕيْنَ ﴿۹۷﴾

"تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔ سب بول اٹھے ابا جان ' آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کریں ' واقعی ہم خطا کار تھے"۔

یہاں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ حضرت یعقوب اپنے بیٹوں سے ناراض تھے لیکن انہوں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ یہ وعدہ فرماتے ہیں کہ میں تمہارے لیے اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کروں گا۔ ذرا رستا بیتے دو ' ذرا دل کی کدورتوں کو صاف ہونے دو اور ذرا سکون کا سانس لے لینے دو۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

اس نے کہا "میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ لفظ سوف کے ساتھ وعدہ دعا سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے زخمی دل سے کدورت نکلتے نکلتے وقت لگتا

ہے۔ دلوں کی کدورت جلدی صاف نہیں ہوتی۔

---○○○---

اب یہاں اس قصے کا خاتمہ بھی اس قصے کے دوسرے اچانک مناظر اور معجزانہ واقعات کی طرح اچانک ہو جاتا ہے۔ زمان و مکان کے فاصلوں کو لپیٹ لیا جاتا ہے اور آخری تبصرہ یوں آتا ہے اور اس میں بے شمار موثر اور جذباتی مناظر ہیں۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

"پھر جب یہ لوگ یوسف ؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور اپنے سب کنبے والوں سے کہا "چلو' اب شہر میں چلو' اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے"۔ (شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے۔ یوسف ؑ نے کہا "ابا جان' یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے لاکر مجھ سے ملایا' حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے' بے شک وہ علیم اور حکیم ہے"۔

یہ کیا ہی خوب صورت منظر ہے! ایک عرصہ گزر گیا ہے اور یوسف ؑ لاپتہ ہیں۔ ان کے بارے میں مکمل مایوسی پائی جاتی ہے اور لوگ انہیں پوری طرح بھول چکے ہیں۔ رشتہ دار اس کے رنج سہ چکے ہیں' یوسف ؑ پر بھی اور پسماندگان پر بھی عرصہ بیت چکا ہے۔ حضرت یعقوب ؑ کا رنج والم' ناقابل کنٹرول پدری محبت کا جوش اور جان کن رنج اور حزن کا طویل عرصہ اور پھر اچانک حالات کا یہ پلٹا یہ ایک ایسا اچانک منظر ہے کہ جس میں دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں' خوشی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور ہر طرف گہرے تاثرات ہیں' خوشی کے بھی اور شرمندگی کے بھی۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس قصے کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے' آغاز میں عالم غیب کی طرف غائبانہ اشارات تھے لیکن وہ سب اشارات اب عالم واقعہ ہیں اور ایسے حالات میں بھی حضرت یوسف ؑ کی زبان پر ثنائے ربانی ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۱۲:۹۹)

"پھر جب یہ لوگ یوسف ؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھا لیا اور اپنے سب کنبے والوں سے کہا "چلو' اب شہر میں چلو' اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے"۔

حضرت یوسف ؑ اب اپنا خواب یاد کرتے ہیں اور اس کی تاویل ان کے سامنے ہے کہ ان کے بھائی ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ در آنحالیکہ اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا ہوا ہے۔ اب گیارہ ستارے اور الشمس و قمران کے سامنے ہیں اور سجدہ ریز ہیں۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا (۱۲ : ۱۰۰) "اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے۔ یوسف ؑ نے کہا "ابا جان' یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا"۔

اور رب کے احسانات کی تو حد نہیں ہے۔

وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَ جَآءَ بِکُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ (۱۲ : ۱۰۰) "اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا' حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا"۔

اور پھر حضرت یوسف ؑ اللہ کی خفیہ تدابیر کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ للہ تعالیٰ کی حد ہی نہیں ہے۔

اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ (۱۲ : ۱۰۰) "حقیقت یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے"۔ وہ نہایت ہی خفیہ طریقوں سے اپنی مشیت کے مقاصد پورے کرتا ہے۔ اس قدر خفیہ طریقے سے کہ لوگ اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ (۱۲ : ۱۰۰) "بے شک وہ علیم و حکیم ہے"۔ اور یہ وہی انداز ہے جو خود حضرت یعقوب ؑ نے اختیار کیا۔ جب حضرت یوسف ؑ ان کے ساتھ اپنا خواب بیان کر رہے تھے۔ اِنَّ رَبَّکَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ "بے شک تمہارا رب علیم و حکیم ہے"۔ اس طرح آغاز قصہ اور اختتام قصہ ایک ہی تبصرے کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور اختتام پذیر ہوتا ہے۔

آخری منظر کے اختتام سے قبل 'ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف ؑ اس ملاقات ' خوشی اور مسرت کے منظر اور پھر تخت و تاج اور جاہ و منزلت اور امن و سکون اور عیش و آرام کی تقریب سے اچانک نکل آتے ہیں۔ آخر وہ پیغمبر خدا ہیں اور رب ذوالجلال کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایک شکر گزار بندے کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اور دست بدعا ہوتے ہیں کہ جاہ و منزلت کے اس اونچے مقام پر اللہ ان کو ایک صحیح مسلمان ہونے کی توفیق بخشیں اور صالحین میں ان کو اٹھالیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

"اے میرے رب' تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے' تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے' میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔ اے رب تو نے مجھے بادشاہت بخشی' اونچا مقام و مرتبہ دیا۔ مال و دولت سے نوازا اور تمام دنیاوی نعمتیں عطا کر دیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ (۱۲:۱۰۱) "اے رب تو نے مجھے حکومت بخشی"۔ اور پھر تو نے مجھے معاملہ فہمی عطا فرمائی۔

وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲:۱۰۱) "اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا"۔ مثلاً معاملات سے برآمد ہونے والا انجام پہلے ہی میرے علم میں آجاتا ہے۔ خوابوں کی تعبیر کا علم مجھے سکھایا گیا اور یہ اے اللہ تمہارا بہت ہی بڑا انعام ہے۔ اے اللہ تو خالق ہے اور تیرے انعامات کا ذکر اور گننا ایک بندے کا فرض ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۲:۱۰۱) "زمین و آسمان بنانے والے"۔ تو نے اس کائنات کو کن فیکون سے تخلیق کیا اور اس کا پورا کنٹرول تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی اس کائنات پر اور اس کے اندر بسنے والوں پر قدرت رکھتا ہے"۔

اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۱۲:۱۰۱) "تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے"۔ تو ہی مددگار اور نصرت کرنے والا ہے۔ اے اللہ یہ ہیں تیرے انعامات اور یہ ہیں تیری قدرتیں۔

اے میرے رب میں تجھ سے حکومت طلب نہیں کرتا' میں تجھ سے صحت طلب نہیں کرتا' اور میں تجھ سے مال طلب نہیں کرتا۔ رب ذوالجلال' میں وہ چیز طلب کرتا ہوں جو دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۲:۱۰۱) "میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔ یوں حکومت اور جاہ و مرتبت غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ملاقات کی خوشیاں اور اہل و عیال اور بھائیوں کا اجتماع نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اب منظر پر ایک بندۂ خدا سامنے آتا ہے۔ یہ نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا ہیں کہ اے رب' میرے اسلام کو محفوظ کیجیے۔ یہاں تک کہ میں تیرے سامنے مسلم ہو کر آؤں اور یہ کہ مجھے اہل صلاح و تقویٰ کی سوسائٹی میں جگہ دیجیے۔۔۔ یہ آخری امتحان ہے اور یہ ہے مکمل کامیابی!

---ooo---

درس نمبر ۱۱۱ تشریح آیات

۱۰۲ --- تا --- ۱۱۱

یہاں آکر حضرت یوسف علیہ السلام کا اصل قصہ ختم ہو جاتا ہے اور اب اس پر سبق آموز تبصرے کیے جاتے ہیں۔ اس سورہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ان اغراض و مقاصد کی طرف اشارہ کیا تھا جس کے لیے یہ قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا۔ یہاں اب عبرت کے لیے کئی باتوں کی طرف قارئین کو متوجہ کیا جاتا ہے اور ان کے احساسات کو جگایا جاتا ہے۔ اس کائنات کی وسعتوں اور نفس انسانی کی گہرائیوں میں فکر انسانی کو دوڑایا جاتا ہے۔ گزشتہ لوگوں کے حالات، موجودہ حالات اور پردۂ غیب کے پیچھے مستور حقائق بتائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس آخری تبصرے کے اندر بیان کردہ حقائق کو ہم اسی ترتیب سے لیتے ہیں کیونکہ یہ قرآنی ترتیب بھی حکمت پر مبنی ہے۔

--- ooo ---

یہ قصہ عربوں میں مشہور نہ تھا، وہ عرب معاشرہ جس میں حضور ﷺ نے پرورش پائی ان واقعات سے بے خبر تھا۔ انہی لوگوں میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی۔ چونکہ اس قصے کے کرداروں کے حالات میں بہت اسرار و رموز تھے، اگرچہ وہ صدیوں پرانے کردار تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ کے آغاز ہی میں اسے احسن القصص کہا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۱۲ : ۳) "ہم آپ کے سامنے احسن القصص بیان کرتے ہیں، یوں کہ ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن وحی کیا اگرچہ اس سے قبل آپ غافلوں میں سے تھے"۔ اور اب اس قصے کے اختتام پر تعقیب یوں آرہی ہے، اور یوں اس کے اختتام میں بھی اس کے آغاز کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝۱۰۲

"اے نبی ﷺ، یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف ؑ کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی"۔ یہ قصہ جو گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا، ان غیبی خبروں

میں سے ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ تم بھی نہ جانتے تھے اور ہم نے یہ تمہاری طرف وحی کیے اور یہ ایک زندہ معجزہ ہے' اے پیغمبر جب وہ یہ سازش تیار کر رہے تھے تو آپ ان کے پاس موجود نہ تھے' خصوصاً جب انہوں نے اپنا ریکشن پلان تیار کر لیا اور جس کی تفصیلات اس پورے قصے میں دی گئیں۔ انہوں نے یوسف ؑ کے خلاف بھی سازش کی' اپنے باپ کے خلاف بھی سازش کی۔ پھر جب یوسف ؑ نے اپنے بھائی کو پکڑ لیا تو یہ لوگ علیحدہ ہو کر مشورہ کرنے لگے جو ان کی جانب سے ایک مکر یعنی تدبیر تھا۔ نیز اس میں عورتوں کی جانب سے یوسف ؑ کے خلاف بھی مکاریاں تھیں۔ پھر اس میں عزیز مصر کی پارلیمنٹ کی مکاری بھی تھی کہ انہوں نے ناحق حضرت یوسف ؑ کو جیل بھجوا دیا۔ یہ سب کچھ مکر تھا اور اے پیغمبر آپ کو ان میں سے کسی مکاری کا علم نہ تھا۔ نہ آپ اس وقت موجود تھے کہ آپ نے اس قدر دقت کے ساتھ قلمبند کر دیا بلکہ یہ وحی ہے اور اس سے اس نئے نظریہ حیات اور نئے دین کے بنیادی عقائد کو ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور اس قصے کے مختلف مشاہد اور مناظر ہیں۔ اس جدید نظریہ حیات کے مسائل اور افکار اس میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

---ooo---

یہ قصہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ کلام وحی الٰہی ہے' اس کے اشارات' تاثرات اور ہدایات دلوں کو متحرک کرتی ہیں' اور ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ پھر اس کلام پر ایمان لائیں۔ خصوصاً جبکہ یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی احوال سے بھی باخبر ہیں۔ وہ آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور آپ ان کے سامنے ایسی ایسی نصیحت آموز غیبی دلچسپ خبریں دیتے ہیں' لیکن اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت مان کر نہیں دیتی۔ لوگوں کی اکثریت اس کائنات میں بکھری ہوئی آیات و معجزات کو رات دن دیکھتے ہیں لیکن انہیں ہوش نہیں آتا۔ یہ لوگ ان آیات و دلائل کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ مثلاً ایک اندھے کی طرح کہ وہ ایک جانب سے دوسری جانب منہ موڑتا ہے اور اسے کچھ خبر نہیں لگتی۔ سوال یہ ہے کہ اس معجزانہ قصہ کے بعد اب یہ لوگ کس بات کا انتظار کرتے ہیں۔ کیا وہ اللہ کے ایسے عذاب کا انتظار کر رہے ہیں کہ جو ان کو اچانک پکڑ لے اور ان کو کوئی شعور نہ ہو؟

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

۱۱ ۱۱ع ۵

"مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو' ان میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔ حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے ہو۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔ زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں

جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے ۔ ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں ۔ کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی بلا انہیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی ؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بڑی شدت کے ساتھ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی قوم ایمان لے آئے ۔ آپ چاہتے تھے کہ آپ جو بھلائی لے کر آئے ہیں وہ ان تک پہنچ جائے اور وہ محروم بھی نہ رہیں ' نیز آپ کو اپنی برادری پر ترس آ رہا تھا کہ اگر وہ شرک کی حالت پر ہی رہے تو دنیا میں بھی ان کو روز بد دیکھنا ہو گا اور آخرت میں وہ دائمی عذاب میں مبتلا رہیں گے لیکن اللہ تعالیٰ تو انسانی دلوں کے بہت ہی قریب ہے ' وہ علیم و خبیر ہے ۔ وہ انسانوں کے مزاج اور ان کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے ۔ اس لیے حضور اکرم ؐ کو بتلایا جاتا ہے کہ آپ کی یہ حرص اور یہ شدید خواہش ان کو اسلام کی طرف راغب نہ کر سکے گی ' اور ان میں سے اکثر مشرک ہی رہیں گے اس لیے کہ یہ لوگ آیات الٰہی کو دیکھ کر یونہی گزر جاتے ہیں ' منہ پھیر لیتے ہیں اور ان کا یہ اعراض ہی ان کے راستے کا روڑا ہے ۔ ان کو ایمان سے روک رہا ہے ۔ اس کائنات میں جگہ جگہ جو دلائل بکھرے ہوئے ہیں ' یہ ان سے استفادہ نہیں کرتے ۔

آپ تو فقط تبلیغ پر مامور ہیں ' اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ کا کچھ نقصان نہیں ہے ۔ آپ اس کام کے لیے کسی سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے ۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اعراض کرتے ہیں اور ہدایات سے منہ پھیرتے ہیں حالانکہ یہ ہدایت انہیں مفت فراہم کی جا رہی ہے ۔

وَ مَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۲ : ۱۰۴) "یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے"۔ آپ اُن کو آیات الٰہیہ کی یاد دہانی کرا رہے ہیں ' ان کی بصارت اور بصیرت دونوں کو راہ ہدایت کی طرف موڑنا چاہتے ہیں اور یہ رہنمائی تمام جہان والوں کے لیے عام ہے ' یہ کسی ایک قوم ' کسی مخصوص نسل اور کسی خاص قبیلے کے لیے محدود نہیں ہے ۔ اس کی کوئی بھی قیمت مقرر نہیں ہے کہ کوئی ادا کرنے سے قاصر ہو ' صرف اغنیاء ہی اسے خرید سکتے ہیں ۔ فقراء کے بس کی بات نہ ہو ۔ نیز اس کے حصول کے لیے کوئی جسمانی توانائی کی شرط بھی نہیں ہے کہ طاقتور لوگ اسے حاصل کر سکتے ہیں اور ناتواں اس کے حصول سے عاجز ہوں ۔ یہ تو تمام جہاں والوں کے لیے کھلی نصیحت ہے ۔ یہ ایک ایسا کھلا دسترخوان ہے جس پر تمام لوگ مدعو ہیں جو چاہے اسے قبول کر لے ۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ

(۱۲ : ۱۰۵) "زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے"۔ وہ نشانیاں جو ذات باری پر گواہی دے رہی ہیں ' جو اللہ کی وحدانیت اور قدرت پر دلالت کرتی ہیں وہ اس کائنات میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں اور لوگوں کی بصارت اور بصیرت کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں ۔ یہ آسمانوں میں بھی ہیں اور زمین میں بھی ہیں اور یہ لوگ صبح و شام ان کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں ۔ رات کے وقت بھی یہ ان کے سامنے ہوتی ہیں اور صبح کے وقت بھی ۔ یہ لوگوں کو پکار پکار کر دعوت دے رہی ہیں اور یہ اس قدر کھلی ہیں کہ لوگوں کی نظروں اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے ۔ یہ انسان کے قلب و نظر کو دعوت فکر دے رہی ہیں ' لیکن لوگ نہ ان کو دیکھتے

ہیں' نہ ان کی پکار کی طرف کان دھرتے ہیں اور نہ ان کے جھنجھوڑنے سے ان کا احساس جاگتا ہے۔

ذرا ایک لمحے کے لیے سورج کے طلوع اور غروب پر ہی غور کر لو' ذرا درختوں کے سائے پر ہی غور کر لو کہ کس طرح غیر محسوس انداز میں گھٹتا بڑھتا ہے۔ ذرا ناپید کنار سمندر کو دیکھو' ذرا زمین میں سے ابلتے ہوئے چشموں کو دیکھو' ذرا بہتی ہوئی ندیوں کا نظارہ کرو' ذرا فضائے آسمانی میں اڑنے والے پرندوں کو دیکھو' اور پھر ذرا پانی کے اندر تیرتی ہوئی رنگ برنگ مچھلیوں کو دیکھو' ذرا سطح زمین پر رینگنے والے کیڑوں کو دیکھو' چونٹیوں اور دوسرے حشرات و حیوانات کے اس لشکر عظیم کو دیکھو اور وہ حیوانات و جراثیم جو نظر ہی نہیں آتے' اور گردش لیل و نہار کو دیکھو' رات کے سکون اور دن کی خوشیوں کو دیکھو۔ ایک لمحے کا غور و فکر انسان پر اس کائنات کے عجائبات کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ یہ مختصر اور متفکرانہ لحظہ ہی انسانی ادراک کی دنیا میں ایک وسیع ارتعاش پیدا کر سکتا ہے اور انسانی فطرت کائنات کی پکار پر لبیک کہہ سکتا ہے لیکن

يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۲:۱۰۵) "یہ لوگ ان پر گزرتے ہیں لیکن توجہ نہیں کرتے"۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ پھر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ان کی فکر و نظر میں بھی کسی نہ کسی راہ سے شرک داخل ہو گیا ہے۔ لہٰذا ایمان خالص کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لحہ بیدار اور چوکنا رہے اور دل سے ہر قسم کے شیطانی وسوسوں کو نکال باہر کرے۔ دل کو ہر قسم کی دنیاوی آلائشوں سے پاک کر دے۔ اپنی ہر سوچ' ہر عمل اور ہر قسم کے تصرفات و اقدامات میں رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھے۔ ہر عمل اور ہر اقدام اللہ کرے' ایمان خالص وہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہو' وہ انسان کے قول و فعل اور طرز عمل پر پوری طرح حکمران ہو' اور وہ انسان پر اس طرح اثر انداز ہو کہ انسان کی زندگی پر اللہ کے سوا کسی اور کی حکمرانی باقی نہ رہے۔ انسان اپنے کسی معاملے میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرے۔ اور وہ اس حاکم کا بندہ ہو جس کے حکم کو کوئی بھی رد کرنے والا نہیں ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲:۱۰۶) "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں"۔ یہ لوگ کیسے مشرک ہیں؟ یہ اس کرۂ ارض پر واقعات' اشیاء اور اشخاص کی قدر و قیمت کے تعین میں شرک کرتے ہیں۔ انسان کے نفع پہنچنے میں اور انسان کو مضرت سے بچانے کے سلسلے میں محض اللہ کی قدرت اور فیصلے کے سوا اور اسباب بھی تلاش کرتے ہیں۔ یہ اللہ اور اللہ کے قانون کے سوا کچھ اور شخصیات اور اداروں کو منبع ہدایت اور ذریعہ قانون اور شریعت قرار دیتے ہیں۔ یہ اللہ کے سوا اوروں سے امید یں باندھتے ہیں' یہ ایسی قربانیاں اور خیراتیں کرتے ہیں جن کی تہہ میں رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ اور شخصیت کی رضا بھی موجود ملحوظ ہوتی ہے۔ یہ اللہ کے سوا اوروں سے نفع حاصل کرنے یا نقصان کے رکوانے کے عمل بے سود میں جدوجہد کرتے ہیں یا اللہ کی بندگی میں محض اللہ کی رضا کے سوا اوروں کی رضا کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہی شرک خفی ہے اور اسی وجہ سے حضور اکرم نے فرمایا تمہارے اندر شرک اس قدر غیر محسوس طور پر داخل ہو جاتا ہے جس طرح چیونٹی کے چلنے کی آواز مخفی ہوتی ہے۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس سلسلے میں چند نمونے بیان فرمائے ہیں جن سے شرک خفی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ امام ترمذی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے "جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا"۔ امام ابوداؤد اور امام احمد وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے "حضورؐ نے فرمایا کہ دم اور تعویذ شرک ہے"۔ مسند امام احمد میں عقبہ ابن عامر کی حدیث نقل ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "جس نے تعویذ

نکالا اس نے شرک کا ارتکاب کیا"۔

حضرت ابوہریرہ نے اسی کی سند کے ساتھ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شریکوں کی شرکت کا محتاج نہیں ہوں جس نے بھی کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی غیر کو شریک کیا تو میں اسے اس غیر کے حوالے کر دیتا ہوں"۔

امام احمد نے ابوسعید ابن فضالہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا میں نے حضور اکرم کو کہتے سنا "جب اللہ اولین اور آخرین کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے تو ایک پکارنے والا پکارے گا "جس شخص نے ایسے کام میں اللہ کا کوئی شریک ٹھہرایا جو اللہ کا مخصوص تھا' تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے عمل کا اجر اس شریک سے طلب کرے کیونکہ اللہ شریکوں کی شراکت کا محتاج نہیں ہے"۔

امام احمد نے اپنی سند سے محمود ابن لبید سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا "میں تمہیں اس چھوٹے شرک سے ڈراتا ہوں جس کے بارے مجھے تشویش ہے"۔ صحابہ نے کہا "رسول خدا' وہ چھوٹی شرک کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا "وہ خواہشیں ہیں"۔ جب قیامت میں لوگ اپنے اپنے اعمال لے کر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ' جاؤ ان لوگوں کے پاس جن کو تم دنیا میں کچھ سمجھتے تھے اور دیکھو ان کے پاس ہے کچھ تمہیں جزاء کے طور پر دینے کے لیے۔"

غرض ایمان کے باوجود یہ شرک خفی کی اقسام ہیں۔ ایک مومن کو چاہئے کہ وہ ان کے بارے میں چوکنا رہے اور ان سے بچنے کی سعی کرے تاکہ اس کا ایمان خالص ہو جائے۔

شرک خفی کے علاوہ بعض واضح اعمال شرکیہ ہیں اور ان میں سے ایک یہ طرز عمل ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی اور کے دین اور نظام کی پیروی کرے ' زندگی کے معاملات میں سے کسی بھی معاملے میں۔ مثلاً وہ ایسے قانون کے مطابق فیصلے کرائے یا کرے جو شریعت کے خلاف ہو' یہ فعل ایک صریح اور منصوص اور واضح شرک ہے جس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے مثلاً ایسے عرس اور میلے مقرر کرنا جو اللہ نے مقرر کیے ہوئے نہ ہوں یا دوسرے ایسے رسم و رواج جن کا کوئی ثبوت شریعت سے نہ ہو۔ یا ایسے لباس جن میں ستر عورت اور دوسرے احکامات کے سلسلے میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ یہ سب کے سب صریح شرکیہ افعال ہیں۔

ایسے معاملات جن کا تعلق ایسے رسوم اور ایسی تقریبات سے ہو جو خلاف اسلام ہوں اور جن کو اللہ کے سوا کسی اور نے رواج دیا ہو اور جن پر عمل پیرا ہونا لوگ ضروری سمجھتے ہوں' اس طرح جس طرح فرمودۂ خدا و رسول ہو تو ایسے افعال و رسوم محض گناہ ہی نہیں رہتے بلکہ یہ شرک کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی پیروی سے انسان غیراللہ کے دین اور نظام کا اتباع کرتا ہے جو خلاف نظام اسلامی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر نہایت ہی اہم ' خطرناک اور شرک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲ : ۱۰۶) "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں"۔ لہٰذا اس آیت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو جزیرۃ العرب میں ایمان لانے کے بعد بھی شرک کرتے تھے اور آپ کے بعد آنے والے لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو ایمان تو لاتے ہیں مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح شرک کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے کہ ہدایت سے اعراض کرنے والے یہ لوگ اس سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں اور آیات قرآنیہ کے بعد آیات کونیہ سے بھی وہ منہ موڑ رہے ہیں۔ آخر وہ کیا سہارا ہے؟ کیا یہ خدا کا خوف نہیں کرتے۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ

"کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی بلا انہیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی" (١٢ : ١٠٧) - یہ ان کے شعور کے تاروں پر ایک قوی ضرب ہے' تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگیں اور اس غفلت کے انجام بد سے ڈریں' کیونکہ عذاب الہٰی کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے' وہ تو کسی بھی وقت نازل ہو سکتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت ان کو دبوچ سکتا ہے اور یہ عذاب عمومی بھی ہو سکتا ہے اور یہ عذاب اس خوفناک دن کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے جو اچانک نمودار ہو جائے گا اور کسی کو اس کا شعور تک نہ ہو گا۔ عالم غیب کے دروازے تو بند ہیں' پردۂ غیب کے پیچھے کیا ہے' کسی کان کو خبر نہیں' کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے' لہٰذا ایک ذی ہوش شخص کس طرح غافل رہ سکتا ہے؟

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے دلائل سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ جب اس کائنات کا ذرہ ذرہ شاہد ہے کہ اس کا ایک واحد خالق و مالک ہے اور یہ لوگ اس کائنات کو بھی دیکھ رہے ہیں اور قرآن کو بھی سمجھتے ہیں کہ وہ عرب ہیں' اور پھر بھی یہ اللہ کے ساتھ پوشیدہ یا ظاہری شرک کرتے ہیں اور لوگوں کی اکثریت اس مرض اور غفلت کا شکار ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی راہ پر گامزن رہیں اور آپ کے پیروکار بھی اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے رہیں' وہ کسی کے عمل اور کسی کی بات سے متاثر نہ ہوں اور انحراف کرنے والوں کی طرف نہ دیکھیں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿١٠٨﴾

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ "میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی' اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْ "یہ ہے میرا راستہ"۔ یہ ایک راستہ ہے' یہ سیدھا راستہ ہے' اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' اور اس کے احکام و قوانین میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ "میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی"۔ یعنی ہمیں اللہ کی راہنمائی حاصل ہے اور ہمیں اس کی طرف سے روشنی دی گئی ہے۔ ہمیں اپنا راستہ اچھی طرح معلوم ہے اور ہم بصیرت و بصارت کے ساتھ اس پر چل رہے ہیں۔ ہمیں بھٹکنے کا

کوئی خطرہ نہیں ہے۔اور نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ہمیں یقین ہے کہ یہی راستہ ہے اسے ہم روشنی میں دیکھ بھی رہے ہیں۔ہم اللہ کو ان چیزوں سے پاک سمجھتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہیں اور ہم ان سے جدا اور ممتاز اور قطع تعلق کرنے والے ہیں جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ "اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔نہ ظاہری شرک کرنے والوں میں سے اور نہ باطنی شرک کرنے والوں میں سے۔یہ ہے ہمارا راستہ پس جو چاہے اسے قبول کر لے اور جو چاہے اس سے انکار کر دے۔میں تو بہرحال اسی راہ پر چلوں گا کیونکہ یہی سیدھی راہ ہے۔

یہاں داعیان حق کو ایک بات نوٹ کرلینا چاہئے یہ کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ انہوں نے دو ٹوک بات کرنی ہے' ان کو اعلان کرنا ہے کہ وہ ایک علیحدہ امت ہیں۔وہ ان لوگوں سے بالکل جدا ہیں جو ان کے نظریات کو من و عن تسلیم نہیں کرتے۔جو ان کے مسلک اور طریق کار کے مطابق چلتے نہیں' یا جو ان کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتے' انہیں جاہلی معاشرے سے چھٹ کر علیحدہ ہو جانا چاہئے' پوری طرح علیحدہ۔داعیان حق کا صرف یہی فریضہ نہیں ہے کہ بس وہ دعوت دین کا حق ادا کر دیں اور پھر اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جاہلی معاشرے میں گھل مل جائیں۔اس قسم کی دعوت کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ان کو صاف صاف اعلان کرنا ہو گا۔کہ وہ جاہلیت سے ممتاز کچھ علیحدہ لوگ ہیں۔ان کو ایک نظریہ کی بنیاد پر علیحدہ اجتماعیت اور تنظیم کی بنیاد رکھنی ہو گی اور ایک اسلامی قیادت کے نام اور عنوان سے منظم ہونا ہو گا۔اور اس جاہلی معاشرے سے پوری طرح علیحدہ ہونا ہو گا۔ان کی قیادت کو بھی ایک جاہلی قیادت سے ممتاز ہونا ہو گا۔

کسی جاہلی معاشرے میں گھل مل جانا اور جاہلی قیادت کے تحت زندگی بسر کرنا' اسلامی نظریہ حیات کی قوت اور جوش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔اور ان کی دعوت کے تمام اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔اور دعوت اسلامی کے اندر وہ جاذبیت نہیں رہتی جو اس صورت میں ہوتی ہے جب اسلامی نظام قائم ہو۔

یہ حقیقت صرف اسی وقت حقیقت نہ تھی جب حضور اکرمؐ مشرکین مکہ کے جاہلی معاشرے میں کام کر رہے تھے بلکہ جب بھی جاہلیت غالب ہوگی اور کوئی اسلامی تحریک اس کے خلاف جدوجہد شروع کرے گی تو اس کے خلاف ایسا ہی کرنا ہو گا۔اس وقت بیسویں صدی کی جو جاہلیت چھائی ہوئی ہے' وہ ان تمام جاہلیتوں کی طرح ہے جن کے خلاف انسانی تاریخ میں انبیاء کی اسلامی تحریکات نے کام کیا' سب کے خدوخال ایک جیسے ہیں۔

وہ لوگ جن کے ذہنوں میں یہ خیال خام جاگزیں ہے کہ وہ موجودہ جاہلی معاشرے کے اندر رہ کر' اور موجودہ جاہلی معاشرے کے طور طریقے اپنا کر اور ان جاہلی سوسائٹیوں کے اندر رہ کر نہایت ہی نرم انداز تبلیغ سے اسلام کی دعوت دیں گے اور کسی نتیجے تک پہنچ جائیں گے وہ کھلی خام خیالی میں مبتلا ہیں۔وہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کو سرے سے سمجھے ہی نہیں اور ان کو معلوم ہی نہیں کہ اسلامی نظریہ حیات دلوں میں کس طرح اترتا ہے۔تمام جاہلی نظریات کے حامل لوگ اپنے نصب العین' اپنے طریقہ کار اور اپنا نام اور عنوان نہایت ہی واضح طور پر بتاتے ہیں اور علانیہ اپنے مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔کیا داعیان اسلام ہی رہ گئے ہیں جو چھپ چھپا کر کام کریں گے۔حالانکہ ان کے کام کے لیے ایک طریقہ کار وضع شدہ ہے اور وہ جاہلیت کے طریقہ کار سے ممتاز ہے۔

---ooo---

اب ایک نکتہ توجہ طلب ہے کہ رسولوں اور رسالتوں کے بارے میں اللہ کی سنت کیا ہے؟ اور یہ کہ بعض سابقہ اقوام کا جو انجام ہوا اس میں بعد میں آنے والوں کے لیے کیا عبرت ہے؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کوئی پہلے نبی نہیں ہیں۔ آپ سے قبل بھی رسول آئے اور انھوں نے اپنی رسالت پیش کی۔ اس سے قبل جن لوگوں نے ناحق تکذیب کی' ان کا انجام تمہارے لیے سبق آموز ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اے نبی' تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے' وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے' اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنھوں نے (پیغمبروں کی بات مان کر) تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے"۔

سابقہ اقوام کی تاریخ میں بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت ہوتی ہے۔ اس لیے بعد میں آنے والوں کو چاہئے کہ وہ سابقین کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اس سے دل نرم ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کے دلوں میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ جب اقوام سابقہ کی سرگرمیوں اور ان کی چلت پھرت کو اپنے تخیل میں زندہ کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی اپنی شان و شوکت کے ساتھ ان مقامات پر چل پھر رہے ہیں' ڈرتے ہیں اور امیدیں باندھتے ہیں' آگے بڑھتے ہیں اور پیچھے ہٹتے ہیں' اور ان کی بڑی شان و شوکت ہے اور پھر پردۂ خیال پر یہ دور آتا ہے کہ وہ دیکھو یہ لوگ تو نیست و نابود ہو گئے اور مر مٹ گئے' بغیر حس و حرکت پڑے ہیں اور مٹی میں مل گئے ہیں۔ ان کے وہ شہر اور بستیاں کھنڈرات کی شکل اختیار کر گئیں اور ان کے ساتھ ان کا علم و ثقافت اور ان کی چلت اور پھرت اور ان کا عروج اور ان کے افکار بھی مر مٹ گئے تو ایسے تخیلات اور غور و فکر سے انسانوں کے دل دہل جاتے ہیں اور غافل سے غافل انسان کے بھی مارے خوف کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم لوگوں کو امم سابقہ کے عروج و زوال کی کہانیاں سناتا ہے اور ان کو لے جا کر ان کھنڈرات میں گھماتا ہے جو ان اقوام کی داستانیں سناتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲:۱۰۹) "تم سے پہلے جو ہم نے پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والے تھے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے"۔ یعنی وہ نہ ملائکہ اور فرشتے تھے اور نہ وہ کوئی اور الوہی مخلوق تھے' بلکہ اے پیغمبر وہ تو آپ ہی جیسے انسان تھے۔ شہری تھے' دیہاتی نہ تھے تاکہ وہ سلجھے ہوئے ہوں اور نرمی سے بات سنیں۔ لہٰذا آپ دعوت اسلامی کی راہ میں پیش آنے والی

مشکلات کو برداشت کرنے کی سعی کریں اور لوگوں کو راہ راست دکھاتے رہیں۔ آپ کی تحریک اور دعوت بھی اسی سنت الٰہی پر قائم ہے جس کے مطابق اللہ نے تمام انبیاء کو بھیجا۔ یہ لوگ بشر تھے اور ان کی طرف خدا کا پیغام وحی کیا گیا تھا؟

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(۱۲:۱۰۹) "پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا، جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں"۔ تاکہ وہ جان سکیں کہ ان کا انجام بھی وہی ہونے والا ہے جیسا کہ ان کا ہوا۔ اِلا یہ کہ سنت الٰہیہ انہیں اپنی گرفت میں لینے ہی والی ہے اور، کہ وہ یہ سمجھتے کہ اس دنیا سے تو جانا ہی ہے۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا (۱۲:۱۰۹) "یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی"۔ اس لیے کہ اس جہان میں تو قرار نہیں ہے، یہاں سے تو جانا ہی ہے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۲:۱۰۹) "کیا اب بھی تم لوگ نہیں سمجھتے"۔ کیا تم لوگ انسانی تاریخ میں سنت الٰہیہ کے عمل کو سمجھتے نہیں۔ اور کیا تمہاری عقل ایسے معاملے میں بھی معقول فیصلہ نہیں کر سکتی کہ ایک چیز فانی ہے اور ایک باقی ہے اور فانی پر باقی کو ترجیح دینا چاہئے۔

اب رسولوں کی زندگی کی بعض مشکل گھڑیوں کا ذکر کیا جاتا۔ اور یہ مشکل مقامات آخری فتح سے قبل آیا کرتے ہیں۔ یہ مشکلات اللہ کی سنت کا حصہ ہیں اور یہ داعی کو درپیش آتی ہیں کیونکہ سنت الٰہیہ ٹلنے والی نہیں ہوتی۔

حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْــَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾

"(پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ مدتوں نصیحت کرتے رہے اور لوگوں نے سن کر نہ دیا) یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا، تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر جب ایسا موقع آ جاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں، بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا"۔

یہ نہایت ہی خوفناک صورت حال ہے۔ یہاں رسولوں کی زندگیوں کے نہایت ہی کربناک، تنگی اور شدید مشکل حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ایسے حالات کہ ان میں رسول کفر، انکار، ہٹ دھرمی اور کھلے اندھے پن کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ دن یوں ہی گزرتے گئے مگر رسولوں نے کبھی بھی دعوت کو نہیں چھوڑا اور لوگ بھی انکار کرتے رہے۔ روز و شب کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور باطل دندناتا رہا۔ اہل باطل بہت ہی کثرت سے رہے اور اہل ایمان قلیل اور ضعیف رہے۔

کس قدر سخت حالات ہیں، باطل ہانپ رہا ہے، سرکشی اور طغیانی کا ارتکاب کر رہا ہے، اور ظلم و عدوان اس کا شعار ہے۔ رسول ان حالات میں اللہ کے وعدے کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کا وعدہ سامنے نہیں آ رہا ہے۔ ان حالات میں

ان کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے آرہے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ انہیں مسترد کر دیا گیا' تم دیکھتے ہو کہ بظاہر ان کا یہ نظریہ مسترد کر دیا گیا کہ اس دنیا میں ان کو کامیابی نصیب ہوگی لیکن یہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

کوئی بھی رسول جب ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت تنگی' شدت اور کرب اور اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ یہ آیت اور اس کے ساتھ ساتھ جب سورہ بقرہ کی درج ذیل آیت میں پڑھتا ہوں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰي يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰي نَصْرُ اللّٰهِ

--- (۲ : ۲۱۴) "کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ حالات پیش نہ آئیں گے جو ان لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ ان کو سخت مصیبت اور تکلیف نے چھوا اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے تھے پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی نصرت؟"

جب بھی ان دو آیات میں سے کوئی آیت پڑھتا ہوں تو میں مارے خوف کے کانپ اٹھتا ہوں کہ رسولوں کو کس قدر جان کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا' ایسے مشکل حالات میں انسان طرح طرح کے وسوسوں کا شکار ہوتا ہے' ایک تسلسل کے ساتھ تکلیف دہ اور ہلا مارنے والے حالات سے دوچار ہوتا ہے جن میں رسول تک متزلزل ہو جاتے ہیں' ایک کربناک نفسیاتی کشمکش سے انسان دوچار ہوتا ہے اور ایک ناقابل برداشت اذیت ہر وقت پیچھا کرتی رہتی ہے۔

ایسے حالات میں جن میں یہ رنج و غم مسلسل نظر آتا ہے اور کلیجہ منہ کو آجاتا ہے اور رسول اور اس کی جماعت اپنی پوری قوت صرف کر دیتی ہے' تو ایسے حالات میں اللہ کی نصرت آجاتی ہے۔ اور ایسے حالات میں جو نصرت آتی ہے وہ فیصلہ کن ہوتی ہے۔ جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۲ : ۱۱۰)

"یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر جب ایسا موقع آجاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں' بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا"۔ یہ ہے دعوت اسلامی کے بارے میں اللہ کی سنت۔ اس راہ میں مشکلات کا آنا ضروری ہے۔ کربناک حالات سے دوچار ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ تحریک اسلامی اپنی پوری قوت اس راہ میں خرچ کر دے۔ اس کی قوت اور طاقت کا پورا حصہ صرف ہو جائے اور نہایت ہی مایوس کن حالات ظاہر ہو جائیں اور ظاہری اسباب جن پر لوگ تکیہ کرتے ہیں' ایک کے بعد ایک غائب ہو جائیں۔ ایسے حالات میں پھر صرف من جانب اللہ نصرت آتی ہے اور وہی لوگ نجات پاتے ہیں جن کے بارے میں اللہ کا کوئی حکم ہوتا ہے اور تحریک اسلامی کے مخالفین پر پھر ہلاکت آتی ہے' اس سے وہ لوگ بچ جاتے ہیں جو نجات کے مستحق ہوتے ہیں' اور ان پر وہ ہلاکت نہیں آتی جو مکذبین پر آتی ہے۔ یوں ایسے لوگ اس جبر اور تشدد کے ماحول سے نجات پاتے ہیں جو ظالموں اور جابروں نے ان پر مسلط کر دیا ہوتا ہے۔ اب مایوسی اور بے بسی مجرموں کے حصے میں آتی ہے۔ ان کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے اور ان کی قوت پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اب نہ ان کا کوئی ولی ہوتا ہے نہ مددگار"۔

یہ سنت کیوں وضع کی گئی ہے؟ اس لیے کہ فتح و نصرت بے قدر نہ ہو۔ وہ محض مذاق نہ ہو' اگر قربانیوں کے بغیر فتح و

نصرت ہاتھ آجایا کرتی تو ہر کوئی اٹھ کر داعی بن جاتا اور کوئی قربانی دیئے بغیر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا یا معمولی جدوجہد سے وہ انقلاب برپا کر دیتا۔ اس لیے اللہ نے دعوت اسلامی کو محض کھیل تماشے کی طرح آسان نہیں رکھا۔ دعوت اسلامی کا مقصد پوری زندگی کے طور طریقوں میں انقلاب برپا کرنا ہے۔ اور یہ انقلاب وہ لوگ نہیں برپا کر سکتے جو محض دعویٰ ہی کریں' اس کی پشت پر کوئی قربانی نہ ہو۔ ایسے لوگ دعوت اسلامی کی راہ میں دی جانے والی قربانیاں نہیں برداشت کر سکتے۔ ایسے لوگ پہلے تو دعوت اسلامی جیسے مشکل کام میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتے لیکن اگر یہ غلطی کر بھی بیٹھیں تو وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکتے اور جلد ہی عاجز آکر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ جب راہ حق میں مشکلات آتی ہیں تو صرف صادق اور اولوالعزم لوگ ہی ان کا مقابلہ کرتے ہیں جو کسی حال میں بھی دعوت اسلامی کی راہ نہیں چھوڑتے اگرچہ ان کو یقین ہو جائے کہ اس جہان میں ان کو کامیابی نہ ہوگی۔

دعوت اسلامی کوئی ایسا سودا نہیں ہے جو ایک محدود وقت کے لیے ہو' نیز اس سودے کا منافع بھی اس دنیا کی محدود زندگی تک موقوف نہیں ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ سودا کرنے والے لوگ اس کا اقالہ کر کے کسی اور نفع بخش سودے کے لیے تیار ہو جائیں' جس سے ان کو اس دنیا میں جلدی نفع مل جائے۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا علم کسی بھی جاہلی معاشرے میں بلند کرتے ہیں (اور یاد رہے کہ جاہلی معاشرہ ہر وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہ ہو' اور اللہ کے سوا اور طاغوتوں کی اطاعت کی جاتی ہو) ایسے لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تحریک کا کارکن ہونا کوئی تفریح کا کام نہیں ہے' نہ یہ کام دنیا کے مفاد کا کوئی تجارتی عمل ہے۔ یہ تو ان طاغوتی قوتوں کے ساتھ کشمکش پیہم کا معاملہ ہے جو افراد اور مالی قوت رکھتی ہیں اور ان طاغوتی قوتوں نے جمہور کو اس طرح دبا رکھا ہے کہ وہ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہتی ہیں۔ اور عوام بے بس ہیں۔ پھر یہ قوتیں اس قدر بااثر ہیں کہ یہ عوام کالانعام کو اسلامی تحریکوں پر کتوں کی طرح چھوڑ دیتی ہیں اور عوام کے اندر ان کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ لوگو! یہ لوگ تم کو ہر قسم کی تفریح اور عیاشی سے محروم کر دیں گے اور زندگی کی رنگا رنگی ختم کر کے چھوڑ دیں گے...... غرض دعوت اسلامی کے حاملین کا فرض ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ اس راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں' اور پھر ان مشکلات کو انگیز کرنے کا عمل مزید مشکل ہے۔ لہٰذا قاعدہ یہ ہے کہ ابتداء میں تحریک اسلامی کے کارکن اولوالعزم لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ عامۃ الناس اس تحریک سے دور بھاگتے ہیں۔ معاشرے کے چیدہ' پسندیدہ اور اولوالعزم لوگ ہی اس طرف آتے ہیں۔ یہ لوگ اقامت دین پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس دنیا کا سب آرام اور سامان قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابتداء میں ایسے لوگ قلیل ہوتے ہیں' لیکن اللہ ایسے لوگوں اور ان کی قوم کے درمیان حق پر فیصلہ فرماتے ہیں اور یہ حق تب ظاہر ہوتا ہے جب اس کے لیے طویل جدوجہد کی جائے اور جب حق آتا ہے' فیصلہ ہو جاتا ہے' فتح حاصل ہو جاتی ہے تو جمہور لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں۔

قصہ یوسف میں رنگارنگ مشکلات ہیں جن سے یہ داعی دوچار ہوتا ہے۔ اندھے کنوئیں میں ان کو ڈالا جاتا ہے۔ عزیز مصر کے گھر وہ ملازم اور غلام کی طرح رہتے ہیں۔ پھر ناحق جیل جاتے ہیں اور لوگوں کی امداد سے مایوس ہوتے ہیں لیکن آخری انجام انہی لوگوں کے حق میں ہوتا ہے۔ جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا اور اللہ کا وعدہ ہر حال میں سچا ہوتا ہے۔ قصہ یوسف قصص انبیاء میں سے ایک اہم نمونہ ہے اور ہر عقل رکھنے والے کے لیے

اس میں سبق ہے۔ اس میں یہ سبق بھی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انبیائے سابقہ کے حالات سے خبردار نہ تھے لیکن اس قصے میں یہ تفصیلات دی گئیں ' اس لیے یہ دلیل ہے صداقت قرآن پر ' ورنہ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایسے حالات اپنی طرف سے گھڑ کر بنائے اور وہ حرف بحرف درست ہوں اور مصنوعی کہانیوں پر دل مومن کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١١١﴾ ۱۲ ع ۷

" اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت "۔

--- ooo ---

ذرا غور کیجئے ' سورہ کا آغاز اور اختتام کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ اس طرح قصے ' کا آغاز و اختتام بھی باہم ہم آہنگ ہیں۔ قصے ' کے آغاز میں بھی نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے درمیان بھی عبرت آموزی کی گئی ہے اور اس کے آخر میں بھی نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور مضمون اور موضوع باہم پیوست و ہم آہنگ ہے۔ طرز ادا اور فقرے موزوں ' فنی اعتبار سے قصہ نہایت ہی پرکشش ہے۔ لیکن ان سب خصوصیات کے ساتھ واقعات حقیقت پر مبنی ہیں اور کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

یہ قصہ ایک ہی سورہ میں پوری طرح بیان ہو جاتا ہے۔ یک جا پورے کا پورا۔ اس لیے کہ اس قصے کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ یہ یکجا ہو۔ کیونکہ واقعات آہستہ آہستہ رونما ہوتے ہیں۔ ایک دن کے بعد دوسرا دن آتا ہے۔ ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے ' اس لیے اس سے نتائج صرف اسی صورت میں اخذ کیے جا سکتے تھے کہ قصے کو پوری شکل میں ایک سورہ میں دے دیا جائے۔ اگر دوسرے قصص کی طرح اس کے صرف بعض حلقے ہی لائے جاتے تو اس طرح وہ نتائج اخذ نہ ہو2 سکتے تھے جو مکمل قصہ کی شکل میں سامنے آتے ہیں دوسرے قصص کا انداز قرآن میں مختلف رہا ہے۔ مثلاً قصہ بلقیس یا قصہ تخلیق مریم۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا واقعہ ' حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کا واقعہ ' کیونکہ یہ ان قصوں کے بعض حلقے اپنی جگہ مکمل حصے اور کڑیاں ہیں اور ان سے ایک مستقل سبق ملتا ہے۔ لیکن قصہ یوسف ایسا ہے کہ اس کو مکمل طور پر ایک ہی نشست میں پڑھنا ضروری ہے اور ابتداء سے انجام تک ایک ہی جگہ اس کا بیان بھی ضروری ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ (۱۲ : ۳) " ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق (قصص) تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تم بالکل بے خبر تھے "۔

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۱۳

سورۃ الرعد ـ ۱۳

۱ --- تا --- ۴۳

سورۂ رعد ایک نظر میں

بارہا میں نے قرآنی آیات پر غوروفکر کرتے ہوئے یہ ڈر محسوس کیا ہے کہ میں قرآن کریم کی تفسیر نصوص قرآنی کو چھوڑ کر کسی دوسرے انسانی اسالیب کلام کے انداز میں کروں۔کیونکہ قرآن کریم کا انداز بیان بے مثال اور لافانی ہے اور ہم اس کی جو تفسیر بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے جو اسوب بیان بھی اختیار کرتے ہیں وہ اس کے اسلوب سے فروتر ہے۔

یہ سورہ بھی سورہ انعام کے انداز اور اسلوب میں ہے۔اس کا انداز بیان اس قدر صاف' سادہ اور واضح ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کی کوئی تشریح نہ کی جائے' اسے کچھ ہی نہ کیا جائے اور قاری اسے پڑھتا ہی چلا جائے۔

لیکن میں کیا کروں' ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس میں لوگ قرآن کریم سے بہت ہی دور ہو گئے ہیں' لہٰذا اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ عوام کو قرآن کے مقاصد' اس کے مزاج' اس کے نظام اور اس کے موضوع بحث سے آگاہ کیا جائے۔ دراصل لوگ اس ماحول سے بے خبر ہیں جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ لوگوں نے وہ اغراض و مقاصد پس پشت ڈال دیئے ہیں جن کے لیے قرآن مجید نازل ہوا۔اس لیے ان کے شعور و احساس سے قرآن مجید کے مفہومات اور اس کے حدود کار زائل اور محو ہو چکے ہیں۔اب صورت حال یہ ہے کہ لوگ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بھی نہیں جانتے' اس لیے کہ لوگ ایسی ہی جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں جس میں وہ لوگ ڈوبے ہوئے تھے جن پر یہ قرآن پہلی مرتبہ نازل ہوا۔اب قرآن کو لے کر مسلمان جاہلیت کا مقابلہ نہیں کر رہے' نہ انہوں نے قرآنی نظام کے قیام کے لیے کوئی تحریک برپا کر رکھی ہے' جس طرح حضور اکرم کے وقت قرآن کو ماننے والوں نے اقامت دین کے لیے ایک تحریک برپا کی تھی۔ قرآنی نظام کے قیام کی تحریک کے بغیر لوگ ان مقاصد' مفاہیم اور مطالب کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو قرآن کے پیش نظر تھے اور ہیں۔ ایک معطل اور بے عمل شخص مقاصد قرآن کو نہیں پا سکتا' اس کی حقیقت سے روشناس وہی شخص ہو سکتا ہے جو قرآن کی روشنی میں ایک تحریک برپا کر دے اور اسے لے کر جاہلیت کے مقابلے میں اتر آئے۔

لیکن ان حقائق کے باوجود میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر کروں کیونکہ وہ خود بین اور واضح ہے۔

قرآن کریم کو پڑھ کر میرے پردہ احساس پر جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اسے میں الفاظ کے جامے میں منتقل نہیں کر سکتا۔یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اس احساس اور شعور کو پوری طرح ظلال القرآن میں الفاظ کی شکل میں منتقل نہیں کر سکتا۔میں جو کچھ کر پاتا ہوں وہ کچھ اور ہے اور الفاظ ظلال کچھ اور ہیں۔

ہاں میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ ہمارے معاشرے اور اس معاشرے میں ایک بنیادی فرق ہے جس کے اندر قرآن کریم پہلے اترا۔ابتدائی لوگ' صحابہ کرام براہ راست اس کے مخاطب تھے۔وہ اپنے دل و دماغ کی تاروں پر براہ راست قرآن کی ضربات کو محسوس کرتے تھے۔اس کے تصورات اور اس کی پرچھائیں اور اس کے اشارات اور اس

کی ہدایات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور وہ براہ راست اس سے متاثر ہو کر بدل جاتے تھے۔ فوراً براہ راست۔ پھر وہ قرآنی تصورات کو عمل کا جامہ پہناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ کے ایک مختصر عرصے میں انہوں نے انقلاب برپا کرنے کا وہ معجزہ دکھایا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔ ایسا انقلاب 'جس نے ان کے تصورات' ان کے شعور' ان کے دل و دماغ اور ان کی پوری عملی زندگی کو بدل دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ماحول کے اندر بھی ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ پھر انہوں نے پورے عالم انسانی کی قدریں بدل دیں۔ پھر انہوں نے آنے والی تاریخ کے دھارے بدل دیئے۔

یہ لوگ قرآن کے سرچشمے سے براہ راست سیراب ہوتے تھے اور ان کے احساس کی تاروں پر قرآنی آیات کی ضربات براہ راست پڑتی تھیں اور اس کی شعاعیں اور حرارت وہ براہ راست محسوس کرتے تھے۔ وہ اس کی کیفیات میں ڈھل جاتے تھے۔ قرآنی اقدار کو زندہ کرتے جاتے تھے اور قرآنی تصور ان کا تصور ہوتا تھا۔

لیکن ہمارا انداز فکر بالکل مختلف ہے۔ ہم پہلے دوسرے مفکرین کی سوچ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کائنات کے بارے میں جاہلیت کے نظریات پڑھتے ہیں' اجنبی اقدار پر ایمان لاتے ہیں' غیروں کے طور طریقے اپناتے ہیں اور اپنے جیسے انسانوں کے فانی نظریات کو سینے سے لگاتے ہیں اور پھر قرآن پڑھتے ہیں۔

نیز ہم ان جاہل اقوام کی ترقیات سے متاثر ہوتے ہیں' جنہوں نے اس جہاں کو آباد کر دیا ہے اور مادی ترقی میں ہم سے آگے ہیں اور پھر قرآن کی تفسیر ہم ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ تفسیر قرآن میں ہم وہ منطق استعمال کرتے ہیں جو مادی ترقیات کی منطق ہے۔ اس طرح بھی ہم تفسیر قرآن میں غلطی کر جاتے ہیں اور ہمارے فہم قرآن سے غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں' اس لیے کہ مادی طور پر ترقی یافتہ معاشرے ان تصورات سے مختلف تصورات کی تخلیق ہیں جو قرآن کے پیش نظر ہیں۔

میں ظلال القرآن کے قارئین کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ظلال القرآن کو پڑھتے ہوئے ایسے مقاصد پیش نظر نہ رکھیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ قرآن کو اس لیے پڑھیں کہ وہ قرآن کریم کے قریب ہوں' اسے حقیقت پسندانہ طور پر سمجھیں اور تمام غلط خیالات و تصورات کو جھاڑ کر دور پھینک دیں۔

یاد رہے کہ ہمارے قارئین اس ہدف کو اس وقت تک نہیں پاسکتے جب تک وہ اپنی پوری زندگی میں قرآنی مدلولات کو روبعمل نہ لائیں' عملاً جاہلیت کے برخلاف کشمکش برپا نہ کر دیں اور قرآنی اصول و قواعد کے جھنڈے اٹھا نہ لیں۔

---- ○○○----

یہ تو تھیں تمہیدی باتیں' اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں' میرے سامنے سورہ رعد ہے' میں نے اس سے قبل اسے بارہا پڑھا ہے' بارہا اسے سنا ہے لیکن آج یوں نظر آتا ہے کہ میں اسے پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم انسان کو اتنا ہی دیتا ہے جس قدر انسان قرآن کو دے۔ جب بھی آپ قرآن کو پڑھیں گے' اس کا نور' اس کی شعاعیں' اس کے اشارات سے دل و دماغ کی تاروں پر اس کی جانب سے نئی ضربات لگیں گی۔ یوں نظر آئے گا کہ گویا آپ اسے آج ہی پڑھ رہے ہیں اور اس سے قبل آپ نے کبھی اس کا مطالعہ نہ کیا تھا' نہ کبھی آپ نے اس پر غور و فکر کیا تھا۔

قرآن کریم کی سورتوں میں سے یہ ایک عجیب سورہ ہے جو آغاز سے انجام تک ایک ہی سانس میں' ایک ہی ٹون میں' ایک ہی فضا میں اور ایک ہی رنگ و بو میں چلتی ہے۔ انسانی پردۂ احساس پر مختلف تصاویر' مختلف سائے' مختلف مناظر اور مختلف

قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں، جن کا تعلق انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ گویا ایک تصویری مقابلہ ہے، انوار، تاثرات اور تصورات کی ایک نمائش ہے۔ یہ انسانی غور و فکر کو وسیع تر کائنات کی سیر کراتی ہوئی روز و شب محدود دائرے سے لامکاں کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سورہ کے درمیان انسان زندہ اور بیدار رہتا ہے اور وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بہت کچھ اخذ کرتا ہے۔

یہ سورہ محض الفاظ کی کرشمہ سازی نہیں ہے اور نہ ہی صرف خوبصورت عبارات کا مرقع ہے۔ بلکہ یہ انسانی شعور کو جھنجھوڑنے والی ہے۔ انسانی پردۂ احساس کو قسم قسم کی نئی تصاویر دیتی ہے۔ اس سے ایک شعور ابھرتا ہے اور اس کی عبارت کے اندر ایک خاص ترنم ہے اور اس کے اندر جگہ جگہ خالص وجدانی اشارات ہیں۔

اس کا موضوع کیا ہے؟ تمام مکی سورتوں کی طرح اس کا موضوع بھی اسلامی نظریہ حیات ہے۔ اسلامی عقیدۂ توحید اور اس کے متعلقہ مسائل، حاکمیت میں توحید، بادشاہت میں توحید، دین اور شریعت میں توحید، دنیا و آخرت میں توحید، وحی الٰہی کے مسائل اور آخرت کے حساب و کتاب کے مناظر وغیرہ۔

اسلامی نظریہ حیات کا عقیدہ ایک ہے اور مسائل متعین ہیں۔ اس پر اس سورہ اور دوسری مکی اور مدنی سورتوں میں قرآن کریم نے بار بار بحث کی ہے لیکن جب بھی اس موضوع پر قرآن کریم بحث کرتا ہے تو ایک نئے اسلوب سے بحث کرتا ہے۔ ہر جگہ ایک نئی روشنی ہوتی ہے، ہر جگہ نیا تاثر، نئے اشارات اور عقل و خرد کی تاروں پر نئی ضربات لگتی ہیں۔

پھر قرآن مجید ان مسائل اور موضوعات پر خشک منطقی اور فلسفیانہ انداز میں کلام نہیں کرتا کہ یہ صغریٰ ہے اور یہ کبریٰ بلکہ وہ ان مسائل کو اس کائنات کے ماحول میں رد کر لیتا ہے۔ اس کائنات کے عجائبات کو ذہن انسانی کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ انسان اس پوری کائنات کے اندر موجود دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے کھلی آنکھ کے ساتھ سمجھے۔ جس طرح اس کائنات کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ قرآن جتنی بار ان مسائل پر کلام کرتا ہے، اتنی ہی بار نیا اسلوب سامنے آتا ہے۔ کیونکہ مومن کی ہر دن نئی شان نئی آن ہوتی ہے، ہر دن انسانی ادراک آگے بڑھتا ہے اور ہر آن قرآنی عجائبات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ غرض جس طرح کائنات کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اسی طرح قرآنی عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسلامی نظریہ حیات پر جب بھی کلام ہوتا ہے، نئے انداز سے ہوتا ہے۔

یہ سورہ انسانی قوت ادراک کو لے کر اس کائنات کے طول و عرض میں اسے گھماتی ہے، اس کی گہرائیوں اور بلندیوں تک اسے لے جاتی ہے۔ وہ انسانی عقل و ادراک کے سامنے اس کائنات کی وسعتیں پیش کرتی ہے۔ دیکھو آسمانوں کو کہ یہ بغیر کسی ستون اور سہارے کے کھڑے ہیں، ذرا شمس و قمر کو دیکھو، یہ کس طرح ایک نظام کے مطابق گردش کر رہے ہیں، دن رات کو ڈھانپ لیتا ہے اور رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ذرا اس زمین ہی کو دیکھو کہ اس کے سینے پر پہاڑ کھڑے کر دیے گئے ہیں اور اس پر نہریں اور دریا جاری ہیں۔ اس کی سرسبزیوں اور شادابیوں پر نگاہ ڈالو، باغات اور مختلف قسم اور رنگ برنگ کے پھل پھول اور فصلیں اور غلے۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی اور رنگ مختلف اور ذائقہ بھی مختلف ہے۔ پھر نظام باد باراں، کڑک و چمک کو دیکھو، رعد تسبیح خواں ہے۔ ملائکہ اللہ کے ثنا خواں ہیں۔ کسی پر بجلی گرتی ہے اور کسی پر باران رحمت۔ بادلوں کو دیکھو، پانیوں سے لدے ہوئے کسی وادی کے اوپر سے گزر جاتے ہیں اور دوسری پر جا برستے ہیں۔ ندی نالے بہہ نکلتے ہیں اور جھاگ اور بے فائدہ مواد ختم ہو جاتا ہے اور جو مفید چیز ہوتی ہے وہ قائم رہتی ہے۔

اس سورہ میں غور و فکر کرتے ہوئے انسان جدھر جاتا ہے یہ اس کی راہنمائی کرتی ہے' یہ بتاتی ہے کہ اللہ کا علم بہت ہی وسیع ہے۔وہ ہر آنے جانے والے کو دیکھتا ہے' دن کو چلنے والے اور رات کو چلنے والے دونوں اس کی نظر میں ہیں۔ وہ تمام زندہ انسانوں کے دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

جو جہان انسانی نقطہ نظر سے غیب ہیں اللہ کے سامنے کھلے ہیں' وہ ماں کے پیٹ میں بھی سب کچھ جانتا ہے۔خصوصاً بچے کی نشوونما اس کی نظر میں ہے۔یہ سورہ کوشش کرتی ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کبریٰ انسانی فہم و ادراک کے قریب آ جائے۔وہ ذات جو ظاہرو پوشیدہ ہرشے کو جانتی ہے وہ ذات جو صغیرہ و کبیرہ ہر چیز سے باخبر ہے۔اس کے حوالے سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے جس کے تصور ہی سے دل کانپنے لگتا ہے۔

ان تمام مضامین کو ایسی مثالوں کے ذریعے فہم انسانی کے قریب لایا جاتا ہے جو زندگی سے بھرپور اور متحرک ہوتی ہیں اور ان میں تاثرات' انفعالات بھرپور ہوتے ہیں' خصوصاً قیامت کے مناظر' حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کے مناظر' نفس انسانی اور اس کے خلجانات' سابق امم کے مناظر بربادی' جن کو سنت الہیہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

--- ○○○---

یہ تھے اس سورہ کے موضوعات و مسائل۔اور یہ تھا اس کا دائرہ بحث یعنی یہ کائنات اور اس کی وسعتیں۔ان کو نہایت ہی فصاحت و بلاغت اور فنی خوبیوں پر مشتمل سلیس عربی میں بیان کیا گیا۔جس فریم ورک میں ان مسائل کو پیش کیا گیا ہے وہ یہ کائنات ہے۔اس کائنات کے عجائبات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا۔کائنات کے مختلف قدرتی مناظر اور خود نفس انسانی کے اندر موجود قدرتی عجائبات' یہ فریم ورک ایک خاص فضا رکھتا ہے' مثلاً :

اس سورہ میں قدرتی مناظر کی فضا پائی جاتی ہے۔آسمان و زمین' شمس و قمر' لیل و نہار' دھوپ اور چھاؤں' اونچے پہاڑ اور بہتے دریا' دریاؤں میں بے کار جھاگ اور مفید پانی' پھر زمین کے اندر مختلف ٹکڑے' زرخیز اور بنجر' پھل دار اور غیر پھلدار درخت' چنانچہ ہر قسم کے مشاہدات اور ... اور مفہومات ہیں۔حرکات و نتائج میں بھی ایک قسم کا حسین تقابل پوری سورہ کا حصہ ہے۔ایک طرف معنوی تقابل ہے تو دوسری طرف حسی تقابل ہے۔چنانچہ شمس و قمر کی تسخیر کے بالمقابل استواء علی العرش آتا ہے۔پھر رحم مادر میں کمی کے مقابلے میں بچے کی نشوونما و تربیت آتی ہے۔جہری قول کے مقابلے میں قول خفی' رات کے وقت چلنے کے مقابلے میں دن کا چلنا' برق و باراں میں خوف کے مقابلے میں طمع' اور رعد کی حمد کے مقابلے میں فرشتوں کی ثنا' دعوت حق کے مقابلے میں شرک کی دعوت باطل'۔۔۔ جہالت کے مقابلے میں بصیرت اور نزول قرآن کے وقت بعض لوگوں کی خوشی اور اس کے مقابلے میں بعض دوسروں کی کبیدگی خاطر۔پھر کتاب اللہ میں محو و اثبات کا عمل۔غرض بے شمار معانی باہم متقابل' حرکات باہم متقابل اور رنگ کے مقابلے میں رنگ اور رجحان کے مقابلے میں رجحان۔اس سورہ میں نہایت ہی موزوں' مناسب اور سورہ کی فضا اور مضامین کے مطابق ہے۔

بیان و ادا کے فنی اور معنوی کمالات میں سے ایک اس سورہ میں یہ بھی ہے کہ اس میں طبعی مناظر' زمین و آسمان' شمس و قمر' رعد و برق' کڑک اور بارش' زندگی اور نباتات کی اس فضا میں ایک نہایت ہی حساس اور انسانی زندگی سے قریب تر حقیقت رحم مادر کی کمی بیشی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ماتغیض الارحام وماتزداد اور اس کا تناسق' بارش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نباتات سے ہے۔اور الفاظ کے تناسب کے ساتھ مفہوم کے اندر بھی ایک خاص ہم آہنگی کو ملحوظ رکھنا

قرآن کریم کا ایک خاص انداز گفتگو ہے ۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے میں نے اس سورہ پر بھی طویل غور کیا جس طرح دوسری سورتوں پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ ممکن نہیں ہے کہ انسانی انداز کلام کے پیمانوں کے ذریعے اس پر کوئی تبصرہ کیا جا سکے ۔ کیونکہ جس طرح انسان کا انداز کلام تغیرات سے پر ہے ' اسی طرح اس کے پیمانے بھی ناقص ہیں ۔ یہ فانی ہیں اور قرآن لازوال ہے لیکن جس قدر گفتگو میں نے کی ہے ' یہ اس لیے کی ہے کہ دور جدید میں جدید تعلیم یافتہ نسل کی یہ ضرورت ہے ۔ اس لیے کہ جدید نوجوان قرآنی معاشرے اور قرآنی فضا سے نابلد ہے اور اپنے چاہتے ہیں کہ وہ قرآن کے قریب ہو جائے ۔ اس معاملے میں ہم اللہ کی مدد چاہتے ہیں اور وہ حقیقی مددگار ہے ۔

---ooo---

درس نمبر۱۱۲ تشریح آیات

۱--- تا--- ۱۸

سورہ کا آغاز اسلامی نظریہ حیات کے ایک بنیادی مسئلہ سے کیا جاتا ہے - یہ کہ یہ کتاب من جانب اللہ نازل ہوئی ہے - یہ جن حقائق پر مشتمل ہے' وہ حق اور سچے ہیں - یہ بات اسلامی نظریہ حیات کے اساسیات میں سے ہے - باقی تمام نظریات و عقائد اسی نکتے پر تعمیر ہوتے ہیں - عقیدۂ توحید' عقیدۂ بعث بعد الموت' زندگی میں عمل صالح کی افادیت اور تمام اخلاقی تعلیمات اس بات پر موقوف ہیں کہ یہ سب احکام من جانب اللہ ہیں اور یہ قرآن کی شکل میں جبرائیل علیہ السلام خدا کی طرف سے لے کر آئے ہیں - حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم برحق ہیں - یہ ہے وہ بنیاد جس پر پورا دین تعمیر ہوا ہے -

سُوْرَةُ الرَّعْدِ (۱۳) مَكِّيَّةٌ (۹۶) آیاتها ۴۳ رکوعاتها ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے -

"ا-ل-م-ر- یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں' اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے' مگر (تمہاری قوم کے) اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں -

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (۱۳ : ۱) "یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں" - یعنی یہ آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ وحی منجانب اللہ ہے - کیونکہ یہ آیات انہی حروف تہجی سے مرکب ہیں - اور جب آج تک ان حروف سے ایسی کتاب کوئی نہیں بنا سکا تو ثابت ہوا کہ یہ وحی الٰہی ہیں -

وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (۱۳ : ۱) "اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے" - یہی حق ہے' یہ ایسا خالص حق ہے جس میں باطل کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے اور جس

میں کوئی شک اور تردد نہیں ہے۔ یہ حروف تہجی بھی اس پر دلیل ہیں کہ یہ حق ہے کیونکہ یہ اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے پر دلیل ناطق ہیں۔ کیونکہ اللہ کی جانب سے جو آتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۳ : ۱) "مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ وہ اس بات پر ایمان نہیں لاتے کہ یہ قرآن مجید من جانب اللہ ہے۔ اور نہ ان نتائج کو مانتے ہیں جو اس ایمان کے بعد سامنے آتے ہیں مثلاً عقیدۂ توحید، صرف اللہ کی مکمل اطاعت، عقیدہ بعث بعد الموت اور عقیدۂ توحید کے ساتھ عمل صالح۔ اور پوری زندگی کی اصلاح۔

---- ○○○ ----

یہ ہے اس سورہ کا کلمہ آغاز اور اس کے اندر پوری سورہ کے مضامین کو نچوڑ کر بند کر دیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جو اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ تفصیلات کا آغاز مناظر قدرت الہیہ کے بیان سے کیا جاتا ہے۔ اس کائنات کی تخلیق، اس کی حرکت اور اس کے اثرات و آثار کس قدر گہری حکمت پر مبنی ہیں اور بذات خود یہ کائنات کس قدر عجیب چیز ہے۔ جب یہ کائنات عجیب ہے، اس کی مخلوق عجیب ہے اور اس کی حکمتیں ناقابل فہم ہیں تو انسان کی ہدایت کے لیے وحی و کتاب لابدی ہیں اور یہ کہ اس فانی دنیا کے بعد دائمی زندگی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز اس کائنات کی اس پیچیدہ قدرت و حکمت کا تقاضا۔ منطقی تقاضا بھی یہ ہے کہ موت کے بعد تمام مخلوقات زندہ کر کے اٹھائی جائے۔ تمام لوگ اس کے سامنے حاضر ہوں جس نے ان کو پیدا کیا اور جس نے ان کے لیے اس کائنات کو مسخر کیا اور اس کی نعمتوں سے نوازا تاکہ وہ پوری زندگی کا جواب دیں۔ حساب و کتاب ہو، جزاء و سزا ہو اور عمل آزمائش مکمل ہو۔

مناظر قدرت کی عکاسی اور تصویر کشی یوں شروع ہوتی ہے کہ سب سے پہلے بڑے بڑے قدرتی مناظر کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ ایک ٹچ آسمانوں کو دیا جاتا ہے اور ایک ٹچ طویل و عریض زمین کو دیا جاتا ہے اور پھر اس زمین پر بکھری ہوئی حیات اور اس کے عجائبات سامنے آتے ہیں۔

اس کے بعد نہایت ہی تعجب سے کہا جاتا ہے کہ آخر ان لوگوں کے پاس کیا دلیل ہے کہ وہ بعث بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ لوگ دراصل ان قدرتی شواہد کے بعد آیات و معجزات کا مطالبہ کر کے دراصل عذاب الہی کو دعوت دیتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ وَفِي

الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَ اُولٰٓىِٕكَ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۵﴾ وَ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۶﴾ وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا، اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لئے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں۔ انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہی، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اگر تمہیں تعجب کرنا ہے، تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں حالانکہ ان سے پہلے (جو لوگ اس روش پر چلے ہیں ان پر خدا کے عذاب کی) عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کے ساتھ چشم پوشی سے کام لیتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ لوگ جنہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟" ـــ تم تو محض خبردار کر دینے والے ہو، اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے"۔

آسمان کیا ہیں اور ان کا مفہوم مختلف ادوار میں لوگ کیا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے، لیکن یہ ہماری نظروں کے

سامنے ہیں۔ یہ ایک عظیم منظر اور عظیم کائنات ہے۔ جب بھی کوئی ان پر غور کرتا ہے اور معلومات حاصل کرتا چلا جاتا ہے تو ان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ سب نظام کسی ظاہری سہارے کے بغیر قائم ہے۔ جس طرح اس زمین پر کوئی چیز بغیر سہارے کے نہیں ہوتی' ایسا سہارا جو ہمیں نظر آئے۔ بغیر عمد ترونہا۔

یہ اس پوری کائنات کی تصویر کشی کے سلسلے میں پہلا ٹچ ہے اور انسانی وجدان اور قوت مدرکہ کے لیے یہ ایک پہلی ضرب ہے' خصوصاً جبکہ انسان اس عظیم کائنات پر غور کر رہا ہو اور وہ سوچے کہ وہ عظیم قوت کون ہے جو اس عظیم کائنات کی خالق ہے اور جس نے اسے یوں ٹھہرا رکھا ہے۔ یہ اللہ ہی ہو سکتا ہے۔

لوگ ستون کے ساتھ یا بغیر ستون زمین کے کسی کونے پر ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور پھر ان عمارتوں کی تعریفیں کرتے ہیں کہ یہ کس قدر عظیم عمارت ہے؟ کس قدر خوبصورت عمارت ہے؟ لیکن وہ ان بلندیوں اور خوبصورتیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جو اس کائنات کے اندر موجود ہیں۔ بغیر ستونوں کے کرات اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اس کائنات کے پیچھے جو قدرت کارفرما ہے اور جو عظمت پوشیدہ ہے اور پھر اس کے اندر اس قوت نے جو خوبصورتی ودیعت کی ہے وہ بھی قابل دید ہے۔

یہ عظیم کائنات جو ہماری نظروں میں ہے اور وہ عظیم کائنات جو ہماری نظروں سے ابھی اوجھل ہے اور جہاں رب کائنات کا دارالخلافہ ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰي عَلَي الْعَرْشِ (۲:۱۳) "پھر وہ عرش پر متمکن ہوا"۔ یہ کائنات اگر بلند ہے تو عرش الٰہی بلند تر ہے۔ اور اگر یہ کائنات عظیم ہے تو عرش الٰہی عظیم تر ہے۔ ہر استواء کا مفہوم وسعت' عظمت اور تمکن ہے اور قرآن کریم نے لفظ استوی محض انسان کی قاصر قوت مدرکہ کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ انسانی قوت مدرکہ محدود اور کمزور ہے۔

یہ قدرت کے قلم معجز رقم کا ایک دوسرا ٹچ ہے۔ پہلا ٹچ تو ان بلندیوں کی بابت تھا جو انسان کو نظر آتی ہیں اور یہ دوسرا ٹچ ان بلندیوں کے بارے میں ہے جو ہماری محدود نظر کے دائرۂ نظارہ سے ماوراء ہیں۔ سیاق کلام میں یہ دونوں تصاویر ایک جگہ نظر آتی ہیں۔ اب بلندی کے عمومی تصور سے نیچے آکر' تسخیر کائنات کے مضمون کو لیا جاتا ہے۔ شمس و قمر کو اللہ نے جس فضا میں مسخر کر رکھا ہے اس کو ہم دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ جس قدر ہم ان کے بارے میں جان سکے ہیں' اس میں اس نظام کی عظمت دامن فکر کو پکڑتی ہے' اور عقل کو دعوت دیتی ہے کہ یہ عظیم قوتیں اللہ عظیم کے قبضہ قدرت میں ہیں' جس کے سامنے ہم نے حاضری دینی ہے۔

پھر جس منظر کی تصویر کھینچی گئی ہے اس کے اندر بے شمار متقابل مناظر ہیں۔ ایک تو اس کائنات کی وہ بلندیاں ہیں جو نظر آتی ہیں لیکن اس کے بالمقابل وہ بلندیاں بھی ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ پھر ایک تو اس کائنات کی بلندی اور اس بلندی اور عظمت کے بالمقابل اس عظیم کائنات کی بے بسی اور تسخیر ہے' شمس و قمر کا باہم مقابلہ ہے' رات اور دن کا مقابلہ ہے اور ستاروں اور سیاروں کا باہم مقابلہ ہے۔

پھر بلندیوں اور تسخیر کائنات کے علاوہ اس کے اندر ایک ممتاز پہلو حکمت الٰہیہ کا مدبرانہ پہلو ہے۔

كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّي (۲:۱۳) "کہ ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے"۔ اس کی بلندی اور چال پھرت ایک مقرر وقت تک ہے' اور یہ وقت ایک مقرر کردہ ناموس الٰہی میں طے شدہ ہے۔ یہ وقت شمس و قمر کے دورہ یومیہ اور مدار میں چکر دونوں میں مقرر ہے۔ کسی جگہ بھی وہ اس اجل مسمی سے منحرف نہیں ہو سکتے اور وہ

وقت بھی مقرر ہے جب اس پورے نظام کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور یہ پوری کائنات ختم کر دی جائے گی۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۱۳: ۲) "اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے"۔ یعنی اس طرح کہ شمس و قمر اپنے اوقات کے مطابق اور اپنے وقت مقرر تک کے لیے ٹھیک ٹھیک جا رہے ہیں اور چلتے رہیں گے اور جو ذات باری ان عظیم الشان کرات کو اس فضائے بسیط میں یوں بغیر ظاہری سہارے کے چلا رہی ہے' اس ذات نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے اور یہ کسی صورت میں بھی وقت مقررہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ وہ ذات برتر مدبر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جلیل القدر ہے۔

اللہ کی مدبرانہ شان کا ایک مظہر یہ ہے کہ یُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (۱۳: ۲) "وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے"۔ ان کو منظم طریقے سے باہم مربوط انداز میں پیش کرتا ہے اور ہر ایک چیز کو اپنی مقررہ میعاد پر لاتا ہے۔ اسباب کے مطابق لاتا ہے اور مقاصد متعین کر کے لاتا ہے۔ یہ کیوں؟

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۱۳: ۲) "شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو"۔ کیونکہ جب ایک انسان دیکھتا ہے کہ آیات الٰہیہ مفصل اور مربوط ہیں اور ان کی پشت پر کائناتی آیات بھی موید ہیں' یہ تکوینی آیات وہ ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں اس کی تخلیق کے وقت سے ودیعت کی ہوئی ہیں اور ان قدرتی دلائل اور آثار کے ساتھ ساتھ اللہ نے کتابی آیات و دلائل بھی نازل کیے اور یوں ان کی تائید فرمائی۔ ان تمام آیات و دلائل کے نتیجے میں انسان لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے۔ وہاں انسانی اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی' ان اعمال پر ان کو جزاء و سزا دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے یہ وہ نتائج ہیں جن کا اظہار حکمت تخلیق سے ہوتا ہے۔

اب مناظر قدرت کی تصویر کشی کا یہ عظیم خط عالم بالا سے عالم زیریں کی طرف آتا ہے اور عالم زیریں کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْهٰرًا وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا

زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳: ۳) "اور وہی ہے جس نے زمین پھیلا رکھی ہے' اس میں پہاڑ کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں' اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں"۔ اس زمین کی تصویر کشی میں پہلا رنگ اس کا بچھایا جانا ہے۔ نظروں کے سامنے یہ بچھی ہوئی ہے اور طول و عرض میں یہ وسیع ہے۔ اگرچہ اس کی حقیقی شکل گول ہے' گول ہونے کے ساتھ ساتھ یہ طویل و عریض ہے۔ یہ ہے اس تصویر کشی کا پہلا رنگ۔ اس کے بعد اس تصویر میں اونچے اونچے پہاڑ نمودار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے درمیان میں نہریں نظر آتی ہیں۔ یوں اس زمین کے ابتدائی خد و خال متعین ہوتے ہیں جو اس منظر کو نہایت ہی موزوں بناتے ہیں۔

زمین کے عمومی خد و خال کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ یہاں نہایت ہی اصولی اور عمومی مظاہر کا تذکرہ ہو' زمین کے اندر زندگی کا اہم اصول اور اس زندگی کو قائم رکھنے کا اصولی مظہر یعنی حیوانی اور نباتی زندگی کے اندر مادہ اور نر کی تقسیم' حیوانی زندگی میں نر اور مادہ کا وجود تو ظاہر ہے لیکن نباتاتی حیات کے اندر نر و مادہ کا وجود صرف قرآن نے بتایا ہے' انسان حالیہ علمی ترقی سے قبل اس سے واقف نہ تھا' اور دوسرا منظر شب و روز کا نظام جو بذات خود قیام حیات کے

لیے ایک اصول ہے۔

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (۱۳ : ۳) "اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں"۔ یہ تو ہے پہلا اصولی منظر اور يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ (۱۳ : ۳) "اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے"۔ تمام ثمرات کے جوڑے کیے ہیں۔ ایک درخت میں دو قسم کے اعضاء ہوتے ہیں۔ مادہ یا نر یا بعض درخت مادہ ہوتے ہیں۔ اور بعض نر ہوتے ہیں۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو انسان کے لئے اس کائنات کے اسرار و رموز کی نشاندہی کی راہ کھولتی ہے۔ یعنی رات اور دن اور حیوانات میں نر و مادہ کے رنگ تو ظاہر ہیں پھلوں کے اندر تناسل و توالد ایک راز تھا۔

غور رات اور دن کا یہ منظر کہ رات اور دن آگے پیچھے آ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ ان کا نظام بڑا ہی عجیب اور سحر انگیز ہے۔ یہ گہرے غور و فکر کا موضوع ہے۔ رات کا آنا اور دن کا بھاگ جانا' فجر کا نمودار ہونا اور رات کے اندھیروں کا چھٹ جانا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو ہم رات اور دن دیکھتے دیکھتے اس کے ساتھ ایسے مانوس اور مالوف ہو گئے ہیں کہ ہمارے پردۂ احساس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تعجب انگیز اور حیران کن ہیں۔ اگر ہم اپنی عادت کو ذرا دور پھینک دیں اور اپنے ذہنی جمود کو ترک کر کے اس کائنات کو شاعرانہ حساسیت کے ساتھ دیکھیں اور اس رات دن کے چلتے رہنے کو ایک معمولی چیز نہ سمجھیں تو گردش ایام کا یہ نظام ایک گہری حکمت الہیہ کا پتہ دیتا ہے اور نظر آتا ہے کہ اس کے اندر صانع کائنات کی عجیب کاری گری عیاں ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳ : ۳) "ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ اس منظر کو چھوڑ کر آگے بڑھنے سے قبل' مناسب ہے کہ ہم ان تقابلی امور پر ایک نظر دوڑائیں جو اس منظر میں پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک طرف اپنی جگہ ہوئے بلند پہاڑ ہیں اور دوسری طرف بہتے ہوئے ندی نالے اور دریا ہیں۔ تمام پھلوں میں نر اور مادہ ہیں۔ رات اور دن ہیں جو ایک دوسرے کے متقابل ہیں' زمین ہے جو بچھی ہوئی ہے اور آسمان ہے جو بہت بلندیوں پر ہے' اور دونوں اس عظیم کائنات کے اہم اور باہم متقابل نکتے ہیں۔ دونوں عظیم کائنات کے اجزاء ہیں۔

یہ تو تھے اس کائنات اور ارض و سما کے عمومی خدوخال اور بڑی لکیریں۔ اب ذرا زمین کے نہایت ہی باریک خطوط اور رنگ ڈھنگ ملاحظہ کریں۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

(۱۳ : ۴) "اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہوتے ہیں۔ انگور کے باغ ہیں' کھیتیاں ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے' سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے' مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کم تر ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

یہ مظاہر قدرت ایسے ہیں کہ ہم میں سے اکثر لوگ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ان کے اندر یہ خیال بھی پیدا

نہیں ہوتا کہ وہ ان کی حقیقت معلوم کریں۔ الا یہ کہ انسان اس کائنات کی بھرپور زندگی پر غور کرے اور اپنے آپ کو اس کا حصہ سمجھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو اس کائنات سے الگ کر کے اس پر غور و فکر کرے اور اس میں مل جائے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (۱۳ : ۴) "اور زمین میں قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہوئے ہیں"۔ ان قطعات کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔ اگر یہ قطعات الگ الگ خصوصیت اور نوعیت کے نہ ہوتے تو ان کو قطعات نہ کہا جاتا بلکہ قطعہ کہا جاتا۔ یعنی ان میں بعض قطعات اچھے اور زرخیز ہیں اور بعض بنجر اور چٹیل ہیں۔ بعض صحراء میں جو بے آب و گیاہ ہیں اور بعض خالص چٹانیں ہیں۔ اور ان میں بھی پھر مختلف درجات کے ٹکڑے ہیں انواع واقسام کے۔ بعض شہروں اور آبادیوں کے لیے ' بعض جنگلوں اور سبزیوں کے لیے ' اور بعض بے آب و گیاہ اور مردہ میدان ہیں۔ اور بعض آبی ہیں اور بعض بارانی اور اس طرح قسم قسم کے ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور باہم متصل بھی ہیں اور سب کے سب اس زمین کا حصہ ہیں۔

یہ تھے زمین کی تصویر کشی کے سلسلے کے ابتدائی اور عمومی خطوط۔ اس کے بعد اب اس تصویر میں تفصیلی رنگ بھرے جاتے ہیں اور مختلف جزوی چیزیں نمودار ہوتی ہیں۔ فصل 'کھجور اور انگور۔ یہ نباتات ..... انگور وہ نباتات ہیں جو زمین پر چھتوں اور درختوں پر رینگتے ہیں۔ کھجور ان نباتات کی نمائندہ ہے جو اونچے اونچے درختوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور دوسرے فصل 'پھول اور غلے کا نمائندہ جو درمیانی شکل میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان تینوں کے ذکر سے تین قسم کے مختلف مناظر کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ یوں اس تصویر میں رنگ بھرے جاتے ہیں اور اس کے اندر مختلف نمائندہ نباتات کے نمونے دیئے جاتے ہیں۔

یہ کھجور کے درخت اکہرے بھی ہیں اور دوہرے بھی ہیں۔ یعنی بعض کا تنا ایک ہی ہے اور بعض ایک ہی جڑ سے دوہرے بھی ہیں ' دو یا اس سے زیادہ۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں ' ایک ہی مٹی ہوتی ہے لیکن سب درختوں کے پھل مختلف ہیں اور مختلف ذائقہ رکھتے ہیں۔

وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ (۱۳ : ۴) "مگر مزے میں ہم بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں"۔ ایک ہی خطے کے مختلف پھل اور نباتات ہم نے چکھے ہیں۔ ہر ایک کا ذائقہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو قرآن کریم جس نکتے کی طرف متوجہ کرتا ہے کیا کبھی ہم نے اس پر غور کیا ہے۔ ایسے ہی نکات ہیں جن کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم ایک جدید کتاب ہے۔ کیونکہ قرآن کریم انسانی احساس اور وجدان اور شعور کو پیش پا افتادہ حقائق کے بارے میں تازگی بخشتا ہے۔ خواہ یہ مناظر کائنات سے متعلق ہوں یا نفس انسانی سے متعلق ہوں۔ یہ نکات اس قدر زیادہ ہیں کہ انسان اگر پوری عمر لگا دے تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی قرآن کے نکات اور عجائبات آنے والے ادوار میں ختم ہوں گے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۳ : ۴) "بے شک اس میں آیات و نشانات ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں پھر ایک نیا تقابل پایا جاتا ہے۔ زمین کے دو ٹکڑے باہم متقابل اور مختلف قسم کے ہیں۔ کھجور کے درخت بھی اکہرے اور دوہرے باہم متقابل ہیں۔ پھر مختلف پھلوں کے ذائقے

مختلف ہیں۔اور جاتات بھی مختلف ہیں 'فصل ' درخت اور انگور۔

اس وسیع تر کائنات پر یہ سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب لوگوں پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اس کائنات اور انفس و آفاق میں پائے جانے والے دلائل اور نشانات پر غور نہیں کرتے اور ان کی عقل اس نتیجے تک نہیں پہنچ پاتی کہ اس عظیم کائنات کا کوئی خالق بھی ہے یا کوئی عظیم قوت' قدرت اور حکمت مدبرہ ایسی موجود ہے جو اسے چلا رہی ہے تو گویا ان کے عقول جمود کا شکار ہیں۔ان کے دل تنگ ہیں' اور ان کی سوچ کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ کیا یہ صورت حالات تعجب انگیز نہیں ؟

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۳ : ۵) "اگر تمہیں تعجب کرنا ہے 'تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے ؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔یہ ہے تعجب انگیز بات اور اس پر تعجب کرنا چاہئے کہ جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا؟

اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جس ذات نے اس عظیم کائنات کی تخلیق کی ہے' جو اسے موجودہ حیرت انگیز انداز سے چلا رہا ہے وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ لوگوں کو جدید شکل میں از سر نو زندہ کر دے۔اگر کوئی اس کو بعید از امکان سمجھتا ہے تو وہ اپنے خالق اور مدبر کائنات کا دراصل انکار کرتا ہے۔ ایسے لوگوں نے دراصل اپنی عقل کو قید کر رکھا ہے اور وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو سزا بھی ایسی ہی دے گا کہ ان کے گلوں میں بڑے بڑے طوق پڑے ہوں گے۔چنانچہ جب کہ ان کا عمل ایسا ہے یعنی عقل کو باندھنا' ایسی ہی سزا ہے یعنی ان کے گلوں میں بڑے بڑے طوق باندھنا۔اس لیے کہ انہوں نے اس خصوصیت انسانیہ کو معطل کر دیا ہے جس کی وجہ سے انسان دوسرے حیوانات پر مکرم ہے۔انہوں نے دنیا میں پسماندگی اختیار کر رکھی ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لیے ایسی زندگی تجویز کی ہے جو اس حیات دنیا سے بھی پسماندہ ہو کیونکہ یہ لوگ فکر و شعور اور احساس وجدان کو معطل کر کے یہاں محض حیوانات کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

یہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہین کہ اللہ ان کو ایک جدید مخلوق کے طور پر کس طرح اٹھائے گا؟ لیکن ان کا یہ تعجب ہی دراصل تعجب انگیز ہے۔یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان پر جلدی عذاب لے آئیں تو یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ وہ ہدایت کا مطالبہ کرنے اور اللہ کی رحمت کے طلبگار ہونے کے بجائے عذاب الٰہی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ (۱۳ : ۶) "اور یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں"۔یہ لوگ اس کائنات اور انفس و آفاق میں غور نہیں کرتے' حالانکہ اللہ کی نشانیاں اس پوری کائنات مین بکھری پڑی ہیں' زمین میں بھی ہیں' آسمان میں بھی ہیں۔پھر کیا یہ لوگ اس سے پہلے ہلاک ہونے والے

لوگوں کے انجام پر بھی غور نہیں کرتے جنھوں نے نزول عذاب کے لیے شتابی کی' ان پر عذاب آیا اور وہ آنے والوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ عبرت بن کر رہ گئے۔

وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ (۱۳ : ۶) "حالانکہ ان سے پہلے عبرتناک مثالیں گزر چکی ہیں"۔ اور یہ لوگ ان مثالوں پر غور نہیں کرتے حالانکہ ان میں ان کے لیے سامان عبرت تھا۔

اللہ تو اپنے بندوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔ اگرچہ وہ ایک عرصہ کے لیے ظلم کرتے ہیں' اللہ لوگوں کے لیے اپنی رحمت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے تاکہ وہ توبہ کے راستے اس میں داخل ہوں۔ لیکن عذاب صرف ان لوگوں پر نازل کرتا ہے جو عذاب الٰہی کے نزول پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ گناہوں میں گھرے جا رہے ہوں اور اللہ کے کھلے دروازے سے اندر جانے کے لیے تیار نہ ہوں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳ : ۶) "بے شک تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے"۔ یہاں سیاق کلام میں اللہ کی مغفرت کو اس کی سزا پر مقدم رکھا گیا ہے' جبکہ یہ لوگ عذاب کے مطالبے میں جلدی کر رہے تھے' اور ہدایت قبول کرنے سے انکاری تھے تاکہ معلوم ہو کہ وہ بھلائی کس قدر عظیم ہے جو اللہ لوگوں کے لیے چاہتا ہے جبکہ یہ لوگ خود اپنے لیے ایک عظیم شر چاہتے ہیں۔ اس صورت حالات کے نتیجے میں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بصیرت کے اندھے ہیں' دلوں کے اندھے ہیں اور یہ کہ وہ نار جہنم کے مستحق ہیں بوجہ اپنی ہٹ دھرمی کے۔

اس کے بعد روئے سخن اس مضمون کی طرف مڑ جاتا ہے کہ ان لوگوں کا رویہ کس قدر عجیب ہے کہ ان کو اس کائنات کے اندر بے شمار جابجا بکھرے ہوئے دلائل تکوینی تو نظر نہیں آتے' مگر یہ لوگ ایک مخصوص معجزہ طلب کرتے ہیں۔ یہ رسول اللہ سے صرف ایک معجزہ طلب کرتے ہیں اور کائنات کے ہزارہا معجزات پر ان کی نظر نہیں ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ

هَادٍ (۱۳ : ۷) "یہ لوگ جنھوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے' کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟ تم تو محض خبردار کرنے والے ہو' اور ہر قوم کے لیے راہنما ہے"۔ یہ لوگ ایک معجزہ طلب کرتے ہیں' جبکہ معجزات کا صدور رسول کے اپنے اختیار میں نہیں ہے' نہ ان کی ذاتی خصوصیت ہے۔ معجزات تو اللہ بھیجتا ہے اور اس وقت بھیجتا ہے جب اللہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اے رسول آپ تو محض ڈرانے والے ہیں جس طرح آپ سے قبل رسولوں کا منصب یہ تھا کہ وہ لوگوں کو ڈرانے والے تھے۔ اللہ نے بے شمار اقوام کی ہدایت کے لیے بے شمار رسول بھیجے ہیں۔ لہٰذا معجزات ارسال کرنا اس ذات کا کام ہے جو اس کائنات اور بندوں کا مدبر ہے۔

---ooo---

یہ تھی ایک اچٹتی سی نظر آفاق کائنات پر۔ اس پر تبصرے تھے' اب کائنات کی بعض مخصوص وادیوں میں آپ کو لے جایا جائے گا۔ مثلاً نفس انسانی' انسانی شعور و ادراک اور اس کرۂ ارض پر حیات انسانی اور دوسری زندہ اشیاء پر غور۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

"اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر' ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی' نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے"۔

جب حیات انسانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ مناظر پیش کیے جاتے ہیں تو انسانی حس اور شعور ششدر رہ جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن کے اس ترنم آمیز انداز بیان پر۔ اللہ کے علم اور اللہ کی حکمتوں کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ علوم جو جنین کے بارے میں انسان پر ظاہر ہو چکے ہیں' پھر وہ راز جو ہر انسان نے اپنے سینے میں چھپا رکھے ہیں' راتوں میں انسان کی حرکات اور دوڑ دھوپ' چھپ کر لوگوں کی سرگرمیاں اور دن کے وقت برملا لوگوں کی جدوجہد' ان تمام امور کو اللہ اچھی طرح جانتا ہے' اللہ کے گماشتے ان تمام سرگرمیوں کو ریکارڈ بھی کر رہے ہیں۔ انسان کی یہ حیرانی دراصل خوف الٰہی کی وجہ سے ہے جس کے نتیجے میں انسان اللہ کی پناہ لیتا ہے۔ وہ اللہ کی پناہ گاہ ہی میں پناہ لیتا ہے۔ ایک مومن اچھی طرح جانتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اللہ کا علم تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے' لیکن اصولی طور پر اللہ کے علم کے شمول اور وسعت کا اقرار اور بات ہے اور یہاں قرآن مجید نے جس موثر انداز میں بعض جزئیات کا ذکر کیا ہے اس کی اثر انگیزی اور بات ہے۔

محض تجریدی کلیہ کا بیان کر دینا اور بات ہے اور کلیہ کے تحت کسی مثالی جزئیہ کا مطالعہ اور بات ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ بعض جزئیات' حساس جزئیات کا ذکر فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰي وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳: ۸) "اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے"۔

ہر حاملہ سے خیال کے پردے پر ہر حاملہ' مطلق حاملہ آ جاتی ہے' اس پوری کائنات میں تمام زندہ حاملہ' وسیع معنوں میں ہر حاملہ شہروں میں اور دیہاتوں میں۔ آبادیوں میں اور پہاڑوں میں' جنگلوں میں دریاؤں میں گھروں میں اور غاروں میں' ہر مادہ کے پیٹ میں جو کچھ پیدا ہو رہا ہے' بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے' ہر وہ قطرۂ خون جو بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے' اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

یہ تو ہے ایک مخصوص مثال اور یہ کوئی تجریدی کلیہ نہیں ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور بس' بلکہ ایک مخصوص شعبہ علم کی بات ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۰) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ---

(۱۱))(۱۳: ۱۰ - ۱۱)) "تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں"۔

جب انسانی خیال پر سرگوشی کرنے والے' ہر جرأ بات کرنے والے کے بارے میں سوچ' اندھیروں میں چلنے والوں اور دن کی روشنی میں متحرک لوگوں کے بارے میں سوچ اور پھر اس پوری کائنات کے بارے میں سوچ اور پھر یہ سوچ کہ اللہ کا علم ان سب کا پیچھا کر رہا ہے اور اس کے گماشتے بھی لکھ رہے ہیں اور رات کے دونوں کناروں پر رپورٹ بھی بھیجتے ہیں۔ پھر ان جزئیات علم الٰہی کے انداز بیان پر بھی ذرا غور کیجئے :

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰي وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳: ۸) "اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے"۔

جب اللہ نے یہ فرمایا کہ رحم مادر میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اللہ اسے جانتا ہے تو اس کے آخر میں فرمایا کہ اللہ کے ہاں ہر چیز

کی مقدار مقرر ہے۔ نقص و زیادتی کے ساتھ مقدار کا لفظ لانا ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کا تعلق اس سے قبل کی اس آیت سے بھی ہے جس میں آیا ہے کہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ مرنے اور مٹی بن جانے کے بعد خلق جدید کی شکل میں لوگ کس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے۔ نیز موضوع اور ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ اس مضمون کے بھی مماثل ہے جس میں بارش کا ذکر ہے کہ بارش برستی ہے اور ہر وادی اپنی مقدار کے مطابق پانی سے بہہ جاتی ہے۔ تمام امور میں مقدار ملحوظ ہے۔ کمی بیشی اور مقدار اس سورہ کا نکتہ خاص ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳:۹) "وہ پوشیدہ اور ظاہر ہر چیز کا عالم ہے وہ بزرگ اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے"۔ لفظ کبیر اور لفظ متعال دونوں پردۂ احساس پر ایک خاص اثر چھوڑتے ہیں' اس کو میں پرتو سے تعبیر کرتا ہوں۔ کسی دوسرے لفظ سے اس کی تعبیر مشکل ہے۔ یعنی جو بھی مخلوق ہے' اس کے اندر کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتا ہے جو اسے صغیر بنا دیتا ہے۔ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو بھی ہم کبیر نہیں کہہ سکتے۔ یا کسی اور معاملے کو ہم کبیر نہیں کہہ سکتے۔ اللہ کا ذکر آتے ہی تمام دوسرے امور صغیر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح لفظ متعال کے بارے میں بھی ہماری سوچ محدود ہے۔ کسی مفسر نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا کہ الکبیر المتعال کا دائرہ اطلاق کیا ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۳:۱۰) "تم میں سے کوئی شخص زور سے بات کرے یا آہستہ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں"۔ عبارت میں تقابل واضح ہے۔ لفظ سارب قابل غور ہے۔ خود لفظ سارب اپنے مفہوم پر روشنی ڈالتا ہے۔ مفہوم ہے اخفا اور پوشیدگی یا قریب پوشیدگی۔ سارب کا مفہوم ہے روشنی میں چلنے والا یعنی خفیہ چیزوں کو بھی اللہ جانتا ہے۔ حمل جو چھپا ہوا ہے' راز جو خفیہ ہوتے ہیں' وہ شخص جو رات کے اندھیرے میں چلتا ہے پھر اللہ کے گماشتے جو نظر نہیں آتے' سارب خفیہ کے بالمقابل لفظ ہے لیکن خود اس کے اندر بھی نرمی' لطف اور اخفاء کا پرتو موجود ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۳:۱۱) "ہر شخص کے آگے پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں موجود ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں"۔ وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں' ہر آنے جانے والے کی حفاظت کرتے ہیں' جو انسانوں کو ہر وسوسہ اور ہر خلجان سے بچاتے ہیں۔ یہ اللہ کے احکام کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہاں ان نگرانوں کی کوئی تعریف و تفصیل بیان نہیں کی جاتی۔ صرف یہ تعریف ان کی یہاں ہے کہ من امر اللہ۔ جو اللہ کے حکم سے کام کرتے ہیں' ہم بھی یہاں ان کو مجمل ہی چھوڑتے ہیں کہ وہ کیا ہیں' ان کی صفات کیسی ہیں' وہ کس طرح یہ نگرانی کرتے ہیں' کہاں ہوتے ہیں' اللہ نے چونکہ اس بات کو مخفی رکھا ہے' اور اس کے اخفاء ہی سے وہ خوف پیدا ہوتا ہے جس کو یہاں پیدا کرنا مطلوب ہے۔ لہٰذا قرآن نے جس قدر کہہ دیا ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اور یہ اخفاء اور اجمال اتفاقی اور بے مقصد نہیں ہے' جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب

کے اظہار کے بارے میں کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ بات مشکل ہے کہ وہ قرآن کی پیدا کردہ ایک فضا کو ختم کر دیں کیونکہ تفصیلات دینے سے وہ تاثر ختم ہو جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳ : ۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"۔ اللہ ان کی نگرانی اپنے کارندوں کے ذریعے یوں کرتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ لوگ اپنے اندر کیا کیا تبدیلیاں لاتے ہیں اور اپنے حالات کو بدلنے کی کیا سعی کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ترقی و پسماندگی میں' عزت و ذلت میں' بلندی اور زوال میں کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک لوگ خود اپنی سوچ' اپنے شعور' اپنے اعمال اور اپنی سرگرمیوں کو بدلتے نہیں۔ چنانچہ اللہ بھی لوگوں کی سوچ اور ان کے فکر و عمل کے مطابق لوگوں کے حالات میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا ایسا کریں گے اور یہ یہ نہ کریں گے۔ عملی نتائج لوگوں کے فکر و عمل کے مطابق ہی نکلتے ہیں۔ ہاں یہ نتائج عملاً اس دور میں پیدا ہوئے جو لوگوں کی زندگی کے ساتھ متعین ہوتا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر بہت ہی بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ یہ اللہ کی مشیت کا تقاضا تھا اور اسی کے مطابق سنت الہیہ جاری و ساری ہے کہ لوگوں کے حالات لوگوں کے بدلنے پر موقوف ہوں گے۔ سنت الہیہ ان کے طرز عمل اور ان کی طرز فکر پر مرتب ہوگی۔ یہ ایک صریح نص ہے' لہٰذا اس میں کسی تاویل اور تحریف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سنت الہیہ کے تعین کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہایت ہی مکرم بنا دیا ہے کہ خود انسان کے عمل سے سنت الہیہ چلتی ہے۔

اس سنت الہیہ کے تعین کے بعد سیاق کلام بتا دیتا ہے کہ اللہ کسی قوم کو ہلاکت میں ڈالتا ہے تو سنت کیا ہوتی ہے۔ وہ بھی یہی ہوتی ہے کہ جب لوگ اپنے اندر بری تبدیلی لاتے ہیں تو پھر سنت الہیہ بھی ان کو برے دن دکھاتی ہے۔

وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ

(۱۳ : ۱۱) "اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی' نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے"۔

یہاں سیاق کلام زوال کا یہ پہلو اس طرح بیان کرتا ہے کیونکہ یہاں موضوع و مضمون ایسا ہے کہ لوگ اچھائی سے زیادہ برائی کے طلبگار ہیں۔ جبکہ اللہ نے ان کو بتایا کہ وہ عذاب سے قبل تمہاری مغفرت کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ کس قدر غافل ہو گئے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے انجام بد کا ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ ڈریں اور عقل کے ناخن لیں کیونکہ اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور جب تمہاری ہلاکت کا فیصلہ آ گیا تو پھر کوئی تمہارا حامی و مددگار نہ ہو گا۔

---ooo---

اب سیاق کلام ہمیں ایک دوسری وادی میں لے جاتا ہے۔ یہ وادی بھی اس کے ساتھ متصل اور مربوط ہے جس

میں ہم ابھی گھوم رہے تھے - یہ وادی وہ ہے جہاں طبعی مناظر اور نفس انسانی کے شعور کے مناظر باہم ملتے ہیں - اس وادی کے مناظر طبیعی' ان کا پرتو اور ان کے اثرات انسانی شعور کی تصویر میں باہم جمع ہو جاتے ہیں - خوف' ڈر' جدوجہد' امید اور خوف باہم ملے ہوئے ہیں اور انسانی شعور اس وادی میں مختلف تاثرات لیتا ہے -

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۬ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

"وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں - وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے - بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں - وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسااوقات) انہیں جس پر چاہتا ہے عین اس حالت میں گرا دیتا ہے جبکہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں - فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے -

اسی کو پکارنا برحق ہے - رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں - انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو

میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں - بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف! وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعا و کرھا سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں -

ان سے پوچھو' آسمان و زمین کا رب کون ہے؟--- کہو' اللہ - پھر ان سے کہو کہ حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرا لیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو' کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟--- کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے' سب پر غالب!"

چمک' گرج اور بادل عام مناظر ہیں - اسی طرح بعض اوقات ان مناظر میں سے برق بھی گرتی ہے - یہ وہ مناظر ہیں جو ہر انسان کو متاثر کرتے ہیں چاہے کوئی ان کی طبعی حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو' یہاں قرآن مجید ان کو پیش کرتے ہوئے' ان کے ساتھ ملائکہ' تسبیح' سجود' خوف' طمع اور ان مشاہد کے سائے کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس بات کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ سچی پکار کیا ہے اور باطل اور ناحق پکار کیا ہے - ان مناظر میں ایک دوسرے شخص کی شکل یوں پیش کی جاتی ہے جو پانی پینا چاہتا ہے لیکن اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا' بلکہ ہاتھ کھول کر اور منہ کھولے ہوئے یہ تمنا کرتا ہے کہ پانی خود بخود اس کے منہ میں پڑ جائے' جبکہ وہ پڑنے والا نہیں' ایک قطرہ بھی -

یہ تمام مناظر' مثالیں اور اشیاء اس آیت میں محض اتفاقاً اور بے مقصد جمع نہیں کر دی گئیں' ان سب چیزوں کا دراصل مدعا سے تعلق ہے - بلکہ یہ مناظر انسان کو ڈرانے' امید، بیم اور طمع اور خوف اور نفع و نقصان کی امید دلانے اور اللہ کے ساتھ انسانوں نے جو دوسرے شریک ٹھہرا رکھے ان کی قوت کی نفی کے لیے لائے گئے ہیں -

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا (۱۳ : ۱۲) "وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں" - اللہ وہ ذات ہے جو تمہیں یہ تکوینی مظاہر دکھاتا ہے - یہ اس کائنات کے طبیعی اور موسمی مظاہر ہیں جسے اس نے پیدا کیا ہے اور اس خاص انداز پر اس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور یہ خواص ان اشیاء کے اندر پیدا کیے ہیں - وہ بجلی جو اللہ تمہیں دکھاتا ہے' یہ اس کے قانون قدرت کے مطابق کام کرتی ہے - تم اس سے ڈر بھی جاتے ہو کیونکہ اس کی ماہیت ہی ایسی ہے جو اعصاب کو ہلا مارتی ہے - کبھی کبھی یہ بجلی برق بن کر بھی گرتی ہے اور خوفناک شکل میں تباہی بھی مچاتی ہے - جیسا کہ بارہا تم کو یہ بھی ہوا ہو گا - تم اس چمک اور بجلی کے بعد باران رحمت کے امیدوار بھی ہوتے ہو' کیونکہ اس چمک اور گرج کے بعد بعض اوقات موسلادھار بارش ہوتی ہے اور مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے -

وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳ : ۱۲) "وہی ہے جو بارش سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے" - بادلوں کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے - سحاب ---- اس جنس کا واحد سحابہ ہے جو بادل کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں - ثقال سے مراد وہ بادل ہیں جو بارش کی وجہ سے بوجھل ہیں - یہ بادل اللہ کے پیدا کردہ ناموس فطرت کے مطابق پیدا

ہوتے ہیں اور موسلادھار بارشیں برساتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ قانون قدرت اس طرح نہ وضع کرتا تو نہ بادل ہوتے اور نہ یوں بارشیں ہوتیں۔ یہ کہہ کر کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارشیں کس طرح برستی ہیں' ان کی علمی اور سائنسی کیفیت معلوم ہونے سے ان کی خوبصورتی اور سحر آفرینی میں کوئی کمی نہیں آتی۔ نہ اس سے اس مفہوم میں فرق پڑتا ہے جو قرآن کریم نے اخذ کیا ہے۔ کیونکہ یہ تمام کام اور عمل صرف اللہ کے پیدا کردہ تکوینی نظام کے مطابق ہوتا ہے' اس میں کسی انسان کی صنعت کاری کا کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ انسانوں کا اس پورے نظام میں کوئی دخل دعمل ہے۔ یہ تکوینی اور طبیعی قواعد جن کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے نہ خود کائنات نے پیدا کیے ہیں اور نہ خود بخود چل پڑے ہیں' اس میں جو کچھ بھی چل رہا ہے ایک خالق مطلق کی وجہ سے چل رہا ہے۔

رعد' باد' باراں کے مناظر میں ایک خاص منظر ہوتا ہے۔ یہ طویل اور کڑاکے کی آواز۔ یہ بھی اس کرۂ ارض کے قوانین قدرت کا ایک مظاہرہ ہے اور اللہ کی صنعت کاری ہے۔ اس کا سائنسی تجزیہ جو بھی ہو' اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اللہ کی تخلیق کا ایک حصہ ہے۔ یہ حمد و تسبیح اس معنی میں کرتا ہے کہ یہ اس قانون قدرت کے مطابق رواں دواں ہے جس کے مطابق اللہ نے یہ نظام بنایا ہے' جیسا کہ ہر خوبصورت بنائی ہوئی چیز کو دیکھ کر بنانے والی کی حمد و ثنا بے ساختہ ہوتی رہتی ہے اور اس کی مصنوعہ چیز کے آثار اور جمال اور افادیت کو دیکھ کر ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔ اسی طرح اس کائنات کے اندر پائے جانے والے کمالات اور حیرت انگیز افادیت کی چیزوں کو دیکھنے سے بے ساختہ اللہ کی تسبیح زبان پر آ جاتی ہے۔ تسبیح کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے اور رعد تو خود ہی پکار رہی ہے اور تسبیح کر رہی ہے۔ بہرحال ہم ان چیزوں کی تسبیح کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے اور نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم ان حقائق پر ایمان لاتے ہیں۔ خود اپنے بارے میں بھی ابھی تک ہم کم ہی جانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہم یہ بھی معلوم کر لیں کہ یہ چیزیں کیسے تسبیح کرتی ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے رعد کے بارے میں ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ گویا رعد ایک زندہ مخلوق ہے اور وہ تسبیح کر رہی ہے' قرآن کریم کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ مناظر قدرت کو آثار زندگی سے مزین کر دیتا ہے حالانکہ یہ مناظر قدرت خاموش ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اس پورے منظر میں تمام دوسرے مناظر زندہ ہیں جیسا کہ میں نے اپنی کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں تفصیلات دی ہیں۔ اس منظر میں چونکہ زندہ چیزوں کے مناظر ہیں مثلاً تسبیح کر رہے ہیں۔ اللہ کو پکارنا' شرکاء کو پکارنا اور یہ منظر کہ ایک آدمی پانی کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے کہ وہ خود بخود منہ میں پڑ جائے جبکہ وہ پڑنے والا نہیں ہے' تو ایسے مناظر جن میں ایک طرف پکار' بندگی اور حرکت ہے' رعد کو بھی زندہ تصور کر کے تسبیح اور دعاء کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔

اب اس منظر کو ذرا مزید خوفناک بنایا جاتا ہے' خوف' دعاء' برق اور رعد اور بھاری بادل اور باد و باراں کے ساتھ اب بجلیاں بھی گرتی دکھائی دیتی ہیں' اور کسی بیچارے پر برق گرتی ہے۔ یہ بجلی جس طرح گرتی ہے وہ اس کائنات کے قدرتی نظام کا حصہ ہے۔ بعض اوقات یہ برق ایسے شخص پر گر جاتی ہے جسے اللہ مزید مہلت دینا نہیں چاہتا کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کو اب مہلت دینا مناسب نہیں لہٰذا بعض لوگ اس برق کے ذریعے ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔

اور تعجب انگیز بات یہ ہے کہ رعد و برق اور طوفان باد و باراں کی اس فضا میں' اور رعد اور برق کی جانب سے تسبیح اور ملائکہ کی جانب سے حالت خوف میں اظہار اطاعت' اور اللہ کے ان غضبناک مظاہر قدرت کے عروج کی حالت میں بھی

بعض لوگ ایسے ہیں جو خود ذات باری کے متعلق شبہات کا اظہار کرتے ہیں' اللہ کے بارے میں مجادلے اور مباحثے کرتے ہیں۔حالانکہ اللہ کی قدرت کے مظاہر بلکہ خوفناک مظاہر وہ خود چشم سر دیکھ رہے ہیں۔

وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳:۱۳) "یہ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ اس کی چال بڑی زبردست ہے"۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو ذات باری میں کلام کرتے ہیں لیکن اس ہولناک فضا اگریہ وزاری اور رعد اور برق' چیخ اور دھاڑ اور اس ہنگامہ خیز فضا میں جس کی تمام چیزیں وجود باری پر دلالت کرتی ہیں ایسے چند لوگوں کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔کیونکہ اس کائنات کے تمام قابل ذکر مناظر اللہ کی وحدانیت' اللہ کی تسبیح و تہلیل پر دلیل ناطق ہیں' پھر فرشتوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہر وقت اللہ کے خوف کے مارے کانپتے رہتے ہیں' لہٰذا ان مناظر کی موجودگی' اور ان فرشتوں کے خوف اور تمام انسانوں کے خوف کی اس فضا میں اللہ کے بارے میں کلام کرنے والوں کی بات شاذ و نادر ہے اور بے محل ہے۔

یہ لوگ اللہ کے بارے میں کلام کرتے ہیں' مثلاً یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ وحدہ حق ہے اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے' زائل ہونے والا اور فانی ہے۔اس فانی کو جو بھی پکارے گا' لاحاصل پکار رہا ہے گا۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ

(۱۳:۱۴) "اسی کو پکارنا برحق ہے۔رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف؟"

یہ منظر بھی بولتا منظر ہے' متحرک اور پرمعنی۔حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی پکار حق ہے' اور وہی اس بات کی مستحق ہے اور حقیقت پسندانہ ہے اور اس کے سوا جو پکاریں بھی ہیں وہ باطل' بے فائدہ اور گمراہانہ ہیں۔کیا تم ذرا غور نہیں کرتے کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں ان میں سے ایک شخص کی مثال ایسی ہے کہ وہ پیاسا ہے اور پیاس کی وجہ سے نڈھال ہو رہا ہے' اس نے بازو پھیلا رکھے ہیں' ہاتھ کھول رکھے ہیں' منہ کھلا ہے اور مسلسل پکار رہا ہے کسی کو' اپنے سامنے موجود پانی کو' لے پانی میرے منہ میں آکر پڑ جا۔حالانکہ وہ پڑنے والا نہیں ہے۔یہ شخص اس پکار اور جدوجہد میں تھک کر چور ہو جاتا ہے اور اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۱۳:۱۴) حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف؟ یہ مثال اس فضا میں دی گئی ہے کہ

ایک پیاس سے نڈھال آدمی ایک قطرۂ آب بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسی فضا میں جس میں ہر طرف برق اور باد و باراں کا طوفان ہے اور یہ تمام خوفناک مناظر اللہ کے قانون قدرت کے مطابق متحرک ہیں۔

جس وقت یہ ناکام اور غلط کار لوگ اللہ کے سوا دوسرے الہوں کو پکارتے ہیں ' غیر اللہ سے امید رکھتے ہیں اور غیر اللہ کے سامنے دست بدعاء ہوتے ہیں ' یہ پوری کائنات اور اس کی ہر چیز اللہ کے سامنے سربسجود ہوتی ہے ' یہ سب لوگ اور یہ سب مخلوق اللہ کے حکم کے تابع ہے اور اللہ کے قانون قدرت میں جکڑی ہوئی ہے۔ اللہ کی سنت کے مطابق چل رہی ہے۔ اس مخلوق میں سے جو مومن ہے وہ خوشی اور مرضی سے اطاعت کرتا ہے اور جو کافر ہیں وہ بھی کرھا اطاعت کرتے ہیں کیونکہ کوئی چیز ارادۂ الہی سے نہیں نکل سکتی اور نہ کوئی چیز ناموس الہیہ سے نکلتی ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (۱۵) السجدہ "وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرھاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں"۔ کیونکہ یہ فضا ہی عبادت اور بندگی اور پکار کی فضا ہے۔ سیاق کلام میں قرآن اللہ کے احکام بجا لانے کو لفظ عبادت سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ سجدے میں انسان غایت درجہ خشوع اور اطاعت اختیار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آسمانوں اور زمین کی مخلوق کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کائنات کی تمام چیزوں کے سائے کو بھی اللہ کا مطیع کہا گیا کہ ان چیزوں کے سائے بھی اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ گویا وہ اللہ کی عبادت اور بندگی کرتے ہیں کیونکہ یہ اطاعت الہیہ سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے اور وہ قانون قدرت کے یوں تابع ہیں جس طرح وہ شخص تابع ہوتا ہے جو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ یہ تمثیل بھی ہے اور حقیقت بھی ہے کیونکہ سایہ سورج کی کرنوں کے تابع ہوتا ہے۔ اس تمثیل کا اس منظر کی فضا پر بھی اثر پڑتا ہے گو سجدے بھی دو قسم کے ہیں۔ افراد کے سجدے اور سایوں کے سجدے۔ اور یہ پوری کائنات بھی اللہ کے تابع فرمان ہے۔ چاہے راہ ایمان سے تابع ہو یا غیر ایمان یعنی قانون قدرت کے ذریعے۔ سب کی سب کائنات بہرحال سربسجود ہے۔ اور یہ بدبخت مشرک ایسے ہیں جو ان حالات میں بھی غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

اس عجیب و غریب منظر اور اس پر تاثیر فضا میں اب ان سے پوچھا جاتا ہے ' ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کا جواب ہاں کے سوا کچھ نہیں اور یوں ان کو اضحوکہ بنایا جاتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۳ : ۱۶) "ان سے پوچھو ' آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ — کہو ' اللہ۔ پھر ان سے کہو کہ حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرا لیا جو خود

اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟۔۔۔کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے 'سب پر غالب!''

ان سے پوچھو اور حال یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کے ارادے اور اللہ کی قدرت سے ماخوذ ہے۔ اللہ کی قدرت میں بندھا ہوا ہے خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو۔ یہ پوچھ کہ کون ہے رب السموات والارض؟ یہ سوال اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ کوئی جواب دیں اس کا جواب تو سیاق کلام میں آگیا ہے۔ یہ سب اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اقرار کر لیں۔ جواب تو یہی ہے کہ ''اللہ'' ہے۔ پھر دوسرا سوال یہ کہ تم جن کو پکارتے ہو کیا وہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک ہیں۔ یہ سوال بھی محض ان کی گوشمالی اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ تم سوال کرتے جاؤ' جبکہ یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ حق و باطل میں امتیاز ہو چکا ہے۔ اس قدر امتیاز ہو چکا ہے کہ جس طرح اندھے اور صاحب بصارت میں فرق ہے یا جس طرح روشنی اور تاریکی میں فرق ہے۔ اعمٰی اور بصیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایک مومن بصیر ہوتا ہے اور ایک کافر اندھا ہوتا ہے۔ کیونکہ اندھا پن ہی انسان کو سچائی کے دیکھنے سے روکتا ہے حالانکہ یہ سچائی ظاہر و باطن ہے۔ اور اس کے آثار زمین و آسمان میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ظلمات اور نور کے تذکرے سے بھی منکرین کے حالات اور مومنین کے حالات کی طرف اشارہ ہے۔ اندھیرا دیکھنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور ان کی حالت بھی یہ ہے کہ ان کے اور سچائی کے درمیان پردے حائل ہیں۔

اہم سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہستیاں جن کو یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں انہوں نے کوئی مخلوق پیدا کی ہے جس طرح کی مخلوقات اللہ تعالیٰ نے پیدا کی۔ اس طرح ان کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ شاید یہ بھی خالقیت میں شریک ہیں یا ان کو شبہ ہو گیا کہ کون سی مخلوق اللہ کی ہے اور کون سی مخلوق ان ہستیوں کی ہے۔ یوں وہ بیچارے معذور ہیں اور یوں اس غلطی کا ارتکاب ممکن ہے کہ انہوں نے اللہ کی ذات و صفات میں ان دوسروں کو شریک کر لیا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ ہستیاں صفت خالقیت میں شریک تھیں لیکن اگر کسی اور کی کوئی مخلوق ہی نہیں ہے تو پھر شرکت چہ معنی دارد۔

یہ اس قوم کے ساتھ ایک مذاق ہے کہ جو دعویٰ تو یہ کرتی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک خالق ہے اور پھر دوسروں کو اللہ کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتی ہے۔ حالانکہ یہ ٹھہراتے ہوئے شریک خود ان کے قول کے مطابق بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو الٰہ بھی مانتے ہیں' ان کی بندگی بھی کرتے ہیں' لہٰذا فکر و نظر و عقل و بصیرت کا یہ نہایت ہی گھٹیا نمونہ ہے۔

اور اس حقارت آمیز مذاق کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے جس میں کوئی کلام اور مجادلہ کی گنجائش نہیں ہے۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۳:۱۶) ''کہو' ہر چیز کا خالق اللہ ہے' وہ یکتا اور سب پر غالب ہے''۔ یعنی تخلیق میں بھی وہ واحد اور یکتا ہے۔ غلبے اور زبردستی میں بھی وہی یکتا ہے۔ قہار کے معنی ہیں انتہائی درجے کا غالب حکمران۔ عقیدۂ توحید اور رد شرک کو یہاں یوں احاطہ کیا جاتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہیں' خواہ کوئی چیز خوشی سے سجدہ کرے (انسان) یا مجبوری سے اور اس سبق کے

آخر میں اللہ کی قہاریت کا ذکر کر کے مسئلہ توحید کو یوں بیان کیا گیا کہ اللہ ایسا حکمران ہے جو غایت درجہ غالب اور گرفت والا ہے - زمین و آسمان کی سب چیزیں اس کی مطیع فرمان ہیں جیسا کہ رعد و برق اور کڑک سب کی سب اللہ کی تسبیح کرنے . سا ہیں - ایسے حالات میں کوئی اندھا یا پتھر دل انسان ہی ہو سکتا ہے جو اللہ کا خوف نہ محسوس کرے اور ایسے شخص کی قسمت میں ہلاکت اور بربادی ہی ہے -

قبل اس کے کہ ہم اس سبق پر بات ختم کریں ضروری ہے کہ طرز ادا کے حوالے سے ہم بعض متقابل امور پر غور کریں - مثلاً گرج و چمک اور بھاری بادلوں کے اندر خوف اور امید کا ذکر ہے' جو متقابل ہیں - سحاب کے ساتھ ثقال کا ذکر ہے اور ثقل کی وجہ سے وہ دھیمی رفتار سے چلتے ہیں جبکہ چمک اور برق نہایت ہی تیز رفتار ہوتی ہے - یہ دونوں مفہوم بھی باہم متقابل اور متضاد ہیں - رعد کی تسبیح اللہ کی حمد کے ساتھ ہے اور ملائکہ کی تسبیح خوف کے ساتھ ہے - یہ دونوں بھی باہم متقابل مفہوم ہیں - دعوت حق اور دعوت باطل دونوں متقابل مقاصد ہیں - زمین و آسمان بھی باہم متقابل ہیں' سجدۂ رضا و مجبوری' طوعاً و کرھاً بھی باہم متقابل مفہوم ہیں - افراد اور ان کے سائے' صبح و شام' اعمیٰ و بصیر' ظلمات اور نور' خالق حقیقی اور شرکائے عاجزین' جو نفع و نقصان کا مالک ہے اور ان کے شرکاء کسی چیز کے مالک نہیں ہیں - اس طرح اس پورے سبق میں باہم متضاد اور متقابل امور کا ذکر کر کے حق و باطل کو سمجھایا گیا ہے - اور یہ نہایت ہی خوبصورت طرز ادا ہے اور ہے بھی عجیب و غریب ہم آہنگی کے ساتھ -

اب ہم ذرا مزید آگے بڑھتے ہیں - اللہ حق و باطل کی ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں - ایک دعوت حق ہے جو ہمیشہ زمین پر باقی رہتی ہے اور ایک دعوت باطل ہے جو ادھر چلتی ہے جدھر ہوا کا رخ ہو - ایک بھلائی ہے جو پروقار اور جمی رہتی ہے - ایک شر اور برائی ہے جو پھلتی پھولتی نظر آتی ہے - یہاں جو مثال دی جا رہی ہے وہ اللہ واحد اور قہار کی قوت اور گرفت اور غلبے کو بتاتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اللہ خالق اور مدبر نے ہر چیز کو کس اندازے اور ضرورت کے مطابق پیدا کیا ہے - یہ مثال بھی انہی مناظر قدرت کی ہم جنس ہے جو اس سبق کا موضوع خاص ہیں -

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

"اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا - پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے - اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں - اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے - جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے - اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے" -

پانی کا نزول اور ندی نالوں کا اس کے ساتھ بہہ نکلنا ایک ایسا مفہوم ہے جو برق اور رعد اور بادلوں کے ساتھ ہم معنی و ہم جنس ہے۔ سابق منظر میں رعد و برق اور سحاب ثقال کا ذکر تھا۔ دونوں اس کائنات کے عام مناظر فطرت کا حصہ ہیں۔ اس سورہ کا پیشتر موضوع اور مضمون انہی کے گرد گھومتا ہے۔ اور ان مناظر سے اللہ واحد اور قہار کی قدرت ' غلبے اور گرفت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ندی نالے اپنی مقدار کے مطابق بہہ نکلتے ہیں ' ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق۔

اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک مقدار مقرر کر رکھی ہے۔ ہر نالے اور ندی کے لیے بھی پانی کی مقدار مقرر ہے۔ یہ اللہ کی شان مدبرانہ ہے ' جو اس سورہ کا موضوع خاص ہے۔ تمثیل کا یہ دائرہ اور موضوع اور منظر وہی ہے جو پیش پا افتادہ ہے اور جس کو رات اور دن لوگ دیکھتے رہتے ہیں یہ منظر ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے لیکن یہ اندھوں کی طرح اس پر کوئی غور نہیں کرتے اور نہ یہ مناظر ان کے دامن کش ہوتے ہیں۔

ہماری نظروں کے سامنے پانی برستا رہتا ہے ' ندی اور نالے بہتے رہتے ہیں اور اس دنیا کے خس و خاشاک کو ساتھ بہا کر لے جاتے رہتے ہیں۔ ان ندی نالوں پر جھاگ بھی اٹھتی رہتی ہے ' اس قدر کہ بعض اوقات پانی چھپ جاتا ہے۔ اور جھاگ کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس جھاگ کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ' اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اور پانی جو جھاگ کے نیچے قائم رہتا ہے اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ نہایت سکون کے ساتھ لگا بندھا۔ پھر یہ پانی اپنے اندر ایک افادیت رکھتا ہے۔ خیر ہی خیر اور زندگی اور شادابی۔ یہی صورت ان دھاتوں اور خزانوں کی ہوتی ہے جنہیں پگھلایا جاتا ہے۔ اس سے مصنوعات بنتی ہیں ' آلات بنتے ہیں اور انسانوں کی حیات کے لیے ممد ثابت ہوتے ہیں مثلاً لوہا ' تانبا اور سیسہ وغیرہ۔ ان پر بھی جھاگ اٹھتی ہے جو بیکار ہوتی ہے اور جسے پھینک دیا جاتا ہے اور جو صاف چیز ہوتی ہے وہ نیچے رہ جاتی ہے۔ جب جھاگ اڑ جاتی ہے تو اصل چیز نیچے سے نمودار ہوتی ہے۔

دنیا کی زندگی میں حق و باطل کی یہ مثال ہے۔ باطل کا یہ منظر اور منظر بسا اوقات سامنے آتا ہے وہ بلند ہوتا ہے ' پھولتا ہے ' دوڑتا بھاگتا ہے۔ اس کا بہت غلو نظر آتا ہے۔ لیکن یہ باطل جھاگ کی طرح ہوتا ہے یا گندے اور خبیث مادے کی طرح ہوتا اور فضلے کی طرح پھینک دیا جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نہ ٹھوس حقیقت ہوتی ہے اور نہ اس کے اندر ٹھہراؤ اور جماؤ ہوتا ہے جبکہ حق ہمیشہ پروقار ' ٹھہرا ہوا اور جما ہوا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ جم گیا ہے ' اس میں جمود ہے ' بلکہ یہ ختم ہو گیا ہے۔ اس کا سکون موت کی علامت ہے۔ لیکن حق ہمیشہ دنیا میں باقی رہتا ہے جس طرح پانی باقی رہتا ہے اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے اور جس طرح پگھلا ہوا مواد اپنی اصل حالت میں باقی رہتا ہے اور لوگوں کو نفع دیتا ہے اور اس کی جھاگ یا فضلہ ختم ہو جاتا ہے اسی طرح حق قائم رہتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳ : ۱۷) "اسی طرح اللہ مثالیں دیتا ہے"۔ اسی طرح اللہ ہر دعوت اور ہر تحریک کا انجام مقرر کرتا ہے ' ہر نظریہ اور اس کے احیاء کی جدوجہد کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اللہ لوگوں کے اعمال و اقوال کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ وہ مدبر کائنات ہے۔ واحد حاکم اور قہار ہے۔ وہ حق و باطل کی کشمکش کا بھی مدبر ہے اور اس نے یہ قانون قدرت وضع کیا ہے کہ آخر کار باطل نے زائل ہونا ہے اور حق نے غالب آنا ہے۔

لہٰذا یہ بات پلے باندھ رکھو کہ جن لوگوں نے حق پر لبیک کہا ان کا انجام اچھا ہو گا۔ اور جن لوگوں نے دعوت حق کا

انکار کر دیا وہ ایک نہایت ہی خوفناک اور ہولناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہو گی کہ اگر ان میں سے کوئی پوری زمین اور آسمانوں کا مالک ہو تو وہ اس دن کے عذاب سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بالکل تیار ہو گا' لیکن اس کے پاس زمین و آسمان کہاں ہوں گے کہ وہ دے سکے۔ ان کا حساب تو رسوا کن ہو گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور کیا ہی برا ٹھکانا ہو گا۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰىؔ ۚ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ڏ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ؀۱۸ۧ

۲ ع ۱۱ ۸

"جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی ان کے لیے بھلائی ہے' اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے' بہت ہی برا ٹھکانا"۔ یہاں دعوت حق کو قبول کرنے والوں کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو قبول نہیں کرتے اور حسنہ کے مقابلے میں سوء الحساب ہے۔ اور جنت کے مقابلے میں بئس المھاد ہے۔ اور یہ تقابلی انداز کلام اس پوری سورہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۱۳ ایک نظر میں

اس سورہ کے حصہ اول میں موضوع تھا اس کائنات کے آفاق اور عالم غیب کی گہرائیاں اور نفس انسانی کے عجائبات اور گہری انسانی نفسیات اور ان پر غور۔ اس دوسرے حصے میں انسانی وجدان کے محسوسات' انسانی عقل کے اخذ کردہ نتائج اور نہایت ہی لطیف اور گہری سوچ' خصوصاً رسالت' منصب رسالت اور وحی الہی کے بارے میں حقائق' عقیدۂ توحید اور رد شرک' لوگوں کی نادانی اور معجزات کا مطالبہ اور وقوع قیامت میں جلدی۔ مسائل وہی ہیں جو پہلے حصے میں تھے' البتہ سفر ایک دوسری وادی میں ہے یعنی وادی عقل و خرد میں۔

اس حصے میں سفر کا آغاز وادی کفر و ایمان میں ہوتا ہے۔ کفر کی وادی میں اندھیری رات جیسی تاریکی ہے جبکہ وادی ایمان میں روز روشن کی طرح روشنی ہے۔ ایک میں علم ہے اور دوسری میں تاریکی اور جہالت ہے۔ اس کے بعد روئے سخن کافرین کی خصوصیات و علامات اور مومنین کی صفات اور مزاج کی طرف پھر جاتا ہے اور پھر مشاہد قیامت میں سے ایک منظر سامنے آتا ہے جس میں اہل جنت کے انعامات اور اہل جہنم کے عذاب کا ذکر ہے۔ درمیان میں رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی کے موضوع پر بھی بات ہوتی ہے اور دونوں حالات کسی کو اللہ کی مشیت کے مطابق پیش آتے ہیں۔ ایک جھلک ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جن کے دل ذکر الہی کے ساتھ مطمئن ہیں۔ پھر قرآن کریم کے اوصاف اور اس کی قوت کا ذکر' قریب ہے کہ اس سے متاثر ہو کر پہاڑ چل پڑیں' قریب ہے کہ زمین مارے خوف کے پھٹ پڑے اور قریب ہے کہ مردے بھی بات کرنے لگیں۔ پھر وہ عذاب اور مصائب جو کفار کو درپیش ہوتے ہیں یا ان کے علاقوں کے قریب ہی دوسری اقوام پر نازل ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ عبرت نہیں لیتے۔ پھر مزاحیہ انداز کلام ان کے الہوں کے بارے میں' پھر قدرے ان اقوام کی وادی میں سیر جن کو ہلاک کیا گیا اور جن کے مقامات اور مصارع ان کے پاس ہی ہیں۔ آخر میں ان کو اس انجام سے ڈرایا جاتا ہے جو ان کے لیے بے چینی سے انتظار کر رہا ہے کیونکہ وہ رسول برحق کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اچھا چلو اس انجام معلوم کی طرف اگر نہیں مانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حصہ اول میں عقل و خرد کو جھنجوڑنے کے لیے جو ضربات لگائی گئی تھیں گویا اس دوسرے حصے میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اب عقل نے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ انسانی عقل کے دروازے قدرے کھل گئے ہیں اور انسان نے دعوت اسلامی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ لہذا سورہ کے ان دونوں حصوں میں باہم ربط ہے۔ یعنی اس سورہ کے دونوں حصے انسانی عقل و کر دکی تاروں کو چھیڑ رہے ہیں تاکہ انسانی احساس اور عقل کام کریں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۱۳ تشریح آیات

۱۹ --- تا --- ۴۳

اس حصے میں پہلا مسئلہ 'مسئلہ وحی الہی ہے ـ اس سورہ کے آغاز میں بھی اسے چھیڑا گیا تھا ـ یہاں دوبارہ اس پر غور کیا جاتا ہے 'نہایت ہی جدید انداز میں ـ

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے 'دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں"۔

یہاں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اس بات پر یقین کرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ حق ہے اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو یقین نہیں کرتے جو جانتے نہیں بلکہ ان کے بالمقابل جو لوگ ہیں وہ اندھے ہیں ـ قرآن کریم کا یہ نہایت ہی پیارا 'موثر اور دل میں بیٹھ جانے والا انداز ہے کہ وہ کسی شخص یا کردار یا رویے کو مجسم شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ تجسیم اور تمثیل بجائے خود حقیقت 'سچی اور بلا مبالغہ بھی ہوتی ہے مثلاً یہاں مخالفین کو اندھا کہا گیا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس واضح اور ظاہر و باطن حقیقت کو جو شخص نہیں دیکھتا وہ اندھا ہی ہو سکتا ہے ـ اس حقیقت کے سامنے اس کے حوالے سے لوگوں کی دو اقسام ہیں ـ ایک گروہ دیکھنے والا ہے تو وہ سمجھتا ہے ـ دوسرا اندھوں کا گروہ ہے اور وہ جاہل ہے ـ بعض اندھے پن سے مراد آنکھوں کا اندھا نہیں ہے بلکہ دل کا اندھا ہے ـ مطلب اس شخص سے ہے جس کی قوائے مدرکہ بجھ گئی ہوں 'جن کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہوں اور جن کی روح آتش معرفت سے محروم ہو گئی ہو اور ان کے دلوں میں معرفت الہی کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی ہو ـ

اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُو الْاَلْبَاب (۱۳ : ۱۹) "نصیحت تو دانش مند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں"۔ وہ لوگ جن کے دل و دماغ میں قوت ادراک ہو اور جن کو سچائی کی یاد دہانی کرائی جائے تو وہ اس یاد دہانی اور نصیحت کو قبول کریں اور اگر ان کے سامنے حق کے دلائل پیش کیے جائیں تو وہ ان پر غور و فکر کرتے ہوں ـ اولوالالباب کی اعلیٰ اور اہم صفات

یہ ہیں :

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

"اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے"۔ اللہ کا عہد مطلق ہے' اس سے وہ تمام عہد مراد ہیں جو اللہ کے ہیں اور میثاق بھی مطلق ہے اور اس سے مراد بھی وہ تمام میثاق ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے گئے۔ سب سے بڑا عہد' عہد ایمانی ہے کیونکہ دوسرے تمام عہد اس کا نتیجہ اور اس کے تقاضے ہیں۔ سب سے بڑا میثاق یہ کہ ہم ایمان کے تقاضے پورے کریں گے۔

عہد ایمان قدیم بھی ہے اور جدید بھی ہے۔ قدیم عہد وہ ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ مربوط ہے اور اس کا تعلق ناموس کائنات سے ہے' جس کے مطابق یہ پوری کائنات چلتی ہے اور فطرت انسانی براہ راست اس واحد ارادے کا ادراک کر لیتی ہے جس سے یہ کائنات پیدا ہوئی اور اس بات کا یقین کرتی ہے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے اور وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ یہ فطری میثاق وہ ہے جو تمام انسانوں سے لیا گیا ہے جبکہ وہ آدم کی پشت میں تھے' اپنے محل پر ہم نے عہد الست کی یہی تفسیر پسند کی ہے۔ پھر اس عہد کی تجدید رسول اللہ کے دور میں ہوتی ہے جن کو اللہ نے امتوں کے لیے بھیجا اس لیے نہیں کہ وہ کوئی جدید عہد لیں بلکہ اس لیے کہ وہ یاد دہانی کرائیں اسی عہد الست کی اور اس کی تفسیر اور تشریح لوگوں کے سامنے کریں۔ وہ لوگوں کو بتائیں کہ اس عہد کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اللہ کے سوا تمام دوسروں کی بندگی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکیں اور عمل صالح اور راہ راست پر چلنے کا مضبوط رویہ اختیار کریں۔ ہر معاملے میں اللہ وحدہ کی طرف رجوع کریں جس کے ساتھ انسانوں نے اصل عہد کیا ہوا ہے۔

اس عظیم عہد الٰہی کے حکم ہی میں بعد میں آنے والے عہد ہیں' خواہ وہ عہد و میثاق انسانوں کے ساتھ ہو۔ رسولوں کے ساتھ ہو' عوام الناس کے ساتھ ہو' قریب کے رشتہ داروں کے ساتھ ہو' امراء کے ساتھ ہو یا جماعتوں کے ساتھ ہو۔ چنانچہ جو شخص عہد اول اور میثاق اول کی فکر کرے گا وہ تمام دوسرے مواثیق کی رعایت کرے گا کیونکہ تمام عہود و مواثیق پر عمل کرنا ایک فریضہ ہے۔ جو شخص عہد اول کا پاس رکھتا ہے وہ دوسرے عہود کا بھی پاس رکھے گا کیونکہ یہ تمام عہد اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔

یہ ایک عظیم اصول ہے جس کے اوپر پوری زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس اصول کو قرآن کریم چند کلمات کے اندر ضبط فرماتا ہے :

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

"ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں' اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے ۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں' اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں ۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لئے ہے"۔

یہ اجمالی اور کلی قاعدہ ہے' یعنی اللہ نے جن روابط کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے جوڑتے ہیں یعنی وہ مکمل اطاعت کرتے اور پوری طرح وفادار اور استوار ہوتے ہیں ۔ سنت الہیہ کے مطابق سیدھے چلتے ہیں اور ان کی رفتار میں کوئی کجی نہیں ہوتی ۔ اس لیے یہاں ایک کلی قاعدہ بیان کر دیا اور جس کے اندر اللہ کے وہ تمام مفرد احکام آگئے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے کیونکہ تمام احکام کو یہاں ایک ایک کر کے بیان کرنا بہت ہی مشکل تھا اور یہاں مقصود بھی نہ تھا بلکہ یہاں مقصود یہ تھا کہ انسان تقاضا ہائے فطرت پر سیدھا چلے اور تمام معاملات میں اطاعت شعار ہو ۔ اطاعت کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور آیت کے آخر میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا کہ وہ لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اطاعت کاملہ کے بارے میں بہت حساس ہیں ۔

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ (۱۳ : ۲۱) "اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے"۔ اللہ کی مشیت اور قیامت کے برے حساب سے وہ ڈرتے ہیں کیونکہ وہ عقلمند ہیں اور عقلمند آدمی حساب و کتاب سے قبل ہی اپنا حساب تیار کرتے ہیں ۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (۱۳ : ۲۲) "ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں"۔ صبر کی کئی انواع و اقسام ہیں اور صبر کے کچھ تقاضے ہیں ۔ ایک صبر یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی راہ میں مشکلات پر صبر کرے ۔ مثلاً اعمال' جہاد اور دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات ۔ نیز نعمتوں پر صبر اور مشکلات حیات میں صبر ۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو خوشحالی میں صبر کریں اور کبر و غرور اور ناشکری نہ کریں ۔ لوگوں کی حماقتوں اور جہالتوں پر صبر' جبکہ ان کی وجہ سے بسا اوقات انسان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح دوسرے معاملات اور اجتماعی زندگی کے روابط میں صبر ۔ یہ سب صبر اللہ کی رضامندی کے لیے ہیں' اس لیے نہیں کہ لوگ یہ کہیں کہ یہ شخص باہمت ہے یا یہ کہ لوگ کہیں یہ شخص فریاد کر رہا ہے ۔ نہ محض اپنے آپ کو شریف ثابت کرنے کے لیے یا محض اس لیے کہ جزع و فزع سے مزید نقصان ہو گا ۔ غرض اللہ کی رضامندی کے سوا کسی بھی مقصد کے لیے کیا جانے والا صبر مقبول نہیں ہے ۔ نعمت اور آزمائش میں صبر یوں ہے کہ انسان اللہ کے فیصلے پر شاکر اور قانع رہے ۔

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ (۱۳ . ۲۲) "اور نماز قائم کرتے ہیں"۔ اقامت صلوۃ بھی اللہ کے میثاق اور عہد میں شامل ہے لیکن یہاں اس کا ذکر علیحدہ اس لیے کر دیا گیا کہ وفائے میثاق کی یہ پہلی علامت اور رکن رکین ہے ۔ نیز اللہ کی طرف توجہ کامل کا یہ اہم اور اتم مظہر ہے اور بندے اور رب کے درمیان جسمانی رابطہ ہے ۔ نماز خالص اللہ کے لیے ہے' اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر کلمہ اللہ اور صرف اللہ کے لیے ہے ۔

وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً (۱۳ : ۲۲) "اور ہمارے دیئے ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں"۔ یہ حکم بھی اس آیت میں شامل ہے کہ اللہ نے جو روابط جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں

جوڑتے ہیں اور میثاق الٰہی کی ذمہ داریاں اور تقاضے پورے کرتے ہیں۔ لیکن اس کو بھی یہاں خصوصیت کے ساتھ لایا گیا کیونکہ یہ اللہ کے بندوں کے درمیان اجتماعی روابط کا مظہر ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے خدائی اور اسلامی زندگی کے روابط مستحکم ہوتے ہیں۔ دینے والے کا دل بخل کی بیماری سے پاک ہوتا ہے اور لینے والے کا دل کینہ سے پاک ہوتا ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی کی اجتماعی زندگی باہم محبت اور تعاون پر مبنی ہو جاتی ہے۔ پوشیدہ خرچ ان مقامات میں ہوتا ہے جہاں لینے والے کی عزت نفس کو بچانا ہوتا ہے۔ اعلانیہ ایسے مقامات پر ہوتا ہے جہاں دوسروں کے لیے نمونہ بننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں شریعت کا نفاذ مقصود ہو یا قانون کی اطاعت مقصود ہو یا دوسرا کوئی اجتماعی فائدہ ہو۔

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳: ۲۲) "اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں"۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں وہ برائی کو بھلائی کے ذریعے دفع کرتے ہیں۔ اس سے مراد دینی معاملات میں نہیں ہیں کہ دینی معاملات میں اگر کوئی برا کرے تو تم اس کے ساتھ اچھا کر دو۔ لیکن یہاں قرآن کریم کی تعبیر تمہید سے آگے بڑھ کر نتیجے کا ذکر کرتی ہے۔ برائی کا جواب نیکی سے دینے سے ایک سرکش شخص کی سرکشی میں کمی آ جاتی ہے اور ایک انسان پھر برائی کے بدلے میں بھلائی پر مائل ہو جاتا ہے۔ اور شر کی آگ بجھ جاتی ہے اور شیطان کے وسوسے ختم ہو جاتے ہیں۔ یوں برائی کا دفعیہ ہو جاتا ہے اور وہ ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آیت میں حسنہ کا ذکر پہلے کیا گیا۔

پھر اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بدی کا جواب نیکی سے صرف اس وقت دیا جائے گا جب یہ امید ہو کہ اس طرح شر کا دفعیہ ہو گا اور برائی ختم ہو گی لیکن اگر کوئی شخص اس سے مزید اکڑتا ہے اور اسے جراءت ہوتی ہے تو ایسا رویہ اچھا نہ ہو گا۔ بلکہ ایسے حالات میں اس بات کی ضرورت ہو گی کہ برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور جہاں بھی مدافعت کی ضرورت ہو شر کا دفاع کیا جائے گا تاکہ شر کی قوتیں بھول نہ جائیں اور ان کو مزید سرکشی اختیار کرنے کی جراءت نہ ہو۔

برائی کا جواب نیکی سے اس وقت دیا جاتا ہے کہ دو افراد کے درمیان معاملہ ہو اور وہ دونوں مساوی حیثیت کے مالک ہوں۔ رہے وہ معاملات جن کا تعلق دین اسلام سے ہے تو اس میں یہ رویہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ دین کے معاملات میں کسی جسارت کرنے والے شخص کے سامنے ننگی تلوار ہی صحیح کاٹ کرتی ہے۔ نیز جن لوگوں کا وطیرہ یہ ہو کہ وہ زمین میں فساد کرتے پھریں ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا جانا چاہئے لیکن کسی معاملے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے قرآن نے ایسی ہدایات کو ایک فردی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ عقل کو کام میں لاکر ایسا رویہ اختیار کرے جس میں خیر ہو اور بہتری ہو۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

"یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی

بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے ۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے "تم پر سلامتی ہے ' تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو ' پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر!" ۔

ان ہی لوگوں کے لیے آخرت کا گھر ہے ۔ یہ آخرت میں عالی مقام ہوں گے ۔ ایسے باغات ہوں گے جو ان کے قیام کے لیے ابدی اور دائمی ہوں گے ۔ ایسے ہی باغات میں ان کے اقارب و رشتہ دار ' آباء و اولاد ان کے ساتھ ہوں گے ' یعنی ان میں سے وہ جو صالح ہوں گے اور یہ لوگ ان باغات میں اپنی نیکی اور صلاح کی بنیاد پر داخل ہوں لیکن ان کے ساتھ ان کے اکرام کے طور پر ان کے رشتہ دار بھی داخل ہوں گے ۔ دوست اور یار بھی وہاں ہوں گے ۔ دوست و احباب اور آباء و اولاد کا اجتماع ایک محبوب اور لذیذ چیز ہے جس سے جنت کے مزے دوچند ہوں گے ۔

اس اجتماع میں جہاں دوست و احباب ہوں گے اور جہاں اعزہ و اقارب ہوں گے ملائکہ کی طرف سے اھلاً وسھلاً اور مبارکباد کے پیغامات ہوں گے اور بے شمار لوگ وہاں آجا رہے ہوں گے ۔

يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِم مِّنْ كُلِّ بَابٍ (۱۳ : ۲۳) "ہر طرف سے ان پر داخل ہوں گے" یہاں آکر انداز گفتگو اس طرح ہو جاتا کہ گویا ہم اس منظر کو دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف سے ملائکہ گروہ در گروہ آرہے ہیں اور مبارک و سلامت ہو رہی ہے ۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳ : ۲۴) "تم پر سلامتی ہے ' تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو" ۔ گویا ایک محفل مسرت ہوگی اور ہر طرف سے خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اور سلامت و مبارک اور جشن مسرت کی اہلچل برپا ہوگی ۔

اور دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جن کی عقل کام نہ کر رہی تھی اس لیے وہ نصیحت نہ پکڑ سکے ' نہ ان میں بصیرت تھی کہ وہ مشکلات راہ حق پر صبر کرتے ۔ ان لوگوں کی حالت ہر لحاظ سے عقلمند اور دانشور لوگوں کے برخلاف اور علی العکس ہوگی ۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝

"رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں ' جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے ' اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ' وہ لعنت کے مستحق ہوں گے اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے" ۔

یہ اس عہد الست کو توڑتے ہیں جو فطرت انسانی نے ناموس ازلی کی صورت میں اللہ کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ اس کے بعد تمام وعدوں اور معاہدوں کو توڑتے ہیں۔ اگر ایک انسان عہد الست کو توڑ دے تو گویا وہ ان تمام وعدوں اور عہدوں کا ناقض ہو گا جو اس عہد الست پر قائم ہیں۔ جس شخص کے دل میں خوف خدا نہیں ہے وہ کسی شخص 'کسی عہد ، اور کسی میثاق کا پاس کیسے کر سکتا ہے۔ یعنی ایسے شخص بالعموم ان روابط کو توڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اہل عقل و دانش تو صبر کرتے تھے 'نماز قائم کرتے تھے اور اعلانیہ اور پوشیدہ راہ خدا میں انفاق کرتے تھے اور پھر ان کا عمومی رویہ یہ تھا کہ وہ برائی کا جواب نیکی سے دیتے تھے۔ لیکن یہ لوگ فساد فی الارض برپا کرتے ہیں۔ اہل دانش کی جن چیزوں کا اوپر ذکر ہوا ان میں سے کسی ایک کو چھوڑنے سے فساد فی الارض نمودار ہوتا ہے۔

"وہ لوگ" وہ جو اللہ سے دور ہیں اور راندۂ درگاہ ہیں ان کے لیے لعنت ہے۔ تکریم و استقبال کے مقابلے میں راندگی ہے اور نعم الدار کے مقابلے میں سوء الدار ہے۔

یہ لوگ اس لیے راندۂ درگاہ ہوئے کہ وہ متاع حیات دنیا میں ہی غرق رہے اور ان کی نظریں آخرت کی دائمی نعمتوں کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ حالانکہ رزق کا تعین صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے 'وہی اس میں توسیع بھی کرتا ہے 'وہی رزق میں تنگی بھی کرتا ہے 'یہ سب کام اللہ کے اختیار میں تھا اور کوئی شخص اپنے لیے خود فراخی رزق کا انتظام نہیں کر سکتا تھا کہ اس پر اتراتا۔ اگر یہ لوگ آخرت کے طلبگار ہوتے تو یہ ضروری نہ تھا کہ اللہ ان سے دنیا کی خوشحالی چھین لیتا کیونکہ وہی داتا تھا۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝۲۶

ع ۸ ۳ ۹

"اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں 'حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

--- ○○○ ---

اس سے قبل اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ ایک شخص اس حقیقت کو جانتا ہے اور مانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جو سچائی نازل ہو رہی ہے 'وہ حق ہے ' وہی دانشمند اور عقلمند ہے اور جو نہیں جانتا وہ اعمیٰ ہے۔ اب یہاں اہل کفر کی کم عقلی اور اندھے پن کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں کہ یہ لوگ اس کائنات میں اللہ کی آیات و نشانات کو نہیں دیکھ پا رہے۔ دانشوروں کے لیے تو یہ قرآن ہی کافی معجزہ ہے لیکن عقل کے یہ کورے قرآن سے بھی بڑا کوئی معجزہ طلب کرتے ہیں۔ سورہ کے پہلے حصے میں ان کے مطالبات کا ذکر ہو چکا ہے اور وہاں یہ جواب بھی دے دیا گیا تھا کہ رسول تو صرف ڈرانے والا ہے اور معجزات کا صدور اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہاں ایسے ہی مطالبات کو پھر دہرا کر بتایا جاتا ہے کہ ضلالت و ہدایت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ پھر ان دلوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اللہ کے ذکر ہی سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اس قرآن اور ذکر الٰہی سے آگے مزید خوارق عادت معجزات کا مطالبہ نہیں کرتے۔ یہ قرآن اپنی جگہ گہری اثر آفرینی کا حامل ہے یہاں

تک کہ اسے سن کر قریب ہے کہ پہاڑ چل پڑیں اور قریب ہے کہ زمین پھٹ پڑے اور قریب ہے کہ مردے بھی اس کی حقانیت کے نعرے لگانے لگ جائیں کیونکہ اس قرآن میں بے پناہ قوت' مادہ حیات اور انقلابی اسپرٹ ہے۔ آخر میں مومنین کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں سے مایوس ہو جائیں جو معجزات طلب کرتے ہیں اور انسانی تاریخ میں ان لوگوں کے رویہ کا مطالعہ کریں جنہوں نے اچھی مثالیں چھوڑی ہیں اور پھر ان لوگوں کی حالت کو بھی دیکھیں جو ان جیسے تھے اور جو اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿٢٩﴾ كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿٣٠﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

۴ ع ۵ ۱۰

"یہ لوگ جنہوں نے (رسالت محمدیؐ کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے' کہتے ہیں: "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری"۔۔۔ کہو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا

ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی ؐ کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔

اے نبی ؐ 'اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے لیک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں 'تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے۔ اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے 'اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔

اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی 'یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟ (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا اہل ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے 'یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے 'مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا 'پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

ان لوگوں کی تردید کا خلاصہ یہ ہے کہ دلوں کے اندر ایمان پیدا ہونے کا حقیقی سبب وقوع معجزات نہیں ہے۔ ایمان کے داعی اور اسباب خود کسی انسان کے نفس کے اندر موجود ہوتے ہیں اور انسان خود اپنی نفسیاتی کیفیات اور داخلی فطری دواعی کی وجہ سے ایمان لاتا ہے۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳:۲۷) "کہو اللہ جسے چاہتا ہے' گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

لہٰذا اللہ صرف ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف میلان رکھتے ہوں اور ان کا یہ میلان اور انابت الی اللہ کا جذبہ ہی ہے جس نے ان کو اہل ایمان بنایا۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کی طرف میلان اور انابت نہیں رکھتے وہی گمراہ ہوتے ہیں' لہٰذا اللہ بھی ان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا دلوں کے اندر ہدایت کی استعداد اور پھر طلب ہدایت اور اس راہ میں سعی کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ لیکن جو دل اللہ کی ہدایت کی استعداد ہی سے محروم ہوتے ہیں اور جو اس سمت میں حرکت ہی نہیں کرتے وہ اللہ سے اور ہدایت سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد مومن دلوں کی ایک نہایت ہی شفاف تصویر کشی کی جاتی ہے۔ یہ تصویر کشی نہایت ہی اطمینان و قرار' انس و محبت اور مسرت اور بشاشت کے رنگوں میں رنگی ہوئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (۱۳:۲۸) "وہ جنہوں نے نبی کی دعوت کو مان

لیا ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب سے متعلق ہیں۔ وہ اللہ کے جوار رحمت میں ہیں اور اللہ کے ہاں مامون اور محفوظ ہیں۔ وہ تنہائی کی مشکلات سے بھی مطمئن ہوتے ہیں' راہ حق کی پریشانیوں میں بھی مطمئن ہوتے ہیں۔ اور وہ تخلیق کائنات' اس کے آغاز اور انجام کے بارے میں بھی شفاف سوچ رکھتے ہیں اس لیے مطمئن ہوتے ہیں' وہ ہر ظلم' ہر شر اور ہر زیادتی سے اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں سمجھتے ہیں اس لیے مطمئن ہوتے ہیں الا یہ کہ اللہ کی مشیت سے کوئی مصیبت آ جائے تو وہ اس پر بھی راضی ہوتے ہیں اور اسے ابتلا سمجھ کر اس پر صبر کرتے ہیں۔ ہدایت' رزق' دنیا و آخرت کی پردہ پوشی کے بارے میں بھی ان کو اللہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اس لیے وہ مطمئن ہوتے ہیں۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۲۸) "بے شک اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"۔ اہل ایمان کے دلوں میں اللہ کے ذکر سے جو اطمینان پیدا ہوتا ہے اس کا صحیح علم صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں ایمان کی بشاشت اور مٹھاس پیدا ہو جائے اور ان کو اللہ کا فضل حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس ایمانی بشاشت اور طمانیت کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس کی کیفیات ایسی ہوتی ہیں جن کو الفاظ کے ذریعہ دوسرے لوگوں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ایسے لوگوں تک جن کو یہ معرفت حاصل نہ ہو کیونکہ یہ حقائق الفاظ کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ یہ اطمینان دلوں میں سرایت کرتا ہے۔ ان کو سکون اور فرحت دیتا ہے' ہمت دیتا ہے۔ وہ امن و سلامتی کا شعور پاتے ہیں۔ ایسے اہل معرفت محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں' ان کو ایک پورا ماحول اپنا دوست اور یار نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کے اردگرد اللہ کی صنعت کاریاں ہوتی ہیں جبکہ خود صاحب معرفت اللہ ہی کی حمایت میں ہوتا ہے۔

ان لوگوں سے بڑا بدبخت اس روئے زمین پر کوئی نہیں ہے جو تعلق باللہ کی وجہ سے اور ذکر الٰہی کی وجہ سے پیدا ہونے والے انس و محبت سے بے خبر ہوں۔ اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں ہے کہ وہ اس کرۂ ارض کے اوپر چلے پھرے اور اسے اپنے کائناتی ماحول سے کوئی انس و محبت نہ ہو۔ اس سے بڑا کوئی بدبخت نہ ہو گا جو اس دنیا میں چلے پھرے اور اسے معلوم نہ ہو کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ وہ کیوں آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے؟ اور اس کے اوپر زندگی کا یہ بوجھ کیوں ڈالا گیا ہے؟ اور اس سے بدبخت اور کون ہو گا جو اس کرۂ ارض پر چلتا پھرتا ہو اور وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے اس لیے بدکتا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس کے اور ہر چیز کے درمیان ایک نہایت ہی لطیف تعلق ہے؟ اس سے بدبخت اور کون ہو گا جو سفر حیات طے کر رہا ہے لیکن اکیلا ہے' راندہ ہے' گم کردہ راہ ہے اور پہاڑوں اور صحراؤں میں اکیلا پھر رہا ہے اور زندگی کا یہ کٹھن سفر وہ اکیلا بغیر گائیڈ کے' بغیر انیس سفر کے اور بغیر ہادی و مددگار کے طے کر رہا ہے۔ اور اسے نشان منزل تک معلوم نہیں۔

یاد رکھو! زندگی کے اس کٹھن سفر میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں' نہایت ہی تاریک گھڑیاں جن کا مقابلہ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو اللہ کا ہو گیا ہو' جسے اللہ کی حمایت کا بھروسہ ہو' ورنہ خواہ کوئی کس قدر طاقتور' بہادر اور مستقل مزاج کیوں نہ ہو زندگی میں بعض ایسی تاریک گھڑیاں آتی ہیں کہ انسان کی تمام قوتیں جواب دے جاتی

ہیں - آخری سہارا صرف تعلق باللہ کی قوت اور ذکر الٰہی سے حاصل ہوتا ہے ۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۲۸) "خبردار! ذکر الٰہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے"۔ یہ لوگ جو اللہ کی طرف جھکنے والے ہیں اور اللہ کے ذکر کی وجہ سے مطمئن ہیں' اللہ کے ہاں ان کا انجام بہت ہی اچھا ہو گا کیونکہ انہوں نے اچھا طرز عمل اختیار کیا اور وہ اللہ کے مطیع فرمان رہے ۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ (۱۳ : ۲۹) "جن لوگوں نے دعوت حق کو قبول کیا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔ طوبیٰ طاب یطیب سے ہے بوزن کبریٰ۔ یہ صیغہ تفخیم اور تعظیم کے لیے آتا ہے یعنی ان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے ۔ ان کا اچھا انجام اس خدا کے ہاں ہو گا جس کے وہ اپنی زندگی میں مطیع فرمان رہے ۔

وہ لوگ جو معجزات طلب کرتے ہیں' ایسے لوگوں کو ایمانی اطمینان کا شعور حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی اس ذہنی پریشانی کو دور کرنے کے لیے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں اور اے پیغمبر آپ کسی قوم میں آنے والے پہلے رسول نہیں ہیں کہ ان لوگوں کے لیے یہ معاملہ ناقابل فہم ہو گیا ہے ۔ اس سے قبل بھی کئی اقوام گزری ہیں اور کئی رسول گزرے ہیں ۔ اگر یہ لوگ کفر پر تل گئے ہیں تو آپ اپنے منہاج پر کام کرتے رہیں اور اللہ پر بھروسہ کریں ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ

(۱۳ : ۳۰) "اے نبی اس شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا۔ ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گذر چکی ہیں تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے ۔ اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت ہی مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں ۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے"۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ رحمٰن کا کفر کرتے ہیں جس کی رحمت بہت ہی بڑی ہے ۔ جس کے ذکر سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس کی عظیم رحمت کا شعور ان میں پیدا ہو جاتا ہے ۔ اے پیغمبر آپ کی ڈیوٹی تو صرف یہ ہے کہ جو وحی آپ کی طرف آتی ہے آپ ان لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں ۔ آپ کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہے ۔ اگر وہ کفر کے ارتکاب پر تل گئے ہیں تو اعلان کر دیں کہ میرا بھروسہ تو صرف اللہ وحدہ پر ہے اور یہ کہ میں اسی کی طرف لوٹنے والا ہوں اور کسی اور کی طرف پناہ لینے کے لیے مجھے رجوع نہیں کرنا ہے ۔

ہم نے آپ کو صرف یہ ڈیوٹی دی ہے کہ آپ قرآن کی دعوت لوگوں تک پہنچا دیں ۔ یہ قرآن بذات خود یہ کتاب اور یہ کلام بہت ہی عجائب اپنے اندر رکھتا ہے ۔ اگر کسی قرآن کے ذریعہ پہاڑ چلائے جاتے' یا زمین کے ٹکڑے کر دیے جاتے' یا اس کے ذریعہ مردے باتیں کرنے لگتے تو یہ باتیں اس قرآن میں بھی ہوتیں اور اس کے ذریعے یہ مذکور معجزات ظہور پذیر ہوتے لیکن قرآن (ہر کتاب الٰہی) تو اس لیے نازل کیا جاتا ہے کہ عوام کو ان کی ڈیوٹیاں اور ان کے

فرائض سے آگاہ کیا جائے۔ اگر یہ مخاطبین اب کفر کرنے پر تل گئے ہیں اور ہرگز مان کر نہیں دیتے تو وقت آگیا ہے کہ مومنین ان سے مایوس ہو جائیں اور ان کو چھوڑ دیں کہ مکذبین کے ساتھ اللہ کا جو سلوک ہوتا ہے وہ آجائے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۱۳ : ۳۱) "اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی' یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟ (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا اہل ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے' یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کو قبول کیا اور اس کی کیفیات میں ڈوب گئے اس نے ان کے اندر اس قدر انقلاب برپا کر دیا کہ پہاڑوں کے چلائے جانے' زمین کے شق ہونے اور مردوں کے زندہ ہونے سے وہ بڑا معجزہ تھا۔ ان مذکور معجزات سے بھی ان لوگوں کی زندگیوں میں دور رس تبدیلی ہوئی اور بڑے بڑے معجزات رونما ہوئے۔ ان کی زندگی کی قدریں بدل دی گئیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں نے خود اس زمین کے چہرے کو بھی بدل کر رکھ دیا اور اسلام اور مسلمانوں نے اس کرۂ ارض کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔

اس قرآن کی اثر آفرینی' اس کی ذات اور طرز ادا میں' اس کی دعوت اور فلسفے میں اس کے موضوعات کلام اور طرز کلام میں بذات خود ایک بڑا معجزہ ہے۔ اس کے اندر کسی بڑے سے بڑے معجزے کے مقابلے میں بہت بڑی تاثیر ہے۔ اور اس کی اس معجزانہ شان سے وہی شخص واقف ہے جو ان معانی اور فلسفوں اور انداز تعبیر اور اسالیب کلام سے واقف ہو۔ اور ان کو ان چیزوں کے سمجھنے کی ذہنی قوت مدرکہ حاصل ہو۔ جن لوگوں نے اسے سمجھا' اس پر عمل کیا اور اس کی کیفیات اور اس کے انوار میں ڈوبے انہوں نے پہاڑوں کے چلانے سے بھی بڑے معجزے کر دکھائے۔ قرآن مجید کے اثرات کے نتیجے میں تو اقوام اور نسلوں کے حالات اور سوچ کے دھارے بدل گئے۔ انہوں نے ان چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جو زمین کے مقابلے میں زیادہ سخت تھیں۔ فکری جمود اور رسم و رواج کا وہ جمود جو قرآن اور مسلمانوں نے توڑا وہ زمین اور پتھروں سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے ایسی اقوام کو زندہ کیا جو مردوں سے زیادہ مردہ تھیں۔ زندہ ہو کر بھی مردہ تھیں' وہ اقوام جن کی روح کو وہم اور گمان نے قتل کر دیا تھا۔ وہ بتان وہم و گمان کے پجاری تھے۔ عربوں

کے اندر جو انقلاب رونما ہوا' ان کی زندگی کے اندر جو تبدیلی نمودار ہوئی اور اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں یہ کہ انقلاب صرف اور صرف قرآن کی وجہ سے آیا جس نے ان کی زندگی کا منہاج ہی بدل کر رکھ دیا تو کیا یہ انقلاب پہاڑوں کے چلنے' زمین کے ٹکڑے ہونے اور مردوں کے گویا ہونے سے کوئی کم انقلاب تھا۔

بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا (۱۳ : ۳۱) "بلکہ سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ وہی ہے' جو تحریک کی نوعیت کو اختیار کرتا ہے اور وہی ہے جو تحریک کے لیے وسائل اور ذرائع اختیار کرتا ہے۔ اگر اس قرآن کو سن کر بھی کسی قوم کے دلوں میں حرکت اور ولولہ پیدا نہیں ہوتا تو اہل ایمان جو ابھی ایسے دلوں کو حرکت میں لانے کی سعی کر رہے ہیں ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے مایوس ہو جائیں۔ ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کے اندر ہدایت کی استعداد پیدا کر دیتا۔ اور انسانوں کو بھی اسی طرح ہدایت کی جبلت پر تخلیق کر دیتا جس طرح فرشتوں کو اس نے ہدایت پر پیدا کیا ہے۔ یا لوگوں کو مجبور کر کے ہدایت کی راہ پر چلا دیتا لیکن اللہ نے انسانوں کے بارے میں نہ خیر کی اسکیم تیار کی اور نہ فرشتوں جیسی جبلت ان کو دی۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اللہ کو معلوم تھا کہ انسان اس مقصد کے تقاضے کس طرح پورے کر سکتا ہے۔

لہٰذا چاہئے کہ لوگوں کو اب اللہ کے فیصلوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر اللہ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان اقوام عرب کو اس طرح نیست و نابود نہ کرے گا جس طرح بعض اقوام کو ہلاک کیا گیا تھا تو ان پر کوئی نہ کوئی مصیبت آتی ہی رہتی ہے۔ یا ان کے گھروں کے قریب آتی رہتی ہے۔ اور یہ لوگ وقتاً فوقتاً اللہ کے عذابوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے بعض ان مصائب میں ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔

اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ (۱۳ : ۳۱) "یا ان کے گھروں کے قریب نازل ہوتی ہے"۔ جس سے وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور پھر وہ نہایت ہی قلق اور خوف سے انتظار کرتے ہیں کہ کہیں اس جیسی مصیبت دوبارہ نہ آ جائے۔ بعض لوگ نرم بھی ہو جاتے ہیں' ان میں ایک تحریک پیدا ہوتی ہے اور ان کو حقیقی زندگی مل جاتی ہے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ (۱۳ : ۳۱) "یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو"۔ یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے لوگوں کے ساتھ کیا ہے اور اس وعدے اور میعاد تک لوگوں کو مہلت عمل دی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۱۳ : ۳۱) "یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر شخص اس دن اس انجام سے دوچار ہونے والا ہے جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ اس بات کی مثالیں انسانی تاریخ میں موجود ہیں کہ اللہ مہلت دیتا ہے لیکن مہلت اور انتظار کے بعد اللہ کی پکڑ بھی آ جاتی ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ

عِقَابِ (۱۳ : ۳۲) "اور تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے' مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔ یہ ایک سوال ہے جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ عذاب ایسا رہا ہے کہ نسلیں اس کا چرچا کرتی رہیں۔

--- ○○○---

دوسرا مسئلہ شرکاء کا ہے۔ سورہ کے حصہ اول میں بھی اسے چھیڑا گیا تھا۔ یہاں بھی ان بیچاروں کا ذکر نہایت ہی حقارت آمیز انداز میں کیا جاتا ہے۔ یہاں اللہ کے ساتھ ان کا تقابل یوں کیا جاتا ہے کہ اللہ تو ہر نفس پر قائم ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے اور جو لوگ اللہ پر یہ افتراء باندھتے ہیں کہ اس کے شریک ہیں ان کو اس دنیا میں بھی سزا دی جاتی ہے اور آخرت کی سزا تو بہت ہی شدید ہے۔ جبکہ اہل تقویٰ کے لیے امن و سلامتی انتظار کر رہی ہے۔

أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا۟ لِلَّهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّـُٔونَهُۥ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى ٱلْأَرْضِ أَم بِظَـٰهِرٍ مِّنَ ٱلْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا۟ عَنِ ٱلسَّبِيلِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾ لَّهُمْ عَذَابٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ ٱلْـَٔاخِرَةِ أَشَقُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ مِن وَاقٍ ﴿٣٤﴾ مَّثَلُ ٱلْجَنَّةِ ٱلَّتِى وُعِدَ ٱلْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ ۖ أُكُلُهَا دَآئِمٌ وَظِلُّهَا ۚ تِلْكَ عُقْبَى ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوا۟ ۖ وَّعُقْبَى ٱلْكَـٰفِرِينَ ٱلنَّارُ ﴿٣٥﴾

"پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے (اس کے مقابلے میں یہ جسارتیں کی جا رہی ہیں کہ) لوگوں نے اس کے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں؟ اے نبی' ان سے کہو (اگر واقعی وہ خدا کے اپنے بنائے ہوئے شریک ہیں تو) زرا ان کے نام لو کہ وہ کون ہیں؟ --- کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو' جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا؟ یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کے لیے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں' پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے' اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو انہیں خدا سے بچانے والا ہو۔ خدا ترس انسانوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال۔ یہ انجام

ہے متقی لوگوں کا ـ اور منکرین حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے"۔
اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہر نفس پر نگراں ہے ـ ہر حال میں ہر شخص اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے ـ اللہ جانتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے' ظاہر میں بھی اور چھپے ہوئے بھی ـ لیکن قرآن کا اندازبیان ایسا ہے کہ وہ اس نگرانی اور قبضے کو نہایت ہی مشخص انداز میں پیش کرتا ہے اور یہ قرآن مجید کا انداز کلام ہے کہ وہ معانی اور تصورات کو مشخص انداز میں پیش کرتا ہے ـ یوں کہ سننے والا متاثر ہو کر کانپنے لگتا ہے۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۱۳:۳۳) "پھر کیا وہ جو ایک ایک نفس کی کمائی کو کھڑے دیکھ رہا ہے"۔ ہر انسان کو ذرا یہ تصور کر لینا چاہئے کہ اس کے اوپر ایک نگران کھڑا ہے' اسے دیکھ رہا ہے اور اس کا حساب کر رہا ہے ـ کون؟ اللہ ـ اب کون ہے جو مارے خوف کے کانپ نہیں اٹھتا جبکہ یہ تصور ہو بھی حقیقت نفس الامری ـ قرآن انسانی قوائے مدرکہ کے سامنے اس معنوی مفہوم کو نہایت ہی حسی انداز میں پیش کرتا ہے کیونکہ انسان مجرد مفہومات کے مقابلے میں محسوس مناظر سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔
جب صورت حالات یہ ہو تو پھر بھی یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں؟ ان لوگوں کی یہ حرکت اس منظر کی روشنی میں نہایت ہی مکروہ اور گھناؤنی نظر آتی ہے ـ اس منظر کو دیکھنے والا ہر شخص ایسے لوگوں کے رویے پر تعجب کرنے لگتا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ (۱۳:۳۳) "لوگوں نے اللہ کے کچھ شریک بنا رکھے ہیں"۔ حالانکہ اللہ ہر نفس پر نگراں ہے ـ ہر شخص کی کمائی اس کی نظروں میں ہے' کوئی چیز اللہ سے چھوٹ نہیں سکتی۔

قُلْ سَمُّوْهُمْ (۱۳:۳۳) "کہو' ذرا نام لو ان کے"۔ کیونکہ ان شریکوں کے جو نام بولے جاتے ہیں وہ نکرے ہیں ـ ہو سکتا ہے کہ بعض بتوں اور شریکوں کے نام بھی ہوں لیکن انداز بیان محض تحکم اور حقارت کے انداز میں ان کو مجہول شخصیت تصور کر کے پوچھتا ہے کہ ذرا ان کے اصل نام تو لو۔

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ (۱۳:۳۳) "کیا تم اللہ کو ایک نئی خبر دیتے ہو جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا"۔ یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے یعنی تم انسان ہو کر بھی ایک ایسی خبر رکھتے ہو جس کا علم اللہ کو اپنی مملکت میں نہیں ـ عجیب سوچ ہے یہ تمہاری ـ تم تو جانتے ہو کہ اللہ کے سوا اور الٰہ بھی ہیں اور اللہ کو اس کا پتہ نہیں؟ جبکہ اس قسم کا دعویٰ کرنے کی جسارت یہ کفار بھی نہ کرتے تھے لیکن لسان الحال سے ان کا دعویٰ یہی تھا کہ اللہ تو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور یہ لوگ کہتے تھے کہ فلاں فلاں بھی الٰہ ہیں۔

اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (۱۳:۳۳) "یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے' کہہ ڈالتے ہو"۔ تم لوگ دوسرے الہوں کے وجود کا قول محض سطحی بات کے طور پر کر دیتے ہو اور اس بات کا کوئی مفہوم اور معنی نہیں ہوتا جبکہ مسئلہ الوہیت کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کا فیصلہ محض سطحی باتوں سے ہو جائے اگر گپ شپ میں الوہیت اور توحید و شرک کے مسائل حل ہو جائیں۔

یہاں تک تو مذاقیہ جواب تھا۔اب سنجیدگی سے اس مسئلہ پر بات کی جاتی ہے۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ

هَادٍ (۱۳: ۳۳) ”حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کے لیے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں' پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے“۔مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کفر کیا۔اپنے آپ سے دلائل ایمان کو چھپایا' اپنے دل و دماغ کو دلائل ایمان و ہدایت سے مستور رکھا۔اس لیے ان پر سنت الٰہیہ کا اطلاق برحق ہو گیا۔ان کے نفوس نے ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ حق پر ہیں۔اور یہ باور کرا دیا کہ ان کی مکاریاں اور حق کے خلاف ان کی تدابیر بہت اچھی اور کامیاب ہیں۔اس طرح ان کے اس طرز عمل نے انہیں راہ حق سے روک دیا۔جس شخص کو اللہ کے سنن ہدایت و ضلالت کے تحت گمراہ قرار دے دیا جائے تو اس کے لیے پھر کوئی بھی ہادی نہیں ہو سکتا۔کیونکہ جب کوئی فرد یا قوم سنن الٰہیہ کے اسباب فراہم کر دے تو پھر اللہ کی سنت اٹل ہو جاتی ہے۔

اور ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۳: ۳۴) ”ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے“۔اگر ان کو کوئی مصیبت آئے یا ان کے گھروں کے قریب ہی کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو بھی ان کے لیے عذاب ہے کہ یہ لوگ ہر وقت اس خوف اور قلق میں رہیں گے کہ ابھی یہی مصیبت ہم پر ٹوٹنے والی ہے۔تیز اگر کسی کا دل ایمان کے لیے خشک ہو جائے اور پتھر بن جائے تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے جبکہ ایسے بے ایمان دل ہر وقت حیرت' پریشانی اور بے چینی کا شکار رہتے ہیں۔ان کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ ان پر یہ عذاب کیوں آ گیا۔

وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ (۱۳: ۳۴) ”اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے“۔
یہاں آخرت کے عذاب کی سختیوں کی تفصیلات نہیں دی جاتیں تاکہ انسان خود اس کے بارے میں سوچ لے۔

وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۱۳: ۳۴) ”کوئی ایسا نہیں جو انہیں خدا سے بچانے والا ہو۔اللہ کی پکڑ سے چھڑا سکے اور اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔ان پر جو عذاب بھی آئے گا وہ اسے جھیلتے رہیں گے۔

دوسری جانب اہل تقویٰ اور اہل ایمان ہیں۔یہ کفار تو ایسے ہوں گے کہ اللہ کے عذاب سے ان کو بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔متقین وہ ہوں گے جنہوں نے ایمان' صلاح کے ہتھیار سے اپنے نفوس کو بچایا۔یہ لوگ عذاب سے مامون اور محفوظ ہوں گے۔بلکہ امن و سلامتی کے علاوہ ان کو رہائش کے لیے باغات ملیں گے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ

ظِلُّهَا (۱۳: ۳۵) "خدا ترس انسانوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال"۔ یہ ہے سازوسامان ان کے لیے اور یہ ہے ان کی تفریح اور خوشی۔ یہ منظر کہ گھنی چھاؤں ہے اور باغات ہیں اور ان میں دائمی پھل ہیں ایک نہایت ہی فرحت بخش منظر ہے جبکہ دوسری جانب جہنم کی مشقتیں ہیں۔ یہ عذاب اور یہ مشقتیں ان لوگوں اور ان لوگوں کا قدرتی انجام ہیں۔

تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۱۳: ۳۵) "یہ انجام ہے متقی لوگوں کا اور منکرین حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے"۔

---- ○○○----

اب بات وحی اور توحید ہی کے مسائل کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے اہل کتاب کا موقف کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ کتب سابقہ کے اندر جو ہدایات دی گئی تھیں' اب یہ آخری کتاب ان کے بارے میں حکم ہے۔ اس کا فرمان قول فیصل ہے اور یہ آخری اور قائل حکم ہے۔ اس آخری کتاب میں اللہ نے وہ احکام دیئے ہیں جو ابد الاباد تک ثابت رہیں گے۔ ان میں وہ امور بھی ہیں جن کو سابقہ رسولوں پر نازل کیا گیا تھا۔ نیز اس کتاب کے ذریعے اللہ نے سابقہ کتب کی جن باتوں کو مٹانا مناسب سمجھا ان کو مٹا دیا۔ ان کی حکمت سے اللہ ہی خبردار ہے۔ لہٰذا اے پیغمبر آپ اس موقف پر جم جائیں جو قرآن کا موقف ہے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں خصوصاً اہل کتاب کی۔ نہ کسی چھوٹے معاملے میں اور نہ کسی بڑے معاملے میں۔ رہے وہ لوگ جو معجزات طلب کرتے ہیں تو انہیں صاف صاف کہہ دو کہ میری ڈیوٹی دعوت پہنچانا ہے۔ جب معجزات کی ضرورت ہو تو اللہ کے اذن سے ان کا ظہور و صدور ہوتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ۝ ۵ ع ۶ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ ۱۱ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ

بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

"اے نبی ؐ جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی 'وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے 'خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے ۔ تم صاف کہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں 'لہذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے" ۔ اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے ۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے"۔

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔ ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے ۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے 'مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے 'قائم رکھتا ہے ۔ ام الکتاب اسی کے پاس ہے ۔ اور اے نبی ؐ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھالیں 'بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

اہل کتاب میں سے جو سچے لوگ ہیں جو دین عیسیٰ کی بنیادی تعلیمات پر کاربند ہیں 'وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو قرآن کی تعلیمات کو اپنی بنیادی تعلیمات سے ہم آہنگ پاتے ہیں ۔ مثلاً عقیدہ توحید وغیرہ میں ۔ نیز وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید تمام ادیان سماوی اور تمام کتب سماوی کی حقانیت کا قائل ہے 'ان سب کا ذکر نہایت ہی احترام سے کرتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ تمام اہل ایمان خواہ نبی آخر الزمان کے مومن ہوں یا انبیائے سابقین کے مومن ہوں وہ ایک ہی جماعت اور ایک ہی امت ہیں اور ذات باری ان کا آمرہ ہے ۔ ایسے لوگ بہت ہی خوش ہوتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں ۔ یہاں ایسے لوگوں کی کیفیت قلبی کو فرحت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ جب کوئی شخص سچائی پاتا ہے تو اسے بہت ہی خوشی ہوتی ہے اور وہ اپنے خیالات کی تصدیق جب قرآن میں پاتے ہیں تو ان کا عقیدہ اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور وہ قرآن پر ایمان لاکر اس تحریک کے حامی بن جاتے ہیں۔

وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْكِرُ بَعْضَهٗ (۱۳ : ۳۶) "اور مختلف گروہوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے"۔ یعنی ان سے مراد اہل کتاب اور مشرکین کی بعض جماعتیں ہیں ۔ یہاں ان لوگوں کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں ۔ کیونکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں منکرین کا ذکر کر کے ان کا رد کر دیا جائے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَیْهِ اَدْعُوْا وَاِلَیْهِ مَاٰبِ (۱۳ : ۳۶)

"تم صاف کہہ دو کہ مجھے صاف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں لہذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے"۔ یعنی بندگی بھی اسی کی ہے ۔ دعوت بھی اللہ کی طرف ہے اور رجوع بھی صرف اللہ ہی کی طرف ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اپنا موقف واضح کر دیں جو قرآنی تعلیمات میں سے بعض چیزوں کے منکر ہیں۔ یہ کہ وہ پوری کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں گے جو ان پر نازل ہوئی ہے چاہے اس پر اہل کتاب خوش ہوں یا ان میں سے کچھ لوگ ناراض ہوں کیونکہ جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے وہ حکم اخیر ہے۔ سابقہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں اور یہ کتاب عربی زبان میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم بھی واضح اور مکمل ہے کیونکہ اب یہ اللہ کا آخری پیغام ہے۔ اس لیے ہم نے اب اپنے تمام نظریات اس سے اخذ کرنے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (۳۷:۱۳) "اس طرح ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے"۔

وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ

(۳۷:۱۳) "اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے"۔ کیونکہ تمہارے پاس جو علم آ رہا ہے وہ علم الیقین ہے' اور دوسرے گروہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کی اپنی خواہشات ہیں' علم ویقین پر مبنی نہیں ہیں۔ یہ حکم حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تہدید آمیز الفاظ میں دیا گیا ہے۔ یہ انداز اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے زیادہ بلیغ طریقہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس معاملے میں تسامح کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی اجازت نہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کسی کو یہ اعتراض ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمام رسول بشر ہی گزرے ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (۳۸:۱۳) "تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا بنایا تھا"۔

اور اگر اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی مادی معجزہ لے کر نہیں آئے۔ تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ان کا کام ہی نہیں ہے' یہ تو اللہ کا کام ہے۔

وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳۸:۱۳) "اور کسی رسول کی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا"۔ اللہ اپنی حکمت کے مطابق' جہاں ضرورت ہو وہاں خارق عادت معجزات کا صدور کرا دیتا ہے۔

ہاں اہل کتاب کو دی ہوئی کتابوں اور نبی آخر الزمان کو دی ہوئی کتاب میں بعض جزئیات کے حوالے سے اختلاف ضرور ہے۔ اس لیے کہ ہر دور کی کتاب الگ ہوتی ہے۔ لیکن یہ آخری کتاب ہے۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۳۸) يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ

(۱۳: ۳۸ - ۳۹) "ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے' اللہ جو کچھ چاہتا ہے' مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتب ہے"۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہو تو وہ جس حکم کو چاہتا ہے' مٹا دیتا ہے اور جو مفید ہو اسے قائم رکھتا ہے۔ تمام باتوں کی اصل کتاب اور سکیم اس کے پاس محفوظ ہے۔ جس کے اندر اس حذف اور نسخ اور نئے احکام کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ لہذا سب کتب اسی کی ہیں' وہی ان میں تصرف اور نسخ کرتا ہے جہاں اور جب اس کی حکمت متقاضی ہو۔ اس کی مشیت کو نہ کوئی رد کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جس عذاب کی دھمکی دی اور جس برے انجام سے انہوں نے دوچار ہونا ہے' چاہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی موجودگی میں وہ اس انجام سے دوچار ہوں یا حضور اکرمؐ اس سے قبل ہی فوت ہو جائیں' اس سے ان لوگوں کے انجام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے رسول کی رسالت اور باری تعالیٰ کی الوہیت پر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وَ اِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳: ۴۰) "اے نبیؐ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں' بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے"۔

اس فیصلہ کن ہدایت میں' تحریک اسلامی کی نوعیت اور تحریک کی لیڈر شپ کے لیے سامان بصیرت ہے' لیڈر شپ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ہر مرحلے میں مناسب پالیسی اختیار کرے اور اپنا فریضہ سرانجام دے۔ ان کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ تحریک کو اس انجام تک پہنچائیں جہاں تک اسے اللہ پہنچانا چاہتا ہے۔ نیز ان کا یہ فریضہ بھی نہیں کہ وہ تحریکی اقدامات اور مراحل میں شتابی دکھائیں نہ ان کا یہ کام ہے کہ تحریک کی ناکامی کا اعلان کر کے مایوس ہو جائیں۔ جب لیڈر شپ دیکھے کہ اللہ کے فیصلے میں دیر ہو رہی ہے اور ان کو تمکن فی الارض نصیب نہیں ہو رہا ہے اور اقتدار سے وہ ابھی دور ہیں تو پریشان نہ ہوں' وہ تو صرف داعی ہیں' محض داعی۔

اللہ کی قوت کے آثار تمہارے ماحول میں نظر آ رہے ہیں۔ اللہ بڑی بڑی مضبوط اقوام کو پکڑتا ہے۔ وہ زوال کے گڑھے میں گرتی ہیں' اس وقت جبکہ وہ زمین پر سرکشی اختیار کرتی ہیں اور فساد برپا کرتی ہیں۔ ایسی اقوام کی قوت میں کمی ہوتی ہے' دولت میں کمی ہوتی ہے اور ان کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔ کسی وقت تو ان کی حکومت سے سورج غروب نہیں ہوتا لیکن بعد میں وہ سکڑ کر رہ جاتی ہیں اور جب اللہ کسی قوم کی شکست و خسارے کا فیصلہ کرتا ہے تو اللہ سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔[1]

---

(۱) بعض لوگوں نے ننقصها من اطرافها کا مفہوم قطبین میں زمین کے سکڑنے سے کیے ہیں۔ یہ تفسیر غلط ہے' ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ قرآن مجید سے ایسا مذاق نہ کریں کیونکہ قرآن کا مضمون اور سیاق ان سائنسی مفہومات کا متحمل نہیں ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں؟ اللہ حکومت کر رہا ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے اور اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی"۔

یہ لوگ امم سابقہ سے مکاری تدابیر اور سیاست اور دھوکہ بازی میں زیادہ نہیں ہیں لیکن اللہ نے اس کے باوجود ان اقوام کو پکڑا کیونکہ اللہ کی قوت اور تدبیر ان سے زیادہ محکم تھی۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾

"ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے' اور عنقریب یہ منکرین حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے"۔

سورہ کا خاتمہ اس بات کی نقل سے ہوتا ہے کہ کفار نے آپ کی رسالت کا صاف صاف انکار کر دیا۔ اس سورہ کا آغاز آپ کی رسالت کے مضمون سے ہوا تھا۔ یوں آغاز و انجام میں سورہ کا مضمون اور محور جا رہا گیا۔ اللہ یہاں خود شہادت دے رہے ہیں کہ اے پیغمبر' آپ کی رسالت پر میں خود گواہ ہوں اور اللہ کی گواہی کے بعد کسی کی گواہی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کتاب اور وحی و رسالت کے بارے میں وہی سب سے زیادہ علیم و خبیر ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾ ۶ ع ۶ ۱۲

"یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر اس شخص کی گواہی جو کتاب آسمانی کا علم رکھتا ہے"۔

---()()()---

یہ سورہ ختم ہوتی ہے' اس نے انسانی دل کو پوری کائنات کی سیر کرائی اور نفس انسانی کی دنیا میں بھی گھمایا' اور اس

پر نہایت ہی گہرے اور وسیع اثرات ڈالے اور پھر دل مومن کو اس دلیل پر لاکر کھڑا کر دیا کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر اللہ گواہ ہے اور یہ اللہ کی شہادت سورہ کے آغاز میں بھی لائی گئی اور اختتام پر بھی لائی گئی۔ اللہ کی شہادت کے بعد کسی دعویٰ کے ثبوت کے لیے اور کیا شہادت درکار ہو گی۔ اللہ کی شہادت پر تو بات ختم ہو جاتی ہے۔

اس سورہ کے خاتمہ پر یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اس سورہ میں اسلامی نظریہ حیات اور جس منہاج پر قرآن نے اس نظریہ کو پیش کیا ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے' حق تو یہ تھا کہ جن آیات میں اس کو بیان کیا گیا ہے' ہم وہاں ہی یہ تفصیل دے دیتے لیکن ہم نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ آیات کی تفسیر کے درمیان میں ایک تفصیلی بحث لاکر آیات کی روانی کو ختم کر دیں۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس موضوع کو سورہ کے آخر تک موخر کر دیں۔

اسلامی نظریہ حیات اور اس کے منہاج کی طرف آیت کے ذیل میں ہم نے اشارات بہرحال کیے ہیں۔ یہاں سورہ کے اختتام کے بعد اب مناسب ہے کہ قدرے مفصل بات رکھی جائے۔ واللہ المستعان!

اس سورہ کا آغاز کلام' اس کے موضوعات' اور اس کے اندر دی جانے والی اکثر ہدایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے' اور جس طرح بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ مدنی ہے' درحقیقت یہ مدنی نہیں ہے۔ جس طرح بعض مصاحف میں بھی اسے مدنی لکھا گیا ہے' ان کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکہ کے اس دور میں نازل ہوئی جس میں لوگ دعوت اسلامی سے سخت منہ موڑے ہوئے تھے۔ وہ جھٹلاتے تھے بلکہ دعوت اسلامی کو چیلنج دے رہے تھے۔ مثلاً یہ سورہ بتاتی ہے کہ مشرکین بار بار معجزات طلب کرتے تھے' اور یہ مطالبہ کرتے تھے کہ جس عذاب سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے وہ ان پر جلدی نازل کیوں نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ گھبرائیں نہیں اور جس حق پر وہ ہیں اس پر جم جائیں۔ ان کے پاس جو دعوت ہے وہ چونکہ بلند دعوت ہے' اس لیے اس کے ذریعہ وہ اس اعراض' تکذیب اور استہزاء کا مقابلہ کریں اور صرف اللہ سے دعا کریں کہ وہ ان کی مشکلات کو دور کر دے اور کھل کر اعلان کریں کہ اللہ وحدہ حاکم اور خالق و رب ہے' اور اس موقف پر جم جائیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ یہی حق ہے اگرچہ مشرکین اس کی تکذیب کریں۔ یہ سورہ مشرکین کے سامنے یہ دلائل بھی رکھتی ہے جو اس کائنات میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور وہ دلائل بھی جو خود ان کے نفسوں میں ہیں۔ پھر تاریخ انسانیت اور اس کے اہم واقعات میں ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کے بے شمار دلائل ہیں جو اس سورہ میں نہایت ہی موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں جن کے اثرات قلب پر گہرے پڑتے ہیں اور جن سے انسانی فکر کو بہت زیادہ غذا ملتی ہے۔

مثلاً اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ہی حق ہے اور یہی سچائی ہے' اگرچہ لوگ اس سے منہ موڑیں' اس کو جھٹلائیں' اسے چیلنج دیں' اور اسے قبول کرنے میں دیر کریں۔ اس راہ کی مشکلات اس بات پر دلیل نہیں ہیں کہ یہ کتاب سچ نہیں ہے۔

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۳ : ۱) "یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے۔ مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے"۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳: ۱۷) "اسی مثال سے اللہ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے' جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے"۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۳: ۱۹) "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے' اور وہ شخص جو اس حقیقت سے اندھا ہے' دونوں یکساں ہو جائیں۔ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں"۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸) (۱۳: ۲۷ - ۲۸)) "یہ لوگ جنہوں نے (رسالت محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے۔ کہتے ہیں: "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری"۔ کہو' اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے' اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (دعوت اسلامی) کو مان لیا ہے' اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ (۱۳: ۳۰) "اے نبی' اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں' تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے' اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے"۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ (۳۶) وَ كَذٰلِكَ

أَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَمَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (۳۷) (۱۳: ۳۶ - ۳۷) "اے نبی ! جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی، وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے ۔ تم صاف کہہ دو کہ " مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں، لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے "۔ اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آ چکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے "۔

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳: ۴۰) "اور اے نبی ! جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں، بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے "۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۴۳) "یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو " میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر اس شخص کی گواہی جو کتاب آسمانی کا علم رکھتا ہے "۔

ذرا ان آیات پر غور کیجئے، ان سے محسوس ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور اس قرآن کا کس طرح مقابلہ اور مزاحمت کر رہے تھے۔ اور ان حالات میں اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم نے مشرکین مکہ کے اس سخت موقف کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا۔

ان آیات میں جو بات کھل کر اور واضح طور پر کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے منہ موڑنے، جھٹلانے، کرنے، مزاحمت کرنے اور دعوت کو نہایت سست رفتاری سے قبول کرنے اور دعوت کی راہ میں بے پناہ مشکلات کھڑی کرنے کی اس مشرکانہ پالیسی کے بالمقابل اللہ نے حضور اکرم کو صاف صاف ہدایت دی کہ آپ ان سے دو ٹوک انداز میں بات کریں اور جو سچائی آپ پر نازل کی گئی ہے وہ صاف صاف بتائیں۔ دعوت اسلامی کے بنیادی نکات یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ اور خالق نہیں، اس کے سوا کوئی حاکم اور قانون ساز نہیں ہے، اس کے سوا کوئی بندگی اور طاعت کے لائق نہیں، وہی واحد اور قہار ہے، سب لوگوں نے اس کے پاس جانا ہے یا جنت میں یا آگ میں، اور یہی وہ نکات تھے جن کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے اور ان کی مزاحمت کرتے تھے۔ حضور اکرم سے کہا گیا کہ آپ اس سچائی میں سے بعض چیزوں کو چھپا کر یا بعض کے اعلان میں تاخیر کر کے ان مشرکین کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی نہ کریں۔ اس سلسلے میں حضور اکرم کو کھلی دھمکی دی گئی کہ اگر آپ نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی تو آپ کے لیے بھی اللہ کے ہاں سزا ہے،

کوئی آپ کو بچا نہیں سکے گا۔

یہ کھلا اشارہ 'بلکہ اعلان ان لوگوں کو صاف صاف بتاتا ہے ' جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں ' کہ اس دعوت کا کیا منہاج ہے '۔ اس میں کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے ' نہ اس میں کوئی خاص حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ داعیوں کو چاہئے کہ وہ اس دعوت کے بنیادی نکات کا اعلان صاف صاف کریں۔ ان میں سے کسی نکتے کو حذف نہ کریں۔ نہ اس کو موخر کریں۔ ان بنیادی حقائق اور نکات میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ چونکہ الہٰ ' حاکم اور رب اور قانون ساز صرف اللہ ہے اس لیے اللہ کے سوا کسی اور شخص یا ادارے کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ حالات جیسے بھی ہوں ' مخالف قوتیں جس قدر بھی طاقتور اور سخت ہوں ' اس نکتے کا اعلان ضروری ہے۔ اگرچہ لوگ نہ مانتے ہوں ' منہ موڑتے ہوں ' یا راہ میں سخت سے سخت مشکلات حائل ہوں ' اور نہایت ہی خطرناک حالات ہوں۔ یہ بات نہ حکمت کے ضمن میں آتی ہے اور نہ موعظہ حسنہ کے ضمن میں آتی ہے کہ دعوت اسلامی کے کچھ نکات کو چھپا دیا جائے یا موخر کر دیا جائے محض اس لیے کہ ملک کے اندر موجود طاغوتی قوتیں اس بات کو پسند نہیں کرتیں ' یا کارکنوں پر تشدد کرتی ہیں ' یا اعراض کرتی ہیں۔ یا داعیوں کے خلاف سازشیں کرتی ہیں ' کیونکہ ان وجوہات کی بنا پر داعیان حق کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام کے ان اساسی نکات میں سے کسی کو ترک کر دیں یا موخر کر دیں۔ داعیان حق کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے شعائر ' اخلاق اور اطوار اپنائیں یا روحانی اور اخلاقی اصلاح کی راہ اختیار کریں اور اللہ کی وحدانیت اور حاکمیت کا صاف اعلان ترک کر دیں اور اس کے نتیجے میں صرف اسلامی نظام کی اطاعت کی دعوت اس لیے چھوڑ دیں کہ وہ ان طاغوتی قوتوں کے غضب اور انتقام سے بچ جائیں۔

یہ بات یاد رہے کہ اللہ نے اسلامی نظریہ حیات کے پیش کرنے کا منہاج یہی اور صرف یہی بتایا ہے ' اور یہی منہاج ہے جس پر اللہ کے حکم کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری زندگی میں چلتے رہے۔ نیز کسی بعد میں آنے والے داعی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طریق کار کو ترک کر دے یا کوئی دوسرا طریق کار اختیار کرے۔ اللہ خود اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ وہ داعیوں کے بچانے کا بھی ذمہ دار ہے۔ اور خود سرکشوں کی ریشہ دوانیوں سے نمٹ لینے والا ہے۔

قرآن کریم نے دعوت اسلامی کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں وہ احکام اور ہدایات و دلائل بھی ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے ہیں اور اس میں وہ دلائل ' شواہد اور اشارات بھی ہیں جو اس کائنات کی کھلی کتاب میں موجود اور مشاہد ہیں۔ قرآن کریم اس پوری کائنات کو انسانی شخصیت کے لیے موضوع غور و فکر قرار دیتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ اس کائنات کے اشارات کو اخذ کرو ' کیونکہ اس کائنات میں ایسے دلائل موجود ہیں جو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کی طرف اشارات کرتے ہیں۔ پھر قرآن مجید وحی متلو اور کتاب کائنات کے ساتھ انسانی تاریخ کے اہم واقعات کو بھی ماخذ علم و ہدایت قرار دیتا ہے۔ انسانی تاریخ میں دست قدرت کی تدبیر و تقدیر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ قرآن انسان کو تاریخ کے سامنے بھی پیش کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ انسان اپنے حس و شعور اور قوت مدرکہ کو تاریخ پر غور کرنے کے لیے استعمال کرے۔

اب لیجئے اس کائنات کی کھلی کتاب کو ' یہ سورہ اس کے کئی صفحات کو پیش کرتی ہے۔ اکثر مقامات پر آیات الٰہیہ قرآنیہ

پیش کرنے کے بعد کتاب کائنات کو پیش کیا جاتا ہے۔ بعض نمونے ملاحظہ ہوں :

الۗمّۗرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۳ : ۱) "یہ کتاب الہی کی آیات ہیں اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے"۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَي الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۲) وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (٤) (۱۳ : ۲ - ٤) "وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں' پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو' اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کر دیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں' جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں' انگور کے باغ ہیں' کھیتیاں ہیں' کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے' سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

چنانچہ اس پوری سورہ میں اس کائنات سے ایسے مناظر پیش کیے جاتے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اللہ اس کا خالق' مالک اور حاکم ہے اور اس پوری کائنات کو وہ چلا رہا ہے۔ اور اس کے اندر اس کا نظام تقدیر چل رہا ہے۔ اس کے بعد پھر قرآن کریم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے۔ وہ ان تمام مشاہد و مناظر کو اچھی طرح دیکھتے ہیں اور پھر اس بات سے

انکار کرتے ہیں کہ اللہ دوبارہ تخلیق کرے گا۔ وحی کا انکار اس بنا پر کرتے ہیں کہ یہ قرآن بعث بعد الموت کا مدعی ہے۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۳ : ۵) "اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے"۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہوں گے۔ یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے"۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۲) وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ (۱۳) (۱۳ : ۱۲ - ۱۳) "وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی تو ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے' بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے' اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے تسبیح کرتے ہیں۔ وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور بسا اوقات انہیں جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے"۔

اللہ اس کائنات کے صفحات ان لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں' حالانکہ وہ اللہ کی ربوبیت کے آثار رات دن مشاہدہ کرتے ہیں۔ اللہ کی قدرت اور اس کی سلطنت کے آثار ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں' یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پوری کائنات اس کی مطیع فرمان ہے۔ وہ اس کائنات کے اندر اپنے بندوں کی بھلائی کے لیے تصرفات کرتا ہے اور اس کائنات میں اس کے سوا کوئی کسی قسم کا تصرف' اور تدبیر و تقدیر نہیں کر سکتا۔

وَ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳) لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۱۴) وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (۱۵) السجدہ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ

نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ أَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱٦)(۱۳: ۱۳ تا ۱٦)) "لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں' فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے۔ اسی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف! وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرھاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں۔ ان سے پوچھو' آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ کہو' اللہ۔ پھر ان سے کہو کہ حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرا لیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو' کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟ کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے' سب پر غالب!"

یوں یہ کائنات دلائل قدرت اور اشارات ایمان کی ایک بھرپور نمائش گاہ بن جاتی ہے۔ یہ انسانی فطرت کو نہایت گہری اور جامع منطق اور سوچ عطا کرتی ہے۔ اور یہ کائنات پوری انسانی شخصیت سے مخاطب ہوتی ہے۔ اس کے تمام قوائے مدرکہ سے ہمکلام ہوتی ہے' اور یہ مکالمہ عجیب ہے اور نہایت منطقی اور مرتب ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم انسان کے غور و فکر کے لیے انسانی تاریخ کو پیش کرتا ہے' انسان کو قرآن کریم یہ سکھاتا ہے کہ اس کی پوری زندگی اور اس کا بھاؤ' اللہ کے دست قدرت میں ہے' اللہ حاکم' قاہر' مدبر اور مکمل کنٹرول کرنے والا ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳: ٦) "یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں' حالانکہ ان سے پہلے عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں اور بے شک تیرا رب بخشش والا ہے انسانوں کے لئے ان کے ظلم پر اور وہ سخت سزا دینے والا بھی ہے"۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۸) عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۹) سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۰) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ

(۱۱) (۱۳: ۸ تا ۱۱) "اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر' ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالا تر رہنے والا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرلے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی' نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے"۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳: ۲۶) "اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں' حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳۱) وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۳۲) (۱۳: ۳۱ ـ ۳۲) "جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔ اور اللہ یقیناً اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے' مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۴۱) وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا يَعْلَمُ مَا تَكْ

كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (٤٢)(١٣: ٤١ - ٤٢)) ''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں؟ اللہ حکومت کر رہا ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں پر نظرثانی کرنے والا نہیں ہے اور اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں' مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے' اور عنقریب یہ منکرین حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے''۔

یوں قرآن کریم اپنے منہاج کے مطابق انسانی تاریخ سے شواہد اور بصیرت افروز دلائل پیش کرتا ہے اور ان کو اس قدر موثر بنا دیتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر انسانی فطرت کو اپیل کرتے ہیں اور یہ دلائل نہایت منظم اور مرتب انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تصریحات سے ہمیں ایک نشان راہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعوت اسلامی کا اہم نشان ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم انسانی شخصیت کو ہمہ جہت اور ہمہ پہلو خطاب کرتا ہے۔ قرآن انسانی شخصیت کے کسی ایک پہلو کو خطاب نہیں کرتا مثلاً فکر و ذہن کا پہلو یا الہام و بصیرت کا پہلو' یا احساسات اور شعور کا پہلو۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کریم کو دعوت اسلامی کی گائیڈ بک بنا لیں۔ داعی ہر مسئلہ کی تلاش تمام دوسرے ذرائع سے پہلے قرآن سے کرے' اور قرآن سے معلوم کرے کہ وہ لوگوں کو دعوت کس اسلوب اور کس طریقے سے دے اور کس طرح مردہ دلوں کو زندگی دے اور کس طرح وہ بجھی ہوئی روحوں میں آگ لگائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس اللہ نے قرآن کو اتارا وہی خالق انسان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسان کا مزاج کیسا ہے اور اس کی ساخت کیسی ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان حضرت میں کہاں کہاں ٹیڑھ ہے۔ پھر داعیوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز اللہ کی وحدت' الوہیت اور وحدت حاکمیت کے مسئلے سے کریں۔ اور یہ دعوت دیں کہ انسان پر اللہ کی بادشاہت کا قیام ضروری ہے اور ان داعیوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو رب تعالیٰ سے متعارف کرانے کا وہی طریقہ اختیار کریں جو قرآن نے اپنایا ہے اور یہی طریقہ حق اور سچ ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے دین اور نظام حیات پر لے آئیں اور ان سے تسلیم کرائیں کہ اللہ بھی وہی ہے اور ایک ہے اور رب بھی وہی ہے اور حاکم ہے اور نظام اور قانون بھی اسی کا چلے گا جو شریعت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کرانے کے لیے اور شرک کے ہر قسم کے شبہات کی مکمل نفی کے لیے قرآن کریم یہ تدبیر اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حقیقت بیان کر دی جائے اور منصب رسالت کی صحیح تعریف پیش کر دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے اہل کتاب کے درمیان حقیقت الوہیت کو حقیقت نبوت کے درمیان خلط ملط کر کے فکری انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات میں ذات باری کے خصائص اور حاکیت الہیہ کے خصائص کا اضافہ کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے لاہوتی اور ناسوتی مباحث نے عیسائیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک عرصہ تک کئی فرقے دست و گریبان ہوتے رہے۔

یہ اختلاط صرف عیسائیوں کے ہاں ہی نہ ہوا بلکہ اس میدان میں بے شمار بت پرستانہ مذاہب کو دھوکہ ہوا۔ نبوت کے تصورات ناقابل فہم ہو گئے۔ بعض لوگوں نے نبیوں کو جادوگروں سے جوڑ دیا۔ بعض نے نبی اور کشفی فلسفہ کو ایک

قرار دیا۔ بعض نے نبیوں اور جنوں کے درمیان رشتہ قائم کیا اور بعض نے نبیوں کو خفیہ ارواح کے ساتھ جوڑ دیا۔

عرب بت پرستوں میں ان میں سے اکثر باتیں پائی جاتی تھیں۔ اس لیے بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ غیب کے بارے میں ہمیں بتائیں۔ بعض یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں خارق عادت معجزات دکھائیں۔ بعض متعین مطالبے بھی تھے۔ بعض آپ پر جادوگر ہونے کا الزام لگاتے تھے اور بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ آپ پر جنوں کا اثر ہو گیا ہے اور آپ مجنون ہیں۔ بعض کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ کے ساتھ فرشتے ہوں۔ غرض اس قسم کے چیلنج اور مطالبے وہ کرتے تھے اور الزامات لگاتے تھے۔ یہ سب مطالبات اس لیے تھے کہ وہ نبوت کے بارے میں بت پرستانہ جاہلی تصور رکھتے تھے۔

چنانچہ قرآن کریم نے نبی اور منصب نبوت کی اصلیت پر طویل کلام کیا اور یہ بتایا کہ رسول کی طبعی حیثیت کیا ہے اور رسالت کی ماہیت کیا ہے اور الوہیت کی حقیقت کیا ہے؟ جو اللہ وحدہ لاشریک کی ذات میں ہے' اور بندگی اور عبودیت کی حقیقت کیا جو ان تمام انواع و اقسام مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ یہ بندگی اور عبودیت انبیاء علیہم السلام کی شخصیات میں بھی ممثل ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اللہ کے صالح بندے ہیں۔ وہ بشر کے علاوہ کوئی اور مخلوق نہیں ہیں۔ ان کے اندر ان صفات میں سے کوئی صفت نہیں ہے جو الٰہی صفات ہیں اور ان کو جنات اور کسی اور خفیہ مخلوق کے ساتھ کوئی تعلق و نسبت نہیں ہے۔ بس فقط ان پر اللہ کی وحی آتی ہے اور اس اسلامی وحی کے ساتھ بھی ان کو کسی خارق عادت معجزہ کو ظاہر کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر کوئی معجزہ صادر ہوتا ہے تو وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے' وہ انسانوں میں سے انسان ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کو منصب رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہے اور نبی اور رسول منتخب ہونے کے بعد بھی وہ بشر اور بندے ہی رہے۔

چنانچہ اس سورہ میں کئی مقامات پر مقام رسالت اور طبیعت نبی کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا کہ نبی اور رسول کے حدود کیا ہیں' چنانچہ بت پرستوں نے نبی کی ذات کے ساتھ جن غلط تصورات و افکار کو وابستہ کر دیا تھا ان کو صاف کیا گیا اور نبیوں کی طرف جن قصوں اور دیومالائی کہانیوں کی نسبت کی جاتی تھی اس کی مکمل نفی کر دی گئی۔ جن کی وجہ سے خصوصاً اہل کتاب کے افکار و عقائد میں فساد پیدا ہوا۔ چنانچہ اس سورہ نے ان اوہام کے اندر داخل شدہ بت پرستانہ اوہام اور کہانیوں کو مکمل طور پر صاف کر دیا۔

یہ مباحث قرآن نے محض لاہوتی اور ناسوتی فلاسفی کے طور پر نہیں چھیڑے۔ نہ کسی فلسفیانہ علمی بحث کے طور پر' بلکہ یہ مباحث اس وقت کے معاشرے میں اٹھنے والے عملی سوالات کے جواب میں آئے ہیں۔ اس لیے یہ جوابات عملی چیلنج کے جواب میں ایک ردعمل اور تحریک کے طور پر آئے ہیں اور یہ اس وقت برپا جہاد میں سے ایک عملی جہاد تھا' مثلاً :

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳ : ۷) "یہ لوگ جنہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے کہتے ہیں کہ "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری؟ تم محض خبردار کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما ہے"۔

وَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳:۲۷) "یہ لوگ جنہوں نے انکار کر دیا' کہتے ہیں "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری"۔۔۔ کہو' اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ (۱۳:۳۰) "اے محمدؐ اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے' ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں' تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے"۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳:۳۸) "تجھ سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں' اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا' اور کسی رسول کو بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔ ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے"۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳:۴۰) "اے نبی جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں' اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں بہرحال تمہارا کام صرف پیغام دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے"۔

رسالت کے منصب کی نوعیت اور رسول کے اختیارات کی حدود کو ان آیات میں نہایت اچھی طرح واضح کر دیا جاتا ہے کہ رسول تو صرف ڈرانے والے ہیں' اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جو پیغام آپ تک آیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دے اور جو وحی آتی ہے اس کی تلاوت کرے۔ وہ کوئی معجزہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پیش کر سکتا۔ وہ اللہ کے بندے ہیں' اللہ ان کے بھی رب ہیں اور آپ نے بھی اللہ ہی کے سامنے جانا ہے۔ آپ دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ آپ نے شادی کی اور آپ کی اولاد ہوئی اور آپ نے اپنی انسانیت اور بشریت کو اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ برتا۔ جس طرح آپ نے اللہ کی عملاً بندگی کی اور بندگی کے تمام حقوق ادا کیے۔

قرآن نے مکمل صفائی کے ساتھ دنیا کی فضا سے منصب نبوت اور ذات انبیاء کے ساتھ وابستہ اوہام و خرافات کو صاف کیا اور یہ ابر آلود مطلع صاف ہو گیا۔ کلیسا نے نبی اور نبوت کے ساتھ اور مسیح اور ان کی والدہ کے ساتھ جو خود ساختہ عقائد متعلق کر دیئے تھے قرآن کریم نے ان کی نفی کر دی۔ یا جس طرح دوسرے بت پرستانہ عقائد نے نبیوں کے ساتھ جو اوہام و خرافات وابستہ کر دیئے تھے قرآن نے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ عیسائیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو ایک سچے آسمانی دین کے رنگ میں پاک و صاف پیش کیا گیا تھا مگر ایک ہی صدی کے اندر عیسائیت ایک مکمل بت پرستانہ دین بن گیا حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو صرف اللہ کے بندے کے طور پر پیش کیا تھا۔

اس نکتے پر بحث کے خاتمے سے قبل درج ذیل آیت پر غور کرنا ضروری ہے۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳: ۴۰) "اور اے نبی جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں 'بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے"۔

یہ بات اس نبی سے کہی جا رہی ہے جس پر یہ قرآن وحی ہو کر نازل ہوا ہے۔ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ خود یہ بات لوگوں کو بتائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دعوت دین کا انجام آپ کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ خود آپ کے ہاتھوں ہی سے دین غالب ہو اور پھیل جائے۔ آپ کا فریضہ اس حد تک محدود ہے کہ آپ تبلیغ کریں ' ہدایت دینا یا نہ دینا اللہ کا کام ہے۔ اب یہ کام آپ کے جیتے جی ہو جائے یا اس سے پہلے آپ کو موت اپنی آغوش میں لے لے یہ امور آپ کے فرائض میں شامل نہیں۔ آپ کا فریضہ صرف یہ ہے کہ آپ یہ دعوت لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد حساب لینا اللہ کا کام ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کچھ اختیارات لے لیے گئے اور آپ کی دعوت کو محدود کر دیا گیا۔ کیونکہ حضور کے فرائض ہی محدود ہیں اور فیصلہ کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

اس سے یہ حکمت نکلتی ہے کہ داعیان حق کو چاہئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے آداب دعوت کو ساتھ لے کر چلیں اور نتائج اور انجام کے ظہور میں جلدی نہ کریں۔ ان کو یہ اختیار بھی نہیں ہے کہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ لوگ کیوں ان کی دعوت کو قبول نہیں کرتے 'نہ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ نے ان کے ساتھ نصرت کا جو وعدہ کیا ہے اس کا مطالبہ کریں اور نہ یہ حق حاصل ہے کہ اللہ نے مکذبین کو نیست و نابود کرنے کا جو وعدہ کیا ہے 'اس کے ظہور کا مطالبہ کریں۔ وہ اس انداز سے بات نہیں کر سکتے مثلاً: "ہم نے اتنا عرصہ دعوت دی اور ہماری بات پر اس قدر قلیل لوگوں نے لبیک کہا"۔ یا "ایک عرصہ ہوا کہ ہم مصائب جھیل رہے ہیں اور اللہ ظالموں کو نہیں پکڑ رہا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ داعیان حق کے ذمہ صرف دعوت دینا ہے۔ رہی یہ بات کہ دنیا و آخرت میں جھٹلانے والوں اور نہ ماننے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے یہ بندوں کا کام نہیں ہے 'یہ اللہ کا کام ہے۔ لہٰذا ایک داعی کو اللہ کے دربار میں نہایت ادب سے کھڑا ہونا چاہئے اور اپنی بندگی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ یہ کام اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ اپنے بندوں کو کس انجام تک پہنچاتا ہے۔

یہ سورہ چونکہ مکی سورتوں میں سے ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرائض کو تبلیغ تک محدود کر

دیا گیا ہے 'کیونکہ مکہ میں جہاد فرض نہ ہوا تھا' مدینہ میں تبلیغ کے بعد جہاد کا حکم بھی دیا گیا تھا۔ تحریک اسلامی میں اس نکتے پر غور کرنا بھی لازمی ہے اور ان آیات پر تحریکی انداز سے غور کرنا چاہئے جن میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اس دین کے تحریکی انداز کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ جہاد کے نصوص تحریکی نصوص ہیں۔ یہ آیات دعوت اسلامی کی راہنمائی تحریکی صورت حالات کو دیکھ کر کرتی ہیں اور تحریک کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان میں یہ ہدایات بھی موجود ہیں کہ ہم دعوت اسلامی کو تحریکی انداز دیں۔ ہمارے دور میں اسلام پر لکھنے والوں اور تحقیقات کرنے والوں کی اکثریت کے پیش نظر یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ اسلام کو مجمد نظام کے طور پر دیکھتے ہیں 'اسے بطور تحریک نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سمجھ میں نصوص جہاد نہیں آتے اور نہ وہ تحریکی زندگی میں نصوص جہاد کا کوئی مصداق تلاش کر سکتے ہیں۔

بعض لوگ تو یہ آیت یا اس قسم کی دوسری آیات پڑھتے ہیں۔

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳: ۴۰) "بے شک تمہارا کام پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے" اور اس فیصلے تک پہنچتے ہیں کہ داعی کا کام تبلیغ کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر انہوں نے پیغام پہنچا دیا تو بس ان کا فریضہ ادا ہو گیا۔ رہا جہاد تو ان لوگوں کے تصور میں بڑے علم کی حد تک 'اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

بعض لوگ اس قسم کی آیات کو پڑھ کر جہاد کو منسوخ تو نہیں کرتے لیکن جہاد کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتے ہیں۔ ان کو اتنی بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ یہ آیت مکی آیت ہے اور جہاد کے فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کو دیکھ نہیں پاتے کہ اسلام اور دعوت اسلامی ایک تحریک تھی اور اس تحریک کو مختلف مراحل میں مختلف ہدایت دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے محققین صرف کمروں میں بیٹھ کر نصوص قرآنیہ کا مطالعہ کرتے ہیں 'یہ کبھی تحریک اسلامی کا حصہ نہیں رہے۔ لیکن جو لوگ کمروں میں بیٹھے ہوں اور "قاعدون" ہوں یا "عابدون" ان کی سمجھ سے یہ آیات بالاتر ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ تبلیغ داعیان حق (خواہ رسول ہوں یا بعد میں آنے والے ہوں) کے کام کی اساس ہے۔ اور یہ تبلیغ بھی جہاد کے مراتب میں سے پہلا مرتبہ ہے۔ جب یہ تبلیغ صحیح خطوط پر ہو' اور اس دین کے اساسی حقائق کی تبلیغ کی جائے۔ ان اساسی عقائد کو فروعی باتوں سے مقدم رکھا جائے یعنی جب اللہ کی الوہیت کی تبلیغ کی جائے کہ وہ وحدہ خالق و مالک ہیں اور ربوبیت کی تبلیغ کی جائے کہ وہ وحدہ رب اور حاکم اور قانون ساز ہیں اور یہ تبلیغ سب سے اول درجے میں ہو' اور پھر یہ تبلیغ کی جائے کہ تمام لوگ صرف اللہ کے بندے اور غلام ہوں گے اور اس کے سوا کسی کی غلامی نہ کریں گے۔ نظام زندگی صرف اللہ سے اخذ کریں گے 'اور کسی اور ذریعہ سے اخذ نہ کریں گے 'تو اس قسم کے داعیوں پر جاہلیت پہلے دن ہی سے اپنی توجہ فوکس کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ صحیح تبلیغی ہوتے ہیں' ان کا نصب العین صحیح ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جاہلیت کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے اعراض کرتی ہے اور ان کو نظر انداز کرتی ہے' پھر چیلنج کرتی ہے' پھر مقابلہ کرتی ہے' پھر تشدد کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلام کے حامل داعیان کے سامنے جلد ہی جہاد کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ اور یہ صحیح تبلیغ کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيرًا

"اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرمین میں سے ایک دشمن بنایا ہے' اور تیرا رب ہی تیرے لیے راہنمائی اور مدد

کرنے کے لیے کافی ہے"۔ یہ ہے صحیح طریق کار اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

اس سورہ میں داعیان حق کے لیے ایک دوسرا سنگ میل بھی آتا ہے کہ انسان کی نیت و ارادے اور پھر اس کے عزم کے مطابق اس کی حرکت اور اس کے انجام و نتائج کے درمیان تعلق کیا ہے۔ چنانچہ یہ سورہ طے کرتی ہے کہ اللہ کی مشیت انسان کو اسی انجام تک پہنچاتی ہے۔ جس کا وہ ارادہ کرے' اس جانب حرکت کرے اور اس کے لیے جدوجہد کرے۔ لیکن نیت' ارادہ اور تحریک اور نتائج بہرحال اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اس اہم نکتے کی وضاحت کے لیے اس سورہ کے اندر جو آیات آئی ہیں وہی کافی ہیں۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور اس پر درج ذیل آیات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳: ۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی' اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔ نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی اور مددگار ہو سکتا ہے"۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۳: ۱۸) "جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی' ان کے لیے بھلائی ہے اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے اس سب کو فدیے میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸) (۱۳: ۲۷ – ۲۸) "کہو' اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (اس نبی کی) دعوت کو مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا

(۳۱) "پھر کیا اہل ایمان مایوس نہیں ہوگئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟"

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ

هَادٍ (۱۳:۳۳) "حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوت کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کے لیے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں' اور وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں۔ پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے"۔ ان آیات میں سے پہلی آیت اس امر میں صریح ہے کہ کسی قوم کے حال کو بدلنے کے معاملے میں اللہ کی مشیت اسی لائن پر چلتی ہے جس پر وہ قوم چلنے کا ارادہ کر لیتی ہے اور ایک ارادے 'ایک شعور اور عملی اقدام سے اپنے حال کو بدلنا شروع کر دیتی ہے۔ جب ایک قوم اس معنی میں اپنے حال کو بدلنا شروع کر دیتی ہے تو اللہ ان لوگوں کو ایسا کرنے کی توفیق دے دیتا ہے۔ لیکن جب کسی قوم کا حال یہ ہو جائے کہ اللہ ان کو برے انجام تک پہنچا دے تو اللہ کا ارادہ بھی نافذ ہو جاتا ہے اور اس پر کوئی حد بندی نہیں ہوتی اور پھر ان کو اللہ سے کوئی اور بچا نہیں سکتا اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی دوست و مددگار ہو سکتا ہے۔

لیکن جب وہ اللہ کی دعوت پر لبیک کہہ دیں اور اس دعوت کو قبول کرنے کے بعد اپنے حالات بدلنا شروع کر دیں' تو اللہ بھی ان کے ساتھ بھلائی کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اگر وہ اللہ کی دعوت کو قبول نہ کریں تو اللہ ان کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ سخت حساب ہوتا ہے اور وہ پھر کوئی بڑے سے بڑا جذبہ یا جرمانہ دے کر بھی وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتے کیونکہ انہوں نے دعوت قبول ہی نہیں کی اور یہ ان کا ہوگا انجام آخرت میں!

دوسری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعوت پر لبیک کہنا یا نہ کہنا ان کی حرکت اور ان کے ارادے پر موقوف ہے۔ اور اللہ کی مشیت ان کے اس ارادے اور حرکت کے ذریعہ ہی کام کرتی ہے۔

تیسری آیت کا پہلا حصہ تو یہ بتاتا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور اس کی مشیت بے قید ہے' لیکن اس آیت میں دوسرا حصہ یہ ہے وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ "اور اپنی طرف ہدایت اس شخص کو دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔ یعنی ہدایت کا فیصلہ اس کے بارے میں ہوتا ہے جو رجوع الی اللہ کرے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ گمراہ اس کو کرتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ جو دعوت قبول کرتا ہے اور پھر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے' اس سمت میں چلتا ہے تو اس کو گمراہ نہیں کرتا اور یہ اللہ کا وعدہ ہے' جو اس نے کیا۔ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں گے' ہم ضرور اپنی راہوں کی طرف ان کی رہنمائی کریں گے"۔ تو یہ ہدایت اور یہ ضلالت اللہ کے اس نظام مشیت کا تقاضا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے جاری کیا ہے۔ لیکن یہ مشیت ان پر چلتی ہے' جن خطوط پر لوگ اپنے حالات و اوصاف بدلنے کا ارادہ کر لیں اور چل پڑیں۔ قبولیت کی راہ پر یا انکار کی راہ پر۔

چوتھی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت پر لے آتا۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کی مشیت یوں ہوتی تو تمام لوگوں کو ایک ہی استعداد پر پیدا کر دیتا اور یہ استعداد ہدایت ہوتی یا ان کو راہ راست پر چلنے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ ان کے اندر ہدایت و ضلالت دونوں کی استعداد ہو۔ یہ نہ چاہا کہ ان سے ضلالت کی استعداد ہی سلب کر لی جائے یا ہدایت کی استعداد سلب کر لی جائے۔ بلکہ اللہ نے یوں چاہا کہ ہدایت و ضلالت کی

راہ پر چلانے کے لیے اپنی مشیت کو ان کے فعل کو قبول دعوت اور انکار دعوت پر چھوڑ دیا۔ اب جو دلائل ایمان پر غور کر کے "ہاں" کہہ دے وہ ہدایت کی راہ پر چل پڑے گا اور جو "نہیں" کہہ دے وہ گمراہی کی راہ پر چل نکلے گا۔

رہی پانچویں آیت 'کہ جو لوگ انکار کرتے ہیں تو اللہ نے ان کی انکار ہی کو ان کے لیے مزین کر دیا ہے' اور وہ راہ راست پر آنے سے روک دیئے گئے ہیں' تو اس آیت کو جن لوگوں نے قرآن کے نصوص سے الگ کر کے پڑھا ہے' اس کے نتیجے میں اسلامی عقائد کی تاریخ میں مسئلہ جبر و اختیار کی مباحث پیدا ہوئے۔ لیکن اس آیت کو اگر دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے' جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں تو اس سے بھی مسئلہ جبر و اختیار میں ایک جامع تصور سامنے آتا ہے۔ ان کے اعمال کو ان کے لیے' جو مزین کر دیا گیا ہے' اور انہیں راہ راست پر آنے سے روک دیا گیا ہے تو یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے انکار کر دیا اور انکار کی راہ پر اس قدر آگے بڑھے کہ پھر مکاریاں شروع کر دیں۔ یہ اس طرح ہوا جس طرح اللہ نے فرمایا کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے بدلنے کا ارادہ اور سعی نہیں کرتی خواہ راہ ہدایت پر یا راہ ضلالت پر۔ لہٰذا ان کے اعمال کی تزئین اور راہ راست سے روکنا ان کے اپنے ارادے اور فعل سے ہوا۔

اب اس بحث کی تکمیل ہو گئی تاکہ یہ موضوع صاف ہو جائے جس میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری ملتوں کے لوگوں نے بھی الجھن محسوس کی۔ وہ یہ کہ خود لوگوں کا ارادہ بھی ان کے انجام کے متعین کرنے میں فائنل نہیں ہے۔ کیونکہ ارادہ اور عمل و نتائج بھی اللہ کی تقدیر کے تابع ہیں۔ ہر واقعہ اور حادثہ (ارادہ بھی واقعہ ہے) اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے اور تقدیر کے ذریعہ اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت پوری ہوتی ہے۔ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ "ہم نے ہر چیز کو ایک انداز کے مطابق پیدا کیا"۔ اس کائنات کے نظام میں خودکاری نہیں ہے' اور نہ اسباب کا ایسا نظام ہے کہ سبب کے نتیجے میں مسبب کا ہونا لازمی ہو۔ سبب اور مسبب دونوں نظام قضا و قدر کے تحت ہیں۔ لہٰذا لوگوں کی توجہ اور ارادہ جو وہ اپنے کسی فیصلے کے بارے میں کرتے ہیں وہ تب ہی کرتے ہیں کہ اللہ کا نظام مشیت ان کی راہ ہموار کر دے اور یہ مشیت نظام تقدیر کے مطابق چلتی ہے۔ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ "اس کے ہاں ہر چیز کی مقدار متعین ہے"۔

یہ آیات' جس طرح ہم نے اس سورہ پر تبصرے کے وقت کہا' انسان کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام کائنات میں انسان نہایت ہی اہم اور مکرم مخلوق ہے۔ کیونکہ یہ واحد مخلوق ہے کہ یہ جو ارادہ کرے گا خود اللہ کا نظام مشیت اس سمت پر چلتا ہے۔ خدا خود بندے سے پوچھتا ہے کہ تم نے کدھر جانا ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ خدا بندے کی رضا پر اپنے نظام مشیت کو چلائے اور یہ اس انسان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔

اس سورہ میں ان لوگوں پر جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور اس دین کو قبول کرنے سے انکار کیا' یہ فیصلہ نافذ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں انسانی "شخصیت" فساد پذیر ہو گئی ہے اور انسان کے اندر قبول حق کی جو فطری استعداد اور صلاحیت رکھی گئی ہے اس نے کام چھوڑ دیا ہے اور انسان کا مزاج' اپنی متوازن اور درست سطح سے گر گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان کی فطرت اپنی جگہ درست معیار پر ہو' اور اس کی انسانیت کی سطح بھی برقرار ہو' وہ بگڑ نہ گئی ہو' معطل نہ کر دی گئی ہو اور اس کے اندر فساد نہ ہو گیا ہو' اور اس کے سامنے صحیح قرآنی انداز میں حق پیش کر دیا گیا ہو اور وہ قبول نہ کرے۔ اور اسلام نہ لے آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایسی فطری دعوت ہے کہ وہ ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں از خود موجود ہے۔ اگر انسان اس راہ حق کو قبول نہیں کرتا یا اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ

ڈال دی گئی ہے تو یہ سب کچھ اس کے اپنے فساد انسانیت کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ انسان خود اپنے اس فطری بگاڑ کی وجہ سے ضلالت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور پھر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے جیسا کہ دوسری سورہ میں اللہ نے فرمایا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ (۷:۱۴۶) "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں' وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے"۔

اس سورہ میں ایسی آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر ہی دراصل اندھے پن اور فطری بصیرت کے خاتمے کا نام ہے۔ اور ہدایت کے معنی یہ ہیں کہ ہدایت پانے والی شخصیت اور فطرت سلامت ہے اور اس کی فہم و ادراک کی قوتیں کام کر رہی ہیں' ورنہ اس کائنات کے اندر واضح دلائل ہدایت موجود ہیں بشرطیکہ کوئی عقل سے کام لے اور غور و فکر کرے۔

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰی اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹) الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ (۲۰) وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۲۱) وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَی الدَّارِ (۲۲)

(۱۳:۱۹ تا ۲۲) "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے' دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں' اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ ہمارے دیئے

ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں۔ اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے"۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ

(۲۹) (۱۳: ۲۷ تا ۲۹) "یہ لوگ جنہوں نے (رسالت محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے' کہتے ہیں: "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری"--- کہو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے"۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (٤) (۱۳: ۳ - ٤) "اور وہی ہے جس نے زمین پھیلا رکھی ہے' اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں' اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں"۔

یوں یہاں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ کلمہ شہادت کو تسلیم نہیں کرتے وہ اندھے ہیں۔ وہ غور و فکر نہیں کرتے' اور عقل سے کام نہیں لیتے اور چونکہ وہ لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں وہ عقلمند ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ قلوب اس منزل کو پا لیتے ہیں جس کو ان کی فطرت جانتی ہے اور چونکہ وہ اسکے عادی ہوتے ہیں اس لیے وہاں پہنچ کر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اس دنیا پر بسنے والے انسانوں کا مطالعہ اگر کیا جائے تو انسان اللہ کے ان اقوال و آیات کا مصداق وہ اس دنیا میں پائے

گا' ان لوگوں کی شکل میں جو اس حق سے منہ موڑتے ہیں جو دین اسلام کی شکل میں نازل ہوا ہے ۔ یہ دین کامل و مکمل حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور یہ لوگ بگڑی ہوئی فطرت کا نمونہ ہیں ان لوگوں کی شخصیت کے وہ پرزے ہی زنگ آلود ہو گئے ہیں جن کے ذریعے انسان اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات سے سچائی کے سگنل وصول کرتا ہے جبکہ یہ پوری کائنات حمد باری کر رہی ہے ۔ اس کی وحدانیت اور قدرت اور تقدیر اور تدبیر کے نظام کو علانیہ ظاہر کر رہی ہے ۔

قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ جو لوگ اس سچائی پر ایمان نہیں لاتے وہ اندھے ہیں اور اللہ ان کو اندھا کہتا ہے ۔ لہٰذا پھر ایسے مسلمانوں کے لیے یہ بات شایان شان نہیں ہے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں' قرآن کو وحی الہیٰ سمجھتے ہیں' وہ اپنی زندگی کے معاملات میں سے کسی معاملے میں اندھوں سے تعلیم اور راہنمائی حاصل کریں ۔ خصوصاً ایسے معاملات میں جن کا تعلق ایسے امور سے ہو جن کے ذریعہ حیات انسانی پر خوب و ناخوب کا حکم لگایا جاتا ہو ۔ نہ ایسے لوگوں سے زندگی کی بنیادی اقدار کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہئے ۔ نہ ان سے سوسائٹی کے رسوم و آداب اور کلچر سیکھنا چاہئے کیونکہ ان کی فطرت بگڑ چکی ہے اور وہ اندھے ہیں ۔

یہ ہے ہمارا موقف غیر اسلامی افکار و فلسفوں کے بارے میں ۔ ہاں خالص مادی علوم کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود فرمایا : انتم اعلم باموردنیاکم "تم اپنے دنیا کے امور کے بارے زیادہ جانتے ہو" ۔ غرض ایک مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے جو اس حق کو جانتا ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف آیا ہے' وہ کسی کافر کے سامنے بیٹھے یا زانوئے تلمذ تہ کرے جبکہ وہ اس سچائی کا منکر ہو' کیونکہ قرآنی رو سے وہ اندھا ہے اور اگر کوئی مسلم اللہ کی شہادت کو رد کرتا ہے تو پھر وہ مسلم نہیں رہ سکتا ۔

ہمیں چاہئے کہ اس دین کو سنجیدگی سے لیں ۔ اور اس کے فیصلوں کو آخری فیصلے سمجھیں اور اگر کوئی ایسے معاملات میں ترقی کرتا ہے تو وہ بنیادی عقیدے اور بنیادی نظریہ میں مداہنت کرتا ہے' اللہ کی شہادت کو رد کرتا ہے ۔ اس صورت میں تو یہ واضح کفر ہو گا ۔

زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آج ہمارے دور کے بعض لوگ یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ مسلم ہیں' اس کے بعد انسانوں کے نظام زندگی فلاں اور فلاں سے اخذ کرتے ہیں اور ان فلاں اور فلاں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

اِنَّهُمْ عَمِیْنَ "وہ اندھے ہیں" ۔ اور پھر بھی یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ مسلم ہیں ۔

یاد رہے کہ یہ دین ایک سنجیدہ دین ہے' اس کے ساتھ مزاح برداشت نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ تو ایک حتمی فیصلہ ہے ۔ اس میں کوئی مداہنت نہیں ہے ۔ اس کی ہر آیت اور ہر لفظ حق ہے ۔ اگر کوئی اس اعتماد' اس جزم اور اس عزم اور اس سنجیدگی سے اس دین کو قبول نہیں کرتا تو اس دین کو کسی ایسے مداہن کی ضرورت نہیں اور اللہ تو غنی عن العالمین ہے ۔

یاد رہے کہ کسی مسلم پر جاہلی کلچر کا اس قدر دباؤ نہیں ہونا چاہئے کہ مسلمان نظام جاہلیت سے اپنا نظام زندگی اور کلچر اخذ کرے جبکہ وہ جانتا ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تعلیمات لے کر آئے ہیں وہ حق ہیں ۔ یہ بات بھی حق ہے کہ اس سچائی سے اندھا اس کو نہیں جان سکتا ۔ اگر پھر بھی وہ کسی اندھے کا شاگرد بنتا ہے اور اس سے علم و ثقافت لیتا ہے اور اللہ کی شہادت کے بعد تو یہ اس کی مرضی ہے ۔

اب ہمارے سامنے اس سورہ کا آخری سنگ میل آتا ہے جو اس سورہ نے نصب کیا ہے ۔ یہ کہ اللہ کی طرف سے جو

سچائی قرآن کی شکل میں آئی اور لوگوں نے اس کا انکار کر کے اندھے ہونے کا ثبوت دیا تو یہ انکار ہی دراصل مبداء اس فتنہ و فساد کا ہے جو اس دنیا میں پھیلا ہوا ہے کیونکہ اس سچائی کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ انسانوں کو خیر اور بھلائی اور امن اور معروف کی طرف بلائے۔ لہٰذا جو لوگ اپنی فطرت کے عہد کو بھول جاتے ہیں اور اپنی عقل و فکر سے بھی کام نہیں لیتے اور اس سچائی کو مسترد کر دیتے ہیں جبکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ حق اور سچائی صرف اس تعلیم میں ہے جو قرآن میں ہے تو یہی لوگ ہیں جو مفسد فی الارض ہیں جبکہ ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جو اسے قبول کرتے ہیں۔ وہ مصلح ہیں اور اس دنیا کی زندگی کو پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں۔

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹) الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ (۲۰) وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۲۱) وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۲۲)

(۱۳: ۱۹ تا ۲۲) "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے' دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں' اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ ہمارے دیے ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں۔ اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں' آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے"۔

وَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓىٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳: ۲۵) "رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں' جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے' اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں' وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے"۔

یاد رہے کہ انسانوں کی زندگی اس وقت تک اصلاح پذیر نہیں ہو سکتی جب تک ان کی قیادت ایسے اصحاب بصیرت

اور عقلمند لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو یہ جانتے ہوں کہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا ہے وہ برحق ہے ' اور انہوں نے ازل کے دین تخلیق فطرت کے وقت اللہ کی دعوت کو تسلیم کرنے کا جو پختہ عہد کیا تھا اس کا پاس رکھتے ہوں ۔ پھر آدم علیہ السلام سے ادھر جو انبیاء لوگوں سے عہد لیتے آئے ہیں ' اس کا بھی وہ پاس رکھتے ہوں اور ان کا یہ عزم ہو کہ صرف اللہ کی بندگی کریں گے ۔ صرف اس کے نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کریں گے ۔ کسی دوسرے سرچشمہ سے ہدایات اخذ نہ کریں گے ' صرف اللہ کے اوامر اور نواہی پر عمل کریں گے ' اللہ نے جن روابط کو جوڑنے کا حکم دیا انہیں جوڑیں گے ۔ جو ہر وقت ڈرتے ہیں کہ ان سے کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو اللہ کو ناراض کر دے ' اور وہ آخرت میں برے حساب سے بھی ڈرتے ہیں اور اپنی ہر سوچ ' ہر عمل اور ہر حرکت میں آخرت کے حساب کو مد نظر رکھتے ہوں ۔ وہ اس عہد الٰہی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو انگیز کرتے ہیں ۔ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال سے خفیہ اور ظاہری طور پر خرچ کرتے ہیں ۔ اور زمین میں سے برائی ' فساد اور شر کی اصلاح برائے احسان سے کرتے ہیں ۔ صرف ایسے ہی لوگ اس زمین کی اصلاح کر سکتے ہیں اور یہی اس کے مستحق ہیں کہ وہ قائد ہوں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر لوگوں کی زندگی کی اصلاح صرف ایسی ہی بالصبر اور عقلمند شہادت کے ذریعے ممکن ہے جو صرف اللہ کی ہدایات پر چلے جو پوری زندگی کو اللہ کے احکام و ہدایات کے مطابق ڈھال دے اور یہ بھی حقیقت ہے ۔ گمراہ اور اندھی قیادت کے ذریعہ اصلاح ممکن ہی نہیں ہے جن کے پاس یہ یقین ہی نہ ہو کہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا ہے وہ حق ہے ' اور اس وجہ سے وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی ہدایات اور طریقوں پر چلتی ہو ' حالانکہ اللہ کی مرضی اس میں نہیں ہے کہ اس کے بندوں پر ایسے احکام اور نظام نافذ کیے جائیں جو اصلاح نہیں کرتے ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانوں کی اصلاح نہ سرمایہ دارانہ نظام سے ہوتی ہے اور نہ اشتراکی نظام سے اور نہ کسی سیکولر نظام سے اس لیے کہ یہ سب نظام اندھا پن ہیں اور یہ نظام یہ یقین نہیں رکھتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ نازل ہوا وہی حق ہے ۔ جس سے ادھر ادھر ہونا جائز نہیں ہے ۔ پھر انسانیت کی اصلاح نہ تھیاکریسی سے ہو سکتی ہے اور نہ کسی ڈکٹیٹرشپ سے ۔ نہ نظام جمہوریت سے انسانیت کی اصلاح ہو سکتی ہے کیونکہ یہ سب طریقہ ہائے کار اور سیاسی نظام اندھے ہیں ۔ یہ نظام خود اپنے لیے رب گھڑتے ہیں ؟ خود اپنے لیے نظام ہائے حکومت تجویز کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی ۔ پھر یہ لوگوں سے خود ان قوانین کی پابندی کراتے ہیں ۔ اور ان کو اپنا غلام بناتے ہیں ۔

یہ بات جو ہم کہتے ہیں اور ہماری بات نص قرآنی پر مبنی ہے لیکن اس کا ثبوت اس صورت حالات سے ملتا ہے جو اس وقت پوری دنیا میں پائی جاتی ہے ۔ ایک عام بدبختی ہے جس میں یہ کائنات گرفتار ہے ۔ مشرق سے مغرب تک ' چاہے جاگیردارانہ سرمایہ داری ہو ' یا لادینی اشتراکی ممالک ہوں ۔ یا دوسرے وہ علاقے جن میں ڈکٹیٹرشپ نافذ ہے ' ایسے تمام علاقے اس وقت ' بدنصیبی ' بدحالی اور ظلم و عدوان سے بھرے ہوئے ہیں ۔ اس لیے کہ ان علاقوں کی تمام قیادتیں اندھی قیادتیں ہیں ۔ اور وہ اس سچائی سے محروم ہیں جو حضرت محمد پر اتری ہے ۔ نہ یہ الٰہی تعلیمات کا پاس رکھتی ہیں اس لیے انسانی زندگی ان نظاموں کے تحت کسی جگہ بھی درست نہیں ہے ۔

جہاں تک ایک سچے مسلم کا تعلق ہے وہ تو اپنے ایمان اور اس عقیدے کے تقاضوں کے مطابق ان تمام تقاضوں کو

پرے پھینک دیتا ہے' جو حضرت محمدؐ کی تعلیمات سے ماخوذ نہ ہوں' چاہے وہ نظام اجتماعی سیاسی نظام ہو یا کوئی اقتصادی نظام ہو' یا کوئی سیاسی طرز عمل ہو۔کیونکہ مسلمان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اسلامی شریعت ہی اس کا دستور اور منشور ہے۔ وہی نظام اس کے ہاں مقبول ہو گا جو خدا اور رسول نے اپنے صالح بندوں کے لیے تجویز کیا ہے ۔ اور اگر کوئی مسلمان کوئی اور نظام اخذ کرنے کی مذموم حرکت کرتا ہے تو محض غیر اللہ کا نظام زندگی اپناتے ہی وہ دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور ان لوگوں کے دین اور طریق زندگی میں داخل ہوتا ہے جن سے وہ یہ نظام اخذ کرتا ہے ۔

کسی مسلمان کا کوئی جاہلی نظام اخذ کرنا' ایک تو اسلام کے خلاف ایک حرکت اور بغاوت ہے لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اس حرکت سے وہ خلافت فی الارض کے منصب جلیل کو ایسی قیادت کے حوالے کر دیتا ہے جو اندھی قیادت ہے ۔ جاہلی نظاموں کی قیادت پر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے ازلی اور فطری عہد کو توڑتے ہیں ۔پھر دنیا میں اللہ نے جن روابط کو قائم کرنے کا حکم دیا ہوتا ہے یہ ان کو توڑتے ہیں ۔پھر یہ فساد فی الارض مچاتے ہیں اور ان تمام فسادات کی جڑ بھی یہ اندھی قیادت ہوتی ہے ۔

انسانیت نے بدبختی اور مصیبت کے طویل دن دیکھے ہیں اور پوری تاریخ میں انسانیت مختلف نظام ہائے زندگی' مختلف طور طریقوں اور مختلف کلچرز کے اندھیروں میں 'اس اندھی قیادت کی پیروی میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی ہے ۔ اس اندھی قیادت نے کبھی فلاسفہ اور مفکرین کا لباس اختیار کیا' کبھی صدیوں تک اس نے قانون سازوں اور سیاست دانوں کا لباس پہنا' لیکن اسے فلاح اور کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اندھی قیادت کے زیر سایہ انسانوں کی انسانیت بلند نہ ہو سکی اور انسان کبھی بھی اس معیار تک نہ پہنچ سکے کہ انہیں خلیفتہ اللہ فی الارض کہا جا سکے ۔ صرف اسلامی نظام حیات کے زیر سایہ ایک عرصہ کے لیے انسانیت نے سربلندی حاصل کی تھی اور اسلامی نظام حیات کا یہ پیریڈ انسانی تاریخ کا یادگار زمانہ رہے گا ۔

دعوت الی اللہ کی حقیقی شاہراہ پر اس سورہ نے یہ واضح سنگ ہائے میل نصب کیے تھے ۔ہم نے قارئین کو ان سنگ ہائے میل کے پاس لا کھڑا کیا ۔اگرچہ ہم اس سورہ کے اشارات کا حق ادا نہیں کر سکے 'البتہ ہم نے قارئین کو سمت دکھا دی ہے ۔

الحمد للہ الذي هدانا لهذا وما كنا لنهدي لولا ان هدانا الله

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد چہارم

پارہ ----- ۱۳

سورۃ ابراہیم ـ ۱۴

۱ --- تا --- ۵۲

سورۂ ابراہیم ایک نظر میں

سورۂ ابراہیم ایک کمی سورہ ہے اور اس کا موضوع وہی ہے جو اکثر کمی سورتوں کا موضوع ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی مسائل' وحی و رسالت' عقیدۂ توحید' بعث بعد الموت اور حساب و کتاب اور جزاء و سزا۔

لیکن اس موضوع کو پیش کرنے اور اس کے بنیادی حقائق بیان کرنے کے سلسلے میں یہ سورہ ایک خاص منہاج بحث و بیان اختیار کرتی ہے' جس طرح قرآن کریم کی تمام سورتوں میں منفرد نہج کلام اختیار کیا جاتا ہے۔ ہر سورہ کی اپنی فضا' اپنا طریقہ ادا' خاص رنگ اور روشنی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ موضوع کے اساسی حقائق پیش کرتی ہے۔ اس سورہ کے اساسی حقائق کا رنگ ڈھنگ موضوع کے اعتبار سے دوسری کمی سورتوں جیسا ہی ہے لیکن ان حقائق کو مخصوص زاویہ سے پیش کر کے اور مخصوص روشنی میں پیش کر کے اس کے اشارات و اثرات کو دوچند کر دیا گیا ہے۔ ان بنیادی حقائق کو بیان کرتے ہوئے یہ سورہ اپنے طول و عرض اور طرف و حال کے مطابق حقائق کے بعض اطراف میں کمی اور بعض میں بیشی کر دیتی ہے' یوں وہی حقائق یہاں جدید حقائق نظر آتے ہیں اور اس طرح یہ سورہ فنی اعتبار سے شاہکار ادبی اقتباسات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کے نام "سورہ ابراہیم" سے اس کی مخصوص فضا نمایاں ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابو الانبیاء تھے۔ وہ نہایت ہی مبارک' اللہ کے شکر گزار اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے اور نہایت ہی عاجزی کے ساتھ عبادت کرنے والے تھے۔ ان صفات ابراہیمی کا پورا سایہ اس سورہ پر چھایا ہوا ہے۔ ان تمام حقائق پر بھی ابراہیمی رنگ غالب ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ طرز ادا اور اس کے اثرات پر بھی ابراہیمی رنگ غالب ہے۔

اس سورہ میں کئی نظریاتی حقائق بیان کیے گئے ہیں' لیکن دو باتیں پوری سورہ پر چھائی ہوتی ہیں اور یہ دونوں باتیں حضرت ابراہیم کے زیر سایہ ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ یہ سورہ تمام رسالتوں اور تمام رسولوں کو ایک ہی حقیقت سمجھتی ہے اور یہ کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک تھی۔ ان کا موقف ایک تھا' ایک ہی امت تھی جو ہمیشہ جاہلیت کے مقابلے میں کھڑی ہوگئی۔ جاہلیت بھی ہمیشہ ایک ہی رہی ہے یعنی وہ قوت جو دین اللہ کی تکذیب کرتی تھی۔ اگرچہ زمانے مختلف تھے اور اگرچہ رسولوں کے علاقے مختلف تھے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر بے شمار نعمتیں نازل کیں اور اگر بندے اللہ کا شکر ادا کریں تو ان انعامات الہیہ میں شکر کے ذریعے اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر کوئی قوم کفر اور ناشکری کرے اور اکثر لوگ ایسا کرتے رہتے ہیں تو اللہ کا عذاب بھی آتا ہے۔

یہ دونوں حقائق یا یہ دونوں پرتو اور رنگ اگرچہ اپنی جگہ ہیں اور ساری سورہ کے روح رواں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ سورہ میں دوسرے حقائق بھی موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں حقائق کا سایہ اس پوری سورہ پر غالب ہے۔ یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری تھا۔

سورہ کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ کسی رسول کا منصب رسالت ہوتا کیا ہے۔ اس کے بنیادی فرائض کیا

ہوتے ہیں؟ یہ کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لانا' یہ کام وہ اپنے شوق سے نہیں کرتے بلکہ اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔

الر کتٰبٌ انزلنٰہُ الیکَ لِتُخرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّورِ باِذنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ (۱۴ : ۱) لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "اے محمدؐ' یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ' ان کے رب کی توفیق سے' اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے"۔ اس کا خاتمہ بھی اسی مضمون پر ہوتا ہے۔ آخر میں اسی عظیم حقیقت یعنی عقیدۂ توحید پر ہوا ہے۔

ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِیُنْذَرُوْا بِہٖ وَ لِیَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّ لِیَذَّکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۴ : ۵۲) "یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آ جائیں"۔ اس سورہ میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی پیغام کے ساتھ بھیجا گیا تھا جس کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجے گئے ہیں اور ان کی بعثت کے مقاصد بھی وہی تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہیں۔ ان کے لیے قرآن کریم جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ بھی وہی ہیں جو حضرت مد کے لیے استعمال ہوئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۱۴ : ۵) "ہم اس سے قبل موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں۔ اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا"۔ اس سورہ میں بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کا عمومی فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا پیغام لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ (۱۴ : ۴) "اور ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے' اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے"۔ رسولوں کے فرائض کے ساتھ ساتھ رسولوں کی شخصیت کی حقیقت بھی یہاں بیان کر دی گئی ہے اور ان کی ذات کی قوت اور اختیارات ہی ان کے فرائض منصبی کی حدود کا تعین کرتے ہیں۔ یہ کہ ایک رسول محض مبلغ' ناصح اور کھلا ڈرانے والا ہوتا ہے۔ وہ کوئی معجزہ از خود نہیں دکھا سکتا۔ اگر ان کے ہاتھوں کسی معجزے کا صدور ہوتا ہے تو وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور جس وقت اللہ کی مشیت ہوتی ہے اس وقت صدور ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جس وقت رسول چاہے یا اس کی قوم چاہے معجزے کا صدور ہو جائے۔ اسی طرح کسی بھی رسول کے اختیار میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ کسی کو از خود ہدایت دے دے یا گمراہی میں چھوڑ دے۔ ہدایت اور ضلالت اللہ کی سنت کے مطابق لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

رسولوں کی بشریت پر ہمیشہ اہل جاہلیت نے اعتراض کیا ہے۔اس سورہ میں بھی اہل جاہلیت نے رسولوں کی بشریت پر ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۴ : ۱۰) "انہوں نے کہا' تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں' تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہے۔اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند"۔اسی طرح رسولوں نے بھی یک زبان ہو کر ان کے اس خیال کی تائید کی۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(۱۴ : ۱۱) "ان کے رسولوں نے ان سے کہا' واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' نوازتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے' کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے"۔
دوران مضمون یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کو اندھیروں سے نکالنا اور روشنیوں میں داخل کرنا بھی اللہ کے اذن ہی سے ہو سکتا ہے۔جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے' ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ قوم کے سامنے پیغام کھول کر بیان کر دیں۔ اس کے بعد یہ کام اللہ کا ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۴ : ۴) "پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔وہ بالادست اور حکیم ہے"۔ان باتوں سے رسولوں کی حقیقت کا تعین بھی ہو جاتا ہے اور ان کے فرائض کا تعین بھی ہو جاتا ہے۔رسولوں کی بشری حقیقت اور صفات میں سے کوئی چیز بھی ذات الہی اور صفات الہیہ کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتی۔یوں اللہ کی ذات و صفات سے کسی قسم کی مماثلت کی نفی ہو جاتی ہے۔

اس سورہ میں اہل ایمان کے ساتھ صاف صاف وعدہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یقیناً پورا ہوتا ہے۔وہ یہ کہ اہل ایمان کو دنیا میں بھی اللہ کی مدد حاصل ہو گی اور ان کو اس زمین پر اقتدار اعلیٰ اور خلافت فی الارض کا منصب دیا جائے گا اور آخرت میں تو وہ جنتوں اور نعمتوں میں ہوں گے اور مکذبین کو داخل جہنم کیا جائے گا۔
قرآن مجید اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے کہ تمام رسول یک زبان ہو کر یہ بات کہتے ہیں اور ان کی امتیں اور تمام اقوام بھی رسولوں کو یک زبان ہو کر یہی بات کہتی ہیں :

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّٰلِمِينَ (۱۳) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ (۱٤) وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (۱۵)

(۱۴ : ۱۳ تا ۱۵) ”اور منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے ۔ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے ۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو ۔ انہوں نے فیصلہ چاہا تو ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی“ ۔ یہ سورہ معرکہ حق و باطل کی تصویر کشی مناظر قیامت میں بھی کرتی ہے ۔ وہاں اہل ایمان کی حالت یہ ہو گی ۔

وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَٰمٌ (۱۴ : ۲۳) ”جو لوگ دنیا میں ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہو گا“ ۔

اور کافروں کی حالت یوں ہو گی ۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ (۴۹) سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ (۵۰) (۱۴ : ۴۹ ۔ ۵۰) ”اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے تارکول کے لباس پہنے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے“ ۔ اس معرکے کو یہ سورہ ضرب الامثال کی صورت میں بھی بیان کرتی ہے ۔ اہل حق کی مثال یوں دی جاتی ہے ۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۲۴) تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۲۵) وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۲۶) يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۲۷) (۱۴ : ۲۴ تا ۲۷) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اچھی ذات کا درخت 'جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثال اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے' اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا و آخرت' دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے' اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے"۔

اور دوسری جگہ ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۱۴ : ۱۸) "جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔ یہ پرلے درجے کی گم گشتگی ہے"۔

اس سورہ کی پوری فضا پر دو حقائق چھائے ہوئے ہیں اور یہ دونوں حقائق ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ حضرت ابراہیم عبد شکور تھے' اللہ کی طرف یکسو ہونے والے' اور اللہ کے سامنے گڑگڑانے والے بندے تھے۔ ان دو حقائق میں سے ایک یہ ہے کہ تمام رسول اور تمام رسالتیں در حقیقت ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ تمام رسولوں کی دعوت ایک تھی' تمام کی امت ایک ہی امت تھی اور تمام امتوں نے اپنے اپنے دور میں جاہلیتوں کا مقابلہ کیا۔ دوسری حقیقت اس پوری سورہ کی فضا پر یہ چھائی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت عام ہے۔ تمام انسانوں پر اور ان میں سے اپنے مختار بندوں پر سب سے زیادہ اللہ کا احسان ہے۔ ان دونوں نکات پر ہم ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔

پہلی حقیقت کو اس سورہ میں ایک منفرد طرز بیان میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن یوں کہ ہر رسول انفرادی طور پر منظر پر آیا ہے' اس نے اپنی دعوت پیش کی ہے' اس نے اپنی قوم سے انفرادی طور پر خطاب کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا رسول آیا ہے' پھر تیسرا آیا ہے اور سب نے ایک ہی بات کی ہے اور سب کو اس کی قوم نے ایک ہی جواب دیا ہے۔ پھر اللہ نے سب کے ساتھ ایک ہی سلوک کر دیا ہے۔ بعض کو دنیا میں سزا دی ہے اور بعض کو آخرت کے لیے مہلت دے دی ہے۔ لیکن طرز ادا یہ تھی کہ ہر رسول اپنی باری پر اسٹیج پر آیا اور اپنی بات کی اور چلا گیا۔ جس طرح کوئی فلم چلتی ہے اور مختلف کردار آتے اور جاتے ہیں۔ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں خصوصیت کے ساتھ یہ انداز اختیار کیا گیا تھا۔

لیکن سورہ ابراہیم 'یعنی ابوالانبیاء کی سورہ میں تمام نبیوں کو ایک ہی جمعیت کی صورت میں ایک ہی صف میں کھڑا کیا گیا ہے۔ سب کی کشمکش اکٹھی دکھائی گئی ہے اور وہ قوم سے یکبارگی مخاطب ہیں۔ اقوام بھی یکبارگی جواب دیتی ہیں اور یہ کشمکش قیامت تک چلتی دکھائی گئی ہے۔

یوں نظر آتا ہے کہ سب رسولوں کی امت ایک جگہ ہے۔ تمام امم جاہلیہ بھی ایک جگہ جمع ہیں۔ زمان و مکان کے

فاصلے مٹا دیے گئے ہیں۔ گویا ان کے بیان مکان و زمان کے فاصلے عارضی تھے جو الٹا دیے گئے۔ یہاں صرف دو عظیم حقائق کی کشمکش دکھائی گئی ہے یعنی ایمان اور کفر۔ ایک طرف ایمان ہے اور دوسری طرف کفر اور اشخاص کے بجائے یہ دونوں حقائق ایک دوسرے سے مخاطب ہیں۔ ان کے مقابلے میں زمان و مکان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۹) قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓي اَجَلٍ مُّسَمًّي قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۰) قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ عَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۱) وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰٓي اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (۱۳) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱٤) (۱٤: ۹ تا ۱٤)) "کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح" عاد" ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے"؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لیے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو' ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدت مقرر تک مہلت دے۔ انہوں نے جواب دیا "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں' تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے

ہو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے - اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند" - ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان - لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں - سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے - اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہئے - آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے" - جب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے - یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو" -

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۵) مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ (۱۶) يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (۱۷) (۱۴ : ۱۵ تا ۱۷) "انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی' پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے - وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا - موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا -

یہاں ان آیات میں نوح علیہ السلام سے لے کر تمام اقوام اور تمام رسولوں کا سوال و جواب ایک ایک کر کے دے دیا گیا - یہاں زمان و مکان کے فاصلے دور ہو جاتے ہیں' ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے' یہ کہ آدم کے بعد نبی آخر الزمان تک تمام رسولوں کی رسالت اور دعوت ایک ہے اور اس دعوت پر تمام اہل جاہلیت کا اعتراض بھی ایک ہے' اور یہ کہ تمام متکبرین' منکرین کا انجام بھی ایک ہے کہ وہ آخر کار شرمندہ و ناکام رہیں گے اور وہ عذاب جو ان سب منکرین حق کا انتظار کر رہا ہے' وہ بھی ایک ہے - نیز اللہ کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا :

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ" - اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں نقل کرنا

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۵)
"اور ہم نے موسیٰ کو رسول بنا کر بھیجا تھا اپنی نشانیوں کے ساتھ کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لاؤ - یہ دونوں احکام ایک ہی قسم کے ہیں - انبیاء و رسل اور اہل کفر کا یہ معرکہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ معرکہ میدان آخرت میں بھی برپا ہوتا ہے - قیامت کے مختلف مناظر میں بھی اس معرکے کے کچھ نشانات ملتے ہیں اور اس سورہ میں بھی

اس کے چند نمونے موجود ہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (۲۱) وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۲) وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (۲۳) (۱۴ : ۲۱ تا ۲۳) "اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے "دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے 'اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" وہ جواب دیں گے "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں"۔

اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور نہیں تھا' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں' ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے' اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہو گا"۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ (۴۲) مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ

(۱۴ : ۴۲ - ۴۳) "اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں' اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو' اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے' اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئی ہیں' سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں' نظریں اوپر جمی ہوئی ہیں اور دل اڑے جا رہے ہیں"۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (۴۶) فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴۷) يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۸) وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (۴۹) سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (۵۰) (۱۴ : ۴۶ تا ۵۰) انہوں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا۔ اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھی کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں۔۔۔پس اے نبی ؐ تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدے کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔ ڈراؤ انہیں اس دن سے جبکہ زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد اور قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔ اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ان کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے' تارکول کے لباس پہنے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے"۔

ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی معرکہ ہے جو دنیا میں شروع ہوتا ہے اور آخرت کے میدان میں اس معرکے کا اختتام ہوتا ہے۔ یوں دنیا اور آخرت باہم مل جاتے ہیں اور ان میں کوئی فاصلہ اور جدائی نہیں رہتی۔

یہ امثال جو دنیا سے شروع ہو کر میدان آخرت میں جا کر اختتام پذیر ہوتی ہیں' ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیان اس طویل معرکے کے خدوخال کیا ہیں' اس کی نوعیت کیا ہے اور اس معرکے کے آخری نتائج کیا ہیں' مثلاً کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے۔ یہ پاکیزہ درخت نبوت کا درخت ہے' یہ ایمان کا درخت ہے۔ یہ سچائی اور بھلائی کا درخت ہے۔ بری بات ایک برے درخت کی طرح ہوتی ہے اور یہ برا درخت کیا ہے' جاہلیت کا درخت ہے۔ باطل کا درخت ہے' تکذیب' شر اور سرکشی کا درخت ہے۔

---000---

دوسری حقیقت کا تعلق نعمتوں اور شکر کے ساتھ ہے' بے بہا نعمتوں اور ان کی ناشکری اور سرکشی کے ساتھ ہے۔ یہ حقیقت بھی اس سورہ کی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ مختلف مقامات پر سیاق کلام میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر اپنی نعمتیں گنواتے ہیں خواہ وہ مومن ہوں یا کافر ہوں' صالح ہوں یا بدکار ہوں' نیک ہوں یا فاجر ہوں اور مطیع فرمان ہوں یا نافرمان ہوں۔ یہ اللہ کی رحمت' اس کی مہربانی اور اس کا فضل و کرم ہے کہ کافر' فاسق اور فاجر کو بھی اس کرۂ ارض پر انعامات سے نوازا جائے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح مومن' نیک اور مطیع فرمان کے لیے

انعامات ہیں تاکہ وہ شکر ادا کریں ۔ اس نعمت کو جب پیش کیا جاتا ہے اس کائنات کے نہایت ہی عظیم میدان میں پیش کیا جاتا ہے اور اس عظیم کائنات کے وسیع فریم ورک میں اسے رکھا جاتا ہے ۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۳۲) وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۳۳) وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۳۴) (۱۴ : ۳۲ - ۳۴) "اللہ وہی تو ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے سے تمہارے رزق کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے' جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے تابع کر دیا اور رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے" ۔

اللہ نے رسولوں کو لوگوں کی ہدایت کے لیے روانہ کیا' یہ بھی ایک نعمت ہے جو مذکور بالا نعمت کے برابر ہے یا اس سے زیادہ ہے ۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "اے محمد ' یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ" ۔ اور روشنی اللہ کی نعمتوں میں سے بڑی نعمت ہے ۔ یہاں جس نور کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ بہت ہی بڑا نور ہے ۔ یہ وہ نور ہے جس کے ذریعہ انسان کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے ۔ یہی تھا تمام رسولوں کا فریضہ ان اقوام میں جن کی طرف انہیں بھیجا گیا اور یہی تھا فریضہ حضرت موسیٰ کا اپنی قوم میں ۔ پھر تمام رسولوں نے بھی اللہ کے انعام کا یوں ذکر کیا ۔

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ (۱۴ : ۱۰) "وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے گناہ بخش دے" ۔ لوگوں کو خود بلانا اور ان کی غلطی معاف کرنا ایک بہت بڑی نعمت ہے جو نور کی نعمت کے برابر ہے ۔ بلکہ اس کے قریب تر ہے ۔ اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ کے انعامات کی یوں یاد دہانی فرمائی ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ

مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۱۴: ٦) "یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی"۔ اسی فضا میں رسولوں کے ساتھ اللہ کے وعدے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (۱۳) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴) (۱۴: ۱۳ - ۱۴)) "ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ضرور ظالموں کو ہلاک کریں گے اور ان کے بعد یقیناً زمین میں تمہیں بسائیں گے۔ یہ ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو مجھ سے ڈرتے ہیں اور میری وعید سے ڈرتے ہیں"۔ یہ بھی اللہ کی بڑی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

پھر کہا گیا کہ اگر تم شکر نعمت بجالاؤ گے تو اللہ کی نعمتوں میں اضافہ ہو گا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ

(۱۴: ۷) "اور یاد رکھو جب تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنوگے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ

(۱۴: ۸) "اور اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔ اس سورہ میں یہ بھی کہا گیا کہ انسان بالعموم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴: ۳۴) "اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔

جو لوگ آیات الٰہیہ پر تدبر کرتے ہیں تو ان کی بصیرت تیز ہو جاتی ہے وہ مصائب پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴: ۵) "بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے"۔

اس سورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات کو صبر اور شکر کے ایک نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اللہ کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہت زاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں جبکہ وہ مسجد الحرام کے پاس تعمیر بیت

اللہ کے بعد کھڑے ہیں - اس وقت وہ پیکر حمد وثنا ہیں اور صبر و شکر کا نمونہ ہیں -

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ (۳۵) رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۳۶) رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (۳۷) رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۳۸) الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ (۳۹) رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ (۴۰) رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ (۴۱) (۱۴: ۳۵ تا ۴۱) "یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے دعا کی تھی کہ "پروردگار' اس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا - پروردگار' ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے' لہٰذا جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقے پر چلے تو تو یقیناً درگزر کرنے والا مہربان ہے - پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں' اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے - پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں' لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے' شاید کہ یہ شکر گزار بنیں - پروردگار' تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے' نہ زمین میں اور نہ آسمان میں' شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے - حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا کو سنتا ہے - اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی' پروردگار' میری دعا قبول کر' پرودگار' مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہو گا" -

چونکہ نعمت اور اس کا شکر یا ناشکری اس سورہ کا بنیادی مضمون ہے اس لیے اس میں جابجا ایسی تعبیرات بکثرت آتی ہیں جو اس سورہ کے مضمون اور اس کے مباحث کی فضا سے مطابقت رکھتی ہیں -

وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (۱۴: ۳۷) "ان کو پھلوں کا رزق دے شاید کہ وہ شکر بجالائیں" -

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴ : ۵) "بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر کرنے والا اور شکرگزار ہے"۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴ : ۲۸) "کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کی وجہ سے اللہ کی نعمت کو بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا"۔

اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۱۴ : ۶) "اللہ کی جو نعمتیں تم پر کی گئی ہیں ان کو یاد کرو"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ (۱۴ : ۳۹) "شکر ہے اس خدا کے لیے جس نے بڑھاپے کے باوجود مجھے اسماعیل اور اسحاق عطا کیے"۔

جب انبیاء نے جھٹلانے والوں کے اعتراضات کو رد کیا تو یوں کہا:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۱۴ : ۱۱) "لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے"۔ یہاں اللہ کے احسانات کو بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس پوری سورہ میں مضمون اور فضا اللہ کی نعمتوں' احسانات اور ان پر اللہ کے شکر کی ہے یا ناشکری کی۔

یوں اس سورہ میں انداز تعبیر بھی سورہ کے مضامین کی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کا انداز ہے کہ وہ الفاظ و معانی سورہ کے موضوع اور مضمون کی مناسبت سے لاتا ہے۔

---ooo---

یہ پوری سورہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں حقیقت رسالت' شخصیت رسول' دنیا و آخرت میں اہل حق اور اہل باطل کے درمیان معرکہ آرائی اور پھر حق و باطل کی مثال کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کے ساتھ۔

دوسرے حصے میں انسانوں پر اللہ کے انعامات' ان لوگوں کا انجام جنہوں نے ان انعامات کی تکفیر کی' اور سرکشی اختیار کی۔ اہل ایمان اور ان کی شکرگزاری اور اہل ایمان اور اہل اسلام کے سرخیل حضرت ابراہیم علیہ السلام' کافروں اور ظالموں کا انجام' اور قیامت کے مناظر سب سے خوفناک اور نہایت ہی اچھے مناظر جن میں حرکت اور زندگی بھرپور نظر آتی ہے اور دوسرے مضامین۔ غرض سورہ کا خاتمہ بھی آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۴ : ۵۲) "یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ خوش ہو جائیں"۔

اب چلئے سورہ کا حصہ اول۔

---ooo---

درس نمبر ۱۱۴ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۷

سُورَةُ اِبْرٰهِيْمَ (۱۴) مَكِّيَّةٌ (۷۲) اٰيَاتُهَا ۵۲ رُكُوْعَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

ا-ں-ر-ل- محمد ' یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ' ان کے رب کی توفیق سے' اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے - اور سخت تباہ کن سزا ہے قبول حق سے انکار کرنے والوں کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں - جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے - یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں -

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ

وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت بخشتا ہے' وہ بالادست اور حکیم ہے"۔

الر کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ (۱۴ : ۱) "اے محمد یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔ یہ کتاب الف' لام اور میم اور ان جیسے دوسرے حروف کی ترکیب سے بنائی گئی ہے۔ یہ تمہاری طرف ہم نے نازل کی ہے' کسی اور نے تمہاری طرف اسے نہیں اتارا۔ نہ تم نے خود اس کی تخلیق کی ہے۔ اور اسے یوں اتارا گیا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاؤ"۔ تم پوری انسانیت کو ظلمات سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ۔ اوہام و خرافات کی تاریکیاں' رسوم و تقالید کی تاریکیاں' ارباب متفرقہ کی بندگی اور کشاکش اور حیرت کی تاریکیاں' جاہلی اقدار اور پیمانوں اور جاہلی خیالات و تصورات کی تاریکیوں سے تم انسانیت نکالو اور قرآن کی روشنی میں داخل کر دو۔ ایسی روشنی جو فی الحقیقت ان تمام تاریکیوں کو دور کر دے۔ وہ عالم ضمیر کو روشن کر دے اور میدان فکر و نظر میں اجالا برپا کر دے۔ زندگی کی عملی راہوں میں اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ افکار میں اجالا برپا کر دے۔

اللہ پر ایمان لانا ایک نور ہے جس سے دل روشن ہو جاتا ہے اور جس کا دل روشن ہو جائے اس کی پوری شخصیت اور اس کا بشری ڈھانچہ بھی منور ہو جاتا ہے اور انسانی شخصیت کے دونوں پہلو' مٹی اور روح اللہ دونوں روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انسانی شخصیت اس روشنی سے خالی ہو جائے اور جس کے اندر سے یہ چراغ بجھ جائے تو پھر انسان تاریک مٹی کا ایک ڈھیر ہوتا ہے اور خون اور گوشت کی شکل میں ایک کیچڑ ہوتا ہے۔ کیونکہ گوشت اور خون پوری طرح زمین کے مادی عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نور نہ ہو جو روح اللہ سے پھوٹتا ہے اور اس کے اندر ایمان اپنی شفاف صیقل شدہ صورت میں موجود ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ سیاہ مادہ شفاف اور چمکدار ہو جاتا ہے اور پھر یہ سیاہ کیچڑ ایک شفاف شیشہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان باللہ ایک ایسا نور ہے جس کے ساتھ نفس انسانی چمک اٹھتا ہے۔ اس کی روشنی میں انسان اپنی راہ متعین کر سکتا ہے۔ اسے اللہ کی طرف راہ بالکل واضح نظر آتی ہے۔ اس راہ میں نہ دھند ہوتی ہے اور نہ غبار۔ اوہام و خرافات کا غبار' لالچ اور خواہشات کا غبار اور جب نفس انسانی راہ دیکھ لے اور صاف صاف نظر آنے لگے تو پھر ایسی راہ میں کوئی ٹھوکر اور کوئی اضطراب نہیں ہوتا اور نہ اس میں کوئی تردد ہوتا ہے اور نہ کوئی حیرانگی ہوتی ہے۔

پھر اللہ پر پختہ ایمان ایک ایسا نور ہے جس سے پوری زندگی چمک اٹھتی ہے۔ تمام لوگ اللہ کے مساوی بندے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان ربط اور رشتہ خدائی رشتہ ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ کی اطاعت اور بندگی کرتے ہیں۔ اب ان میں آقا اور غلام کی تقسیم نہیں ہوتی۔ ان کو اس پوری کائنات کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پوری کائنات سے بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ پوری کائنات ایک ناموس الٰہی اور قانون قدرت کے ساتھ چلتی ہے اس لیے وہ اس پوری کائنات' اس کے اندر موجود پوری مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ سب کے سب اللہ کے مخلوق ہیں۔

پھر ایمان ایک نور ہے' انصاف کی روشنی ہے' آزادی کی روشنی ہے۔ علم و معرفت کی روشنی ہے' اللہ کے لیے محبت

کی روشنی ہے۔ اللہ کے عدل حکمت اور رحمت پر اعتماد کی روشنی ہے۔ خواہ مشکلات ہوں یا مسرتیں ہوں یہ ایمان مشکلات میں صبر پر آمادہ کرتا ہے اور مسرتوں میں شکر رب کی تعلیم دیتا ہے اور آزمائش میں حکمت و تجربہ عطا کرتا ہے۔

صرف اللہ پر ایمان کہ وہی الٰہ اور رب ہے' یہ ایمان ایک نظام زندگی بھی ہے۔ فقط عقیدہ یا تصور ہی نہیں ہے جو دل کو روشن کرتا ہے۔ یہ نظام زندگی صرف اللہ کی بندگی کے اصول پر قائم ہے۔ جس میں صرف اللہ کی ربوبیت کا عقیدہ ہوتا ہے۔ اور تمام دوسری ربوبیتوں کا انکار ہوتا ہے' جس کے اندر برتری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہوتی ہے۔ وہی حاکم ہوتا ہے اور سب اس کے بندے ہوتے ہیں۔

اس نظام زندگی میں انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہے' اس میں انسان کی ضروری اور لابدی حاجات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایسی حاجات جو انسان کو سعادت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اس کو نور اطمینان دیتی ہیں اور اسے خوشی اور مسرت عطا کرتی ہیں۔ اس نظام میں قرار و ثبات بھی موجود ہے اور جو معاشرے اللہ کے سوا دوسرے انسانوں کی بندگی کرتے ہیں۔ ان میں جو تغیرات' انقلابات اور حیرانیاں اور پریشانیاں ہوتی ہیں ان سے اس میں انسان محفوظ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا حاکم نہیں ہوتا۔ سیاست میں حکومت میں' معاشیات میں اور سوسائٹی کے اجتماعی روابط میں اور رسم و رواج میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوتا۔ اس نظام میں انسانوں کی قوتیں اس کام میں صرف نہیں ہوتیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو غلام بنائیں اور نہ اس نظام میں کوئی شخص کسی طاغوتی قوت کا طبلچی ہوتا ہے۔

اس مختصر جملے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو" کے پیچھے معانی و مفہومات کے جہاں پوشیدہ ہیں بڑے بڑے حقائق یہاں ہیں اور قلب و نظر کی گہری سوچ کے نتیجے میں وہ نظر آ سکتے ہیں۔ اسلامی نظام زندگی کے قیام کے بعد ہی وہ آفاق نظر آ سکتے ہیں۔ صرف انسانی الفاظ ان وسیع معانی کے بیان کے لیے کافی نہیں ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ (۱۴ : ۱) "تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لاؤ ان کے رب کے حکم سے"۔ اللہ کے حکم سے اور اذن ہی سے تم یہ کام کر سکتے ہو کیونکہ رسول کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ پیغام پہنچائے۔ اس کی ڈیوٹی صرف بیان ہے۔ رہا لوگوں کا تاریکیوں سے روشنی میں آنا تو یہ صرف اللہ کے فضل و کرم اور اس کے حکم اور اذن سے ہو سکتا ہے اور یہ کام اس سنت کے مطابق ہوتا ہے جو اللہ کی مشیت کے مطابق کام کرتی ہے۔ رسول تو فقط رسول ہوتا ہے۔

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱۴ : ۱) "اس خدا کے راستے کی طرف جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔ نحو کے اعتبار سے صراط نور کا بدل ہے' اور اللہ کی راہ اللہ کا طریقہ ہے۔ اللہ کی سنت ہے' اس کا وہ ناموس ہے جو اس پوری کائنات پر حکمران ہے' اس کی راہ اس کی وہ شریعت ہے جو زندگی پر حاوی کرنے کے لیے بھیجی گئی ہے اور ایمان کی روشنی اور نور اسی شریعت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ بلکہ یہ نور بذات خود یہ صراط اور شریعت ہے۔ انسانی نفس کے اندر جو ایمانی نور چمکتا ہے وہی نور اس پوری کائنات کے اندر بھی چمکتا ہے۔ یہ سنت الٰہیہ ہے' ناموس

فطرت ہے اور وہی شریعت ہے جو نفس اس نور سے منور ہو وہ ادراک اور تصور میں غلطی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ طرز عمل اور طریقہ زندگی میں بھی وہ غلطی نہیں کرتا۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ عزیز و حمید کی راہ یہی ہے اور یہ عزیز قوت قاہرہ کا مالک ہے' اور اپنی ذات میں محمود اور پوری کائنات پر قابض ہے۔

یہاں اللہ کی قوت کا اظہار اس لیے کیا گیا ہے کہ کفار سن کر ذرا خائف ہو جائیں اور حمید اس لیے کہا گیا کہ اہل شکر اس کی حمد و ثنا کر کے اس کا شکر ادا کریں۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین و آسمان کا مالک اور حاکم بھی ہے۔ وہ لوگوں کا محتاج نہیں ہے وہ تو اس پوری کائنات کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھتا ہے۔

اللّٰهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (١٤ : ٢) "اور زمین و آسمان کی ساری موجودات کا مالک ہے"۔ جو شخص اندھیروں سے نکل کر نور میں آگیا اور اس نے راہ ہدایت پالی تو اس کے بارے میں یہاں خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ یہاں ان لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے جو روشنی میں آنے سے انکار کرتے ہیں۔ کافروں کو عذاب شدید سے ڈرایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اس نعمت سے استفادہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے رسول بھیجا' اسے ایک کتاب دی تاکہ وہ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کرے۔ یہ اس قدر عظیم نعمت ہے کہ کوئی انسان اس نعمت عظمیٰ کا شکر ہی ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوئی الٹا اس نعمت کی ناشکری کرے تو پھر کہا

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (١٤ : ٢) "اور سخت تباہ کن سزا ہے قبول حق سے انکار کرنے والوں کے لیے"۔ یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ صفت کیا ہے جس سے اس نعمت کی ناشکری اور کفر ہوتا ہے جو رسول کریم لے کر آئے ہیں۔ وہ صفت یہ ہے۔

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (١٤ : ٣) "جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں' جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے' یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی محبت ایمان کے تقاضوں کے ساتھ متصادم ہے اور صراط مستقیم پر استقامت کے خلاف ہے اور جب کوئی دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دے تو صورت یہ نہیں رہتی۔ آخرت کو ترجیح دینے سے دنیا میں بھی اعتدال پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا آخرت کی محبت اور ترجیح سے ترک دنیا لازم نہیں آتا۔

واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل آخرت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے میدان میں بھی خسارے میں نہیں ہوتے۔ یہ بات ان لوگوں کے ذہن میں آتی ہے جن کی فکر جادۂ اعتدال سے منحرف ہو۔ اسلام میں آخرت کو ترجیح دینے کا تصور بھی دراصل دنیا ہی کی اصلاح کے لیے ہے۔ ایمان باللہ کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ فریضہ خلافت ارضی کو بحسن و خوبی سرانجام دیا جائے۔ حق خلافت ارضی میں یہ بھی داخل ہے کہ زمین کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی

کی جائے اور اس کے اندر موجود خزانوں سے استفادہ کیا جائے۔ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ آخرت کے فائدے کے لیے دنیا کے نظام کو معطل کر دیا جائے بلکہ سچائی' انصاف' راستی اور خدا کی رضامندی کی خاطر زندگی کی تعمیر و ترقی ہی دراصل تمہید ہے' آخرت کی ترقی کے لیے۔ یہ اسلام کی پالیسی ہے کہ دنیا میں بھی حسنہ ہو اور آخرت میں بھی حسنہ۔

پھر وہ لوگ کون ہیں جو دنیا کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نور ایمان کی روشنی میں اپنے مذموم مقاصد تک نہیں پہنچ سکتے' وہ زمین کے قدرتی وسائل پر تب ہی قبضہ کر سکتے ہیں' وہ حرام تب ہی کما سکتے ہیں' وہ لوگوں کا استحصال تب ہی کر سکتے ہیں اور لوگوں کی اجتماعی دولت کو تب ہی لوٹ سکتے ہیں جب وہ نور ایمان کے دائرے سے نکل جائیں اور اللہ کے دین کی طرف ہدایت اور اس پر استقامت سے محروم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے دنیا پرست لوگوں کو بھی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور خود بھی اللہ کے راستے پر نہیں چلتے بلکہ وہ اللہ کے دین اور شریعت کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ دین سے استقامت اور عدالت کو معیشت سے عدل کو نکالنا چاہتے ہیں۔ جب یہ لوگ اپنے آپ کو اور دوسرے عوام الناس کو اللہ کی راہ سے روک دینے میں' کامیاب ہو جاتے ہیں اور جب وہ اسلام کی عدالت اور استقامت سے دامن چھڑا لیتے ہیں' تب جا کر ایسے لوگ ظلم کر سکتے' سرکشی کر سکتے' دھوکہ دے سکتے' اور لوگوں کو فساد پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ پھر زمین کے وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں' حرام کماتے ہیں' ذلیل اور غیر اخلاقی ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں۔ پھر یہ زمین میں سرکشی اور علو فی الارض اختیار کرتے ہیں۔ لوگوں کو غلام بناتے ہیں اور لوگوں کو اس قدر کمزور کر دیتے ہیں کہ ان میں مقابلے یا احتجاج کی سکت بھی نہیں رہتی۔

یہ واقعہ ہے کہ ایمانی نظام زندگی ہی دراصل زندگی' حرمت اور معاشی انصاف کا ضامن ہے اور یہی اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اثر و رسوخ ختم ہو گا جو وسائل ارضی پر قابض ہونا چاہتے ہیں یا وہ آخرت کے مقابلے میں دنیا پرستی کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴ : ۴) "اور ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے"۔ یہ انسانوں کے لیے ہر نبی کی نبوت میں ایک بڑی نعمت رہی ہے کہ رسول ان کی زبان ہی کا بھیجا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف بڑی سہولت سے نکال سکے اور اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ وہ اہل لسان ہو تاکہ وہ بیان کرے اور یہ سمجھیں اور مقصد پورا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی ان کی قوم کی زبان میں رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اگرچہ آپ پوری انسانیت کے لیے رسول تھے کیونکہ آپ کی قوم کے ذمہ یہ فریضہ عائد کر دیا گیا تھا کہ اب پوری انسانیت تک عربوں کا فرض ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچائیں۔ رسول اللہ کی عمر تو محدود تھی۔ آپ کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا گیا کہ آپ سب سے پہلے جزیرۃ العرب کو جاہلیت سے پاک کر دیں اور اسلام کو وہاں غالب کر دیں تاکہ وہ مرکز اور سرچشمہ ہو اور آپ کی رسالت اور پیغام کو پھر امت کے لوگ دور دراز تک پہنچائیں اور عملاً ایسا ہی ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جزیرۃ العرب میں اسلام کو غالب کر دیا تو اللہ نے آپ کو اس جہاں سے اٹھا لیا لیکن خود آپ نے جیش اسامہ کو جزیرۃ

العرب کے اطراف کے لیے تیار کر کے بھیج دیا تھا۔ یہ لشکر ابھی نکلا نہ تھا کہ حضور ؐ وفات پا گئے۔ اس سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جزیرۃ العرب سے باہر دوسرے ممالک تک اپنے دعوتی خطوط ارسال کر دیئے تھے۔ یہ خطوط آپ نے اس لیے بھیجے تھے کہ لوگ دیکھ لیں کہ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ لیکن اللہ نے رسول اللہ کے لیے صرف یہی فریضہ مقرر کیا تھا اور مختصر عمر انسانی میں ایک انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ آپ جزیرۃ العرب میں عربی زبان میں تبلیغ کا کام کریں اور اس کے بعد پوری دنیا تک تبلیغ رسالت کا کام بعد میں دعوت اسلامی کے حاملین کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لہٰذا اس بات میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ رسول اللہ کی رسالت پوری انسانیت کے لیے تھی اور خود آپ نے اپنی قومی زبان میں کام کرنا تھا اور اپنی زندگی میں عملاً عربوں ہی میں کام کرنا تھا۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (١٤ : ٤) "پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے وہ بالادست اور حکیم ہے"۔ ہر رسول اور نبی آخر الزمان کی رسالت کا فریضہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنا پیغام پہنچا دے۔ رہی یہ بات کہ کوئی ہدایت کی راہ لیتا ہے یا نہیں تو یہ کام تو کسی رسول کی قدرت میں نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ کسی کو ہدایت دے یا گمراہ کر دے۔ خود رسول کی خواہش بھی اس سلسلے میں ضروری نہیں ہے کہ پوری ہو۔ یہ شان الٰہی ہے۔ اللہ نے اس کے لیے اس کائنات میں ایک سنت وضع کر رکھی ہے۔ یہ سنت اللہ کی مشیت کے مطابق چلتی ہے۔ جو شخص گمراہی کے مقدمات اختیار کرتا ہے اور گمراہی کی راہ لیتا ہے تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور جو شخص ہدایت کے مقدمات اختیار کرتا ہے اور ہدایت کی راہیں اپناتا ہے تو وہ اہل ہدایت میں سے ہو جاتا ہے۔ یہ سب کام اللہ کی مشیت کے مطابق اور تابع ہوتے ہیں۔ اور انسان کے لیے یہی سنت اللہ نے وضع کی۔

وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (١٤ : ٤) "وہ بالادست اور حکیم ہے"۔ وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ جس طرح اس کی مشیت ہو اس کے مطابق لوگوں کی زندگی پھر جائے اور وہ یہ تصرف اپنی حکمت اور اپنی تقدیر سے کرتا ہے۔ اللہ نے تمام معاملات اپنے کنٹرول میں لے رکھے ہیں۔ اس کی مملکت میں واقعات اتفاقاً، بغیر کسی سبب اور بغیر کسی تدبیر کے رونما نہیں ہوتے۔

اس طرح ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کی زبان میں ارسال کیا تھا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ

يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷ وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

"ہم اس سے قبل موسیٰؑ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں۔ اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا اور انہیں تاریخ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کر۔ ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا" اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ بچا رکھتے تھے، اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔ اور موسیٰ نے کہا کہ "اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو حکم دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو حکم دیا گیا تھا دونوں کے الفاظ ایک ہی ہیں۔ اس سورہ میں یہی انداز کلام اختیار کیا گیا ہے۔ اس فقرے کے بارے میں ابھی ہم مفصل بات کر چکے ہیں، یہی تفسیر یہاں بھی ہے۔ حضرت محمدؐ کے لیے یہ حکم تھا۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ"۔ اور یہی حکم موسیٰؑ کے لیے ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۵)
"یہ کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نکال کر روشنی میں لاؤ"۔

حضورؐ کو حکم پوری انسانیت کے لیے ہے اور حضرت موسیٰؑ کو حکم صرف ان کی قوم کے لیے تھا۔ لیکن مقصد دونوں کا ایک ہی تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالو۔

وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (۱۴ : ۵) "اور انہیں تاریخ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کرو"۔ سب کے سب دن اللہ کے ہیں۔ لیکن یہاں ان تاریخی دنوں سے مقصد ہے جن میں اللہ کے انعامات یا اللہ کا عذاب واضح طور پر نظر آتا ہے تاکہ ان سے انسانیت یا انسانیت کی کوئی جماعت استفادہ کرے اور نصیحت حاصل کرے۔ بعد میں تفصیلات آرہی ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو ایام اللہ سے ڈرایا اور اقوام کے تاریخی واقعات، قوم نوح، قوم عاد،

قوم ثمود اور ان کے بعد آنے والی اقوام کے بارے میں یاد دہانی کرائی - یہ ہیں ایام اللہ ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴ : ۵) "ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو"۔ ان ایام میں بعض آیات ' دلائل اور نشانات اقوام کی بدبختی کے ہیں تو اس سے صبر کی نصیحت حاصل ہوتی ہے اور بعض آیات اللہ کی نعمتوں کی ہوتی ہیں اور ان سے شکر کی نصیحت حاصل ہوتی ہے ۔ جو شخص صبر کرنے والا اور شکر بجالانے والا ہوتا ہے وہی ان نصیحتوں کا ادراک کر سکتا ہے اور ان کے اندر پائی جانے والی حکمت اور عبرت کو سمجھ سکتا ہے ۔ نیز ان میں اس کے لیے تسلی اور یاد دہانی بھی ہوتی ہے ۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں نبوت کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور قوم کو نصیحت کرتے رہے ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۱۴ : ۶) "یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے ۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے ' تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ بچارکھتے تھے ' اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی"۔

حضرت موسیٰ ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلاتے ہیں ۔ یہ نعمت کی اللہ نے ' ان کو سخت عذاب سے نجات دی ۔ یہ عذاب ان کو آل فرعون کی طرف سے دیا جا رہا تھا اور یہ عذاب مسلسل ان پر ڈھایا جا رہا تھا ۔ اس میں کوئی وقفہ یا کوئی چھٹی کا پیریڈ نہ تھا اور اس عذاب کی انتہا یہ تھی کہ وہ ان کے بچوں میں سے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۔ یہ اس لیے کہ ان کے اندر قوت مدافعت باقی نہ رہے اور مردوں کی کمی کی وجہ سے جنگی اعتبار سے وہ ضعیف ہو جائیں تاکہ ان کو ذلیل کر کے رکھا جاسکے ۔ اللہ نے ان کو غلامی اور ذلت کی اس حالت سے نکالا ۔ چنانچہ یہاں ان کو حضرت موسیٰ یاد دلاتے ہیں تاکہ وہ شکر بجالائیں ۔

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۱۴ : ۶) "اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی"۔ پہلے تو ان کو نعمت کے ساتھ نہیں بلکہ مصیبت میں آزمایا گیا تاکہ ان کے صبر ' برداشت اور قوت مدافعت اور عزم کو آزمایا جائے کہ وہ کس قدر مخلص ہیں اور کس قدر اللہ کے احکام بجالانے والے ہیں ۔ صبر کا یہ مفہوم یہ نہیں ہے کہ کوئی انسان ذلت کو برداشت کرتے کرتے اپنے آپ کو اس کا عادی بنائے بلکہ صبر یہ ہے کہ انسان مصائب کو برداشت کرے لیکن اس کی استقامت میں کوئی تزلزل نہ آئے ۔ وہ شکست برداشت نہ کرے ' روحانی طور پر ہمت نہ ہارے ، اپنے پروگرام پر چلنے کا عزم پورا رکھتا ہو اور اس کے اندر ظلم اور سرکشی کے مقابلے کے لیے تیاری کا عزم موجود ہو ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو صبر نہیں بلکہ خواری اور ذلت کو قبول کرنا ہے اور نجات میں بھی ان کے لیے آزمائش ہے کہ آیا وہ شکر کرتے ہیں یا نہیں ۔ اللہ کی اس نعمت کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں ۔ اور نجات کے بدلے اللہ کی راہ ہدایت کو

اپناتے ہیں یا نہیں۔

حضرت موسیٰ اب مزید بیان کرتے ہیں۔ ایام اللہ کے بیان کے بعد اب ان کو مستقبل کی ہدایات دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب تمہیں چاہئے کہ صبر اور شکر کو اپنا وطیرہ بنالو اور اگر تم شکر کرو گے تو اس کا نتیجہ اچھا ہو گا اور اگر کفر کرو گے تو اللہ کا عذاب پھر تیار ہو گا۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ

"یاد رکھو' تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا سخت ہے"۔ (۱۴ : ۷)

یہ ایک عظیم حقیقت ہے' یہ حقیقت کہ شکر نعمت سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور کفران نعمت سے انسان اللہ کی شدید پکڑ میں آجاتا ہے۔ جب ہم ذرا اس حقیقت پر غور کرتے ہیں تو پہلی ہی سوچ میں ہمارے دل اس حقیقت پر مطمئن ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک تو یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس نے بہرحال پورا ہو کر رہنا ہے لیکن اگر ہم اس کے اسباب کو بھی معلوم کرنا چاہیں اور ایسے اسباب کی تلاش کریں جنہیں ہم سمجھ سکتے ہیں تو بھی ہمیں کچھ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

شکر نعمت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر کرنے والے کے نفس میں ایک صحیح معیار بیٹھا ہوا ہے۔ اللہ کی نعمت کا فطری تقاضا ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔ ہر فطرت سلیم' احسان کا فطری صلہ شکر کو سمجھتی ہے۔ ایک تو یہ سبب ہے' دوسرے یہ کہ جو شخص نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہی ان نعمتوں کا متصرف ہے۔ اس طرح یہ شخص سرکشی سے باز رہتا ہے' لوگوں پر اپنے آپ کو برتر نہیں سمجھتا اور اللہ کی نعمتوں کو مخلوق خدا کے اذیت دینے' شر کرنے' معاشرے میں فساد پھیلانے اور خصوصاً گندگی پھیلانے کے لیے استعمال نہیں کرے گا۔

ان امور سے انسان کے نفس کے اندر پاکی آجاتی ہے اور ایسا شخص عمل صالح کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ خدا کی دی ہوئی دولت میں اچھا تصرف کرتا ہے اور اس اچھے تصرف کی وجہ سے اس میں ترقی ہوتی ہے اور برکت آجاتی ہے۔ اس طرح ایسے شخص سے اس کے ارد گرد کے لوگ بھی خوش ہوتے ہیں اور پھر اس خوشی کی وجہ سے وہ اس کی اور معاونت کرتے ہیں۔ اس طرح معیشت کی ترقی کے لیے مزید پرامن ماحول فراہم ہوتا ہے اور اس میں ترقی ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک مومن کے لیے تو صرف یہی کافی ہے کہ اگر شکر کرو گے تو میں زیادہ دولت دوں گا چاہے وہ دوسرے اسباب کو سمجھ سکے یا نہ سمجھ سکے کیونکہ اللہ کا وعدہ ایک حق ہے اور اس نے بہرحال پورا ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو اس طرح کہ نعمت کا شکر ادا نہ کیا جائے' دوسرے اس طرح کہ دولت مند شخص اس بات کا انکار کر دے کہ ان نعمتوں کا بخشنے والا اللہ ہے۔ وہ ان نعمتوں کو اپنے علم' اپنی مہارت اور اپنی ذاتی جدوجہد کا ثمرہ قرار دے۔ گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ علم' مہارت' جدوجہد کی قوت یہ اللہ کی نعمتیں نہیں ہیں۔ یہ اس کی خود پیدا کردہ ہیں۔ اور بھی کفران نعمت یوں ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے یہ شخص سرکشی اختیار کرتا ہے' تکبر کرتا ہے' اپنے آپ کو لوگوں کے مقابلے میں بڑی چیز سمجھتا ہے اور ان کے ذریعہ فساد پھیلاتا ہے اور عیش و عشرت کرتا ہے۔ یہ سب امور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری میں آتے ہیں۔ عذاب شدید کی بھی پھر مختلف شکلیں ہیں' کبھی تو یہ یوں آتا ہے کہ اللہ کی نعمت کسی

سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ مشخص طور پر ان سے محروم ہو جاتا ہے یا انسانی شعور پر نعمتوں کا جو اثر ہوتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی نعمت کو انسان کے لیے مصیبت بنا دیا جاتا ہے اور صاحب نعمت پر اس کی وجہ مصائب آ جاتے ہیں۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں وہ اس کے ساتھ حسد کرتے ہیں اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اس پر ایک عرصے کے بعد عذاب آ جاتا ہے اور کبھی اس عذاب کو آخرت تک ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عذاب ملتا ضرور ہے کیونکہ کفران نعمت کا جرم بغیر سزا کے نہیں رہ سکتا۔

اگر کوئی شکر کرتا ہے تو اللہ کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور اگر کوئی کفران نعمت کرتا ہے تو اللہ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اللہ تو بذات خود غنی ہے اور دونوں جہانوں میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بذات خود محمود ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ صرف لوگوں کے شکر اور حمد کے ساتھ محمود ہو سکتا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ

(۱۴.۸) "اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔ اگر تم شکر کرو گے تو اس سے تمہاری زندگی سدھرے گی۔ لوگوں کے نفوس اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے اور پاکیزہ ہوں گے اور شکر کی وجہ سے وہ سدھر جائیں گے۔ وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ اب یہ نعمت ان شاء اللہ جاری رہے گی اور اس کے بگڑنے اور ختم ہونے کا خطرہ نہ رہے گا۔ نیز بطور شکر نعمت جو خرچ کیا جائے گا اس پر کوئی نفس پریشان نہ ہو گا بلکہ خوش ہو گا۔ کیونکہ منعم موجود ہے اور بطور شکر جو حصہ جائے گا اس سے بقیہ حصہ پاک ہو گا اور اجر مزید ملے گا۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم کے سامنے وعظ و نصیحت جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن وہ پس منظر میں چلے گئے تاکہ منظر پر ایک عظیم معرکہ دکھایا جا سکے۔ جو تمام انبیاء کی امتوں اور ان کے بالمقابل جاہلیتوں میں برپا ہو گا۔ ان جاہلیتوں نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ قرآن مجید کا یہ انوکھا اسلوب ہے کہ وہ کلام کا انداز یکلخت بدل کر اسے زندہ منظر میں بدل دیتا ہے۔ یہ منظر زندہ اور متحرک ہوتا ہے۔ اس میں افراد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کے تاثرات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ زمان و مکان کو لپیٹ کر اب ایک عظیم منظر۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّىؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَاؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝

"کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح" عاد' ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لیے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبالیے اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔ ان کے رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدت مقرر تک مہلت دے۔ انہوں نے جواب دیا "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو' جن کی بندگی ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند"۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' نوازتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے ہو سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے"۔

یہ نصیحت حضرت موسیٰ" کے قول میں سے ہے لیکن سیاق کلام میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر چھوڑ دیا گیا' تاکہ منظر پر رسولوں اور ان کی دعوت کا حصہ لایا جائے۔ یعنی تمام رسولوں کا اپنی اپنی بالمقابل جاہلیتوں کے ساتھ مکان و زمان کے اختلاف کے باوجود جو رویہ رہا' اسے یکجا کر کے اس منظر میں لایا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام گویا اس عظیم قصے کو پیش کرنے والے Compairor تھے۔ انہوں نے اس قصے کے بڑے کرداروں کو آمنے سامنے کر دیا۔ اب وہ خود منظر پر شریک گفتگو ہیں۔ قصص کو پیش کرنے کا یہ ایک مخصوص اسلوب ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے کہ وہ ایک حکایتی اور بیانیہ انداز کلام کو زندہ کرداروں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سب رسول اور ان کی امم موجود ہیں اور تمام رسولوں کا مقابلہ جاہلیتوں کے ساتھ ہے۔ اقوام اور رسولوں کے درمیان زمان و مکان کے فاصلے مٹا دیئے جاتے ہیں اور واقعات کو زمان و مکان سے علیحدہ کر کے پیش کر دیا جاتا ہے' جب کہ زمان و مکان کے پردوں کے پیچھے وجود کی حقیقت ہے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (۱۴: ۹) "کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح" عاد' ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟" یہ بہت سی اقوام ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہوا۔ یعنی قوم موسیٰ اور اقوام ثمود کے درمیان۔ یہاں سیاق کلام کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان اقوام کی تفصیلات دی جائیں کیونکہ رسول بھی دراصل ایک زمرہ ہیں اور جن لوگوں کو تبلیغ کی جا رہی تھی وہ بھی ایک زمرہ کے لوگ ہیں۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ (۱۴: ۹) "تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ (۱۴: ۹) کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنی آواز کو بلند کرنے کے لیے منہ کے سامنے ہاتھ رکھتا ہے تاکہ آواز بلند ہو اور دور تک سنی جا سکے۔ اس وقت لوگ اپنے منہ کے سامنے ہتھیلی ہلاتے ہیں تاکہ ہتھیلی کے آگے پیچھے ہونے سے آواز زیادہ بلند ہو۔ اس طرح آواز میں زیادہ موجیں پیدا ہوں اور اس تموج کی وجہ سے آواز دور تک جائے۔ یہاں ان کی اس حرکت کو اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ پر زور انداز میں تکذیب کرتے تھے۔ بیانگ دہل اور توہین آمیز طریقے سے نہایت ہی کرخت اور تہذیب و آداب سے خالی طریقوں سے انہوں نے پیغمبروں کی بات کا انکار کیا۔

رسولوں کی دعوت کا بنیادی نکتہ ہی یہ ہوتا تھا کہ اللہ ایک ہے اور وہی وحدہ الٰہ و رب ہے اور اپنے بندوں میں سے کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اس حقیقت میں شک کرنا جس کا ادراک ہر فطرت سلیمہ کرتی ہے اور اس کائنات کے اندر پھیلے ہوئے شواہد بھی ظاہر و باہر ہیں تو ایسے حالات میں عقیدۂ توحید میں شک کرنا نہایت ہی مکروہ اور قبیح حرکت ہے۔ رسولوں نے اس شک کو بے حد مکروہ سمجھا کہ زمین و آسمان کا یہ نظام شاہد عادل ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۴: ۱۰) "ان کے رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے"۔ کیا اللہ کے بارے میں شک ہے حالانکہ زمین و آسمان کا یہ نظام بآواز بلند پکار رہا ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے یہ نظام بنایا ہے اور اسے چلایا ہے۔ رسولوں نے یہ بات اس لیے کی کہ زمین و آسمان نہایت ہی واضح اور کھلے دلائل و نشانات ہیں۔ ان کی طرف صرف اشارہ ہی کافی ہے۔ ان کے نظام کو ہر گمراہ دیکھ کر راہ ہدایت پر آ سکتا ہے۔ رسولوں نے زمین و آسمان کی طرف فقط اشارے ہی کو کافی سمجھا۔ اس کے بعد رسولوں نے بندوں پر اللہ کی نعمتوں کو گنوانا شروع کر دیا کہ اللہ نے ان کو ایمان کی دعوت دی اور ایک

وقت تک مہلت بھی دی تاکہ وہ دعوت ہدایت پر سوچ سکیں۔

يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ (۱۴ : ۱۰) "وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے"۔ حقیقی دعوت تو ایمان کی دعوت ہے جس کے نتیجے میں مغفرت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہاں دعوت و مغفرت کو ایک ساتھ لایا گیا ہے تاکہ اللہ کا احسان اچھی طرح واضح ہو کہ ایمان لاتے ہی مغفرت ہو جاتی ہے اور پھر ان لوگوں کا رویہ اور سخت انکار مزید قابل تعجب اور قابل مذمت ہو جاتا ہے کہ مغفرت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور یہ لوگ ہیں کہ منہ میں ہاتھ ڈال کر انکار کرتے ہیں۔

وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۴ : ۱۰) "اور تم کو ایک مدت مقررہ تک مہلت دے"۔ اللہ تعالیٰ ایمان و مغفرت کی دعوت دینے کے ساتھ ہی ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ فوراً قبول کریں اور نہ ان کی تکذیب کے بعد فوراً ان کو ہلاک کرتا ہے، بلکہ مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت اس دنیا میں بھی ایک وقت تک ہوتی ہے یہ اور قیامت تک بھی بڑھ سکتی ہے۔ اس عرصے میں تم اچھی طرح اس دعوت پر غور کر سکتے ہو اور اللہ کی عزت اور رسولوں کے بیان پر بھی غور کر سکتے ہو۔ یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت اور مہربانی ہے اور یہ بھی اللہ کے انعامات میں سے ایک نعمت ہے۔ تو کیا ایسے انعامات الٰہیہ کا وہی جواب ہے جو تم دے رہے ہو۔ لیکن یہ لوگ بہت ہی جاہل ہیں اور وہ اسی پرانے جاہلانہ اعتراض کا سہارا لیتے ہیں۔

قَالُوٓا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (۱۴ : ۱۰) "انہوں نے جواب دیا "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے"۔ اللہ نے انسانوں میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا۔ یہ تو انسانوں کے لیے اعزاز تھا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اسے سمجھتے نہیں بلکہ اس کا انکار کرتے ہیں اور اس میں نہ صرف شک کرتے ہیں بلکہ وہ الٹا رسولوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف یہ سازش کی ہے کہ ہمیں اس راہ سے ہٹا دیں جس پر ہمارے باپ دادا چلے آئے ہیں۔ لیکن سوچتے نہیں کہ رسول کیوں نہیں اس راہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ تمام بت پرست ہمیشہ عقلی جمود میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کے پاس یہی دلیل ہوتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد یہی کام کرتے رہے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ آباء کے مذہب کی حیثیت کیا ہے؟ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان الہوں کی حیثیت کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ وہ کوئی عقل و فکر سے کام لیں اور اس جدید معقول دعوت کو قبول کر لیں یہ لوگ الٹا پیغمبروں سے ثبوت مانگتے ہیں۔

فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (۱۴ : ۱۰) "اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند"۔ رسول اپنی بشریت کا انکار نہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں بلکہ وہ لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ نے ان پر احسان کیا کہ انہیں بار رسالت کے اٹھانے کے اہل بنایا۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ

عِبَادِهٖ (۱۴ : ۱۱) "ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے"۔ یہاں سیاق کلام میں اللہ کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس پوری سورہ میں فضا اللہ کے احسانات کی ہے۔ ہر جگہ اللہ کے انعامات کا ذکر ہے۔ چنانچہ یہاں بھی لکھا گیا کہ اللہ کے احسانات ہیں جس پر ہو جائیں۔ یہ احسان صرف رسولوں کی ذات پر ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ پوری بشریت پر احسان ہے کہ اس میں سے بعض افراد کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دوسروں کی ہدایت اور راہنمائی کا کام کریں۔ یہ ڈیوٹی ہے کیا؟ یہ کہ عالم بالا سے ان کا رابطہ ہو اور پھر لوگوں تک پیغام پہنچائیں اور پھر پوری انسانیت پر احسان ہے کہ یہ رسول لوگوں کی فطرت کو جگائیں اور اس کے اوپر سے زنگ دور کر دیں تاکہ فطرت انسانی میں وہ قوتیں تازہ ہو جائیں جو ہدایت کو قبول کریں اور جمود کی موت سے نکل کر قبولیت حق کی زندگی میں داخل ہوں۔ پھر انسانیت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ یہ رسول لوگوں کو مختلف الہوں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور ان کی عزت نفس ' اور ان کی قوتوں کو لوگوں کی غلامی میں صرف ہونے سے بچائیں۔ کیونکہ غلامی میں جب ایک انسان اپنے جیسے انسان کے سامنے جھکتا ہے تو اس کی عزت نفس ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی قوت اپنے جیسے انسانوں کو الہٰ بنا کر بکھر جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ رسول کوئی واضح معجزہ پیش کریں یا کسی فوق الفطرت قوت کا مظاہرہ کریں تو تمام رسولوں نے اپنی اپنی قوم سے یہی کہا کہ معجزات کا صدور تو اللہ کے ہاتھ میں ہے تاکہ عوام الناس کے تاریک ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ذات الٰہی اور ذات بشر میں فرق کیا ہے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں توحید کا ایسا صاف تصور بیٹھ جائے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہ ہو۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر پہنچ کر تمام بت پرستوں نے راستہ گم کر دیا اور عیسائیوں نے بھی توحید کا راستہ اس وقت گم کر دیا جب انہوں نے اپنے دین کو یونانی ' رومی ' مصری اور ہندی فلسفوں کے ساتھ مکس کر لیا۔ عیسائیوں کی گمراہی کا آغاز ہی اس عقیدے سے ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر خوارق عادت معجزات کا صدور ہوا۔ چنانچہ خود عیسائیوں نے بعد میں ان کو الہٰ مان لیا۔

وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ عَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۴ : ۱۱) "اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے ہو سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے"۔ رسولوں کا کہنا یہ تھا کہ ہم اللہ کی قوت کے سوا کسی اور قوت پر کبھی کوئی بھروسہ نہیں کرتے اور یہ ان کا دائمی اصول ہے۔ کیونکہ اہل ایمان کا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہوتا ہے۔ ایک مومن کا دل صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' اور وہ اس کے اوپر بھروسہ کرتا ہے۔

رسولوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی طرف سے تمام زیادتیوں کا مقابلہ ایمان سے کرتے ہیں۔ اور ان کی اذیتوں کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرتے ہیں۔ رسول سوالیہ انداز میں ان جاہلوں سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۱۲ؑ

۲ ع ۲ ۱۴

"اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہیں ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے"۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا (۱۴ : ۱۲) "اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟" یہ اس شخص کی بات ہے جسے اپنے موقف اور اپنے طریقہ کار پر پختہ یقین ہو اور وہ اپنے منہاج پر مطمئن ہو۔ اس کا دامن اپنے حقیقی ولی اور ناصر کے اعتماد سے بھرا ہوا ہو' اور وہ یقین رکھتا کہ جو ذات ہدایت دیتی ہے وہ اس کی معین و مددگار ہوگی۔ اگر ایک راہ رو صحیح راہ پر جا رہا ہو تو اسے کیا پرواہ ہے کہ وہ منزل تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ اصل فکر تو اس بات کی ہونا چاہئے کہ راہ رو جس راہ پر سفر کر رہا ہے وہ راہ دعوت ہے یا نہیں۔

جو شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ دست قدرت اس کی راہنمائی کر رہا ہے اور اپنے قدم بقدم چلا رہا ہے' تو وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا شعور اللہ کے وجود اور اس کی قدرت قاہرہ کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے شخص کا دل اللہ تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ جس شخص کو یہ شعور حاصل ہو وہ اپنی راہ پر چلنے میں پھر کوئی تردد نہیں کرتا اگرچہ راستے میں مشکلات ہوں' اور اگرچہ راستے میں بڑی سے بڑی طاغوتی قوتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انبیاء علیہم السلام کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ یہ یقین رکھیں کہ اللہ ان کا ہادی و ناصر ہے اور وہ طاغوتی قوتوں کو خاطر میں نہ لا کر اپنی راہ پر بے دھڑک چلیں۔ اور اللہ پر بھروسہ کریں اور طاغوتی قوتوں کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لا کر آگے ہی بڑھیں۔

اس عظیم حقیقت تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو کسی موجود اور مستحکم مقتدر اعلیٰ طاغوتی نظام کے خلاف عملاً اسلامی تحریک کو لے کر اٹھتے ہیں۔ صرف ایسے عملی لوگوں کے دل میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ اللہ خود ان کی راہنمائی کر رہا ہے۔ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان کے دل ایمان و یقین سے بھر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دل محسوس کرتے ہیں کہ ان کے لیے روشنی کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور ان کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ان پر روشنی آتی ہے' جو ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ اس رابطے کے ذریعہ ایمان کی تازہ ہوا کے جھونکے بھی آتے رہتے ہیں اور ایسے دل اللہ کے ساتھ نہایت انس اور قرب محسوس کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے جن کارکنوں کے دلوں میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے وہ پھر اس زمین پر پائے جانے والی مقتدر طاغوتی قوتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کو نہ کوئی دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ کوئی دھمکا سکتا ہے۔ ایسے کارکن پھر ایسی طاغوتی قوت کی قوت اور اقتدار کو نہایت ہی حقارت سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے قلوب اللہ تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور ان حقیر لوگوں کی سازشوں اور مظالم کو پھر وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا

"اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟" اور جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے"۔ ہم صبر سے کام لیں گے اور انشاء اللہ ہمارے پاؤں ہرگز نہ ڈگمگائیں گے' ہم کمزوری نہ دکھائیں گے اور ہمارے قدم متزلزل نہ ہوں گے اور دشمن ہمارے قریب نہ آئے گا اور نہ ہم الٹے پاؤں پھریں گے۔ ہم اس راہ سے ہرگز ادھرادھر نہ ہوں گے۔ نہ جدوجہد میں کمی کریں گے اور نہ ہی ہم شک میں گرفتار ہوں گے۔ اور یہ اس لیے کہ

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۴ : ۱۲) "اور بھروسہ کرنے والے' اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ اب سرکش طاغوتی قوتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں' یہ قوتیں' مجادلہ اور مباحثہ ترک کر دیتی ہیں' غور و فکر چھوڑ دیتی ہیں کیونکہ یہ محسوس کرتی ہیں کہ یہ لوگ لوہے کے چنے ہیں۔ ان کو نہیں چبایا جاسکتا۔ نظریات کے مقابلے میں ان قوتوں کو شکست ہو جاتی ہے۔ اب یہ لوگ تشدد کے اوچھے ہتھیار لے کر سامنے آتے ہیں کیونکہ طاغوتی سرکش قوتوں کے پاس اس کے سوا ہوتا کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

"آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے"۔

اس مقام پر اسلام اور جاہلیت کے معرکے کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ دراصل کوئی جاہلی نظام اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اسلام کا کوئی مستقل اقتدار اعلیٰ ہو' اور وہ جاہلیت کے انتداب سے باہر ہو۔ نہ جاہلیت اس بات کو برداشت کرتی ہے کہ اس کے مستحکم نظام سے باہر کوئی اسلامی نظام ہو' اگرچہ اسلام کی یہ مقتدر اعلیٰ قوت جاہلیت کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصول پر چلنے کے لیے راضی ہو۔ اس لیے کہ جاہیت کو پتہ ہے کہ اسلام ایک مستقل متحرک سوسائٹی کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی اپنی قیادت ہوتی ہے' جس کا اپنا دائرہ دوستاں ہوتا ہے' جبکہ یہی وہ بات ہے جسے کوئی نظام جاہلیت کبھی گوارا نہیں کرتا۔ چنانچہ یہاں جاہلیت رسولان کرام سے فقط یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی دعوتی سرگرمیاں بند کر دیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ تم ہماری ملت اور ہماری پارٹی میں واپس آجاؤ' اور ہماری جاہلی سوسائٹی میں مدغم ہو جاؤ' بلکہ ہماری کان میں پگھل جاؤ' اس طرح کہ تمہارا کوئی مستقل وجود نہ رہے۔ یہی تو وہ بات ہے جسے اسلامی نظام کا مزاج قبول ہی نہیں کرتا اور نہ اس بات سے رسول ...... دستبردار ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ انکار کر دیتے ہیں اس لیے کہ ایک مسلم جو جاہلی سوسائٹی سے کٹ کر باہر آتا ہے کس طرح وہ دوبارہ اس سوسائٹی میں گھل مل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر جاہلی سوسائٹی' ایسے عناصر سے مرکب ہوتی ہے جو اپنے طبعی مزاج کے اعتبار سے کسی اسلامی عنصر کو قبول ہی نہیں کرتی الا یہ کہ کوئی مسلمان اپنی پوری تحریکی اور عملی قوتیں اس جاہلی سوسائٹی کے استحکام ہی کے لیے خرچ کر رہا ہو' اور جاہلیت کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ وہ جاہلیت میں گھس کر اور جاہلیت کے نظام کے اندر پگھل کر اور اس کا کل پرزہ بن کر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ دراصل

اسلامی سوسائٹی کے عضویاتی عناصر ترکیبی اور اس کے مزاج ہی سے واقف نہیں ہیں اور نہ جاہلی معاشرے کے مزاج سے یہ لوگ واقف ہیں۔ ہر معاشرہ دراصل اپنے اندر صرف انہی اجزاء کو قبول کرتا ہے جو اس معاشرے کے لیے کام کر رہے ہوں۔ اس کے مقام اور نظام کو مستحکم کر رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولان کرام اعلانیہ انکار کر دیتے ہیں کہ ہم اب تمہاری ملت اور سوسائٹی میں واپس نہیں آسکتے۔ اس مقام پر اللہ کی قوت قاہرہ پھر جاہلیت پر ضرب لگاتی ہے۔ یہ ایسی ضرب ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی کیونکہ یہ ضرب نہایت ہی عظیم قوت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس ضرب کو پھر بڑے بڑے سرکش اور ڈکٹیٹر بھی نہیں سہہ سکتے۔

فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

"تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو"۔

یہ بات جان لینا چاہئے کہ اللہ کی عظیم قوت تحریکی معاملات میں تب مداخلت کرتی ہے جب رسول اپنی قوم سے مکمل علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں اس جاہلیت سے نجات دے دی ہے' اس لیے اب وہ دوبارہ اس نظام جاہلیت میں واپس نہیں جاسکتے۔ جب تک وہ اپنی امتیازی شان پر اصرار نہیں کرتے۔ جب تک وہ اپنے دینی نظریہ پر مصر نہیں ہوتے اور اپنی قیادت کی ماتحتی میں اپنی الگ سوسائٹی کی تشکیل نہیں کرتے۔ اور جب تک یہ تحریک اور قیادت نظریاتی بنیادوں پر اپنی قوم کو منقسم نہیں کر دیتی۔ غرض جب تک یہ صورت نہیں ہوتی کہ ایک قوم دوملتوں کی شکل میں منقسم ہو جائے' جن کا نظریہ' جن کا طریق زندگی' جن کی سوسائٹی اور جن کی قیادت علیحدہ ہو جائے تو اس وقت تک اللہ کی عظیم قوت مداخلت نہیں کرتی۔ جب اسلامی تحریک یہ پوزیشن اختیار کر لیتی ہے تو پھر اللہ کی عظیم قوت جاہلیت پر فیصلہ کن ضرب لگاتی ہے۔ اب پھر کیا ہوتا ہے' وہ تمام طاغوتی قوتیں پاش پاش کر دی جاتی ہیں جو تحریک اسلامی کے لیے خطرہ ہوتی ہیں اور پھر ایسے لوگوں کو اللہ کی عظیم قوت زمین میں مستحکم کر کے بٹھا دیتی ہے اور تب جا کر اللہ کا وہ وعدہ سچا ہوتا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور ان کے بعد داعیان حق کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر تحریک اسلامی جاہلی سوسائٹی کا حصہ ہو۔ اس کے اندر پگھل چکی ہو' اور جاہلی سوسائٹی کے طور طریقوں کے اندر' جاہلی تنظیم کے اندر کام کر رہی ہو' اس سے علیحدہ' ممتاز اور جدا تحریک یا نظام نہ رکھتی ہو اور اس کی اپنی قیادت نہ ہو۔ اس وقت تک یہ مداخلت نہیں ہوتی اور نہ اللہ کی نصرت آتی ہے۔

فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴: ۱۳) "تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے"۔ یہ نون تاکید اور عظمت کے لیے ہے۔ یہ دونوں معانی اس سخت موقعہ پر بہت اہمیت رکھتے ہیں' یعنی ہم ان جابر مشرکوں' ظالموں اور سرکشوں کو ہلاک کر دیں گے' ان کی ذاتی خرابیوں کی وجہ سے اور

اس سچائی کی خاطر جو عوام کے لیے بھیجی گئی اور اس خوف و ہراس کی وجہ سے جو انہوں نے عوام کے اندر پیدا کر دیا تھا۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ (۱۴ : ۱٤) "اور اس کے بعد تمہیں زمین پر آباد کریں گے"۔ یہ کام کسی طرف داری یا مزاح کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اللہ کے ہاں فیصلے عدل کے مطابق ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ (۱۴ : ۱٤) "یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو"۔ یعنی ایک مقتدر کو ہٹا کر کسی اور کو اقتدار دینا' اور زمین کی خلافت دینا' اس لیے ہوتا ہے کہ سرکشوں کو ہٹا کر ان کی جگہ خدا کا خوف رکھنے والی قیادت لائی جائے۔ پھر وہ دست درازی نہ کرے' زمین میں غرور اور تکبر نہ کرے' جباری و قہاری سے حکمرانی نہ کرے' اللہ کے حدود سے ڈرے اور اللہ کے سامنے جوابدہ ہو اور فساد فی الارض سے بچے' زمین میں ظلم نہ کرے' اس لیے کہ اسے یہ اقتدار اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لیے اہل سمجھی گئی ہے۔

جب اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مکمل جدائی ہو جاتی ہے تو پھر سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کی اس حقیر دنیاوی قوت کے مقابلے میں اللہ جبار و قہار اور مکمل گھیر لینے والے کی عظیم قوت سامنے آتی ہے۔ کیونکہ رسولوں کی تبلیغ کی مہم ختم ہو جاتی ہے' حق و باطل ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء ہو جاتے ہیں اور مومن جھوٹوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اب صورت حالات یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف ایک کیمپ میں دنیا کے سرکشوں کی قوت سامنے آتی ہے اور رسول اور داعیان حق دوسری طرف کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ کی عظیم قوت ہوتی ہے۔ دونوں فتح و نصرت کے لیے دعا کرتے ہیں' اور انجام یوں ہوتا ہے:۔

وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿١٥﴾ مِّن وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِن مَّاءٍ صَدِيدٍ ﴿١٦﴾ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ وَمِن وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿١٧﴾

"انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی' پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے۔ وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا"۔

یہ ایک عجیب منظر ہے' اس میں ہر سرکش ڈکٹیٹر تباہ حال ہوتا ہے' اس دنیا کے میدان جنگ میں یہ شکست کھاتا ہے'

لیکن یہ منظر اسے کھڑا کر کے ایک دوسرا تخیلاتی منظر اسکرین پر لاتا ہے۔اب یہ آخرت میں جہنم کے اندر ہے' اس جہنم میں یہ شدید پیاسا ہے اور اس کو انسانی زخموں سے بہنے والا سیال مادہ پلایا جا رہا ہے' یہ اسے نہیں پینا چاہتا مگر اسے یہ مشروب بجبر پلایا جاتا ہے۔یہ اس کے حلق سے نہیں اتر رہا کیونکہ یہ تو تلخ اور بدمزہ ہے۔گندہ اور مکروہ مشروب۔اس ڈکٹیٹر کی طرف سے اظہار کراہیت اور تکلیف الفاظ کی اسکرین پر صاف و شفاف نظر آتے ہیں۔صورت یہ ہے کہ ہر طرف سے اس پر آنے والا عذاب اس قدر شدید ہے کہ شاید ابھی مر جائے مگر اسے مرنے کی تو اجازت ہی نہیں ہے۔شدید عذاب پر عذاب اس پر آ رہا ہے' اسی لیے تو نہیں مرتا۔

یہ ایک عجیب منظر ہے۔اس میں ایک شکست خوردہ جبار اور ڈکٹیٹر کی تصویر کشی کی گئی ہے اور اس تصویر کے پس منظر میں اس کا اخروی خوفناک انجام دکھایا گیا ہے اور اس پس منظر کی تخیلاتی تصویر میں لفظ "غلیظ" کا رنگ بھرا گیا ہے۔کیونکہ دنیا میں' اپنے دور اقتدار میں یہ ریاستی قوت کو داعیان حق کے خلاف اسی شدت (غلیظ) سے استعمال کرتا تھا حالانکہ ان کی دعوت یقیناً' اصلاح اور بھلائی کے لیے تھی۔

سرکشوں کے اس انجام کے پس منظر میں اب کفار کی تصویر کشی کے لیے ایک تمثیل آتی ہے جو مصور انداز میں ہے۔یہ تصویر آرٹ کا بہترین نمونہ ہے اور یہ اس جاری منظر سے پہلے آتی ہے جس میں بتایا جا رہا ہے کہ حق کو جھٹلانے والوں کو اللہ نیست و نابود کر دیتا ہے اور اس دنیا کو جدید لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جبکہ اس سے قبل اس زمین کے مناظر میں سے ان سرکشوں کی شکست کا منظر دکھایا جا چکا ہے۔کفار کے اعمال کی یہ تصویر ایک دوسرے پس منظر میں دکھائی جاتی ہے جس طرح کسی منظر کے درمیان میں تخیل آتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝۱۸

"جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے"۔

یہ منظر کہ سخت طوفانی ہوا کے دن راکھ اڑ رہی ہے' پیش آتا رہتا ہے اور ہر کسی کے ذہن میں ہے۔یہاں اس منظر سے قرآن کریم یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ کوئی چیز کس طرح مجسم طور پر ضائع ہو جاتی ہے اور اس کا مالک اس کے یوں ضائع ہونے کو کسی طرح نہیں روک سکتا اور نہ ایسی ضائع شدہ چیز سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔اس طوفانی منظر میں اس مفہوم کو مجسم کر کے پیش کیا جاتا ہے اور یہ منظر انسانی شعور کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے' ضیاع اعمال کی تعبیر اگر مجرد ذہنی اور فلسفیانہ انداز میں کی گئی ہوتی تو اس کا اس قدر اثر ہرگز نہ ہوتا۔اس سے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ یہ اعمال پوری طرح اکارت گئے۔

یہ منظر کفار کے اعمال کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتا ہے جو اعمال ایمان کی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہوتے اور جو اپنے حقیقی اسباب کے ساتھ مضبوط رسی سے باندھے ہوئے نہیں اور جن کا باعث اور سبب تعلق باللہ نہیں ہوتا۔ وہ اسی طرح اڑ جاتے ہیں جس طرح سخت آندھی میں راکھ اڑ جاتی ہے اور ایسے اعمال نہ مضبوطی سے قائم ہو سکتے اور نہ منظم ہو سکتے ہیں' کیونکہ اصل بات عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ داعیہ ہوتا ہے جس کی اساس پر عمل کا ظہور ہوتا ہے اس لیے کہ عمل ایک آلاتی حرکت ہے' جس طرح مشین حرکت کرتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عمل کے پیچھے محرک ہو اور اس عمل کا کوئی متعین مقصد ہو۔

اس منظر میں ایک گہری معنوی حقیقت اور ظاہری تصور کے درمیان مکمل مطابقت ہے اور یہ منظر اس مفہوم کو نہایت موثر' اشاراتی اور دلچسپ اسلوب میں ظاہر کرتا ہے اور پھر جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ اس مفہوم پر فٹ آتا ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (١٤: ١٨) "یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے"۔ یہ نتیجہ جس قدر تاریک ہے وہ راکھ کی اڑان کی تاریکی کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے' کافر خود اپنے اعمال کے غبار میں گم گشتہ راہ نظر آتا ہے۔

پھر ایک دوسری جھلکی جو اگلی آیت میں آرہی ہے' وہ بھی اس منظر کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس میں سیاق کلام میں اہل قریش کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے مکذبین والا انجام تمہارے انتظار میں ہے۔ اگر تم درست نہ ہوئے تو اللہ تمہیں مٹا کر کسی دوسری قوم کو میدان میں اتار دے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۹ وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۲۰

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟ وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے"۔

ایمان اور کفر کے موضوع سے اور رسولوں اور جاہلیتوں کے مقابلے کے مضمون سے اب بات زمین و آسمان کے مناظر کی طرف آجاتی ہے۔ قرآن کے اسلوب کے مطابق اس انداز میں روئے سخن کا پھر جانا ایک طبیعی امر ہے اور انسانی شعور میں بھی یہ تبدیلی یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ اسلامی نظام حیات اور قرآنی اسلوب ایک ایمانی اور خدائی اسلوب ہے اس لیے کہ فطرت انسانی اور روح کائنات کے درمیان ایک خاص زبان کے ذریعہ پیغامات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت' خلوت کائنات کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی ہے' انسان جونہی اس کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اس سے اثرات اور پیغامات وصول کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وہ لوگ جو اس کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر بھی ان کی فطرت' فطرت کائنات کے اشارات اور پیغامات اخذ نہیں کرتی' ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی فطرت کی مشین بگڑ گئی ہے اور اس مشین کا ریسیور خراب ہو گیا ہے' ان کے

باطنی حواس خراب ہو گئے ہیں۔ اس طرح جس طرح آنکھ اندھی ہو جاتی ہے ' کان بہرے ہو جاتے ہیں ' زبان گونگی ہو جاتی ہے ' پرزے موجود ہیں مگر کام نہیں کرتے۔ ایسے افراد جن کی فطرت کے اہم پرزے خراب ہو گئے ہوں وہ اس دنیا کی قیادت کے بہرحال لائق نہیں رہتے۔ وہ تمام لوگ اس کیٹگری میں آتے ہیں جن کی سوچ پر مادیت چھاگئی ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو سائنس دان کہتے ہیں اور اپنے اوپر دانشوری کا غلط اطلاق کرتے ہوں۔ اس لیے کہ علم و دانش انسانی فطرت کو معطل نہیں کرتے۔ اور انسان کو روح کائنات سے کاٹتے نہیں بلکہ جوڑتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو قرآن اندھا' گونگا اور بہرہ کہتا ہے اور انسانی زندگی کی قیادت اگر اندھوں کے ہاتھ میں ہو تو وہ کبھی درست نہیں ہو سکتی۔

زمین و آسمان کی تخلیق میں عظیم قدرت اور مضبوط نظم کے اشارات ہیں۔ سچائی اور حق نہایت مضبوط ہے۔ اپنے مفہوم میں بھی اور لفظ "حق" کے تلفظ میں بھی قوت ہے۔ یہ حق چٹان کی طرح ٹھوس نظر آتا ہے جس طرح طوفانی ہوا میں اڑنے والی باطل کی راکھ نظر آتی ہے۔ جو دور تک صحراؤں میں اڑتی نظر آتی ہے اور ناپید ہو جاتی ہے۔

تحریک اسلامی کے معاندین کو اس فضا میں سخت دھمکی دی جاتی ہے۔

انْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ (۱۴ : ۱۹) "وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے"۔ اور جو ذات زمین و آسمان پیدا کر سکتی ہے وہ اس بات پر قدرت رکھتی ہے کہ انسانوں کے مقابلے میں کوئی دوسری ہی مخلوق لے آئے۔ یا کسی ایک قوم کو زمین کی قیادت سے ہٹا کر کسی دوسری قوم کو لے آئے۔ اقوام کا منصہ شہود سے یوں غائب ہوتے چلے جانے کے معانی اس منظر کے ساتھ پوری طرح متفق ہیں جس میں کفار کے اعمال راکھ کی طرح آندھی میں دوڑتے نظر آتے ہیں اور نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (۱۴ : ۲۰) "ایسا کرنا اس اللہ پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے" اور اس پر زمین و آسمان کی تخلیق شاہد ہے۔ پھر انسانی تاریخ میں اقوام جس طرح مٹتی رہی ہیں اور ایک کا زوال اور دوسری کا عروج سامنے آتا رہا ہے۔ یہ بھی اس پر گواہ ہے۔ جس طرح ایک طوفان آسانی سے راکھ کو اڑا دیتا ہے' یہ کام اس سے بھی اللہ کے لیے آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا ہی اعجاز ہے' قرآن کریم کا جس میں مناظر اور تصاویر اور معانی ہم آہنگ ہیں اور کلام نہایت ہی متناسب ہے۔ الفاظ' معانی اور مناظر کے اعتبار سے۔

اب ہم فنی تصویر' خوبصورت طرز ادا اور متناسب اسلوب اظہار کے ایک دوسرے افق کے سامنے آجاتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو ہماری آنکھ جباروں اور ڈکٹیٹروں کی بربادی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس دنیا ہی میں ہر ڈکٹیٹر ذلیل ہو کر رہا۔ اس کا منظر اسکرین پر تھا کہ اس کے پیچھے ایک خیال بھی منظر پر آگیا جس میں قیامت میں اس کا حشر دکھایا گیا تھا۔ حالانکہ وہ ابھی دنیا ہی میں ذلیل ہو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے ان ڈکٹیٹروں کا حشر میدان حشر میں نظر آرہا ہے۔ ان کا یہ منظر اب انسانیت کی عظیم کہانی کے مناظر کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے آرہا ہے۔ یہ شاید آخری منظر ہے۔ لیکن یہ منظر قیامت کے نہایت ہی عجیب اور دلچسپ مناظر میں سے ایک ہے' جو تاثرات اور حرکات سے بھرپور ہے۔ اور جس کے اندر گمراہوں اور گمراہ کرنے والے بااثر لوگوں اور شیطان کے درمیان بھرپور مکالمے ہیں۔ ذرا قرآن کے الفاظ میں دیکھئے :

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۚ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۚ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۚ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۗ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٢﴾

"اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے، وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے "دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" وہ جواب دیں گے "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع و فزع کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں"۔ اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں، ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔

دعوت اسلامی اور داعیان حق کی یہ داستان، اور جھٹلانے والوں اور ڈکٹیٹروں کی یہ کہانی اب اس دنیا کے اسٹیج سے آخرت کے اسٹیج پر منتقل ہو گئی ہے اور نہایت ہی دلچسپ منظر ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۱۴ : ۲۱) "اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے"۔ یہ سرکش ڈکٹیٹر بھی کھڑے ہیں۔ اللہ کے سامنے اور ان کے کمزور کردار والے متبعین بھی کھڑے ہیں جنہوں نے ذلت اور کمزوری کا کردار پسند کر لیا تھا۔ شیطان بھی ایک طرف کھڑا ہے۔ دوسری جانب وہ لوگ بھی کھڑے ہیں جو رسولوں پر ایمان لائے تھے اور نیک کام کرتے تھے۔ یہ سب اب ایک میدان قیامت میں ہیں، کھلے میدان میں۔ اللہ کے لیے تو یہ پہلے بھی ظاہر و باہر تھے لیکن آج وہ خود اپنے احساس و شعور میں اپنے آپ کو ننگا اور بے حجاب محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ

میدان حشر میں کوئی پردہ اور اوٹ نہیں ہے۔ یہ میدان بھرا ہوا ہے' پردہ اٹھتا ہے اور مکالمہ شروع ہوتا ہے۔

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (۱۴: ۲۱) "اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے' وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے" دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" بودے کردار کے کمزور لوگ بہرحال کمزور ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس اعلیٰ انسانی دولت سے دستبردار ہو جاتے ہیں جو اللہ نے ہر انسان کو دی ہے۔ وہ آزادی کی دولت ہے' آزادی رائے ہے' آزادی دین اور نظریہ اور حریت عمل ہے۔ ان لوگوں نے اپنی مرضی سے اپنی آزادی کو ترک کر کے غلامی اختیار کر لی ہے اور سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے غلام بن گئے ہیں۔ یہ غیراللہ کے بندے اور غلام بن گئے ہیں اور اللہ کی غلامی کی بجائے انہوں نے انسانوں کی غلامی اختیار کر لی ہے' لیکن اسلام میں ضعیفی کوئی معقول عذر نہیں ہے بلکہ ضعیفی ایک جرم ہے' اللہ کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کا غلام بن جائے وہ تو انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ باعزت زندگی اختیار کرو' میری عزت کرو' میری پناہ میں آجاؤ۔ اللہ نے ہر انسان کو آزاد اور مکرم بنایا ہے اور اسے یہ اجازت نہیں ہے کہ اپنی آزادی کو بیچ دے' یا کسی بڑی سے بڑی مادی قوت کے سامنے سپرانداز ہو جائے چاہے وہ بہت بڑی قوت کیوں نہ ہو۔ کسی بھی قوت کو اللہ یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنا کے رکھے۔ اسلام میں ہر انسان کی آزادی اور عزت کا احترام ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی مادی قوت بھی صرف انسانی جان اور جسم کا تعلق ختم کر سکتی ہے۔ تشدد اور اذیت دے سکتی ہے لیکن کسی کی آزادی سلب نہیں کر سکتی۔ انسانی ضمیر' انسانی روح اور انسانی عقل پر کوئی ڈکٹیٹر حکومت نہیں کر سکتا' نہ عقل' روح اور ضمیر کو کوئی قید کر سکتا ہے' ضمیر اور روح' اور عقل اور حریت سے ایک انسان خود دستبردار ہوا کرتا ہے۔ پھر وہ ذلیل ہو کر مستضعفین میں داخل ہو جاتا ہے۔

اپنے عقائد' نظریات' افکار اور طرز عمل میں کسی ضعیف سے ضعیف آدمی کو کوئی انسان سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے تابع نہیں بنا سکتا۔ کوئی شخص بھی کسی ضعیف سے ضعیف آدمی کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی سرکش اور ڈکٹیٹر کا دین قبول کرلے' کیونکہ اللہ خالق و رازق موجود ہے جو سب کا کفیل و ذمہ دار ہے۔ صرف ضعیف لوگ خود اپنی خوشی سے یہ کام کرتے ہیں' یہ خود ضعیف بن گئے' ان کی قوت اور کسی سرکش اور ڈکٹیٹر کی قوت برابر ہے۔ جاہ و مرتبہ اور مال و منال کے اعتبار سے یہ مستضعفین ڈکٹیٹر کے برابر ہوتے ہیں۔ کسی ڈکٹیٹر کا مرتبہ اور منصب کسی کو ضعیف نہیں بنا سکتا بلکہ یہ ذہنی طور پر بودے کردار کے لوگ ہوتے ہیں' اپنے ایمان اور روح کے اعتبار سے یہ کمزور لوگ ہوتے ہیں' بے عزت اور آبرو باختہ لوگ ہوتے ہیں اور اپنی آزادی اور عزت کو معمولی مفادات کے لیے بیچ دینے والے لوگ ہوتے ہیں جو جھکتے ہیں حالانکہ عزت و آبرو اور آزادی انسان کا نہایت قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان بودے لوگوں کی ایک بھیڑ ہے اور سرکش اور ڈکٹیٹر چند ایک ہیں۔ آخر یہ بھیڑ کیوں چند لوگوں کی غلامی اختیار کرتی ہے' دراصل ان عوام میں ہمت نہیں ہوتی' یہ روحانی اعتبار سے شکست خوردہ ہوتے ہیں۔ ان کے اندر حمیت نہیں ہوتی' عزت نفس نہیں ہوتی اور یہ روحانی اور داخلی طور پر ان ڈکٹیٹروں کے سامنے شکست

کھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ڈکٹیٹر جمہور عوام کو صرف ان کی مرضی ہی سے ذلیل کرتا ہے۔اگر عوام اٹھ کھڑے ہوں تو ان کے سامنے کوئی ڈکٹیٹر کھڑا نہیں رہ سکتا۔لیکن یہ صورت حال خود عوام کے کمزور ارادے کی وجہ سے ہے۔

کسی انسان پر ذلت تب ہی طاری ہوتی ہے' جب اس کے اندر ذلیل ہونے کی صلاحیت ہو' ڈکٹیٹر ہمیشہ عوام کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔اب ذرا کمزوروں کی ذہنیت کو دیکھو کہ قیامت کے دن وہ کس انداز سے پیش آتا ہے' ان کی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت بودے کردار کے مالک تھے اور ہیں۔

اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (۱۴:۲۱) "دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" یہ تمہاری تابع داری ہی ہمیں اس انجام تک لے آئی ہے جو بہت ہی المناک انجام ہے۔یا ان کا مقصد فقط یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کا عذاب تو دیکھ لیا ہے' اب یہ ان متکبرین کی سرزنش کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری قیادت اور راہنمائی یہ رنگ لاتی ہے' اب آگے بڑھو اس عذاب کے لیے۔بہرحال ان کا مطلب جو بھی ہو' ہر حال میں ان کی ذلت پر بھی دلالت کرتا ہے اور متکبرین کا جواب۔

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ

(۱۴:۲۱) "وہ جواب دیں گے' اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع و فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے لیے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے"۔

یہ بادل ناخواستہ ایک دو ٹوک جواب ہے: "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے"۔ اب ہمیں کیوں ملامت کرتے ہو' ہماری راہ بھی ایک ہے اور انجام بھی ایک ہے' آخر ہم کب راہ نجات پر چلے کہ تم کو گمراہ کر دیا۔اگر ہمیں ہدایت نصیب ہوتی تو تم بھی ہمارے ساتھ راہ ہدایت پر ہوتے' جس طرح ہماری گمراہی نے تمہیں گمراہ کیا۔اب قیامت میں یہ لوگ اپنی ہدایت اور ضلالت کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔اب تو یہ اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہیں اور اللہ پر ایمان لاتے ہیں حالانکہ دنیا میں یہ ان ضعفاء پر اس طرح دست درازیاں کرتے تھے کہ گویا ان سرکشوں سے کوئی پوچھنے والا جبار و قہار ہے ہی نہیں۔اب یہاں وہ ہدایت و ضلالت کو اللہ کی طرف منسوب کرکے اس کی ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں' حالانکہ اللہ نے تو ان کو یہ حکم نہ دیا تھا کہ تم گمراہ ہو جاؤ؟

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ "اللہ لوگوں کو فحاشی کا حکم نہیں دیتا"۔ لیکن درپردہ یہ ان کمزور فطرت لوگوں کو ملامت بھی کرتے ہیں' ان کا مطلب یہ ہے کہ اب جزع و فزع سے فائدہ نہیں' نہ صبر کرنے سے فائدہ ہے۔عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے' صبر سے یا جزع و فزع سے یہ تو ٹلنے کا نہیں۔اب توبہ کا دروازہ بند ہے۔اگر یہ کھلا ہوتا تو گمراہ لوگ فریاد کرکے ہدایت پر آ سکتے تھے' اگر دنیا میں کوئی سختی ہوتی اور تم صبر کرتے تو بھی اللہ کی رحمت کی امید تھی۔اب تو مہلت ختم

ہے اور عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (۱۴ : ۲۱) "اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے لیے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے"۔ اب تو آخری فیصلہ ہو چکا ہے' بات ہی ختم ہے' سوال و جواب ہو چکا ہے' اب اسٹیج پر ایک تعجب انگیز کردار آتا ہے۔ شیطان نمودار ہوتا ہے' جو گمراہی کا داعی اور سرکشی کا حدی خواں ہے۔ یہ اسٹیج پر زاہدوں کے جبے میں آتا ہے۔ کاہنوں کی طرح نمودار ہوتا ہے' اور دونوں فریقوں پر اپنے شیطانی غرور کا اظہار کرتا ہے اور ان کو ایسا چرکہ لگاتا ہے کہ یہ زبانی زخم شاید عذاب جہنم سے بھی کڑوا ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۴ : ۲۲) "اور شیطان کہے گا" حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں' ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔

خدا کی پناہ' حقیقت یہ ہے کہ شیطان درحقیقت شیطان ہے۔ اس منظر میں یہ مکمل فارم میں ہے جس طرح مستکبرین ڈکٹیٹر اور مستضعفین بودے کردار کے لوگ اپنی صحیح فارم میں ہیں۔

یہ وہی شیطان ہے جو سینوں کے اندر وسوسہ اندازیاں کیا کرتا تھا' لوگوں کو بدکرداریوں اور گناہوں کے لیے دھوکے دیتا تھا' کفر کو لوگوں کے لیے مزین بناتا تھا۔ دعوت اسلامی کے سننے سے لوگوں کو روکتا تھا' آج وہ انہیں نہایت ہی نیش زنی اور طعنہ زنی اور دردناک مزاح سے کہتا ہے کہ تمہاری اپنی غلطی ہے۔ اب یہ بھی اس کے بیان کردہ حقائق کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے مطابق تو آخری فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب تو وہ سچی بات کہتا ہے لیکن بعد از وقت۔

اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ (۱۴ : ۲۲) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی پورا نہ کیا"۔ اس کے بعد شیطان ایک نیا طعنہ دے کر انہیں چرکہ لگاتا ہے کہ کیوں تم نے میری دعوت پر لبیک کہا' مجھے تم پر کوئی اقتدار تو حاصل نہ تھا۔ صرف یہ بات تھی کہ تم لوگوں نے اپنی شخصیت کو بھلا دیا ہے میرے اور تمہارے درمیان جو دشمنی تھی اس کو

نظرانداز کر دیا۔ اور تم نے میری غلط دعوت کو قبول کر لیا۔ اور انبیاء کی سچی دعوت کو ترک کر دیا۔

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ (١٤ : ٢٢) "میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا"۔ اس کے بعد وہ انہیں مزید شرمندہ کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے ملامت نہ کرو بلکہ تم خود قابل سرزنش ہو کہ تم نے میری اطاعت کی۔

فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (١٤ : ٢٢) "اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو"۔ اب وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور ان سے دستکش ہو جاتا ہے، حالانکہ خود اس نے ان کے ساتھ وعدے کیے تھے اور ان کو امیدیں دلائی تھیں، اور ان کے دل میں وسوسے ڈالے تھے کہ تمہارا کچھ بھی نہ بگڑے گا۔ اب جبکہ وہ فریاد کر رہے ہیں تو ان کی کوئی مدد نہیں کر رہا ہے۔ اور اگر وہ ان سے فریاد کرے تو وہ بھی کوئی مدد اس شیطان کی نہیں کر سکتے۔

مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ (١٤ : ٢٢) "یہاں نہ میں تمہاری فریادرسی کر سکتا ہوں، نہ تم میری"۔ اب تو ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق اور کوئی دوستی نہیں ہے۔
اب وہ اس بات سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہے کہ تم نے مجھے اللہ کا شریک بنایا۔ صاف صاف انکار کرتا ہے کہ میں نے تو ایسا نہیں کہا۔

اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (١٤ : ٢٢) "اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں"۔ شیطان اپنی تقریر ایک ایسی بات پر ختم کرتا ہے جو اس کے دوستوں کے لیے سخت حوصلہ شکن ہے۔

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (١٤ : ٢٢) "ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔
یہ دیکھو شیطان کا کردار! یہی تو ہے جو ان کو گمراہی کی طرف بلا رہا تھا اور وہ اس کے کہنے پر گمراہ ہو گئے تھے۔ ان کو رسول خدا کی طرف بلا رہے تھے اور ان لوگوں نے رسولان کی ایک نہ مانی۔ انکار کر دیا۔
قبل اس کے کہ اس منظر پر پردہ گر جائے دوسری طرف سے ایک اہل ایمان کا گروپ نمودار ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آج قیامت کے دن سرخرو ہو گئے ہیں۔ ان کی نجات کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿٢٣﴾

"بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کیے

جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے' اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہو گا"۔اب پردہ گرتا ہے ۔ کیا ہی خوبصورت منظر ہے۔ دعوت اسلامی اور داعیوں اور جھٹلانے والوں اور سرکش ڈکٹیٹروں کی یہ کیا ہی خوبصورت کہانی ہے۔

ذرا پیچھے اس کہانی کے تمام مناظر پر دوبارہ نگاہ ڈالیں اور اس فضا کو ذہن میں رکھیں۔پہلے منظر میں تحریک اسلامی اور جاہلیت کا مقابلہ اس کرۂ ارض پر دکھایا گیا۔رسولان کرام کا گروہ سرکشوں کے مقابلے میں کھڑا تھا۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (١٥) مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ (١٦) يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (١٧) (١٤: ١٥ تا ١٧) "انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی' پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے۔وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا۔موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا"۔

پھر آخرت کے اسٹیج پر بھی ہم نے ابھی ابھی وہ انوکھا منظر دیکھ لیا ہے۔یہ سرکش ڈکٹیٹروں' جابر بنے ہوئے لوگوں اور خود شیطان کے عجیب مکالمے پر مشتمل تھا۔اس بہترین قصے کی فضا میں اور نیک لوگوں کے اچھے انجام اور برے لوگوں کے برے انجام کے ان مناظر کے بعد اب اللہ تعالیٰ اچھی باتوں اور صحیح نظریہ حیات اور بری باتوں اور برے فلسفوں کی مثال دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں نیک و بد اور طیب و خبیث کی کشمکش انسان کی پوری زندگی میں جاری رہتی ہے۔گویا ایک قصے کے خاتمے اور پردہ گر جانے کے بعد اب اس پوری کہانی پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

م ع ٦ ١٦

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہیں' ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے' اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت' دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے' اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے"۔

کلمہ طیبہ کی مثال اچھے درخت کی دی گئی ہے جو ہر وقت پھل دیتا ہے' پھلتا پھولتا ہے' اور کلمہ خبیثہ کی مثالی بیکار جڑی بوٹیوں کی ہے' جن کو کسان جہاں دیکھتا ہے بیکار اور مضر سمجھتے ہوئے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ کسی جگہ اس کے لیے قرار نہیں ہے۔ یہ تمثیل اور تمثیلی منظر انبیاء اور سرکش اور ڈکٹیٹروں کے قصے سے لیا گیا ہے۔ اس قصے میں انبیاء اور داعیوں کا جو انجام بتایا گیا ہے اور جھٹلانے والے سرکشوں کا جو انجام بتایا گیا ہے یہ تمثیل اس پر مبنی ہے۔ سلسلہ انبیاء ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ درخت تاریخ کے مختلف موسموں میں اپنا پھل دیتا رہا ہے' کسی نہ کسی دور میں کوئی نہ کوئی نبی آیا ہے اور وہ اصلاح' دعوت اور ایمان کا پھل دیتا رہا ہے جس میں بھلائی اور اچھی زندگی کا سامان فراہم ہوتا رہا ہے۔

لیکن یہ تمثیل اس سورہ کی فضا اور اس قصے کی فضا کے ساتھ متناسب ہونے کے ساتھ ساتھ مطالب و معانی کا نہایت وسیع آفاق رکھتی ہے اور اس کے اندر گہرے حقائق ہیں۔ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ حق ہے' جو ایک مفید اور اصل دار درخت کی طرح ہوتا ہے' یہ حق مستحکم' ٹھوس اور مفید ہوتا ہے۔ زمانے گزر جاتے ہیں لیکن یہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ باطل کی طوفانی ہوائیں اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں اور ظلم و سرکشی کے کدال اسے اکھاڑ نہیں پھینک سکتے۔ اگرچہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ظلم اور سرکشی کے تحت طوفان اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ یہ درخت نہایت بلند ہوتے ہیں اور ان کی شاخیں فضاؤں میں بڑی دور تک جاتی ہیں۔ یہ سرکشی اور ظلم پر بڑی بلندی سے حقارت آمیز نظر ڈالتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ شر اس کا بلند فضاؤں میں بھی مقابلہ کر رہا ہے لیکن اس درخت کا پھل آتا ہی رہتا ہے' پھر اس درخت کی تخم ریزی صالح انسانوں کے دلوں میں ہوتی اور اس کی پودنگتی ہی رہتی ہے اور یہ نسلاً بعد نسل بڑھتا ہی رہتا ہے۔

باطل جو کلمہ خبیثہ ہوتا ہے۔ یہ بے کار جھاڑی اور بوٹی کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ جھاڑیاں بھی بہار دکھاتی ہیں اور گھنے جنگلات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور بعض لوگ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید باطل کا درخت حق سے بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس کی جڑیں نہیں ہوتیں۔ معمولی طاقت صرف کرنے سے اسے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔ جس طرح فصل سے جڑی بوٹیوں کو اکھاڑ لیا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اسے اکھاڑ پھینکتے ہیں اس لیے وہ قرار و بقا سے محروم ہوتا ہے کیونکہ ہوتا ہی خبیث ہے۔

یہ محض ایک مثال یا ضرب المثل ہی نہیں ہے' نہ کوئی ایسی بات ہے جس کے ذریعہ نیک لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے' بلکہ یہ تمثیل زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اگرچہ بعض اوقات اس حقیقت کے ظاہر ہونے میں دیر لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سچائی اور بھلائی کو کبھی بیخ و بن سے نہیں اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا اور نہ یہ سچائی کبھی مرتی یا نابود ہوتی ہے اگرچہ

شر کی گرفت سخت ہو اور شر اس کی راہ روک رہا ہو۔ اسی طرح خالص شر بھی دنیا میں پھلتا پھولتا نہیں۔ دراصل وہ اپنے ساتھ خیر کا کوئی حصہ ملاتا ہے' اور جب اس شر کے ساتھ ملائے ہوئے خیر کے عناصر ختم ہو جاتے ہیں تو پھر شر اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ بڑی قوت اور عظیم طاقت نظر آتا ہو۔ بہرحال اصل حقیقت یہ ہے کہ خیر ہی خیریت سے ہوتا ہے اور شر ہمیشہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (١٤ : ٢٥) "یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں"۔ یہ ایسی مثالیں ہیں جو زمین پر حقیقت کی شکل میں موجود ہیں۔ لوگ ان پر نظر نہیں ڈالتے' قرآن صرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تذکرہ ہے۔

شجرۂ ثابتہ اور اس مستحکم درخت کی تعبیر میں حق کے ثبات کی تصویر کشی بھی ہے' یوں کہ حق کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اور وہ آسمان تک بلند شاخیں رکھتا ہے اور نظر بھی آتا ہے کہ وہ بلند ہے۔ حق کھڑا رہتا ہے اور یہ جتلاتا ہے کہ وہ مضبوط اور ٹھوس ہے' اس کلمہ طیبہ اور شجرۂ طیبہ کے ذریعہ ایک تمثیل دے کر اللہ کیا چاہتا ہے؟

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

(١٤ : ٢٧) "ایمان والوں کو اللہ اس قول ثابت کی بنیاد پر' دنیا و آخرت دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے"۔ اور اسی طرح کلمہ خبیثہ کی تمثیل دے کر کہ وہ شجرۂ خبیثہ کی طرح ہے اور اس کے لیے کوئی ثبات و قرار نہیں ہے۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (١٤ : ٢٧) "اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے"۔ چنانچہ انداز کلام اور اس سے مراد مفہوم کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے"۔ اللہ اہل ایمان کو اس زندگی میں ثبات و قرار عطا کرتا ہے اور یہاں ان کی بات پختہ ہوتی ہے آخرت میں انہیں مضبوط کرتا ہے' وہاں ان کا انجام پختہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے دلوں کی دھرتی پر ایمان پختہ کھڑا ہوتا ہے۔ ان کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے اور اس درخت سے ان کی زندگی سے اعمال صالحہ پھوٹتے رہتے ہیں۔ پے درپے یہ اعمال آتے ہیں۔ یہ درخت قرآن و سنت کی تعلیمات کے ذریعہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے سامنے امید کی شمع ہوتی ہے۔ اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا یقین ہوتا ہے' یہ سب باتیں بالکل حق ہیں اور ٹھوس ہیں۔ ایک ہی راہ ہے اور ایک ہی طریقہ ہے۔ اور جن لوگوں کے ضمیر کی دھرتی میں یہ درخت کھڑا ہوتا ہے اس سرزمین میں قلق' بے چینی' حیرت اور اضطراب نہیں ہوتا۔

ظالموں کو اپنے ظلم اور شرک کی وجہ سے (قرآن میں ظلم کا اطلاق بالعموم شرک پر ہوتا ہے) نور اور روشنی سے دور کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اوہام و خرافات کی تنگ و تاریک وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ یہ ہوائے نفس کی مختلف راہوں پر چلتے ہیں۔ اللہ کی ایک ہی راہ سے محروم ہوتے ہیں' تو اللہ اپنی سنت جاریہ کے مطابق پھر ان کو مزید گمراہ کرتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے خود ظلم' تاریکی اور ہوائے نفس کی بندگی کی راہ کو اختیار کیا۔ تو یہ بھٹکتے رہے اور بدی کی راہوں میں ادھر ادھر بھاگتے رہے۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۱۴ : ۲۷) "اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے"۔ اس کا ارادہ بے قید ہے ' ٹھیک ہے کہ وہ ایک ناموس فطرت جاری کرتا ہے لیکن وہ خود اپنے ناموس فطرت کا پابند نہیں ہے۔ البتہ اس کے قانون پر جو چلے وہ اس کو پسند کرتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے جاری کیے ہوئے ناموس فطرت کو بدل بھی دیتا ہے کیونکہ اللہ کو روکنے والی کوئی قوت نہیں ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ' وہی ہوتا ہے۔

اس تبصرے سے رسولان کرام کے عظیم قصے اور کہانی کی بات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ دعوت اسلامی کی کہانی تھی۔ اس کا پہلا حصہ اس سورہ کے آغاز میں ایک بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں حضرت ابراہیم ابوالانبیاء کی کہانی تھی۔ پھر چند دوسرے انبیاء کی کہانی تھی جس کی شاخیں تاریخ کے اندر دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور یہ کلمہ طیبہ کے درخت کے مالی تھے جو حق کی طرح پھلتا پھولتا تھا۔ یہ کلمہ طیبہ جو یہ سب پیغمبر لے کر آئے یہ شجرۂ طیبہ کی طرح تھا۔ یہ کلمہ توحید تھا ' تمام انبیاء کا شجرۂ طیبہ ایک ہی تھا ' ایک ہی پھل دیتا تھا ' یہ کلمہ توحید تھا اور تمام انبیاء کے ہاں یہ کلمہ ایک رہا اور دعوت بھی ایک ہی رہی۔

یہ تھی اسلام اور جاہلیت کے درمیان طویل کشمکش۔ اس کی طرف ہم نے اس پوری سورہ میں جابجا سرسری اشارات کیے ہیں۔ میں اس بات کو ضروری سمجھتا ہوں کہ ان اشارات پر دوبارہ قدرے غور کیا جائے۔

چنانچہ اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں قافلہ ایمان ایک ہی قافلہ ہے۔ آدم علیہ السلام سے ادھر یہ قافلہ رواں دواں ہے اور رسولان کرام اس قافلے کے قائد ہیں۔ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی نظریہ وعقیدہ کی طرف تھی۔ ایک ہی آواز انہوں نے بلند کی اور ایک ہی طریق کار پر انہوں نے کام کیا۔ سب کی دعوت یہ تھی کہ الہ اور حاکم ایک ہی ہے ' وہی رب ہے ' اور اس کے ساتھ کوئی اور الہ اور رب اور حاکم نہیں ہے ' اور اہل ایمان کو اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہ اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ میں آنا چاہیے اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا سہارا سمجھنا چاہیے۔

پس اللہ وحدہ کو ایک سمجھنے اور عقیدۂ توحید کی وہ تاریخ جسے آج کل علماء "تقابل ادیان" بتلاتے پھرتے ہیں ' کہ پہلے لوگ متعدد الہوں کو مانتے تھے۔ پھر دو الہوں کو ماننے لگے یعنی "خیر و شر کے الہ" اس طرح لوگ پہلے شجر و حجر ' سورج ' چاند ' ستاروں اور سیاروں کی پوجا کرتے تھے اور پھر آخر میں انہوں نے اللہ واحد کی پوجا شروع کر دی۔ یوں ان کے نظریات میں ارتقاء ہوا اور انسانیت کا علم و فلسفہ ترقی کرتا رہا۔ اسی طرح ان کی سوسائٹی بھی ترقی کر کے ' ایک بادشاہ کی بادشاہی کے قیام تک جا پہنچی۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جب سے انسانی تاریخ شروع ہوئی ہے تمام رسولوں نے عقیدۂ توحید کی تبلیغ کی ہے۔ تمام رسولوں کی رسالت اور دعوت میں یہی بنیادی عنصر تھا اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ جس قدر معروف سماوی دین ہیں ' قرآن کریم کے مطابق ان کی دعوت یہی تھی۔

اگر تقابل ادیان کے علماء اپنی بات اس طرح کرتے کہ رسولوں نے جو عقیدۂ توحید آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بیان کیا۔ اس کے بعد سمجھنے کے لیے انسانوں کے فہم و ادراک میں یوں ارتقاء ہوا کہ رسولان کرام کی مسلسل جدوجہد کی وجہ سے عوام الناس کے اذہان میں یہ روشنی پھیلتی چلی گئی اور آخر میں اس طویل جدوجہد کے لیے زیادہ لوگ اللہ کے دین ' عقیدہ توحید کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو ان علماء تقابل ادیان کی بات معقول نظر آتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس منہاج بحث و تحقیق سے متاثر ہیں جو یورپ میں مروج ہے۔ اس

منہاج کی تہ میں دراصل کنیسا کے خلاف عداوت دفن ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ دور جدید کے مسلم مفکرین نے بھی اس کا خیال نہیں رکھا ۔ بہرحال تقابل ادیان دانستہ یا نادانستہ صحیح اسلامی اور دینی سوچ کے مخالف چلتے ہیں اور یہ انداز ثابت کرتے ہیں کہ ادیان کی بنیاد وحی پر نہیں ہے بلکہ دین بھی دراصل انسانی سوچ کا ارتقاء ہے ۔ جس طرح دوسرے انسانی افکار' فلسفوں اور تجربوں میں ارتقاء ہوتا رہا ہے اسی طرح دینی فکر بھی ارتقاء پذیر رہی ہے ۔ غرض اس قدیمی دشمنی اور اس سوچ ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے دور کے ماہرین علماء تقابل ادیان اس طرز پر بات کرتے ہیں اور اپنی اس سوچ اور فکر کو علمی اور تحقیقی سوچ کہتے ہیں ۔

اگر کسی اور ملک و ملت کا کوئی فرد اس منہاج سے دھوکہ کھاتا ہے تو کھائے مگر ایک مسلمان اس منہاج سے ایک منٹ کے لیے بھی متاثر نہیں ہو سکتا ۔ مسلمانوں کے پاس اپنے دین کے حوالے سے ایک صحیح منہاج فکر موجود ہے اور ان کے پاس دین کے حوالے سے ان کے اپنے کچھ طے شدہ اصول ہیں' اور اپنا منہاج بحث موجود ہے ۔

غرض تمام انبیاء انسانیت کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کرتے رہے ۔ ایک ہی نظریہ دیتے رہے ۔ اور اسی منہاج کے مطابق انہوں نے اپنے اپنے دور میں جاہیت کا مقابلہ کیا ۔ قرآن کریم اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ تمام رسول یہ دعوت لے کر آئے' یہ ایک ہی نظریہ پیش کر کے' ہر دور میں ایک ہی طرح جاہلیت کا مقابلہ کرتے رہے ۔ اور اس معاملے میں قرآن نے زمان و مکان کے حوالے سے کسی ارتقاء کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیں دعوت فکر دیتی ہے کہ اسلام' اسلام ہے اور جاہلیت' جاہلیت ہے ۔ اسلام ہمیشہ اسلام رہا ہے اور جاہلیت ہمیشہ جاہلیت رہی ہے ۔ تاریخ کے کسی دور میں ان کے درمیان کوئی اتحاد نہیں رہا ہے ۔ جب اسلام کی بنیاد پر کوئی سوسائٹی بنی ہے' اس کے ایک ہی مد و سال رہے ہیں اور جب بھی جاہلیت کی اساس پر کوئی اٹھ ہوا ہے وہ بھی ایک جیسا رہا ہے ۔ مثلاً جاہلیت کی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے اور اس میں حاکم اللہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور ہوتا ہے ۔ پرورش کرنے والا بھی اور ہوتا ہے' چاہے کوئی متعدد الہوں کا قائل ہو یا اللہ ایک سمجھتا ہو مگر رب اور حاکم متعدد ہوں تو بھی یہ سوسائٹی ایک جاہلی سوسائٹی ہوگی اور اس سوسائٹی میں جاہلیت کے تمام اوصاف و علامات موجود ہوں گی ۔

رسولوں کی دعوت کی بنیاد یہ رہی ہے کہ اللہ کو ایک سمجھا جائے اور تمام جھوٹے خداؤں کا انکار کر دیا جائے ۔ دین صرف اللہ کا ہو' صرف اللہ کے دین و شریعت کی اطاعت ہو اور صرف اللہ کو حاکم اور قانون ساز تصور کیا جائے ۔ یہ نظریہ براہ راست اس نظریہ کی ضد ہے جو جاہلیت کی اساس رہا ہے ۔ جونہی کوئی شخص یہ اعلان کرتا ہے کہ حاکم بھی اللہ ہوگا' قانون بھی اللہ کا ہوگا تو ہر جاہیت اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے' خصوصاً جب لوگ اس نظریہ کے گرد جمع ہو کر ایک جماعتی زندگی اختیار کر لیں اور خصوصاً یہ افراد جاہیت سے چھٹ چھٹ کر آ رہے ہوں اور ایک اٹھ اختیار کر رہے ہوں' ایسی صورت میں نظریہ جاہیہ اور حاکم جاہلیت ایسے افراد کے اجتماع کو اپنے خلاف ایک بغاوت سمجھتے ہیں ۔ پھر ہر جاہلی حکومت یہ خیال کرتی ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ مشکوک ہے ۔ حالانکہ یہ امور ایسے ہیں کہ ہر دور میں یہ تحریک اسلامی کے لیے لابدی ہیں کہ وہ اپنے نظریات کا مکمل کر اعلان کرے ۔ پھر ان کی اساس پر جمعیت تشکیل دے اور پھر یہ لوگ مل کر کام کریں ۔ ہر دور میں یہ طریق کار ضروری ہے ۔

ہر دور میں نظام جاہلیت کا ایک نظام ہوتا ہے اور اس کی عضویاتی تشکیل ہوتی ہے۔ جب وہ نظام دیکھتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک متضاد نظریاتی نظام آگیا ہے اور ایک نئی سوسائٹی بھی بن رہی ہے جو ان کی سوسائٹی کے بالکل متضاد عضویاتی تشکیل اور نظام رکھتی ہے۔ کیونکہ جاہلی سوسائٹی کی تہ میں متعدد الہوں کا نظریہ ہوتا ہے۔ حاکم اس میں متعدد ہوتے ہیں اور اس میں انسان انسانوں کے غلام اور تابع ہوتے ہیں جبکہ اسلامی سوسائٹی میں ایک اللہ اور حاکم کا نظریہ ہوتا ہے اور اس میں تمام لوگ اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا بندہ نہیں ہوتا تو پھر جاہلی سوسائٹی اس نئی سوسائٹی کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔

خطرے میں اضافہ اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ یہ نوتشکیل شدہ اسلامی سوسائٹی روز بروز جاہلی سوسائٹی کے جسم کو کھاتی چلی جاتی ہے۔ ابتداء میں جب اسلامی سوسائٹی بنتی ہے تو خطرہ کم ہوتا ہے لیکن جب وہ جاہلیت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اقتدار ہمارے حوالے کرو تو یہ خطرہ حقیقت بن کر جاہیت کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ اسلامی تحریک پھر جاہلیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ لوگوں کو اپنی غلامی سے نکالو اور تم سب اللہ کی غلامی میں داخل ہو جاؤ۔ چونکہ آغاز رسل سے یہی طریق کار رہا ہے' دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کا اس لیے آغاز ہی سے ہر دور میں جاہلیت نے اسلامی تحریک کو اپنے وجود کے خلاف چیلنج سمجھا ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے اور قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی قائم وجود کسی حملہ آور کے مقابلے میں اپنی حفاظت کرتا ہے اور جس طرح ہر وہ شخص اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے جس نے عوام سے حاکیت غصب کی ہوئی ہوتی ہے۔

جب جاہلیت محسوس کرتی ہے کہ تحریک اسلامی اس کے وجود کے لیے خطرہ بن گئی ہے تو وہ بھی اس مقابلے کو موت و حیات کا مسئلہ سمجھتی رہی ہے۔ جاہلیت نے تحریک اسلامی کے ساتھ کبھی بھی نرمی' مصالحت اور امن و سلامتی کے اصول کو نہیں اپنایا۔ کبھی بھی اس معرکے میں جاہلیت نے اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیا۔ نہ رسولان کرام نے اس معرکے میں کبھی اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ نہ ان کے بعد کسی مومن داعی نے اس سلسلے میں اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ جاہلیت کا اعلان یہ رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (۱۴ : ۱۳) "اور کفار نے بیشہ ان کے پاس آنے والے رسولوں کو یہ کہا کہ یا تو ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے یا تمہیں واپس ہماری ملت اور دائرہ اقتدار میں آنا ہوگا"۔ یہ لوگ رسولوں اور مومنوں کا علیحدہ وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کا اپنا کوئی نظریہ ہو یا اپنی کوئی جماعت ہو۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ واپس ہماری پارٹی میں آجاؤ یا جلاوطن ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ واپس آجاؤ' ہماری سوسائٹی میں مدغم ہو جاؤ' پگھل جاؤ اور اپنی علیحدہ سوسائٹی اور اجتماعیت مت بناؤ۔

لیکن رسولان کرام نے بھی اس بات کو کبھی قبول نہیں کیا کہ وہ ملت جاہلیہ میں پگھل جائیں اور مدغم ہو جائیں۔ اپنا وجود ختم کر دیں اور اپنی شخصیت کو ختم کر دیں۔ اس لیے کہ ان کی سوسائٹی بالکل ایک نئے نظریہ' نئے آئین و دستور و منشور پر قائم ہوتی ہے جو جاہلیت کے نظریہ اور دستور و منشور سے متضاد ہوتا ہے۔ رسولوں نے اس طرح کا جواب بھی نہیں دیا اور عمل بھی نہیں کیا جو ہمارے دور کے بعض جاہل لوگ کہتے ہیں کہ جاہلی سوسائٹی میں مدغم ہو جاؤ اور اندر اندر سے کام کرو' اندر جاکر اپنے عقیدے کو پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی جاہلی معاشرے میں اہل دعوت ایک نیا اسلامی نظریہ لے کر اٹھتے ہیں تو اس نظریہ کی اساس پر خود بخود ان کی سوسائٹی ' ان کی قیادت اور ان کی وفاداریاں الگ ہو جاتی ہیں۔ یہ فطری بات ہے اس میں کسی کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ کسی بھی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے فطری انداز ہے جو طبیعی ہے اور لازمی ہے۔ اس عمل سے اگر کسی جاہلی سوسائٹی کے اندر ردعمل ہوتا ہے کہ لوگوں کو صرف ایک خدا کی بندگی ' حاکمیت اور قانون اور دستور و منشور پر جمع کیا جا رہا ہے تو یہ ردعمل بھی طبیعی ہوتا ہے۔ اس جاہلی نظام کے تمام کل پرزے پھر اسلام کے خلاف کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس جاہلی سوسائٹی کا کل پرزہ بنتا ہے تو یہ دراصل اس جاہلی سوسائٹی کا خادم ہو گا ' اسلام کا نہ ہو گا جس طرح بعض احمق یہ سمجھتے ہیں کہ جاہلیت کا پرزہ بن کر اسلام کی خدمت کرو۔

اس کے بعد وہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جو کسی بھی دعوت کے لیے مقدر ہے ' اور جو شخص دعوت اسلامی کا کام کرتا ہے خواہ کسی زمان و مکان میں ہو ' وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے دوستوں کے ساتھ جو نصرت کا وعدہ فرمایا ہے ضرور یہ کہا ہے کہ میری نصرت آئے گی اور انہیں زمین میں اقتدار ملے گا تو یہ وعدہ اس وقت تک حقیقت کا روپ اختیار نہ کرے گا جب تک وہ کسی جاہلی سوسائٹی سے ممتاز ہو کر علیحدہ نہ ہو جائیں ' اور وہ اس دعوت کی بنیاد پر اپنی قوم سے الگ ہو کر اپنی سوسائٹی اور اپنی جمعیت تشکیل نہ دے لیں۔ اگر وہ کسی جاہلی سوسائٹی کا ہی حصہ رہیں اسی میں چلیں پھریں ' اسی کے کل پرزے ہوں ' تو اگرچہ وہ اسلام کے نظریہ حیات پر یقین رکھتے ہوں ' اس کے لیے کام کرتے ہو ' اللہ کی اس نصرت اور وعدے میں تاخیر ہو جائے گی۔ یہ وہ لازمی ' عظیم اور بنیادی شرط ہے جس پر دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں نے مکمل عمل کرنا ہے۔ اس بات کو انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

آخر میں ایک پہلو دوسرا بھی قابل غور ہے ' قرآن کریم رسولان کرام کے اس قافلے کو کس خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ قافلہ پوری انسانی تاریخ میں جاہلیت کا نہایت ہی خوبصورتی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بیان اس لیے خوبصورت ہے کہ اس قافلے کے مسافر جس حق کے حامل ہیں وہ نہایت ہی سادہ ' فطری اور خوبصورت ہے۔ یہ مسافر مطمئن ہیں ' سنجیدہ اور اپنی راہ پر ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(۱۴ : ۱۱) "ان کے رسولوں نے ان سے کہا " واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے ' نوازتا ہے "۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے ہو سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے "۔

آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی یہ خوبصورتی ' اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ یہ ایک متحدہ قافلہ ہے جو ہر زمان و مکان میں ' متحدہ جاہلیت کا مقابلہ کرتا چلا آیا ہے ' ہر دور میں اور ہر قوم میں۔

پھر یہ خوبصورتی ایک دوسرے پہلو سے بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اس دعوت اور اس حق کا جس کے یہ

رسولان کرام حامل ہیں' اور اس حق کا جو اس کائنات میں پوشیدہ باہم گہرا رابطہ ہے کیونکہ رسول یہ کہتے ہیں۔

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۱۴ : ۱۰) "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمان اور زمین کا خالق ہے"۔ اور دوسری آیت میں ہے۔

وَمَا لَنَآ أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا (۱۴ : ۱۲) "اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟" اور دوسری جگہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (۱۹) وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ (۲۰) (۱۴ : ۱۹ - ۲۰) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟ وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے"۔

اس طرح اس کائناتی سچائی اور دعوت اسلامی کی سچائی کے درمیان گہرا رابطہ قائم ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری جو برحق ہے وہ ان دونوں سچائیوں کا سرچشمہ ہے اور یہ سچائیاں گہری استحکام اور دور تک اس کائنات میں جڑیں رکھتی ہیں۔

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴ : ۲۴) "جس طرح ایک اچھی نسل کا درخت ہوتا ہے جس کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان میں ہوتی ہیں"۔ اور اس حق کے سوا جو کچھ ہو وہ باطل ہے جس طرح

كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۱۴ : ۲۶) "جس طرح ایک خبیث درخت ہوتا ہے جسے زمین کے اوپر سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور اسے زمین پر قرار نصیب نہیں ہوتا"۔

---ooo---

درس نمبر ۱۱۵ تشریح آیات

۲۸--- تا--- ۵۲

سورہ ابراہیم کا یہ دوسرا دور ہے۔ یہ بھی دور اول کے مضامین ہی کو لیے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اسی کا تسلسل ہے۔

پہلے حصے کا مضمون یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ آپ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنیوں کی طرف نکال لائیں اور ان کو یہ نصیحت کریں کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوتا ہے۔ اللہ نے بنی اسرائیل پر بڑا فضل وکرم کیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ اگر تم نے شکر کیا تو میں تمہارے اوپر انعامات میں اضافہ کر دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب سخت ہے۔ اس کے بعد نبیوں کے حالات اور ان کی تکذیب کرنے والے سرکشوں کا انجام دیا گیا ہے۔ یہ قصہ شروع ہوا اور پھر سیاق سے غائب ہو گیا۔ اس کی مختلف کڑیاں آتی رہیں اور مختلف مناظر بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ کافر قیامت کے میدان تک پہنچ گئے اور وہاں انہوں نے شیطان کا وعظ سنا لیکن یہ بعد از وقت تھا۔ قیامت میں وعظ چہ معنی دارد۔

رسولان کرام کی یہ طویل کہانی اسٹیج کرنے کے بعد اب بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی قوم تک آ پہنچتی ہے کہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا کہ لوگوں کو ظلمات سے نکال کر روشنیوں میں داخل کرے اور یہ اللہ کا بہت بڑا انعام تھا اور رسول اللہ تمہیں بلاتے ہیں کہ اللہ تمہیں بخش دے گا مگر تمہارا ردعمل بھی یہی ہے کہ تم اس نعمت کی ناشکری کرتے ہو اس دعوت کا انکار کرتے ہو اور کفر کو اختیار کرتے ہو اور تم رسولؐ اللہ اور اس کی دعوت پر کفر اور ناشکری کو ترجیح دیتے ہو۔

اس کے بعد پوری انسانیت پر اللہ کے انعامات و اکرامات گنوائے جاتے ہیں۔ اور اس پر کھلے کائناتی مناظر سے مثالیں دی جاتی ہیں اور اللہ کی نعمت کے شکر کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جنہوں نے لوگوں کو یہ دعوت دی کہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے نماز پڑھو۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ نیکی کرو' قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ مالی فوائد ہوں گے اور نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی یاری ہو گی۔

سوال یہ تھا کہ اللہ ان کافروں کو پکڑتا کیوں نہیں؟ اللہ نے ان کے معاملے کو نہ یونہی مہمل چھوڑ دیا ہے اور نہ اللہ غافل ہے بلکہ اللہ ان کے معاملے کو اصولاً ان کے عذاب کے لیے مؤخر کر رہا ہے جس میں نظریں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ رہی یہ بات کہ اللہ نے رسولان کرام کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کر رہنے والا ہے اگرچہ کفار مکر کریں اور اگرچہ ان کا مکر اس قدر عظیم

ہو کہ بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا مارنے والا ہو۔ یوں یہ دوسرا حصہ بھی پہلے حصے سے مربوط اور مسلسل ہو جاتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

"تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفران نعمت سے بدل ڈالا اور (اپنے ساتھ) اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا یعنی جہنم، جس میں وہ جھلسے جائیں گے اور وہ بدترین جائے قرار ہے اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کر لیے تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں؟ ان سے کہو، اچھا مزے کر لو، آخر کار تمہیں پلٹ کر جانا دوزخ ہی میں ہے۔"

کیا ہی عجیب صورت حال ہے، کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صورت میں کسی قوم کو ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ یہ رسول ایک عظیم دعوت کا حامل ہے۔ یہ ایمان اور عمل صالح کی طرف دعوت ہے۔ اس کے نتیجے میں پوری قوم فلاح و مغفرت حاصل کر سکتی ہے اور جنت میں داخل ہو سکتی ہے، لیکن قوم ہے کہ اس نعمت کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بجائے کفر کو لے رہی ہے، اور اس قوم کے قائد جن کے ہاتھ میں جاہل عوام کی باگ ڈور ہے وہ قوم کی قیادت جنت کے بجائے ہلاکت کے گڑھے کی طرف کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم کی حالت یہی ہوتی ہے۔ اس کے اٹھانے والے اور اس کے گرانے والے قائدین ہی ہوتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قوم کے قائدین بھی لوگوں کو جہنم کے دہانے تک پہنچانے کے بعد اس میں گرانے اور ٹھہرانے کا انتظام کر رہے ہیں جیسا کہ پہلے انبیاء کے مخالف جاہلیت زدہ قائدین نے اپنی قوم کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ جس طرح ان لوگوں نے اپنی اقوام کا برا حشر کیا، اسی طرح اہل مکہ بھی یہی کر رہے ہیں۔

کسی قوم کے قائدین کا یہ عجیب فعل ہوتا ہے، حالانکہ انہوں نے زمانہ ماقبل کی اقوام کی تاریخ کو پڑھا اور دیکھا ہوتا ہے۔ اگر نہیں دیکھا تھا اور پڑھا تھا تو قرآن نے یہ انجام ان کے سامنے کس قدر موثر ڈرامائی انداز میں اسٹیج کیا ہے۔ ابھی ابھی اس کے مناظر نظروں سے گزرے ہیں، اور یہ مناظر اس قدر دلچسپ تھے کہ گویا (Living) تھے اور عنقریب وہ ان کو عملاً اسی طرح دیکھیں گے۔ کیونکہ نصوص قرآن وہی مناظر پیش کرتی ہیں جو ہونے والے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ قرآن ان کو اس قدر موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا واقع ہو گئے ہیں۔ غرض ان لوگوں کے طرز عمل میں تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ اس نعمت کے بدلے وہ کفر خرید رہے ہیں اور جس توحید کی دعوت ان کو دی جا رہی ہے اس کا انکار کر رہے ہیں۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ (۱۴ : ۳۰) "اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کیے ہیں تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں"۔ یعنی یہ اللہ کے ساتھ دوسری شخصیات کو برابر کرتے ہیں اور ان کی عبادت اسی

طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ کی عبادت کی جاتی ہے۔ ان کی حاکمیت کو اسی طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان دوسری شخصیات میں اس طرح خصوصیات تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ کی خصوصیت ہیں حالانکہ اللہ کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ یہ شریک اس لیے ٹھہرائے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ وحدہ اور صراط مستقیم سے بدراہ کر دیں 'کیونکہ اللہ کی راہ کے سوا وہ اور جن راہوں پر چلیں گے وہ شیطانی راہیں ہوں گی۔

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ قوم کے کبراء اور لیڈروں نے عمداً اس قوم کو اللہ کی راہ سے بدراہ کیا اور اللہ کو الٰہ واحد قرار دینے کے بجائے لوگوں کو دوسرے الہوں کی قیادت میں دے دیا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان دوسرے الہوں کے روپ میں یہ لوگ اپنی قیادت اور سیادت بھی چکاتے تھے جبکہ عقیدۂ توحید ہر سرکش ڈکٹیٹر کی قیادت کے لیے اور اس کے مفادات کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔ ہر زمانے اور ہر سوسائٹی میں طاغوتی قوتوں کا یہی ردیہ ہوتا ہے جس طرح زمانہ سابقہ کی جاہلیتوں میں یہی صورت رہی اسی طرح دور جدید کی جاہلیت میں بھی یہی صورت ہے کہ لوگ کسی نہ کسی صورت میں عقیدۂ توحید کو چھوڑ کر اپنی قیادت کسی طاغوتی قوت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ دور جدید میں لوگ اپنی حریت اور آزادی ایسے ہی طاغوتی الہوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ ان کی خواہشات کے مطابق چلتے ہیں 'ان سے قانون اور شریعت اخذ کرتے ہیں 'اور اللہ کے قانون کے بجائے ان کبراء سے قوانین اور ہدایات اخذ کرتے ہیں۔ اللہ کی توحید کے نظریہ کو جب اس مفہوم تک وسعت دی جاتی ہے کہ حاکم بھی اللہ ہے 'اور قانون ساز بھی اللہ تو دور جدید کے لیڈر بھی جاہلیت اولیٰ کی طاغوتی قوتوں کی طرح تحریک اسلامی کے خلاف میدان میں آ جاتے ہیں۔ یہ تحریک اسلامی کو اپنی خدائی کے خلاف خطرہ سمجھتے ہیں اور اسے پھر ہر طریقے سے بچانے کی سعی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح لوگ آج پارلیمنٹ یا آرڈیننس کے ذریعہ غیر اللہ سے قانون اخذ کرتے ہیں 'جو اللہ کے احکام کے خلاف ہوتے ہیں 'بلکہ اللہ کے حرام کو حلال کرتے ہیں اور اللہ کے حلال کردہ کو حرام کرتے ہیں تو یہ لوگ بھی دراصل شرک کرتے ہیں اور ایسے لیڈر اور قانون ساز اللہ کے شریک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور یوں لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپ بھی اپنی قوم کو صاف صاف کہہ دیں کہ مزے کر لو' تمہارے چند دن ہیں 'جب یہ مدت ختم ہو گی تو تم اور تمہاری ایسی قیادت سب واصل جہنم ہو گی۔

اے پیغمبر ان کو اپنے اس حال پر چھوڑ دے اور اب میرے بندوں کو وعظ دیں جو ایمان لا چکے ہیں 'جو اللہ کی اس نعمت کی قدر کرتے ہیں اور انکار نہیں کرتے۔ اللہ کی نعمت کو کفر کے بدلے نہیں بیچتے 'کہ وہ میرا شکر ادا کریں 'میری عبادت کریں اور اطاعت کریں۔ ان کفار کو چھوڑ کر آپ اپنی پوری توجہ اہل اسلام کو دیں۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

"اے نبی ' میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس

میں سے کھلے اور چھپے (راہ خیر میں) خرچ کریں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔

میرے بندوں سے کہیں کہ میرا شکر اقامت صلوٰۃ کے ذریعہ ادا کریں۔ نماز شکر الٰہی ادا کرنے کا مخصوص ترین طریقہ ہے۔ پھر میرا شکر ادا کرنے کا اہم طریقہ انفاق فی سبیل اللہ ہے جو کچھ میں نے ان کو دیا ہے' اس سے اعلانیہ اور خفیہ خرچ کریں۔ خفیہ اس وقت جب لینے والوں کی عزت نفس کی حفاظت بھی مقصود ہو اور دینے والوں کی مروت بھی محفوظ ہو' کیونکہ جو لوگ تفاخر' ظاہرداری اور مقابلے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ انفاق فی سبیل اللہ نہیں ہوتا' اور اعلانیہ وہاں خرچ کریں جہاں صدقات واجبہ کا ادا کرنا مقصود ہو' اور جہاں انفاق کو مثالی بنانا مقصود ہو' دونوں طریقوں میں سے کسی طریقے کا انتخاب انفاق کرنے والے کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اور ان کو یہ بھی کہہ دیں کہ انفاق کا بھی ایک وقت ہے' ایک مہلت ہے' جب مہلت ختم ہو گئی تو پھر نہ تجارت ہو گی' نہ مال بڑھے گا اور نہ دوستیاں ہوں گی اور نہ انفاق کے لیے ہاتھ میں کچھ ہو گا۔ وہاں تو اچھے اعمال ہی کام آئیں گے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ (١٤ : ٣١) "قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔ اب اللہ تعالیٰ اس کائنات کی عظیم کتاب کو کھول کر اپنے انعامات گنواتے ہیں۔ یہ عظیم اور ناقابل شمار انعامات ہیں۔ اس کتاب کے بڑے بڑے صفحات ہیں اور ان کے اندر نامعلوم اقسام و الوان کے انعامات ہیں۔ دور تک پھیلے ہوئے آسمان' یہ زمین' شمس و قمر' رات اور دن کی گردش' آسمانوں سے نازل ہونے والا پانی' زمین سے اگنے والے انواع و اقسام کے نباتات' سمندر' سمندری مخلوق اور جہاز رانی' زمین کی ندیاں' نالے اور دریا' غرض وہ سب کچھ جو انسان رات اور دن دیکھ رہا ہے۔ لیکن لوگ اپنی جہالت اور جاہلیت کی وجہ سے اس صفحات کو نہیں پڑھتے۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔ بے شک انسان ظالم اور ناشکرا ہے۔ اللہ کی نعمتوں کو چھوڑ کر کفر اپناتا ہے۔ اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے حالانکہ اللہ وحدہ خالق و رازق ہے اور اس پوری کائنات کو اسی نے انسان کے لیے مسخر رکھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

"اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری

رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جارہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔

یہ ایک زبردست تنقیدی حملہ ہے' انسانی شعور پر کوڑے برسائے جارہے ہیں۔ زمین و آسمان کے بڑے بڑے اجرام و پہاڑ'شمس و قمر'گردش لیل و نہار' بارشیں اور پھل' یہ سب کوڑے اور سنگ باری کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں اس ظالم انسان کے شعور کے لیے سخت کاٹ بھی ہے اور پر محبت اور پر سوز آواز بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل فکر کے لیے اس کتاب کے معجزات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اس کائنات کے مناظر اور نفس انسانی کی الجھنوں کو عقیدۂ توحید کے ساتھ جوڑتی ہے۔ یہ کتاب اس کائنات کے مناظر میں سے ہر منظر اور ہر چمک کو ایک اشاراتی رنگ دیتی ہے۔ اسی طرح انسانی نفس کے تصورات اور اشراقات میں سے ہر اشراق سے اشارات اخذ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ یوں یہ کتاب اس پوری کائنات کو اللہ کے نشانات اور دلائل کی نمائش گاہ بنا دیتی ہے' جس میں دست قدرت کے عجائبات جگہ جگہ سجے ہوئے ہیں۔ ہر منظر اور ہر مثال پر قدرت الٰہیہ کے عجائبات کے طومار لگے ہوئے ہیں۔ ہر تصور اور ہر رنگ اور ہر سایہ میں قدرت ہی قدرت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم وجود باری کے مسئلہ پر منطقی مناظرہ نہیں شروع کرتا جس میں الٰہیات کے لاہوتی اور ناسوتی مباحث ہوں۔ فلسفیانہ' مجرد' مردہ' خشک مباحث' جن میں قلب انسانی کے لیے کچھ تروتازگی نہیں ہوتی بلکہ نفس انسانی پر یہ مباحث بوجھ ہوتی ہیں۔ قرآن کریم اس مسئلہ کو نہایت موثر' اشاراتی انداز دیتا ہے اور کائنات کے مناظر' عجائبات' فطری دلچسپ اور بدیہیات کے ذریعہ نہایت ہی خوبصورت انداز میں اور نہایت منطقی ترتیب سے اسے پیش کرتا ہے۔

یہ عظیم اور بھرپور منظر ہے' جس کے مناظر اس لائن پر چلتے ہیں جس میں' اللہ کے بندوں پر اس کے انعامات و اکرامات دکھائے گئے ہیں۔ دست قدرت کی کاری گری کے عجیب نمونے ہیں۔ اس لائن پر پہلے زمین و آسمان کے وسیع فاصلے اور لاتعداد عجائبات آتے ہیں۔ پھر بارشوں کے مناظر اور ان کے نتائج نباتات اور پھول پھل آتے ہیں' اور یہ سب کچھ زمین پر پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے' پھر اس راہ میں ہمارے سامنے سمندروں کے نظارے آتے ہیں جس میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں جو لوگوں کی ضروریات اٹھائے ہوئے ہیں' پھر ہمارے سامنے ایک نیا نظارہ آتا ہے جو شمس و قمر اور زمین سے متعلق ہے جس میں ان کی گردش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گردش لیل و نہار کے مناظر اور پھر ان تمام انعامات کی ایک مجموعی جھلک جس میں انسان کی ہر ضرورت اور خواہش اور ان کے پورے ہونے کی جھلک دکھائی گئی ہے۔

وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴: ۳۴) "جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا"۔ اب سوال یہ کیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کے بعد بھی تم اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہو۔ تمہارا اندازہ اور فیصلہ کس قدر ظالمانہ ہے کہ تم اللہ کی مخلوقات میں سے زمین و آسمان کی ایک ادنیٰ مخلوق کو پوجتے ہو۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۱۴ : ۳۲) "اور جس نے آسمانوں سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے"۔ زراعت تو انسانی رزق کا سب سے بڑا اور پہلا ذریعہ ہے' اور تمام ظاہری انعامات کا تعلق زراعت سے ہے۔ بارش اور اس کے نتیجے میں نباتات کا پیدا ہونا اس قانون فطرت کے تابع ہے جو اللہ نے اس کرۂ ارض پر جاری کیا ہے۔ یہ قانون قدرت بارشیں برساتا ہے' نباتات اگاتا ہے اور پھر اس سے مختلف قسم کے پھل تیار ہوتے ہیں اور یہ سب موافقات اور سہولیات انسان کے لیے ہیں۔ رزق کے ایک دانے کی تشکیل اور فراہمی کے اندر کس قدر عوامل کام کرتے ہیں' مثلاً زمین' پانی' سورج کی شعاعیں اور ہوا۔ لوگ لفظ رزق سن کر صرف مال و دولت کی آخری شکل کو ذہن میں لاتے ہیں حالانکہ انسانی رزق کے دائرے میں بہت سی چیزیں آتی ہیں اور رزق کا مکمل نظام بہت ہی گہرا ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے قیام کے لیے کم از کم جس چیز کی ضرورت ہے اس کی فراہمی کے لیے یہ کائنات بڑے بڑے اجرام فلکی کو حرکت دے رہی ہے۔ اس کے اندر ایک نہایت گہرا قانون قدرت کام کرتا ہے اور ہزارہا سہولیات اور موافقات فراہم ہوتے ہیں جو باہم ہمقدم ہو کر کام کرتے ہیں۔ تب جا کر انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کم سے کم معیار پورا ہوتا ہے۔ اگر ان موافقات میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو اس حضرت انسان کا زندہ رہنا ہی محال ہو جائے اور اس کا وجود ہی نہ ہو۔ اس آیت میں جن اجرام کی حرکت اور خدمت کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ انسان کے رزق کے اسباب فراہم کرتے ہیں' یہ کافی و شافی ہے اور یہ تمام کام دست قدرت کے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (۱۴ : ۳۲) "اور جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے"۔ کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے عناصر میں یہ خواص رکھے جن کی وجہ سے کشتی پانیوں پر چلتی ہے اور انسان کو ایسے عقلی خواص دیئے جس سے یہ باتیں معلوم کیں۔ یہ سب کام انسان اللہ کے امر سے کر سکتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۱۴ : ۳۲) "اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا"۔ ان دریاؤں کو بہایا' ان کے نتیجے میں زندگی کے دریا بہنے لگے اور انسانوں کے لیے خیر کے سوتے پھوٹ پڑے۔ پھر ان دریاؤں میں مچھلیاں اور بھلائی کی دوسری اشیاء' یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے لیے پیدا کیں۔ پرندے ہیں یا چرندے ہیں' انسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (۱۴ : ۳۳) "اور سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں"۔ انسان براہ راست شمس و قمر سے استفادہ تو نہیں کر سکتا جس طرح پانی' فصلوں اور پھلوں سے' سمندروں اور کشتیوں اور نہروں اور دریاؤں سے براہ راست کرتا ہے لیکن شمس و قمر کے آثار انسان کے لیے مفید ہیں۔ ان سے انسان زندگی کا مواد لیتا ہے اور قوت حاصل کرتا ہے کیونکہ ان کو اللہ نے ایسے قانون قدرت کا پابند کر دیا ہے کہ یہ مسلسل انسان کے لیے اس کی ضرورت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ضروریات اور جسم انسانی کے خلیے سورج کی ان شعاعوں سے ترکیب' تجدید اور تغیر پاتے ہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ (١٤ . ٣٣) "اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا"۔ ان کو اللہ نے انسانی ضرورت کے مطابق بنایا' گردش لیل و نہار کا موجودہ نظام اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کے لیے اور اس کی سرگرمیوں کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اگر یہاں ہمیشہ دن ہوتا یا ہمیشہ رات ہوتی تو انسان سرے سے زندہ ہی نہ رہ سکتا۔ زمین کا یہ ماحول اس کے لیے ناساز گار ہو جاتا' یہ زندگی' یہ ترقیات اور یہ پیداوار مشکل بن جاتی۔

اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات کی تو یہ صرف آؤٹ لائن ہیں۔ ان خطوط کے اندر انعامات الٰہی کے جو نکات ہیں' اگر ایک ایک نکتے پر بحث کی جائے تو مستقل کتاب بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان کو اجمالاً سمیٹ دیتے ہیں۔ ایک اصولی بات۔

وَ اٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا"۔ مال' اولاد' صحت' ساز و سامان وغیرہ وغیرہ۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (١٤ ، ٣٤) "اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے"۔ یہ اس قدر زیادہ ہیں کہ انسانوں کی ایک عظیم جماعت بھی انہیں گن نہیں سکتی۔ بلکہ تمام انسان لگ جائیں تو بھی نہیں گن سکتے۔ اس لیے کہ انسان زمان و مکان کے اندر محدود ہے' اس کا علم محدود ہے' اس کے علم کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے اور زمان و مکان کے درمیان محدود بھی ہے جبکہ اللہ کے انعامات اس قدر زیادہ ہیں کہ انسان کے دائرہ علم و ادراک سے وراء ہیں۔ ان سب حقائق کے بعد بھی' اے لوگو' تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو' اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے تم اللہ کے انعامات کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ شکر کے بجائے تم کفر کرتے ہو' حق ہے :

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (١٤ : ٣٤) "حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔ جب انسانی ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور اپنے اردگرد کائنات کو چشم بینا سے دیکھنے لگتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ یا تو براہ راست اس کے کنٹرول میں ہے یا اس طرح کہ اللہ کے جاری کردہ ناموس قدرت کی رو سے یہ انسان کے لیے کام کر رہی ہے اور انسان کی ضروریات فراہم کر رہی ہے۔ جب اس طرح انسان اپنے ماحول پر غور کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ اللہ کے رحم و کرم کی وجہ سے یہ پورا ماحول انسان کا دوست ہے' انسان کا مددگار ہے' اور اللہ نے اس کو انسان کے لیے نہایت ہی نرم اور مطیع فرمان بنا دیا ہے۔ پھر انسان کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ سر اٹھا کر ذرا اپنے ماحول پر غور و فکر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ کانپنے لگتا ہے۔ اللہ کا خوف کھاتا ہے۔ سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور پھر وہ خضوع و خشوع میں اس رب منعم کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر وہ کسی مشکل میں ہو تو فراخی کی دعا کرتا ہے اور اگر وہ اللہ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہو تو یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ ان نعمتوں کو محفوظ اور جاری رکھ۔

اور انسان ذاکر اور شاکر اور متدبر کا اعلیٰ نمونہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے' جن کے نام سے یہ سورہ معنون ہے اور یہی مناسبت ہے کہ اس سورہ کے مضامین اور فضا بھی شکر اور ناشکری اور کفران نعمت کے محور کے گرد

گھومتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اعلیٰ کردار میں پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ مجسمہ شکر ہیں۔ نہایت خشوع و خضوع کی حالت میں ہیں اور نہایت ہی نرم اور دھیمے زمزمہ میں دست بدعا ہیں۔ آپ کی دعاؤں اور شکر کا یہ زمزمہ آسمان کی طرف نہایت ہی نرم اور باادب موجوں کی شکل میں بلند ہوتا ہے اور دور تک اس کی گونج آسمانوں میں غائب ہو جاتی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾ رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَ مَا نُعْلِنُ ؕ وَ مَا یَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع ۶

۱۸

"یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ "پروردگار' اس شہر (یعنی مکہ) کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار' ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کریں' لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ پروردگار' میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں' لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے' شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار' تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں"۔

اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے' نہ زمین میں نہ آسمانوں میں ”شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیئے' حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔ اے میرے پروردگار' مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں)۔ پروردگار' میری دعا قبول کر۔ پروردگار' مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہو گا“۔

اس منظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کے پاس کھڑے نظر آتے ہیں۔ بیت اللہ کی تعمیر انہوں نے کر دی ہے اور یہ وہی بیت اللہ ہے جس کی تولیت اب قریش تک آپہنچی ہے۔ اور ذرا دیکھو ان کو یہ اللہ کے ساتھ کفر بیت اللہ میں کرتے ہیں۔ اور یہ کفر وہ اس گھر میں کرتے ہیں جس کے بنانے والے نے اسے صرف اللہ کی بندگی کے لیے بنایا تھا۔ قرآن کریم اس منظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک عاجزی کرنے والا' اللہ سے نہایت ڈرنے والا' ذکر و شکر کرنے والا ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس لیے کہ قریش ذرا غور کریں اور اپنے انکار اور ہٹ دھرمی کو ترک کر کے دعوت اسلامی کا اعتراف کر لیں' کفر کے بجائے شکر کریں' غفلت کے بجائے نصیحت حاصل کریں اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ وہ جو بدراہ و گمراہ ہو گئے' واپس ان کی اصلی راہ پر آجائیں اور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کر کے راہ ہدایت پر آجائیں۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا (۱۴ . ۳۵) ”پروردگار' اس شہر (یعنی مکہ) کو امن کا شہر بنا دے“۔ امن وہ نعمت ہے جو ہر انسان کی ضرورت ہے۔ انسان کے احساسات پر امن بہت اثر کرتا ہے' کیونکہ انسان کی زندگی جاری ہی امن سے رہ سکتی ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائے امن کو اس لیے لایا گیا ہے کہ اہل مکہ کو بتایا جائے کہ ذرا عقل کے ناخن لو اور اس شہر کے امن کو تباہ نہ کرو' بڑی دعاؤں کے بعد یہ ملا ہے۔ تم ایک طویل عرصہ ہوا اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہو اور خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرتے ہو اور شکر نہیں کرتے۔ یہ امن اس شہر کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں سے حاصل ہوا ہے۔ افسوس صد افسوس کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے اور دین کو چھوڑ چکے ہو' اور یوں ناشکری کرتے ہو۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اس خانہ توحید میں تم نے اللہ کے شریکوں کے بت رکھ چھوڑے ہیں' تم اس شہر میں حضرت ابراہیم کے دین اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہو' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے اس حصے پر تو غور کرو۔

وَّ اجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴ : ۳۵) ”اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا“۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رب کے سامنے تسلیم و رضا کے پیکر ہیں۔ اور دل کی گہرائیوں سے التجا کر رہے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیو' آپ اپنی دعا میں مدد بھی طلب فرماتے ہیں اور راہنمائی بھی چاہتے ہیں۔ اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس ہدایت کو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے دل شرک اور بت پرستی کی تاریکیوں سے نکل آتا ہے اور جہالت کے بدلے علم اور تاریکی کے بدلے روشنی پاتا ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور توحید کی ہدایت اور روشنی۔ توحید میں آخر انسان حیرت اور پریشانی کے تہ بہ تہ اندھیروں سے نکل جاتا ہے اور گمراہی اور بدکرداری سے بچ نکلتا ہے۔ وہ روشن دماغ' پرسکون اور برقرار ہوتا ہے اور مختلف الہوں اور خداؤں کی بندگی سے نکل کر اور ذلت اور غلامی سے نکل کر' ایک خدا کی نہایت ہی باعزت بندگی

میں داخل ہوتا ہے اور ایک آزاد زندگی پاتا ہے۔ یہ وہ انعامات ہیں جو حضرت ابراہیم پر رب تعالیٰ نے کر رکھے تھے۔ اب وہ دعا کرتے ہیں کہ یہ انعامات برقرار رہیں۔ وہ بھی اور ان کی اولاد بھی بت پرستی کی لعنت سے دور رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ماحول میں ان کی ہم عصر نسلوں میں سے اکثریت کو بت پرستی نے گمراہ کر رکھا ہے' سابقہ لوگ بھی اس میں مبتلائے ہوئے اور خلق کثیر کو ان بتوں نے گمراہ کیا۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ (۱۴:۳۶) "اے رب' ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے"۔ اب یہ دعا اعلان کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ جو شخص میرے طریقے کو اپنائے گا وہی میرا ہو گا' وہ میری طرف نسبت کر سکے گا' اور قیامت میں میرے ساتھیوں میں سے ہو گا۔ ایمان اور نظریہ کا رفیق ہو گا۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴:۳۶) "لہٰذا ان میں سے جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے"۔ اور جو میرے طریقے کو چھوڑ دے تو اس کا انجام میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔

وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴:۳۶) "اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو' تو درگزر کرنے والا مہربان ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس قدر مہربان' رحیم اور بردبار اور صبر کرنے والے تھے۔ اس لیے وہ ان لوگوں کی ہلاکت کا مطالبہ نہیں کرتے۔ جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے طریقوں کو نہیں اپناتے اور ادھر ادھر ہو جاتے ہیں' آپ ان کے لیے عذاب میں جلدی نہیں فرماتے بلکہ عذاب کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ آپ ان لوگوں کو جو حضرت کے طریقوں سے ہٹ جاتے ہیں' اللہ کے رحم و کرم کے سپرد کرتے ہیں' عفو و درگزر کے حوالے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس فضا پر رحمت اور مغفرت کے سائے پھیل جاتے ہیں اور رحمت و شفقت اور معرفت کے ان سایوں کے نتیجے میں معصیت کی فضا دب جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام معصیت کی فضا کو کھولتے نہیں' پس منظر میں لے جاتے ہیں۔

اب اس سے آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے سامنے یہ درخواست پیش فرماتے ہیں کہ اے اللہ تو دیکھ رہا ہے کہ میں نے اپنی اولاد میں سے بعض لوگوں کو اس بنجر وادی میں مستقلاً آباد کر دیا ہے۔ جو بیت اللہ کے قریب ہونے کے سوا بنجر اور پسماندہ ہے اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو یہاں بسانے کا مقصد کیا ہے۔

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (۱۴:۳۷) "اے رب' میں نے اس بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے ساتھ لا بسایا ہے"۔ یہ کیوں؟

رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (۱۴:۳۷) "پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز

قائم کریں"۔ فقط اقامت صلوۃ مقصد ہے اور صرف اس مقصد کے لیے اس بنجر اور خشک وادی میں ان کو بسایا ہے۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ (۱۴: ۳۷) "لہٰذا لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا"۔ دعا میں کس قدر رقت ہے اور فضا میں کس قدر سرور ہے' دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور مشتاقان دیدا زاڑ کر اس شہر پر گرتے نظر آتے ہیں۔ اس وادی غیرذی زرع اور خشک و بنجر کی طرف عاشقوں کے قافلے رواں دواں ہیں۔ غرض اس دعا کے اندر اس قدر تروتازگی ہے اور دعا کے اندر اس قدر رقت ہے کہ قریب ہے کہ پوری کائنات کے آنسو اس وادی کو تر کر دیں۔

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ (۱۴.۳۷) "اور انہیں کھانے کو پھل دے"۔ اور یہ پھل ان کو ان لوگوں کے ذریعہ ملیں جو ہر طرف سے اس گھر اور ان لوگوں پر پروانوں کی طرح آ کر گریں۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کھائیں پئیں اور مزے کریں' اور اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جیسے شکرگزار ہونے کی خواہش ظاہر ہے کہ یہی ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۱۴: ۳۷) "شاید یہ شکر گزار بنیں"۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اپنی اولاد کو بیت اللہ کے پڑوس میں آباد کرتے ہیں اور سیاق کلام سے اس کا مقصد یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں رہ کر نمازوں کو قائم کریں جس طرح نماز کو قائم کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس خواہش کے پیچھے صرف یہ جذبہ ہے کہ لوگ اللہ کے شکرگزار ہوں۔ لوگوں کے دل بیت اللہ اور اہل بیت اللہ کی طرف کھنچ آئیں' پھر لوگوں کے اس اجتماع سے ان کے لیے پھلوں اور غلوں کی شکل میں خوراک فراہم ہو اور اس کے جواب میں یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کریں۔

اس دعا کی روشنی میں قرآن کریم اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قریش جس مقصد کے لیے بیت اللہ کے قریب بسائے گئے تھے انہوں نے وہ مقصد ترک کر دیا ہے۔ نہ وہ اللہ کے لیے نماز قائم کرتے ہیں اور نہ اللہ کے ان انعامات پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ بیت اللہ پر لوگوں کا اجتماع جاری ہے اور پھل اور فروٹ ہر طرف سے ان کے لیے وافر مقدار میں آ رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اس دعا پر' کہ اس نے اپنی اولاد کو یہاں بسایا ہے اور ان کو پھل اور دوسری ضروریات فراہم ہوں' تاکہ وہ نماز قائم کریں اور اللہ کا شکر ادا کریں' اب خود تبصرہ فرماتے ہیں کہ اللہ تو سب لوگوں کے دلوں کی خواہشات کو جانتا ہے خواہ ظاہری ہوں یا خفیہ ہوں۔ اگر کوئی خدا کے خوف سے نماز پڑھتا ہے اور شکر کرتا ہے تو اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی طرف توجہ میں مظاہر کی اہمیت نہیں ہے' جس طرح یہ لوگ بیت اللہ میں تالیاں بجاتے اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ عبادت اور دعا تو اصل وہ ہوتی ہے جس میں کسی کا قلب و ضمیر اللہ کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اللہ سے کسی کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو زمین و آسمان میں ظاہر و خفیہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَ مَا نُعْلِنُ وَ مَا يَخْفٰي عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۱۴:۳۷) "پروردگار' تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں"۔ اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے 'نہ زمین میں نہ آسمانوں میں"۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی سابقہ مہربانیوں کو یاد کر کے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور حمد کرتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ (۱۴:۳۹) "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیئے' حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے"۔ اگر کسی کو بڑھاپے میں اولاد دے دی جائے جبکہ اس سے قبل اس کی اولاد نہ ہو تو اس پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے کیونکہ اولاد دراصل انسانی زندگی کا تسلسل ہے۔ اگر انسان کی زندگی قریب الاختتام ہو اور اسے غیر متوقع طور پر اولاد مل جائے تو یہ نہایت ہی اطمینان کی بات ہوتی ہے کیونکہ انسانی نفس ہمیشہ یہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم حمد باری کرتے ہیں اور اللہ کی مزید رحمت کے امیدوار ہیں۔

اب اس شکر اور حمد کے بعد یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مجھے شکر ادا کرنے اور حمد باری تعالیٰ پر مداومت عطا فرما' کہ میں تیری عبادت کرتا رہوں' اطاعت کرتا رہوں۔ یوں حضرت ابراہیمؑ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ شکر کرتے رہیں گے' عبادت الٰہی کرتے رہیں گے اور یہ دعا اس ڈر سے کر رہے ہیں کہ کہیں اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے' کوئی امران کو اس سے موڑ نہ دے۔ چنانچہ اپنے اس عزم کو بھی اب اللہ کی امداد سے جاری رکھنے کی دعا کرتے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ (۱۴:۴۰) "اے میرے پروردگار' مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں)۔ پروردگار' میری دعا قبول کر"۔ ایک بار پھر ہمیں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد لئل قریش کے موقف میں مکمل تضاد نظر آتا ہے' ابراہیم علیہ السلام اللہ سے اس بات کے لیے مدد طلب کرتے ہیں کہ مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دے اور اس کام میں مجھے اور میری اولاد کو توفیق دے مگر اس کی اولاد ہے کہ وہ نماز سے اعراض کر رہی ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہی سے جو رسول ان کے پاس آیا اور جو انہیں نصیحت کرتا ہے' اور حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات یاد دلاتا ہے یہ لوگ اس کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں' حالانکہ یہ خود ان میں سے ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اپنی اس خضوع و خشوع اور عاجزی سے بھری ہوئی دعا کو اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے اور تمام مومنین کے لیے طلب مغفرت پر ختم فرماتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں حساب کے دن بخش دیجئے۔ کیونکہ حساب کے دن تو ہر شخص کو صرف عمل ہی فائدہ دے گا یا پھر اللہ کی طرف سے مغفرت ہی اس کا کام کرے گی۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۱۴:۴۱) "پروردگار'

مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہو گا"۔ خشوع و خضوع سے بھرپور اس دعا کا منظر یہاں ختم ہوتا ہے جس میں اللہ کی بے بہا نعمتوں اور ان پر شکر کے مناظر دکھائے گئے ' جس میں گفتگو کا ٹون نہیت ہی دھیمی موسیقی کا تھا 'جس طرح ہلکی ہوا میں سطح آب پر ہلکی سی موجیں اٹھتی ہیں۔ اس منظر سے پورے ماحول پر ایک الوداعی اور لطیف جذباتی فضا طاری ہو جاتی ہے۔ انسانی دل اللہ کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ اللہ کے انعامات کو یاد کرتے ہیں اور یہ منظر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک بندۂ ذاکر و شاکر کے طور پر تصور کرتا ہے 'جس طرح اس دعا سے پہلے تمام بندگان خدا کو قرآن نے دعوت دی تھی کہ وہ اللہ کے بندگان ذاکر و شاکر بن جائیں۔

یہاں قارئین یہ بات نوٹ کرنا بھول نہ جائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پرسوز دعا میں "ربنا" اور "رب" اور "ربی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے لیے اور آپ کے بعد اپنی اولاد کے لیے اللہ کی صفت ربوبیت کو جان بوجھ کر استعمال کیا ہے اور اس میں گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ آپ یہاں اللہ کی صفت الوہیت کو نہیں لاتے بلکہ صفت ربوبیت کو بکرار لاتے ہیں اس لیے کہ تمام جاہلیتوں خصوصاً عربی جاہلیت میں اللہ کی الوہیت مختلف فیہ نہیں رہی ہے۔ جس چیز میں ہمیشہ اختلاف واقع ہوتا ہے وہ اللہ کی صفت ربوبیت ہے۔ یعنی رب وہ ہوتا ہے جس کا تجویز کردہ نظام ' دین اور شریعت اس زمین پر چلتا ہے۔ اور یہی اصل عملی مسئلہ ہوتا ہے 'جو لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام اور جاہلیت میں تمیز ہوتی ہے 'توحید شرک سے جدا ہوتی ہے کیونکہ لوگ یا تو اللہ کے دین میں ہوں گے تو اللہ ان کا رب ہو گا یا وہ غیر اللہ کے نظام میں ہوں گے پھر یہ غیر اللہ ان کا رب ہو گا۔ اسلام اور جاہلیت اور توحید اور شرک میں یہی فرق ہے جو عملی زندگی میں اسلام کو جاہلیت اور توحید کو شرک سے جدا کرتا ہے۔ قرآن کریم یہاں قریش پر ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ربوبیت کے مسئلے کو اس لیے پیش کرتا ہے اور ربوبیت پر اسی لیے زور دیتا ہے کہ وہ عربوں اور قریش پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ تم اپنے جد امجد کی وصیت اور دعاؤں کے خلاف جا رہے ہو۔

سیاق کلام میں اس حصے کا آغاز ان آیات پر کیا گیا تھا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (١٤ : ٢٨) "وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفران نعمت سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا"۔ یہ لوگ بدستور اپنی اس ظالمانہ چال پر قائم رہے ' لیکن ان پر عذاب الٰہی بھی نہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان سے یہ کہیں

قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ (١٤ : ٣٠) "کہو ' اچھا مزے کر لو ' آخر کار تمہیں پلٹ کر دوزخ ہی میں جانا ہے"۔ اور حضور اکرم کو مزید حکم دیا گیا تھا کہ آپ اپنی دعوت کا رخ اہل ایمان کی طرف پھیر دیں ' انہیں نماز اور کھلے طور پر اور خفیہ طور پر انفاق پر آمادہ کریں۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ (١٤ : ٣١) "قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں

نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔ اب اس حصے کی تکمیل اس پر ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے کیا تیار کر رکھا ہے اور وہ اپنے اس انجام تک کب پہنچیں گے اور یہ بات قیامت کے مناظر کی شکل میں بتائی جاتی ہے۔ جو پے در پے آتے ہیں۔ جن میں مارے خوف کے انسانی قدم ڈگگاے جاتے ہیں اور دل تھر تھر کانپتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

"اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں' اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔ اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں' سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں' نظریں اوپر جمی ہیں اور دل اڑے جاتے ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کو ظالموں کے اعمال سے غافل نہ سمجھتے تھے۔ لیکن بظاہر یہ بات نظر آتی تھی کہ لوگ دیکھتے تھے کہ ظالم عیش کر رہے ہیں۔ اللہ کی دھمکیاں سن رہے ہیں' دنیا کی زندگی گزر رہی ہے اور ان ظالموں کو اللہ کا کوئی عذاب اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ یہ انداز کلام اختیار کرتے ہیں تاکہ یہ یقین کر لیا جائے کہ یہ لوگ اپنے لیے متعین مدت کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ آخر میں اللہ ایسے لوگوں کو وقت آنے پر پکڑتا ہے اور اس کی پکڑ ایسی ہوتی ہے کہ پھر اس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔ وہ ایسا سخت دن ہو گا جس میں ان کی نظریں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور وہ نہایت جزع و فزع کی حالت میں ہوں گے۔ آنکھیں کھلی ہوں گی لیکن ان کے حواس مبہوت ہو جائیں گے اور ان کو کچھ نظر نہ آئے گا۔ اس قدر خوف ہو گا کہ ان کی نظر جہاں جم گئی جم گئی اور پھر اس ہولناک دن میں پوری قوم کی حالت یوں ہو گی کہ وہ بھاگے بھاگے پھریں گے۔ کسی چیز کی طرف ان کا دھیان نہ ہو گا۔ کسی چیز کی طرف التفات نہ ہو گا۔ سر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہوں گے۔ کسی بھی منظر پر جب ان کی نظر اٹھ کر جم جائے گی تو اس سے ہٹا نہ سکیں گے اور نظر وہیں کی وہیں ٹک جائے گی۔ ان کے دل ہوا ہوں گے' اڑے اڑے پھر رہے ہوں۔ نہ کچھ یاد ہو گا' نہ کوئی حجت و دلیل ہو گی نہ کوئی تدبیر ہو گی۔

یہ ہے وہ دن جس کی طرف اللہ ان کو موخر کر رہا ہے۔ اس طرح یہ اس میدان میں کھڑے ہوں گے' نہایت خوفزدہ۔ آیت کے ان چار ٹکڑوں میں ان کی حالت یہ نظر آتی ہے جس طرح ایک طاقتور باشے (باز) کے پنجوں میں ایک نہایت ہی چھوٹا پرندہ پھنس جاتا ہے اور وہ اسے دبوچ لیتا ہے۔ ذرا دوبارہ پڑھیں :

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ (۴۲) مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا

یرتدّ الیھم طرفھم وافئدتھم ھوآء (۴۳) (۱۴ : ۴۲ - ۴۳) اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے۔ اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں ' سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں 'نظریں اوپر جمی ہیں اور دل اڑے جاتے ہیں"۔

سر اٹھائے تیز تیز بھاگنا' یوں کہ نظریں آسمانوں پر جمی ہوں اس طرح کہ ٹکٹکی بندھ گئی ہو' اور دوں کی حالت یہ ہو کہ وہ ہوا کی طرح اڑ رہا ہے اور کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو' تو یہ ایسی حالت جس میں انتہائی خوف ظاہر کیا گیا ہے' جس میں انسان کی نظر ایک جگہ ٹک جاتی ہے۔

یہ دن جس کی طرف اللہ ان کو لے جا رہا ہے اور اس مہت کے ختم ہونے کا وہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے' تو اے پیغمبر' ان لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس میں کوئی عذر قبول نہ ہو گا اور کوئی صورت چھٹکارے کی نہ ہو گی۔ چنانچہ اس خوفناک دن کا ایک دوسرا منظر لایا جاتا ہے۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍۙ(۴۴) وَّ سَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ(۴۵)

"اے نبی ' اس دن سے تم انہیں ڈرا دو جبکہ عذاب انہیں آ لے گا۔ اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ "اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے ' ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔ (مگر انہیں صاف جواب دے دیا جائے گا کہ) "کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے؟ حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا اور ان کی مثالیں دے دے کر ہم تمہیں سمجھا بھی چکے تھے"۔

اے پیغمبر ان لوگوں کو اس عذاب سے ڈرائیں جس کا نقشہ ابھی کھینچا گیا' اس دن یہ ظالم بڑے پر امید ہو کر اور برخوردار بن کر یہ سوال کریں گے "ربنا" (اے ہمارے رب) آج تو وہ بہت احترام سے ربنا کہتے ہیں جبکہ دنیا میں تو وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔

اخرنا الی اجل قریب نجب دعوتك و نتبع الرسل (۱۴ : ۴۴) "ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے ' ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔

اب یہاں حکایتی انداز کلام براہ راست خطاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے ' گویا وہ ہمارے سامنے کھڑے ہیں ' دیکھ رہے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں ' دعا کر رہے ہیں اور ہم اب میدان حشر میں ہیں ' حیات دنیا کا دفتر لپیٹ دیا گیا ہے اور وہ

دیکھو عالم بالا سے ان کو براہ راست مخاطب کر کے سخت سرزنش اور سخت شرمندہ کیا جا رہا ہے اور ان کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو تم کیا کرتے رہے ہو۔

اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال (۱۴ : ۴۴) "کیا تم لوگ وہی نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے"۔ اب تمہاری کیا رائے ہے؟ تم زوال پذیر ہو گئے یا نہیں؟ تم تو ایسی باتیں کیا کرتے تھے جبکہ امم سابقہ کے آثار اور تاریخ تمہارے سامنے تھی۔ ظالموں اور سرکشوں کا انجام تو سامنے تھا۔

وسکنتم فی مسکن الذین ظلموا انفسھم وتبین لکم کیف فعلنا بھم وضربنا لکم

الامثال (۱۴ : ۴۵) "حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ان کی مثالیں دے کر تمہیں سمجھا چکے تھے"۔ لیکن تمہارا رویہ بھی عجیب تھا کہ ان ظالموں کے کھنڈرات اور ان کے احوال کو دیکھ کر کہ وہ ان سے خالی پڑے ہیں اور ان کے شہروں میں اب تم بس رہے ہو اور پھر بھی تم قسمیں کھا رہے تھے۔ "تمہارے لیے کوئی زوال نہیں ہے"   یہاں اب یہ منظر ختم ہو جاتا ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ ان کی دعا اور اسے مسترد کرنے کے بعد اب ان کا انجام کیا ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی میں ایسی صورت حال رات اور دن پیش آتی رہتی ہے۔ کئی سرکش اور ڈکٹیٹر ان لوگوں کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جو ان سے پہلے گزرے اور بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ ان برسر اقتدار سرکشوں کے ہاتھوں ہی وہ مغلوب ہو کر نکالے گئے ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے یہ جانشین پھر سرکشی اور جباری و قہاری شروع کر دیتے ہیں اور عین ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور ہلاکت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے شعور و وجدان کے اندر اس سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے عبرتناک واقعات کوئی ارتعاش پیدا نہیں کرتے حالانکہ ان کی تاریخ پکار رہی ہوتی ہے۔ یہی تمہاری تاریخ ہے۔ پھر جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو یہ بھی اپنے پیش رووں کی طرح پکڑے جاتے ہیں اور یہ بھی ان کے ساتھ 'اسی انجام سے دوچار ہوتے ہوئے جاتے ہیں اور اللہ کی زمین ان ناپاک لوگوں سے خالی کر دی جاتی ہے۔

اب پردہ گرتا ہے' قیامت کا منظر لپیٹ دیا جاتا ہے اور ان لوگوں کے موجودہ حالات پر بات شروع ہوتی ہے جو اس دنیا میں موجود تھے۔ یہ لوگ حضور اکرم   اور مومنین کے خلاف رات اور دن سازشیں کر رہے تھے اور زندگی کے میدانوں کے ہر پہلو کے اعتبار سے اسلام کے خلاف فتنے برپا کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا مکر و فریب اور پروپیگنڈا جس قدر بھی عظیم ہو تمہیں اللہ اقوام ماقبل ہی کی طرح پکڑے گا۔

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

"انہوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں' مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا اگرچہ ان کی چالیں ایسی

غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں"۔

اللہ ان کو بھی گھیرے ہوئے ہے اور ان کی مکاری بھی اللہ کے دائرہ قدرت میں ہے اگرچہ ان کی تدابیر اس قدر سخت اور شدید ہوں کہ ان کے ذریعہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے بہت بڑی قوت کی ضرورت ہے اور اس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ بہت بڑے بڑے مکر اور فریب کرتے ہیں لیکن ان کا کوئی فریب اللہ کے دائرہ قدرت سے باہر نہیں ہے بلکہ اللہ جس طرح چاہے وہ ان کی مکاریوں کو ختم کر سکتا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍؕ

"پس اے نبی ؐ تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے"۔

یہ لوگ جو تدابیر کرتے ہیں یہ اللہ کے مقابلے میں موثر نہیں ہیں اور اللہ اپنے رسولوں اور اپنی تحریکات کی جب مدد کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ "وہ تو زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے"۔

اس سے کوئی ظالم بچ کر نہیں نکل سکتا اور کوئی مکار اس کے عذاب سے نجات نہیں پاسکتا۔ یہاں ظلم اور سرکشی اور عظیم مکاری کے بالمقابل لفظ انتقام لایا گیا ہے جو نہایت موزوں ہے کیونکہ ظالم اور مکار سے انتقام لینا مناسب ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف جب انتقام کی نسبت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ظلم و سرکشی کی مناسب جزاء و سزا اور اس میں بھی عادلانہ طریق کار۔ اور یہ عادلانہ جزاء و سزا ثابت واقعہ ہوگی۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ

"ذرا ڈراؤ انہیں اس دن سے جبکہ زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے"۔ یہ کیونکر ہوگا' اس کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے' نہ ہمیں معلوم ہے کہ اس دوسری زمین کی طبیعیات کیسی ہوں گی اور یہ ہوگی کہاں' البتہ قرآن کی یہ آیات ہمارے شعور کے اندر یہ تاثر بٹھاتی ہے کہ یہ لوگ کیا ہیں اور ان کی مکاریاں کیا ہیں' اللہ کی قدرت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ زمین و آسمان کو بدل کر رکھ دے گا۔ ان کی کامیابیاں اللہ کے مقابلے میں حقیر اور معمولی ہیں۔ وہ دیکھو دوسرے منظر میں یہ زمین و آسمان تو قدرت نے بدل کر رکھ دیئے!!

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۝۴۸

"اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے"۔ ان کو یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ تو اللہ کے سامنے کھلے اور ننگے کھڑے ہیں۔ کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہے۔ نہ اپنے گھروں میں چھپے ہیں! وہ تو قبروں میں بھی نہیں! وہ تو ایک کھلے میدان میں اللہ واحد و قہار کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہاں "قہار" کا لفظ عمداً استعمال ہوا تاکہ سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو ذرا متنبہ کر دیا جائے کہ ان کی سرکشی اللہ کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سرکشی اور مکاری اس قدر سخت ہو کہ اس سے پہاڑوں کو ہٹایا جاسکتا ہو۔

اب ہمارے سامنے مناظر عذاب قیامت میں سے ایک شدید اور سخت منظر پیش کیا جاتا ہے جو نہایت ذلیل کرنے والا ہے اور سرکشوں اور جابر مکاروں کے لیے موزوں ہے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾

"اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں گے' تارکول کے لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے"۔

ان مجرموں کا منظر یوں ہے کہ دو دو زنجیروں میں بندھے ہوں گے۔ صف در صف جا رہے ہوں گے۔ اللہ قہار کی طرف سے یہ ان کی تذلیل ہو گی۔ مزید یہ کہ ان کا لباس ایک ایسے مواد سے بنا ہو گا جو سخت آتش گیر ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ سیاہ تارکول سے ہو گا۔ یہ ان کی مزید تذلیل ہو گی۔ مقصد یہ ہے کہ آگ کے قریب آتے ہی یہ لوگ شعلوں کے نذر ہوں گے۔

وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ (١٤ : ٥٠) "ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ رہی ہو گی"۔ یہ ایک ذلیل عذاب ہو گا' اور ان کے مکر اور سرکشی اور استکبار کے لیے مناسب علاج۔

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾

"یہ اس لیے ہو گا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی"۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ظلم اور مکاری کو اپنا کسب بنا لیا تھا' تو اللہ کی طرف سے ان پر قہر نازل ہو گا اور وہ ذلیل ہوں گے۔ اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے' ان کی مکاری اور گہری مدبیر کے لیے مناسب ہے کہ جلدی ان کا حساب لیا جائے کیونکہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ ان کی اس مکاری کو ظاہر نہ کرے گا اور کوئی قوت بھی ان پر غالب نہ آسکے گی چنانچہ اللہ بڑی سرعت سے اب ان سے حساب بھی لے گا اور نہایت ذلت کے ساتھ انہیں عذاب بھی دے گا۔

آخر میں سورت کا خاتمہ اسی مضمون پر ہوتا ہے جس سے اس کو شروع کیا گیا تھا لیکن یہ خاتمہ ایک اعلان عام کی شکل میں ہے جو بانگ دہل کیا جاتا ہے' تاکہ تمام لوگوں تک ہر جگہ یہ اعلان عام پہنچ جائے۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٥٢﴾

"یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے' اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعہ سے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آجائیں"۔ اس اعلان عام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ اللہ ایک ہی الٰہ اور حاکم ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس کے اوپر اسلامی نظام قائم ہے۔

لیکن اس اعلان عام سے اصل غرض و غایت مجرد نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنی زندگی کا پورا نظام اس اصول پر قائم کریں اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اختیار کریں ۔ اگر وہ اللہ کو واحد الٰہ اور حاکم سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ اگر کسی کو الٰہ اور خالق و مالک سمجھا جاتا ہے تو وہی حاکم اور رب بھی ہو گا ۔ وہی سربراہ ' متصرف فی الامور ' ڈائریکٹر اور قانون ساز ہو گا ۔ اس ایمان و اعلان پر اگر انسانی زندگی کو عملاً قائم کیا جائے تو وہ عملی نظام اس نظام کے سراسر متضاد ہو گا جو اس اصول اور اعلان پر قائم کیا جائے کہ کچھ لوگ اپنے جیسے کچھ لوگوں کے غلام ہوں گے ۔ اور انسانوں میں سے کچھ حاکم ' قانون ساز اور ظالم ہوں گے ۔ یہ ایک بنیادی اختلاف ہے ' جس کی وجہ سے عقائد و تصورات مختلف ہو جاتے ہیں ۔ شعائر اور مراسم عبادت مختلف ہو جاتے ہیں ۔ اخلاق اور طرز عمل مختلف ہو جاتے ہیں ۔ حسن و قبح کی قدریں بدل جاتی ہیں ' اور سیاسی اور اقتصادی نظام بدل جاتے ہیں ۔ غرض کسی سوسائٹی کو ان میں سے کسی قاعدے پر منظم کیا جائے تو اس کے انفرادی اور اجتماعی خدوخال ہی بدل جائیں گے ۔

یہ نظریہ کہ اللہ ایک ہے اور وہی حاکم ہے اس کی بنیاد پر ایک مکمل نظام حیات تعمیر ہوتا ہے ۔ یہ نظریہ صرف ذہنوں میں بیٹھے رہنے والا نظریہ نہیں ہے ۔ اسلامی نظریہ حیات محض عقائد تک محدود نہیں ہے ' اس کی حدود بہت آگے چلی جاتی ہیں ۔ یہ نظریہ انسان کی پوری عملی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے ۔ اللہ کی حاکمیت کا نظریہ اسلامی عقائد کا ایک حصہ ہے ۔ اسلامی اخلاق کا قیام بھی ہمارے عقائد کا حصہ ہے ۔ اور یہ ایک ایسا عقیدہ اور نظریہ حیات ہے جس سے ایک مکمل نظام پھوٹ کر نکلتا ہے ۔ نئی قدریں وجود میں آتی ہیں اور یہ دنیا میں نئے حالات اور نیا دستوری اور قانونی نظام پیش کرتا ہے ۔

ہم اس وقت تک قرآنی ' مقاصد و اہداف کا ادراک نہیں کر سکتے ' جب تک ہم قرآنی عقائد و نظریات کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور جب تک ہم کلمہ شہادت کے مفہوم کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اصلی مفہوم کیا ہے اور جب تک ہم اس کے مفہوم کو اس کی وسعتوں کے ساتھ نہ سمجھ لیں ۔ جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ اسلام میں "عبادت" کا مفہوم کیا ہے ۔ اور جب تک ہم عبادت کی تعریف میں یہ نہ شامل کر لیں کہ اس سے مراد پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت و غلامی ہے ۔ صرف نماز کے اوقات میں نہیں ' بلکہ زندگی کے تمام امور میں ۔

عرب بت پرستی جس کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اور اپنی اولاد کے بارے میں دعا کی کہ اللہ ہمیں اس سے بچائیو ' یہ اس قدر سادہ نہ تھی جس طرح عرب حضور اکرم کے دور میں اس پر عامل تھے یا جس طرح دوسری جاہلیتوں میں مختلف انداز میں اس پر عمل ہوتا تھا کہ درختوں اور پتھروں کی پوجا ہو رہی ہے ' حیوانوں اور پرندوں کو پوجا جا رہا ہے ' ستاروں اور سیاروں کو پوجا جا رہا ہے ' ارواح اور اوہام کو پوجا جا رہا ہے ۔ یہ سادہ شکلیں ہی شرک نہ تھا ' اور نہ بتوں کی عبادت کی فقط یہ سادہ شکلیں تھیں ' نہ شرک ان سادہ شکلوں میں محدود تھا ۔ نہ اس بت پرستی کا یہی مفہوم تھا اور اس سے آگے ہم شرک کی دوسری شکلیں دریافت نہیں کر سکتے یا ہیں ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شرک کی لاتعداد صورتیں ہیں ' ہم اپنی فکر کو ان صورتوں تک محدود نہیں کر سکتے ' بلکہ جاہلیت جدیدہ میں شرک کی بے شمار جدید صورتیں بھی پیدا ہو گئی ہیں ۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم شرک کو سمجھیں اور شرک کے ساتھ بت پرستی کے تعلق کو بھی سمجھیں ' نیز بتوں کی حقیقت پر بھی غور کرنا ضروری ہے ' اور دور جدید میں ' جاہلیت جدیدہ نے جو نئے اصنام گھڑ لیے ہیں ان کا بت پرستی کے ساتھ تعلق دریافت کرنا بھی ضروری ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے مخالف شرک کا دائرہ ہر اس صورت حال تک وسیع ہوتا ہے جس میں زندگی کے معاملات میں سے کسی ایک حال میں اللہ وحدہ کی اطاعت نہ ہو' یہ حال بھی شرک کی تعریف میں آتا ہے کہ ایک انسان زندگی کے بعض معاملات میں اللہ کا مطیع فرمان ہوتے ہوئے بھی دوسرے معاملات میں غیراللہ کا مطیع ہو' شرک صرف مراسم عبودیت کے اندر محدود نہیں ہے' یہ تو شرک کی ایک مخصوص صورت ہوتی ہے۔ جدید دور میں ہماری زندگیوں میں بعض ایسی واضح مثالیں موجود ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ شرک صریح کی واضح مثالیں ہیں۔ ایک شخص جو اللہ کو وحدہ لا شریک تسلیم کرتا ہے۔ پھر وضو' طہارت' نماز' روزے' حج اور تمام دوسری عبادات میں اللہ کی طرف رخ رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اقتصادی معاملات اور اجتماعی قوانین میں' غیراللہ کی اطاعت کرتا ہے اور وہ اپنی اجتماعی قدروں میں ایسے تصورات ایسی اصطلاحات کا تابع ہے جو غیراللہ کی جاری کردہ ہیں اور اپنے اخلاق' اپنی عادات اور رسم و رواج میں' اپنے لباس میں' ایسے لوگوں کی اطاعت کرتا ہے' جو اللہ کے احکام کے بالمقابل اس پر یہ تصورات' اخلاق' عادات اور لباس مسلط کرتے ہیں اور یہ ایسے ہیں جو صراحۃ شریعت کے مخالف ہیں' اللہ کے احکام کے خلاف ہیں' اور حقیقتاً اسلام کے خلاف ہیں تو یہ عمل اس کلمہ شہادت کے خلاف ہے جو وہ شخص پڑھتا ہے' لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہ ہے وہ اصل بات جس سے ہمارے دور کے مسلمان غافل ہیں۔ حالانکہ یہ شرک ہے' آج کے مسلمان نہایت بھونڈے انداز میں غیراللہ کی یہ اطاعت کرتے ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ یہ شرک ہے اور ہر دور کے مشرک یہی کام کرتے رہے ہیں۔

بت کیا ہیں' یہ ضروری نہیں ہے کہ بت ہی مجسّمے ہوں جو پتھروں سے بنے ہوں۔ یہ بت تو دراصل رمز ہیں طاغوت کے لیے' ان بتوں کے پیچھے اصل طاغوت ہوتا ہے جو ان بتوں کے نام اور عنوان سے لوگوں سے اپنی بندگی کراتا ہے۔ اور ان بتوں کے نام سے اپنا اور اپنی بندگی کا نظام جاری کرتا ہے۔

بت تو نہ بات کرتے تھے' نہ سنتے تھے اور نہ دیکھتے تھے' دراصل مجاور' ۔۔۔۔۔۔ اور حاکم وقت ان کی پشت پر ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ان کے نام سے تعویذ اور گنڈے کرتے تھے' دم درود کرتے تھے اور اس طرح وہ جمہور عوام کو اپنا غلام بنائے رکھتے تھے۔ اب اگر کسی جگہ ایسے ہی شعار اٹھ کھڑے ہوں۔ کچھ ادارے ہوں اور ان اداروں کے نام سے کچھ کاہن اور کچھ حنت اور کچھ حکام اپنے تصورات' اپنے قوانین اور اپنے اعمال و تصرفات عوام پر مسلط کرتے ہوں تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ بھی شرک باللہ ہو گا۔

اگر قومیت کو ایک بت بنا لیا جائے۔ اگر کسی وطن کو بت بنا لیا جائے' یا کسی مملکت کو بت بنا لیا جائے' یا کسی طبقے کو بت بنا لیا جائے اور لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس بت کو پوجیں' اور اللہ کے علی الرغم پوجیں اور ان کی راہ میں جان' مال' اخلاق اور اپنی عزت سب کچھ قربان کر دیں' یوں کہ جب ان بتوں کے مطالبات اور شریعت کے مطالبات کے درمیان تعارض آ جائے تو اللہ کی شریعت اس کے قوانین اور اس کے مطالبات کو پس پشت ڈال دیا جائے اور ان نئے بتوں کے مطالبات' تقاضوں' قوانین اور اخلاق کو نافذ کر دیا جائے یا صحیح الفاظ میں ان مفادات اور جدید بتوں کی پشت پر موجود طاغوتی قوتوں کی اطاعت کی جائے تو یہ صریح شرک ہو گا اور ایسے لوگ بت پرست ہوں گے' مشرک ہوں کیونکہ بت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ پتھر اور لکڑی کا بت ہو' ہر مذہب اور ہر شعار بت ہوتا ہے۔

اسلام صرف اس لیے نہیں آیا تھا کہ وہ لکڑیوں اور پتھروں کے بنے ہوئے بتوں کو توڑ دے اور یہ مسلسل مشقتیں جو رسولان کرام کے طویل سلسلہ نے برداشت کیں' اور اس سلسلے میں ناقابل برداشت اور ناقابل تصور تکالیف برداشت

کیں' یہ محض پتھر اور لکڑی کے بتوں کے ختم کرنے کے لیے نہ تھیں بلکہ مقصد ہر قسم کی بت پرستی کو ختم کرنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کر دے۔ ہر شکل اور ہر صورت میں اور زندگی کے تمام معاملات میں سے' چاہے اس کی شکل و صورت جو بھی ہو' غیر اللہ کی اطاعت کو ختم کر دے لہٰذا زندگی کے ہر طور طریقے اور نظام میں ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ اس کی کون سی صورت توحید ہے اور کون سی صورت شرک ہے' اس میں اطاعت اور بندگی اللہ وحدہ کی ہے یا کسی اور طاغوتی قوت کی ہے' کسی اور رب یا بت کی ہے۔

وہ لوگ جو محض اس لیے اپنے آپ کو اللہ کے دین میں سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ادا کرتے ہیں اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ طہارت' مراسم عبودیت' نماز' روزہ' حج اور نکاح و طلاق میں یا مسئلہ میراث میں اللہ کے قانون کو مانتے ہیں۔ جب کہ اس سے آگے ان کی پوری زندگی ان قوانین کے مطابق ہے جو اللہ کے قوانین کے خلاف ہیں اور ان قوانین کی اکثریت ایسی ہے جو قرآن و سنت کے صریح خلاف ہیں' اور وہ ان قوانین اور اس نظام کے لیے اپنے نفس' اپنے مال اور اپنے اخلاق اور کلچر کو قربان کرتے ہیں' خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں' اور یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں کہ یہ جدیدیت ان سے راضی ہوں' اور صورت حالات یہ ہو کہ کسی مرحلے میں اللہ کے احکام اور قوانین کا ان بتوں کے احکام اور قوانین کے ساتھ تعارض ہو جائے تو یہ ان بتوں کے احکام کو نافذ کریں تو یہ صریح بت پرستی ہے۔

جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اللہ کے دین میں سمجھتے ہیں اور ان کا حال وہ ہے جو ابھی بتایا گیا' ان کو چاہیے کہ وہ اس شرک سے باز آ جائیں جس میں وہ ہیں۔ دین اسلام ایسا مزاح نہیں ہے جو یہ لوگ سمجھتے ہیں جو مشرق و مغرب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ دین اسلام روز مرہ کی جزئیات حیات کو بھی اپنے دائرہ میں لیتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ زندگی کی تمام جزئیات میں اللہ وحدہ کی اطاعت کی جائے' اصول اور کلیات اور دستور و قانون تو بڑی بات ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کے سوا خدا کسی "دین" کو قبول نہیں کرتا۔

شرک اس کے اندر محدود نہیں ہے کہ کوئی اللہ کو ایک نہ سمجھے بلکہ شرک کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ کوئی کسی غیر اللہ کو حاکم سمجھے۔ پتھروں اور لکڑیوں کے بنے ہوئے بتوں کو پوجنا بت پرستی کا بہت سادہ تصور ہے' اصل بت پرستی خلاف اسلام اداروں کی پرستش ہے۔

سادہ ترین الفاظ میں' میں یوں کہتا ہوں کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ ان کی زندگی میں اہم کون ہے؟ وہ کس کی مکمل اطاعت کرتے ہیں؟ وہ کس کی پیروی' اتباع کرتے ہیں؟ کس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں؟ اگر وہ یہ سب کام اللہ کے لیے کرتے ہیں تو وہ مسلم ہیں' اگر وہ یہ کام کسی اور کے لیے کرتے ہیں تو یہ ان کے دین پر ہیں۔ بت ہیں تو بتوں کے دین پر۔ طاغوت میں تو طاغوت کے دین ہو۔

یہ ہے پیغام! سب انسانوں کو اس سے ڈرایا جائے! ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ان معنوں میں وحدہ لا شریک ہے! اگر عقل ہے تو ان باتوں کو سمجھو!

هذا ابلاغ هذا ابلاغ صدق الله العظيم

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۱۴

سورۃ الحجر - ۱۵

۱ --- تا --- ۹۹

سورۃ النحل - ۱۶

۱ --- تا --- ۱۲۸

درس نمبر ۱۱۶ ایک نظر میں

اس سورہ کا موضوع یہ ہے کہ کافروں اور جھٹلانے والوں کو اس خوفناک انجام سے خبردار کر دیا جائے جس کی طرف وہ غفلت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس موضوع کو سمجھانے کے لیے مختلف انداز میں بار بار کوشش کی گئی ہے اور اس کے لیے 'بات کو ہیر پھیر کر مختلف اسالیب میں اور مختلف موضوعات کی صورت میں لایا گیا ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے کہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرایا جائے۔ قصص ' کائناتی مشاہد' قیامت کے مناظر اور ان کے درمیان تبصرے اور ہدایات سب کے سب ایک ہی ہدف پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

سورہ رعد کی فضا اور مضامین و موضوعات اگر سورہ انعام کی یاد دلاتے ہیں تو اس سورہ یعنی سورہ حجر کے مضامین اور گفتگو کا ماحول سورہ اعراف کے مماثل ہے۔ سورہ اعراف کا آغاز ڈراوے سے تھا' اس میں بھی بات خوفناک انداز میں آگے بڑھی ہے۔ انداز کلام ڈراوے ہی کا ہے اگرچہ جابجا دونوں سورتوں میں ذوق اور چاشنی مختلف بھی ہے۔

سورہ اعراف کے آغاز میں نہایت صراحت کے ساتھ ڈرایا تھا۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰي لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(۷ : ۲) "یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے محمدؐ تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو' اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے ڈراؤ' اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دہانی کراؤ"۔ اس سورہ کی چوتھی آیت یہ تھی۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ (۷ : ۴) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جبکہ وہ آرام کر رہے تھے"۔ اس کے بعد آدم و ابلیس کا قصہ آتا ہے۔ قصہ آدم و ابلیس کے بعد اس دنیا کے خاتمہ کا بیان آتا ہے اور سب لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈرانے والے کی دعوت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کائنات کے بعض مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ زمین و آسمان' رات اور دن' سورج اور چاند' ستارے اور سیارے' فضاؤں میں مسخر ہوائیں' بارش اور پانی اور اس کے نتیجے میں روئیدگی اور پھل پھول' پھر تاریخ کی جھلکیاں' قصہ نوح' ہود' صالح' لوط' شعیب اور موسیٰ علیہ السلام۔ ان سب قصص کا مقصد یہ ہے کہ ڈرانے والوں کی دعوت کے انکار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اب ذرا سورہ الحجر پر ایک نظر ڈالیں اس کا آغاز بھی ڈراوے سے ہوتا ہے' یہ ڈراوا قدرے مجمل ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (٢) ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَ يَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (٣) وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ (٤) مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (٥) (١٥ : ٢ تا ٥) "بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں' کھائیں پئیں' مزے کریں اور بہلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔

اس کے بعد کائنات کے بعض اہم مناظر پیش کیے جاتے ہیں' آسمان اور اس کے اندر پائے جانے والے برج' زمین اور اس میں پھیلے ہوئے بلند پہاڑ' نباتات' متنوع و موزوں' پانی سے لدے بادل' زمین کی سیرابی اور موت و حیات اور حشر و نشر پھر قصہ آدم و ابلیس حضرت ابراہیم' حضرت لوط' حضرت صالح علیہم السلام کے قصص اور ان کے اندر مکذبین کا انجام۔ یہ ہیں دونوں سورتوں کے مضامین۔ غرض دونوں سورتوں کا محور اور موضوع ایک ہے۔ البتہ دونوں سورتوں کی شخصیت کے الگ الگ خدوخال بھی ہیں' اگرچہ ان کے اثرات ایک ہیں۔ قرآن کریم کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ بالکل ایک جیسے مضامین کو جب دہراتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے بالکل جدا اور مستقل نظر آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ بات اور معانی وہی ہوتے ہیں جبکہ کہیں بھی تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔

اس سورہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان پانچ ٹکڑوں میں سے ہر ایک کا پھر اپنا موضوع اور دائرہ کلام ہے۔ پہلا ٹکڑا سنت الہیہ کے بیان کے ساتھ مخصوص ہے۔ رسالت' اس پر ایمان اور اس کی تکذیب اس کا موضوع اساسی ہے لیکن انداز بیان ایسا ہے کہ اس کے اندر خوفناک ڈراوا پوشیدہ۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (٢) ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَ يَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (٣) (١٥ : ٢ — ٣) "بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں' کھائیں پئیں' مزے کریں اور بہلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اس حصے کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تکذیب کرنے والے اس لیے تکذیب نہیں کرتے کہ دعوت میں کوئی کمی ہے یا دلائل موثر نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ عناد محض کی وجہ سے تکذیب کرتے ہیں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ (١٤) لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ (١٥) (١٥ : ١٤ — ١٥) "اگر ہم ان پر

آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دھاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔ غرض یہ سب لوگ ایک جیسے ہیں اور ایمان لانے والے نہیں۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵ : ۱۳) "یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے"۔

اس سورہ کے دوسرے حصے میں بعض تکوینی دلائل و شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ یہ شواہد آسمانوں سے بھی ہیں، زمین سے بھی ہیں اور بلند فضاؤں اور خلاؤں سے بھی ہیں۔ یہ سب شواہد نہایت ہی حکیمانہ اور مدبرانہ ہیں کہ کائنات کی ساخت میں ہر چیز کی تعداد کو متعین کیا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵ : ۲۱) "کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔ ہر چیز کا مآل اور مرجع اللہ ہی ہے۔ ہاں ہر چیز کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ (۲۴) وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۲۵)

(۱۵ : ۲۴ - ۲۵) "زندگی اور موت ہم دیتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں، پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے اور بعد میں آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی"۔

تیسرے حصے میں تخلیق انسانیت کی کہانی اور فلسفہ ہدایت و ضلالت بتایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہدایت کے اسباب کیا ہیں مثلاً یہ کہ کن اسباب کی بنا پر کس کو گمراہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ گمراہوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور اہل ہدایت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ آدم کو سیاہ مٹی کے کیچڑ سے پیدا کیا گیا اور اس کیچڑ میں بھی اللہ نے اپنی روح یعنی حیات کو پھونکا۔ اس کے بعد ابلیس کے غرور اور استکبار کا واقعہ آتا ہے اور یہ اعلان ہوتا ہے کہ ابلیس تمام گمراہوں کی سرپرستی کرے گا۔

چوتھے حصے میں گزشتہ گمراہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات ہیں۔ قوم لوط" قوم شعیب" قوم صالح" یہ حصہ یوں شروع ہوتا ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۹) وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۵۰) (۱۵ : ۴۹ - ۵۰) "میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں ہی غفور و رحیم ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے"۔ اس کے بعد مسلسل قصص لائے گئے ہیں جن میں حضرت ابراہیمؑ پر رحمت خداوندی

اور حضرت لوطؑ کو مع اہل بچانا اور لوط، شعیب اور صالح علیہم السلام کی اقوام کی ہلاکت کے واقعات ہیں۔

پانچویں حصے میں بتایا گیا ہے کہ اس کائنات میں حق پوشیدہ ہے اور یہ حق پر قائم ہے اور اس کائنات کی تخلیق اس بات کی متقاضی ہے کہ حشر و نشر قائم ہو اور اس میں لوگوں کو حقیقی جزا و سزا دی جائے اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت ہے۔ دعوت اسلامی دراصل اس پوری کائنات میں ودیعت کردہ حق کا ایک پہلو ہے جس کے مطابق ہر چیز کا آغاز اور انجام ہوتا ہے۔

پہلے سبق میں پہلے تین حصے آگئے ہیں۔ اب تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

---ooo---

درس نمبر۱۱۶ تشریح آیات

۱---تا---۴۸

سُورَۃُ الحِجر مَکِّیَّۃٌ آیاتُھا ۹۹ رکوعاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۲﴾ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۵﴾ وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴿۸﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

ع ۱

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

ا-ل-ر- یہ آیات ہیں کتاب الٰہی اور قرآن مبین کی۔ بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آ جائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں 'کھائیں پئیں' مزے کریں اور بہلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے' تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟" --- ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں' اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی۔ رہا یہ ذکر' تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

اے نبیؐ ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے' بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔

الۗرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۵:۱) "ا-ل-ر- یہ آیات ہیں کتاب الٰہی اور قرآن مبین کی"۔ یعنی یہ حروف اور ان جیسے دوسرے حروف ہی دراصل قرآن اور کتاب الٰہی ہیں اور یہ حروف سب انسانوں کی دسترس میں ہیں۔ لیکن یہی حروف قرآن کریم کی شکل میں عظیم آیات الٰہی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہو جاتے ہیں' ایسی ترکیبات اور جملوں کی شکل اختیار کرتے ہیں کہ کسی کے لیے ایسا کلام لانا ممکن نہیں ہوتا۔ ان حروف کا کوئی ذاتی مفہوم نہیں ہے لیکن یہی حروف قرآن مجید میں موضح 'بیان کنندہ اور کشاف بن جاتے ہیں۔

لوگوں میں سے بعض لوگ آج ان آیات و معجزات کی تکذیب کرتے ہیں اور قرآن مبین کو نہیں مانتے لیکن ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ وہ بڑی حسرت سے یہ کہیں گے کہ کاش وہ ایسا رویہ اختیار نہ کرتے بلکہ کاش کہ وہ ایمان لاتے اور استقامت اختیار کرتے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (۱۵:۲) "بعید نہیں کہ ایک وقت آ جائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوت اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے' پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا"۔

یہ وقت دور نہیں ہے' لیکن اس وقت ان کی یہ تمنائیں ان کو کوئی فائدہ نہ دیں گی۔ اس وقت چاہتوں کا فائدہ نہ ہو گا۔ اس انداز بیان میں نہایت ہی لطیف طور پر ان کا مذاق بھی اڑایا گیا ہے اور ان کو دھمکی بھی دی گئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعوت اسلامی جو تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے' اس کے قبول کرنے کے بعد مہلت بہت ہی محدود ہے'

اسے ضائع مت کرو' بہت جلد ایسے حالات آنے والے ہیں کہ یہ لوگ تمنائیں کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے' لیکن اس وقت ان کی یہ خواہشات مفید نہ ہوں گی۔

اس خفی دھمکی کو ذرا مزید وضاحت کے ساتھ لیکن ملفوف انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۱۵ : ۳) "چھوڑ انہیں' کھائیں پئیں اور مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔ وہ جس حال میں ہیں' انہیں اسی میں چھوڑ دے' یہ تو محض حیوانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کھانا پینا اور عیش کرنا' جس میں کوئی غور و فکر نہیں ہے۔ وہ حیوانیت سے آگے کچھ دیکھنا نہیں چاہتے' لہٰذا انہیں رہنے دیجئے اپنے حال میں۔ انہوں نے جھوٹی امیدوں کے طویل و عریض منصوبے اس زندگی کے بارے میں بنا رکھے ہیں حالانکہ زندگی کی گھڑیاں تک تک کر کے ختم ہو رہی ہیں اور فرصت اور مواقع ختم ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کا انجام خراب ہونے والا ہے۔ آپ ان کی سرگرمیوں میں حصہ دار نہ بنیں' یہ لوگ تو دنیا کی بے وفا تمناؤں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ محض خواہشات کے سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں' یہ خواہشات ان کو یہ دھوکہ دیتی ہیں کہ ابھی زندگی کی فرصت طویل ہے اور یہ کہ اس زندگی میں یہ لوگ تمناؤں کے طویل و عریض منصوبے کو روبعمل لے آئیں گے اور ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی' کوئی بات ان کی تمناؤں کے علی الرغم نہ ہوگی الا یہ کہ ان سے کوئی بھی زندگی کا حساب و کتاب لینے والا نہیں ہے اور وہ جس طرح کھا پی رہے ہیں اس طرح آخرت میں یا زندگی کے آنے والے دنوں میں بھی وہ کامیاب رہیں گے۔

اور سراب کی طرح دھوکہ دینے والی امیدیں اور سراب کے پیچھے دشت پیمائی کی یہ تصویر درحقیقت ایک زندہ انسانی روپ کی تصویر ہے' جو انسانی زندگی میں واضح طور پر نظر آتی ہے اور ہمیشہ انسان کو دھوکہ دیتی ہے۔ انسان ہمیشہ ان امیدوں کے سراب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ ان میں مگن رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ امن و عافیت کی حدود کو اچانک پار کر لیتا ہے اللہ سے غافل' موت سے غافل اور قضا و قدر کے فیصلوں سے بے علم' اپنے فرائض سے غافل' حلال و حرام کی حدود کو پھاندتے ہوئے' یہاں تک کہ وہ خدا سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ اسے موت اور حشر و نشر کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ اچانک پکڑا جاتا ہے۔

یہ ہے ان کی بھلاوے کی حالت جس میں وہ مبتلا ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپ ان کو اس میں غرق چھوڑ دیں۔ عنقریب ان کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی' لیکن اس وقت ان کا یہ علم ان کے لیے مفید نہ ہو گا کیونکہ وہ زائد المیعاد ہو گا۔ یہ ایک تہدید آمیز انداز گفتگو بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو جگانے کے لیے ایک چٹکی بھی دی جاتی ہے' شاید کہ وہ مدہوشی سے جاگ اٹھیں جس کی وجہ سے وہ نہایت ہی اٹل انجام بد سے غافل ہیں۔ اس کائنات کا نظام ایک مخصوص سنت الہیہ کے مطابق چل رہا ہے۔ اس سنت میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ قوموں کا عروج و زوال بھی اس سنت کے مطابق ہوتا ہے۔ اقوام کا انجام اس رویے کے مطابق متعین ہوتا ہے جو وہ اس سنت الہیہ کے حوالے سے اختیار کرتی ہیں۔

وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (٤) مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (٥) (١٥ : ٤ - ٥) "ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ لہٰذا اگر کسی کو تھوڑی مہلت مل گئی ہے اور عذاب ٹلا ہوا ہے تو اسے غافل نہ ہو جانا چاہئے۔ عذاب کا جلدی آنا یا دیر سے آنا سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا۔

یہ مہلت اقوام و ملل کو کون دیتا ہے؟ یہ اللہ کے اختیار میں ہے اور مہلت یا عذاب کا تعین لوگوں کے طرز عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایمان لے آئے' نیکی کی راہ اختیار کرے' اپنے رویے کو درست کر لے اور دنیا میں عدل و انصاف کا نظام رائج کر دے تو مہلت دراز ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ قوم فسق و فجور اور برے راستے اختیار کرتی ہے' اس میں بھلائی کی مقدار کم رہ جاتی ہے اور اس سے خیر کی توقع نہیں ہوتی۔ اب یہ امت اپنے مقررہ انجام تک پہنچ جاتی ہے اور اس دنیا سے اس کے وجود کو مٹا دیا جاتا ہے۔ یا تو وہ مکمل طور پر نیست و نابود کر دی جاتی ہے یا اس کو اس قدر ضعیف و ناتواں کر دیا جاتا ہے کہ اس کا وجود ہی کالعدم تصور ہوتا ہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ بعض اقوام نہ مومن ہیں' نہ نیک ہیں' نہ صالح ہیں اور نہ ان کے اندر عدل پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیا میں عروج پا رہی ہیں' پر قوت اور ذی شوکت ہیں اور بدستور زندہ رہ رہی ہیں۔ یہ سوال بظاہر قوی نظر آتا ہے مگر یہ درست نہیں ہے' اس لیے کہ جن اقوام کو دیکھ کر یہ سوال اٹھتا ہے ان میں خیر اور صلاح کے بعض پہلو لازماً موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً زمین کے اندر فریضہ خلافت خداوندی کو وہ اچھی طرح ادا کر رہی ہوتی ہیں اور دنیا کی آبادی اور تعمیر میں وہ اچھے کام کر رہی ہوتی ہیں' وہ جن علاقوں میں بستی ہیں ان میں وہ عدل کرتی ہیں اگرچہ ان کا نظریہ عدل محدود ہوتا ہے۔ مادی ترقی' مادی بہبود کا ایک معیار انہوں نے قائم کر رکھا ہے اگرچہ وہ محدود نقطہ نظر پر مبنی ہے۔ یہ اقوام یہ مہلت محض ان کی اس محدود خیر کی وجہ سے پا رہی ہیں۔ جب بھی یہ خیر ختم ہو جائے گا' یہ اقوام ختم ہو جائیں گی۔

حقیقت یہی ہے کہ سنت الٰہیہ میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ ہر امت اور ہر قوم کے زوال کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور یہ اپنے وقت پر ہوتا ہے۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (١٥ : ٥) "کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ کسی قوم کو اس بات پر مغرور نہیں ہونا چاہئے کہ ان کو اللہ کی گرفت نے ابھی تک اپنی لپیٹ میں نہیں لیا ہے۔ یہاں سیاق کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ان کے برے رویے کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے' حالانکہ رسول نے ان کے سامنے ایک کتاب مبین رکھ دی ہے۔ یہ ان کو جگاتی ہے اور ان کو بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ ان کو نئی روشنی دیتی ہے' لیکن وہ ہیں کہ الٹا مذاق کرتے ہیں اور گمراہی میں حد سے گزر رہے ہیں۔

وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (٦) لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷) (۱۵ : ۶ - ۷) لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے' تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟" انہوں نے حضور اکرمؐ کے لیے یہ فقرہ جو کہا

يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ "اے وہ شخص جس پر ذکر نازل ہوا ہے" بطور مذاق استعمال کیا ہے' کیونکہ یہ لوگ در حقیقت وحی رسالت کے منکر تھے۔ یہ فقرہ وہ بطور تحکم اور استہزا استعمال کر رہے تھے۔ نیز ان کا رویہ حضور اکرمؐ کے بارے میں اس قدر گستاخانہ تھا کہ انہوں نے حضورؐ کے لیے اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (۱۵ : ۶) "تم یقیناً دیوانہ ہو" کے الفاظ استعمال کیے اور وہ آپ کو مجنون اس لیے کہتے تھے کہ آپ ان کو مسلسل دعوت دے رہے تھے اور یہ لوگ حضور اکرمؐ سے فرشتوں کے نزول کا مطالبہ بھی غایت درجہ مذاق کے طور پر کرتے تھے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵ : ۷) "اگر تم سچے ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتے"۔ منکرین کی جانب سے نزول ملائکہ کا مطالبہ اس سورہ اور دوسری سورتوں میں بار بار دہرایا جاتا ہے۔ آپ سے بھی اور دوسرے رسولوں سے بھی یہ مطالبہ ہوتا رہا ہے اور یہ مطالبہ جن لوگوں کی طرف سے ہوا ہے انہوں نے نہ انسان کو پہچانا ہے اور نہ ان کے دل میں اس کی اصل قدر وقیمت اجاگر ہے کہ اللہ نے مقام نبوت انسان کو عطا کیا ہے اور انسان میں سے برگزیدہ لوگوں کو بطور نبی مبعوث فرمایا ہے۔

قرآن کریم اس سوال کا جواب یوں دیتا ہے کہ فرشتوں کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ رسولوں کی معاونت تبلیغ میں کریں۔ فرشتے رسولوں کی معاونت میں اس وقت آتے ہیں جب تبلیغ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور سنت الٰہیہ کے مطابق فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اب مکذبین کو ہلاک کرنا ہے۔ ان کی مہلت کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اس وقت جب فرشتے آتے ہیں تو مہلت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۱۵ : ۸) "اور ہم فرشتوں کو یوں نہیں اتار دیا کرتے۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی"۔ کیا یہ لوگ فرشتوں کا ایسا نزول چاہتے ہیں اور اسی کا مطالبہ کرتے ہیں؟

ان کے اس مطالبے کی خطرناکی کے بیان کے بعد' ان کے سامنے ہدایت اور عقل و تدبر کا رویہ اختیار کرنے کی دعوت پیش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فرشتے سچائی کے ساتھ آتے ہیں اور وہ احقاق حق کر کے جاتے ہیں اور مکذبین اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں نابود کر دیا جائے۔ چنانچہ جب فرشتے نازل ہوتے ہیں تو وہ اس آخری سچے فیصلے کے نفاذ (Execution) کے لیے آتے ہیں۔ ان پر جو فرشتے نازل نہیں ہو رہے تو اس میں ان کی خیر ہے لیکن وہ اپنی خیر کو نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ فرشتوں کے بجائے ان پر ذکر و فکر والی آیات نازل فرما رہے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ تفکر و تدبر کام لیں اور اپنی ہلاکت کو دعوت نہ دیں۔ ان کے لیے فرشتوں کا نازل نہ ہونا بہتر ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ : ۹) "اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے' اور ہم ہی

اس کے نگہبان ہیں"۔ لہٰذا ان کے لیے اسی میں بہتری ہے کہ یہ قبول کر لیں۔ اب یہ آخری نصیحت تو محفوظ ہے اور ابدالآباد تک باقی رہنے والی ہے۔ اس میں حق ہے' باطل کا کوئی آمیزہ نہیں ہے۔ اس میں اب کوئی تحریف نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ آخری نصیحت زندگی کے ہر معاملے میں ان کی راہنمائی کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ حق کے طالب ہوں اور ملائکہ کے نزول کا غلط مطالبہ نہ کریں۔ کیونکہ اللہ نے ابھی فرشتے بھیجنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ کیونکہ اللہ ابھی ان کی خیریت چاہتا ہے اس لیے انہیں ہلاک کرنے والے فرشتے بھیجنے کے بجائے اس نے قرآن محفوظ بھیجا۔

اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اپنی جگہ تسلی دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ پہلے رسول نہیں ہیں جس کا استقبال تکذیب اور استہزاء سے کیا گیا ہو' پہلی اقوام میں بھی رسول آتے رہے ہیں اور ان کو بھی آپ کی طرح جھٹلایا گیا اور ان کا بھی آپ ہی کی طرح مذاق اڑایا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ (١٠) وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (١١)(١٥: ١٠ - ١١) "اے محمدؐ ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کبھی ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو' اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو"۔ بتایا جاتا ہے کہ اے محمدؐ جس طرح انبیائے سابقین کی پیش کردہ دعوت کے ساتھ ان کے مخاطبین نے سلوک کیا بعینہٖ ایسا ہی سلوک آپ کی پیش کردہ دعوت کے ساتھ یہ مکذبین کر رہے ہیں اور اسی طرح ہم اس دعوت کو ان کے دلوں میں چلاتے ہیں جبکہ یہ دل نہ اس پر غور کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی قبولیت کے لیے تیار ہیں۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ (١٢) لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (١٣)(١٥: ١٢ - ١٣) "مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح گزارتے ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے"۔ یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے غور و فکر کے لیے رسولوں نے دلائل پیش نہیں کیے ہوتے بلکہ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ وہ عناد اور مکابرہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور ایمان کی مخالفت میں آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں۔

یہاں ان کی ذلت آمیز ہٹ دھرمی کا ایک نمونہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کے خلاف حد درجہ بغض اور حسد میں مبتلا ہیں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ (١٤) لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (١٥)(١٥: ١٤ - ١٥) "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔ بجز یہ تصور کہ انسان آسمانوں میں بلند ہو رہا ہے' یہ بھی ایک قسم کا دروازہ کھولنا ہے۔

لیکن اگر وہ اپنے اجسام کے ساتھ عملاً چڑھیں، دیکھیں کہ آسمانوں کے دروازے ان کے سامنے مفتوح ہیں۔ وہ دیکھیں کہ وہ چڑھ رہے ہیں اور ان کے حواس مدرکہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ عمل ہو رہا ہے۔ اور وہ مشاہدہ کر رہے ہوں تو پھر بھی اپنی یہ ہٹ دھرمی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور کہیں گے "نہیں نہیں" یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے اور ہماری نظربندی کر دی گئی ہے۔ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں محض تخیل ہے۔ بلکہ ہم پر صریح جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں "محسوس کر رہے ہیں" یہ سب کچھ جادوگری ہے۔

یوں قرآن مجید ان کی ہٹ دھرمی کی یہ نہایت ہی انتہائی تصویر کشی کرتا ہے "جس سے ان کا گھٹیا مفاد ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرنا نہایت ہی فضول بات ہے۔ مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کے پاس دلائل ایمان کی کمی نہیں اور یہ نہیں ہے کہ وہ نزول ملائکہ کا مطالبہ کر رہے ہیں اور وہ پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے کیونکہ اگر نزول ملائکہ کے بجائے خود ان کے لیے آسمانوں میں پرواز کا انتظام کر دیا جائے "تو بھی ان کا رویہ یہی ہو گا" یہ پرلے درجے کے ہٹ دھرم ہیں۔ لاپرواہ، بے حیا اور دیدہ دلیر ہیں۔ حق اگر روز روشن کی طرح بھی آ جائے تو بھی یہ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔

یہاں قرآن مجید نے انسانوں میں ہٹ دھرمی کرنے والوں کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ اس قدر بری تصویر کشی کہ انسان کو اس سے گھن آنے لگتی ہے اور وہ ان لوگوں کے روپ کو نہایت ہی حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

---ooo---

اب ہٹ دھرمی کے منظر سے ہم کائناتی دلائل و نشانات کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ تو صرف آسمانوں سے متعلق تھا "اب پوری کائنات ہمارے سامنے ہے۔ پہلے آسمانوں کو لیا جاتا ہے" پھر زمین کے بعض مظاہر سامنے لائے جاتے ہیں۔ ایسی ہواؤں کا منظر پیش کیا جاتا ہے جو بارآور بادلوں سے لدی ہوئی ہیں "پھر اس کرۂ ارض پر موت و حیات کی بوقلمونیاں پیش کی جاتی ہیں اور اس کے بعد حشر و نشر کے بعض مناظر۔ ان تمام نشانات و شواہد کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جائیں اور وہ ان سے اوپر چڑھ بھی جائیں تو بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ مانیں گے اور یہ کہیں گے "کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے" نظربندی کر دی گئی ہے "ہم مسحور ہو گئے ہیں۔ اب ذرا ان تمام مناظر و مشاہد کو ایک ایک کر کے ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ ﴿١٨﴾

"یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے "ان کو دیکھنے والوں کے لیے (ستاروں سے) آراستہ کیا" اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا۔ کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پا سکتا" الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے"۔

اس پھیلی ہوئی کائنات کی یہ پہلی لائن ہے۔ اس عجیب و غریب کائنات کے نقش و نگار کی یہ پہلی تصویر ہے۔ اس کائنات میں نزول ملائکہ سے بھی زیادہ عجائبات ہمارے سامنے ہیں۔ خود اس کائنات کی تشکیل اور طبیعی لحاظ سے اس کی کارکردگی اللہ کی قدرت و صنعت کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری دلیل کی سرے سے احتیاج ہی نہیں ہے۔

بروج کیا ہیں' یہی ستارے اور سیارے عظیم سے عظیم تر۔ ان سیاروں اور ستاروں کے مدار اور مقامات بھی برج ہو سکتے ہیں۔ جو بھی مراد ہو لیکن دونوں حالات میں ان کی کارکردگی ایک معجز دلیل ہے اور اللہ کی قدرت اور حکمت پر شاہد عادل ہے' کس قدر پیچیدہ' موثر ہے اور دیکھنے میں بھی خوبصورت منظر ہے۔

وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵ : ۱۶) "ہم نے اسے دیکھنے والوں کے لیے مزین کیا"۔ اس پوری کائنات اور خصوصاً سماء دنیا کے حسن و جمال کو تو دیکھیے۔ اس آیت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کائنات میں حکمت و تقدیر کے علاوہ حسن و جمال کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے محض ضامت اس کائنات میں مدنظر نہیں' محض وسعت مدنظر نہیں' محض اس کی پیچیدہ ساخت پر ہی توجہ نہیں دی گئی بلکہ اس کی ساخت میں ایک خاص خوبصورتی کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

ایک خوبصورت رات میں کبھی آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا ہے؟ جس میں کواکب بکھرے پڑے ہوتے ہیں' ہر ایک ستارہ روشنی چھوڑ رہا ہوتا ہے گویا کہ ایک انگارہ ہے جو اپنی جگہ دہک رہا ہے' پھر اس حالت میں ہماری نظر ایک نہایت ہی بعید ستارے پر ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرا منظر آپ سامنے لائیں۔ ایک خوبصورت رات ہے اس میں چودھویں کا چاند بلندیوں پر ہے اور اس کے سامنے پوری کائنات خاموش کھڑی ہے۔

اس کائنات کی خوبصورتی کو محسوس کرنے کے لیے بغیر چاند کے شفاف رات اور چودھویں کے چاند کی ایک خوبصورت رات میں' ایک شاعرانہ نگاہ ہی کافی ہوتی ہے' کس قدر وسیع حسن و جمال ہے؟ اور کس قدر گہرا اثر ہے اس کا پردۂ احساس پر؟ کیا اس کے سوا کسی اور برہان کی ضرورت ہے؟

وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵ : ۱۶) "اسے دیکھنے والوں کے لیے ہم نے مزین کیا ہے"۔ جو دیکھنے والے نہیں ہیں۔ لیکن اس کائنات کو حسن و جمال سے بھر دینے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی محفوظ اور پاکیزہ بھی بنایا گیا ہے۔

وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۱۵ : ۱۷) "اور ہر شیطان مردود سے اسے محفوظ کر دیا"۔ کوئی شیطانی قوت اسے خراب نہیں کر سکتی اور کوئی شیطانی قوت اس کی فضا کو آلودہ نہیں کر سکتی۔ اس کائنات کے نظام میں کوئی شیطانی قوت اپنا وائرس داخل کر کے اس کے نظم کو خراب نہیں کر سکتی۔ اسے گندہ نہیں کر سکتی' اور اس کی رفتار کار کو متاثر کر کے اسے گمراہ نہیں کر سکتی' جس طرح شیطان انسان کے ساتھ اس کرۂ ارض پر یہ سب کام کرتا ہے اور اس کرۂ ارض پر اس کا یہ مشن ہے۔ اس کرۂ ارض پر تو شیطان اپنا مشن پورا کر سکتا ہے لیکن آسمانوں کے نظام میں اس کا کوئی عمل و دخل نہیں ہے۔ آسمانوں پر اور بلندیوں پر اس کی دسترس نہیں ہے۔ اس کی ناپاکیاں' گمراہیاں وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ آسمانوں پر اس کے حملے رد کر دیئے جاتے ہیں۔ وہاں ان کے دفاع کا انتظام ہے۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (۱۵:۱۸) "الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے"۔ شیطان کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ آسمانوں سے کس طرح سن گن لیتا ہے' وہ کیا چیز چراتا ہے۔ ان سب امور کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ ہم ان کا مفہوم صرف اسی قدر سمجھ سکتے ہیں جس قدر ان نصوص قرآنیہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے مزید جستجو کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس شعبے میں کچھ مزید دریافت بھی کر لیں کہ شیطان کس طرح سن گن لیتا ہے تو اس کا ہمارے ایمان کی کمی بیشی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معاملات میں تحقیق وتدقیق سے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے کہ انسان اس زندگی کے عملی معاملات سے دور ہو کر محض عقلی گھوڑے دوڑانے لگتا ہے اور وہ کوئی نئی حقیقت اور کوئی نیا علم بھی نہیں پا سکتا۔

ہم نے جس قدر جانا ہے وہ یہی ہے کہ شیطان کا عمل و دخل آسمانوں میں نہیں ہے۔ اس وسیع کائنات کا یہ حسن و جمال اور حرکت و فعالیت شیطان کی دسترس سے محفوظ ہے۔ اس کائنات کے امور میں شیطانی قوتوں کی طرف سے جو دخل اندازی ہوتی ہے' یا دخل اندازی کی جو کوشش ہوتی ہے' اس موقع پر شیطانی قوتوں کو مار بھگایا جاتا ہے اور شہاب ثاقب کی وجہ سے ان کے عزائم رک جاتے ہیں۔

یہاں جس انداز میں بلند قلعوں اور برجوں کا ذکر ہوا ہے' جس طرح شیطانوں کے اوپر چڑھنے کی مساعی کا ذکر ہوا اور پھر جس انداز میں ان پر بمباری ہوتی ہے تصور اور تخیل اور مشاہدے کے اعتبار سے یہ منظر ایک نہایت ہی خوبصورت منظر ہے اور قرآن کریم کی فنی تصویر کشی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

کائنات کی اس وسیع پینگ کی دوسری لائن' وہ وسیع زمین ہے جس پر ہم بستے ہیں۔ ہماری نظروں سے یہ وسیع تر اور طویل و عریض ہے۔ ہماری سیر و سیاحت کے لیے یہ بہت کھلی ہے۔ اس کے اندر اونچے اونچے پہاڑ' قسم قسم کی روئیدگی اور پھل اور پھول ہیں۔ نیز انسانوں اور تمام دوسری زندہ مخلوق کے لیے رزق کا وافر سروسامان ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

"اور ہم نے زمین کو پھیلایا' اس میں پہاڑ جمائے' اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے تمہارے لیے اور ان بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو"۔

اس کائنات کی فضاؤں میں ایک قسم کی وسعت اور عظمت پائی جاتی ہے۔ آسمانوں میں بڑے بڑے قلعوں کا ذکر ہے۔ لفظ بروج کے تلفظ میں بھی ایک قسم کا زمزمہ اور عظمت ہے۔ "شہاب" کو لفظ مبین سے بیان کیا گیا۔ اس میں ایک عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

زمین میں پہاڑوں کو رواسی کہا گیا اور ان پہاڑوں کے بھاری بھرکم ہونے کا اظہار لفظ القینا سے کیا گیا۔ پھر نباتات کو

موزون کی صفت سے موصوف کیا گیا۔ موزون لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے بھاری بھرکم ہے۔ اگرچہ یہاں مفہوم یہ ہے کہ اپنی پیچیدہ ساخت کے اعتبار سے وہ محکم اور متوازن ہے۔ پھر عظمت کی اس فضا میں معیشت کے بجائے معایش کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور اسے نکرہ کی صورت میں مجمل چھوڑا گیا ہے۔ پھر مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ (۱۵: ۲۰) میں بھی تمام زندہ مخلوقات کی طرف اشارہ کر دیا گیا جو اس کرۂ ارض پر پائی جاتی ہیں۔ غرض تعبیرات' الفاظ اور مفاہیم' ہر اعتبار سے اس منظر میں عظمت ہی عظمت پائی جاتی ہے۔ یہ تکوینی آیت ہے۔ یہ آفاق کائنات سے گزر کر انفس کو بھی لیتی ہے۔ یہ وسیع تر سرزمین جو دعوت نظارہ اور دعوت سیر دے رہی ہے' یہ عظیم الشان پہاڑ جو سینہ گیتی پر ابھرے ہوئے ہیں اور یہ قسم قسم کے نباتات جو اس میں لگے ہوئے ہیں اور پھر بات اس پہلو پر مرکوز ہوتی ہے کہ یہ سب کے سب انسانوں کے مفاد کے لیے ہیں۔ اس کرۂ ارض پر زندگی کا سروسامان اور نوع نوع کی خوراکیں' آیت میں ان کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ان کی وسعت اور عظمت کی طرف اشارہ ہو' یہ سب کچھ اے انسان' تیرے لیے ہے اور پھر تمہارے لیے ایسی مخلوقات بھی پیدا کی گئی ہیں کہ جو تمہارے لیے مفید ہیں اور تم ان کو پالتے نہیں ہو۔ اللہ اور صرف اللہ ان کو پالتا ہے۔ تم اس طرح ایک امت اور مخلوق ہو' جس طرح دوسری مخلوقات ہیں جن کی تعداد اور انواع بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ یہ نوع نوع کی مخلوق اللہ کے رزق خاص پر پلتی ہے۔ اور اللہ نے' اے انسان انہیں مفت تمہاری خدمت میں لگایا ہے۔ پھر بعض صنف مخلوقات ایسی ہے کہ اللہ کے رزق پر پلتی ہے اور ان پر کوئی فرائض نہیں ہیں۔

یہ تمام انواع و اقسام کی مخلوقات اور ان کے لیے قسم قسم کا رزق' اللہ تعالیٰ نے پورا پورا' اس کائنات میں پیدا کر رکھا ہے اور یہ سب مخلوق اور ان کا سامان زیست اللہ کے دست قدرت اور تصرف ذاتی میں ہے اور اللہ اپنی سنت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے تمام امور میں تصرف فرماتا ہے اور اپنے احکام اپنی مخلوقات کے اندر جاری فرماتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

"کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔

لہٰذا مخلوقات میں سے کوئی نوع بھی کسی چیز کی مالک نہیں ہے' تمام خزانے اللہ کی حاکمیت میں ہیں' اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ اللہ اپنی مخلوق کے لیے جو خزانے چاہتا ہے' ایک معلوم اور متعین مقدار کے مطابق اتارتا ہے' کوئی چیز بھی اٹکل پر نازل نہیں ہوتی اور نہ کوئی چیز اتفاقاً وقوع پذیر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو ایک معلوم مقدار کے مطابق بھیجتا ہے' ان میں سے ہوائیں اور بارشیں بھی ہیں۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمانوں سے پانی برساتے ہیں اور اس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اس دولت کے خزانے دار تم نہیں ہو"۔

ہواؤں کے دوش پر کیا بار ہوتا ہے؟ پانی جس طرح اللہ ناقہ کو حاملہ کرتا ہے اور پھر بادل جو حامل ماء ہوتے ہیں آسمانوں سے برس پڑتے ہیں اور یوں ہم تمہیں پانی پلاتے ہیں۔ کیا بارش کے یہ خزانے تمہاری تحویل میں ہیں؟ کہ جب ضرورت ہو برسالو، بلکہ یہ خزانے اللہ کی تحویل میں ہیں اور اللہ ایک معلوم مقدار کے مطابق برساتا ہے۔

یہ ہوائیں فضائی عوامل کے مطابق چلتی ہیں اور ان فضائی ضوابط کے مطابق ان میں پانی ہوتا ہے اور برستا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ ان فضاؤں کو کس نے پیدا کیا اور ہواؤں اور بارشوں کے یہ عوامل اور ضوابط کس نے بنائے؟ یہ یقیناً خالق کائنات کا کام ہے لہٰذا یہ تمام عوامل و اسباب اللہ کے ناموس کلی اور سپر کمپیوٹر کے مطابق ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵ : ۲۱) "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔ اس آیت کا انداز تعبیر ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ ہر حرکت یہاں تک کہ سیرابی کو بھی اللہ کی طرف منسوب کیا گیا۔

فَاَسْقَیْنٰکُمُوْہُ (۱۵ : ۲۲) "ہم نے اسے تمہیں پلایا"۔ حالانکہ مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق یوں بنائی ہے کہ تم پانی کی طلب کرتے ہو، اور پانی کو یوں بنایا کہ وہ تمہاری طلب کو پورا کرتا ہے اور اس طلب اور رسد کو ہم نے متوازن بنایا۔ لیکن انداز تعبیر ایسا ہے جو موقع و مقام کلام کے مطابق ہے۔ ہر فعل اور ہر حرکت کی نسبت اللہ کی طرف ہے کیونکہ تصور یہ دینا مقصود ہے کہ اس کائنات کی ہر حرکت اور ہر واقعہ اللہ کے ارادے اور حکم سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ آسمانوں کے لیے اللہ کا جو تکوینی قانون ہے، وہی تمام مخلوقات کے لیے بھی ہے۔ پہلی آیت میں مکذبین کے بارے میں سنت الٰہیہ کا بیان تھا، اس دوسرے ٹکڑے میں آسمان و زمین اور کائنات کے بارے میں سنت الٰہیہ کا بیان ہے اور اس فضا میں ہواؤں اور پانیوں کا نظام بھی اسی سنت کے مطابق ہے۔ ان میں سے کوئی امر بھی سنت الٰہیہ کے سوا یا باہر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ تمام امور اس ناموس اکبر کے مطابق چلتے ہیں جو اس کائنات میں جاری ہے اور جیسے قرآن حق کہتا ہے: اب اس مضمون کا خاتمہ یوں ہوتا ہے کہ موت و حیات بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمام چیزوں کو زندگی دینا، مارنا اور پھر سے اٹھانا اور حساب و کتاب اللہ کے اختیار میں ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْکُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّکَ ھُوَ یَحْشُرُھُمْ اِنَّہٗ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

۲
ع۱۰
۲

"زندگی اور موت ہم دیتے ہیں' اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں' پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے اور بعد میں آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی"۔

یہاں یہ دوسرا پیراگراف پہلے پیراگراف سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ پہلے میں یہ کہا گیا تھا۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ (۲۳) وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ (۲۴) (۱۵: ۲۳ - ۲۴) "ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ جبکہ یہاں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ سب کا وارث ہے اور موت کے بعد اس کی طرف لوگ اٹھیں گے۔ اللہ جانتا ہے اور اس نے لکھ رکھا ہے کہ کوئی پہلے مار دیا جائے اور کس کو مہلت عمل دی جائے اور بعد میں وہ اس جہاں سے رخصت ہو' بہرحال موت کے بعد سب نے اٹھنا ہے' اور اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۵: ۲۵) "وہ حکیم و علیم ہے"۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق اقوام و افراد کے لیے وقت سمت طے کرتا ہے۔ اسے موت کا وقت معلوم ہے اور حشر کا وقت بھی اس نے مقرر و متعین کر رکھا ہے اور درمیانی عرصے کے امور بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اس پیراگراف اور سابق دونوں پیراگراف میں منظری حرکات ہم آہنگ ہیں۔ آسمانوں سے نزول ہدایت' فرشتوں کا اترنا' شیاطین پر ستاروں کی بمباری' ہواؤں کا چلنا اور بارشوں کا نزول' یہ سب مناظر دونوں میں ہیں۔ پھر اس دنیا اور کائنات کے بڑے بڑے واقعات آسمان' قلعے' ستارے اور سیارے' زمین' پہاڑ' ہوائیں' بارشیں اور نباتات بھی مشترکہ مناظر ہیں۔ ہٹ دھرمی کے اظہار کے لیے بھی ایسی ہی مثال دی گئی جو ان پیروں کے مضمون سے ہم آہنگ ہے کہ اگر آسمان میں ایک دروازہ کھول دیا جائے اور یہ لوگ اس میں چڑھ جائیں تو پھر بھی ان کے مکابرہ اور ہٹ دھرمی کا حال یہی ہو گا۔ غرض مضمون اور اس کی تصویر کشی قرآن عظیم کے انوکھے انداز تعبیر کو ظاہر کرتی ہے۔

---ooo---

اب یہاں تخلیق انسانیت کا قصہ عظیم پیش کیا جاتا ہے۔ آغاز انسانیت اور اس جہان میں ہدایت و ضلالت کی حکمت اور اس کے اسباب و عوامل' یعنی قصہ آدم۔ وہ کن عناصر سے کس طرح پیدا ہوئے؟ اور ان کی تخلیق کے وقت اور بعد کیا حالات ان کو پیش آئے۔

اس سے پہلے' اس تفسیر میں قصہ آدم کا مطالعہ ہم نے دو دفعہ کیا ہے یعنی سورہ بقرہ اور سورہ اعراف میں۔ دونوں مقامات پر یہ قصہ بعض مخصوص حالات میں' مخصوص مقاصد کے لیے بیان ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مقامات پر اس قصے کی مختلف کڑیاں لائی گئیں اور طرز ادا بھی دونوں جگہ مختلف رہا۔ قصے کی فضا اور اس کے اثرات مختلف رہے اگرچہ دونوں مقامات پر بعض اثرات اور نتائج یکساں بھی تھے۔ یہ قصہ یہاں تیسری بار آ رہا ہے۔

تینوں مقامات پر اس قصے کے بعض تمہیدی بیانات یکساں ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ میں جہاں یہ قصہ آیا' وہاں اس سے قبل یہ کہا گیا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲:۲۹) "وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں' پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ اور سورہ اعراف (۱۱) میں جہاں یہ قصہ آیا اس سے پہلے کہا گیا۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷:۱۰) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے"۔ اور یہاں سورہ حجر (۱۹) میں کہا گیا ہے:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (۱۵:۱۹) "ہم نے زمین کو پھیلایا' اس میں پہاڑ جمائے۔ اس میں ہر قسم کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی۔ لیکن ان تینوں مقامات پر قصے کا انداز بیان مختلف ہے۔ اور اس سے غرض و غایت بھی مختلف ہے۔

سورہ بقرہ میں اس قصے سے غرض یہ تھی کہ تخلیق کائنات کے بعد اللہ نے اس کرۂ ارض پر حضرت آدم کو اپنا نائب و خلیفہ بنایا اور زمین کے اندر جو سہولیات موجود ہیں وہ سب بنی آدم کے لیے ہیں۔ چنانچہ بات کی ابتداء ہی یوں ہوئی۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (۲:۳۰) "اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا' میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں"۔ اس لیے وہاں اس قصے میں آدم کے منصب خلافت ارضی کے اسرار و رموز بیان کیے گئے تھے جن پر فرشتوں کو تعجب ہوا' کیونکہ وہ اسرار و رموز ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خلیفہ کا مقام ان پر ظاہر کرنا پڑا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۱) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۳۲) قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳)

۳۱ تا ۳۳)) ”اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے' پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا ”اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ“۔ انہوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے' ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں' جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں“۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا' تم ان چیزوں کے نام بتاؤ“۔ جب اس نے ان سب کے نام بتا دیئے' تو اللہ نے فرمایا: ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں اور جو تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو' اسے بھی ہم جانتے ہیں“۔

اس کے بعد بقرہ میں ملائکہ کا سجدہ اور ابلیس کے انکار و استکبار کے واقعات بیان ہوئے۔ آدم اور ان کی اہلیہ کو جنت میں بسانے کی کہانی بیان کی گئی۔ پھر بتایا گیا کہ کس طرح شیطان نے آدم و حوا کو بہکایا اور یوں انہیں جنت سے خارج کرا دیا۔ اس کے بعد آدم و حوا کو زمین پر اتارا گیا اور یہاں ان کے ذمے فریضہ خلافت ارضی کی ذمہ داری لگائی گئی۔ لیکن جنت سے خارج کرنے سے قبل ان سے امتحان لے کر زمین میں رہنے کے لیے تیار کیا گیا۔ انہوں نے توبہ کی اور اللہ سے مغفرت طلب کی۔ سورہ بقرہ میں اس قصے کے بعد بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ وہ میرے ان انعامات کو یاد کریں جو میں نے ان پر کیے۔ اور انہوں نے خدا کے ساتھ جو عہد کیے اس کو پورا کریں کیونکہ یہ فریضہ وہ ہے جو تمام انسانوں کے ابو الآباء حضرت آدم نے اپنے اوپر عائد کیا اور اسی عہد کی اساس پر ان کو خلافت ارضی نصیب ہوتی۔

سورہ اعراف میں بھی یہ قصہ آیا ہے۔ اس میں وہ طویل کہانی بیان کی گئی جو عروج فی الجنہ اور وہاں سے پھر نکالے جانے سے متعلق ہے۔ اس قصے میں یہ سبق یاد دلایا گیا ہے کہ ابلیس آغاز کائنات سے انسان کا دشمن تھا اور آخر تک رہے گا۔ یہاں تک کہ آدم و ابلیس جس طرح پہلے دربار الہی میں تھے پھر وہاں پیش ہوں۔ اب ایک فریق تو ان لوگوں کا ہو گا جو جنت میں داخل ہوں گے' جہاں سے شیطان نے ان کے والدین کو نکالا تھا کیونکہ ان لوگوں نے شیطان کو اپنا دشمن سمجھ کر اس کی مخالفت کی۔ ایک دوسرا فریق آگ میں گرا لیا جائے گا کیونکہ انہوں نے شیطان مردود اور ہٹ دھرم کے قدموں کی پیروی کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بھی ملائکہ کی جانب سے آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا ذکر بھی ہوا۔ یہ تذکرہ بھی ہوا کہ ابلیس نے انکار اور استکبار کیا۔ اس نے اللہ سے مطالبہ کیا کہ قیامت تک اسے مہلت دی جائے تاکہ وہ ان بنی آدم کو گمراہ کر سکے جن کی وجہ سے وہ جنت سے بے آبرو کر کے نکالا گیا۔ اب آدم اور اس کی زوجہ کو جنت میں بسایا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ جو چاہیں وہاں کھائیں پئیں صرف ایک درخت کے قریب نہ جائیں۔ یہ ایک درخت کی ممانعت بھی دراصل علامتی ممانعت تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کے جذبہ اطاعت امر اور ان کی قوت ارادی کو ٹیسٹ کیا جائے۔ اس کے بعد وہاں یہ تذکرہ آتا ہے کہ کس طرح شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسے ڈالے اور کس طرح انہوں نے اس درخت کا پھل چکھ لیا اور پھر کس طرح معجزانہ انداز میں ان کے جسم عریاں ہو گئے اور کس طرح اللہ کا عتاب حضرت آدم اور ان کی زوجہ پر نازل ہوا اور کس طرح ان کو' سب کو' زمین میں اتار کر بسا دیا گیا کہ وہ اس کرہ ارض پر بھی حق و باطل کے معرکے میں شریک ہوں۔ فرمایا گیا:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (٢٤) قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ (٢٥) (٧: ٢٤ – ٢٥)) "فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی جائے قرار اور سامان زیست ہے"۔ اور فرمایا: "وہیں تم کو جینا ہے اور وہیں مرنا ہے اور اسی سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا"۔

انسانیت کی یہ کہانی سورہ اعراف میں اسی طرح چلتی ہے یہاں تک کہ سب لوگ دوبارہ میدان حشر میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ وہاں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں اور ردو قدح اور حساب و کتاب کے بعد ایک فریق جنت میں اور ایک فریق دوزخ میں چلا جاتا ہے۔

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (٧: ٥٠) "اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر بھی ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے' اس میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں منکرین حق پر حرام کر دی ہیں"۔ (۵۰) اور اس کے بعد اب اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔

لیکن یہاں اس قصے کا مدعا کیا ہے؟ یہاں تخلیق انسان کے اسرار و رموز اور فلسفہ ہدایت و ضلالت زیر بحث ہیں اور انسان کی ذات میں ہدایت و ضلالت کے جو عوامل رکھ دیئے گئے ہیں ان سے بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ یہاں بات کا آغاز اس امر سے کیا جاتا ہے کہ انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا گیا اور اللہ نے پھر اس میں اپنی روشن روح پھونکی اور اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے جنوں کو آگ کی لپیٹ سے پیدا کر دیا تھا' یہاں پھر سجود ملائکہ' انکار ابلیس کے واقعات آتے ہیں۔ ابلیس کہتا ہے کہ کیا میں ایک ایسے انسان کے سامنے سربسجود ہو جاؤں جسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ کس طرح شیطان کو ملعون قرار دے کر درگاہ الٰہی سے نکالا گیا۔ پھر اس کی طرف سے درخواست پیش ہوتی ہے کہ اسے قیامت تک کے لیے مہلت دی جائے۔ اس کی درخواست منظور ہوتی ہے۔ یہاں شیطان اعتراف کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا لیکن اللہ کے جو مخلص بندے ہوں گے ان پر اسے کوئی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ وہ جن لوگوں کو گمراہ کرے گا وہ اس کی اطاعت اور اس کے طریقوں کو قبول کرنے کے لیے از خود تیار ہوں گے اور اللہ کے دین اور طریقے میں ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ دونوں فریقوں کا انجام مختصراً بیان کر دیا جاتا ہے بغیر تفصیل کے کیونکہ یہاں مقصد صرف تخلیق انسان اور فلسفہ ہدایت و ضلالت موضوع کلام ہے۔

ذرا اب اس قصے کے مناظر کو یہاں ہم تفصیل سے لیتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ

مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

"ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپیٹ سے پیدا کر چکے تھے"۔

قصے کے آغاز ہی میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان اور جنات یا شیطانوں کی فطرتوں میں یوم تخلیق کائنات سے ہی فرق و امتیاز ہے۔ انسان کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا گیا جو سڑی ہوئی خمیری مٹی یعنی کیچڑ سے لی گئی تھی یعنی اس مٹی کو ٹھو کا جائے تو بجتی ہے اور شیطان کو نار سموم یا آگ کی لپیٹ یا شعلے سے بنایا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہو گا کہ انسان کے مزاج میں ایک جدید عنصر بھی داخل ہوا ہے یعنی انسان کے اندر اللہ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ رہا شیطان تو وہ نار سموم ہی کی طبیعت پر قائم ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۸) فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۹) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (۳۰) اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۱) قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۲) قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۳۳) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (۳۴) وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (۳۵) (۱۵ : ۲۱ تا ۳۵) "پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا"۔ اس نے کہا "میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے"۔ رب نے فرمایا: "اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے اور اب روز جزاء تک تجھ پر لعنت ہے"۔

پھر یاد کرو اس موقع کو کہ جب اللہ فرشتوں کے ساتھ ہمکلام ہوا۔ یہ کب کی بات ہے؟ کہاں یہ واقعہ پیش آیا؟ اس کی تفصیلی کیفیت کیسی تھی؟ ان سوالات کا جواب ہم نے پارۂ اول میں سورۃ بقرہ میں دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ ان سوالات کا شافی جواب ہی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ عالم بالا کی کہانی ہے اور ہمارے پاس کوئی نص صریح نہیں ہے کیونکہ عالم غیب سے متعلق کسی سوال کا جواب ہم صرف نص صریح ہی سے دے سکتے ہیں۔ جو لوگ ایسے سوالات کا جواب دینا چاہتے ہیں وہ اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں اور ان کی باتوں پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ انسان کو ایسی مٹی سے کیسے بنایا گیا جو سڑی ہوئی تھی اور اس خمیری مٹی سے بنا کر اس کو کس طرح خشک کر دیا گیا تھا کہ وہ بجتی تھی۔ پھر یہ کہ اس کے اندر روح کس طرح ڈال دی گئی۔ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ ان امور کی تفصیلی کیفیات سے ہم بے خبر ہیں۔ کسی صورت میں بھی ہم از سرتو اس کیفیت کا سائنسی تجزیہ نہیں کر سکتے۔

اس سلسلے میں قرآن کریم کی جو آیات وارد ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہیں ' خصوصاً یہ آیت کہ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳ : ۱۲) "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا"۔ اور دوسری آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ "ہم نے انسان کو مٹی کی ست سے پیدا کیا جو حقیر پانی کی شکل میں ہے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصلیت اور زندگی کی حقیقت اس زمین کی مٹی سے ہے اور انسان کے اندر وہی اہم عناصر موجود ہیں جو اس زمین کے اہم عناصر ترکیبی ہیں۔ اسی طرح انسان اور تمام دوسرے زندوں کے اجسام انہی عناصر سے بنے ہوئے ہیں۔ لفظ سلالۃ ایک خاص انداز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہاں تک تو قرآن اشارہ کرتا ہے اور اس کے الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے 'لیکن اس سے آگے جدید دور کے انکشافات سے جو کچھ معلوم ہوا اسے قرآن مجید سے اخذ کرنا ایک تکلف ہی ہے۔ موجودہ آیات ان مفاہیم کی متحمل نہیں ہیں۔ جہاں تک سائنسی تحقیقات کا تعلق ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ سائنسی تحقیقات اپنے وسائل و ذرائع کے ساتھ جاری رہیں گی۔ اور سائنسی تحقیقات کے نتائج فرضی ہوتے ہیں۔ سائنسی تحقیقات اپنے وسائل ذرائع کے ساتھ جاری رہیں گی۔ اور سائنسی تحقیقات کے نتائج فرض ہوتے ہیں اور وہ حقائق نہیں بلکہ نظریات ہوتے ہیں۔ ان نظریات میں سے بعض حقائق کا روپ اختیار کر لیتے ہیں بشرطیکہ کسی حقیقت تک پہنچنے کی کوئی سبیل میسر ہو جائے اور ان نظریات میں سے جو حقائق کا روپ نہیں اختیار کرتے وہ بحث وتمحیص کے بعد بدل بھی جاتے ہیں لیکن ان سائنسی تحقیقات کا کوئی نتیجہ بھی ان اصولی حقائق سے متضاد نہیں ہوتا جو قرآن میں ثبت ہیں۔ قرآن کریم نے جو ابتدائی حقیقت دی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "ابتداء انسان کو مٹی کے ست سے تخلیق کیا گیا ہے اور اس کی تخلیق میں پانی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ لہٰذا ابتدائی حقیقت جو قرآن کریم نے بیان کی ہے' اپنی جگہ باقی ہے' بعد میں آنے والے نظریات اس کی تفصیلات ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیچڑ اور اس کے اندر پائے جانے والے عناصر جیسے نے یک زندہ انسان کی شکل کس طرح اختیار کی۔ کس طرح اعضا بنے اور کس طرح انسان کی شکل و صورت وجود میں آئی۔ یہ وہ راز ہے جس کے علل و اسباب معلوم کرنے سے انسان آج تک بے بس ہے۔ پہلے خلیے کو زندگی کس طرح ملی۔ انسان اور زندگی کی نشوونما پر کام کرنے والے سائنس دان آج تک اس راز سے آگاہ نہیں ہو سکے۔ رہی اعلیٰ درجے کی انسانی زندگی جس کے اندر فہم و فراست کی قوتیں موجود ہیں' اس کے اندر ایسی امتیازی قوتیں موجود ہیں جن کے ذریعے انسان نے پوری کائنات کو مسخر کر لیا ہے' تمام دوسرے درجے کے زندہ حیوانات کو قابو کر لیا ہے۔ اس حضرت انسان کو اس پوری دنیا پر فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ یہ تو وہ عظیم راز ہے جس کے بارے میں انسانی نظریات آج تک مخبوط الحواس ہیں۔ لیکن اس اہم راز کے بارے میں

قرآن کریم انسان کو نہایت ہی سادہ ، واضح اور اجمالی علم دیتا ہے۔

سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (۱۵ : ۲۹) (جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو) تو در حقیقت یہ اللہ کی پیدا کردہ روح ہے جو اس حقیر عضویاتی مخلوق کو ایک بلند انسانی مخلوق بنا دیتی ہے۔ لیکن اہم سوال یہی ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب یہ حقیقت ہے کہ اس انسان کو اس قدر قوت مدرکہ دی کب گئی ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ سکے۔ چنانچہ مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ وہ اس راز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ یہ موقف نہایت ہی ٹھوس ہے اور ہم اس پر بڑے اطمینان سے کھڑے ہیں۔

اس سے قبل یعنی تخلیق انسان سے قبل اللہ نے شیطان کو آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا تھا۔ شیطان اور شیطانی قوت تخلیق آدم سے بھی پہلے موجود تھی۔ یہ ہے وہ علمی اور یقینی اطلاع جو اللہ نے ہمیں دی ہے۔ رہی یہ بات کہ ذات شیطانی کی کیفیت کیا ہے اور اس کی تخلیق کی تفصیلات کیا ہیں تو یہ ایک دوسری حقیقت ہے اور اللہ نے ہمارا یہ فرض قرار نہیں دیا کہ ہم ان لاحاصل چیزوں میں فضول بحثیں اور تحقیقات کریں۔ ہاں ہم اس ناری مخلوق کی بعض صفات سے ضرور واقف ہیں اور آگ کی لپیٹ اور شعلوں کو بھی جانتے ہیں اور اس قوت کی ناری صفات انسانی ذات پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ آگ سے ہیں۔ نیز ہمیں اس قدر معلوم ہے کہ جنات کی ذاتی صفات میں اذیت اور برق رفتاری شامل ہے کیونکہ ان کی تخلیق نار سموم سے ہے۔ اس قصے کے درمیان میں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیطان میں صفت غرور اور تکبر پایا جاتا ہے۔ چونکہ شیطان جن تھا اس لئے غرور و استکبار اس کے مزاج کا خاصہ ہونا چاہئے کیونکہ نار کے ساتھ یہ صفات لگا کھاتی ہیں۔

انسان کی تخلیق چونکہ سڑے ہوئے گارے سے ہوئی، جو خشک ہوکر صلصال بن گیا تھا یعنی بجنے کی آواز اس سے نکلتی تھی۔ پھر اس میں ذات باری کی طرف سے ایک روح پھونکی گئی جس کی وجہ سے زندہ مخلوق کی یہ صنف دوسری مخلوقات سے ممتاز ہوگئی۔ پھر اسے مخصوص انسانی صفات بھی عطا ہوئیں۔ اور ان صفات میں سے اہم صفت انسان کی وہ علمی ترقی تھی جو وہ انسانیات کے شعبے میں کر رہا تھا۔

یہ نفخ روح، دراصل انسان کو عالم بالا سے مربوط کر دیتی ہے۔ یہی صفت ہے جو انسان کو خدا رسیدگی کی قوت دیتی ہے اور یہی قوت انسان کو یہ صلاحیت دیتی ہے کہ وہ خدا سے ہدایت اخذ کر سکے، یوں حضرت انسان جسمانی اور مادی اور حواس کی دنیا سے بلند ہو جائے اور اس عالم تجرید میں کام کرے، جس میں دل و دماغ جولانی دکھاتے ہیں۔ اس طرح انسان کو وہ راز عطا کیا جاتا ہے جس تک انسان ایسے حالات میں پہنچتا ہے کہ وہ زمان و مکان سے وراء ہوتا ہے اور دائرہ حواس سے آگے بڑھ کر غیر محدود تصورات کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ اونچے درجات حاصل کرنے کے باوجود انسان کے ساتھ مادیت کی آلودگی بہرحال قائم رہتی ہے۔ اس کا مزاج مادی ہی رہتا ہے اور وہ مادی ضروریات اور کمزوریوں کا شکار رہتا ہے۔ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، لباس کا محتاج ہوتا ہے۔ طبعی میلانات اور جنسی خواہشات رکھتا ہے۔ کمزوریاں اور کوتاہیاں اس میں ہوتی ہیں اور اپنے جسمانی اور تصوراتی کمزوری کی وجہ سے پھر اس سے برے افعال بھی سرزد ہوتے ہیں۔

اسلام کا منشا اور اعلیٰ نصب العین یہ ہے کہ انسان' انسان مادی اور مٹی کے تقاضوں اور روحانی اور علوی تقاضوں کے درمیان ایک حسین توازن کے اعلیٰ اور ارفع مقام تک پہنچ جائے۔ یہ وہ ترقی یافتہ اور بلند مقام ہے جسے ہم کمال بشری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اپنے عناصر ترکیبی میں سے کسی ایک کو نظرانداز کر دے اور یا خالص روحانی بن جائے' رہبان ہو یا ہندو' جوگی ہو یا خالص مادہ پرست بن جائے اور مادی اقدار کے سوا تمام اعلیٰ اقدار کی نفی کر کے حیوان بن جائے۔ اگر انسان ان دونوں عناصر میں سے کسی ایک ہی کا انتخاب کرے گا تو وہ کبھی بھی کمال و ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتا۔ جو قومیں صرف ایک عنصر کو پیش نظر رکھ کر انسان کو ترقی دیتی ہیں وہ ان مقاصد کے خلاف کام کر رہی ہیں جن کے لیے اس مخلوق کی تخلیق کی گئی ہے۔

جو لوگ انسان کی جسمانی قوتوں کو معطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہی ہیں جو انسان کی روحانی قوتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں فریق انسان کے سیدھے فطری مزاج کے خلاف جا رہے ہیں۔ ایسے لوگ انسان سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جس کے بارے میں خالق انسان کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں کیونکہ یہ لوگ جسد انسانی کے ایک حصے کو کاٹ رہے ہیں' لہٰذا وہ اس سلسلے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے کیونکہ وہ فطرت کے خلاف جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو تنبیہ کی جو رہبانیت اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ بعض نے کہا کہ وہ کبھی عورت کے قریب نہ جائے گا۔ بعض نے کہا کہ وہ صائم الدہر ہو گا' کبھی بھی افطار نہ کرے گا۔ کسی نے کہا کہ وہ ساری ساری رات عبادت کرے گا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوئے گا۔ حضورؐ نے ان کو سخت تنبیہ فرمائی۔ حدیث عائشہ کے آخر میں ہے : فمن رغب عن سنتي فليس مني "جو شخص میری سنت سے منہ موڑے گا وہ میری امت سے نہ ہو گا"۔

اسلام نے انسان کے لیے قوانین شریعت کی جو ضابطہ بندی کی ہے وہ اسی اصول پر کی ہے۔ اسلام نے اخلاق و قانون کا ایسا ضابطہ دیا ہے جو اسی اصول پر مبنی ہے اور اس میں انسان کی تمام فطری صلاحیتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسلام انسان کی صلاحیتوں میں سے کسی صلاحیت کی بیخ کنی نہیں کرتا' ہاں اسلام ان صلاحیتوں کے درمیان ایک قسم کا توازن ضرور قائم کرتا ہے تاکہ ان میں سے کوئی طاقت اور صلاحیت حد اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے اور کوئی صلاحیت دوسری کو ختم نہ کر دے۔ کیونکہ توازن بگاڑنے سے بہرحال غیر متوازن صلاحیت ختم ہو گی اور انسان کی بعض خصوصیات کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔ اور یوں انسان ایک شرعی جرم کا مرتکب ہو گا کیونکہ اللہ کا یہ بھی حکم ہے کہ اپنی فطری قوتوں کو محفوظ رکھو اور ان کی نشوونما کرو۔ کیونکہ یہ اللہ کی عطا کردہ ہیں اور کسی مقصد کے لیے ہیں' محض اضافی نہیں ہیں اور نہ بے مقصد ہیں۔

یہ تھیں وہ بعض باتیں اور کچھ خیالات جو انسان کی تخلیق کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد دل میں اترے۔ قرآن کریم تخلیق انسان کے بارے میں یہی حقائق ذہن نشین کرتا ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم اس قصے کے مشاہد اور مناظر کی طرف آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا :

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

مَّسْنُوْنٍ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴿۲۹﴾

"پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔

چنانچہ فرشتوں نے ایسا ہی کیا جس طرح اللہ نے حکم دیا تھا۔ اور اللہ نے چونکہ انسان کی تخلیق کا ارادہ کر لیا تھا اس لیے انسان مطلوبہ ارادہ کرتے ہی تخلیق ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی روح جو اس فانی جسد خاکی میں پھونکی گئی اور جو لافانی چیز ہے وہ کس طرح اس جسد خاکی کے ساتھ آمیختہ ہو گئی' جو فانی چیز ہے۔ ایک مومن تو ایسے سوالات نہیں کرتا کیونکہ اس موضوع پر یہ مباحثہ و مذاکرہ ایک عبث کوشش ہے۔ بلکہ اس قسم کے مباحث میں جدل و جدال کرنا محض تضیع اوقات ہوتا ہے۔ ان موضوعات پر کلام کر کے ہم عقل کو ایک ایسے دائرے میں داخل کرتے ہیں جس میں اس کے اسباب ادراک اور اس کی قوت فیصلہ کام ہی نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں جو بحثیں اس سے قبل ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں وہ اس جہل پر مبنی ہیں جس میں انسان خود عقل انسانی کی حقیقت کو سمجھنے کے حوالے سے مبتلا ہے۔ عقل انسانی کا یہ مقام ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر ماوراء کے حدود میں دخل دے۔ کیونکہ عقل میں وہ طاقت ہی نہیں ہے کہ اپنے اسباب ادراک کی حدود اور صلاحیت سے آگے بڑھے کیونکہ خالق کائنات کی کیفیت عقل انسانی کی حدود سے باہر ہے۔ لہٰذا اس میدان میں عقل کو لگانا ہی حماقت ہے۔ تخلیق کائنات کے راز معلوم کرنے میں عقل انسانی کو کھپانا ہی بنیادی غلطی ہے۔ عقل اس بات میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ ایک فانی چیز سے ایک خالد اور دائمی حقیقت کے ساتھ کس طرح وابستہ و آمیختہ ہو سکتی ہے۔ ایک چیز ازلی ہے اور دوسری حادث اور نہ اللہ نے عقل انسانی سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرے اور اسے ثابت کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف یہ بتایا ہے کہ ایسا ہوا لیکن کسی جگہ یہ نہیں بتایا کہ کیسے ہوا؟ کیونکر ایسا ہوا؟ یہ بات تو ثابت ہے کہ انسان مخلوق ہے اور ہمارے سامنے موجود ہے۔ عقل انسانی اس موجود حقیقت کا انکار تو نہیں کر سکتی۔ نہ عقل انسانی خود اس تخلیق کی کیفیت بتا سکتی ہے۔ عقل انسانی کے بس میں صرف یہ بات ہے کہ وہ قرآن کی خبر کی تصدیق کر دے۔ جہاں تک حقیقت تک رسائی کا تعلق ہے تو عقل انسانی ایسا نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات بداہتہً ثابت ہے کہ خود انسان اور عقل انسانی ایک حادث اور مخلوق اور فانی حقائق ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ کوئی فانی اور مخلوق چیز لافانی' ازلی اور ابدی حقائق پر کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ کسی شکل و صورت میں بھی نہیں لگا سکتی۔ اس سلسلے میں عقل کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اس میدان میں جولانی دکھانے سے باز آ جائے اور ایسے میدانوں میں کام کرے جو اس کے لیے کھلے اور محفوظ ہیں۔ مثلاً عام سائنسی میدان۔

میں نے اپنی عادت کے برعکس اس عقلی مسئلے پر یہاں قدرے طویل بحث کر دی ہے حالانکہ ظلال القرآن میں ہمارا یہ طریقہ نہیں رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ امور غیب کی نوعیت ایک جیسی ہے اور ان تمام امور غیبیہ کے مسئلے میں ہم ایک ایسا اصولی قاعدہ وضع کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی دل و دماغ اور انسانی سوچ اور ایمان اس قاعدے پر مطمئن ہو جائیں۔ بہرحال اس کے بعد کیا ہوا؟

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

"چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا' سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا"۔

فرشتوں نے تو یہ سجدہ اس لیے کیا کہ ان کی فطرت ہی عبادت الہٰی اور تعمیل حکم ہے۔ بغیر چون و چرا کے اور ابلیس نے انکار اس لیے کیا کہ وہ ملائکہ میں سے نہ تھا۔ ملائکہ نوری مخلوق ہیں اور شیطان ناری۔ فرشتے ایسے ہیں کہ ان کو اللہ کی طرف سے جو حکم بھی ملے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے' انہیں جو حکم ملے وہ کر گزرتے ہیں اور ابلیس نے یہ حکم ملتے ہی انکار کیا اور استکبار کیا۔ اس لیے یقیناً وہ فرشتوں میں سے نہ تھا۔ یہاں استثناء متصل نہیں ہے' یہ اس طرح ہے جس طرح کہتے ہیں کہ فلاں کی اولاد تو سب آگئے مگر احمد نہیں آیا۔ جبکہ احمد فلاں کے بیٹوں میں سے نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہی رہنے والا ہوتا ہے یا ان کے آنے والے کے فعل کے ساتھ۔ اس کا بھی کچھ تعلق ہوتا ہے اس لیے اسے استثنائیہ جملے میں یکجا کر دیا جاتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم تو تھا ہی فرشتوں کو' پھر ابلیس اس حکم کے مدلول میں کس طرح شامل ہو گیا۔ تو جواب یہ ہے کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس بھی اس حکم میں شامل تھا۔ سورہ اعراف میں تو صراحت کے ساتھ ابلیس کو شامل کیا گیا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ "اس نے کہا کس چیز نے تجھے منع کیا کہ تو سجدہ کرے جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ قرآن کریم کا یہ انداز بیان ہے کہ وہ حالاتی مفہوم پر اکتفاء کرتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ آیت مذکورہ اس بات پر قطعی الدلالت ہے کہ اللہ کی طرف سے ابلیس کو بھی حکم دے دیا گیا تھا اور یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حکم وہی ہو جو فرشتوں کو دیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے احکام میں ہی ابلیس کو شامل کر دیا گیا ہو کیونکہ وہ ان سے متعلق تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابلیس کو علیحدہ حکم دیا گیا ہو' لیکن یہاں اس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ یہاں اسے نظرانداز کرنا مطلوب تھا اور فرشتوں کو نمایاں کرنا مطلوب تھا۔ لیکن جس طرح ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا اور ہم بھی یہی موقف اختیار کرتے ہیں۔

فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ ابلیس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ غیبی امور ہیں اور مسلمات ایمانیہ میں سے ہیں۔ ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح نصوص میں ان کا تذکرہ ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر تشریح کی ہے عقل کے لیے ان حقائق تک رسائی ممکن نہیں ہے اس لیے وہ نصوص کے سوا کسی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کا دائرہ کار نہایت ہی محدود ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

رب نے پوچھا "اے ابلیس ' تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟" اس نے کہا "میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے"۔

یہ غرور و استکبار کا مزاج بول رہا ہے۔ نظر آتا ہے کہ گرم آگ سے پیدا ہونے والی یہ مخلوق کس قدر سرکش ہے۔ اسے خشک بجنے والا گارا نظر آتا ہے۔ اس سے بھی پہلے اس کی سڑی ہوئی حالت بھی نظر آتی ہے لیکن اسے وہ قدرتی روح نظر نہیں آتی جو عالم بالا سے اس جسد خاکی میں پھونکی گئی۔ یہ مغرور تکبر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی عظمت ' شان اور مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ میں ایک ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جسے گلی سڑی ہوئی مٹی کے ایسے گارے سے بنایا گیا ہے جو بج رہا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اسے راندۂ درگاہ کر دیا جائے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون قرار دے دیا جائے۔'

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾

رب نے فرمایا "اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے ' اور اب روز جزا تک تجھ پر لعنت ہے"۔

اب اس کا حسد ' بغض اور شرارت کا مزاج سامنے آتا ہے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

اس نے عرض کیا "میرے رب ' یہ بات ہے تو پھر مجھے اس روز تک کے لیے مہلت دے جب کہ سب انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔ فرمایا "اچھا ' تجھے مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے"۔

یہ دربار الٰہی ہے اور یہ حضرت ندامت اور معافی مانگنے کے بجائے مہلت مانگ رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ رجوع الی اللہ کریں ' توبہ و استغفار کی کوئی سبیل نکالیں اور گناہ معاف کرالیں بلکہ وہ آدم اور آدم کی تمام نسل سے انتقام لینے کا اعلان کرتا ہے۔ اگرچہ وہ آدم کے حوالے سے خود اپنے کیے کی وجہ سے مردود ہوا مگر اپنی کوتاہی کو آدم کی طرف منسوب کرتا ہے اور اسے یہ نظر نہیں آتا کہ نافرمانی کا ارتکاب تو خود اس نے کیا ہے اور اپنے غرور اور استکبار کی وجہ سے کیا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

وہ بولا "میرے رب ' جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا ' سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو"۔

یہاں ابلیس نے اپنا میدان جنگ خود ہی متعین کر دیا ہے' یہ کہ وہ زمین میں انسان کے خلاف جنگ کرے گا۔

لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ "میں زمین میں ان کے لیے اپنے دل فریبیاں پیدا کروں گا"۔ اسی طرح اس نے میدان جنگ میں استعمال ہونے والے اپنے ہتھیار کا بھی اعلان کر دیا۔ وہ یہ کہ میں غلط اور مضر اعمال کو ان کے لیے خوشنما بناؤں گا۔ برے کو بھلا قرار دوں گا۔ مصنوعی خوبصورتیوں کے ذریعے ان کو دام فریب میں گرفتار کروں گا۔ چنانچہ جو شخص بھی شر کا ارتکاب کرتا ہے وہ تب ہی کرتا ہے کہ شیطان اس کے لیے اسے خوشنما بنا دیتا ہے۔ شر کو وہ خیر کا لباس پہناتا ہے اور وہ شر کو ہرگز شر کی صورت میں پیش نہیں کرتا۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ شیطانی حربے کو اچھی طرح سمجھ لے انسان کو ہر اس معاملے پر چوکنا ہو کر غور کرنا چاہئے۔ جس چیز کو خوشنما بنا دیا گیا ہو اور جس کی طرف نفس انسانی کا میلان زیادہ ہو' اس بات کا غالب امکان ہے کہ ایسے معاملات کے پیچھے شیطان کا ہاتھ ہو گا انسان شیطان کے ان خوشنما ہتھیاروں سے تب ہی بچ سکتا ہے کہ وہ تعلق باللہ کو ہر وقت مضبوط رکھے' اللہ کی بندگی کما حقہ ادا کرے کیونکہ شیطان خود اقرار کرتا ہے کہ اللہ کے مخلص بندوں کے مقابلے میں اس کے یہ ہتھیار کند ہوں گے۔ وہ کہتا ہے۔

وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (۳۹) إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (۴۰)(۱۵: ۳۹ -

۴۰) "میں ان سب کو بہکا دوں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو"۔ اور ہر دور میں اللہ اپنے بعض بندوں کو خالص کر لیتا ہے۔ جبکہ اللہ کے وہ بندے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کر لیتے ہیں اور وہ اللہ کی بندگی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر شیطان کے حربے کارگر نہیں ہوتے۔

شیطان نے یہ استثناء خود کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کائنات میں سنت الٰہیہ کیا ہو گی؟ اور یہ کہ سنت الٰہیہ سے فرار ممکن نہیں ہے۔ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بندوں کو اپنے لیے چن لے گا جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کر دیا۔ ایسے بندے اللہ کی حمایت میں ہوں گے۔ اللہ کی زیر نگرانی ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے بھی صاف صاف جواب دے دیا:

قَالَ هَٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿٤١﴾ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿٤٢﴾

فرمایا "یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں"۔

یہ سیدھی راہ ہے' یہ ناموس فطرت ہے' یہ سنت الٰہیہ ہے' ہدایت و ضلالت میں اللہ نے یہی سنت قرار دی ہے' یہ

کہ اللہ کے مخلص بندوں پر شیطانی چالیں کارگر نہ ہوں گی اور یہی قانون الٰہی ہے' شیطان ان پر اثرات نہ ڈال سکے گا اور اس دنیا کو وہ ان کے لیے حزین نہ بنا سکے گا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے شیطان کو یہ کام کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ اللہ کی حمایت میں آ چکے ہیں' ان بندوں تک شیطان کا داخلہ بند ہوتا ہے' اس لیے کہ ان کی نظریں ہر وقت اللہ پر ہوتی ہیں اور یہ بندے ناموس فطرت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ شیطانی چالیں صرف ان لوگوں پر چلتی ہیں جو گمراہ ہوں اور جو شیطان کی پیروی کرتے ہوں۔ یہ بھی استثناء منقطع ہے کیونکہ اللہ کے صالح بندے گمراہوں میں شمار ہی نہیں ہوتے۔ شیطان تو صرف ان لوگوں کو شکار کرتا ہے جو بھٹک چکے ہوں جیسا کہ بھیڑیا بھٹکی ہوئی بکری کو بسہولت شکار کر لیتا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے نفوس خالص ہیں اور اللہ کے لیے خالص ہو چکے ہیں تو ایسے لوگوں کو اللہ ضائع ہونے نہیں دیتا۔ اس کی رحمتیں وسیع ہوتی ہیں۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے بھی رہ جائیں تو بھی وہ راہ پا لیتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو گمراہ ہو چکے ہیں تو ان کا انجام آغاز کائنات ہی سے معلوم ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوۡعِدُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبۡعَةُ اَبۡوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنۡهُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ﴿۴۴﴾ ۳ ۱۹ع ۳

"اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے ۔ یہ جہنم (جس کی وعید پیروان ابلیس کے لیے کی گئی ہے) اس کے سات دروازے ہیں' ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے"۔

سات دروازے کا لفظ محض عدد کا اظہار ہے یا واقعی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے دونوں معنوں کے لینے سے حقیقت نفس الامری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گمراہوں کی کئی اقسام اور درجات ہیں اور گمراہی کی بھی کئی شکلیں اور رنگ ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کے لوگوں کے لیے ایک دروازہ مخصوص ہو گا ان کے مقام اور مرتبے کے لحاظ سے۔

یہ قصہ اب مقام عبرت اور غرض و غایت کے بیان کے مقام تک پہنچ گیا ہے۔ یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ انسان کی ذلت میں اس کا مادی پہلو کس طرح انسان کے روحانی پہلو پر غالب آ جاتا ہے اور یہ کہ جو لوگ تعلق باللہ کو تازہ اور زندہ رکھتے ہیں ان پر شیطان کو دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ آخر میں گمراہوں کے انجام کے بالمقابل بتا دیا جاتا ہے کہ اہل حق کا انجام کس قدر خوبصورت ہو گا۔

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿۴۵﴾ اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيۡنَ ﴿۴۶﴾ وَنَزَعۡنَا مَا فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيۡنَ ﴿۴۷﴾ لَا يَمَسُّهُمۡ فِيۡهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمۡ مِّنۡهَا بِمُخۡرَجِيۡنَ ﴿۴۸﴾

”بخلاف اس کے متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے' وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔انہیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے“۔

متقی کون ہیں؟ وہ جو خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اسباب سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں جو عذاب الٰہی کا باعث بنتے ہیں۔ جنتوں میں جن چشموں کا ذکر ہے وہ سات ابواب کے بالمقابل ہے۔یہ لوگ جنتوں میں نہایت ہی امن و اطمینان سے اتریں گے اور وہ اس طرح خوفزدہ نہ ہوں گے جس طرح اہل جہنم تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کدورت ہوگی وہ بھی ہم نکال دیں گے۔جبکہ ابلیس کے دل میں جو حسد اور کینہ ہو گا وہ اہل جہنم کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور وہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے رہیں گے۔ جبکہ اہل جنت کے لیے کوئی مشقت نہ ہوگی اور نہ ان کے لیے وہاں سے نکلنے کا کوئی خطرہ ہو گا۔یہ لوگ زمین میں خدا سے ڈرتے تھے 'لیکن یہاں ان کے لیے کوئی خوف و خطر نہ ہو گا۔رب کریم کے جوار رحمت میں خوش و خرم ہوں گے۔

---()()()---

درس نمبر ۱۱۷ ایک نظر میں

اس سبق میں اللہ کی رحمت اور اللہ کے عذاب دونوں کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی کبر سنی کے باوجود اولاد دی جاتی ہے اور اسے اولاد علیم کہا جاتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو نجات دی جاتی ہے اور اس رحمت سے صرف ان کی بیوی محروم ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق ظالمین سے تھا۔ پھر یہاں اصحاب ایکہ اور اصحاب حجر کے برے دنوں کا تذکرہ بھی ہے۔

یہ تمام قصص اور مثالیں اس تمہید کے بعد آتی ہیں:

نَبِّئْ عِبَادِيْ اَنِّيْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۹) وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۵۰) (۱۵: ۴۹ — ۵۰) "اے نبی میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک ہے"۔ چنانچہ ان امثلہ وقصص میں سے بعض تو اللہ کی رحمت کی مثالیں ہیں اور بعض اللہ کے عذاب کی۔ یہ قصص اس سورہ کے ابتدائی تبصرے کے بھی مناسب ہیں جس میں لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا:

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۳) وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (۴) مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۵)

(۱۵: ۳ تا ۵) "چھوڑ دو انہیں، کھائیں پئیں، مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ تو اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ چنانچہ یہ قصص ان بستیوں کی مثالیں ہیں جو ہلاک کی گئیں اور جب ان کی مہلت عمل ختم ہو گئی تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ نیز سورہ کے آغاز میں فرشتوں کے نزول کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا کہ وہ حق کے ساتھ اترتے ہیں۔

وَقَالُوْا يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (۶) لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷) مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ

٦ تا ٨) "یہ لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کر کیوں نہیں آتا؟ ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں اور پھر ان لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی"۔ یوں یہ سورہ ایک متحد اور مربوط مضمون بن جاتی ہے جس کے تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے موید نظر آتے ہیں' یہ اس حقیقت کے باوجود کہ قرآن مجید کی سورتوں میں شاذ و نادر ہی ایسی سورتیں ہیں جو تمام کی تمام بیک وقت نازل ہوئی ہیں۔ ان کی آیات اس ترتیب سے نازل نہ ہوتی تھیں جس طرح ہم مصحف میں پاتے ہیں۔ ہاں یہ بات مسلم ہے کہ سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب اللہ کی جانب سے ہے یعنی توقیفی ہے۔ لہٰذا اس خدائی ترتیب کے اندر حکمت اور ترتیب ضرور ملحوظ ہے۔ ان سورتوں کے مضامین کی ترتیب اور ہم آہنگی کے سلسلے میں اللہ نے بعض پہلو ہم پر منکشف کیے ہیں جن کا بیان ہم نے تمام سورتوں کے مقدمات میں کیا ہے۔ ہر سورہ کی ایک فضا اور اس کے خدوخال بیان کیے ہیں' حقیقی علم بہرحال اللہ کو ہے۔ ہم نے جو ترتیب' ربط مضامین اور حکمت بیان کی ہے وہ اجتہادی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---OOO---

درس نمبر ۱۱۷ تشریح آیات

۴۹ --- تا --- ۸۴

نَبِّئْ عِبَادِيٓ أَنِّيٓ أَنَا ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ ٱلْعَذَابُ ٱلْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

اے نبی" میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے"۔

گمراہوں کے عذاب اور متقین کی جزاء کے ذکر کے متصلاً بعد حضور اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس مضمون کا اعلان کر دیں۔ سیاق کلام میں اس کا ربط ظاہر ہے' یہاں اعلان رحمت اور مغفرت کو مقدم کیا گیا ہے اور اعلان سزا کا تذکرہ بعد میں کیا گیا ہے' کیونکہ اللہ کی رضا اس میں ہے کہ لوگوں کو اس کی رحمت و مغفرت نصیب ہو' کیونکہ اللہ نے رحمت و مغفرت کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہے' ہاں کبھی کبھی مضمون اور مقام کے تقاضے کے مطابق صرف عذاب کا تذکرہ ہوتا ہے یا تذکرہ تو دونوں کا ہوتا ہے لیکن سیاق کلام میں کسی مخصوص حکمت کی وجہ سے عذاب الٰہی کا تذکرہ پہلے آ جاتا ہے۔ اس کی تشریح ایسے مقامات پر بھی کی گئی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان فرشتوں کا قصہ آتا ہے جو قوم لوط کی بیخ کنی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کا یہ قصہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور ہر جگہ اسے مختلف انداز میں لایا گیا ہے۔ ہر مقام کی مناسبت سے اس قصے کا ایک حصہ لیا گیا ہے۔ ہاں حضرت لوطؑ کا قصہ بعض مقامات پر علیحدہ بھی آیا ہے۔ سورہ اعراف میں قصہ لوط کا ایک حصہ گزر گیا ہے۔ پھر سورہ ہود میں بھی قصہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کا تذکرہ ہوا ہے۔ سورہ اعراف میں حضرت لوطؑ کی جانب سے اپنی قوم کی فحاشی پر نکیر اور سرزنش کا ذکر تھا اور قوم کی طرف سے ان کی نکیر کا یہ جواب دیا گیا تھا:

أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ "نکالو ان کو اپنے گاؤں سے' یہ لوگ بہت پاکباز بنتے ہیں"۔ لیکن جب عذاب الٰہی آیا تو اللہ نے انہیں اور ان کے اہل و عیال کو نجات دے دی' ماسوائے ان کی ایک بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو گئی۔ یہاں فرشتوں کی آمد اور ان کے بارے میں قوم کی سرگوشیوں کا ذکر نہ تھا۔

سورہ ہود میں یہ قصہ ذکر ملائکہ پر مشتمل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی بات کی گئی ہے لیکن انداز گفتگو ہر جگہ مختلف ہے۔ وہاں بعض تفصیلات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ آپ کی بیوی کھڑی تھی اور

فرشتوں کی جانب سے بشارت سن رہی تھی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت لوطؑ اور قوم لوط کے بارے میں فرشتوں سے تکرار شروع کر دی۔ ان کڑیوں کا تذکرہ یہاں چھوڑ دیا گیا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں واقعات کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ سورہ ہود میں جو واقعات بیان ہوئے' ان میں فرشتوں کی حقیقت کو پوشیدہ رکھا گیا۔ ان کی حقیقت ان پر اس وقت کھلی جب لوگ لوط کے خوبصورت مہمانوں کا سن کر دوڑتے ہوئے چلے آرہے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام ان کو بے عزتی سے بچانے کی خاطر ان کی منت سماجت کر رہے تھے اور وہ آپ کی ایک بھی نہ مان رہے تھے یہاں تک کہ ان کا دل بھر آیا اور وہ یہ اندوہناک بات کرنے پر بھی مجبور ہو گئے۔

لَوْ اَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْ اِلَي رُكْنٍ شَدِيْدٍ "اے کاش کہ میں تمہارے مقابلے میں قوت رکھتا یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ میں اس کی پناہ لیتا"۔ یہاں قصے میں ابتدا ہی سے فرشتوں کی حقیقت بتا دی گئی ہے اور لوگوں کے مشورے اور رے لراوس کی بات کو بعد میں لایا گیا ہے' کیونکہ یہاں یہ مقصود نہیں ہے کہ قصہ کے واقعات کی ترتیب کیا ہے بلکہ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کا عذاب کس طرح آتا ہے اور یہ کہ جب فرشتے آتے ہیں تو پھر مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور انہیں ذرا ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ آئے اس کے ہاں اور کہا "سلام ہو تم پر"۔ تو اس نے کہا "ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔ "ڈرو نہیں' ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں"۔ ابراہیم نے کہا "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں' تم مایوس نہ ہو"۔ ابراہیم نے کہا "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں"۔

جب فرشتے آئے تو انہوں نے کہا تم پر سلامتی ہو' اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہاں آپ نے خوف کی کوئی وجہ نہیں بتائی اور یہ تذکرہ بھی نہیں ہے کہ آپ بھنا ہوا بچھڑا لائے اور انہوں نے ہاتھ نہ بڑھایا جیسا کہ سورہ ہود میں بیان یوں ہے :

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً "مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا"۔ یہاں یہ تفصیلات اس

لیے نہیں دی گئیں کہ وہاں مقصود قصہ یہ ہے کہ اللہ جب اپنے رسول کے ذریعے کسی قوم سے رحمتوں کا وعدہ کرتا ہے تو وہ رحمت آکر رہتی ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم ؑ کے قصے کے واقعات بیان کرنا مطلوب نہیں ہے' اس لیے یہاں جلدی سے خوشخبری کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۱۵:۵۳) "انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم تمہیں ایک سیانے لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں"۔ یوں یہ خوشخبری تیزی سے دی گئی' جیسا کہ ہمیشہ خوشخبری دینے والا تیزی کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی سیاق کلام میں تفصیلات کو چھوڑ کر خوشخبری سنا دی۔

چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم ؑ کا اپنے بارے میں جواب و استفسار و استعجاب کا ذکر ہوتا ہے اور حضرت کی بیوی کا کلام ترک کر دیا جاتا ہے۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (۱۵:۵۴) "فرمایا کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی خوشخبری دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم نے مجھے دے رہے ہو؟" ابتداء میں حضرت ابراہیم ؑ نے اس بات کو مستبعد سمجھا کہ اس عمر میں ان کو اولاد نصیب ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ دوسری جگہ تصریح آئی ہوئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میری بیوی بوڑھی اور بانجھ ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا:

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (۱۵:۵۵) "انہوں نے کہا ہم نے تمہیں برحق بشارت دی ہے' تم مایوس نہ ہو"۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائی اور مایوسی کا انکار کر دیا۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ (۱۵:۵۶) "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں' ابراہیم ؑ نے کہا"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات میں قرآن کریم نے لفظ رحمت کو نقل کیا ہے' یہ سیاق کلام میں موضع و محل کے ساتھ گہری ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ان کی بات ایک قاعدہ قرار پاتی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے صراط مستقیم گم کر دیا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے راستے سے ہٹ چکے ہوتے ہیں' ان پر رحمت خداوندی کی خوشگوار ہوائیں چلتی' ان کو یہ احساس نہیں رہتا کہ قدم قدم پر اللہ کی رحمتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں' وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ہر ہر لمحہ وہ اللہ کے رحم و کرم پر ہیں اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو قلب رحمت خداوندی سے تروتازہ ہوتا ہے' جو رحمان سے جڑا ہوا ہوتا ہے وہ کبھی بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ مصائب و شدائد میں گھرا ہوا ہو' اگرچہ اس کے ارد گرد مصائب کی تاریکیاں ہوں' اگرچہ مایوسیوں کے بادل اس کے سر پر منڈلا رہے ہوں اور اگرچہ منزل کا پتہ دور دور تک نہ ہو' اس لیے کہ رحمت خداوندی ہروقت قلوب مومنین سے قریب ہوتی ہے۔

اس مقام پر آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مخلوق یعنی فرشتوں کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور انہوں نے جو خوشخبری دی اس پر ان کو دلی اطمینان اور مسرت حاصل ہو گئی ہے۔ اب وہ ان فرشتوں کی آمد کی اصل غرض

وعایت پوچھتے ہیں۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

۴ ۱۶ ع ۴

پھر ابراہیم ؑ نے پوچھا "اے فرستادگان الٰہی ' وہ مہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟" وہ بولے "ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ صرف لوط ؑ کے گھر والے مستثنیٰ ہیں ' ان سب کو ہم بچالیں گے ' سوائے اس کی بیوی کے جس کے لیے (اللہ فرماتا ہے کہ) ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔

یہاں سیاق کلام میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت ابراہیم ؑ نے حضرت لوط ؑ کی قوم کے بارے میں فرشتوں سے اچھا خاصا تکرار کیا' جیسا کہ سورہ ہود میں بتایا گیا ہے بلکہ یہاں فرشتے پوری کی پوری بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا دیتے ہیں کیونکہ وہ حضرت لوط اور آل لوط پر رحمت خداوندی کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہاں ان کی بیوی کے بارے میں فیصلہ ذرا مختلف ہے' وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے (غابرین یعنی پیچھے قوم کے ساتھ رہ جانے والوں سے ہوگئی اور اس کا انجام قوم کے ساتھ ہوا۔ یہ لفظ غبرہ سے نکلا ہے' جس کا اطلاق اس دودھ پر ہوتا ہے جو مویشی کو دوہنے کے بعد اس کے تھنوں میں رہ جاتا ہے) چنانچہ فرشتے قوم لوط کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

"پھر جب یہ فرستادے لوط ؑ کے ہاں پہنچے تو اس نے کہا "آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا "نہیں 'بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں۔ لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے"۔ اور اسے ہم نے اپنا

یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی"۔

یہاں فرشتے جلدی سے لوط علیہ السلام کو بتا دیتے ہیں کہ وہ فرشتے ہیں' وہ اس کام کے لیے آگئے ہیں جس میں ان کی قوم شک میں مبتلا تھی 'یعنی یہ کہ وہ جو بداعمالیاں کر رہے ہیں اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ وہ اللہ کے عذاب کو بروئے کار لانے کے لیے آئے ہیں اور جب فرشتے آجاتے ہیں تو پھر اللہ کے عذاب کے نزول میں دیر نہیں ہوتی۔ وہ فوراً آتا ہے اس لیے یہاں بھی بات جلد ختم کی جا رہی ہے۔

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (۱۵:۶۲) "آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں"۔ یہ بات حضرت لوط نے اس لیے کہی کہ ان کو ان مہمانوں کے بارے میں پریشانی لاحق ہو گئی تھی' وہ اپنی قوم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ یہ قوم ان کے مہمانوں کے ساتھ برا سلوک کرے گی۔ نیز یہ کہ وہ اپنی قوم میں کمزور ہیں اور لوگ طاقتور اور فساق و فجار ہیں 'یعنی وہ کہہ رہے ہیں کہ تم عجیب لوگ ہو کہ اس گاؤں میں آگئے ہو حالانکہ یہ لوگ جس فسق و فجور میں مبتلا ہیں اور تم جیسے لوگوں کے ساتھ وہ جو سلوک کرتے ہیں وہ معروف و مشہور ہے لیکن فرشتوں نے وضاحت کر دی :

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (۶۳) وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۶۴) (۱۵:۶۳ - ۶۴) "انہوں نے جواب دیا نہیں بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں۔ ان تاکیدات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اس معاملے میں کس قدر بے بس ہو گئے تھے اور ان کی بے چینی کا عالم کیا تھا۔ وہ حیران تھے کہ ایک طرف سے وہ اپنے مہمانوں کے حوالے سے ذمہ دار ہیں اور دوسری جانب وہ قوم کے مقابلے میں بے بس ہیں۔ چنانچہ فرشتوں نے نہایت ہی تاکیدی الفاظ میں ان کو تسلی دی اور ان کو فائنل ہدایات دینے سے قبل ان کو اچھی طرح مطمئن کر دیا کہ اب ان لوگوں کا وقت ختم ہے۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ (۱۵:۶۵) "لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے"۔ سری' رات کے سفر کو کہتے ہیں۔ رات کا قطعہ یعنی اس کا ایک حصہ' حضرت لوط علیہ السلام کو حکم تھا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر رات کے وقت نکل جائیں' صبح سے پہلے پہلے' حضرت خود ان کے پیچھے پیچھے جائیں۔ ان میں سے کوئی تذبذب نہ کرے' پیچھے نہ دیکھے یعنی اپنے علاقے کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ انسان جب اپنا محبوب علاقہ چھوڑتا ہے تو وہ نکلنے میں سست روی اختیار کرتا ہے۔ بار بار پیچھے دیکھتا ہے اور یہاں چونکہ صبح کے وقت ہی عذاب آنے والا تھا اور وقت مقرر تھا اس لیے ان کو بروقت نکلنے کی سخت تاکید کی گئی۔

وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَٰلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هَٰؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ (۱۵: ۶۶) "اور اسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی"۔ یہ عظیم فیصلہ تھا اور پیغمبر کو قبل از وقت اس سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ صبح سے پہلے پہلے ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ جب ان کی جڑ کٹ گئی تو شاخیں خود بخود کٹ گئیں۔ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس سے ان کا مکمل استیصال ظاہر ہوتا ہے' لہٰذا اہل اسلام کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ دیکھے۔ یہ نہ ہو کہ کفار کی طرح یہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آجائے۔ کیونکہ پیچھے رہنے والے عمومی عذاب سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

یہاں سیاق کلام میں اس انجام کو دوسرے واقعات سے قبل ہی پیش کر دیا گیا کیونکہ سورہ کے موضوع اور محل کا تقاضا ہی یہ تھا۔ اس کے بعد وہ واقعات دے دیئے جو مہمانوں کی آمد کے موقع پر پیش آئے۔

انہوں نے جب سنا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر چاند جیسے چہروں والے نوجوان لڑکے آئے ہوئے ہیں' (بعض روایات میں آیا ہے کہ ان مہمانوں کے بارے میں اطلاع خود حضرت لوط کی بیوی نے ان اوباشوں کو دی تھی) تو یہ لوگ بہت خوش ہوئے کہ خوب شکار ملا ہے۔

وَجَاءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٦٧﴾

"اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوط علیہ السلام کے گھر چڑھ آئے"۔ اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ فسق و فجور اور فحاشی و بے حیائی کی حدیں پار کر گئے تھے اور یہ قوم سب کی سب اخلاقی مریض تھی۔ یہ منظر کس قدر عجیب و شرمناک ہے کہ یہ لوگ گروہ در گروہ آرہے ہیں' خوشیاں منا رہے ہیں اور اعلانیہ کہہ رہے ہیں کہ آج خوب شکار ہاتھ آیا ہے۔ ایک تو برائی اور بے راہ روی ہے' دوسرے یہ کہ یہ اعلانیہ اور دیدہ دلیری سے کی جا رہی ہے۔ کوئی بھی صحت مند انسانی معاشرہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک فرد تو یہ رویہ کبھی کبھار اختیار کر سکتا ہے لیکن وہ بھی اپنی بیماری کو چھپاتا ہے۔ وہ یہ بے راہ لذت خفیہ طور پر حاصل کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے شرمندگی سے بچا سکتا ہے۔ لیکن ایک پورا معاشرہ اعلانیہ ایسا کرے اس لیے کہ اگر جنسی لذت سے کوئی سلیم الفطرت شخص جائز حدود کے اندر بھی لطف اندوز ہوتا ہے تو وہ بھی خفیہ طور پر ایسا کرتا ہے۔ بعض حیوانات بھی جنسی ملاپ کو چھپاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو دیکھو کہ یہ لوگ میلے ٹھیلے کی طرح اعلانیہ اس فحاشی کے لیے جا رہے ہیں' اس کا اعلانیہ مطالبہ کرتے ہیں' ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور اجتماعی شکل میں اس کام کے لیے آتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ انسانی سوسائٹی کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

ان حالات میں نہایت بے بسی کے حالات میں' حضرت لوط نہایت ہی کربناک اور اندوہناک حالت پریشانی میں کھڑے ہیں' وہ اپنے مہمانوں اور اپنی آبرو بچانے کی سعی کرتے ہیں' وہ انہیں انسانی شرافت اور انسانی قدروں کا واسطہ دے رہے ہیں' وہ ان کو خدا سے ڈراتے ہیں' وہ اللہ کا واسطہ دے رہے ہیں' حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں کے دل خدا خوفی سے عاری ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں میں نہ آدمیت کا احساس ہے' نہ انسانی شعور ہے' اور نہ ان کے

اندر خدا خوفی اور تقویٰ نام کی کوئی چیز ہے۔ لیکن وہ اس حالت پریشانی میں بھی بہرحال اپنی آخری کوشش کرتے ہیں اور انہیں انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ تو مہمان ہیں اور خدا سے ڈراتے ہیں کہ تمہارے جو ارادے ہیں وہ خدا کے حکم کے خلاف ہیں، بہرحال وہ سعی کرتے ہیں۔

قَالَ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ ضَيْفِي فَلَا تَفْضَحُونِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ ﴿٦٩﴾

لوط علیہ السلام نے کہا "بھائیو، یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رسوا نہ کرو"۔

حضرت لوط علیہ السلام کی یہ دردوزاپیل، بجائے اس کے کہ ان کے دلوں میں انسانی جذبات کو ابھارے اور یہ کہ وہ شرم محسوس کریں، اس کے جواب میں انہوں نے مزید دیدہ دلیری شروع کر دی۔ انہوں نے خود حضرت لوط علیہ السلام کو ڈانٹ پلانا شروع کر دی کہ وہ اس قسم کے لوگوں کو اپنا مہمان بناتے ہیں جو ہمارے کام کے ہیں۔ گویا مجرم وہ نہیں ہیں بلکہ اصل مجرم حضرت لوط علیہ السلام ہیں کہ وہ ان کے سامنے ایک ایسا شکار لاتے ہیں جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ پر کوئی ضبط نہیں کر سکتے۔

قَالُوا أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٧٠﴾

وہ بولے "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟"

لیکن حضرت لوط علیہ السلام ان کو راہ فطرت سلیم بہرحال دکھاتے جارہے ہیں۔ وہ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ خالق فطرت نے اس کام کے لیے عورت کو پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی ملاپ پر اس کائنات کی فطری بقا اور امتداد حیات کا انتظام کیا گیا ہے۔ بقائے نسل کے علاوہ یہ راہ دونوں جنسوں کے لیے مفید، فرحت بخش اور باعث سکون بھی ہے۔ قانون اور فطرت کے دائرے کے اندر۔ چنانچہ حضرت انہیں راہ راست پر لانے کی یوں سعی فرماتے ہیں :

قَالَ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ﴿٧١﴾

"لوط" نے (عاجز ہو کر) کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں"۔

حضرت لوط علیہ السلام ایک نبی تھے، وہ اپنی حقیقی بیٹیاں ان اوباشوں کے سامنے پیش نہ کر رہے تھے تاکہ وہ ان کے ساتھ بدکاری کریں بلکہ وہ ان کو قوم کی خواتین کی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ اللہ نے ان خواتین کو اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ فطری اور صحت مند راہ ہے۔ خود حضرت بھی جانتے تھے کہ ان کا مطالبہ یہ نہ تھا کہ آپ کی بیٹیوں کے ساتھ بدکاری کریں بلکہ انہوں نے تو فطری راہ کو چھوڑ کر بے راہ روی اپنائی ہوئی تھی۔

یہ منظر پیش نظر تھا، قوم لوط اپنی مریضانہ ذہنیت کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی، اشاروں کنایوں میں برے ارادوں کا اظہار ہو رہا تھا، ادھر حضرت لوط علیہ السلام مہمانوں کے دفاع میں لگے ہوئے تھے، وہ ان کی غیرت خوابیدہ کو

جگا رہے تھے۔ وہ ان کے ضمیر اور وجدان کو جگا رہے تھے اور ان میں فطرت سلیمہ کے رجحان کو تلاش کر رہے تھے جبکہ وہ اپنے سفلی ارادہ میں آگے ہی بڑھ رہے تھے۔

یہ منظر یوں ہی اسکرین پر تھا کہ اچانک خالص عربوں کے انداز میں لوطؑ اور قوم لوط کی اس کشمکش پر ایک تبصرہ آتا ہے اور خطاب قسم سے شروع ہوتا ہے :

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٧٢﴾

"تیری جان کی قسم اے نبیؐ' اس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے"۔ یہ تھی ان کی اصل تصویر اور اس حالت میں وہ ہمیشہ رہتے تھے' اس لیے حضرت لوط علیہ السلام کو سعی کے باوجود ان کے بارے میں یہ امید نہ تھی کہ وہ راہ راست پر آجائیں گے' نہ یہ امید تھی کہ ان میں شرافت اور غیرت کے جذبات جاگ اٹھیں گے یا وہ خدا سے ڈر کر راہ راست اور فطرت سلیمہ کی طرف لوٹ آئیں گے۔

اب ان کے خاتمے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے اور اللہ کا کلمہ سچ ہو رہا ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۱۵ : ۸) "اور ہم فرشتوں کو نہیں بھیجتے مگر حق کے ساتھ اور اس وقت پھر کسی کو مہلت نہیں دی جاتی"۔ اب ہمارے سامنے آخری منظر آتا ہے۔ یہ ہلاکت' تباہی اور زمین میں دھنس جانے کا منظر ہے۔ ایک ہمہ گیر تباہی ہے جو ہر طرف نظر آتی ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾

"آخر کار پو پھٹتے ہی ان کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی"۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں پر جو عذاب آیا وہ بظاہر شدید زلزلے اور آتش فشانی کے مشابہ ہے' جس میں گاؤں کے گاؤں دھنس جاتے ہیں' جس میں پتھروں کی بارش بھی ہوتی ہے اور جس میں خاک آلود پتھر بھی ہوتے ہیں اور ہمہ گیر تباہی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے بحیرۂ لوط اس ہمہ گیر حادثے کے بعد نمودار ہوا' اس وقت جب سدوم کی پوری کی پوری آبادی زمین میں دھنس گئی' اور اس جگہ اس قدر بڑا گڑھا نمودار ہوا کہ وہاں پانی جمع ہو کر بحیرہ بن گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی یہ بستیاں حجاز سے شام جاتے ہوئے شارع عام پر واقع تھیں اور ان کو دیکھ کر ہر عقل مند اور ذی بصیرت شخص عبرت حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ تمام آیات و نشانات صرف ان دلوں کے لیے مفید ہوتے ہیں جن میں صلاحیت ہو اور جو ہدایت کے لیے کھلے ہوں اور جن میں حقیقی ایمانی نظریات موجود ہوں۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُقِيمٍ ﴿٧٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾

"اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحب فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گزرگاہ عام پر واقع ہے۔ اس میں سامان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحب ایمان ہیں"۔

یہ تھی تصدیق ایک سچے ڈرانے والے کی' فرشتوں کا نزول دراصل اعلان نزول عذاب الٰہی تھا اور جب یہ عذاب آتا ہے تو پھر وہ ٹلتا نہیں اور نہ اس میں تاخیر ممکن ہوتی ہے اور نہ پھر مہلت عمل ملتی ہے۔

---- ()()() ----

یہی صورت حال اصحاب ایکہ کو پیش آئی جو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم دعوت تھے۔ (ایکہ کا مفہوم گھنے جنگلات والے' حضرت شعیبؑ اصحاب ایکہ اور قوم مدین کی طرف بھیجے گئے تھے) یہی حالات قوم صالح کے ساتھ پیش آئے جنہیں حجر والے بھی کہا جاتا ہے۔

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿٨٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾

۵ ۱۹ع ۵

"اور ایکہ والے ظالم تھے' تو دیکھ لو ہم نے بھی ان سے انتقام لیا اور ان دونوں قوموں کے اجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔ حجر کے لوگ بھی رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات ان کے پاس بھیجیں' اپنی نشانیاں ان کو دکھائیں' مگر وہ سب کو نظرانداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخرکار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے آلیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی"۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ حضرت شعیبؑ اور قوم شعیب اہل مدین اور اصحاب ایکہ کا قصہ مفصل بیان کیا ہے۔ یہاں ان کے واقعہ ظلم اور ان کی ہلاکت کی طرف صرف اشارہ مطلوب ہے۔ ثابت یہی کرنا ہے کہ جب عذاب الٰہی کا اعلان ہو جائے تو وہ آکر رہتا ہے' جیسا کہ اس سورہ کے آغاز میں اس اصول کا ذکر ہوا کہ جب کسی قوم کی سلت عمل ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس پر عذاب آنا سنت الٰہیہ کے مطابق لازم ہو جاتا ہے۔ مدین اور ایکہ دونوں بستیاں علاقہ لوط کے قریب تھیں اور یہ بات اس اشارہ سے معلوم ہوتی ہے۔

وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۵ : ۷۹) "ان دونوں قوموں کے علاقے کھلے راستے پر موجود ہیں"۔ ان دونوں قوموں سے مراد مدین اور ایکہ والے ہیں کیونکہ ان دونوں بستیوں کے کھنڈرات شارع عام پر موجود ہیں اور ابھی تک ان کے آثار قائم ہیں۔ ان دونوں سے مراد قریہ لوط اور قریہ شعیب بھی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ بھی شارع عام پر موجود ہیں۔ ہلاکت سے دوچار ہونے والی اقوام کا شارع عام پر ہونا زیادہ عبرت آموز ہوتا ہے کیونکہ انسان صبح و شام وہاں سے گزرتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ یہ بستیاں بھی اسی طرح زندہ تھیں جس طرح آج ان کا ماحول زندہ ہے۔ ان کھنڈرات کے اردگرد زندگی سے بھرپور آبادیاں ہیں اور وہ سوئی پڑی ہیں۔

اصحاب الحجر کون تھے؟ یہ حضرت صالحؑ کی قوم تھے۔ حجر بھی شام اور حجاز کے درمیان وادی القریٰ میں واقع ہے۔ یہ وادی اور اس کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں کیونکہ یہ بستیاں انہوں نے بڑی بڑی چٹانیں کاٹ کر بنائی تھیں جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر ترقی یافتہ تھے اور ان کے ہاں ٹیکنالوجی کس قدر ترقی کر چکی تھی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۵ : ۸۰) "حجر کے لوگ بھی اس سے قبل رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں"۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے صرف حضرت صالحؑ کی تکذیب کی تھی۔ لیکن صالح جماعت رسل کے نمائندہ تھے۔ لہٰذا ایک کی تکذیب سب کی تکذیب قرار پائی۔ جب انہوں نے ان کی تکذیب کی تو کہا گیا کہ انہوں نے تمام مرسلین کی تکذیب کی۔ کیونکہ رسول اور رسالت ایک ہی ادارہ ہیں۔ وہ ہر دور میں اور ہر زمانہ میں ایک ہی نظریہ پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود وہ ایک ہی تھے۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۱۵ : ۸۱) ہم نے اپنی آیات ان کے پاس بھیجیں، مگر وہ اعراض ہی کرتے رہے"۔ حضرت صالحؑ کی نشانی اور ان کا معجزہ تو ناقہ تھی لیکن نشانی کے بجائے نشانیاں اس لیے کہا گیا کہ ناقہ کے علاوہ اور نشانیاں بھی تو اس کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ خود انسان کی ذات میں بھی کئی نشانیاں ہیں۔ یہ سب نشانیاں ہمارے غور و فکر کو دعوت دے رہی ہیں، اگر انہوں نے حضرت صالحؑ کے ایک معجزے سے انکار کیا تو دراصل انہوں نے اس کائنات میں بکھرے ہوئے تمام معجزات کا انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی نشانیوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے اپنے ضمیر و شعور کے دروازے بند رکھے۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ (۸۲) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ

(۸۳) فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸٤) (۱۵ : ۸۲ تا ۸٤) "وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخر کار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے ہی آلیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی"۔ یہ لمحہ ان کے لیے اچانک آیا، یہ لوگ پہاڑ کے تراشے ہوئے مکانات کے اندر محفوظ بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے جو کچھ کمایا تھا، جو مضبوط عمارات تعمیر کی تھیں اور پہاڑوں کو کاٹ کر جس قدر مضبوط رہائش گاہیں بنائی تھیں ان میں سے کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور ان

بستیوں میں پھر کچھ بھی نہ تھا۔ یہ لمحہ انسانی شعور پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ پہاڑوں اور چٹانوں کو کاٹ کر جو لوگ اپنے لیے پناہ گاہیں بناتے ہیں ان سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر انسان رات گزار کر جب صبح میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت وہ بڑے اطمینان سے رات کو بلا خوف و خطر الوداع کہتا ہے' لیکن صبح کے ان اطمینان بخش لمحات میں ان کو ایک زبردست دھماکہ پیش آتا ہے اور وہ اپنی قیمتی جانوں کے ساتھ سب کچھ کھو دیتے ہیں' ان کی تمام احتیاطی تدابیر ختم ہو جاتی ہیں' ان کے محفوظ قلعے ریت کا ڈھیر ثابت ہوتے ہیں۔ اس کڑک دار دھماکے کے پیچھے کچھ چیز بچ کر نہیں نکلی۔ یہ تیز ہوا تھی' یا تیز دار تھی اور اس کے اثر سے یہ لوگ اپنے محفوظ ترین گھروں میں لاشوں کے ڈھیر بن گئے۔

یوں اس سورہ میں تاریخی قصص و واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے اور ان تمام قصص میں صرف یہ سبق دیا جاتا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے' اقوام کی بربادی کا وقت آ پہنچتا ہے تو پھر سنت الہیہ کے مطابق عذاب الہی آتا ہے اور فرشتے حق کے ساتھ نازل ہوتے ہیں اور پھر سنت الہیہ ایک لمحے کی مہلت نہیں دیتی۔ یہ سبق ان تمام قصص کا قدر مشترک ہے اور اس کی وجہ سے یہ سب واقعات آپس میں مربوط ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۱۸ ایک نظر میں

یہ ہیں وہ سنن الہیہ جن میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ یہ کائنات اللہ کے ان نوامیس اور سنن کے مطابق چلتی ہے۔ یہی قوانین و نوامیس کائنات اور زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جماعتوں اور تحریکات کو بھی یہی کنٹرول کرتے ہیں۔ ہدایت و ضلالت کے نتائج بھی ان نوامیس الہیہ کے مطابق بر آمد ہوتے ہیں۔ اقوام کا انجام اور آخرت کا حساب و کتاب بھی انہی نوامیس فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس سورہ کا ہر سبق انہی نوامیس فطرت اور سنت الہیہ کے مطابق اختتام پذیر ہوتا ہے اور مختلف اسالیب میں سنن الہیہ کو پیش کرتا ہے۔ یہ نوامیس فطرت اللہ کی تمام مخلوقات کے اندر پائے جاتے ہیں اور یہی حق ہیں اور فطرت کائنات اسی حق پر قائم ہے۔

چنانچہ اس سورہ کے خاتمے پر اس عظیم سچائی کو واضح کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ سچائی زمین و آسمان اور ان کے درمیان پائے جانے والے تمام موجودات کی فطرت میں عیاں ہے۔ یہ کہ قیامت برپا ہونے والی ہے۔ یہ اس کائنات کا فطری انجام ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے' اور یہ کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک تھی اور اس ناموس فطرت کے مطابق ہے۔ تمام رسولوں کے درمیان قدرت مشترک یہ ہے کہ وہ ایک ہی عظیم حق کے حامل ہیں جو روشن ہے۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ یہ سچائی تمام مخلوقات کے اندر موجود ہے' اور اللہ ہی اس سچائی کا خالق ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (۱۵:۸۶) "یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔ لہٰذا اس سچائی کو آگے بڑھنا چاہئے اور اس سچائی پر جو اسلامی دعوت برپا ہے اسے چاہئے کہ وہ آگے بڑھے۔ داعیان حق کسی کی پرواہ نہ کریں اور آگے بڑھیں۔ اور دعوت کے مخالفین اور مذاق اڑانے والوں کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵:۹۴) "آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اسے صاف صاف بتائیں اور مشرکین کو نظر انداز کر دیں"۔ اللہ کی سنت بھی اپنی راہ پر گامزن ہے' وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹی۔ سنت الہیہ کی پشت پر جو سچائی ہے اور یہ سچائی دعوت اسلامی' قیام قیامت اور تخلیق ارض سے وابستہ ہے۔ یہ سچائی ان تمام چیزوں سے متعلق ہے جو زمین و آسمان میں موجود ہیں اور جو خلاق علیم کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی اور تنبیہ ہے جس پر اس سورہ کا خاتمہ ہو رہا ہے اور یہ تنبیہ انسان کو اس عظیم سچائی کی طرف متوجہ کرتی ہے جس پر یہ وجود قائم ہے۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۱۱۸ تشریح آیات

۸۵ --- تا --- ۹۹

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۶﴾

''ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے' اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے' پس اے نبیؐ (ان لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے''۔

یہ تبصرہ کہ آسمان و زمین کی تخلیق ایک سچائی کے ساتھ ہوئی ہے ایک عظیم اور اہم تبصرہ ہے یعنی یہ کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو چیزیں بھی ہیں یہ سچائی کے ساتھ پیدا کر دہ ہیں۔ یہ انداز بیان بھی عجیب ہے کہ تمام موجودات حق کے سوا کسی اور ناموس پر پیدا نہیں کیے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اس فقرے کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۵:۸۵) ''ہم نے آسمان و زمین کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا''۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں سچائی کا گہرا دخل ہے۔ یہ سچائی کائنات کی گہرائیوں میں ہے۔ کائنات کی رفتار کے ضابطے میں سچائی موجود ہے۔ کائنات کا انجام اور خاتمہ بھی حق پر ہو گا۔

اس کائنات کے وجود میں سچائی ہے اور اس کی منصوبہ بندی اور اس کے نقشہ تخلیق میں سچائی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بطور کھیل تماشا پیدا نہیں کی گئی۔ نہ یہ کائنات اتفاقاً وجود میں آگئی ہے۔ اس کے اصل نقشے اور منصوبے میں نہ دھوکہ و فریب ہے' نہ کھوٹ ہے اور نہ یہ باطل مخلوق ہے۔ اس پر اگر بظاہر باطل چھایا ہوا نظر آتا بھی ہے تو وہ اوپرا ہوتا ہے' باطل اس کائنات کے حقیقی عناصر میں سے نہیں ہے۔

اس کائنات کی ساخت میں سچائی بہت گہری ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی وہ ہیں جو حق کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اس میں نہ وہم ہے' نہ فریب ہے۔ وہ قوانین جو عناصر کائنات کو جوڑے رکھتے ہیں' وہ سچائی پر مبنی ہیں اور ان قوانین میں کبھی بھی تخلف نہیں ہوتا۔ نہ ان میں تبدیلی آتی ہے اور نہ ان میں اضطراب ہوتا ہے۔ نہ ان میں کوئی التباس اور افراتفری ہوتی ہے۔

اس کائنات کی تدبیر اور کنٹرول نہایت ہی گہرے ضوابط پر ہے۔ اور اسے سچائی کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ اس کائنات کے چلانے کے لیے جو نوامیس و ضوابط وضع کیے گئے ہیں وہ صحیح اور عادلانہ ہیں۔ وہ کسی مخصوص خواہش یا کسی مخصوص میلان کے نتیجے میں وضع نہیں ہوئے' صرف عدل اور سچائی پر یہ نوامیس وضع ہوئے ہیں۔

اس کائنات کے انجام میں بھی حق گہرائی تک رچا بسا ہے۔۔ نہایت ہی محکم قوانین کے مطابق اس کائنات کے تمام نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان اشیاء کے اندر جو تغیر و تبدل بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ سچائی کے ساتھ ہوتا ہے اور سچائی کے لیے ہوتا ہے۔ اس کائنات میں جزاء و سزا کا ہر واقعہ اور ہر اصول سنت الہیہ کے مطابق ہے اور کوئی واقعہ سنت الہیہ کے برخلاف وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت جو یقیناً وقوع پذیر ہونے والی ہے' وہ اسی سچائی کا نتیجہ ہے' کیونکہ کائنات کی تخلیق حق کے ساتھ ہوئی ہے' لہذا قیامت نے ایک دن واقعہ ہونا ہے' یہ ٹل نہیں سکتی۔ کیونکہ جس ناموس کے مطابق یہ کائنات قائم و دائم ہے اور رواں دواں ہے' اسی حق کا تقاضا ہے کہ ایک دن قیامت آئے۔ یہ بذات خود حق ہے۔ جب قیامت حق ہے تو اس کا وقوع بھی حق ہے۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵ : ۸۵) "لہذا ان لوگوں کی بیہودگیوں پر شریفانہ درگذر سے کام لیں"۔ اور اپنے دل کو تنگ نہ کریں' اور کسی کے ساتھ بغض و عداوت نہ رکھیں کیونکہ سچائی بہرحال سچ ہو کر رہنے والی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ (۱۵ : ۸۶) "بے شک تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔ وہ پیدا کرنے والا ہے' وہ جانتا ہے کہ اس نے کیا پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ چونکہ اس نے سب کچھ پیدا کیا ہے لہذا ہر چیز کی ماہیت میں حق ودیعت شدہ ہے۔ لہذا جس طرح سچائی سے اس جہان کا آغاز ہوا اسی طرح سچائی پر اس کا اختتام ہو گا۔ کیونکہ سچائی اس کائنات کی اصل ماہیت ہے اور سچائی کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے' کھوٹ ہے' ختم ہونے والی ہے اور زندہ و تابندہ اور دائماً اس سچائی نے رہنا ہے جو قلب کائنات کے اندر ودیعت شدہ ہے۔

رسول جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ بھی اس کائناتی سچائی ہی کا ایک حصہ ہے' اور اس کا ظہور بشکل قرآن ہے' جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝

"ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں' اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے"۔ یہ سبع مثانی کیا ہیں؟ راجح بات یہ ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ جیسا کہ روایات میں بھی وارد ہے' مثانی اس لیے کہا گیا کہ نماز میں ان کو بار بار دہرایا جاتا ہے یا ان کو مثانی اس لیے کہا گیا کہ ان میں اللہ کی ثنا بیان ہوتی ہے جبکہ قرآن عظیم سے مراد بقیہ قرآن ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں قرآن عظیم کو آیات تخلیق کائنات اور آیات وقوع قیامت کے ساتھ ایک

ہی لڑی میں پرویا گیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تخلیق کائنات 'قیام قیامت اور نزول قرآن اسی ایک سچائی کی کڑیاں ہیں جو اس پوری کائنات کی روح ہے۔ اس طرح قرآن کریم دلوں کو اس عظیم سچائی اور نوامیس قدرت کو سمجھنے کے لیے مائل کرتا ہے جو اس کائنات میں پوشیدہ ہیں۔ نفس انسانی اور آفاق میں موجود ہیں۔ انہی کے مطابق لوگوں کو ہدایت و ضلالت نصیب ہوتی ہے۔ حق و باطل کا انجام 'خیر و شر کی اقدار' صلاح و فساد کا تعین اسی ناموس حق کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم اس حقیقی سچائی کی دفعات اور اصولوں پر مشتمل ہے اور قرآن ہی کے ذریعے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ جس سچائی پر کائنات قائم ہے وہ کیا ہے؟ گویا جس سچائی پر اس کائنات کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ قرآن کریم ہے۔ اس سے نوامیس فطرت ثابت ہوتے ہیں 'اور یہ ان نوامیس فطرت کے ساتھ مربوط اور مرتب ہے۔ یہ قرآن کریم کوئی عارضی چیز نہیں ہے' نہ مٹنے والی حقیقت ہے۔ یہ حق ہے اور یہ ہمیشہ موثر رہے گا۔ یہ زندگی کی راہنمائی کرتا رہے گا۔ اگرچہ خندہ و استہزاء کرنے والے خندہ و استہزاء کرتے رہیں۔ اگرچہ باطل پرست باطل کے جھنڈے اٹھائیں کیونکہ باطل زائل ہونے والا ہے اور ایک دن مٹنے والا ہے۔

جن لوگوں کو سورہ فاتحہ دی گئی اور یہ قرآن عظیم دیا گیا' جو اس کائنات کی عظیم سچائی پر مشتمل ہے جس کا اس عظیم سچائی اور حق اکبر کے ساتھ گہرا تعلق ہے' ان کی نظریں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ وہ پھر اس دنیا میں باطل چیزوں اور زائل ہونے والی چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ نہ ان کو باطل پرستوں کے ہاؤ ہو سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو اہمیت ہی نہیں دیتے کہ وہ قلیل ہیں یا کثیر ہیں۔ ان کی تعداد کم ہے یا زیادہ ہے بہرحال ایسے لوگ اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں کیونکہ حق ان کے ساتھ ہوتا ہے لہذا ہر حال میں ان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَٱخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ إِنِّىٓ أَنَا ٱلنَّذِيرُ ٱلْمُبِينُ ﴿٨٩﴾

"تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ۔ انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو اور (نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ "میں تو صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں"۔

آنکھیں لمبی نہیں ہوتیں۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۱۵: ۸۸) "تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو۔ جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے"۔ درحقیقت نظریں پھیلتی اور لمبی ہوتی ہیں لیکن للچائی نظروں کی تعبیر ان الفاظ میں کی گئی کہ گویا آنکھیں نکل کر لمبی ہو گئی ہیں۔ تخیل کی یہ تعجب انگیز اور طرب آمیز تصویر کشی ہے۔ مفہوم یہی ہے کہ اے رسول' ان چیزوں کی طرف توجہ ہی نہ کرو' ان کو اہمیت ہی نہ دو' بعض مردوں اور عورتوں اور طبقوں کو جو یہ دولت دی گئی ہے اس کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔

ان چیزوں کو زیادہ اہتمام سے نہ دیکھو۔ ان کو خوبصورت نہ سمجھو' ان کو دیکھ کر تمہاری نظریں خیرہ نہ ہو جائیں اور تم

ان کی تمنائیں نہ کرنے لگو۔ یہ تو زائل ہونے والی چیزیں ہیں' یہ حق نہیں ہیں' باطل ہیں جبکہ اے پیغمبر' آپ تو عظیم سچائی' مثانی اور قرآن عظیم کے حامل ہیں۔

اس کا یہ مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دنیا میں محروم طبقات کو حالت محرومیت ہی میں چھوڑ دیا جائے' اور منعم اور عیش پرست لوگوں کو ان کے مال و منال میں غرق اور مست چھوڑ دیا جائے جبکہ اعلیٰ اقدار مٹ جائیں اور معاشی عدل ختم ہو جائے اور دنیا مستقلاً محرومین اور مترفین کے درمیان منقسم ہو جائے۔ اسلام جو سچائی پر قائم ہے اور جو یہ تعلیم دیتا ہے کہ حق اس کائنات کی روح ہے تو وہ کیسے اس قسم کی ظالمانہ اور غیر عادلانہ صورت حال کو جاری رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

یہاں اس کا ایک خاص مقامی مفہوم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کو رشد و ہدایت کی جو دولت دی گئی ہے وہ ان لوگوں کی زرق و برق زندگی اور دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ لہٰذا آپ ان سرمایہ داروں کو نظرانداز کر دیں اور مخلص مومنین کی طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ یہ اہل ایمان جو دنیاوی اعتبار سے اگرچہ غریب ہوں گے لیکن یہ اس سچائی کے حاملین ہیں جس کے اوپر اس کائنات کی تخلیق کی گئی ہے اور ان تمام چیزوں کی تخلیق کی گئی ہے جو اس کائنات کے درمیان ہیں۔ دنیا دار لوگ تو باطل کے پیروکار ہیں جو عارضی چیز ہے اور اس کا اس کائنات کی اصل حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ (١٥ : ٨٨) "اور ان کے حال پر اپنا دل نہ کڑھاؤ"۔ یہ فکر نہ کرو کہ ان لوگوں کا انجام نہایت ہی بھیانک ظاہر ہونے والا ہے۔ قیامت کے دن یہ برا انجام اس حق کا تقاضا ہے لہٰذا ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِينَ (١٥ : ٨٨) "اور ایمان لانے والوں کی طرف اپنے پر جھکاؤ"۔ یہاں نرمی' محبت اور شفقت کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ جس طرح پرندہ اپنے بچوں کے سامنے پر بچھاتا ہے۔ یہ نہایت ہی مصورانہ انداز تعبیر ہے اور اسے قرآن کریم بہت زیادہ استعمال کرتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا مخصوص فنی انداز ہے۔

وَقُلۡ إِنِّيٓ أَنَا ٱلنَّذِيرُ ٱلۡمُبِينُ (١٥ : ٨٩) "اور کہہ دو کہ میں تو صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں"۔ دعوت کا موثر اور حقیقی طریقہ ہی یہ ہے کہ بات واضح طور پر کہو' یہاں موقعہ و محل چونکہ مکذبین اور مذاق کرنے والوں کا تھا۔ یہاں صرف ڈراوے کا ذکر کیا گیا ہے۔ بشارت کو ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ خطاب ان لوگوں سے تھا جو دنیا پرست ہیں اور اس سچائی پر غور و فکر نہیں کرتے جو تخلیق کائنات کی بنیاد ہے جس کے اوپر قرآن آیا ہے اور جس کے مطابق قیامت برپا ہوگی۔

تخلیق کائنات کی عظیم سچائی اور فاتحہ اور قرآن عظیم کے ذکر کے موقعہ پر یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ رسولان سابق کے بعض متبعین قرآن کریم پر غور نہیں کرتے۔ اس کی بعض باتوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی جو باتیں ان کی کتابوں سے موافق ہیں ان کو تسلیم کرتے ہیں اور جو باتیں زیادہ ہیں ان کو نہیں مانتے حالانکہ قرآن کریم اللہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے اور اس میں وہ تمام سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں جن پر کتاب سابقہ مشتمل تھیں۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿٩١﴾ فَوَ رَبِّكَ لَنَسْــَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

"یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے ان تفرقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی جنھوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

یعنی ہم نے آپ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم دیا ہے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جسے ہم نے ان تفرقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی۔ آپ اکیلے نبی نہ تھے جس کو کتاب دی گئی دوسرے انبیاء کو بھی دی گئی اور ان تمام کتابوں کی اصل الکتاب ہے۔ یہ واحد ہے اس کا مرجع ایک ہے کیونکہ سب کتب اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لیے جن لوگوں پر اس سے قبل کتاب نازل ہو چکی ہے، ان کا تو حق نہیں ہے کہ وہ کسی کتاب کا انکار کریں کیونکہ کتاب نازل کرنے والا خالق حقیقی بہت ہی اچھی طرح جانتا ہے کہ کس دور میں لوگوں کو کس ضابطے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ جنھوں نے قرآن کریم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور اس کو تقسیم کر لیا ہے، ایک حصے کو تو قبول کرتے ہیں اور دوسرے حصے کو رد کر دیتے ہیں۔ (عضین جمع عضی ہے یعنی جزء۔ عضي الشاة يعني فصل بين اعضائها ان لوگوں نے اس رویہ کی مخالفت کی جو ان سے اہل کتاب ہونے کے حوالے سے متوقع تھا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (٩٢) عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٩٣) (١٥:٩٢ - ٩٣) "تو قسم ہے تیرے رب کی ہم ضرور ان سے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔ اور پوچھنے کا مقصد معلوم ہے یعنی سزا۔ جب بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو حضور اکرم ﷺ کو براہ راست خطاب کیا جاتا ہے کہ آپ اپنی راہ پر گامزن رہیں۔ جو حکم اللہ نے آپ کو دیا ہے اسے ببانگ دہل کہہ دیں۔ یہاں اس کے لیے صدع کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی چیرنے کے ہیں یعنی پوری قوت سے بات کریں۔ لوگوں کا شرک کرنا اور اس پر اصرار کرنا آپ کو اپنی جدوجہد سے نہ روک دے۔ کیونکہ مشرکین اور دشمنان اسلام اپنے انجام سے جلد ہی دوچار ہو جائیں گے۔ اسی طرح آج جو لوگ تحریک اسلامی سے استہزاء کرتے ہیں وہ بھی اپنے انجام تک پہنچ جائیں گے۔ ان کے مذاق کو دعوت اسلامی کی رفتار پر اثر انداز ہونے نہ دیں۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾

"پس اے نبی ﷺ، جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ

کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اور رسول اللہ ﷺ بہرحال انسان اور بشر تھے 'وہ جب دیکھتے کہ لوگ کفر و شرک پر اصرار کرتے ہیں' الٹا داعیان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں' تو آپ کو سخت غصہ آتا تھا اور آپ نہایت ہی دل تنگ اور پریشان ہوتے تھے۔ اس پر آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی تعریف و تسبیح کرتے رہیں۔ اللہ کی بندگی کرتے رہیں اور تسبیح و تہلیل اور عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول رہیں۔ لوگوں کی جانب سے جو ہنسی مذاق ہوتا اسے برداشت کریں اور پوری زندگی میں اللہ کو یاد کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ آپ کو حق الیقین آ جائے یعنی موت آ جائے اور آپ رب تعالیٰ کے جوار رحمت میں پہنچ جائیں۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

۶ ع ۲۰ ۶

"ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' اس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ' اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو' جس کا آنا یقینی ہے"۔

یہ ہے اس سورہ کا خاتمہ یعنی کافروں کو نظر انداز کرنا اور رب تعالیٰ کی طرف واپس ہونا اور یہ کہ جلد ہی ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ کافر خواہش رکھیں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے؟

--- ○ ---

فی ظلال القرآن

پارہ ------- ۱۴

سورۃ النحل ۔ ۱۶

۱--- تا--- ۱۲۸

درس نمبر ۱۱۹ ایک نظر میں

یہ سورہ نہایت ہی دھیمے انداز کی ہے ۔ اس کا زمزمہ معمول کے مطابق ہے' لیکن اس کے موضوعات مختلف اور بھرپور ہیں ۔ اس کا دائرہ کلام وسیع ہے اور اس کے اندر مختلف قطعات اور زاویئے ہیں جن سے بات کی گئی ہے اور نہایت ہی موثر انداز میں کی گئی ہے ۔ اس میں جو رنگا رنگ سائے ہیں ان کے خطوط نہایت ہی گہرے اور دیرپا ہیں ۔

تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا مرکزی مضمون بھی اسلام کا مرکزی عقیدہ ' عقیدۂ توحید ہے ۔ یعنی اللہ کی الوہیت اور اللہ کی حاکمیت ' وحی الٰہی ' بعث بعد الموت کا عقیدہ ۔ لیکن اس میں بعض دیگر موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں جو ان موضوعات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ۔ اس سورہ میں عقیدۂ توحید پر مفصل بحث کی گئی ہے ۔ ایک تو یہ اسلام کے اہم موضوعات میں سے ہے اور دوسرے یہ کہ دین محمدی اور دین ابراہیم علیہ السلام کے درمیان مسئلہ توحید کی وجہ سے ایک خاص نسبت بھی پائی جاتی ہے ۔ ایمان 'کفر اور ہدایت و ضلالت کے بارے میں اللہ کے ارادے اور انسانی ارادے کے دائرہ کار سے بھی اس سورہ میں بحث کی گئی ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسولوں کے فرائض کیا ہیں اور جو لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں ' ان کے بارے میں اللہ کی سنت کیا ہے ؟ نیز اس سورہ میں حلال و حرام کے بعض قواعد بھی بتائے گئے ہیں اور بت پرستوں نے اس میدان میں جن اوہام و خرافات کو سینے سے لگا رکھا تھا اس پر بھی بحث کی گئی ہے ۔ پھر ہجرت فی سبیل اللہ اور دیار کفر میں مسلمانوں پر تشدد اور مظالم کا بھی ذکر ہے ۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا کس قدر جرم ہے ۔ عقائد و نظریات کے مسائل سے آگے بڑھ کر معاملات پر بھی اس میں بحث موجود ہے ۔ عدل ' احسان ' انفاق فی سبیل اللہ ' وفائے عہد وغیرہ اسلامی اعمال اور اخلاقی رویوں کا بھی ذکر ہے جو اسلامی نظریہ حیات کے منطقی تقاضے ہیں ۔ وہ میدان اور دائرۂ کار جس میں یہ موضوعات چلتے ہیں وہ بہت وسیع ہے یعنی زمین اور آسمان ' آسمانوں سے پانی کا آنا اور زمین میں روئیدگی کا نمودار ہونا ' رات اور دن ' سورج اور چاند ' سمندر اور پہاڑ ' زمین اور اس کے نشانات راہ اور راستے ' نہریں اور دریا وغیرہ مختلف النوع موضوعات ہیں جو اس سورہ کا حصہ ہیں ۔ پھر دنیا ' اس میں ہونے والے واقعات اور ان کے نتائج ' آخرت اور اس کی قدریں اور مشاہد قیامت ' عالم غیب کے واقعات اور نفس انسانی اور اس کے میلانات اور انسان کے اردگرد پھیلے ہوئے آفاق ۔

موضوعات کے اس طویل و عریض میدان میں آغاز کلام ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ گویا یہ ایک عظیم مہم ہے جس میں انسانی ضمیر اور انسانی عقل کو متاثر کر کے اسے ہدایت قبول کرنے کی سعی کی گئی ۔ انسان کو راہ ہدایت پر آنے کا جوش دلایا گیا ہے ۔ یہ مہم نہایت ہی دھیمے انداز میں شروع کی گئی ہے لیکن اس کا مضراب عقل و خرد کے مختلف تاروں کو چھیڑتا ہے ۔ نہایت ہی دھیمے ٹون میں ' آواز میں گھن گرج نہیں ' لیکن یہ دھیما ٹون ہمہ گیر ہے اور انسانی شخصیت کے تمام تاروں کو چھیڑتا ہے ۔ یہ مضراب عقل کے تاروں کو بھی چھیڑتا ہے اور انسان کے حساس وجدان کو بھی جگاتا ہے ۔ آنکھوں کو

بھی کھولا جاتا ہے کہ دیکھو کانوں کو چھیڑا جاتا ہے کہ سنو' انسانی شعور کو چھوا جاتا ہے کہ احساس کرو' انسانی وجدان کو خوراک دی جاتی ہے۔ عقل کو تدبر کی دعوت دی جاتی ہے کہ یہ کائنات تو علامات و نشانات سے بھری پڑی ہے۔ ذرا آسمان و زمین کو دیکھو' ذرا شمس و قمر پر غور کرو' ذرا رات اور دن کے نظام اور حرکت اجرام فلکی پر غور کرو' ذرا پہاڑوں اور دریاؤں پر غور کرو' ذرا اوروں اور نالوں کو دیکھو' ذرا درختوں اور ان کی چھاؤں پر غور کرو' نباتات اور پھلوں کو دیکھو' حیوانات اور پرندوں کو دیکھو' اور پھر ذرا آخرت اور اس کے مناظر اور خصوصاً اس کے ان مناظر کو دیکھو جو نظروں سے غائب ہیں۔ یہ تمام مضراب ہیں جو انسان کے حواس' عقل' اعضاء اور قلب و نظر کو متاثر کر سکتے ہیں اور ان کو تازہ زمزمہ دے سکتے ہیں۔ غرض یہ بتایا جاتا ہے کہ ان تمام علامات و نشانات کے ہوتے ہوئے' اگر کسی کے رباب حیات کے تار زمزمہ پیدا نہیں کر سکتے تو سمجھ لیا جائے کہ اس کی عقل کے دروازے بند ہیں' اس کا دل مردہ ہو گیا ہے اور اس حس و شعور کے قویٰ ناکارہ ہو چکے ہیں۔ یہ زمزمہ انسان کو ان نشانات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو اللہ نے اس کائنات کے اندر بکھیر دیئے ہیں اور جن کے ذریعے اللہ نے انسانوں پر بے شمار احسانات فرمائے۔ ان میں مشاہد قیامت بھی ہیں اور ان میں اللہ کے سامنے پیشی کے مناظر اور مکذبین کی ہلاکت کے سین بھی ہیں۔ ان میں بعض وجدانی نج ایسے ہیں جو انسانی نفسیات کے اسرار و رموز کو اجاگر کرتے ہیں اور خود حضرت انسان کے تناسل اور تخلیق کے مناظر بھی ہیں۔ انسان ایک وقت ماں کے پیٹ میں جنین ہوتا ہے' پھر یہ جوان ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر ضعیف و ناتواں ہوتا ہے۔ اس پر اعلیٰ قوت اور اعلیٰ درجے کے ضعف کے حالات بھی آتے ہیں' کبھی وہ ناز و نعم میں پلتا ہے اور کبھی اس پر فاقے بھی آتے ہیں۔ یوں یہ سورہ ایک نمائش گاہ ہے جس میں مناظر اور مکالمے' قصے اور دلائل بطور اشیائے نمائش پیش کیے جاتے ہیں۔

لیکن اس پوری سورہ کو جو سائے نہایت ہی خوبصورت رنگ دیتے ہیں وہ دلائل کونیہ ہیں جن سے اس تخلیق کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ پھر وہ انسان کے لیے جس قدر مفید ہیں' ان سے انسان پر اللہ کے عظیم انعامات و احسانات ثابت ہوتے ہیں اور پھر ان میں جس قدر حکمت اور ٹیکنالوجی ہے اس سے علیم و حکیم کا تدبر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب امور ایک ساتھ چلتے ہیں۔ یہ عظیم کائنات' اپنی عظمت اور نشان قدرت ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے نعمت بھی ہے۔ یہ کائنات نہ صرف یہ کہ انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرتی ہے بلکہ یہ انسان کے ذوق جمال کے لیے سرو سامان بھی فراہم کرتی ہے۔ انسان کی تمام ضروریات اس کے اندر موجود ہیں۔ اس میں انسان کے لیے زیب و زینت کے سامان ہیں۔ انسان کی جسمانی سہولیات کی وافر مقدار' انسان کے لیے روحانی سکون کا سامان بھی۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ انسان اللہ کا شکر ادا کرے۔

چنانچہ اس سورہ کے صحراؤں میں اللہ کے انعامات و احسانات اور اس کے شکر کی گھنی چھاؤں موجود ہے' اس کے اندر انسان کی ہدایت کے لیے وسیع اشارات موجود ہیں اور سورہ کے تمام اسباق کے آخر میں ان سے نتائج اخذ کر کے انسان کی ہدایت کا سرو سامان کیا گیا ہے۔ امثال کے ذریعے بھی مدعا کو ثابت کیا گیا ہے۔ ہر موضوع کے لیے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اعلیٰ نمونہ حضرت ابراہیم کی زندگی کا نمونہ ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (١٦ : ١٢١) "اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اسے منتخب کر لیا' اور اسے سیدھا راستہ دکھایا"۔ یہ تمام مضامین نہایت ہی مرتب انداز میں بیان

ہوئے ہیں ۔ تصویر کشی اور تصاویر کے سایوں میں ' مباحث اور ان کے اثرات میں ' مسائل و موضوعات میں ' مکمل ہم آہنگی ہے ۔ ان شاء اللہ ہم تشریح آیات کے ضمن میں بعض نکات کی مزید تشریح کریں گے ۔

پہلا سبق موضوع توحید کے بارے میں ہے اور اس کے اوپر جو دلائل دیئے گئے ہیں وہ اس کائنات کے تکوینی دلائل ہیں ۔ پھر کائنات کے اندر انسان کے لیے فائدہ اور ضرورت کے لیے جو انعامات رکھے گئے ہیں ان کی طرف اشارے ہیں اور پھر اللہ کی وسعت علم کو سمجھایا گیا ہے جو ظاہر اور مفید اور دنیا و آخرت سب کو جانتا ہے ۔ مناسب ہے کہ اس سبق کا آغاز تشریح آیات ہی سے کر دیا جائے ۔

--- ooo---

رس نمبر ۱۱۹ تشریح آیات

۱--- تا --- ۲۱

سُورَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ آیاتها ۱۲۸ رکوعاتها ۱۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲

”آگیا اللہ کا فیصلہ ' اب اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) ”آگاہ کرو ' میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے ' لہذا تم مجھ سے ڈرو“۔

مشرکین مکہ اس معاملے میں جلدی کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اقوام سابقہ کی ہلاکت کی بات کرتے ہیں 'ہم پر بھی دنیا یا آخرت کا عذاب لے آئیں۔ مکہ میں آپ کی زندگی گزر رہی تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ اپنے اس مطالبے پر زیادہ زور دیتے۔ بلکہ مذاق کرنے لگتے اور خندہ و استہزاء میں بہت ہی آگے بڑھ جاتے۔ وہ اس تاثر کا اظہار کرتے کہ حضرت محمدؐ انہیں خواہ مخواہ ڈراتے ہیں ' جو ڈراوے وہ دیتے ہیں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لیے وہ محض اوہام پر ایمان نہیں لا سکتے ہیں ' نہ ایسی چیز کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتے ہیں جن کا وجود ہی نہ ہو۔ اللہ ان کو جو مہلت دے رہا تھا اور مواقع فراہم کر رہا تھا اس میں گہری حکمت اور رحمت تھی اور وہ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ مزید یہ کہ قرآن کریم جو آیات کونیہ پیش کر رہا تھا اور خود قرآن جو عقلی دلائل پیش کر رہا تھا وہ اس پر غور و فکر نہ کرتے تھے ' حالانکہ یہ دلائل قلب و نظر پر جو اثرات چھوڑتے تھے ' وہ تخویف بذریعہ عذاب سے زیادہ کارگر ہو سکتے تھے۔ انسان کو اللہ نے عقل و خرد سے نوازا ہے ' اس کے شایان شان تو یہ ہے کہ وہ ان دلائل پر غور کرے ' محض ڈراوے سے تسلیم کرنا تو ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل و خرد کے پہلو سے کمزور ہوں۔ ڈراوے سے حریت ارادہ پر بھی زد پڑتی ہے۔

ایسے حالات میں فرمایا:

اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ (۱۶ : ۱) "اللہ کا فیصلہ آ گیا"۔ یعنی اللہ فیصلہ کر چکے ہیں، ان کا ارادہ متوجہ ہو گیا ہے جو وقت صدور اللہ نے مقرر کیا ہے اس میں ان اوامر و احکام اور فیصلوں کا صدور ہو جائے گا۔ لہٰذا

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ (۱۶ : ۱) "جلدی نہ مچاؤ"۔ اللہ کے فیصلے اس کی مشیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ تمہاری طرف سے شتابی کرنا اللہ کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ تمہاری طرف سے درازی مہلت کی امید بھی ان کو موخر نہیں کر سکتیں۔ عذاب آتا ہے یا قیامت برپا ہوتی ہے، اس کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس فیصلے کا وقوع اور نفاذ اپنے مقررہ وقت پر بہرحال ہو گا۔ اس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔

ایک شخص اپنی حالت پر جس قدر جمے رہنے کی کوشش بھی کرے یہ فیصلہ کن انداز گفتگو اسے بہرحال متاثر کرتا ہے، چاہے وہ انکبار کی وجہ سے اپنے تاثر کو ظاہر نہ کرے۔ جس قدر انداز فیصلہ کن ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی اٹل ہے کہ اللہ کا حکم جب آتا ہے تو وہ اٹل ہوتا ہے۔ بس صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اللہ کا ارادہ کسی امر سے متعلق ہو جائے بس وہ امر واقع ہو جاتا ہے۔ چشم زدن میں وہ وجود میں آ جاتا ہے۔ لہٰذا یہ زوردار انداز کلام کسی شاعرانہ مبالغہ آرائی پر بھی مبنی نہیں ہے۔ جس طرح انداز کلام شعور کو متاثر کرتا اسی طرح اللہ کے فیصلے واقعی صورت حالات میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔

رہے مشرکین مکہ کے اعمال شرکیہ اور عقائد شرکیہ اور ان کے وہ تمام تصورات جو اعمال شرکیہ اور عقائد شرکیہ پر مبنی ہیں تو اللہ کی ذات ان سے پاک ہے۔

سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۶ : ۱) "پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے تمام ان شرکوں سے جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ یاد رہے کہ شرک میں کوئی انسان تب ہی مبتلا ہوتا ہے جب وہ فکری اعتبار سے گراپڑا ہو اور اس کے تصورات کسی دلیل پر مبنی نہ ہوں۔

اللہ کے احکام و اوامر آ گئے، جو شرک سے پاک ہیں اور امر دینے والے باری تعالیٰ بھی شرک سے پاک ہیں اور اہل مکہ اللہ تعالیٰ کو جو مقام دیتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے گمراہانہ خیالات میں ڈوبا ہوا نہیں چھوڑتے۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے فرشتے بھیجتے ہیں اور یہ فرشتے ایسے پیغام کے حامل ہوتے ہیں جو انسانوں کی حیات نو اور نجات اخروی کے پروگرام پر مشتمل ہوتا ہے۔

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖٓ (۱۶ : ۲) "وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے" اور یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ آسمانوں سے فقط بارش ہی نہیں برساتا جو ان کے جسم کے لیے ساز و سامان فراہم کرتی ہے بلکہ وہ ملائکہ کو انسان کی روحانی غذا دے کر بھی بھیجتا ہے۔ قرآن کریم اور اسلام کو روح کہنا نہایت ہی معنی خیز ہے۔ پیغام قرآن ایک سوسائٹی کو اسی طرح

زندہ کرتا ہے جس طرح ایک انسان کے جسم میں روح ڈال کر زندہ کیا جاتا ہے۔اس پیغام سے نفس و ضمیر زندہ ہوتا ہے۔ عقل و شعور کو جلا ملتی ہے اور سوسائٹی اس طرح زندہ اور صحت مند ہوتی ہے کہ اس سے ہر قسم کے فساد ختم ہو جاتے ہیں۔ لہذا آسمانوں سے انسانی زندگی کے لیے جو برکات و انعامات نازل ہوتے ہیں' یہ ان میں سے اعلیٰ و افضل ہے۔یہ نعمت عظمیٰ وہ مخلوق لے کر آتی ہے جو پاک طینت ہے۔جو اللہ کے بندوں میں سے برگزیدہ افراد پر نازل ہوتی ہے' جو افضل العباد ہوتے ہیں اور اس روح کائنات کا خلاصہ کیا ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۱۶ : ۲) "میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے لہذا تم مجھ ہی سے ڈرو"۔

اللہ وحدہ لاشریک حاکم و معبود ہیں۔یہ تمام عقیدہ عقائد کی روح ہے' یہ نفس انسانی کی زندگی ہے' یہ وہ تصور ہے جس سے سوسائٹی زندہ و توانا ہوتی ہے اور اس کے سوا جو تصورات ہیں انسانی سوسائٹی کے لیے مہلک اور تباہ کن ہیں۔جو شخص اللہ وحدہ کی ذات پر ایمان نہیں رکھتا وہ حیران و پریشان' تباہ و برباد ہوتا ہے۔اسے ہر طرف سے ایک باطل عقیدہ اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا ہے' اوہام پر مبنی باہم متناقض تصورات ہر طرف سے دامن گیر ہوتے ہیں اور اس کا نفس ہر وقت وساوس' ان جانے خوف اور وہم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور وہ کبھی بھی کسی ایک سمت میں کسی متعین ہدف کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔افکار پریشان اور اعمال بے ترتیب کے اندر گھرا ہوتا ہے۔

اسلام کی تعبیر روح سے کرنا دراصل ان تمام مفہومات کا اظہار ہے اور سورہ کے آغاز میں جہاں اللہ تعالیٰ اپنے تمام انعامات کا ذکر فرماتے ہیں' اسلام کو روح حیات قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات دراصل وہ نعمت عظمیٰ ہے' جس کے بغیر انسان اللہ کی دوسری نعمتوں سے بھی کماحقہ مستفید نہیں ہو سکتا۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ نعمت کسی کو نہ دی گئی ہو تو اس کے لیے دوسرے انعامات بھی اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں کیونکہ یہ نعمت ہی دراصل انسان کو حیات جاوداں بخشتی ہے۔

اس آیت میں ڈراوے اور انذار کو وحی و رسالت کا اصل مشن قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ اس سورہ کے پورے مضامین مکذبین' مشرکین اور اللہ کی نعمتوں کے منکر اور ناشکرے طبقات کے گرد گھومتے ہیں۔نیز اس میں ان لوگوں پر بھی تنقید کی گئی ہے جو حلال کو حرام قرار دیتے ہیں جو بہت بڑا جرم ہے اور شرک ہے' نیز اللہ کے ساتھ عہد کر کے توڑنے والوں پر بھی اس سورہ میں تنقید ہے' نیز جہاں ان لوگوں سے بھی بحث کی گئی ہے جو اسلام کو قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جاتے ہیں۔لہذا آغاز سورہ میں یہ کہنا کہ لوگوں کو ان گناؤنے جرائم سے ڈراؤ' ایک مناسب آغاز کلام ہے کہ لوگو احتیاط کرو' اللہ سے ڈرو' اور آخرت کا خوف کرو۔

---000---

اس تمہید کے بعد لوگوں کے سامنے وہ دلائل و شواہد پیش کئے جاتے ہیں جو اس پوری کائنات میں بکھرے پڑے ہیں' جو توحید باری تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔پھر اللہ کے بعض انعامات کا ذکر ہے جو منعم حقیقی کے احسان پر دلالت کرتے ہیں۔ ان نشانات و انعامات کا ذکر بکثرت اور فوج در فوج ہے۔آغاز تخلیق ارض و سما اور تخلیق حضرت انسان سے ہوتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿۴﴾

"اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے' وہ بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا"۔

وہی بات کہ تخلیق کائنات حق پر ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۱۶ : ۳) "اس نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا ہے"۔ گویا اس کی تخلیق کا بنیادی عنصر حق ہے۔ اس کائنات کو حق کے مطابق چلایا جا رہا ہے اور اس کائنات کو چلانے اور اس کے اندر موجود تمام مخلوقات کو چلانے کا بنیودی عنصر اور بنیادی قوت حق اور سچائی ہے۔ اس کائنات کی کوئی چیز عبث' اتفاقی اور بے مقصد نہیں ہے۔ یہ چیز سچائی پر قائم ہے۔ سچائی کے ساتھ وابستہ ہے' وہ سچائی کی طرف بڑھتی ہے اور اس کا انجام بھی سچائی کے مطابق ہو گا۔

تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۱۶ : ۳) "وہ بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں"۔ اللہ لوگوں کے شرک سے بہت بلند اور دور ہے' اللہ جو خالق سماوات والارض ہے' اس کے ساتھ خود اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں کو شریک کرنے کی تک کیا ہے؟ لہٰذا اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کے شریک ہونے کے لائق ہی نہیں ہے' لہٰذا وہ واحد خالق لاشریک ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۱۶ : ۴) "اس نے انسان کو ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے وہ صریحاً جھگڑالو ہستی بن گیا"۔ اس کے آغاز کو دیکھو اور اس کی تکمیل کے بعد اس کے نخروں کو دیکھو کس قدر عظیم فرق ہے۔ اس حقیر اور سادہ بوند کو دیکھو اور پھر ایک مکمل جھگڑالو اور خالق کے مقابل میں آنے والے اس حضرت کو دیکھو کہ وہ خود خالق کے ساتھ مجادلہ کرتا ہے' خالق کے وجود تک کا منکر ہو جاتا ہے یا اس کی وحدانیت کا انکار کر کے اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے۔ اس کی حالت نطفہ اور حالت جدال کے درمیان زمان و مکان کا کوئی بہت بڑا فاصلہ بھی نہیں ہوتا۔ قرآن بھی ایسا انداز تعبیر اختیار کرتا ہے کہ یہ فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان کے آغاز و انجام میں یہ فرق جس قدر عظیم اور واضح ہے اسی طرح اچانک ہے۔ چنانچہ ایک ہی لمحے میں انسان کے سامنے دو مختلف مناظر آ جاتے ہیں۔ ایک وہ منظر کہ انسان ایک حقیر بوند ہے اور دوسرا وہ منظر کہ وہ کامل ہو کر نازنخرے کرتا ہے اور خود خالق کے بالمقابل آکھڑا ہوتا ہے۔ تصویر کشی کا یہ اعجاز بھی ہے اور ایجاز بھی یعنی مختصر ترین الفاظ میں معجزانہ طرز ادا۔

اب ذرا منظر کائنات پر غور کریں' یہ ایک وسیع منظر ہے۔ زمین و آسمان کا وسیع دائرہ جس میں حضرت انسان کھڑا ہے۔ اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ اس میں بحث کا آغاز ان جانوروں سے کیا جاتا ہے جو واضح طور پر خادم انسان ہیں۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"اس نے جانور پیدا کیے ہیں جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی' اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ ان میں تمہارے لیے جمال ہے جب کہ صبح تم انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جب کہ شام انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں (تمہارے فائدے کے لیے) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے"۔

جس معاشرے میں قرآن مجید نازل ہوا' مثلاً سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں' اور اس قسم کے تمام معاشرے جو آج بھی موجود ہیں' خصوصاً وہ سوسائٹیاں جن کی معیشت زراعت پر مبنی ہے۔ ایسے معاشروں میں انسان کی زندگی کا تصور بھی ان جانوروں کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ جزیرۃ العرب میں متعارف جانور یہی تھے' اونٹ' گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں کھانے پینے کے لیے اور گھوڑے اور خچر اور گدھے سواریوں اور زینت کے لیے۔ گھوڑوں کے بارے میں فقہی اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اس کا کھانا حرام سمجھتے ہیں کہ بعض احادیث میں اس سے منع کیا گیا ہے نیز قرآن نے اسے رکوب کے لیے بتایا ہے جبکہ دوسرے ائمہ جائز سمجھتے ہیں کیونکہ صحیح احادیث میں گھوڑوں کا گوشت کھانا جائز بتایا گیا ہے۔

قرآن کریم نے یہاں ان جانوروں کو بطور نعمت پیش کیا ہے' اس لیے کہ ان میں بعض کے ساتھ انسان کی مادی ضروریات وابستہ ہیں اور بعض انسان کے لیے زینت ہیں۔ نیز ان کی جلد سے انسان اپنے لیے لباس بناتا ہے' ان کی اون اور بالوں سے مختلف مصنوعات تیار ہوتی ہیں' ان کا دودھ' گوشت وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ گھی اور چربی اور ہڈیاں تک کام میں آتی ہیں۔ یہ جانور بار برداری کا کام کرتے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک انسان خود بھی سامان پہنچا سکتا ہے مگر بہت بڑی مشقت کے ساتھ۔ نیز صبح جب تم مویشی نکالتے ہو چرنے کے لیے اور شام کو واپس لاتے ہو' تو یہ تمہارے لیے ایک جمال ہے۔ تم انہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ جب وہ خوبصورت اور موٹے تازے تمہاری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں' شام کے وقت جب خوب پھلے پھولے واپس آتے ہیں۔ دیہاتی لوگ ان آیات کا مفہوم' شہریوں کی نسبت زیادہ گہرائی تک سمجھتے ہیں۔ گھوڑے' خچر اور گدھے زیادہ تر بار برداری کے کام آتے ہیں۔ ان کو سواری کے طور پر بہت خوبصورت بھی بنایا جاتا ہے۔

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (۱۶:۸) "تاکہ ان پر سوار ہو اور تمہاری زندگی کی رونق بنیں"۔ لفظ زینہ یہاں

زیادہ توجہ کے قابل ہے۔ اس سے زندگی کے بارے میں اسلام اور قرآن کا نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ اسلامی زاویہ سے جمال اور حسن زندگی کا اصلی جزو ہے۔ نعمت کا مفہوم ضروریات زندگی 'کھانے پینے اور سواری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسانی شوق اور تفریح بھی ضروریات زندگی میں سے ہے۔ حسن و جمال کی حس تفریح اور مسرت کا شعور اور اعلیٰ انسانی ذوق 'محض حیوانی ضروریات و حاجات سے 'اسلام کی نظر میں زیادہ اہم ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۶ : ۷) "تمہارا رب بڑا شفیق و مہربان ہے"۔ یہ تعقیب اس حقیقت پر ہے کہ باربرداری کا کام اگر خود انسان کو کرنا پڑے تو یہ بہت ہی مشقت کا کام ہے۔ لہٰذا اللہ نے باربرداری کے لیے جو جانور پیدا کیے ہیں وہ اللہ کی رحمت بے پایاں ہے اور نعمت عظیم ہے۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۸) "اور وہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں"۔ یہ تعقیب ہے اس پر کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جانور پیدا کیے جنہیں تم کھاتے بھی ہو۔ باربرداری کا کام بھی ان سے لیتے ہو اور وہ تمہارے لیے زینت اور خوشی اور مسرت کا سامان بھی ہیں۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ایسی چیزوں کی تخلیق بھی کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں۔ لہٰذا ان مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسانی سوچ کو کھلا رکھا گیا ہے کیونکہ دور جدید میں حمل و نقل کے نئے نئے ذرائع بھی تخلیقات الٰہیہ میں آتے ہیں' نیز زیب و زینت اور تفریح و مسرت کے نئے نئے ذرائع بھی تم پیدا کر سکتے ہو۔ لہٰذا اس تصور کو ابتدائی معاشرہ جس میں قرآن مجید نازل ہوا' اسی تک محدود نہیں کر دیا گیا۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات زمان و مکان میں مقید نہیں۔ ہر دور اور ہر زمان و مکان کے آگے مزید دور اور مزید زمان و مکان آتے ہیں اور ان میں ضرورت و مسرت کے جدید ذرائع ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کو یہ امید دی جاتی ہے کہ وہ مزید تخلیقات الٰہیہ کی توقع رکھیں۔ اگر توفیق الٰہی سے انسان کوئی جدید سہولت اور زینت ایجاد کرتا ہے تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں' یہ نہ ہو کہ وہ اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ اور جدید انکشافات و ایجادات سے فائدہ نہ اٹھائیں اور یہ نہ کہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد تو مذکورہ بالا جانوروں ہی سے ضرورت پوری کرتے تھے۔ گھوڑے 'خچر اور گدھوں ہی سے باربرداری کا کام لیتے تھے لہٰذا ہم جدید ذرائع حمل و نقل کو کام میں نہیں لاتے اور نہ ہی ان سے استفادہ کرتے ہیں اور یہ کہ چونکہ قرآن نے صرف مذکورہ بالا اقسام کی تصریح کر دی ہے لہٰذا ان کے سوا سہولیات ' خوراک اور زیبائش حرام ہے اسی لیے کہا گیا کہ تخلیقات کا دائرہ وسیع ہے۔

اسلام ایک ایسا نظریہ ہے جو کھلا اور چمکدار ہے۔ وہ زندہ کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے استفادہ کرتا ہے اس لیے قرآن کریم مسلمانوں کے ذہن کو آنے والے ادوار کی قوتوں اور علوم کی فراہم کردہ سہولیات سے استفادے کے لیے تیار کرتا ہے۔ ایک مسلمان کا ذہن اس قدر کھلا ہوتا ہے کہ وہ مستقبل کے تمام انکشافات کو دینی ذہن کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اسے از عجائبات تخلیق الٰہی اور عجائبات علوم میں سے سمجھتا ہے اور زندگی کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

دور جدید میں حمل 'نقل اور سواری کے نئے نئے وسائل ایجاد ہو گئے ہیں۔ سہولیات کے ساتھ ساتھ یہ وسائل زیب و زینت کے بھی اعلیٰ ذرائع ہیں۔ نزول قرآن کے دور کے لوگ ان کے بارے میں تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ نیز آئندہ ایسے وسائل بھی ایجاد ہوں گے جن کے بارے میں ہمارے دور کے لوگ سوچ نہیں سکتے۔ ایسے ہی حالات کے

لیے قرآن کریم لوگوں کو فکری زاویہ سے تیار کرتا ہے کہ ان کا ذہن تجمد نہ ہو۔ یہی ہے مفہوم وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۱۶:۸) کا۔

یہاں بحث یہ تھی کہ اللہ نے انسان کے لیے ذرائع نقل و حمل پیدا کیے۔ ان ذرائع کو استعمال کر کے انسان بڑے بڑے فاصلے طے کرتا ہے۔ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے' موضوع کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ روحانی راستے اور روحانی سفر اور ان کے ذرائع نقل و حمل کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف جانے کے بھی راستے ہیں۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ بالکل سیدھا راستہ ہے۔ دنیا میں اللہ تک پہنچانے کے لیے بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں' جو درحقیقت اللہ تک نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ خود اللہ ہی بتاتا ہے۔ اس راستے کو معلوم کرنے کے لیے اللہ نے اس کائنات میں نشانات رکھے ہوئے ہیں ان پر تدبر کیا جانا چاہئے اس لیے خود انسانوں میں سے بعض افراد کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ وہ بھی اس راستے کی نشاندہی کر دیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِينَ ﴿٩﴾

"اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا"۔ سیدھا راستہ یا سبیل قاصد صراط مستقیم ہے گویا وہ راستہ خود منزل مقصود کا قصد کرتا ہے۔ وہ منزل سے ادھر ادھر نہیں ہوتا اور سبیل جائر اس راستے کو کہتے ہیں جو منزل مقصود سے منحرف ہوتا ہے اور منزل مقصود تک نہیں پہنچتا یا منزل مقصود سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِينَ (۱۶:۹) "اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا"۔ لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ انسان کو اس نے ہدایت و ضلالت کی استعداد دے دی اور انسان ہدایت کی راہ اختیار کرتا ہے یا ضلالت کی راہ لیتا ہے یہ اللہ نے اس کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ انسانوں میں سے بعض تو سبیل قاصد پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھی راہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ اللہ کے دائرہ مشیت کے بہرحال اندر ہی رہتے ہیں کیونکہ انسان کے لیے آزادی اور اختیار کا تعین بہرحال اللہ ہی نے کیا تھا۔

اب آیات تخلیق اور انعامات کا دوسرا حصہ۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُوْنَ ﴿١٠﴾ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿١١﴾

"وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے ۔ وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے ۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔

یہ پانی آسمانوں سے اترتا ہے' ان قوانین کے مطابق جو قدرت نے اس کائنات کے لیے وضع کیے ہیں ۔ یہ قوانین اس کائنات کی حرکت کو کنٹرول کرتے ہیں ۔ ان حرکات کے نتائج خالق مدبر کے ارادے اور تدبیر کے مطابق بر آمد ہوتے ہیں ۔ یہ بارش جو آسمانوں سے برستی ہے اسے اللہ کے انعامات میں سے ایک انعام کہا گیا ہے ۔

مِنْهُ شَرَابٌ (۱۶ : ۱۰) "تم اس سے پیتے ہو"۔ اس کی بڑی خصوصیت تو آبنوشی ہے ۔ اس کے بعد اس کی خصوصیت

وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ (۱۶ : ۱۰) "اس میں سے درخت پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے جانوروں کے لیے چارہ بنتے ہیں"۔ تمام چراگاہیں اور درختوں کے پتے اس ذیل میں آتے ہیں ۔ چراگاہوں اور درختوں کا ذکر جانوروں کی مناسبت سے ہوا' جن سے جانوروں کے چارے کا انتظام کیا گیا ۔ پھر زرعی پیداوار کا ذکر ہوا جو انسان کے لیے خوراک کا کام دیتی ہے ۔ مزید انسان کی خوراک کے سلسلے میں زیتون' کھجور' انگور وغیرہ پھلوں کی انواع و اقسام وغیرہ کا ذکر ہوا ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۶ : ۱۱) "اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ کس امر میں غور و فکر؟ اس میں کہ اللہ اس کائنات کی تدبیر کس عظیم حکمت سے کر رہا ہے ۔ اس نے اس کے اندر کس قدر اٹل قوانین فطرت جاری کر دیئے ہیں جو بشر کے لیے ممد حیات ہیں ۔ انسان اس کرۂ ارض یا ستارۂ کائنات موسومہ بہ زمین میں ہرگز زندہ نہ رہ سکتا' اگر اللہ اس کائنات میں ایسے قوانین فطرت وضع نہ کرتا جو اس کے لیے ممد حیات ہیں اور اس کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ۔ اس کی فطری خواہشات کو پورا کرنے والے ہیں ۔ یہ محض حسن اتفاق نہیں ہے کہ اس کرۂ ارض پر انسان کو پیدا کر دیا گیا ہو اور اس کرۂ ارض کو دوسرے کرات سماوی کے ساتھ موجودہ نسبت میں رکھ دیا گیا ہو اور فضائی اور کلیاتی حرکات اس نظام کے مطابق محض اتفاقاً متعین ہو گئی ہوں جس طرح کہ آج ہیں اور یہ محض اتفاقاً انسان کے لیے ممد حیات بن گئی ہوں جس طرح کہ ہم انہیں دیکھ رہے ہیں ۔

جو لوگ غور و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں' وہ اللہ کے حسن تدبیر اور حکمت تدبیر کو سمجھتے ہیں ۔ مدبرین کرۂ ارض کی خصوصیات روئیدگی' اس کے پھل پھول اور ہواؤں اور بارشوں کے نظام کو اللہ کے نوامیس فطرت کے ساتھ جوڑتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ ایک خالق حکیم ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ۔ وہ وحدہ لاشریک ہے ۔ اس کا ارادہ ایک ہی جیسا ہے' اور اس کے قوانین کے اثرات و ثمرات یکساں ہیں ۔ رہے غافل تو وہ ان چیزوں کو صبح و شام دیکھتے ہیں' گرمیوں اور سردیوں میں دیکھتے ہیں' لیکن ان کے مدارک فہم و ادراک سوئے رہتے ہیں ۔ ان کے قوائے اخذ و ادراک اور ان کا ضمیر و شعور اس حکیم کی تلاش میں نہیں نکلتا جس نے اس کائنات بوقلموں کو پیدا کیا ۔ وہ نہیں سوچتے کہ اس عجیب و

غریب نظام کا موجد کون ہے۔

اب آیات دلائل کائنات کا تیسرا گروپ۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِأَمْرِهٖ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

تدبیر مخلوقات اور انسان پر اس کے انعامات کا ایک مظہر گردش لیل و نہار ہے۔ شمس و قمر کی گردش اور سیاروں اور ستاروں کا یہ نظام بھی انسان کے لیے ممد حیات ہے۔ یہ تمام مظاہر انسانوں کی ڈیوٹی میں لگے ہوئے ہیں' اپنے یوم تخلیق سے یہ خدمت انسان پر مامور ہیں۔ گردش لیل و نہار تو حیات انسان میں فیصلہ کن اثر رکھتی ہے۔ ذرا سوچو کہ اگر دن بھی قائم و دائم ہو جائے اور رات نہ آئے یا رات ہی قائم رہ جائے اور دن نہ آئے تو؟ پہلی صورت میں زمین جل جائے اور دوسری صورت میں زمین جم جائے۔

شمس و قمر اور اس کرۂ ارض پر نظام حیات سے اس کا تعلق بالکل واضح ہے۔ شمس و قمر کی گردش سے انسانی زندگی براہ راست متعلق ہے۔

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ (۱۶: ۱۲) "سب ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں"۔ یہ سب انسان اور غیر انسانی مخلوقات کے لیے مفید اور ممد حیات ہیں جن کی افادیت کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے"۔ یہ باتیں اللہ کی حکمت و تدبیر کا ایک حصہ ہیں اور اللہ کے تمام قوانین مدبرہ باہم ہم آہنگ ہیں' ان قوانین مدبرہ اور حکمت تدبیر کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مظاہر فطرت کے پیچھے ایک قوت مدبرہ کار فرما ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۶: ۱۲) "اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

اب آیات و دلائل کائنات کا چوتھا گروپ

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

"اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں' ان میں بھی ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں"۔

اللہ نے زمین کو پیدا کیا اور اس کے اندر قسم قسم کی معدنیات پیدا کیں' رنگ برنگ کے پتھر اور دوسری چیزیں جن پر انسانوں کی زندگی موقوف ہے لیکن اللہ نے ان ضروریات حیات کے ایسے ذخیرے پیدا کیے ہیں جو نہ ختم ہونے والے ہیں۔ پھر نئی نئی دریافتیں جو انسان اس زمین میں کر رہا ہے اور زمین کے اندر پوشیدہ خزانے اور ذرائع قوت دریافت کر رہا ہے' جوں جوں اس کی حاجات و ضروریات بڑھتی ہیں وہ دریافتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک خزانہ ختم ہوتا ہے تو قوت کے کئی اور خزانے دریافت ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کا رزق ہے جو اس نے بندوں کے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ (۱۶ : ۱۳) "ان میں ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرتے ہیں"۔ ایسے لوگ اس بات کو نہیں بھولتے کہ دست قدرت نے یہ خزانے ہمارے لیے ودیعت کیے ہیں۔

اب آیات دلائل کائنات کا پانچواں گروپ آتا ہے۔ جو ان مخلوقات متنوعہ کے بارے میں ہے جن سے تلخ سمندر بھرا پڑا ہے۔ سمندر کا پانی پینے کے قابل تو نہیں ہے لیکن انسان کے لیے کئی پہلوؤں سے مفید ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۱۴

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو"۔

سمندروں کی متنوع حیات بھی انسانی زندگی کے لیے مفید و ممد ہے۔ سمندروں میں انسانی زندگی کی دلچسپیوں کے دوسرے سامان بھی موجود ہیں۔ مچھلیوں اور دوسرے حیوانات بحری انسان کے لیے بہترین غذا ہیں۔ نیز سمندر کے موتی' مونگے اور سیپ انسان کے لیے بطور زیور آج کے دور جدید میں بھی کام دیتے ہیں۔ یہاں کشتی کا فائدہ صرف سفر ہی نہیں بتایا گیا بلکہ سمندروں میں کشتیوں کے چلنے کے منظر کے حسن کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ (۱۶ : ۱۴) "تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے چلتی ہے"۔ لفظ تری سے کشتی' پانی اور کشتی کی روانی کے خوبصورت منظر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سمندری جہاز پانی

کو چیرتے ہوئے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس فقرے سے ایک بار پھر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام اس جہان کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کائنات کی ہر چیز کو افادۂ حیات کے علاوہ انسان کے لیے حسین بھی بنایا گیا ہے۔

پھر قرآن مجید اس منظر سے انسان کو سبق سکھاتا ہے کہ یہ تمہارے لیے مفید بھی ہے 'تمہارے سفر و تجارت کا ذریعہ بھی' اور یہ منظر تمہاری آنکھوں کے لیے خوبصورت بھی ہے لیکن ان تمام چیزوں کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تم اللہ کا شکر بجالاؤ۔

وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۶: ۱۴) "یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو"۔

اب اس سبق میں آیات و دلائل کائنات کا آخری گروپ۔

وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥﴾ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿١٦﴾

"اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں' اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں"۔ پہاڑوں کو زمین میں میخ بنایا۔ جدید علم جغرافیہ اس کے اسباب سے بحث کرتا ہے' لیکن علم جدید نے یہ نہیں بتایا کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین ایک طرف ڈھلک جاتی۔

یہ حقیقت صرف قرآن مجید نے بیان کی ہے۔ جدید علم جغرافیہ پہاڑوں کے وجود کے متعدد اسباب بیان کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ زمین کا اندرون ایک گرم لاوا ہے۔ وہ جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو سکڑ جاتا ہے اور اس کے اوپر زمین کی سطح بھی سکڑ کر ایک شکن کی صورت میں پہاڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یوں اونچے اونچے پہاڑ اور وادیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ لیکن قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ یہ پہاڑ زمین کے اندر توازن رفتار پیدا کرتے ہیں۔ علم جدید نے شاید ابھی تک اس پہلو پر غور نہیں کیا۔

ان پہاڑوں کے بالمقابل بڑی بڑی وادیاں ہیں اور ان میں مختلف راستے اور ندیاں نالے ہیں۔ اس کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ ندی نالے طبعی تعلق رکھتے ہیں۔ پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں۔ پہاڑوں کے اوپر برف پڑتی ہے اور بارش ہوتی ہے اور پھر اس سے دریاؤں اور ندی نالوں سے راستے نکلتے ہیں۔ پھر ان راستوں پر لوگ چلتے ہیں۔ سامان پہنچاتے اور بار برداری کا کام کرتے ہیں۔ پھر ان راستوں کے لیے نشانات راہ وضع ہوتے ہیں' جس طرح یہ پہاڑ راستوں کا نشان ہوتے ہیں' اسی طرح صحراؤں اور سمندروں میں ستارے راہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ غرض اللہ کی یہ پوری کائنات انسان کے لیے مفید ہے۔

آیات تخلیق اور نشانات انعامات باری اور حکمت تدبیر کائنات کے بیان کے بعد اب وہ بات واضح طور پر بیان کی جاتی ہے جس کے لیے یہ پورے دلائل و شواہد پیش کیے گئے۔ یہ تمام شواہد اس مقصد کے لیے لائے گئے تھے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہ ان باتوں سے منزہ ہے جو یہ لوگ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿١٧﴾ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿١٩﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿٢٠﴾ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٢١﴾

"پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے ' دونوں یکساں ہیں ؟ کیا تم ہوش میں نہیں آتے ؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے ' حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ' حالانکہ وہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی۔

اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں ' وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔

یہ نتیجہ نہایت ہی موزوں وقت میں نکالا جاتا ہے ' ایسے حالات میں کہ نفس انسانی اور عقل سلیم اس کے مضمون کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ (١٦ : ١٧) "پھر جو پیدا کرتا وہ اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے دونوں یکساں ہیں "۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیا کوئی حساس اور غور و فکر کرنے والا انسان اس ذات والا صفات کو جس نے یہ عظیم الشان کائنات کی تخلیق کی ہے اس شخص کے برابر تصور کر سکتا ہے جس نے کوئی چیز بھی پیدا نہیں کی۔ نہ بڑی اور نہ چھوٹی۔

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (١٦ : ١٧) "کیا تم ہوش میں نہیں آتے "۔ اس کے لیے تو محض یادداشت تازہ کرنے کی ضرورت ہے ' یہ امر تو تمہاری فطرت کے اندر موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کے کئی رنگ اور کئی پہلو بیان کرنے کے بعد یہ کہا

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (١٦ : ١٨) "اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے"۔ شکر ادا کرنا تو دور کی بات ہے ' اس لیے کہ نہ ان کا شمار ممکن ہے اور نہ شکر ' بلکہ اللہ کے اکثر انعامات ایسے ہیں جن کے بارے میں ابھی تک انسان کو علم ہی حاصل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ بعض امور کو انسان روٹین کے امور سمجھتا ہے۔ ان کا اسے شعور ہی نہیں ہوتا۔ البتہ تب احساس ہوتا ہے جب کوئی نعمت چھن جاتی ہے۔ ذرا انسان کے جسم کی میکانکی ترکیب کو دیکھو ! جسم کا ہر حصہ ایک فریضہ ادا کر رہا ہے اور انسان کو احساس اس وقت ہوتا ہے جب کوئی پرزۂ جسم ناکارہ ہو جائے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر عظیم نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ بس انسان پر تقصیر اور ضعیف کی مدد کو تو اللہ کی صفت رحمت اور صفت غفوریت پہنچتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۶:۱۸) "بے شک اللہ بڑا ہی درگزر کرنے والا رحیم ہے"۔ وہ خالق ایسی ذات ہے جو ہمارے کھلے اور پوشیدہ تمام امور سے واقف ہے۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ (۱۶:۱۹) "اور اللہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی"۔ لہذا یہ بات تعجب انگیز ہے کہ لوگ اللہ کی ذات کو ان اشخاص و اشیاء کے ساتھ برابر کرتے ہیں جو نہ کوئی حقیر سی شے بھی پیدا کر سکتے ہیں' نہ کوئی چیز جانتے ہیں' بلکہ وہ تو مردہ ہیں' ان کے اندر زندگی داخل ہی نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ وہ شعور نہیں رکھتے۔

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّہُمْ یُخْلَقُوْنَ (۲۰) اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (۲۱) (۱۶: ۲۰ - ۲۱) "اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں' وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں' مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا"۔

یہاں جو بعث بعد الموت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے خالق تو وہ ہوتا ہے جسے بعث کا علم ہو' کیونکہ تخلیق کی تکمیل تب ہوگی جب قیامت برپا ہوگی اور اس وقت تمام ذی عقل افراد کو ان کے کیے کی جزاء و سزا دی جائے گی۔ لہذا ایسے خدا جن کو بعث بعد الموت کا علم ہی نہیں ہے وہ خدا یا الٰہ ہونے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ یہ تو ایک مذاق ہے کہ ایک خالق کو نہ اپنی مخلوق کا پتہ ہو اور نہ یہ علم ہو کہ اس مخلوق کو کب اٹھایا جائے گا۔

---○○○---

درس نمبر ۱۲۰ ایک نظر میں

درس سابق میں ہمیں بتایا گیا کہ خالق کائنات کی اس عظیم مخلوق میں بے شمار آیات و نشانات موجود ہیں۔ اس عظیم تخلیق میں حضرت انسان کے فائدے ہی فائدے ہیں اور یہ کہ خالق حقیقی انسان کے ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہے۔ جبکہ جن ہستیوں اور اشیاء کو تم الٰہ سمجھتے ہو' ان کی کوئی تخلیق نہیں ہے۔ وہ خود مخلوق ہیں' وہ کسی چیز کا علم و شعور نہیں رکھتے' بلکہ وہ مردہ ہیں اور ان کو اب اس جہان میں زندگی حاصل نہیں ہو سکتی یا وہ حیات کے قابل ہی نہیں ہیں۔ نیز ان ہستیوں کو اس قدر بھی معلوم نہیں ہے کہ سزاء و جزاء کے لیے ان کو کب اٹھایا جائے گا۔ یہ تمام دلائل قطعاً اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ ہستیاں عبادت کے لائق نہیں ہیں اور یہ کہ عقیدۂ شرک سرے سے باطل اور لغو ہے۔ اس سورہ میں عقیدۂ توحید کے بیان کا یہ پہلا دور تھا جس میں قیام قیامت کی طرف بھی اشارہ تھا۔

اس سبق میں بھی وہ مضمون ہے جو ہم نے پچھلے سبق میں چھوڑا۔ بیان توحید کا یہ دوسرا دور ہے' اس کا آغاز اس دعویٰ سے ہوتا ہے کہ تمہارا الٰہ بس ایک ہی اللہ ہے۔ اور جو لوگ صرف ایک ہی الٰہ کو نہیں مانتے در حقیقت ان کے دل منکر ہیں۔ چونکہ انکار ان کے دلوں کے زند جاگزیں ہے اسی لیے اس کائنات کے شواہد و افرہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ اقرار نہیں کرتے۔ دل میں انکار کی جاگزینی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ غرور اور کبر کی بیماری میں مبتلا ہیں اور یہ کبر بھی انہیں حقیقت کو تسلیم کرنے سے روکتا ہے۔ یہ مضمون ایک موثر منظر پر یوں ختم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں تمام سائے در حقیقت ذات کبریا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس کائنات کے تمام جانور بھی اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ملائکہ بھی اللہ الٰہ واحد کے سامنے جھکتے ہیں جن کی ذات استکبار سے خالی اور جن کے قلوب خوف سے پاک ہیں اور ہر وقت بلا کسی چوں و چرا کے اللہ کے احکام بجا لاتے ہیں اور اطاعت امر کے یہ منظر مستکبرین کے استکبار کے بالمقابل بیان ہوئے جو اس سبق کے آغاز میں بیان ہوا۔

اس سبق کے آغاز اور اختتام کے درمیان قرآن مجید ان مستکبرین کے نقطہ نظر کو بھی قارئین کے سامنے رکھتا ہے کہ ان کا موقف کیا ہے؟ یہ کہ وحی اور قرآن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ پرانے قصے ہیں اور یہ کہ وہ کیوں شرک کرتے ہیں؟ وہ ان چیزوں کو کیوں حرام قرار دیتے ہیں جن کو اللہ نے حرام قرار نہیں دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہے' اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ کب ایسا کر سکتے۔ قیامت کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ وہ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ ہرگز مردوں کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ ان کے ان تمام مزعومات کو اس سبق میں سختی سے رد کیا جاتا ہے اور رد کا انداز یہ ہے کہ جب قیامت کے روز یہ اٹھیں گے تو یہ بذات خود اپنے ان نظریات کا صاف صاف انکار کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہلاک شدہ امتوں کے بعض واقعات بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں اور ان کو

ڈرایا جاتا ہے کہ تم پر بھی رات اور دن کی کسی گھڑی میں اسی طرح عذاب آسکتا ہے جبکہ آپ کو کوئی توقع نہ ہوگی اور بعض صورتیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں کہ تم کو عذاب کی توقع ہوگی اور تم انتظار کر رہے ہوگے۔ اس کے بالمقابل اس سبق میں مومنین کے موقف اور نظریت کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے، خصوصاً جبکہ موت اور بعث بعد الموت کے وقت ان کا مکالمہ فرشتوں سے ہوگا۔ اس طرح یہ سبق ختم ہوتا ہے جس میں خشوع و خضوع اور اطاعت و امتثال امر الٰہی کے مناظر بھی ہیں اور انکار کے بھی اور یہ پوری کائنات، اس کے سائے، فرشتے اور گردش لیل و نہار اور ارض و سماء سب کے سب امتثال امر الٰہی کے نشانات ہیں۔

--- ٥٥٥ ---

درس نمبر ۱۲۰ تشریح آیات

۲۲ --- تا --- ۵۰

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

”تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں ۔ اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے 'چھپے ہوئے بھی اور کھلے ہوئے بھی ۔ وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور نفس میں مبتلا ہوں“۔

یہاں اللہ وحدہ پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان کو یکجا کیا گیا ہے بلکہ اللہ وحدہ پر ایمان کا لازمی نتیجہ آخرت پر ایمان کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ اللہ وحدہ کی بندگی کا براہ راست تعلق عقیدہ آخرت اور جزاء و سزا کے قیام سے ہے ۔ صرف اسی صورت میں خالق حقیقی کی حکمت تخلیق کا اظہار اور مکمل انصاف ہو سکتا ہے ۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۶ : ۲۲) ”تمہارا خدا بس ایک خدا ہے“۔ اس سورہ میں تخلیق باری کے جو نشانات گنوائے گئے ۔ اللہ کے جن جن انعامات کا ذکر ہوا' اور اللہ کے علم و حکمت کی جن باتوں کو بیان کیا گیا' وہ سب اس حقیقت عظیمہ کی متقاضی ہیں کہ اللہ ایک ہے' اس کے آثار اس کائنات کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت میں عیاں ہیں' اور ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور باہم تعاون اور توافق پایا جاتا ہے اور یہ تمام قوانین ہم قدم ہیں۔

لہذا جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ آخرت کو تسلیم نہیں کرتے ۔ جو لوگ اللہ کی تخلیق' اس کی وحدانیت اور اس کی حکمت اور عدل پر ایمان لاتے ہیں' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ پھر قیام قیامت پر ایمان لائیں ۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس کا سبب دلائل و نشانات کی کمی نہیں ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انکار کی علت خود ان کی ذات کے اندر

پوشیدہ ہے۔ ان کے مزاج میں انکار ہے اور ان کے دل انکار کرنے والے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں پہلے سے انکار بیٹھا ہوا ہے۔ اس لیے وہ دلائل و براہین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور دلائل و براہین کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ وہ مستکبرین ہیں اور اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ نہ دلائل کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اللہ کی بندگی کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا انکار کرتے ہیں اور اس کا حقیقی سبب خود ان کے نفوس کے اندر ہے۔

اللہ جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے وہ اپنی مخلوق کے ہر کل پرزے سے واقف ہے' وہ ان امور سے بھی واقف ہے جو پوشیدہ ہیں اور ان سے بھی جو ظاہر ہیں وہ از سب سب کچھ جانتا ہے اور ان کے اس رویے کو ناپسند بھی کرتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (۱۶: ۲۳) "اور اللہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور نفس میں مبتلا ہیں"۔ ایک متکبر دل سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس کائنات کے دلائل و شواہد پر مطمئن ہو جائے اور سر تسلیم خم کر دے۔ چنانچہ وہ اللہ کی طرف سے ناپسندیدہ لوگ ہیں کیونکہ وہ غرور نفس میں مبتلا ہیں اور اللہ ان کے حالات اور حقیقت سے خوب واقف ہے اور ان کے ہر ظاہر و باطن سے بھی واقف ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾

"اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے' تو کہتے ہیں "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔ یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنہیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں"۔

یہ مستکبرین اور منکر دل والوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (۱۶: ۲۴) "تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے"۔ یہ لوگ اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیتے۔ حالانکہ جواب سیدھا سادہ ہے۔ یہ لوگ قرآن کریم کو پڑھ سکتے ہیں' اس کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ اگر ایمان نہ بھی لائیں پھر بھی دیانت داری سے صحیح جواب تو دے سکتے تھے لیکن انہوں نے سیدھا جواب دینے کے بجائے یہ جواب دیا

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۶: ۲۴) "وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔ اساطیر ان کہانیوں کو کہا جاتا ہے جو وہم سے پر ہوں اور خرافات پر مشتمل ہوں۔ یہ لوگ قرآن کے بارے میں ایسے ریمارکس پاس کرتے ہیں حالانکہ قرآن مجید انسانی عقل' انسانی نفسیات' انسانی طرز زندگی' لوگوں کے عمومی طرز عمل' سوسائٹی کے طبقات کے باہم تعلق اور

انسان کے ماضی، اس کے حال اور اس کے مستقبل پر نہایت ہی معقول تنقید و تبصرہ کرتا ہے اور حقیقی راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن نے امم ماضیہ کے واقعات بیان کیے ہیں، لہٰذا اس کے بارے میں ان کی یہ سطحی رائے ہے۔ یوں یہ لوگ خود اپنے گناہوں کا بوجھ بھی بڑھاتے ہیں اور اپنے متبعین کے گناہوں کا بھی ایک حصہ اپنے بوجھ میں ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان کی باتوں سے ان کے پیروکار گمراہ ہوتے ہیں اور اسلام اور ایمان سے رک جاتے ہیں۔ یہ متبعین چونکہ خود جاہل ہیں کوئی صحیح رائے وہ خود قائم نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم ان لوگوں کے گناہوں کی تعبیر ایک ایسے بوجھ سے کرتے ہیں جو کوئی مسافر اٹھاتا ہے۔ یہ بوجھ زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ احمق مسافر اس کو اور زیادہ کرتا جاتا ہے۔ یہ بوجھ نفس انسانی کو اس قدر جھکا دیتا ہے، اس قدر مشقت میں ڈال دیتا ہے جس طرح بھاری بوجھ کمر کو دوہرا کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روحانی اور نفسیاتی بوجھ بھی انسان کے لیے اس طرح باعث درماندگی ہوتا ہے جس طرح جسمانی بوجھ جسم کے لیے تھکن کا موجب ہوتا ہے بلکہ نفسیاتی بوجھ جسم کو جسمانی بوجھ کے مقابلے میں زیادہ چور چور کر دیتا ہے۔

ابن ابو حاتم، سدی سے روایت کرتے ہیں کہ قریش نے ایک میٹنگ کی اور اس میں قرار دیا کہ حضرت محمدؐ شیریں زبان ہیں۔ جب وہ کسی سے بات کرتے ہیں تو اس کی عقل جاتی رہتی ہے۔ لہٰذا قریش میں سے چند ایسے افراد کا انتخاب کرو جو معروف ہوں اور ان کا نسب بھی معروف ہو۔ ان کو مکہ کی راہوں پر ایک دو رات کے لیے بٹھا دو تاکہ جو شخص بھی محمدؐ سے ملاقات کے لیے آئے وہ اسے واپس کر دیں۔ چنانچہ کچھ لوگ نکلے اور مکہ کے راستے پر بیٹھ گئے۔ جو شخص بھی اپنی قوم کی طرف سے محمدؐ کے حالات معلوم کرنے کے لیے مکہ آتا، تو ان میں سے جو شخص راستے پر بیٹھا ہوتا وہ کہتا میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ تو یہ شخص اسے پہچان لیتا کیونکہ وہ مشہور شخص ہوتا۔ پھر وہ کہتا کہ میں تمہیں محمدؐ کے بارے جانتا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑا جھوٹا شخص ہے۔ اس معاملے میں اس کے متبعین یا تو بے وقوف لوگ ہیں یا غلام ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ رہے اس کی قوم کے اکابر اور شیوخ تو وہ سب کے سب اس کے خلاف ہیں۔ اس طرح وہ شخص معتبر دیہہ کی بات سن کر واپس ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّا ذَا اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۶: ۲۴) "اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے وہ تو پرانے زمانے کی کہانیاں ہیں"۔ اب اگر یہ شخص صاحب عزم صمیم ہوتا اور اس کے لیے ہدایت لکھی ہوئی ہوتی تو یہ لوگ جب اپنی بات کرتے تو وہ کہتا میں اپنی قوم کا کس قدر بے کار نمائندہ ہوں گا کہ میں دور کا سفر کر کے آیا اور ایک دن کا سفر رہ گیا اور اب میں اس شخص سے ملے بغیر واپس چلا جاؤں۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کیا کہتا ہے اور قوم کے پاس کوئی مصدقہ بیان لے کر نہ جاؤں۔ تو ایسا شخص مکہ میں داخل ہوتا۔ وہ مومنین سے ملتا اور پوچھتا کہ حضرت محمدؐ کی تعلیمات کیا ہیں، تو وہ اس کو اچھی باتیں بتاتے"۔

قریش نے تحریک اسلامی کے خلاف ایک زبردست مخالفانہ پروپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ قریش کے بعد بھی ہر زمان و مکان میں مستکبرین پر تحریک اسلامی کے خلاف ایسی ہی مخالفانہ مہم چلاتے ہیں کیونکہ ان کا غرور اور استکبار ان کو دلیل اور سچائی کے اتباع سے روکتا ہے۔ پس قریش کے یہ مستکبرین، پہلے منکر اور معاند نہ تھے۔ قرآن کریم ان کے سامنے ان مستکبرین کا انجام واضح طور پر پیش کرتا ہے جس سے ان سے قبل کے مستکبرین دوچار ہوئے، خصوصاً

قیامت کے دن ان کا جو انجام ہونے والا ہے' بلکہ یہ انجام ان کا قیامت سے بھی پہلے اس وقت شروع ہونے والا ہے جونہی ان کی روح جسد خاکی سے نکل جائے گی۔ قرآن کریم ان کے سامنے' یہ مناظر نہایت ہی موثر انداز میں پیش کرتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا اسلوب ہے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

"ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لیے) ایسے ہی مکاریاں کر چکے ہیں' تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آ رہی اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا۔ پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان سے کہے گا "بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لیے تم (اہل حق سے) جھگڑے کیا کرتے تھے؟" جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے "آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے"۔ ہاں' انہی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں کر رہے تھے"۔ ملائکہ جواب دیتے ہیں "کر کیسے نہیں رہے تھے! اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے۔ اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے"۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کے لیے"۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۱۶ : ۲۶) "ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لیے) ایسے ہی مکاریاں کر چکے ہیں"۔ قرآن کریم ان کے پروپیگنڈے کو ایک ایسی عمارت سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیادیں بھی ہیں اور ستون بھی اور چھت بھی ہے۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا پروپیگنڈا بڑا گہرا' مضبوط' پختہ اور ضخیم تھا لیکن اللہ کی قوت اور تدبیر کے مقابلے میں یہ کامیاب نہ ہوا۔

فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (۱۶ : ۲۶) "تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آرہی"۔ یہ ایک ایسا منظر اور ایسی تصویر کشی ہے جس سے مکمل تباہی کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ تباہی اوپر سے بھی آتی ہے اور نیچے سے بھی آتی ہے کیونکہ جن بنیادوں پر یہ عمارت کھڑی تھی وہی گر گئیں اور اوپر سے چھت ان پر اس طرح آگری کہ وہ دب گئے اور دفن ہو کر رہ گئے۔

وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۶ : ۲۶) "اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا"۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ جس عمارت کو انہوں نے نہایت ہی پختہ کر کے تعمیر کیا تھا اور ان کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ اس میں پناہ لیں گے وہی ان کا مقبرہ بن گئی اور وہ ان پر ایسی ہلاکت لائی کہ اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی ان پر تباہی آئی۔ وہ عمارت انہوں نے اس قدر مضبوط بنائی تھی کہ اس کی کسی جہت سے بھی ان کو تباہی کا ڈر نہ تھا۔

تباہی و بربادی کا یہ ایک مکمل منظر ہے۔ یہ مکر کرنے والوں کے مکر اور مخالفانہ تدابیر کرنے والوں کی تدابیر کے ساتھ معنی خیز مذاق ہے۔ جو لوگ تحریک اسلامی کی راہ روکنے کے لیے مکر کرتے ہیں یہ سوچتے ہیں کہ ان کے مکر کا کوئی توڑ نہ ہوگا اور یہ کہ ان کی تدابیر ناکام نہ ہوں گی حالانکہ اللہ ان کی تمام مکاریوں اور تدابیر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہ منظر قریش کے دور میں بھی دیکھا گیا۔ ان سے پہلے بھی تاریخ نے بھی بارہا دیکھا اور بعد کے ادوار میں بھی دیکھا گیا۔ دعوت اسلامی آج تک اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ مکر کرنے والے جس قدر چاہیں تدابیر سوچیں 'جس قدر چاہیں مکاریاں کریں۔ تحریک اسلامی کے کارکن ان تاریخی مناظر کو بار بار پڑھ کر دیکھتے ہیں جس طرح قرآن کریم نے منظر کشی فرمائی۔

فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۶ : ۲۶) "تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آرہی اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا"۔ یہ تو ان کا انجام ہوا اس دنیا میں اور اس کرۂ ارض پر۔ لیکن ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ (۱۶ : ۲۷) "پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان سے کہے گا اب بتاؤ کہاں ہیں وہ شریک جن کے لیے تم اہل حق سے جھگڑے کیا کرتے تھے"۔ قرآن کریم یہاں مشاہد قیامت سے ایک منظر تصویر کشی کر رہا ہے۔ یہ مکار مستکبرین اس منظر میں نہایت ہی شرمندگی کی حالت میں ہیں۔ ان کا تکبر کافور ہو چکا ہے اور ان کی مکاریوں کے دن لد گئے ہیں۔ اب وہ اس ذات کبریا کے دربار میں ہیں جو تخلیق کا بھی مالک ہے اور فیصلے بھی اب اسی کے چلتے ہیں۔ اللہ اب ان کو مزید شرمندہ اور خوار کرنے کے لیے سوال کرتے ہیں۔

اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ (۱۶ : ۲۷) "کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے

بارے میں تم جھگڑتے رہتے تھے"۔ جن جعلی شریکوں کے متعلق تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان سے جھگڑتے تھے وہ کہاں ہیں۔ جو لوگ عقیدۂ توحید کے قائل تھے تم ان سے مناظرے کیا کرتے تھے۔

یہاں یہ لوگ گم سم کھڑے ہیں۔ شرمندگی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن فرشتے 'رسول' اہل علم اور اہل ایمان کو اب بولنے کی اجازت ہوگی کیونکہ یہ لوگ تو اب کامیاب ہو چکے ہوں گے لہٰذا بولنا اب ان کا حق ہوگا۔

قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ (۱۶:۲۷) "جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے 'آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے"۔ فی الواقعہ آج رسوائی اور بدبختی صرف کافروں کے لیے ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (۱۶:۲۸) "انہی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے"۔ اب قرآن کریم ان لوگوں کو ایک قدم پیچھے لے جاتا ہے 'قیامت سے قبل ان لوگوں کی موت کا وقت قریب ہے' ملائکہ ان کی روح قبض کرتے ہیں 'ان کے جسم سے ان کی روح کو نہایت ہی کرختگی کے ساتھ کھینچ کر نکالا جاتا ہے' اس لیے کہ یہ لوگ ایمان ویقین سے محروم تھے۔ انہوں نے اپنی روح کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔ پھر ان کی جانیں آگ اور دائمی کے عذاب کے حوالے ہوگئیں۔

جب ان لوگوں کی موت قریب آئی اور ابھی تو زمین میں یہ جھوٹ 'مکر اور فریب کا کاروبار کر رہے تھے تو دیکھو کہ یہ کس قدر سادہ ہوگئے ہیں۔

فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ (۱۶:۲۸) "تو یہ لوگ فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں کر رہے تھے"۔ یہ مستکبرین اب تو سلامتی کے پیغامبر بن گئے ہیں' وہ تو اس سر تسلیم خم کرنے اور اطاعت کرنے کی پیشکش کر رہے ہیں۔ یہ بھی ان کا جھوٹ ہے اور یہ جھوٹ ان کے دنیاوی سلسلہ جھوٹ کا حصہ ہے۔ یہ نہایت ہی عاجزی سے کہتے ہیں۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ (۱۶:۲۸) "ہم تو قصور نہیں کر رہے تھے"۔ یہ بھی نہایت ہی شرمساری اور ذلت کا منظر ہے۔ ان مستکبرین کو دیکھو اور ان کی اس حالت کو دیکھو۔

لیکن اللہ کی طرف سے جواب آئے گا "ہاں" اور یہ جواب علیم و خبیر کی طرف سے ہوگا۔

بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶:۲۸) "ہاں اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے"۔ لہٰذا اب یہاں جھوٹ 'مغالطہ اور ملمع کاری نہیں چل سکتی۔

اب ان کے فیصلے اور جزاء کا وقت آتا ہے۔ یہ متکبرین کی جزاء ہے۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۱۶:۲۹) "اب

جاؤ' جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے"۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کے لیے"۔ اب فریق بالمقابل' وہ لوگ ہیں جنہوں نے تقویٰ کی راہ اختیار کی۔ یہ لوگ متکبرین اور مستکبرین کے مدمقابل میں شروع سے انتہا تک۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوْا خَيْرًا ۗ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۚ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے' تو وہ جواب دیتے ہیں کہ "بہترین چیز اتری ہے"۔ اس طرح کے نیکوکار لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا' دائمی قیام کی جنتیں' جن میں وہ داخل ہوں گے' نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' اور سب کچھ وہاں عین ان کی خواہش کے مطابق ہو گا۔ یہ جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو۔ ان متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں "سلام ہو تم پر' جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے"۔

متقیں اس بات کو سمجھتے ہیں کہ دعوت اسلامی کا بنیادی عنصر خیر ہے۔ اللہ نے جو کلام نازل کیا ہے' جو امر و نہی اور ہدایت و قانون پر مشتمل ہے' اس کی روح انسان کی بھلائی ہے۔ یہ لوگ پوری داستان کو ایک لفظ کے کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ ان سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو کہتے ہیں (خیرا) اور اس کے بعد وہ اس خیر کی تشریح اپنے علم و فضل کے مطابق کرتے ہیں۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۱۶ : ۳۰) "اس طرح کے نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے"۔ بہترین زندگی' بہترین ساز و سامان اور بہترین مقام و مرتبہ۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (۱۶ : ۳۰) "اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے لیے بہتر ہے"۔ اس دنیا کی بہتری سے بھی اس کی بہتری برتر ہے۔

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (۱٦ : ۳۰) "بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا"۔ یہ تو تھی اجمالی بات۔ اب اس اجمال کی تفصیلات یہ ہیں:-

جَنّٰتُ عَدْنٍ (۱٦ : ۳۱) "دائمی قیام کی جنتیں"۔ یہ ان کی اقامت گاہیں ہوں گی۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۱٦ : ۳۱) "جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی"۔ بہت سہولتیں ہوں گی۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ (۱٦ : ۳۱) "اور سب کچھ وہاں عین ان کی خواہش کے مطابق ہو گا"۔ وہاں نہ کسی چیز سے محرومیت ہوگی اور نہ محنت ہوگی نہ رزق محدود ہو گا جس طرح اس دنیا میں ہے۔

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ (۱٦ : ۳۱) "اس طرح جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو"۔

اب متقین کو بھی سیاق کلام ایک قدم پیچھے لے کر چلتا ہے۔ جس طرح اس سے قبل مستکبرین کو پیچھے کی طرف حالت نزع میں لے جایا گیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں' ان کی حالت نہایت ہی پر سکون ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ (۱٦ : ۳۲) "وہ لوگ جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں ملائکہ قبض کرتے ہیں"۔ ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ سے ملنے والے ہوتے ہیں۔' وہ سکرات الموت اور مشکلات نزع روح سے محفوظ ہوتے ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (۱٦ : ۳۲) "فرشتے کہتے کہ سلام ہو تم پر"۔ یہ سلام ان کو اطمینان دلانے کے لیے اور مرحبا اور خوش آمدید کہنے کے لیے ہو گا۔

ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱٦ : ۳۲) "جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے"۔ گویا ان کو جنت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے حالانکہ وہ ابھی تک آخرت کے دروازے پر ہی ہیں۔ یہ پوری پوری جزاء ہے ان کے اعمال کے بدلے۔

موت کا منظر اور بعث بعد موت کا منظر فضا پر سایہ فگن ہے کہ اسکرین پر ایک سوال آتا ہے۔ یہ سوال اس فضا میں مشرکین قریش سے کیا جاتا ہے کہ وہ اب کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ آیا وہ فرشتوں کا انتظار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آئیں اور مذکورہ بالا طریقے پر ان کی روح قبض کر لیں یا وہ اس بات کا انتظار کرنا چاہتے کہ اللہ قیامت برپا کر دے کیونکہ ان دونوں مراحل سے ان کو بہرحال گزرنا ہے۔ موت کے وقت بھی یہی منظر ہو گا اور بعث بعد الموت کے وقت وہی سزا ہو گی۔ کیا ان دونوں مناظر میں ان کے لیے کوئی عبرت و نصیحت کا مقام نہیں ہے؟

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾ ع ۴

"اے نبیؐ اب جو یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں تو اس کے سوا اب اور کیا باقی رہ گیا ہے کہ ملائکہ ہی آپہنچیں یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ اسی طرح کی ڈھٹائی ان سے پہلے بہت سے لوگ کر چکے ہیں۔ پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ ان پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا۔ ان کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار ان کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیز ان پر مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے"۔

لوگ بھی عجیب ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک راستے پر ان کے پیش رو چلے اور وہ عذاب الٰہی سے دوچار ہوئے' تباہی و بربادی ان کے حصے میں آئی' پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کا جو حشر ہوا وہ ان کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتے نہیں کہ سنت الٰہیہ ایک ہے اور اس کے نتائج ہمیشہ ایک جیسے ہی نکلتے ہیں۔ یہ کہ مکافات عمل ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہے' یہ کہ قانون قدرت اور سنن الٰہیہ اٹل ہیں اور وہ کسی سے رو رعایت نہیں کرتیں' نہ ان میں کسی کے لیے کوئی تخلف ہو سکتا ہے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۶ : ۳۳) "پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ ان پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا"۔ اللہ نے تو ان کو تدبر' تفکر اور اختیار تمیزی کی آزادی دی تھی' ان پر انبیاء کے ذریعہ آفاقی دلائل اور ان کے نفوس کے اندر پائے جانے والے شواہد دکھائے تھے' ان کو برے انجام سے ڈرایا تھا' ان کو عمل کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا کہ اللہ کی سنت کے مطابق جو چاہیں روش اختیار کریں۔ چنانچہ ان پر ظلم و زیادتی ان کے برے اعمال نے کی کیونکہ جن نتائج سے وہ دوچار ہوئے وہ ان کے اعمال کے طبیعی نتائج تھے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۱۶ : ۳۴) "پس ان کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار ان کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیز ان پر مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔ اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ان کے اعمال سے باہر کوئی سزا نہ ہو گی۔ سزا ان کے اعمال کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اور ان کے ذاتی اعمال کے نتائج ہیں جو یہ بھگت رہے ہیں۔ وہ جو اعمال کر رہے ہیں ان کے مطابق وہ انسانیت کے نچلے سے نچلے درجے تک گر جاتے ہیں لہٰذا وہ توہین آمیز درجے کے عذاب ہی کے مستحق ہوں گے۔

اب مشرکین کے شرکیہ نظریات و افعال پر ان کی جانب سے پیش کردہ نئی دلیل۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ

لَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝

"یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے"۔ ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں۔ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا' اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔

ان لوگوں کی اس نئی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے شرک' بتوں کی بندگی اور اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے شرک اور بتوں کی بندگی اور بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے کے فعل کو اللہ کے ارادے اور مشیت کی طرف موڑتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا اور اس کا ارادہ نہ ہوتا تو نہ ہم یہ خلاف شریعت کام کرتے اور نہ ہمارے آباؤ اجداد۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو یہ سب کام کب ہوتے؟

دراصل ان لوگوں نے مشیت کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ لوگ انسان سے انسان کی وہ اہم اختیاری خصوصیت چھین لینا چاہتے ہیں جو اللہ نے انسان کو بخشی ہے۔

اللہ اپنے بندوں سے یہ نہیں چاہتے کہ وہ شرک کریں' نہ اللہ کی یہ رضا ہے کہ اللہ کی حلال کردہ طیبات کو ناحق حرام کر دیا جائے۔ اللہ کی رضا تو تمام قوانین شریعت اور تمام نبیوں کی ہدایات میں ثبت شدہ ہے۔ تمام رسولوں نے اس کی تبلیغ کی ہے' اس کے لیے جدوجہد کی ہے اور انہوں نے پوری طرح فریضہ دعوت دین ادا کیا ہے۔

ولقد بعثنا فی كل امة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت (۱۶: ۳۶) "ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔ پس یہ ہے اللہ کا حکم اور یہ ہے اس کا ارادہ اپنی مخلوق کے بارے میں۔ اللہ بہرحال لوگوں کو ایسے کاموں سے نہیں روکتا جن کے بارے میں وہ ازروئے تخلیق رکنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ نہ اللہ نے لوگوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ اللہ کی مخالفت کریں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب لوگ اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں تو اللہ ان کو پکڑتا ہے اور سزا دیتا ہے۔

فسیروا فی الارض فانظروا كیف كان عاقبة المكذبین (۱۶: ۳۶) "پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ وہ انسان کو ہدایت و ضلالت کی استعداد

کے ساتھ پیدا کرے اور انسان کو یہ اختیار ہو کہ وہ آزادانہ طور پر جو راہ چاہے اختیار کرے۔ پھر اللہ نے انسان کو عقل عطا کی تاکہ وہ عقل کو کام میں لا کر ان دونوں راستوں میں سے کوئی ایک راہ اپنے لیے منتخب کرے، خصوصاً عقل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ایسے دلائل و شواہد بھی رکھے ہیں جو انسان کی آنکھ، کان اور عقل و شعور اور دل و دماغ کو دعوت غور و فکر دے رہے ہیں، اور وہ ان دلائل و شواہد کو رات دن دیکھ رہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر اکتفاء نہ کیا کہ انسان صرف عقل و شعور کے بل بوتے پر ہی اپنے لیے صحیح راہ کا انتخاب کرے۔ اللہ نے ہر دور اور ہر امت کے لیے ایک رسول بھی بھیجا تاکہ اگر انسان کی عقل کے لیے کسی مشکل معاملے کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے تو رسول ایک شریعت کی صورت میں ایک معیار نیک و بد بھی مفصل طور پر انسانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ انسان کی ذاتی خواہشات اور اس کے میلانات اسے گمراہ نہ کر سکیں۔ پھر اللہ نے ان رسولوں کو قہار و جبار نہیں بنایا کہ لوگوں کی گردنیں موڑ کر ان کو راہ ایمان پر ڈال دیں۔ ان کو بھی صرف مبلغ بنایا کہ وہ لوگوں کو صحیح راستے کی طرف تبلیغ و تلقین کے ذریعے موڑیں، وہ ان کو بتائیں کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ نہ بتوں کی، نہ اپنی ہوا و ہوس کی اور نہ کسی بادشاہ کی۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶: ۳۶)
"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔ چنانچہ ایک فریق نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ (۱۶: ۳۶) "اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی"۔ اور بعض نے گمراہی کی راہ لی۔

وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ (۱۶: ۳۶) "اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی"۔ یہ دونوں فریق اللہ کے دائرہ مشیت کے اندر ہی رہے۔ ان میں سے کسی فریق کو بھی اللہ نے ہدایت یا ضلالت پر مجبور نہیں کیا، اللہ نے ان کے لیے یہ راستہ وضع کیا کہ ان میں سے ہر فریق اپنے آزادانہ ارادے اور آزادانہ طرز عمل سے جو راہ چاہے اختیار کرے جبکہ اللہ نے ان کے لیے نشانات راہ اور علامات حق اس کائنات میں بھی اور ان کے نفوس میں بھی ودیعت کر دیئے۔

اس طرح قرآن کریم اس تفصیل سے اس وہم کا قلع قمع کر دیتا ہے جس کی طرف مشرکین نے اپنے استدلال میں اشارہ کیا تھا۔ آج ہمارے دور میں بھی بہت سے نافرمان اور سرکش ایسا ہی استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس سلسلے میں اسلامی عقائد و نظریات بالکل واضح ہیں۔ یوں کہ اللہ اپنے بندوں کو بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے منع کرتا ہے، برائی کرنے والوں کو کبھی کبھی اس دنیا میں بھی سزا دے دیتا ہے اور یہ سزا ایسی واضح ہوتی ہے جس سے اللہ کا غضب بالکل عیاں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد یہ استدلال کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ کوئی یہ کہے کہ اللہ کا ارادہ ہمیں برائیوں پر مجبور کرتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو واضح اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی راستہ اختیار کریں اور یہ اختیار دینا ہی اللہ کا ارادہ ہے۔ اس معنی میں ان سے جو اچھائی یا بھلائی یا شر اور معصیت صادر ہوتی ہے، وہ اس مفہوم میں اللہ کی

مشیت اور ارادے کے مطابق ہوتی ہے 'جیسا کہ ہم نے واضح کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت الہیہ بتائی جاتی ہے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴿۳۷﴾

"اے نبی 'تم چاہے ان کی ہدایت کے لیے کتنے ہی حریص ہو 'مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اسے ہدایت نہیں دیا کرتا اور اس طرح کے لوگوں کی مدد کوئی نہیں کر سکتا"۔

ہدایت و ضلالت کا مدار اس پر نہیں ہے کہ رسول اللہ اس پر زیادہ حریص ہیں یا نہیں ہیں کیونکہ رسول کا کام تو صرف ابلاغ ہے۔ رہی ہدایت و ضلالت تو وہ سنت الہیہ کے مطابق ملتی ہے اور یہ سنت ایسی ہے کہ اس کے نتائج کو روکا نہیں جا سکتا۔ جس کو اللہ گمراہ کرتا ہے تو وہ اسے سنت الہیہ کے مطابق گمراہ کرتا ہے۔ جو شخص سنت الہیہ کے مطابق گمراہ ہو جائے اسے اللہ ہدایت نہیں دیتا کیونکہ سنت الہیہ اپنے نتائج ظاہر کرتی رہتی ہے۔ یہ سنت دائرہ مشیت الہیہ کے اندر ہے اور و اللہ فعّالٌ لما یشاءُ "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ وَ ما لھُم مّن نّصرین (۱۶:۳۷) "ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہو گا"۔ یعنی اللہ کی مشیت کے مقابلے میں۔

اب منکرین اور مستکبرین کی تیسری کٹ حجتی:

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴿۴۰﴾

۵ ع ۶ ۱۱

"یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا"۔ اٹھائے گا کیوں نہیں؟ یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں 'اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔ (رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے"۔

جب سے اللہ نے اپنے رسول بھیجے ہیں اور انہوں نے بعث بعد موت سے ڈرایا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام شروع ہوا تو اکثر لوگ بعث بعد الموت کے عقیدے کے بارے میں خلجان میں مبتلا رہے ہیں۔ اہل قریش بھی اللہ کے نام کی سخت سے سخت قسمیں کھا کر یہ کہتے تھے کہ اللہ مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ یہ لوگ اللہ کے وجود کے تو قائل تھے لیکن اس بات کے قائل نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو قبروں سے اپنی اصلی حالت میں دوبارہ اٹھائے گا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ کام تو بہت ہی مشکل ہے کہ جب انسان گل سڑ کر ذرے ذرے ہو جائے تو پھر کس طرح جمع ہو گا۔

لیکن ان لوگوں نے اس بات پر غور نہ کیا کہ اللہ نے پہلی بار کس طرح ان ذرات کو حیات بخشی۔ یہ لوگ قدرت الہیہ کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے اور خدا کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کیا۔ اللہ کے لیے کسی چیز کا ایجاد کرنا کچھ ممکن نہیں ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو کسی چیز کو کہتا ہے کہ ہو جا' پھر وہ ہو جاتی ہے۔

نیز انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ بعث بعد الموت کی حکمت کیا ہے۔ بے شمار امور اس جہان میں ایسے ہیں جو اپنے قدرتی انجام تک نہیں پہنچتے۔ اس جہان میں حق و باطل کے بارے میں لوگوں کے درمیان سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے بارے میں لوگوں کے تصورات مختلف ہیں۔ خیر و شر کا معیار مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان ان امور کا فیصلہ اس جہان میں ہی نہیں چکاتا کیونکہ مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو اس جہاں میں مہلت و امتیاز دیا جائے اور یہاں ہی سب کو جزاء و سزا نہ دے دی جائے۔ ان امور کا فیصلہ قیامت میں بعث بعد الموت کے وقت ہوتا ہے۔

قرآن کریم اس کافرانہ کٹ حجتی کو آغاز ہی میں رد کر دیتا ہے اور اس غلطی اور غلط سوچ کو اللہ تعالیٰ یوں دور کرتا ہے کہ بلیٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا (۱۶:۳۸) "یہ تو ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے"۔ اور جب اللہ کسی بات کا وعدہ کر لے تو اس کی خلاف ورزی کسی حال میں بھی نہیں ہوتی۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۶:۳۸) "مگر اکثر لوگ جانتے نہیں" کہ اللہ کے عہد کی حقیقت کیا ہوتی ہے یعنی وہ اٹل ہوتا ہے۔

پھر اللہ کے اس فیصلے کے پیچھے ایک گہری حکمت بھی ہے۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ (۱۶:۳۹) "اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں' اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔ کس بات میں؟ اس بات میں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اس بات میں کہ وہ رسول کو جھوٹا سمجھتے تھے' اس بات میں کہ ان کے نزدیک قیام قیامت ممکن نہیں ہے۔ نیز اپنے اعمال و اعتقادات وغیرہ ہیں۔

رہا اس کا عملاً قیام تو وہ کوئی مشکل نہیں۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۱۶ : ۴۰) ”ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے“۔ اور قیام قیامت بھی ایسے ہی حالات میں سے ایک حالت ہے جوں ہی ارادہ الٰہی اس طرف متوجہ ہوا وہ برپا ہو جائے گی۔

منکرین اور مکذبین کے بالمقابل ذرا مومنین صادقین کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے جو نہ صرف اپنے نظریہ حیات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس کے لیے اپنا مال اور اپنا ملک چھوڑ کر ہجرت بھی کرتے ہیں اور یہ کام وہ صرف رضائے الٰہی کی خاطر کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

”اور جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں۔ (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)“۔

یہ لوگ جنہوں نے اپنے ملک و مال کو چھوڑ کر ہجرت کی' اپنی جائیداد اور محبوب آبائی وطن سے دستکش ہو گئے۔ انہوں نے ملک' رشتہ داروں اور اپنی محبوب یادوں کی قربانی دی۔ یہ لوگ دار آخرت میں عوضانہ کے مستحق ہیں۔ انہوں نے جو جو قربانیاں دیں اس کا اجر تو انہیں ملنا چاہئے۔ پھر یہ مال اور ملک انہوں نے خوشی سے نہیں چھوڑا بلکہ ظلم سے تنگ آکر چھوڑا۔ اگر یہاں انہوں نے اپنی اچھی رہائش گاہیں چھوڑیں تو لازم ہے کہ دنیا میں بھی ان کو ان حالات سے اچھے حالات نصیب ہوں۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً (۱۶ : ۴۱) ”ان کو ہم دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیں گے“۔ اور آخرت میں بھی ان کو ہم اچھے مقامات پر ٹھہرائیں گے۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (۱۶ : ۴۱) ”اور آخرت کا اجر بہر حال بڑا ہے“۔ کاش کہ لوگ اس بات کو جانتے۔

اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ (۱۶ : ۴۲) ”جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں“۔ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے' اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اور اسی کی طرف متوجہ ہیں۔ اگر قیامت نہ ... تو ایسے لوگوں کا اجر کہاں ان کو ملے گا۔

---000---

اس سے قبل مشرکین کے عذرات کو رد کرتے وقت یہ کہا گیا کہ اللہ کی مرضی نہیں ہے کہ تم یا تمہارے آباء شرک کرو' ورنہ وہ رسول کیوں بھیجتا۔ جو ہر امت میں بھیجے گئے۔ یہاں اب رسولوں کے منصب کے فرائض ازاتفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کا بھی تعین کیا جاتا ہے' اور حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جو دعوت دے رہے ہیں اگر تم نے اس کا انکار کیا تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔـلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

"اے نبی" ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں' آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے' اہل ذکر سے پوچھ لو' اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں"۔

یعنی اس سے قبل ہم نے جو رسول بھیجے تھے وہ آدمی ہی تھے۔ فرشتے نہ تھے۔ نہ آدم اور فرشتوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق تھے۔ البتہ یہ برگزیدہ لوگ تھے۔

نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (۱۶:۴۳) "جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے" جیسا کہ آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں۔ ان کے فرائض بھی یہی تھے کہ دعوت کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ جس طرح آپ کا بھی یہی فریضہ ہے۔

فَسْــَٔـلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ (۱۶:۴۳) "اہل ذکر سے پوچھ لو"۔ یعنی اہل کتاب سے پوچھ لو جن کے پاس بہت سے رسول آئے کہ یہ رسول آدمی تھے یا فرشتے یا کوئی اور مخلوق۔

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶:۴۳) "اگر تم خود نہیں جانتے"۔ ان رسولوں کو کتابیں بھی دی گئیں اور دلائل بھی دیے گئے۔ عربی میں زبر کے معنی متفرق کتابوں کے ہوتے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶:۴۴) "اور ہم نے اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے"۔ نبی آخر الزمان کا بیان ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو پہلے اہل کتاب تھے' جنہوں نے اپنی کتاب میں اختلاف کیا اور قرآن آیا اور

ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا اور مسئلہ مختلفہ میں حق بات کہہ دی۔ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے سوا آپ کے معاصر تھے 'جن کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا تاکہ لوگ اللہ کی آیات اور قرآن کی آیات دونوں میں غور و فکر کریں۔

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (١٦: ٤٤) "قرآن مجید ہر وقت انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور انسانی شعور کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ درس 'جس کا آغاز مستکبرین اور مکارین کی سمت ہوا تھا' اس کے آخر میں قارئین کو چند وجدانی احساس دلائے جاتے ہیں۔ پہلا احساس یہ دلایا جاتا ہے کہ انسان کو رات اور دن کے کسی بھی وقت اللہ کے عذاب اور اللہ کی جوابی تدبیر سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرا احساس یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اللہ کو یاد رکھنا چاہئے اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنا چاہئے۔ یہ انسان ہی ہے جو تکبر کرتے ہوئے غافل اور منکر ہو جاتا ورنہ اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات ہر وقت تسبیح میں مشغول رہتی ہے۔

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٤٥﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٤٦﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿٤٧﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿٥٠﴾ السجدۃ

۶ ع ۱۰ ۱۲

"پھر کیا وہ لوگ جو (دعوت پیغمبر کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں' اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے 'یا ایسے گوشے سے ان پر عذاب لے آئے جدھر سے اس کے آنے کا ان کو وہم و گمان تک نہ ہو' یا اچانک چلتے پھرتے ان کو پکڑ لے 'یا ایسی حالت میں انہیں پکڑے جب کہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور وہ اس سے بچنے کی فکر میں چوکنے ہوں؟ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے یہ لوگ اس کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی نرم خو اور رحیم ہے۔

اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟ سب کے سب اسی طرح اظہار عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جس قدر جان دار

مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ' سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔ وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے۔ اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے' ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں"۔

یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ انسانی سوسائٹی کے اندر دست قدرت کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض لوگ اللہ کی سخت پکڑ میں آجاتے ہیں۔ وہ مکاریاں اور تدابیر کرتے ہی رہتے ہیں لیکن جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو وہ ایک غالب اور صاحب قوت ہستی کی گرفت ہوتی ہے۔ پھر ان کی قوت' ان کا مال اور ان کا وسیع علم ان کو بچا نہیں سکتا۔ لیکن اس کے باوجود بقیہ مکار اپنی مکاریاں جاری رکھتے ہیں اور جو اللہ کے عذابوں سے بچ نکلتے ہیں وہ پھر اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ الا یہ کہ ان کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ ڈرتے نہیں کہ خدا ان کو بھی پکڑ سکتا ہے۔ ہر وقت وہ اللہ کی گرفت میں آسکتے ہیں چاہے سوتے میں یا جاگتے ہوئے غفلت یا بیداری میں۔ قرآن کریم انسانی احساس اور انسانی وجدان کو بیدار کرتا ہے تاکہ لوگ متوقع عذاب سے ڈریں اور اللہ کے عذاب سے وہی لوگ غافل ہوتے ہیں جو خسارے میں ہوں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (۱٦: ٤٥) "پھر کیا وہ لوگ جو بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ایسے گوشے سے ان پر عذاب لے آئے جس طرف سے اس کے آنے کا وہم وگمان تک نہ ہو"۔ یا یہ کہ ایسے لوگوں کو اللہ اس حال میں پکڑ لے کہ یہ لوگ شہر شہر' قریہ قریہ تجارت اور سیاحت کے لیے پھر رہے ہوں۔

فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ (۱٦: ٤٦) "یہ لوگ اللہ کو عاجز کرنے کی طاقت تو نہیں رکھتے"۔ ان لوگوں کا پکڑا جانا یا جائے گرفتاری کسی حال میں بھی اللہ سے بعید نہیں ہے۔

اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ (۱٦: ٤٧) "یا ایسی حالت میں انہیں پکڑ لے کہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو"۔ کیونکہ ان کا چوکنا ہونا اور عذاب کی توقع رکھنا بھی عذاب الٰہی کو کسی صورت میں رد نہیں کر سکتا۔ اللہ اس حال میں بھی پکڑ سکتا ہے جب وہ دفاع کے لیے تیار ہوں اور اس حال میں بھی جب وہ غافل ہوں۔ لیکن اللہ نہایت ہی مہربان اور رحیم ہے۔

یہ لوگ جو برائیوں کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں کیا اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ کیوں یہ اپنی مکاریوں میں سرگرداں ہیں؟ کیوں یہ لوگ اپنی بے راہ روی میں آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں اور واپس نہیں آتے اور خدا سے نہیں ڈرتے! باوجود اس کے کہ ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات اپنے قوانین فطرت اور ضوابط قدرت کے ساتھ پکار رہی ہے کہ یہ ہے راہ ایمان۔ بلکہ یہ پوری کائنات ذات باری کی حمد خواہ اور ثنا گو ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ

وَهُمْ دٰخِرُوْنَ (۱٦ : ٤٨) "کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتا ہے' دائیں اور بائیں گرتا ہے۔ سب کے سب اس طرح اظہار عجز کر رہے ہیں۔

سایوں کی حرکات کا منظر! سایہ آگے بڑھتا ہے' واپس ہوتا ہے اور پھر ایک جگہ رک جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو صرف اس آنکھ کو دعوت نظارہ دیتا ہے جو کھلی ہو' اس دل کو دعوت ریبرت دیتا ہے جس کے دروازے کھلے ہوں' اس احساس کو شعور دیتا ہے جو جاگ رہا ہو اور ایسے شخص کو ہدایت دیتا ہے جس کے قوائے مدرکہ کائنات کے ساتھ ہمقدم ہوں۔

قرآن کریم یہاں قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کی اطاعت کو سجدہ ریز ہونے سے تعبیر کرتا ہے۔ سجدہ گزاری' خضوع و خشوع کی آخری تصویر ہوتی ہے۔ یہاں متوجہ کیا جاتا ہے کہ درختوں کے سائے بڑھتے ہیں اور پھر سکڑتے ہیں۔ سائے کی حرکت نہایت ہی خفیف ہوتی ہے اور انسانی شعور پر اس کا نہایت ہی گہرا اثر ہوتا ہے۔ پھر اس کائناتی مخلوق کے ساتھ فرشتوں کی فوج اشیاء' درخت' سائے' پرندے اور چرندے اور پھر فرشتے سب کے سب اللہ کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہیں اور عبادت اور بندگی بجالا رہے ہیں! یہ سب اللہ کی بندگی سے نہ تکبر کرتے ہیں اور نہ سرمو انحراف کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ لیکن اے منکر از بنی نوع انسان تمہارا کتنا دل گردا ہے کہ تو تکبر بھی کرتا ہے اور سرتابی بھی۔ یہ تیری نہایت ہی تعجب انگیز حرکت ہے!

یہ سبق یہاں منکرین اور مستکبرین کی طرف اشارہ کر کے ختم ہو جاتا ہے تاکہ سبق کے آخر میں ان کو خصوصیت کے ساتھ متوجہ کر دے کہ تمہارا انکار و استکبار فطرت کائنات کے خلاف ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۱ ایک نظر میں

مسئلہ توحید کا یہ تیسرا دور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک خدا ہے۔ اس سبق کا آغاز اس مفہوم سے ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہے جو وحدہ مالک اور منعم ہے۔ پہلی تین آیات میں یہی مفہوم بیان ہوا ہے۔ یہاں ایک بہترین تمثیل دی گئی ہے کہ ایک مالک ہے' رازق ہے اور دوسرا شخص غلام اور مملوک اور محتاج ہے۔ جس کا کوئی اختیار نہیں۔ اور جس کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تو پھر اللہ جو خالق مالک اور رازق ہے وہ اور تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کس طرح برابر ہو سکتے ہیں جو نہ مالک ہیں اور نہ رازق۔ کس طرح ہم دونوں کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی الٰہ ہے اور یہ بھی!

اس سبق میں لوگوں کا ایک نمونہ یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو وہ پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔

اس سبق میں بت پرستی کے اوہام و خرافات کی کئی صورتیں بھی دی گئی ہیں۔ یہ لوگ اپنے بنائے ہوئے الہوں کے لیے بعض جانوروں کو مخصوص کرتے ہیں۔ حالانکہ خود ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے مملوکات میں سے کسی چیز کو وہ اپنے غلاموں کے دائرۂ اختیار میں دینے کے لیے تیار نہیں۔ نہ کوئی چیز ان کے ساتھ تقسیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ خود تو لڑکیوں کو بے حد ناپسند کرتے ہیں لیکن فرشتوں کو اللہ کی لڑکیاں کہتے ہیں۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۶:۵۸) "اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ نہایت ہی کبیدہ خاطر ہوتا ہے"۔ یہ لوگ اللہ کے لیے تو وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے یہ خود ناپسند کرتے ہیں لیکن ان کی زبانوں پر یہ دعویٰ ہر وقت رہتا ہے کہ ان کے لیے تو اچھائی ہی مقرر ہے اور یہ کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ اچھا ہی رہے گا۔ یہ اوہام و خرافات ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو مبعوث ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ آپ ان کے سامنے ان کی حقیقت کھول کر بیان کر دیں۔ چنانچہ آپ اہل ایمان کے لیے صاحب ہدایت اور باعث رحمت ہیں۔

اس کے بعد حقیقی خدا کی پیدا کردہ بعض چیزوں کی نمونے دیئے جاتے ہیں اور اگر ان میں انسان ... غور و فکر کرے تو وہ بہت کچھ نصیحت اور عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی ایجاد پر صرف اللہ وحدہ قادر ہے اور یہ چیزیں اللہ کی خدائی اور آپ کی برتری کے دلائل ہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے آسمانوں سے بارشیں برسانے کا انتظام فرمایا جس کے ذریعے مردہ زمین تروتازہ ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانی کے علاوہ لوگوں کے پینے کے لیے نہایت ہی خوشگوار اور لذیذ دودھ پیدا کیا اور یہ دودھ جانور کے گوبر اور خون کے درمیان سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر اللہ نے کھجور اور

انگور پیدا کیے جن سے تم لوگ نشہ آور چیز بھی بناتے ہو اور رزق حسن بھی۔ پھر اس نے شہد کی مکھی کو یہ وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا' درختوں میں گھر بنا' اور ٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں گھر بنا اور اس میں سے شہد پیدا ہوتا کہ وہ لوگوں کے لیے شفا ہو۔ اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ بعض کو وہ جلدی بلا لیتا ہے اور بعض دوسرے طویل عمر پاتے ہیں۔ وہ علم کو بھول جاتے ہیں اور اس قدر سادہ ہو جاتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ پھر اللہ نے بعض لوگوں کو دوسروں پر رزق میں فضیلت دی۔ پھر بعض کو بیویاں اور لڑکے اور پوتے دیئے۔ ان حقائق کے باوجود بعض لوگ ایسے شرکاء کی بندگی کرتے ہیں جو زمین و آسمان میں لوگوں کو کسی قسم کا رزق دینے پر قدرت نہیں رکھتے اور اس کے ساتھ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو مشابہ اور مماثل قرار دیتے ہیں۔

احساس دلانے والے یہ دلائل جو نفس انسانی اور اس کے ماحول میں بکھرے ہوئے ہیں' اس کی طرف قرآن انسان کو متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کی قدرت کو پا سکیں جو ان کی ذات' ان کے رزق' ان کے کھانے' ان کے پینے اور ان کے ارد گرد ان کے افادے کی ہر چیز میں متحرک ہے۔ اس سبق کا خاتمہ پھر ان دو مثالوں پر ہوتا ہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔ یہ گویا انسانی عقل و وجدان کو احساس دلانے کی ایک مفید کوشش ہے' جس کے گہرے اثرات ہیں اور اس میں نفس انسانی کے رباب کے نہایت ہی حساس تاروں کو چھیڑا گیا ہے لہٰذا ممکن نہیں کہ نفس انسانی اس سے متاثر نہ ہو اور لبیک نہ کہے۔

---○○○---

درس نمبر ۱۲۱ تشریح آیات

۵۱ --- تا --- ۷۶

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اللہ کا فرمان ہے کہ "دو خدا نہ بنالو' خدا تو بس ایک ہی ہے' لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"۔ اسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' اور خالصتاً اسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کرو گے؟ تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اس مہربانی کے شکریے میں) شریک کرنے لگتا ہے' تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا' مزے کرلو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اللہ کا یہ فرمان ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ۔ خدا تو بس ایک ہی ہے۔ اس بات کے لئے اسلوب نہایت ہی فیصلہ کن اور مثبت اختیار کیا گیا۔ الٰہ کے بعد دو کا لفظ آیا ہے اور دوسرے فقرے میں نہیت تاکیدی مصرع کہ "اللہ تو بس ایک ہی ہے' اور ان دونوں فقروں کے بعد ایک دوسرا مصرع ہے "لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"۔ اور میرے سوا کسی اور سے نہ ڈرو۔ کسی کے ساتھ ڈرنے کا ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو جس طرح مجھ سے ڈرنا ہوتا ہے۔ فارهبون اس لیے کہا گیا کہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ ڈرو۔ اسلامی نظریہ حیات میں عقیدۂ توحید ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اسلامی نظریہ حیات قائم ہی عقیدۂ توحید پر ہے۔ جب تک توحید نہ ہو ایمان قائم ہی نہیں ہو سکتا اور ایمان کے بغیر اسلام کا نظریہ حیات قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ مسئلہ اس سے تب ہو دماغ میں اس قدر واضح ہونا چاہئے کہ اس میں کوئی التباس نہ ہو اور کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

اور جب خالق و مالک و الٰہ وہی ہے تو پھر اس زمین و آسمان اور کائنات کا مالک بھی وہی ہے۔

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۶:۵۲) "وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے"۔

وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (۱۶:۵۲) "خالصتاً اسی کا دین چل رہا ہے"۔ یعنی جب سے یہ کائنات اور دین وجود میں آئے ہیں اسی کا دین مسلسل چل رہا ہے اور منعم بھی وہی اللہ ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶:۵۳) "تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے' اللہ ہی کی طرف سے ہے"۔ یہ بات تمہاری فطرت کے اندر رکھی ہوئی ہے کہ جب کوئی مشکل وقت آتا ہے تو تمہاری فطرت پکار اٹھتی ہے کہ صرف اللہ کو پکارو۔ اس مشکل وقت میں پھر کوئی وہمی مددگار یاد بت انسان کو یاد نہیں رہتا۔

ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ (۱۶:۵۳) "پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو"۔ اور تم اس وقت پھر چیخ چیخ کر پکارتے ہو کہ وہ تمہیں اس مشکل سے نجات دے۔

یوں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کو خدائی' حاکمیت' ملک' قانون سازی' نعمت اور ہدایت اور نظام زندگی دینے کا واحد سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ انسانی فطرت اس بات کی تصدیق یوں کرتی ہے کہ جب انسان کسی عظیم مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس وقت انسان کی حقیقی فطرت تمام شرک کے تمام شائبوں اور آلائشوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض لوگ پھر بھی ایسے کج دماغ ہوتے ہیں کہ جب یہ مہیب خطرہ ان سے ٹل جاتا ہے تو یہ لوگ اچانک شرک کرنے لگتے ہیں۔ یوں وہ اللہ کے انعامات کی ناشکری کرتے ہیں اور اللہ کی ہدایات سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ لیکن دنیا کا یہ مختصر دور جلد ختم ہو گا اور ذرا انتظار کرو کہ آخرت میں ان کو مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶:۵۵) "اچھا مزے کر لو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔ یہ نمونہ مخلوقات جس کے خدوخال قرآن مجید نے یہاں نقش کیے۔

ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ

بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (۱۶:۵٤) "پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو پھر تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتا ہے۔ اس طرز کے لوگ انسانوں میں ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ مشکلات میں دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انسان بمقتضائے فطرت اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ کے سوا بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ عافیت کے

زمانے میں انسان عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کا تعلق باللہ کمزور پڑ جاتا ہے - اس میں کئی رنگ کی کج رویاں پائی جاتی ہیں' ان میں سب سے بڑی کج روی اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے' نیز انسان بعض رسوم اور اقدار کو بھی خدائی درجہ دے دیتا ہے' اگرچہ ان کو وہ الٰہ نہیں کہتا۔

بعض اوقات اس کا انحراف بہت ہی شدید ہو جاتا ہے اور فطرت پوری طرح بگڑ جاتی ہے کہ بعض لوگ نہایت ہی شدید حالات میں بھی اللہ کو نہیں پکارتے بلکہ وہ بعض دوسری ہستیوں کو بچاؤ' نجات اور امداد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کا بہانہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ہستیاں اللہ کے ہاں جاہ و منزلت رکھتی ہیں اور بعض اوقات بعض لوگ اس تصور کے سوا بھی دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ اولیاء اللہ کو مصیبتوں کے وقت پکارتے ہیں۔ ان لوگوں کی یہ حرکت مشرکین جاہلیت کے شرک سے بھی بدتر ہے کیونکہ مشرکین جاہلیت کے بارے میں تو قرآن یہ کہتا ہے کہ سخت مشکلات میں یہ لوگ صرف اللہ کو پکارتے تھے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ

"یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں ان کے حصے ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے مقرر کرتے ہیں"۔

مثلاً یہ لوگ اپنے اوپر بعض جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ نہ ان پر سوار ہوتے ہیں اور نہ ان کا گوشت چکھتے ہیں یا بعض جانوروں کے گوشت کو مردوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں اور عورتوں پر وہ حرام تصور ہوتے ہیں اور یہ کام وہ اپنے نام نہاد الہوں کے نام پہ کرتے ہیں۔ ان کے ان مزعومات کی تفصیلات ہم نے سورہ انعام میں دے دی ہیں۔ اور جن الہوں کے نام پر یہ لوگ شرک کرتے ہیں ان کے بارے میں ان لوگوں کو کوئی علم نہیں ہے۔ یہ ان کے موروثی تصورات ہیں جو جاہلیت سے ان کے ہاں نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ یہ نعمتیں ان کو اللہ نے دی ہیں جو وحدہ لاشریک ہے اور جن الہوں کی طرف یہ ان کو منسوب کرتے ہیں ان کے بارے میں خود ان کو کچھ علم نہیں ہے۔ غرض یہ ان نام نہاد الہوں کے عطا کردہ انعامات نہیں ہیں بلکہ یہ انعامات اللہ وحدہ کے ہیں جس کے ساتھ یہ لوگ شریک کرتے ہیں۔

یوں قرآن کے نظریہ حیات اور ان جاہلوں کے نظریات کے درمیان واضح فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ رزق سب کا سب اللہ واحد کا عطا کردہ ہے۔ اور اس کے نام سے استعمال ہونا چاہئے یہ لوگ بعض ارزاق کو ان الہوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ایسی ہستیوں کو الٰہ بناتے ہیں جن سے انہیں روکا گیا ہے۔ دونوں نظریات میں یہ واضح فرق ہے۔

لیکن آج قرآن کے ہوتے ہوئے اور عقیدۂ توحید کی وضاحت کے بعد بھی بعض لوگ اللہ کی عطا کردہ بعض اقسام رزق کو ایسی شخصیات کے نام سے منسوب کرتے ہیں جو جاہلیت کے الہوں کے مشابہ ہیں۔ آج بھی بعض وب ایسی باتیں کرتے ہیں کہ "یہ سید بدوی کا بکرا ہے"۔ یہ بکرا جہاں چاہے چرے چگے کوئی اسے منع نہیں کرے گا۔ کوئی شخص اس کو نہ کھائے گا۔ وہ سید بدوی کے نام سے ذبح ہو گا اور اس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے گا۔ بعض لوگ آج بھی بعض اولیاء کے نام جانوروں کی نذریں مانتے ہیں اور پھر یہ نذریں چڑھاتے ہیں۔ یہ ان اولیائے کے نام پر ہوتی ہیں اور ان پر اللہ کا

نام ہی نہیں لیا جاتا۔ صرف مذکور ولی کا نام لیا جاتا ہے۔ اہل جاہلیت بھی اسی طرح بعض نامعلوم خداؤں کے نام پر اپنی نذریں چڑھاتے تھے۔ ایسے جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کا نام لیا جائے کیونکہ یہ اہل لغیر اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝

"خدا کی قسم 'ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے"۔ اللہ قسم کھا کر تاکید مزید سے یہ بات کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک افتراء ہے اور اسلامی عقیدہ اور ایمان کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ اس سے عقیدۂ توحید کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں اللہ ضرور پوچھے گا۔

--- ○○○---

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

"یہ خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! اور ان کے لیے وہ جو یہ خود چاہیں؟ جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں"۔

عقائد کے بارے میں انسان کا فکری انتشار اور فساد صرف عقائد کے حدود تک ہی محدود نہیں رہا کرتا بلکہ یہ زندگی کے پورے طور طریقوں اور رسم و رواج میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ زندگی کے لیے واحد محرک ہوتا ہے۔ چاہے یہ کسی کی زندگی میں یہ نظریہ بادی النظر میں محرک نظر آئے یا پس منظر میں ہو۔ دور جاہلیت کے عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں یعنی فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ لیکن ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے گھر میں بیٹی کی ولادت کو بہت ہی برا خیال کرتے تھے۔ ان کے خیال میں بیٹیاں اللہ کے لیے ہیں اور وہ چونکہ بیٹوں کو پسند کرتے ہیں اس لیے بیٹے ان کے ہیں۔

ان کے اس نظریاتی فساد ہی کی وجہ سے ان کے ہاں یہ رسم بد پڑ گئی کہ وہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے یا اگر زندہ رکھ لیتے تو ان کو نہایت ہی ذلت 'بدسلوکی اور کم تر درجے میں رکھتے اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کی وجہ سے ان کو خفت اٹھانی پڑے گی اور ان کی مالی حالت گر جائے گی کیونکہ عورتیں نہ جنگ کر سکتی ہیں اور

نہ بہت زیادہ کمائی کے لائق ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لوٹ مار اور ڈاکے میں عورتوں کو باندیاں بنا کر لے جاتے تھے یا وہ خاندان پر بوجھ بن جاتی تھیں۔ یوں خاندان کی مالیات پر بوجھ ہوتیں' اس لیے وہ انہیں پسند نہ کرتے۔

جبکہ صحیح نظریات ان سب باتوں سے بہت دور ہیں۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب کا رزاق ہے۔ ہر شخص کو وہی بات پیش آتی ہے جو اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ انسان کو اللہ نے ہی شرف پیدا کیا ہے اور اس میں مرد عورت برابر ہیں' پھر عورت کے بغیر نہ انسانیت جاری رہ سکتی اور نہ مکمل ہو سکتی جیسا کہ اللہ کا حکم ہے۔

یہاں جاہلیت کے رسم و رواج کی خوب تصویر کشی کی جاتی ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۶ : ۵۸) "جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ نہایت ہی کبیدہ خاطر ہوتا ہے"۔ یعنی حزن و ملال سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے غم کو چھپانے کی سعی لاحاصل کرتا ہے۔ وہ اس ولادت کو ایک مصیبت سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ اللہ کا عطیہ ہوتی ہے جیسا کہ بیٹا ایک عطیہ ہوتا ہے کیونکہ انسان بذات خود رحم مادر میں نہ مرد بنا سکتا ہے اور نہ عورت پیدا کر سکتا ہے۔ نہ انسان خود جنین میں حیات پھونک سکتا ہے نہ انسان ایک سادہ نطفے سے انسان تیار کر سکتا ہے۔ اگر انسان صرف انسانی زندگی کی تخلیق پر ہی غور کرے کہ کس طرح نطفے سے لے کر ایک تندرست و توانا انسان تک وہ نشوونما پاتی ہے تو بچہ چاہے مرد ہو یا عورت ہو' وہ خوشی خوشی اس کا استقبال کرے۔ سوچنے والے انسان کے لیے تو ہر بچہ اللہ کا معجزہ ہے اور یہ معجزہ بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن بار بار دہرائے جانے کے باوجود اس معجزے کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان صحیح الفکر ہو تو وہ لڑکی کی پیدائش کی اطلاع پا کر نہ غمگین ہو اور نہ لوگوں سے چھپتا پھرے۔ اس لیے کہ لڑکی کی تخلیق میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس معاملے میں ایک باپ تو اس عظیم معجزہ کے صدور میں محض ایک پرزہ ہے اور بس۔

اب اللہ کی حکمت کو دیکھیں اور یہ کہ معجزۂ حیات کا صدور کس طرح ہوتا ہے؟ بادی النظر میں یہ بات نظر آتی ہے کہ انسان کو اللہ ایک مرد اور عورت کے ملاپ کے ساتھ پیدا کرتا ہے' حیات انسانی کے وجود میں آنے کے لیے جس طرح مرد ضروری ہے' اسی طرح عورت بھی ضروری ہے بلکہ مرد کے مقابلے میں عورت کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ بچے کی نشوونما کے لیے تو عورت زیادہ ضروری اور اہم ہے جبکہ مرد کے لیے بھی وہ جائے قرار ہے۔ تو پھر عورت کی پیدائش پر کسی کا چہرہ کیوں سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر قوم سے کیوں بھاگتا پھرتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ حیات بشر کا تسلسل عورت کے بغیر ممکن نہیں ہے؟

ظاہر ہے کہ سوچ' نظریہ اور عقیدے کا انحراف اور فساد معاشرے کے اندر رسم و رواج اور لوگوں کے طرز عمل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۱۶ : ۵۹) "دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ لگاتے ہیں"۔ اور ان کے یہ فیصلے اور اندازے کس قدر غلط ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی سوسائٹی کے اجتماعی تصورات اور سوسائٹی کی اجتماعی اخلاقیات کو درست کرنے کے لیے اسلامی نظریہ حیات کی اہمیت کیا ہے؟ نیز اسلام نے عورت کے بارے میں انسانی نقطہ نظر میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا ہے اور عورت کو کس قدر شرف عطا کیا۔ نہ صرف عورت کو بلکہ پوری انسانیت کو شرف عطا کیا گیا ہے۔ کیونکہ دور جاہلیت میں نہ یہ کہ صرف عورت ذلیل تھی بلکہ انسانیت بذات خود ذلیل تھی۔ کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ عورت انسانیت کا اہم عنصر ہے اور اس کی توہین بذات خود انسانیت کی توہین ہے۔ اس کو زندہ درگور کرنا انسانیت کا دفن کرنا ہے۔ کیا یہ فعل زندگی کے ایک اہم حصے کو ضائع کرنا نہ تھا اور اللہ کی حکمت تخلیق کے ساتھ جنگ نہ تھی۔ اللہ کی حکمت تخلیق تو یہ ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ ہر زندہ چیز کی تخلیق نر اور مادہ سے ہو۔

جب بھی انسانیت صحیح عقائد اور صحیح نظریہ حیات سے منحرف ہوئی ہے' اس کے اخلاق' اس کے رسم و رواج کسی نہ کسی جاہلیت میں ڈوب گئے۔ آج دور جدید میں بھی اعلیٰ ترقیات کے باوجود دنیا بیسویں صدی کی جاہلیت کا شکار ہو گئی ہے۔ آج بھی لڑکی کی پیدائش پر اس خوشی اور مسرت کا اظہار نہیں کیا جاتا' جس طرح لڑکے کی پیدائش پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بھی جاہلیت کے تصورات و رسومات میں سے ایک رسم ہے۔ اور یہ اس لیے پائی جاتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات ہماری نظروں میں صاف اور ستھرا نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ آج کل جاہلیت جدیدہ کے پرستار اشاروں کنایوں میں اسلامی عقائد و نظریات پر انگلی اٹھاتے ہیں کہ اسلام میں عورت کو یہ مقام دیا گیا ہے اور یہ کہ اسے آزادی نہیں ہے۔ یہ لوگ جاہلیت جدیدہ سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کے پیش نظر وہ عظیم انقلاب نہیں ہے جو عورت کے بارے میں اسلامی نظریات نے آج سے صدیوں قبل برپا کیا۔ عورت کے بارے میں لوگوں کی سوچ بدل دی اور اسے بلند رتبہ دیا۔ عورت کے بارے میں اسلام نے یہ انقلابی فکر محض دنیاوی ضرورت یا اجتماعی تقاضے یا اقتصادی ضرورت کے تحت نہیں دی تھی بلکہ یہ فکر و نظر کی تبدیلی' اس اسلامی نظریہ حیات کی وجہ سے پیدا کی گئی جس نے پوری انسانیت کو شرف فضیلت بخشا۔ پوری انسانیت کی تکریم کی وجہ سے عورت کو بھی شرف ملا۔ یہ قرار دیا گیا کہ عورت حصہ حیات اور حصہ انسانیت ہے' لہٰذا بشریت کے دو حصوں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلامی نظریہ حیات اور جاہلی نظریہ حیات کے درمیان فرق کیا ہے؟ یہ فرق یوں ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک ذمہ دار اور جوابدہ معاشرہ ہوتا ہے اور وہ آخرت کی جوابدہی پر ایمان رکھتا ہے جبکہ جاہلی معاشرہ وہ ہے جو آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ وہ ہر چیز کی قدر و قیمت اسی دنیا کے حوالے سے طے کرتا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ عقیدہ اور نظریہ کے مظاہر بھی اعلیٰ ہوتے ہیں۔

لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۖ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٠﴾

”بری صفت سے متصف کیے جانے کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ تو اس کے لیے

سب سے برتر صفات ہیں' وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے''۔

یہاں شرک کے مسئلے کو مسئلہ انکار آخرت سے ملا دیا جاتا ہے اس لیے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں میں ایک ہی قسم کی گمراہی ہے۔ انسانی شعور میں شرک اور انکار آخرت باہم مخلوط ہوتے ہیں اور انسانی شخصیت اور انسانی معاشرت پر ان کے اثرات بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جب ہم ان لوگوں کو بات سمجھائیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے تو وہ ہر پہلو کے اعتبار سے برے لوگ نظر آئیں گے۔ اپنے شعور' اپنے طرز عمل اور اپنے عقائد کے اعتبار سے' غرض وہ ہر پہلو سے برے ہوں گے۔ یہ لوگ زمین و آسمان میں ہر جگہ برے لوگ ہوں گے۔ اللہ کی اگر ہم کوئی مثال دیں گے تو وہ ہر اعتبار سے ایک اعلیٰ مثال ہوگی۔ اللہ کی ذات اور کسی دوسری شخصیت میں کوئی مماثلت ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا چھوڑ دو ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۶ : ۶۰) ''وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے''۔ وہ نہایت ہی زبردست طاقت والا ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی حکیم ہے' وہ ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھتا ہے تاکہ ہر پرزہ اپنی صحیح جگہ پر اس کی حکمت' اور اس کے قانون کے مطابق صحیح انداز میں کام کر سکے۔

وہ تو اس قدر طاقتور ہے کہ اگر لوگوں کی بدعملی اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان کو فوراً پکڑ لے تو ان کی پوری دنیا کو تہ و بالا کر دے۔ لیکن اس کی اسکیم کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو قدرے مہلت دی جائے کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے' پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا''۔

اللہ ہی ہے جس نے اس تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے' خصوصاً انسانوں کو۔ پھر ان پر وسیع انعامات کیے' لیکن انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے کہ وہ ظلم بھی کرتا ہے اور فساد فی الارض کی مرتکب بھی ہوتا ہے اور اس کا سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ عقیدۂ توحید سے انحراف کر کے شرک کرتا ہے۔ پھر دوسرا ظلم یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ پھر وہ دوسری مخلوقات کو بھی اذیت دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام مظالم کے باوجود اللہ تعالیٰ صبر کرتا ہے' ان پر رحم کرتا ہے اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ لیکن آخرکار ان کو یونہی چھوڑ نہ دیا جائے گا بلکہ ان سے اس مہلت کے اختتام پر انس سے حساب لیا جائے گا۔ اللہ کی قوت حکیمانہ ہے اور اس کی رحمت عادلانہ ہے لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب مہلت ملتی ہے تو وہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت اور حکمت کو صحیح طرح نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ اللہ کی قوت اور اس کی صفت عدل

ان کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ اور یہ کام اس وقت ہوتا ہے جب مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ نے یہ مہلت کیوں دی؟ اس لیے کہ وہ رحیم ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۶ : ۶۱) "پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر اس سے ایک گھڑی بھر بھی کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا"۔

لیکن ان لوگوں کی سوچ و طرز عمل کا تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہیں جسے وہ خود اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے اور ان کے ساتھ اچھا اور بھلائی کا سلوک ہو گا اور یہ اچھا سلوک ان کی اس کج فکری اور کج روی پر ہو گا۔ لیکن قرآن کریم فیصلہ کن انداز میں بتا دیتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا؟ یقیناً اس سے مختلف ہو گا جو یہ لوگ سوچتے ہیں۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

"آج یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لیے تجویز کر رہے ہیں جو خود اپنے لیے انہیں ناپسند ہیں' اور جھوٹ کہتی ہیں ان کی زبانیں کہ ان کے لیے بھلا ہی بھلا ہے۔ ان کے لیے تو ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ضرور یہ سب سے پہلے اس میں پہنچائے جائیں گے"۔

انداز بیان یوں ہے کہ گویا ان کی زبانیں بذات خود مجسمہ کذب ہیں یا یہ جھوٹ کی تصویر ہیں۔ بذات خود ان کی زبان کے لوتھڑے سے جھوٹ ٹپکتا ہے۔ جیسا کہ ضرب المثل ہے "اس کا قد خوبصورتی کی تعریف کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھ حور کی مدح خواں ہے"۔ گویا اس کا قد ہی مظہر ہے کہ وہ خوبصورت اور سمارٹ ہے اور اس کی آنکھ اسی طرح ہے جس طرح حور عین۔ اسی انداز بیان کے مطابق کہا گیا کہ "ان کی زبانیں جھوٹ کی تعریف کر رہی ہیں"۔ گویا وہ مجسمہ جھوٹ ہیں کیونکہ یہ زبانیں ہر وقت جھوٹ بولتی رہتی ہیں اس لیے وہ بذات خود جھوٹ ہیں۔

ان کا جھوٹ کیا ہے؟ یہ دعویٰ کہ ان کے لیے کوئی اچھا ہی انجام ہے لیکن عقیدہ یہ ہے کہ جو بات خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ خدائے کبریا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ البتہ وہ سچائی جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔ آیت کی تکمیل سے قبل ہی ان کو بتا دی جاتی ہے اور وہ لاریب اور بلاشبہ اس سے دوچار ہوں گے' وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی سزا آگ ہے اور وہ بغیر کسی تاخیر کے سب سے پہلے اس میں ڈالے جائیں گے۔ مفرطون کے معنی ہیں معجلون' اور مفرط وہ شخص ہوتا ہے جسے سب سے پہلے بھیجا جائے بغیر کسی تاخیر کے۔

---()()---

اے پیغمبر یہ لوگ پہلے ظالم اور تجاوز کرنے والے نہیں ہیں اور یہ سب سے پہلے ناشکرے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی تاریخ عالم میں بہت سے بے راہ رو اور ناشکرے گزرے ہیں۔ شیطان نے ان کو گمراہ کیا اور ان کے لیے ان کے

نظریات اور اعمال کو خوبصورت بنایا۔ شیطان ان کا نگران بن گیا' اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا پھراتا رہا اور تم سے پہلے بھی اللہ نے ایسے لوگوں کو شیطانی چنگل سے چھڑانے کے لیے رسول بھیجے تاکہ وہ ان کو سچ اور حق بتا دیں اور ان اختلافات کو اچھی طرح حل کر دیں جن میں ان کے درمیان اختلاف واضح ہو گیا تھا تاکہ یہ حل ان کے لیے ہدایت و رحمت کا باعث ہو' خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۶۳ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝۶۴

"خدا کی قسم' اے نبی' تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ) شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات انہوں نے مان کر نہ دی)۔ وہی شیطان آج ان لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے مان لیں"۔

پس اس آخری رسول اور اس آخری کتاب کا کام یہ ہے کہ وہ ان تمام مسائل کا فیصلہ کر دے جن میں امم سابقہ اور کتب سابقہ کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات واقعہ ہو گئے تھے اور وہ طائفہ طائفہ اور فرقہ فرقہ ہو گئے تھے کیونکہ اصل حقیقت تو عقیدۂ توحید ہے اور عقیدۂ توحید کے اوپر جو شبہات' شرک اور تشبیہات کے رنگ چڑھ گئے وہ سب باطل ہیں۔ قرآن کریم آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ان تمام باطل تصورات کو صاف کر کے رکھ دے اور ان لوگوں کے لیے باعث رحمت و ہدایت ہو جن کے قلوب ایمان و ایقان کے لیے کھلے ہوں اور وہ گوہر ایمان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

---000---

یہاں قرآن کریم نے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت پر وہ دلائل دینے شروع کر دیے ہیں جو اس کائنات میں بالکل عیاں ہیں۔ پھر ان صفات اور صلاحیتوں کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ نے انسان کی ذات کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں اور پھر وہ انعامات و احسانات بیان کیے ہیں جو اللہ نے اس انسان پر کیے ہیں' وہ اس کے اردگرد موجود ہیں اور اللہ کے سوا یہ نعمتیں کوئی اور ذات نہ پیدا کر سکتی ہے' نہ فراہم کر سکتی ہے۔

اس سے قبل والی آیت میں کتاب الٰہی کے نزول کی بات ہوئی تھی اور یہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں سے آخری کتاب ہے جو بھلائی پر مشتمل ہے اور اس میں انسان کی روحانی زندگی کا سامان ہے' چنانچہ اس مناسبت سے یہاں آسمانوں سے بارشیں برسانے کا ذکر کیا گیا جس میں انسانوں کی جسمانی زندگی کا سامان ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

"(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لیے"۔

پانی تو ہر چیز کی زندگی کا سامان ہے۔ قرآن مجید اسے پورے کرۂ ارض کے لیے علی العموم سامان حیات قرار دیتا ہے، جو چیز بھی اس کرۂ ارض کی پشت پر ہو اور اللہ جو ہر چیز کو حالت مردنی سے زندگی کی حالت میں لاتا ہے وہی ہے جو الٰہ ہونے کے لائق و سزاوار ہے۔

ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۱۶ : ۶۵) "یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لیے" تاکہ وہ جس چیز کو سنیں اس پر غور کریں اور سمجھیں۔ یہی اصل مسئلہ ہے یہ کہ دلائل الوہیت اور دلائل حیات بعد الموت جس کا قرآن کریم بار بار تذکرہ کرتا ہے اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے اس کائنات میں جابجا بکھرے پڑے ہیں، لیکن یہ آیات و معجزات ان لوگوں کے لیے ہیں جو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور پھر مزید غور و فکر کرتے ہیں۔ مویشیوں اور جانوروں کے اندر بھی ایک نصیحت آموز چیز موجود ہے۔ یہ خالق کائنات کی عجیب تخلیق ہے اور یہی ایک دلیل اللہ العالمین کی کبریائی کے لیے بس ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

"اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے"۔

یہ دودھ، جسے ہم حیوانات کے پستانوں سے نچوڑتے ہیں، یہ کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟ یہ گوبر اور خون کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔ فرث اس محصول کو کہتے ہیں جو ہضم کے بعد جگالی کرنے والے جانور کے اوجھ میں رہ جاتا ہے۔ تیز ہضم کے بعد جو محلول رہ جاتا ہے اور اسے آنتیں خون کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں اسے بھی فرث کہا جاتا ہے۔ یہ خون جسم کے ہر خلیے میں گردش کرتا ہے۔ یہ خون جب جانور کی کھیری میں دودھ کے غدود میں جاتا ہے تو یہ دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ قدرت کا عجوبہ ہے کہ یہ خون دودھ بن جاتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ محلول اور یہ خون کس طرح دودھ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

پھر ہر قسم کی خوراک کا خلاصہ خون کی شکل کس طرح اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اس خون کی قوت میں سے جسم کے ہر

خلیے کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا کا فراہم ہونا ایک ایسا عمل ہے جو نہایت ہی پیچیدہ اور تعجب انگیز ہے۔ یہ عمل جسم میں ہر سیکنڈ کے حساب سے تکمیل پاتا ہے۔ اس طرح جسم میں جلنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ ہر سیکنڈ میں' انسانی جسم کی اس پیچیدہ مشینری میں تخریب و تعمیر کا یہ عمل جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک جسم سے روح پرواز نہیں کر جاتی۔ کوئی انسان جس کا شعور زندہ ہو' وہ ان عجیب عملیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' جن میں جسم انسانی کی اس عجیب مشینری کا ہر ذرہ خالق کا ثناخواں نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی عجیب مشینری ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی پیچیدہ سے پیچیدہ مشینری اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ انسان کے لیے جسم انسانی کے لاتعداد خلیوں میں سے ایک خلیہ بھی بنانا ممکن نہیں۔

ہم نے جسم انسانی میں خوراک کے ہضم' اس کے خون کی شکل اختیار کرنے اور پھر جلنے اور ختم ہونے کے عمل کا ایک عام جائزہ لیا ہے۔ اس جسم کے اندر ایسے ایسے کام ہو رہے ہیں کہ اگر ان کا سائنسی مطالعہ اور ملاحظہ کیا جائے تو عقل دنگ رہ جائے۔ خود جسم انسانی کے خلیوں میں سے ایک خلیے کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر بھی نہ ختم ہونے والی سوچ عطا کرتا ہے۔

ماضی قریب تک یہ تمام عجائبات راز ہی رہے' اور یہ حقیقت جس کا ذکر یہاں قرآن مجید کر رہا ہے کہ دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے' انسان اس سے ماضی قریب تک واقف نہ تھا۔ ادوار سابقہ میں انسان نہ اس کا تصور کر سکتا تھا اور نہ ہمارے دور کی طرح اس کا دقیق سائنسی مطالعہ کرنے کے قابل تھا۔ اس بارے میں کوئی انسان نہ شک کر سکتا ہے اور نہ بحث کر سکتا ہے۔ اس قسم کے پیچیدہ سائنسی حقائق میں سے کسی ایک حقیقت کی طرف قرآن کریم کا واضح طور پر اشارہ کرنا ہی اس بات کے لیے کافی ثبوت ہے کہ قرآن کریم وحی الٰہی پر مشتمل ہے کیونکہ یہ وہ حقیقت ہے جس کا سائنٹیفک علم کسی انسان کو بھی اس دور میں نہ تھا۔

لیکن ان خالص سائنسی حقائق کو اگر ایک طرف بھی چھوڑ دیں تو بھی قرآن کریم میں ایسے دلائل و خصائص موجود ہیں جو اس کے وحی الٰہی ہونے کا اثبات کرتے ہیں۔ ہاں اس قسم کی سائنسی حقیقتوں میں سے ایک واضح حقیقت سامنے آ جانا مخالفین اور معاندین کے منہ کو بند کرنے کے لیے کافی ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۶۷

"(اسی طرح) کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے"۔

یہ پھل جو اس تروتازگی اور نباتاتی حیات سے پیدا ہوتے ہیں جو آسمانوں سے پانی برسنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے' ان سے تم شراب بناتے ہو (اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی) اور رزق حسن بناتے ہو۔ اس آیت میں بہرحال

اشارہ کر دیا گیا ہے کہ رزق حسن شراب سے کوئی الگ چیز ہے اور یہ کہ شراب رزق حسن نہیں ہے۔ یہ دراصل تمہید تھی اس حکم کے لیے جو بعد میں تحریم شراب کے بارے میں نازل ہوا۔ اس آیت میں صرف واقعاتی تجربہ ہے کہ کھجوروں اور انگور اللہ نے پیدا کیے اور تم اس سے یہ یہ مصنوعات تیار کرتے ہو' یہاں کسی چیز کی حلت اور حرمت سے بہرحال بحث نہیں ہے اگرچہ یہ حرمت کے لیے تمہید ضرور ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (١٦: ٦٧) "یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے"۔ لہٰذا عقل مند لوگ جب سمجھ لیتے ہیں تو وہ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ بندگی کا سزاوار وہی خالق ہے جو یہ چیزیں پیدا کرتا ہے۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٦٩﴾

"اور دیکھو' تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں' اور درختوں میں' اور ٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں' اپنے چھتے بنا' اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس' اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔

شہد کی مکھی اس الہام کے مطابق کام کرتی ہے جو خالق نے تخلیق کے وقت اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ یہ بھی وحی کی ایک قسم ہے اور یہ مکھی اس کے مطابق عمل پیرا ہے۔ یہ مکھیاں جس پیچیدہ انداز میں اپنا کام جاری رکھتی ہیں' اسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ کس انجینئرنگ سے اپنا چھتہ تیار کرتی ہیں۔ وہ باہم تقسیم کار کس طرح کرتی ہیں اور پھر وہ عسل مصفیٰ کو کس طرح علیحدہ کرتی ہیں؟

یہ اپنی فطرت کے مطابق گھر بناتی ہیں' پہاڑوں میں' درختوں کی شاخوں میں' لوگ دیواروں پر جو بوٹے چڑھاتے ہیں ان میں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کی فطرت کے مطابق زمین کے اندر راستے ہموار کیے ہیں کہ یہ عسل مصفیٰ شفاء للناس ہے۔ بعض ڈاکٹروں نے اس پر تحقیق کی ہے اور یہ تحقیق نہایت ہی فنی انداز کی ہے۔ لیکن ایک مسلم کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے وہ شفاء للناس ہے۔ حضور اکرمؐ سے بعض احادیث میں بھی عسل مصفیٰ کی ان خصوصیات کی طرف اشارہ ہے۔

بخاری شریف نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آیا اور کہا' حضورؐ

میرے بھائی کو اسہال ہو رہے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا' اسے شہد پلا دو۔ تو اس نے اسے شہد پلا دیا۔ اس کے بعد وہ پھر آیا اور کہا' حضورؐ میں نے اسے شہد پلایا مگر اس سے تو اس کے اسہال اور زیادہ ہو گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ اور اسے شہد پلاؤ۔ وہ گیا اور اس نے اور شہد پلایا۔ پھر آیا اور کہا' حضورؐ وہ تو اور بھی زیادہ ہو رہا ہے تو حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ نے تو سچ کہا ہے تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹ بول رہا ہے' لہٰذا جاؤ اور اسے مزید شہد پلاؤ۔ وہ شخص گیا اور اس نے بھائی کو مزید شہد پلایا اور وہ تندرست ہو گیا۔

اس حدیث شریف کو پڑھ کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ ایک رسول ایمان و ایقان کے کس اعلیٰ مقام پر ہوتا ہے۔ مریض کا بھائی بار بار اطلاع کرتا ہے کہ مرض میں اضافہ ہی ہو رہا ہے لیکن حضور اکرمؐ وہی علاج تجویز کرتے ہیں کیونکہ قرآن نے اسے شفاء کہا ہے۔ آخر کار قرآن کی بات عملاً بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان تمام مسائل میں جن کا فیصلہ قرآن نے کر دیا ہے اسی طرح کے ایمان و ایقان کا اظہار کریں۔ اگرچہ بظاہر صورت حالات قرآن کے حکم کے خلاف ہی کیوں نہ نظر آئے۔ کیونکہ ظاہری حالات کے مشاہدے میں غلطی ہو سکتی ہے لیکن قرآنی حقائق کبھی غلط نہیں ہو سکتے اور آخر کار قرآنی حقائق ہی سچے ثابت ہوتے ہیں۔

اب ذرا طرز کلام کی فصاحت و مناسبت پر غور کریں۔ آسمانوں سے پانی اترنے کی نعمت گوبر اور خون کے درمیان سے بغیر دودھ کی پیدائش' کھجوروں اور انگوروں سے شکر و شراب کی پیدائش' شہد کی مکھی سے مختلف رنگوں کا شہد' یہ تمام مشروبات ہیں اور ان مشروبات کا اخراج ایسے اجسام سے ہو رہا ہے جو ان سے شکل و جنس میں بھی مختلف ہیں۔ چونکہ یہاں ذکر مشروبات کا تھا اس لیے جانوروں کے ضمن میں صرف دودھ کا ذکر کیا گیا کیونکہ وہ مشروب ہے تاکہ مضمون و مفہوم آپس میں متناسب ہو جائیں۔ آگے دوسرا سبق آ رہا ہے۔ اس میں انعام کے ضمن میں چمڑوں' بالوں اور اون کا بھی ذکر ہے کیونکہ وہاں خیموں اور گھروں کا مضمون ہے لہٰذا وہاں حیوانات کی ان چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا جو اس مضمون اور منظر کے ساتھ متناسب تھیں۔ قرآن مجید کے اسلوب کلام کا یہ ایک بہت ہی اہم فنی پہلو ہے کہ وہ الفاظ کے ساتھ معنوی ہم آہنگی کا بھی خیال رکھتا ہے۔

اب روئے سخن جانوروں' درختوں' پھلوں' شہد کی مکھیوں' شہد کے انعامات کے مقابلے میں نفس انسانی کے قریب تر' انسانی شخصیت کی گہرائیوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے موضوع کی طرف مڑ جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف مراحل' انسان کی عمر' اس کا رزق' اس کا جوڑا' بچے اور پوتے وغیرہ جو انسانی دلچسپی کے مخصوص ترین موضوعات ہیں۔ انسان ایسی باتوں سے بہت ہی متاثر ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کے میدان ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ وَاللّٰهُ

۹ ع ۵

۱۵

فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَآدِّي رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ ۗ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ ﴿۷۱﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۗ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۷۳﴾

"اور دیکھو' اللہ نے تم کو پیدا کیا' پھر وہ تم کو موت دیتا ہے' اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی۔
اور دیکھو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔ پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے؟"
اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔
پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں"۔

ان حساس موضوعات میں سے پہلا موضوع انسانی زندگی' انسانی موت اور زندگی کے مراحل کے بارے میں ہے اور یہ تمام انسانوں کی دلچسپی کا محبوب موضوع ہے۔ انسانی زندگی پر غور کرنے سے انسان یقیناً بعض اوقات سخت سے سخت دل انسان بھی نرمی کا احساس کر لیتے ہیں اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ اس پر ہونے والے تمام انعامات تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور جب انسان کے دل میں ان انعامات کے زوال کی بات ڈال دی جائے تو فطرت انسانی کے اندر ودیعت کردہ خدا خوفی کا احساس 'تقویٰ کا وجدان اور اس زندگی کے عطا کرنے والے کی طرف میلان پیدا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً بڑھاپے کی صورت حالات میں جب انسان ارذل العمر میں داخل ہوتا ہے وہ علوم کو بھولنا شروع کر دیتا ہے اور دوبارہ ایک بچے کی طرح سادہ' عاجز اور انجان ہو جاتا ہے۔ جب انسان ایسے حالات پر سنجیدگی سے غور کرے تو وہ اپنی موجودہ جوانی' قوت 'علم اور عزت و [illegible] پر سوچے تو وہ کافی حد تک راہ راست پر آ سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (۱۶ : ۷۰) "بے شک اللہ علیم و قدیر ہے"۔ یہ نتیجہ یہاں اس لیے بتایا گیا کہ انسان کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ مکمل ازلی اور ابدی علم صرف اللہ کا ہے اور حقیقی ازلی اور ابدی قدرت بھی صرف اللہ کے پاس ہے۔ انسان کا علم بھی محدود ہے اور زوال پذیر بھی ہے۔ انسان کی قدرت بھی محدود ہے اور قابل زوال بھی ہے' اس کے علم اور اس کی قدرت میں بھی جزئی علم و قدرت۔

ان آیات میں دوسرا انسان کے وسائل رزق سے متعلق ہے۔ رزق کے میدان میں ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان تفاوت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ رزق کے معاملے میں لوگوں کے درمیان فرق ہے اور اللہ نے بعض کو بعض پر برتری دی ہے اور یہ برتری بھی سنت الٰہیہ کے تابع ہے۔ مراتب میں یہ تفاوت بھی محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ اس میں بھی اللہ کی گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بڑا عالم' مفکر اور عقلمند ہوتا ہے لیکن وسائل رزق اور ان میں ترقی کی صلاحیتیں اس میں محدود ہوتی ہیں کیونکہ دوسرے شعبوں میں اللہ نے ایسے لوگوں کو قیمتی صلاحیتیں دی ہوئی ہوتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا انسان بہت ہی سادہ' باغی اور جاہل نظر آئے گا لیکن حصول رزق اور اس کی ترقی کے میدان میں یہ شخص بہت ہی ماہر ہو گا۔ پھر لوگوں کے درمیان صلاحیتوں میں تفاوت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ غور نہیں کرتے اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ رزق کو صلاحیتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' حالانکہ حصول رزق بھی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہوتی ہے۔ نیز بعض اوقات رزق کی فراوانی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے جبکہ رزق کی تنگی میں بھی بعض اوقات کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور اس حکمت کی بنا پر اللہ بعض لوگوں کو آزماتا ہے۔ بہرحال رزق اور وسائل رزق میں تفاوت ایک ایسی حقیقت ہے جو موجود ہے اور اس کا مدار صلاحیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ تاہم رزق کا اختلاف صلاحیتوں کے مطابق تب ہو گا جب معاشرے میں مواقع حصول رزق پر ظالمانہ کنٹرول اور مصنوعی تفاوت نہ ہو جس طرح آج کل کے فساد زدہ معاشروں میں ہے۔ اس آیت میں اشارہ اس معاشرے کی طرف ہے جو حضورؐ کے وقت دور جاہلیت میں موجود تھا۔ اس صورت حال کو ایک مثال کے طور پر پیش کر کے اللہ تعالیٰ مشرکانہ افکار کے نظام عقائد میں سے ایک عقیدے کی تصحیح فرماتا ہے۔ مکہ کے بت پرستانہ معاشرے میں یہ رواج تھا' جس طرح ہم نے اس سے قبل اس کی تشریح کر دی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے دیئے ہوئے اموال میں سے بعض چیزوں کو بتوں کے لیے مخصوص کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو' تمہارے بھی غلام ہیں' جس طرح تم اللہ کے غلام ہو' (یاد رہے کہ اس وقت کے جاہلی معاشرے میں غلامی کا ادارہ موجود تھا)۔ تم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ یہ غلام تمہاری کمائی میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہو جائیں تو اللہ کس طرح یہ بات پسند کرے گا کہ اس کی مخلوقات و مملوکات میں سے بعض چیزیں ان لوگوں کی ہو جائیں جنہیں ناحق اللہ کی خدائی کے امور میں شریک کر دیا گیا ہے۔

اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶ : ۷۱) "کیا یہ اللہ کے انعامات و احسانات کا انکار کرتے ہیں"۔ اللہ نے تو ان پر انعامات کی بارش کر دی اور انہوں نے مقابلے میں دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرالیا۔ حالانکہ ان کی جانب سے شکر کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ اللہ وحدہ کو الٰہ سمجھتے۔

یہ تیسری احساس جگانے والی تنبیہ نفس انسانی 'اس کے جوڑے 'بیٹوں' پوتوں اور دوسری اولاد کے بارے میں ہے۔سب سے پہلے ذکر مخالف جنس پر مشتمل جوڑنے اور ان کے باہم زندہ تعلق کے بارے میں ہے۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (۱۶ : ۷۲) "جس نے تمہارے لیے تمہاری ہی ہم جنس بیویاں بنائیں"۔وہ تمہارے ہی نفس کا حصہ ہیں 'وہ تمہارا ہی حصہ ہیں 'یہ تم سے کوئی کم تر درجے کی مخلوق نہیں ہے کہ تمہیں عورتوں کی پیدائش سے شرم آتی ہے۔

وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (۱۶ : ۷۲) "اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے"۔انسان فانی ہے لیکن وہ اپنی ذات کا تسلسل بذریعہ اولاد و احفاد چاہتا ہے۔حیات انسانی کا یہ پہلو نہایت ہی حساس ہے اور اس تار کو معمولی طور پر چھونے ہی سے زمزمہ حیات گونجنے لگتا ہے۔وسائل رزق کے مقابلے میں اولاد و احفاد کا یہاں ذکر کیا گیا بطور نعمت تاکہ انسانی شعور کے سامنے یہ سوال رکھا جائے۔

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۱۶ : ۷۲) "تو اب بھی یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں"۔یوں کہ وہ اللہ کے شریک قرار دیتے ہیں اور اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ یہ تمام انعامات اللہ کے عطا کردہ ہیں اور یہ نعمات اللہ کی الوہیت و حاکمیت پر گواہ بھی ہیں اور عملاً ان کی زندگی میں یہ نعمتیں موجود بھی ہیں اور ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہیں۔

کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کے سوا جو بھی ہے وہ باطل ہے۔اور یہ اللہ جن کو یہ پکارتے ہیں لامحالہ باطل ہیں 'محض اوہام ہیں 'ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ان کے بارے میں ایسی سوچ اور مرتبے کا کوئی حق و حقیقت نہیں ہے۔لہذا اس حرکت کا ارتکاب کر کے وہ انعامات الہیہ کا انکار کرتے ہیں۔جبکہ اس حقیقت کو وہ خود بھی اپنی فطری صلاحیت سے محسوس بھی کرتے ہیں اور احساس ہوتے ہوئے انکار کرتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۱۶ : ۷۳) "اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں"۔یہ عجیب بات ہے کہ انسانی فطرت اس حد تک منحرف ہو جائے اور ایسی چیزوں کی بندگی کرے جن کے ہاتھ میں لوگوں کا رزق نہیں ہے اور نہ وہ ایک ہی دن کے لیے لوگوں کے رزق کا انتظام کرنے کے اہل ہیں۔جبکہ یہ لوگ اللہ کو خالق 'رازق 'فریادرس مانتے بھی ہیں اور اس کا انکار نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود اللہ کے مماثل اور اس جیسی شخصیات کے قائل ہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷۴

"پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو' اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے"۔ اللہ کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ اس کے کوئی مماثل ہے کہ تم اس کی مثالیں دو۔

اس کے بعد اللہ ان لوگوں کے سامنے دو مثالیں پیش کرتا ہے' ایک شخص مالک رازق ہے اور دوسرا شخص مملوک غلام اور عاجز ہے۔ کسی چیز کا نہ مالک ہے اور نہ کسب کمائی پر قادر ہے۔ یہ مثال اس لیے دی جا رہی ہے کہ جس عظیم حقیقت کو وہ بھول چکے ہیں وہ ان کے فہم کے قریب تر ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی کوئی مثال نہیں' اور یہ کہ اللہ کے ساتھ اس کی الوہیت و حاکمیت اور بندگی میں اس کی مخلوق میں سے کسی چیز کو بھی شریک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مخلوق سب اس کی غلام اور بندہ ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۚ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

۱۰ ع ۶ ۱۶

"اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک تو غلام ہے' جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ' کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ ۔ الحمد للہ' مگر اکثر لوگ (اس سیدھی بات کو) نہیں جانتے۔

اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا بہرا ہے' کوئی کام نہیں کر سکتا' اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے' جدھر بھی وہ اسے بھیجے کوئی بھلا کام اس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے کہ انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود راہ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟"

پہلی مثال تو ان کے اندر موجود صورت حالات سے لی گئی ہے۔ اس وقت عرب کے جاہلی معاشرے میں مملوک غلام موجود تھے' یہ اس قدر بے بس مخلوق تھی کہ نہ وہ کسی چیز کے مالک ہوتے تھے اور نہ ان کو کوئی اختیار حاصل تھا۔ یہ لوگ بھی مالک مختار و متصرف اور عاجز غلام اور بے اختیار کے درمیان فرق مراتب سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہذا ان سے کہا گیا کہ مالک حقیقی کو تم کس طرح اپنے غلاموں کے ساتھ برابر قرار دیتے ہو اور ان غلاموں کو مالک کا شریک قرار دیتے ہو' کیونکہ تمام انسان اللہ کے غلام اور بندے ہیں۔

دوسری مثال ایسے شخص کی ہے جو گونگا' بلید الذہن اور کم نوال ہے۔ وہ کسی کام کو نہیں جانتا' مالک پر بوجھ ہے۔ جدھر بھی بھیجا جائے کوئی خیر کا کام اس سے نہ بن پائے۔ لیکن دوسرا شخص قوی الجسم' سلیم العقل ہے' خوب

بات کرتا ہے اور بات بھی عدل و انصاف کی کرتا ہے ' اور کردار کے اعتبار سے راہ راست پر قائم ہے۔ ان دونوں اشخاص میں کوئی سلیم العقل شخص مساوات قائم نہیں کر سکتا۔ بس ایک بت اور ایک پتھر اور اللہ سبحانہ قادر و علیم کے درمیان کس طرح شرکت و مساوات قائم ہو سکتی ہے ' جبکہ اللہ حکم دیتا ہے کہ معروف کا حکم دو اور منکر سے لوگوں کو روکو اور صراط مستقیم کی طرف آؤ۔

یہ سبق جو اللہ کے اس حکم سے شروع ہوا تھا کہ جدالیین کا نظریہ نہ رکھو ' ان دونوں مثالوں سے اس سبق کا خاتمہ ہوا جن سے ثابت ہوا کہ شرکیہ عقائد و نظریات تعجب انگیز ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۲ ایک نظر میں

اس سورہ کا محور و موضوع یعنی دلائل الوہیت اور حاکمیت رب العالمین 'اس سبق میں بھی بدستور جاری ہیں۔ مثلاً اللہ کی تخلیق کی عظمت 'اللہ کے وسیع انعامات 'اللہ کا وسیع علم اور بعث بعد الموت کے دلائل۔ اس سبق کا موضوع بعث بعد الموت ہے۔ بعث بعد الموت کے بارے میں ہمیشہ اہم سوال یہ رہا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ تو اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے ان مخصوص رازوں میں سے ہے جس کی اطلاع کسی کو نہیں دی گئی۔

اس سبق کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع زمین و آسمان کے وہ اسرار ہیں جن کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔ یہ اسرار نفس انسانی اور آفاق کائنات دونوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً قیام قیامت کے وقت کا غیب 'جس کا علم صرف اللہ کو ہے اور قیام قیامت پر اللہ پوری طرح قادر ہے 'بلکہ وہ اس کے لیے اس قدر آسان ہے جس طرح پلک جھپکنا۔

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ (۱۶ : ۷۷) "اور قیامت برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے"۔ پھر رحم مادر میں بچے کا غیب 'صرف اللہ ہی کو ہے جو اس غیب سے جنین کو نکالتا ہے 'یہ جنین کچھ بھی نہیں جانتا۔ پھر اللہ لوگوں کو سمع 'بصر اور سوچنے کی قوت دیتا ہے تاکہ وہ اس کا شکر ادا کریں۔ مزید اسرار کائنات و مخلوقات کے غیب 'مثلاً پرندوں کا فضا میں مسخر کر دیا جانا کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوتے ہیں۔ یہ رحمٰن ہی ہے جو انہیں وہاں ٹھہراتا ہے۔

اس کے بعد انسان کے لیے بعض مادی سہولتوں کا ذکر ہے۔ یہ مادی سہولیات بھی فضائے کائنات کے رازوں کے ساتھ بہت اہم ہیں۔ رہائش گاہیں برائے آرام 'سایوں میں 'تعمیر شدہ مکانات میں 'مویشیوں کے چمڑوں کے خیموں میں جو اقامت کی اور سفر کی دونوں حالتوں میں مفید ہیں۔ اثاث البیت، صوف 'اون اور بالوں سے تمہارے لیے لباس بنائے 'پھر سائے 'پہاڑوں کی پناہ گاہیں 'ایسی پوشاک جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہے 'ایسی پوشاک جو تمہیں جنگ میں بچاتی ہے۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۱۶ : ۸۱) "اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے 'شاید کہ تم فرماں بردار بنو"۔ اس کے بعد قیام قیامت کی یہ تفصیلات کہ ایک منظر میں مشرکین اور ان کے ٹھہرائے ہوئے شرکاء جمع ہوں گے 'رسول اور شہداء جمع ہوں گے۔ رسول اپنی اپنی قوم پر گواہی دیں گے وغیرہ وغیرہ اس طرح قیام قیامت کی یہ بحث اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۲۲ تشریح آیات

۷۷--- تا --- ۸۹

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

"اور زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔ بعث بعد الموت کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جو ہر دور میں نہایت درجہ مختلف فیہ رہا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں نے ہر رسول کے ساتھ مکالمہ' مجادلہ اور مناظرہ کیا ہے۔ اپنی اصل میں یہ وہ غیب ہے جو اللہ کے مخصوص ترین رازوں میں سے ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۶:۷۷) "زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے"۔ انسانوں کی حالت تو یہ ہے کہ وہ پردۂ غیب کے پیچھے پوشیدہ اسرار و رموز کے پانے سے عاجز و قاصر ہیں۔ ان کا مادی علم جس قدر بھی آگے بڑھ جائے اور دنیا کی مادیات کے بارے میں ان پر جس قدر علوم کے خزانے بھی کھل جائیں۔ وہ زمین کے اندر پوشیدہ خزانوں کی ایک بڑی مقدار کو دریافت کیوں نہ کر لیں وہ ان اسرار کائنات کو پا نہیں سکتے۔ جبکہ اس کائنات میں علوم غیب کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے برگزیدہ انسان کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کل اس کی ذات کے ساتھ کیا ہونے والا ہے' بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ نکلنے والا سانس پھر لوٹے گا یا نہیں۔ انسان کی خواہشات کی دنیا تو طویل و عریض ہے لیکن پردۂ غیب کے پیچھے سے تقدیر اس پر خندہ زن ہوتی ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بعض اوقات اگلے ہی لمحے میں اسے مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اگلے لمحے آنے والے واقعات سے لاعلم رکھا ہے تاکہ وہ ہر وقت پر امید رہیں' کام کرتے رہیں' پیدا کرتے رہیں' اور نشو و نما دیتے رہیں اور جن کاموں کا انہوں نے آغاز کیا ہے انہیں پیچھے چھوڑ دیں تاکہ آنے والے ان کی تکمیل کریں۔ یہاں تک کہ تقدیر وہ چہرہ نمودار کر دے جو پس پردہ ہے۔

قیامت بھی ان پوشیدہ اور مستور غیبوں سے ہے۔ اور اگر لوگوں کو قیام قیامت کی ساعت کا علم ہو جائے تو زندگی کی

گاڑی یکدم رک جائے یا اس کے اندر عظیم خلل پڑ جائے۔ زندگی کے شب و روز اس طرح نہ گزریں جس طرح کہ قانون قدرت نے ان کے لیے ضابطہ بندی کی ہوئی ہے بلکہ لوگ بیٹھ جاتے اور سال و ماہ اور دن اور گھنٹے گنتے کہ بس اب قیام قیامت کے لیے کتنے دن رہ گئے۔

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (۱۶ : ۷۷) "اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ یہ بہت ہی قریب ہے لیکن اس کے وقت کا حساب انسان کے ماہ و سال کے حساب سے مختلف پیمانوں کے ساتھ ہے۔ اس کے انتظامات کے لیے اللہ کو کسی وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ پلک جھپکنے کی دیر کافی ہے' اس سے بھی کم وقت میں یہ تمہارے سامنے اپنے پورے مناظر کے ساتھ حاضر ہوگی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱۶ : ۷۷) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ انسانوں اور مخلوقات کی یہ ان گنت تعداد کو حاضر کرنا' ان کا اٹھانا' جمع کرنا' حساب و کتاب لینا' جزاء و سزا دینا اس قدرت کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے جس نے صرف کن کہنا ہے اور سب کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے لیے خوفناک اور مشکل ہے جو انسانی پیمانوں سے معاملات کو سوچتے ہیں۔ انسانی نظروں سے دیکھتے ہیں اور انسانی اعداد میں حساب و کتاب کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی سوچ اور اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس عظیم واقعہ کو انسانی زندگی کی بعض مثالوں سے انسان کے لیے قریب الفہم بناتے ہیں' کیونکہ اس عظیم اور ہولناک واقعہ کے حقیقی تصور سے انسان کی قوت ادراک اور قوت تصور عاجز ہے۔ یہ مثالیں انسانی زندگی میں دہرائی جاتی ہیں۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸

"اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اس نے تمہیں کان دیئے' آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے' اس لیے کہ تم شکرگزار بنو"۔

یہ بھی ایک عالم غیب ہے جو انسان کے بہت ہی قریب ہے' لیکن قریب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فہم و ادراک سے بہت بعید بھی ہے۔ یہ کہ اس عالم غیب بطن مادر میں جنین کس طرح تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے۔ بعض اوقات لوگ جنین کے حالات ملاحظہ کرتے ہیں' لیکن ان کا علم محدود ہے اور وہ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ کس طرح تکمیل اور نشوونما کے مراحل طے کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نشوونما میں راز حیات اصل راز ہے' جس کا علم آج تک پوشیدہ ہے۔ وہ علم جس کا انسان دعویٰ کرتا ہے اور جس کے ساتھ انسان آگے بڑھتا ہے اور جس کے ذریعے وہ قیامت کے قیام کو بھی معلوم کرنا

چاہتا ہے 'وہ ایک حادث علم ہے کیونکہ پہلے انسان کچھ بھی نہ جانتا تھا۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا (۱۶:۷۸) "اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے"۔ ہر عالم اور ہر محقق کی ولادت اور اس حال میں ماں کے پیٹ سے اس کا نکلنا کہ وہ کچھ نہیں جانتا ایک قریب العہد واقعہ ہے۔ اس کے بعد اس نے جو علم سیکھا وہ اللہ کا دین ہے اور یہ اللہ نے انسان کو اسی قدر دیا ہے جس قدر اس جہاں میں انسان کے لیے زندگی گزارنے کے لیے کافی ہو' یعنی اس پوری کائنات میں جو انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔

وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۱۶:۷۸) "اس نے تمہیں کان دیئے' آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے"۔ قرآن کریم انسان کے قوائے مدرکہ کے مجموعے پر قلب اور فواد کا اطلاق کرتا ہے۔ اس میں عقل بھی آتی ہے اور اس میں وہ وجدانی اور الہامی قوتیں بھی آتی ہیں جن کی حقیقت سے انسان خبردار نہیں ہے۔ اور انسان کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ قوتیں کس طرح کام کرتی ہیں اور تمہیں کان' آنکھیں اور دل دیئے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۶:۷۸) "اس لیے کہ تم شکرگزار بنو"۔ جب تم غور کرو کہ یہ چیزیں انسان کو دے کر اللہ نے کس قدر کرم کیا ہے' نیز ان کے علاوہ اللہ کے انعامات کو ان آلات مدرکہ سے پا کر تم اللہ کا شکر ادا کرو' اور شکر کا پہلا مظہر یہ ہے کہ انسان اللہ وحدہ پر ایمان لائے۔

ایک دوسرا تعجب انگیز منظر جو رحمت الہیہ کے آثار میں سے ہے اور جو انسانوں کے پیش پا افتادہ ہے' انسان اسے دیکھتا ہے اور تدبر نہیں کرتا۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

"کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

پرندے زمین و آسمان کی فضا میں مسخر ہیں۔ یہ اسی میں اڑتے پھرتے ہیں' ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ یہ منظر ہم بار بار دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھنے کی وجہ سے اس کے اندر جو عجوبہ ہے' وہ غیر محسوس ہو گیا ہے۔ اس کی طرف انسان کا دل و دماغ تب توجہ کرتا ہے جب وہ جاگنے والا ہو' اور اس کو شاعرانہ قوت مشاہدہ دی گئی ہو۔ ایک شاعرانہ ژرف نگاہی رکھنے والا شخص تو اس پر ایک نظم اور قصیدہ لکھ سکتا ہے اور وہ بے ساختہ اس قدیم' مالوف اور جدید شاعرانہ منظر کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (۱٦ : ۷۹) "اللہ کے سوا کس نے انہیں تھام رکھا ہے"۔ یہ کس طرح' پرندوں کی فطرت ہی ایسے اصولوں پر وضع کی گئی' اس کے ارد گرد فضائی حالات اللہ نے ایسے بنائے کہ اس میں وہ اڑ سکیں اور زمین پر کسی بھی وقت نہ گریں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱٦ : ۷۹) "اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ ایک قلب مومن اس کائنات کی عجائبات پر اسی طرح نظر دوڑاتا ہے جس طرح شاعر کسی چیز کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا شعور اور اس کا ضمیران مخلوقات کے حسن اور کمال کو محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے احساس کی تعبیر نہایت ہی خوبصورتی سے کرتا ہے۔ ایمان کی شکل میں' اللہ کی بندگی کی شکل میں اور اللہ کی ثنا اور تسبیح کی شکل میں۔ اہل ایمان میں سے اللہ نے جن لوگوں کو قادر الکلامی دی ہے' وہ اللہ کی ان تخلیقات میں عجیب و غریب پہلو دیکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ ایسے مومنین کی تخلیقات اس قدر گہری ہوتی ہیں کہ عام شاعر کی اس مقام تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

---000---

اب مضمون' اللہ کی تخلیقات کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ اللہ کی قدرت کے مزید نشانات اور اللہ کے انعامات کے کچھ مزید نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے گھر اور ان کی مسرتیں' گھروں کا ماحول ساز و سامان اور پناہ گاہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝

"اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا۔ اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنہیں تم سفر اور قیام' دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس نے جانوروں کے صوف اور اون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدت مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا' پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں' اور تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں۔ اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے شاید کہ تم فرمانبردار بنو"۔

گھر اور پر سکون گھر کس قدر عظیم نعمت ہے' اس کی قدر وہ جانیں جو مہاجر ہیں' جو گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں اور مارے مارے پھر رہے ہیں۔ نہ ان کا گھر ہے اور نہ سکون ہے۔ یہاں گھروں اور سایوں کا ذکر غیب کے ذکر کے بعد آتا ہے۔ ربط یوں ہے کہ ایک سایہ بھی کسی چیز کو ڈھانپ لیتا ہے اور غیب بھی ان امور کو ڈھانپ لیتا ہے جو غیب میں ہوتے ہیں۔ دونوں میں ستر اور پوشیدگی ہے۔ گھروں کی تعبیر جائے سکون سے کرنے سے ایک حساس شخص ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے' غافل لوگ اس سے کماحقہ لطف نہیں لے سکتے۔ یہاں مناسب ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ گھر کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ قرآن کریم نے گھر کی تعبیر یوں کی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا (۱۶ : ۸۰) "اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا ہے"۔ اسلام چاہتا ہے کہ ایک گھر نفسیاتی اطمینان' شعوری ٹھہراؤ اور جذباتی سکون کی جگہ ہو۔ یہ خوشی کی جگہ ہو' انسان وہاں آکر خوش ہوں۔ اور اس میں انسان کے لیے مادی اور روحانی سکون کا انتظام ہو۔ اس میں جو لوگ رہتے ہوں وہ ایک دوسرے کے لیے باعث اطمینان اور خوشی ہوں' اور ان میں سے ہر ایک شخص دوسرے کے لیے سامان سکون ہو۔ اسلام کسی بھی گھر کو نزاع' جھگڑے' بے اتفاقی اور مخاصمت کی جگہ بنانا نہیں چاہتا کیونکہ وہ اس کے نزدیک ٹھہرنے' سکون' امن اور اطمینان و سلامتی کی جگہ ہونا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام گھر کے احترام کی ضمانت دیتا ہے تاکہ گھر کے امن و سکون اور سلامتی کی ضمانت دی جاسکے۔ مثلاً کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہو۔ کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بس گھس جائے۔ بغیر حق کے اور بغیر اجازت کے۔ اسی طرح کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ گھر والوں کی اجازت کے بغیر کسی بھی وجہ سے کسی کی پرائیویسی میں دخل انداز ہو' نہ کسی کو کسی گھر کے خلاف تجسس کی اجازت ہے اور نہ کسی کی غیبت کی اجازت ہے کیونکہ ان امور سے کسی بھی گھر کا امن و سکون اور خوشی اور اطمینان ختم ہو سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے ایک گھر کو جائے سکون قرار دیا ہے۔

یہ منظر چونکہ گھر' پناہ گاہ اور لباس سے متعلق تھا' اس لیے یہاں جانوروں کے بھی اس پہلو کا ذکر کیا گیا' جو ان مقاصد کے لیے مفید ہے یعنی مسکن و لباس کا پہلو۔

وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۱۶ : ۸۰) "اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنہیں تم سفر اور قیام' دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس نے جانوروں کے صوف اور اون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدت مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں"۔ یہاں بھی جانوروں کے مفادات میں سے ضروریات کا ذکر کیا اور ان چیزوں کا ذکر بھی کیا جو حسن اور شوق کا سامان کرتی ہیں۔ متاع اور اثاث البیت میں یہی فرق ہے۔ متاع سے مراد فرش' قالین اور دوسرا سامان آرائش ہے لیکن اس میں وہ سب چیزیں شامل ہیں جو تمتع کی تعریف میں آتی ہیں اور فرحت بخش ہوتی ہیں۔

سکون، اطمینان کی فضا میں اب انداز تعبیر لطیف ہو جاتا ہے۔ سایوں، پناہ گاہوں، پہاڑوں اور گرمی سردی اور جنگی پوشاکوں کی بات چلتی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ (۱۶ : ۸۱) "اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا، پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں، اور تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں۔ اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں"۔ چھاؤں میں انسان کے لیے سکون ہے اور چھاؤں کے تصور میں بھی فرحت ہے۔ پہاڑی پناہ گاہوں میں انسان اطمینان اور امن محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ پوشاکیں جو سردی، گرمی میں اور جنگ کی حالت میں کام آتی ہیں انسان کی دلچسپی کا سامان ہیں اور انسان کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں۔ پھر خوشی اور مسرت کا بھی ان میں سامان ہے اس لیے اس پر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۱۶ : ۸۱) "اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے شاید کہ تم فرمانبردار بن جاؤ"۔ اسلام کا مفہوم ہی سکون، سپردگی اور سلامتی ہے۔ اس طرح اس منظر کی تمام چیزوں کے درمیان معنوی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو قرآن کریم کے اسلوب کلام کا خاص انداز ہے۔

اب اگر وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں تو بہتر، اور اگر وہ منہ موڑتے ہیں اور بھاگتے ہیں تو رسول کا فریضہ تو صرف ابلاغ ہے۔ اگر یہ انکار پر تل گئے ہیں تو انکار کر دیں لیکن جن نعمتوں کا ذکر ہوا ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ مان جائیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

۱۱ ع ۷

"اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ تم پر صاف صاف پیغام حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں"۔

---ooo---

اب وہ بات سامنے لائی جاتی ہے جس کا آغاز کلام میں ذکر ہوا تھا، وہ یہ کہ جب قیامت آجائے گی تو کافر کس حالت سے دوچار ہوں گے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٨٤﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٥﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿٨٨﴾

"(انہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اس روز کیا بنے گا) جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے 'پھر کافروں کو نہ حجتیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا 'نہ ان سے توبہ و استغفار ہی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھر مہلت دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں شرک کیا تھا اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے "اے پروردگار' یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے"۔ اس پر ان کے وہ معبود انہیں صاف جواب دیں گے کہ "تم جھوٹے ہو"۔ اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افتراء پردازیاں رفوچکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے۔ اس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے"۔

یہ قیامت کا منظر ہے۔ انبیاء کھڑے ہیں اور وہ تمام واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان جو کشمکش ہوئی وہ اسکرین پر چل رہی ہوگی۔ کفار دنگ کھڑے ہوں گے۔ اب ان کو حجت بازی کی اجازت نہ ہوگی۔ سفارشیں لانے کی اجازت نہ ہوگی۔ ان سے یہ مطالبہ بھی نہ کیا جائے گا کہ یہ یہ کام کر کے رب کو راضی کرو کیونکہ اب تو توبہ کا دروازہ بند اور عمل کا میدان ختم ہے۔ اب تو مکافات عمل کا میدان ہے۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ (۱۶ : ۸۵)

"ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھر مہلت دی جائے گی"۔ اب میدان حشر میں وہ لوگ نمودار ہوں گے جن کو یہ کفار و مشرکین بزعم خود خدا کا شریک سمجھتے تھے اور اللہ کے سوا ان کو خدا سمجھ کر ان کی بندگی کرتے تھے۔ تو اب مہر سکوت ٹوٹ جائے گی اور مشرکین دوڑ کر پکاریں گے۔

رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ (۱۶ : ۸۶) "اے پروردگار یہی

ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے"۔ اب تو وہ اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں "اے ہمارے رب"۔ آج وہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے شرکاء ہیں بلکہ کہتے ہیں "یہ ہمارے شرکاء ہیں"۔ لیکن وہ تو خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس عظیم تہمت اور الزام کو سن کر فوراً بول اٹھیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو' تم بڑے جھوٹے ہو۔

فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۶ : ۸۶) "وہ دور ہی سے ان کی طرف جواب پھینکیں گے' بے شک تم تو بہت بڑے جھوٹے ہو"۔ اور یہ شرکاء اور ضعفاء اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے نہایت ہی بندگی کی حالت میں'

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ (۱۶ : ۸۷) "اور یہ سب اللہ کے سامنے جھک جائیں گے"۔ اور مشرکین کے ہاتھ ان کی افتراء پردازیوں میں سے کچھ بھی نہ آئے گا۔ وہ کسی دلیل پر اعتماد نہ کر سکیں گے اور ان کی تمام صحت بازیاں کافور ہو جائیں گی۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۶ : ۸۷) "اور ان کی وہ سب افتراء پردازیاں ختم ہو جائیں گی"۔ اب فیصلہ یہ صادر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ لی اور دوسروں کے لیے بھی باعث گمراہی بنے' ان کا عذاب دوگنا ہو گا کیونکہ انہوں نے دوسروں کو بھی راہ راست سے روکا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ (۱۶ : ۸۸) "جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا' انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے۔ اس فساد کے بدلے جو دنیا میں وہ برپا کرتے تھے۔ بے شک کفر بذات خود ایک فساد ہے' دوسرے کو کافر بنانا بہت بڑا فساد ہے۔ انہوں نے اپنے کفر کے جرم کا بھی ارتکاب کیا اور دوسروں کو بھی ہدایت سے روکا۔ اس لیے ان کا عذاب دگنا کر دیا گیا۔ یہی ان کے جرم کا پورا بدلہ ہے۔

یہ معاملہ تمام اقوام کا ہو گا لیکن رسول اللہؐ اور آپ کی قوم کا معاملہ یوں ہو گا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

۱۲ ع۶ ۱۸

"(اے نبیؐ انہیں اس دن سے خبردار کر دو) جب کہ ہم ہر امت میں خود اسی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں

گے جو اس کے مقابلہ میں شہادت دے گا' اور ان لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لیے ہم تمہیں لائیں گے ۔ اور (یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ) ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت اور بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے"۔

مشرکین کا منظر نظروں کے سامنے ہے ۔ بہت ہی سخت حالات ہیں ۔ شرکاء ان لوگوں کی تکذیب کر رہے ہیں جو انہیں شریک سمجھ رہے تھے اور وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں اور اپنے دنیاوی متبعین کے الزامات سے براءت کا اظہار کر رہے ہیں ۔ ایسے ہی حالات میں رسول اللہ اور مشرکین مکہ اور منکرین قریش کے کیس کی بھی ایک جھلکی نظروں کے سامنے آتی ہے ۔ صرف ایک جھلکی :

وجئنابك شهيدًا علي هؤلاء (۱٦ : ۸۹) "اور ان لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لیے ہم تمہیں لائیں گے" ۔ اس کے بعد متصلاً یہ بات آتی ہے کہ اے رسول تم پر جو کتاب اتاری گئی ہے وہ ایک جامع کتاب ہے ۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًي وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰي لِلْمُسْلِمِينَ

(۱٦ : ۸۹) "اور ہدایت و رحمت اور خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے" ۔ لہذا جو شخص ہدایت و رحمت چاہتا ہے تو وہ قیام قیامت سے پہلے ہی اسلام قبول کرے 'کیونکہ اس دن پھر کافروں کو دوبارہ عمل کی نہ اجازت ہو گی اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کی اجازت ہو گی ۔ یوں قرآن مجید منظر کشی کے انداز میں اپنے مطالب بیان کرتا ہے خوبصورت ہم آہنگی کے ساتھ ۔

---000---

درس نمبر ۱۲۳ ایک نظر میں

سابقہ درس اس آیت پر ختم ہوا تھا۔

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

"اور اے نبی ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے جس میں ہر شے کا بیان ہے اور ہدایت 'رحمت اور خوشخبری ہے 'مسلمانوں کے لیے"۔ (۱۶: ۸۹) چنانچہ اس درس میں اس کی بعض تعلیمات بیان کی گئی ہیں یعنی وہ کیا تعلیمات ہیں جو ہدایت 'رحمت 'اور بشارت ہیں۔ یہ کہ اس میں عدل 'احسان 'رشتہ داروں پر خرچ کا حکم 'فحاشی کی ممانعت 'گناہ اور حد سے تجاوز کی ممانعت ہے اور نیز اس میں وعدے کے وفا کرنے کا حکم ہے اور قسموں کے توڑنے کی ممانعت ہے۔ یہ وہ اہم اور بنیادی تعلیمات ہیں کہ اس کتاب میں ان پر زور دیا گیا ہے۔

اس سبق میں نقض عہد کو جرم قرار دیا گیا ہے 'اسی طرح قسمیں کھا کر لوگوں کو گمراہ کرنا اور ان کو دھوکہ دینے کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے عذاب عظیم کی شدید وعید ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ صبر کرتے ہیں ان کے لیے خوشخبری ہے کہ ان کو ان کے اچھے اعمال کا صلہ ملے گا۔

اس کے بعد کتاب عظیم کے آداب تلاوت بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ تلاوت سے قبل شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگیں تاکہ یہ مردود مجلس تلاوت قرآن سے بھاگ جائے۔ نیز کتاب عظیم کے بارے میں مشرکین کی بعض خود ساختہ باتوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً بعض مشرکین یہ کہتے تھے کہ نعوذ باللہ حضور ؐخود باتیں بنا کر ناحق خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بعض یہ کہتے تھے کہ ایک عجمی غلام ہے جو حضور ؐکو یہ باتیں بتاتا ہے۔

اس سبق کے آخر میں ان لوگوں کی سزا کا ذکر ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں۔ نیز ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جنہیں کفر پر مجبور کر دیا جائے لیکن ان کا قلب ایمان سے مطمئن ہو۔ نیز ان برگزیدہ لوگوں کا ذکر ہے جن پر ایمان کی وجہ سے تشدد ہوا۔ اور انہوں نے ہجرت کی 'جہاد کیا اور صبر کیا۔ یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے واضح ہدایات ہیں 'بہترین راہنمائی ہیں 'اللہ کی رحمت ہیں اور اہل ایمان کے لیے خوشخبری ہیں۔

--- ooo---

درس نمبر ۱۲۳ تشریح آیات

۹۰ --- تا --- ۱۱۱

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْــَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو' اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے' اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی

امت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے' اور پھر ضرور تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس ہو کر رہے گی"۔

قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے اس نظریہ کے مطابق ایک امت کو میدان میں لایا جائے ایک ایسی سوسائٹی تشکیل دی جائے جو ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ ایک نیا جہاں پیدا کیا جائے اور ایک نیا نظام تشکیل دیا جائے۔ ایک ایسی عالمی دعوت اور تحریک برپا کی جائے جو کسی گروہ' قبیلے اور کسی نسل کی طرفدار نہ ہو۔ اس دعوت میں اجتماعی رابطے اور تعلق کی بنیاد کسی عصبیت اور قومیت پر نہ ہو۔

چنانچہ اس کتاب کی تعلیمات ان اصولوں پر مبنی ہیں جن کے اوپر سوسائٹی اور امت کی تشکیل ممکن ہے۔ ان تعلیمات اور اصولوں پر افراد' اقوام اور امم کو پورا اطمینان حاصل ہو' اور باہم معاملات و تعلقات' وعدوں اور معاہدوں پر پورا بھروسہ ہو۔

اس کتاب کی تعلیمات میں سے پہلی تعلیم عدل سے متعلق ہے۔ ایسا عادلانہ نظام جس میں ایک فرد' ایک جماعت' ایک قوم اور اقوام سب کے حقوق محفوظ ہوں۔ یہ عدل کسی کی خواہش سے متاثر نہ ہو۔ محبت اور بغض سے متاثر نہ ہو۔ رشتہ داری اور اقرباپروری کا اس میں نام و نشان نہ ہو۔ امیر و غریب کے لیے یکساں ہو' قوی اور ضعیف کے حقوق اس میں برابر ہوں۔ یہ عدل اپنی راہ پر سیدھا چلے اور اس میں سب کے لیے ایک ہی معیار اور ایک ہی پیمانہ ہو۔

اس عدل کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی تعلیمات ایک دوسرے اہم اصول' احسان پر مبنی ہیں۔ جہاں تک عدل کا تعلق ہے' اس کی تلوار نہایت ہی تیز' مضبوط اور بے لچک ہوتی ہے اور سیدھا کاٹتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی تعلیمات نے عدل کے ساتھ ساتھ دلوں کو جیتنے کے لیے احسان کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے۔ یہ لازم نہیں کیا کہ بے لچک عدل کے مطابق اپنے حقوق بہرحال لیے جائیں' اگر کوئی اپنے حقوق سے دست کش ہونا چاہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اس سے دلوں کی دشمنی دور ہو جاتی ہے اس سے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ نیز فضائل اخلاق اور کریمانہ طرز عمل کا اظہار ہوتا ہے۔

احسان کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے۔ ہر اچھا کام احسان ہے۔ احسان کے حکم میں ہر عمل اور ہر معاملہ آتا ہے۔ انسان کا اپنے رب کے ساتھ تعلق' انسان کا اپنے خاندان کے ساتھ تعلق' انسان کا جماعت کے ساتھ تعلق اور انسان کا پوری انسانیت کے ساتھ تعلق۔

بعض مفسرین نے محض اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے' عدل کو عبادات واجبہ اور احسان کو عبادات نفلی پر محمول کیا ہے کیونکہ مکہ میں اسلامی قوانین نازل نہ ہوئے تھے۔ لیکن عدل و احسان میں قانون کے علاوہ اخلاقی معاملات اور انفرادی طرز عمل بھی آتے ہیں اس لیے ان کو عبادات کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں ہے۔

احسان کی ایک قسم رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ان پر خرچ ہے اور اس کا خصوصی حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اسلام میں اس کی بہت بڑی اہمیت اور عظمت ہے اور اس کی بہت بڑی تاکید ہے۔ اس میں پائے جانے والی بنیادی سوچ خاندان کی عصبیت نہیں ہے بلکہ اس سے غرض و غایت خاندانی نظام اور خاندانی نظام کے اوپر تعمیر کردہ اسلامی نظام تکافل اجتماعی ہے۔ اسلام نے اپنے اجتماعی نظام کا پہلا یونٹ خاندان کو قرار دیا ہے اور اس کے بعد وہ اسے بتدریج سوسائٹی تک عام کرتا ہے کیونکہ اجتماعی تکافل (Security) کے بارے میں اسلام کی اپنی سوچ ہے۔

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (۱۶ : ۹۰) "اور بدی اور بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے"۔ فَحْشَآء ہر اس بات کو کہتے ہیں جو حد سے تجاوز کرے۔ یہ زیادہ تر اس تجاوز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی ذاتی عزت کے خلاف ہو کیونکہ جنسی بے راہ روی بھی ایک ایسا فعل ہے جو اپنی حدود سے آگے بڑھ کر کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی زیادتی اور حدود سے تجاوز پایا جاتا ہے۔ بالعموم یہ لفظ جنسی بے راہ روی کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ المنکر وہ فعل ہے جس کا فطرت سلیمہ انکار کرے اور شریعت بھی اسے اسی وجہ سے منکر سمجھتی ہے کیونکہ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام ایک فطری نظام ہے۔ شریعت اور قانون تو اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ اور فطرت انسانی بسا اوقات بگڑ جاتی ہے۔ فطرت کے بگاڑ کے وقت پھر شریعت معیار بن جاتی ہے۔ البغی سے مراد ظلم اور لوگوں کے حقوق پر دست درازی ہے۔

دنیا میں کوئی معاشرہ بھی فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ایسا معاشرہ کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتا جس میں فحاشی وسیع پیمانے پر رائج ہو، نیز ایسی سوسائٹی بھی کبھی پنپ نہیں سکتی، جس میں منکرات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہو۔ ایسا کوئی ملکی نظام قائم نہیں رہ سکتا جس کی اساس ظلم پر ہو۔

کوئی بھی معاشرہ ایسے اجتماعی نظام کو بہت ہی کم عرصہ تک برداشت کرتا ہے، جلد ہی اس نظام کے خلاف لوگ احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کوئی ظالمانہ اور جابرانہ معاشرہ پر قوت اور پر شوکت ہو۔ اگرچہ ایسے اجتماعی نظام کے بااختیار لوگ ایسے نظام کی حمایت اور بچاؤ کے لیے لا انتہاء وسائل استعمال کریں۔ انسانی تاریخ کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو یہ تاریخ در حقیقت فحاشی، منکرات اور ظلم کے خلاف مسلسل احتجاج سے عبارت ہے لہٰذا اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تاریخ میں کچھ عرصے تک کوئی اجتماعی نظام فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم رہا ہے۔ ایسے نظاموں کے خلاف چونکہ ہمیشہ احتجاج اور رد عمل ہوتا رہا ہے اس لیے تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے۔ ایسے نظام میں اسلامی سوسائٹی کے جسم کے لیے فارن باڈی رہے ہیں اور انسانی سوسائٹی نے ہمیشہ ایسے نظاموں کو جھاڑ کر پھینک دیا ہے جس طرح ہر جسم اپنے اندر فارن باڈی کے آنے کے خلاف رد عمل کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے عدل و احسان کا حکم دینا اور فحاشی، منکرات اور ظلم سے منع کرنا فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ اسلام اس فطری رد عمل کو اسلامی جدوجہد قرار دے کر اسے قوت عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حکم پر سبق آموز تبصرہ یوں آتا ہے۔

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۱۶ : ۹۰) "وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو"۔ یہ نصیحت اس لیے ہے کہ تم اپنی اصل فطرت کی طرف رجوع کرو اور اسے یاد کرو"۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۶ : ۹۱) "اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔ جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے"۔

اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد میں مسلمانوں کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا عہد بھی شامل ہے' اور وہ عہد بھی شامل ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ نیز کسی بھی انسانی سوسائٹی میں تعلقات کا قیام صرف اسی وجہ سے ہے کہ لوگ عہد کا احترام کریں۔ اس کے بغیر تو کوئی معاشرہ قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ نہ انسانیت قائم رہ سکتی ہے۔ یہ آیت لوگوں کو اس بات پر ملامت کرتی ہے کہ وہ عہد کو پختہ باندھنے کے بعد اسے توڑیں' حالانکہ انہوں نے اس عہد کا گواہ اور ضامن صرف اللہ کو ٹھہرایا ہے اور اللہ کے نام سے یہ عہد ہوا' ذرا ہلکی سی تنبیہ بھی۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۶ : ۹۱) "اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے"۔

اسلام نے وفائے عہد میں بہت ہی سختی کی ہے۔ اس میں کسی بھی وقت چشم پوشی کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے کہ وفائے عہد وہ بنیاد ہے جس پر پورا اجتماعی نظام قائم ہوتا ہے' اس کے سوا اجتماعی نظام منہدم ہو جاتا ہے۔ اسلامی نصوص قرآن و سنت نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا کہ وفائے عہد کا حکم دے دیا جائے اور نقض عہد کے خلاف محض وعید کر دی جائے بلکہ اس کی بار بار تاکید کی ہے' اور نقض عہد کی قباحتیں بیان کی ہیں۔ ان تمام اسباب و وجوہات کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی وقت نقض عہد کا باعث بنیں۔

قرآن کہتا ہے :

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱۶ : ۹۲) "تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے' اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا"۔

جو شخص عہد توڑتا ہے وہ اس بے وقوف عورت کی طرح ہے جو کمزور ہے اور ہر وقت رائے اور عزم بدل دینے والی ہے۔ بار بار سوت کاتتی ہے اور پھر اسے توڑ دیتی ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھر اسے سوت بنا دیتی ہے۔ اس تمثیل کا ہر جز تعجب اور حقارت کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس عورت کے فعل کو فعل شنیع اور قابل نفرت بناتا ہے۔ یہی اصل مقصود ہے اس تشبیہ سے۔ کوئی بھی شریف النفس انسان اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ اس ضعیف الارادہ' احمق عورت کی طرح ہو جائے جو ایسا کام کرتی ہو جس میں اس کے لیے کوئی فائدہ نہ ہو۔

ان میں سے بعض لوگ حضور اکرمؐ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے عہد کو اس لیے توڑنے کی سوچ رہے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعیت قلیل ہے اور وہ کمزور ہے جبکہ ان کے مقابلہ میں قریش کی جمعیت کثیر ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو متنبہ کیا گیا کہ یہ ان کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ وہ ایسے قسمیہ معاہدوں کو دھوکہ اور بے ایمانی کا ذریعہ

بنائیں اور کسی بھی وقت گردن سے اتار پھینکیں۔

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶: ۹۲) "تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار نہ بناؤ اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر ہے"۔ یعنی اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے تعداد میں زیادہ ہے اور تمہاری مصلحت زیادہ تعداد والی امت سے وابستہ ہے۔

اس آیت کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کوئی شخص اس لیے عہد کو توڑے کہ کسی ملک کے مصالح اس کا تقاضا کرتا ہوں۔ مثلاً پہلے ایک حکومت دوسری حکومت کے ساتھ یا دوسری حکومتوں کے مجموعے کے ساتھ کوئی معاہدہ کرے اور پھر اس کو محض اس لیے توڑ دے کہ دوسری طرف اقوام کا بڑا جتھہ ہے اور اس حکومت کے مصالح اس دوسرے مجموعے کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اسلام اس قسم کی مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر حالت میں عہد کو وفا کیا جائے اور کسی بھی عہد کو دھوکے اور مفاد کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ یہ شرط اس کے علاوہ ہے کہ کوئی عہد صرف نیکی اور خدا خوفی کی اساس پر ہو' کسی غیر مستحسن اور خدا کی نافرمانی کے مقاصد کے لیے کوئی عہد سرے سے کیا ہی نہ جائے۔ اثم' فسوق اور نافرمانی کی بنیاد پر کوئی عہد نہ کیا جائے۔ یہ بات تو ناقابل تصور ہے کہ اقوام و ملل کو لوٹنے کے لیے کوئی عہد کیا جائے۔ یہ ہے وہ اصول جس پر اسلامی جماعت کی تشکیل ہوئی اور اسلامی مملکت کی یہی پالیسی رہی۔ اس کے نتیجے میں پوری دنیا اطمینان' اعتماد اور پاکیزگی کی دولت سے مالا مال ہو گئی۔ اسی پر مسلمان' افراد اور امم سے معاملہ کرتے رہے جب تک کہ مسلمان جہان کے قائد تھے۔

قرآن کریم کی یہ آیت مسلمانوں کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں کو وجہ جواز بنا کر معاہدات کو پس پشت نہ ڈالیں اور یہ کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ کوئی شخص یا حکومت معاہدے کو توڑنے کے لیے مجبور ہو جائے۔

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶: ۹۲) "اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ ہے"۔ یہ ایک آزمائش ہے اور اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ اس طرح اللہ ان کی قوت ارادی' ان کے جذبہ وفائے عہد اور ان کی عزت نفس کی اس ذات کے احترام کرنے میں آزمائش کرتا ہے جس کے نام پر انہوں نے یہ عہد کیا تھا۔ یعنی اس پر انہوں نے اللہ کو شاہد و گواہ بنایا تھا۔

اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ (۱۶: ۹۲) "بے شک اللہ تعالیٰ اس معاملے میں تمہیں آزماتا ہے"۔ افراد اور اقوام کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں' ان کے پورے فیصلے یہاں ہی نہیں ہو جاتے' اللہ فرماتے ہیں کہ آخری فیصلہ اللہ نے قیامت کے دن کرنا ہے۔

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱۶: ۹۲) "اور اللہ ضرور قیامت کے دن تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا"۔ ان الفاظ کو بطور تمہید یہاں لایا گیا ہے' یہ اس امر کے لیے تمہید ہیں کہ رائے' نظریہ اور عقیدے کے خلاف لوگوں کے ساتھ بھی اگر عہد ہو تو اسے پورا کیا جائے یونکہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۶: ۹۳) "اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس ہوگی"۔

اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی استعداد پر پیدا کرتا' لیکن اللہ نے ان کو بالکل مختلف صلاحیتیں دیں اور ان کو ایک ہی طباعت کے نسخے نہیں بنایا۔ مختلف طرز پر بنایا ہے۔ پھر ان کے لیے اس نے ہدایت پانے اور ضلالت پانے کے ضابطے بنا دیئے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا مسئول بنایا۔ لہٰذا اختلاف عقائد و مذاہب اس بات کا جواز نہیں ہے کہ تم اس سے نقض عہد کرو۔ اختلاف مذاہب کے اور اسباب ہیں جن کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے۔ رہا عہد تو اس کا وفا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ عقائد کا اختلاف ہو۔ یہ ہے اسلام کا اولین اصول بین المسی معاملات اور مذہبی رواداری۔ اس اصول میں اسلام اپنے عروج پر ہے اور قرآن کریم کے زیر ہدایت اس اصول کو اس دنیا میں صرف مسلمانوں نے عملی شکل دی۔

---- OOO----

مزید تفصیلات دی جاتی ہیں جن میں وفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے اور اس بات کی مزید ممانعت کی گئی ہے کہ تم معاہدے کو دھوکہ دہی اور فساد پرستی کے لیے استعمال کرو۔ یہ دنیاوی مفاد پرستی اور دنیائے دنی کے وقتی مفادات تمہیں اطمینان کی وہ دولت نہیں دے سکتے۔ اس کے نتیجے میں انسان کی نفسیاتی اور اجتماعی زندگی کے تمام اصول ٹوٹ جائیں گے اور اجتماعی معاملات اور تعلقات میں ایک بھونچال پیدا ہو جائے گا۔ یہ تو تھا دنیا کا عذاب۔ رہی آخرت تو آخرت میں ایسے لوگوں کو سخت عذاب سے دوچار ہونا ہوگا۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے وفائے عہد کیا اور اس کے نتیجے میں تمہیں کوئی دنیاوی نقصان ہو گیا تو اس کی جزاء بھی اللہ دے گا۔ دنیا کے مفادات تو فنا ہونے والے ہیں اور آخرت کے مفادات باقی رہنے والے ہیں۔ اللہ کے خزانے وسیع ہیں اور اس کے پاس نہ ختم ہونے والی دولت ہے۔

وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٩٥﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ ۖ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

"(اور اے مسلمانو) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنالینا' کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا' برا نتیجہ دیکھو اور سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے نہ بیچ ڈالو' جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر

ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔ اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے"۔

قسموں کو دھوکے اور فریب کے لیے استعمال کرنے کے نتیجے میں انسانی ضمیرت عقیدہ مرجاتا ہے اور دوسروں کے ضمیر میں اس کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ جو شخص قسم اٹھاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے اٹھاتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے' ایسے شخص کے دل میں کوئی عقیدہ قرار نہیں پکڑ سکتا۔ نہ ایسا شخص کسی راستے پر ثابت قدمی سے چل سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جن کے خلاف قسم اٹھاتا ہے ان کی نظروں میں بھی اپنے دین و ایمان کی شکل بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ دوسرا فریق جان لیتا ہے کہ اس کی یہ قسمیں دھوکے کے لیے تھیں۔ یوں یہ شخص ان لوگوں کو دین اسلام سے متنفر کر کے ان کی گمراہی کا سبب بنتا ہے کیونکہ یہ دوسرے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ایک بری مثال قائم کرتا ہے۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ اہل اسلام اپنے وعدے کے بہت پکے ہیں' عہد کے پابند ہیں' معاملات میں صاف ہیں اور ایمان میں مخلص ہیں تو کفار جماعتوں اور اقوام کی شکل میں اسلام میں داخل ہو گئے کیونکہ وفائے عہد اور ایفائے میثاق کے نتیجے میں ان کو جو خسارہ ہوتا تھا' اس سے فائدہ بہت زیادہ تھا۔

قرآن کریم اور سنت رسولؐ نے مسلمانوں کا کردار تعمیر کرتے ہوئے اس پہلو سے ان کی زندگیوں پر بہت ہی اچھے نقوش چھوڑے اور انہی نقوش کے مطابق مسلمان انفرادی طور پر اور حکومتی سطح پر لوگوں سے معاملات کرتے رہے۔ ان کا یہ طرز عمل نہایت ہی امتیازی تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت معاویہ اور شاہ روم کے درمیان معاہدۂ امن کا ایک وقت مقرر تھا۔ حضرت معاویہ نے اختتام اجل سے پہلے ہی شاہ شام کے خلاف لشکر کشی کر دی جبکہ ان کو معلوم ہی نہ تھا۔ اس موقعہ پر حضرت عمرابن عتبہ نے فرمایا اللہ اکبر' یا معاویہ' وعدے کی وفا کرو' غداری مت کرو' میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے "جس شخص اور کسی قوم کے درمیان ایک میعاد امن مقرر ہو' تو وہ اپنے اس عہد کو ہرگز حلال نہ کرے جب تک وقت گزر نہ جائے۔ چنانچہ حضرت معاویہ لشکر لے کر واپس ہو گئے۔ اسلامی تاریخ ایسی روایات سے بھری پڑی ہے کہ مسلمانوں نے نقض عہد میں صریح فائدے کے باوجود عہد کا پاس رکھا اور ظاہری مصلحتوں کو چھوڑ دیا۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کے دلوں پر یہی اسلامی رنگ چڑھا دیا تھا۔ قرآن نے وفائے عہد کی ترغیب دی' عہد شکنی سے ڈرایا۔ حضورؐ نے لوگوں کو ڈرایا اور یہ قرار دیا ہے کہ فریقین ہی معاہدے کے فریق نہیں ہوتے بلکہ اللہ بھی فریق ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ قرار دیا کہ عہد شکنی کی صورت میں جو نفع ہوتا ہے وہ نہایت ہی معمولی اور حقیر ہوتا ہے اور اللہ وفائے عہد پر جو اجر اور انعام دے گا وہ بہت ہی بڑا انعام ہو گا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۶: ۹۵) "اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے بیچ نہ ڈالو' جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے' اگر تم جانو"۔ پھر قرآن کریم یاد دلاتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے' اگرچہ وہ ان کی ملکیت ہو' وہ زائل ہونے والا ہے اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (۱۶: ۹۶) "جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے' وہی باقی رہنے والا ہے"۔ قرآن کریم وفائے عہد کے لیے لوگوں کے عزم کو قوت دیتا ہے اور وفائے عہد کی راہ میں تکالیف اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے اور ان تکالیف پر صبر کرنے والوں کے ساتھ اجر حسن کا وعدہ کرتا ہے۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶: ۹۶) "اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر' ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے"۔ اور اس سلسلے میں ان سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان کو معاف کر دیں گے۔ پس جزاء میں صرف اعمال کا اچھا پہلو ملحوظ رہے گا۔

--- ooo ---

عمل اور جزاء کی مناسبت سے یہاں عمومی ضابطہ بتا دیا جاتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مومن' اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے"۔

چنانچہ اس آیت سے درج ذیل اصول وضع ہوتے ہیں:-

(۱) جزاء و سزا میں انسان کے دونوں جنس مرد اور عورت ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ دونوں اس معاملے میں بالکل مساوی ہیں اور دونوں کی سزا و جزاء برابر ہے۔ اللہ کے ہاں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ لفظ (من) اگرچہ مرد اور عورت دونوں کے لیے آتا ہے لیکن مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۱۶: ۹۷) کا لفظ زیادہ تاکید اور وضاحت کے لیے اضافہ کر دیا۔ اس سورہ میں اس لفظ کو بالخصوص اس لیے بھی لایا گیا کہ اس میں عورت کے بارے میں اہل جاہلیت کے برے خیالات کی تردید بھی کی گئی تھی۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کے بارے میں اس سوسائٹی کی رائے اچھی نہ تھی اور جس شخص کو یہ خبر ملتی کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو وہ بدرنگ ہو جاتا اور لوگوں سے چھپتا پھرتا۔ پریشانی' شرمندگی اور عار میں مبتلا ہوتا۔

(۲) ہر عمل کے لیے کسی اساس کا ہونا ضروری ہے۔ اسلام میں اعمال کے لیے ایک ہی اساس ہے' وہ یہ کہ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (۱۶: ۹۷) "بشرطیکہ وہ مومن ہو"۔ یہ ایمان کسی بھی اخلاقی عمارت کے لیے ایک پختہ اساس ہے' اس کے بغیر کوئی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بغیر اعمال یونہی ہوں گے جس طرح ریت کا ڈھیر کہ جب اسے کوئی سخت آندھی لے تو ہوا میں بکھر جائے۔ عقیدہ اور نظریہ وہ چیز ہے جس کے ساتھ اعمال کی تاریں جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر اعمال کے تار و پود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ عقیدہ اعمال صالحہ کا سبب بنتا ہے اور ان کو مقصدیت عطا

کرتا ہے ۔ عقیدہ اور نظریہ اعمال خیریہ کو ایک ایسی اساس عطا کرتا ہے جس کی اوپر وہ سب ٹھہرے ہوتے ہیں 'مضبوط ہوتے ہیں ۔ ان میں عارضی پن اور تزلزل نہیں ہوتا اور نہ مفادات اور خواہشات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں ۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ایمان کی اساس پر استوار ہوں تو نتائج یہ ہوں گے کہ ایسے لوگوں کو اس جہاں میں بھی حیات طیبہ عطا ہوگی ۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حیات عیاشی ' خوشحالی اور دولتمندی کی زندگی ہو کبھی یہ بھی ہو گا کہ ایک مومن کو یہ چیزیں بھی دستیاب ہوں گی ۔ اور کبھی نہ ہوں گی ۔ لیکن یاد رہے کہ بعض اوقات بقدر کفایت مال کے ساتھ بھی انسان کی زندگی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ گزرتی ہے بشرطیکہ تعلق باللہ قائم ہو ' اطمینان قلبی نصیب ہو اور اللہ پر بھروسہ اور اللہ کی رضا حاصل ہو ۔ انسان کو جسمانی صحت نصیب ہو ' اس کی خواہشات میں ٹھہراؤ ہو اور اس کی ہر چیز میں برکت ہو ۔ گھر کا ماحول اچھا ہو ' اور افراد خانہ کے دلوں میں محبت ہو ۔ ماحول ایسا ہو کہ اس میں اعمال صالحہ ہو رہے ہوں اور ان اعمال کی وجہ سے ہر طرف زندگی میں طمانیت اور ضمیر میں سکون ہو ۔ مال تو امن و سکون کا ایک معمولی عنصر ہے ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مال بقدر کفایت ہو ورنہ وبال بن جاتا ہے ۔ لیکن یہ مقام ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا دل پاکیزہ ' برگزیدہ اور اعلیٰ مقاصد کے ساتھ لگا ہوا ہے جو اللہ کے ہاں قیمتی ہیں ۔

یاد رہے کہ دنیا کی حیات طیبہ آخرت کے اجر میں کوئی کمی نہیں لاتی ۔ آخرت کا اجر تو ان اچھے اعمال پر ہو گا جو اہل دین نے سرانجام دیئے اور باحسن ما کانوا یعملون (۱۶ : ۹۷) سے ضمناً یہ بات نکلتی ہے کہ برے اعمال قلم زد ہو جائیں گے ۔ کیا اچھا سلوک ہے اور کس قدر کرم نوازی ہے ذات باری کی ۔

---○○○---

جس کتاب کے ذریعہ مذکورہ بالا تعلیمات دی گئیں اب اس کتاب کے بارے میں چند کلمات اس کے ' آداب تلاوت اور اس کے بارے میں مشرکین کے تبصروں پر تنقید ۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾

۱۲
۱۱ ع
۱۹

" پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو ۔ اسے ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں ۔

تلاوت سے قبل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھنا اس لیے ضروری ہے کہ تلاوت قرآن مجید سے قبل ایسی فضا تیار ہو جس میں کوئی شیطانی وسوسہ نہ ہو ' اور انسانی شعور سب کا سب اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے ۔ اس میں کوئی گندہ جذبہ کارفرما نہ ہو ۔ اور شیطانی شر اس سے دور ہو ۔

شیطان سے اللہ کی پناہ مانگو۔

انَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۱۶: ۹۹) ''اسے ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں''۔ لہٰذا جو لوگ للہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے دل اللہ کے لیے خالص ہو جاتے ہیں۔ شیطان ان پر غالب نہیں آسکتا اگرچہ وہ ان پر ڈورے ڈالے کیونکہ ان کا تعلق خدا کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ ان کو اس ملعون کے دام سے بچاتا ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ ساتھ ہوتے اور اللہ کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان سے کبھی غلطی سرزد ہوتی ہے لیکن وہ شیطان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ لہٰذا وہ تعوذ کے ذریعے شیطان کو بھگاتے رہتے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹتے رہتے ہیں۔

انَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ (۱۶: ۱۰۰) ''اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے ہیں''۔ وہ اس کو اپنا دوست بناتے ہیں' وہ اس کے سامنے جھکتے ہیں اور اس کی خواہشات و میلانات کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کرتے ہیں۔ آج بھی بعض اقوام میں شیطان کی بندگی اور ''الہ شر'' کی بندگی کا رواج موجود ہے۔ محض شیطان کا اتباع کرنا اور اس سے دوستی کرنا بھی ایک نوع کا شرک ہے۔

اب قرآن کے بارے میں مشرکین کے اقاویل اور جواب۔

وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے۔۔۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے

کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تا کہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے ۔ ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے ۔ حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے ' اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۔ (جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے ' وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں"۔

مشرکین کو معلوم نہیں ہے کہ اس کتاب کا فنکشن کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اس لیے نازل کی گئی ہے کہ یہ ایک عالمی سوسائٹی وجود میں لائے یعنی امت مسلمہ اور اس بات سے وہ بے خبر ہیں ۔ یہ امت ایسی ہو جو پوری دنیا کی قیادت کرے اور یہ کہ یہ آخری امت ہے ۔ آئندہ دنیا میں سب کچھ اس نے کرنا ہے ' آسمانوں سے اب کوئی نئی رسالت نہیں آنی ہے ۔ پھر یہ کہ اللہ جس نے انسان کو پیدا کیا وہی جانتا ہے کہ انسان کی مصلحت اور ضرورت کیا ہے ۔ جب کسی حکم کا مقصد پورا ہو جائے اور اس وقتی حکم کی میعاد پوری ہو جائے تو اللہ ایک جدید حکم لے آتا ہے کیونکہ جدید حالات میں اس جدید حکم کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور وہ زیادہ مناسب بھی ہوتا ہے ۔ سابقہ وقتی حکم کے مقابلے میں اب یہ حکم دائمی اور ابد الدھر تک قائم رہنے کا قابل ہوتا ہے ۔ اللہ ہی سب کچھ جانتا ہے اور آیات الٰہیہ کی مثال تو ایسی ہے کہ جس طرح مریض کو گھونٹ گھونٹ دوا پلائی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ شفایاب ہو جاتا ہے ۔ اب دوائی کے بجائے اسے معمول کی غذائیں دی جاتی ہیں تا کہ وہ معمول کی زندگی بسر کرے ۔

لیکن مشرکین مکہ اس حکمت سے واقف نہ تھے ' اس لیے وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ ایک آیت کے بعد دوسری آیت کیوں آ رہی ہے ۔ خود حضور کی زندگی میں قوانین کیوں بدل رہے ہیں ۔ انہوں نے اس بات کو اس پر محمول کیا کہ نعوذ باللہ حضورؐ اپنی طرف سے آیات بناتے ہیں ' حالانکہ وہ جانتے تھے کہ حضورؐ تو صادق و امین ہیں اور وہ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے ' چہ جائیکہ وہ اللہ پر جھوٹ بولیں ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۱۰۱) "حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (۱۶ : ۱۰۲) "کہہ دو اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک تیرے رب کی طرف سے بتدریج مجھ پر نازل کیا ہے"۔ لہذا اس بات کا امکان ہی نہیں رہتا کہ یہ افتراء ہو ۔ اسے روح القدس لے کر آئے ہیں ' اللہ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کی تعلیمات سچائی پر مشتمل ہیں ۔ ان میں باطل کا شائبہ تک نہیں ہے اور یہ اس لیے آئی ہیں کہ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۱۶ : ۱۰۲) "تا کہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کریں"۔ ان کے دل اللہ کے ساتھ جڑ جائیں اور وہ معلوم کر لیں کہ یہ تعلیمات اللہ کی طرف سے ہیں ۔ وہ حق پر جم جائیں اور ان کی سچائی پر مطمئن ہو جائیں تا کہ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱۶ : ۱۰۲) "اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں سعادت اور فلاح کی خوشخبری دے"۔ یہ خوشخبری خصوصاً نصرت اور تمکین فی الارض کے بارے میں ہے ۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ

هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (١٦ : ١٠٣) "ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا ہے حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صف عربی زبان ہے"۔

ان کی طرف سے دوسرا افتراء یہ تھا کہ شاید رسول اللہؐ کو کوئی آدمی یہ قرآن مجید سکھاتا ہے۔انہوں نے اس کا نام بھی لیا تھا۔ البتہ اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ وہ ایک عجمی غلام کی طرف اشارہ کرتے تھے جو دراصل بعض قبائل قریش کا غلام تھا اور یہ حلفاء کے قریب تجارت کرتا تھا۔ اس کے پاس حضور اکرمؐ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ شخص عجمی تھا اور عربی زبان جانتا ہی نہ تھا۔ صرف عربی میں بقدر ضرورت شد بد رکھتا تھا۔

محمد ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضور اکرمؐ مروہ کے قریب ایک عیسائی غلام کے پاس بیٹھا کرتے تھے اس کا نام جبر تھا۔ یہ بنی الحضرمی شاخ کا غلام تھا۔تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ

هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (١٦ : ١٠٣) "ہمیں معوم ہے کہ یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا ہے حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے"۔

عبداللہ ابن کثیر نے کہا ہے اور عکرمہ اور قتادہ سے نقل کیا ہے کہ اس کا نام یعیش تھا ابن کثیر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام کو تعلیم دیتے تھے۔یہ مکہ میں تھا اور اس کا نام بلعام تھا اور حضور اکرمؐ اس کے پاس جایا کرتے تھے۔ مشرکین کو معوم تھا کہ آپؐ اس کے پاس آتے جاتے ہیں تو انہوں نے یہ الزام لگایا کہ آپؐ کو یہ تعلیمات بلعام دے رہا ہے۔

بہرحال نام جو بھی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس الزام کی جو تردید کی ہے وہ سادہ اور لاجواب ہے۔ اور یہ کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ جس شخص کا تم کہتے ہو اس کی تو زبان عجمی ہے اور قرآن عربی مبین میں ہے۔

ان لوگوں نے حضور اکرمؐ پر جو الزام لگایا تھا اسے ہم ہرگز سنجیدہ الزام نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ بھی ان کی جانب سے جھوٹے پروپیگنڈے کی سازش تھی۔ اس لیے کہ وہ قرآن مجید کی ادبی اور نظریاتی قدروقیمت اور اس کے اعجاز کو اچھی طرح جانتے تھے۔یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی عجمی حضور اکرمؐ کو یہ کلام سکھا سکے۔ اگر کوئی عجمی اس قسم کا کلام لاسکتا تو وہ اسے بطور اپنے کلام کے کیوں پیش نہ کرتا۔

آج جبکہ انسان نے بہت زیادہ ترقی کر لی ہے اور انسانی قابلیت کے نتیجے میں تصنیف و تالیف کا فن بہت ہی آگے بڑھ گیا ہے۔ نیز قانون سازی اور نظم و نسق کے جدید ترین طریقے وجود میں آگئے ہیں۔ آج ایک معمولی علم رکھنے والا کوئی شخص اور اجتماعی نظاموں اور قانونی نظاموں سے واقف کوئی بھی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب کسی ایک انسان کی

تصنیف ہو سکتی ہے۔

روس کے مادہ پرست اور ملحدوں کی رائے بھی یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک پوری جماعت کی تصنیف ہے بلکہ اس کے بعض حصے جزیرۃ العرب کی تصنیف بھی نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں کہ وہ یقیناً باہر سے لائے گئے ہیں۔ یہ نگارشات انہوں نے ۱۹۵۴ء میں اس کانفرنس کے نتیجے میں مرتب کیں جو قرآن کریم پر تنقید کے لیے انہوں نے منعقد کی تھی۔

روسیوں نے یہ تجویز اس لیے پیش کی کہ ایک شخص کے اندر اس قدر قابلیت نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسی کتاب تصنیف کرے۔ اور نہ کسی ایک قوم کا یہ کام ہے لیکن روسیوں کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ سیدھی سادی بات تسلیم کر لیں کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ وحی رب العالمین ہے۔ لیکن وہ چونکہ مادہ پرست اور ملحد تھے ' اور خدا' رسولوں اور رسالت کے وجود ہی کے منکر تھے اس لیے انہوں نے یہ سچائی تسلیم نہ کی۔

اگر بیسویں صدی کے مستشرقین کی سوچ یہ ہے کہ قرآن کریم کسی ایک انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتا تو پھر جزیرۃ العرب کے ایک عجمی غلام کی تصنیف کس طرح ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم ان کے ان اقوال کی وجہ یہ بتاتا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۶ : ۱۰۴)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے' اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

یہ لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے ' اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق نہیں دی کہ وہ اس کتاب کے بارے میں صحیح رائے قائم کریں۔ نہ وہ اصل حقیقت کی طرف راہ پا سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کفر کریں گے ' منہ موڑیں گے اور کبھی بھی مان کر نہ دیں گے۔ اس لیے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۶ : ۱۰۴) "ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

یہاں اب بتایا جاتا ہے کہ رسول امین کس طرح اللہ پر افترا باندھ سکتے ہیں۔ ایسا کام تو وہ لوگ کرتے ہیں جو بدقماش لوگ ہوں اور جو افتراء پردازی کرتے رہتے ہیں۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰۤئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۶ : ۱۰۵) "(جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے' وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں"۔

جھوٹ اس قدر گھناؤنا گناہ ہے کہ کوئی مومن کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حضور اکرمؐ نے ایک حدیث میں صاف فرمایا ہے کہ کوئی مسلم جھوٹ نہیں بول سکتا اگرچہ مسلم سے دوسرے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔

---ooo---

اب یہاں سے آگے ان لوگوں کے احکام بیان کیے جاتے ہیں جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا' اور اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا جو اس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے' یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ آخرت میں یہی خسارے میں رہیں۔"

مکہ کے ابتدائی دور میں مسلمانوں پر اس قدر مظالم ڈھائے گئے اور وہ اس قدر مشکلات سے دوچار ہوئے کہ ان کا برداشت کرنا صرف اس شخص کے لیے ممکن تھا جس نے شہادت کی نیت کی ہوئی تھی اور اس نے اس دنیا کی زندگی کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دی ہوئی تھی اور وہ اسلام کے بعد کفر کی طرف لوٹنے کے مقابلے میں شدید سے شدید اذیت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

یہاں بتایا جاتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کرنا بڑا جرم ہے۔ کیونکہ ایمان کو جاننے اور اس کو برتنے کے بعد ارتداد اختیار کرنا اور آخرت کے مقابلے میں کفر اختیار کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہو گا' عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے اور ہدایت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں' کانوں اور آنکھوں پر مہر لگ جاتی ہے اور آخرت میں یہ لوگ بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوں گے اس لیے کہ نظریہ کے بارے میں کوئی تحریک بھی سودا بازی نہیں کر سکتی اور نظریہ اور دعوت کے بارے میں سود و زیاں کا لحاظ بھی نہیں کیا جاتا۔ جب ایک شخص ایمان لا کر اسلامی نظریہ حیات کو قبول کر لیتا ہے تو پھر چاہئے کہ اس زمین اور اس دنیا کے موثرات میں سے کوئی موثر بھی اس انسان پر اثر انداز نہ ہو کیونکہ زمین کا اپنا حساب و کتاب اور قدر و قیمت ہوتی ہے اور نظریات کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ نظریہ کوئی مذاق نہیں ہوتا' نظریات کے بارے میں کوئی بھی سودا

بازی نہیں ہو سکتی کیونکہ نظریات سودے بازی سے بلند مقام رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس فعل کی سزا میں اس قدر سختی کی گئی ہے۔اس سخت حکم سے صرف ایک استثناء ہے۔وہ یہ کہ ایک آدمی کو اعلان کفر پر مجبور کر دیا گیا ہو لیکن اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو' یعنی کوئی شخص اعلان کفر اس حالت میں کر دے کہ اسے موت کا خطرہ ہو لیکن اس کا دل ایمان و یقین پر مطمئن ہو۔روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار ابن یاسر کے بارے میں نازل ہوئی۔

ابن جریر نے محمد ابن عمار ابن یاسر سے روایت کی ہے کہ مشرکوں نے عمار ابن یاسر کو پکڑا اور انہیں سخت تکلیف دی۔بہت تشدد کیا یہاں تک کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق بات کرنے کے قریب ہو گیا۔اس نے اس بات کی شکایت حضورؐ سے کی کہ اس نے تشدد کی وجہ سے یہ یہ باتیں کیں تو حضورؐ نے فرمایا تم اپنے دل کو کیسا پا رہے ہو تو انہوں نے عرض کیا کہ میرا دل تو ایمان پر مطمئن ہے۔تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر انہوں نے پھر اس قدر تشدد کیا تو تم پھر ایسی بات کہہ دو۔چنانچہ ایسے مشکل حالات میں کلمات کفر کہنے کی اجازت اور رخصت دے دی گئی۔

بعض مسلمان ایسے بھی گزرے جنہوں نے محض زبان سے کلمہ کفر ادا کرنے کے مقابلے میں موت کو پسند کیا۔سمیہ ابن یاسر نے یہ مقام عزیمت حاصل کیا۔ان کے اندام نہانی میں تیر کا نشانہ لگا۔اسی طرح ابو یاسر نے بھی یہ مقام حاصل کیا۔دونوں شہید ہو گئے مگر کلمہ کفر نہ کہا۔

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا۔شدید گرمی میں ایک عظیم پتھر ان کے سینے پر رکھ دیا جاتا اور کہا جاتا کہ شرک کرو۔وہ انکار کرتے اور کہتے احد احد اور کہتے کاش اگر اس سے زیادہ سخت بات معلوم ہوتی تو میں وہ بھی کہتا۔

یہی حال حبیب ابن زید انصاری کا رہا۔ان سے مسیلمہ کذاب نے کہا: کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ محمد رسول اللہؐ ہیں؟ تو وہ کہتے ہاں' پھر اس نے کہا' کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں رسول ہوں۔تو وہ کہتے میں نہیں سن رہا۔تو وہ ان کا ایک ایک عضو کاٹتے رہے۔یہاں تک کہ وہ اس حالت میں شہید ہو گئے۔

ابن عساکر نے عبداللہ ابن حذیفہ سہمی کی سوانح عمری میں لکھا ہے۔یہ صحابی تھے۔ان کو رومیوں نے گرفتار کر لیا۔انہوں نے اسے اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔بادشاہ نے انہیں کہا کہ آپ نصرانی بن جائیں' میں آپ کو اپنے اقتدار میں بھی شریک کرتا ہوں اور اپنی لڑکی آپ کے نکاح میں دیتا ہوں۔انہوں نے کہا کہ اگر تو مجھے اپنی پوری مملکت دے دے اور تمام عربوں کی حکومت بھی عطا کر دے' اس کے عوض کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو ترک کر دوں اور وہ بھی پلک جھپکنے جتنی دیر کے لیے تو بھی میں یہ کام نہ کروں گا۔اس نے کہا تو پھر میں تمہیں قتل کر دوں گا۔انہوں نے کہا تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔کہتے ہیں کہ اس نے حکم دیا اور انہیں سولی پر لٹکا دیا گیا۔پھر اس نے تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے پاؤں اور ہاتھوں کے قریب تیر ماریں۔چنانچہ وہ تیر مارتے رہے اور بادشاہ ان پر نصرانیت کا دین پیش کرتا رہا۔لیکن انہوں نے انکار کیا۔اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ انہیں سولی سے اتار دیں۔چنانچہ انہیں تختہ دار سے اتار دیا گیا۔اس کے بعد تانبے کی ایک (تیل کی) ہنڈیا یا دیگ لائی گئی۔اسے گرم کیا گیا۔اس کے بعد ایک مسلمان قیدی لایا گیا' اسے اس کے اندر پھینکا گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ چمکدار ہڈیاں بن کر رہ گیا۔اس کے بعد پھر اس نے ان پر اپنا دین پیش کیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔اب اس نے حکم دیا کہ ان کو بھی اس میں پھینک دیا جائے۔انہیں لوہے کی چرخی پر چڑھایا گیا تاکہ اس کے اندر پھینک دیں۔اس وقت وہ روئے۔اس پر اس بادشاہ کو یہ لالچ پیدا ہو گیا کہ شاید

اب مان جائیں تو انہوں نے اسے بلایا تو انہوں نے کہا کہ میں رویا اس لیے ہوں کہ میری جان ایک ہے اور یہ ابھی اسی دیگ میں ڈال دی جائے گی اور ختم ہو جائے گی لیکن میری خواہش تو یہ ہے کہ میرے جسم کے ہر بال کے برابر جانیں عطا ہوتیں اور وہ اللہ کی راہ میں قربان ہوتیں۔

ایک روایت میں ہے کہ اس نے ان کو قید کر دیا اور کھانا بند کر دیا۔ ایک عرصے تک یہ پابندی تھی۔ اس کے بعد انہیں شراب اور خنزیر بھیجا تو انہوں نے ان کو ہاتھ نہ لگایا۔ تو انہوں نے بلا کر پوچھا کہ تم نے ان کو کیوں ہاتھ نہ لگایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ چیزیں اس وقت تو میرے لیے حلال ہیں لیکن میں تمہیں خوش کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر اس نے کہا چلو میرے سر ہی کو چوم لو' میں تمہیں رہا کر دوں گا۔ اس پر انہوں نے کہا کیا تم میرے ساتھ تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دو گے؟ تو اس نے کہا ہاں۔ تو انہوں نے اس کے سر کو چوم لیا اور انہوں نے وہ تمام قیدی رہا کر دیئے جو ان کے ساتھ تھے۔ جب وہ لوٹے تو عمر ابن الخطابؓ نے فرمایا ہر مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ عبداللہ ابن حذافہ کا سر چومے اور میں اس کی ابتداء کرتا ہوں۔ وہ اٹھے اور انہوں نے ان کے سر کو چوما۔ اللہ دونوں سے راضی ہو۔

یہ اس لیے کہ عقیدہ اور نظریہ ایک عظیم دولت ہیں۔ نظریہ میں کمزوری نہیں دکھائی جاتی اور رخصتوں پر عمل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگرچہ رخصت ہوتی ہے لیکن ایک مومن نفس اس کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ عزیمت پر عمل کرے کیونکہ نظریہ ایک ایسی امانت ہے جس پر انسان کو پوری زندگی اور پورے دنیاوی مفادات کو قربان کرنا چاہیے۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١٠﴾ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١١١﴾

۱۸ ۲۰ ع ۱۰

"بخلاف اس کے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو انہوں نے گھر بار چھوڑ دیئے۔ ہجرت کی' راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا۔ ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے۔ (ان سب کا فیصلہ اس دن ہو گا) جب کہ ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہو گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائے گا"۔

یہ لوگ عربوں میں ضعفاء میں سے تھے اور سرکش مشرکین نے ان کو ان کے دین اور نظریہ کی وجہ سے تکالیف دیں۔ لیکن جو نہی ان کو موقعہ ملا انہوں نے ہجرت کی۔ اسلام میں پختگی حاصل کی۔ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور دعوت اسلامی کی خاطر تکالیف اٹھاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کو مغفرت کی بشارت دیتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (١٦ : ١١٠) "ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم

ہے"۔

یہ وہ دن ہے جس میں ہر نفس اپنے معاملات میں گھرا ہو گا۔ کوئی کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہو گا۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (۱۶: ۱۱۱) "ہر نفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہو گا"۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن ہر شخص سخت ہولناک حالت میں ہو گا' ہر شخص اپنے ہی بارے میں فکر کر رہا ہو گا' اپنا ہی کیس لڑ رہا ہو گا۔ لیکن کسی کا جھگڑا اسے کچھ فائدہ نہ دے گا۔ وہاں تو ہر کسی کو اس کی اپنی ہی کمائی ملے گی۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۶: ۱۱۱) "کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا"۔

---OOO---

درس نمبر ۱۲۴ ایک نظر میں

اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ نے اس سورہ میں دو مثالوں کے ذریعے اسلامی عقیدۂ توحید کو سمجھایا ہے۔ یہاں اب اہل مکہ اور مشرکین قریش اور مکہ کے حالات پر ایک مثال دی جاتی ہے۔ اہل مکہ پر اللہ نے اپنے انعامات کی بارش کر دی تھی لیکن انہوں نے اپنی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا۔ اس مثال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو اس انجام سے خبردار کرنا چاہتے ہیں جو مستقبل کے پردوں میں ان کا منتظر ہے۔

اس مثال میں جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ وافر رزق اور امن و اطمینان کی نعمت ہے جو مکہ میں موجود تھی' اس حوالے سے پھر ان کے سامنے یہ بات بھی رکھی جاتی ہے کہ انہوں نے بت پرستی کی وجہ سے اپنے اوپر بعض طیبات اور حلال چیزوں کو خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے حالانکہ اللہ نے ان چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ اللہ نے حرام چیزوں کو بیان کر دیا ہے اور یہ چیزیں ان میں سے نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے انعامات الہیہ کی ناشکری ہے۔ اس طرح کی ناشکری کے نتیجہ میں بھی تم پر عذاب الیم نازل ہو سکتا ہے اور یہ اللہ پر بہت ہی بڑا افتراء ہے اور اللہ نے ان اشیاء کی حرمت کا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

پھر مسلمانوں پر جو ناپاک چیزیں حرام کی گئیں اس کے حوالے سے ان اشیاء کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو یہودیوں پر حرام کی گئیں۔ یہ چیزیں ان پر بطور سزا ان کے بعض جرائم کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں۔ نیز یہ ان کے بعض مظالم کی وجہ سے بطور سزا حرام ہوئی تھیں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حرام نہ تھیں جو اپنی ذات میں ایک امت تھے اور اللہ کی طرف یکسو اور حنیف تھے۔ شرک نہ کرتے تھے اور اللہ نے ان کو ہدایت دی تھی۔ وہ برگزیدہ تھے اور صراط مستقیم پر تھے۔ یہ طیبات ان پر بھی حلال تھیں اور ان کی اولاد پر بھی۔ یہاں تک کہ بعد کے ادوار میں بنی اسرائیل پر بطور سزا حرام ہوئیں اور ان جہالتوں سے کوئی تائب نہ ہو جائے تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس کے بعد دین ابراہیم کے تسلسل کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین آیا' اس میں وہ تمام طیبات از سرنو حلال کر دی گئیں جو دین ابراہیم میں حلال تھیں۔ اسی طرح یوم سبت میں یہودیوں کو شکار سے منع کیا گیا تھا' اسے بھی حلال کر دیا گیا تھا کیونکہ یہودیوں نے سبت کی پابندی کو بھی مشکوک بنا دیا تھا۔ بعض لوگ رک گئے اور بعض نے سبت کی پابندی کو توڑ دیا۔ اس لیے اللہ نے ان لوگوں کے چہرے مسخ کر دیئے اور ان کو انسانیت کے درجہ سے گرا دیا۔

اس مناسبت سے رسول اللہؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ کی طرف نہایت ہی حکمت سے اور بہترین نصیحت سے دعوت دیتے رہیں اور ان کے ساتھ نہایت ہی بھلے انداز میں مکالمہ کریں۔ اگر آپ پر زیادتی ہو تو قصاص اس کی نسبت سے عادلانہ ہو' کسی صورت میں بھی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اگر مخالف کو معاف کر دیا جائے اور صبر سے کام لیا جائے تو یہ سب سے بہتر ہے۔ اس کے بعد یاد رکھو کہ اچھا انجام متقین اور محسنین ہی کا ہے کیونکہ اللہ اہل تقویٰ اور اہل احسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ ان کی امداد کرتا ہے' ان کی نگرانی کرتا ہے اور صلاح و فلاح کی راہ کی طرف ان کو راہنمائی کرتا رہتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۴ تشریح آیات

۱۱۲--- تا--- ۱۲۸

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴿۱۱۲﴾ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ﴿۱۱۳﴾

”اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔ تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار عذاب نے ان کو آ لیا جبکہ وہ ظالم ہو چکے تھے“۔

یہ مثال مکہ پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اللہ نے اس بستی میں بیت اللہ بنایا۔ پھر اس کو حرمت دیتے ہوئے بلد حرام قرار دیا۔ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ آمن اور مامون ہو گا۔ کسی کو اجازت نہ ہو گی کہ کوئی اس کی طرف ہاتھ بڑھائے اگرچہ وہ قاتل ہو۔ جب تک وہ بیت اللہ میں ہے کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ جزیرۃ العرب کی حالت یہ ہوتی تھی کہ مکہ کے ارد گرد کے تمام علاقوں میں امن و امان نہ تھا اور لوگوں کو اچک لیا جاتا تھا۔ لیکن اہل مکہ ہر وقت امن و امان میں رہتے تھے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ نیز ان کا سامان زیست بھی ہر طرف سے چلا آ رہا تھا' حاجیوں کے ساتھ اور پر امن تجارتی قافلوں کے ساتھ' حالانکہ وہ وادی غیر ذی زرع میں بستے تھے۔ اس کے باوجود ہر چیز کا ثمرہ اور ہر قسم کا پھل ان تک پہنچتا تھا۔ یوں وہ امن کے مزے لیتے تھے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ حال اس وقت سے تھا جب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا کی تھی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو یہ لوگ آپؐ سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ آپؐ کو صادق و امین کہتے تھے۔ وہ آپ میں کوئی کمزوری نہ پاتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ آپؐ کو نبوت عطا کرتے ہیں تاکہ آپؐ ان کو اور ان

کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کی اصلاح کریں۔ اور آپؐ کا دین بھی دین ابراہیم ہے جنہوں نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ جس کے جوار رحمت میں یہ لوگ امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نہایت ہی خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ رسول اللہؐ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپؐ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔ آپؐ پر اور آپؐ کے پیروکاروں پر قسم قسم کی سختیاں کرتے ہیں اور ستم ڈھاتے ہیں۔

کسی قریہ کی یہ مثال جو اللہ اہل مکہ کے لیے بیان کرتے ہیں وہ خود ان کے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ اس کا انجام ان کے انتظار میں ہے جس طرح اللہ نے اس گاؤں کی مثال دی جس کے باسی مطمئن اور پر امن تھے۔ ان کے لیے سامان زیست وافر مقدار میں ہر طرف سے آرہا تھا لیکن انہوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی اور اللہ کے رسول کی تکذیب کی۔ پھر کیا ہوا۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (١٦: ١١٢) "تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف ان کا لباس ہو گیا"۔ ان پر دوسرے عذاب بھی آئے اس لیے کہ وہ ظالم تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ خوف اور بھوک کو لباس کی طرح مجسم کر کے پیش فرماتے ہیں۔ گویا وہ ہر وقت اس حالت میں رہتے ہیں اور بھوک و افلاس ان کا لباس ہے اور اس لباس کو وہ پہنتے نہیں چکھتے ہیں کیونکہ محض لباس پہننے سے چکھنا زیادہ موثر ہوتا ہے۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس میں قوت ذائقہ اور لامسہ بیک وقت کام کرتی ہے اور اس طرح بھوک اور خوف کا احساس دوچند ہو جاتا ہے اور بات نفس میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی زوردار انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ وہ آنے والے انجام کے بارے میں اچھی طرح سوچ سکیں۔

اس مثال میں ایک طرف سے اللہ کی نعمتوں اور رزق کا تخیل دیا گیا ہے اور دوسری جانب ان سے محرومیت کا تصور دیا گیا ہے۔ اس مناسبت سے یہاں یہ حکم دیا گیا کہ ان کے لیے جو طیبات حلال کر دی گئی ہیں' ان کو کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کرو۔ راہ ایمان پر سیدھے چلو اور شرک سے بچو جس کی وجہ سے ان کے نام نہاد الہوں نے ان پر بعض طیبات بے جواز حرام کر دیے ہیں۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١١٤﴾

"پس اے لوگو' اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو"۔ یہاں اللہ تعالیٰ محرمات کی حدبندی فرما دیتے ہیں۔ محرمات کا شمار کر دیا جاتا ہے کہ بس یہی ہیں اس کے سوا کوئی چیز حرام نہیں اور اس شمار میں وہ محرمات نہیں جو انہوں نے از خود اپنے اوپر حرام کر رکھے ہیں۔ مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ

"اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار' خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو"۔

یہ چیزیں مختلف وجوہات سے حرام کی گئی ہیں یا تو اس لیے کہ ان میں جسمانی معترت ہے یا حسی معترت ہے مثلاً مردار' خون اور لحم خنزیر میں یا نفسیاتی اور نظریاتی معترت ہے مثلاً وہ ذبیحے جن پر غیراللہ کا نام لیا گیا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۵﴾

"البتہ بھوک سے مجبور اور بے قرار ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھالے' بغیر اس کے کہ وہ قانون الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو' تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اس لیے کہ دین اسلام ایک سہل دین ہے اور اس میں کسی پر غیر ضروری سختی نہیں ہے۔ جس شخص کو موت کا ڈر ہو' یا بھوک سے سخت بیماری کا اندیشہ ہو یا سخت پیاس کا اندیشہ ہو تو وہ بقدر ضرورت ان چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس بارے میں فقہی اختلافات ہیں جن کا تذکرہ پہلے ہم کر آئے ہیں۔ غیر باغ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصول حرمت کو توڑنے والا نہ ہو اور غیر عاد کا مطلب یہ ہے کہ وہ قدر ضرورت سے آگے بڑھنے والا نہ ہو کیونکہ صرف بقدر ضرورت اجازت دی گئی ہے۔

یہ ہیں حدود حلال و حرام جو اللہ نے مطعومات میں وضع کیے ہیں۔ لہٰذا بت پرستانہ اوہام کے نتیجے میں حلال و حرام کے ان حدود سے تجاوز مت کرو اور نہ جھوٹ بولو' اس طرح کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دو اور یہ کہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے کیونکہ حلال و حرام کے حدود و قیود وضع کرنا صرف اللہ کے اختیارات میں ہے۔ اس کا تعلق قانون سازی سے ہے اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ جو شخص اللہ کے اذن کے سوا اور قرآن و سنت کی دلیل کے سوا قانون سازی کرے گا اور اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھے گا وہ جھوٹا ہے اور جھوٹے اللہ کے ہاں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۱۶﴾

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام' تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو' جو لوگ اللہ پر جھوٹے افتراء باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے"۔

یہ تمہاری زبانیں جو جھوٹے طور پر بعض چیزوں کے بارے میں کہتی ہیں کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے ان کو حلال و حرام نہ سمجھو۔ یہ افتراء علی اللہ ہے۔ نیز تم جو ایسا کہتے ہو کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے بغیر دلیل شرعی کے جھوٹ بھی

ہے۔ ایسے لوگ ظاہر ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں ضرور عیش و عشرت کر لیں گے لیکن آخرت میں ان کے لیے عذاب ہے اور یہ لوگ سخت گھاٹے میں ہوں گے۔

ان آیات کے باوجود' بعض لوگ اسلامی ممالک میں قانون سازی کا کام کرتے ہیں اور ایسی قانون سازی کرتے ہیں جو قرآن و سنت کے صریح خلاف ہوتی ہے اور پھر بھی یہ امید رکھتے ہیں کہ انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی ہوگی بلکہ عذاب عظیم کے مستحق ہوں گے۔

---ooo---

مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١١٧﴾

"دنیا کا عیش چند روزہ ہے آخر کار ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔

یہاں سورہ انعام کی ایک آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ ان میں بعض مزید چیزیں بھی یہودیوں پر حرام کی گئی تھیں۔ ایک یہ ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (١٤٦:٦)

"اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے' ان پر ہم نے ہر ناخن والی چیز کو حرام کیا تھا اور گائے اور بھیڑ بکری سے ہم نے ان پر چربی حرام کر دی تھی ماسوائے اس کے جو ان کی پیٹھ پر یا آنتوں کے ساتھ یا ہڈیوں سے مخلوط ہو" تو بتایا جاتا ہے کہ یہ چیزیں ان پر بطور سزا حرام ہوئی تھیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٩﴾

۱۵
ع ۹
۲۱

"وہ چیزیں ہم نے خاص طور پر یہودیوں کے لیے حرام کی تھیں جن کا ذکر اس سے پہلے ہم تم سے کر چکے ہیں۔ اور یہ ان پر ہمارا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ہی ظلم تھا جو وہ اپنے اوپر کر رہے تھے۔ البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور اور رحیم ہے"۔

بنی اسرائیل پر یہ چیزیں اس لیے حرام کی گئی تھیں کہ وہ مسلسل نافرمانی اور حدود سے تجاوز کرتے تھے اور یہ ان کی جانب

سے خود اپنے آپ پر ظلم تھا۔ اب اگر کسی نے برے کام پر اصرار نہ کیا اور جہالت سے سچے دل سے تائب ہو گیا تو اللہ غفور الرحیم ہے۔ اس کی رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ یہ آیت عام ہے' یہودیوں کے لیے بھی تھی اور ان کے بعد آج کے مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ نیز آج یہودی اور غیر یہودی کافر اگر تائب ہو جائیں تو ان کے بھی تمام گناہ بخشے جائیں گے۔

اس مناسبت سے کہ بعض چیزیں یہودیوں پر کیوں حرام کی گئیں اور یہ کہ اہل مکہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں اور جن چیزوں کو انہوں نے اپنے الٰہوں کے نام پر حرام قرار دیا ہے وہ احکام ان کو دین ابراہیم سے ملے ہیں۔ یہاں روئے سخن ابراہیم علیہ السلام اور دین ابراہیم کی طرف مڑ جاتا ہے کہ آپ کیا تھے اور آپ کا دین کیا تھا اور یہ کہ حضرت محمدؐ حقیقی دین ابراہیم پر ہیں اور یہ کہ یہودیوں پر جو مخصوص چیزیں ان کے جرائم کی وجہ سے حرام ہوئیں وہ دین ابراہیم میں حرام نہ تھیں۔

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٢١﴾ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٣﴾ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾

"واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا' اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہو گا۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ رہا سبت' تو وہ ہم نے ان لوگوں پر مسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطور نمونہ ہدایت' مجسمہ انابت اور صبر و شکر کا پیکر اور مطیع اور عبادت گزار بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ وہ امت تھے' یعنی ان کے اندر جو اطاعت' انابت اور شکر و برکت تھی وہ پوری امت کے برابر تھی۔ یا اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ امام ہدایت تھے۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ مفسرین سے دونوں مفہوم مروی ہیں۔ اور دونوں مفہوم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ کیونکہ جو امام ہدایت کی راہ دکھائے وہی امت کا قائد ہوتا ہے اور ایسے امام کو ان تمام لوگوں کے اعمال کا ثواب بھی ملے گا جن کو اس نے ہدایت کا راستہ دکھایا۔ اس طرح یہ راہنما بذات

خود ایک امت بن جاتا ہے۔ وہ فرد واحد نہیں رہتا۔

قَانِتًا لِّلّٰهِ (۱۶ : ۱۲۰) کا مفہوم ہے اطاعت گزار' خشوع کرنے والا اور عبادت کرنے والا۔

حَنِيفًا (۱۶ : ۱۲۰) کا مفہوم ہے حق کی طرف متوجہ ہونے والا۔ سچائی کا قلبی میلان رکھنے والا۔

وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۶ : ۱۲۰) "وہ مشرکین میں سے نہ تھے"۔ لہٰذا مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنا تعلق ان سے ظاہر کریں۔ نہ اپنے آپ کو ان کے ذریعے متبرک بنائیں۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهِ (۱۶ : ۱۲۱) "وہ اللہ کی نعمتوں پر شکر گزار تھے"۔ قول کے ساتھ بھی اور عمل کے ساتھ بھی۔ جبکہ مشرکین مکہ زبانی طور پر بھی اللہ کے انعامات کی ناشکری کرتے ہیں اور عملاً بھی کفران نعمت کرتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ اللہ کے انعامات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ اور محض اوہام و خرافات اور خواہشات کے نتیجے میں اللہ کی بعض نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرتے ہیں۔

اِجْتَبٰهُ (۱۶ : ۱۲۱) "اللہ نے انہیں چن لیا"۔

وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۶ : ۱۲۱) "اور اسے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی" اور صراط مستقیم خالص اور سیدھی توحید کی راہ ہے۔ یہ ہیں حضرت ابراہیم جن کے ساتھ یہودی بھی تعلق جوڑتے ہیں اور جن کے ساتھ مشرکین مکہ بھی اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۶ : ۱۲۳) "اور پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا"۔ پس ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حقیقی رابطہ اس دین جدید کا ہے۔ رہا یہ سوال کہ سبت کی تحریم یعنی ہفتے کے دن دنیاوی کاموں کی ممانعت تو یہ صرف یہودیوں کے ساتھ مخصوص معاملہ تھا۔ اس میں بھی انہوں نے اختلافات کیے۔ سبت کی تحریم کا بھی دین ابراہیم سے تعلق نہیں ہے لہٰذا سبت کی تحریم دین محمد میں بھی نہیں ہے۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۱۶ : ۱۲۴) "رہا سبت تو وہ ہم نے ان لوگوں پر مسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا"۔ اور اس کا فیصلہ بھی اللہ کے حوالے ہے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۶ : ۱۲۴)
"اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں"۔

---()()()---

یہاں تک تو دین جدید اور خالص عقیدۂ توحید اور دین ابراہیم اور ان کے عقیدۂ توحید کے باہم تعلق اور ان دونوں اور مشرکین و یہود کے منحرف عقائد کے درمیان فرق و امتیاز کی بات تھی ۔ قرآن مجید کے مقاصد میں سے یہ ایک اہم مقصد بھی تھا ۔ اب آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رب کی راہ میں آگے بڑھتے رہیں اور بہترین نصیحت اور حکمت اور اعتدال کے ساتھ اپنی دعوت کو پھیلاتے رہیں ۔ اگر مخالفین کے ساتھ مکالمہ کرنا پڑے تو یہ نہایت ہی احسن طریقے سے ہونا چاہئے ۔ ہاں اگر مخالفین تحریک اسلامی پر دست درازی کریں تو انتقام میں حد سے نہ گزریں اور قصاص کی حد تک اپنی جوابی کارروائی محدود رکھیں ۔ ہاں اگر آپ مخالفین کی بعض قابل معافی حرکات سے درگزر کریں تو زیادہ بہتر ہے ۔ آپ اطمینان رکھیں کہ اچھا انجام یقیناً خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے ۔ آپ ان لوگوں کے لیے پریشان نہ ہوں ۔ اگر وہ مان کر نہیں دیتے اور اگر وہ آپ کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف مکاریاں کرتے ہیں تو بھی آپ پرواہ نہ کریں ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے ۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿١٢٥﴾ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿١٢٨﴾

۱۶

ع ۹

۲۲.

"اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو ۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے ۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو ۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے ۔ اے نبی! صبر سے کام کیے جاؤ ۔۔۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ۔۔۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو ۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں" ۔

یہ ہیں دعوت اسلامی کی بنیادیں اور یہ ہیں تحریک اسلامی کے کام کے اصول و قواعد اور یہ طریقہ کار خود نبی کریم اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے وضع کیا گیا ہے ۔ نیز آپ کے بعد آنے والے تمام داعیان حق کے لیے یہی دستور العمل

ہے اور یہی منہاج دعوت ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ یہ دعوت الی اللہ ہے۔ اللہ کے راستے اور اللہ کے نظام کی طرف دعوت کسی شخصیت یا کسی قوم کی طرف نہیں ہے۔ اس میں داعی کا کردار صرف یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ اس لیے دعوت دینا اس کا کوئی احسان نہیں ہے کہ وہ جتلاتا پھرے نہ دعوت اسلامی پر احسان ہے اور نہ ان لوگوں پر احسان ہے جو داعی کے پیرو کار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا اجر بھی اللہ پر ہے۔

دعوت حکمت اور حسن تدبیر کے ساتھ جاری رہنی چاہئے۔ مخاطب کے ظروف و احوال کو اس میں مدنظر رکھنا چاہئے اور یہ متعین کرنا چاہئے کہ بیک وقت مخاطب کو کس قدر دعوت دینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ لوگوں کو اس قدر احکام اور نواہی مختصر وقت میں سنا دیئے جائیں اور وہ ذہناً ان کے لیے تیار نہ ہوں۔ یوں وہ اسے بوجھ اور ناقابل برداشت بوجھ سمجھ لیں۔ طریقہ دعوت مناسب ہو۔ ظروف و احوال کے مطابق ہو اور اس میں تبدیلی ہوتی رہے۔ داعی جوش و خروش میں آکر حتی نہ کرے نہ حکمت سے زیادہ جوش و غیرت پیدا کرے۔ ہر معاملے میں اعتدال سے کام لے۔

اس کا انداز وعظ نرم اور نہایت ہی دلکش ہو۔ بات اس انداز میں ہو کہ دل و دماغ میں بیٹھ جائے۔ صرف کوسنے اور شرمندہ کرنے کے انداز ہی کو نہ اپنائیں۔ نیز داعی لوگوں کی ان غلطیوں کو نہ کھولے جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے کسی سے سرزد ہو جائیں۔ بعض اوقات ایسی غلطیاں نیک نیتی سے ہو جاتی ہیں۔ وعظ میں نرمی سے بعض اوقات نہایت ہی سرکش اور اخلاق سے گرے ہوئے لوگ بھی ہدایت پا لیتے ہیں۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر' لیکن زجر و توبیخ اور لعنت و ملامت کا اثر بعض اوقات الٹا ہوتا ہے۔

ان کے ساتھ اگر مجادلہ کا موقعہ پیش آئے تو وہ بھی احسن طریق سے ہو۔ یہ مناسب نہ ہو گا کہ مخالف پر داعی حملہ آور ہو جائے اور اس کو ذلیل کرے یا اس کی قباحتیں بیان کرے۔ دعوت میں مباحثے کا انداز یہ ہو کہ مخاطب کو یقین ہو جائے کہ دعوت دینے والا محض غلبہ اور کلام میں برتری کا حصول نہیں چاہتا بلکہ داعی محض ایک حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ عناد کا مادہ ہوتا ہے اور ہر شخص کی عزت نفس ہوتی ہے۔ وہ آخر دم تک اپنی رائے کی مدافعت چاہتا ہے تاکہ وہ ہزیمت اور شکست سے بچے۔ اعتقاد و نظریہ دراصل رائے ہوتی ہے اور لوگ رائے کی قدر و قیمت اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ اگر کسی کو رائے بدلنے کا کہا جائے تو سمجھتے ہیں کہ ان کے رعب' ان کے احترام اور ان کی شخصیت میں فرق آ جائے گا۔ اگر داعی اچھے انداز میں مباحثہ اور مکالمہ کرے تو اس سے کسی شخص کے ذاتی احساس کو ٹھیس نہ پہنچے گی اور مخاطب یہ سمجھے گا کہ اس کی عزت نفس' اس کی شخصیت اور عزت و کرامت محفوظ ہے اور داعی صرف دعوت پہنچانا چاہتا ہے۔ محض اللہ کے لیے اسے ایک اچھی راہ کی طرف بلا رہا ہے۔ اس کام سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے' نہ وہ اپنی فتح اور مخاطب کی شکست چاہتا ہے۔

داعی کے زیادہ جوش اور جذبے کو ذرا کم کرنے کی خاطر نص قرآنی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دراصل اللہ ہی زیادہ علیم ہے وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون ہدایت پانے والا ہے۔ لہٰذا بحث و مباحثے کے اندر بہت زیادہ جوش اور جدال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شستہ انداز میں دعوت دے دی جائے اور اس کے بعد اس کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیئے جائیں۔

جب تک دعوت اسلامی میں کارکردگی صرف لسانی دعوت اور دلیل کے ساتھ بحث و مباحثے تک محدود ہے' دعوت

اسلامی کا اسلامی دستور العمل یہی ہے۔ لیکن اگر مخالف دست درازی پر اتر آئے تو پھر یہ پالیسی نہ رہے گی کیونکہ دست درازی ایک محسوس اور مادی فعل ہے۔ سچائی کی عزت اور سچائی کے مقام کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ باطل کی طرف سے دست درازی کا مناسب جواب دیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ باطل ماحول پر پوری طرح غالب آ جائے۔ ہاں باطل کی دست درازی کا جواب بھی حدود و قیود کے اندر ہو۔ یہ نہ ہو کہ مخالف کو ذلیل کر کے عبرت آموز سزا دی جائے۔ کیونکہ اسلام ایک عادلانہ دین ہے۔ یہ امن و سلامتی کو بہت پسند کرتا ہے۔ اسلام صرف اپنی ذلت اور اہل اسلام کا دفاع چاہتا ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی زیادتی اور دست درازی کا قائل نہیں ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (۱۶: ۱۲۶) "اگر تم بدلہ لو تو اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی"۔ یہ دعوت اسلامی کے طریقہ کار سے باہر کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اندر داخل ہے۔ دعوت اسلامی کا دفاع کرنا اور اس معاملے میں اعتدال کا رویہ اپنانا' یہ تحریک اسلامی کے وقار اور عزت کا باعث ہو گا۔ لوگوں کے دلوں میں یہ کوئی بے وقعت دعوت نہ ہو گی۔ کوئی ایسی دعوت جس کا وقار نہ ہو' لوگ اسے ہرگز قبول نہیں کرتے۔ نہ لوگوں کو یہ یقین آتا ہے کہ یہ دعوت دین ہے۔ نیز اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ دعوت اسلامی کو یوں بے وقار اور لاچار چھوڑ دے جو اپنے عزت و وقار کا دفاع نہ کر سکتی ہو۔ اس لیے اہل ایمان جب تک کہ وہ اللہ کے دین کے داعی ہوں' ذلت ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ نیز داعی کا منصب یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر سچائی کا امین ہے۔ اس نے لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا ہے' اور اس نے ہی انسانیت کی قیادت راہ راست کی طرف کرنی ہے۔ وہ یہ کام ہرگز نہیں کر سکتے اگر ان کو سزا دی جائے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں اور وہ دست درازی کرنے والے کی مناسب سرزنش نہ کر سکیں۔

اس سلسلے میں مناسب جواب اور سرزنش کا اصول' اصول قصاص ہو گا۔ قرآن کا اصل منشا تو یہ ہے کہ انسان عفو و درگزر سے کام لے۔ لیکن عفو و درگزر اس وقت ہوتا ہے جب انسان انتقام اور بدلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو اور ایسے حالات میں عفو و درگزر کا بہت ہی اچھا اثر ہوتا ہے اور دعوت کو بہت فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اگر بعض افراد پر دست درازی ہو لیکن دعوت کو فائدہ ہو تو اشخاص پر تعدی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اگر عفو و درگزر سے دعوت الی اللہ کی توہین ہوتی ہو اور اس کے وقار پر حرف آتا ہو تو اس صورت میں قصاص کا اصول ہی بہتر ہے۔ چونکہ صبر اور درگزر کرنے سے داعی اپنے جذبات اور جذبہ انتقام پر کنٹرول کرنا سیکھتا ہے اس لیے قرآن کریم اس فعل اور اس کے اجر کو اللہ اور آخرت سے وابستہ کرتا ہے۔

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (۱۲۶) وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ

(۱۲۷) (۱۶: ۱۲۶ - ۱۲۷) "ولیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے اور صبر کرو' تمہارا صبر اللہ ہی کے لیے ہے"۔ یہ اللہ ہی ہے جو صبر اور ضبط نفس کی توفیق دیتا ہے اور اس میں انسان کا مددگار ہوتا ہے اور یہ جذبہ للہیت ہی ہے جو انسان کو ذاتی انتقام اور قصاص اور بدلہ لینے کے مقابلے میں صبر پر آمادہ کرتا ہے۔

قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کے انداز میں یہ اصول وضع کر رہا ہے اور آپ کے ہر دعوت دین دینے والے کے لیے یہی ضابطہ عمل ہے کہ اگر لوگ ہدایت کی راہ پر نہیں آتے تو وہ پریشان نہ ہو۔ اس کا فرض وہی ہے جو وہ ادا کر رہا ہے۔ ہدایت و ضلالت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہدایت و ضلالت سنت الہیہ کے مطابق ہے اور سنت الہیہ وہ استعداد ہے جو ہدایت و ضلالت کے لیے اللہ نے نفوس انسانیہ کے اندر ودیعت کر دی ہے۔ نیز یہ کہ مخالفین کی مکاریوں کی وجہ سے داعی دل تنگ نہ ہو۔ کیونکہ وہ تو داعی ہے۔ اللہ اس کا محافظ ہے۔ وہی مخالفین کی مکاریوں اور ریشہ دوانیوں کا جواب دے گا۔ اللہ کسی داعی کو اس کے مخالفین کے حوالے نہیں کرتا بشرطیکہ وہ دعوت میں مخلص ہے' اللہ کے لیے کام کر رہا ہے اور اس کے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔

یہ جو اس کو اذیت دی جا رہی ہے یہ اس کے صبر کا امتحان ہے۔ اللہ کی نصرت آنے میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ اللہ پر اس کے بھروسے اور یقین کو آزمایا جا رہا ہے لیکن اچھا انجام یقینی ہے اور فتح اس کے قدم چومنے والی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (١٦:١٢٨) "بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں"۔ جس کے ساتھ اللہ ہو' تو اسے کوئی ڈر نہیں ہے۔ جو چاہے اس کے خلاف سازش کرے اور اس کے خلاف تدبیر کرے' اللہ بہرحال اپنے نیک بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

یہ ہے دعوت اسلامی کا دستور العمل اور اسے خود باری تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔ اگر داعی اس پر چلے تو کامیابی یقینی ہے۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کون کر سکتا ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۱۵

سورۂ بنی اسرائیل – ۱۷

۱ --- تا --- ۱۱۱

سورۂ الکہف – ۱۸

۱ --- تا --- ۸۲

سورۃ بنی اسرائیل ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے' اس کا آغاز تسبیح الٰہی سے ہوتا ہے اور اختتام بھی اللہ کی حمد پر ہوتا ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر کلام کیا گیا ہے اور سب سے بڑا موضوع اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید ہے۔ بعض موضوعات کا تعلق اسلامی نظریہ حیات پر مبنی اخلاقیات سے ہے' فردی اخلاقیات سے بھی اور اجتماعی اور سوشل اخلاقیات سے بھی۔ کچھ واقعات بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی متعلق ہیں۔ یعنی مسجد اقصیٰ اور حضور اکرمؐ کے سفر معراج کے حوالے سے۔ اس سورت میں آدم و ابلیس کے قصے کا ایک حصہ بھی بیان ہوا ہے جس کا مقصد تکریم انسانیت ہے۔

لیکن اس پوری سورت کی تعبیر جس مواد سے ہوئی ہے اس کا حقیقی تعلق رسول اللہ کی ذات سے ہے' اس زاویہ سے کہ آپؐ کے متعلق اہل مکہ نے کیا موقف اختیار کیا۔ پھر ایک اہم موضوع خود یہ قرآن کریم ہے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس کی تعلیمات کی نوعیت کیا ہے' اور اہل مکہ نے اسے سن کر کیا موقف اختیار کیا۔ اس مناسبت سے بھی رسولوں کے منصب اور رسالت کی حقیقت پر بھی بات کی گئی ہے اور پھر یہ بتایا گیا کہ سابق رسولوں کی امتوں کو حسی معجزات دکھائے گئے اور نہ ماننے والوں کو ہلاک کیا گیا لیکن رسالت محمدیہ کا اعجاز دوسری نوعیت کا ہے یہ کہ ہدایت و ضلالت کے میدان میں ہر شخص اپنے نظریات کا ذمہ دار ہے جبکہ معاشرے میں عملی ذمہ داری اجتماعی بھی ہے اور یہ تمام امور اللہ نے اپنی کتاب میں نہایت ہی تفصیل سے اپنے رسولوں کے ذریعہ بیان فرمائے تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے اور کل وہ معذرت نہ پیش کر سکیں۔

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۷ : ۱۲) "اور ہر چیز کو ہم نے نہایت ہی مفصل بیان کیا ہے"۔ اس سورت میں اللہ کی حمد' اس کی تسبیح و تعریف اور اس کے انعامات پر اس کے شکر کے مضامین بار بار آتے ہیں۔ سورت کے آغاز ہی میں فرمایا گیا۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے"۔ اور اس سورت میں جب بنی اسرائیل کو توحید کی تعلیم دی جاتی ہے تو ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ ان مومنین کی اولاد سے ہیں جن کو نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا گیا اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۱۷ : ۳) "اور وہ ایک شکر گزار بندہ تھا"۔ اور جب مشرکین کے باطل دعووں کا ذکر ہوتا ہے جو وہ اپنے خود ساختہ الہوں کے بارے میں کرتے تھے تو فرمایا جاتا ہے :

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴۳) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۴۴) (۱۷: ۴۳ - ۴۴) "پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں ۔اس کی پاکی تو ساتوں آسمانوں اور زمین اور ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں ۔کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم اس کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو"۔ اور جب بعض اہل کتاب پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ یوں تبصرہ کرتے ہیں :

وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (۱۷: ۱۰۸) "پاک ہے ہمارا رب ‘ بے شک اس کا وعدہ پورا ہونے والا ہے"۔ اور سورت کا خاتمہ یوں ہے :

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (۱۷: ۱۱۱) "اور کہو تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا ‘ نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو اور اس کی بڑائی بیان کرو ‘ کمال درجے کی بڑائی"۔ غرض اس سورت کے لیے ہم نے جو محور بیان کیا ہے یہ متنوع موضوعات اسی کے گرد گھومتے ہیں اور اس سورت کے مضامین دائروں کی شکل میں ہیں۔

پہلا دائرہ واقعہ اسریٰ کی طرف ایک مختصر اشارے سے شروع ہوتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (۱۷: ۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے"۔ اور اس میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اسریٰ کی غرض و غایت کیا ہے۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۷: ۱) "تاکہ ہم اسے اپنی آیات دکھا دیں"۔ اور اسی مناسبت سے پھر حضرت موسیٰ کی کتاب توریت کا ذکر ہوا اور اس میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا ذکر ہوا ‘ جس میں ان کے عروج و زوال کے اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ ان پر یہ زوال ان کی سرکشی اور بداعمالی کی وجہ سے آیا۔ ان کو متنبہ کیا گیا کہ اگر تم باز نہ آئے تو دوبارہ تم پر تیسری اور چوتھی بار بھی زوال آئے گا۔

وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (۱۷: ۸) "اگر تم دوبارہ سرکشی کی طرف لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے"۔ حضرت موسیٰ کی کتاب کی مناسبت سے قرآن کریم کے بارے میں بھی یہاں تبصرہ آتا ہے کہ یہ کتاب ایک مضبوط راہ بتاتی ہے لیکن

انسان بہت ہی جلد باز ہے' وہ اپنے میلانات پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ اور پھر آخر میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے کیے کا ذمہ دار ہے' ہدایت و ضلالت میں ذمہ داری انفرادی ہے اور عمل اور سلوک میں ذمہ داری اجتماعی ہے۔

دوسرے دائرے میں اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید کا ذکر ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ تمام اجتماعی آداب اور اقدار' اس کی اساس پر تعمیر ہوں گے۔ اسلامی معاشرے کی ہر بات میں عقیدۂ توحید کا رنگ ہو گا۔

تیسرے دائرے میں بت پرستی کے موضوع کو لیا گیا ہے خدا کی طرف لڑکیوں کی نسبت اور خدا کے لیے شرکاء ٹھہرانا اور بعث بعد الموت کے بارے میں ان کے غلط خیالات اور رسول اللہ پر ان کی افتراء پردازیاں۔ نیز آخر میں اہل ایمان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ احسن انداز میں گفتگو اور مکالمے کے ذریعے دعوت پھیلائیں۔

اور چوتھے سرکل میں یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے معجزات کا نزول کیوں نہیں ہوا جو سابقہ انبیاء پر ہوا؟ اس لیے کہ امم سابقہ نے ان معجزات کو بھی مان کر نہ دیا تھا' اس لیے وہ ہلاک ہوئے اور یہ سنت الہیہ ہے' اس میں رسول اللہ کے خواب کے بارے میں ان کے موقف پر ان کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ تکذیب سے باز آجائیں اور حد سے نہ گزریں۔ اس میں قصہ آدم و ابلیس کا بھی تھوڑا سا ذکر ہے جس میں ابلیس اعلان کرتا ہے کہ وہ ذریت آدم کے خلاف جنگ جاری رکھے گا۔ اور اہل مکہ جو اس وقت سرکشی اور تکذیب پر تلے ہوئے ہیں وہ شیطان کے بہکاوے میں آگئے ہیں۔ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ انسان ایک مکرم اور برتر مخلوق ہے۔ وہ ایک جواب دہ مخلوق ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قیامت میں جب سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ اٹھایا جائے گا تو اس وقت نافرمانوں کا انجام کیا ہو گا اور فرماں برداروں کا انجام کیا ہو گا۔

فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۱) وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۷۲)(۱۷: ۷۱ - ۷۲)

"اس وقت جن لوگوں کو اعمال نامہ سیدھے ہاتھ میں دیا گیا وہ اپنا کارنامہ پڑھیں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے زیادہ ناکام"۔ آخری حصے میں کفار مکہ کی ان سازشوں کا ذکر ہے' جو وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کر رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ ان تعلیمات میں سے بعض کو ترک کر دیں جو آپ پر نازل ہوئیں مثلاً یہ کہ آپ کو مکہ سے نکال دیا جائے۔ اگرچہ اس سلسلے میں آپ پر سختی کرنا پڑے۔ اور یہ بتایا گیا اگر اللہ آپ کو یہاں سے ہجرت کا حکم نہ دیتا تو مشرکین مکہ پر بھی وہی ہلاکت آجاتی جو ان سے قبل کی اقوام پر آئی۔ حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی راہ پر سیدھے چلتے رہیں' قرآن پڑھیں' نماز پڑھیں اور بہتر سے بہتر انداز میں دعوت پھیلاتے رہیں اور اگر آپ کو نکلنا پڑے تو اچھے طریقے سے نکلیں اور پریشان نہ ہوں کیونکہ اسلامی انقلاب آنے والا ہے' حق آیا ہی چاہتا ہے اور باطل کی رخصت ہی رخصت ہے۔ سفر میں بتایا جاتا ہے کہ جس دعوت اور جس قرآن کے خلاف یہ سازشیں کرتے ہیں وہ تو ان کے تمام مسائل کا حل ہے۔ لیکن افسوس کہ انسان جانتا نہیں۔

وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۸۵) "اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے"۔ اب بات قرآن مجید کے اعجاز کی آ جاتی ہے۔ یہ لوگ تو معجزات طلب کرتے ہیں' فرشتوں کے نزول کو دیکھنا چاہتے ہیں' یہ کہتے ہیں کہ رسول کے پاس ایک ایسی کوٹھی ہو جو قیمتی اثاث البیت پر حاوی ہو' اس کا ایک عظیم باغ ہو جس میں ہر قسم کے میوہ جات ہوں اور اس کے اندر نہریں بہتی ہوں' یا اس کے باغ میں ابلتے چشمے ہوں یا اور نہ ہو تو وہ سیدھا آسمان پر چڑھے اور وہاں سے موسیٰ کی طرح ایک کتاب لے کر آ جائے اور ہم اسے لے کر پڑھیں اور یہ اور اس قسم کی دوسری تجاویز و مطالبات وہ پیش کرتے تھے جو محض مکابرہ کے لیے تھے۔ وہ ماننا نہیں چاہتے تھے۔ ان سب مطالبات کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ چیزیں حضورؐ کے فرائض منصبی میں داخل نہیں ہیں اور ان لوگوں کو جواب میں مزید کہا جاتا ہے کہ خود تو تم اس قدر بخیل ہو کہ اگر اللہ کے خزانے' رحمتوں کے خزانے تمہارے اختیار میں دے دیے جائیں تو تم کسی کو کوڑی نہ دو' اس لیے کہ کہیں خزانے ختم نہ ہو جائیں۔ کیا ان کے لیے یہ بات کم معجزہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی مطیع فرمان ہے اور یہ کائنات ایک ضابطے کے مطابق چل رہی ہے اور یہ کہ حضرت موسیٰ کے عظیم معجزات کو کیا سب نے مان لیا تھا۔ کیا تم وہی صورت حالات پیدا کرنا چاہتے ہو جو فرعون کو درپیش ہوئی کیونکہ ماننا تو تم نے بہرحال نہیں ہے۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن حقیقی حق اور سچائی پر مشتمل ہے۔ اور یہ کہ یہ متفرق طور پر حسب ضرورت' وقت کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوتا رہا ہے تاکہ وہ اس پر عمل کرتے رہیں' اس کے تقاضوں کو وقت کے مطابق پورے کرتے رہیں اور یہ تو اس قدر قیمتی تعلیمات پر مشتمل ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں وہ تو خوشی کے جذبات سے روتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ سورت کا خاتمہ جن کلمات پر ہوتا ہے وہ بہت اہم ہیں۔ یہ کہ حمد و ثنا اسی کو سزاوار ہے جس نے کوئی بیٹا نہیں پیدا کیا' نہ اس کا کوئی شریک ہے کیونکہ وہ کسی کام کا خود کرنے سے عاجز نہیں ہے۔ تو سورت کا آغاز بھی حمد سے اور اختتام بھی حمد سے۔ یہاں مناسب ہے کہ معراج کے مشہور قصے پر ایک نوٹ دے دیا جائے۔

قصہ اسراء یعنی رات کا سفر اور قصہ معراج اگر ایک ہی رات میں واقع ہوئے تو ان کی تفصیلات یہ ہیں کہ اسراء یعنی رات کا سفر مکہ کی مسجد حرام سے بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ تک ہے اور معراج کا سفر بیت المقدس سے آسمانی بلندیوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک ہوا' یہ ایک غیبی سفر تھا اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ اس واقعے کے بارے میں بے شمار روایات آئی ہیں اور پھر ان کے بارے میں طویل مباحث ہوئے اور آج تک چل رہے ہیں۔

اسرا کا واقعہ کہاں پیش آیا' اس میں بھی اختلاف ہے' بعض نے کہا ہے کہ یہ واقعہ مسجد حرام میں پیش آیا۔ اور عام روایات سے یہی بات بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ حضورؐ سے روایت ہے کہ "میں مسجد میں تھا' بیت اللہ کے پاس حجر میں' نہ سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام براق لے کر آئے"۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ام ہانی بنت ابو طالب کے گھر میں تھے۔ مسجد حرام سے مراد حرم شریف ہے' کیونکہ حرم شریف مسجد کو گھیرے ہوئے ہے اور مسجد کے ساتھ اس کا تلبس ہے اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ تمام حرم مسجد ہے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ نماز عشاء کے بعد ام ہانی کے گھر سو رہے تھے کہ اسرا کا واقعہ پیش آیا اور آپ نے یہ واقعہ ام ہانی کے سامنے بیان فرمایا اور پھر کہا: "تمام نبی میرے سامنے عالم مثال میں پیش کیے گئے اور میں نے ان

کے ساتھ نماز ادا کی"۔ اس کے بعد آپ اٹھے تاکہ مسجد حرام میں جاکر نماز پڑھیں تو ام ہانی نے آپ کو کپڑوں سے پکڑ لیا تو آپ نے ان سے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تو انہوں نے کہا "مجھے ڈر ہے کہ تمہاری قوم تمہاری تکذیب کر دے گی۔ اگر تم نے ان کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی"۔ تو آپ نے فرمایا "چاہے وہ میری تکذیب کریں؟" پھر آپ نکلے اور ابوجہل کے پاس بیٹھے تو آپ نے اسے اسرا کا پورا واقعہ بتا دیا۔ ابوجہل نے کہا: اے اہل قریش 'اے اہل کعب ابن لوی ادھر آؤ۔ پھر اس نے ان کے سامنے یہ پورا واقعہ بیان کیا۔ بعض لوگوں نے تالیاں بجائیں 'بعض نے تعجب کی وجہ سے سر پر ہاتھ رکھ لیے اور بعض نے انکار کر دیا۔ بعض ضعیف الایمان مرتد ہو گئے۔ بعض لوگ ابوبکرؓ کے پاس دوڑے اور یہ اطلاع دی۔ تو انہوں نے کہا کیا یہ درست ہے کہ آپؐ نے ایسا کہا؟ انہوں نے کہا بالکل درست ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو میں شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ نے سچ کہا ہے۔ انہوں نے کہا "کیا تم اس کی یہ بات بھی مان رہے ہو کہ وہ ایک ہی رات میں شام چلا جائے اور صبح ہونے سے قبل ہی مکہ واپس آ جائے تو صدیقؓ نے کہا اگر وہ اس سے دور کا بھی دعویٰ کرے تو میں پھر بھی تصدیق کروں گا۔ میں آسمانوں کی خبروں کے بارے میں بھی اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد آپ کا نام صدیقؓ رکھ دیا گیا۔ اہل مکہ میں سے بعض لوگ بیت المقدس گئے ہوئے تھے 'انہوں نے بیت المقدس کی مسجد کی ساخت کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اللہ نے مسجد آپ کے سامنے کھڑی کر دی۔ آپ اس کی طرف دیکھتے اور ان کے سوالوں کے مطابق اس کی ساخت بتاتے۔ انہوں نے کہا جہاں تک مسجد کی ساخت کا تعلق ہے اس نے سوالات کا جواب صحیح صحیح دیا ہے۔ اس پر انہوں نے حضورؐ سے پوچھا تو پھر آپ ہمارے قافلے کے بارے میں بتائیں تو آپ نے بتایا کہ قافلے میں اس قدر اونٹ ہیں اور ان حالات میں قافلہ آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ قافلہ فلاں دن طلوع شمس کے وقت مکہ پہنچے گا اور سب سے پہلے ایک خاکستری رنگ کا اونٹ ہو گا۔ یہ لوگ پہاڑی موڑ کی طرف گئے اور بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگے۔ چنانچہ اس دن ان میں سے ایک چلایا کہ یہ ہے سورج نکلنے والا اور دوسرا چلایا یہ ہے خدا کی قسم قافلہ۔ اور اس میں سب سے آگے خاکستری رنگ کا اونٹ ہے جیسا کہ محمدؐ نے کہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے اور اسی رات حضورؐ کو بیت المقدس سے آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ واقعہ اسرا سونے کی حالت میں ہوا یا بیداری کی حالت میں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "خدا کی قسم! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد اپنی جگہ سے غائب نہیں ہوا۔ آپؐ کی روح کو بلندیوں پر لے جایا گیا۔ حسن سے روایت ہے کہ آپؐ کو خواب میں سیر کرائی گئی۔ دوسری روایات میں آتا ہے کہ واقعہ معراج روح و جسم دونوں کے ساتھ ہوا۔ البتہ وقفہ اس قدر قلیل تھا کہ آپؐ کا بستر ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا کہ آپؐ واپس آ گئے۔

مجموعہ روایت سے جو بات راجح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے ام ہانی کے گھر اپنے بستر کو چھوڑا اور آپؐ حرم میں چلے گئے۔ آپؐ حجر میں تھے اور ایسی حالت میں تھے کہ نہ سو رہے تھے اور نہ جاگ رہے تھے کہ یہ اسراء کا واقعہ پیش ہوا۔ اس کے بعد آپؐ اپنے بستر پر لوٹ آئے قبل اس کے کہ وہ ٹھنڈا ہو۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بارے میں قدماء اور جدید دور کے محققین نے جو بحثیں کی ہیں وہ سب بے محل ہیں۔ یہ واقعہ تواتر سے ثابت ہے اور جسمانی اسرا ہو یا روحانی اسرا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان میں سے کوئی بھی بعید

الامکان نہیں ہے۔اصل واقعہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کائنات کے دور دراز مقامات کی سیر کرائی جائے اور یہ سیر ایک قصیر لحظہ میں کرائی جائے۔جن لوگوں کے ذہن میں قدرت الٰہیہ کا معمولی تصور بھی ہوا' اور جو نبوت کی نوعیت کو سمجھتے ہوں' ان کو اس واقعہ کے جسمانی وقوع میں کوئی بات عجیب نظر نہیں آتی۔اس جہاں میں مشکل اور آسان یا ممکن الواقع اور ناممکن الوقوع امور انسانی قوت کے زاویہ سے نظر آتے ہیں' جہاں تک قدرت الٰہیہ کا تعلق ہے' اس کی نسبت سے تمام امور ایک جیسے ہیں' اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ رہی منصب رسالت کی حقیقت و نوعیت تو وہ انسانی سوچ اور تصور سے ایک مختلف چیز ہے۔ایک نبی دوسرے انسانوں سے ایک مختلف حقیقت رکھتا ہے۔لہٰذا ایک نبی کو اگر دور دراز کائنات کی سیر متعاد طریقوں کے مطابق کرائی جائے یا غیر معمولی اور نامعلوم طریقوں کے مطابق کرائی جائے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے اس واقعہ کو عجیب و غریب سمجھتے ہوئے سوالات کیے تو آپ نے فرمایا میں تو اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیزوں کو مانتا ہوں کہ حضور اکرم اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمانوں کی خبر دیتے ہیں۔

اس واقعہ کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس واقعہ کے بیچ ہونے پر لوگوں نے آپ سے کسی مادی دلیل کا مطالبہ کیا اور آپ نے اس سلسلے میں قافلے کی آمد کی تفصیلات ان کو بتائیں۔اس سے بھی اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ سچا تھا۔پھر یہ کہ ام ہانی نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ اس واقعہ کو عوام میں بیان نہ کریں' اس لیے کہ لوگ آپ کی تکذیب کریں گے۔لیکن آپ کو اس قدر یقین تھا کہ آپ نے ان کے مشورے پر کان نہ دھرا اور یہ فرمایا کہ جو بھی سچائی ان پہ اتری وہ بلاجھجک اس کا اظہار کریں گے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔اس واقعہ کے بعد بعض عملاً مرتد بھی ہو گئے۔بعض نے مذاق کیا اور بعض نے شک کا اظہار کیا لیکن ان تمام امور کے باوجود حضورؐ حق بات کہتے رہے کیونکہ آپ کو پختہ یقین تھا۔یہی انداز داعیان حق کا ہونا چاہیے' چاہے کوئی ان کی بات مانے یا نہ مانے۔داعیان حق کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ راضی ہوں گے یا ناراض ہوں گے' انہیں چاہیے کہ حق بات صاف صاف کہہ دیں۔سچائی کے مقابلے میں جو بھی آئے اسے رد کر دیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اس واقعہ کو اپنی رسالت پر معجزانہ دلیل کے طور پر نہیں پیش فرمایا حالانکہ اہل مکہ رات دن خوارق عادت معجزات طلب کرتے رہتے تھے۔حالانکہ وقوع معراج پر حضورؐ نے ان کے سامنے معجزانہ طور پر ثبوت بھی پیش کر دیا تھا' اس لیے کہ دعوت اسلامی کی سچائی کا ثبوت خود اس کے اندر ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب۔دعوت اسلامی کا منہاج ہی فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور عقل انسانی اس کی تصدیق و توثیق کرتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ معراج کا بیان اس لیے نہ کیا کہ یہ واقعہ آپ کی رسالت کے لیے دلیل تھا بلکہ اس نے کیا کہ یہ ایک حقیقی واقعہ تھا۔اور ایک حقیقت تھی۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ آیات کی تشریح کی طرف آئیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۵ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۱

سورۃ بنی اسرائیل مکیۃ
آیاتھا ۱۱۱ رکوعاتھا ۱۲
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۱

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا"۔

سورت کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے' چونکہ مقام ایسا ہے جہاں بندے اور رب کی ملاقات ہو رہی ہے' اس لیے ایسی فضا اور ایسے حالات میں تسبیح و تہلیل ایک مناسب فعل ہے اور حضرت محمد اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صفت عبدیت کو یہاں خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان کیا گیا کہ اس قدر عروج اور بلندی درجات کے باوجود حضور اکرم اللہ کے بندے ہی ہیں۔ دوسرے غلط مذاہب کی طرح مقام عبودیت اور مقام الوہیت کو ایک کرنے کے بجائے اس کو ممتاز رکھنا چاہیے۔ ان دونوں کا امتزاج ممکن نہیں۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آپ کی ذات میں الوہیت کو جمع کیا گیا۔ یہ محض اس لیے کیا گیا کہ آپ کی ولادت معجزانہ تھی' آپ سے معجزات کا صدور ہوا اور پھر آپ کو اس دنیا سے معجزانہ طور پر اٹھایا گیا۔ ان وجوہات کی بنا پر بعض لوگوں نے ذات عیسیٰ میں مقام الوہیت و عبودیت کا امتزاج کر دیا۔ لیکن اسلامی عقیدے کو اس معاملے میں سادہ' صاف اور خالص رکھا گیا اور اسلام نے ذات باری کے ساتھ ہر قسم کی شرک کی نفی کی خواہ قریب ہو یا بعید۔

اسراء سریٰ سے مشتق ہے' جس کے معنی رات کے وقت چلنے کے ہیں۔ اس سے اسریٰ کے مفہوم ہی میں رات کا وقت داخل ہے۔ لہٰذا اسریٰ کے بعد رات کی صراحت ضروری نہیں ہے لیکن سیاق کلام میں رات کی صراحت

بھی کر دی گئی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا (۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو رات کو"۔ یہ اس لیے کہ اس سفر کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ دکھایا جائے کہ اس سفر پر رات کے سائے تھے 'نہایت ہی پر سکون ماحول تھا۔ اور یہ قرآن کریم کا خصوصی اسلوب ہے کہ وہ ہر واقعہ کے ماحول کو بھی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے' جن حالات میں واقعہ ہوتا ہے۔ ویسی ہی فضا انسان کی قوت مدرکہ اور اس کے نفس پر سایہ فگن ہو جاتی ہے اور وہ واقعہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

یہ سفر مبارک مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اللہ نے کرایا اور اللہ لطیف و خبیر ہے۔ اس سفر کی غرض و غایت یہ بتانا تھی کہ تمام توحیدی ادیان سماوی کا سرچشمہ اور تاریخ ایک ہے' یہ ادیان ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام سے چلے ہیں اور ان کا خاتمہ حضرت محمد خاتم النبیین پر ہوا ہے۔ ان ادیان کے مقامات مقدسہ بھی یکساں طور پر قابل احترام ہیں۔ لہٰذا خاتم النبیین' تمام انبیاء اور ان کے مقامات مقدسہ کے وارث اور امین ہیں۔ گویا یہ سفر زمان و مکان کے حدود کے اندر مقید نہیں ہے' یہ کوئی مخصوص واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک آفاقی سفر ہے اور بادی النظر میں اس سے جو مقصد و مفہوم نکلتا ہے اس سے کہیں آگے اس کی غرض و غایت زیادہ وسیع ہے اور اس کے اندر گہری حکمت ہے۔

یہاں مسجد اقصیٰ کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے۔

الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (۱۷ : ۱) "جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد پر ہر وقت برکات الٰہیہ کا فیضان ہوتا رہتا ہے اور وہ اس میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم نے اسے بابرکت بنایا ہے یا یہ کہا جاتا کہ اس میں برکات ہیں تو مفہوم میں اس قدر وسعت نہ ہوتی جس طرح ان الفاظ میں ہے کہ ہم نے اس کے ماحول کو بابرکت بنایا ہے۔

یہ سفر بذات خود بھی ایک معجزہ تھا' لیکن اس کے اندر آپ کو مزید معجزات اور آیات کی سیر بھی کرائی گئی۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۷ : ۱) "تاکہ ہم اسے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں"۔ سب سے پہلے تو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر ہی ایک معجزہ ہے' کہ اس قدر قلیل وقت میں یہ سفر اختتام کو پہنچا کہ حضور کا بستر بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا' چاہے اس سفر کی کیفیت جو بھی ہو' بہرحال یہ ایک معجزہ تھا' مقصد یہ تھا کہ حضور کو وسیع تر کائنات کی سیر کرائی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اس انسانی مخلوق کی ذات میں بڑے بڑے کمالات پوشیدہ ہیں' نیز اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت خاتم النبین کو ان حقائق کے ادراک کے لیے تیار کیا جائے جو انبیاء کی ذات پر القاء ہوتے ہیں' اور جن کے اخذ کی استعداد صرف ان مخصوص بندوں کو دی جاتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ رسالت کا اعزاز بخشنے کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ انبیاء اسی نوع بشر سے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے خلق کثیر پر فضیلت دی ہوتی ہے اور جس کے اندر اللہ نہایت ہی لطیف اسرار رکھے ہوتے ہیں۔

اِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۷ : ۱) "وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے"۔ وہ ہر لطیف اور باریک چیز کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ ایسی آواز بھی سنتا ہے جو بہت ہی دھیمی ہوتی ہو وہ تمام لطائف اور تمام اسرار سے واقف ہے۔

سیاق کلام میں آغاز اللہ کی تسبیح سے ہوتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا (۱۷ : ۱) اور تسبیح اللہ کی تعریف ہے۔ اس کے بعد مقصد سفر بتایا جاتا ہے جو اثباتی اور قطعی پہلو رکھتا ہے۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۷ : ۱) اور اس کے بعد پھر اللہ کی تعریف کی طرف بات منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ سب مطالب و مفہومات اپنے اندر ایک گہرا توازن رکھتے ہیں۔ تسبیح تو صفت باری تعالیٰ ہے جو انسان کی طرف سے اللہ کے لیے ہے۔ مقصد اللہ کی طرف سے ایک فیصلہ ہے اور سمیع و بصیر اللہ ہی کی صفت دائمہ قائمہ ہے جو خبر کے انداز میں بیان ہوئی ہے۔ غرض ایک ہی آیت میں یہ سب معانی بڑی خوبصورتی کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں اور جو اپنا مفہوم نہایت ہی باریکی سے ادا کرتے ہیں۔

--- ooo---

حضور کو رات کا یہ سفر کرانا ایک معجزہ ہے۔ جس طرح دوسرے معجزات اللہ تعالیٰ صادر فرماتا رہا ہے۔ معجزہ یوں ہے کہ انسان سفر کے سلسلے میں جس انداز کا عادی ہے یہ اس سے دراہٹ کر ہے۔ مسجد اقصیٰ اس سفر میں ایک مرحلہ رہا ہے۔ مسجد اقصیٰ اس علاقے کا قلب ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بسایا اور پھر وہاں سے ان کو نکالا۔ درج ذیل آیات کے ضمن میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کے واقعات آئیں گے۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲ۭ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا

وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ أَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

"ہم نے اس سے پہلے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا تھا اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا' اور نوحؑ ایک شکر گزار بندہ تھا۔ پھر ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقعہ پیش آیا' تو اے بنی اسرائیل 'ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقعہ دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی' اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی' اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے' اور کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے"۔

بنی اسرائیل کی سیرت اور تاریخ کا یہ حصہ قرآن کریم کی صرف اسی سورت میں بیان ہوا ہے اس میں بنی اسرائیل کے اس انجام کا ذکر ہے جس پر وہ پہنچے اور جس کے نتیجے میں ان کی عزت و شوکت' زوال و نکبت سے بدل گئی۔ اس تاریخی تبصرہ کے ذریعے انسانوں کو یہ سمجھایا گیا کہ اقوام کے عروج و زوال میں اصلاح و فساد کا کتنا گہرا دخل ہوا کرتا ہے۔ بعد کی آیات میں' اسی سورت میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ سنت الٰہیہ ہے کہ اللہ جس قوم کو ہلاک کرنا چاہتا ہے وہ اس قوم کے مترفین کے اندر فسق پیدا کرتا ہے' وہ بگاڑ میں ڈوب جاتے ہیں اور ہلاک کر دیئے جاتے اور اس طرح نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

یہاں ان کو بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو تورات دی گئی۔ اس میں ان کے لیے ہدایات تھیں' پھر ان کے جد امجد حضرت نوح علیہ السلام جو عبد' شکور اور صالح تھے اور وہ آباء و اجداد جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ یہ سب لوگ صالح اور مومن تھے کیونکہ انہوں نے اپنے ساتھ کشتی میں صالحین مومنین کو بٹھایا تھا۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ

وَكِيلًا (۲) ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۳) (۱۷ : ۲ - ۳)
"ہم نے اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا تھا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور نوحؑ ایک شکر گزار بندہ تھا"۔

بنی اسرائیل کو کتاب کے ذریعہ یاد دہانی اور ارادہ اس لیے دیا گیا کہ اللہ کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی قوم کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا یا عذاب نہیں دیتا جب تک ان پر رسولوں کے ذریعہ حجت تمام نہ ہو جائے۔ جس کا تذکرہ بھی بصراحت جلد ہی آئے گا۔

حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل کو کتاب دینے کا پہلا مقصد یہ بتایا گیا۔

هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا (۱۷ : ۲) "اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا اور یہ تاکید کہ میرے سوا کسی کو وکیل نہ بنانا"۔ یعنی صرف اللہ پر بھروسہ کرو' صرف اللہ ہی کی طرف متوجہ ہو جاؤ' یہی ہدایت ہے اور یہی اصل ایمان ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو وکیل بناتا ہے وہ نہ ہدایت پر ہے اور نہ مومن ہے۔

ان کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور اس جہاں کے عہد اول میں یہی لوگ خلاصہ انسانیت تھے۔ کیونکہ وہ حضرت نوح کے یعنی ایک عبد شکور کے ساتھی اور رفقاء تھے اور صالح لوگ تھے' اس طرح اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک مومن کا حقیقی شجرۂ نسب اس کا ایمانی شجرۂ نسب ہوتا ہے۔

یہاں حضرت نوح علیہ السلام کی صفت عبودیت کا ذکر ہوا ہے کیونکہ یہی انسانیت کی اصل غایت ہے' لیکن اس کے علاوہ یہ حکمت بھی ہے کہ یہاں چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت عبدہ کا ذکر ہو گیا تھا اس لیے رسولوں میں سے ایک دوسرے ممتاز رسول' حضرت نوح علیہ السلام کی صفت عبودیت کا بھی تذکرہ کر دیا گیا اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ ہر صورت میں ایک مخصوص انداز بیان بھی اپناتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی تھی اس میں بنی اسرائیل کو صاف صاف بتایا تھا کہ تمہارے فساد کی وجہ سے تمہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ تم دو مرتبہ فساد اور بگاڑ میں مبتلا ہو گئے اور دو مرتبہ تمہیں ہلاک کیا جائے گا۔ کیونکہ ہلاکت و بربادی کے اسباب تم دو مرتبہ فراہم کرو گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اٹل ہوتی ہے۔ جو قوم بھی فساد و بگاڑ میں مبتلا ہو وہ ہلاک کر دی جاتی ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا (۱۷ : ۴) "پھر ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے"۔ یہ تنبیہ ان کو دراصل اس بات کی پیشگی اطلاع تھی کہ تمہارے ساتھ

یہ یہ ہونے والا ہے۔ کیونکہ اللہ ان کے ہونے والے انجام سے پیشگی باخبر تھا۔ یہ اطلاع محض پیشگی علم کی وجہ سے تھی۔ اس میں ان کے لیے جبر کا کوئی پہلو نہ تھا۔ یا یہ کہ ان کے اندر جو فساد بعد میں پیدا ہوا' وہ محض اس پیشگی اطلاع کی وجہ سے پیدا ہوا کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کسی کو فساد پر مجبور کرے۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ "کہہ دو' اللہ فحش پھیلانے کا حکم نہیں دیتا"۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے والے تھے۔ اللہ کے علم میں جو بات ہوتی ہے' اگرچہ بشر کو اس کا علم نہیں ہوتا اور پردہ تب اٹھتا ہے جو بشر اس کام کو کر بیٹھتا ہے۔

اللہ کا فیصلہ یہ تھا اور حضرت موسیٰ کو کتاب میں بتا بھی دیا تھا کہ بنی اسرائیل اپنی تاریخ میں دو مرتبہ فساد برپا کریں گے۔ اور اس طرح وہ زمین میں سرکشی اختیار کر لیں گے۔ بیت المقدس پر ان کا غلبہ ہو گا۔ لیکن اپنے اس غلبے کو وہ ذریعہ فساد بنائیں گے۔ جن لوگوں پر ان کو برتری حاصل ہو گی ان کی جان اور آبرو ان کے نزدیک مباح ہو جائے گی اور یہ لوگوں کو تباہ کر دیں گے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (۱۷:۵) "آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا' تو اے بنی اسرائیل' ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا"۔ یہ ان کی پہلی سرکشی تھی۔ ان لوگوں نے بیت المقدس میں بڑی ترقی اور سربلندی حاصل کی۔ ان کے پاس حکومت اور قوت جمع ہو گئی' جس پر انہوں نے فساد شروع کر دیا۔ اللہ نے ان پر ایک دوسری زور آور اور صاحب قوت قوم کو مسلط کر دیا۔ ان لوگوں کی گرفت مضبوط تھی۔ انہوں نے تمام علاقوں کو اپنے لیے حلال قرار دے دیا اور صبح و شام حملہ آور ہوتے رہے اور جو کچھ ان کے سامنے آتا اسے تاخت و تاراج کرتے رہے۔ اور وہ کسی کام کے کر گزرنے میں کوئی باک اور ڈر محسوس ہی نہ کرتے تھے۔

وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (۱۷:۵) "یہ اللہ کا ایسا وعدہ تھا جس نے پورا ہو کر ہی رہنا تھا"۔ کیونکہ اللہ کے وعدے اور فیصلے میں نہ تخلف ممکن ہے اور نہ اللہ کا کوئی فیصلہ جھوٹا ہو سکتا ہے۔

جب بنی اسرائیل نے مغلوبیت' ذلت اور غلامی کا مزہ چکھا' تو انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے اپنے حالات کو درست کیا' تو ان پر جو عذاب مسلط کیا گیا تھا اس سے ان کی گلو خلاصی ہوئی' کیونکہ فاتحوں کے اندر بھی اسی طرح کا فساد پیدا ہو گیا۔ ان کو بھی اپنی قوت پر گھمنڈ ہو گیا' انہوں نے بھی زمین میں فساد پیدا کر دیا تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان مغلوبین کو منظم کر کے ان حملہ آوروں پر غالب کر دیا اور اب بنی اسرائیل کے مستضعفین دوبارہ غالب آ گئے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ

نَفِيرًا (۱۷ : ٦) "اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقعہ دلایا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی"۔ اس کے بعد یہی عمل از سرنو دہرایا جاتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پیش گوئی کا دوسرا حصہ روبعمل آئے اور جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو' اللہ تعالیٰ یہاں ایک نہایت ہی اہم اساسی قانون مکافات عمل بیان کر دیتا ہے۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷ : ۷) "دیکھو تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے ہی برائی ثابت ہوئی"۔ مکافات عمل کا یہ وہ اساسی قاعدہ ہے جو دنیا و آخرت میں یکساں لاگو ہے۔ یہ کہ انسان اپنے اعمال کا خود حقدار و ذمہ دار ہے۔ اس کے تمام پھل اور نتائج اس کے لیے ہیں۔ عمل اور جزائے عمل لازم و ملزوم ہیں۔ نتیجہ عمل سے پیدا ہوتا ہے' اس لیے انسان ایک مسئول اور ذمہ دار ہستی ہے' اگر چاہے تو اپنے ساتھ اچھا کرے یا برا کرے' اگر اسے اچھے عمل یا برے عمل کا ثمرہ ملے تو اسے گلہ نہیں کرنا چاہئے۔

مکافات عمل کا یہ قاعدہ بیان کرنے کے بعد اب دوبارہ روئے سخن اس پیش گوئی کی طرف مڑ جاتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْءُوْا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۱۷ : ۷) "پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں"۔ یہاں سیاق کلام میں بنی اسرائیل کے دوسرے فساد کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ کیونکہ پہلے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ "تم دو بار زمین میں فساد برپا کرو گے"۔ اور دوسری بار ان پر جیسے لوگوں کو مسلط کیا گیا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسری بار بھی بگاڑ کی راہ اختیار کی تھی۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْءُوْا (۱۷ : ۷)) "پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں"۔ یعنی انہوں نے ان سے اس قدر انتقام لیا کہ ان کی شخصیت اس کے اثرات سے بدل گئی۔ یہاں تک کہ یہ ذلت و نکبت ان کے چہروں پر ظاہر ہو گئی۔ انہوں نے تمام مقدسات کی بے حرمتی کی اور ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷ : ۷) "وہ بھی اسی طرح مسجد میں داخل ہوئے جس طرح پہلے دشمن داخل ہوئے تھے"۔ جس جس چیز پر ان کا غلبہ ہوتا تھا' اسے تاخت و تاراج کرتے اور ہر چیز کو تباہ کرتے جاتے۔

وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۱۷ : ۷) "تاکہ جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے تباہ کر دیں"۔ یعنی انہوں نے

بیت المقدس کو پوری طرح تباہ کر دیا اور ان لوگوں کو ملک بدر کر کے عدسقے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

چنانچہ یہ پیشن گوئی سچی ثابت ہوئی۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور بنی اسرائیل پر ایسے ہی لوگ مسلط ہو گئے۔ پھر دوبارہ ان پر دشمن مسلط کیے گئے اور انہوں نے ان کو ملک بدر کر کے ملک کو تباہ کیا۔

قرآن کریم نے اس بات کی تصریح نہیں کی کہ یہ لوگ کون تھے کیونکہ بنی اسرائیل کی دوبارہ کی تباہی کے بیان سے جو مقصد تھا وہ اسی قدر بیان سے پورا ہو گیا۔ اگر بتا دیا جاتا کہ فلاں فلاں اقوام کو ان پر مسلط کیا گیا تو اس سے کسی مفہوم میں اضافہ نہیں ہوتا۔ یہاں مقصد اس سنت الٰہی کا بیان تھا جس کا تعلق اقوام کے عروج و زوال سے ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ ایسی تباہیاں کیوں لاتا ہے؟ تو بتایا جاتا ہے کہ بعض اوقات کسی قوم کی تباہی ہی اس کے لیے باعث رحمت ہوتی ہے۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ (۱۷ : ۸) "ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے"۔ اگر تم اپنی تاریخ سے عبرت حاصل کرو۔

لیکن یاد رکھو اگر تم نے سرکشی کا یہ عمل پھر دہرایا تو اس کے نتائج پھر ظاہر ہوں گے۔ اللہ کی سنت جاری و ساری ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (۱۷ : ۸) "لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے"۔ ہاں انہوں نے پھر فساد کیا اللہ نے ان پر مسلمانوں کو مسلط کر دیا اور ان کو جزیرۃ العرب سے خارج البلد کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری دنیا میں فساد کیا تو اللہ نے ان پر اپنے اور بندوں کو مسلط کر دیا اور ہٹلر نے ان کی گوشمالی کی۔ اور دور حاضر میں انہوں نے پھر فساد اور سرکشی شروع کر دی ہے۔ اسرائیل کی شکل میں منظم ہو کر انہوں نے پورے شرق اوسط کو مصائب میں مبتلا کر دیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان پر اللہ کسی ایسی قوم کو مسلط کرے جو ان کو ان کی سرکشی کی پوری سزا دے تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے۔ یہ تو وہ قسمیں ہیں کہ اگر تم نے پھر ایسا کیا تو ہم بھی ایسا کریں گے۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ بنی اسرائیل اپنے کیے کا مزہ چکھ لیں۔

---۰۰۰---

اب یہاں سیاق کلام اہل کفر کے اخروی انجام کی طرف ہو جاتا ہے کیونکہ تمام مفسد کافر ہی ہوتے ہیں جن کے درمیان یک رنگی ہوتی ہے۔

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا (۱۷ : ۸) "اور کافروں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا دیا ہے"۔ یہ جہنم اس طرح ان کو گھیرے گی کہ ان میں سے کوئی اس سے بچ کر نہ نکل سکے گا۔ یہ جہنم اس قدر وسیع ہو گی کہ سب اس میں سما جائیں گے۔

---۰۰۰---

سبق کے اس حصے میں تاریخ بنی اسرائیل کا یہ پہلو بیان ہوا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی کہ یہ لوگ

اس سے ہدایت لیں۔ لیکن انہوں نے ہدایت نہ لی بلکہ گمراہ ہوئے اور اللہ کی ہلاکت نے ان کو آ لیا۔ اب سیاق کلام قرآن کریم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس طرح یہ قرآن بھی نہایت ہی ٹھوس تعلیمات پیش کر رہا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾

"حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

یہ قرآن راہ راست دکھاتا ہے۔ یہ ہر قسم کی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور ہر کسی کے لیے منبع ہدایت ہے۔ بغیر کسی حدود و قیود کے۔ انسانوں کی راہنمائی کے لیے جس ہدایت 'جس نظام کی ضرورت ہے وہ اس میں موجود ہے۔ ہر دور اور ہر قسم کے معاشرے میں۔

انسانی ضمیر و شعور کو یہ ایک واضح عقیدہ اور صاف و سادہ خیالات عطا کرتا ہے' ایسے عقائد و تصورات جن میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ خیالات انسانی شعور کو وہم و گمان' اوہام و خرافات سے پاک کر کے اس کی سوچ کو قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہیں۔

پھر یہ قرآن انسان کے ظاہر و باطن کو باہم مربوط کرتا ہے۔ انسانی سوچ اور عمل کو باہم یکساں کرتا ہے اور انسانی نظریات اور اعمال کے اندر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ گویا انسان کی شخصیت کے تمام پہلو ایک ہی رسی میں بندھ جاتے ہیں' زمین پر انسان کے اعمال و خیالات عالم بالا کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں' انسان اس دنیا میں جو جدوجہد کرتا ہے' وہ عبادت بن جاتی ہے۔

عبادات میں بھی اس کی پالیسی اور ہدایت نہایت ہی متوازن ہے۔ وہ صرف اس قدر عبادت اور بندگی کا حکم دیتا ہے جس قدر انسان کے بس میں ہو۔ ایسے احکام نہیں دیتا کہ انسان کے اندر ان کی تعمیل کی طاقت ہی نہ ہو۔ یہ انسان کو سستی اور عیش پرستی کے حوالے بھی نہیں کرتا کہ انسان عیش پرست ہو جائے بلکہ ہر میدان میں اس کی ہدایات توازن و اعتدال پر مبنی ہیں۔

اس میں انسانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں بھی نہایت ہی مستحکم ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک فرد اور فرد کے تعلقات کے بارے میں' میاں اور بیوی کے بارے میں' حاکم و محکوم کے بارے میں' اقوام اور حکومتوں کے بارے میں۔ یہ کتاب اس قسم کے تمام روابط کو نہایت ہی مستحکم بنیادوں پر قائم کرتی ہے' ایسی مستحکم بنیادیں جو آراء اور خواہشات سے متاثر نہیں ہوتیں۔ دوستی اور دشمنی سے بھی ان اصولوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اغراض و مفادات بھی ان روابط کو متاثر نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ اصول ایک علیم و خبیر نے وضع کیے ہیں' وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی مخلوقات کی حقیقی ضرورت کیا ہے' اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قسم کی سرزمین اور ہر علاقے کے لیے جامع ہدایت کیا ہے' اس طرح اس نے اس کتاب

میں ایک ایسا جامع نظام مرتب کر دیا جو دنیا کے تمام انسانوں کی قانونی' معاشی' اجتماعی اور اخلاقی ضروریات کے لیے مستحکم ہدایات دیتا ہے بلکہ اس نے بہترین بین الاقوامی ہدایات بھی دی ہیں۔

اس نے تمام ادیان سماوی کے بارے میں بھی بہترین ہدایات دی ہیں' تمام ادیان کے مقامات مقدسہ کا احترام سکھایا ہے۔ چنانچہ جب انسان اس کتاب سے ہدایات اخذ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں تمام انسانوں کے درمیان ایک بھائی چارہ قائم ہو جاتا ہے اور انسان نہایت ہی امن و امان سے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سیدھی اور مستحکم ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا (٩) وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (١٠) (۱۷: ۹ - ۱۰) "جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ عمل اور جزائے عمل کا یہ بنیادی اصول ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے نتائج مرتب ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح دونوں ضروری ہیں۔ بغیر ایمان کے عمل مفید نہیں ہے اور بغیر عمل کے صرف ایمان معتبر نہیں ہے۔ اگر ایمان کے ساتھ عمل نہ ہو تو وہ ناتمام مسلمانی ہے۔ اور عمل بلا ایمان بھی بے بنیاد ہے۔ ایمان اور عمل دونوں ہوں تو زندگی راہ راست پر چلتی ہے اور ایمان اور عمل دونوں ہوں تو انسان ہدایت اخذ کر سکتا ہے۔

جو لوگ قرآن کریم کی راہ نہیں لیتے وہ انسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور انسان بہت ہی جلد باز ہے۔ وہ اپنے نفع میں بھی جلدی کرتا ہے اور نقصان میں بھی۔ وہ اس قدر جلدی سے آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ اپنے جذبات پر اسے کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ وہ آگے ہی بڑھنا چاہتا ہے اگرچہ اس کے سامنے شر ہو۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾

"اور انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے"۔

یہ اس لیے کہ وہ معاملات کے انجام سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ کسی کام کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے اور درحقیقت وہ شر ہوتا ہے اور اس کے کر گزرنے میں وہ بہت جلدی کرتا ہے' بعض اوقات وہ کسی کام کو شر سمجھ کر کرتا ہے لیکن وہ خیر ہوتا ہے۔ غرض انسان کسی بھی کام کے عواقب و نتائج کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ جبکہ قرآن کریم جو ہدایت دیتا ہے وہ نہایت ہی سیدھی' نہایت ہی دھیمی اور پروقار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی راہنمائی والی راہ جدا ہے اور انسان کی خود طے کردہ راہ جدا ہے۔ اور ان دونوں کے اندر بہت بڑا فرق ہے۔

--- ○○○---

سابقہ آیات میں چند معجزانہ اشارات تھے۔ حضور اکرم اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واقعہ معراج اور اس کے اندر پائے جانے والے معجزات 'حضرت نوح علیہ السلام کا معجزانہ طور پر طوفان سے بچنا اور ان لوگوں کی طرف اشارہ جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے۔ تاریخ بنی اسرائیل کے مدوجزر اور ان میں اللہ کے معجزانہ فیصلے اور اقوام کے عروج و زوال کے اصول کی طرف اشارہ 'اور انسانی زندگی میں مکافات عمل اور قرآن کریم کی کتاب ہدایت اور منہج عمل ہونے کی طرف اشارہ۔

ان تمام معجزانہ امور کے بعد اب روئے سخن معجزات کائنات کی طرف پھر جاتا ہے' ان سابقہ معجزات کا صدور تو پیغمبروں کے ذریعہ ہوا۔ لیکن یہ معجزات ایسے ہیں کہ ہر کسی کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ ان کائناتی معجزات کے ساتھ انسانی زندگی کی جدوجہد اور انسانی اعمال بھی وابستہ ہیں۔ انسانی اعمال اور جدوجہد کا نتیجہ ان قوانین قدرت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ جس طرح انسانی عمل اور مکافات عمل کا اصول کائنات میں رواں دواں ہے' اسی طرح نوامیس فطرت کے اصول بھی انسانی زندگی کے ساتھ مربوط ہیں جس طرح انسانی عمران کچھ قواعد پر مبنی ہے' اسی طرح یہ کائنات بھی بعض قواعد پر مبنی ہے۔ اور اس کے اندر کوئی تخلف نہیں ہوتا۔ رات و دن کا یہ نظام جس طرح نہایت ہی اٹل قواعد پر مبنی ہے اسی طرح سنت الٰہیہ بھی اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کے اصول بھی اٹل ہیں۔ اور وہ بھی اسی ذات باری کے ارادے سے چل رہے ہیں جس کے ارادے سے رات و دن چل رہے ہیں۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا

بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

"دیکھو' ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے ۔ رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو ۔ اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیز کر کے رکھا ہے ۔

ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے' اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا پڑھ اپنا نامہ اعمال' آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے ۔ جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے' اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا ۔ اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغام بر نہ بھیج دیں ۔

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں' تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں ۔ دیکھ لو' کتنی ہی نسلیں ہیں جو نوحؑ کے بعد ہمارے حکم سے ہلاک ہوئیں ۔ تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے پوری طرح باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے ۔

جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو' اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں' پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا' ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر ۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی ۔ ان کو بھی اور ان کو بھی' دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامان زیست دیے جا رہے ہیں' یہ تیرے رب کا عطیہ ہے' اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے ۔ مگر دیکھ لو' دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے ۔ اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے' اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہو گی"۔

وہ قوانین قدرت جو رات و دن کو کنٹرول کرتے ہیں' انہی کے ساتھ انسان کے کسب اور جدوجہد کا تعلق بھی ہے ۔ رات اور دن کی بنیاد پر سالوں کا حساب ہوتا ہے' انہی کے ساتھ انسانی کسب و عمل بھی منسلک ہے ۔ وہ اچھائی کرے یا برائی

کرے اس پر جزاء و سزا مرتب ہوگی - اسی کے ساتھ ہدایت و ضلالت بھی مربوط ہے - اور تمام امور میں انفرادی ذمہ داری کا اصول کارفرما ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا - اسی پر یہ اصول بھی طے ہوا ہے کہ اللہ کسی کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک رسول نہ بھیج دے - اور اسی سے یہ اصول بھی مربوط ہے کہ جب اللہ کسی بستی کو ہلاک کرتا ہے تو تب کرتا ہے کہ اس کے مترفین اس بستی میں فسق و فجور اور دنگا فساد برپا کر دیتے ہیں - اسی پر یہ اصول بھی مبنی ہے کہ بعض لوگ صرف دنیا کو طلب کرتے ہیں اور بعض آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں' تو اہل دنیا کو اللہ دنیا دیتا ہے اور اہل آخرت کو اللہ آخرت دیتا ہے - یہ تمام امور خواہ دینی اور عمرانی ہوں یا تکوینی دونوں ایک ہی ناموس الٰہی کے مطابق چلتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں جاری کر رکھا ہے - اور یہ ناموس الٰہی اور یہ سنت الٰہیہ اٹل ہے - اس کے اصولوں کے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی - اس میں کوئی چیز بھی محض اتفاقی نہیں ہے -

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۷:

۱۲) "دیکھو' ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے - رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو - اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیز کر کے رکھا -

رات اور دن اس کائنات کی نہایت ہی بڑی نشانیاں ہیں اور رات اور دن کے نظام کا اصول نہایت ہی دقیق اور باریک اصول پر مبنی ہے - یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا' اس میں کبھی بھی تعطیل واقع نہیں ہوئی' یہ رات اور دن دائماً چل رہے ہیں - سوال یہ ہے کہ (محونا) سے مراد کیا ہے - تو (فمحونا) کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ رات کو روشنی نہیں ہوتی - اس میں اس کائنات کی حرکات اور نظارے اچھی طرح نظر نہیں آتے - ظاہر ہے کہ دن کی سرگرمیوں اور رنگا رنگیوں کے مقابلے میں رات کو محو اور بے نور کہہ سکتے ہیں - دن کھلا ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے اور رات ذرا محو ہے کہ اس میں دن کی طرح سب کچھ نظر نہیں آتا - رات کو محو' اس لیے رکھا گیا اور دن کو کھلا اس لیے رکھا گیا ہے کہ

لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (۱۷: ۱۲) "تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو" - رات آرام' سکون اور ملاپ کا وقت ہوتا ہے اور دن جدوجہد' کسب و کمائی اور قیام و سفر کے لیے ہوتا ہے اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے کی وجہ سے ماہ و سال کا حساب مکمل ہوتا ہے - وعدے کے وقت کا حساب' موسم اور فصل کا حساب غرض تمام معاملات کا حساب رات اور دن کے نظام سے قائم ہے -

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۷: ۱۲) "اور ہم نے ہر چیز کو الگ ممیز کر کے رکھ دیا ہے" - یعنی

اس کائنات میں کوئی چیز، کوئی اہم اور غیر اہم بات ہم نے محض بخت و اتفاق کے حوالے نہیں کی بلکہ وہ ہمارے ناموس قدرت کے مطابق ہے۔ یا قانون قدرت پوری طرح مفصل اور جامع اور دقیق ہے مثلاً رات اور دن کی گردش ہی کو دیکھئے۔اس سے اس کائنات کے مدبر کی گہری تدبیر کا ثبوت ملتا ہے۔

جس طرح کائنات میں ایک مکمل ضابطہ کارفرما ہے۔ اسی طرح جزاء و عمل اور قانون مکافات عمل بھی ایک نہایت ہی گہرا اور اٹل ضابطہ ہے۔

وَكُلَّ انْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (۱۳) اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۴) (۱۷:۱۳ – ۱۴) "ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے، اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا پڑھ اپنا نامہ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے"۔ انسان کا شگون اس کا عمل ہے، جو اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ اس سے مراد خود انسان کا کسب و عمل ہے اور اس کے گلے میں لٹکانے سے مراد یہ ہے کہ انسان سے اس کا شگون یعنی اعمال کبھی جدا نہیں ہوتے۔ یہ قرآن کریم کا انداز ہے کہ قرآن کریم معانی و مفاہیم کو بھی ایک مجسم شکل میں پیش کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے ثمرہ کا ذمہ دار ہے اور وہ ان اعمال کے اثرات سے بھاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح قیامت کے دن کتاب منشور سے بھی مراد اس کے اعمال کا ظہور ہے۔ یعنی اعمال کھلے ہوں گے۔ کوئی چھپ نہ سکے گا۔ یا کوئی عمل حساب سے رہ نہ جائے گا۔ لیکن قرآن اسے کھلی کتاب کی مجسم شکل میں پیش کرتا ہے جس سے مخاطب پر زیادہ اثر ہوتا ہے اور بات انسانی احساس کا حصہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ انسانی خیال یکدم پرندے اور کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس سخت دن کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ جس کے تمام راز کھل جائیں گے۔ ایک کھلی کتاب ہوگی اور اس دن کسی محاسب کی ضرورت نہ ہوگی۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷:۱۴) "پڑھ اپنا نامہ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے"۔

اسی اٹل قانون قدرت کے ساتھ عمل اور مکافات عمل کا قانون وابستہ ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۱۷:۱۵) "جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے"۔ چنانچہ عمل کی ذمہ داری انفرادی ہے اور اس کی وجہ سے ہر انسان اپنے نفس کے ساتھ منسلک ہے۔ اگر ہدایت اختیار کرتا ہے تو بھی اپنے لیے کرتا ہے، اگر گمراہ ہوتا ہے تو وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔ کوئی بھی دوسرے کے کیے کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ اور کوئی بھی کسی کے بوجھ میں کمی نہ کر سکے گا۔ ہر انسان سے خود اس

کے اعمال کی بازپرس ہوگی اور صرف اس کے اعمال حسنہ کی جزا دی جائے گی اور کوئی دوست بھی کسی دوست کا ذمہ دار نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت مہربانی کرتے ہوئے انسان کو صرف اس اصول پر مسئول اور ذمہ دار نہیں بنایا جو اس کائنات فطرت میں موجود ہے اور نہ اس کو صرف عہد الست کی بناء پر مسئول بنایا جو اللہ نے تمام انسانوں سے اس وقت لیا تھا جب وہ آدم کی پشت میں تھے بلکہ اللہ نے نہایت مہربانی کرتے ہوئے سلسلہ رسل جاری فرمایا' جو لوگوں کو ناموس شریعت کی یاد دہانی کراتے رہے' انجام بد سے لوگوں کو ڈراتے رہے۔ اور یہ اصول مقرر فرمایا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۱۷ : ۱۵) "اور ہم اس وقت تک سزا دینے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج دیں یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ وہ عذاب دینے سے قبل لوگوں پر حجت تمام کرتا ہے۔ اور کوئی عذر رہنے نہیں دیتا۔

یہ سنت الہیہ اس دنیا میں لوگوں پر عذاب نازل کرنے کے سلسلے میں بھی ہے۔ یہ عذاب بھی اللہ کے اس ناموس قدرت کے مطابق ہی نازل ہوتا ہے جس کے مطابق نظام لیل و نہار جاری و ساری ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (۱۷ : ۱۶) "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں' تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں"۔

یہ مترفین کون لوگ ہوتے ہیں؟ یہ کبراء کا وہ طبقہ ہے جو مالدار اور کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں۔ نوکر ان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ آرام طلب ہوتے ہیں اور خوشحالی' عزت اور قیادت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھیلے ڈھالے' گندے اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ اعلیٰ اقدار' مذہبی مقدسات اور شرف و وقار کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور عیاشی اور فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے تو وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ پھر وہ پوری امت میں فحاشی اور بے راہ روی پھیلاتے ہیں۔ اور جن اعلیٰ اقدار کی وجہ سے دنیا میں اقوام بنتی ہیں اور عروج حاصل کرتی ہیں ان کو ایسے لوگ سرعام پامال کرتے ہیں۔ یوں امت کا اجتماعی نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور اس میں سے زندگی' قوت اور ترقی کے عناصر ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں وہ امت آخر کار تباہ ہو کر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں اللہ کی اسی سنت پر بحث کی گئی ہے جب اللہ کسی امت کی ہلاکت کا فیصلہ کر دیتا ہے' اس لیے کہ اس نے اپنی بربادی کے تمام اسباب خود مکمل کر دیئے ہوتے ہیں تو اس میں اس قسم کے مترفین زیادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اللہ کے ایسے لوگوں کی رسی ڈھیلی کر دیتا ہے' کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ یہ مترفین امت کے قائدین بن جاتے ہیں' فسق و فجور عام ہو جاتا ہے' یوں امت کا اجتماعی نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اس میں سستی آ جاتی ہے' اس کی ہلاکت کا

فیصلہ ہو جاتا ہے ' اور اچانک وہ ہلاک اور برباد ہو جاتی ہے - اس ہلاکت کی ذمہ داری پھر پوری امت پر ہوتی ہے کیونکہ امت کے افراد میں سے کسی نے ' جماعتوں میں سے کسی نے مترفین کے ہاتھ نہیں پکڑے - نظام کی اصلاح کے لیے اجتماعی سعی اور جدوجہد نہیں کی - لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ قوم کے اندر مترفین کو پیدا نہ ہونے دیا جائے - ان کا وجود ہی اس بات کی علامت ہے کہ قوم پر ہلاکت آنے والی ہے - اگر کسی امت کا اجتماعی نظام ایسے لوگوں کی راہ روک دے اور ان کو پیدا ہونے ہی نہ دے تو امت ہلاکت سے بچ سکتی ہے - کیونکہ ہلاکت کا سبب صرف یہ مترفین اور ان کا فسق و فجور ہوتا ہے - یہی لوگ کسی امت اور سوسائٹی کو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں -

اللہ نے انسانیت کے لیے ایسے فطری قوانین مقرر کیے ہیں ' جو اٹل ہیں اور ان میں کبھی بھی تخلف یا استثناء نہیں ہوتی - یہ ناقابل تبدیل سنن الٰہیہ ہیں - ان نوامیس اور سنن کے مطابق جب کسی واقعہ کے لیے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں تو وہ واقعہ ہو جاتا - یوں اللہ کا ارادہ پورا ہو جاتا ہے اور اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے اور اس کی بات پوری ہو جاتی ہے - لیکن اللہ کسی کو فسق و فجور کا حکم نہیں دیتا - وہ فحاشی کا حکم کبھی نہیں دیتا - اس لیے اگر کسی سوسائٹی میں طبقہ مترفین پایا جاتا ہے تو اس کا وجود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سوسائٹی نے اپنی ہلاکت کے اسباب پیدا کرنا شروع کر دیے ہیں - اس کی چولیں ڈھیلی ہو چکی ہیں اور یہ تتر بتر ہونے والی ہے - اور وہ تقدیر الٰہی کے مطابق اپنے قدرتی انجام تک پہنچنے والی ہے - وہ یہ کہ سنت الٰہیہ کے فیصلے کے مطابق وہ ان مترفین کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئی - کیونکہ اس نے خود اپنے اندر اس طبقہ مترفین کو پیدا ہونے دیا -

اب یہاں ارادۂ الٰہیہ سے مراد کیا ہے ؟ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ پکڑ پکڑ کر مترفین کو پیدا کرتا ہے اور وہ پھر مجبور ہو کر فسق و فجور کرتے ہیں اور اللہ زبردستی کر کے کسی سے اس کی ہلاکت کے اسباب پیدا کراتا ہے - بلکہ دراصل اسباب وہ سوسائٹی خود فراہم کرتی ہے اور سنن الٰہیہ کے مطابق نتیجہ بعد میں مرتب ہوتا ہے - یہ بات درست ہے کہ یہ قانون فطرت اور سنت الٰہیہ اللہ کی جاری کردہ ہے - لیکن ہلاکت کا حقیقی سبب وجود مترفین اور فسق و فجور ہے -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاں نظام اجتماعی میں پائے جانے والے خلل کو دور کر دے اور مترفین کو فسق و فجور کرنے سے روکا جائے تاکہ سنن الٰہیہ کے مطابق پوری سوسائٹی پر ہلاکت اور بربادی کا عذاب نہ آ جائے -

قرون اولیٰ سے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد یہ سنت جاری و ساری ہے - زمانوں کے بعد زمانے گزر گئے اور یہی ہوتا رہا ہے - جب بھی کسی امت میں فسق و فجور عام ہوا وہ ہلاک ہوئی - اور اللہ اپنے بندوں کی بداعمالیوں سے اچھی طرح خبردار ہے -

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (۱۷ : ۱۷) "دیکھ لو 'کتنی ہی نسلیں ہیں جو نوح" کے بعد ہمارے حکم سے ہلاک ہوئیں - تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے پوری طرح باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے "-

---(○)---

اب آخر میں بتایا جاتا ہے بعض لوگ صرف دنیا ہی کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ صرف اس دنیا کے لیے۔ وہ اس زمین سے اوپر کی طرف نظریں نہیں اٹھاتے' ایسے لوگوں کو اللہ صرف اس دنیا کے سامان فراہم کرتا ہے' اور آخرت میں ایسے لوگوں کے حصے میں صرف جہنم آتی ہے' اور جو لوگ صرف اس دنیا ہی کے لیے زندہ ہوتے ہیں اور ان کی نظریں اس سے آگے کسی منظر کی تلاش میں نہیں اٹھتیں' وہ اسی دنیا میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ اس زمین کے کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں' کیڑوں کی طرح گندی نالیوں میں پڑے رہتے ہیں' اور ہر قسم کی گندی لذت کوشی میں ڈوبے ہوئے ہوتے اور شہوت اور جذبات کے غلام ہوتے ہیں اور دنیاوی لذت کے حصول میں ایسے ایسے کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں جو ان کو جہنم رسید کر دیتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۷ : ۱۸) "جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو' اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں' پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا' ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر"۔ مذموم اور ملامت زدہ اس لیے کہ اس نے یہی کمائی کی اور رحمت سے محروم یوں کہ وہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷ : ۱۹) "اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی"۔ پس جو لوگ آخرت چاہتے ہیں ضروری ہے کہ اس کے لیے سعی بھی کریں۔ اس کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اور اس کے تقاضے پورے کریں اور یہ تمام جدوجہد ایمان کے بعد ہو' ظاہر ہے کہ ایمان محض خواہش اور تمنا کا نام نہیں ہے' بلکہ ایمان یہ ہے کہ وہ دل میں بیٹھ جائے اور عمل صالح اس کی تصدیق کرے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ آخرت کے لیے سعی کرنے کے نتیجے میں انسان دنیا کے مفاد اور سہولتوں اور لذتوں سے یکدم محروم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ آخرت کو مدنظر رکھتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ دنیا ہی اس کا منتہائے مقصود ہو' آخرت بھی پیش نظر ہوتی ہے اور جب آخرت انسان کے پیش نظر ہو تو پھر دنیا کا رہن سہن انسان کے لیے مضر نہیں ہوتا۔

اور جو شخص صرف دنیا چاہتا ہے وہ جہنم میں ملامت زدہ اور رحمت سے محروم پھینک دیا جائے گا' اور جو شخص آخرت کے لیے ساعی ہے تو اس کا استقبال ملاء اعلیٰ میں نہایت ہی عزت اور تکریم سے ہو گا' کیونکہ اس نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کے لیے کام کیا اور قریب کو چھوڑ کر اس نے بعید اور بلند آفاق کی طرف نظریں اٹھائیں۔

دنیا کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ وہ لوگ اس کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں جو کیڑوں مکوڑوں' حشرات الارض' حیوانات اور وحوش کی زندگی کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کی انسانی زندگی اور دنیا میں مذکورہ بالا حشرات الارض کی زندگی میں کوئی بنیادی امتیاز نہیں ہے۔ انسان کی انسانیت کے ساتھ لائق زندگی تو آخرت کی زندگی ہے' یہ اللہ کے جوار میں

دائمی زندگی ہے۔کیونکہ انسان کو اللہ نے ایک خاص انداز سے پیدا کیا اور اس کو برابر کیا۔اس کے اندر اپنی خاص روح پھونکی اور اسے زمین کے اوپر آباد کیا اور یہاں اسے متمکن کر کے علم سے نوازا اور فرشتوں پر برتری عطا کی۔

جو شخص دنیا کے لیے جدوجہد کرے اس کے سامنے بھی میدان کھلا ہے اور جو آخرت کے لیے جدوجہد کرے اس کے لیے بھی میدان کھلا ہے۔ دونوں کو اللہ ان کے مطلوبہ مقاصد اور مطالب اور اہداف تک پہنچاتا ہے۔کوئی دنیا چاہے یا آخرت۔اللہ کسی کی راہ نہیں روکتا جہاں کوئی چاہے اللہ کی مشیت اسے لے جاتی ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷ : ۲۰) "ان کو بھی اور ان کو بھی' دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامان زیست دیے جارہے ہیں' یہ تیرے رب کا عطیہ ہے' اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے"۔

لیکن زمین کے اندر' اس دنیا میں بھی لوگوں کے درمیان حسب درجات' حسب وسائل اور حسب اسباب اور حسب میلانات ورجحانات اور مطابق سعی وجہد فرق مراتب ملحوظ ہے۔کیونکہ دنیا کا دائرہ بھی محدود ہے' اور یہ کرۂ ارض بھی محدود ہے۔لیکن اس کے مقابلے میں آخرت کا میدان وسیع ہے۔وہاں کی وسعتیں محدود ہیں۔عالم آخرت! اس کے کیا کہنے' اس کے مقابلے میں یہ پوری دنیا ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۱۷ : ۲۱) "مگر دیکھ لو' دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے۔اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے' اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگی"۔اس لیے اگر کوئی حقیقی طور پر بلند مرتبہ چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس عظیم اور اونچی تفاوت و امتیاز کے لیے جدوجہد کرے جو آخرت میں ہوگی' جس کا میدان وسیع اور جہاں کسی جگہ کوئی تنگی اور کمی نہیں ہے۔اور وہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کی حدود سے صرف اللہ ہی خبردار ہے اور جو لوگ مقام امتیاز میں باہم مقابلہ کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ مقام آخرت کے لیے مقابلہ کریں۔دنیائے دنی کے حقیر اور قلیل ساز و سامان کے لیے کیا بھاگنا!

---ooo---

درس نمبر ۱۲۶ ایک نظر میں

اس سورت کے پہلے سبق میں عمل و مکافات عمل کے اصولوں اور ہدایت و ضلالت کے قوانین اور کسب اور حساب کی ذمہ داریوں کو کائناتی اصولوں اور طبیعی قوانین اور گردش لیل و نہار سے مربوط کیا گیا تھا۔ اس سبق میں انسانی طرز عمل 'اخلاق و آداب اور انفرادی اخلاق اور اجتماعی طرز عمل اور قوانین کو اسلامی نظریہ حیات کے اساسی اصول و عقائد یعنی توحید ہی کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ چنانچہ تمام انفرادی اور اجتماعی روابط کی اساس یہی عقیدہ توحید ہے 'جو ایک مضبوط رسی ہے۔ اور یہی ایک خاندان اور ایک سوسائٹی کی اجتماعی زندگی کی اساس اور رابطہ ہے۔

درس سابق میں کہا گیا تھا کہ یہ قرآن بالکل ایک سیدھی راہ کی طرف ہدایت اور راہنمائی کرتا ہے۔ اور اس کے اندر اس راہنمائی کی تمام تفصیلات درج ہیں۔

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا (۹) وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۰) وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَہٗ بِالْخَیْرِ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۱) وَجَعَلْنَا الَّیْلَ وَالنَّھَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَآ اٰیَۃَ الَّیْلِ وَجَعَلْنَآ اٰیَۃَ النَّھَارِ مُبْصِرَۃً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ وَکُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰہُ تَفْصِیْلًا (۱۲) (۱۷ . ۹ - ۱۲) "جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ "انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے"۔ "دیکھو 'ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو۔ اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیز کر کے رکھا ہے"۔

جبکہ اس سبق میں قرآن کریم کے احکامات میں سے بعض احکام 'منہیات میں سے بعض مناہی کی تفصیلات دی گئی ہیں اور یہ انسانی زندگی کے عملی معاملات سے متعلق ہیں۔

چنانچہ درس کا آغاز شرک کی ممانعت سے ہوتا ہے' اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ صرف اللہ وحدہ لا شریک مستحق عبادت ہے۔ اس کے بعد احکام شروع ہوتے ہیں۔ پہلا حکم والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں ہے۔ پھر رشتہ داروں' مساکین اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک' پھر اعطاء اور خرچ میں اعتدال اور حفاظت' وفائے عہد' ناپ تول برابر رکھنے کا حکم' سچائی پر قائم رہنے کا حکم' تکبر سے اجتناب اور آخر میں پھر شرک سے اجتناب۔ چنانچہ تمام اخلاقی اور قانونی احکام کو عقیدۂ توحید کے اندر باندھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام پورے کا پورا اسلامی نظریہ حیات پر قائم ہے اور اسلامی نظریہ حیات کلمہ طیبہ پر قائم ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۱۲۶ تشریح آیات

۲۲--- تا--- ۳۹

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝۲۲

"تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا"۔ اس آیت میں شرک سے ممانعت اور اس کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔ امر تو عام ہے لیکن اسے صیغہ مفرد کی شکل میں لا کر ایک فرد کو مخاطب کیا گیا تاکہ ہر فرد یہ سمجھے کہ یہ حکم اسی کے لیے ہے' اور مخصوص طور پر ہر فرد کے لیے صادر ہوا ہے۔ کیونکہ عقیدہ ایک شخصی معاملہ ہے اور اس کے بارے میں ایک شخص ہی انفرادی طور پر مسئول ہے اور انجام یہ ہے کہ جو شخص بھی شرک کا ارتکاب کرے گا' وہ مذموم ہو گا کیونکہ اس نے قابل مذمت فعل کا ارتکاب کیا ہے اور پھر دوسرا انجام یہ ہے کہ وہ شرمندہ اور بے یار و مددگار رہ جائے گا' اگرچہ اس کے خیال میں اس کے مددگار بہت ہوں اور جو شخص مذموم ہو جائے اور اس کی امداد کے لیے کوئی نہ آئے تو وہ بھی علیحدہ ہو کر شرمندگی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان ضعیفی کی حالت میں اکثر بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی حرکت نہیں کر سکتا اس لئے لفظ قعود (بیٹھنا) ایسے شخص کے لیے اس جگہ نہایت ہی بامعنی ہے۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ: تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی"۔ شرک کے بعد اب یہ حکم بھی دے دیا کہ بندگی بھی صرف اللہ کی کرو' اور یہ حکم فیصلے کی صورت میں دیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح فیصلہ ایک حتمی امر ہوتا ہے اور اس کی تعمیل ضروری ہوتی ہے' اسی طرح اس حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے۔ لفظ قضی سے حکم کو مزید تاکیدی کر دیا گیا' اس کے علاوہ نفی اور استثنیٰ بذات خود ایک تاکیدی اور حصری انداز ہے کہ یہی کچھ ہو اور اس کے سوا کچھ نہ ہو۔ چنانچہ انداز بیان کے اندر تاکید مزید کا طریقہ اختیار کیا گیا کیونکہ توحید فی العقیدہ اور توحید فی العبادۃ نہایت ہی اساسی مسائل ہیں۔

اور جب یہ قاعدہ اور بنیاد اور اساس رکھ دی گئی تو اب انفرادی احکام صادر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اجتماعی احکام اور قوانین وضع ہونے لگتے ہیں۔ اس سے قبل ذہنوں میں عقیدۂ توحید بٹھا دیا گیا ہے۔ اس عقیدے کے ذریعے اعمال اور فرائض و قوانین کا داعیہ بھی نفوس کے اندر پیدا ہو چکا ہے۔

انسان کے لیے سب سے پہلا رابطہ رابطہ عقیدہ ہے۔ عقیدے اور نظریات ہی انسانوں کو متحد رکھ سکتے ہیں۔ عقائد و

نظریات کے بعد انسانیت کے لیے پہلا یونٹ خاندان کا یونٹ ہے اور خاندان کی تشکیل والدین سے ہوتی ہے' اس لئے پہلا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ وحدہ کی بندگی کے بعد پہلا حکم یہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اسلام میں اس کی بہت اہمیت ہے' یہ پہلی قدر ہے۔

وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

"والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو' اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک' یا دونوں' بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو' نہ انہیں جھڑک کر جواب دو' بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو' اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو' اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار' ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا"۔

نہایت ہی خوبصورت انداز کلام اور نہایت ہی نرم اور پرسوز الفاظ کے ساتھ قرآن کریم اولاد کے دلوں میں والدین کے حق میں عزت و احترام پیدا کرتا ہے اور ان کے وجدان اور ان کے دل میں جذبات عطوفت کو موجزن کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب زندگی اپنی راہوں پر رواں دواں ہوتی ہے تو تمام لوگوں کی نظریں' جذبات اور اہتمام اور توجہ آگے کی طرف ہوتی ہے۔ ہر انسان پیچھے والدین کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے آگے اپنی اولاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگلی نسل کی فکر سب کو ہوتی ہے' کم لوگ ہوتے ہیں جو پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔ والد والدہ اور گزرنے والوں کی طرف توجہ کم لوگوں کی ہوتی ہے' چنانچہ قرآن کریم نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ والدین اور جانے والی نسل کی بابت اولاد کے وجدان اور شعور کو جگایا جائے تاکہ وہ پیچھے دیکھ کر والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

تمام والدین کے اندر فطری داعیہ ہوتا ہے کہ وہ اولاد کا غم کھائیں' والدین تو بچوں کے لیے اپنی جان تک دے دیتے ہیں' جس طرح ایک دانہ خاک میں مل کر ایک پودے کی شکل اختیار کرتا ہے اور خود گم ہو جاتا ہے اور انڈے کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کچھ بچے کی شکل اختیار کر لیتا ہے' اس طرح بچے اپنے والدین سے تمام رس' تمام قوت' تمام اہتمام اور تمام طاقت نچوڑ لیتے ہیں اور والدین ناتواں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں' بسا اوقات موت اپنی مہلت دے دیتی ہے' اور وہ نہایت ہی بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو وہ بہت جلد یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور وہ آگے کو دیکھتے ہیں اور خود اپنے فرائض منصبی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کی توجہ اپنی بیوی بچوں کی طرف ہوتی ہے اور یوں زندگی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ والد اور والدہ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کا خیال رکھیں بلکہ اولاد کو اس تلقین

کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ضعیف والدین کا خیال رکھیں اور اس سلسلے میں ان کے شعور و وجدان کو جگانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس نسل کی بہبود کا بھی خیال رکھیں جس نے اپنے خون کا آخری قطرہ خشک کر کے ان کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ خود خشک اور ضعیف ہو گئے۔

والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا حکم اللہ نے قضا اور فیصلہ کی شکل میں دیا۔ یعنی یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور ہر حاکم اپنے فیصلہ کو نافذ کراتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حکم نہایت ہی تاکیدی ہے جو ڈگری کی شکل میں ہے۔ جس طرح اس سے قبل یہ کہا گیا تھا کہ اللہ نے فیصلہ دیا ہے کہ صرف اس کی بندگی کرو۔

اس کے بعد والدین کے بارے میں نہایت ہی رحیمانہ و کریمانہ اور مشفقانہ انداز گفتگو ہے۔ نہایت ہی جذباتی انداز میں ایام طفولیت میں والدین کی شفقتوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ بچے کے ساتھ کس قدر پیار و محبت کا سلوک انہوں نے کیا تھا۔

اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا (۱۷ : ۲۳) "اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں"۔ بڑھاپے کا خود اپنا وقار ہوتا ہے لیکن بڑھاپے میں جو ضعف ہوتا ہے وہ بھی لفظ (کبر) میں شامل ہے۔ اور عندک سے یہ اشارہ ہے کہ بڑھاپے میں والدین بچوں کے ہاں پناہ بھی لیتے ہیں اور حالت ناتوانی میں حمایت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا (۱۷ : ۲۳) "تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑک کر جواب دو"۔ والدین کے احترام اور ادب کا یہ پہلا مرحلہ ہے کہ اولاد کی طرف سے والدین کے حق میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کیا جائے جس میں تنقید، زجر و توبیخ اور جھڑکی آتی ہو، یا اس میں کوئی چیز توہین آمیز اور سوئے ادب کے زمرے میں آتی ہو۔

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷ : ۲۳) "بلکہ ان کے ساتھ احترام کے ساتھ بات کرو"۔ بات کی حد تک یہ نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے کہ والدین کے ساتھ نہایت ہی احترام کا سلوک کیا جائے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷ : ۲۴) "اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو"۔ یہاں نہایت ہی ترحم آمیز شفاف انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ انداز بیان کے اندر اطاعت اور بندگی اور وفا شعاری کو مجسم کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس طرح بچھ جاؤ اور اس قدر برخورداری اختیار کرو کہ گویا "جھکنا" ایک مجسم پرندے کی شکل میں کھڑا ہے اور اس کے پر ہیں اور اس نے اپنے پر بھی بچھا رکھے ہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۱۷ : ۲۴) "اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا"۔ یہ خوشگوار یادیں ہیں۔ محبت کی یادیں ہیں۔ بچپن کی یادیں اور ماں اور باپ کی محبت کی یادیں۔ لیکن اس یاد سے انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ آج یہ مشفق والدین اسی طرح تمہاری شفقت کے محتاج و طلبگار ہیں جس طرح تم بچے اور محتاج اس لیے یہ حق ہے کہ انسانی شفقت و رحمت کے مقابلے

میں اللہ کی رحمت و شفقت زیادہ اہم ہے - کیونکہ اللہ کی رحمت و شفقت کا دائرہ نہایت ہی وسیع ہے اور انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ جو محنت و مشقت کی ہے اس کا اجر صرف اللہ ہی دے سکتا ہے - اولاد کے لیے یہ ممکن ہے کہ والدین کو وہ رحم اور شفقت دے سکیں جس کے وہ حق دار ہیں -

حافظ ابوبکر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے - انہوں نے حضرت برید سے انہوں نے اپنے والد سے کہ ایک شخص طواف میں تھا اور وہ اپنی والدہ کو اٹھا کر طواف کرا رہا تھا - اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں نے اسی طرح اپنی والدہ کا حق ادا کر دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "نہیں" بلکہ ایک سانس کے برابر بھی نہیں -

---:0:0:0---

انسان کے تمام تاثرات اور حرکات چونکہ انسانی نظریہ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں' اور نظریہ کی اساس پر وجود میں آتے ہیں اس لیے ان تمام احکام کے آخر میں تمام امور کو اللہ کی طرف لوٹایا جاتا ہے' جو نیتوں کو جانتا ہے اور احوال اور افعال کے پیچھے جو نیت ہے' اس سے بھی واقف ہے -

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

"تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے - اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں"-

اس سے قبل کہ مزید احکام و ہدایت دی جائیں اور اخلاق و قوانین بنائے جائیں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کے ہر قول اور ہر فعل سے اللہ خبردار ہے - اور اس کا دروازہ کھلا ہے - ہر گناہ گار کسی بھی وقت توبہ کر کے واپس آسکتا ہے - جب تک کسی انسان میں اصلاح کا مادہ موجود ہے' وہ توبہ کر کے واپس آسکتا ہے - "اواب" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جب اس سے کوئی قصور سرزد ہو جائے تو وہ جلدی اللہ کی طرف لوٹ آئے اور توبہ و استغفار کرے -

---:0:0:0---

والدین کے بعد اب قریبی رشتہ داروں کے بارے میں ہدایات دی جاتی ہیں اور رشتہ داروں کے ساتھ مساکین اور مسافر بھی شامل کر دیئے جاتے ہیں - قریبی رشتہ داروں کے علاوہ انسانی روابط کے زمرے میں مساکین اور مسافر سب سے زیادہ مستحق ہیں - یوں حسن سلوک اور کفالت اجتماعی کے دائرے کو پوری انسانیت تک وسیع کر دیا گیا ہے -

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا

فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

"رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں' مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو' اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو' تلاش کر رہے ہو' تو انہیں نرم جواب دے دو"۔

اسلام نے اقرباء' مساکین اور مسافروں کے لیے لوگوں کے ذمہ ایک حق مقرر کیا ہے اور یہ حق ان مدات میں انفاق کے ذریعہ ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ نیز ان مدات پر خرچ محض خیرات اور مہربانی ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کا حق ہے جو ہر مسلمان کی گردن پر لازم ہے۔ اور اس حق کو فریضہ قرار دینے کے بعد اسے اسلامی عقیدہ توحید اور اسلامی عبادت اور بندگی کے ساتھ منسلک کر کے اسے عبادت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایسا حق اور فریضہ ہے جس سے مکلف صرف ادائیگی کے بعد ہی بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مد میں خرچ کرنے والا تو اپنا فریضہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب سے اس کے اور مستفید کے درمیان محبت بھی پیدا ہوگی۔

اس کے بعد قرآن کریم تبذیر کی ممانعت کرتا ہے۔ تبذیر کیا ہے؟ ابن مسعود اور ابن عباس ؓ اس کی تعریف یوں کرتے تھے کہ ایسی مد میں خرچ کرنا جس میں خرچ کرنے کا حق نہ ہو' تبذیر ہے۔ اور مجاہد کہتے ہیں اگر سچائی کی راہ پر کوئی انسان اپنا پورا مال خرچ کر دے تو وہ تبذیر نہ ہوگا اور اگر کوئی دو کلو بھی بغیر حق کے خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔

لہٰذا تبذیر کا تعلق انفاق کی مقدار سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق اس مد سے ہے جس میں خرچ کیا جاتا ہے۔ مبذرین کو شیطان کا بھائی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ باطل اور شر اور معصیت میں خرچ کرتے ہیں۔ اور یہ شیطان کے ساتھی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ وہ رب کے انعامات کا شکر ادا نہیں کرتا۔ اور شیطان کے بھائی بھی اللہ کے انعامات کا شکر ادا نہیں کرتے۔ ... نعمتوں کا حق یہ ہے کہ ان کو اپنی جگہ خرچ کیا جائے۔

اگر کسی کے پاس اس قدر مال نہ ہو کہ وہ رشتہ داروں' مساکین' مسافروں کا حق ادا کرے اور وہ ان کا سامنا کرنے میں شرم محسوس کرتا ہو' تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ سے سوال کرے کہ اللہ اسے بھی رزق وافر دے اور ان کو بھی رزق وافر دے۔ اور ان حقداروں کے ساتھ وعدہ کرے کہ جب حالت درست ہوں گے اور وہ کچھ کرنے کے قابل ہوا تو کرے گا وہ وعدہ کرے اور اچھی نرم بات ان کے ساتھ کرے۔ دل تنگی اور ترش دلی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور خاموشی بھی اختیار نہ کرے۔ مبادا کہ وہ دل میں تنگی محسوس کریں اور اس کی خاموشی کو دوسرے معنی پہنائیں۔ کیونکہ اچھی طرح بات کرنے سے اور نرمی سے سمجھانے کے نتیجے میں ان کو تسلی ہوگی۔

پچھلی آیت میں چونکہ تبذیر اور فضول خرچی کی ممانعت کی گئی۔ اس کی مناسبت سے یہاں خرچ میں میانہ روی کا حکم دے دیا گیا۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ

الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴿۲۹﴾

"نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ"۔
اسلامی نظام زندگی میں توازن بنیادی اصول ہے تفریط کی طرح غلو بھی توازن میں خلل انداز ہوتا ہے۔ لیکن توازن کے بیان میں بھی تصویر کشی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ بخیل کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے کہ وہ ایک شخص ہے جس نے اپنے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ رکھے ہیں اور مسرف اور مبذر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ایک شخص ہے جس نے اپنے دونوں ہاتھ اور بازو کھول رکھے ہیں۔ اور وہ کسی چیز کو اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔ اور بخیل اور مسرف دونوں کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ ایک شخص ہے جو ہر طرف سے مسترد شدہ ملامت کردہ ہے۔ اور عاجز و ناتواں اور لاچار ہے۔ محسور حسیر سے ہے اور حسیر اس سواری کو کہتے ہیں جو ضعف و ناتوانی کی وجہ سے بیٹھ جائے اور اس میں چلنے کی سکت ہی نہ رہے۔ بخیل ملامت زدہ ہوتا ہے اور مبذر عاجز ہو جاتا ہے اور دونوں ملامت زدہ ہوتے ہیں۔ جبکہ شریعت کا حکم ہے۔

خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا (میانہ روی بہترین طریق کار ہے) یہ حکم دینے کے بعد کہ میانہ روی اختیار کی جائے' یہ بتایا جاتا ہے کہ حقیقی رزاق اللہ ہے' وہی ہے جو کسی کو رزق فراواں دیتا ہے اور کسی پر رزق کے سلسلے میں تنگی کرتا ہے چونکہ رزاق وہی ہے اس لیے وہ میانہ روی کا حکم دیتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا﴿۳۰﴾

۳ ع ۸ ۳

"تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے"۔
وہ اچھی طرح دیکھ کر کسی کو رزق میں فراوانی دیتا ہے' اور اچھی طرح دیکھ کر اور جان کر کسی کو رزق میں تنگ کرتا ہے۔ وہ میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور بخل و اسراف کی ممانعت کرتا ہے اس لیے کہ وہ تمام حالات میں لوگوں کے بارے خبیر و بصیر ہے اور سب کچھ جانتا ہے اس لیے وہ اپنے علم کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اور اس نے یہ قرآن نازل ہی اس لیے کیا ہے کہ تمام حالات میں یہ اچھی اور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

--- ○○○ ---

اہل جاہلیت اپنی لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے' اس ڈر سے کہ وہ ان پر بوجھ بن کر ان کو معاشی لحاظ سے کمزور کر دیں گی اور ان کے لیے ان کا سنبھالنا مشکل ہو گا۔ سابقہ آیت میں چونکہ یہ حقیقت بتا دی گئی تھی کہ رزق کی فراوانی اور تنگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے یہاں صاف صاف کہہ دیا کہ اب تم لوگ اولاد کو معاشی زاویہ سے نہ دیکھو۔ کثرت

اولاد یا لڑکیوں کی وجہ سے کوئی غریب نہیں ہو گا۔ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا کثرت نسل یا کثرت اقسام نسل کے نتیجے میں معاشی تنگی نہیں ہو گی اور نہ افراد خانہ کم ہونے کی وجہ سے کوئی معاشی لحاظ سے خوشحال ہو گا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

”اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے“۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی گمراہی کے نتیجے میں کسی بھی سوسائٹی کے اندر عملی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظریاتی بے راہ روی کی وجہ سے صرف نظریہ ہی خراب نہیں ہوتا یا اس کے نتیجے میں محض مذہبی مراسم میں کمزوری نہیں آتی بلکہ سوسائٹی کا اجتماعی نظام بھی خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا نظریہ درست ہو تو صرف اس کی عبادات ہی درست نہیں ہو جاتیں بلکہ اس سوسائٹی کا عملی نظام، اس کے اجتماعی ادارے بھی صحیح و سلامت ہو جاتے ہیں اور درست سمت میں کام کرتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کی یہ رسم محض غلط عقیدے پر قائم کی تھی کہ لڑکیوں کی وجہ سے غربت آتی ہے، جب یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ رزاق صرف اللہ ہے تو اس کے بعد قتل اولاد خود بخود موقوف ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی نظریہ زندگی پر عملاً اثرانداز ہوتا ہے۔ نظریہ محض خلا میں نہیں ہوتا یا محض کسی شخص کے دماغ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ عمل کی دنیا تک اترتا ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کے انداز تعبیر کی ایک نہایت ہی گہری مثال پر قدرے غور کریں۔ یہ عجیب لطیف مثال ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کے رزق کو آباء کے رزق پر مقدم رکھا۔

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷ . ۳۱) ”ہم تمہاری اولاد کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی“۔ لیکن سورت انعام میں اولاد کے رزق پر آبا کے رزق کو مقدم رکھا گیا، وہاں کہا گیا۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶ . ۱۵۱) ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی“۔ کیونکہ دونوں آیات کے مفہوم میں ایک دوسرا اختلاف ہے۔ پوری آیات یوں ہیں :

ولا تقتلوٓا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم (۱۷:۳۱) اور انعام میں یوں تھی :

ولا تقتلوٓا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم (۶:۱۵۱) یہاں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد کو اس لیے قتل نہ کرو کہ تم غریب ہو جاؤ گے۔

خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (۱۷: ۳۱) اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اولاد کا رزق ہم پر ہے۔ اور انعام یہ تھا من املاق یعنی فقر اور تنگی رزق پہلے سے موجود تھے' اس لیے والدین کے رزق کو پہلے لایا گیا۔ یہ ایک لطیف فرق ہے اور اسی وجہ سے تقدیم و تاخیر کا یہ عمل ہوا۔

قتل اولاد کی ممانعت کی نسبت ہی سے ممانعت زنا کا حکم آتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

"اور زنا کے قریب نہ پھٹکو' وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ"۔ اس لیے کہ قتل اولاد اور زنا کے درمیان تعلق موجود ہے' نیز اس کے بعد قتل نفس کا مضمون آتا ہے۔ قتل اولاد' زنا اور قتل نفس کے درمیان مخصوص تعلق موجود ہے۔ قتل اولاد تو بعینہ قتل نفس ہے' لیکن زنا بھی مختلف پہلوؤں سے دراصل قتل نفس ہی ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے زانی حیات کو بے محل گراتا ہے' اگر زنا کے نتیجے میں کوئی اولاد پیدا ہو جائے تو اس سے فرار حاصل کیا جاتا ہے۔ پہلے جنین ہی کو قتل کر دیا جاتا ہے' ورنہ بچہ پیدا ہونے کے بعد بالعموم قتل کر دیا جاتا ہے۔ پیدائش سے پہلے یا بعد وہ اگر زندہ رہ بھی جائے تو یا وہ مادر پدر آزاد ہوتا ہے یا پھر معاشرے میں ذلیل و خوار ہو کر رہتا ہے۔ بہرحال اگر قتل نہ ہو اور زندہ بچ بھی جائے تو کسی نہ کسی طرح وہ ایک کم تر درجے کی زندگی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک گونہ وہ بھی قتل ہے۔ پھر زنا دراصل پوری سوسائٹی کے لیے قتل کا سبب ہے۔ کیونکہ اس میں نسب مل جاتے ہیں اور خون خالص نہیں رہتے اور بچوں کے بارے میں صحیح صورت نہیں رہتی۔ یہ دراصل ایک سوسائٹی کی موت ہوتی ہے۔

ایک طرح زنا قتل کے برابر اس طرح بھی ہوتا ہے کہ جس سوسائٹی میں زنا عام ہوتا ہے اس میں ازدواجی زندگی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یوں بھی سوسائٹی سے خاندانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ خاندان ایک بچے کے لیے بہترین جائے پرورش ہوتا ہے۔ خاندان کے بغیر کسی بچے کی فطرت سلیمہ اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اور اس کی تربیت میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور رہ جاتا ہے۔

پھر تاریخ گواہ ہے کہ جس سوسائٹی میں زنا عام ہوا ہے' وہ تباہی و بربادی اور زوال کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ تاریخ قدیم اور عصر جدید دونوں کا عمرانی مطالعہ یہی نتیجہ دیتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں زنا عام ہے حالانکہ وہ اس وقت مادی ترقی کے قائدین ہیں' لیکن ان میں سے فرانس جیسی قوم کے زوال کے آثار تو ابھی سے نمودار ہو چکے ہیں۔ جس طرح ایک فرد جوانی کے ایام میں تروتازہ رہتا ہے اور اس کی اخلاقی بے راہ روی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور بڑھاپے میں پھر وہ یکدم گر جاتا ہے' اسی طرح اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا اقوام یکدم زوال کا شکار نہیں ہو جایا کرتیں' جب ان پر زوال آتا ہے تو یکدم گر جاتی ہیں۔

اسلام زنا کے قریب جانے سے بھی روکتا ہے' یعنی مقدمات زنا کے حالات سے ہی دور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ زنا کی ممانعت کی سخت تاکید ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ایسے حالات سے نہیں بچتا جن کے نتیجے میں زنا واقع ہو جاتا ہے تو پھر اس کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے اسلام سد باب ذریعہ پر عمل کرتا ہے تاکہ اس فحاشی میں مبتلا ہونے کا کوئی راستہ ہی نہ رہے۔ اسلام غیر ضروری اختلاط مرد و زن کی ممانعت کرتا ہے' غیر مرد اور عورت کی ایک جگہ تنہائی کی ممانعت کرتا ہے' اسلام نوجوانوں کی شادی کی تلقین کرتا ہے۔ ایسی باتوں کو روکتا ہے جن کے نتیجے میں شادی ممنوع ہو جائے مثلاً جہیز اور زیادہ مہر۔ اور اس خوف کا بھی قلع قمع کرتا ہے کہ شادی کی وجہ سے تنگ دستی نہ آ جائے اور جو لوگ شادی کی تلاش میں ہوں ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ پاک دامنی کی راہ اختیار کریں اور پھر بھی اگر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسلام اسے سخت سزا دیتا ہے نیز زنا کے الزام کو بھی قابل حد جرم قرار دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے تمام ذرائع و اسباب اختیار کرتا ہے کہ سوسائٹی زنا کے ارتکاب سے بچ جائے۔ اور اس طرح وہ تباہی اور ہلاکت سے بچ جائے۔ چنانچہ قتل اولاد اور زنا کی ممانعت کے ساتھ ہی حکم آتا ہے ناحق کسی زندہ انسان کی جان لینا بھی اسلام میں ایک عظیم جرم ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ﴿٣٣﴾

"قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے' پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے' اس کی مدد کی جائے گی"۔

اسلام سلامتی کا دین ہے۔ اسلام میں شرک باللہ کے بعد سب سے بڑا جرم قتل ناحق ہے۔ زندگی دینے والا اللہ ہے' اللہ کے سوا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی سے اللہ کا یہ عطیہ سلب کرے' الا یہ کہ اللہ کے طے کردہ قوانین کے مطابق کسی کی زندگی لی جا سکتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی چند محدود جرائم پر انسانی جان لینے کی اجازت دی ہے۔ اور ان حدود میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ طے شدہ حدود کسی کی ذاتی رائے یا خواہش پر نہیں چھوڑ دیئے گئے۔ صحیحین میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "کوئی مسلمان جو کلمہ شہادت ادا کرتا ہے اور شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ مگر صرف تین صورتوں میں' یہ کہ اس نے ناحق قتل کیا ہو' وہ محصن ہو اور زنا کا ارتکاب کیا ہو' یہ کہ وہ تارکِ دین ہو اور جماعت مسلمہ کو اس نے چھوڑ دیا ہو"۔

اسلام میں قتل نفس کی گنجائش کی پہلی صورت ہے کہ کسی نے قتل کا ارتکاب کیا ہو اور اس کے خلاف عدالت مجاز سے منصفانہ فیصلہ قصاص صادر ہو چکا ہو۔ اس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ "تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے"۔ اس طرح کہ نفاذ قصاص سے مجرموں کے ہاتھ پکڑے جاتے ہیں اور وہ پھر کسی زندہ شخص کی جان لینے سے باز رہتے ہیں۔ جب نظام قصاص موثر طور پر نافذ ہوتا ہے تو یہ دوسرے لوگوں کو اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے روکتا ہے۔ نیز اس طرح یہ بھی زندگی ہے کہ

قاتل کے ورثاء ایک شخص کو قتل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ ایک قتل کے بدلے کئی لوگوں کا خون نہیں بہاتے - نہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں - بعض اوقات لوگ سلسلہ قتل کو جاری رکھتے ہیں اور جانبین سے کئی قتل ہو جاتے ہیں - نیز نظام قصاص کے اجراء میں اس طرح بھی زندگی ہے کہ ہر شخص کی جان اپنی جگہ محفوظ ہو جاتی ہے اور اسے عدالت پر اعتماد ہوتا ہے - یوں پوری امت اور سوسائٹی مطمئن ہوتی اور امن وچین سے زندگی گزارتی ہے -

قتل کی دوسری صورت مرتد کی ہے - یہ دراصل روحانی فساد اور طوائف الملوکی کے دفعیے کے لیے ضروری ہے - جب ایک شخص اپنی خوشی سے بغیر کسی جبر کے اسلام قبول کرتا ہے' اسلامی جماعت میں داخل ہوتا ہے اور امت کا حصہ بن جاتا ہے اور امت اس کی ذات میں داخل ہو جاتی ہے' وہ امت اسلامیہ کے رازوں اور بھیدوں سے واقف ہو جاتا ہے' اور پھر وہ اگر امت کو چھوڑ کر مرتد ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر پائی جانے والی امت کو قتل کرتا ہے - اگر یہ شخص پہلے ہی اسلام میں داخل نہ ہوتا تو اسے کس نے مجبور کیا تھا - اگر وہ اہل کتاب میں سے تھا تو اسلام نے اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی اور اگر وہ مشرک تھا تو اسلام اسے پناہ دیتا تھا اور اسے اس کی جائے پناہ تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتا تھا' اس لیے اگر وہ اپنی خوشی سے اسلام میں داخل ہوا ہے تو اب اسے لازماً اسلام میں رہنا ہوگا ورنہ قتل مرتد کی سزا پائے گا -

وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِيۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ (۱۷ : ۳۳) "اور جس نفس کا قتل اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ" - اور قتل مرتد بھی ایک حق ہے -

تیسری قسم کا قتل یہ ہے کہ کوئی محصن زنا کا ارتکاب کرے - یہ فحاشی کی اشاعت ہے اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا -

یہ تین اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام میں سزائے موت دی جا سکتی ہے - ان تین اسباب کے بغیر ناحق کوئی کسی شخص کو قتل کرے گا تو پھر مقتول کے ورثاء کو اختیار ہو گا کہ قاتل کو بعد از ثبوت جرم قتل کر دیں - پھر بھی اگر وہ چاہیں تو قتل کرا دیں' اگر چاہیں تو دیت لے کر معاف کر دیں' چاہیں تو بغیر دیت کے معاف کر دیں - یہ اختیار مقتول کے ورثاء کا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں -

لیکن ورثاء کو بھی قتل کا اختیار دینے کے ساتھ ساتھ ان پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے کہ وہ اس اختیار سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں - قتل میں اسراف نہ کریں - اسراف یہ ہے کہ مقتول کے علاوہ اوروں کو قتل نہ کریں جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے انتقام میں ہوتا تھا کہ قاتل کے بہن بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی ناحق قتل کر دیا جاتا - حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا - ان کا قصور صرف یہ ہوتا کہ وہ قاتل کے افراد خاندان یا افراد قبیلہ ہیں - اس طرح مثلہ کرنے اور قتل میں ناجائز آلات استعمال کرنے کے سلسلے میں ممانعت کی گئی ہے - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسراف فی القتل کی تمام شکلوں کی ممانعت کی ہے -

فَلَا يُسۡرِفۡ فِّي الۡقَتۡلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنۡصُوۡرًا (۱۷ : ۳۳) "پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے بے شک اس کی مدد کی جائے گی" - اس کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کر دیا - دین اسلام اور اسلامی قانون اس کے حق کا موید ہے - اور حاکم وقت کا بھی فرض ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کی نصرت کرے - لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ

قصاص لینے میں بھی انصاف کرے' اس لیے کہ تمام اسلامی ادارے اس کے حامی و ناصر ہیں۔

یہ کیوں کہا گیا کہ قصاص لینے کا اختیار مقتول کے ورثاء کو دے دیا گیا؟ جبکہ حکومت' حکومتی اداروں اور تمام سوسائٹی کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ورثائے مقتول کی نصرت کریں۔ یہ ایک نہایت ہی فطری عمل ہے' اس طرح انسان کا جذبہ انتقام سرد پڑ جاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کے دلوں میں جذبہ انتقام کی موجوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ انتقام بعض اوقات اس قدر شدید ہوتا ہے کہ لوگ اس سے مغلوب ہو کر دائیں بائیں جو بھی سامنے آتا ہے اسے گاجر اور مولی کی طرح کاٹ دیتے ہیں لیکن جب ورثاء یہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قاتل کی زندگی ان کے اختیار میں دے دی ہے اور یہ کہ حاکم بھی ان کی امداد پر کمربستہ ہے۔ اور عدالت ان کی پشت پر ہے تو اس طرح اس کا جوش انتقام سرد پڑ جاتا ہے اور وہ عدالت کے منصفانہ فیصلہ کا انتظار کرتا ہے اور قصاص پر اکتفاء کرتا ہے۔

انسان بہرحال انسان ہے اور اس کی فطرت کے اندر قصاص کا داعیہ موجود ہے۔ اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے وہ انسان کی اس فطری خواہش کو پورا کرتا ہے اور محفوظ اور مامون حدود کے اندر اسے بدست خود انتقام لینے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام عفو و درگزر کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیں اور اس پر اجر بھی دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ حق قصاص عطا کرنے کے بعد۔ جب فیصلہ دے دیا جائے تو پھر یہ وارث یا وارثان مقتول کا حق ہے کہ قصاص لیں' دیت لیں یا بالکل عفو و درگزر سے کام لیں۔ ہاں اگر ان کے اندر یہ احساس ہو کہ انہیں عفو و درگزر پر مجبور کیا گیا ہے تو اس صورت میں وہ پھر جذبات انتقام سے مغلوب ہو سکتے ہیں اور زیادتی کر سکتے ہیں۔

---()()()---

جان اور عزت کی حفاظت کے بعد اب روئے سخن مال یتیم اور عہد کی حفاظت کی طرف آتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝

"مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے' یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ عہد کی پابندی کرو' بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی"۔

اسلام ہر مسلمان کی جان' مال اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تمام مسلمان مسلمانوں پر حرام ہیں' ان کی جان' ان کی آبرو اور ان کا مال"۔ لیکن قرآن کریم اور سنت دونوں نے مال یتیم کے بارے میں بالخصوص سخت تشدید سے ممانعت کی ہے۔ طریق احسن کو چھوڑ کر کسی اور صورت میں بھی اس کے قریب تک جانے سے منع کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ یتیم کمزور ہوتا ہے وہ اپنے مال کی حفاظت اور تدبیر کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور وہ اپنے مال کی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسلامی نظام زندگی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مال یتیم کی حفاظت اور تدبیر کرے۔ اور یہ اس وقت تک جاری رہے جب تک وہ سن رشد کو پہنچ نہیں جاتا اور جب تک وہ اس بات کے اہل

نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے مال میں مناسب تصرفات کر سکے۔

ان احکام اور اوامر و نواہی کے اندر یہ لطیف نکتہ پایا جاتا ہے کہ جن احکام کا تعلق ایک فرد سے ہے ان کے بارے میں مفرد صیغہ استعمال ہوا ہے اور جن کا تعلق سوسائٹی یا حکومت اور اجتماعی نظام سے ہے ان کو جمع کے صیغے میں لایا گیا ہے۔ مثلاً والدین کے ساتھ حسن سلوک' اقرباء' مساکین اور مسافروں کی مالی امداد' فضول خرچی کی ممانعت' خرچ کرنے میں بخل اور اسراف کے درمیان معتدل راہ اپنانے کا حکم' حق پر ثابت قدمی اور کبر و غرور کی ممانعت کے احکام اور امر و نہی میں صیغہ مفرد استعمال ہوا ہے' اور قتل اولاد کی ممانعت کے احکام' حرمت زنا' قتل نفس' مال یتیم کی حفاظت' وفائے عہد کے احکام' ناپ و تول پورا کرنے کے حکم یا نہی میں جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال یتیم کے قریب نہ جانے کی ممانعت صیغہ جمع کی صورت میں آئی ہے تاکہ پوری سوسائٹی حفاظت مال یتیم کی ذمہ داری میں برابر کی شریک ہو کیونکہ یہ ایک اجتماعی نوعیت کی ذمہ داری ہے۔

مال یتیم کی حفاظت چونکہ پوری سوسائٹی کی ذمہ داری ہے' اسی کے ساتھ وفائے عہد کے احکام بھی دیئے گئے۔ کیونکہ اجتماعی ذمہ داریوں کے سلسلے میں بالعموم عہد لیا اور دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وفائے عہد کا ایک عمومی حکم یہاں دے دیا گیا۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷ : ۳۴) "اور وعدہ کو پورا کرو' بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔ وفائے عہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود سوال کرے گا اور جو لوگ وفائے عہد نہیں کرتے' ان سے قیامت کے دن اس سلسلے میں باز پرس ہوگی۔

اسلام نے وفائے عہد کے سلسلے میں تاکید شدید کی ہے۔ کیونکہ ایک فرد اور جماعت کے کردار میں وفائے عہد اصل معیار ہے کہ کون شخص ٹھوس اور ثابت قدم ہے' کون ضمیر کے اعتبار سے پاکیزہ ہے۔ قرآن و حدیث میں بار بار اور مختلف طریقوں سے وفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے۔ چاہے یہ عہد اللہ کی طرف سے ہو' لوگوں کی طرف سے ہو' فرد کی طرف سے ہو' کسی جماعت یا سوسائٹی کی طرف سے ہو' رعایا کی طرف سے ہو یا حکومت کی طرف سے ہو' حاکم کی طرف سے ہو یا محکوم کی طرف سے' نیز بین الاقوامی تعلقات میں اسلام نے عہد کی پابندی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ انسانی تاریخ میں ایسی مثالیں صرف اس حصے میں ملتی ہیں جن میں مسلمان دنیا کے حکمران تھے' یا دنیا کے حکمرانوں میں سے معتبر حکمران تھے (دیکھئے کتاب "عالمی امن")۔

---ooo---

ناپ تول کا پورا کرنا بھی دراصل وفائے عہد کے زمرے میں آتا ہے' کہا گیا:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵

"پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو' اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر

ہے"۔ وفائے عہد اور ناپ اور تول پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک کرنے اور وفائے عہد کے درمیان لفظی اور معنوی مناسبت تو بالکل ظاہر ہے۔ لہٰذا وفائے عہد کے حکم کے بعد ناپ اور تول پورے کرنے کے احکام کی طرف آنا موضوع کی مناسبت سے درست ہے۔

ناپ اور تول پورا کرنا معاملات میں دیانت و امانت کا حصہ ہے۔ اس سے تاجر کو قلبی طہارت بھی حاصل ہوتی ہے اور سوسائٹی کی نشوونما صحت مند بنیادوں پر ہوتی ہے۔ لوگوں کے درمیان معاملات میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اس سے برکت پیدا ہوتی ہے۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۱۷ : ۳۵) "یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی بہتر ہے"۔ یعنی دنیا میں بھی بہتر ہے اور آخرت میں بھی بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں "جو شخص بھی حرام پر قدرت رکھتا ہو اور پھر حرام سے اجتناب کرے اور یہ کام وہ محض رضائے الٰہی کے لیے کرے 'تو اللہ آخرت سے قبل خود اس دنیا میں اسے اس سے بہتر دیتا ہے"۔

جو لوگ ناپ اور تول میں کمی کرتے ہیں وہ دراصل نہایت ہی گندہ کام کرتے ہیں 'یہ نفسیاتی گراوٹ ہے اور معاملے میں دھوکہ اور خیانت ہے۔ اس سے مارکیٹ میں اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کساد بازاری بھی پیدا ہوتی ہے اور پوری سوسائٹی سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سے تمام تر افراد جماعت کو نقصان ہوتا ہے حالانکہ وہ بظاہر سمجھتے ہیں کہ اس خیانت کے ذریعے وہ کما رہے ہیں 'لیکن وہ محض ظاہری اور وقتی کمائی ہوتی ہے لیکن مآل کار میں نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کساد بازاری آتی ہے تو نقصان اس خیانت کار کو بھی ہوتا ہے۔

جو لوگ تجارتی دنیا میں دور کی نظر رکھتے ہیں انہوں نے اپنے ذاتی تجربے سے اس حقیقت کو پا لیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے کسی اخلاقی یا دینی جذبے سے یہ کام نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے سائنٹیفک سٹڈی سے اس حقیقت تک رسائی حاصل کی۔

سوال یہ ہے کہ پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ جو شخص محض تجارتی مقاصد کے لیے دیانت داری کرتا ہے اور جو شخص دینی جذبے سے دیانت داری کرتا ہے دونوں میں کیا فرق ہے 'جو شخص اخلاقی اور دینی عقیدے اور جذبے سے یہ کام کرتا ہے اس کا نقطہ نظر اور اس کی ذہنی سطح زیادہ اعلیٰ 'ارفع اور بلند ہے 'اور دل کی زیادہ تطہیر اس سے ہوتی ہے۔ اور اس کی زندگی میں زیادہ سکون و اطمینان ہوتا ہے۔ اس طرح اسلام عملی زندگی میں بھی ہمیشہ وسیع اور ارفع اور روشن مستقبل کی طرف بڑھتا ہے اور دور تک انسانوں کی مادی اور روحانی راہنمائی کرتا ہے۔

---000---

اسلامی نظریہ حیات کا یہ کمال ہے کہ وہ نظریہ 'عقیدہ اور تصورات میں بہت زیادہ صفائی 'وضاحت اور حقیقت پسندی کا قائل ہے اسلام کسی معاملے میں پیچیدگی 'وہم و شبہات کی اجازت نہیں دیتا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝

"کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو' یقیناً آنکھ 'کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے"۔

ان چند الفاظ میں انسانی دل و دماغ کے لیے ایک بہترین منہاج عمل اور طریق کار وضع کر دیا گیا ہے اور یہ ایک سائنسی انداز ہے جسے دوسرے لوگوں نے حال ہی میں معلوم کیا ہے۔ اسلام نے اس میں قلب کی درستی 'خدا ترسی اور سائنس میں حکمت خداوندی پر غور کا جوڑ لگا کر ایک خشک علم کے مقابلے میں اسے مزید مقدس اور بامعنی بنا دیا ہے۔ یہ اسلام اور قرآن کی خصوصیت ہے۔

قرآن کریم یہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قبل پوری تحقیق کرو' معاملے کو پایہ ثبوت تک پہنچاؤ' یہ اسلام کا نہایت ہی باریک طریق کار ہے۔ جب دل و دماغ اس منہاج پر گامزن ہو جائیں۔ تو پھر وہم و گمان کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی اور معاملات 'فیصلوں میں یقین پر محکم ہوتا ہے 'لہٰذا کوئی بات محض فرض کرنے 'وہم یا شبہات کی بنیاد پر تسلیم نہیں کی جاتی۔ بحث و تحقیق کے میدان میں 'فیصلوں کا مدار تحقیق اور ثبوت پر ہوتا ہے 'مفروضوں پر نہیں۔ انسانیت کو یہ علمی اور سائنسی انداز سب سے پہلے قرآن نے دیا ہے۔

وہ علمی امانت جس کے ساتھ دور جدید کے لوگ مسلح ہیں 'اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اس علمی امانت کا ایک حصہ ہے۔ جس کی تلقین قرآن کرتا ہے یعنی قلب و نظر کی وہ امانت جسے عقل کہتے ہیں اور جس کے استعمال اور کام میں لانے کی قرآن کریم بار بار تلقین کرتا ہے اور یہ قرار دیتا ہے کہ انسان سمع اور بصر اور قلب و نظر کی قوتوں کو کام میں لانے کا ذمہ دار ہے اور یہ ذمہ داری اس ذات کے سامنے ہے جس نے یہ قوتیں انسان کو عطا کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام اعضاء اور جوارح 'اس کے حواس اور اس کی عقل یہ سب اللہ کی امانتیں ہیں اور ان امانتوں کا مالک اللہ ہے' وہ انسان سے پوچھے گا کہ اس نے یہ قوتیں کام میں لائی تھیں یا نہیں۔ جب انسان ایک لفظ بولتا ہے تو اس کے مفہوم پر غور کرتے ہوئے انسان معلوم کر لیتا ہے کہ عقل اور فکر و نظر اور سمع و احساس کس قدر عظیم قوتیں ہیں۔ خصوصاً جب ایک انسان کوئی کہانی یا روایت بیان کرتا ہے' یا کوئی فیصلہ کرتا ہے 'کسی کے خلاف 'کسی حادثے کے بارے میں' یا کسی اور معاملے میں۔

وَ لَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷ : ۳۶) "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو"۔

یعنی اس بات میں نہ پڑو' جس کا تمہیں یقینی علم نہ ہو' جب تک اس کی صحت کے بارے میں تمہیں وثوق حاصل نہ ہو' خواہ بات ہو یا کوئی روایت ہو' کسی منظر کی تشریح ہو یا کسی واقعہ کے اسباب پر بحث ہو' کوئی شرعی اور قانونی مسئلہ ہو یا کوئی اعتقادی اور نظریاتی مسئلہ ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے :

ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث "بدگمانی سے دور رہو' کیونکہ محض ظن و تخمین کی بات جھوٹی بات ہوتی ہے"۔ سنن ابوداؤد میں ہے۔ بئس مطیة الرجل زعموا "کسی شخص کی یہ بہت بری سواری ہے کہ وہ کہے "لوگ یہ کہتے ہیں"۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ان افری الفری ان یری الرجل عینیه مالم تریا "سب سے بڑی افتراء یہ ہے کہ ایک شخص اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو انہوں نے نہیں دیکھی"۔

یوں آیات و احادیث و روایات کا ایک بڑا ذخیرہ اس بات کی توثیق و تائید کرتا ہے کہ اسلام میں عقل و خرد اور ثبوت احکام کے لیے نہایت ہی مستحکم اور معقول طریق کار اپنایا گیا ہے۔ تمام اسلامی احکام کے ثبوت' میں پوری طرح چھان بین کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان اپنی سوچ' اپنے تصور' اپنے شعور' اپنے فیصلوں میں پختہ ثبوت اور یقین کا قائل ہوتا ہے' وہ کوئی بات' کوئی روایت' کوئی حکم' اور کوئی فیصلہ بغیر شہادت اور ثبوت کے نہیں دیتا۔ جب تک اس کے تمام اجزاء پایہ ثبوت و یقین تک پہنچ نہ جائیں۔ اور یہ ثبوت معقول حالات کے اندر نہ ہو' اور جس میں کوئی شک و شبہ نہ رہا ہو۔ بے شک قرآن نے بہت ہی صحیح کہا ہے۔

انَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷:۹) "بے شک یہ قرآن ایک صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے"۔ صدق اللہ العظیم۔

--- ۰۰۰ ---

یہ احکام' اوامر و نواہی جو عقیدہ توحید پر مبنی ہیں' یہاں ان کا خاتمہ ایک نہایت ہی اہم اخلاقی تعلیم پر کیا جاتا ہے' وہ یہ کہ انسان اپنی بے بضاعتی کو بھی پیش نظر رکھے اور اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝

"زمین میں اکڑ کر نہ چلو' تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو' نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو"۔

انسان جب صاحب مال و جاہ بن جاتا ہے اور اسے دنیا میں قوت اور سلطنت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے دل و دماغ سے خدا کا تصور نکال دیتا ہے' جو اس پوری کائنات کا خالق و مالک ہے' تو اس نظریاتی بے راہ روی کی وجہ سے وہ کبر و غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے پاس جو قوت اور مال ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی قوت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تو اس کے دل و دماغ پر کبر و غرور کا غبار کبھی نہ چھائے۔ اور وہ اکڑ کر نہ چلے اور زمین کے اوپر نہایت ہی شریفانہ چال چلے۔ اس میں کوئی اکڑ نہ ہو۔

قرآن کریم اس قسم کے متکبر' مغرور انسان کے سامنے اس کی کمزوریاں رکھتا ہے کہ دیکھو۔

انَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (۱۷:۳۷) "تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو"۔ انسان جسمانی اعتبار سے بہت ہی نحیف و نزار ہے۔ جسمانی اعتبار سے یہ اللہ کی دوسری مخلوقات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انسان کے اندر جو قوت ہے وہ خدائی قوت ہے' اس کو غلبہ صرف اللہ کے دین کی وجہ سے حاصل ہے' اور یہ جو اس کائنات میں معزز ہے تو اس لیے کہ اللہ نے اپنی روح پھونک کر اسے معزز بنایا ہے۔ تاکہ وہ اللہ سے اپنا رشتہ ہر وقت جوڑے رکھے اور اسے بھلائے نہیں۔

یہ عاجزی اور یہ تواضع جس کی طرف قرآن بلاتا ہے تکبر غرور اور خیالاتی برتری کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ یوں انسان درگاہ باری تعالیٰ میں بھی باادب رہتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ بھی شریفانہ ہوتا ہے اور خیالات و تصورات میں سنجیدہ اور سوشل لائف میں متوازن ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے بعد 'اگر کوئی غرور و تکبر کرتا ہے تو وہ کم عقل' بے وقوف اور گھٹیا انسان ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو اللہ پسند نہیں کرتا' کیونکہ وہ غرور میں مبتلا ہے اور عوام الناس بھی ایسے شخص کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو یوں بڑا سمجھتا ہے اور بے جا پھولا ہوا ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے 'من تواضع لله رفعه فهو في نفسه حقير وعند الناس كبير، ومن استكبر وضعه الله فهو في نفسه كبير وعند الناس حقير - حتي لهوا بغض اليهم من الكلب والخنزير "جو شخص تواضع کرے محض رضائے الٰہی کے لیے' تو اسے اللہ اٹھائے گا' وہ تو اپنے خیال میں حقیر ہوگا لیکن لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوگا' جو تکبر کرے' اللہ اسے گرا دیتا ہے' وہ تو اپنے خیال میں بڑا آدمی ہوتا ہے مگر لوگوں کے نزدیک حقیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے اس قدر نفرت کرنے لگتے ہیں جس طرح کتے اور خنزیر سے" (ابن کثیر)۔

اب یہ بحث یہاں ایک اصولی بات پر ختم ہوتی ہے 'جس قدر امور سے اس فہرست میں منع کیا گیا ہے وہ افعال مذمومہ ہیں' اب عموماً کہا جاتا ہے کہ اللہ تمام برے اعمال اور افعال اور صفات کو پسند نہیں کرتا۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

"ان امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں"۔

یہاں تمام احکام اور منہیات کا سبب بتا دیا گیا کہ ان امور کی ممانعت ان کے برے پہلو کی وجہ سے ہے۔ ان میں کوئی اچھا پہلو بھی ہو سکتا ہے لیکن ان کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ ان میں برائی کا پہلو غالب ہے۔

یہ تمام احکام اور اخلاقی تعلیمات کو اب عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے ہیں۔ لہٰذا شرک سے بچو اور قرآن کی تعلیمات حکمت کی یہ خاص خاص باتیں ہیں یہ حکمت قرآن کا ایک حصہ ہیں۔

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

"اور دیکھ' اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھ ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محروم ہو کر"۔

اس سبق کا یہ خاتمہ' اس کے آغاز کے ساتھ مماثل ہے۔گویا اس کے دونوں سرے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ تمام سبق اس عظیم قاعدے اور اصول پر قائم ہے۔جس پر اسلامی نظام حیات کی بنیاد اٹھائی گئی ہے یعنی عقیدۂ توحید اور صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور اطاعت اور اللہ کے سوا تمام طاغوتوں کی بندگی اور اطاعت سے انکار۔

---000---

درس نمبر ۱۲۷ ایک نظر میں

دوسرے سبق کا آغاز و انجام عقیدۂ توحید کے بیان اور رد شرک کے مضمون کے ساتھ ہوا' اور اس آغاز و انجام کے درمیان بے شمار احکام امرو نہی اور بے شمار آداب و اخلاق بیان ہوئے جو سب کے سب عقیدۂ توحید کے ساتھ مربوط تھے اور اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے تھے ۔ اس سبق کا آغاز و انجام بھی شرک کی ایک مخصوص قسم کے رد کے ساتھ ہوتا ہے' یعنی یہ کہ اللہ کا کوئی بیٹا اور شریک نہیں ہے ۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے لیے بیٹا ہونا ایک ایسا نظریہ ہے جس کی کمزوری اور لچرپن بالکل واضح ہے ۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اللہ وحدہ کی مخلوق ہے اور سب چیزیں اس کی ثناخواں اور تسبیح گویا ہیں ۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (۱۷ : ۴۴) "جو چیز بھی ہے وہ اس کی تعریف کے ساتھ اس کی ثناخواں ہے"۔ اور تمام اشیاء کا انجام ایک ہے اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور جو چیزیں بھی زمین و آسمان میں ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں ۔ اور اللہ وحدہ اپنی مخلوقات کے اندر جو تصرفات بھی کرتا ہے 'کوئی اس کے معاملات میں اس سے بازپرس نہیں کر سکتا ۔

اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ (۱۷ : ۵۴) "اگر چاہے تو تم پر رحم کر دے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے" ۔

اس سبق کے درمیان بتایا جاتا ہے کہ شرکیہ عقائد کمزور اور غیر معقول ہیں اور ذات باری تعالیٰ وحدہ' حاکم' مطاع' صاحب قدرت' متصرف اور تمام معاملات کائنات میں خود مختار ہے ۔ اور اس سے کوئی بھی بازپرس کرنے والا نہیں ہے ۔ دنیاوی امور بھی اس کے ہاتھ میں ہیں' اخروی بھی اس کے ہاتھ میں ہیں' ظاہری بھی اور خفیہ بھی ۔ اور یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمان ہے' اس کی طرف متوجہ ہے اور اس کی تعریف اور تسبیح کرتی ہے ۔ اور اس کام میں انسان' حیوان' چرند پرند اور تمام اشیاء شامل ہیں ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۷ تشریح آیات

۴۰ --- تا --- ۵۷

اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۴۰

"کیسی عجیب بات ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں تو بیٹوں سے نوازا اور خود اپنے لیے ملائکہ کو بیٹیاں بنا لیا؟ بڑی جھوٹی بات ہے جو تم لوگ زبانوں سے نکالتے ہو"۔

یہ استفہام انکاری ہے' اور یہ انداز اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب کو یہ بتانا مقصود ہو کہ تمہاری یہ حرکت بہت ہی بری ہے۔ تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حالانکہ اللہ بیوی' اولاد' مثل اور مثال سے پاک ہے۔ اور اس کا کوئی شبیہ اور کوئی شریک نہیں ہے۔ اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے لیے تو لڑکیوں کو معیوب سمجھتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور خود رزق کے خوف اور عار لاحق ہونے کی وجہ سے بیٹیوں کو قتل کرتے ہیں اور اس کے باوجود فرشتوں کو لڑکیاں قرار دیتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تو اگر لڑکے اور لڑکیاں دینے والا اللہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دوسروں کو لڑکے دے اور اپنے لیے لڑکیاں رکھے جو درجے میں لڑکوں سے کم ہیں۔

یہ استدلال محض اس کے رواج کے مطابق کیا گیا کیونکہ ان کے ہاں لڑکیوں کو برا سمجھا جاتا تھا اور لڑکوں کو اچھا تاکہ یہ بتایا جائے کہ خود ان کے تصورات کے مطابق بھی۔ ان کا قول کمزور ہے۔ ورنہ بات درحقیقت اپنی اصل ہی سے غلط تھی۔

اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا (۱۷ : ۴۰) "بڑی جھوٹی بات ہے جو تم لوگ زبان سے نکالتے ہو"۔ یہ برائی کے اعتبار سے بہت ہی بری بات ہے اور یہ اللہ کی شان میں بری جسارت ہے اور نہایت ہی گندی بات ہے اور یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور اسلامی عقائد' قرآنی آیات اور حقائق کے ساتھ متصادم ہے اور ناقابل یقین و تصدیق ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۴۱

"ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں مگر وہ حق سے اور زیادہ دور ہی بھاگے جارہے ہیں"۔

قرآن کریم عقیدۂ توحید لے کر آیا۔ اس عقیدے کو قرآن نے مختلف اسالیب سے بیان کیا اور اس پر بے شمار دلائل دیئے۔ اور کئی طریقے اختیار کیے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور فطری دلائل اور فطری اور منطقی طرز استدلال کو سمجھیں اور توحید کا فطری عقیدہ قبول کریں اور اس کائنات میں اللہ وحدہ لاشریک کی ذات پر جو آثار و دلائل موجود ہیں ان پر غور کریں مگر ان لوگوں نے اس کے سوا کچھ نہ کیا کہ انہوں نے قرآن سے نفرت کی۔ کیونکہ انہیں ڈر یہ تھا کہ اگر انہوں نے قرآن کو سنا اور پڑھا تو وہ ان عقائد باطلہ پر قائم نہ رہ سکیں گے 'جن کو وہ مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہتے ہیں 'کیونکہ ان کے عقائد شرکیہ ' اوہام اور خرافات پر مبنی تھے اور قرآن کے فطری اور منطقی استدلال کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے تھے۔

جس طرح اس سے قبل لڑکیوں کی نسبت الی اللہ کے معاملے میں قرآن کریم نے ان کے خیالات کے مطابق بات کی تھی کہ خود اپنے لئے تو لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے مگر اللہ کے لیے ثابت کرتے ہیں 'اب یہاں ان کے عقیدۂ شرکیہ کو فرض کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی دوسرے خدا بھی ہوتے تو وہ اللہ کی ذات تک پہنچنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالتے۔ وہ اللہ کا قرب حاصل کرتے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

"اے نبی ان سے کہو اگر اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں 'تو وہ مالک عرش کے مقام کو پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے"۔

جیسا کہ نحویوں نے کہا ہے لو حرف امتناع ہے اور یہ استعمال ہی قضیہ ممتنعہ پر ہوتا ہے 'لہٰذا اللہ کے سوا الہوں کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اور جن ہستیوں کو یہ الٰہ بناتے ہیں وہ خود اللہ کی مخلوقات ہیں۔ چاہے وہ ستارے ہوں 'سیارے ہوں 'انسان ہوں یا حیوان ہوں 'نباتات ہوں یا جمادات ہوں۔ اور یہ تمام مخلوقات قانون قدرت کے مطابق سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں اور یہ سب مخلوقات ارادۂ باری تعالیٰ کی مطیع فرمان ہیں۔ اور ہر چیز اللہ کی طرف رواں دواں ہے۔

اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (۱۷ : ۴۲) "تو وہ مالک عرش کے مقام کو پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے"۔ یہاں عرش سے مراد مطلق بلندی اور ان مخلوقات سے برتری ہے جن کو یہ لوگ الٰہ سمجھتے ہیں۔ یہ تمام مخلوق اللہ کے عرش کے تحت ہیں اور اللہ کی حکمرانی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

"پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں"۔
اب ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی ثناخواں اور اس کی مطیع فرمان ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

"اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگزر کرنے والا ہے"۔

اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے، اللہ کی تسبیح و تہلیل کر رہا ہے، یہ پوری کائنات ایک زندہ کائنات ہے اور اللہ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔

یہ ایک منفرد کائناتی منظر ہے، جب انسان سوچتا ہے کہ ہر شجر و حجر، ہر بیج اور ہر پتہ، ہر پھل اور پھول، ہر پودا اور ہر درخت، ہر چرند اور ہر پرند، ہر سانپ اور ہر حیوان، ہر دوڑنے والا اور ہر رینگنے والا، ہر اڑنے والا اور ہر تیرنے والا، زمین کا ہر مکیں اور ہوا کا ہر باسی، پستیوں میں رہنے والا یا بلندیوں پر بسیرا رکھنے والا، سب کے سب اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور ثناخواں ہیں۔

جب انسان ان تمام چیزوں کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرتا ہے تو اس کے شعور کے اندر ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اسے اپنے اردگرد تمام مخلوق حرکت کرتی ہوئی اور زندہ نظر آتی ہے اور وہ اسے محسوس کرتا ہے، وہ جس چیز کو بھی ہاتھ سے چھوتا ہے یا پاؤں سے روندتا ہے، وہ اسے ثناخوان الٰہی نظر آتی ہے اور زندہ و تابندہ دکھائی دیتی ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (۱۷ : ۴۴) "کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو"۔ اور اس کی تسبیح کا انداز مخصوص ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷ : ۴۴) "مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو"۔ تم اس لیے نہیں سمجھتے کہ مادیت نے تمہاری روح کو چھپا رکھا ہے، تمہارے دل ان کی آواز کو نہیں سنتے، اور اس کائنات کے اسرار و رموز پر تم نے غور نہیں کیا۔ اس کائنات کے ان قوانین قدرت پر تم نے غور نہیں کیا جو اس کے اندر جاری و ساری ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے رب کی طرف رواں دواں ہے۔ قوانین قدرت کے مطابق اس کائنات کے ہر ذرے کا حدی خواں ہے۔

یاد رکھو' کہ جب روح شفاف ہو جاتی ہے اور انسان روحانی صفائی کے مدارج طے کر لیتا ہے تو وہ سب چیزوں کی تسبیح سنتا ہے' ہر متحرک اور ہر ساکن مخلوق کی آواز وہ سنتا ہے۔ اسے ہر چیز کی نبض چلتی نظر آتی ہے اور ہر چیز کی تسبیح سنائی دیتی ہے۔ اس کا رابطہ عالم بالا سے ہو جاتا ہے اور وہ اس کائنات کے ان اسرار و رموز کو دیکھتا ہے جس سے غافل لوگ بے خبر ہوتے ہیں' کیونکہ مادیت کے پردہ نے ان غافلوں کی روح کو دبا رکھا ہوتا ہے' حالانکہ روح کائنات ہر ساکن و جامد میں بھی متحرک ہے۔ ہر چیز میں' ہر شجر و حجر میں۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۱۷ : ۴۴) "حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگزر کرنے والا ہے"۔ حلم اور مغفرت کا ذکر یہاں اسی لیے کیا گیا کہ انسان ہر معاملے میں پر تقصیر ہے۔ خصوصاً وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی ثناخواں ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ نباتات و جمادات کے اقرار و تسبیح سے جاہل بلکہ یہ انسان انسان ہوتے ہوئے بھی باری تعالیٰ کا منکر بن جاتا ہے۔ کوئی شرک کرتا ہے' کوئی اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتا ہے' کوئی بلکہ اکثریت کائنات کی تسبیح سے بے خبر ہے' حالانکہ شجر و حجر کے مقابلے میں بشر پر زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کا مطیع ہو اور ثناخواں ہو' اور ذات باری کی معرفت کا حامل ہو۔ اگر اللہ کی درگزر نہ ہوتی' وہ مہلت نہ دیتا' مغفرت نہ کرتا' تو کب کے وہ تباہ ہو چکے ہوتے لیکن وہ حلیم و غفور ہے۔ بار بار نصیحت کرتا ہے' ڈراتا ہے اور نصیحت کرتا ہے۔

---ooo---

کبراء قریش چپکے چپکے قرآن سنا کرتے تھے' لیکن وہ ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ ان کے دلوں پر قرآن کا اثر نہ ہو جائے' وہ زبردستی اپنے اوپر مرتب ہونے والے اثرات کو جھڑک دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے اور رسول ؐ کے درمیان پردے حائل کر رکھے تھے۔ وہ اپنے آپ کو غافل رکھتے تھے۔ کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے' چنانچہ اللہ نے بھی انہیں ان کی اس روش پر چلنے دیا۔ ان کے اور قرآن کے درمیان پردے حائل ہو گئے۔ ان کے دلوں پر تالے لگ گئے اور کانوں میں بھاری پن آگیا۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝

"جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں' اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے' اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب وہ کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں تو دراصل کیا سنتے ہیں' اور جب بیٹھ کر باہم سرگوشیاں کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں۔ یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں کہ یہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے جس کے پیچھے تم لوگ جا رہے ہو--- دیکھو' کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں' یہ بھٹک گئے ہیں' انہیں راستہ نہیں ملتا"۔

ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔ (محمد ابن شہاب' زہری سے) کہ ابوسفیان ابن حرب' ابوجہل' اور اخنس ابن شریق ابن عمرو ابن وھب ثقفی ایک رات کو اپنے اپنے طور پر نکلے' تاکہ حضورؐ سے قرآن سنیں۔ آپؐ رات کو اپنے گھر میں جہرا نماز میں قرآن پڑھتے تھے۔ ہر شخص نے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر کلام الہی سنا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے متعلق نہ جانتا تھا۔ رات کو وہ سنتے رہے' یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ صبح واپس ہوتے وقت راستے میں ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: "دوبارہ یہ کام نہ کرنا اگر نادان لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ اچھا اثر نہ لیں گے"۔ پھر چلے گئے۔ دوسرے دن یوں ہوا کہ دوبارہ یہ تینوں اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ رات گئے تک سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو پھر راستے میں انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ پھر انہوں نے وہی بات کی جو پہلے دن کی تھی پھر چلے گئے۔ جب تیسری رات ہوئی تو پھر سب کے سب اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے اور سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو پھر اتفاقاً ایک دوسرے کو مل گئے۔ اب کے انہوں نے کہا کہ جب تک ہم معاہدہ نہ کر لیں واپس نہ ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کیا کہ اب ہرگز یہ کلام نہ سنیں گے۔ جب صبح ہوئی تو اخنس ابن شریق نے اپنی لاٹھی لی' ابوسفیان ابن حرب کے پاس آیا خود اس کے گھر میں۔ تو ان سے کہا ابو حنظلہ' براہ کرم تم نے محمدؐ سے جو کلام سنا اس کے بارے میں بتایئے۔ تمہاری حقیقی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا ابوثعلبہ' خدا کی قسم کہ میں نے بعض چیزیں ایسی سنی ہیں جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں۔ ہاں بعض چیزوں کا مطلب میں نہیں سمجھتا۔ اس پر اخنس نے کہا اور میری بھی یہی رائے ہے۔ اس خدا کی قسم جس کے ساتھ تم نے قسم کھائی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلا اور ابوجہل کے پاس آیا۔ یہ اس سے بھی اس کے گھر پر ملا۔ اور یہی سوال کیا کہ ابوالحکم براہ کرم محمدؐ سے جو کچھ تو نے سنا اس کے بارے میں تمہاری حقیقی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے کیا سنا؟ ہمارے اور بنو عبد مناف کا عزت و شرف کے بارے میں مقابلہ تھا۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا' ہم نے بھی کھلایا' انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں' ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے عطیے دیئے ہم نے بھی دیئے' یہاں تک کہ ہم گھٹنے سے گھٹنا ملا کر چلے اور ہم مقابلے کے گھوڑوں کی طرح دوڑے۔ اب انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ ہم میں ایک نبی آیا ہے جس پر وحی آتی ہے۔ تو ہم اسے کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟ ہم اس پر نہ ایمان لائیں گے نہ اس کی تصدیق کریں گے۔ اس پر اخنس ابن شریق اسے چھوڑ کر اٹھ گیا....."

یہ تھے ان لوگوں کے حالات۔ یہ قرآن سے متاثر ہوتے تھے لیکن وہ زبردستی اس تاثر کو دور کرنے کی سعی کرتے۔ ان کے دل اس کی طرف کھنچتے تھے مگر وہ زبردستی اس سے دور کرتے۔ چنانچہ ان کے اس رویے کی وجہ سے اللہ نے ان کے اور قرآن کے درمیان ایسے خفیہ پردے حائل کر دیئے جو بظاہر نظر نہ آتے تھے مگر [illegible] تھے۔ وہ قرآن سے

فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور وہ قرآن سنتے تھے مگر ہدایت نہ پاتے تھے ۔ وہ جب سنتے تو مبہوت و مسحور ہو جاتے' لیکن واپس ہو کر پھر خفیہ مشورے کرتے ۔ سازشیں کرتے اور پختہ عہد کرتے کہ اب کے بعد پھر سرے سے سنیں گے ہی نہیں تاکہ ان کے دلوں پر قرآنی اثرات نہ پڑ جائیں ۔ ان کا دماغ متاثر نہ ہو جائے ۔ کیونکہ قرآن مجید کی تعلیمات جس نظریہ حیات اور جس عقیدۂ توحید پر مبنی تھیں اس کے نتیجے میں قائم ہونے والا نظام اور معاشرہ ان کی خود ساختہ برتری اور امتیازات کو ختم کر دیتا تھا اور یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی ۔

اذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (۱۷:۴٦)

''اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں'' ۔ یہ نفرت ان کو لفظ وحدہ سے تھی ۔ کیونکہ عقیدہ توحید ان کے اجتماعی نظام کو ختم کر رہا تھا ۔ ان کا اجتماعی نظام بت پرستی اور جاہلیت کے رسم و رواج پر قائم تھا' جس میں قریش کی امتیازی حیثیت تھی' ورنہ وہ خود جانتے تھے کہ ان کے عقائد میں کس قدر جھول ہے اور اسلام کے نظریات کس قدر پختہ ہیں ۔ نیز وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن ایک نہایت ہی بلند پایہ پیغام و کلام ہے ۔ اور اس کی ایک امتیازی شان ہے ۔ اور قرآن کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے حالانکہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی بھی کرتے تھے اور اس کے اثرات کو زائل کرنے میں جدوجہد بھی کرتے تھے ۔

ان کا ضمیر اور ان کی فطرت ان کو اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ بات سنیں' متاثر ہوں' لیکن غرور کی وجہ سے وہ تسلیم کرنے اور یقین کرنے سے باز رہتے تھے ۔ اپنی ہٹ دھرمی اور مکابرہ کو وہ یوں چھپاتے تھے کہ رسول اللہ پر مختلف قسم کے الزامات عائد کرتے تھے ۔ مثلاً یہ کہ آپ جادوگر ہیں ۔

اذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۱۷:۴۷) ''یہ ظالم آپس میں کہتے تھے کہ یہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے'' ۔ لیکن خود ان کے اس الزام کے اندر ان کی کمزوری ظاہر ہے' اس الزام ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن سے بے حد متاثر تھے ۔ کیونکہ وہ اندر اندر سے یہ اعتراف کرتے تھے کہ یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا' اس کے اندر غیر بشری رنگ ہے' یہ نہایت ہی خفیہ انداز میں غیر محسوس طور پر اپنے شعور اور وجدان میں اس بات کو پاتے تھے کہ یہ کوئی فوق البشر کلام ہے' اس لیے کبھی اسے جادوگری کہتے' کبھی کچھ اور کہتے' کیونکہ وہ خود سمجھتے تھے کہ یہ کوئی معمولی کلام نہیں ہے ۔ اس کی ترتیب اور اس کی ساخت میں ایک فوقیت پائی جاتی ہے ۔ لہٰذا یہ بات وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ کلام خود حضرت محمدؐ کا نہیں ہے بلکہ کسی جادو کا کرشمہ ہے ۔ انسانی قوت کا کرشمہ نہیں بلکہ جادوگری ہے' لیکن ان کو حقیقت کے اعتراف کی توفیق نہ ہوتی ورنہ وہ کہتے کہ یہ کلام الٰہی ہے کیونکہ انسان' کوئی بھی انسان ایسا کلام پیش نہیں کر سکتا' نہ انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق ایسا کلام بنا سکتی ہے ۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (۱۷:۴۸) دیکھو کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں' یہ بھٹک گئے ہیں' انہیں راستہ نہیں ملتا'' ۔ یہ آپ کو جادوگر اور جادو زدہ کہتے ہیں' حالانکہ آپؐ تو رسول ہیں ۔ یہ خود گمراہ ہو گئے' راہ ہدایت نہیں پا رہے' یہ اس قدر حیران ہو گئے کہ انہیں کوئی راہ

نہیں سوجھتی۔ نہ وہ راہ راست پر آتے ہیں اور نہ ہی اپنے غلط موقف پر کوئی صحیح استدلال کر سکتے ہیں۔

---ooo---

یہ تو تھے ان کے اقوال اور ان کی آراء قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں۔ قرآن کے فلسفہ کائنات کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ قیامت اور بعث بعد الموت کے قائل نہ تھے اور اسے مستبعد سمجھتے تھے۔

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ ۵ ۱۲ ع

۵ وہ کہتے ہیں "جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ' یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبول حیات سے بعید تر ہو" (پھر بھی تم اٹھ کر رہو گے)۔ وہ ضرور پوچھیں گے "کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟" جواب میں کہو: "وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا"۔ وہ سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے: "اچھا' تو یہ ہو گا کب؟" تم کہو: "کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو۔ جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہو گا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں"۔

بعث بعد الموت کا مسئلہ رسول اللہ اور مشرکین مکہ کے درمیان بار بار زیر بحث آتا تھا۔ قرآن کریم نے بکثرت ان مباحث کو نقل کیا ہے' حالانکہ اس کائنات اور موت و حیات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والا ہر آدمی بڑی آسانی کے ساتھ اسے سمجھ سکتا ہے۔ حشر و نشر کی نوعیت کو بسہولت سمجھ جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اس پر بار بار روشنی ڈالی ہے' لیکن جس سادگی اور سلاست اور جس وضاحت کے ساتھ قرآن نے اس مسئلہ کو سمجھایا' یہ لوگ اسے نہ سمجھ سکے۔ لہٰذا وہ یہی کہتے رہے کہ مرنے کے بعد وہ کیسے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷:۴۹) "وہ کہتے ہیں کہ جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟" وہ یہ باتیں اس لیے کرتے تھے کہ وہ حیات کی اصل حقیقت کے بارے میں سوچتے ہی نہ تھے کہ وہ ایک وقت بالکل نہ تھے اور اللہ انہیں وجود میں لایا۔ اور یہ کہ ابتدائی تخلیق مشکل ہوتی ہے جبکہ دوبارہ تخلیق کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی وہ نہیں سوچتے کہ اللہ کی قدرت لامحدود ہے' اس کے سامنے مشکل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ کی تخلیق کا آلہ اور سبب

فقط کن فیکون ہے۔ لہذا کوئی چیز سہل یا دشوار انسانوں کے نقطہ نظر سے تو ہو سکتی ہے لیکن اللہ کے نقطہ نظر سے نہیں۔ وہاں تو صرف ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کے اس تعجب کو یوں رد کر دیا گیا۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا (٥٠) أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ (٥١)

(١٧ : ٥٠ — ٥١) "ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ' یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبول حیات سے بعید تر ہو"۔ جہاں تک ہڈیوں اور مٹی کا تعلق ہے ان کے ساتھ تو پھر بھی زندگی کی یادیں وابستہ ہیں اور پتھر اور لوہا تو زندگی سے بہت دور ہیں کہ تم پتھر ہو جاؤ' لوہا ہو جاؤ' یا اور کوئی سخت چیز ہو جاؤ جو تمہارے خیال میں آثار حیات کو قبول کرنے سے بہت ہی دور ہو' جس میں زندگی کی روح نہ پھونکی جا سکتی ہو تو بھی جب اللہ چاہے گا تمہیں زندہ کر دے گا۔

یہ لوگ نہ پتھر بن سکتے تھے اور نہ لوہا' لیکن یہ ان کو بطور چیلنج کہا جا رہا ہے' اس چیلنج میں ایک طرح کی زجر و توبیخ بھی پوشیدہ ہے۔ پتھروں اور لوہے میں کوئی احساس نہیں ہوتا' لہذا ایک بعید اشارہ اس طرف ہے کہ تمہاری سوچ پتھر اور لوہے کی طرح بے لچک ہے۔

فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا (١٧ : ٥١) "وہ ضرور پوچھیں گے کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا لائے گا؟" یعنی جب ہم مٹی ہو گئے' بوسیدہ ہڈیاں ہو گئیں' تو کون ہے وہ جو ہمیں دوبارہ حیات دے گا۔ یا جب ہم پتھر اور لوہا بن گئے تو پھر کون حیات دے گا؟

قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (١٧ : ٥١) "کہہ دو' وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا"۔ ان کے سوال کا یہ نہایت ہی سادہ اور صاف اور دل لگتا جواب ہے۔ کیونکہ جس ذات نے پہلی مرتبہ ان کو زندگی دی وہ دوبارہ بھی دے سکتا ہے' لیکن وہ اس سادہ جواب سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور نہ اطمینان ان کو ہوتا ہے۔

فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ (١٧ : ٥١) "وہ سر ہلا کر پوچھیں گے"۔ یعنی سر کو اوپر نیچے کر کے سوالیہ انداز اختیار کریں گے' یہ حرکت وہ اس لیے کریں گے کہ وہ اس بات کو بعید از امکان سمجھتے ہیں یا غرور کے طور پر سر ہلائیں گے۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هُوَ (١٧ : ٥١) "اچھا تو یہ ہو گا کب؟" یہ بھی وہ نہایت ہی لاپرواہی سے وقوع قیامت کو بعید از امکان سمجھتے ہوئے کہیں گے۔

قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا (١٧ : ٥١) "آپ جواب دیں' کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ

ہو"۔ وقوع قیامت کے وقت کا علم تو رسول اللہ کو بھی نہیں دیا گیا لیکن شاید یہ وقت ان لوگوں کے گمان اور ظن و تخمین سے قریب تر ہو۔ مناسب تو یہی ہے کہ وہ اس کے وقوع سے ڈریں کیونکہ یہ اس حال میں واقع ہو گا کہ لوگ غفلت میں ہوں گے۔ تکذیب کر رہے ہوں گے' مذاق کر رہے ہوں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔

اور قرآن اپنے مخصوص انداز کے مطابق اچانک قیامت کے مناظر کا بیان شروع کر دیتا ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷:۵۲)

"جس روز تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس پکار کے جواب میں نکل آؤ گے"۔ یہ ان لوگوں کا منظر ہے جو وقوع قیامت کے منکر تھے۔ آج وہ لبیک کہتے ہوئے میدان حشر میں چلے آ رہے ہیں۔ ان کی زبانوں پر بے ساختہ حمد و ثنا جاری ہے' اور اس کے سوا ان کے ساتھ کوئی سوال و جواب نہیں ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے سوالات کا یہ عجیب جواب دیا ہے' یہ لوگ تو اس بات کا انکار کر رہے کہ قیامت ہو گی۔ لیکن آج وہ الحمدللہ' الحمدللہ کہتے ہوئے دوڑے آ رہے ہیں۔ آج پوری زندگی کی اسکرین اس طرح لپیٹ دی جائے گی جس طرح سایہ سمٹ آتا ہے۔

وَتَظُنُّونَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷:۵۲) "اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہو گا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں"۔ دنیا میں زندگی کے طویل ایام کی چادر کو اور پھر برزخ میں صدیوں کے عرصے کو یوں لپیٹ کر رکھ دینا یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا' اس کی زندگی اور عالم برزخ میں صدیاں کس قدر مختصر عرصہ ہیں' یہ سب کچھ چند لمحات ہیں۔ طویل زندگی کے لحات اور تاثرات انسانی احساس میں نہایت ہی مختصر ہوتے ہیں۔ یہ ایک وقت ہوتا ہے جو گزر جائے۔ ایک زمانہ ہوتا ہے جو بیت جائے اور ایک سایہ ہوتا ہے جو لپیٹ لیا جائے اور ساز و سامان دنیا ہوتا ہے جو فنا ہو جائے۔

---○○○---

اب وقوع قیامت کا انکار کرنے والوں' اللہ کے اس پختہ عہد کو جھٹلانے والوں اور اس کے ساتھ مذاق کرنے والوں' سر ہلانے والوں اور مذاق مذاق میں اعتراض کرنے والوں کو چھوڑ کر' اللہ کے مومن بندوں کے ساتھ مکالمہ شروع ہوتا ہے۔ حضور اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ میرے بندوں سے یہ کہو کہ وہ ہمیشہ اچھی بات کریں۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝

"اور اے نبیؐ میرے بندوں (یعنی مومن بندوں) سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے"۔

میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ منہ سے وہی بات نکالا کریں جو بہتر ہو۔ ہر حال میں بہترین بات سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ کیونکہ بری بات سے لوگوں کا دل دکھتا ہے اور شیطان کا مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کے درمیان رخنہ ڈال دے۔ اور اس سے وہ صرف اس صورت میں بچ سکتے ہیں کہ وہ اچھی بات کریں۔ اگر کوئی بری بات منہ سے نکل جائے تو جواب بھی برا ہو گا۔ یوں نزاع شروع ہو جائے گا اور محبت اور آشتی کی فضا نہ رہے گی۔ سختی پیدا ہو گی' پھر دشمنی ہو جائے گی۔ جبکہ اچھی بات سے دلوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور دلوں کو خشکی اور سختی میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ اور آخر کار اچھے کلمات سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (۱۷:۵۳) "حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے"۔ شیطان تاک میں رہتا ہے کہ کسی کے منہ سے بری بات نکلے' اس کی زبان لغزش کرے اور یوں اسے بغض و عداوت کی آگ بھڑکانے کا موقعہ مل جائے اور بھائی بھائی کا دشمن ہو جائے' جبکہ بھلی بات سے رخنے بھر جاتے ہیں' شیطان کی راہ بند ہو جاتی ہے اور اسلامی اخوت شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور رخنہ پردازیوں سے مامون ہو جاتی ہے۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد روئے سخن اب انسانوں کے انجام کی طرف مڑ جاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ کی ایک آواز پر یہ لوگ جمع ہو جائیں گے۔ اس دن ان کا نظام خالص اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس دن کوئی شریک نہ ہو گا۔ اللہ چاہے گا تو رحم کرے گا' چاہے گا تو سزا دے گا' اب لوگوں کا انجام اللہ ہی کے فیصلے پر ہو گا۔ اب تو رسول بھی ان کے لیے وکیل نہ ہو گا۔ وہ تو رسول تھا۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۖ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ۖ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۵۴﴾ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۖ

"تمہارا رب تمہارے حال سے خوب واقف ہے۔ وہ چاہے تو تم پر رحم کرے' اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے۔ اور اے نبی' ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ تیرا رب زمین اور آسمانوں کی مخلوقات کو زیادہ جانتا ہے"۔

بے قید علم اللہ ہی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جامع علم کی بنا پر لوگوں کے ساتھ رحیمانہ سلوک کرے گا یا عذاب دے گا۔ جہاں تک رسول کا تعلق ہے تو لوگوں تک پیغام پہنچانے کے بعد اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ کا جامع علم آسمان اور زمینوں کے درمیان موجود تمام مخلوقات کے ساتھ وابستہ ہے' خواہ ملائکہ ہوں' جن ہوں' انس ہوں یا دوسری مخلوقات جن کو اللہ کے سوا ابھی تک کوئی نہیں جانتا۔ نہ اس مخلوق کی مقدار سے لوگ باخبر ہیں نہ اس کی ماہیت سے بے خبر ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اپنی مخلوقات کے بارے میں مکمل ہے' اس لیے اس نے اپنے علم ہی کی بنا پر بعض انبیاء پر بعض کو فضیلت دی ہے۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ

”ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے دیئے“۔ یہ فضیلت وہ ہے جس کی حقیقت اور سبب صرف اللہ کے علم میں ہے۔ اس فضیلت کے مظاہر پر ہم نے پارۂ سوئم میں بحث کی ہے یعنی آیت

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے ضمن میں۔ لہٰذا تفصیلات وہاں ہی ملاحظہ کریں۔

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۝

”اور ہم نے ہی داؤد کو زبور دی تھی“۔ یہ فضیلت کا ایک خاص نمونہ ہے۔ یعنی حضرت داؤد کو جو کمالات دیئے گئے وہ دوسرے انبیاء میں نہ تھے، زبور کا ذکر اس لیے کیا کہ کتاب دوسرے معجزات کے مقابلے میں بڑا معجزہ ہوتا ہے، خصوصاً بعض مخصوص اور متعین ادوار میں۔

--- ○○○ ---

اس سبق کا خاتمہ بھی اسی مضمون پر ہوتا ہے جس سے آغاز ہوا تھا یعنی اللہ کی بیٹیوں کی نفی اور شریکوں کی نفی اور یہ کہ دعاء و پکار میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور یہ کہ لوگوں کو نفع و نقصان دینے میں صرف اللہ ہی کارساز ہے۔ یہاں ان لوگوں کو چیلنج دیا جاتا ہے جو شرک کے قائل ہیں کہ وہ اپنے شریکوں کو ذرا پکاریں اور دیکھیں کہ وہ انہیں کیا فائدہ دے سکتے ہیں؟ یا ان پر آنے والی کس مصیبت کا منہ موڑ سکتے ہیں؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا۝

”ان سے کہو، پکار دیکھو ان معبودوں کو، جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو، وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں“۔

اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جو مصیبت کو ٹال سکے یا اس کا منہ موڑ سکے۔ یہ کام صرف اللہ وحدہ کر سکتا ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی قسمتوں کا مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں مثلاً فرشتے، جن اور انس وہ سب کے سب اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ خود اللہ تک رسائی کے طریقے تلاش کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اور وہ خود اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ فی الحقیقت ذات باری کو جانتے ہیں۔

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ ٱلْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُۥ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُۥٓ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

"جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق"۔

بعض لوگ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے اور یہ لوگ حضرت عزیر کی بندگی بھی کرتے تھے۔ بعض لوگ ایسے تھے جو حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ بعض لوگ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے اور بعض لوگوں نے ان کے سوا اور معبود اور خدا بنا رکھے تھے۔ اللہ ان سب لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ جن لوگوں کو تم پکارتے ہو' وہ خود اللہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے وسیلے تلاش کرتے ہیں اور عبادات کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اور اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اللہ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں' تو تمہارے مناسب حال بھی یہ بات ہے کہ تم بھی اللہ کا تقرب حاصل کرو جیسا کہ یہ معبود اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں' حالانکہ یہ معبود نہیں ہیں' یہ تو اللہ کے بندے ہیں۔ اور اللہ کی رضامندی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

یوں اس سبق کا آغاز اور انجام رد شرک سے ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ شرک کی تمام صورتیں باطل ہیں' صرف اللہ وحدہ الٰہ ہے' قابل عبادت ہے اور اس بات کے لائق ہے کہ ہم اسے پکاریں۔

---000---

درس نمبر ۱۲۸ ایک نظر میں

درس سابق کا خاتمہ یوں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک اپنے بندوں کے معاملات میں متصرف ہے چاہے تو ان پر رحم کردے اور چاہے تو انہیں سزا دے دے۔ اور لوگ جن الہوں کی بندگی کرتے ہیں وہ نہ ان سے کوئی مصیبت ٹال سکتے ہیں اور نہ کسی مصیبت کا منہ دوسروں کی طرف موڑ سکتے ہیں۔

اب یہاں یہ بتایا جاتا ہے تمام انسانوں کا آخری انجام کیا ہو گا۔ کیونکہ اللہ نے اپنے علم کے مطابق جو فیصلے کیے ہیں' وہ اٹل ہیں۔ اور یہ آخری انجام یوں ہو گا کہ قیامت سے قبل اللہ تمام بستیوں کو ہلاک کر دے گا۔ اگر ان بستیوں میں سے کوئی بستی ایسے جرائم کا ارتکاب کرے جسے دنیا میں ہی سزا دینا لازمی ہو تو یہاں ہی اسے عذاب دے دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تمام زندہ انسان دو طرح کے انجام سے لازماً دوچار ہوں گے یا تو اپنی موت مریں گے یا عذاب الٰہی کے نتیجے میں ہلاک ہوں گے۔

عذاب الٰہی کے ذکر کی مناسبت سے یہاں ان معجزات کا ذکر کر دیا جاتا ہے جن کا ظہور انبیائے سابق کے ہاتھوں پر ہوا۔ یعنی رسالت محمدیہ سے پہلے رسولوں پر۔ ایسے خوارق عادت معجزات کا ظہور رسالت محمدیہ کے ہاتھوں اس لیے نہیں کیا گیا کہ امت محمدیہ کے لیے وہ عذاب مقدر نہیں جو ان اقوام پر آیا کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ جب کوئی معجزہ ظاہر ہوتا ہے اور پھر بھی امت تسلیم نہیں کرتی تو پھر اس پر عذاب الٰہی آتا ہے۔ اور امت محمدیہ کے لیے چونکہ ہلاکت مقدر نہیں اس لیے ایسے معجزات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیے گئے۔ اور امم سابقہ کے انبیاء کو یہ معجزات ڈرانے کی خاطر دیے گئے لیکن جب معجزات دیکھ کر وہ نہ ڈرے تو ہلاک ہوئے۔

اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک لوگوں کی رسائی کے راستے بند کر دیے۔ چنانچہ وہ آپ کو کوئی دکھ نہ پہنچا سکے۔ اور اللہ نے آپ کو جو سیر کرائی اور جو کچھ دکھانا تھا' دکھایا تاکہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آزمائش ہو اور اسے دوسرے معجزات کی طرح خارق عادت معجزہ نہ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شجرۂ ملعونہ سے ڈرایا مگر وہ مزید سرکشی کرتے رہے۔ شجرۂ ملعونہ سے مراد زقوم ہے جس کی روئیدگی جہنم کی تہہ میں ہوتی ہے' اس تخویف کا لوگوں کے رویہ پر کوئی اثر نہ ہوا لہٰذا معجزات کا صدور بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس مضمون کے دوران قصہ آدم و ابلیس بھی بیان ہوا ہے۔ اللہ نے ابلیس کو یہ اجازت دی کہ وہ ابن آدم میں سے جس کو چاہے گمراہ کرے مگر میرے صالح بندوں پر تیری دسترس نہ ہو گی۔ کیونکہ میں نے ان کو برے اثر سے محفوظ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس قصے کے ذریعہ گمراہی کے اصل اسباب لوگوں کو بتا دیے گئے' جو لوگوں کو کفر اور سرکشی پر آمادہ کرتے ہیں اور وہ اللہ کی بات پر تدبر نہیں کرتے۔

یہاں سیاق کلام انسان کو یہ تاثر دیتا ہے کہ اللہ کی جانب سے اس پر کس قدر فضل و کرم ہے لیکن اس فضل و کرم کے مقابلے میں انسان ہے کہ اللہ کا انکار کرتا ہے اور سرکشی اختیار کرتا ہے۔ اور انسان کو اللہ صرف اس وقت یاد آتا ہے جب وہ نہایت ہی اضطرابی حالت میں ہو' اگر سمندر میں کوئی مشکلات پیش آ جائیں تو انسان پھر اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے لیکن جونہی اللہ نجات دیتا ہے تو لوگ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تو انہیں سمندر اور خشکی دونوں میں پکڑ سکتا ہے۔ حالانکہ انسان کو اللہ اپنی مخلوقات کے ایک بڑے حصے پر فضیلت بخشی ہے' لیکن انسان ہے کہ شکر نہیں کرتا اور اللہ کو یاد نہیں کرتا۔

یہ سبق قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پر ختم ہوتا ہے' جب یہ لوگ وہ سب کچھ پالیں گے جو انہوں نے کمایا تھا لہذا نجات صرف اس صورت میں ہے کہ انسان اگلے جہاں کے لیے کچھ کمائی کرے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۸ تشریح آیات

۵۸ --- تا --- ۷۲

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُورًا ﴿۵۸﴾

"اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں ' یہ نوشتہ الٰہی میں لکھا ہوا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جب قیامت آئے تو اس کرۂ ارض کی چھاتی پر حیات کا نام و نشان نہ ہو ' لہٰذا قیامت سے قبل اس کرۂ ارض کی تمام زندہ چیزیں ختم ہونے والی ہیں۔ اسی طرح اس کرۂ ارض پر واقع بعض بستیوں کے لیے تباہی مقدر ہے اس لیے کہ وہ جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں اور ان جرائم کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ یہ تقدیر اللہ کے علم میں ہوتی ہے کہ ایسا ہونا ہے کیونکہ جو ہو چکا یا جو ہونے والا ہے اللہ کے علم میں دونوں برابر ہیں۔

تمام رسولوں کو معجزات دیئے گئے تھے اور یہ معجزات رسولوں کی حقانیت کی تصدیق کرتے تھے اور ان معجزات کے ذریعے لوگوں کو اس بات سے ڈرایا جاتا تھا کہ اگر انہوں نے تکذیب کی تو ان پر ہلاکت آجائے گی لیکن ان خوارق عادت معجزات کو دیکھ کر صرف ان لوگوں کو ایمان نصیب ہوا جن کے دل ایمان کے لیے تیار تھے۔ رہے وہ لوگ جن کو کفر پر اصرار تھا تو انہوں نے انکار ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی آخر الزمان کو ایسے خارق عادت معجزات نہ دیئے گئے۔

وَمَا مَنَعَنَآ أَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ إِلَّآ أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۚ وَاٰتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴿۵۹﴾

"اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ ان سے پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں (چنانچہ دیکھ لو) ثمود کو ہم نے علانیہ اونٹنی لا کر دی اور انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ ہم نشانیاں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر ڈریں"۔

اسلام کا معجزہ فقط یہ قرآن ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو زندگی کا ایک مکمل نظام عطا کرتی ہے۔ یہ کتاب انسان کے دل و دماغ اور عقل و خرد کو اپیل کرتی ہے۔ انسان کی فطرت سیمہ کو اپیل کرتی ہے۔ پھر یہ ایک زندۂ جاوید اور مسلسل معجزہ ہے' قیامت تک لوگ اسے پڑھیں گے اور ایمان لاتے رہیں گے۔ رہے خارق عادت معجزات تو وہ صرف مخصوص نسل کو اپیل کرتے ہیں' جنہوں نے انہیں دیکھا۔ بعد میں آنے والوں کے لیے وہ ایک تاریخی واقعہ بن جاتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے انبیائے سابقین کے ان معجزات کو دیکھا ان میں سے اکثریت نے ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ اللہ نے بطور نمونہ قوم ثمود کے معجزۂ ناقہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے ایک واضح معجزے کا مطالبہ کیا تھا اور یہ ناقہ ان کے طلب کردہ معجزے کے طور پر آئی تھی لیکن انہوں نے اس کے باوجود اس کے ساتھ بے انصافی کی اور اسے ہلاک کر دیا۔ اسی طرح اللہ نے یہ پوری قوم ہلاک کر دی اور معجزات کا صدور اسی لیے ہوتا ہے کہ اگر ان کے بعد بھی کوئی تسلیم نہیں کرتا تو اسے ہلاک کر دیا جائے۔

ان انسانی تجربات کا تقاضا یہ تھا کہ آخری رسالت کو خوارق عادت معجزات کی تائید کی ضرورت نہ ہو کیونکہ یہ آخری کتاب اور یہ آخری رسالت ان تمام نسلوں کے لیے ہے جو تاقیامت تک اس دنیا میں آئیں گی۔ یہ صرف ان نسلوں تک محدود نہیں ہے جن کے سامنے حضور اکرمؐ بذات خود موجود تھے کیونکہ یہ آخری رسالت عقل انسانی کے بلوغ کی رسالت ہے اور اب یہ تمام آنے والی نسلوں کی عقل و دانش سے مخاطب ہے۔ اور یہ رسالت انسان کے فہم اور ادراک کی قوتوں کا احترام کرتی ہے کیونکہ اپنے فہم و ادراک ہی کی وجہ سے انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دی گئی ہے۔

رہے وہ معجزات جن کا صدور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر ہوا' ان میں سے ایک معجزہ واقعہ اسرا اور معراج ہے' تو یہ معجزہ برائے تصدیق رسالت نہ تھا۔ یہ تو لوگوں کی فہم و فراست کی ایک آزمائش تھی۔

وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۚ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ﴿٦٠﴾

۶　ع ۸　۶

"یاد کرو اے نبیؐ" ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تیرے رب نے ان لوگوں کو گھیر رکھا ہے اور یہ جو کچھ ابھی ہم نے تمہیں دکھایا ہے' اس کو اور اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے' ہم نے ان لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا۔ ہم انہیں تنبیہ پر تنبیہ کیے جا رہے ہیں مگر ہر تنبیہ ان کی سرکشی میں اضافہ کیے جاتی ہے"۔

واقعہ اسرا کے بعد بعض وہ لوگ جو حضور اکرمؐ پر ایمان لا چکے تھے' مرتد ہو گئے اور دوسرے اہل ایمان اس واقعہ کو سن کر مزید ثابت قدم ہو گئے اور ان کے یقین میں اضافہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس رات اللہ نے اپنے بندے کو جو کچھ دکھایا' وہ لوگوں کے لیے فتنے کا موجب بنا اور یہ اہل ایمان کے لیے آزمائش تھی۔ "اللہ نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ تھا کہ لوگ آپؐ کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے

اور ان کی رسائی آپ تک نہ ہو سکے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمانوں کو بتا دیا تھا کہ ان کی رسائی ان تک نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ کو سچے خواب میں یہ بات من عند اللہ بتا دی گئی تھی اور سفر اسرا میں حضور اکرمؐ کو جو باتیں بتائی گئیں ان میں سے ایک درخت زقوم کے بارے میں تھی کہ یہ جہنمیوں کی خوراک ہوگی اور ابوجہل اور دوسرے مشرکین نے اس کی بھی تکذیب کی اور ابوجہل نے مذاق کے طور پر کہا مجھے کچھ اور مکھن دے دو' جب دیا گیا تو وہ کھجور کے ساتھ مکھن ملا کر کھاتا اور کہتا جاتا۔ کھاؤ اس زقوم کو کہ میں اس کے سوا کسی اور زقوم کو نہیں جانتا"

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خارق عادت معجزات بھی دے دیئے جاتے تو بھی وہ اس قوم پر اثر انداز نہ ہوتے 'جس طرح انبیائے سابقین کے حق میں آنے والے معجزات اور آیات لوگوں کے لیے موجب ہدایت نہ ہوئے۔ جس طرح معجزۂ اسراو معراج اور زقوم کے درخت سے ڈراوے نے ان کو ہدایت نہ بخشی اور وہ مزید سرکشی اختیار کرتے رہے اسی طرح دوسرے معجزات اگر صادر بھی ہو جاتے تو لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

اللہ نے عذاب الہٰی کے ذریعہ امت محمدیہ کی ہلاکت لکھی ہوئی نہ تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کو ایسا خارق عادت معجزہ نہیں دیا' کیونکہ اللہ کا اصول یہ تھا کہ اگر پھر بھی کوئی تکذیب کرے تو اسے ہلاک کر دیا جائے۔ رہے قریش تو ان کو اللہ نے مہلت دی اور ان کو قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح' قوم لوط اور قوم شعیب علیہم السلام کی طرح جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینکا' کیونکہ قریش کے مکذبین میں سے بیشتر لوگ بعد میں ایمان لائے اور وہ اسلام کے نامور سپاہی بنے۔ اور ان ہی میں سے بعض لوگ نہایت ہی سچے مسلمانوں میں شمار ہوئے اور قرآن کریم 'ایک کھلی کتاب کے طور پر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے ایک معجزہ ہے۔ اور آج بھی اس پر بے شمار ایسے لوگ ایمان لاتے ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عہد دیکھا ہی نہیں۔ ہزارہا افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا یا ایسے لوگوں کے شاگرد اور ساتھی اور رفیق بنے جنہوں نے قرآن مجید پڑھا اور سمجھا۔ آنے والی نسلوں کے لیے بھی 'قیامت تک' یہ ایک کھلی کتاب ہوگا اور مستقبل کے پردۂ غیب کے پیچھے ہزارہا لوگ ایسے ہیں جو اس کو پڑھ کر ہدایت لیں گے اور ان میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جو نہایت ہی پختہ مومن 'نہایت ہی صالح' اسلام کے لیے نہایت ہی مفید اور متقی ہوں گے۔

---000---

وہ سچا خواب جو رسول اللہؐ کو دکھایا گیا اور اس خواب کے ذریعے رسول اللہؐ کو جو علوم عطا ہوئے اور جو ملعون درخت رسول اللہؐ کو دکھایا گیا جو شیاطین کے متبعین کی خوراک ہو گا۔ اس کے بعد اسی مناسبت سے ابلیس ملعون کی بحث آتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس شیطان نے بنی آدم کو کس طرح چیلنج دیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ؗ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ

تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَٰنُ إِلَّا غُرُورًا ﴿٦٤﴾ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ﴿٦٥﴾

"اور یاد کرو جبکہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا: "کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" پھر بولا: "دیکھ تو سہی' کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں' بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم ہی بھرپور جزا ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے' ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا' اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس --- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں --- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا۔ اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے"۔

یہاں بتایا جاتا ہے کہ گمراہ لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ قصہ آدم و ابلیس کا یہ منظر یہاں پیش کیا جاتا ہے' تاکہ وہ لوگ جو گمراہی کے اصل اسباب معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ اسباب کیا ہیں اور یہ کہ شیطان ان کا بنیادی دشمن ہے۔ یہ ان کے جد امجد کا بھی دشمن تھا' یوں انسانوں کے ابوالآباء کا رشتہ بتا کر انہیں ڈرایا جاتا ہے کہ شیطان ان کا جدی دشمن ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ قَالَ ءَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا (۱۷: ۶۱) "اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا: "میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے"۔ یہ کبر کی وجہ سے شیطان کے حسد کا ظہور ہے کہ وہ مٹی کو تو دیکھتا ہے' لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ اس مٹی میں اللہ نے اپنی روح پھونکی ہوئی ہے۔ یہاں ابلیس بنی آدم کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مٹی سے تخلیق کردہ یہ مخلوق بڑی آسانی سے گمراہ کی جا سکتی ہے۔ وہ بڑے غرور سے کہتا ہے:

قَالَ أَرَءَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷: ۶۲) "ذرا دیکھ تو سہی' کیا یہ اس قابل تھا کہ

تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی"۔ اس پر نظر تو ڈالو! کیا اس کو تو نے مجھ سے برتر قرار دیا' اور لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ کہا۔

لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۶۲) "اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں' بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ میں ان پر حاوی ہو جاؤں گا اور ان کو اپنی گرفت میں لے لوں گا' ان کی لگام میرے ہاتھ میں ہو گی' بلکہ یہ میری مٹھی میں ہوں گے اور جس طرح چاہوں گا ان کے معاملات میں تصرف کروں گا۔

شیطان کے ذہن میں چیلنج دیتے وقت یہ حقیقت نہ تھی کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جس طرح گمراہی کی استعداد رکھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ ہدایت اور قبولیت خیر کی استعداد بھی رکھی ہے۔ جب انسان ایسے حالات میں ہو کہ اس کا تعلق باللہ قائم ہو تو وہ بلند ہو گا اور اعلیٰ مدارج کی طرف اٹھنے والا ہو گا اور ایسے حالات میں وہ شر اور گمراہی سے بچ جائے گا' شیطان کو معلوم نہ تھا کہ یہ بلا ارادہ چلنے والے حیوانات کی طرح نہیں ہے بلکہ انسان کو قوت ارادی دی گئی ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ ارادہ اور پختہ ارادہ ہی اس مخلوق کی بڑی امتیازی خصوصیت ہے اور اس کے اندر اس مخلوق کا راز پنہاں ہے۔ اللہ کا یہ ارادہ ہو گیا کہ شر و گمراہی کے اس پیغامبر کو کھلا میدان دے دیا جائے اور جس طرح چاہے انسان کو گمراہ کرنے کی سعی کرے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (۱۷ : ۶۳)

"اللہ نے فرمایا' اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں تجھ سمیت ان کے لیے جہنم ہی بھرپور جزاء ہے"۔

جاؤ جو کرنا چاہتے ہو کرو' تمہیں اجازت ہے جس قدر لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہو کرو' اس نے ان کو بھی عقل و ارادے کا ہتھیار دے دیا ہے۔ ان کو بھی یہ قوت و اختیار حاصل ہے کہ وہ تیرے مطیع فرمان ہو جائیں یا تم سے اعراض کریں۔

فَمَنْ تَبِعَكَ (۱۷ : ۶۳) "ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا"۔ یعنی اپنی ذات کے اندر گمراہی کی استعداد کو زیادہ کرتے ہوئے اور ہدایت کی استعداد کو کمزور کرتے ہوئے' اللہ کی پکار سے اعراض کرتے ہوئے اور شیطان کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے' اس کائنات میں موجود اللہ کی تکوینی آیات و دلائل سے منہ موڑتے ہوئے اور پھر رسولوں کی دی ہوئی آیات اور معجزات سے منہ پھیرتے ہوئے۔

فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (۱۷ : ۶۳) "تو پھر جہنم تم سب کے لیے بھرپور جزاء ہے"۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ (۱۷ : ۶۴) "تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا دے' ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا"۔ یہاں شیطان کے وسائل گمراہی اور ضلالت کو مجسم طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ کس طرح شیطان انسانوں کے دل' ان کے شعور اور ان کی عقل پر تسلط اختیار کر لیتا ہے۔ گویا آدم و ابلیس کے درمیان کھلی جنگ ہے۔ ہمہ گیر جنگ ہے۔ اس

میں آواز' گھوڑے اور ٹینک پیادے اور تمام دوسرے وسائل شیطان استعمال کرتا ہے جیسے کہ تمام روایتی جنگوں کے درمیان ہر قسم کے ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ آوازیں بھی دی جاتیں اور آوازوں اور مبارزت کی وجہ سے دشمن کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ استدراج اور کیموفلاج سے کام لیا جاتا ہے۔ جنگی چالیں چلی جاتی ہیں' پہلے کسی دشمن کو کھلے میدان میں لایا جاتا ہے' پھر اس پر وار کیا جاتا ہے یا گھیر لیا جاتا ہے۔

وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ (۱۷: ۶۴) "مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا"۔ جاہلانہ بت پرستی کے اندر یہ شرکت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اپنے بنائے ہوئے بتوں اور الہوں کے لیے اہل جاہلیت اپنے اموال میں سے حصے مقرر کرتے تھے۔ یہ تمام حصے گویا شیطان کے تھے۔ اولاد میں شیطان کی حصہ داری یوں تھی کہ اولاد میں سے بعض کو وہ ان الہوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے تھے جو درحقیقت شیطان کے ہو جاتے تھے۔ مثلاً عبداللات اور عبدمناۃ اور بعض اوقات وہ براہ راست شیطان کا حصہ کرتے تھے مثلاً عبدالحارث یعنی شیطان کا بندہ۔

اسی طرح وہ تمام دولت جو حرام ذرائع سے آتی تھی یا جو حرام طریقوں میں صرف ہوتی تھی' بدکاریوں اور گنہ گاریوں کی راہ میں جو لٹائی جاتی تھی۔ حرام اولاد بھی شرکت شیطان کا ایک نمونہ ہے۔ یہاں مراد عمومی شرکت ہے۔ ذکر صرف مال اور اولاد کا ہوا ہے اس لیے کہ مال اور اولاد معیشت کے بنیادی فیکٹر ہیں۔

ابلیس کو بنی آدم کے گمراہ کرنے میں ہر قسم کے وسائل استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ یعنی ایسے وعدے جو پورے نہ کیے جاسکیں۔

وَعِدْهُمْ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۷: ۶۴) "اور ان کو وعدوں کے جال میں پھنسا دے اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں"۔ مثلاً یہ کہ اگر تم نے میری راہ اپنائی تو تم پر کوئی عذاب نہ ہو گا' تم سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور یہ کہ حرام ذرائع سے ہر قسم کا مال تمہارے پاس جمع ہو گا۔ تم دنیا میں غالب اور کامیاب رہو گے اور ناپاک ذرائع آمدنی اور نجس طرز معیشت کے تمام دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے۔

شیطان کا سب سے بڑا جھوٹا وعدہ یہ ہوتا ہے کہ گناہوں اور خطاکاریوں کے بعد تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ یہ وہ سوراخ ہے' جس کے ذریعے شیطان ہر دل میں داخل ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے کمزور لوگوں کے دلوں میں جو گناہوں اور خطاکاریوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے یا ایسے لوگوں کے دلوں میں جو ارتکاب معصیت میں بے باک ہوتے ہیں اور انہیں قابل فخر و عزت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ وہ یوں چاپلوسی اختیار کرتا ہے کہ بھائی اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ اسے اس بات میں دلچسپی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کو سزا دے۔

شیطان! تم جاؤ تمہیں اجازت ہے کہ جو لوگ تمہاری طرف میلان رکھتے ہیں ان کو پھانسو لیکن میرے بعض بندے ایسے بھی ہوں گے جن پر تمہارے داؤ نہیں چلیں گے کیونکہ وہ ایسے قلعوں میں محفوظ ہوں گے جو تمہارے اور تمہاری افواج کی دسترس سے دور ہوں گے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (۱۷: ۶۵) "یقیناً میرے

بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہو گا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے"۔ جب دل اللہ کے ساتھ جڑ جائیں گے' اللہ کی بندگی میں مشغول ہوں گے' جب انسان ایسی رسی تھام لیں گے جو مضبوط ہو گی اور جو ٹوٹنے والی نہ ہو گی۔ جب عالم بالا کی روح ان میں سرایت کر جائے گی تو اس وقت شیطان کی قوت کچھ کام نہ کرے گی۔ یہ دل محفوظ ہوں گے۔ ایسی روحیں اللہ کے نور سے منور ہوں گی اور ایسے لوگوں کا وکیل تمہارا رب ہو گا اور توکل اور بھروسے کے لیے وہ قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ وہ بڑا ناصر اور مددگار ہے اور شیطان سے وہی بچانے والا ہے۔

یوں شیطان اپنے وعدے اور اپنے چیلنج کو پورا کرنے میں لگ گیا' بندوں کو ذلیل اور گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اللہ کے بندوں اور عباد الرحمن کے قریب بھی وہ نہ بھٹک سکا' کیونکہ ان پر اس کی ایک نہیں چلتی۔

--- ۰۰۰ ---

یہ ہے وہ شیطانی منصوبہ جو اس نے انسانوں کے لیے علی الاعلان تیار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ اس قدر سادہ لوح ہیں کہ شیطان کی اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ اس کی باتوں پر کان دھرتے ہیں۔ اللہ کی آواز اور پیغمبروں کی پکار پر کان نہیں دھرتے۔ حالانکہ اللہ ان کے لیے کریم و رحیم ہے۔ اور ان کو صحیح راہ بتلاتا ہے۔ ان کے لیے معیشت کے وسائل اللہ نے پیدا کیے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو مشکلات اور کربناک حالات میں ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اور ایسے حالات میں جب کہ انسان کسی دنیاوی مدد سے مایوس ہوتا ہے' اللہ ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٦٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ﴿٦٧﴾

"تمہارا (حقیقی) رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں' مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے"۔

یہاں قرآن کریم ایک عجیب منظر کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک کشتی ہے جو گہرے سمندروں میں چلتی ہے۔ اس سفر میں بعض نہایت ہی کربناک مناظر آتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک منظر ہمارے سامنے ہے۔ سمندر کی گہرائیوں اور تلاطم میں انسان کے اندر کسی فوق الفطرت ہستی کا شعور بہت ہی پیدا ہوتا ہے۔ سمندر کی تاریکیوں اور پہنائیوں میں جہاز لکڑی کا یا دھات کا ہو ایک چھوٹا سا نکتہ ہوتا ہے۔ جو سمندر کی پہاڑ جیسی لہروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ موجیں اور طوفان اسے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دھکیلتے چلے جاتے ہیں۔ لوگ مارے خوف کے اس نکتے جیسے چھوٹے سے جہاز سے چمٹے ہوتے ہیں۔

یہ وہ منظر ہے جس کا گہرا احساس ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس نے کبھی بحری سفر کیا ہو اور اسے ایسے لمحات پیش آئے ہوں۔ دل خشک اور سانس رکی ہوئی ہوتی ہے اور ہر جھٹکے اور ہر زیروبم سے دل بیٹھتے جاتے ہیں۔ چھوٹا جہاز ہو یا بڑا سب میں ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ نہایت ہی بڑے بڑے بحری جہاز بھی بعض اوقات یوں نظر آتے ہیں جس طرح ایک نہایت ہی سخت طوفان باد و باراں میں ایک پرندے کا پر۔

اس منظر کی تعبیر نہایت ہی حساس انداز سے کی گئی ہے۔ دلوں پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے اور انسان کو یہ شعور ملتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس کشتی کو چلاتا ہے اور اسے رفتار دیتا ہے تاکہ وہ جہازوں میں چلیں اور اللہ کا فضل و کرم تلاش کریں۔

اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (۱۷ : ۶۶) "بے شک وہ تمہارے حال پر بہت ہی مہربان ہے"۔ کیونکہ سمندروں میں اللہ کا رحم و کرم سب کا مطلوب ہوتا ہے اور ہر سوار رحمت ربی کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کا شعور اپنے اندر پاتا ہے۔

آپ اس کشتی رانی اور خوشگوار سفر کے دوران اچانک مشکلات اور اضطرابات سے دوچار ہوتے ہیں کشتی موجوں کے تھپیڑوں میں گھری ہوتی ہے۔ وہ اس قدر ہچکولے کھاتی ہے کہ اس کے سواروں کو اب اللہ کے سوا تمام باطل الٰہ بھول جاتے ہیں۔ اب اس ہمہ گیر خطرے میں وہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں اور صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔

ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۷ : ۶۷) "تو اس کے سوا تم جن جن کو پکارتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں"۔

لیکن انسان بہرحال انسان تو ہے ہی۔ جونہی یہ طوفان بیٹھتا ہے' جونہی اس کے قدم خشکی پر پڑتے ہیں' تو یہ کرب اور خوف کے وہ لمحات فوراً بھول جاتا ہے' پھر وہ اللہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اب وہ ہوا و ہوس اور خواہشات اور چاہتوں کی موجوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور سمندر کے خطرات میں اس کی حقیقی فطرت پر سے جو پردے ہٹ گئے تھے اور جو غبار چھٹ گئی تھی وہ دوبارہ آجاتی ہے۔

فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷ : ۶۷) "مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے"۔ مگر صرف وہ لوگ جن کے دل اللہ سے ملے ہوئے ہوں اور وہ نور ربانی سے منور ہوں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نہایت ہی موثر انداز میں ان کے شعور اور وجدان کو بیدار کرتا ہے کہ سمندر کے جن خطرات سے تم باہر نکل آئے ہو' وہ تو دوسری شکلوں میں خشکی میں بھی تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔ نیز تم لوگ دوبارہ سمندر کے سفر پر بھی تو جا سکتے ہو' مقصد یہ ہے کہ روحانی امن و سکون صرف اللہ کے ساتھ رابطے اور ذکر الٰہی ہی میں ملتا ہے۔ صرف اللہ کے جوار رحمت ہی میں سکون ملتا ہے' حقیقی سکون۔ نہ سمندر میں اور نہ خشکی میں' نہ خوشگوار سمندری سفر میں اور نہ ناقابل کنٹرول بحری امواج میں۔ نہ حصن حصین میں اور نہ محلات اور کوٹھیوں میں۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا

ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝

"اچھا، تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے، یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟ اور کیا تمہیں اس کا اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمہیں غرق کر دے اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟"

انسان جہاں ہو اور جس دور میں ہو، جس لمحے میں ہو، وہ اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جس طرح خشکی میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اسی طرح سمندر میں بھی وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوں۔ تو وہ کس طرح امن میں ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی زلزلے میں، زمین دھنس میں جائیں، کوئی آتش فشاں پھٹ پڑے یا دوسری کوئی آفت سماوی ان پر ٹوٹ پڑے۔ اگر کوئی آتش فشاں پھٹ پڑے تو ان پر گرم لاوے، گرم پانی، کیچڑ اور پتھروں کا سیلاب آ جائے، اور وہ اس طرح ہلاکت کا شکار ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی ان کے لیے ناصر و مددگار نہ رہے۔ کوئی ان کی حمایت نہ کر سکے اور کوئی انہیں بچا نہ سکے۔

پھر کیا گارنٹی ہے کہ وہ دوبارہ سفر پر نہ جائیں یا اللہ انہیں نہ بھیج دے۔ اور دوبارہ ان کو ناقابل کنٹرول موجوں کے حوالے کر دے۔ یا ایسی ہوائیں ان پر آ جائیں کہ کشتیوں اور جہازوں کو توڑ پھوڑ دیں اور ان کو ان کے کفر اور ناشکری کی وجہ سے غرق کر دے اور اگر اللہ ایسا کر دے تو اس سے پھر کون ہے پوچھنے والا۔ کیا یہ لوگ کوئی دادرسی کی جگہ پاتے ہیں؟

خبردار، یہ صریح غفلت ہے کہ لوگ اپنے رب سے منہ پھیر لیں اور پھر مامون ہو کر بیٹھ جائیں کہ ان پر کوئی عذاب نہ آئے گا۔ حالانکہ شدید ترین مصائب میں وہ بتقاضائے فطرت رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن نارمل حالات میں وہ دوبارہ غفلت کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ گویا جو شدت اور تکلیف گزری وہ آخری تھی اور دوبارہ کوئی تکلیف ان پر آنے والی نہیں ہے۔ اور پھر خدا کا کوئی عذاب آنے والا نہیں ہے۔

--- ۰۰۰ ---

انسان کے یہ بچھن اس حقیقت کے ہوتے ہوئے ہیں کہ اسے اللہ نے اپنی مخلوق کے ایک بڑے حصے پر فضیلت دی ہے۔ سب سے پہلے تو اس کی تخلیق ایک بہترین ہیئت پر کی گئی۔ اس کا بڑا خمیر مٹی سے تیار کیا گیا اور اس کے اندر اللہ نے اپنی روح حیات پھونک دی۔ یوں اس مخلوق کے اندر مادی اور روحانی قوتیں، زمینی اور آسمانی قوتیں جمع ہو گئیں یعنی حضرت انسان کے اس ہیکل میں۔

پھر اللہ نے اس کے اندر عجیب عجیب فطری قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اور ان قوتوں ہی کی وجہ سے وہ خلافت فی الارض کے منصب کا اہل قرار پایا۔ وہ اس زمین میں تبدیلیاں کرتا ہے، اس میں تصرفات کرتا ہے، اس کو نشوونما دیتا ہے اور نئی نئی ایجادات کرتا ہے۔ اس میں وہ ترکیب کرتا ہے اور مرکبات کا تجزیہ کرتا ہے اور زندگی کی نشوونما کو کمال تک

پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔

پھر اس پوری کائنات نے 'اس انسان کا استقبال جس انداز میں کیا' وہ بھی اس کی تکریم خاص ہے۔ تمام ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ یوں ایک کائناتی محفل اور سماوی تقریب میں اسے یہ اعزاز عملاً بخشا گیا رسمی طور پر۔

پھر اس انسان کی تکریم اور عزت افزائی کا اعلان اللہ نے اپنی اس آخری کتاب میں کیا جو اللہ کی آخری کتاب ہے اور ابد الاباد تک رہنے والی ہے 'یعنی قرآن کریم میں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

ع ۱۰

"یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی"۔

وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۷: ۷۰) "اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں"۔ خشکی اور تری میں انسانی ٹرانسپورٹ کا مہیا ہونا صرف اسی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو ایک ایسی فطرت دی ہے اور ایسا نظام فطرت دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کی سہولیات کے لیے مدد و معاون ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کے نظام اور خصوصاً زمین و آسمان کی گردش اور ساخت کو انسانی حیات کے موافق نہ بناتا تو اس کے لیے یہاں زندگی گزارنا یا زندہ رہنا ہی مشکل ہوتا۔ نظام فطرت کی قوائے طبیعیہ کو دیکھا جائے تو بہ نسبت انسان کے وہ بہت 'سرکش اور پرقوت ہیں اور انسان کے لیے بحر و بر میں یہ حکمرانی ممکن نہ ہوتی۔ لیکن انسان کو اللہ نے وہ قوت دی جس کی وجہ سے اس نے اس کائنات کو مسخر کر لیا اور پھر اسے مسخر کرنے کے بعد اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اور یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل و کرم سے ہوا۔

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (۱۷: ۷۰) "اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا"۔ انسان چونکہ اپنی پوری زندگی' آغاز انسانیت سے یہاں گزار رہا ہے۔ اور دنیا کا ایک طویل عرصہ اور تاریخ گزر چکی ہے۔ اس لیے وہ روٹین میں اللہ کی عطا کردہ بے شمار پاکیزہ نعمتوں کو سرے سے شمار ہی نہیں کرتا۔ ان میں سے کسی نعمت کا احساس اسے تب ہوتا ہے جب وہ اس نعمت سے محروم ہوتا ہے۔ جب وہ محروم ہو جاتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اللہ کی کس قدر نعمت تھی جس سے وہ محروم ہو گیا اور وہ کس قدر مزے لیتا رہا ہے۔ لیکن جب یہ محرومیت دور ہو جاتی ہے تو پھر وہ بھول جاتا ہے۔ یہ سورج' ہوا' پانی' یہ صحت' یہ چلنے پھرنے کی قوت' یہ حواس' یہ عقل' یہ کھانے پینے کی چیزیں' یہ طویل و عریض کائنات جس میں وہ خلیفۃ اللہ ہے اور اس میں۔

لاتعد ولا تحصي طيبات جن سے وہ لطف اندوز ہو رہا ہے۔

وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷ : ۷۰) "اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی"۔ پہلی فضیلت تو یہ دی کہ اس عظیم کائنات کا خلیفہ اسے بنایا۔ پھر انسان کو ایسی خصوصیات بخشیں کہ وہ پوری مخلوق میں ایک ممتاز مخلوق بن گیا۔ اللہ کی تمام مخلوق میں۔

انسان کی سب سے بڑی تکریم یہ ہے کہ انسان خود اپنا ناظم اور کنٹرولر ہو۔ وہ ذمہ دار ہو اور اپنے افعال و اعمال کے نتائج بھگتے۔ کیونکہ یہی وہ بڑی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان انسان کہلایا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ آزاد ہے جو چاہے کرے اور جو بھی کرے اس کے نتائج و عواقب کا ذمہ دار ہو اور جو بوئے اسے کاٹے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دارالعمل میں وہ اللہ کا خلیفہ قرار پایا ہے۔ لہٰذا عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دارالحساب اور یوم الحساب میں وہ اپنے کئے کا ذمہ دار ہو اور اس نے جو بویا ہو' اسے کاٹے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

"پھر خیال کرو اس دن کا جب کہ ہم ہر انسانی گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ اس وقت جن لوگوں کو ان کا نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا گیا۔ وہ اپنا کارنامہ پڑھیں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام"۔

یہ ایک نیا منظر ہے ' مناظر قیامت میں سے۔ تمام لوگ میدان حشر میں ہوں گے۔ ہر جماعت کو اس کے نام و عنوان اور اس کے امام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ اگر کسی کا کوئی نبی ہو گا تو وہ ان کا امام ہو گا۔ یا دنیا میں اگر ان کا کوئی پیشوا اور مقتداء ہو گا تو اس کے ساتھ۔ امام کے سامنے ان کو ان کا نامہ اعمال تھمایا جائے گا۔ دائیں ہاتھ' جن کو اعمال نامے دیئے جا رہے ہیں وہ ان کو خوشی خوشی سے پڑھ رہے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے اعمال کا پورا پورا اجر ان کو مل رہا ہے۔ ایک فتیل (وہ دھاگہ جو گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے) کے برابر بھی ان پر ظلم نہ ہو گا۔ جس شخص نے اس دنیا میں دلائل ہدایت کے دیکھنے میں اندھے پن کا ثبوت دیا' وہ وہاں بھی اندھا ہو گا اور اپنے اعمال نامے میں کوئی خیر و ہدایت نہ دیکھ سکے گا۔ اور جزاء پھر معلوم ہے کیا ہو گی؟ سیاق کلام کے اس منظر کو اس طرح بتاتا ہے کہ جس طرح وہ شخص قیامت میں "اندھا ہو گا۔ ادھر ادھر ٹانک ٹوئیاں مار رہا ہو گا۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر اسے راہ راست پر لے جانے والا نہ ہو گا۔ نہ کوئی ایسا ذریعہ ہو گا۔ جس کی وجہ سے وہ راہ معلوم کر سکے۔ بس اس شخص کو اس منظر میں یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ادھر ادھر پھر رہا ہے۔ آگے قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود سوچ لے کہ ایسے شخص کا انجام کیا ہوا یا ہو گا؟

--- ○○○ ---

درس نمبر ۱۲۹ ایک نظر میں

سورہ اسرا کا یہ آخری سبق بھی اس سورت کے بنیادی محور کے ارد گرد گھوم رہا ہے۔ یعنی رسول اللہ کی ذات اور ان کی قوم کا ان کے بارے میں موقف۔ قرآن اور اس کی خصوصیات۔ یہ اس سورت کا بھی اور اس سبق کا بھی اہم موضوع ہے۔

اس سبق کا آغاز ان مساعی پر تبصرے سے ہوتا جو مشرکین نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ ؐ کے عقائد و اعمال میں بعض سے ہٹانے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ پھر یہ کہ وہ آپ کو مکہ سے نکالنے کے سلسلے میں جو منصوبے بنا رہے تھے اور آپ ؐ کو کمزور کر کے اور آپ ؐ کے حامیوں کو کم کر کے وہ جو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کو ان کے ان ارادوں میں ناکام کر دیا۔ اور اللہ نے آپ ؐ کو ان کے فتنوں سے بچا لیا۔ کیونکہ اللہ کے علم میں یہ بات تحریر تھی کہ اہل مکہ کے لیے ابھی تک مہلت موجود ہے۔ اور ان کے لیے اللہ کے فیصلے میں ایسی تباہی نہ تھی جیسی امم سابقہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ اگر وہ رسول اللہ کو نکالتے یا ایسا اللہ نے مقدر کیا ہوتا تو پھر ان پر بھی وہ عذاب نازل ہوتا جو امم سابقہ پر ہوا کیونکہ اللہ کی سنت نبیوں اور ان کی امتوں کے سلسلے میں ایک ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ؐ اپنی راہ پر چلتے رہیں، نماز پڑھیں، قرآن کی تلاوت فرمائیں۔ اور دعا کریں کہ اللہ آپ کو جہاں بھی لے جائے سچائی کے ساتھ لے جائے اور جہاں سے بھی نکالے سچائی کے ساتھ نکالے اور آپ کے لیے ایک ایسی حکومتی قوت فراہم کرے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد کے حصول کے لیے آپ ؐ کی نصرت کرے۔ اور وہ حکومت یہ اعلان کر دے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا اور زائل ہو گیا اور مغلوب ہو گیا۔ پس یہ ہے اللہ کے ساتھ رابطہ اور یہ ہے وہ زبردست ہتھیار جو آپ ؐ کو فتنوں سے بچا سکتا ہے اور جو آپ ؐ کے لیے ایسی قوت بن سکتا ہے جو آپ ؐ کی نصرت کرے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ قرآن ایک شفا ہے اور ان لوگوں کے لیے رحمت کا باعث ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جو اس کی تکذیب کرتے ہیں وہ ان کے لیے باعث عذاب اور مصیبت ہے۔ دنیا میں بھی وہ اس کی وجہ سے مصیبت میں رہیں گے اور اس سے روگردانی کی وجہ سے آخرت میں بھی واصل جہنم ہوں گے۔

اسی مضمون کی مناسبت سے یہ بتایا جاتا ہے کہ رحمت کی حالت میں اور عذاب کی حالت میں انسان کے شب و روز کیسے ہوتے ہیں۔ جب اس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے تو وہ متکبر اور حق سے منہ موڑنے والا بن جاتا ہے اور جب وہ گرفتار مصیبت ہوتا ہے تو نہایت ہی مایوس اور شکستہ دل ہوتا ہے اور اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے طریق کار کے مطابق زندگی اختیار کرتا ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں جزاء و سزا بھی اس کے رویہ کے مطابق ہو گی لہذا اسے اپنے رویے کا تعین سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اپنے علمی کمال اور خصوصیت کے باوجود انسان کا علم بہت ہی قلیل ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ روح کے بارے میں سوالات کرتے تھے' حالانکہ روح اللہ کے غیوب میں سے ایک غیب ہے' انسانی قوائے مدرکہ میں ابھی اس کے ادراک کی قوت نہیں ہے۔ یقینی علم وہی ہے جو اللہ نے رسول اللہؐ پر نازل کیا ہے۔ یہ اللہ کا رسول اللہ پر بہت ہی بڑا فضل ہے اور اگر اللہ اپنے اس فضل کو واپس لے لے تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ کا رحم و کرم ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا۔

پھر کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن ایک کتاب معجز ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے کوئی بھی ایسی کتاب پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں' اور ایک دوسرے کی امداد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں دلائل ہدایت کو مختلف اسالیب سے پھیر پھیر کر بیان کیا ہے تاکہ ہر معیار علم و دانش کے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن تعجب ہے کہ کفار قریش نے اسے کافی نہ سمجھا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مادی معجزات طلب کرنے لگے مثلاً زمین سے چشمے نکالنا' یا یہ کہ آپؐ کے لیے کوئی بہت ہی قیمتی مکان ہو' پھر ان کی ہٹ دھرمی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایسے مطالبات کرنا شروع کر دیئے جو انسانی خصائص کے خلاف تھے' مثلاً یہ کہ آپؐ آسمان میں چڑھ جائیں۔ اور یہ واقعہ ان لوگوں کے سامنے ہو' اس کے بعد آپ ایک لکھی ہوئی تحریر لے کر آئیں جسے وہ پڑھ سکیں یا یہ کہ آسمان کا ایک ٹکڑا ان پر گرا دیں بلکہ اس سے بڑھ کر انہوں نے کفر و ہٹ دھرمی کی حدیں پار کرتے ہوئے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ آپؐ فرشتوں اور خدا تعالیٰ کو سیدھے ان کے سامنے لے کر آ جائیں۔

ہٹ دھرمی پر مبنی ان کے مطالبات کا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک بنا دیئے گئے ہوتے تو بھی یہ انسانی تھڑدلے پن اور کنجوسی کا شکار ہو جاتے۔ اور ان کو یہ خوف لاحق ہو جاتا کہ کہیں خزائن رحمت ربی ختم ہی نہ ہو جائیں' لیکن یہ لوگ جو مطالبات کرتے ہیں اس میدان میں یہ بہت ہی سخی ہیں' کسی حد تک رکتے ہی نہیں اور ایک سے ایک بڑا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ان کے ان بے جا مطالبات کی بحث ہی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کیسے کیسے خارق عادت معجزات دیئے تھے لیکن اس کے باوجود بھی فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ تو اللہ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا۔ جس طرح اللہ کی سنت ہے کہ وہ مکذبین کو ہلاک فرماتا ہے۔

رہا قرآن مجید تو وہ تو باقی رہنے والا اور برحق معجزہ ہے۔ اس کا نزول متفرق طور پر ہوا ہے۔ امت کی ضرورت اور حاجت کے مطابق یہ وقتاً فوقتاً نازل ہوا ہے۔ امم سابقہ کے اہل علم بھی جانتے ہیں کہ یہ کتاب 'کتاب حق' ہے۔ وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور بہت ہی ڈرتے ہیں اور ایمان لاکر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

سورت کا خاتمہ اس مضمون اور ہدایت پر ہوتا ہے کہ رسول اللہ اللہ کی بندگی کریں۔ صرف اللہ کی بندگی اور اللہ کی حمد و ثنا کریں۔ جس طرح سورت کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہوا تھا یعنی اللہ کی پاکی اور تسبیح کے ساتھ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۹ تشریح آیات

۷۳ ـــ تا ـــ ۱۱۱

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝

۸ ۔ ع ۷ ۔ ۸

"اے نبی" ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ و۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے۔ اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا' پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔ اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں۔ لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کوششوں کا ذکر فرماتے ہیں جو مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے موقف سے ہٹانے کے سلسلے میں کرتے تھے۔ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ حضور' قرآن میں کچھ تبدیلیاں کر دیں اور ان کے خیال میں جو بعض بہت سخت باتیں تھیں' ان کو بدل کر دوسری باتیں لے آئیں' اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اللہ پر افتراء ہوتی' لیکن ایسا کیسے ممکن

تھا 'کیونکہ آپ صادق و امین تھے۔

یہ کوشش انہوں نے مختلف تجاویز دے کر کی مثلاً ایک تجویز انہوں نے یہ دی کہ وہ حضور اکرمؐ کے اللہ کی بندگی کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ حضورؐ ان کے الہوں پر تنقید چھوڑ دیں۔ نیز ان کے آباء و اجداد جو کچھ کرتے رہے' ان کو بھی برا بھلا نہ کہیں' بعض لوگوں نے یہ کہا کہ وہ اس بات کے لیے تب تیار ہوں گے کہ جب وہ ان کے علاقے کو بھی اسی طرح حرام قرار دے دیں جس طرح بیت اللہ حرام ہے۔ بعض اکابرین مکہ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ آپؐ ہمارے لیے ایک خاص مجلس مقرر کر دیں اور فقراء کے لیے ایک الگ مجلس وغیرہ وغیرہ۔

اس آیت میں ان کوششوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیلات نہیں دی گئیں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ اے محمدؐ 'تم پر یہ اللہ کا فضل و کرم تھا کہ تمہیں راہ حق پر ثابت قدم رکھا اور تمہیں مشرکین کے فتنوں سے بچایا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس ثابت قدمی کو واپس لے لیتا اور جو عظمت آپ کو دی ہوئی تھی' وہ کھینچ لیتا تو آپؐ ان مطالبات کو مان کر ان کی طرف جھک جاتے اور اس طرح یہ کفار آپؐ کو دوست بنا لیتے اور پھر آپ کے اس جھکنے کی سزا آپ کو ملتی۔ اور پھر یہ عذاب دوسرے عام لوگوں کے مقابلے میں اس زندگی اور قیامت دونوں میں دوچند ہوتا اور پھر یہ لوگ آپ کی کوئی نصرت اور مدد بھی نہ کر سکتے۔

یہ کوششیں اور سازشیں 'جن سے اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بچایا' ہر دور کے کبراء' داعیان حق کو پھسلانے کی خاطر کرتے رہے۔ مثلاً وہ داعیان حق کو اپنے موقف سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ دعوت اسلامی کی سختی میں قدرے نرمی کر دی جائے اور اس سیدھے راستے میں ٹیڑھ پن پیدا کر دی جائے۔

کبرائے وقت ہمیشہ درمیانی درجے کی راہ تلاش کرتے رہے ہیں اور اہل حق کو معاونت کی نیز بڑے بڑے مفادات کی پیشکشیں کرتے رہے ہیں اور راہ حق سے بھٹکانے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ بعض داعیان حق معاملے کو معمولی سمجھتے ہوئے اپنی دعوت میں تبدیلی کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کبراء اور اہالیان حکومت ایسے داعیان حق سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ اپنی دعوت کو بالکل چھوڑ دیں۔ البتہ وہ اس قدر غیر محسوس اور معمولی تبدیلیوں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کے نتیجے میں دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ گزارہ کر سکیں۔ شیطان بعض داعیان حق کو اس نکتے پر پھسلا دیتا ہے اور داعیان حق یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت اسلامی کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ کوئی برسراقتدار بڑا آدمی دعوت اسلامی کا حامی بن جائے۔ اگرچہ اس سلسلے میں انہیں اپنے موقف میں بعض تبدیلیاں لانی کیوں نہ پڑیں۔

لیکن نکتہ آغاز سے جب راہ حق سے ایک معمولی سے انحراف کا آغاز کیا جائے تو راستے کی انتہا میں جا کر وہ انحراف بہت بعید پیدا کر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص آغاز دعوت میں اس کے کسی معمولی سے جزء میں بھی کمزوری دکھاتا ہے اگرچہ یہ بہت ہی معمولی جزءیوں ہو یا کسی نسبتاً ہی جزئی مسئلہ سے غفلت برتی جائے اور چشم پوشی کی جائے تو پھر داعی کے بس میں یہ بات نہیں رہتی کہ وہ کسی حد پر جا کر رکے کیونکہ جب ایک آدمی ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر وہ ہتھیار ڈالتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور وہ ایک کے بعد دوسری پسپائی اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے پوری دعوت کو قبول کیا ہے۔ اور مکمل اسلامی نظام کے قیام کی دعوت ہماری دعوت ہے۔ اس لیے جو شخص بھی اسلامی نظام کے کسی جزء کو نظرانداز کرتا ہے اگرچہ وہ بہت ہی چھوٹا اور جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو' اور جو

شخص دعوت اسلامی کے کسی بھی چھوٹے مسئلہ کے بارے میں خاموشی اختیار کرتا ہے وہ دعوت اسلامی پر درحقیقت مومن نہیں ہے۔اس لیے کہ ایک مومن کی نظر میں دعوت اسلامی کا ہر جزء اہم ہوتا ہے۔اسلامی نظام کے اجزاء میں سے کوئی جزء فاضل و مفضول نہیں ہے۔اس میں ضروری اور غیر ضروری کچھ بھی نہیں۔اس میں کوئی ایک جزء بھی ایسا نہیں ہے جس سے انسان بری الذمہ قرار دیا جاسکے۔اسلامی نظام ایک کل ہے' اگر اس میں سے ایک جزء بھی غائب کر دیا جائے تو تمام اجزاء بے مقصد ہو جاتے ہیں۔جس طرح کوئی دی ترکیب کسی نسخے اور فارمولے سے ایک جزء غائب ہو جانے تو تمام دوسرے اجزاء کے خواص کام نہیں کرتے۔

اہل اقتدار کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کے اجزاء کو ایک ایک کر کے' داعیان نظام اسلامی سے ترک کراتے ہیں۔جب اہل حق کسی ایک جزء پر مسالمت اور صلح کرتے ہیں تو ان کی پوزیشن ختم ہو جاتی ہے۔اور اہل اقتدار اور ڈکٹیٹر پھر ایک ایک بات پر سودا بازی کی کوشش کرتے ہیں اور آخر کار وہ اپنی تمام شرائط منوا لیتے ہیں اور دعوت اسلامی کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یہ کہ برسر اقتدار (اور بااثر) لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنی دعوت کے کسی معمولی جزء سے چشم پوشی کرنا' درحقیقت شکست خوردگی ہے۔روحانی اور اخلاقی شکست کو تسلیم کرنا ہے۔اور یہ برسر اقتدار اور بااثر لوگوں پر اعتماد کرنا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کی حمایت کریں گے۔حالانکہ ایک سچا مومن اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں صرف اللہ پر اعتماد کرتا ہے' صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔لیکن جب داعیوں کے قلب و نظر میں شکست نے راہ پالی تو پھر یہ شکست شکست ہی ہوگی اور کسی صورت میں بھی اسے فتح سے نہ بدلا جاسکے گا۔

اللہ کا یہ رسول اللہ پر بہت بڑا احسان تھا کہ اللہ نے حضورؐ کو اسلامی نظام حیات اور ان تمام امور پر ثابت قدم کر دیا تھا جو آپ کی طرف وحی ہوتے تھے۔اور مشرکین نیز مشرکانہ معاشرے کے تمام فتنوں سے اللہ نے آپؐ کو بچا لیا تھا۔اور آپؐ کو اس قدر ثابت قدمی عطا کر دی تھی کہ آپؐ کسی دینی معاملے میں ان کی طرف نہ جھکتے تھے۔اگرچہ وہ معمولی سا کیوں نہ ہوتا اور دین کے معاملے میں مداہنت کے عذاب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے بچا لیا' جو دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس سے دوچند ہوتا ہے اور دنیا میں یوں کہ ایسے داعیوں کو اللہ کی معاونت اور نصرت حاصل نہیں رہتی۔

جب مشرکین اس کوشش میں ناکام ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' بعض قرآنی ہدایات کو چھوڑ دیں یا بدل دیں اور ان کی یہ سازش کامیاب نہ ہوئی تو انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ سے نکال دیں لیکن وہ آپؐ کو نکالنے میں بھی کامیاب نہ ہوئے تو اللہ نے بذریعہ وحی حضورؐ کو حکم دیا کہ آپؐ خود مہاجر الی اللہ بن کر مدینہ چلے جائیں کیونکہ اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اہل قریش کو ہلاک نہ کیا جائے۔اور اگر وہ زبردستی رسول اللہؐ کو نکال دیتے یا آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیتے تو ان پر تباہی ایک عذاب کی صورت میں نازل ہو جاتی۔اور وہ نیست و نابود ہو جاتے'

وَ اِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۷:۷۶) "اگر وہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے"۔کیونکہ یہ اللہ کی جاری و ساری سنت ہے۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (۱۷:۷۷) "یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنھیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ اٹل قانون بنایا ہے کہ جو قوم رسول کو ملک بدر کر دیتی ہے اللہ اسے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ کیونکہ رسولوں کا ملک بدر کرنا اس قدر بڑا جرم ہے کہ اسے سرزنش کے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اللہ کی اس کائنات کو اس کے اٹل قوانین اور سنن چلا رہے ہیں اور لوگوں کے انفرادی اعمال کا اس میں کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ یہ کائنات محض اتفاقات کے مطابق نہیں چل رہی ہے کہ کچھ واقعات ہو جائیں اور گزر جائیں اور یہ کائنات یونہی چل رہی ہو۔ بلکہ اس کائنات کو اللہ کے اٹل قوانین کنٹرول کرتے ہیں۔ چونکہ عالم بالا میں، بعض حکمتوں کی بنا پر یہ طے تھا کہ قریش کو ہلاک اور نیست و نابود نہیں کرنا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو طبیعی خوارق عادت معجزات نہیں دیے اور نہ قریش کو ہمت دی کہ وہ رسول اللہ کو زبردستی یا حالات سے مجبور کر کے مکہ سے نکال دیں بلکہ بذریعہ وحی حکم دیا کہ آپ اس آبادی کو خود ہی چھوڑ دیں۔ یوں اللہ کی سنت جاری و ساری رہی۔

---()()()---

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اللہ سے لو لگائے رکھیں، اللہ سے نصرت اور معاونت طلب کرتے رہیں اور جس راہ کو آپ نے اپنایا ہے اس پر چلتے رہیں۔ حق کا بول بالا ہو گا اور باطل مغلوب اور زائل ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ﴿۷۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴿۸۱﴾ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۙ وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

"نماز قائم کرو غروب آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر

مشہود ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو یہ تمہارے لیے نفل ہے' بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے۔ اور دعا کرو کہ پروردگار' مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ اور اعلان کر دو کہ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا' باطل تو مٹنے ہی والا ہے"۔ ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے' مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا"۔

دُلُوْكِ الشَّمْسِ سے مراد ہے سورج کا غروب کی طرف مائل ہونا یعنی غروب آفتاب سے لے کر اندھیرے تک۔ یہ حکم خاص نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے۔ جہاں تک پانچ فرض نمازوں کا تعلق ہے تو ان کے اپنے اوقات ہیں اور تواتر سے احادیث رسول کے ذریعہ ثابت ہیں۔ نیز آپ کی عملی سنت بھی متواتر ہے۔ بعض نے دلوک الشمس سے مراد زوال آفتاب لیا ہے یعنی آسمان کے درمیان سے آفتاب کا گزر جانا اور غسق الليل کی تفسیر بعض لوگوں نے اول لیل سے کی ہے۔ اور قرآن الفجر سے مراد صبح کی نماز کی گئی ہے۔ اور یوں اس آیت سے زوال آفتاب سے رات کے اندھیروں تک۔ دُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ (۱۷ : ۷۸) سے ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں لی گئی ہیں اور تہجد کا حکم حضور اکرمؐ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اور یہ آپؐ کے لیے نفل یعنی زائد حکم ہے۔ لیکن ہماری رائے پہلی تفسیر ہی کی طرف جاتی ہے۔ یعنی اس آیت کے تمام احکام رسول اللہ کے ساتھ مختص ہیں اور پانچ نمازوں کے اوقات احادیث متواترہ اور سنت عملیہ متواترہ سے ثابت ہیں۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰي غَسَقِ الَّيْلِ (۱۷ : ۷۸) "یعنی نماز قائم کرو جب سورج غروب کی طرف جھکنے لگے اور رات آنے لگے اور تاریکیاں چھانے لگیں"۔ اور صبح کے وقت کا قرآن پڑھو۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۱۷ : ۷۸) "اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے"۔ ان دونوں اوقات کی اپنی خصوصیات بھی ہیں۔ دن کا جانا اور شب کا آنا یا رات کا جانا اور دن کا آنا' نفس انسانی پر دونوں اوقات گہری تاثیر چھوڑتے ہیں۔ جب رات آتی ہے تو اس میں تاریکیاں آگے بڑھتی ہیں اور جب دن نمودار ہوتا ہے تو روشنیاں آگے بڑھتی ہیں۔ دونوں اوقات میں قلب اور فکر و نظر پر مخصوص اثرات ہوتے ہیں۔ دونوں اوقات میں انسانی دماغ اس کائناتی نظام پر غور و فکر کرنے کے لیے مائل ہوتا ہے۔ انسان اس ناموس فطرت کے بارے میں سوچتا ہے کہ یہ ناموس چل رہا ہے اور اٹل ہے۔ نماز کی طرح صبح کے وقت قرآن کے مطالعے کا بھی نفس انسانی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ذہن میں تازگی آجاتی ہے۔ نہایت سکون اور ٹھنڈے دل سے انسان سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔ روشنی آرہی ہوتی ہے' زندگی کی نبض متحرک ہو جاتی ہے اور زندگی بھرپور طور پر حرکت میں آجاتی ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (۱۷ : ۷۹) "اور رات کو قرآن کے ساتھ تہجد پڑھو یہ تمہارے لیے نفل ہے"۔ تہجد سے مراد پچھلی رات کی وہ نماز ہے جو رات کے اول حصے میں سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جاتی ہے اور بہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے یعنی رات کو قرآن کے ساتھ تہجد پڑھو کیونکہ قرآن مجید نماز کی روح ہے اور نماز کا بنیادی عنصر ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۱۷: ۷۹) "بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے" ۔یعنی نماز کی پابندی، قرآن فجر کی تلاوت اور تہجد گزاری اور اللہ کے ساتھ اس پختہ اور دائمی تعلق کی وجہ سے ۔کیونکہ مقام محمود تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے ۔جب مقام محمود تک پہنچنے کے لیے اللہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور برگزیدہ رسول کو حکم دیتا ہے کہ وہ نماز پڑھیں، قرآن کی تلاوت کریں اور تہجد پر عمل پیرا ہیں تو دوسرے لوگ ان عبادات کے زیادہ محتاج ہیں اور وہ اپنے لیے مقرر مراتب تک تب ہی پہنچ سکتے ہیں جب وہ ان عبادات پر اچھی طرح عمل پیرا ہوں ۔یہی صحیح راستہ اور یہی تحریک اسلامی کے کارکنوں کا زاد راہ ہے ۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا (۱۷: ۸۰) "اور دعا کرو، کہ پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے" ۔یہ دعا ہے جو اللہ اپنے نبیؐ کو سکھاتا ہے تاکہ وہ ان الفاظ میں اللہ کو پکارے ۔اور آپؐ کے بعد آپ کی امت کو بھی معلوم ہو کہ وہ کس طرح اللہ کو پکارے اور کن معاملات میں اللہ کی طرف متوجہ ہو، سچائی کے ساتھ دخول اور سچائی کے ساتھ خروج کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میرا اول اور آخر، اور اولی اور آخری کے مابین تمام مراحل میں مجھے سچائی پر قائم رکھ ۔اور یہاں سچائی کی دعا کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ جس مرحلے میں یہ آیات آئیں اس وقت کفار یہ مطالبہ کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی بعض سخت باتیں بدل کر اپنی طرف سے نرم باتیں اس میں داخل کر دیں اور ظاہر ہے کہ یہ اللہ پر افتراء ہوتا۔ نیز سچائی کا اپنا پرتو اور رنگ ہوتا ہے، مثلاً ثابت قدمی، اطمینان، پاکیزگی معاملات، اخلاص وغیرہ سب کے سب سچائی کے رنگ ہیں۔

وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا (۱۷: ۸۰) "اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے" ۔ایک قوت، ہیبت مجھے حاصل ہو جائے، جس کی وجہ میں زمین کے اقتدار پر قابض ہو جاؤں اور مشرکین کی قوت کو مغلوب کر لوں۔

مِنْ لَّدُنْكَ (۱۷: ۸۰) یعنی (اپنی طرف سے) میں یہ رنگ ہے کہ اللہ کے ساتھ حضور اکرمؐ کا گہرا قرب ہے ۔اور آپؐ صرف اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور صرف اس سے مدد کے طلبگار ہیں اور اللہ ہی حمایت و حفاظت میں اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

کوئی بھی داعی صرف اللہ ہی سے اقتدار کا طالب ہوتا ہے اور ایک داعی سے لوگ صرف اس صورت میں خوف کھاتے ہیں کہ وہ الہی قوت سے مسلح ہو ۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی حاکم اور صاحب اقتدار نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی داعی کی حمایت پر کمربستہ ہو جائے بلکہ کسی دنیاوی قوت سے پہلے داعی کو الہی قوت سے لیس ہونا ضروری ہے ۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی تحریک اور دعوت بعض اوقات اہل اقتدار اور صاحب قوت لوگوں کے دلوں کو فتح کر

لیتی ہے ' اور وہ دعوت کے سپاہی بن جاتے ہیں اور دعوت کی خدمت کرتے ہیں اور فلاح پاتے ہیں ۔ لیکن اگر دعوت اور تحریک کسی بادشاہ یا صاحب اقتدار کے تابع ہو اور اس کی سپہ گری کا کام کرے اور کسی شخص کی خدمت گار ہو تو وہ دعوت کبھی کامیاب نہیں ہوتی ۔ دعوت اسلامی تو اسلامی ہے ' اور اسے اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے ۔ اور اہل اقتدار اور ذی جاہ لوگوں کو اس کا خادم ہونا چاہیے ۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱) " اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا ' باطل تو مٹنے ہی والا ہے " ۔ یعنی اللہ کی جانب سے جو اقتدار نبی اور داعیوں کو ملتا ہے اس کی بدولت ۔ اے نبی ' اعلان کر دو کہ یہ اقتدار اب آ ہی گیا اور اس کی وجہ سے باطل گویا مٹ ہی گیا کیونکہ حق اپنے اندر قوت ' سچائی اور ثبات رکھتا ہے ۔ اور باطل کے مزاج میں کمزوری اور مٹنا ہے ۔ سچائی کا مزاج یہ ہے کہ وہ زندہ رہے ' پھلے پھولے اور قائم و دائم رہے اور باطل کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ مٹ جائے ' ختم ہو جائے اور اس کا نام و نشان تک نہ رہے ۔

" باطل مٹنے والا ہے " ۔ یہ ایک الٰہی حقیقت ہے اور اللہ اسے نہایت ہی تاکیدی الفاظ میں بیان فرماتا ہے ۔ اگرچہ بظاہر باطل رائج نظر آئے ' اس کی حکومت ہو اور اس کا رعب ہو ' کیونکہ باطل پھلا اور پھولا نظر آتا ہے لیکن اس کا موٹاپا بیماری کا موٹاپا ہوتا ہے ۔ وہ چونکہ بے حقیقت ہوتا ہے اس لیے اس کے غبارے سے جلد ہی ہوا نکل جاتی ہے ۔ اور اس پر کبھی کسی قوم کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔ لیکن باطل ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر کے ان کو مرعوب کر دے اور ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے کہ وہ مستقل اور پختہ اور ایک عظیم نظام نظر آئے لیکن اس کی مثال لپی خود رو گھاس کی ہوتی ہے جو جلد ہی خشک ہو جاتی ہے ۔ جیسا کہ کسی خشک گھاس اور پھوس کو آگ لگ جائے تو یکدم شعلے آسمانوں تک پھیل جاتے ہیں لیکن جلد ہی وہ شعلے بیٹھ جاتے ہیں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں رہتا ۔ جبکہ ایک مضبوط انگارہ دھکتا رہتا ہے اور اس کی چنگاریاں دیر تک راکھ میں بھی دبی رہتی ہیں یا اس طرح کہ وہ جھاگ کی طرح ہوتا ہے ۔ یکدم پھول جاتا ہے لیکن جلدی بیٹھ جاتا ہے اور پانی جو ایک حقیقت رکھتا ہے اپنی جگہ قائم رہتا ہے ۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱) " بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے " ۔ کیونکہ باطل کے اندر باقی رہنے والے عناصر ہی نہیں ہوتے ۔ بعض خارجی عوامل ہوتے ہیں جن سے وہ وقتی طور پر فائدہ لیتا ہے ۔ اس کا وجود غیر طبیعی ہوتا ہے ۔ جب یہ خارجی عوامل ختم ہوتے ہیں اور یہ خارجی سہارے دور ہوتے ہیں یا کمزور پڑتے ہیں تو یہ دھڑام سے گرتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے ۔ جہاں تک حق اور سچائی کا تعلق ہے اس کی ذات کے اندر اس کے دوام کا سامان ہوتا ہے ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لوگوں کی خواہشات نفس سچائی کے خلاف ہوتی ہیں ۔ بعض اوقات ماحول سچائی کے خلاف ہوتا ہے ۔ اور بعض اوقات وقت کے اہل اقتدار سچائی کے خلاف ہوتے ہیں ۔ لیکن حق کا ثبات اس کا سکون و اطمینان آخر کار اسے فتح سے ہمکنار کرتا ہے اور اس کے بقاء کا ضامن ہوتا ہے اس لیے کہ یہ حق اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اللہ کا نام ہی حق ہے اور اللہ چونکہ زندہ باقی اور لازوال ہے اس لیے سچائی اور حق بھی لازوال ہے ۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱) " بے شک باطل مٹنے والا ہے " ۔ اس کے پیچھے بعض اوقات

بڑی قوت ہوتی ہے اور وقت کا اقتدار بھی اس کا حامی ہوتا ہے لیکن اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ کی قوت اور سلطنت اور اقتدار بزرگ و برتر ہے۔ جن اہل ایمان نے ایمان کا حقیقی ذائقہ چکھ لیا ہوتا ہے وہ اللہ کے وعدے کی مٹھاس اور اللہ کے اس وعدے کی سچائی کو محسوس کرتے ہیں۔ کون ہے جو اللہ سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا ہے اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچی بات کرنے والا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۷: ۸۲) "ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے"۔ یقیناً قرآن میں شفاء ہے۔ یقیناً قرآن میں رحمت الٰہی کے خزانے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں ایمان کی تازگی داخل ہو چکی ہو' ان کے دل روشن ہو چکے ہوں اور وہ قبولیت حق کے لیے کھل گئے ہوں اور وہ روح قرآن کو اپنے اندر جذب کر رہے ہوں اور ان کے دلوں میں سکون اور سکینت اور طمانیت داخل ہو چکی ہو۔

قرآن کریم تمام وسوسوں' تمام حیرانیوں' اور تمام بے چینیوں کی دوا ہے اور اس میں ان روحانی بیماریوں کی شفاء ہے۔ یہ بندے کے دل کو اللہ سے جوڑتا ہے۔ یوں اسے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اسے یہ شعور ملتا ہے کہ وہ اللہ کی حمایت میں ہے اور حالت امن و سلامتی میں ہے۔ اس طرح وہ اللہ سے راضی ہو کر راضی رہتا ہے' زندگی خوشی سے گزارتا ہے اور زندگی کے جو حالات بھی ہوں ان میں راضی رہتا ہے۔ بے چینی بھی ایک قسم کا مرض ہے' حیرانی بھی ایک مرض ہے۔ وسوسہ بھی ایک بیماری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اہل ایمان کے لیے رحمت ہے۔

اسی طرح قرآن مجید' ہوائے نفس' گندگی' لالچ' حسد اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے مقابلے میں بھی شفاء ہے۔ یہ قلبی اور روحانی بیماریاں ہیں جن کے نتیجے میں دلی بیماریاں ضعف اور تکان پیدا ہوتی ہے۔ اور انسانی روح اور دل بوسیدہ ہو کر ٹوٹ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مومنین کے لیے شفاء و رحمت ہے۔

قرآن کریم میں شعور اور فکر کی بے لگامی کا بھی علاج ہے۔ عقل و فکر کے انتشار سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ قرآن انسان کو بے فائدہ کاموں میں اپنی جسم و عقل کی قوتوں کے خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ اور مفید اور ترقی کے کاموں میں اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے آزاد چھوڑتا ہے۔ وہ انسان کے لیے ایک صحت مند اور مضبوط منہاج زندگی تجویز کرتا ہے۔ انسانی سرگرمیاں فائدہ مند اور محفوظ ہوتی ہیں اور لغزشوں اور بے راہ رویوں سے قرآن انسان کو بچاتا ہے۔ جسمانی میدان میں بھی قرآن انسان کو اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔ وہ حکم دیتا ہے کہ اپنی قوتوں کو اعتدال کے ساتھ صحت مند میدانوں میں خرچ کرو' نہ جسمانی قوتوں پر غیر ضروری پابندی ہے اور نہ ان کے استعمال میں بے راہ روی کی اجازت دی گئی ہے۔ لہذا جسمانی قوت کی بھی حفاظت کی جاتی ہے' تاکہ وہ صحت مند میدانوں میں صرف ہو۔ لہذا یہ اہل ایمان کے لیے ایک قسم کی رحمت ہے۔

پھر قرآن شریف میں ان اجتماعی بیماریوں کا بھی علاج ہے جن سے کسی سوسائٹی کے اجتماعی نظام میں خلل اور بیماری پیدا ہوتی ہے' جن سے سوسائٹی کا امن اور سلامتی تباہ ہو جاتی ہے۔ اور افراد معاشرہ کے درمیان کوئی اطمینان نہیں رہتا۔ قرآنی ہدایات پر عمل کے بعد اسلامی سوسائٹی اسلام کے اجتماعی عدل اور اجتماعی سلامتی اور امن کے زیر سایہ' نہایت ہی

اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے' لہٰذا اس مفہوم میں بھی قرآن رحمت اور شفاء ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (۱۷: ۸۲) "مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا"۔ کیونکہ ظالم اس نسخہ وشفاء سے استفادہ نہیں کرتے' جو اس قرآن کے اندر موجود ہے۔ پھر ظالم یوں بھی خسارے میں ہوتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان قرآن کے ذریعہ سربلندی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں' وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہیں اور ان کو زبردست غصہ آتا ہے' مگر بے بس ہوتے ہیں اور جہاں ان کا بس چلتا ہے وہ وہاں ظلم و ستم کا ریکارڈ قائم کر دیتے ہیں۔ پھر وہ دنیا میں مسلمانوں کے مقابلے میں مغلوب ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ خسارے میں ہیں اور آخرت میں ان کے کفر کی وجہ سے ان کو عذاب ہو گا نیز وہ جن سرکشیوں میں غرق تھے اور ان پر اصرار کرتے تھے ان کی وجہ سے انہیں سخت سزا ہو گی۔ لہٰذا اس سے بڑا اور کیا خسارہ ان کو ہو سکتا ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ ظالموں کے لیے خسارے کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ ہو گا۔

---ooo---

اور جب انسان اللہ کی رحمت اور شفاء سے محروم کر دیا جائے اور جب اسے اس کی خواہشات نفس اور سفلی جذبات اور میلانات کے حوالے کر دیا جائے۔ اگر وہ مالی لحاظ سے خوشحال ہو تو وہ مغرور' متکبر اور سرکش ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا' اللہ کو یاد نہیں کرتا' اور اگر اس پر کوئی مصیبت یا بدحالی آ جائے تو وہ اللہ کی رحمت سے مایوس اور قنوطی ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے زندگی تاریک ہی تاریک نظر آتی ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ اینٹھتا اور پیٹھ موڑ لیتا ہے' اور جب ذرا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہونے لگتا ہے"۔

زیادہ دولت مندی انسان کو سرکش اور مغرور بنا دیتی ہے۔ الا یہ کہ کوئی دولت مند یہ یقین رکھتا ہو کہ اس دولت کا عطا کرنے والا اللہ ہے اور وہ اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہو۔ لیکن اگر بدحالی آ جائے تو انسان مایوس ہو جاتا ہے اور اس پر قنوطیت چھا جاتی ہے۔ الا یہ کہ کسی کا تعلق باللہ مضبوط ہو' وہ امید کرتا ہے کہ اللہ اس کی مشکلات دور کر دے گا تو ایسا شخص اللہ کے رحم و فضل سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت اللہ کے فضل و کرم کا امیدوار اور خوش اور شاکر رہتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے۔ غرض مشکلات اور خوشحالی دونوں میں ایمان اللہ کی رحمت اور شفاء ہے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر فریق اپنی طرز زندگی پر جما ہوا ہے' اب اپنی خواہشات و روایات کے مطابق ہر شخص چلتا ہے اور ہر شخص کے طرز عمل کے بارے میں فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا۠

"اے نبیؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ "ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے' اب یہ تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ سیدھی راہ پر کون ہے"۔

یہاں نہایت ہی نرم الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے اور ہر شخص کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ اپنے رجحان' طرز عمل اور نظام زندگی کے بارے میں اچھی طرح غور کر لے' احتیاط کرے اور یہ تسلی کر لے کہ اس کا طرز عمل' نظام فکر اور نظام زندگی اسلامی ہدایات کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اسے اللہ کے راستے کی طرف لوٹ آنا چاہیے۔

---))) ---

بعض لوگ رسول اللہؐ سے پوچھتے تھے کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن قرآن کریم کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور انسانی عقل اور قوت مدرکہ ان ہدایات یا ان موضوعات کو سمجھ سکے اور سہولت کے ساتھ اپنی گرفت میں لے سکے۔ لہذا اسلام اور قرآن فکری قوت کو ان موضوعات پر ضائع نہیں کرتا جن کا انسان کو کوئی فائدہ نہیں' کوئی ضرورت نہیں یا جن موضوعات پر عقل کو رسائی حاصل نہیں ہے جب ان لوگوں نے روح کے بارے میں پوچھا تو اللہ نے سیدھا سادا جواب دیا کہ روح امرالہی ہے اور اس سلسلے میں تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝

"یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں' کہو یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے' مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے"۔

اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ عقل انسانی پر روح کا انکشاف بند کر دیا گیا ہے اور اسے روح کے میدان میں کام نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ یہاں عقل کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار اور اس حد تک محدود رہے جس تک وہ ادراک کر سکتا ہے' کیونکہ بغیر حقیقی علم و ادراک کے بے تکی باتیں کرنے سے حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ پھر عقل کی قوت کو ایسے کام میں کھپانا جس کا ادراک عقل کے لیے ممکن ہی نہ ہو' ایک بے مقصد کام ہے۔ روح درحقیقت اللہ کے غیوب میں سے ایک غیب ہے۔ اللہ کے سوا اس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہے۔ نہ اس کا ادراک کوئی کر سکتا ہے۔ اور نہ وہ وسائل انسان کو دیئے گئے ہیں بلکہ یہ ایک لاہوتی راز ہے' جو اس بشری ڈھانچے میں رکھا گیا ہے۔ اور بعض دوسری مخلوقات کو بھی دیا گیا ہے' جس کی حقیقت کو ہم نہیں جانتے۔ پھر انسان کا علم قادر مطلق کے علم کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔ اس کائنات کے اسرار و رموز اس قدر گہرے ہیں کہ انسانی عقل کے دائرہ ادراک سے ماوراء ہیں۔ انسان اس کائنات کا مدبر نہیں ہے کیونکہ انسانی قوت اور طاقت اس کائنات پر حاوی نہیں ہے انسان کو تو صرف اس قدر

قوت اور حکمت دی گئی ہے جس کے ساتھ وہ اس کرۂ ارض پر خلافت فی الارض کا وظیفہ پورا کر سکے۔ اور یہاں وہ کام کر سکے جس کے بارے میں اللہ کی مرضی ہے کہ وہ کرے اور وہ اپنا کام اپنے محدود علم کے مطابق کرے۔

انسان نے اس کرۂ ارض پر بے شمار ایجادات کی ہیں لیکن وہ آج تک روح کی حقیقت معلوم کرنے سے صاف عاجز ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ روح کیا ہے؟ کس طرح یہ روح انسانی ڈھانچے میں ڈالی جاتی ہے۔ کس طرح یہ نکل جاتی ہے یہ پہلے کہاں تھی، نکل کر کہاں جاتی ہے۔ الا یہ کہ علیم و خبیر نے اس سلسلے میں بذریعہ وحی جو علم دیا ہے وہ انسان کا ماخذ علم ہے۔

قرآن کریم میں جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ یقینی علم ہے کیونکہ وہ علیم و خبیر کے یقینی ذریعے سے آیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو انسانیت کو اس سے محروم رکھتا اور وہ پیغام ہی انسانوں کے پاس نہ بھیجتا جو اس نے بھیجا لیکن یہ اللہ کا رحم و کرم تھا کہ اس نے وحی الٰہی کے نزول کا سلسلہ شروع کیا۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝

"اور اے نبی ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعے سے تم کو عطا کیا ہے، پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی حامی نہ پاؤ گے جو اسے واپس دلا سکے۔ یہ تو جو کچھ تمہیں ملا ہے تمہارے رب کی رحمت سے ملا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے"۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اپنا احسان جتاتا ہے کہ اس نے ازراہ کرم تم پر وحی نازل کی۔ اور پھر قرآن کریم کو محفوظ رکھا۔ رسول اللہ سے زیادہ یہ احسان انسانوں پر ہے کیونکہ انسانیت پوری کی پوری اس قرآن کی بدولت رحمت اور ہدایت سے سرفراز ہے۔ اور نسلاً بعد نسل یہ سرچشمہ نور و ہدایت ضو فشاں ہے۔ جس طرح روح اللہ کے اسرار میں سے ہے اور کوئی انسان اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا، اس طرح یہ قرآن بھی اللہ کی معجزانہ صفت ہے اور کوئی انسان بلکہ تمام مخلوق بھی جمع ہو جائے تو اس کی نقل نہیں اتار سکتی۔ اور انس و جن جو ظاہری اور خفیہ مخلوقات ہیں دونوں جمع ہو کر بھی اگر سعی کریں تو قرآن جیسی کتاب ان کے لیے لانا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے سچے معاون کیوں نہ بن جائیں۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے،

چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں"۔

یہ قرآن محض عبارتوں' تراکیب اور الفاظ کا نام نہیں ہے کہ جن و انس اس کی نقل کر لیں گے۔ بلکہ یہ قرآن اللہ کی دوسری مخلوقات اور عجائب کی طرح ہے جن کی نقل کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ یہ روح کی طرح ایک امر الہی ہے۔ انسان روح کے اسرار و رموز اور حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ انسان صرف روح کے اوصاف اور آثار کو جانتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے معانی' نظریات اور اسرار کو پوری طرح انسان نہیں سمجھ سکتے کہ اس جیسی کتاب لے آئیں۔

پھر قرآن ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں انسانی فطرت کے تمام قوانین اور تمام طور طریقوں کو مد نظر رکھ کر یہ حکم تجویز کیا گیا ہے اور یہ نظام ایسا ہے کہ ہر انسانی سوسائٹی کو ہر طرح کے حالات میں راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس میں ایک فرد کے لیے بھی ہدایت ہے' ایک مختلف النوع سوسائٹی کے لیے بھی ہدایات ہیں۔ اس میں ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جو زندگی کے تمام نشیب و فراز اور زندگی کے مختلف النوع مسائل کے مکمل اور تشفی بخش حل تجویز کرتے ہیں اور ہر حل پوری طرح مکمل اور ہمہ گیر ہے۔ ان قوانین کے اندر ایسی جامعیت ہے کہ یہ مختلف النوع اور بدلتی ہوئی زندگی کے مختلف حالات میں سے ہر حال پر' اس کے قوانین منطبق ہوتے ہیں۔ خواہ یہ حالات انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے۔ کیونکہ ان قوانین کا مقنن وہ ذات ہے جو اس انسان کے فطری تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ اور انسان کی مختلف النوع ضروریات سے واقف ہے کیونکہ وہ خود انسان کا خالق ہے۔

رہے وہ قوانین اور طرز ہائے زندگی اور تنظیمات جو انسان نے وضع کیے ہیں تو ان کے اندر انسانی کمزوری کی چھاپ اس وقت بھی موجود ہوتی ہے جس وقت کوئی اسمبلی ان قوانین کو وضع کرتی ہے۔ لہٰذا یہ قوانین وقتی ہوتے ہیں بلکہ وقتی ضروریات کے لیے بھی ناکافی ہوتے ہیں اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں فرسودہ کہا جاتا ہے۔ جب حالات بدلتے ہیں تو پھر ان قوانین کے بدلنے کے لیے واویلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ جدید تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

قرآن کریم کے اعجاز کا مفہوم صرف یہ قرآن' فصیح و بلیغ عبارات اور معانی کے حسن ادا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جن و انس اس جیسی کتاب لانے سے جو عاجز رہے ہیں اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جن و انس نے آج ایسا نظام حیات تجویز نہیں کیا جو قرآن نے پیش کیا ہے جو ایک مکمل نظام زندگی ہے اور زندگی کے پورے معاملات پر محیط ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ٘ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِیْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِی السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰى

تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۟ ۹۳

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے' اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے نبی' ان سے کہو" پاک ہے میرا پروردگار" کیا میں پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں"۔

ذرا دیکھئے' یہ لوگ قرآن کریم کی اس معجزانہ شان کو نہ سمجھ سکے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے مادی معجزات اور خوارق عادت امور کے وقوع کا مطالبہ کرتے رہے۔ معمولی غور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے مطالبات کس قدر طفلانہ ہیں۔ یہ لوگ ذات باری تعالیٰ کے حق میں بھی توہین آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ مطالبہ کرتے وقت انہیں شرم نہیں آتی کہ اللہ خود ہمارے سامنے حاضر ہو جائے۔ حالانکہ قرآن مجید نے جو تعلیمات پیش کی ہیں' وہ نہایت ہی معقول انداز میں اور پھیر پھیر کر مختلف اسالیب میں اور مختلف مثالوں کی مدد سے ہر درجہ عقل و فکر کے لوگوں کے لیے سہل انداز میں پیش کی ہیں' اور یہ تعلیمات اور یہ انداز کلام ابد الاباد کے لیے مفید ہے لیکن

فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۱۷:۸۹) "مگر اکثر لوگ انکار پر ہی جمے رہے"۔ اور انہوں نے رسول اللہؐ پر ایمان لانے کو اس شرط سے مشروط کر دیا کہ آپ ہمارے لیے زمین سے چشمے نکال دیں۔ یا آسمان کا کوئی ٹکڑا ان پر عذاب بن کر گرے جس طرح آپ ہمیں ڈراتے ہیں کہ قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا یا یہ کہ اللہ اور ملائکہ ہمارے سامنے آکر حاضر ہو جائیں اور اللہ اور فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں ایسی مدافعت کریں۔ جیسی مدافعت قبائل ایک دوسرے کے لئے کرتے ہیں۔ یا یہ کہ نہایت ہی قیمتی دھاتوں سے ان کے لیے ایک محل بنے یا یہ کہ حضورؐ ان کے سامنے آسمانوں پر چڑھ جائیں اور وہ دیکھ رہے ہوں اور اس طرح واپس آئیں کہ آپؐ کے ہاتھ میں ایک کتاب ہو جسے وہ پڑھ سکیں۔ یہ تھے ان کے مطالبات۔

ان کے تصور اور قوت مدرکہ کی ناپختگی کا اظہار ان مطالبات سے ظاہر ہے۔ نیز ان مطالبات سے ان کی ہٹ دھرمی بھی اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک طرف یہ مطالبہ کرتے ہیں آپ کے پاس قیمتی دھاتوں کا بنا ہوا مکان ہونا چاہیے اور دوسری طرف سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ زمین سے آسمان کی طرف چڑھ جائیں۔ ایک طرف زمین سے چشمے نکالنے کا مطالبہ اور دوسری طرف سے فرشتوں اور خدا تعالیٰ سے یہ مطالبہ کہ وہ ان کے سامنے چلے آئیں۔ ان کے ذہن میں ان تمام باتوں کے درمیان مشترک چیز یہ ہے کہ یہ سب خارق عادت امور ہیں۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شرائط کو پورا کر دیں تب وہ ایمان لانے پر غور کر سکتے ہیں اور آپ کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں کی کند ذہنی کا حال یہ ہے کہ ان کو قرآن کی شکل میں آنے والا معجزہ نظر نہیں آتا۔ بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ نہ لفظ میں' نہ نظم و ترکیب میں' نہ اسلوب میں اور نہ معانی میں اور نہ نظام زندگی کے اعتبار سے اس جیسی کتاب لا سکے ہیں۔ ان کے حواس اور قوائے مدرکہ اس اعجاز کا ادراک تو نہیں کر سکتیں البتہ ایسے معجزات کے یہ لوگ طلبگار ہیں جن کو ان کی حواس دیکھ سکیں۔

معجزات جن کا صدور پیغمبروں کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے وہ کسی پیغمبر کی کارستانی نہیں ہوتی نہ پیغمبر کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ معجزات دکھاتا پھرے۔ یہ کام تو خداوند کریم کا ہے۔ وہ اپنی حکمت اور اسکیم کے مطابق معجزات بھی ظاہر کرتا ہے۔ نیز کسی رسول کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ وہ ان معجزات کا مطالبہ کرے۔ اگر اللہ ان کا صدور نہ چاہتا ہو' اس کائنات کی تدبیر میں اللہ کی جو حکمتیں کارفرما ہوتی ہیں ان کو جانتے ہوئے اور بارگاہ تعالیٰ میں ادب و احترام کا لحاظ کرتے ہوئے' رسولوں کی عادت اور آداب یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی قسم کے معجزے کا مطالبہ نہیں کیا کرتے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳) "اے نبیؐ ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" یہ ہے ادب رسول' جو اپنی بشریت کی حدود پر جاکر رک جاتے ہیں' رسول اپنے مقررہ فرائض منصبی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے مطالبات نہیں کرتے۔ اور اپنے فرائض کے حدود سے آگے بڑھ کر بھی کام نہیں کرتے۔

--- ○○○---

وہ بڑا شبہ جو مختلف اقوام و ملل کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قبل لاحق ہوا اور آپ کی بعثت کے بعد بھی کئی ملتوں کو لاحق ہوا اور جس کی وجہ سے ان اقوام نے رسولوں کی تصدیق نہ کی اور ان ہدایات کو تسلیم نہ کیا جو رسول لے کر آئے تھے وہ یہ تھا کہ یہ لوگ اس بات کو مستبعد سمجھتے تھے کہ کوئی رسول بشر بھی ہو سکتا ہے اور یہ کہ رسول فرشتہ نہیں ہوتا۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

"لوگوں کے سامنے جب بھی ہدایت آئی' تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا"۔

لوگوں کے درمیان یہ وہم اس لیے پھیلا کہ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ اللہ کے ہاں انسان کی انسانیت اور بشریت کی کیا قدر ہے۔ اس لیے انہوں نے اس بات کو مناسب نہ سمجھا کہ کوئی بشر اللہ کا رسول بن جائے۔ نیز انہوں نے اس کائنات کے مزاج اور فرشتوں کے مزاج اور نوعیت کے سمجھنے میں بھی غلطی کی۔ کیونکہ فرشتوں کو اللہ نے اس لیے پیدا ہی نہیں کیا کہ وہ کرۂ ارض پر بسیں اور یہاں لوگ انہیں جانیں اور پہچانیں اور وہ فرشتوں کی شکل میں ہوں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

"ان سے کہو' اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے"۔

اگر اللہ نے یہ فیصلہ کیا ہوتا کہ زمین میں فرشتے بسیں تو وہ آدمیوں کی شکل و صورت میں ہوتے کیونکہ آدمی کی شکل و صورت ایسی ہے جو اس کرۂ ارض پر سکونت کے لیے مناسب ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (۶ : ۹) "اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بناتے تو بھی وہ ایک آدمی ہی ہوتا"۔
اور اللہ تو سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اللہ نے اس کرۂ ارض کے لیے نوامیس قدرت بنائے ہیں اور ان نوامیس قدرت کے مطابق انسان کی تخلیق کی ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات کو بھی ان کے مطابق بنایا ہے۔ اور یہ طے کیا ہے کہ یہ قوانین قدرت جاری و ساری رہیں گے اور یہ کائنات ان کے مطابق چلتی رہے گی تاکہ اس کی حکمت خلق و تکوین پوری ہو لیکن افسوس ہے کہ لوگ اللہ کی حکمت تخلیق کائنات اور انسان کو نہیں سمجھتے۔
چونکہ اللہ کی حکمت یہ ہے' تو اللہ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جدل و جدال نہ کریں۔ اور تمام امور کو اللہ کے حوالے کر دیں۔ وہ دیکھ رہا ہے ان لوگوں کے معاملات میں تصرف چھوڑ دیں۔ اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے اعمال سے بھی خبردار ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

"اے نبی' ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان بس ایک اللہ کی گواہی کافی ہے' وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔
اس بات میں ایک قسم کی جھڑکی اور تہدید کا رنگ ہے۔ اللہ تو گواہ ہے لیکن اس گواہی کا انجام کیا ہو گا تو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر دیکھئے :

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ١ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا۝

"جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے' اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے سوا ایسے لوگوں کے لیے تو کوئی حامی و ناصر نہیں پا سکتا۔ ان لوگوں کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ لائیں گے' اندھے' گونگے اور بہرے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔ یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا "کیا ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا؟" کیا ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے کی ضرور قدرت رکھتا ہے؟ اس نے ان کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے' مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے"۔

اللہ نے ہدایت و ضلالت کے کچھ قوانین بنائے ہیں اور لوگوں کو ان قوانین کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اور ان قوانین کے مطابق وہ نفع و نقصان کے ذمہ دار ہوں گے۔ ان قوانین میں سے ایک یہ قانون بھی ہے کہ انسان ہدایت و ضلالت دونوں کی استعداد رکھتا ہے۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ ہدایت کے رولز کے مطابق راہ اختیار کرتا ہے یا ضلالت کے رولز اپناتا ہے۔ جو ہدایت کے اصول اور سنن اپناتا ہے وہ ہدایت کا مستحق ہو جاتا ہے اور جو ضلالت کے اصول اور سنن اپناتا ہے وہ ضلالت کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس نے گمراہی کو اپنایا اور ہدایت کے اصولوں سے اعراض کیا۔ ایسے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ (۱۷ : ۹۷) "اللہ کے سوا ایسے لوگوں کے لیے کوئی حامی و ناصر نہ ہو گا"۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ قیامت کے دن نہایت ہی توہین آمیز اور خوفناک صورت میں اٹھائے گا۔

عَلٰى وُجُوْهِهِمْ (۱۷ : ۹۷) "اوندھے منہ"۔ یہ ہاتھوں کے سہارے چل رہے ہوں گے'

عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا (۱۷ : ۹۷) "اندھے' گونگے اور بہرے"۔ ان کے وہ تمام اعضاء جو اس اژدھام میں ان کے لیے مفید ہو سکتے تھے سب کے سب بے کار ہو چکے ہوں گے اور یہ اس لیے کیا جائے گا کہ دنیا میں ان کو یہ اعضا اس لیے دیئے گئے تھے کہ یہ لوگ ان کو صحیح کام میں لائیں اور ہدایت کے دلائل کو سمجھنے کی سعی کریں مگر انہوں نے ان اعضاء و جوارح کو بری راہوں میں استعمال کیا۔

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (۱۷ : ۹۷) "ان کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ ایسی آگ' جو کبھی بجھتی نہیں اور نہ سرد پڑتی ہے۔

كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۱۷ : ۹۷) "جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے

بھڑکا دیں گے"۔

یہ نہایت ہی خوفناک انجام ہے اور یہ نہایت ہی ارادی سزا ہے لیکن یہ لوگ اس کے مستحق اس لیے ہو گئے ہیں کہ انہوں نے آیات الہیہ کا کفر کیا۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (۱۷:۹۸) "یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا"۔ انہوں نے بعث بعد الموت کا انکار کیا۔ اور وقوع قیامت کو مستبعد سمجھا۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷:۹۸) "اور کہا کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کر کھڑا کیا جائے گا"۔

سیاق کلام میں اس منظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا وہ آج موجود ہے۔ اور وہ دنیا جس میں وہ رہ رہے تھے اسے گویا لپیٹ لیا گیا ہے اور وہ ماضی بعید بن گئی ہے۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ مستقبل کے واقعات کو نہایت ہی مجسم شکل میں پیش کرتا ہے۔ اور منظر یوں نظر آتا ہے کہ گویا وہ ایک زندہ واقعہ ہے اس طرح واقعات کا اثر دلوں پر بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ اور انسانی شعور پر یہ واقعات اپنا پورا اثر ڈالتے ہیں۔

اب قرآن مجید حقیقی صورت حال ان کے سامنے رکھتا ہے اور انداز سخن بھی واقعی بن جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ تم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہو مگر غفلت سے کام لے رہے ہو۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ

(۱۷:۹۹) "کیا ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے"۔ لہٰذا بعث بعد الموت میں کیا انہونی بات ہے' اللہ اس عظیم کائنات کا خالق ہے۔ وہ ان جیسے آسمان و زمین کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ان کو ختم کر کے دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ (۱۷:۹۹) "اس نے ان کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے"۔ میں ان کو مہلت دے رہا ہوں اور ان کا وقت مقرر ہے۔

فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (۱۷:۹۹) "مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے"۔ لہٰذا ان ظالموں کو جو سزا ہو گی وہ دلائل و مشاہدات اور آیات کی وضاحت کے اعتبار سے معقول ہو گی۔

یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور یہ مطالبات نہایت ہی نامعقول تھے مثلاً یہ کہ قیمتی دھاتوں کا مکان' کھجوروں اور انگوروں کا باغ اور زمین سے پھاڑ کر چشمے نکالنا' مگر تم لوگ خود اس قدر بخیل ہو کہ اگر اللہ کی رحمت کے خزانوں کی کنجیاں تمہیں دے دی جائیں تو تم ان میں سے کچھ بھی خرچ نہ کرتے اور

ہاتھ روک لیتے کہ کہیں یہ خزانے ختم نہ ہو جائیں حالانکہ اللہ کی رحمت کے خزانے ختم ہونے والے نہیں ہوتے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۟

"اے نبیؐ ان سے کہو' اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے۔ واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے"۔

بخل اور کنجوسی کی یہ حد ہے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اس کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اس قدر بخیل ہیں کہ اگر سمندر پر بھی بیٹھے ہوں تو ان کو پانی کی کمی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ان کو اللہ کی رحمت میں بھی کمی نظر آتی ہے۔

بہرحال اگر ان کے سامنے وہ معجزات کثرت سے بھی لائے جائیں جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں' ان کے دل چونکہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں اس لیے یہ نہ مانیں گے۔ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ۹ بڑے معجزات دیئے گئے' مگر فرعون اور اس کے سرداروں نے مان کر نہ دیا۔ اس لیے اس پر تباہی آئی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۟ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۟ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۟ۙ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۟

"ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اب یہ تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے ہاں آئے تو فرعون نے یہی کہا تھا نا کہ "اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے"۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں زمین اور آسمانوں کے رب کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں' اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ

آدمی ہے"۔ آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے مگر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو' پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہو گا' تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے"۔

قصہ بنی اسرائیل کو یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ سورت کے مضمون کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ مسجد اقصیٰ اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصہ یہاں دیا گیا ہے۔ اس قصے کے آخر میں بھی آخرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور فرعون اور اس کی قوم کے سے آنے کا تذکرہ ہے۔ یہ ان مناظر قیامت کی مناسبت سے ہے جو ابھی سورت میں گزرے تھے اور جن میں بتایا گیا تھا کہ مکذبین کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات جن کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا وہ ید بیضا' عصا' فرعون اور اس کی قوم پر خشک سالی' ہر قسم کی پیداوار کی کمی' طوفان' ٹڈی دل' قمل' مینڈک اور خون تھے۔

فَسْئَلْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ (۱۷ : ۱۰۱) "بنی اسرائیل سے پوچھو' جب موسیٰ ان کے پاس آئے"۔ کیونکہ بنی اسرائیل موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کے شاہد تھے اور ان کے پاس ریکارڈ موجود تھا۔

فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا (۱۷ : ۱۰۱) "فرعون نے اس سے کہا اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں تو ضرور سحر زدہ آدمی ہے"۔ سچی بات' عقیدۂ توحید' ظلم و سرکشی کا ترک کرنا اور لوگوں کو ایذا نہ دینے کی دعوت دینا' ایک باغی اور سرکش شخص کے نزدیک ایک سحر زدہ شخص کا کام ہے۔ کوئی معقول آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ فرعون کی طرح کے سرکش اور مغرور ڈکٹیٹر ان باتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے سامنے تو کوئی شخص سر اٹھا کے نہیں چل سکتا۔ چہ جائیکہ وہ ایسی باتیں کرے۔ ان کے خیال میں کوئی معقول فرد ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔ سرپھرے ہی ایسی باتیں کرتے ہیں۔

موسیٰ تو ایک بہادر آدمی تھے اور ان کا دل سچائی کے نور اور خدائی روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مطمئن تھے کہ اللہ کی امداد اور سرپرستی انہیں حاصل ہے۔ تو انہوں نے کہا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (۱۷ : ۱۰۲) "انہوں نے کہا' تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں زمین اور آسمانوں کے رب کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں' اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے"۔ تو ہلاک ہونے والا اور تہس نہس ہونے والا ہے۔ کیونکہ تو آیات الہیہ کی تکذیب کر رہا ہے۔ تو جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ان خارق عادت معجزات کا صدور و ظہور نہیں کر سکتا۔ یہ نہایت ہی واضح اور بصیرت افروز نشانیاں ہیں۔ گویا یہ نشانیاں خود آنکھیں ہیں جن کی وجہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اب یہ سرکش آدمی اپنی مادی قوت کا سہارا لیتا ہے۔ اور یہ عزم کرتا ہے کہ وہ موسیٰ کو زمین سے نکال کر ان کی قوم کو تباہ و برباد کر دے گا۔

وَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۱۷: ۱۰۳) "آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے"۔ تمام ڈکٹیٹر اور سرکش لوگ کلمہ حق کے بارے میں یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ ان کے پاس کلمہ حق کا یہی جواب ہوتا ہے۔

اس مقام پر آکر ایسے سرکشوں پر اللہ کا کلمہ اور اللہ کی سنت کا اطلاق برحق ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کی اٹل سنت کے مطابق، ظالموں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اور زمین کے اندر جو کمزور اہل ایمان اور صبر کرنے والے طبقات ہوتے ہیں' ان کو زمین کا وارث بنا دیا جاتا ہے۔

فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا (۱۰۳) وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۰۴) (۱۷: ۱۰۳ - ۱۰۴)

"مگر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو' پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہوگا' تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے"۔

یہ تھی انجام آیات الٰہی کے جھٹلانے کا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کے اقتدار کا وارث ان لوگوں کو بنایا' جو زمین میں پسے ہوئے تھے۔ اور اب ان کو کہا گیا کہ تمہارے مستقبل کا دارومدار تمہارے اعمال و افعال پر ہوگا۔ اس سورت کے آغاز میں بتا دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا تھا؟ یہاں صرف یہ کہا جاتا ہے کہ تم اور تمہارے دشمن اب قیامت کے سپرد ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی تو تم سب کو لپیٹ کر اللہ لے آئے گا۔

یہ تھی مثال اس پیغمبر کی جو نو خوارق عادت معجزات لے کر آئے اور ان کا استقبال جھٹلانے والوں نے اس طرح کیا۔ اور اللہ کی اٹل سنت نے پھر اپنا کام یوں کیا۔ رہا یہ قرآن تو یہ تو ایک ابدی سچائی لے کر آیا ہے۔ اور اسے تھوڑا تھوڑا کر کے وقفے وقفے کے بعد نازل کیا گیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کو پڑھ کر مہلت بعد مہلت کے ساتھ سنائیں۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝

"اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے' اور اے ہمارے نبی' تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اسے) متنبہ کر دو۔ اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے"

نزول قرآن کا مقصد ایک امت کی تشکیل و تربیت تھا۔ پھر اس امت کے لیے ایک نظام حیات کی تشکیل قرآن کے

پیش نظر تھی تاکہ یہ امت قرآن اور اس نظام کو لے کر اکناف عالم میں پھیل جائے۔ اور تمام انسانیت کو اس مکمل اور خود کفیل نظام حیات کی تعلیم دے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب متفرق طور پر مختلف اوقات میں اس امت کی واقعی ضرورت کے مطابق اترتی رہی۔ اور ان حالات کے مطابق اس کا نزول ہوتا رہا۔ جن حالات میں اس امت کی دور اول میں تربیت ہو رہی تھی۔ چونکہ مقصد ایک امت کی تربیت تھا۔ اس لیے نزول قرآن بھی متفرق طور پر ایک طویل عرصے تک ہوتا رہا کیونکہ کسی جماعت کی تربیت کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ تربیت عملی تجربات کی شکل میں ایک طویل عرصہ تک ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ قرآن آیا اور اس نے اپنے ایک ایک جزئی حکم کو عملی مرحلے میں نافذ کیا اور وہ ایک نظام کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ نظام محض نظریاتی قانون سازی کی شکل میں نہیں آیا۔ نہ یہ مجرد فکر اور نظریہ کی شکل میں پیش ہوا' کیونکہ نظریاتی بحثیں محض ذہنی عیاشی اور محض پڑھنے پڑھانے کے لیے ہوتی ہیں۔

یہ تھی قرآن مجید کے متفرق نزول کی حکمت۔ اور یہی وجہ تھی کہ قرآن مجید کو یکبار ایک کتاب کی شکل میں نہیں اتارا گیا۔ قرآن کریم مسلمانوں کی پہلی نسل نے خدا و رسول سے اس طرح اخذ کیا کہ یہ ان کے لیے ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں عملی ہدایات تھیں۔ جب بھی کوئی امر آیا یا نہی وارد ہوئی' جب بھی کوئی اخلاقی ادب سکھایا گیا یا کوئی فریضہ نازل ہوا تو یہ عمل کے لیے تھا۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کو محض پڑھنے پڑھانے اور ذہنی اور نظریاتی اور نفسیاتی عیاشی کے طور پر نہیں لیا۔ جیسا کہ وہ شعر و ادب کو لیتے تھے۔ نہ وہ لہو و لعب کے طور پر اسے لیتے تھے جس طرح وہ قصے کہانیوں کو بطور لہو و لعب استعمال کرتے تھے۔ جب بھی قرآن نازل ہوا انہوں نے اس کی کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر دیا۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسے عملی شکل دے دی۔ ان کا شعور اور ان کا ضمیر اس رنگ میں رنگا گیا۔ قرآن ان کے طرز عمل اور ان کی سرگرمیوں پر چھا گیا۔ ان کے گھروں' ان کے بازاروں میں قرآن کا دور دورہ ہو گیا اور وہ ان کے لیے ایک نظام زندگی بن گیا اور انہوں نے قرآن کے علاوہ ہر طور طریق کو ترک کر دیا۔ جو طور طریقے ان کو وراثت میں جاہلیت سے ملے تھے' یا جن کو وہ جانتے تھے یا جن کے مطابق وہ نزول قرآن سے قبل چل رہے تھے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص دس آیات پڑھ لیتا تھا تو وہ آگے نہ بڑھتا تھا جب تک وہ ان کا مفہوم نہ جان لیتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن مجید حق پر قائم ہوتے ہوئے اتارا ہے۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ (۱۷: ۱۰۵) "اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے"۔ یہ اس لیے نازل ہوا کہ زمین پر سچائی کو مستقل ٹھہرا دے اور اس کی بنیادیں مضبوط کر دے۔

وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ (۱۷: ۱۰۵) "اور یہ قرآن بھی حق کے ساتھ اترا"۔ گویا اس کا مواد بھی سچائی پر مشتمل ہے اور اس کی غرض و غایت بھی سچائی ہے۔

اس کا بنیادی عنصر ہی سچائی ہے اور اس کی اہم تعلیمات بھی سچائی پر مبنی ہیں۔ وہ حق اور سچائی جو اس کائنات میں کارفرما ناموس قدرت کی شکل میں رواں ہے اور جس حق و سچائی کی قوت پر یہ کائنات قائم ہے' اور جس سچائی کے ساتھ یہ کائنات اور ارض و سما پیوستہ ہیں اسی کے ساتھ یہ قرآن بھی مربوط ہے۔ یہاں قرآن اسی نظام کائنات (حق) کی طرف اشارہ کر رہا

ہے۔ یہی سمجھاتا ہے کہ یہ قرآن بھی اس عظیم تکوینی سچائی کا ذریعہ ہے۔ پس حق قرآن مجید کا جسم و جان ہے اور حق ہی اس کا بنیادی عنصر اور اس کا مقصود ہے اور رسول مبشر 'نذیر اور مبلغ ہے اس عظیم سچائی کا' جسے وہ لے کر آیا ہے۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس حق کے ذریعے اپنی قوم کا مقابلہ کریں۔ اور انہیں چھوڑ دیں کہ وہ جو راہ اختیار کرنا چاہیں اختیار کریں۔ اگر چاہیں تو قرآن پر ایمان لائیں 'اگر چاہیں تو نہ لائیں۔ لیکن وہ جو راہ بھی اختیار کریں گے اس راہ کے نتائج و عواقب کے وہ ذمہ دار ہوں گے اور ان لوگوں کے سامنے بطور مثال ان اہل کتاب کو پیش کر دیں 'یہود و نصاریٰ کو ان میں سے جنہوں نے قرآن مجید پر ایمان لایا ہے۔ شاید کہ وہ ان کے لیے اچھی مثال کا کام کریں۔ کیونکہ قریش تو امی ہیں۔ ان کے پاس نہ تو تعلیم ہے۔ اور نہ ان کو اس سے قبل کوئی کتاب دی گئی ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ۝ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ۩ ۝

"اے نبی' ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو' جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے 'انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب 'اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا"۔ اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے"۔

یہ نہایت ہی پر تاثیر منظر ہے۔ ان لوگوں کا منظر جنہیں اس سے قبل علم دیا گیا تھا۔ وہ قرآن سنتے ہیں۔ ان پر خوف کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

یخرّون للاذقان (۱۷:۱۰۷) "اور وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں"۔ یہ سجدہ نہایت ہی بے ساختہ ہوتا ہے۔ وہ سجدے میں نہیں گرتے بلکہ ان کی ٹھوڑیاں سجدہ کرتی ہیں۔ پھر ان کے احساسات کے اندر جو چیز ان کو چبھتی ہے وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی عظمت اور اللہ کے وعدوں کے سچا ہونے کے احساس کا اظہار کرتے ہیں۔

سبحٰن ربنآ ان کان وعد ربنا لمفعولا (۱۷:۱۰۸) "پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا"۔ وہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کے تاثرات کو الفاظ میں قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے دل جوش میں آتے ہیں اور ان کے تاثرات آنسوؤں کی شکل میں باہر آ جاتے ہیں۔

ویخرّون للاذقان یبکون (۱۷:۱۰۹) "اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں"۔

ویزیدھم خشوعا (۱۷:۱۰۹) "اور قرآن کو سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے"۔ جبکہ اس

سے قبل وہ نہایت ہی خشوع اور عاجزی سے اس کا استقبال کر چکے تھے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو نہایت ہی گہرے شعوری تاثرات کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ فیوض قرآن سے مستفید ہونے کے لیے اپنے دلوں کو کھول دیتے ہیں' جو قرآن مجید کی حقیقت' اس کی قدر و قیمت اور اس کی تعلیمات کو جانتے ہیں اور جو لوگ قرآن سے قبل کتب الہیہ کے علوم سے واقف ہوتے ہیں ایسے لوگ قرآن کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں' اس لیے کہ حقیقی علم وہی ہے جو کتب سماوی نے دیا ہے اور جو اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ یہ منظر یہاں ایسے حالات میں پیش کیا گیا کہ اہل مکہ نہایت ہی خلجان اور حیرت میں تھے کہ وہ اس علم کو قبول کریں یا نہ کریں جو قرآن دیتا ہے۔ ایسے حالات میں علمائے اہل کتاب کا یہ منظر پیش کرنے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات کو کوئی جس نام سے پکارے' پکار سکتا ہے۔ اس کے لیے کئی اسمائے حسنیٰ ہیں۔ جاہلیت میں یہ لوگ اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال نہ کرتے تھے۔ وہ رحمٰن کو اللہ کا نام نہ سمجھتے تھے اس لیے کہا گیا کہ اللہ کے اسمائے صفت بے شمار ہیں جن سے چاہو' اسے پکارو۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ

"اے نبیؐ ان سے کہو "اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر' جس نام سے بھی پکارو' اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں"۔

یہ تو اوہام جاہلیت ہیں اور بت پرستی کی ولدل باتیں ہیں کہ اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال نہ کرو' ایسی باتوں کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ نماز میں جہر اور خفا میں میانہ روی اختیار کریں' کیونکہ وہ لوگ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر مذاق اور ٹھٹھے کرتے تھے۔ اور اس طرح کرنا اللہ کے حضور حاضر ہوتے وقت زیادہ مناسب بھی ہے۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

"اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے' ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو"۔ جس طرح سورت کے مضامین کا آغاز یوں ہوا تھا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور اس کا کوئی شریک اور بیٹا نہیں ہے۔ اور اس کو ولی اور مددگار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ علی وکبیر ہے' تو اسی مضمون پر اس سورت کا خاتمہ بھی ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے مضامین کا محور یہی ہے۔ انہی مضامین سے اس کا آغاز ہوا اور انہی پر اس کا اختتام ہوا۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾ ۱۲ ع ۱۱

۱۲ "اور کہو "تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے کسی کو بیٹا بنایا' نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے' اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو"۔ اور اس کی بڑائی بیان کرو' کمال درجے کی بڑائی"۔

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۱۵

سورۃ الکہف - ۱۸

۱ -- تا -- ۸۲

سورۃ الکھف ایک نظر میں

اس سورت کا بیشتر حصہ قصص پر مشتمل ہے۔ آغاز میں قصہ اصحاب کہف ہے۔ اس کے بعد دو باغوں کا قصہ ہے۔ اس کے بعد آدم و ابلیس کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک صالح بندے کی کہانی ہے۔ اور اس کے آخر میں ذوالقرنین کا قصہ ہے۔ اس سورت کی آیات کا زیادہ تر حصہ ان قصص میں چلا گیا ہے یعنی ۱۱۰ آیات میں سے ۷۱ آیات میں یہ قصص ہیں ' ۷۱ آیات کے علاوہ جو آیات ہیں ان کا بڑا حصہ بھی انہی قصص پر تبصرہ ہے۔ ان قصص کے ضمن میں مشاہد قیامت میں سے بعض مناظر بھی دیئے گئے ہیں اور خود انسانی زندگی کے بعض وہ مناظر بھی دیئے گئے ہیں جو فکر انگیز ہیں یا جن کی کسی طرح افادیت ہے اور ان سب مضامین کو قرآن کریم کے مصورانہ انداز بیان میں دیا گیا ہے۔

لیکن اس پوری سورت کا موضوع اور محور جس کے ارد گرد اس کے مضامین و قصص چلتے ہیں وہ اسلامی نظریہ حیات ' اسلامی عقیدہ اور اسلامی فکر و نظر کی درستگی ہے۔ نیز اسلامی عقائد ' اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام کی جو اعلیٰ قدریں ہیں ان کو بھی اس میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی تصور زندگی اور اسلامی عقائد سورت کے آغاز اور انجام میں دونوں جگہ تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ سورت کا آغاز یوں ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱) قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا (۲) مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (۳) وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (۴) مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (۵) (۱۸: ۱ - ۵)

"تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب ' تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے ' اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' اور ان لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا۔ بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے ' وہ محض جھوٹ بکتے ہیں"۔

اور سورت کا اختتام یوں ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (۱۸:۱۱۰) "اے محمدؐ کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو، اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔

یوں سورت کا آغاز اور انجام دونوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، دونوں جگہ اللہ کی وحدانیت اور رد شرک ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ دونوں جگہ وحی کا اثبات کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اور تمام مخلوقات و حوادث میں مکمل فرق ہے۔

یہ موضوع اس سورت کے مختلف مقامات پر دیا گیا ہے اور اسے اس میں بار بار دہرایا گیا ہے اور مختلف انداز میں لایا گیا ہے۔ مثلاً قصہ اصحاب الکہف میں مومن نوجوان یوں گویا ہوتے ہیں:

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا (۱۸:۱۴) "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمان و زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے"۔

اور اس قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا:

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸:۲۶) "زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبرگیر اس کے سوا نہیں، اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

اور دو باغوں کے قصے میں رجل مومن اپنے ساتھی کے ساتھ بات کرتے ہوئے یہ کہتا ہے:

اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا (۳۷) لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (۳۸) (۱۸:۳۷ - ۳۸) "کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا، رہا میں تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

اور اس قصے پر تبصرہ میں یہ مضمون یوں آیا ہے:

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا (۴۳) هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ

لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا (٤٤) (١٨ : ٤٣ - ٤٤) "نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتے اور نہ کر سکا تھا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ۔ اس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے' انعام وہی بہتر ہے' جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے)۔

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں یہ مضمون یوں آتا ہے :

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (١٨ : ٥٢) "پھر کیا کریں گے یہ لوگ اس روز جبکہ ان کا رب ان سے کہے گا پکارو اب ان ہستیوں کو جنہیں تم میرا شریک سمجھتے تھے۔ یہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کی مدد کو نہ آئیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے"۔

اور اس منظر پر تبصرے میں یہ مضمون یوں لایا گیا ہے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْ اَوْلِيَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (١٨ : ١٠٢) "کیا یہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے' یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنائیں؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے"۔

اس سورت میں انسان کے فکر و نظر اور عقل و ادراک کے منہاج کو بھی درست کیا گیا ہے' مثلاً اس میں مشرکین کے ان دعوؤں اور مزعومات پر سخت گرفت کی گئی ہے۔ جو وہ ان باتوں اور موضوعات کے بارے کرتے تھے۔ جو انسانی عقل و ادراک کے دائرے سے ماوراء تھیں۔ اور جن کے بارے میں انسان کوئی دلیل و برہان سرے سے پیش ہی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نکتے کو سامنے رکھ کر انسان کو یہ ہدایت کی گئی کہ اسے چاہیے کہ ان باتوں کے درپے نہ ہو جن کے بارے میں اسے علم نہیں' اپنے دائرۂ علم کے اندر رہ کر بات کرے۔ جن امور کے بارے میں انسان کو علم نہیں ان کو اللہ پر چھوڑ دے۔

اس سورت کے آغاز ہی میں کہا گیا :

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (٤) مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ (٥) (١٨ : ٤ - ٥) "تاکہ وہ ان لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا"۔

دوسری جگہ اصحاب کہف نوجوان یوں کہتے ہیں۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ (۱۸ : ۱۵)
"یہ لوگ ہماری قوم ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا الٰہ بنا رکھے ہیں۔کیوں نہیں لاتے یہ ان پر کوئی دلیل بین"۔اور جب خود ان سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کتنا عرصہ غار میں رہے تو وہ یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ (۱۸ : ۱۹) "انہوں نے کہا تمہارا رب زیادہ اچھا جاننے والا ہے کہ تم نے کتنا عرصہ گزارا؟"۔

پھر اس قصے کے درمیان 'اصحاب کہف کی تعداد کے بارے ان کے اندازوں کے متعلق کہا گیا کہ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا (۱۸ : ۲۲) "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔کہو' میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔پس سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو' اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو"۔

حضرت موسیٰ اور بندۂ صالح کے قصے میں جب وہ بندۂ صالح اپنے تصرفات کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو بتا دیتے ہیں کہ حقیقت تو اللہ جانتا ہے۔اس نے فقط حکم الٰہی کی تعمیل کی۔حضرت موسیٰ نے ان کے ان تصرفات پر تنقید کی تھی۔وہ کہتے ہیں :

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (۱۸ : ۸۲) "یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا۔میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے"۔ وہ حقیقت حال اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

چونکہ اعلیٰ اجتماعی قدروں کا تعین اسلامی نظریہ حیات کے پیمانے سے درست کیا گیا ہے۔اس لئے اس کا اظہار متعدد مقامات پر ہوتا ہے جبکہ ایمان اور عمل صالح پر مبنی اقدار سامنے آتی ہیں اور ان کے علاوہ تمام دنیاوی قدریں نظروں سے گر جاتی ہیں جو دنیاوی اعتبار سے اور دنیا پرستوں کی نظر میں بہت اہم ہیں۔اور نظروں کو چکا چوند کرنے والی ہیں۔

مثلاً یہ کہ زمین پر جو سامان زیب و زینت ہے وہ ایک آزمائش اور ابتلا ہے اور اس کا انجام زوال اور فنا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۷) وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (۸) (۱۸ : ۷ - ۸) "واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے' اس

کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے ۔ آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں"۔

ایمانی اقدار میں سے اہم قدر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ سب سے بڑی اور سب سے وسیع ہے ۔ اگرچہ انسان ایک پتھریلے غار میں کیوں نہ ہو' اصحاب کہف کے نوجوان مومن جب اپنی قوم کو چھوڑ کر غار میں پناہ لیتے ہیں تو وہ یوں فیصلہ کرتے ہیں :

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۸:۱۶) "اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو' تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کر دے گا"۔

اس میں خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ آپ اہل ایمان کو ساتھی بنا کر اپنے مشن پر جم جائیں ۔ اور دنیا پرستوں اور حصول دنیا میں ڈوبے ہوئے غافلوں کی پرواہ نہ کریں ۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۲۸) وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۲۹) (۱۸:۲۸ - ۲۹) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں' اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو ۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے ۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔

دو باغوں کی کہانی یہ بتاتی ہے کہ ایک مومن کو اپنے ایمان پر فخر ہوتا ہے اور وہ ایمان کے مقابلے میں مال و دولت اور زندگی کے سازوسامان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ۔ اور ایک مومن ایک بر خود غلط' مغرور اور سرکش و بے دین پر کس طرح تنقید کرتا ہے اور اسے متنبہ کرتا ہے کہ اس نے مالک حقیقی کو بھلا دیا ہے ۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا (۳۷) لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (۳۸) وَلَوْلَآ

اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا (۳۹) فَعَسٰي رَبِّيْ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (۴۰) اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا (۴۱) (۱۸:۳۷ - ۴۱) "اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا 'کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟ رہا میں 'تو میرا رب وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور جب تو اپنی جنت میں بھی داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ 'اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں ہے کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے"۔

اس قصے کے بعد یہ مثال دی جاتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں جس طرح جلد تروتازگی پیدا ہوتی ہے 'اسی طرح جلد اس پر زوال بھی آ جاتا ہے۔ جس طرح ایک فصل آتی ہے 'لہلاتی ہے 'اور پھر بھوسے کی شکل میں ہواؤں کے ساتھ اڑتی پھرتی ہے۔

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (۱۸:۴۵) "اے نبی انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی ہے جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں 'اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اور اس پر ایک تبصرہ آتا ہے کہ زائل ہونے والی قدریں کون سی ہیں اور باقی رہنے والی قدریں کون سی ہوتی ہیں :

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (۱۸:۴۶) "یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں"۔

ذوالقرنین کا ذکر اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک بادشاہ تھا بلکہ وہ اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے یاد رکھا جاتا ہے۔ جب ذوالقرنین کے سامنے یہ تجویز رکھی جاتی ہے کہ وہ ان کے لیے ایک دیوار بنا دے جو ان کو یاجوج و ماجوج سے بچائے۔ اور اس کے اخراجات وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں تو وہ ان کی جانب سے قیمت کی ادائیگی کو رد کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس زمین پر جو تمکن دیا ہے وہ اس مال سے بہتر ہے جو تم مجھے دینا چاہتے ہو۔

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ (۱۸: ۹۵) "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے"۔ لیکن جب بند تیار ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے رب کی طرف منسوب کرتا ہے 'اپنی قوت کی طرف نہیں۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّي فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا (۱۸: ۹۸) "یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ حق ہے"۔

سورت کے آخر میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ اعمال کے اعتبار سے کون لوگ بڑے خسارے میں ہوں گے۔ وہی لوگ جو قیامت کے منکر ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہو گا' نہ ان کی کوئی قیمت ہو گی۔ اگرچہ بظاہر وہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے اعمال وزن دار ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا (۱۰۳) اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۰۴) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۰۵) (۱۸: ۱۰۳ تا ۱۰۵) "اے محمدؐ ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ ہیں لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے دن ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے"۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورت کا محور و موضوع عقائد کی درستگی 'فکر و نظر کی درستگی اور اسلامی فکر کے مطابق اعلیٰ قدروں کی اہمیت ہے۔

--- ooo ---

اس پوری سورت کا مضمون ان موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔ آغاز اللہ کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری جس کا مقصد لوگوں کو خبردار کرنا ہے۔ مومنین کو بشارت دینا اور ان لوگوں کو ڈرانا جن کے عقائد یہ ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ زینت ہے اور دنیا میں انسان ایک امتحان اور آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور آخری انجام اس دنیا کا زوال ہے اور یہ دنیا فانی ہے۔ اس کے بعد قصہ اصحاب کہف جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی اور عیش و عشرت پر ایمان کو فوقیت دی اور ایمان پر آرام اور عیش و عشرت کو قربان کر دیا۔ ایک غار میں جا کر اللہ کی پناہ لے لی اور اپنے عقیدے اور نظریہ حیات کو بچا لیا۔

اس سورت کے دوسرے حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے

ساتھ وابستہ رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف رضائے الٰہی چاہتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے ذکر سے غافل ہیں ان کو نظر انداز کر دیں۔ اس کے بعد دو باغوں کا قصہ آتا ہے جس میں ایک مومن دنیا کی قدروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ حصہ اس بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ قدریں وہ ہیں جو اللہ کے نزدیک قابل اجر ہوں۔

اس سورت کا تیسرا حصہ کئی مناظر پر مشتمل ہے۔ قیامت کا منظر، بیچ میں قصہ آدم و ابلیس ہے اور آخر میں اللہ کی اس سنت کا ذکر ہے کہ وہ ظالموں کو کس طرح ہلاک فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ کی یہ رحمت ہے کہ وہ گناہ گاروں کو بھی ایک وقت تک مہلت دیتا ہے۔

آخری دو قصوں میں حضرت موسیٰ اور عبد صالح کا قصہ ہے۔ ذوالقرنین کا قصہ ہے اور سورت کا خاتمہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح آغاز ہوا یعنی مومنین کو خوشخبری اور کافروں کو انجام بد سے ڈراوا۔ وحی کا ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے شرک کی نفی۔

اب ہم پہلے حصے کی تفصیلات دیتے ہیں۔

---○○○---

درس نمبر ۱۳۰ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۷

آیاتها ۱۱۰ سُورَةُ الكَهْفِ (۱۸) مَكِّيَّةٌ (۶۹) رکوعاتها ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
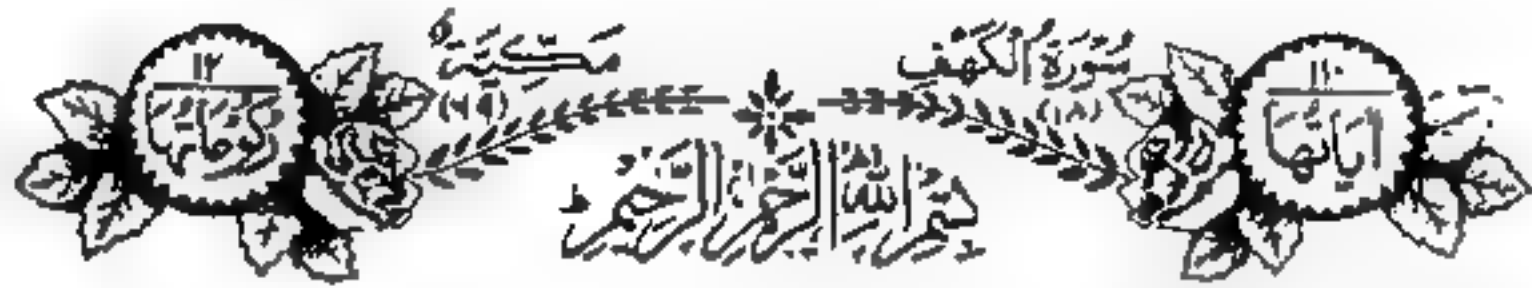
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ﴿۱﴾ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾ مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ﴿۳﴾ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾

”تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی ۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے ' اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے ' اور ان لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے ۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا ۔ بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے ' وہ محض جھوٹ بکتے ہیں ۔

اچھا' تو اے نبیؐ' شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو' اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے۔ اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں۔ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں"۔

اس سورت کا آغاز نہایت ہی پر اعتماد اور فیصلہ کن انداز میں ہو رہا ہے۔ اللہ کی تعریف اس بات پر کی جارہی ہے کہ اس نے اپنے بندے پر یہ کتاب اتاری۔ یہ ایک سیدھی کتاب ہے' اس کی تعلیمات سیدھی ہیں اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ ان میں کوئی ٹیڑھ پن اور ہیر پھیر نہیں ہے' اس میں لاگ لپیٹ کے بغیر بات کی جارہی ہے۔ یہ کیوں؟

لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّن لَّدُنْهُ (۱۸ : ۲) "تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے ڈراوے"۔ پہلی ہی آیت سے شان منزل آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا نظریہ کیا ہے' بغیر کسی التباس اور بغیر کسی پیچیدگی کے۔ اللہ نے یہ کتاب نازل کی ہے اور اللہ قابل حمد و ثنا ہے کہ اس نے یہ احسان کیا۔ محمد اللہ کے بندے ہیں جیسا کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی شریک۔

اور یہ کتاب کیسی ہے؟ اس میں کوئی ٹیڑھ پن نہیں ہے۔ یہ قیم ہے۔ اس کی تعلیمات کے سیدھے پن کا اظہار ایک دفعہ یوں کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ٹیڑھ پن نہیں اور دوسری مرتبہ یوں کہا جاتا ہے کہ یہ قیم ہے یعنی سیدھی۔ یعنی اس کتاب اور اسلام کے صراط مستقیم ہونے کی تاکید شدید۔

اور یہ کتاب کیوں نازل کی گئی؟

لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّن لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا (۱۸ : ۲) "تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے' اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے"۔

اس پوری سورت میں سخت اور قطعی الفاظ میں ڈراوا بھی ہے۔ ڈراوے کا آغاز تو اجمالی اور اصولی طور پر ہوتا ہے۔

لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّن لَّدُنْهُ (۱۸ : ۲) "تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے"۔ اور اس کے بعد پھر مخصوص طور پر مشرکین کو ڈرایا جاتا ہے۔

وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا (۱۸ : ۴) "اور ان لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے"۔ لیکن انذار اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ مومنین کے لیے تبشیر بھی ہے۔ ان لوگوں کے لیے خوشخبری ہے جو عمل صالح کرتے ہیں۔ یہاں ایمان کے بعد عمل صالح کی قید لگائی گئی ہے۔

الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ (۱۸ : ۲) یہ اس لیے لگائی گئی ہے کہ عمل صالح ایمان کی دلیل ہوتا ہے اور ظاہری عمل کی بنا پر کوئی کسی کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی غلط سوچ اور غلط انداز فکر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے مشکل اور نازک مسئلے کے بارے کس قدر غلط سوچ رکھتے ہیں یعنی اس کائنات کے بارے میں اور اس کے خالق کے بارے میں عقائد کے مسئلے کے متعلق۔

مَالَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ (۱۸ : ۵) "اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا"۔ لہٰذا بغیر علم کے اس موضوع پر کلام کرنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح بے تکی باتیں کرنا ان کے لیے انجام کار شرمندگی کا باعث ہو گا۔

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (۱۸ : ۵) "بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں"۔ قرآن کریم نے ان کے کلام اور ان کے عقیدے کے لیے جو الفاظ چنے ہیں وہ تعبیر مفہوم اور الفاظ کی آواز دونوں کے اعتبار سے ان کے کلمہ اور ان کی بات کے قابل مذمت ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ پہلا لفظ ہے (کبرت) تاکہ سننے والے کو معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ جو بات کرتے ہیں وہ غایت درجے کی قابل مذمت اور بہت بڑی بات ہے باعتبار نتائج۔ كَلِمَةً تو ضمیر جملہ سے تمیز کے طور پر لایا گیا۔ یعنی كَبُرَتْ کے اندر موجود ضمیر سے۔

یہ زیادہ متوجہ کرنے کے لیے کہ ان کے منہ سے یہ عظیم بات بڑی لاپرواہی اور بے تکے انداز میں نکل رہی ہے۔ اور بغیر کسی احتیاط اور جھجک کے بس نکلی چلی آ رہی ہے۔

تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۸ : ۵) "ان کے منہ سے نکلتی ہے"۔ افواھم کا تلفظ بھی بڑا برا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے بھی اس لفظ سے ان کی بات زیادہ قابل مذمت معلوم ہوتی ہے اور لفظی اعتبار سے بھی ایک شخص اس لفظ کو منہ کھول کر افوا ادا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد باہم متصل دو ھاء کی ادائیگی سے اس کا منہ بھر جاتا ہے اور ہم تک پہنچتے پہنچتے اس کا منہ پھول جاتا ہے۔ لہٰذا مفہوم اور ترکیب اور تلفظ تینوں اعتبار سے اس بات اور کلمہ کی شناعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد تاکید منفی بھی آ جاتی ہے۔ یعنی :

اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (۱۸ : ۵) (نہیں کہتے وہ مگر جھوٹ"۔ پھر یہاں مَا يَقُوْلُوْنَ نہیں کہا ہے۔ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ کہا ہے کیونکہ لفظ ان میں نون ساکن ہونے کی وجہ سے سختی اور فیصلہ کن انداز پایا جاتا ہے اور ما میں مد الف سے جو نرم بات کو ظاہر کرتی ہے۔ اور یہ سب لفظی اور معنوی سختی محض تاکید کے لیے کی گئی ہے کہ یہ کلمہ یا یہ بات جو یہ لوگ کہتے ہیں 'نہایت ہی عظیم بات ہے اور اس کے نتائج ان کے لیے بہت ہی سنگین ہیں"۔

ان کی اس بات پر گرفت شدید کے ساتھ ساتھ اس طرح کی ایک تنبیہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کی جاتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات پر بہت ہی پریشان تھے کہ آپ کی قوم آپ کی تکذیب کر رہی ہے اور ایسے طریقے اختیار کر رہی ہے جن کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں، تو حضور اکرم کو بھی ذرا سخت الفاظ میں کہا جاتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰي اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (۱۸ : ۶)

"اچھا تو اے نبیؐ شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو' اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے"۔ یعنی تم رنج و ملال کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر دینا چاہتے ہو کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ حالانکہ ان لوگوں کا رویہ تو یہ ہے کہ آپ ان کے بارے میں کوئی رنج اور غم اپنے اوپر طاری نہ کریں۔ اب ان کو چھوڑ دیں۔ یہ اس دنیا میں گم ہیں اور اس دنیا میں جو سروسامان ہم نے پیدا کیا ہے' وہ محض زیب و زینت کا سامان ہے۔ مال اور اولاد اور یہ ان لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں کون اچھے اعمال کرتا ہے اور کون برے اعمال کرتا ہے۔ کون اس دنیا کی متاع کے لیے اپنے آپ کو مستحق ثابت کرتا ہے اور کون آخرت کے ساز و سامان کا خیال کرتا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَي الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸ : ۷) "واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی سروسامان زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے" اللہ کو تو خوب معلوم ہے لیکن مقصد یہ ہے کہ عملاً ان باتوں کا صدور ان سے ہو جائے اور ظاہر ہو جائے کہ زندگی میں کون ہے جو احسن رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں برے اعمال کرنے والوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے' کیونکہ انداز کلام سے ان کے بارے میں مفہوم واضح ہے۔

اور دنیا کی اس زیب و زینت کا انجام بھی معلوم ہے۔ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ اس دنیا کی یہ سب رنگینیاں ختم ہو جائیں گی اور دنیا ایک چٹیل میدان ہو گی اور اس پر جو کچھ ہے سب نیست و نابود ہو گا' انسان حیوانات و نباتات سب ختم ہوں گے۔ یہ دنیا خشک اور چٹیل میدان ہو گی۔

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (۱۸ : ۸) "آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں"۔

تعبیر فیصلہ کن انداز کی ہے۔ منظر بھی سخت ہے' (جُرُزًا) کا کلمہ لفظاً اور معنیً خشکی اور بے آب و گیاہ میدان کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ (صَعِيْدًا) بھی میدان' ہمواری اور سختی کو لفظاً اور معنیً ظاہر کرتا ہے۔

---- ○○○----

اب قصہ اصحاب کہف آتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے جن کے دلوں میں ایمان بیٹھ جاتا ہے اور جب ایمان دلوں میں اتر جاتا ہے تو وہ اطمینان اور سکون سے اس طرح بھر جاتے ہیں جس طرح اصحاب کہف تھے۔ پھر یہ دل زمین کی آرائش اور زیب و زینت کو کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ غار میں پناہ لیتے ہیں' غار میں کیا چیز لے جا کر چھپاتے ہیں؟ ایمان اور صرف دولت ایمان۔ یہ لوگ اس وقت غار میں جاتے ہیں جب وہ ایمان کی حفاظت کرتے ہوئے لوگوں میں نہیں رہ سکتے۔ اب دیکھئے کہ اللہ ایسے لوگوں کو کس طرح بچاتا ہے۔ ان کو فتنوں سے محفوظ کرتا ہے اور اپنی رحمت سے ڈھانپ لیتا ہے۔

اس قصے کے بارے میں بے شمار روایات ہیں۔ اور بہت سی آراء ہیں اور قصے کہانیوں کی بعض پرانی کتابوں میں ان کے بارے میں مختلف روایت ہیں۔ ... طریق کار یہ ہے کہ ہم قرآن کی حد تک اپنے آپ کو محدود کرتے ہیں' کیونکہ

قرآن ہی واحد یقینی مصدر علم ہے۔ روایات اور قصوں کو ہم انکی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ روایات ہمارے تفسیری ذخیرے میں راہ پا گئی ہیں۔ بغیر سند اور صحت کی جانچ پڑتال کیے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ قرآن نے اس بات سے منع کیا ہے کہ اس سلسلے میں غیر قرآنی مصادر کی طرف ہرگز رجوع نہ کیا جائے اور اس میں محض تیر تکے نہ چلائے جائیں۔

اس قصے اور ذوالقرنین کے قصے کے نزول کے سلسلے میں لکی روایات وارد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اہل مکہ کو سوالات دے کر ابھارا کہ یہ سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے جائیں۔ ان دو قصوں کے بارے میں اور روح کے بارے میں یا اہل مکہ نے یہودیوں سے امداد طلب کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہمیں کچھ ایسے سوالات بتاؤ تاکہ ہم ان کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امتحان لیں۔ یہ دونوں باتیں صحیح ہو سکتی ہیں کیونکہ ذوالقرنین کے قصے کی ابتدا یہی ہے۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْ عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (۱۸:۸۳) "وہ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو میں اس کے بارے میں تمہیں بتاؤں گا"۔ لیکن قصہ اصحاب کہف کے بارے میں اس قسم کی بات نہیں آئی۔ اس لیے ہم اس قصے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ قصہ بذات خود سورت کے محور اور موضوع کلام سے واضح طور پر مربوط ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے یہ بات کہہ دی ہے۔

فنی اعتبار سے اس قصے کو پیش کرنے کے لیے قرآن میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ پہلے اجمالی تلخیص کا ہے اور پھر اس کی تفصیلات پر بحث کا ہے۔ یہ قصہ کئی مناظر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے لیکن مختلف مناظر کے درمیان خلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مضمون اور سیاق کلام سے یہ خلا خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں۔ اس قصے کا آغاز یوں ہے:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝

۱ ع ۱۲

۱۳ "کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "اے پروردگار ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے"" تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے"۔

یہ اس قصے کی تلخیص ہے اور اس کی روٹ لائن اس میں دی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک گروہ تھا۔ تعداد معلوم نہیں ہے۔ یہ اہل ایمان تھے۔ انہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ ان کے کانوں پر مہر لگا دی گئی تھی یعنی سو گئے

تھے کئی سال تک - سالوں کی تعداد معلوم نہیں - اس طویل نیند سے وہ اٹھائے گئے - ان کی میعاد کہف کے بارے ان میں دو گروہ ہو گئے تھے تاکہ معلوم ہو کہ کس کا اندازہ زیادہ درست ہے - اور یہ کہ یہ قصہ عجیب و غریب ہونے کے باوجود عجیب نہیں ہے - اس کائنات میں اس سے بھی زیادہ عجوبے ہیں اور اصحاب کہف اور اصحاب رقیم سے زیادہ عجیب تر -

یہ پرکشش تلخیص دینے کے بعد اب اس قصے کی تفصیلات دی جا رہی ہیں - تفصیلات سے پہلے بتایا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں چونکہ تاریخی روایات میں بے حد اضطراب پایا جاتا ہے - اس لیے قرآن کریم میں ہم جو کچھ بتا رہے ہیں وہ فیصلہ کن امر ہے اور یہی حق الیقین ہے -

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝

"ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں، وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی - ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے - ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے - اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے" - (پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) "یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے - یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو - تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کر دے گا" -

اس قصے کے مناظر میں سے یہ پہلا منظر ہے -

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ (۱۸ : ۱۳) "وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے"۔ اور مزید یہ کہ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى (۱۸ : ۱۳) "اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی"۔ یعنی ان کو یہ الہام کر دیا تھا کہ وہ اپنے معاملات میں کس طرح تدابیر اختیار کریں اور پھر وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۱۸ : ۱۴) "اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے"۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے ایمان پر ثابت قدم ہو گئے۔ راسخ العقیدہ ہو گئے اور جس سچائی کو انہوں نے اختیار کیا تھا اور جان لیا تھا اس پر استقامت اختیار کر لی تھی اور جو ایمان انہوں نے اپنایا تھا وہ انہیں بہت ہی عزیز تھا۔

اِذْ قَامُوْا (۱۸ : ۱۴) یعنی وہ اٹھے اور انہوں نے ایمان کی تحریک برپا کر دی اور وہ عزم و ثبات کا پیکر بن گئے۔

فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۸ : ۱۴) "انہوں نے کہا ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے"۔ وہ رب کائنات ہے۔ سب کی سب کا۔

لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا (۱۸ : ۱۴) "ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے"۔ کیونکہ وہ واحد ہے اور بلا شریک ہے۔

لَقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (۱۸ : ۱۴) "اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے"۔ حق سے تجاوز کریں گے اور صحیح راستے سے ایک طرف ہو جائیں گے۔

اس کے بعد وہ اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس پر ان کی قوم عمل پیرا تھی، وہ ان کے عقائد پر تنقید کرتے ہیں اور اس منہاج پر اعتراض کرتے ہیں جس کے مطابق ان کی قوم زندگی بسر کر رہی تھی۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ (۱۸ : ۱۵)
"یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے، یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی بین دلیل کیوں نہیں لاتے"۔

اسلامی نظریہ حیات میں یہ بات عقیدے کا حصہ ہے کہ انسان جو موقف اختیار کرے اس پر اس کے پاس دلیل بین ہو۔ ایسی دلیل ہو جو دل کو لگتی ہو، اور عقل اسے تسلیم کرتی ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ کذب اور افتراء ہے اور یہ چونکہ کذب علی اللہ ہے، اس لیے یہ زیادہ گھناؤنا جھوٹ ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۱۸ : ۱۵) "آخر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے"۔

یہاں تک تو اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں کا موقف واضح، صریح اور دو ٹوک ہے، اس میں کوئی تردد یا کوئی توقف نہیں ہے۔ یہ نوجوان ہیں، جسمانی لحاظ سے بھی قوی ہیں ایمان میں بھی شدید ہیں اور قوم جس غلط راہ پر چل رہی ہے، اس سے بھی انہیں سخت نفرت ہے۔

دو گروہوں کی راہیں مختلف ہو چکی ہیں' ان کی زندگی کے طریقے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں' اب دونوں کے باہم ملنے کے لیے کوئی موقف نہیں ہے۔ ان دونوں کی زندگیاں ایک جگہ نہیں گزر سکتیں۔ لہذا صرف ایک راہ رہ جاتی ہے وہ یہ کہ یہ نوجوان اپنے نظریات کو لے کر ہجرت کر جائیں یہ اپنی قوم کی طرف رسول بنا کر نہ بھیجے گئے تھے تاکہ وہ اپنی قوم کا مقابلہ کریں۔ اپنے نظریات پر جم جائیں' غلط نظریات کے مقابلے میں صحیح نظریات پیش کریں۔ ان کو دعوت دیں اور اس انجام تک پہنچیں جس تک رسول پہنچتے ہیں بلکہ وہ کچھ نوجوان تھے' کافرانہ ماحول میں ان کو ایمان کی روشنی مل گئی تھی۔ اگر وہ ایسے ماحول میں اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں تو اس معاشرے میں ان کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے' خود قوم کی راہ پر بھی نہ جا سکتے تھے' قوم کو اپنی راہ پر نہ لا سکتے تھے' نہ وہ تقیہ کر کے ان کے غلط الہوں کی عبادت کر سکتے تھے اور نہ اپنی عبادت کو چھپا سکتے تھے بلکہ راجح بات یہ ہے کہ ان کے عقائد و نظریات کے بارے میں کافروں کو علم ہو چکا تھا۔ اس لیے ان کے لیے صرف ایک ہی راہ رہ گئی تھی کہ وہ اپنے دین اور نظریات کو لے کر بھاگ نکلیں۔ اور شہر میں پر آسائش زندگی بسر کرنے کے بجائے کسی غار میں جا چھپیں۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا :

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۸ : ۱۶) "اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو' تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا"۔

یہاں حقیقی مومن دلوں کی اصل حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ نوجوان اپنی قوم کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے ہیں۔ یہ اپنے علاقے کو چھوڑ رہے ہیں۔ اپنے اہل و عیال کو چھوڑ رہے ہیں' گھروں اور کاروبار اور کرۂ ارض اور اس دنیا کی زیب و زینت کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور یہ لوگ کہاں پناہ لے رہے ہیں؟ ایک کرخت' پتھریلی جگہ اور تاریک غار میں۔ لیکن یہاں رحمت خداوندی ہے اور اس رحمت میں وہ خوش ہیں۔ اس تاریک غار میں انہیں اللہ کی رحمت سے رضامندی نہایت وسیع نظر آتی ہے۔

يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (۱۸ : ۱۶) "تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن پھیلا دے گا"۔

ینشر کا لفظ کشادگی' وسعت اور خوشی اور مسرت کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تاریک غار ان کے لیے ایک کھلا میدان ہے اور کھلی فضا ہے۔ طویل و عریض میدان ہے اور اس میں رحمت خداوندی کی چھاؤں ہے اور یہاں وہ نہایت ہی خوشحالی' آرام اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ جب اللہ کی رحمت ہو تو نہایت ہی تنگ جگہ ایک وسیع میدان نظر آتی ہے۔ اور ان کی اونچی اونچی دیواریں گر جاتی ہیں' اور تنہائی اور وحشت کے غبار چھٹ جاتے ہیں۔ رحمت خداوندی' شفقت اور خوشی اور سہولت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اس ظاہری دنیا کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور دنیاوی زندگی کی ان اقدار کی کیا قیمت جن سے

لوگ اس زندگی میں متعارف ہو چکے ہیں؟ اور ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی دنیا ایک دوسری دنیا ہے۔ اس دنیا کے ساز و سامان کچھ اور ہیں۔ اس دنیا میں ایک مومن رحمن کے ساتھ' انس و محبت کے ساتھ' اللہ کے سایہ میں' اللہ کی رضامندی' محبت اور اطمینان کے وسیع سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اب اس منظر سے پردہ گرتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو ایک دوسرا منظر ہمارے سامنے ہے۔ یہ نوجوان ہیں۔ یہ اس غار میں نہایت ہی اطمینان سے گہری نیند میں ڈوبے ہوئے آرام کر رہے ہیں۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

"تم انہیں غار میں دیکھتے تو تمہیں یوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے' جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے۔ تم انہیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں' حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انہیں دیکھتے تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی"۔

یہ عجیب مصورانہ منظر ہے' غار کے اندر پڑے ہوئے نوجوانوں کی ہو بہو تصویر کشی کی گئی ہے۔ الفاظ کے ذریعے ایسی تصویر کشی جس طرح قلم چل رہی ہے' اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ سورج طلوع ہوتا ہے اور وہ ایک طرف ہو کر گزر جاتا ہے گویا وہ عمداً ایسا کر رہا ہے تزاور' کا لفظ سورج کے طلوع کے عمل کے ساتھ ساتھ سورج کے ارادے کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یعنی وہ ان کو چھوڑ کر دائیں طرف نکل جاتا ہے اور جب وہ غروب ہوتا ہے کہ وہ شمال کی طرف ہو کر گزر جاتا ہے اور یہ لوگ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔

اس منظر کی تکمیل سے پہلے درمیان میں ایک قرآنی تبصرہ بھی آ جاتا ہے۔ قرآن کا یہ مخصوص اسلوب کلام ہے کہ قصے کے درمیان مناسب جگہ پر انسانی دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ (۱۸ : ۱۷) "یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے"۔ ان کو غار میں یوں رکھنا، سورج کی شعاعوں سے ان کو محفوظ رکھنا، اور سورج کی روشنی ان کو فراہم کرنا، اور غار کے اندر ان کو اس حال میں رکھنا کہ نہ مرتے ہیں اور نہ حرکت کرتے ہیں۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (۱۸ : ۱۷) "جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے"۔ ہدایت اور ضلالت کے لیے ایک قانون قدرت اور ایک سنت الہیہ ہے جو شخص آیات الہیہ کو دیکھ کر ہدایت کی راہ لے، اس کے ناموس قدرت کے تحت، تو وہ حقیقی ہدایت یافتہ ہو گا۔ اور جس نے ہدایت کے اسباب ہی فراہم نہ کیے وہ گمراہ ہوا اور اس کی گمراہی بھی سنت الہیہ کے مطابق اور ناموس قدرت کے تحت ہوتی ہے۔ اور اسے یوں اللہ ہی گمراہ کر دیتا ہے۔ اور پھر اس کا کوئی ولی مرشد نہیں ہوتا۔

اس درمیانی نوٹ کے بعد یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ لوگ سوتے میں کروٹیں لے رہے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ سو رہے ہیں۔ اور ان کا کتا کتوں کی عادت کے مطابق اپنے بازو غار کے دہانے پر پھیلائے سو رہا ہے۔ گویا وہ ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ ایسے حالات میں جو بھی ان کو دیکھے مرعوب ہو کر بھاگ اٹھے۔ کیونکہ وہ اس طرح سو رہے ہیں کہ جاگتے نظر آتے ہیں، کروٹ بدل رہے ہیں اور جاگتے نہیں۔ یہ تھی اللہ کی تدبیر ان کے بارے میں تاکہ وہ اپنے مقررہ وقت تک یوں ہی رہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اچانک یہ لوگ جاگ اٹھتے ہیں۔ ان میں زندگی کی حرکت دوڑ رہی ہے دیکھو اور سنو اس نئے منظر کو"۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾

"اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انہیں اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "دیکھو، کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسروں نے کہا "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے"۔ پھر وہ بولے "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور

وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے' ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے' یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے' اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے''۔

اس قصے کے بیان میں سر پر ائز کا عمل جاری ہے۔ اچانک جب یہ منظر سامنے آتا ہے تو نوجوان اب جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ یہ اندازہ صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے اس غار میں کتنا وقت گزارا۔ اور کتنی دیر تک سوتے رہے۔ یہ آنکھیں ملتے ہیں' ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پوچھتے ہیں بھائی کتنی دیر ہو گئی۔ طویل نیند سے جاگ کر ہر شخص پہلا سوال یہی کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک طویل نیند کے کچھ آثار بھی پا رہے تھے۔ تو انہوں نے یہی اندازہ لگایا۔

لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (۱۸ : ۱۹) ''شاید ایک دن یا اس سے کچھ کم''۔ اس کے بعد انہوں نے یہ موضوع سخن ترک کر دیا' جس پر بحث کا کوئی عملی فائدہ نہ تھا۔ اور اس مسئلے کو اللہ کے علم کے حوالے کر کے انہوں نے عملی کام میں مشغول ہونا مناسب سمجھا۔ یہ اہل ایمان کی شان اور عادت ہوتی ہے کہ وہ ان معاملات میں طویل دلچسپی نہیں لیتے' جن میں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بھوکے تھے اور ان کے پاس چاندی کے روپے تھے جنہیں وہ شہر سے لے کر نکلے تھے۔

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (۱۸ : ۱۹) ''پھر وہ بولے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا' چلو اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے' وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے''۔ یعنی وہ پاکیزہ اور اچھا کھانا شہر میں تلاش کرے اور اس میں سے کچھ خرید کر لے آئے۔

وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ ان کی جائے پناہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے اور انہیں شہر کے حکمران پکڑ نہ لیں اور اس طرح ان کو سنگسار کر کے قتل نہ کر دیں۔ کیونکہ ان حکمرانوں کے خیال میں وہ مروجہ دین سے خارج ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ ایک مشرک گاؤں میں وہ ایک خدا کو پوجتے تھے یا انہیں اس کا ڈر تھا کہ انہیں ان کے عقائد کی وجہ سے سزا دے کر فتنے میں نہ ڈال دیں۔ یہی وہ بات تھی جس سے وہ ڈرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس شخص کو جو شہر جا رہا تھا' سخت احتیاط کرنے کی تاکید کر رہے تھے۔

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا (۱۹) اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۲۰) (۱۸ : ۱۹ - ۲۰) ''اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے' ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے' یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے' اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں

گے"۔ظاہر ہے کہ جو شخص ایمان کی راہ چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کرے وہ کب فلاح پا سکتا ہے۔یہ تو عظیم خسارہ ہے۔

ہم اس منظر میں دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس طرح ہم کلام ہیں' ڈر رہے ہیں' پکڑے جانے کا خوف ہے اور سہمے ہوئے ہیں۔ان کو معلوم نہیں کہ زمانہ گزر گیا۔سال و ماہ ایک عرصہ تک گردش کر چکے ہیں۔ صدیوں کے بعد نئے لوگ پیدا ہو گئے ہیں اور نیا زمانہ ہے۔وہ شہر جس کے وہ باشندے تھے اس کے در و دیوار بدل گئے ہیں اور جن حکمرانوں سے وہ ڈر رہے ہیں ان کا دور ہی چلا گیا ہے اور وہ قصہ کہ اس طرح فلاح صدی میں فلاں حکمران کے ظلم سے تنگ آکر نوجوانوں کا ایک گروہ شہر چھوڑ گیا تھا۔وہ باپ دادا سے لوگوں میں نقل ہوتا چلا آرہا تھا۔اور لوگوں کے درمیان ان کے بارے میں اختلاف رائے بھی نقل در نقل ہوتا ہوتا چلا آرہا تھا۔ان کی تعداد' ان کے عقائد کے بارے میں اور یہ کہ کتنا عرصہ ہوا ہے ان کا اس شہر کو چھوڑنے کا اور یہ کہ کب سے وہ لوگ روپوش ہیں۔

یہاں آکر پردہ گر جاتا ہے' غار کے اندر ان کی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔یہاں سیاق کلام میں پھر ایک خلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ذہن انسانی خود اسے بھر دیتا ہے۔اور ایک دوسرا منظر سامنے آجاتا ہے۔

اب معلوم ہو جاتا ہے کہ اہل شہر اب سب کے سب مومن ہو چکے ہیں۔اور اہل شہر کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اصحاب کیف میں سے ہے جو مدت دراز ہوئی ایمانی جذبے سے شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے تو وہ ان لوگوں کا غایت درجہ احترام کرتے ہیں لیکن ہم یہاں سوچ سکتے ہیں کہ جب اس شخص کو معلوم ہو گا کہ وہ جب شہر چھوڑ کر گئے ہیں تو صدیوں کا عرصہ گزر گیا ہے۔نیز اس شخص نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہر بدل گیا ہے۔جب سے انہوں نے چھوڑا ہے بہت ہی طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ان کے اردگرد کی دنیا بالکل بدل گئی ہے۔اس لیے ان کے لیے ہر چیز ایک عجوبہ ہے۔وہ جب اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے تو وہ زمانہ قدیم کے لوگ نظر آتے تھے۔بلکہ لوگوں کے احساس اور ان کی نظر میں وہ عجوبہ تھے۔اس لیے لوگوں نے بھی ان کے ساتھ عام انسانوں جیسا سلوک نہ کیا ہو گا۔اور ان کے اپنے دور میں جو رابطے' رشتہ داریاں' رسم و رواج کے عادات و اطوار سب کے سب بدل گئے ہیں' گویا وہ زمانہ قدیم کی ایک زندہ یادگار ہیں۔جو واقعی زندہ اس معاشرے میں لا کر کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں پر اللہ کا مزید کرم یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو فوراً اس دنیا سے اٹھا لے۔چنانچہ یہ لوگ فی الفور فوت ہو جاتے ہیں۔

یہ ہمارا کام ہے کہ ہم یہ سب واقعات تصور کر لیں۔کیونکہ قرآن ان واقعات کو چھوڑ کر اب آخری منظر پیش کرتا ہے۔یہ لوگ فوت ہو گئے ہیں اور لوگ اس غار کے باہر جمع ہیں اور ان کے بارے میں باہم گفتگو اور تکرار کر رہے ہیں۔لوگوں کا تنازعہ یہ تھا کہ یہ لوگ کس دین پر تھے۔اب ان کو کس طرح دوام بخشا جائے اور کیا ذرائع اختیار کیے جائیں کہ ان کا ذکر دائماً رہ جائے اور اگلی نسلیں بھی انہیں یاد رکھیں تاکہ ان کے اس عجیب واقعہ سے اگلی نسلیں بھی عبرت لیں۔اور اصحاب کہف سب کے لیے مشعل راہ ہوں۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ

مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾

"اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آکر رہے گی (مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اس وقت وہ آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا "ان پر ایک دیوار چن دو' ان کا رب ہی ان کے معاملہ کو بہتر جانتا ہے"۔ مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے انہوں نے کہا "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"۔

اس واقعہ سے قرآن مجید کے پیش نظر کیا نتیجہ نکالنا مقصود ہے؟ یہ کہ بعث بعد الموت کے لیے یہ واقعہ ایک قریب الفہم اور محسوس نمونہ ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ موجودہ انسانی ڈھانچے کو بھی صدیوں تک زندہ رکھ سکتا ہے اور دوبارہ بھی اٹھا سکتا ہے اور قیام قیامت اور بعث بعد الموت حق ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یوں اللہ نے ان نوجوانوں کو ان کی نیند سے جگایا اور ان کی قوم کو بتایا کہ صدیوں تک یہ لوگ یونہی پڑے تھے۔

اب بعض لوگوں نے کہا

فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا (۱۸ : ۲۱) "بعض لوگوں نے کہا ان پر ایک دیوار چن دو"۔ کیونکہ ان کے عقائد کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ہے۔

رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ (۱۸ : ۲۱) "ان کا رب ان کے معاملے کو بہتر جانتا ہے"۔ یعنی ان کے عقائد اور ان کی پوزیشن کے بارے میں۔ لیکن اس وقت اصحاب حل و عقد نے کہا

لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا (۱۸ : ۲۱) "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"۔ مسجد سے مقصد یہاں عبادت گاہ ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ تھا کہ وہ انبیاء اور اولیاء کی قبروں کے قریب عبادت گاہ بنا دیتے تھے۔ جس طرح آج مسلمانوں میں سے جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کار کو چھوڑ کر 'صلحاء کی قبروں کے ساتھ مساجد اور گنبد بناتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم وصالحیھم مساجد "اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں سے عبادت گاہ بنا دی"۔

اب اس منظر پر بھی پردہ گرتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو اصحاب کہف کے بارے میں اب تاریخی مباحث شروع ہیں' جیسا کہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ لوگ تاریخی خبریں اور روایات نقل کرتے رہتے ہیں۔ بعض واقعات کو حذف کر دیتے ہیں' بعض میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور نسلاً بعد نسل ان واقعات میں اپنے خیالات بھرتے رہتے ہیں۔ اب قصے پھیلتے جاتے ہیں' اصل قصہ الگ رہ جاتا ہے' کچھ اور واقعات اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک ایک بات کے بارے میں اقوال و اختلاف سامنے آتے ہیں اور قیل و قال میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا ہے' اختلافات بڑھتے جاتے ہیں۔

سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

۱۵ "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو' میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو' اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو"۔

اب ان لوگوں کی تعداد کے بارے میں بحث لاحاصل ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کی تعداد تین ہو یا چار ہو' پانچ ہو یا زیادہ تو اس سے اصل واقعہ اور اس سے جو عبرت سکھانا تھا اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ کتنے تھے' یہ بات اللہ ہی جانتا ہے۔ یا وہ قلیل لوگ جانتے تھے جن کے سامنے یہ واقعہ ہوا۔ یا جن تک صحیح روایات پہنچیں۔ لہٰذا ان کی تعداد کے بارے میں مباحث کرنا بے فائدہ بات ہے۔ ان کی تعداد کم ہو یا زیادہ ان کے واقعہ سے جو نصیحت اور عبرت حاصل ہوتی ہے' اس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے قرآن مجید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ آپؐ کسی سے ان کی تعداد کے بارے میں نہ الجھیں اور نہ ان کے بارے اہل کتاب سے پوچھیں کیونکہ ان کا علم خود مضطرب ہے۔ اس لیے کہ اسلام اور قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ انسان کو عقل و خرد کی قوتوں کو ایسے کاموں میں نہیں کھپانا چاہیے جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ نیز ایک مسلم کو اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہئے جس میں اسے پورا پورا علم حاصل نہ ہو۔ یہ واقعہ ایک قدیم تاریخی واقعہ ہے۔ اصل حقائق سے صرف اللہ خبردار ہے۔ لہٰذا اسے علم الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہئے۔

ماضی کے غیوبات کے بارے میں بحث سے منع کیا گیا تو اس موقعہ پر اس سے بھی منع کر دیا گیا کہ مستقبل کے غیوبات کے بارے میں فضول پیشین گوئیوں میں بھی نہ الجھ جائے' کہ کل کیا ہو گا؟ جب انسان مستقبل کے بارے میں کوئی بات جانتا نہیں تو وہ اس کے بارے میں کیا قطعی رائے دے سکتا ہے؟

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

"اور دیکھو کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کر دوں گا (تم کچھ نہیں کر سکتے) الا یہ کہ اللہ چاہے۔ اگر بھولے سے ایسی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو' اور کہو "امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا"۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر حرکت اور ہر سکون بلکہ زندہ انسانوں کے سانسوں میں سے ہر سانس اللہ کے ارادے کی مرہون منت ہے۔ عالم غیب لمحہ حاضرہ کے پردے کے پیچھے مستور ہے' اور انسانی آنکھ اس پردے کے پیچھے نہیں دیکھ سکتی۔ انسان چاہے بہت ہی عقلمند ہو' مستقبل کے بارے میں اس کی عقل کند ہے اور کچھ جاننے سے قاصر ہے۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں کل یہ کروں گا۔ جبکہ کل پردۂ غیب کے پیچھے ہے اور کل کے نتائج کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان بیٹھ جائے اور مستقبل کے امور کے بارے میں کوئی غور و فکر نہ کرے۔ اور وہ اپنی زندگی کے بارے میں صرف ایک دن ہی کی منصوبہ بندی کرے یا لمحہ بہ لمحہ زندگی کے بارے میں نئی نئی سوچ سامنے لائے اور اپنی سابقہ زندگی کو حال اور مستقبل کے ساتھ مربوط نہ کرے۔ ایسا مفہوم اس آیت کا ہرگز نہیں ہے بلکہ مفہوم یہ ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں غیبی اور ناگہانی واقعات اور اللہ کی مشیت کا بھی خیال رکھے۔ وہ جو عزم چاہے کرے' جو منصوبہ چاہے بنائے' لیکن اس کے بارے میں اللہ کی مدد کا طلب گار رہو' یہ بات ذہن میں رکھے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اگر کام اس کے منصوبے کے مطابق ہو گیا تو بہتر ورنہ اگر اللہ کی مشیت نے اس کے خلاف کوئی اور تدبیر کر دی تو اسے بھی وہ مسجد نہ سمجھے' کیونکہ اللہ کا حکم بہرحال برتر رہتا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ سوچے' تدبیر کرے۔ لیکن اسے یہ شعور زندہ رکھنا چاہئے کہ وہ جو سوچتا ہے' وہ توفیق الٰہی اور اللہ کی فراہم کردہ آسانیوں کے نتیجے ہی میں کر سکتا ہے۔ اس کی وہی سوچ اور وہی تدبیر کامیاب ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال ہو۔ یاد رہے کہ یہ کاہلی' سستی' ضعف اور بے تدبیری کا جواز فراہم نہ کرے بلکہ چاہئے کہ اس سے قوت' اعتماد' اطمینان اور عزم مضبوط ہو۔ اور اگر کام اس کی تدابیر کے خلاف ہو جائے تو بس وہ یہی کہہ دے کہ اللہ کا حکم اور فیصلہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں' مطمئن ہیں اور سر تسلیم خم کرتے ہیں کیونکہ ہونا وہی تھا جو ہوا' البتہ ہمیں وہ معلوم نہ تھا وہ پردۂ غیب کے پیچھے مستور تھا۔

یہ ہے وہ طریقہ کار جس پر اسلام ایک مومن کو ڈالنا چاہتا ہے لہٰذا ایک مومن تنہائی اور وحشت محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ہر وقت فکر و تدبیر کرتا رہتا ہے اور اگر وہ کامیاب ہوتا ہے تو وہ غرور اور سرکشی اختیار نہیں کرتا۔ نہ وہ قنوطیت اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی منصوبے میں ناکام ہو جائے' بلکہ کامیابی اور ناکامی دونوں میں وہ اللہ سے جڑا رہتا ہے۔ اس کا اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ کی توفیق پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے فیصلوں پر راضی برضا ہوتا ہے۔ نہ وہ متکبر ہوتا ہے اور نہ قنوطی ہوتا ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ (۱۸ : ۲۴) "اور جب تم بھول جاؤ تو اللہ کو یاد کرو"۔ اگر کسی وقت تم اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھول جاؤ تو فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور کہہ دو

وَقُلْ عَسَى أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَذَا رَشَدًا (۱۸ : ۲۴) "اور کہو' امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا"۔ اس نہج کے مطابق انسانی دل ہمیشہ اللہ سے جڑا ہوتا ہے' اپنے اہم امور میں بھی اور اپنے تمام منصوبوں میں بھی۔

یہاں لفظ عسی (امید ہے) اور لفظ لاقرب (یعنی قریب تر بات) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ یہ مقام بلند پانا عام لوگوں کے لیے بہت ہی مشکل ہے اور ہر انسان کو چاہئے کہ وہ ایسے مقام پر قائم رہنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہے۔

اس قصے سے یہاں تک ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ غار میں کتنا عرصہ رہے۔ اب ہمیں یقینی طور پر معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کتنا عرصہ رہے ہیں۔

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ

"اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے' اور (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) ۹ سال اور بڑھ گئے ہیں۔ تم کہو' اللہ ان کے قیام کی مدت زیادہ جانتا ہے' آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں' کیا خوب ہے' وہ دیکھنے والا اور سننے والا"۔

یہ ہے ان کے بارے میں فیصلہ کن بات۔ اللہ جو عالم ہے غیوب السموات والارض کا' اس نے یہ اطلاع دے دی۔ وہی ہے جو بہترین سننے والا ہے اور وہی ہے جو بہترین دیکھنے والا ہے۔ اس اعلان کے بعد کسی کے لیے کوئی بحث و جدال کی گنجائش نہیں ہے۔

اس قصے پر اب یہ تبصرہ سامنے آتا ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ولی ہے اور اس کے حکم اور اس کے قانون میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔

مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾

"زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبرگیر اس کے سوا نہیں' اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جو وحی آپؐ پر نازل ہوئی آپؐ اس کی تلاوت کریں۔ اسی میں دو ٹوک فیصلے ہیں۔ اس کے تمام فیصلے عین سچائی ہیں' اس میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ ہمیں صرف اللہ کو پکارنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ کی پناہ کے سوا کوئی اور پناہ نہیں ہے۔ دیکھئے اصحاب کہف اللہ کی طرف بھاگے تو اللہ نے ان پر رحمت کی۔

وَاتْلُ مَآ أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾

"اے نبیؐ' تمہارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے (جوں کا توں) سنا دو' کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردو بدل کر دو گے تو) اس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے"۔

یوں یہ قصہ اپنی انتہا کو پہنچتا ہے' اس کے آغاز میں' اس کے درمیان میں اور اس کی انتہا میں جابجا وہ ہدایات ہیں جن کی وجہ سے اس قصے کو قرآن میں جگہ دی گئی ہے۔ دینی اور نظریاتی ہدایات کے ساتھ ساتھ قصے کا فنی انداز بیان بھی نہایت اعلیٰ ہے۔

---()---

درس نمبر ۱۳۱ ایک نظر میں

یہ سبق سب کا سب اسلامی نظریہ حیات کی قدروں کے تعین کے موضوع کے ساتھ منسلک ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اعلیٰ قدریں صرف مال و دولت 'منصب و مرتبہ اور اقتدار و اختیارات ہی نہیں ہیں' نیز اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اعلیٰ قدریں صرف زندگی کا سازو سامان یا عیش و عشرت ہی نہیں ہیں۔ یہ تو سب کھوئی اور زائل ہونے والی چیزیں ہیں۔ ان چیزوں سے جو حلال و طیب ہیں اسلام ان کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن اسلام ان چیزوں کو انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ بھی قرار نہیں دیتا۔ اگر کوئی ان چیزوں سے زندگی میں فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ بے شک اٹھائے لیکن وہ اس ذات باری کا بھی شکریہ ادا کرے۔ جس نے انسان کے لیے یہ یہ نعمتیں پیدا کی ہیں۔ اور یہ شکر عمل صالح کے ذریعہ ادا کرے۔ کیونکہ اعمال صالحہ اللہ کے ہاں باقی رہنے والے ہیں اور ان کے نتائج انسانوں کے لیے عقبیٰ میں اچھے ہیں۔

اس سبق کا آغاز حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس ہدایت سے ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ جم جائیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور جن لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا ان کو بھلا دیں۔ اس کے بعد فریقین کو ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اپنے مال 'عزت اور سازو سامان پر اتراتا ہے اور دوسرا ایمان خالص پر فخر کرتا ہے اور یہ امید رکھتا ہے کہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ سب سے بہتر ہے۔ اس کے بعد حیات دنیا کی فنا اور زوال کو ایک تمثیل سے واضح کیا جاتا ہے۔ جس طرح دنیا میں شادابی پیدا ہوتی ہے اور پھر یہ چیزیں بھس بن جاتی ہے اور ان کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور آخر میں یہ ثابت شدہ حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (۱۸ : ۴۶) "یہ مال اور یہ اولاد محض دنیاوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں"۔

---o0o---

درس نمبر ۱۳۱ تشریح آیات

۲۸--- تا --- ۴۶

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ

"اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں 'اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے 'اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے 'اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات اشراف قریش کے بارے میں نازل ہوئیں جن کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ اپنی مجلس سے فقراء' اہل ایمان مثلاً بلال' عمار' خباب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کو نکال دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خواہش تھی کہ اکابر قریش اگر ایمان لے آئیں تو اسلام کو ترقی نصیب ہو جائے۔ نیز آپ یہ بھی خواہش رکھتے تھے کہ ان کے لیے عام مسلمانوں سے علیحدہ ایک مجلس کا انتظام کریں 'کیونکہ ان غرباء کے بدن پر ایسے جبے تھے جن سے پسینے کی بو آتی تھی 'اور کبرائے قریش کو یہ بات اذیت دیتی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم ان کے ایمان کے معاملے میں دلچسپی رکھتے تھے 'اس لیے آپ نے دل میں اہل قریش کے اس مطالبے پر غور شروع کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ (۱۸ : ۲۸) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں"۔ یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک حقیقی قدر قائم کر دی اور حق و باطل کی جدائی کے لیے ایک ایسا ترازو قائم کر دیا جس میں کوئی

غلطی نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد پھر یہ اصول آتا ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸ : ۲۹) "جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔ اسلام کسی کی چاپلوسی نہیں کرتا۔ اور نہ وہ جاہلیت کے پیمانوں سے لوگوں کو ناپتا ہے' نہ اسلام کسی بھی جاہلیت کے پیمانوں کو قبول کرتا ہے جو اسلام کے پیمانوں سے علیحدہ ہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ "اپنے دل کو مطمئن کر دو"۔ نہ پریشان ہو اور نہ جلدی کرو۔

مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۱۸ : ۲۸) "ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں"۔ ان کا مطلوب اللہ ہوتا ہے وہ صبح و شام اللہ کی ہی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ سے منہ نہیں پھیرتے۔ صرف اس کی رضامندی کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔ جس کی تلاش میں یہ طالبان دنیا ہوتے ہیں۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸ : ۲۸) "اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو' کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو"۔ یعنی آپ کی نظروں میں دنیا کی زیب و زینت کی اہمیت زیادہ نہ ہو جائے' جس کا اہتمام' یہ اہل دنیا بہت کرتے ہیں کیونکہ یہ تو دنیا کی زندگی کی زیب و زینت ہے اور جو لوگ صبح و شام اللہ کی رضامندی کی تلاش میں ہیں ان کی نظریں جس افق پر ہیں وہ بہت بلند ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸ : ۲۸) "کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے' اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے"۔ یعنی ان کا جو مطالبہ ہے کہ امرائے قریش اور ان کے درمیان امتیازی سلوک کرو' اس معاملے میں ان کی پیروی نہ کرو' اگر یہ لوگ اللہ کا ذکر کرتے تو ان کے کبر و غرور میں کچھ کمی آ جاتی اور ان کے سر ذرا جھک جاتے۔ اس غلو میں وہ کمی کر دیتے' اور غرور کی جن بلند چوٹیوں پر وہ بیٹھے ہیں ان سے ذرا نیچے اتر آتے۔ اور اللہ کی بزرگی اور بلندی کا شعور انہیں حاصل ہوتا۔ جس کے نتیجے میں ان کے نزدیک تمام انسان مساوی ہو جاتے۔ یہ لوگ اسلامی اخوت کے رابطے کو سمجھ جاتے۔ جس کے اندر تمام انسان بھائی بھائی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں یعنی جاہلی خواہشات کی۔ یہ بے وقوف ہیں' ان کی خواہشات احمقانہ ہیں' انہوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے۔ لہٰذا اس کا صلہ ان کو یہ ملنا چاہیے کہ ان کو بھی بھلا دیا جائے۔

اسلام کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ اللہ کے ہاں کسی کو مال' نسب' مرتبے کے زاویہ سے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قدریں تو زائل ہونے والی کھوٹی قدریں ہیں۔ اللہ کے نزدیک درجات کی بلندی و پستی صرف اس لحاظ سے ہے کہ اللہ کے ہاں مرتبہ کس کا بلند ہے۔ اور اللہ کے ہاں درجات کی بلندی کی پیمائش اس طرح ہوتی ہے کہ کون اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہے' کون کس قدر اللہ کی طرف خالص ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ہوائے نفس ہے' حماقت ہے اور باطل اور زوال پذیر ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (۱۸ : ۲۸) "کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے"۔ اس کا دل غافل ہوا کہ وہ اپنی ذات' اپنے مال اور اپنی اولاد کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا' اس کی توجہات کا مرکز دنیا کا سازو سامان' دنیا کی لذات' اور خواہشات نفس بن گئے۔ اس کے دل میں اللہ کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ یاد رہے کہ جو دل بھی ان مشاغل میں مشغول ہو جائیں اور ان کو اپنا مقصود اور مطلوب بنالیں' وہ ذکر الہیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اللہ ان کی غفلت میں اور اضافہ کرتا ہے اور جس حال میں وہ ہوتے ہیں اس میں ان کو مہلت دیتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی ایسے ہی گزر جاتی ہے اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ نے جو انجام تیار کیا ہوتا ہے' اس تک وہ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸ : ۲۹) "صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔ نہایت عزت کے ساتھ' نہایت صاف گوئی کے ساتھ' نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں ہے یہ اعلان۔ حق کسی کے سامنے جھکتا نہیں۔ کسی کے سامنے ٹیڑھ نہیں اختیار کرتا۔ وہ بڑی قوت کے ساتھ آتا ہے۔ نہایت صراحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس میں کوئی رو رعایت نہیں ہوتی۔ جو چاہے اسے مان لے' جو چاہے اس کا انکار کر دے۔ اگر کسی کو سچائی پسند نہ ہو تو اپنی راہ لے۔ اگر کسی شخص کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کی خواہشات اللہ کی ہدایات کے تابع ہوں گی تو پھر نظریہ کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی سودا بازی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی کی کھوپڑی اللہ کی بلندی کے مقابلے میں نہیں جھکتی اور وہ اپنے غرور کے بلند محلات سے نیچے نہیں اترتا تو اسلامی نظریہ حیات کو بھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کسی شخص کی ملکیت نہیں ہے کہ وہ اس میں رو رعایت کر دے' سودا بازی کر دے' یہ تو اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ تمام جہانوں سے غنی ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے' جہاں تک اسلامی نظریہ حیات کا تعلق ہے۔ وہ کسی شخص پر فخر نہیں کرتا اور نہ کسی ایسے شخص سے نظریاتی امداد طلب کرتا ہے جو شخص اسے خالص طور پر قبول نہیں کرتا یا جو شخص اس نظریے کو پوری طرح قبول نہیں کرتا' جس طرح کہ وہ ہے' بغیر کسی تغیر و تبدل کے۔ اور جو شخص اپنے آپ کو ان لوگوں سے بلند کوئی مخلوق سمجھتا ہے جو اپنے آپ کو رات اور دن رب کی پکار میں مصروف رکھتے ہیں اور صرف اللہ کی رضامندی کے طلبگار ہیں' ایسے شخص سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے' نہ اسلام کے لیے اور نہ مسلمانوں کے لیے۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد قرآن کریم قیامت کے مناظر میں سے وہ چیزیں دکھاتا ہے جو اللہ نے مسلمانوں کے لیے تیار کی ہیں اور جو کفار کے لیے تیار کی ہیں۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝

"ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔ وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہو گا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا' بد ترین پینے کی چیز اور بہت بری آرام گاہ! رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں' تو یقیناً ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ ان کے لیے سدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی' وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے' باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے' اور اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام!"

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ (۱۸ : ۲۹) "ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے"۔ یہ آگ تیار ہے اور حاضر و موجود ہے۔ اسے جلانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہے' نہ اس کے جلانے کے لیے اور تیار کرنے پر کوئی وقت لگتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اللہ کی جانب سے کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے صرف کن کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جب اللہ کا ارادہ ہو جائے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں آگ کے لیے لفظ "اعتدنا" استعمال کیا گیا ہے یعنی ہم نے اسے تیار کیا ہے یعنی بڑی سرعت سے اس کو تیار کیا گیا ہے' یعنی ان کے لئے پکڑ لیا جائے گا اور جلدی سے اس تیار شدہ آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

یہ آگ ایسی ہوگی کہ اس کی خیمے جیسی لپٹیں ظالموں کو گھیر لیں گی۔ یہ اس سے بھاگ نہ سکیں گے۔ نہ ان کو اس سے چھوٹنے اور نجات پانے کی کوئی امید ہے۔ نہ ان کو یہ امید ہے کہ کس طرف سے ان کو کوئی ٹھنڈی ہوا ملے گی۔ نہ یہ امید ہے کہ اس میں ان کے لئے آرام کا وقفہ ہو گا۔

اگر وہ وہاں گرمی پیویں اور شدت سے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی۔ اور ان کو ایسا پانی دیا جائے گا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہو گا اور ایک قول کے مطابق گرم پیپ جیسا ہو گا۔ یہ منہ کو بھون ڈالے گا۔ جب یہ منہ کو بھول ڈالے گا تو ان کے گلوں اور ان کے پیٹ کا اس سے کیا حال ہو جائے گا۔

بِئْسَ الشَّرَابُ (۱۸ : ۲۹) "بد ترین پینے کی چیز"۔ یعنی یہ بد ترین تواضع ہوگی جو گرمی سے جلے ہوئے ان پیاسے لوگوں کی کی جائے گی۔ کیا بری آگ ہوگی اور پھر اس آگ کے وہ خیمے کس قدر برے ہوں گے' جو ان کے ٹھہرنے اور آرام کے لیے ان کو مہیا کیے جائیں گے۔ ان کو رہنے کے لیے جو سہولیات دی جا رہی ہیں ان میں بھی ان کے ساتھ ایک نہایت ہی سخت مذاق ہو گا۔ کیونکہ وہاں ان کو سہولیات تو نہیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ یہاں تو ان کو بھول ڈالنے کا انتظام ہو

گا۔ البتہ یہاں آگ کے خیموں کا ذکر اس لیے ہے کہ ان لوگوں کی سہولیات کے ساتھ ان لوگوں کی سہولیات کا مقابلہ ہو جائے جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیا۔ لیکن دونوں کی سہولیات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔

یہ تو رہے حالات ان لوگوں کے جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ اب رہے وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کیا اور نیک عمل کیے تو ان کے لیے سدا بہار باغات ہوں گے۔ اور یہ ان باغات میں رہیں گے۔ ان کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ ان کو سیراب کریں گی۔ سبز منظر ہو گا اور ہوا میں اعتدال ہو گا۔ اور وہاں وہ ان سہولتوں کے حقدار ہوں گے۔

مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ "اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے"۔ اور ریشم کے قسم قسم کے کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ نرم ریشم کے اور اطلس کے نرم اور موٹے کپڑوں میں۔ اور زیب و زینت کے لیے انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸ : ۳۱) "بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کا جائے قیام!" اب جس کی مرضی ہو وہ اس راہ کو اختیار کرے۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے، جو چاہے فقراء اہل ایمان کی مجلس میں بیٹھے جبکہ ان کے جبوں اور لباس سے پسینہ کی بو آ رہی ہے اور جو چاہے ان سے نفرت کرے۔ جن لوگوں کو ان غریب حضرات کے لباس سے پسینے کی بو پسند نہیں، جن کے دل پاک ہیں اور ذکر الہیٰ سے معطر ہیں تو پھر ان کو چاہیے کہ وہ جہنم کی آگ سے بنائے ہوئے محلات اور خیموں کی سہولیات حاصل کر لیں۔ اور پھر تیار ہو جائیں تیل کی تلچھٹ یا پیپ کا شربت پینے کے لیے، جس سے لوگ جہنم کے منہ جھلس جائیں گے۔

---ooo---

اس کے بعد باقی رہنے والی اسلامی اقدار اور فنا ہونے والی کافرانہ اقدار کو سمجھانے کے لیے دو آدمیوں اور دو باغوں کا قصہ سنایا جاتا ہے۔ دو کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک کردار ان لوگوں کا ہے جو زوال پذیر اقدار کے حامل کا نمونہ ہے اور دوسرا کردار ان لوگوں کا ہے جو لازوال اقدار کے حاملین ہیں۔ یہ دونوں نمونے نہایت ہی واضح طور پر پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان نفوس کے لیے نمونہ ہو جو اس دنیائے زندگی کی فانی اقدار کے دلدادہ ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی نمونہ ہو جو اللہ کی رضا اور اخروی اقدار کے دلدادہ ہیں۔ اور یہ کردار دونوں قسم کے لیے ایک انسانی نمونہ ہیں۔ جو شخص دو باغوں کا مالک ہے وہ دنیا داروں کا نمونہ ہے جسے دولت اور ثروت مدہوش کر دیتی ہے اور سازوسامان دنیا اسے سرکش کر دیتا ہے اور وہ اس قوت قاہرہ کو بھلا دیتا ہے جو لوگوں اور ان کی تقدیر کی مالک ہے۔ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ دنیاداری دائمی ہے اور اس کے لیے کوئی فنا نہیں ہے اور اس شخص کا ساتھی اہل ایمان کے لیے ایک نمونہ ہے ان لوگوں کے لیے جن کو اپنے ایمان پر فخر ہوتا ہے، جو ہر وقت اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان نعمتوں کا بھی کوئی خالق ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حمد و شکر بجا لائیں، اس کی ناشکری نہ کریں اور انکار بھی نہ کریں۔

قصے کا آغاز دو باغوں کے بیان سے ہوتا ہے کہ وہ کس قدر قیمتی اور سرسبز باغ ہیں۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ

مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ

"اے نبی" ان کے سامنے ایک مثال پیش کر دو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اسے خوب نفع حاصل ہوا"۔

یہ دو باغ انگوروں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اردگرد کھجوروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی اور ان کے درمیان زرعی زمین بھی تھی اور ان کے درمیان پانی کی ایک نہر تھی۔ یہ ایک خوبصورت منظر تھا اور اس میں بھرپور زندگی تھی اور سامان زندگی تھا۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (۱۸: ۳۳) "دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی"۔ یہاں قرآن کریم نقص اور کمی کے لئے لفظ "ظلم" استعمال کرتا ہے تاکہ ان دونوں باغوں اور ان کے مالک کے کردار کے درمیان تقابل پیدا کیا جا سکے۔ کیونکہ باغات نے تو اپنا حق ادا کر دیا جبکہ باغات کے مالک نے تکبر کیا' سرکشی اختیار کی اور کبرو غرور کی وجہ سے اللہ کا شکر ادا نہ کیا اور ظلم کیا۔

اب ذرا ان دو باغوں کے اس مالک کو ملاحظہ کریں کہ اس کا پیمانہ بھر جاتا ہے اور وہ ان کو دیکھ کر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہے۔ فخر و مباہات سے اس کا سر غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کا پیمانہ مرغی کے پیمانے کی طرح ہے' جلدی بھر جاتا ہے' اور پھر یہ طاؤس کی طرح فخر سے ناچنے لگتا ہے اور اپنے فقیر ساتھی اور ہمسائے پر بوجہ کبر' اپنے آپ کو بلند سمجھتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے:

فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

"یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کرتے ہوئے بولا "میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقتور نفری رکھتا ہوں"۔

پھر وہ اپنے اس رفیق کو لے کر ایک باغ میں پھرتا ہے۔ اس کا دل خوشی سے جوش میں آتا ہے۔ اب یہ سخت غرور کی حالت میں داخل ہوتا ہے' اللہ کو اس نے پوری طرح بھلا دیا۔ اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہے کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر بجا لانا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ یہ باغات کبھی بھی نیست و نابود نہ ہوں گے۔ اس نے قیام قیامت کو بالکل بھلا دیا اور اس کا صاف صاف انکار کر دیا۔ پھر اس نے قیام قیامت کا سرے سے انکار کر دیا۔ چلو اگر قیامت قائم بھی ہو جائے تو وہاں بھی اس کے ساتھ ترجیحی سلوک اور عزت کا معاملہ ہو گا۔ کیا اس دنیا میں ... باغات کا

مالک نہیں ہے' لہذا لازمی ہے کہ وہاں بھی اسے یہ سہولتیں بہرحال حاصل ہوں۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَآ أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِۦٓ أَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَمَآ أَظُنُّ ٱلسَّاعَةَ قَآئِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّى لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا ﴿٣٦﴾

''پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا''میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی' اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا''۔

ہمیشہ اصحاب جاہ و مال اور اہل ثروت اور اہل اقتدار کے دلوں میں یہی سودا سمایا ہوتا ہے کہ اس فانی دنیا میں ان کی قدر و منزلت ہے' اسی طرح آخرت میں بھی انہیں یہی اعزاز ملے گا۔عالم بالا میں بھی وہ کرسی نشین ہوں گے۔اگر اہل دنیا کے ہاں ان کا یہ مرتبہ ہے تو اہل سماء میں کیوں نہ ہو گا۔

اب ذرا اس کے اس ساتھی کو دیکھئے جو فقیر ہے اور اس کے پاس کوئی دولت نہیں ہے۔نہ اس کے پاس باغ ہے اور نہ اس کے پھل ہیں۔کیونکہ اس کے نزدیک ان باغات کے مقابلے میں ایک اور چیز ایسی ہے جو زیادہ قیمتی ہے۔اسے اپنے عقیدے اور ایمان پر فخر ہے۔اسے اپنے اس رب پر بھی فخر ہے جس کے سامنے بڑے بڑے سر جھک جاتے ہیں۔ یہ شخص اپنے اس مغرور سرپھرے اور منکر حق متکبر ساتھی کو بڑے اعتماد سے مخاطب کرتا ہے۔اور اسے یاد دلاتا ہے کہ تم اپنے آپ کو کوئی بہت بڑی چیز سمجھتے ہو' لیکن ذرا اپنی پیدائش کو تو دیکھو کہ تمہیں ایک ناپاک پانی سے پیدا کیا ہے' پھر کیچڑ سے۔وہ اسے یاد دلاتا ہے کہ منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا لازم ہے۔اور کبر و غرور کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔یہ رجل صالح اسے کہتا ہے کہ تمہارے باغ و راغ کی بہ نسبت مجھے عند اللہ بہتر اجر ملے گا۔

قَالَ لَهُۥ صَاحِبُهُۥ وَهُوَ يُحَاوِرُهُۥٓ أَكَفَرْتَ بِٱلَّذِى خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّىٰكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لَّٰكِنَّا۠ هُوَ ٱللَّهُ رَبِّى وَلَآ أُشْرِكُ بِرَبِّىٓ أَحَدًا ﴿٣٨﴾ وَلَوْلَآ إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ ٱللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِٱللَّهِ ۚ إِن تَرَنِ أَنَا۠ أَقَلَّ مِنكَ مَالًا وَوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسَىٰ رَبِّىٓ أَن يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّن جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾ أَوْ

يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

"اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا "کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا؟ رہا میں 'تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ 'لا قوۃ الا باللہ؟ اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے 'یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے"۔

ایک نفس مومن کے اندر ایمانی عزت نفس اس طرح جاگ اٹھتی ہے۔ اس لیے اسے کسی کے مال اور دولت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی وہ کسی کی دولت اور اس کی گردن فرازی سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ سچائی کی بات صاف صاف کرتا ہے اور حق کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کرتا۔ ایک سچے مومن کے دل میں یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ جاہ و مال کے مقابلے میں غالب اور بھاری ہے۔ اور یہ کہ اس دنیا کے سازوسامان کے مقابلے میں اس کے لیے قیامت میں جو اجر ہے وہ زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کا فضل چاہتا ہے اور اللہ کا فضل عظیم ہے اور یہ کہ اللہ کا انتقام بڑا سخت ہوتا ہے۔ اور وہ کسی بھی وقت ایسے غافلوں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

اچانک سرسبزی اور شادابی کے ان مناظر سے نکل کر ہم لوگ تباہی اور بربادی کے مناظر میں داخل ہوتے ہیں۔ تکبر اور استکبار کے منظر کے بجائے اب ندامت اور اللہ سے مغفرت طلب کرنے کا منظر آجاتا ہے۔ وہ بات اب سامنے آجاتی ہے جس کی توقع یہ رجل مومن رکھتا تھا۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

"آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ "کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا"۔

یہ ایک مکمل نظر آنے والا مجسم منظر ہے۔ اس باغ کا تمام کا تمام پھل تباہ ہو گیا ہے۔ گویا اس پر ہر جانب سے حملہ ہوا اور اس میں سے ایک دانہ بھی نہ بچا۔ اور اس کے تمام درخت اور بوٹے اپنے تنوں اور ٹہنیوں پر پڑے تھے اور اس کے درخت اور بیلیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھس بن گئیں۔ مالک نے جب یہ منظر دیکھا کہ اس کا باغ تو مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہے 'تو وہ اپنے اس عظیم مالی بربادی پر ہاتھ ملنے لگا۔ اس کی پوری کی پوری محنت آج چلی گئی۔ اب تو وہ اس پر بھی نادم ہے کہ اس نے اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کیا۔ اب وہ اللہ کی ربوبیت اور وحدانیت کو پوری طرح تسلیم کر رہا

ہے۔ اگرچہ اس سے قبل اس نے کسی شرکیہ عقیدے کا اظہار نہیں کیا لیکن اس نے اس زمین کی فانی اقدار کو عالم بالا کی لافانی اقدار پر ترجیح دی تھی۔ یہ اس کی جانب سے ایک قسم کا شرک تھا۔ اور اب وہ اس سے بھی تائب ہو رہا ہے۔ لیکن اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ وحدہ ہی والی ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ نہیں کوئی قوت مگر اس کی قدرت۔ نہیں کوئی نصرت مگر اس کی نصرت۔ اس کا ثواب اچھا ثواب ہے۔ اور اگر کسی انسان کی کوئی بچت اللہ کے ہاں باقی ہے تو وہ سب سے زیادہ اچھی بچت ہے۔

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿٤٣﴾ ۵
هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿٤٤﴾ ع ۱۲
۱۷

"نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا' اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ اس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے' انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے"۔

اب پردہ گرتا ہے اور یہ منظر بھی اوجھل ہو جاتا ہے جس میں باغ مکمل تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا وہ اپنی ٹٹیوں پر پڑا تھا' مالک ہاتھ مل رہا تھا اور شرمندگی سے سرنگوں تھا۔ اللہ کا جلال اس منظر پر سایہ فگن تھا۔ جس کے سامنے انسانی قوت اور انسانی طاقت نیست و نابود ہوتی ہے۔

---○○○---

اس منظر کے بعد اب حیات دنیا کو ایک تمثیل سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ دیکھو حیات دنیا اس باغ کی طرح ہی ہے' یہ بہت ہی ناپختہ' مختصر اور بے قرار ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿٤٥﴾

"اور اے نبیؐ! انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی' اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔
یہ منظر در حقیقت ایک مختصر جھلکی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو بتایا جائے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ آسمانوں سے پانی

برستا ہے' یہ پانی نہ بہتا ہے اور نہ سیلاب کی شکل اختیار کرتا ہے بلکہ یہ براہ راست نباتات کے ساتھ مختلط ہو جاتا ہے۔ اور یہ نباتات ابھی پوری طرح نشو ونما نہیں پاتے اور پکتے ہی نہیں کہ یہ ایک بھوسے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ دیکھو ہوا اس بھوسے کو اڑائے پھرتی ہے۔ غرض تین مختصر ترین جملوں میں زندگی کی کہانی کہہ دی جاتی ہے۔

یہاں تین فقروں کے اندر مختصر ترین انداز میں پوری زندگی کی کہانی کہہ دی اور پھر یہ کہا کہ زندگی بہت ہی مختصر ہے۔ کس قدر مختصر اور کس قدر آسان بس

كَمَاءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ (۱۸:۴۵) "اس پانی کی طرح جسے ہم نے آسمان سے برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی" اس دنیائے فانی کی زندگی کی یہ مختصر جھلکی دکھانے کے بعد' اب قرآن مجید زندگی کی دائمی قدریں بتاتا ہے' جن کو لوگ معمولی سمجھتے ہیں لیکن وہ باقی رہنے والی قدریں ہیں اور جن کو اہمیت دی جانی چاہئے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝

"یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں"۔

مال اور اولاد اس زندگی کی زینت ہے اور اسلام جائز حدود کے اندر دنیا کی زینت سے نہیں روکتا۔ لیکن اسلام زینت دنیا کو اسی قدر اہمیت دیتا ہے اور اسی قدر قیمت دیتا ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔ یعنی فنا اور دوام کے اعتبار سے۔ ضرورت سے زیادہ قیمت ان چیزوں کو نہیں دیتا۔

مال اور اولاد زینت ہیں لیکن ان کی قدر و قیمت یہ نہیں ہے کہ وہ معیار اور میزان بن جائیں اور لوگوں کو دنیا میں ان کے سہارے تولا جائے۔ اصل قیمت باقیات صالحات کی ہے۔ وہ اعمال' وہ اقوال اور وہ عبادات' جن کا اجر قیامت میں ملنے والا ہے۔

اگرچہ لوگ عموماً مال اور اولاد سے دلچسپیاں وابستہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کے دل مال اور اولاد ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن باقیات صالحات زیادہ بہتر ہیں اور ہمیں چاہئے کہ ہم باقیات صالحات سے امیدیں وابستہ کریں جن کی جزاء قیامت میں ملنے والی ہوتی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۳۲ ایک نظر میں

درس سابقہ کا خاتمہ باقیات صالحات پر ہوا تھا۔ اس سبق کا آغاز ہی یوم قیامت کے بیان سے ہوتا ہے جس میں باقیات صالحات کا وزن ہوگا اور ان کا حساب و کتاب ہوگا۔ قیامت کا بیان بھی حسب معمول مناظر قیامت میں سے ایک منظر کی صورت میں ہے۔ اس کے بعد پھر ابلیس کے اس طرز عمل کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو اس نے اس وقت اختیار کیا جب اللہ نے اسے حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے' اس نے امر ربی کی تعمیل سے انکار کیا۔ انسانوں پر تعجب ہے کہ وہ پھر شیطان کو اپنا دوست بناتے ہیں' حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ تمام شیاطین انسانوں کے دشمن ہیں۔ اور اس دوستی کے نتیجے میں وہ قیامت کے روز عذاب جہنم تک پہنچنے والے ہیں۔ پھر یہ شرکاء جو قیامت کے دن ان لوگوں کی پکار کا جواب ہی نہ دیں گے جو ان شرکاء کی بندگی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار مثالیں دیں اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ اس دن کے حساب و کتاب سے اپنے آپ کو بچائیں۔ لیکن لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے۔ بلکہ الٹا امم سابقہ کی ہلاکت کی طرح کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور باطل انداز میں اہل ایمان کے ساتھ مجادلہ کرتے ہیں تاکہ حق کا مقابلہ کریں۔ اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ مذاق کریں۔ اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو ان پر یہ عذاب آ بھی جاتا۔

قیامت کا یہ منظر اور امم سابقہ کے عذاب کا ذکر اس سورت کے مرکزی مضمون سے ہم آہنگ ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی قدریں بٹھائی جائیں تاکہ وہ ہدایت پکڑیں۔

--- ooo ---

درس نمبر ۱۳۲ تشریح آیات

۴۷ --- تا --- ۵۹

وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۫ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

”فکر اس دن کی ہونی چاہئے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے ' اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے ' اور ہم تمام انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا ' اور سب کے سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کیے جائیں گے --- لو دیکھ لو ' آگئے نا تم ہمارے پاس اسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا ۔ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا ۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے ۔ اور کہہ رہے ہوں گے کہ ”ہائے ہماری کم بختی ' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہ گئی جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو“ ۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا ' وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا“ ۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں اس کائنات کا طبیعی ماحول ' اور اس کائنات اور انسانی دلوں پر خوف و ہراس کے نقوش واضح نظر آتے ہیں ۔ اس منظر کے گرد اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں جو دیکھتے دیکھتے دھواں بن جاتے ہیں اور یہ نہایت تیزی سے چلتے ہیں ' دلوں پر خوف طاری ہے ' زمین اچانک چٹیل میدان بن جاتی ہے ۔ نہ اس میں سرسبزی اور شادابی ' نہ پہاڑ ہیں اور نہ خوبصورت وادیاں ۔ بلکہ دلوں کے حال میں اس منظر میں سامنے آجاتے ہیں اور کوئی بات خفیہ نہیں رہتی ۔

یہ ہموار اور چٹیل میدان زمین جو کسی چیز کو نہیں چھپا سکتی اور نہ اس پر کسی کے چھپنے کی کوئی جگہ ہے ' اسی زمین سے یکدم تمام مخلوقات اگ آئے گی۔

وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۱۸ : ۴۷) "انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ ایک بھی نہ چھوٹے گا"۔ اس جامع حشر کے بعد اگلا منظر پھر اللہ کے سامنے حاضری کا ہے۔

وَ عُرِضُوْا عَلٰی رَبِّكَ صَفًّا (۱۸ : ۴۸) "سب کے سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کیے جائیں گے"۔ یہ تمام مخلوق جس کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ اس وقت سے لے کر جب سے انسانیت کو یہاں بسایا گیا اور جب تک اس زمین پر انسانیت کو آہستہ آہستہ مٹایا گیا۔ یہ سب مخلوق اٹھائی جا چکی ہے ' سب جمع ہو گئی ہے ' حلقوں کی شکل میں کھڑی ہے ' کوئی ایک آدمی بھی غیر حاضر نہیں ہے ' کیونکہ سب زمین ایک میدان ہے۔ اس میں چھپنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔

اب بات کا انداز ایک بیانیہ منظر سے ' خطاب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ گویا منظر سامنے موجود ہے۔ اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور اس میں جو مکالمہ ہو رہا ہے گویا ہم اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور کانوں سے سن رہے ہیں۔ وہ لوگ جو اس منظر کے وجود میں آنے کے منکر تھے ' ان کے چہروں پر شرمندگی بالکل عیاں ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا

(۱۸ : ۴۸) "دیکھ لو آ گئے نا تم ہمارے پاس جیسے ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا تھا"۔

اس بیانیہ انداز خطاب میں یکلخت تبدیلی کر کے اسے خطابی انداز میں لانے سے منظر میں ایک طرح کی زندگی پیدا کر دی جاتی ہے۔ کردار زندہ و متحرک نظر آتے ہیں۔ اور منظر ہمارے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ گویا یہ مستقبل میں آنے والا قیام قیامت کا کوئی منظر نہیں ہے بلکہ موجودہ دور کا منظر ہے۔

جو لوگ قیامت کی تکذیب کرتے تھے ان کے چہروں پر شرمندگی صاف صاف نظر آتی ہے اور باری تعالیٰ کی ڈانٹ ان لوگوں کی سرزنش یوں کر رہی ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۸ : ۴۸) "آ گئے نا تم ہمارے سامنے اس طرح جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا"۔ اور تم یہ سمجھتے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا (۱۸ : ۴۸) "تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا تھا"۔

بیانیہ انداز کلام سے خطاب کی طرف آنے کے بعد پھر قیامت کے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَي الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ (۱۸ : ۴۹) "اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے"۔ یہ ہے ان کے اعمال کا پورا رجسٹر' ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا' وہ اسے پڑھ رہے ہوں گے' بار بار ورق گردانی کر رہے ہوں گے' وہ حیران ہوں گے کہ وہ نہایت ہی جامع ریکارڈ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یہاں درج ہیں۔ یہ اپنے انجام سے ڈر رہے ہوں گے۔ دل ان کے غم کے مارے پھٹ رہے ہوں کہ اس کتاب کی وجہ سے جو ذرہ ذرہ ریکارڈ کر رہی ہوگی۔ نہ کوئی چھوٹی چیز اس سے چھوٹی ہوئی ہے اور نہ بڑی۔

وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا (۱۸ : ۴۹) "کہہ رہے ہوں گے' ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو"۔ یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جو سخت گھاٹے میں آگیا ہے' سخت پریشان ہے' سخت خوفزدہ ہے' کیونکہ جلد ہی وہ نہایت بھیانک انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔ اور وہ اس قدر مضبوط بندھا ہوا ہے کہ اس کے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی مغالطہ دے سکتا ہے اور نہ کوئی بہانہ اور تاویل کر سکتا ہے۔

وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (۱۸ : ۴۹) "جو جو انہوں نے کیا تھا وہ سب حاضر پائیں گے"۔ اور ان کو اپنے کیے کی سزا ملے گی۔

وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۱۸ : ۴۹) "اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہیں کرتا"۔

---ooo---

یہ مجرمین جن کا میدان حشر میں یہ حال ہو رہا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شیطان ان کا دشمن ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس شیطان کے ساتھ دوستی کی اور اس نے ان کو اس مقام بد تک پہنچایا' لہٰذا کیا ان کی یہ حرکت تعجب انگیز نہیں ہے کہ یہ لوگ ابلیس اور اس کی ذریت کو' دوست رکھیں حالانکہ ابلیس کے اس واقعہ کے بعد انسانوں سے اس کی دشمنی کا اعلان ہو چکا تھا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۞

"یاد کرو' جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔ اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو' حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں"۔

آدم و ابلیس کے اس قدیم قصے کی طرف یہاں ایک اشارہ سا کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بطور تعجب کے کہ ابن آدم پھر بھی ابلیس اور اس کی ذریت کو دوست بناتے ہیں حالانکہ ابلیس ابن آدم کا قدیم دشمن ہے۔ اور یہ تکریم آدم کی وجہ سے دشمن ہوا ہے اور پھر بھی ہم اللہ کو چھوڑ کر اپنے دشمن سے دوستی کرتے ہیں۔ اور ابلیس کی دوستی یہ ہے کہ ہم اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ کی اطاعت نہیں کرتے جو اللہ کا دوست ہوتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

یہ لوگ اپنے ان دشمنوں کے ساتھ کیوں دوستی رکھتے ہیں حالانکہ ان لوگوں کے پاس نہ علم ہے اور نہ قوت ہے۔ اور نہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے وقت ان لوگوں کو بلایا تھا اور نہ خود ان کی تخلیق کے وقت ان کو بلایا تھا' بلکہ وہ تھے ہی نہیں۔ اس لیے یہ لوگ اللہ کے غیوب سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ نیز اللہ نے ان کو اپنے مددگار بھی نہیں پیدا کیا کہ ان کے پاس کوئی قوت ہو۔ اس لیے اس دوستی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

"میں نے آسمان و زمین پیدا کرتے وقت ان کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود ان کی اپنی تخلیق میں انہیں شریک کیا تھا۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں"۔

اللہ تو بے نیاز ہے۔ وہ ذو القوۃ المتین ہے' اس کو کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے' خواہ وہ مضل ہو یا غیر مضل یہاں یہ جو کہا گیا کہ اللہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا تو یہ دراصل مشرکین کے اوہام کی بیخ کنی کے لیے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ نے کیا ایسے لوگوں کو اپنا شریک بنا لیا ہے جو ہدایت کی بجائے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ جو لوگ شیطان کو اللہ کا شریک سمجھتے تھے وہ یہ حرکت اس لیے کرتے تھے کہ شیطان کے پاس کوئی خفیہ علم ہے اور کوئی فوق الفطری قوت ہے۔ اس لیے لوگ شیطان کے ساتھ دوستی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان لوگوں کی اس حماقت کو اس طرح رد فرماتا ہے کہ اگر بطور فرض محال میں نے کسی کو اپنا مددگار بنانا ہی تھا تو کیا ایسے ضال اور مضل کو بنانا تھا۔ یہ ایک الزامی انداز تعبیر ہے۔

چنانچہ قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ دیکھ لیں کہ ان شریکوں اور شریک کرنے والے مجرمین کی حالت وہاں کیا ہوگی۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ

يَسۡتَجِيبُوا لَهُمۡ وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُم مَّوۡبِقًا ﴿٥٢﴾ وَرَءَا ٱلۡمُجۡرِمُونَ ٱلنَّارَ فَظَنُّوٓا أَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا وَلَمۡ يَجِدُوا عَنۡهَا مَصۡرِفًا ﴿٥٣﴾

ع ۱۹

"پھر کیا کریں گے یہ لوگ اس روز جب کہ ان کا رب ان سے کہے گا کہ پکارو اب ان ہستیوں کو جنھیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کی مدد کو نہ آئیں گے۔ اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے۔ سارے مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں گرنا ہے۔ اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے"۔

یہ لوگ اب ایک لمبی عدالت میں کھڑے ہوں گے جس میں کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے مسموع نہیں ہے۔ اللہ ان سے مطالبہ کرے گا کہ لائیے وہ شرکاء جو تم میرے ساتھ قرار دیتے تھے۔ حکم ہو گا جاؤ ان کو بلا کر لاؤ۔ یہ لوگ اپنی حماقت میں اور مدہوشی میں پکارنے لگیں گے لیکن ان کے شرکاء ظاہر ہے کہ کوئی جواب نہ دیں گے۔ وہ خود مخلوق ہوں گے اور قیامت کے میدان میں نہ اپنی کسی چیز اور نہ دوسروں کے لیے کسی چیز کے مالک ہوں گے۔ خود خوفزدہ ہوں گے۔ اللہ ان شریک کرنے والوں اور ان کے شریکوں کے درمیان ایک ہلاکت کا گڑھا پیدا کر دیں گے جس کو کوئی بھی پار نہیں کر سکے گا اور یہ گڑھا آگ کا ہو گا۔

وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُم مَّوۡبِقًا (۱۸ : ۵۲) "ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے"۔

یہ مجرم اب اگلے مرحلے کو دیکھیں گے۔ یہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان کو آگ نظر آئے گی اور ان کو ہر لحظہ اس میں پڑنے کا خطرہ ہو گا۔ عذاب کا یہ انتظار کس قدر شدید ہوتا ہے۔ جب کوئی یہ توقع کرے کہ ابھی آنے والا ہے۔ اور اب ہمیں اس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

وَرَءَا ٱلۡمُجۡرِمُونَ ٱلنَّارَ فَظَنُّوٓا أَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا وَلَمۡ يَجِدُوا عَنۡهَا مَصۡرِفًا

(۱۸ : ۵۳) "مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب ہمیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے"۔

---ooo---

ان کے لیے اس سے رہائی کا راستہ تو تھا۔ اے کاش کہ وہ اس سے قبل دنیا میں اپنے دلوں کو قرآن کی طرف پھیرتے۔ اور قرآن جس سچائی کو لے کر آیا تھا اس کے مقابلے میں نہ اتر آتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں امثال کے ذریعے بات کو بار بار پھیر کر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اور ہر حال ان کو سمجھایا تھا۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِي هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ

الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے"۔

قرآن مجید نے یہاں انسان کو ایک چیز کہا ہے۔ اور یہ کہ وہ بڑی جھگڑالو چیز ہے۔ چیز سے تعبیر اس لیے کیا گیا تاکہ انسان اپنے کبرو غرور سے ذرا نیچے اترے۔ اور یہ سمجھے کہ وہ بھی اللہ کی بے شمار مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اور انسان تمام مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ اس کے باوجود کہ اللہ نے اس قرآن میں انسان کو مختلف طریقوں سے سمجھانے کی سعی کی۔ اور مثالوں سے اسے سمجھایا۔

اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اکثر لوگ کیوں ایمان نہ لائے؟ وہ کیا شبہ تھا جو رکاوٹ بنا؟ مختلف رسولوں کے زمانے میں اکثر لوگ ایمان سے محروم رہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾

"ان کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حضور معافی چاہنے سے آخر ان کو کس چیز نے روک دیا؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے' یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں!"

حالانکہ ان لوگوں کے پاس اس قدر راہنمائی آچکی تھی جو اس کے لیے کافی تھی کہ وہ راہ ہدایت پر آجائیں۔ لیکن انہوں نے راہ ہدایت کو اس لیے قبول نہ کیا کہ وہ اس قسم کے عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جیسا کہ ان سے پہلے مکذبین پر آیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیوں ایسا خوفناک مطالبہ کرتے تھے یا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ عذاب لے آئیں وہ دیکھ لیں اور اس وقت وہ ایمان لائیں گے۔

لیکن یہ دونوں کام رسولوں کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ مکذبین کے سامنے معجزے پیش کرنا' پھر انکار کی وجہ سے ان کو ہلاک کرنا بھی رسولوں کے اختیار میں نہیں ہے جیسا کہ سابقہ رسولوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ یا معجزات کے علاوہ عذاب کا آجانا یہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ رسولوں کی ڈیوٹی تو صرف یہ ہے کہ وہ خوشخبری دیں اور ڈرائیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا ﴿٥٦﴾

"رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں۔ مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہوں نے میری آیات کو اور ان تنبیہات کو جو انہیں کی گئیں' مذاق بنالیا ہے"۔

حق واضح ہے' لیکن اہل کفر باطل ہتھیاروں' سے حق کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں اور حق کو باطل ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اہل باطل جو خارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں یا یہ لوگ عذاب کے مطالبے میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو اطمینان ہو جائے بلکہ یہ لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور رسولوں کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٥٧﴾

"اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ ان سے منہ پھیرے اور اس برے انجام کو بھول جائے جس کا سروسامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے؟ (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیے ہیں جو انہیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔ تم انہیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ' وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے"۔

یہ لوگ دراصل اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ اس لیے ان سے یہ توقع نہ کی جائے کہ یہ لوگ قرآن کو سمجھ لیں گے۔ نہ ان سے یہ توقع رکھی جائے کہ یہ لوگ اس کی تعلیمات سے نفع اٹھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس روش کی وجہ سے ان دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں' اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔ لہٰذا یہ نہ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان کی اس روش مذاق اور استہزاء کی وجہ سے ان کے لیے ضلالت لکھ دی گئی ہے۔ لہٰذا اب ان کو کبھی بھی ہدایت نہیں ملے گی کیونکہ ہدایت ان لوگوں کو ملتی ہے جو کھلے دل و دماغ سے بات کو سنتے ہیں۔

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ

"تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ ان کے کرتوتوں پر انہیں پکڑنا چاہتا تو جلدی ہی عذاب بھیج دیتا"۔

لیکن اللہ ان لوگوں کو خالص اپنی رحمت کی وجہ سے مہلت دیتا ہے۔ اور ان پر وہ ہلاکت نہیں لاتا جس کے لیے وہ جلدی کر رہے ہیں لیکن اس مہلت کی بھی ایک حد مقرر ہے۔

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

"مگر ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی یہ کوئی راہ نہ پائیں گے"۔

یعنی دنیا میں بھی ان پر عذاب الہی کے نزول کے لیے وقت مقرر ہے اور پھر آخرت میں ان کے لئے ایک وقت مقرر ہے جس میں انہیں سخت سزا دی جائے گی۔

انہوں نے چونکہ ظلم کیا ہے اس لیے یہ لوگ بھی امم سابقہ کی طرح ہلاکت کے مستحق قرار پا چکے ہیں۔ لیکن اللہ نے اپنی حکمت اور تدبیر کے مطابق چونکہ ان کے لیے ایک مہلت مقرر کر رکھی ہے اس لیے اللہ ان کو اس طرح ہلاکت سے دوچار نہیں کر رہا ہے جس طرح اللہ نے ظالم امم سابقہ کو ہلاک کیا۔ ہاں ان کے لیے علیحدہ میعاد مقرر ہے۔

۸
ع ۶
۴۰

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

"یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ انہوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا"۔

لہٰذا ان لوگوں کو چاہئے کہ اس مہلت سے دھوکہ نہ کھائیں۔ ان کی مہلت بھی ختم ہونے ہی والی ہے۔ اللہ کی سنت اپنا کام کر رہی ہے وہ اٹل ہے اور اللہ جو میعاد مقرر کرتا ہے وہ آکر رہتی ہے۔

---000---

درس نمبر ۱۳۳ ایک نظر میں

اس سبق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا جو گوشہ بیان ہوا ہے وہ صرف اسی سورت کے اسی مقام پر مذکور ہے۔ قرآن میں کسی دوسری جگہ اس کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس مقام کا بھی تعین نہیں فرمایا صرف یہ کہا ہے کہ وہ مجمع البحرین ہے۔ نیز اس واقعہ کی تاریخ بھی متعین نہیں ہے کہ آیا یہ اس دور میں ہوا جب حضرت موسیٰ مصر میں تھے یا یہ واقعہ خروج بنی اسرائیل کے بعد پیش آیا۔ اگر خروج کے بعد آیا تو کہاں اور کس وقت پیش آیا؟ بیت المقدس پر حملے کے وقت سے پہلے آیا یا بعد میں۔ جب موسیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوں تو انہوں نے داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہاں جبار قوم بستی ہے اور قابض ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ واقعہ اس دور میں پیش آیا جب یہ صحرانوردی کر رہے تھے۔

قرآن کریم نے اس بندۂ صالح کے بارے میں بھی تفصیلات نہیں دی ہیں جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام ملنے گئے تھے۔ یہ کون تھے؟ ان کا نام کیا تھا؟ یہ نبی تھے؟ رسول تھے؟ کوئی عالم دین تھے؟ یا کوئی ولی تھے؟

اس قصے کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات سے بہت سی روایات وارد ہیں لیکن ہم صرف قرآن مجید کے بیان تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے تاکہ ہم قرآن ہی کے سایہ میں رہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ جس انداز میں اس قصے کو قرآن نے دیا ہے اس میں اس کی تاریخ بھی نہیں دی' نام بھی نہیں دیئے' جگہ کا تعین بھی نہیں کیا' اس میں کوئی خاص حکمت ہوگی۔ لہٰذا ہم بھی اس قدر معلومات پر اکتفاء کرتے ہیں جس قدر قرآن نے دے دی ہے۔ (۱)

--- ○○○---

(۱) بخاری میں ہے۔ سعید ابن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ نوف بکالی کا خیال ہے کہ جو موسیٰؑ خضرؑ سے ملے وہ موسائے بنی اسرائیل نہ تھے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہمیں ابی بن کعب نے حضورؐ سے سن کر بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سامنے خطبہ دے رہے تھے تو ان سے پوچھا گیا کہ کون زیادہ علم رکھتا ہے تو موسیٰؑ نے کہا' میں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کو غصہ آیا کیونکہ موسیٰ نے اپنے علم کو اللہ کی طرف منسوب نہ کیا۔ تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا کہ مجمع البحرین میں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے سوال کیا کہ اے اللہ میں اس سے کیسے مل سکتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا تم اپنے پاس ایک مچھلی کو تھیلے میں رکھ لو' جہاں تم نے مچھلی کو گم کر دیا بس وہ جگہ ہوگی اس بندۂ صالح کی۔

درس نمبر ۱۳۳ تشریح آیات

۶۰ --- تا --- ۸۲

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

"(ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ "میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں' ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا"۔

مجمع البحرین سے کون سی جگہ مراد ہے' غالب یہ ہے کہ شاید بحر روم اور بحر قلزم کے درمیان کوئی جگہ یا بحر اسود یا بحر احمر کے درمیان کوئی جگہ ہے۔ان کا مقام التقاء بحیرہ مرہ یا بحیرہ تمساح ہو سکتا ہے یا خلیج عقبہ اور خلیج سویس کے اجتماع کی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔یہ بحر احمر کی دو شاخیں ہیں۔کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں خروج کے بعد بنی اسرائیل چلتے پھرتے رہے۔ بہرحال قرآن کریم نے اس بات کو مجمل چھوڑ دیا ہے۔ہم بھی فقط اس کی اشارہ کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔[1]

قصے کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک خاص ہدف تھا۔جہاں تک انہوں نے پہنچنے کا عزم کر رکھا تھا۔آپ کے پیش نظر کوئی خاص مطلب تھا۔کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ آپ مجمع البحرین تک ضرور پہنچیں گے چاہے اس سفر میں زیادہ مشقت درپیش ہو اور چاہے اس میں زیادہ عرصہ لگ جائے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تعبیر اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا (۱۸ : ۶۰) "ورنہ میں زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا"۔حقب کے معنی ایک سال کے ہیں یا بعض اقوال کے مطابق ۸۰ سال کے ہیں۔بہرحال مقصد یہ ہے کہ وہ بہرحال مجمع البحرین تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔کوئی متعین زمانہ مراد نہیں ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ

---

(1) قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد بحر فارس ہے جو شرق کی جانب سے اور بحر روم ہے جو مغرب کی جانب سے قریب ہے۔محمد ابن کعب قرظی نے کہا ہے کہ مجمع البحرین بلاد مغرب میں طنجہ کے قریب ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقوال مستبعد ہیں۔

اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾

"پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جاکر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا "لاؤ ہمارا ناشتہ ' آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں"۔ خادم نے کہا "آپ نے دیکھا ' یہ کیا ہوا؟ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا ' اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی"۔

راجح بات یہ ہے کہ یہ مچھلی بھونی ہوئی تھی۔ اور اس کا زندہ رہنا اور پھر اس کا سمندر کے اندر عجیب انداز میں گم ہو جانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک نشانی تھی۔ اس کے ذریعے اللہ نے ان کو بتانا تھا کہ عبد صالح کا مقام یہی ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے نوکر نے جو بیان کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی نے قابل تعجب انداز میں سمندر میں اپنی راہ لی تھی۔ یہ بات کہ زندہ مچھلی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ سمندر میں چلی گئی تو اس میں تعجب کیا بات ہے۔ سبب ترجیح یہ ہے کہ یہ سفر سب کا سب غیبی معجزات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی ان میں سے ایک معجزہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ عبد صالح کے مقام سے وہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس سے ملاقات اس پتھر کے پاس ہوگی۔ چنانچہ وہ واپس ہوئے اور وہاں ان کو عبد صالح انتظار کرتے ہوئے ملے۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اسی کی تو ہمیں تلاش تھی"۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رب کے درمیان ایک خفیہ راز تھا۔ اور اس راز سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نوجوان بھی باخبر نہ تھے۔ ملاقات تک اسے خبر نہ تھی اور بعد کے مناظر میں بھی اب نوجوان حضرت موسیٰ اور عبد صالح کے ساتھ نظر نہیں آتے۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

"موسیٰ نے اس سے کہا "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو

سکھائی گئی ہے ؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت ہی احترام سے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا آپ ہمیں کچھ سکھائیں گے ؟ یعنی آپ کو اللہ نے جو علم دیا ہے اس میں سے کوئی راہنمائی اور دانش مندی ہمیں بھی سکھائیں گے ۔ لیکن اس شخص کا علم وہ علم نہ تھا جو انسانوں کو سکھایا گیا ہے اور جس کے اسباب و نتائج معلوم اور قریب الفہم ہوتے ہیں بلکہ اس کے علم کا تعلق علم لدنی اور اس کائنات کے تکوینی انتظام کے ساتھ تھا۔ یہ اللہ کے غیبی امور کا ایک حصہ تھا۔ جو اس عبد صالح کو اللہ نے اپنی مخصوص مصلحتوں اور حکمت کے تحت سکھایا ہوا تھا۔ اس لیے عبد صالح کو معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ اس کے تصرفات کو برداشت نہ کر سکیں گے ۔ کیونکہ آپ تو رسول اور نبی ہیں۔ خلاف شریعت کسی بات کو برداشت نہ کریں گے ۔ کیونکہ یہ تصرفات بظاہر شریعت کے بھی خلاف ہوں گے اور عقلی طرز عمل کے بھی خلاف ہوں گے اور اس بات کی ضرورت ہو گی کہ ان کی تہہ میں جو تکوینی حکمت پوشیدہ تھی وہ بھی ان کو بتائی جائے ۔ اگر اصل حقیقت نہ بتائی جائے تو یہ قابل اعتراض ہوں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ عبد صالح اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ تم صبر نہ کر سکو گے ۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

اس نے جواب دیا " آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے ' اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو ' آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں" ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر اور اطاعت کے عزم کا اظہار کرتے ہیں ' اس سلسلے میں اللہ کی مدد کی بھی امید کرتے ہیں اور اللہ کی مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

موسیٰ نے کہا " ان شاء اللہ ' آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا" ۔

عبد صالح اب بطور تاکید دوبارہ صبر کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے ساتھ رہنے کی شرط یہ ہے کہ میرے تصرفات کی بابت آپ کوئی سوال نہ کریں گے ' یہاں تک کہ میں خود ان تصرفات کی حقیقت بیان نہ کر دوں ۔

۹

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ۱۱ع

۲۱

اس نے کہا " اچھا ' اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں " ۔ حضرت موسیٰ یہ شرط قبول کرتے ہیں ۔ اب پہلا تصرف اور اس کا منظر۔

فَانْطَلَقَا ٙ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ

"اب وہ دونوں روانہ ہوئے ' یہاں تک کہ وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا" ۔ یہ کشتی ان دونوں کو بھی لے جا رہی اور ساتھ ہی اور سوار بھی اس پر موجود ہیں ۔ یہ سب لوگ سمندر کے درمیان موجوں میں سفر کر رہے ہیں ۔ عبد صالح اس میں شگاف ڈال دیتے ہیں ۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ اس شگاف کی وجہ سے یہ کشتی غرق ہو سکتی ہے ۔ اور مالکوں اور سواروں کے لیے مصیبت کا باعث ہو سکتی ہے ۔ تو سوال یہ ہے کہ عبد صالح نے یہ حرکت کیوں کی ؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذہن سے شرائط سفر محو ہو گئیں ۔ وہ اس غیر معقول حرکت کو برداشت نہ کر سکے ۔ جو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے ۔ انسان بعض اوقات محض تصور کی حد تک بہت کچھ کہتا ہے ۔ لیکن جب وہ کسی عملی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے تمام نظریاتی جائزے اور توقعات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں ۔ عملی میدان میں اس کا ردعمل محض نظری میدان سے مختلف ہوتا ہے ۔ عملی تجربات اور ہوتے ہیں اور نظری تصورات اور ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نظری طور پر متنبہ بھی کر دیا گیا تھا کہ تم ان امور پر صبر نہ کر سکو گے جن کے بارے میں تمہیں علم نہ ہو گا ۔ وہ اللہ کے فضل و کرم سے صبر کرنے کا عزم بھی کرتے ہیں ' وعدہ بھی کرتے ہیں ' شرط قبول بھی کرتے ہیں ۔ لیکن جب وہ عملاً ایک منظر کو دیکھتے ہیں تو سب کچھ بھول کر اعتراض کرتے ہیں ۔

حضرت موسیٰ کی طبیعت بھی انفعالی اور جذباتی تھی ۔ اس لیے وہ صبر نہ کر سکے ۔ وہ وعدے کا ایفا نہ کر سکے ۔ وہ اس فعل کے انوکھے پن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی برائی کو برداشت نہ کیا ۔ مثلاً مصر میں جب ایک قبطی ایک بنی اسرائیلی سے لڑ رہا تھا تو آپ نے غصے میں اسے مکا رسید کیا اور وہ مر گیا ۔ پھر انہوں نے اس فعل پر اللہ سے معافی مانگی ۔ پھر دوسرے دن جب وہی بنی اسرائیلی پھر ایک مصری سے لڑ رہا تھا تو آپ پھر غصہ ہوئے ۔

بہرحال حضرت موسیٰ اپنی افتاد طبع کے مطابق یہاں بھی برداشت نہ کر سکے ۔ واقعہ عجیب و غریب تھا ۔ عقل و نقل کے خلاف تھا ۔ اور اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا اور شرط بھی قبول کر لی تھی لیکن نظریات اور ہوتے ہیں اور عملی صورت حالات اور ہوتی ہے ۔ چنانچہ جب عملاً موسیٰ علیہ السلام کے سامنے یہ صورت حالات پیش ہوئی تو آپ نے بے ساختہ اعتراض کر دیا ۔

قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں ؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی" ۔ یہ عبد صالح نہایت بردباری سے اور نہایت ہی سنجیدگی سے یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے درمیان معاہدہ کیا طے ہوا تھا ؟

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا

اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے"۔ اب حضرت موسیٰ معذرت کرتے ہیں کہ وہ تو بھول گئے اور درخواست کرتے ہیں کہ آپ میرے عذر کو قبول کر لیں، بھول ہو گئی اور یہ کہ اس معاملے میں آپ میرے ساتھ سختی نہ کریں۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا

موسیٰ نے کہا "بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں"۔
عبد صالح بھی یہ عذر و معذرت قبول کر لیتے ہیں اور ہم اب دوسرے منظر کے سامنے ہیں۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ

"پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا"۔
پہلے تو کشتی میں شگاف ڈالا تھا اور لوگوں کی ہلاکت کا محض احتمال تھا لیکن اب تو واضح طور پر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ یہ قتل عمد تھا۔ محض احتمال قتل نہ تھا۔ اور یہ گناہ کبیرہ تھا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے عہد کیا تھا اور انہیں یہ عہد یاد بھی تھا۔

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی برا کیا"۔

اس دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ بھولے تھے اور نہ غافل تھے۔ اب انہوں نے بالارادہ اعتراض کر دیا۔ کیونکہ وہ اس گناہ کبیرہ پر اعتراض کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ نہ وہ اس کی کوئی تاویل کر سکتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ لڑکا بے گناہ تھا۔ اس نے ایسا کوئی فعل نہ کیا جس کے نتیجے میں اس کا قتل جائز ہو۔ بلکہ وہ تھا بھی نابالغ اس پر تو حد جاری ہی نہ ہو سکتی تھی۔

عبد صالح دوبارہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا ہے اور وہ انہیں پھر یاد دلاتے ہیں اور یہ کہ تجربے کے بعد تجربہ بتلاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام برداشت نہیں کر سکتے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا

اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے"۔ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ اب ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ وہ اب سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دو مرتبہ وعدہ خلافی کر لی۔ اور ان کی یاد دہانی کے بعد پھر وہ بھول گئے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر خود ہی اپنے لیے آخری بار مقرر فرماتے ہیں کہ اگر اب کے میں نے خلاف ورزی کی تو آپ مجھے علیحدہ کر دیں۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجئے' اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا"۔ اب ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں اور تیسرے منظر کے سامنے کھڑے ہیں۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ

"پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا تو انہوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی' جو گرا چاہتی تھی۔ اس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا"۔ یہ دونوں بھوکے تھے۔ لیکن وہ دونوں ایسے گاؤں میں تھے جس کے باشندے بخیل تھے۔ وہ کسی بھوکے کو کھانا نہ کھلاتے تھے نہ کسی مہمان کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ اچانک یہ شخص دیکھتا ہے کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے۔ یہاں بھی انداز ایسا ہے کہ دیوار گویا زندہ ہے اور وہ بالارادہ گرنا چاہتی ہے۔

يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ (۱۸:۷۷) "وہ ارادہ کرتی ہے کہ گر جائے"۔ یہ بندۂ خدا بس دیکھتے ہی بغیر کسی معاوضہ کے دیوار کو از سر نو کھڑا کرنے میں لگ گیا۔
یہاں موسیٰ علیہ السلام سہ بارہ محسوس کرتے ہیں کہ اس شخص کے طرز عمل میں کھلا تضاد ہے۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ یہ شخص مشقت برداشت کرتا ہے اور اس گاؤں میں یہ نیکی کا کام کرتا ہے جبکہ ہم بھوکے ہیں اور ان لوگوں نے ہمیں کھانا کھلانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ کیا کم از کم یہ بات معقول نہ تھی کہ وہ اس دیوار کو درست کرنے پر معاوضہ طلب کرتے اور اس کے عوض کھانا کھا لیتے۔

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا

"موسیٰ علیہ السلام نے کہا - اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے"۔ پس اب اس سے دونوں کے درمیان جدائی ہو گئی - اب موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ نہ اب دونوں کے درمیان مزید رفاقت کی کوئی گنجائش رہ گئی تھی -

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

"اس نے کہا - بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔

یہاں تک حضرت موسیٰ اور ہم جو قرآن پڑھتے ہیں' یہ حیران کن واقعات دیکھتے چلے آئے ہیں - یہ عجیب واقعات ہیں - ہم ان کے راز کو نہیں جانتے - لیکن ان کے بارے میں ہر قاری قرآن کی رائے وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے بلکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ شخص ہے کون جو اس قسم کے عجیب اقدامات کر رہا ہے - کیونکہ قرآن کریم نے ہمیں اس کا نام بھی نہیں بتایا - نام تو قرآن نے اس لیے نہیں بتایا کہ اس عجیب اور حیرت انگیز قصے کی فضا مزید حیران کن ہو جائے بلکہ نام کے اظہار کی یہاں اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت اس کی ہے کہ اس کائنات میں ان واقعات کی پشت پر جو حکمت ہے وہ معلوم ہو جائے - اور بظاہر جو تصرفات عجیب نظر آتے ہیں وہ معقول نظر آئیں - اور ان کے دور رس اسباب معلوم ہوں - نام معلوم ہو کہ نہ ہو' بلکہ ان کی پراسرار شخصیت کے ساتھ موزوں یہی ہے کہ وہ نامعلوم رہیں - کیونکہ پوری سورت اور اس قصے میں غیبی قوتیں کام کر رہی ہیں - موسیٰ علیہ السلام اس بندۂ خدا سے ملنا چاہتے ہیں - وہ اپنا سفر طے کر رہے ہیں لیکن پتھر کے پاس حضرت موسیٰ کے غلام کھانا بھول جاتے ہیں - بھول بھی اس لیے جاتے ہیں کہ واپس اس چٹان تک لوٹ آئیں - وہاں یہ شخص غائبانہ انداز میں موجود ہو جاتا ہے - اگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی غذا نہ بھولتے تو وہ ان سے نہ مل سکتے اور آگے ہی چلے جاتے - لیکن دست قدرت نے انہیں دوبارہ پتھر تک لوٹایا - غرض قصے کی تمام فضا پراسرار ہے اور ایک کردار کا نام تک معلوم نہیں ہے - لیکن اب ان پراسرار واقعات کا راز کھلتا ہے -

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

"اس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے - میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں' کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا"۔

اور اس عیب کی وجہ سے یہ کشتی بیگار میں پکڑے جانے سے بچ گئی - اور یہ عیب ایک چھوٹا نقصان تھا اور ایک بڑے

نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اگر کشتی کو یہ تھوڑا سا نقصان نہ پہنچایا جاتا تو اس کو شدید نقصان اٹھانا پڑتا۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۝ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝

"رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا۔ اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو"۔

یہ لڑکا بظاہر تو قتل کے مستحق نہ تھا۔ نہ واجب القتل تھا، لیکن مستقبل میں وہ بہت ہی خطرناک بن رہا تھا۔ سخت کافر اور حد سے تجاوز کرنے والا ہو رہا تھا۔ اس کے نفس کے اندر ان برائیوں کے بیج موجود اور بعد میں ظاہر ہونے والے تھے۔ اگر یہ زندہ رہتا تو اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے والدین کی نافرمانی کرتا اور یہ والدین اس کی محبت کی وجہ سے اس کی راہ پر چلتے۔ اس لیے اللہ نے اس بندۂ صالح کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو قتل کر دے اور اللہ اس کے والدین کو اس کے بدلے نہایت ہی صالح اولاد دے دے گا جو والدین کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کرنے والی ہوگی۔

اگر ان امور کو انسان کے ظاہری علم ہی پر چھوڑ دیا جاتا تو انسان اس لڑکے کے بارے میں ظاہری فیصلہ ہی کرتا اور اس لڑکے کو قانوناً کچھ بھی نہ کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اس نے شریعت کے مطابق ایسا کوئی جرم نہ کیا تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا۔ نیز اللہ کے سوا اگر کوئی غیب بھی جانتا ہو تو بھی کسی فرد کو کوئی اس طرح قتل نہیں کر سکتا۔ کوئی جج بھی اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فیصلہ قانون کے مطابق ہی ہوگا۔ لیکن یہاں عبد صالح نے فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق کیا اور یہ حکم مستقبل کے اعمال کے ساتھ وابستہ علم الٰہی کی وجہ سے کیا گیا۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

۱۰ ۱۲ع ۱

"اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ

ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں - یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے' میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے - یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔

یہ دیوار جسے از سرنو کھڑا کرنے میں اس شخص نے اپنے آپ کو تھکایا اور گاؤں والوں سے اس پر کوئی اجر بھی طلب نہ کیا۔ جبکہ دونوں بھوکے بھی تھے اور گاؤں والوں نے ان کی مہمان نوازی کرنے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ اس کے نیچے خزانہ تھا۔ اور یہ خزانہ گاؤں کے دو ضعیف یتیموں کی ملکیت تھا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی' خزانہ ظاہر ہو جاتا تو لوگ اسے اڑا لیتے اور یہ یتیم کوئی مدافعت نہ کر سکتے چونکہ ان کا باپ صالح تھا اس لیے باپ کی نیکی نے ان بچوں کو فائدہ دیا۔ ان کی ذاتی کمزوریوں پر بھی اللہ کو رحم آیا۔ اس لیے اللہ کے حکم سے یہ دیوار تعمیر ہوئی کہ وہ ذرا مضبوط ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکالیں اور اسے بچا بھی سکیں۔

اس کے بعد یہ عبد صالح اس کارنامے سے اپنے ہاتھ جھاڑ دیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت تھی جس نے یہ سب تصرفات کیے۔ اللہ کا حکم تھا' اپنی مرضی سے اس نے کچھ نہ کیا۔ ان تمام امور میں اللہ نے عبد صالح کو غیب کی اطلاع کر دی اور حکم دیا کہ یہ تصرفات کرو'

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي (۱۸:۸۲) "یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا"۔

اب ان تصرفات کا پس منظر سامنے آگیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ کا غیبی نظام کیا ہے اور اللہ اپنے غیب اسی کو بتاتا ہے جس کے بارے میں اس کی رضا ہو۔

جب اس راز کا انکشاف ہوتا ہے تو دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں اور عبد صالح منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ جس طرح وہ اچانک نمودار ہوا تھا۔ اس طرح اچانک پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اس قصے میں اس عظیم حکمت اور تدبر کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ جس کے مطابق اس کائنات کا نظام چلتا ہے۔ اور یہ سب حکمت پس پردہ غیب سے اپنا کام کرتی ہے۔

اب یہاں دیکھیے کہ قصہ موسیٰ اور قصہ اصحاب کہف میں بھی غائبانہ حکمت الٰہیہ ایک قدر مشترک ہے۔ یہ کائنات اللہ کے وسیع علم کے مطابق چل رہی ہے۔ انسان کے لیے اس پر حاوی ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ انسان پردۂ غیب سے ادھر کھڑا ہے۔ پردۂ غیب کے اسرار و رموز سے واقف اللہ ہی ہے۔

(منصورہ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ء)

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۱۶

سورۃ الکھف - ۱۸

۸۳--- تا--- ۱۱۰

سورۃ مریم - ۱۹

۱--- تا--- ۹۸

سورۃ طٰہٰ - ۲۰

۱--- تا--- ۱۳۵

درس نمبر ۱۳۴ ایک نظر میں

یہ سورہ کہف کا آخری سبق ہے۔ اس سبق کا بڑا حصہ ذوالقرنین کے قصے کے بارے میں ہے۔ اس میں ذوالقرنین کے تین سفروں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ سفر مشرق' سفر مغرب اور سفر وسط۔ نیز اس میں یاجوج اور ماجوج کے مقابلے میں ان کی جانب سے دیوار کھڑی کرنے کا خصوصی ذکر ہے۔

قرآن کریم نے اس قصے میں ذوالقرنین کا ایک قول نقل کیا ہے۔ تعمیر سد کے بعد وہ کہتا ہے۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا (۱۸: ۹۸) "ذوالقرنین نے کہا' یہ میرے رب کی رحمت ہے' مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔ اس کے بعد نفخ صور اور قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر آتا ہے اور اس سبق اور اس سورہ دونوں کا خاتمہ تین مختصر قطعات پر ہوتا ہے۔ جن پر بات ختم کی جاتی ہے اور ہر ایک مقطعہ کا آغاز لفظ قل کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان قطعات کے ذریعہ پوری سورہ کے مضامین کا خلاصہ دیا جاتا ہے اور سورہ کا عام فکری رجحان بتا دیا جاتا ہے۔ گویا یہ خلاصہ کلام قاری کے دل و دماغ کی تاروں پر آخری ضربات ہیں لیکن ذرا زیادہ قوت کے ساتھ ہیں۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۳۴ تشریح آیات

آیت ۸۳--- تا--- ۱۱۰

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝

”اور اے نبیؐ یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہو' اس کا کچھ حال میں تم کو سناتا ہوں“۔ محمد ابن اسحاق نے اس سورہ کے شان نزول کے سلسلے میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ”مجھے ہمارے شہر کے ایک شیخ نے بتایا' جس نے ہمارے ہاں چالیس سال سے اوپر قیام کیا۔ انہوں نے عکرمہ' عن ابن عباس کی سند سے روایت کی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش نے نضر ابن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ میں یہود کے علماء کے پاس بھیجا' قریش نے ان سے کہا کہ ان علماء سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں دریافت کرو' ان کا پورا تعارف کراؤ' ان کی باتوں کے بارے میں ان کو پوری طرح آگاہ کرو' یہ لوگ پہلے اہل کتاب ہیں' ان کے پاس انبیاء کے بارے میں ہمارے مقابلے میں زیادہ علم ہے۔ یہ لوگ اس سفر پر نکلے یہاں تک کہ یہ مدینہ آئے' انہوں نے یہودی علماء سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سوالات کیے۔ انہوں نے حضرت محمدؐ کا پورا تعارف کرایا اور آپؐ کے بعض اقوال و نظریات ان کو بتائے' ان دونوں نے یہ گزارش کی کہ تم لوگ حاملین تورات ہو' ہم تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ تم ہمیں ہمارے اس شخص کے بارے میں صحیح معلومات دو اور اپنی رائے بھی دو۔ کہتے ہیں کہ ان علماء نے اس وفد کو مشورہ دیا کہ ہم تمہیں تین سوالات بتاتے ہیں' تم یہ سوالات ان سے پوچھو۔ اگر اس نے ان تینوں کے جوابات تمہیں دے دیئے تو وہ بے شک نبی مرسل ہیں' اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اگر انہوں نے ان سوالات کے جوابات نہ دیئے تو پھر یہ شخص باتیں بنانے والا ہے۔ تم جانو اور وہ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ نوجوان کون تھے جو پہلے زمانے میں دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا؟ کیونکہ ان کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ ان سے دوسرا سوال یہ کرو کہ وہ مہم جو شخص کون تھا جس نے کرہ ارض کے مشرق و مغرب کا سفر کیا۔ اس کے متعلق واقعات و خبریں۔ تیسرا سوال یہ کہ ان سے پوچھیں کہ روح کیا ہے۔ اگر اس نے ان تین سوالات کے جوابات دے دیئے تو وہ سچا نبیؐ ہے۔ تمہیں چاہئے کہ اس کی اطاعت کرو' اور اگر اس نے ان سوالات کا جواب نہ دیا تو وہ اپنی طرف سے باتیں بنانے والا شخص ہے' اس کے بارے میں تم جو چاہو کرو۔ نضر اور عقبہ واپس قریش کے پاس آئے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ ہم تمہارے اور محمدؐ کے

درمیان ایک فیصلہ کن بات طے کر آئے ہیں۔ ہمیں یہودی علماء نے یہ مشورہ دیا کہ اس سے کچھ باتیں پوچھو۔ انہوں نے قریش کو یہ سوالات بتائے۔ پھر یہ لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا' محمدؐ ہمیں ان سوالات کے بارے میں صحیح بتاؤ۔ انہوں نے وہ سوالات آپؐ کے سامنے رکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' میں تمہیں تمہارے سوالات کا جواب کل دوں گا لیکن آپؐ نے اس موقع پر لفظ ان شاء اللہ نہ کہا۔ یہ لوگ چلے گئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پندرہ شب و روز جبرئیل کا انتظار کرتے رہے لیکن وحی نہ آئی نہ جبرئیل آئے۔ اہل مکہ مارے خوشی کے ناچنے لگے۔ وہ کہتے ہمارے ساتھ محمدؐ کا وعدہ کل کا تھا لیکن آج پندرہواں دن ہے اور محمدؐ ہمیں سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بے حد رنج ہوا۔ کیونکہ ایک تو وحی بند ہو گئی' دوسرے اہل مکہ بغلیں بجانے لگے۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل سورہ کہف لے کر نازل ہوئے۔ اس سورہ میں آپؐ کو تنبیہ کی گئی کہ آپؐ ان لوگوں کی باتوں سے پریشان کیوں ہوئے؟ اس سورہ میں نوجوانوں کا قصہ شرق و غرب تک پہنچنے والے شخص کا قصہ اور روح کے بارے میں جواب نازل ہوا۔

یہ تو تھی ایک روایت' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت روح کے نزول کے سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی مروی ہے ------- نے اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہودیوں نے حضورؐ سے سوال کیا کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ جسم میں جو روح ہے اسے کس طرح سزا دی جاتی ہے جبکہ روح من جانب اللہ ہے؟ اس بارے میں آپؐ پر کوئی آیت نازل نہ ہوئی تھی اس لئے آپؐ نے ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر یہ آیت ازل ہوئی۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷: ۸۵) "کہہ دو' روح اللہ کے امر میں سے ایک امر ہے اور تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔

چونکہ اسباب نزول میں روایات متعدد ہیں لہٰذا ہم اسی مفہوم پر اکتفاء کرتے ہیں جو قرآن کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ اس آیت میں صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں اس وقت سوال کیا گیا تھا لیکن یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ یہ سوال کس نے کیا تھا۔ نیز اگر معلوم بھی ہو جائے کہ یہ سوال کس نے کن حالات میں کیا تھا تو اس سے اس قصے کے اصل حقائق اور عبرت آموزی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ تفسیر میں اسی حد تک اپنے آپ کو محدود رکھیں جس حد تک نص سے بات معلوم ہوتی ہے۔ اس پر حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ماہر فلکیات ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب (الآثار لباقیۃ عن القرون الخالیہ) میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ ملوک حمیر میں سے تھا۔ انہوں نے محض اس کے نام ذوالقرنین سے یہ قیاس کیا ہے کیونکہ ملوک حمیر اپنے نام کے ساتھ (ذو) کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ذونواس' اس کا نام دراصل ابوبکر بن افریقس تھا۔ یہ اپنی فوجیں لے کر بحر متوسط کے ساحل کے ساتھ ساتھ آخر تک گیا۔ تونس اور مراکش اس نے فتح کیا۔ اس نے شہر افریقہ بنایا' بعد کے زمانوں میں پورے براعظم کا نام افریقہ پڑ گیا اور ذوالقرنین اس کو اس لیے کہا گیا کہ یہ سورج کے دونوں سینگوں تک پہنچ گیا۔ (یعنی مشرق و مغرب تک)۔

البیرونی کی یہ بات صحیح بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمارے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ ہم بالجزم کوئی بات کہہ سکیں یا اس

شخص کی حقیقت کے بارے میں چھان بین کر سکیں اس لیے کہ انسانی تاریخ میں اس شخص کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ہے جس کی تاریخ کے ایک حصے کے بارے میں ہمیں قرآن کریم بتاتا ہے۔اس قصے کی نوعیت بھی ایسی ہے جس طرح قصص القرآن کے دوسرے حصوں کی ہے۔مثلاً قصہ قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح وغیرہ۔کیونکہ ان قصص کا تعلق جس دور سے ہے وہ ماقبل التاریخ دور ہے۔تاریخ تو دور جدید کی ایک مولود چیز ہے جبکہ انسانوں کا زمانہ اس سے بہت پہلے کا ہے۔زمانہ "تاریخ مدون" سے قبل ایسے واقعات گزرے ہیں جن کے بارے میں انسان کو کوئی علم نہیں ہے۔لہذا کوئی ایسا تاریخی ریکارڈ نہیں ہے' جہاں سے ہم کوئی یقینی بات اخذ کر سکیں۔

اگر تورات تحریف اور اضافوں سے پاک ہوتی تو وہ ان قدیم واقعات کے بارے میں ایک قابل اعتماد ریکارڈ ہوتی۔ لیکن تورات ایسے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہے جن کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔نیز اس میں ایسی باتیں کثرت سے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل وحی پر اضافہ ہیں۔تورات میں جو تاریخی قصے ہیں' وہ تاریخ کا مستند ماخذ نہیں ہو سکتے۔اب قرآن ہی وہ ماخذ رہ جاتا ہے جو حذف و اضافہ اور تحریف سے پاک ہے اور اس کے اندر جو بھی تاریخی مواد ہے وہ درست ہے۔

ایک نہایت ہی مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ اب ہم قرآن کریم کو تاریخ کی روشنی میں نہیں پڑھ سکتے۔اس کی دو واضح وجوہات ہیں۔پہلی وجہ یہ ہے کہ تاریخ بالکل دور جدید کی لکھی ہوئی چیز ہے اور ہے بھی نامکمل۔انسانی تاریخ کے کئی واقعات بلکہ بے شمار اہم واقعات تاریخ میں ریکارڈ ہونے سے بالکل رہ گئے ہیں۔ان کے بارے میں انسانوں کو اب کوئی علم نہیں ہے۔قرآن کریم ان واقعات میں سے بعض واقعات کو پیش کرتا ہے جن کے بارے میں تاریخ تہی دامن ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تاریخ نے اگرچہ بعض واقعات کو سمجھا اور قلم بند کیا ہے لیکن یہ کام بہرحال دوسرے انسانی اعمال کی طرح قصور اور غلطی سے مبرا نہیں ہے۔اس میں غلطی اور تحریف کا ہر جگہ امکان موجود ہے۔ہم خود اپنے زمانے میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ذرائع مواصلات ترقی کر گئے ہیں اور تحقیقات کے لئے بے شمار ذرائع میسر ہیں لیکن ایک ہی واقعہ کے بارے میں رپورٹروں کی رپورٹ مختلف ہوتی ہے۔لوگ مختلف زاویوں سے اسے بیان کرتے ہیں اور متضاد تجزیہ کرتے ہیں۔یہ ہے وہ خام مواد جس سے انسانوں کی تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے۔کوئی جس قدر چاہے تحقیق و تفتیش کا دعویٰ کیوں نہ کرے تاریخی ریکارڈ بہرحال مشکوک ہوتا ہے۔

یہ بات کرنا تو موجودہ دور کے مرتب کردہ اصول تاریخ کے بھی خلاف ہے کہ قرآن مجید جن واقعات کا ذکر کرتا ہے ان کو ہم تاریخ کی کسوٹی پر پرکھیں' جبکہ اسلامی عقیدہ اور اسلامی نظریہ حیات تو اس کی سرے سے اجازت ہی نہیں دیتا کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید ایک قول فیصل ہے۔اس انداز کی بات نہ تو وہ شخص کر سکتا ہے جو ایک سچا مومن ہے اور نہ وہ شخص کر سکتا ہے جو دور جدید کے انداز تحقیق و تفتیش کو جانتا ہے۔قرآن کریم کی صحت کو تاریخ سے معلوم کرنا محض بے عقلی ہے۔

پوچھنے والوں نے ذوالقرنین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ سوالات پوچھے۔آپ کی سیرت کے مصدقہ ذرائع اور مصادر بتاتے ہیں کہ آپ پر اللہ نے وحی بھیجی اور وہ قرآن میں قلم بند کر دی گئی۔قرآن کے سوا اس دور کی تاریخ کے بارے میں اور کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے لہذا ہم بغیر علم کے اس کے بارے عقلی گھوڑے نہیں

دوڑا سکتے۔

تفاسیر میں بے شمار اقوال وارد ہیں لیکن ہماری تفسیروں کے بے شمار اقوال بھی قابل یقین نہیں ہیں۔ ہم ان تفاسیر کے اقوال میں سے جو قول بھی لیں ہمیں چاہئے کہ اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کریں کیونکہ ہماری قدیم تفاسیر میں اسرائیلیات اور قصے کہانیاں بھی راہ پاگئی ہیں۔

قرآن مجید کے سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین سفر کیے۔ ایک سفر مشرق 'ایک سفر مغرب اور تیسرا سفر (بین السدین) دو بندوں والی جگہ کا سفر۔ ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کریم کے مطابق انہی تین سفروں کو یہاں لیں۔

قرآن کریم ذوالقرنین کی بات یوں شروع کرتا ہے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

"ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے"۔

اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار دیا تھا اور ایک مضبوط سلطنت دی تھی اور اسے ہر چیز کے وسائل و اسباب عطا کیے تھے۔ اس وجہ سے وہ علاقوں کے علاقے فتح کرتا چلا گیا۔ اس نے دنیا میں تعمیر اور ترقی کے کام شروع کر دیئے۔ یہ شخص قوت اور سازوسامان کے اعتبار سے اس وقت کے تمام وسائل پر دسترس رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی قوت اور وسائل کو سب سے پہلے مغرب کی طرف متوجہ کیا۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾

"اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سروسامان کیا حتیٰ کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا۔ وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا' ذوالقرنین' تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے"۔ اس نے کہا "جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے' پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا' اور نیک عمل کرے گا' اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے"۔

مغرب الشمس وہ جگہ ہے جہاں دیکھنے والے کو سورج غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مختلف مقامات میں سورج کی جائے غروب مختلف ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر یوں نظر آتا ہے کہ سورج پہاڑ کے پیچھے غروب ہو رہا ہے۔ بعض مقامات پر یوں نظر آتا ہے کہ سورج پانیوں میں غروب ہوتا ہے جس طرح بڑے بڑے سمندروں میں ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر یوں نظر آتا ہے کہ سورج صحراؤں اور ریگستانوں میں غروب ہو رہا ہے۔ مثلاً جہاں نظر کے سامنے صحرا اور ریگستان ہوں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گیا تھا۔ اسے بحر ظلمات بھی کہتے ہیں اور اس وقت یہ گمان کیا جاتا تھا کہ خشکی اس سمندر کے ساحل پر ختم ہو جاتی ہے اس لیے اس نے دیکھا کہ سورج کالے پانیوں میں ڈوبنے لگا ہے۔

راجح بات یہ ہے کہ یہ شخص جاتے جاتے ایک ایسے ساحل پر پہنچ گیا جہاں کوئی دریا آکر سمندر میں گرتا تھا۔ ایسے مقامات پر گھاس اور کیچڑ اور سیاہ دلدل جمع ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات پر تالاب بھی نظر آتے ہیں جو چشموں کے مانند ہوتے ہیں۔ یہاں سورج کی جائے غروب کے بارے میں قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں: وجدھا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ (۱۸: ۸۶) "اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا"۔ قرآن کی اس نشاندہی کے باوجود ہم اس جگہ کی نشاندہی نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن میں کسی جگہ کی تخصیص نہیں کی' ایسی جگہ یا جگہیں کئی ہو سکتی ہیں۔ قرآن کے علاوہ اور کوئی مرجع و ماخذ بھی ایسا نہیں ہے' جس پر ہم اس مقام کے تعین کے سلسلے میں اعتماد کر سکتے ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی شخص جو تفسیر بھی کرے گا اس میں غلطی کا امکان ہو گا کیونکہ وہ تفسیر کسی مستند ذریعہ علم کی طرف منسوب نہ ہوگی۔

بہرحال اس سیاہ چشمے یا سیاہ دلدل کے پاس ذوالقرنین کو ایک قوم ملی۔

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا (۱۸: ۸۶) "ہم نے کہا اے ذوالقرنین' تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے"۔ یہ بات اللہ نے ذوالقرنین کو کس انداز میں کہی۔ یہ ان پر وحی تھی یا اس صورت حالات کی حکایت تھی کیونکہ اللہ نے ذوالقرنین کو ان پر مسلط کر دیا تھا۔ ان کے تمام معاملات اس کے اختیار میں دے دیئے تھے گویا لسان حال سے اس کو کہہ دیا کہ اب تم جانو اور وہ جانیں۔ تم حکمران ہو اور وہ رعایا۔ حکمران رعایا پر یا ظلم کرتا ہے یا احسان' یہ دونوں انداز تعبیر عربی میں درست ہیں اور یہاں دونوں ممکن ہیں۔ آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ذوالقرنین نے اپنے ممالک مفتوحہ کے بارے میں اپنی پالیسی کا یہ اعلان کر دیا تھا۔ چاہے لوگ خود اس کے تابع فرمان ہوئے ہوں یا اس نے فتح کیے ہوں' بہرحال اس کا دستور یہ تھا۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا (۸۷) وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (۸۸)

(۱۸: ۸۷ - ۸۸) اس نے کہا" جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے' پھر وہ اپنے رب کی طرف بلایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا' اور نیک عمل کرے گا' اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے"۔

اس نے اعلان کیا کہ ظالموں کو وہ سخت سزا دے گا اور پھر ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے گا اور اللہ ان کو مزید سخت عذاب دے گا۔ (نکرا) کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا سخت عذاب دے گا جس کی کوئی مثال نہ ہو گی۔ رہے صالح مسلمان تو ان کے لیے جزائے حسن ہے۔ ان کے ساتھ بہتر سلوک ہو گا' ان کی تکریم ہو گی' ان کی معاونت ہو گی اور ان کے لیے آسانیاں ہوں گی۔

یہ ہے ایک صالح حکومت کا منشور۔ اسلامی حکومت میں' حکومتی پالیسی میں مومن صالح کی عزت اور حوصلہ افزائی ہونا چاہیے۔ اس کے لیے سہولتیں اور جزائے حسن کا انتظام ہونا چاہئے' ظالموں اور حد سے تجاوز کرنے والوں پر سختی ہونا چاہئے اور ان کی پکڑ دھکڑ اور سزا جاری رہنا چاہئے۔ جب کسی معاشرے میں صالح عنصر کی تکریم اور اس کے احسان کا بدلہ احسان سے ملے اور اس کی حوصلہ افزائی ہو اور عزت و منزلت ہو اور مجرمین اور ظالموں کی بے عزتی' سزا اور ان کے اوپر سختی ہو تو عام لوگوں کا میلان اصلاح کی طرف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب حکومت کا دستور یوں بدل جائے کہ ظالم' چور اور ڈاکو دربار حکومت میں راہ پالیں' ان کی عزت ہو اور وہ حکام کے مقرب ہوں اور نیک اور صالح لوگوں کے خلاف حکومت کا اعلان جنگ ہو' ان کی بیخ کنی کی جا رہی ہو تو سمجھئے کہ اب حکومت عذاب الہی بن کر عوام پر مسلط ہو گئی ہے اور یہ حکومت وسیلہ اصلاح نہیں ہے بلکہ ذریعہ فساد ہے۔ ایسے حالات میں بالعموم سوسائٹی میں فساد اور طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے اور برائی نیکی پر غالب آ جاتی ہے۔

اب ذوالقرنین کا سفر مشرق شروع ہوتا ہے' جہاں تک وہ مشرق کی طرف بڑھ سکتا ہے اور اسباب جہاں تک اسے میسر ہیں۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

"پھر اس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی' یہاں تک کہ وہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔ یہ حال تھا ان کا' اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اسے ہم جانتے تھے"۔

مغرب الشمس کے بارے میں جو تفسیر کی گئی وہی مشرق کے بارے میں بھی درست ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ وہاں سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ قرآن حکیم نے اس مقام کا بھی تعین نہیں کیا' لیکن قرآن نے اس کے

کوائف اور وہاں کے لوگوں کے وہ حالات قلم بند کیے ہیں' جن میں ذوالقرنین نے لوگوں کو وہاں پایا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا

سِتْرًا (۱۸ : ۹۰) "یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے"۔ یعنی یہ ایک کھلی سرزمین تھی' سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ صفت صحراؤں اور کھلے میدانوں پر صادق آتی ہے۔ اس میں بھی کسی خاص مقام کا تعین نہیں کیا گیا۔ ہمارے خیال میں مشرق بعید کی کوئی جگہ تھی' جہاں دیکھنے والا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ سورج ایک ہموار اور کھلی زمین پر چمک رہا ہے۔ یہ مشرقی افریقہ کی کوئی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آیت لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (۱۸ : ۹۰) "ہم نے اس کی دھوپ سے بچنے کے لیے ان کے لیے کوئی سامان نہ بنایا تھا"۔ اس سے مراد ایک ایسی قوم ہو سکتی ہے جس کے جسم پر کوئی لباس نہ ہو اور وہ ننگے جسم والے تھے اور ان کے جسم پر سورج کی دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی لباس نہ تھا۔

اس سے قبل ذوالقرنین اپنی حکومت کا دستور و منشور پیش کر چکا تھا' اس لیے یہاں اس مشرقی قوم کے لیے اس نے دوبارہ اپنے دستور کا اعلان نہیں کیا کیونکہ اس کا پروگرام معلوم تھا۔ اللہ کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی کے مقاصد اور نصب العین کیا ہے۔

یہاں قرآن مجید کی ایک خاص فنی خصوصیت کا ملاحظہ ضروری ہے۔ اس لیے یہاں قدرے وقفہ کرتے ہوئے طرز ادا کے پہلو سے قرآن کریم کی فنی ہم آہنگی پر بات کریں گے۔ یہاں سفر شرقی میں جو منظر ہے وہ یہ ہے کہ ایک قوم چٹیل میدان میں رہتی ہے اور سورج کی گرمی سے سر چھپانے کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ اسی طرح ذوالقرنین کا دل بھی اللہ کے علم کے سامنے کھلا ہے۔ کوئی بات اللہ سے چھپائی نہیں جا سکتی۔ اللہ فرماتے ہیں "ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا' اسے ہم جانتے تھے"۔ یوں مضمون کا ظاہری اور باطنی انداز یکساں ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن کا نہایت ہی خاص انداز ہے کہ وہ گفتگو کے ظاہری ماحول اور معنوی تصورات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ

انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝

"پھر اس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین 'یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں' ہم اگر تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟" اس نے کہا "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس قوت سے میری مدد کرو"۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لا دو۔ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ حتیٰ کہ (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ کر دی تو اس نے کہا "لاؤ' اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا"۔ (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج و ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آ سکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا "یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا' اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔

اب ذوالقرنین نے تیسری مہم شروع کی۔ وہ دو پہاڑوں یا دو بندوں کے درمیان پہنچا۔ ہم اس مقام کا تعین بھی نہیں کر سکتے۔ نہ ہم ان دو بندوں کا تعین کر سکتے ہیں کہ یہ بند کہاں تھے۔ مفہوم یہی ہو سکتا ہے "قدرتی پہاڑوں کی شکل میں بند یا رکاوٹیں تھیں یا دو مصنوعی رکاوٹیں تھیں اور ان کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی جو گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ یہاں کوئی نہایت ہی پہاڑی پسماندہ قوم آباد تھی۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا (۹۳:۱۸) "جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتے تھے"۔

اس قوم نے جب دیکھا کہ ذوالقرنین ایک بڑا فاتح ہے اور قوت اور ٹیکنالوجی سے واقف ہے تو انہوں نے اس کے سامنے درخواست پیش کی کہ قوم یاجوج و ماجوج سے بچانے کے لیے وہ ان کے لیے ایک سد تعمیر کر دے کیونکہ یاجوج و ماجوج اس راہ سے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کے علاقے میں فساد پھیلاتے ہیں۔ وہ خود نہ یہ دیوار بنا سکتے ہیں اور نہ ان کے فساد کا دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ کام وہ ایک خاص ٹیکس کے بدلے کریں جو وہ اس کے لیے جمع کریں گے۔

ذوالقرنین ایک صالح حکمران تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے مقاصد کا اعلان اس سے قبل کر دیا ہے کہ وہ زمین میں سے ظلم و فساد کو جڑ سے اکھاڑ کر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ان کی جانب سے ٹیکس یا مالی معاوضے کی پیشکش کو مسترد کر دیا اور یہ بند ان کو بلا معاوضہ بنا کر دینا منظور کیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس شر و فساد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس گزرگاہ ہی کو ختم کر دیا جائے اور دونوں طرف کی قدرتی رکاوٹوں کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیا جائے۔ ذوالقرنین نے اس پسماندہ قوم سے صرف افرادی قوت کا مطالبہ کیا اور کہا:

فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا (۹۵) اٰتُوْنِيْ زُبَرَ

الْحَدِيْدِ(۹٦)(۱۸: ۹۵- ۹٦) "تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لا کر دو"۔ چنانچہ انہوں نے لوہے کے ٹکڑے جمع کیے اور دونوں قدرتی رکاوٹوں کے درمیان دیوار بنا دی اور جب یہ دیوار ان پہاڑوں کے برابر ہو گئی تو انہوں نے حکم دیا کہ اس لوہے کو گرم کرنے کے لیے اسے ہوا دو، یہ لوہا اس قدر گرم ہو گیا کہ آگ نظر آنے لگی۔ پھر انہوں نے کہا اچھا اس پر میں اب پگھلا ہوا تانبا ڈالوں گا۔ یہ پگھلا ہوا تانبا لوہے سے مل جائے گا اور یہ لوہے کی دیوار اور مضبوط ہو جائے گی۔

دور جدید میں اس طریقے کو لوہے کی قوت اور مضبوطی میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ کیونکہ لوہے کے اندر ایک خاص مقدار سے تانبا ملانے سے لوہے کی قوت اور مضبوطی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی اللہ نے سب سے پہلے ذوالقرنین کو سکھائی تھی اور پھر اسے اپنی لازوال کتاب میں بھی قلم بند کر دیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ تمہارے علم سے پہلے بھی اللہ نے ایسے بندوں کو بعض راز دیئے کس قدر پہلے؟ یعنی زمانہ ماقبل تاریخ میں۔

غرض یوں یہ دو قدرتی رکاوٹیں آپس میں مل گئیں اور یاجوج و ماجوج کی راہ مسدود ہو گئی۔ اپنی لازوال کتاب میں بھی قلم بند کر دیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ تمہارے علم سے پہلے بھی اللہ نے اپنے بندوں کو بعض راز دیئے، کس قدر پہلے؟ یعنی زمانہ ماقبل تاریخ میں۔

غرض یوں یہ دو قدرتی رکاوٹیں آپس میں مل گئیں اور یاجوج و ماجوج کی راہ مسدود ہو گئی۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ(۱۸: ۹۷) "یہ اس پر غالب بھی نہ آ سکتے تھے"۔ اس کے اوپر بھی نہ چڑھ سکتے تھے اور وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (۱۸: ۹۷) "اور اس میں نقب لگانا بھی ان کے لیے مشکل تھا"۔ اس لیے وہ اس بند سے آگے بڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کے لیے اس ضعیف اور پسماندہ قوم پر حملہ آور ہونا ممکن ہی نہ رہا اس لیے وہ امن میں ہو گئے اور اطمینان سے رہنے لگے۔

اب ذوالقرنین دیکھ رہا تھا کہ اس نے کس قدر عظیم مفید عوامی منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا دیا ہے۔ تاہم اس پر اس نے کبر و غرور نہ کیا۔ علم اور ٹیکنالوجی کی قوت نے اسے مدہوش نہ کیا بلکہ اس نے اللہ کو یاد کیا اور وہ شکر بجا لایا۔ اللہ نے اسے جس عمل صالح کی توفیق دی تھی اسے اس نے اللہ ہی کی طرف لوٹا دیا اور اپنی قوت سے دستبردار ہو کر اللہ کی قوت کے دائرے میں پناہ طلب کی۔ اپنے امور اللہ کے سپرد کر دیئے اور اس نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا کہ پہاڑ، رکاوٹیں اور بند سب کے سب قیامت سے قبل ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے اور یہ زمین ایک چٹیل ہموار میدان کی شکل اختیار کر لے گی۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ

حَقًّا (۱۸: ۹۸) "یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اسے پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔ یوں سیرت ذوالقرنین کا یہ حلقہ ختم ہوتا ہے۔ ذوالقرنین ایک

اچھے حکمران کا نمونہ تھے جسے اللہ نے تمکین فی الارض عطا کی - ترقی اور قوت کے اسباب فراہم کیے - اس نے زمین کے شرق و غرب کو روند ڈالا - لیکن اس نے کبرو غرور کو اپنے قریب آنے نہ دیا' نہ اس نے سرکشی اور نافرمانی کی - نہ اس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کے اندر لوٹ مار مچائی - نہ افراد' نہ علاقوں اور ملکوں کا استحصال کیا - اپنے مفتوحہ علاقوں کو غلام بھی نہ بنایا - نہ اس نے علاقوں کو اپنے مفادات کے لیے فتح کیا - بلکہ یہ حکمران جہاں جاتا ہے وہاں عدل و انصاف کا سایہ پھیلاتا ہے - پسماندہ لوگوں کی امداد کرتا ہے اور بغیر ٹیکس لیے لوگوں پر ظلم کرنے والوں کا ہاتھ روکتا ہے - سائنسی قوت اور ٹیکنالوجی جو اللہ نے اسے دی' اسے وہ انسانیت کی اصلاح اور تعمیر کے لیے استعمال کرتا ہے - ظلم کو روک کر حق حقدار تک پہنچاتا ہے اور یہ سارے کام کر کے پھر وہ ان کا کریڈٹ اللہ کو دیتا ہے کہ یہ تو اللہ کی توفیق اور رحمت ہے - اپنی اس قوت' جبروت اور جلال کے باوجود وہ اس حقیقت کو یاد رکھتا ہے کہ ایک دن سب قوتیں' ریزہ ریزہ ہو جائیں گی اور لوگ اللہ کے ہاں حاضر ہوں گے -

اب سوال یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کون ہیں؟ اور اب یہ لوگ کہاں ہیں؟ ان کا واقعہ کیا تھا اور کیا ہو گا؟ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام سوالات کا علی وجہ الیقین جواب دینا بہت ہی دشوار ہے کیونکہ یاجوج و ماجوج کے بارے میں تاریخ خاموش ہے اور صرف قرآن نے بھی ان کے بارے میں یہ مختصر واقعہ دیا ہے - بعض صحیح احادیث میں بھی ان کے بارے میں مختصر سی معلومات ہیں -

اس موقعہ پر قرآن کریم ذوالقرنین کی زبانی یہ بات کہتا ہے :

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا (۱۸:۹۸) "مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اسے پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے" - یہ نص کسی مخصوص وقت کا تعین نہیں کرتی کہ اللہ کا وعدہ کب آئے گا - اللہ کے وعدے سے مراد یہاں وہ میعاد ہے کہ جب یہ بند ٹوٹ جائے گا - ہو سکتا ہے کہ اللہ کا وعدہ گزر چکا ہو اور وہ بند ٹوٹ چکا ہو - جب تاتاریوں نے عالم اسلام پر ہلہ بولا تھا تو انہوں نے تمام مہذب ممالک میں پھیل کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی - (۱)

سورہ انبیاء کی ایک آیت میں ہے -

حَتّٰٓي اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (۹۶) وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ (۹۷) (۲۱:۹۶ - ۹۷) "یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیئے

---

(۱) پندرہویں صدی میں یہ معلوم ہوا ہے کہ ترمذ شہر کے قریب ایک لوہے کے دروازے کی دریافت ہوئی ہے - ایک جرمن سیاح سیلذبرجر نے اسے دیکھا اور اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے - ایک ہسپانوی مورخ کلانیجو نے ۱۴۰۳ء میں اس کا ذکر کیا ہے - انہوں نے کہا ہے کہ سمرقند سے انڈیا کی طرف جاتے ہوئے راستے میں لوہے کا ایک دروازہ واقع ہے' ہو سکتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کا بنایا ہوا ہو -

جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے اور وعدۂ برحق کے آنے کا وقت قریب آ لگے گا"۔

اس آیت میں بھی خروج یاجوج و ماجوج کا زمانہ متعین نہیں ہے۔ وعدۂ برحق کے قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آجائے گی۔ قیامت کا قریب آجانا واقعہ ہو چکا ہے' جب سے رسول اللہؐ مبعوث ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے : اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ "قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا"۔ اب قریب کا مطلب اس زمانے کے لحاظ سے نہیں ہے جس کا شمار ہم کرتے ہیں' اللہ کے حساب میں قرب اور دوری کا اور مفہوم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے قریب آنے اور وقوع قیامت کے درمیان بھی کئی ملین سال گزر جائیں یا صدیاں گزر جائیں جنہیں انسان اپنے حساب میں ایک طویل عرصہ سمجھتا ہے جبکہ اللہ کے نزدیک وہ بہت ہی مختصر عرصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر بھی جائز ہے کہ حضورؐ کی رسالت کے زمانے کے بعد اور ہمارے اس دور سے قبل ہی یہ بند کھل گیا ہو اور مغلوں اور تاتاریوں کا خروج خروج یاجوج و ماجوج ہو۔

ایک صحیح حدیث جسے امام احمد نے سفیان عن عروہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے اسب بنت ابو سلمہ' حبیبہ بنت ام حبیبہ بنت ابو سفیان سے۔ اس نے اپنی ماں حبیبہ سے۔ انہوں نے زینب بنت جحش ام المومنین سے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک دن رسول اللہؐ خواب سے بیدار ہوئے تو آپ کا چہرۂ مبارک سرخ تھا اور آپ فرما رہے تھے "ہلاکت ہے عربوں کے لیے اس شر سے جو قریب ہو گئی ہے۔ آج یاجوج اور ماجوج کے بند میں اس قدر شگاف پڑ گیا ہے اور آپ نے اپنے انگوٹھے اور اشارہ کی انگلی کے درمیان فاصلہ کر کے بتایا کہ اس قدر شگاف پڑ گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا رسول خداؐ کیا ہمیں ہلاک کر دیا جائے گا حالانکہ ہمارے درمیان صالح لوگ بھی موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں جب برا عنصر زیادہ ہو جائے۔

اس پیشین گوئی کو چودہ سو سال ہو گئے ہیں۔ تاتاریوں کی تاخت و تاراج اس کے بعد واقعہ ہوئی۔ انہوں نے عربوں کی حکومت کو' خلافت عباسیہ کے زمانے میں' معتصم کی خلافت کے دور میں' جو عباسی خلفاء میں سے آخری خلیفہ تھا' ختم کر دیا۔ یہ حضور اکرمؐ کے خواب کی تعبیر ہو سکتی ہے۔ حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے بلکہ ہماری ترجیح ہے۔

--- ○○○ ---

اب ہم دوبارہ سیاق قرآن کی طرف آتے ہیں۔ ذوالقرنین کے تذکرہ کے بعد بطور تعقیب مناظر قیامت میں سے ایک منظر سامنے لایا جاتا ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾

۱۱ ع ۹ ۲

"اور اس روز ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور صور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔ اور وہ دن ہو گا جب ہم جہنم کو کافروں کے سامنے لائیں گے 'ان کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو مختلف انسانی گروہوں کی عکاسی کر رہا ہے' جس میں مختلف گروپ نظر آ رہے ہیں جو مختلف رنگوں' مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک وسیع میدان میں اٹھائے گئے ہیں اور یہ لوگ بغیر کسی نظام اور ترتیب کے ایک دوسرے کے خلاف گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کیوں ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہے۔ یہ لوگ دریا کی موجوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور باہم مل جاتے ہیں بغیر کسی انتظام کے۔ پھر ایک صور پھونکا جائے گا۔

وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸ : ۹۹) "پھر صور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے"۔ اب وہ ایک صف میں منظم طریقے سے کھڑے ہیں۔

پھر وہ کافر جنہوں نے اللہ کی یاد سے منہ موڑا اور جو اس طرح نظر آ رہے تھے کہ شاید ان کی آنکھوں پر پردے ہیں اور شاید ان کے کانوں میں سننے کی قوت ہی نہیں ہے۔ ان پر جہنم پیش ہو گی۔ اب یہ لوگ جہنم سے اس طرح منہ نہ موڑ سکیں گے جس طرح یہ دنیا میں ہدایت سے منہ موڑ رہے تھے۔ اب ان میں منہ موڑنے کی طاقت ہی نہ ہو گی۔ اب ان کی آنکھوں کے اوپر سے پردے ہٹ جائیں گے۔ اب وہ سرکشی اور اعراض کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے یعنی جزاء پوری کی پوری جزاء۔

قرآن کریم نے یہاں اس منظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے اعراض کی تصویر کو اور ان کے لیے جہنم کی پیش کو ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کیا ہے۔ دونوں چیزیں عملاً حرکت کرتے ہوئے منظر کی صورت میں پیش کی گئی ہیں اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز کلام ہے۔ اور اس تقابلی منظر کشی پر پھر تبصرہ' نہایت ہی تلخ اور حقارت آمیز تبصرہ یوں کیا جاتا ہے!

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝۱۰۲

"تو کیا یہ لوگ' جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے' یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنا لیں؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے"۔

کیا لوگوں نے میرے اپنے پیدا کردہ بندوں کو اپنا مددگار بنا رکھا ہے؟ کیا یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں گے؟ اور اللہ کی حکومت کی گرفت سے انہیں بچائیں گے؟ اگر انہوں نے ایسا کوئی گمان باندھ رکھا ہے تو انہیں چاہئے کہ اپنے اس گمان کے انجام سے دوچار ہونے کی تیاری بھی کر لیں۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (۱۸ : ۱۰۲) "ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے" ۔ اللہ بچائے! کیا ہی خوفناک استقبال ہے ۔ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے نہ ان کو کوئی جدوجہد کرنی پڑے گی اور نہ کوئی انتظار کرنا ہو گا ۔ یہ سب کچھ ان کے لیے تیار ہے ۔ صرف مہمانوں کے پہنچنے کی دیر ہے؟

---ooo---

اب فکر و شعور کی تاروں پر آخری ضربیں لگائی جاتی ہیں ۔ تمام خطوط کو یہاں جمع کر کے اب ان پر آخری تبصرے کیے جاتے ہیں ۔

پہلا تبصرہ اسلامی قدروں اور حسن و قبح کے پیمانوں کے بارے میں ہے ۔ وہ اقدار اور پیمانے جو گمراہوں اور خسارے سے دوچار ہونے والوں کے ہاں مقبول عام ہیں اور قیمتی نتائج کے حامل ہیں ۔ اعمال و اشخاص سے متعلق ان کے افکار کی روشنی میں ۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝

"اے نبیؐ، ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون لوگ ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا ۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے" ۔

اے نبیؐ لوگوں کو یہ بات سمجھاؤ کہ ناکام اور نامراد لوگ کون ہیں؟ ایسے نامراد کہ ان سے بڑا نامراد اور خسارے میں پڑنے والا اور کوئی نہیں ہے ۔ وہ لوگ جن کی سعی اور جدوجہد اس دنیا میں بھٹکی رہی ہے ۔ ان کی یہ جدوجہد ان کو راہ راست پر نہ لا سکی اور اس پوری سعی کا کوئی ثمرہ اور نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸ : ۱۰۴) "اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں" ۔ وہ اس قدر غفلت میں پڑے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ ان کی یہ جدوجہد ضائع جا رہی ہے ۔ اپنی جدوجہد میں غلط سمت پر بہت دور نکلے جا رہے ہیں اور اپنی پوری زندگی کو اس میں کھپا کر ضائع کر رہے ہیں ۔

ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خوفناک سوال کر کے کہ بتاؤں تمہیں؟ اور جب سامعین کا شوق بڑھ جاتا ہے اور وہ بے تاب ہو جاتے ہیں کہ پردہ گرے اور وہ حقیقت کو دیکھیں تو انہیں بتا دیا جاتا ہے ۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۸:۱۰۵) "یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا' اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے"۔

حبوط کا اصلی اور لغوی مفہوم' جانور کا پیٹ پھولنا ہے' جب وہ کوئی زہریلی گھاس کھالے۔ضائع ہونے والے انسانی اعمال کی حقیقت بتانے کے لیے حبوط سے کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔یہ جانور پھول جاتا ہے' نادان مالک جانتا ہے کہ یہ جانور توانا اور مضبوط ہو گیا ہے اور اب وہ کامیاب اور نفع بخش ہو گا لیکن اس کے نتیجے میں اس کی موت واقعہ ہو جاتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸:۱۰۵) "یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا' اس لیے ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے۔قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں گے" کیونکہ یہ بے کار اور مہمل ہو گئے تھے۔نہ ان کی قیمت ہے اور نہ وزن۔اللہ کے صحیح پیمانوں کے مطابق ان کا وزن نہ ہو گا' تو اب کیا ہو گا ان لوگوں کا؟

ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝

"ان کی جزا جہنم ہے اس کفر کے بدلے جو انھوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے"۔لیکن منظر مکمل تب ہوتا ہے جب اس میں اہل ایمان کا انجام بھی سامنے لایا جائے۔ان کے پیمانوں اور اقدار کا انجام بھی بتا دیا جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۝

"البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے' ان کی میزبانی کے لیے فردوس کے باغ ہوں گے۔وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو ان کا جی نہ چاہے گا"۔ان لوگوں کی جنت الفردوس میں مہمانی مقابل ہے کفار کی مہمانی کے جو جہنم میں ہو رہی ہے۔کتنا ہی بڑا فرق ہے دونوں میں۔

یہاں نہایت ہی لطیف انداز میں انسانی نفس اور اس کے احساسات اور مسرتوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا (۱۸:۱۰۸) "کہ کبھی اس جگہ سے نکل جانے کو ان کا جی نہ چاہے گا"۔

اس انسانی نفسیاتی اشارے میں جو گہرائی ہے' اس پر ہمیں چاہیے کہ قدرے غور کریں۔

یہ لوگ جنت الفردوس میں ہمیشہ رہیں گے لیکن نفس انسانی ہمیشہ تغیر طلب ہے۔ کسی کام کا تسلسل اسے ملول کر دیتا ہے۔ کسی ایک جگہ ہمیشہ رہتے رہتے اور کسی ایک ہی حال میں ہوتے ہوئے وہ تنگ آجاتا ہے اور جب انسان نعمتوں میں ڈوبا ہوتا ہے اور اسے یہ خطرہ نہیں رہتا کہ اس نعمت کا زوال بھی ہو گا تو اس کے دل میں کوئی حرص اور لالچ نہیں رہتی۔ اور جب انسان ایک ہی ڈگر پر چلتا رہتا ہے تو وہ اکتا جاتا ہے بلکہ یہ اکتاہٹ دل کی تنگی میں بدل جاتی ہے اور انسان پھر چاہتا ہے کہ اس سے کسی طرح جان چھوٹ جائے۔ ذائقہ بدل جائے۔

یہ ایک حکمت ہے' نہایت ہی گہری حکمت' جس پر اللہ نے انسان کی جبلت تیار کی ہے اور یہ گہری فطرت و جبلت اللہ نے انسان کے اندر اس لیے پیدا کی ہے کہ یہ انسان کے فریضہ خلافت ارضی کی انجام دہی کے لیے لابدی تھی۔ اس سلسلے میں انسان کو جو کردار سپرد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہروقت زندگی کے شب و روز کو بدلتا رہے اور بہتر سے بہتر بنا کر اسے ترقی دیتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس معیار پر پہنچ جائے جو تقدیر الٰہی میں مقدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فطرتاً تغیر پسند ہے۔ وہ نئے نئے انکشافات اور نئی نئی اطلاعات کا دلدادہ ہے۔ ہر حال سے دوسرے حال میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اس کا من پسند مشغلہ ہے۔ ایک منظر سے دوسرے منظر' ایک نظام سے دوسرا نظام وغیرہ تاکہ انسان یہ سفر کرتے کرتے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے زندگی کے اندر حقیقی تبدیلی لاتا رہے اور زمین کے اندر پوشیدہ رازوں تک آئے دن پہنچتا رہے۔ زمین کی مادی شکل اور نظام کی نئی نئی شکلیں وضع کرے۔ ان انکشافات' ان ایجادات اور علم کی اس ترقی کے نتیجے میں' زندگی بھی بدلتی رہے اور یوں آہستہ آہستہ یہ اس کمال تک پہنچ جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا ہوا ہے۔

اور پھر فطرت کا ایک دوسرا رنگ بھی ہے۔ ہم بعض اوقات قدیم سے بھی محبت کرتے ہیں۔ پرانی روایات کو بھی سینے سے لگاتے ہیں۔ بعض اوقات اپنی عادت کو بدلنا بھی نہیں چاہتے جبکہ ہماری یہ عادات بعض اوقات ہمیں جامد بھی بنا دیتی ہیں۔ شوق تغیر کے ساتھ ساتھ عادات و تقالید کا یہ جمود دراصل جوش تغیر کے اندر ایک توازن پیدا کر دیتا ہے۔ جب بھی یہ توازن ختم ہوتا ہے تو جمود ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ جب جمود حد سے بڑھتا ہے تو ردعمل میں انقلاب آتا ہے اور یہ انقلاب زندگی کی گاڑی کو کبھی کبھار اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ توازن قائم نہیں رہتا۔ انسانی زندگی کا بہترین دور وہ ہوتا ہے کہ جب تغیر و ثبات اور ترقی اور جمود اور حرکت و قیام کی قوتوں کے درمیان توازن ہو۔

یاد رکھیے کہ جب کسی سوسائٹی پر جمود طاری ہو جاتا ہے تو زندگی کی وہ قوتیں جو اسے آگے بڑھانے والی ہوتی ہیں وہ محدود ہو کر رک جاتی ہیں' اور سوسائٹی پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد بھی مردہ تصور ہوتے ہیں۔

یہ ہے انسانی فطرت جس کو اس کے فریضہ خلافت ارضی کے لیے موزوں بنایا گیا ہے۔ رہی جنت تو وہ ترقی کا منتہائے کمال ہے۔ وہاں تغیر کی تو ضرورت نہ ہو گی' بلکہ اس سے اونچا کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ اس سے آگے کوئی منزل نہیں ہے۔ اگر وہاں بھی انسان کو زمین کی فطرت پر قائم رکھا گیا اور صورت یہ ہو گی کہ جنت تو نعیم مقیم ہے' اس کے ختم ہونے کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ وہاں تغیر کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی واقعہ نہ ہو گی اور حالات جوں کے توں رہیں گے جبکہ انسان جنت میں بھی سیماب فطرت ہے تو پھر یہ جنت اس کے لیے جہنم بن جائے گی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے

بعد یہ انسان اکتا جائے گا بلکہ جنت کو قید خانہ سمجھے گا۔ اور یہ انسان کوشش کرے گا کہ اسے اس جنت کو چھوڑنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ وہ ایک تھوڑے عرصے کے لیے باہر جانا چاہتا ہے اگرچہ باہر جہنم ہی کیوں نہ ہو تاکہ وہ اپنے جذبہ تغیر اور تبدیلی کو تسکین دے سکے۔ لیکن جس انسان کو اللہ نے اس جہان میں پیدا کر کے بھیجا ہے وہ اس کے بارے میں خوب جانتا ہے۔ وہ وہاں انسان کے ان دنیاوی جذبات کو بدل دے گا۔ انسان وہاں تغیر اور تبدیلی کی چاہت ہی نہ رکھے گا۔ یہ اس لیے کہ وہاں انسانی فطرت حالات خلود کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گی کیونکہ اس نے وہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

اب ذرا انسانی شعور و آگاہی کی تاروں پر ایک دوسری ضرب لگائی جاتی ہے۔ اس سے انسانی شعور کو یہ آگاہی دینا مقصود ہے کہ انسانی علم محدود ہے۔ اس کی فہم و ادراک کی قوت اور دائرہ محدود ہے۔ لیکن اس معنوی مفہوم کو قرآن کریم نہایت ہی محسوس اور عام فہم انداز میں پیش کرتا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

"اے نبی کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے"۔

انسانی معلومات کی حد تک سب سے بڑا ذخیرہ آب سمندر ہے۔ انسان جو علوم لکھتے ہیں وہ سیاہی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اپنے علم کو وہ روشنائی کی شکل میں کاغذ پر لاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کا علم بہت ہی وسیع ہے۔

قرآن مجید یہاں ان کو یہ سمجھاتا ہے کہ اگر ان وسیع اور گہرے سمندروں کو روشنائی بنا دیا جائے اور اللہ کے علم کو لکھنا شروع کیا جائے 'تو یہ سمندر تو خشک ہو جائیں گے مگر اللہ کے علوم ختم نہیں ہو سکتے۔ ذرا آگے سوچو کہ اس سمندر جتنا اور سمندر لے آئے ہم۔ دوسرا سمندر بھی ختم ہو گیا' مگر اللہ کے کلمات و علوم ختم نہ ہوئے۔

اس محسوس تصور' اور اس مجسم حرکت کے ذریعے انسانی محدود تصور اور ناپختہ شعور اور قاصر قوت مدرکہ کے قریب حقیقت لائی گئی کہ اللہ کا علم بہت وسیع ہے۔ اگرچہ اللہ کے علم کی وسعت کی حقیقت اب بھی ہمارے ادراک کی حدود سے وراء ہے۔

یہ ہے وہ مقصد' یعنی تقریب الی الافہام' جس کے لیے قرآن کریم امثال لاتا ہے اور نہایت ہی گہرے اور ناقابل فہم معانی کو ایک مشاہدے اور تصویر کی شکل میں انسانی فہم و ادراک کے قریب لایا جاتا ہے۔

اس مثال میں بحر کو چونکہ انسان بہت ہی وسیع سمجھتا ہے اور اپنے علم کو بھی سمندر کی طرح بہت ہی وسیع سمجھتا ہے' اس لیے قرآن بتاتا ہے کہ وسیع اور گہرا ہونے کے باوجود یہ سمندر بھی محدود ہے اور کلمات جو علم الہی کو ظاہر کرتے ہیں' لامحدود ہیں۔ انسان ان کی انتہا تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان علم الہی کا نہ ادراک کر سکتا ہے' نہ اسے قلم بند کر سکتا ہے اور نہ اس کی نقل کر سکتا ہے۔

انسان اپنے انفس و آفاق کی دنیا میں جو معمولی سی پیش رفت کر لیتا ہے، وہ اس پر بھی اترانا شروع کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید اسے بہت بڑی علمی فتح حاصل ہو گئی ہے۔ بعض کو تو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ سب کچھ جان گئے ہیں یا جلد ہی سب کچھ جان لیں گے۔

لیکن عالم مجہول انسان کے سامنے ایسے آفاق رکھتا ہے جن کو سر کرنا اور جن تک انسان کا پہنچ جانا نہایت ہی دور کی بات ہے۔ انسان جب بھی اپنے حقیقی علم کا جائزہ لے گا کہ وہ سمجھے گا کہ وہ تو ابھی تک ساحل ہی پر کھڑا ہے۔

انسان آج تک اللہ کے جن علوم کو دائرہ علم اور دائرہ تحریر میں لا سکا ہے وہ علم الٰہی کا ایک نہایت ہی محدود اور قلیل حصہ ہیں کیونکہ محدود اور لامحدود کے درمیان ہم کوئی نسبت قائم نہیں کر سکتے اور نہ ان کے درمیان کوئی نسبت ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

غرض انسان جس قدر علوم چاہے سیکھے اور اس کرۂ ارض کے بارے جو انکشافات چاہے کرے۔ لیکن اسے چاہئے کہ غرور علمی کو ذرا تھوک دے۔ اس کے علم کی انتہا اگر یہ ہو کہ "سمندر روشنائی بن کر خشک ہو جائے تو بھی علم الٰہی کی تحریر و تسوید ختم نہ ہو گی اگرچہ اس جیسا کوئی اور سمندر بھی لے آیا جائے، کلمات الٰہیہ کا اختتام نہ ہو سکے گا۔

---○○○---

علم انسانی کی محدودیت کو ثابت کرنے کے لیے آپ انسانی شعور کی تاروں کو تیسری مرتبہ چھیڑا جاتا ہے۔ یہاں انسان کے مرتبہ و کمال کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور رسالت آخیرہ کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کہ نبی آخر الزمان کا علم بھی ذات باری کے لامحدود علم کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔ انسانی فکر و نظر اس کے لامحدود علم کے مقابلے میں قاصر ہی رہے گا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

"اے نبی" کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو، اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔

یہ ہے مقام الوہیت کا افق بعید، افق بلند۔ اس کے مقابلے میں انسانی علم کا افق بہت ہی نیچے ہے۔ کیونکہ علم نبوی ہو، بہرحال نبی بشر ہی تو ہوتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸ : ۱۱۰) "اے نبی" کہو میں تو ایک انسان ہی ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی"۔ بس یہی فرق ہے میرے اور تمہارے درمیان کہ میں باری تعالیٰ کے بلند آفاق علم سے کچھ حاصل کرتا رہتا ہوں۔ اس دائمی سرچشمے سے میں علم حاصل کرتا ہوں۔ میں ان ہدایات سے سرمو

انحراف نہیں کر سکتا جو مجھے عالم بالا سے ملتی ہیں۔ میں انسان ہوں' پہلے خود سیکھتا ہوں' پھر سکھاتا ہوں لہٰذا جو شخص ان بلند علوم کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ ان علوم سے فائدہ اٹھائے جو اس سرچشمے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سکھائے۔ انسانوں کو چاہئے کہ وہ حصول علوم کے لیے سرچشمہ نبوت سے سیراب ہوں اور اس کے سوا تمام سرچشموں کو چھوڑ دیں۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا

(۱۸ : ۱۱۰) "پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو' اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔

بارگاہ الٰہی کی بلند مملکت میں داخل ہونے کے لیے علوم نبوت ویزا ہیں۔ اس سورہ کا آغاز بھی مضمون وحی اور توحید سے ہوا تھا۔ خاتمہ بھی علوم الٰہیہ کے سلسلے میں ان اہم ہدایات پنے ہوا اور انسانی شعور و آگہی کے تاروں کو یوں چھیڑا گیا کہ ان سے وہ نغمات حقیقت بلند ہونے لگے جو اس کائنات کے راز کو ظاہر کرتے ہیں۔ عظیم راز یعنی وحی الٰہی و توحید مطلق کے راز۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۱۶

سورۂ مریم - ۱۹

آیات ۱--- تا--- ۹۸

سورہ مریم ایک نظر میں

سورہ مریم کا محور عقیدہ توحید ہے اور نفی اولاد اور نفی شرک ہے۔ عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا عقیدہ بعث بعد الموت ہے' لہٰذا مناظر قیامت بھی اس سورہ کا بنیادی مضمون ہیں۔ چنانچہ دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورہ کا اساسی مضمون بھی یہی ہے۔

اس سورہ کے مواد میں زیادہ تر قصص ہیں۔ آغاز قصہ حضرت زکریا سے ہوتا ہے۔ حضرت یحییٰ کا قصہ آتا ہے۔ مریم اور ولادت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات ہیں۔ حضرت ابراہیم اور ان کے باپ کی ایک جھلک ہے۔ اس کے بعد تمام نبیوں کی طرف اشارات ہیں۔ حضرت اسحاق و یعقوب' حضرت موسیٰ و ہارون' حضرت اسماعیل و ادریس اور حضرت آدم و نوح وغیرہ۔ اس سورہ کا دو تہائی حصہ ان قصص پر مشتمل ہے۔ تمام قصص کے لانے سے مقصود عقیدۂ توحید ہے۔ عقیدہ بعث بعد الموت کا ثبوت' رد شرک اور نفی اولاد۔ مزید یہ بتایا گیا ہے کہ ان نبیوں کے متبعین کے خدوخال کیا رہے اور گمراہوں کا طرز عمل کیا رہا۔

اس میں منکرین قیامت کے لیے بعض مناظر قیامت دکھائے گئے ہیں اور شرک اور دعوائے ابنیت عیسیٰ کی مذمت اور رد بھی اس میں ہے۔ مشرکین اور رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر عذاب الہٰی کے مناظر بھی ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یہ سب مناظر اس سورہ میں پائے جانے والے قصص کے رخ کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہیں اور سورہ کے اصلی اور حقیقی محور اور موضوع کے ساتھ منسلک بھی۔ پھر اس سورہ کی ایک خاص فضا ہے جو اس پوری سورہ میں قائم رہتی ہے اور اس کے تمام موضوعات میں وہ فضا پائی جاتی ہے۔

اس سورہ کا انداز کلام گہرے تاثرات اور گہرے شعور پر مشتمل ہے۔ نفس انسانی کے تاثرات' اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کا گہرا شعور! کائنات کا شعور! ہاں اس کائنات کو ہم جمادات کا حصہ شمار کرتے ہیں جو احساس سے محروم ہے لیکن یہ سورہ بتاتی ہے کہ حقیقت کبریٰ کا شعور و احساس اس جامد کائنات کو بھی ہے۔ یہ کائنات بھی اس شعور میں شریک ہے۔ یہ سورہ بتاتی ہے کہ عقائد شرکیہ کے اظہار پر اس کائنات کو بھی غصہ آتا ہے اور خوف بھی آتا ہے اور اس غصے اور خوف کے مارے قریب ہے کہ یہ پہاڑ پھٹ جائیں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ کیوں؟

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۹۱) وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا

(۹۲) (۱۹ : ۹۱ - ۹۲) "اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اللہ کے لئے سزاوار نہیں کہ اسکی اولاد ہو"۔

انسانی نفس کے تاثرات تو اس سورہ کے آغاز ہی سے شروع ہوتے ہیں اور اس کے اختتام تک جاری رہتے ہیں۔ اس سورہ کے اہم قصص میں بھی یہ نفسیاتی تاثرات قائم ہیں۔ خصوصاً قصص کے پریشان کن مواقع میں۔ مثلاً قصہ مریم کے مختلف مراحل میں۔

اس سورہ کی غالب فضا رحمت' رضامندی اور اللہ کے ساتھ اتصال کی فضا ہے۔ اس کا آغاز حضرت زکریا اور اللہ تعالیٰ کی مناجات سے ہوتا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا (۱۹ : ۲) "ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی"۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ اپنے رب کے بہت ہی قریب تھے اور ان کے درمیان مناجات ہو رہی تھی۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (۱۹ : ۳) "جبکہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا"۔ اس سورہ میں لفظ رحمت کا بار بار تکرار ہوتا ہے اور رحمت خداوندی کی فضا بھی اس پوری سورہ پر چھائی ہوئی ہے۔ اس سورہ میں اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سورہ میں اس نعمت کا بھی ذکر ہے جسے اہل ایمان باہم ودگر محبت کی شکل میں پاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹ : ۹۶)

"یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کر رہے ہیں' عنقریب رحمٰن ان کے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا"۔ اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ پر اپنی رحمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کو حنان (محبت کرنے والا) بنایا گیا۔

وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا (۱۹ . ۱۳) "اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی اور وہ بڑا پرہیزگار تھا"۔ اور حضرت عیسیٰ پر اللہ کی رحمت کا ایک رنگ یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ بہت ہی نرمی کرنے والے تھے اور والدہ کے حق شناس بنائے گئے تھے۔

وَّبَرًّا بِوَالِدَتِهٖ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۹ . ۱۴) "اور اللہ نے مجھے اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا"۔

آپ جب اس سورہ کو غور سے پڑھیں تو آپ اس میں نہایت ہی مہربانی' محبت اور رحمت وشفقت کے لطیف کلمات و عبارات اور نہایت ہی گہری چھاؤں محسوس کریں گے۔ جس طرح آپ محسوس کریں گے کہ شرک اور ابنیت کے عقیدے کو سن کر یہ کائنات بھی مارے خوف کے کانپ اٹھتی ہے اور فطرت کائنات کے لیے بھی یہ قول ناقابل برداشت ہے۔

پھر اس سورہ میں ایک خاص موسیقی اور ترنم ہے۔ اس کے الفاظ میں بھی اور اس کے فواصل میں بھی نہایت ہی گہرا ترنم ہے۔ مثلاً دیکھئے رضیا' خفیا' سریا' نجیا۔ لیکن جہاں مقام شدت اور سختی کا ہے تو اس میں لفظ بھی سخت ہیں مثلاً مشدد دال ہے۔ مثلاً مدا' ضدا' ھدا یا مشدد زاء ہے عزا' ازا وغیرہ۔

اس سورہ میں فواصل اور قافیہ کا تنوع بھی واضح طور پر پایا جاتا ہے اور ان کے تنوع کے ساتھ ترنم اور موسیقی میں بھی تنوع اور زیر و بم پایا جاتا ہے۔ حصہ اول کا آغاز حضرت زکریا اور یحییٰ کے ذکر سے ہوتا ہے تو فواصل اور قافیے یوں ہیں۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا (٢) إِذْ نَادٰى رَبَّهُ نِدَآءً خَفِيًّا (٣) (١٩: ٢ - ٣)

اور اس کے بعد جب حضرت مریم و عیسیٰ کا قصہ شروع ہوتا ہے تو فواصل و قوافی یوں بدل جاتے ہیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (١٦) فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (١٧) (١٩: ١٦ - ١٧)

یوں یہ قوافی چلتے ہیں۔

اس طرح قصص ختم ہوتے ہیں اور پھر ان پر تبصرہ آتا ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کی حقیقت کا تعین کیا جاتا ہے' ان کی نبوت کے بارے میں قول فیصل آتا ہے۔ اور قوافی و فواصل کا نظام بدل جاتا ہے۔ آیات کا فاصلہ طویل ہو جاتا ہے اور میم اور نون کا قافیہ ختم ہوتا ہے جو وقت پر برقرار رہتا ہے اور ساکن ہوتا ہے اور یائے ممدودہ کے فواصل بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ (٣٤) مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحٰنَهُ إِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (٣٥) (١٩: ٣٤ - ٣٥)

پھر جب بات کی سختی ختم ہوتی ہے اور بات فیصلہ کن انداز کی ہو جاتی ہے تو پھر وہی مد والا قافیہ آ جاتا ہے اور بات میں وہی نرمی آ جاتی ہے جو اس سورہ کا خاص رنگ ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا (٤١) إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يٰأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا (٤٢) (١٩: ٤١ - ٤٢) لیکن جب اس قصے میں جھٹلانے والوں کا ذکر آتا ہے' جس میں جھٹلانے والوں کے لیے عذاب اور ان سے خدائی انتقام کا ذکر ہے تو آیات کا ترنم اور قافیہ کی صوتی صورت حالات بدل بھی جاتی ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا حَتّٰى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا (١٩: ٧٥) پھر سرزنش اور تحزیں کے موقع پر یہ معنوی ترنم اور موسیقی مشدد دال کی شکل میں آتی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (۸۸) لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا (۸۹) تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۹۰) (۱۹: ۸۸ تا ۹۰) یوں اس سورت میں موسیقی اور الفاظ کی سختی اور نرمی مفہوم 'فضا اور موقعہ کے اعتبار سے نرم اور سخت ہو جاتی ہے۔ یوں پوری سورہ کے درمیان صوتی اثرات اور لہجہ موقعہ و محل کے مطابق نرم و سخت ہوتا رہتا ہے۔ جوں ہی سیاق کلام اور مفہوم ایک فضا سے دوسری فضا میں داخل ہوتا ہے الفاظ اور صوتی انداز بھی بدل جاتا ہے۔

یہ سورہ اپنے موضوع کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

(۱) پہلے حصے میں حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ کا قصہ ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا قصہ ہے۔ اس پر پھر تفصیلی تبصرہ کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے مسئلے کو نہایت ہی حقیقت پسندانہ انداز میں حل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے درمیان نہایت بنیادی اختلاف تھا اور دونوں گروہ دو انتہاؤں پر تھے۔

(۲) حصہ دوئم میں حضرت ابراہیم کے قصے کا ایک حصہ 'حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے باپ اور ان کی قوم کے درمیان کشمکش کی کہانی۔ ان کا ان لوگوں سے الگ ہونا اور پھر ان کو بہترین اولاد دینا اور پھر ان کو امت قرار دینا۔ پھر دوسرے نبیوں کے قصص اور ان لوگوں کا ذکر جنہوں نے ہدایت حاصل کی اور ان لوگوں کا ذکر جو گمراہ ہوئے اور دونوں کا انجام 'اس حصے کا اختتام بھی عقیدہ توحید کے بیان پر ہوتا ہے۔ اللہ کی بندگی بلا شائبہ شرک۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (۱۹: ۶۵) "وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں۔ بس تم اس کی بندگی پر ثابت قدم رہو۔ کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کے ہم پایہ؟"

(۳) تیسرا حصہ بعث بعد الموت پر کلام سے شروع ہوتا ہے۔ قیامت کے کچھ مناظر اس میں بیان ہوتے ہیں۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات عقیدہ شرکیہ کا انکار کرتی ہے اور پھر قرون اولیٰ کی بے شمار منکر حق اقوام کی ہلاکت کا ایک موثر منظر بھی دکھایا گیا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۱۹: ۹۸) "ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں 'پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟"

اب ہم درس اول کی طرف آتے ہیں۔

درس نمبر ۱۳۵ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۴۰

سُورَةُ مَرْيَمَ (۱۹) مَكِّيَّةٌ (۴۴) اٰيَاتُهَا ۹۸ رُكُوعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾

"ک، ہ، ی، ع، ص"۔ یہ حروف مقطعات جن سے اس سورہ کا آغاز ہو رہا ہے ان کی تفسیر میں ہماری یہی رائے ہے کہ یہ وہی حروف ہیں جن سے قرآن کریم بنا ہے۔ ان ہی سے یہ معجز کتاب بنی ہے اور انسانیت اس کتاب جیسی کتاب لانے سے عاجز ہے۔ حالانکہ یہ حروف اور ان سے بنے ہوئے کلمات انسانوں کی دسترس میں ہیں' لیکن وہ اس موجود مواد سے کوئی ایسی کتاب تیار کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

ان حروف کے تذکرے کے بعد حضرت زکریا اور یحییٰ کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس قصے کا بیشتر مواد رحمت الٰہی پر مبنی ہے۔ پورے ماحول پر رحمت خداوندی سایہ فگن ہے۔ چنانچہ آغاز ہی لفظ رحمت سے ہوتا ہے' ذکر رحمت سے ہوتا ہے.....

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾

"ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی"۔

اصل قصے کا آغاز ایک دعا کے منظر سے ہوتا ہے۔ یہ دعا حضرت زکریا کرتے ہیں اور نہایت عاجزی اور خضوع و خشوع کے ساتھ کرتے ہیں۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَ اِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾

"جبکہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اس نے عرض کیا: "اے پروردگار' میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے اے پروردگار' میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی

بندوں کی برائیوں کا خوف ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کی میراث بھی پائے اور اے پروردگار' اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا"۔

وہ اپنے رب کے ساتھ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر مناجات کرتے ہیں۔ نہ کوئی دیکھتا ہے' نہ کوئی سنتا ہے۔ گوشہ تنہائی میں نہایت خلوص کے ساتھ رب کو پکارتے ہیں اور اپنا سینہ کھول کر اپنے رب کے سامنے رکھتے ہیں (جو خوب جانتا ہے)۔ وہ اپنا بوجھ' پریشانی اللہ کے سامنے رکھتے ہیں۔ نہایت قرب و اتصال کی حالت میں وہ رب کو پکارتے ہیں۔ (رب) - وہ یہاں حرف ندایا کو بھی بیچ میں نہیں لاتے۔ اللہ تو بغیر دعا کے بھی سنتا ہے اور دیکھتا ہے' اسے کسی پکارنے والے کی پکار کی ضرورت نہیں' لیکن یہ ایک غمزدہ شخص کی ضرورت ہے کہ وہ پکارے' وہ شکوہ کرے' اور اللہ رحیم و کریم ہے۔ اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ پکارنے' رونے اور شکوہ کرنے سے بھی اس مخلوق کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ دعا کرو' گڑگڑاؤ' جس چیز سے تمہارے دل پر بوجھ پڑتا ہے اسے باہر نکالو'

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ "اور تمہارے رب نے کہا مجھے پکارو' میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں"۔ تاکہ تمہارے اعصاب پر سے قدرے بوجھ اتر جائے۔ تمہارے دلوں کو یہ اطمینان تو ہو جائے کہ ہم نے ایک قوی تر ہستی کے پاس رپورٹ کر دی ہے۔ وہ بڑی قوت والا قادر مطلق ہے تاکہ تمہیں یہ شعور مل جائے کہ تمہارا رابطہ اس ذات سے ہے جس کے ہاں کوئی سوالی مایوس نہیں ہوتا۔ اور اس پر جو بھروسہ کرے وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوتا۔

حضرت زکریا رب کے سامنے یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور جب ہڈیاں ڈھیلی پڑ جائیں تو جسم سارا کا سارا ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ ہڈیاں ہی تو جسم کا مضبوط ترین حصہ ہیں۔ جسم کا بنیادی ڈھانچہ ہی ہڈیوں سے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر وہ بالوں کی سفیدی کی شکایت کرتے ہیں۔ انداز تعبیر کو دیکھئے کہ گویا سفیدی ایک آگ ہے جو سر کے بالوں کو لگی ہوئی ہے۔ سر اس میں تیزی سے جل رہا ہے اور جلد ہی اس میں کوئی سیاہ بال نہ رہے گا۔

ہڈیوں کا ڈھیلا پڑنا اور سر کے بالوں کا سفید ہونا دونوں کنایہ ہے' بڑھاپے سے۔ اور اس ضعف و کمزوری سے جس سے وہ دوچار ہیں اور اللہ کی رحمت سے بھی وہ ناامید نہیں ہیں۔ عرض پیش کرتے ہیں۔

اور وہ ساتھ ساتھ قبولیت دعا سے پہلے اپنا تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۱۹ : ۴) "اور اے پروردگار میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں ہوا"۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے بارے میں رب تعالیٰ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب بھی انہوں نے دعا کی ہے رب تعالیٰ نے منظور فرمائی ہے۔ جب وہ اپنے زمانہ جوانی اور قوت میں دعا میں نامراد نہیں رہے تو اب حالت ضعیفی میں تو وہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ اللہ انہیں نامراد نہ کرے اور ان کی دعا کو قبول کر لے۔

یہ تھی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اپنے رب کے جناب میں' نہایت ہی خفیہ انداز میں اور عاجزی اور تضرع کے ساتھ' الفاظ' معانی' ماحول اور اثرات پر اعتبار سے اس میں نرمی پائی جاتی ہے' اور منظر پر نہایت ہی ادب اور شائستگی چھائی ہوئی ہے۔

اب جواب دعاء ملاحظہ ہو اور اس موقعہ پر مکالمات :-

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْــــًٔا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِـيًّا ۝ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

ا
۱۵ع
۴

(جواب دیا گیا) "اے زکریا' ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحیٰ ہو گا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا"۔ عرض کیا "پروردگار' بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہو گا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں؟" جواب ملا "ایسا ہی ہو گا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے' آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا"۔ زکریا نے کہا "پروردگار' میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے"۔ فرمایا "تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا"۔ چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔

"اے یحیٰ' کتاب الٰہی کو مضبوط تھام لے"۔

ہم نے اسے بچپن ہی میں "حکم" سے نوازا اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔ سلام اس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے"۔

قبولیت دعا کے اس لمحے کی تصویر کشی نہایت ہی مہربانی' محبت اور رضا کی فضا میں ہے۔ عالم بالا سے ربِّ ذوالجلال

خود اپنے بندے کو پکارتے ہیں یٰزَکَرِیَّآ (اے زکریا) اور پکارتے ہی اسے خوشخبری دے دی جاتی ہے۔ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ (۱۹:۷) "ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں"۔ اب اللہ ان پر مہربانی کی انتہا کر دیتے ہیں کہ لڑکے کا نام بھی عالم بالا سے تجویز ہوتا ہے۔ اسْمُهٗ يَحْيٰي (۱۹:۷) "جس کا نام یحیٰی ہو گا"۔ اور پھر یہ کہ اس سے قبل یہ نام کسی فرد بشر کا نہیں رکھا گیا۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (۱۹:۷) "اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔

یہ اللہ کے کرم کا فیض اور بارش ہے' اسے اللہ اپنے اس بندے پر نچھاور کر رہا ہے جس نے اسے نہایت ہی عاجزی سے پکارا۔ تنہائی میں پکارا' اپنا سینہ کھول کر رب کے سامنے رکھ دیا کہ اسے ڈر کیا ہے۔ اپنا مسئلہ اللہ کے سامنے رکھا۔ اس دعا پر ان کو جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ انہیں اپنے عزیزوں اور ساتھیوں سے خطرہ لاحق تھا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی امانت اور مالی انتظام اچھی طرح نہ کر سکیں گے۔ اللہ نے ان پر فضل کیا اور ان کی خواہش پوری کر دی اور ان کو راضی کر دیا۔

ان کی دعا چونکہ فوری طور پر منظور ہو گئی' ان کی خواہش اولاد کا جوش فوراً ٹھنڈا ہو گیا' امید کی حرارت یقین میں بدل گئی۔ وہ اچانک ایک واقعی صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ عملاً اب یہ کام کس طرح ہو گا۔ وہ تو سوکھ بوڑھا ہے، ہڈیاں ڈھیلی پڑ گئی ہیں' سر سفید ہے۔ پھر بیوی بانجھ ہے' جوانی میں اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی' اب کس طرح وہ بچہ دے گی۔ اس لئے مزید طلب اطمینان قدرتی ہے۔ لہٰذا وہ معلوم کرتے ہیں کہ اس بچے کا ذریعہ کون اور کیا ہو گا؟

قَالَ رَبِّ اَنّٰي يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا

(۱۹:۸) "عرض کیا' پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہو گا' جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں"۔ چونکہ ان کو ایک عملی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر اللہ کا وعدہ بھی ہے اور اٹل ہے۔ ان کو پورا پورا یقین ہے کہ یہ عمل ہونے والا ہے لیکن وہ اس کی کیفیت معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یہ وعدہ کس طرح حقیقت کا روپ اختیار کرے گا تاکہ ان کا دل مطمئن ہو۔ یہ ایک قدرتی اور طبیعی نفسیاتی حالت ہوتی ہے۔ حضرت زکریا نبی صالح ہیں مگر ایک بشر ہیں اور ایک واقعیت پسند انسان۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ واقعی حقیقی صورت حالات کو اللہ کس طرح بدل دے گا؟

اللہ کے ہاں سے اس کا بھی جواب آ جاتا ہے۔ اے بندے یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔ ذرا اپنے نفس کو تو دیکھو' کہ تم کیسے وجود میں آ گئے جبکہ تم سرے سے تھے ہی نہیں۔ ہر زندہ ذات کی یہی مثال ہے۔ اس کائنات کی ہر زندہ چیز نہ تھی اور ہو گئی'

قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا

(۱۹:۹) "جواب ملا' ایسا ہی ہو گا' تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ایک ذرا سی بات ہے۔ اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا"۔

اپنی مخلوقات کی پیدائش میں اللہ کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں ہے۔ چھوٹی اور بڑی چیز 'حقیر اور عظیم چیز سب کا سبب صرف کن ہے۔ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو ہو جاتا ہے۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے بانجھ عورت کو ایسا بنایا ہے کہ اس کی اولاد نہ ہو اور بوڑھوں کو ایسا بنایا ہے کہ اس سے سلسلہ تناسل کا چلنا ختم ہو جائے۔ وہ بانجھ کو درست بھی کر سکتا ہے اور بانجھ پن کو دور کر سکتا ہے اور ایک بوڑھے مرد میں از سر نو قوت تولید پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہ کام بہ نسبت اس کے 'کہ اللہ نے انسان کو اس حال میں پیدا کیا کہ وہ کچھ نہ تھا' آسان ہے۔ اگرچہ اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو ابتداؤ پیدا کرے یا اس کا اعادہ کرتا چلا جائے۔

ان سب حقائق کے باوجود حضرت زکریا مکمل اطمینان کے لئے اس قدر بے تاب ہیں کہ وہ اس ناقابل توقع عمل کے لئے علامت اور نشانی طلب فرماتے ہیں کہ جب یہ خوشخبری عملاً ظہور پذیر ہوگی تو اس کی علامت کیا ہوگی۔ تو اللہ نے اس خوشخبری کے لئے ایک ایسی علامت مقرر کی جو اس فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس میں حضرت نے یہ دعا ابتداءً کی تھی اور قبول ہوئی تھی تاکہ زکریا اس علامت کے ذریعہ رب تعالیٰ کا شکر بھی ادا کریں کہ اللہ نے انہیں اس بڑھاپے میں ایک بچہ دیا۔ وہ لوگوں کی دنیا سے کٹ جائیں اور تین دن صرف اللہ کے ساتھ مشغول ہوں۔ ان دنوں میں اس کی زبان صرف تسبیح الٰہی میں گویا ہو سکے گی اور اگر وہ لوگوں سے بات کرنا چاہیں گے تو زبان بند ہو جائے گی۔ حالانکہ ان کے اعضاء درست ہوں گے۔ ان کی زبان کو بھی کوئی معاملہ لاحق نہ ہو گا۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (۱۹ : ۱۰) "فرمایا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰي اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا

(۱۹ : ۱۱) "چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو"۔ تاکہ وہ بھی اس فضا اور اس حالت میں داخل ہو جائیں جس میں وہ داخل ہو چکے ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کریں کہ اللہ نے اس پر اور ان پر احسان کیا کیونکہ یہ لڑکا ان کے بعد ان کا امام اور راہنما ہو گا۔

یہاں قرآن مجید زکریا کو حالت خاموشی میں چھوڑ دیتا ہے' پردہ گرتا ہے' اور اس منظر کا صفحہ لپیٹ لیا جاتا ہے اور جب دوسرا منظر سامنے آتا ہے تو اس میں خود حضرت یحییٰ چلے آ رہے ہیں اور ان کو عالم بالا سے رب کی ندا آتی ہے۔

يٰيَحْيٰي خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (۱۹ : ۱۲) "اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے"۔ حضرت یحییٰ پیدا بھی ہوئے' بچپنا گزرا' جوان ہوئے اور یہ سب کچھ ان دو مناظر کے درمیان گیپ میں ہو گیا۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص فنی انداز بیان ہے۔ وہ قصے کے اہم حلقوں کو پیش کر دیتا ہے جن میں بھرپور زندگی اور ہماہمی ہوتی ہے۔ غیر اہم حلقے ذہن انسانی کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰ کو کلمہ ندا کے ساتھ پکارا جاتا ہے اور بعد میں ان سے بات ہوتی ہے کیونکہ آواز دے کر کسی کو پکارنے کا منظر نہایت ہی دلکشا منظر ہوتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا میں حضرت یحییٰ کا مقام کیا ہے' پھر یہ کہ حضرت

زکریا کی دعا کی قبولیت کس قدر اہم واقعہ تھا۔ ان کی دعا ہی یہ تھی کہ ان کا ولی وارث ہونا چاہئے ' جو ان کے بعد ان کا خلیفہ ہو اور منصب خلافت کو اچھی طرح چلائے ' نظریاتی حوالے سے بھی اور خاندانی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی۔ چنانچہ حضرت یحییٰ کو یہ چارج دیا جا رہا ہے تاکہ وہ حسب دعا اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (۱۹ : ۱۲) "اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے"۔ اس کتاب سے مراد تورات ہے ' جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی کتاب تھی۔ اور انبیائے بنی اسرائیل اسی کتاب کو لے کر چلتے تھے ' اسی پر عمل پیرا ہوتے تھے اور اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ حضرت یحییٰ اپنے والد زکریا کے وارث تھے ' اس لئے ان کو آواز دی گئی کہ وہ اب اس بوجھ کو اٹھائیں اور قوت اور عزم سے اس امانت کو لے کر اٹھیں اور اس کام میں سستی نہ کریں اور نہ کوئی کمزوری دکھائیں اور اس وراثت کی ذمہ داریوں سے پیچھے نہ ہٹیں۔

اس پکار کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے یحییٰ کو کیسی شخصیت عطا کی تھی تاکہ وہ منصب خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرے۔

وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (۱۲) وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً وَ كَانَ تَقِيًّا (۱۳)

(۱۹ : ۱۲ - ۱۳) "ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا اور اپنی طرف سے اسے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی اور وہ بڑا پرہیزگار تھا"۔ یہ تھی وہ قابلیت جس سے اللہ نے ان کو نوازا تھا اور اس طرح منصب خلافت زکریا کی ذمہ داریاں نبھانے میں ان کی مدد کی گئی۔

اسے بچپن ہی میں حکم اور حکمت عطا کر دی گئی تھی ' لہٰذا وہ اہلیت میں بھی یکتا کر دیئے گئے جس طرح وہ اپنے نام اور اپنی ولادت میں ممتاز تھے۔ حکمت جو کسی بھی شخص میں بڑے تجربے کے بعد آتی ہے حضرت یحییٰ کو زمانہ طفولیت ہی میں ' عطا کر دی گئی تھی۔

نیز آپ کو پیدائشی طور پر نرم دلی عطا کر دی گئی تھی ' اس لئے ان کو اس کے اظہار کے لئے کوئی تکلیف نہ کرنا پڑی اور نہ اس کی ٹریننگ کر کے ' اس رویہ کو عادت ثانیہ بنانے کی ضرورت تھی۔ بلکہ وقت پیدائش وہ ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ نرم دلی ہر ذمہ دار کے لئے خصوصاً نبی کے لئے ایک بنیادی صفت ہے تاکہ وہ مختلف لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر سکے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی گہری محبت پیدا ہو جائے اور وہ کچھے چلے آئیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو طہارت ' عفت اور قلبی صفائی عطا کر دی تھی۔ اس کے ذریعہ وہ دلوں کی کدورت ' اور دلوں کی میل کو صاف کرتے تھے اور عوام کے اندر پاکیزگی اور اخلاقی تطہیر کا کام کرتے تھے۔

وَ كَانَ تَقِيًّا (۱۳) "وہ بڑے پرہیزگار تھے"۔ موصول باللہ تھے ' اللہ سے ڈرنے والے تھے ' اللہ کو ہر وقت پیش نظر رکھنے والے تھے ' اس سے ڈرنے والے تھے اور اللہ کی نگرانی کا خیال رکھنے والے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ ظاہر و باطن کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تھا وہ زاد راہ جو اللہ نے بچپن ہی میں حضرت یحییٰ کو دے دیا تھا ' تاکہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہو ' جس کے لئے زکریا نے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اور گڑگڑا کر دعا کی تھی اور رب نے اس دعا کو قبول کر لیا تھا اور یہ پاکیزہ بچہ ان کو عطا کیا تھا۔

یہاں آکر یحییٰ بھی منظر سے اچانک اوجھل ہو جاتے ہیں ' پردہ گرتا ہے ' جس طرح اس سے قبل زکریا علیہ السلام اچانک پس منظر میں چلے گئے تھے ' لیکن چند جھلکیوں میں ان کی زندگی کے خطوط کھینچ دیئے گئے ' ان کے رجحانات اور طرز زندگی کی جھلکیاں دکھا دی گئیں ۔ پوری کہانی کا مقصد دو مناظر تھے ' حضرت زکریا کی دعا اور خدا کی جانب سے اعلان قبولیت اور یہ مقصد چند الفاظ میں عالم بالا سے حضرت یحییٰ کو آواز دے کر پکارنے اور ان کی اہلیت اور قابلیت کے ذکر کے اندر پورا کر دیا گیا۔ لہٰذا تفصیلات دینے اور ایک ایک واقعہ قلم بند کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی ۔ اگر ان مناظر کے بعد کوئی حضرت یحییٰ کی زندگی کے بہت سے واقعات بھی دے دے تو مقصد قصہ میں کوئی اضافہ نہ کر سکے گا۔

اب قرآن کریم حضرت یحییٰ کی پیدائش سے بھی زیادہ عجیب ولادت کی طرف آتا ہے ۔ یہ قصہ ولادت عیسیٰ علیہ السلام ہے ۔ سیاق کلام بڑھاپے میں ایک بانجھ عورت اور ایک کھوسٹ بوڑھے سے بچہ کی ولادت کا عجیب منظر پیش کر کے اب بتدریج قارئین کو ایک نسبتہ ہی مختلف نہ یہ عجیب تر واقعہ کی طرف لے جاتا ہے ۔ اس دوسرے واقعہ میں زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک کنواری سے بن باپ بچہ پیدا ہو گیا۔

اگر ہم خود حضرت انسان اور آدم علیہ السلام کی تخلیق کو نظر انداز کر دیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت تاریخ انسانیت میں ایک بہت بڑا اعجوبہ ہے ۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں ہے ' نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ماقبل تاریخ میں اور نہ آپ کے بعد کی تاریخ میں۔

حضرت عیسیٰ کی ولادت سے بھی بڑا اعجوبہ خود آدم کی تخلیق ہے ' لیکن اس وقت انسانیت موجود ہی نہ تھی کہ اللہ نے انسان اول کو کس طرح بغیر باپ اور ماں کے پیدا کیا۔ انسان بعد میں پیدا ہوئے اور انہوں نے تخلیق آدم کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ مشیت خداوندی نے یہ چاہا کہ یہ دوسرا اعجوبہ خود لوگوں کے سامنے واقع ہو۔ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہو جائیں اور جب سے انسان کو اس کرۂ ارض پر آباد کیا گیا ہے اور جس سنت کے مطابق انسان کا سلسلہ توالد و تناسل جاری ہے اس سے ہٹ کر ایک واقعہ ایسا ہو جائے کہ لوگ بچشم سر اسے دیکھ لیں ۔ اور یہ واقعہ اس قدر مشہور ممتاز اور ناقابل فراموش ہو کہ صدیوں تک آنے والی نسلیں اس سے عبرت لیں کیونکہ پہلا معجزہ اور اعجوبہ وجود انسان سے قبل ہوا تھا۔

اللہ نے اپنی تمام مخلوقات کے لئے ایک سنت جاری فرما دی ہے کہ تمام انواع و اقسام کے جاندار ایک مخصوص سنت توالد و تناسل کے مطابق چلتے رہیں اور یہ سلسلہ مرد و عورت سے جاری ہو گا۔ یہاں تک کہ جن چیزوں میں مرد اور عورت نہیں ہے ' ان میں بھی فرد واحد میں مذکر و مونث کے خلیے رکھ دیئے گئے ہیں ۔ یہ سنت قرون سے چلتی آرہی ہے اور ذہن انسانی میں یہ پوری طرح بیٹھ گئی ہے ۔ انسان یہ سوچنے لگا ہے کہ شاید تخلیق کا یہی واحد طریقہ ممکن ہے ۔ تخلیق آدم کو وہ بھلا بیٹھا کہ کس طرح پہلا انسان وجود میں آیا۔ انسانی سوچ اور مشاہدے سے یہ بات زرا باہر بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی بن باپ تخلیق کر کے یہ بتایا کہ اللہ اپنی جاری کی ہوئی سنت کا خود پابند نہیں ہے ۔ اللہ کا ارادہ آزاد ہے ' اس کی قدرت بے قید ہے اور اس کا ارادہ کسی شکل اور طریقہ کا پابند نہیں ہے ۔ نالہ پابند نے نہیں ہے ۔ لیکن حضرت عیسیٰ جیسا واقعہ جاری نہ رہا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لئے جو سنت جاری کر رکھی تھی اسے جاری رکھنا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے واقعہ سے توالد و تناسل انسانیت کی سنت جاریہ کو بدلنا مقصود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ' مشیت اور ارادے کی آزادی کے ثبوت کے لئے بس یہ ایک مثال ہی کافی تھی کہ اللہ خود اپنے جاری کردہ قوانین کا پابند نہیں ہے ۔

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ "تاکہ ہم اسے لوگوں کے لئے نشانی بنائیں"۔

یہ واقعہ چونکہ سنت الٰہیہ سے ہٹ کر عجیب و غریب تھا اس لئے بعض فرقے اسے صحیح طرح نہ سمجھ سکے اور اس واقعہ کو ظاہر کرنے کی حکمت بھی وہ نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی طرف الوہیت کی صفات کی نسبت شروع کر دی اور آپ کی ولادت کے بارے میں اوہام و خرافات کا تانا بانا بننا شروع کر دیا۔ انہوں نے ان کی اس تخلیق سے اللہ کا جو اصل مقصد تھا اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ ہدایت کے بجائے الٹا گمراہی کی طرف چلے گئے۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ کہتے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت الٰہیہ بے قید ہے انہوں نے خود حضرت عیسیٰ کو الٰہ بنا لیا اور ان کے عقائد خراب ہو گئے۔

اس سورہ میں قرآن کریم اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے نقل کرتا ہے' اس واقعہ کا حقیقی مقصد بتاتا ہے اور خرافات اور قصے کہانیوں کی تردید کرتا ہے۔ انداز بیان نہایت ہی پرتاثیر مناظر کی شکل میں ہے' جو جذباتی مناظر اور انسانی تاثرات سے بھرپور ہیں۔ جو شخص ان مناظر کو غور سے پڑھتا ہے اور چشم تصور سے دیکھتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ کانپ اٹھتا ہے' ذرا غور سے پڑھیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

"اور اے نبیؐ' اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو' جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریم یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔ اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔ مریم نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں"۔ فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہو گا' تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور یہ

کام ہو کر رہنا ہے"۔

یہ پہلا منظر ہے۔ایک کنواری نوجوان عورت ہے' نہایت ہی پاکباز ہے' اس کی ماں نے اسے اس وقت عبادت خانے کی خدمت کے لئے نذر کر دیا تھا جب وہ ابھی ماں کے پیٹ میں تھی۔اس کے بارے میں سب کے سب یہی جانتے تھے کہ وہ نہایت ہی پاکباز عورت ہے' عفت مآب ہے۔وہ ہارون کی طرف نسبت رکھتی ہے جو اسرائیلی معبد کے متولی اور پاکباز شخص تھے۔ان کے خاندان کی شہرت بھی یہ تھی کہ وہ نہایت ہی پاکباز لوگوں کا خاندان ہے اور زمانہ قدیم سے یہ لوگ پاک سیرت چلے آرہے ہیں۔

یہ عورت اپنے اہل و عیال اور اپنے اس پاکیزہ خاندان سے چھپتی پھرتی ہے' اس کے حالات ایسے ہیں کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔سیاق کلام میں اس حقیقت کی صراحت نہیں کی جارہی ہے کیونکہ یہ کنواریوں کے مخصوص پوشیدہ امور کے ساتھ متعلق ہے۔

یہ اپنی اس خلوت میں ہے' اپنی زندگی سے مطمئن ہے' لیکن وہ کیا دیکھتی ہے کہ ایک نوجوان اس کے کمرے میں کھڑا ہے' ایک مکمل نوجوان۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹ : ۱۷) "اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔یہ اب کسی بھی کنواری عورت کی طرح گھبرا اٹھتی ہے' جس کے کمرے میں اچانک ایک پورا نوجوان مرد داخل ہو جائے۔وہ اللہ کی پناہ میں آتی ہے۔اللہ سے پناہ طلب کرتی ہے' اس شخص کو اللہ اور تقویٰ و طہارت کا واسطہ دیتی ہے۔اللہ کے خوف کا واسطہ دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے' یہ جگہ خالی نہیں ہے۔اللہ موجود ہے۔

قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا (۱۹ : ۱۸) "مریم یکایک بول اٹھی کہ اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔کسی بھی متقی آدمی کے سامنے اگر خدا کا ذکر کیا جائے تو اس کا شعور تقویٰ بیدار ہوتا ہے اور وہ شیطانی وسوسہ اور شہوت کی اکساہٹ سے باز آجاتا ہے۔

یہ پاک فطرت دوشیزہ' نہایت ہی اچھی تربیت یافتہ' نہایت ہی پاک ماحول میں رہنے والی' جس کی کفالت کی ذمہ داری زکریا جیسے پاکباز شخص کے ذمہ ہے۔جب وہ جنین کی حالت میں تھی تو اسے اس معبد کے لئے نذر کر دیا گیا تھا۔ اس کے لئے یہ پہلا جھٹکا تھا۔ذرا سوچئے کہ یہ فرشتہ یا یہ نوجوان اسے یوں جواب دیتا ہے :

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹ : ۱۹) "اس نے کہا میں تو تمہارے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔

اس اعلان سے سوچا جا سکتا ہے کہ اس دوشیزہ پر کس قدر خوف طاری ہو گیا ہو گا' اسے کس قدر شرمندگی لاحق ہوگئی ہوگی۔اسے تو ابھی یہ یقین ہی نہیں ہے کہ یہ نوجوان اللہ کا فرستادہ ہے۔ہو سکتا ہے کہ وہ اس رنگ میں اسے دھوکہ دے رہا ہو' جبکہ وہ اس شرمیلی پاکیزہ فطرت خاتون کو صراحت کے ساتھ پکار رہا ہے کہ میں تمہیں ایک پاکیزہ بچہ دینے آیا ہوں' یہ اس خاتون کے لئے دوسرا دھچکا ہے۔

جب بھی کسی خاتون کی عزت و ناموس خطرے میں ہو اس کے اندر قدرتی طور پر شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت مریم جرأت کے ساتھ پوچھتی ہیں۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (۱۹ : ۲۰) مریم نے کہا میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا، جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں"۔ یوں وہ صراحت کے ساتھ بات کرتی ہیں، کھلے الفاظ میں، وہ اور یہ شخص دونوں تنہائی میں ہیں۔ اچانک اس شخص کے در آنے کی غرض و غایت بھی ظاہر ہو گئی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ اسے کس طرح بچہ دینا چاہتا ہے۔ ہاں جب اس نے کہا کہ میں تمہارے رب کا فرستادہ ہوں تو اس کے خوف میں اس سے بھی کمی نہیں آئی کہ وہ اسے ایک ایسا بچہ دینے والے ہیں جو پاک ہو گا، جس کی ولادت ناجائز ذرائع سے نہ ہوگی، اس کی سیرت بھی بری نہ ہوگی۔ اس لئے وہ اسی موقعہ پر کھل کر بات کرتی ہیں اور یہی مناسب بھی ہے کہ معلوم کیا جائے کہ کس طرح یہ بچہ پیدا ہو سکتا ہے جبکہ مجھے تو کسی انسان نے چھوا تک نہیں اور میں کوئی عصمت فروش عورت بھی نہیں ہوں کہ لوگ میرے بچے کو قبول کر لیں کہ یہ فاحشہ کا بچہ ہے۔

یہاں تک کے سوال و جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مریم مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدائش کے سوا کوئی اور صورت پیدائش پر یقین نہ رکھتی تھی اور ایک عام انسان کے لئے یہی قدرتی سوچ ہے۔

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا

(۱۹ : ۲۱) "فرشتے نے کہا ایسا ہی ہو گا تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت"۔

یہ خارق عادت طریقہ ولادت جس کے بارے میں مریم بھی نہیں سوچ سکتی اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔ کیونکہ اللہ جب کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو وہ صرف کن کہتے ہیں اور وہ ہو جاتی ہے۔ اللہ کے لئے سب کچھ آسان ہے چاہے مروجہ سنت الٰہیہ کے مطابق قدرتی طریقوں سے ہو یا غیر معمولی طریقوں سے ہو۔ فرشتہ اب صاف صاف بتا دیتا ہے کہ خدا کا یہی فرمان ہے کہ ایسا ہی ہو گا اور میرے لئے یہ آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اعجوبے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی قدرت اور اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت بے قید ہیں، یہ واقعہ سب سے پہلے بنی اسرائیل کے لئے رحمت ہو گا پھر تمام انسانوں کے لئے رحمت ہو گا۔ اس واقعہ کے ظہور سے لوگوں کو معرفت الٰہی حاصل ہوگی، وہ اللہ کی بندگی کریں گے، اور اللہ کی رضامندی کے متلاشی ہوں گے۔

روح الامین اور کنواری مریم کے درمیان اب یہ مکالمہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مکالمے کے بعد کیا ہوا، اب یہاں اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ اب یہاں قصے کے درمیان ایک خلا ہے، یہ مناظر قصہ پیش کرنے کے درمیان ایک فنی خلا ہے۔ البتہ فرشتہ اس قدر ضرور کہہ دیتا ہے کہ یہ بچہ یونہی ایک کنواری سے پیدا ہو گا، کنواری کو کسی نے چھوا تک نہ ہو گا، یہ بچہ لوگوں کے لئے معجزہ ہو گا، اللہ کی طرف سے رحمت ہو گا۔ اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ اور ایسا ہی ہو گا۔

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۱۹ : ۲۱) "اور یہ کام ہو کر رہنا ہے"۔

اب اس قصے کا ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے' ہماری پاک دامن کنواری کو ایک دوسری حیران کن اور پریشان کن حالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ منظر پہلے منظر سے بھی زیادہ خوفناک ہے' اس کے لیے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

"مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی' پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا"۔

یہ اس پاک دامن دوشیزہ کے لئے تیسرا دھچکا ہے۔ سیاق کلام میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ یہ حمل کیسے ٹھہرا' کتنا عرصہ رہا' یا یہ کوئی عادی حمل تھا جس طرح عورتوں کو ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی جانب سے ایک پھونک تھی اور عورت کے رحم میں بیضے کے اندر حرکت پیدا ہو گئی۔ یہ خون کا لوتھڑا بن گیا' اس کے اندر ہڈیاں بن گئیں' ہڈیوں پر گوشت بننا شروع ہو گیا اور جنین نے حمل کا مقررہ وقت پورا کیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ عورت کے بیضے میں مرد کا جرثومہ ملنے کے بعد اس میں نشوونما شروع ہوتی ہے اور ۹ قمری مہینوں تک حمل ٹھہرا رہتا ہے۔ نفخ الٰہی نے بس اس بیضے میں حرکت پیدا کی اور اس نے اپنا طبیعی عمل شروع کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس غیر معمولی واقعہ میں بیضے نے اپنا عادی کورس پورا نہ کیا ہو' یہ تمام مراحل اعجوبے کی طرح جلدی جلدی طے ہو گئے ہوں اور رحم مادر میں بچہ جلدی جلدی تکمیل کے مراحل طے کر گیا ہو۔ یہاں آیت میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ دونوں طریقوں اور امکانیات میں سے کون سا عمل ہوا۔ لہٰذا ہم بھی اس بحث میں نہیں پڑتے جس کے بارے میں تحقیق کے لئے ہمارے پاس کوئی مستند مواد نہیں ہے۔ ہمیں جو بات یہاں بتائی اور دکھائی جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حمل ٹھہرا اور مریم اپنی فیملی سے دور ایک تنہا مقام میں چلی گئی ہیں۔ یہ صورت حالات ان کے لئے سابقہ حالات سے زیادہ خوفناک ہے۔ پہلے موقف میں تو ان کو صرف اپنے کنوارے پن' تربیت اور اخلاق کی فکر تھی' یہ صرف ان کا خفیہ مسئلہ تھا۔ خفیہ رہ سکتا تھا' لیکن یہاں یہ مسئلہ اب سوسائٹی کے سامنے آنے والا ہے۔ نفسیاتی تکالیف کے ساتھ اب وہ جسمانی تکالیف سے بھی دوچار ہیں۔ دردزہ کی تکلیف انہیں کھجور کے ایک تنے کے پاس لاتی ہے۔ وہ مجبوراً اس درخت کا سہارا لیتی ہے۔ یہاں یہ یکہ و تنہا ہے۔ کنوارے پن کی پہلی ولادت میں زچگی کی تکالیف بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ کچھ تجربہ نہیں رکھتیں' کوئی معاون و مددگار بھی نہیں ہے' اچانک اس کے منہ سے یہ کلمات نکلتے ہیں۔

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (۱۹ : ۲۳) "کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام و نشان ہی نہ رہتا"۔ قرآن نے اس بات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے گویا ہم اس کے چہرے کے خدوخال دیکھ رہے ہیں' اس کے دلی اضطراب کو گویا ہم محسوس کر سکتا ہے۔ رنج و الم جو ان کو ہے ہر شخص اسے حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر یہ تمنا جائز ہے کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے۔ مَّنْسِيًّا وہ کپڑا جسے حیض کے خون کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پھینک دیا جاتا ہے اور بھلا دیا جاتا ہے (ایسی جگہ پھینک دیا جاتا

ہے کہ کوئی دیکھ بھی نہ سکے)
اس شدت رنج والم میں اچانک ایک عظیم سرپرائز دیا جاتا ہے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝

"بچے نے نیچے سے اس کو پکار کر کہا" غم نہ کر تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا' تیرے اوپر تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمن کے لئے روزے کی نذر مانی ہے' اس لئے آج میں کسی سے نہ بولوں گی"۔

یا اللہ' یہ کیسا بچہ ہے' ابھی تو پیدا ہوا ہے' زمین پر پڑا ہے اور وہ باتیں کر رہا ہے۔ اب مریم کو خوشی کے ساتھ سکون حاصل ہو گیا۔ اب وہ اپنے رب سے واصل ہیں۔ ان کے کھانے اور پینے کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے' عجیب انداز میں اور ان کو اس معجزانہ ولادت کی دلیل اور جواز بھی سمجھا دیا گیا ہے۔

اے ماں تو پریشان نہ ہو۔ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (۱۹ : ۲۴) "تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے"۔ وہ تمہیں بھولا نہیں اور نہ تمہیں بے سہارا چھوڑ دیا ہے' بلکہ اس نے تمہارے لئے تمہارے قدموں کے نیچے ایک چشمہ جاری نکال دیا ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ ایک لحظہ میں یہ چشمہ معجزانہ طور پر پھوٹ پڑا۔ زمین سے یا پانی کی کسی گزر گاہ سے۔ جس کھجور کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اسے ذرا حرکت دو' تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ چنانچہ یہ تیری خوراک ہے اور وہ شراب طہور ہے۔ نفاس اور زچگی کی مریضہ کے لئے میٹھا کھانا بہت مفید ہوتا ہے' کھجوریں تازہ اور خشک زچگی کی مریض خواتین کا بہترین طعام ہے۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا (۱۹ : ۲۶) "تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر"۔ یہ خوشگوار طعام و شراب استعمال کرو اور بچے کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کرو اور اگر کوئی سوال کرے تو اشاروں سے یہ کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں' میں نے روزے کی نذر مانی ہے' عبادت اور ذکر الٰہی کے لئے کٹ گئی ہوں' آج میں کسی سے بات نہ کروں گی کسی کو اس کے سوال کا جواب نہ دوں گی۔

ہمارا خیال ہے کھجور کے اس درخت کو ہلانے سے قبل وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی ہو گی' نہایت ہی پریشانی کا وقت اس پر گزرا ہو گا' لیکن جب درخت کے ہلاتے ہی اس پر تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں تو وہ سمجھ گئی ہو گی کہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اسے اللہ نے نہیں چھوڑا اور یہ کہ حجت الٰہیہ اس کے پاس ہے۔ یہ بچہ جو ولادت ہوتے ہی باتیں کرتا ہے' یہ حجت الٰہیہ ہے

اس لئے یہ باتیں اس معجزے کی تفسیر کر دیں گی ' جو اس بچے کی ولادت کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوا۔
اب اگلا نہایت ہی موثر منظر دیکھئے :

فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾

"پھر وہ اس بچے کو لئے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے "اے مریم' یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن ' نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی"۔ مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"۔

جب یہ آتی ہے تو پوری قوم کے چہرے سیاہ نظر آتے ہیں' یہ لوگ اس کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی شریف ' پاکدامن اور ہیکل کو بخشی ہوئی متبرک بیٹی ' عبادت گزار اور اچھی شہرت والی راہبہ 'ایک بچے کو اٹھائے چلی آ رہی ہے۔ وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے۔

قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۲۷) يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (۲۸) (۱۹:۲۷ – ۲۸) لوگ کہنے لگے "اے مریم' یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن' نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی"۔ ان کی زبانوں کی کاٹ تیز ہے کہ تو نے تو بہت ہی مکروہ کام کر ڈالا۔ طعنے دینے لگے اور تو تو ہارون کی بہن ہے' جو نبی ہیں' جو اس ہیکل کے متولی رہے ہیں اور اس کے بعد ان کی اولاد اس ہیکل کی وارث رہی ہے۔ تمہاری نسبت اس طرف ہے کہ تو اس ہیکل کی راہبہ ہے اور یہاں عبادت کے لئے وقف ہے۔ کیا اس نسبت' اس مقام' اس حیثیت اور اس مکروہ فعل کے درمیان کوئی نسبت ہے۔ تمہارا باپ بھی ایسا نہ تھا' تمہاری ماں بدکار نہ تھی۔ یہ جو کام تو نے کیا ہے یہ تو بدکار لوگوں کی بہن بیٹیاں کرتی ہیں۔ عصمت فروش طبقات کے ہاں ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

مریم وہی کرتی ہیں جس کا اس معجزانہ بچے نے ان کو بوقت پیدائش مشورہ دے دیا تھا۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ (۱۹:۲۹) "مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا"۔ اس عجیب صورت حال کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ تعجب اور غیظ و غضب اور شرمندگی میں یہ لوگ مریم کے درپے ہوئے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ان کی بیٹی ان کے سامنے برملا ایک بچہ اٹھائے چلی آ رہی ہے۔ وہ ان لوگوں کے غیظ و غضب کو اہمیت نہیں دیتی' خاموش ہو جاتی ہے اور بچے کی طرف اشارہ کر دیتی ہے کہ پوچھو اس سے سارے واقعہ کا راز' اور وہ جل بھن کر کہتے ہیں :

قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (۱۹ : ۲۹) "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"۔

اب ایک دوسرا معجزہ رونما ہوتا ہے :

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

"بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں ' اس نے مجھے کتاب دی ' اور نبی بنایا ' اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں ' اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں ' اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا ' اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں"۔

یوں حضرت عیسیٰ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں ' وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں ' جس طرح بعض عیسائی فرقے دعویٰ کرتے ہیں۔ نہ وہ بذات خود الہ ہیں جس طرح بعض دوسرے فرقے عقیدہ رکھتے ہیں۔ نہ یہ بات ہے کہ وہ تینوں کا ایک ہیں اور تین الہ واحد ہیں جیسا کہ ایک دوسرا فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ نے مجھے نبی بنایا ہے۔ نہ بیٹا بنایا ہے اور نہ شریک۔ مجھ میں برکت ڈالی ہے ' اور یہ حکم دیا ہے کہ پوری زندگی میں نماز ادا کروں اور زکوٰۃ پر عمل کروں۔ والدہ کے ساتھ حسن سلوک کروں اور فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھوں۔ خود میری زندگی محدود ہے۔ موت کے لئے ایک دن مقرر ہے۔ مروں گا ' پھر اٹھایا جاؤں گا۔ اللہ نے میرے لئے سلامتی ' امن ' اطمینان کا پورا پورا سامان کر دیا ہے ' ولادت کے وقت بھی ' موت کے وقت بھی اور بعث بعد موت کے وقت بھی۔

یہ آیت حضرت عیسیٰ کی موت اور بعث بعد موت پر نص صریح ہے۔ اس میں کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی اور نہ اس میں بحث کی کوئی گنجائش ہے۔

---ooo---

قرآن مجید یہ منظر پیش کر کے اس پر کسی اور بات کا اضافہ نہیں کرتا۔ یہ تفصیلات نہیں دی جاتیں کہ اس معجزے کے بعد قوم کا رد عمل کیا ہوا۔ اس کے بعد مریم اور ان کے اس ذی شان بچے کا کیا بنا۔ جس نبوت کی طرف انہوں نے اپنے کلام میں اشارہ کیا تھا وہ انہیں کب ملی کیونکہ انہوں نے کہا تھا۔

اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا (۱۹ : ۳۰) "مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے"۔ کیونکہ اس جگہ قرآن کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خارق عادت معجزہ پیش کر دیا جائے اور جب بات اس حیران کن اور معجزانہ کلام تک پہنچی ہے تو پردہ گرتا ہے تاکہ اس کے بعد وہ اصل بات نہایت ہی مثبت ' فیصلہ کن انداز میں کی

جائے کیونکہ یہ بہتر موقعہ ہے کہ اس مقام پر نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اصل بات کہہ دی جائے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

”یہ ہے عیسیٰ ابن مریم اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا' اور بس وہ ہو جاتی ہے۔ (اور عیسیٰ نے کہا تھا کہ)“اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی' پس تم اسی کی بندگی کرو' یہی سیدھی راہ ہے“۔

یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حقیقت' نہ ان لوگوں کی بات درست ہے جو ان کو اللہ بناتے ہیں۔ نہ ان لوگوں کی بات درست ہے جو ان کی ولادت کے بارے میں ان کی والدہ محترمہ کو متہم کرتے ہیں۔ ان کی ولادت' ان کی نشوونما اور مرتبہ و مقام کی یہی حقیقت ہے۔ یہی قول حق ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں۔ وہ زبانی طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور حالات قصہ بھی یہی بتاتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ (۱۹ : ۳۵) ”اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے“۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کا یہ کام نہیں ہے اور نہ اس کو اس کی ضرورت ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ بیٹا تو ان لوگوں کی ضرورت ہے جو فنا ہونے والے ہیں۔ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے کسی کو اپنا بیٹا بناتے ہیں' پھر ایک ضعیف والد کو آخری عمر میں مدد کے لئے بیٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ باقی اور لازوال ہے' وہ قادر مطلق ہے' کسی کا محتاج نہیں ہے اور تمام کائنات اس کے کلمہ کن سے بنتی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا' محض اس کا ارادہ اس طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے' لہٰذا اسے نہ اولاد اور نہ شریک کی ضرورت ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بات اس پر ختم ہوتی ہے کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' لہٰذا صرف اسی خدائے واحد کی عبادت کرو۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۱۹ : ۳۶) ”اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی' بس تم اسی کی بندگی کرو' یہی سیدھی راہ ہے“۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ کی شہادت اور ان کے قصے کی اس شہادت کے بعد اب اوہام اور اساطیر اور قصے کہانیوں کی اب کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تبصرہ مشیت اور قرارداد کی صورت میں کیا گیا ہے۔

اس تقریر اور قرارداد کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مختلف پارٹیوں کے اختلافات پر تبصرہ کیا جاتا ہے کہ اس حقیقت کے آنے کے بعد اب ان اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ (۱۹ : ۳۷)) "مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے"۔
قیصر روم آمنلین نے پادریوں کی ایک مجلس منعقد کی تھی جس میں دو ہزار ایک سو ستر (۲۱۷۰) پادری شریک ہوئے تھے۔
یہ مجلس ان کی تین مجالس میں سے ایک تھی۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کے درمیان شدید اختلاف ہو گیا۔
ہر فرقے نے اپنا موقف بیان کیا۔ بعض نے کہا کہ وہ خدا ہے جو زمین پر اترا' جس کو چاہا زندہ کیا' جس کو چاہا مارا اور پھر وہ
آسمانوں پر چلا گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ ابن اللہ ہے' بعض نے کہا کہ وہ اقانیم ثلاثہ میں سے ایک ہیں' باپ بیٹا اور
روح القدس۔ بعض نے کہا کہ وہ تینوں میں سے ایک ہیں' یعنی اللہ بھی اللہ ہے وہ بھی اللہ ہیں اور والدہ بھی الٰہ ہیں۔ بعض نے
کہا کہ وہ اللہ کے بندے' اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ ان بڑے اقوال کے علاوہ اور فرقوں نے بھی کئی اقوال پیش کئے۔
کسی عقیدے پر تین صد افراد سے زیادہ کا اتفاق نہ ہوا۔ یہ تعداد ایک قول پر جمع ہو گئی۔ قیصر روم اس کی طرف مائل ہو گیا
اور اس قول کے ماننے والوں کی امداد کی اور دوسروں کو ختم کر دیا' خصوصاً اہل توحید کو نیست و نابود کر دیا۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلط عقائد کا تعین چونکہ مذہبی پیشواؤں کی مجالس نے کیا تھا' اس لیے یہاں سیاق کلام ان
لوگوں کو ڈراتا ہے جنہوں نے توحید کے علاوہ دوسرے عقائد اختیار کئے۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے' اس دن سے' جس میں ان
مجالس کے مقابلے میں زیادہ لوگ جمع ہوں گے اور یہ لوگ دیکھیں گے کہ کافروں کا انجام کس قدر عبرت ناک ہو گا۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٣٧﴾ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا ۖ لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾

"مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لئے وہ وقت بڑی تباہی کا ہو گا جب
کہ وہ ایک بڑا دن دیکھیں گے۔ جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے اس روز تو ان کے کان بھی خوب سن رہے ہوں
گے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہوں گی' مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اے نبیؐ اس حالت میں جب کہ
یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں' انہیں اس دن سے ڈرا دو جبکہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا
کوئی چارۂ کار نہ ہو گا"۔

ان لوگوں کے لئے اس دن بہت بڑی ہلاکت ہو گی' بہت بڑا خوفناک منظر ہو گا' وہ عظیم اور خوفناک منظر جن و انس
سب دیکھ رہے ہوں گے' ملائکہ بھی حاضر ہوں گے۔ اس اللہ کے سامنے سب لوگ کھڑے ہوں جس کے ساتھ ان احزاب
نے شرک کیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کی حالت دیدنی ہو گی کہ یہ لوگ یہاں اس دنیا میں دلائل ہدایت سے منہ
موڑ رہے تھے' لیکن وہاں تو ان کے کان بھی اچھی طرح سن رہے ہوں گے اور آنکھیں بھی اچھی طرح دیکھ رہی ہوں گی۔

أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لَكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۱۹ : ۳۸)
"جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے اس روز تو ان کے کان بھی خوب سن رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھ رہی ہوں گی مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں"۔ آج ان کی حالت یہ ہے کہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں جبکہ آج سننا اور دیکھنا ہدایت کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن جس دن سننا اور دیکھنا شرمندگی کا باعث ہو گا اس دن یہ خوب سن اور دیکھ رہے ہوں گے۔ اس دن یہ ایسی چیزیں دیکھیں گے جو دیکھنے کے قابل نہ ہوں گی اور ایسی چیزیں سنیں گے جسے سننا نہ چاہیں گے۔ یہ ہو گا مشہد عظیم کا دن۔

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ (۱۹ : ۳۹) "اور ان کو پچھتاوے کے دن سے ڈراؤ"۔ اس قدر حسرتیں ہوں گی کہ قیامت کا دن ہی حسرتوں کا دن ہو گا۔ حسرت کے سوا وہاں کچھ نہ ہو گا۔ میدان میں ہر طرف حسرت ہی حسرت ہو گی لیکن اس دن حسرت کرنا مفید مطلب نہ ہو گا۔

إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۹ : ۳۹) "جب فیصلہ کر دیا جائے اور یہ لوگ غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لا رہے"۔ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے لیکن قیامت کا دن ان کے کفر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جس غفلت میں یہ ڈوبے ہوئے ہیں اس کے ساتھ قیامت جڑی ہوئی ہے۔

ان کو اس دن سے ڈراؤ جس میں شک نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کے اوپر جو چیز اور جو انسان بھی ہیں وہ سب کے سب اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اللہ ہی سب کا وارث ہے۔

۲

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿۴۰﴾　　　ع ۵

۵

"آخر کار ہم ہی زمین اور اس کی ساری چیزوں کے وارث ہوں گے اور سب ہماری طرف پلٹائے جائیں گے"۔

---ooo---

درس نمبر ۱۳۶ ایک نظر میں

پہلے سبق کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی حقیقت بیان کی گئی ' اور بتایا گیا کہ جو لوگ ان کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں ' وہ محض وہم و گمان اور قصے کہانیوں پر یقین رکھتے ہیں ۔ بڑی گمراہی میں مبتلا ہیں اور ان کہانیوں سے بعض گمراہ اہل کتاب استدلال کرتے ہیں ۔ اس کے بعد یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کا ایک حصہ دیا جاتا ہے جس میں عقائد شرکیہ کی گمراہی اور بطلان کو واضح کیا گیا ہے ۔ عرب اور مشرکین مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ مشرکین مکہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اس گھر کے متولی ہیں جس کی تعمیر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے فرمائی تھی ۔

حضرت ابراہیم اپنے اس قصے کی اس کڑی میں نہایت ہی حلیم الطبع کردار والے نظر آتے ہیں اور اللہ کی مشیت پر راضی ہونے والے شخص ہیں ۔ ان کی شخصیت کے یہ خدوخال ان کے الفاظ ' ان کے انداز کلام سے بھی اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں جن کی حکایت قرآن کریم نے عربی میں بیان کی ہے ۔ نیز ان کے اقدامات سے اور والد کی جہالت کے مقابلہ کے سلسلے میں ان کے رویہ سے بھی ان کی شخصیت واضح ہو رہی ہے ۔ لیکن اللہ کی طرف سے ان کے اس کردار اور ان کے ان اوصاف کا صلہ بھی ان کو خوب ملا ۔ ان کے مشرک باپ اور مشرک فیملی کی جگہ اللہ نے ان کو ایسی صالح اولاد دی جن سے ایک بڑی امت پیدا ہوئی ۔ اس امت میں بڑے بڑے انبیاء و صالحین پیدا ہوئے لیکن ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا ۔ اور خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرنے لگے اور اس راہ سے وہ منحرف ہوگئے ' جو ان کے لئے ان کے باپ ابراہیم نے تجویز کیا تھا ۔ اور انہوں نے حضرت ابراہیم کا دین تک ترک کر دیا اور مشرکین مکہ انہی لوگوں کے سرخیل تھے ۔

اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو صدیق اور نبی کہا ۔ صدیق سے یہ بھی مفہوم کہ وہ بہت ہی سچے تھے اور یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ بہت تصدیق کرنے والے تھے ۔ دونوں معنی حضرت ابراہیم کی شخصیت کے ساتھ مناسب ہیں ۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۳۶ تشریح آیات

۴۱ --- تا --- ۶۵

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْــًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

"اور اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرو' بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا (انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ) جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ "ابا جان' آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان' میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' آپ میرے پیچھے چلیں' میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان' آپ شیطان کی بندگی نہ کریں' شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان' مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں"۔

وہ نہایت ہی ادب اور تہذیب کے ساتھ اپنے باپ سے ہمکلام ہیں۔ وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اللہ نے جو ہدایت ان کو دی ہے' اس سے ان کے والد بھی مستفید ہو جائیں۔ جو علم اللہ نے ان کو دیا ہے وہ اپنے باپ کو بھی سکھا دیں۔ وہ نہایت ہی محبت کے انداز میں باپ سے مخاطب ہیں۔ ابا جان' نہایت ہی نرم الفاظ ہیں۔

لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا (۱۹ : ۴۲) "آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں' نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟" عبادت کا اصول تو یہ ہے کہ انسان اس ذات کے آگے سرنگوں ہو جو انسان سے اعلیٰ و ارفع ہو۔ زیادہ علم والا اور زیادہ قوت والا ہو اور وہ ذات انسان کو مقام انسانیت سے بھی بلند کر دے اور مزید اونچا مرتبہ دے دے۔ ایک انسان ان چیزوں کی عبادت اور بندگی کیسے کر سکتا ہے جو اس سے کم تر ہوں! بلکہ وہ دوسرے حیوانات سے بھی کم تر ہوں' نہ سنتی ہوں' نہ دیکھتی ہوں اور نہ

کسی کے نفع و نقصان کی مالک ہوں۔ یہ تقریر انہوں نے اس لئے کی کہ ان کے والد اور ان کی قوم بتوں کی پوجا کرتے تھے جس طرح اہل قریش بتوں کی پوجا کرتے تھے جن کے ساتھ اسلام کا مقابلہ تھا۔

یہ تو تھی پہلی جھلک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کی جو انہوں نے اپنے والد کے سامنے پیش کی۔ اس کے بعد انہوں نے مزید تشریح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ بات وہ خود اپنی جانب سے نہیں کہہ رہے بلکہ دراصل یہ وہ علم ہے جو ان کے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو یہ دعوت دوں اگرچہ میں عمر میں آپ سے کم ہوں اور میرا تجربہ بھی آپ سے کم ہے لیکن عالم بالا کی امداد سے میں حقیقت تک پہنچ گیا ہوں۔ وہ اپنے والد کو دردمندی کے ساتھ نصیحت کرتے ہیں کہ آپ کو اس علم کا پتہ نہیں ہے لہذا آپ کو چاہئے کہ آپ میری اطاعت کریں۔ میں آپ کو راہ راست دکھا سکتا ہوں۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (۱۹ : ۴۳) ”اباجان، میرے پاس ایک ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا“۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ایک والد اپنے ہدایت یافتہ بیٹے کے پیچھے چلے، اگر ایک بیٹا نبی ہو اور اس کا اعلیٰ ذریعہ علم سے رابطہ ہو۔ اس صورت میں والد بیٹے کی نہیں بلکہ اس اعلیٰ سرچشمے کی اطاعت کر رہا ہوتا ہے اور ہدایت یافتہ ہو جاتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کہ بتوں کی بندگی کرنا ایک منکر فعل ہے اور یہ کہ میری دعوت کا سرچشمہ ذات باری ہے جبکہ والد جس موقف کو اپنائے ہوئے ہیں اس کا سرچشمہ کچھ اور ہے۔ اب حضرت ابراہیم صراحت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ والد صاحب، آپ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ شیطان کی راہ ہے، جبکہ میں جس راہ کی طرف آپ کو بلا رہا ہوں وہ رحمٰن کی راہ ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ اے باپ، آپ پر اللہ کا غضب نازل نہ ہو جائے اور آپ ہمیشہ کے لئے شیطان کے پیروکاروں میں شامل ہو جائیں۔

يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (۴۴) يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا (۴۵) (۱۹ : ۴۴ - ۴۵)

”ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں“۔

یہ شیطان ہی ہے جو اللہ کے سوا بتوں کی بندگی پر لوگوں کو آمادہ کرتا ہے جو لوگ بتوں کی بندگی کرتے ہیں گویا وہ شیطان کی بندگی کرتے ہیں۔ اور شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ حضرت ابراہیم اپنے والد کو ڈراتے ہیں کہ ان پر کہیں اللہ کا غضب نہ آ جائے اور اس طرح اللہ کہیں انہیں شیطان کا دوست ہی نہ بنا دے اور وہ مستقلاً شیطان کے تابع نہ ہو جائیں۔ اللہ جب بندے کو اپنی عبادت کی توفیق دیتا ہے تو یہ اس کا انعام ہوتا ہے اور جب اللہ اپنی سنت کے مطابق کسی

کے بارے میں فیصلہ کر دے کہ وہ شیطان کا دوست ہو گا تو یہ اللہ کا غضب ہوتا ہے اور اس غضب کے نتیجے ہی میں پھر یہ شخص سخت عذاب اور بڑے خسارے سے دوچار ہو جاتا ہے یعنی قیامت میں۔

لیکن نہایت ہی نرم و نازک الفاظ میں یہ پر تاثیر دعوت ایک کٹر مشرک کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ دل پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ جواب میں والد ابراہیم سخت غصے میں آکر دھمکی پر اتر آتے ہیں۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ۝

"باپ نے کہا "ابراہیم 'کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا؟"

جواب میں والد صاحب نے کہا کہ ابراہیم تو میرے معبودوں سے نفرت کرتے ہو' اور اس نفرت کی وجہ سے تم ان کی عبادت سے پھر گئے ہو' یا تمہیں اس قدر جراءت ہو گئی ہے' میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے اپنے اس مکروہ موقف پر نظر ثانی نہ کی تو میں تمہیں رجم کر دوں گا۔

لَئِن لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ (۱۹ : ۴۶) "اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا"۔ میرے سامنے سے ہٹو اور ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ اسی میں تمہاری خیر ہے ورنہ یہاں زندہ نہ بچو گے۔

وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا (۱۹ : ۴۶) "ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جاؤ"۔

یہ شخص ہدایت کی دعوت کا جواب اس سختی سے دیتا ہے اور نہایت ہی باادب خطاب اور درخواست کو بھی سختی سے رد کر دیتا ہے۔ یہ ہے ایمان اور کفر کے درمیان فرق۔ ملاحظہ کیجئے کہ جس دل کو اسلام نے مہذب بنا دیا وہ کیسا ہے اور جس دل کو کفر نے برباد کر دیا وہ کیسا ہے؟ حضرت ابراہیم طیش میں بھی نہ آئے' انہوں نے بھلائی' محبت اور ادب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور یوں گویا ہوئے :

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۖۚ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ۝

"ابراہیم نے کہا "سلام ہے آپ پر۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے' میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا' امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا"۔

تم پر خدا کی سلامتی ہو' نہ جھگڑا ہے' نہ تردید ہے' نہ دھمکی اور نہ ارادۂ قتل کے جواب میں ردعمل ہے۔ بلکہ جواب

یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں اپنے رب سے دعا کرتا رہوں گا کہ وہ آپ کو اس گمراہی سے اور شیطان کی دوستی سے کسی طرح نکال لائے۔ آپ پر رحم فرمائے اور آپ کو ہدایت نصیب کرے۔ میرے ساتھ میرے رب کا معاملہ یہ ہے کہ میں نے جب بھی دعا کی ہے میرے رب نے مجھے نامراد نہیں لوٹایا اور اگر میرا آپ کے پاس رہنا اور آپ کی نظروں کے سامنے پھرنا آپ کو پسند نہیں تو لے اباجان 'میں آپ کو اور آپ کی قوم کو چھوڑ دوں گا۔ آپ جائیں اور آپ کے معبود جائیں۔ میں تو اپنے رب وحدہ ہی کی بندگی کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا رب میری اس دعا کو مسترد نہیں کرے گا۔

حضرت ابراہیم جس بات کی امید کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرا رب مجھے شقی نہیں بنائے گا۔ ان کی یہ بات بھی نہایت کسر نفسی 'ادب اور تقویٰ پر مبنی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے۔ صرف یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ اللہ مجھے شقاوت اور بدبختی سے بچائے گا۔

یوں حضرت ابراہیم نے اپنے باپ 'اپنی قوم 'اپنے اہل اور رشتہ داروں اور ان کی بت پرستیوں کو چھوڑ کر علاقے کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ نے بھی انہیں تنہا نہ چھوڑا۔ اللہ نے بھی انہیں اولاد دی اور مقام عالی عطا کیا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۙ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع ۱۰ ۳ ۲

"پس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی"۔

حضرت اسحاق ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ یہ سارہ سے پیدا ہوئے 'جو پہلے بانجھ تھیں اور یعقوب حضرت اسحاق کے بیٹے ہیں 'لیکن یعقوب علیہ السلام کو بھی ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دادا کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے اور دادا کے زیر تربیت رہے تھے۔ گویا وہ براہ راست ان کے بیٹے تھے۔ انہوں نے براہ راست حضرت ابراہیم سے دین سیکھا اور پھر اپنی اولاد کو سکھایا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح نبی تھے۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا (۱۹ : ۵۰) "اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا"۔ یعنی حضرت ابراہیم 'حضرت اسحاق 'حضرت یعقوب اور ان کی نسل کو۔ یہاں ان حضرات کے مقام اعلیٰ کو رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس پوری سورہ پر رحمت کے سائے چھائے ہوئے ہیں اور رحمت وہ رفیق ہمدم ہے جو حضرت ابراہیم کو اپنی قوم اور علاقے کے چھوڑنے کے عوض دی گئی تاکہ ان کی تنہائیوں میں رحمت ان کے ساتھ رہے۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (۱۹ : ۵۰) "اور ان کو ہم نے سچی ناموری عطا کی"۔ یعنی وہ اپنی

دعوت میں سچے تھے 'لوگ ان کی بات کو سچا مانتے تھے 'عوام الناس میں ان کا احترام تھا اور لوگ ان کی اطاعت کرتے تھے ۔

اب حضرت ابراہیم کی اولاد ہی کی بات ذرا آگے بڑھتی ہے ۔ پہلے حضرت اسحاق کی اولاد حضرت موسیٰ اور ہارون کو لیا جاتا ہے ۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡاِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝

"اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا ۔ وہ ایک چیدہ شخص تھا اور رسول نبی تھا ۔ ہم نے اس کو طور کے داہنی جانب سے پکارا اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرب عطا کیا 'اور اپنی مہربانی سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اسے (مددگار کے طور پر) دیا" ۔

حضرت موسیٰ کی صفت اخلاص کا ذکر ہے 'اللہ نے ان کو اپنے لئے خالص کر لیا تھا' دعوت اسلامی کے لیے وہ وقف تھے ۔ وہ رسول اور نبی تھے 'رسول وہ ہوتا ہے کہ جن کے لئے یہ حکم ہوتا ہے کہ وہ اس دعوت کو دوسروں تک پہنچائیں ۔ جبکہ نبی کی ذمہ داری یہ نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں تک دعوت پہنچائیں 'ان کا منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ براہ راست اللہ سے ہدایت اور نظریہ لیتے ہیں ۔ بنی اسرائیل میں بہت سے نبی گزرے ہیں 'ان کی دعوت یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کی دعوت اور دین کو قائم کریں ۔ تورات کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں 'جو اللہ کی جانب سے آیا ہوا قانون ہے ۔

يحكم بها النبيون الذين اسلموا للذين هادوا والربانيون والاحبار بما استحفظوا من كتب الله وكانوا عليه شهداء یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت یوں دی جاتی ہے کہ طور ایمن کی جانب سے اللہ نے ان سے کلام کیا ۔ ایمن یعنی دائیں جانب 'سے 'یہ حضرت موسیٰ کے موقف کے اعتبار سے دایاں کہا ۔ حضرت موسیٰ اللہ کے اس قدر مقرب بندے تھے کہ انہوں نے قریب سے اللہ کے ساتھ کلام کیا اور یہ کلام مناجات کی صورت میں تھا ۔ ہمیں اس کلام کی کیفیت کا علم نہیں ہے 'نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کلام کا ادراک حضرت موسیٰ نے کیسے کیا ۔ یہ کوئی آواز تھی جسے کان سن رہے تھے 'یا یہ کوئی ایسی چیز تھی جو پورے جسد موسیٰ میں ڈال دی جاتی تھی ۔ یہ بھی ہم نہیں جانتے کہ حضرت موسیٰ کی شخصیت کو اس ازلی کلام کی وصولی کے لئے کس طرح تیار کیا گیا ۔ ہمارا ایمان فقط یہ ہے کہ ایسا ہوا ۔ اللہ کے لئے ہر چیز آسان ہے اور یہ بھی کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ڈائریکٹ رابطہ کرے ۔ انسان اپنی بشریت پر قائم ہو 'اور اللہ کا کلام علوی اپنی علویت پر قائم ہو اور رابطہ ہو جائے ۔ آخر اس سے قبل بھی انسان اللہ کی جانب سے روح پھونکنے ہی سے انسان بنا ۔

پھر اللہ حضرت موسیٰ پر اپنی اس رحمت کا بھی ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ان کے مطالبے پر ایک معاون اور مددگار کے طور پر ہارون دیا۔

وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (۲۸: ۳۴) "اے اللہ ' میرے بھائی ہارون کو جو مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے 'انھی میرے ساتھ معاون بنا کر بھیج دے ' وہ میری تصدیق کرے گا' کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ میری تکذیب کر دیں گے"۔ اور ہارون کو اللہ کی رحمت نے ان کا ساتھی بنا دیا۔ اس پوری سورہ میں رحمت ہی رحمت ہے۔

اب اولاد ابراہیم کی دوسری شاخ کو لیا جاتا ہے یعنی عربوں کے باپ اسماعیل کو۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

"اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا"۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے صادق الوعد کی صفت لائی گئی ہے۔ ہر نبی اور صالح شخص کو صادق الوعد ہونا چاہئے اور ہوتا ہے۔ لیکن حضرت اسماعیل میں یہ صفت بہت ہی نمایاں تھی اس لئے ان کی خصوصی صفات میں سے یہاں اس صفت کو بیان کر دیا گیا۔

ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ "رسول نبی" تھے ' لہٰذا ان کی مخصوص دعوت ہو گی۔ عرب میں حضور کے زمانے تک بعض موحدین پائے جاتے تھے۔ یہ انہی کی دعوت کے آثار باقیہ تھے۔ ان کے دین اور دعوت کے ارکان بھی یہاں گنوائے گئے ہیں ' زکوٰۃ اور صلوٰۃ اور تطہیر اہل خانہ ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں وہ پسندیدہ انسان تھے۔ رضائے خداوندی بھی اس سورہ کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ رحمت و رضامندی قریب قریب کی صفات ہیں۔

اس سبق کا خاتمہ ذکر ادریس علیہ السلام پر ہوتا ہے:

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

"اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو ' وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھے اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا"۔

حضرت ادریس کے زمانے کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں اور انبیائے بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔ اس لئے بنی اسرائیل کی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن کریم ان کو صدیق اور نبی کہتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایک عالی مقام شخص تھے ان کا ذکر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

بعض لوگوں کی رائے (ہم نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ انکار) یہ ہے کہ مصر کے ماہرین آثار قدیمہ نے یہ لکھا ہے کہ ادریس دراصل "اوزریس" کے لفظ کا عربی تلفظ ہے اور یہ قدیم مصری زبان کا لفظ ہے جس طرح یحیٰ یوحنا کا عربی تلفظ ہے اور الیسع الیشع کا عربی تلفظ ہے۔ ان کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ یہ کہ وہ آسمانوں پر چلے گئے اور وہاں ان کے لئے ایک بڑا تخت بنایا گیا۔ یہ کہ جس شخص کی نیکیاں گناہوں پر بھاری ہو گئیں تو وہ دیوتا "اوزریس" کے پاس چلا جائے گا۔ یہ کہ "اوزریس" نے آسمانوں پر چڑھنے سے قبل لوگوں کو بہت سے علوم و معارف سکھائے۔ یہ بات دل کو لگتی ہے۔

بہرحال وہ جو بھی ہیں ہمارے لئے ان کے بارے میں قرآن مجید کی دی ہوئی معلومات کافی ہیں اور یہ بنی اسرائیل کے انبیاء سے پہلے گزرے ہیں۔

یہاں سیاق کلام میں ان انبیاء کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ صحیح مومن، اتقیاء اور انبیاء کیسے تھے اور وہ لوگ کیسے ہیں جو ان کی اولاد اور جانشیں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مثلاً عرب اور مشرکین بنی اسرائیل۔ دونوں کے درمیان بہت فاصلے اور دوریاں ہیں۔ دونوں کے درمیان نشیب و فراز بہت گہرے ہیں اور ان اسلاف اور ان اخلاف کے درمیان اب کوئی بھی چیز مابہ الاشتراک نہیں ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

"یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، آدم کی اولاد میں سے، اور ان لوگوں کی نسل میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیم کی نسل میں سے اور اسرائیل کی نسل میں سے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں"۔

انسانی تاریخ کے باب نبوت میں، قرآن کریم نے یہاں ممتاز ترین لوگوں پر اکتفاء کیا ہے۔ یہ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ (۱۹:۵۸) "اولاد آدم سے" ہیں۔ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹:۵۸) "اور ان لوگوں میں سے ہیں

جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا"۔ اور وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْرَآءِيْلَ (۱۹ : ۵۸) "اور ابراہیم اور یعقوب کی اولاد میں سے"۔ آدم تو سب کے جد امجد ہیں' نوح بھی آدم ثانی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام نبوت کی دو مشہور شاخوں کے باپ ہیں اور یعقوب بنی اسرائیل کے جد امجد ہیں جن میں بے شمار رسول اور نبی آئے اور اسماعیل کی طرف عربوں کی نسبت ہے جن کی اولاد میں نبی آخر الزمان مبعوث ہیں۔ یہ نبی اور ان کا اتباع کرنے والے صالح اور برگزیدہ لوگ اور ان کی اولاد' یہ کون لوگ ہیں؟ ان کی ممتاز صفت یہ ہے۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا (۱۹ : ۵۸ السجدۃ) "جب رحمٰن کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے"۔ یہ ایسے پرہیز گار لوگ تھے جو ذات باری کے بارے میں بہت ہی حساس تھے۔ جب اللہ کی آیات ان کے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے وجدان میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ان پر اس قدر اثر ہوتا ہے کہ اس کے اظہار کے لئے ان کو موزوں کلمات نہیں ملتے جن کے ذریعے وہ اپنے احساسات کا اظہار کر سکیں۔ ان احساسات کا اظہار وہ آنسوؤں سے کرتے ہیں اور معاً سجدے میں گر کر اور رو کر وہ اپنے جذبات اندرونی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان حساس' متقی آیات الٰہی سن کر رونے والوں کے بعد پھر کون آیا؟ ان کے بعد ایسے اخلاف آئے جو اللہ سے دور ہو گئے۔

اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (۱۹ : ۵۹) "جنہوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا"۔ نمازوں کو چھوڑ دیا اور ان کا انکار ہی کر دیا۔

وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (۱۹ : ۵۹) "انہوں نے خواہشات نفس کی پیروی شروع کر دی"۔ پیروی خواہشات میں غرق ہو گئے۔ ذرا غور کیجئے کہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان کس قدر فرق ہو گیا ہے اور ان کے درمیان مشابہت کے عام خدوخال مٹ گئے۔

ایسے لوگوں کو قرآن کریم تہدید آمیز تنبیہ کرتا ہے کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں' انہوں نے اپنے صالح آباء کی پاک سیرتوں کو چھوڑ دیا ہے اس لیے فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹ : ۵۹) "پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں"۔ غی کا مفہوم ہے گمراہی یعنی وہ گمراہ ہو جائیں گے اور بے راہ روی کا شکار ہو جائیں گے اور انجام یہ ہو گا کہ وہ تباہ ہو جائیں گے۔

لیکن ان اندوہناک اور تباہ کن حالات کے باوجود قرآن توبہ کا دروازہ کھول دیتا ہے جہاں سے باد رحمت کے تازہ جھونکے آتے ہیں اور اللہ کی مہربانی اور نعمتوں کے راستے کھلے نظر آتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا

بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

"البتہ جو توبہ کر یں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کر لیں' وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو گی۔ ان کے لئے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے در پردہ وعدہ کر رکھا ہے اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے' جو کچھ بھی سنیں گے' ٹھیک ہی سنیں گے اور ان کا رزق انہیں پیہم صبح و شام ملتا رہے گا۔ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے"۔

وہ توبہ جو ایمان اور عمل صالح پیدا کر دیتی ہے' وہی صحیح معنوں میں توبہ ہوتی ہے اور وہی برے انجام سے انسان کو بچاتی ہے۔ ایسے حقیقی تائب برے انجام تک پہنچنے سے بچ جاتے ہیں۔ وہ تو جنت میں جاتے ہیں اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوتا۔ جنت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ وہ جنت جس کا وعدہ اللہ نے اپنے بندوں سے کر رکھا ہے۔ وہ اس پر ایمان لائے اور دیکھنے سے قبل ہی اس پر یقین کیا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔

اہل جنت اور جنت کی تصویر کیا ہو گی؟

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلٰمًا (۱۹:۶۲) "وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے' جو بات بھی سنیں گے صحیح سنیں گے"۔ کوئی فضول بات وہاں نہ ہو گی' نہ شور و شغب ہو گا۔ وہاں ہر طرف سے سلامتی ہی سلامتی ہو گی۔ اس جنت میں ضروریات اور رزق ہر وقت مطابق خواہش دستیاب ہو گا۔ کسی نفس کو کوئی قلق نہ ہو گا' کوئی خوف نہ ہو گا۔ کسی چیز کی کمی کا خطرہ نہ ہو گا۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۹:۶۲) "اور ان کا رزق انہیں صبح و شام پیہم ملتا رہے گا"۔ مطابق خواہش ... غرض نہایت ہی خوشگوار ماحول ہو گا اور اللہ کی نعمتوں کا ہر سو اعلان ہو گا۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا (۱۹:۶۳) "یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے"۔ جو شخص جنت کی وراثت چاہتا ہے' اسے اللہ نے راہ بتا دی ہے۔ یعنی توبہ' ایمان' عمل صالح۔ نسبی وراثت کو یہاں ذریعہ استحقاق نہیں بنایا ہے۔ نسبی لحاظ سے ایک قوم نے ان برگزیدہ صالحین کی وراثت پائی تھی مگر انہوں نے نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات نفسانیہ کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کو نسبی وراثت نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ ایسے لوگ جلد ہی فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹:۵۹) "برے انجام تک پہنچ جائیں گے"۔

اس سبق کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ رب مطلق ہے۔ اس کی عبادت اور بندگی کرو اور اس راہ کی مشکلات پر صبر کرو اور اس کی شبیہ اور نظیر کا انکار کرو۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ

ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

"اے نبی" ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ' ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں 'پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو۔ کیا ہے کوئی اور ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟"

اس بارے میں کافی روایات ہیں کہ

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ (۱۹: ۶۴) "اے محمدؐ' ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے"۔ اللہ کے حکم کے مطابق جبرائیل نے یہ بات اپنی زبان میں کی کیونکہ کسی موقع پر جب وحی نہ آئی تو آپ کو وحشت اور پریشانی لاحق ہوگئی اور آپ کا شوق بڑھ گیا کہ کیوں اس قدر طویل عرصہ عالم بالا سے رابطہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اللہ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ تم یہ پیغام دے دو اور کہہ دو کہ ہم تو اللہ کے حکم کے مطابق نازل ہوتے ہیں اور حکم دینا اللہ کا کام ہے۔

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ (۱۹: ۶۴) "جو کچھ ہمارے آگے ہے 'جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے"۔ وہ کسی چیز کو بھلاتا نہیں۔ وحی تب ہی نازل ہوتی ہے جب اللہ کی حکمت کا تقاضا ہو کہ نازل ہو جائے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (۱۹: ۶۴) "اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے"۔ اس کے بعد شاید یہ تھا کہ آپ کو صبر کرنے کی تلقین کی جائے اور یہ حکم دیا جائے کہ آپ اللہ کی بندگی پر جم جائیں ' صرف اللہ کو اپنا رب سمجھیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (۱۹: ۶۵) "وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان کے درمیان ساری چیزوں کا"۔ اس کے سوا کوئی رب نہیں 'اس عظیم کائنات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (۱۹: ۶۵) "اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو"۔ اسلام میں عبادت صرف مراسم پرستش کا نام نہیں ہے۔ ہر تصور ' ہر ارادہ ' ہر حرکت اور ہر سرگرمی عبادت کے دائرے میں آتی ہے اور یہ نہایت ہی مشکل کام ہے کہ انسان زندگی کے پورے معاملات میں صرف اللہ کی بندگی کرتا ہے ' اس لیے اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اور بڑے صبر اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے اس لئے ضروری ہے اس زمین کی تمام

سرگرمیوں میں انسان آسمان کی طرف متوجہ رہے۔ زمین کی آلودگیوں میں' مادی ضروریات کی کشاکش میں' خواہشات نفس کے دباؤ میں اور زندگی کے گوناگوں نشیب و فراز میں۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ انسان کو اس کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ اسے اپنے اندر یہ شعور پیدا کرنا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت کر کے عبادت کر رہا ہے۔ اس طرح اس کی پوری زندگی اور اس کی ہر حرکت' ہر روش عالم بالا سے مل کر طاہر اور پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو بہت بڑے صبر' بہت بڑی جدوجہد اور بہت بڑی محنت کا طلبگار ہے۔

"اللہ کی بندگی کرو' اس کی بندگی پر جم جاؤ کیونکہ اللہ ہی وہ واحد ذات ہے جو اس لائق ہے کہ دل و دماغ اس کی طرف متوجہ ہوں' کیونکہ کوئی اس کا ہمسر' کوئی اس کا ہم نام نہیں اور کوئی اس کا ہم پایہ نہیں ہے۔ کیا اللہ کی کوئی نظیر ہے؟ ہرگز نہیں' وہ نظیر اور شبیہ سے پاک ہے۔ صدق اللہ العظیم!

---000---

درس نمبر ۱۴۳ ایک نظر میں

اس سورہ میں حضرت زکریاؑ کا قصہ گزر گیا ہے اور حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بات بھی گزر گئی ہے۔ حضرت مریمؑ کا قصہ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا واقعہ بھی گزر گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی جانب سے باپ اور قوم کو چھوڑ دینے کا قصہ اور ان حضرات کے بعد آنے والے اہل ہدایت اور اہل ضلالت کا ذکر بھی گزرا ہے۔ ان سب قصوں کے بعد یہ ذکر آیا کہ اس کائنات کا رب وحدہ لاشریک ہے اور وہی بلاشریک عبادت کا مستحق ہے۔ یہ تمام قصص صرف اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی قابل عبادت و بندگی ہے۔

اس مضمون کے بعد اب یہ پورا سبق عقیدۂ توحید اور عقیدۂ بعث بعد الموت کے بارے میں ہے۔ ان عقائد کو مناظر قیامت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور یہ مناظر تاثرات اور زندگی کی ہماہمی سے بھرپور ہیں' پھر پوری کائنات بھی ان مناظر میں شریک محفل ہے۔ تمام انسان اور پوری زمین' تمام انسان اور تمام جن' مومنین بھی اور کافر بھی ان مناظر میں اسٹیج کے کردار ہیں۔

پھر یہ مناظر اس دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور قیامت کی طرف بھی نکل جاتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا ایک ہی اسٹیج پر دنیا و آخرت دونوں کے مناظر دکھائے جا رہے ہیں۔ آغاز اس دنیا سے ہوتا ہے اور انجام آخرت میں جا کر نہایت ہی موثر انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ دنیا و آخرت میں بس چند آیات و چند کلمات کا فاصلہ رہ جاتا ہے جس سے پردہ شعور انسانی پر یہ احساس ابھر آتا ہے کہ یہ دنیا اور وہ جہاں دونوں ایک اسٹیج اور منظر کے دو حصے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۳۷ تشریح آیات

۶۶ ۔۔ تا ۔۔ ۹۸

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْــًٔا ﴿۶۷﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَ الشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

"انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مرچکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی گھیر لائیں گے۔ پھر جہنم کے گرد لاکر انہیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے' پھر ہر گروہ میں سے ہر اس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمٰن کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا' پھر یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو' یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمے ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچا لیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے"۔

پہلے انسان اسٹیج پر آتا ہے اور وہ بعث بعد الموت کے بارے میں اپنا موقف بیان کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی بات کرتا ہے جسے آج تک کئی انسان دہراتے چلے آئے ہیں۔ مختلف زمانوں میں انسانوں نے یہی بات کی ہے۔ گویا یہ ایک عالمی انسانی شبہ ہے اور تمام قوموں اور تمام نسلوں کو اس سوال نے ستایا ہے۔

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا (۱۹ : ۶۶) "انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مرچکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟" یہ سوال انسان کے دل میں محض اس کی غفلت کی وجہ

سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے غور نہیں کیا کہ وہ موجود ہے اور اسے بہرحال پیدا کیا گیا ہے ' تو وہ موجود ہے۔ یہ کہاں تھا؟ کیسے تھا؟ یقیناً یہ نہ تھا پھر ہوا۔ اگر انسان ذرا بھی غور کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ پہلی بار کی پیدائش کے مقابلے میں دوبارہ اٹھانا تو بہت آسان کام ہے۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (۱۹:۶۷) "کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم نے پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟"

آگے جا کر اس انکار اور زبردستی کے انکار پر ذرا تشدید آمیز لہجے میں بات کی جاتی ہے۔ اللہ اپنی ذات کی قسم اٹھاتے ہیں اور ذات باری کی قسم ایک عظیم قسم ہے کہ لازماً ان لوگوں کو اور تمام لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ ان کو اٹھا کر میدان حشر میں لایا جائے گا اور یہ ایک فیصلہ شدہ اور طے شدہ امر ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ (۱۹:۶۸) "میرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اٹھائیں گے"۔ اور یہ اکیلے ہی نہ ہوں گے۔ ان کے ساتھ شیاطین کو بھی اٹھائیں گے۔ کیونکہ یہ اور شیاطین ایک ہی قماش کے لوگ ہیں۔ یہ شیاطین ہی تو ہیں جو ان کے دلوں میں ایسے شبہات پیدا کرتے ہیں۔ یہ تو تابع ہیں اور شیاطین ان کے لیڈر ہیں۔ ان کے درمیان تابع اور متبوع کا رشتہ ہے۔

اب اگلے مرحلے میں یہ سب گھٹنوں کے بل آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ ان کی نہایت ہی برے حال کی حسی تصویر ہے۔ سخت شرمندگی اور توہین آمیز حالت میں ہیں یہ لوگ۔

ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا (۱۹:۶۸) "پھر جہنم کے گرد لا کر انہیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے"۔ یہ ایک مجسم منظر ہے' بے حد و حساب لوگ جمع کئے گئے ہیں' جہنم کی طرف ان کو اہانت آمیز انداز میں گھٹنوں کے بل لایا جا رہا ہے۔ یہ لاچاری میں اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کے شعلوں کی لپٹوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ہر وقت وہ اس خوف میں ہیں کہ ابھی پکڑے گئے اور اس میں پھینکے گئے۔ جزع و فزع میں وہ گھٹنوں کے بل چلے اور اوندھے گرا دیئے گئے۔

دنیا کے جباروں اور قہاروں کے لئے یہ بہت ہی توہین آمیز منظر ہے۔ اس منظر میں ان منکرین کی صفوں سے ان لوگوں کو چھانٹا جا رہا ہے جو اوروں کے مقابلے میں زیادہ سرکش تھے۔ کھینچ کھینچ کر ان کو باہر صفوں سے نکالا جا رہا ہے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (۱۹:۶۹) "پھر چھانٹ کر نکالیں گے ہم ہر گروہ سے ان لوگوں کو جو اللہ کے شدید نافرمان تھے"۔ چھانٹ لینے کے لئے نہایت ہی تاکیدی مشدد لفظ استعمال ہوا ہے' تاکہ لفظ کی سختی' تشدید اور معنوی مبالغہ چھانٹ لینے کے عمل کو مزید خوفناک بنا دے' جس کے بعد پھر ان لوگوں کو جہنم میں پھینکنے کا عمل آتا ہے۔ خیال ان تمام حرکات کو عملی شکل دیتا ہے۔

اللہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی جہنم میں تپائے جانے کا مستحق ہے۔ اس لئے وہ ان لاتعداد اور ان گنت انسانوں کے سیلاب میں سے ان کو چن کر باہر نکال لائے گا۔

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا (۱۹:۷۰) "پھر ہم یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے"۔ ان کو وہ نکال لائے گا اور وہ جہنم میں ڈالے جانے والوں کا ہراول دستہ ہوں گے۔ اس منظر کو اہل ایمان دیکھ رہے ہوں گے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۱۹:۷۱) "اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ تو ایک طے شدہ بات ہے، جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمہ ہے"۔ تمام لوگ جہنم کے قریب کئے جائیں گے اور جب وہ جہنم کو دیکھیں گی تو اس کی آگ کے شعلے بلند ہوں گے، جوش میں ہوں گے اور پھٹ رہے ہوں گے۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ نافرمان بندے لوگوں میں سے نکالے جائیں گے اور اس میں گرائے جائیں گے۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (۱۹:۷۲) "پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو دنیا میں متقی تھے"۔ یہ دوزخ ان سے دور ہو جائے گی اور وہ اس میں ڈالے جانے سے بچالئے جائیں گے اور

وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (۱۹:۷۲) "اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے"۔

اب روئے سخن اس ڈراؤنے منظر سے پھر جاتا ہے جس میں نافرمان نہایت ہی اہانت کے ساتھ گھٹنوں کے بل چلائے جا رہے ہیں۔ جس میں متقی لوگ نجات پا جاتے ہیں اور ظالموں کو اوندھے منہ جہنم میں گرا ہوا چھوڑا جا رہا ہے۔ یکایک ہم پھر دنیا میں آ جاتے ہیں، یہاں اہل کفر اہل ایمان کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو ان کی بدحالی پر طعنے دیتے ہیں۔ اپنی دولت مندی پر، ظاہری شان پر اور دنیاوی قدروں پر فخر کرتے ہیں حالانکہ یہ دار فنا کی چیزیں ہیں، ختم ہونے والی قدریں ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾

"ان لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں "بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں"۔

بڑی بڑی مجلسیں اور عیش و طرب کی محفلیں اور وہ قدریں جن پر کبراء اور مترفین زمانہ اخلاقی فساد میں عمل پیرا ہوا کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بظاہر نچلے درجے کی سوسائٹیاں اور غربت و افلاس والوں کی محفلیں جن میں ایمان کے سوا اور کوئی سازوسامان کم ہی ہوتا ہے۔ نیز ان میں زیب و زینت اور شان و شوکت کم ہوتی ہے۔ نہ قیمتی لباس ہوتے ہیں اور نہ قیمتی جائے قیام۔ اس دنیا میں لوگ ان ہی چیزوں میں باہم مقابلہ کرتے ہیں اور ان ہی کی بنیاد پر طبقاتی امتیازات قائم ہوتے ہیں۔

اس مقابلے اور نمائش گاہ میں، پہلے طبقے کے اسٹال پر بڑا بڑا دنیاوی سازوسامان، مال و جمال، قوت اور مرتبہ،

بڑے بڑے معاذلت' بڑی بڑی آمدنیاں' کھانے پینے کے لذیذ سازو سامان ہوتے ہیں اور دوسرے طبقے کے اسٹال پر فقر و تواضع ہے۔ ایسا سازو سامان جو کبرا کے ہاں قیمتی ہے' ان کی نظروں میں حقیر ہے' جاہ و مرتبہ ان کے ہاں پرکاہ کے برابر ہے۔ یہ دوسرا اسٹال عیش طرب کے لئے نہیں۔ معاذلت کے لئے نہیں' حکام کے ہاں اثر و رسوخ کے لئے نہیں' اقتدار ہر فخر کے لئے نہیں بلکہ محض نظریاتی متاع گراں بہا کی طرف بلاتا ہے' اس اسٹال پر کوئی قیمتی دنیاوی مال و متاع نہیں ہے' کوئی آرائش و زیبائش نہیں ہے لیکن وہاں اللہ کے کلمے کی سربلندی کا داعی ہے' صرف کلمہ حق کی سربلندی کی طرف یہ دوسرا فرق بلاتا' نہ صرف یہ کہ یہاں مذکور دنیاوی چیزیں نہیں بلکہ مشقت' جدوجہد اور قربانیاں ہیں۔ ان تمام مشقتوں کا عوض بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہاں انہیں صرف اللہ کا قرب حاصل ہو گا' جہاں تک اجر اور جزاء کا تعلق ہے وہ آخرت میں ہے۔

یہ قریش جن کو حضور اکرمؐ کے دور میں آیات الہیہ سنائی جا رہی تھی' وہ اہل ایمان فقراء کو دیکھ کر یہ کہتے تھے :

أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا (۱۹ : ۷۳) "بتاؤ' ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالات میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں"۔ وہ کبرا بہتر ہیں جو محمدؐ پر ایمان نہیں لاتے یا وہ فقراء بہتر ہیں جو اس کے ارد گرد جمع ہیں' ان میں سے کن کے حالات دنیاوی اعتبار سے بہتر ہیں اور کس کی سوسائٹی شاندار ہے۔ ایک طرف نضیر ابن حارث' عمرو ابن ہشام' ولید بن مغیرہ اور ان کے بھائی اور دوسرے سردار ہیں اور دوسری جانب بلال' عمار' حباب اور ان کے دوسرے بھائی ہیں جن کے پاس ایک کوڑی نہیں ہے۔ اگر محمدؐ جن باتوں کی طرف بلاتے ہیں وہ اچھی ہوتیں تو ان کے ساتھی یہ لوگ جن کی قریش کی سوسائٹی میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی رعب ہے۔ یہ لوگ سب کے سب ایک مسکین حباب کے گھر جمع ہوتے ہیں جو غریب اور بے روزگار ہے۔ اور محمدؐ کے مخالف بڑی بڑی شاندار مجالس میں بیٹھتے ہیں اور سوسائٹی میں ان کا اونچا مرتبہ ہے۔

یہ ہے دنیا پرستوں کی منطق اور ان کی سوچ۔ ہر زمان و مکان میں دنیا پرستوں اور کوتاہ بینوں کی یہی انداز فکر ہوتی ہے۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ دعوت اسلامی اور اس کے حاملین دنیاوی زیب و زینت سے خالی ہوں' زیب و زینت اور مصنوعی رنگ و روغن ان کی اصل حقیقت کو نہ چھپا سکے۔ ان کی کسی چیز میں کوئی کلاکاری نہ ہو۔ اس دعوت کو ان داعیوں کی قیادت کو قبول کرنا چاہے وہ خالص اللہ کے لئے قبول کریں' اس دعوت کو قبول کریں۔ اس میں دنیا اور دنیا پرستوں کا کوئی کردار نہ ہو۔ ان میں کوئی نمائش اور ملمع کاری نہ ہو تاکہ جو لوگ دنیا کے مفادات چاہتے ہیں' دنیا کا نفع چاہتے ہیں وہ اس طرف نہ آئیں جو دنیا کی زیب و زینت چاہتے ہیں' شان و شوکت چاہتے ہیں اور مال و متاع چاہتے ہیں وہ دور رہیں۔

ان برخود غلط گمراہوں اور کافروں کی منطق' شان و شوکت اور زیب و زینت کی نمائش کرنے والوں کی اس طرز فکر کو ایک وجدانی چٹکی سے ذرا تاریخ انسانیت کی طرف موڑ دیا جاتا ہے کہ تاریخ انسانی میں کئی اقوام' اس قسم کا بظاہر شاندار مقام عزت رکھتی تھیں' دنیا کے مال و متاع اور نعمتوں میں مست تھیں لیکن ذرا دیکھو' ان کا کیا انجام ہوا؟

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ﴿۷۴﴾

”حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے زیادہ سرو سامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان و شوکت میں ان سے بڑھی ہوئی تھیں“۔

ہوا یہ کہ ان کی اس شان و شوکت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا۔ ان کے زیب و زینت نے ان کو عذاب الہی سے نہ بچایا۔ جب ان پر ہلاکت آئی تو یہ سب ظاہرداریاں مٹ گئیں۔

یاد رکھو' انسان بہت جلد بھول جاتا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی تاریخ کے اسباق یاد کرتا اور ذرا بھی غور کرتا تو وہ ان ظاہر داریوں پر کبھی غرور نہ کرتا حالانکہ انسانی تاریخ میں جو اقوام ہلاک ہوئیں' ان کی ہلاکتوں اور بربادیوں میں بہت بڑا سامان عبرت ہے۔ تاریخ انسانی انسان کے دامن کو پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتی ہے کہ ذرا دیکھو' خدا کے عذاب سے ڈرو' اللہ کی پکڑ سے خوف کھاؤ۔ لیکن انسان ہے کہ سر نیچے کئے ہوئے اپنی غلط روش پر چل رہا ہے۔ وہ پیچھے کی طرف نہیں دیکھتا کہ آگے جاتے ہوئے ٹھوکروں سے بچے' حالانکہ اقوام ماضی میں سے جن لوگوں کو ٹھوکر لگی وہ ان سے زیادہ صاحب قوت تھیں' زیادہ دولت مند تھیں' زیادہ آبادی والی تھیں۔

لیکن اس اچٹتی نظر کے بعد قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے یہ وجدانی اشارہ کافی نہیں ہے۔ ان کو چیلنج کے انداز میں کہو کہ اچھا جو گروہ گمراہی میں اور غلط راستے پر ہے' اللہ اسے مزید گمراہ کرے اور وہ پہنچے اس انجام تک جو گمراہوں کا قدرتی انجام ہوتا ہے خواہ اس جہاں میں یا آخرت میں۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ۝ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝

ان سے کہو' جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اسے رحمن ڈھیل دیتا ہے یہاں تک کہ جب ایسے لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے --- خواہ وہ عذاب الہی ہو یا قیامت کی گھڑی --- تب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتھا کمزور! اس کے برعکس جو لوگ راہ راست اختیار کرتے ہیں اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے اور باقی رہ جانے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک جزاء اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں“۔

ان لوگوں کا زعم یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبعین سے زیادہ صحیح راستے پر ہیں محض اس لیے کہ وہ دولت مند ہیں' شان و شوکت والے ہیں۔ اچھا ان کی دولت اور شان میں اور اضافہ ہو' اور اے محمدؐ تم ان کو یہ بددعا دو کہ گمراہی میں یہ اور دور نکل جائیں۔ اللہ ان کی رسی اور دراز کر دے۔ اہل ہدایت کو مزید ہدایت دے تاکہ یہ لوگ اپنے انجام تک پہنچ جائیں اور ان کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ یا دنیا میں ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دی جائے اور یا آخرت میں ان کو سزا دی جائے۔ اس وقت پھر ان کو صحیح صورت حالات کا علم ہو جائے گا' کہ کس کا مقام و مرتبہ اچھا ہے

اور کون کمزور اور ناتواں اور بے بس ہے۔ اس وقت مسلمان بہت خوش ہوں گے اور عزت پائیں گے۔

وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ مَّرَدًّا (۱۹ : ۷۶) "اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں"۔ ان تمام چیزوں سے بہتر ہیں جن پر اہل دنیا فخر کرتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں۔

اب کافروں کے فخر و مباہات کا ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ان کی ایک دوسری بات جس پر تعجب کر کے سخت نکیر کی جاتی ہے۔

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ؕ اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۙ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا یَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۙ وَّ نَرِثُهٗ مَا یَقُوْلُ وَ یَاْتِیْنَا فَرْدًا

"کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا؟ کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لئے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔ جس سروسامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا"۔

اس آیت کے شان نزول میں حضرت خباب ابن الارت کی یہ روایت آئی ہے: "میں ایک لوہار تھا۔ عاص ابن وائل پر میرا قرض تھا۔ میں اس کے پاس آیا اور اس سے اپنے قرضے کا تقاضا کیا تو اس نے کہا خدا کی قسم میں تجھے ہرگز تمہارا قرض نہ دوں گا جب تک تم محمدؐ پر ایمان لانے سے انکار نہ کر دو۔ تو میں نے کہا خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں حضرت محمدؐ کی نبوت کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ تم ایک بار مر کر دوبارہ زندہ نہ ہو جاؤ۔ اس نے کہا اچھا پھر جب میں مر گیا اور دوبارہ زندہ ہو گیا تو وہاں میرے پاس بہت مال ہو گا، میری اولاد ہو گی، وہاں آنا میرے پاس میں آپ کو قرض دے دوں گا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا (۱۹ : ۷۷) "تو نے دیکھا اس شخص کو، جو ہماری آیات کے ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا"۔

عاص ابن وائل کی یہ بات کفار قریش کے اس مذاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جو وہ بعث بعد الموت کے نظریہ کے ساتھ کرتے تھے۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کی سوچ پر تعجب سے یہ تبصرہ اور گرفت کرتا ہے۔

اَطَّلَعَ الْغَیْبَ (۱۹ : ۷۸) "کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے"۔ کیا اسے قبل از وقت معلوم ہے کہ وہاں کیا ہو گا۔

اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹ : ۷۸) "یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے" اور اسے یقین ہے کہ اللہ اپنے عہد کا پابند ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے۔

كَلَّا "ہرگز نہیں"۔ کلا نفی اور زجر کا لفظ ہے۔ نہ اسے غیب کا علم ہے اور نہ اس نے اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے بلکہ یہ کفر پر تل گیا ہے اور محض مذاق کرتا ہے۔ ایسے مقامات پر ایسے کافروں کے لائق یہی ہے کہ انہیں تہدید آمیز تنبیہ کر دی جائے۔

كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (۱۹ : ۷۹) "ہرگز نہیں' جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لئے سزا میں اور اضافہ کریں گے"۔ یعنی وہ جو کچھ کہتا ہے اسے لکھیں گے کہ یوم الحساب کے لئے حسب معمول اس کا ریکارڈ تیار ہو تاکہ نہ وہ بھولے اور نہ مغالطہ ہو' یہ تہدید اور ڈراوے کی نہایت ہی بہترین تصویر کشی ہے۔ حالانکہ مغالطہ تو وہاں ہو نہیں سکتا۔ اللہ کا علم تو نہ صغیرہ کو چھوڑتا ہے اور نہ کبیرہ کو۔ یعنی ہم اس کے عذاب کو طویل و عریض کرتے چلے جائیں گے۔ اس میں کوئی کمی اور کوئی انقطاع نہ ہو گا۔ مزید ڈراوا تصویر کشی کے انداز میں ملاحظہ ہو۔

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ (۱۹ : ۸۰) "جس سرو سامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا"۔ یہ جو مال و اولاد چھوڑے گا اسے ہم اس طرح لے لیں گے جس طرح وارث اپنی موروثہ اشیاء کو لے لیتا ہے۔

وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا (۱۹ : ۸۰) "یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا"۔ اس کے پاس نہ مال ہو گا' نہ اولاد ہو گی اور نہ کوئی مددگار ہو گا' نہ کوئی سند و ثبوت ہو گا۔ یہ اکیلا' ضعیف و ناتواں ہمارے سامنے ہو گا۔ تو کیا تو نے ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتا ہے' وہ اس دن کے ساتھ مذاق کرتا ہے جس دن یہ تہی دست ہو گا۔ اس دنیا میں اس کے تمام مملوکات اس کے ہاتھ سے چلے جائیں گے۔ یہ شخص ہے نمونہ کفر اور مثال کفار' انکار' ادعا اور گمراہی کی مثال۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ کفر اور شرک کی علامات کیا ہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ

عَهْدًا ﴿٨٧﴾

"ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے پشتیبان ہوں گے ۔کوئی پشتیبان نہ ہو گا۔وہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور الٹے ان کے مخالف بن جائیں گے ۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے منکرین حق پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو انہیں خوب خوب (مخالفت حق پر) اکسا رہے ہیں؟ اچھا' تو اب ان پر نزول عذاب کے لئے بے تاب نہ ہو۔ہم ان کے دن گن رہے ہیں وہ دن آنے والا ہے ۔جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حضور پیش کریں گے' اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے ۔اس وقت لوگ کوئی سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اس کے جس نے رحمٰن کے حضور سے پروانہ حاصل کر لیا ہو"۔

یہ لوگ جو آیات الہیہ کا انکار کرتے ہیں' وہ اللہ کے سوا دوسروں کو الٰہ بناتے ہیں اور ان کے ہاں اپنی عزت بناتے ہیں اور انہی سے غلبہ اور نصرت مانگتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگ تو ملائکہ کی بندگی کرتے ہیں ۔بعض ایسے ہیں جو جنوں کی پرستش کرتے ہیں' ان سے نصرت طلب کرتے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا' عنقریب وہ سب معبود ان سب کی عبادت' بندگی اور پکارنے کا انکار کریں گے ۔ان کے اس فعل سے نفرت کریں گے اور اللہ کے سامنے ان سے اپنی برائت کا اظہار کریں گے ۔

وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (۱۹:۸۲) "اور یہ الٹے ان کے مخالف بن جائیں گے"۔یعنی ان سے بری الذمہ ہو جائیں گے اور ان کے خلاف شہادت دیں گے"۔جو شیاطین ان کو اس کام پر اکسا رہے ہیں' یہ ہم نے ان پر مسلط کیے ہیں۔ان کو اللہ نے اجازت دے رکھی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ورغلا سکتے ہیں اور یہ اس وقت سے ماذون ہیں جب سے ابلیس نے اللہ سے اجازت چاہی کہ مجھے مہلت دیں۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ (۱۹:۸۴) "آپ ان پر نزول عذاب کے لئے عجلت نہ کریں"۔اپنے دل کو بھی تنگ نہ کریں' پریشان نہ ہوں' ان لوگوں کو تھوڑی سی مہلت دے دی گئی ہے ۔ان کے اعمال گنے جا رہے ہیں ۔ان کا حساب رکھا جا رہا ہے ۔انداز بیان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ان کے اعمال کا حساب نہایت ہی باریکی سے رکھا جا رہا ہے ۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا (۱۹:۸۴) "ہم ان کے دن گن رہے ہیں"۔کس قدر خوفناک دھمکی ہے یہ!وہ شخص ہلاک ہوا جس کے گناہوں' جس کے اعمال' جس کی ہر سانس کا حساب اللہ خود رکھ رہا ہے' اور نہایت باریکی سے اس کا حساب ریکارڈ کیا جا رہا ہے' تاکہ سختی سے اس کی گرفت ہو سکے ۔جو شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض کی زندگی میں اس کا افسر اس کے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کی غلطیاں نوٹ کی جا رہی ہیں' وہ ڈر جاتا ہے ۔اسے ہر وقت خوف رہتا ہے' کھٹکا لگا رہتا ہے کہ شاید اس سے کسی وقت کوئی غلطی سرزد ہو کر نوٹ نہ ہو جائے ۔لیکن جس شخص کی غلطیاں اللہ بذات خود نوٹ کر رہا ہو تو.....

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں اس گنتی اور حساب کا انجام دکھایا جاتا ہے۔ اہل ایمان کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے دربار میں معزز وفود کی شکل میں آرہے ہیں' نہایت عزت اور احترام کے ساتھ۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (۱۹: ۸۵) "وہ دن آنے والا ہے جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حضور پیش کریں گے" اور مجرموں کو جہنم کی طرف ہانک کر لے جائیں گے۔

وَّنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ اِلَى جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹: ۸۶) "اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنم میں ہانک لے جائیں گے"۔ اس دن کسی کی کوئی سفارش نہ ہوگی' ماسوائے اس شخص کے جس نے کوئی اچھا عمل کیا۔ یہ عمل صالح اس کا سفارشی ہوگا اور اللہ اپنے عہد کو پورا کرے گا۔ اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے اس کو پوری جزا دے گا اور اللہ عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

ایک بار پھر روئے سخن مشرکین کے عقیدۂ منکرہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بعض مشرکین عرب کا یہ قول تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہودیوں کا ایک مشرک طبقہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتا تھا' نصاریٰ کے مشرکین کہتے تھے مسیح ابن اللہ ہیں' ان مشرکانہ اقوال کی وجہ سے پوری کائنات کانپنے لگتی ہے۔ فطرت کائنات اس کا انکار کرتی ہے اور اس کا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

"وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سخت بے ہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں' زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں' اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے"۔

اس منظر میں فضا غضب' غیرت اور رد عمل کی ہے۔ اس فضا کو الفاظ کی گونج اور گرج اور عبارات اور فقروں کی ضربات مزید تیز کر دیتی ہیں۔ کائنات کے ضمیر میں ایک اشتعال ہے۔ کس کائنات کی تمام نفرت کرنے والی قوتوں کے اندر بھونچال آیا ہوا ہے۔ تمام تکوینی قوتوں کے اندر' ذات باری کی شان میں اس قدر سخت گستاخی کرنے کی وجہ سے سخت اشتعال ہے۔ جب کسی انسان کی ذات یا اس کے محبوب شخص کی توہین کر دی جائے اور اس کی عزت خطرے میں ہو تو اس کے تمام اعضاء یکدم رد عمل میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ پوری کائنات اس منظر میں نہایت ہی رد عمل میں ہے کیونکہ اس کے مالک کی شان میں گستاخی ہو رہی ہے۔

اس کلمہ کفر اور شان باری کی توہین کے ردعمل میں پوری کائنات 'زمین' آسمان' درخت اور پہاڑ سب ردعمل میں ہیں۔ اور اس کے اظہار کے لئے جو الفاظ قرآن نے چنے ہیں وہ بذات خود زلزلہ انگیز ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس کلمہ کفر کا اظہار ہوتے ہی کہ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (۱۹:۸۸) "وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے"۔ فوراً ہی ردعمل سامنے آتا ہے اور اس کی سخت مذمت کی جاتی ہے اور فوراً تردید آجاتی ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا (۱۹:۸۹) "سخت بیہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو"۔ اس کی تردید کے ساتھ ہی تمام ماحول بھڑک اٹھتا ہے' ہر چیز میں حرکت آجاتی ہے۔ پوری کائنات رب کی توہین کے ردعمل میں غضبناک ہو جاتی ہے۔ ہر چیز یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کلمہ کفر سے اس کے وجود' اس کی ذلت' اس کی فطرت کی توہین کی گئی ہے' چونکہ ہر چیز کے ضمیر اور اس کی شخصیت کا ردعمل باہر آجاتا ہے' اور وہ بنیادیں ہی ہل جاتی ہیں جن پر اس کلمہ کفر سے قبل کائنات کی ہر چیز میں سکون اور ٹھہراؤ تھا۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۹۰) اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۹۱) (۱۹:۹۰ - ۹۱) "قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں' زمین شق ہو جائے' اور پہاڑ گر جائیں' اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا۔ رحمٰن کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے"۔ اس خوفناک ماحول میں یہ قرارداد پیش کر دی جاتی ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا

"زمین و آسمان کے سب لوگ اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

زمین و آسمان میں جو چیز بھی ہے وہ اپنے رب معبود کے سامنے ایک مطیع فرمان عبادت گزار کی طرح جھکتی ہے۔ لہذا اسے ولد اور شریک کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب تو مخلوق اور بندے ہیں۔ یہ پوری کائنات کے حقیقی مفہوم پر غور کرتا ہے۔

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا (۱۹:۹۴) "سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے"۔ لہذا نہ کوئی اس سے بھاگ سکتا ہے' نہ وہ کسی کو بھول سکتا ہے۔

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (۱۹:۹۵) "سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے"۔ تمام افراد اللہ کی نظروں میں ہیں۔ پھر یہ تمام اللہ کے سامنے فرداً فرداً آئیں گے۔ کوئی جتھا نہ ہو گا' کوئی

مونس و مددگار نہ ہو گا۔ وہاں ان سے اجتماعیت کی روح اور اجتماعیت کا شعور ہی نکال دیا جائے گا۔ ہر شخص اللہ کے سامنے وحید و فرید ہو گا یکہ و تنہا۔

اس تنہائی' اکیلے پن' وحشت اور ڈر کے ماحول میں اچانک اہل ایمان کا گروہ نمودار ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت سے تروتازہ اور اس کے سایہ عاطفت میں ہے' نہایت ہی خوش و خرم' رحمٰن کی محبتوں میں ڈوبا ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾

"یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں' عنقریب رحمٰن ان کے لئے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا"۔ یہاں محبتوں کے تحفے فضا کو معطر بنا دیتے ہیں۔ اللہ کی رضامندی کی روح انسانی نفوس کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ عالم بالا میں اس روح کا دور دورہ ہوتا ہے۔ پھر یہ روح زمین پر اترتی ہے اور لوگوں میں پھیل جاتی ہے۔ تمام فضا' پوری سوسائٹی اور پوری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور کہتا ہے جبرئیل! میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں' پس تم بھی اس سے محبت رکھو۔ فرمایا تو جبرائیل اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمان والوں میں منادی کی جاتی ہے کہ سنو' اللہ فلاں سے محبت کرتا ہے' اس سے محبت رکھو' تو اہل سماء اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد اس شخصیت کو زمین پر قبول عام حاصل ہو جاتا ہے اور جب اللہ کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو جبرائیل کو بلا کر کہہ دیتا ہے کہ میں فلاں سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اس سے بغض رکھو' تو جبرائیل اس سے بغض رکھتے ہیں' پھر آسمان والوں میں منادی کر دی جاتی ہے کہ اللہ فلاں سے بغض رکھتا ہے' تم بھی اس سے دشمنی کرو' پس تمام اہل آسمان اس سے دشمنی کرتے ہیں۔ اس کے بعد پوری زمین میں اس کے ساتھ نفرت رکھ دی جاتی ہے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ مومنین و متقین کے لئے یہ قرآن خوشخبری اور منکرین اور مخاصمت کرنے والوں کے لئے یہ ڈراوا ہے اور یہ خوشخبری اور ڈراوا قرآن کریم کے اولین مقاصد میں سے ہے۔ اللہ نے عربوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے قرآن کریم کو عربی میں نازل کیا تاکہ وہ اسے پڑھیں اور رسول انہیں پڑھ کر سنائیں اور ان کو ڈرائیں۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾

"پس اے نبیؐ" اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمہاری زبان میں اس لئے نازل کیا ہے کہ تم پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو"۔ یہ سورہ ایک ایسے منظر پر ختم ہوتی ہے جس کو دیکھ کر ہر انسان ایک طویل وقفے کے لئے غور کرتا ہے اور انسانی شعور و وجدان کے اندر ایک طویل تاثر قائم رہتا ہے اور ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے اور دیر تک غور کرتا رہتا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۹۸ۧ

"ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں' پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟"

یہ ایک سخت جھٹکا ہے۔ اس کے بعد ایک مہیب سکوت اور خاموشی۔ گویا ہم تباہی اور ہلاکت کی وادی میں ہیں اور ان تمام وادیوں کو ایک ایک کر کے دیکھ رہے ہیں جن کو صدیوں سے ہلاک و برباد کیا جاتا رہا۔ ہلاکتوں کا یہ ایک طویل سلسلہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ہمارا خیال ان اقوام کی زندگیوں' ان کی ترقیوں اور رنگا رنگ سرگرمیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ بڑے بڑے شہر اور ان میں آبادیاں اور پھر زندگی کی حرکت اور دوڑ دھوپ نظر آتی ہے اور پھر جب ان آبادیوں پر' اللہ کی ہلاکت آتی ہے تو وہاں الو بولتا نظر آتا ہے۔ زندگی یکدم خاموش ہو جاتی ہے۔ ہر طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔ ہر طرف انسانی لاشیں ہیں' ہڈیاں ہیں اور پھر سیاہ مٹی ہے' نہ زندگی ہے' نہ احساس ہے' نہ حرکت ہے' نہ آواز ہے'

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ (۹۸:۱۹) "ان میں سے کیا کسی کا احساس تم پاتے ہو"۔ کوئی نام و نشان ہے؟ زرا خوب دیکھو ان تہذیبوں کو'

اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۹۸:۱۹) "یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے"۔ زرا کان لگا کر سننے کی کوشش کرو' یہ خوفناک خاموشی' یہ مہیب سناٹا' زرا دیکھو' یہاں اللہ وحدہ' حی لا یموت اور قہار و جبار کے سوا کوئی اور ہے؟

---○○○---

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۱۶

سورۃ طٰہٰ ـ ۲۰

۱ --- تا --- ۱۳۵

سورۂ طٰہٰ ایک نظر میں

اس سورہ کا آغاز اور اختتام دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خطاب سے ہوتا ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کے فرائض منصبی کیا ہیں؟ یہ کوئی مصیبت نہیں ہے جس میں آپ کو مبتلا کر دیا گیا ہے' نہ کوئی مشقت ہے ہے جس سے آپ کو عذاب دینا مقصود ہے ۔ یہ تو ایک دعوت اور یاد دہانی ہے ۔ لوگوں کو ڈرانا اور خوشخبری سنانا ہے ۔ اس کے بعد لوگوں کو چھوڑ دینا اور ان کو اللہ وحدہ کے سپرد کر دینا ہے کہ وہ جو چاہے ان کی تقدیر کا فیصلہ کرے ۔ وہ اس کائنات کے ظاہر و باطن پر محیط ہے ۔ وہ ظاہر و باطن دونوں کو اچھی طرح جاننے والا ہے ۔ بڑے بڑے گردن فراز اس کے سامنے جھکتے ہیں اور سب لوگ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں ۔ خواہ مطیع فرمان ہوں یا نافرمان اور باغی ہوں ۔ اگر کوئی تکذیب کرتا ہے یا کفر کرتا ہے تو رسول پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۔ اگر لوگ کفر کرتے ہیں اور آپ کو جھٹلاتے ہیں تو اس سے آپ پریشان نہ ہوں ۔

اس سورہ کے آغاز اور انجام کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی دو کڑیاں ہیں ۔ یعنی وہ حصہ جہاں سے آپ کی رسالت کا آغاز ہوتا ہے اور بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کرتے ہیں اور پھر وہ بچھڑے کو خدا بناتے ہیں ۔ لیکن یہ قصہ یہاں قدرے طوالت اور تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے ۔ اللہ اور کلیم اللہ کے درمیان ہمکلامی کے حصے کو زیادہ تفصیل سے دیا گیا ہے ۔ اسی طرح موسیٰ و فرعون کے درمیان مکالمے اور مجادلے کو بھی زیادہ جگہ دی گئی ہے ۔ موسیٰ اور جادوگروں کے مقابلے کو بھی تفصیل سے دیا گیا ہے ۔ اس قصے کے درمیان نظر آتا ہے کہ اللہ کریم موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں' خصوصاً آپ کے بچاؤ کی خصوصی تدابیر کی جا رہی ہیں ۔ حضرت موسیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کی تخلیق بھی تو خدا نے براہ راست اپنی نگرانی میں کی ۔ ان کی تربیت بھی اپنی نگرانی میں دشمن سے کرائی اور ان کو اور ان کے بھائی کو صراحت سے کہا ۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰي (۲۰ : ۴۶) "دونوں بالکل خوف نہ کھاؤ' بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں' سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں" ۔ اس سورہ میں قصہ آدم و ابلیس پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈالی جاتی ہے ۔ اس میں اللہ تعالیٰ آدم کی غلطی کے بعد ان پر اپنی رحمت کرتے ہیں ۔ آدم کو ہدایت دی جاتی ہے اور اس ہدایت کی استعداد و دیعت کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ ابن آدم کو چھوڑ دو کہ وہ اپنی آزادی سے ہدایت و ضلالت میں سے جو راہ چاہے' اختیار کرے ۔ البتہ دعوت و تذکیر اور ڈراوا اور تخویف ضروری ہے ۔

اس قصے کے ارد گرد قیامت کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں ۔ گویا یہ مناظر اس قصے کا تکملہ ہیں کیونکہ آدم کو دنیا میں خلیفہ بنانے کی اسکیم میں یہ طے ہوا تھا کہ انسانوں میں سے راہ راست اپنانے والے جنت میں جائیں گے اور گمراہ جہنم میں

جائیں گے اور حضرت آدم کو زمین پر اتارتے ہوئے یہ پوری اسکیم ان کو بتا دی گئی تھی۔

چنانچہ سیاق کلام اور بیان اس سورہ میں دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ پہلا حصہ حضور کو یہ مخاطب کر کے شروع کیا جاتا ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی (۲) اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی (۳) (۲۰ : ۲ - ۳)

"ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لئے' جو ڈرے"۔ اور اس کے بعد متصلاً بطور مثال قصہ موسیٰ و فرعون شروع ہو جاتا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ داعی بنا کر بھیجتا ہے' وہ اللہ کے زیر نگرانی کام کرتا ہے' اللہ اس کا محافظ ہوتا ہے اور ان کو مصیبتوں سے بچاتا ہے۔

دوسرے حصے میں قیامت کے مناظر اور قصہ آدم و ابلیس ہے۔ یہ بھی سورہ کے ابتدائیہ اور قصہ موسیٰ کی لائن پر ہے۔ اور اس کے بعد سورہ کا خاتمہ بھی خطاب رسول کے ساتھ ہے اور یہ خاتمہ سورہ کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

اس سورہ کا ایک خاص رنگ ہے' جو پوری سورہ پر نظر آتا ہے۔ عالم بالا کا گہرا سایہ اس پوری سورہ پر چھایا ہوا ہے۔ اس کو پڑھ کر قلب کے اندر میں خوف خدا اور خشوع پیدا ہوتا ہے۔ دل میں سکون اور طمانیت پیدا ہوتی ہے۔ گردن فرازی کو چھوڑ کر گردنیں جھک جاتی ہیں۔ یہ علوی سایہ سب سے پہلے وادی مقدس طویٰ پر نظر آتا ہے۔ جہاں عبد و معبود ہمکلام ہیں۔ اس طویل مناجات کے ساتھ پوری کائنات ہم آہنگ اور ہم رنگ ہے اور ہمقدم ہے۔ یہی سایہ علوفت پھر میدان حشر میں بھی نظر آتا ہے۔

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۲۰ : ۱۰۸) "اور آوازیں رحمن کے آگے دب جائیں گی ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے"۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (۲۰ : ۱۱۱) "اور لوگوں کے چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھک جائیں گے"۔

اس قسم کی فضا سورہ کے آغاز سے اختتام تک چھائی ہوئی ہے۔ الفاظ کا صوتی ترنم نہایت ہی نرم' نہایت دلدوز اور نہایت ترو تازہ اور فواصل و قوافی میں الف مقصورہ کو مسلسل استعمال کیا گیا ہے' جو سورہ کے واقعات' فضا اور مضمون کے ساتھ نہایت ہی ہم آہنگ ہے۔

--- ٥٥٥ ---

درس نمبر ۱۳۸ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۹۸

سُورَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ — آيَاتُهَا ١٣٥ — رُكُوعَاتُهَا ٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ﴿١﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿٢﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٣﴾ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴿٤﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿٥﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿٦﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿٧﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾

"طٰ ' ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے۔ نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے۔ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔ تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو' وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔ وہ اللہ ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں' اس کے لئے بہترین نام ہیں"۔

نہایت ہی نرم و نازک اور تر و تازہ آغاز ہے' حروف مقطعات طا۔ ہا۔ اشارہ یہی ہے کہ یہ پوری سورہ ایسے ہی حروف مقطعات سے مرکب ہے۔ جس طرح یہ قرآن ایسے ہی حروف سے مرکب ہے جیسا کہ دوسری سورتوں کے آغاز میں بھی یہی اشارہ ان حروف کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ یہاں جو دو حروف چنے گئے ہیں ان میں ایک مزید یہ اشارہ بھی پیش نظر ہے کہ ان کے تلفظ کے آخر میں الف مقصورہ آتا ہے جس طرح اس پوری سورہ میں فواصل الف مقصورہ پر ختم ہوتے ہیں۔ حروف مقطعات کے بعد قرآن کریم کا ذکر آتا ہے' جس طرح پورے قرآن میں جس سورہ کا آغاز حروف

مقطعات سے ہوتا ہے' ان کے بعد متصلاً قرآن کریم کا ذکر ہوتا ہے ۔یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خطاب کی شکل میں تبصرہ ہے قرآن مجید اور اس کی دعوت پر 'کہ یہ مصیبت نہیں ہے ۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓي (۲۰ : ۲) "ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ"۔یعنی یہ قرآن آپ پر نازل ہوا کہ آپ اس کی تبلیغ کریں' اس کی وجہ سے تم پر کوئی مصیبت نہ آئے گی۔ یہ نہیں کہ اس کی تلاوت میں آپ کو تکلیف ہو' یہ نہیں کہ اس پر عمل میں آپ کو کوئی مشقت ہو' یہ تو یاد دہانی اور نصیحت آموزی کے لئے آسان کر دیا گیا ہے ۔اس کے اندر جو احکام دیئے گئے ہیں وہ انسانی طاقت کی حدود کے اندر اندر ہیں ۔یہ نعمت خداوندی ہے مصیبت و عذاب خداوندی نہیں ہے ۔اس کے ذریعہ تو عالم بالا سے انسان کا رابطہ ہوتا ہے اور انسان کو عالم بالا کی تائید حاصل ہوتی ہے اور وہ قوت و اطمینان حاصل کرتا ہے ۔اللہ کی رضامندی کا شعور' اللہ کے ساتھ انس و محبت کا شعور' اور اللہ کے ساتھ ملنے اور رابطے کا شعور اس سے حاصل ہوتا ہے ۔

یہ قرآن اس لئے بھی نازل نہیں ہوا کہ اگر لوگ اسے نہیں مانتے تو آپ پریشان ہوں کیونکہ یہ آپ کے فرائض میں نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں ۔نہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کے عدم ایمان کی وجہ سے دل کو حسرتوں کا خزانہ بنا دیں ۔ یہ تو صرف اس لیے ہے کہ آپ نصیحت کرتے چلے جائیں اور لوگوں کو انجام بد سے ڈراتے چلے جائیں ۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰي (۲۰ : ۳) "یہ تو ایک یاد دہانی ہے' ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے"۔ جو شخص ڈرتا ہے' جب اسے نصیحت کی جائے تو وہ اثر قبول کرتا ہے' اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے معافی طلب کرتا ہے بس یہاں تک رسول اور داعی کے فرائض پورے ہو جاتے ہیں ۔رسولوں اور داعیوں کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ دلوں کو لگے ہوئے تالے کھول دیں یا لوگوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوں ۔یہ کام تو اللہ کا ہے جس نے قرآن مجید نازل کیا ہے ۔یہ اللہ ہی ہے جو اس پوری کائنات کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے' اس پر محیط ہے اور اس کو دلوں کے خفیہ ارادے اور راز تک معلوم ہیں ۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰي (٤) اَلرَّحْمٰنُ عَلَي الْعَرْشِ اسْتَوٰي (٥) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰي (٦) (۲۰ : ٤ تا ٦) "نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے ۔مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں"۔کیونکہ جس نے اس قرآن کو نازل کیا ہے وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے' ان بلند ترین آسمانوں کو' کیونکہ یہ قرآن بھی اسی طرح ایک تکوینی مظہر ہے جس طرح زمین و آسمان مظاہر کونیہ ہیں ۔یہ بھی عالم بالا سے اترا ہے ۔یہاں قرآن مجید ان قوانین قدرت کو جو اس کائنات میں کار فرما ہیں

اور ان قوانین کو جو اس قرآن میں ضبط کیے گئے ہیں یکجا کر کے بیان کرتا ہے۔ آسمانوں کا پرتو زمین پر پڑتا ہے اور اس طرح قرآن بھی ملاء اعلیٰ سے زمین کی طرف آتا ہے۔

جس ذات نے ملا اعلیٰ کی طرف سے یہ قرآن نازل کیا ہے اور جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے وہ کون ہے؟ رحمٰن ہے اور رحمٰن جو نہایت ہی مہربان ہوتا ہے' اس کی جانب سے اترا ہوا قرآن کبھی بھی باعث مشقت اور مصیبت نہیں ہو سکتا۔ قرآن اور رحمٰن دونوں میں صفت رحمت قدر مشترک ہے۔ اور یہ رحمت ہی ہے جس نے اس پوری کائنات کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَي الْعَرْشِ اسْتَوٰي (۲۰:۵) "رحمٰن کائنات کے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے"۔ استوائے عرش کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا اس کائنات پر پوری طرح کنٹرول ہے اور یہ اس کی مکمل گرفت میں ہے۔ لہٰذا لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے' رسول کا کام صرف یہ ہے کہ جو ڈرتا ہے اسے ڈرائے۔

اس کائنات پر مکمل کنٹرول اور گرفت کے ساتھ ساتھ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰي (۲۰:۶) "وہ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں"۔ یہ کائناتی مناظر یہاں اس لئے دیئے گئے کہ اللہ کی ملکیت اور اس کی قدرت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ یہ انسانی تصور کے قریب تر ہو جائیں جبکہ اللہ کی ملکیت اور اس کی ضرورت کا تصور اس سے عظیم تر ہے۔ زمین اور آسمانوں اور مٹی کے نیچے کا ذکر محض اس لئے کیا گیا ہے کہ عوام اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں کہ اللہ کی گرفت میں جو کائنات ہے اس کی وسعت کا ادراک آہستہ آہستہ وسیع ہو رہا ہے اور بہت بڑا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ خطاب اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ رب ان کے ساتھ ہے۔ رب تعالیٰ ان کو اکیلا نہیں چھوڑتا کہ وہ تکالیف منصب نبوت کی وجہ سے مشقت میں پڑ جائیں۔ کافروں کا مقابلہ آپ بلاسند نہیں کر رہے' اگر آپ اللہ کو جہراً پکاریں تو بھی حرج نہیں لیکن اللہ سراً اور جہراً دونوں پکارنے والوں کو جانتا ہے۔ انسانی دل و دماغ اور شعور میں جب یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اللہ اس کے قریب ہے' اور اس کی دلی دنیا سے بھی واقف ہے تو انسان مطمئن ہو جاتا ہے اور راضی برضا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس قرآن کو پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ جھٹلانے والے مخالفوں کے درمیان تنہائی محسوس نہیں کرتا اور وہ مخالفین کے درمیان اپنے آپ کو یکہ و تنہا بھی محسوس نہیں کرتا۔

یہ ابتدائی آیات' جو تمہیدی بھی ہیں' اس اعلان پر ختم ہوتی ہیں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور کائنات اس کے کنٹرول میں ہے۔ وہ اس کائنات کا مالک ہے اور اس کائنات کے بارے میں پوری پوری خبرداری اسے حاصل ہے۔

--- ooo---

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ قصہ نمونہ ہے اس بات کا کہ اللہ اپنے داعیوں کی حفاظت اور حمایت کس طرح کرتا ہے۔ نبیوں اور رسولوں کے جو قصص قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں' فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ان سب کے مقابلے میں قرآن مجید کے اندر زیادہ جگہ لیتا ہے۔ اس قصے کی مختلف کڑیاں قرآن مجید کی

مختلف سورتوں میں آتی ہیں۔ ان کڑیوں کا انتخاب ہر سورہ کے مضمون اور موضوع کی مناسبت سے کیا جاتا ہے اور اس کا انداز بیان بھی اسی رنگ میں ہوتا ہے جس رنگ میں پوری سورہ کا انداز بیان ہوتا ہے۔ اس سے قبل اس قصے کی کچھ کڑیاں، سورہ بقرہ، سورہ مائدہ، سورہ اعراف، سورہ یونس، سورہ اسراء، سورہ کہف میں آچکی ہیں اور دوسری سورتوں میں بھی اس قصے کی طرف اشارات موجود ہیں۔

مائدہ میں جو کچھ آیا وہ صرف ایک کڑی ہے یعنی یہ کڑی کہ بنی اسرائیل جب بیت المقدس میں آئے تو یہ لوگ شہر کے باہر کھڑے ہوگئے اور شہر کے اندر داخل ہونے سے رک گئے، اس لئے کہ اس شہر میں ایک جبار قوم رہتی ہے۔ سورہ کہف میں بھی اس کی ایک ہی کڑی ہے، یعنی حضرت موسیٰ اور عبد صالح کے ساتھ ان کی ملاقات اور مختصر صحبت۔

بقرہ، اعراف، یونس اور طٰہٰ میں قصہ موسیٰ و فرعون کی کئی کڑیاں آئی ہیں لیکن ان میں سے بھی مختلف سورتوں میں آنے والی کڑیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جس طرح اس قصے کی کڑیاں مختلف ہیں۔ اسی طرح مختلف سورتوں میں ان کڑیوں کے مختلف پہلو موقع و مناسبت سے مختلف دیئے گئے ہیں اور انداز بیان بھی مختلف ہے۔

سورہ بقرہ میں جب یہ قصہ آیا تو اس سے قبل قصہ آدم و ابلیس تھا اور اس میں آدم علیہ السلام کو عالم بالا میں اعزاز بخشا گیا تھا۔ آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی سپرد کی گئی تھی اور آدم کو معاف کر کے ان پر رحمت خداوندی کا نزول ہوا تھا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات بیان ہوئے، یہ یاد دلانے کے لئے کہ اے بنی اسرائیل ذرا غور کرو تم پر اللہ نے کیسی کیسی مہربانیاں کیں۔ تمہارے ساتھ عہد کیا تمہیں فرعون اور اس کی قوم سے نجات دی۔ تمہیں صحرا میں پانی پلایا اور تمہارے لئے پتھروں سے چشمے نکالے تمہیں صحرا میں من و سلویٰ کی شکل میں کھانا فراہم کیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی ہمارے ساتھ ملاقات اور ہم کلامی کا وقت آیا اور پیچھے سے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی لیکن اللہ نے تمہیں پھر بھی معاف کر دیا۔ پہاڑ کے نیچے تم سے عہد لیا۔ پھر سبت کے معاملے میں تم نے حد سے تجاوز کیا۔ اور پھر گائے کے ذبح کرنے کا قصہ تو عجیب تر ہے۔

اعراف میں اس قصے سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ مکذبین پر اللہ کا عذاب حضرت موسیٰ سے قبل کیسے کیسے آیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا قصہ آیا۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی تقریب ہے۔ اس کے بعد معجزات عصا، ید بیضا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں اور مینڈک اور خون، اور اس کے بعد جادوگروں کے ساتھ مقابلہ، اور فرعون کا بھی اسی طرح خاتمہ جس طرح پہلے کے مکذبین کا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ واقعہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں انہوں نے بچھڑے کو خدا بنا لیا۔ ان کے بعد اس قصے کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت کی وراثت ان لوگوں کے لئے ہے جو نبی امی پر ایمان لے آئیں۔

سورہ یونس میں جہاں یہ قصہ آیا ہے، اس میں اس سے قبل ان اقوام کا ذکر ہے جو ہلاک کی گئیں۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کی رسالت کی کڑی، جادوگروں کے ساتھ مقابلے کی کڑی اور فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کی کڑی بالتفصیل لائی گئی ہے۔

ہاں سورہ طٰہٰ میں سورہ کا آغاز ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ جن لوگوں کو رسول بنا کر بھیجتا ہے ان پر اس کی رحمت ہوتی ہے۔ اور وہ اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں اور ان پر رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ چنانچہ قصے کا آغاز اس منظر سے ہوتا جس میں حضرت موسیٰ طور پر رب ذوالجلال سے ہم کلام ہیں، اس کے بعد اس میں وہ مناظر آتے ہیں جن میں صاف

نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ اللہ کی پناہ میں ہیں اور تائید ایزدی ان کی پشت پر ہے ۔ بچپن میں ہی یہ رحمت ان کے شامل حال رہی اور ان کی پرورش اور نگرانی ہوتی رہی ۔

وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ (۲۰ : ۳۹) "اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے" ۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝

"اور تمہیں کچھ موسیٰ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ "ذرا ٹھہرو' میں نے ایک آگ دیکھی ہے ۔ شاید کہ تمہارے لئے ایک آدھ انگارا لے آؤں' یا اس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے؟"

کیا تمہیں موسیٰ کی کہانی معلوم ہے ۔ اس کہانی سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ اللہ جن لوگوں کو منصب رسالت عطا کرتا ہے وہ ان لوگوں کو اپنی خاص پناہ میں رکھتا ہے اور ان کو بروقت ہدایت دیتا رہتا ہے ۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰي (۲۰ : ۹) "کیا موسیٰ کا قصہ تمہیں معلوم ہے" ۔ اگر نہیں تو سنئے ' حضرت موسیٰ مدین سے واپسی پر مصر جا رہے تھے ۔ وہ طور کے دامن میں سفر کر رہے تھے ' ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھی اور ان کے اور اللہ کے نبی شعیب علیہ السلام کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ پورا ہو گیا تھا ۔ معاہدہ یہ تھا کہ حضرت شعیب اپنی بیٹیوں میں سے ایک کو ان کے نکاح میں دے دے گا اگر وہ ان کی آٹھ سال تک خدمت کرتا رہے یا دس سال تک ۔ میعاد پوری کرنے کے بعد حضرت موسیٰ عازم مصر ہوئے تاکہ وہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ مستقلاً زندگی گزاریں ۔ مصر میں جہاں ان کی ولادت ہوئی اور جہاں ان کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل آباد ہیں ' فرعون کے ظلم و ستم سہ رہے ہیں اور غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

یہ کیوں واپس ہو رہے ہیں جبکہ مصر سے تو وہ خارج البلد ہو گئے تھے ۔ مفرور ہو گئے تھے ' جب ایک بار انہوں نے دیکھا کہ ایک قبطی ان کے ہم قوم بنی اسرائیلی سے لڑ رہا ہے ' اس جھگڑے میں قبطی ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا ۔ حضرت موسیٰ مصر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے جبکہ بنی اسرائیل پر انواع و الوان کے مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے ۔ مدین میں اللہ کے نبی شعیب علیہ السلام کے ہاں ان کو پناہ مل گئی جہاں انہوں نے دامادی اختیار کر لی اور ان کی ایک بیٹی سے ان کا نکاح ہو گیا ۔

دست قدرت نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک اہم رول تجویز کر رکھا تھا لیکن بظاہر وطن کی محبت اور اہل و عیال اور قوم کی کشش ان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ مدین سے مصر کی طرف واپس ہو جائیں ۔ اس دنیا میں بطور انسان ہم لوگ

اسی طرح ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں' جذبات' میلانات اور محبتیں ہمیں ادھر ادھر گھماتی رہتی ہیں' جدوجہد اور منافع' مصائب اور امیدیں' یہ باتیں ہمیں ادھر ادھر حرکت دیتی رہتی ہیں 'لیکن یہ محض ظاہری چیزیں ہیں' دراصل محرک ایک خفیہ دست قدرت ہے جسے ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ۔ یہ دست قدرت پوشیدہ مقاصد کے لئے ہمیں حرکت دے رہا ہے ۔ یہ مدبر کائنات' اور عزیز اور جبار کا دست قدرت ہے جس کے پاس ہماری ڈائری ہے ۔

غرض دست قدرت نے موسیٰ کو مدین سے اٹھایا ۔ صحرائے سینا میں وہ راہ گم کر بیٹھے' ان کی بیوی ان کے ساتھ ہے' ممکن ہے کوئی خادم بھی ساتھ ہو' رات کا وقت ہے' اندھیری رات ہے' اور صحرا وسیع ہے ۔ یہ صورت حال اس آیت سے معلوم ہوتی ہے انہوں نے اہلیہ سے کہا:

اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْ اٰتِیْکُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی (۲۰: ۱۰)

"ذرا ٹھہرو' میں نے ایک آگ دیکھی ہے' شاید میں تمہارے لئے ایک آدھ انگارا لے آؤں یا اس آگ پر مجھے کوئی راہنمائی مل جائے ۔ کیونکہ دیہاتی لوگ اونچی جگہ آگ جلایا کرتے ہیں تاکہ صحرا میں چلنے والے گم کردہ راہ لوگ اسے دیکھ لیں اور ان کو راستہ معلوم ہو جائے یا ان کو کھانے پینے کا سامان مل جائے یا ایسا شخص مل جائے جو انہیں سیدھی راہ بتلا دے ۔

موسیٰ علیہ السلام نے ایک ٹیلے پر آگ دیکھی تو خوش ہوئے' اس طرف چل دیئے تاکہ وہاں سے کوئی انگارہ لے آئیں اور اس سے آگ جلا کر رات کے وقت یہ لوگ تاپیں ۔ رات سرد ہے اور صحراؤں کی راتیں تو بہت سرد ہوتی ہیں یا کوئی راہنما مل جائے یا اس آگ کی روشنی میں راستہ دیکھا جا سکے ۔

وہ گئے تو اس لئے کہ آگ کا انگارہ لے آئیں یا صحرا میں کوئی راہنمائی کرنے والا مل جائے لیکن وہاں وہ اچانک ایک عظیم الشان واقعہ سے دوچار ہو گئے ۔ یہاں انہیں ایسی آگ ملی جو جسم کے تاپنے کے کام نہ آتی تھی بلکہ روح کو تپانے کے لیے کارگر تھی ۔ یہ آگ صرف صحرا میں رہنمائی کے لئے مفید مطلب نہ تھی بلکہ یہ آگ زندگی کے عظیم سفر کے لئے راہ دکھانے والی تھی ۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ﴿۱۱﴾ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ﴿۱۲﴾ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی ﴿۱۵﴾ فَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی ﴿۱۶﴾

"وہاں پہنچا تو پکارا گیا" "اے موسیٰ! میں ہی تیرا رب ہوں' جوتیاں اتار دے' تو وادی مقدس طویٰ میں ہے اور میں

نے تجھ کو چن لیا ہے' سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے - میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے' پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر - قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے - میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے - پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے' ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا"۔

انسان کا خون خشک ہو جاتا ہے اور جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے - محض اس منظر کے تصور سے' ایک غیر آباد پہاڑی پر موسیٰ اکیلے کھڑے ہیں - تاریک اور سیاہ رات ہے - ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا' مہیب اور خوفناک خاموشی ہے' طور کے دامن سے انہوں نے آگ دیکھی تھی' وہ اس کی تلاش میں نکلے تھے' لیکن ان کو ہر طرف سے پوری کائنات کی طرف سے یہ ندا آ رہی ہے :

إِنِّيٓ أَنَا۠ رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (١٢) وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰٓ (١٣) (٢٠: ١٢ - ١٣) "اے موسیٰ میں تیرا رب ہوں' جوتیاں اتار دے' تو وادی مقدس طویٰ میں ہے اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے"۔

یہ چھوٹا سا ذرۂ ناچیز' یہ محدود بشر لامحدود رب ذوالجلال کے سامنے کھڑا ہے' جسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی - وہ عظمت و جلال جس کے مقابلے میں یہ نظر آنے والی کائنات زمین و آسمان سب حقیر ہیں یہ ذرۂ ضعیف' انسانی قوائے مدرکہ کے ساتھ' ایک لامحدود ذات کے ساتھ مربوط ہو گیا' اس کی آواز سن رہا ہے' کس طرح؟ اللہ کی خاص رحمت سے' ورنہ کیسے ممکن ہے - محدود اور لامحدود کا اتصال؟

پوری انسانیت اب موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں اٹھائی جا رہی ہے' سربلند کی جا رہی ہے کہ ایک لمحے کے لئے وہ بشری شخصیت کو لئے ہوئے یہ لامحدود فیض وصول کر رہی ہے - اس انسانیت کے لئے کیا یہ کوئی کم شرف ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا اتصال اور رابطہ' اس انداز میں' رب ذوالجلال کے ساتھ ہو گیا' لیکن ہم نہیں جانتے کہ کیونکر ہو گیا یہ؟ کیونکہ انسانی قوائے مدرکہ اس حقیقت کا نہ ادراک کر سکتی ہیں اور نہ اس بارے میں کوئی فیصلہ دے سکتی ہیں - انسان کی قوائے مدرکہ کا بس یہ کام ہے کہ وہ حیران رہ کر اپنے قصور کا اعتراف کریں' ایمان لائیں اور شہادت دیں کہ یہ حق ہے -

فَلَمَّآ أَتَىٰهَا نُودِيَ يَٰمُوسَىٰٓ (١١) إِنِّيٓ أَنَا۠ رَبُّكَ (١٢) (٢١: ١١ - ١٢) "جب وہاں پہنچا تو پکارا گیا اے موسیٰ' میں ہی تیرا رب ہوں"۔ پکارا گیا' ماضی مجہول کا صیغہ استعمال ہوا - کیونکہ آواز کے مصدر اور جہت کا تعین ممکن نہیں ہے - نہ آواز کی صورت اور کیفیت کا تعین ممکن ہے - نہ اس بات کا تعین ممکن ہے کہ کس طرح سنا اور کس طرح سمجھے - پکارا گیا جس طرح پکارا گیا اور انہوں نے سمجھا جس طرح سمجھا - کیونکہ یہ اتصال ان امور میں سے ہے جن پر ہم ایمان لاتے ہیں کہ ایسا ہوا مگر اس کی کیفیت کے بارے میں نہیں پوچھتے کیونکہ یہ کیفیت انسانی قوت مدرکہ اور انسانی دائرہ تصور سے وراء ہے -

اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۲۰ : ۱۲) "اے موسیٰ! میں ہی تیرا رب ہوں' جوتیاں اتار دے تو وادی مقدس طویٰ میں ہے"۔ تم بارگاہ رب العزت میں ہو' اس لئے پاؤں سے جوتے اتار دو تاکہ تم ننگے پاؤں آؤ' ایک ایسی وادی میں جس پر پاکیزہ انوار کا نزول ہو رہا ہے۔ اس لئے اس وادی کو اپنے جوتوں سے نہ روندو۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ (۱۳) "اور میں نے تجھ کو چن لیا"۔ ماشاء اللہ کیا اکرام ہے! اللہ بذات خود انتخاب فرما رہے ہیں۔ اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو' انسانوں کے ہزار ہا گروہوں میں سے صرف ایک فرد کو' یہ فرد اللہ کے پیدا کردہ ستاروں میں سے ایک ستارے پر رہتا ہے' جو بہ نسبت پوری کائنات کے ایک ذرہ ہے۔ وہ کائنات جو صرف کن کے حکم کے نتیجے میں وجود میں آگئی لیکن یہ اس ذات باری کی ذرہ نوازی ہی تو ہے۔

اس اعزاز اور انتخاب کے بعد اور جوتے اتار کر بارگاہ رب العزت میں حاضری اور اخذ وحی کی تیاری و استعداد کے بعد حکم آتا ہے کہ اب سنو' باران رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۱۳) "سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے"۔ جو پیغام دیا جا رہا ہے' وہ تین مربوط امور پر مشتمل ہے۔ عقیدۂ توحید' توجہ سے اللہ کی بندگی اور آخرت کی جوابدہی کا احساس اور اس کی تیاری۔ یہ نکات تمام رسالتوں کا نصب العین رہے ہیں جو ایک ہی نوعیت رکھتی ہیں۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۱۴) اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰي كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰي (۱۵) فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰي (۲۰ : ۱۶)(۲۰ : ۱۴ — ۱۶) "میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔ میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے' پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا' تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا"۔

یہ کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اسلامی نظریہ حیات کا بنیادی عنصر ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود پکار کر موسیٰ علیہ السلام کو جو پیغام دیا' اس میں اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ ہمہ جہت تاکید۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ میں لفظ ان تاکیدی' پھر انا تاکیدی' مبتدا و خبر کی حصر تاکیدی' پھر نفی و اثبات کی تاکیدی حصر

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (۱۴) جس میں اللہ کی الوہیت کا اثبات اور تمام غیر اللہ کی الوہیت کی نفی ثابت کی گئی ہے۔ پھر الوہیت کے ثبوت کے بعد اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور بندگی کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں صرف

اللہ کی طرف توجہ کی جائے لیکن عبادات میں سے نماز کو یہاں خصوصی طور پر لیا گیا ہے ـ

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۱۴) "میری یاد کے لئے نماز قائم کر" ـ نماز دراصل عبادت کی ایک مکمل صورت ہے اور ذکر الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے ـ کیونکہ اس کا فنکشن ہی اللہ کی یاد کو تازہ رکھنا ہے ـ اس میں انسان یاد الٰہی کے سوا تمام باتوں سے کٹ جاتا ہے ـ صرف یاد الٰہی پیش نظر رہ جاتی ہے اور کچھ دیر کے لئے انسان اللہ سے مربوط ہو جاتا ہے ـ

رہی قیامت تو وہ پوری زندگی کی جوابدہی کا ایک عادلانہ وقت حساب و محاسبہ ہے ـ لوگ آخرت کی طرف جب متوجہ ہوتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اس کا خیال رکھتے ہیں اور زندگی کی پر پیچ راہوں میں ٹھوکروں اور پھسلن سے بچتے ہیں ـ قیام قیامت کی قرآن کریم میں بار بار تاکید کی گئی ہے ـ بار بار کہا گیا ہے ـ

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ (۱۵) "قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے" ـ اللہ نے اس کے قیام کے وقت اور تاریخ کو مخفی رکھا ہے ـ لہٰذا اس کے قیام کے بارے میں ہمارا علم اسی قدر ہے جس قدر اللہ نے ہمیں دیا ہے ـ اللہ نے اس کے بارے وہی کچھ علم دیا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق ہے ـ بعض چیزوں سے لاعلمی انسانی زندگی کو مناسب طریقے سے چلانے کے لئے بہت ہی اہم ہے لہٰذا اللہ نے بعض چیزوں کو جان بوجھ کر انسانوں سے مجہول رکھا تاکہ وہ حصول علم کے لئے تگ و دو کرتے رہیں ـ اگر تمام امور کے بارے میں اللہ انسان کو قبل از وقت علم دے دیتا اور انسان ایسے ہی ہوتے جس طرح کہ ان کی فطرت اس وقت ہے 'تو ان کی زندگی کی گاڑی رک جاتی اور زندگی جمود کا شکار ہو جاتی کیونکہ انسان کی جدوجہد ایک مجہول اور نامعلوم مستقبل کے لئے ہے ـ وہ احتیاط کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں 'امید رکھتے ہیں 'تجربے کرتے ہیں ' نئی نئی معلومات حاصل کرتے ہیں ـ اپنی خفیہ قوتوں کو کام میں لاتے ہیں ـ ان کے ارد گرد کائنات میں پھیلی ہوئی قوتوں کے بارے میں وہ ہر وقت کھوج لگاتے ہیں اور اپنے نفسوں اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں وہ نشانات الٰہیہ کو دریافت کرتے ہیں ـ وہ زمین میں اللہ کی مشیت کے مطابق نئی نئی ایجادات کرتے ہیں اور ان کے دل قیام قیامت کے ساتھ لٹکے ہوتے ہیں 'جس کے قیام کا وقت انہیں معلوم نہیں ہے ـ یہ تصور ان کو بے راہ روی سے بچاتا ہے ـ وہ نہیں جانتے کہ قیامت کب آئے گی ' اس لیے ہر لمحہ وہ اس کے قیام کی توقع کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں ـ یہ تو ان لوگوں کی بات ہے جو صحیح الفطرت ہوں ' ان کی فطرت مستقیم ہو ' رہے وہ لوگ جن کی فطرت میں بگاڑ ہو ' جو خواہشات نفس کے بندے ہوں ' تو وہ غافل اور جاہل ہو جاتے ہیں ' ایسے لوگ زندگی کی پر پیچ راہوں میں کسی گڑھے میں گر جاتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں ـ

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْہَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِہَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰہُ فَتَرْدٰی (۲۰ : ۱۶) "پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہو تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے" ـ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی خواہشات نفس کے بندے ہوتے ہیں ' وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں ـ ایک صحیح الفطرت انسان تو یہی سوچتا ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں انسان کمال تک نہیں پہنچ سکتا ـ اس میں مکمل عدل کا قیام ممکن نہیں ـ اس لئے اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ضروری ہے جس میں مطلوبہ کمال حاصل کیا جا سکے ـ جس میں ہر انسان کو اس کے اعمال

کے مطابق پوری پوری جزاء و سزا دی جاسکے۔

یہ تو تھی اس آسمانی پکار کی پہلی اہم بات، جس کی تائید میں موسیٰ ؑ کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات ان کے ہمرکاب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عقیدہ توحید کی بنیادیں سکھائیں۔ حضرت موسیٰ ؑ کو اچانک جس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا، ظاہر ہے کہ وہ اس موقع پر اپنی ذات اور وادی طویٰ میں آنے کی غرض و غایت اور اپنے پسماندگان سب کو وہ بھول گئے ہوں گے۔ وہ ہمہ تن اس نئی صورت حال کی طرف ہی متوجہ ہوں گے۔ گھبراہٹ اور خوف میں مزید کچھ سننے کے منتظر ہوں گے۔ وہ اس سوچ ہی میں گم تھے اور ان کے جسم کا ذرہ ذرہ عالم بالا کی طرف متوجہ تھا کہ اچانک ان پر ایک سوال ہوتا ہے۔ ایک بہت آسان سوال جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾

"اور اے موسیٰ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا؟" موسیٰ نے جواب دیا "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو میں اس سے لیتا ہوں"۔

سوال ہوتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا؟ حضرت موسیٰ ؑ تو اپنے حال میں نہ تھے۔ دیکھ کر بتایا کہ عصا ہے۔ سوال میں یہ نہ تھا کہ عصا کے فوائد کیا ہیں؟ صرف یہ تھا کہ ہاتھ میں کیا ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ نے یہ سمجھا کہ جو ہاتھ میں ہے، اس کی ماہیت تو نہیں پوچھی جاتی، ماہیت تو واضح ہے، بلکہ عصا کے فوائد پوچھے جارہے ہیں، اس لئے انہوں نے فوائد گنوا دیئے، جو فوائد حضرت موسیٰ جانتے تھے، وہ بتا دیئے کہ وہ اس کا سہارا لیتے ہیں، اس کے ذریعہ درختوں کے پتے جھاڑتے ہیں تا کہ بکریاں کھالیں۔ آپ حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واپسی کے وقت حضرت موسیٰ کے ساتھ بکریوں کا ایک گلہ بھی تھا، جو ان کے حصے میں آئی تھیں، الا یہ کہ یہ عصا اس قسم کے دوسرے مقاصد میں بھی استعمال ہوتا ہے، ان کا ذکر انہوں نے اشارۃً کر دیا کہ اس میں اور بھی فوائد ہیں۔

لیکن ذرا آگے دیکھو کہ قدرت خداوندی اس عصا سے وہ کچھ کام لینا چاہتی ہے جس کا کبھی موسیٰ ؑ نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ یہ تجربہ ان کو اس لئے کرایا جاتا ہے کہ وہ فرعون کے دربار میں بے دھڑک ہو کر جائیں۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ٚ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾

"فرمایا پھینک دے اس کو موسیٰ"۔ اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھی جو دوڑ رہا تھا۔ فرمایا "پکڑ لے

اس کو اور ڈر نہیں' ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی"۔

یہ خارق عادت معجزہ ظہور پذیر ہو گیا' یہ معجزہ اس کائنات میں ہر لحہ ہر طرف ظاہر ہوتا رہتا ہے' لیکن لوگوں کی سوچ اس طرف نہیں جاتی۔ یعنی "زندگی" کا معجزہ۔ ایک عصا سانپ بن گئی۔ اس دنیا میں ہر سیکنڈ میں عصا کی طرح اربوں مردہ ذرے زندگی پاتے ہیں اور زندہ خلیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں لیکن انسان انہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح وہ ایک بڑی عصا کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اس لیے کہ انسان اپنے حواس کا بندہ اور اپنے تجربات کا قیدی ہے۔ وہ اپنے تصورات میں حواس کے دائرے سے آگے جانے کی تکلیف نہیں کرتا۔ ایک عصا کا زندہ ہو کر سانپ بن جانا اور پھر چلنا انسانی احساس کو شدت سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے' لیکن وہ خلیسے جو زندگی کے پہلے معجزے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور وہ مظاہر جو ہر لحہ اربوں ذرات کے زندہ خلیوں کی شکل اختیار کرنے میں پیش آتے ہیں۔ یہ خفیہ یا باریک ہیں۔ اور انسان ان کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔ پھر جو لوگ ان کا ملاحظہ بھی کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے وہ ان مناظر کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ ان سے متاثر ہی نہیں ہوتے اور غفلت کے ساتھ ان مناظر پر سے گزر جاتے ہیں۔

یہ معجزہ جب رونما ہوا تو موسیٰ ششدر رہ گئے' بلکہ ڈر گئے اور اللہ کو کہنا پڑا خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (۲۰: ۲۱) "پکڑ لے اس کو اور ڈرو نہیں' ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے"۔ یعنی عصا..... یہاں قرآن مجید نے ایک بات کا ذکر نہیں کیا جو دوسری جگہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام بھاگ کھڑے ہوئے اور پیچھے نہ دیکھا۔ یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ نہ ڈرو' یہ اس لیے کہ اس سورہ کی فضا اور مناظر میں امن' اطمینان' سکون اور وقار چھایا ہوا ہے لہٰذا اس میں یہ مناسب نہیں ہے کہ اسٹیج پر جزع و فزع دکھایا جائے اور کوئی بھاگ کھڑا ہو۔

حضرت موسیٰ مطمئن ہو گئے' عصا کو لیا تو سانپ پھر عصا تھا۔ یہ معجزہ اب دوسری شکل میں ظاہر ہو گیا۔ ایک زندہ چیز کو مردہ بنایا گیا۔ اچانک زندہ رینگنے والی چیز مردہ اور عصا کی شکل میں آگئی۔ جس طرح کہ پہلے معجزے سے قبل تھی۔ ایک بار پھر موسیٰ کو عالم بالا سے حکم ملتا ہے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾

"اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے' یہ دوسری نشانی ہے"۔

موسیٰ نے ہاتھ اپنی بغلوں میں دبائے۔ یہاں قرآن کریم نے ہاتھ اور بغل کے لئے پر کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ پروں میں خوبصورتی اور حرکت ہے' ہلکا پن ہے اور یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں انسانیت زمین کی بوجھل فضا سے ہلکی ہو کر عالم بالا کی طرف پرواز کر رہی ہے اور یہ ہاتھ سفید ہو کر نکلے' مرض کی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ معجزانہ سفید بغیر بیماری کے سفید ہو گا۔ اور عصا کے بعد یہ دوسری نشانی ہو گی آپ کی نبوت کی سچائی پر۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ ع ۲

"اس لئے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا' وہ سرکش ہو گیا ہے"۔

یہ نشانیاں اور معجزات جس کا حسن اظہار ہو رہا ہے اے موسیٰ پہلے آپ کو دکھائی جا رہی ہیں تاکہ تم مطمئن ہو کر اور ان سے مسلح ہو کر فرعون کے پاس جاؤ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس عظیم مہم اور اس عظیم منصب کے لئے چن لئے گئے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ فرعون کون ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی اس کے گھر میں تھے' اس کی سرکشی اور سخت دار و گیر سے وہ واقف تھے۔ وہ بنی اسرائیل پر جو مظالم ڈھا رہا تھا اس سے بھی وہ واقف تھے' وہ اس وقت چونکہ بارگاہ رب العزت میں پہنچے ہوئے ہیں' سمجھتے ہیں کہ ان کو بڑا اعزاز مل چکا ہے اور وہ ایک بہت ہی معزز بندے ہیں لہٰذا ان کے دل میں یہ بات آگئی کہ یہ موزوں وقت ہے کہ وہ اس مہم کے لئے ضروری ساز و سامان اسی وقت طلب کر لیں تاکہ وہ پوری طرح لیس ہو کر فرعون کے پاس جائیں۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾

"موسیٰ نے عرض کیا: "پروردگار' میرا سینہ کھول دے' اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے لئے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون' جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے' تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران رہا ہے"۔

اس نازک موقعہ پر حضرت موسیٰ نے یہ درخواست کی کہ اے اللہ' میرے سینے کو اس کام کے لئے کھول دے۔ جب انسان کو شرح صدر حاصل ہو جائے تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اس میں انسان کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے انسان کی زندگی ہلکی ہو جاتی ہے۔ اس پر کوئی بوجھ نہیں رہتا اور انسان سبک رفتاری سے زندگی بسر کرتا ہے۔

انہوں نے یہ درخواست بھی کی کہ اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ کی زبان میں لکنت تھی' راجح بات یہ ہے کہ ان کا سوال اس لکنت کو دور کرنے کے بارے میں تھا۔ دوسری سورہ میں اس کے بارے میں یوں آیا ہے

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا "اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں"۔

اس سے قبل وہ ایک عمومی دعا کر چکے تھے کہ اللہ مجھے شرح صدر عطا کر اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔اس عمومی دعا اور مطالبہ کے بعد یہ خصوصی درخواست تھی تاکہ اس کام کے سلسلے میں آپ کو تمام سہولتیں حاصل ہو جائیں۔

پھر آپ نے یہ درخواست کی کہ میرے خاندان میں سے میرا ایک معاون اور مددگار بھی مجھے عطا کر دے ' ہارون میرے بھائی' وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان 'مضبوط دل والے اور مضبوط اعصاب کے مالک ہیں 'جبکہ حضرت موسیٰؑ زیادہ جذباتی 'تیز مزاج اور جلد متاثر ہونے والے تھے۔چنانچہ انہوں نے یہ درخواست کی کہ ان کو یہ معاون دے دیں تاکہ ان کی قوت اور فعالیت میں اضافہ ہو 'وہ ان کے لئے قوت کا باعث ہوں 'مشیر ہوں کیونکہ یہ مہم بہت ہی عظیم ہے۔

یہ مہم جسکے لئے وہ بھیجے جا رہے ہیں وہ ذکر کثیر اور تسبیح وثنا کثیر کی محتاج ہے 'اس میں اللہ کے ساتھ مضبوط رابطہ ضروری ہے۔اس لئے انہوں نے شرح صدر تیسیر امر 'زبان کی گرہ کھولنے ' معاون اور بھائی کو وزیر مقرر کرنے کے مطالبے کیے۔یہ سب درخواستیں ایسی نہ تھیں کہ وہ براہ راست اس مہم کو آگے بڑھائیں۔بلکہ یہ چیزیں اس مہم کی تیاری کے مرحلے کے لئے ضروری تھیں۔یہ چیزیں انہیں اور ان کے بھائی کو اس کام کے لئے تیار کر رہی تھیں۔تسبیح کثیر' ذکر کثیر 'علم کثیر 'اور زبان کی صفائی اور اللہ سے علوم کا اخذ 'یہ سب تیاری کے مراحل ہیں۔

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا (۲۰ : ۳۵) "تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران ہے"۔آپ کو ہمارا حال اچھی طرح معلوم ہے ہم ضعف و قصور رکھتے ہیں اور آپ کو ہماری ضروریات کا اچھی طرح علم ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے بہت ہی طویل سوال کیا اور اپنی ضروریات بتائیں۔اپنی کمزوری کا اظہار کیا' مدد' سہولیات اور مسلسل رابطے کی ضرورت کا ذکر کیا۔رب تعالیٰ تو سنتا ہے اور جانتا ہے۔آپ کے سامنے موسیٰ ضعیف ہیں۔مانگتے ہیں اور بات کرتے جاتے ہیں۔تو رب ذوالجلال اپنے مہمان کو شرمندہ نہیں فرماتے 'کوئی سوال رد نہیں کرتے 'منظوری میں دیر بھی نہیں کرتے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝

"فرمایا" دیا گیا جو تو نے مانگا اے موسیٰ!"۔ایک ہی فقرہ میں تمام سوالات منظور' ایک ہی اجمالی آرڈر کر دیا گیا۔تفصیلات دینے کی ضرورت ہی نہیں۔وعدہ بھی نہیں بلکہ فائنل منظوری بلکہ دستی تعمیل۔جو مانگا وہی دے دیا گیا۔نہ دیر اور نہ بار بار کا مطالبہ۔درخواست کی منظوری کے ساتھ ساتھ لطف و کرم کا اظہار بھی ہے' تعظیم و تکریم بھی ہے 'پھر محبت کا اظہار یوں نام لے کر (اے موسیٰ) اس سے بڑھ کر تکریم اور کیا ہو سکتی ہے۔کہ پوری کائنات کی مجلس میں اللہ ایک بندے کا نام لے کر اس کے مطالبے منظور کرے۔

یہاں تک آپ نے دیکھا کہ اللہ کے فضل و کرم کی تکمیل کس قدر ہو چکی ہے 'محبت اور بے تکلفی کی باتیں ہو چکیں۔طویل عرصے تک تجلی قائم رہی 'مناجات ہوتی رہی ' تمام درخواستیں منظور اور فوراً تعمیل ہو گئی 'لیکن ان کے فضل پر کوئی داروغہ نہیں ہے۔اور اللہ کی رحمتوں پر کوئی کنٹرول کرنے والا نہیں ہے۔اللہ اس بندے پر مزید فضل کرنا چاہتے ہیں 'اپنی رضامندی کا یہ فیض ان پر طویل تر کرتے جاتے ہیں۔اس دربار میں ان کی حاضری کا وقت مزید بڑھا دیا جاتا ہے۔اللہ

اب موسیٰؑ پر اپنی سابقہ مہربانیاں گنوا کر ان کے ساتھ مزید ہمکلام ہونا چاہتے ہیں کہ ان کو مزید اطمینان ہو' وہ مزید بے تکلف ہو جائیں' اللہ اپنی رحمتوں اور قدیم مہربانیوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں ۔اس دربار عالیہ میں ان کے لقاء کے وقت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے وہ ان کے لئے سرمایہ زندگی ہے اور باعث افتخار ہے ۔وہ ایک نہایت ہی روشن اور مقدس مقام پر کھڑے ہیں ۔سنئے :

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰٓ ﴿٣٧﴾ إِذْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰٓ ﴿٣٨﴾ أَنِ ٱقْذِفِيهِ فِى ٱلتَّابُوتِ فَٱقْذِفِيهِ فِى ٱلْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ ٱلْيَمُّ بِٱلسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّى وَعَدُوٌّ لَّهُۥ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّى وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِىٓ ﴿٣٩﴾ إِذْ تَمْشِىٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ﴿٤٠﴾ وَٱصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِى ﴿٤١﴾

"ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا۔یاد کر وہ وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا' ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے کہ اس بچے کو صندوق میں رکھ دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے ۔دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا اور اسے میرا دشمن اور اس بچے کا دشمن اٹھالے گا۔میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے ۔یاد کر جبکہ تیری بہن چل رہی تھی' پھر جا کر کہتی ہے' میں تمہیں اس کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے؟ اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو۔اور (یہ بھی یاد کر کہ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا' ہم نے تجھے اس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے گزارا اور تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا۔پھر اب ٹھیک اپنے وقت پر تو آگیا ہے اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنے کا کام بنالیا ہے"۔

حضرت موسیٰؑ ایک ایسے بادشاہ کے دربار میں پیغام حق پہنچانے کے لئے جا رہے ہیں جو اس وقت اس کرۂ ارض پر نہایت ہی سرکش' ظالم اور داروگیر بادشاہ تھا۔وہ کفر و ایمان کے معرکہ میں داخل ہو رہے تھے' وہ پہلی بار فرعون کے دربار میں جا رہے تھے ۔وہاں ان کے لئے مسائل' واقعات اور مشکلات کے پہاڑ کھڑے تھے ۔پھر ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ ایک طویل عرصہ ذلت اور غلامی کی زندگی گزارتے گزارتے وہ اس کے خوگر ہو گئے تھے ۔ان کی فطرت ہی بدل گئی

موسیٰ اگر اپنی مہم میں کامیاب ہوئے بھی تو ان کی قوم اس آزادی کے لئے نہ موزوں ہے نہ تیار۔ ان کے رب ان کو بتاتے ہیں کہ تمہیں تیاری کے بعد بھیجا جا رہا ہے اور وہ کسی بھی رسول کو جب بھیجتے ہیں تو تب بھیجتے ہیں کہ اس کے ارسال کے لئے اسٹیج تیار ہوتا ہے۔ یہ کہ اے موسیٰ تمہاری تربیت بھی ہم ایک عرصہ سے اپنی نگرانی میں کر رہے ہیں۔ جب تم دودھ پیتے بچے تھے تب سے ہم نے تمہیں تربیت دینا شروع کی ہے۔ اس ضعف و ناتوانی کی حالت میں اللہ کا فضل تمہارے شامل حال رہا ہے۔ تم فرعون کے ہاتھ میں تھے۔ تمہارے پاس کوئی قوت نہ تھی لیکن یہ اللہ ہی کی حکمت تھی جس نے فرعون کی دست درازیوں سے تمہیں بچایا۔ یہ دست قدرت تھا جو تمہاری مدد کر رہا تھا۔ اللہ کی نظروں میں تم تھے۔ قدم قدم پر تمہاری نگرانی اور نگہبانی ہو رہی تھی۔ لہٰذا آج بھی فرعون تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔ آج تو تم جوان ہو۔ رب تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہو گیا ہے اور تم اس کی بارگاہ میں ہو۔ اور میں نے تمہیں خود اپنے مشن کے لئے پیدا کیا ہے اور تربیت دی ہے اور چنا ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰي (۲۰: ۳۷) "ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا"۔ تم پر تو زمانہ قدیم سے مسلسل مہربانیاں ہو رہی ہیں۔ ایک عرصے سے اللہ کی مہربانی اور فضل تمہارے شامل حال ہے اور اس مشن کی سپردگی کے بعد تو یہ مسلسل جاری رہے گا۔

دیکھو، تم پر یہ احسان کیا کم تھا کہ فرعون بچوں کو قتل کر رہا تھا اور ہم نے تیری ماں کو یہ الہام کیا کہ

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۰: ۳۹) "ہم نے تیری ماں کو اشارہ دیا، ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے کہ "اس بچے کو صندوق میں رکھ دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا"۔ یہ ایسے افعال ہیں جن میں سختی پائی جاتی ہے، بچے کو تابوت میں گرانا، تابوت کو نذر سمندر کرنا، سمندر کی طرف سے اسے ساحل پر پھینک دینا اور پھر کیا؟ یہ تابوت اب کہاں جائے گا، اس میں بچہ پھینکا گیا ہے، تابوت سمندر کی لہروں کے کرم پر ہے۔ لہریں اسے ساحل پر پھینک دیتی ہیں۔ کون اب اسے لے گا؟

عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ (۲۰: ۳۹) "اسے میرا دشمن اور اس بچے کا دشمن اٹھا لے گا"۔

ان خطرات کے ہجوم میں اور ان صدمات کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس ضعیف، ناتوان اور بے بس بچے کو جو تابوت میں قید ہے، کیا پیش آتا ہے؟ کون اسے بچاتا ہے۔

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ (۲۰: ۳۹) "میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے"۔ اے قادر مطلق تیری قدرت کے کیا کرشمے ہیں کہ تو اس ناتواں پر محبت کا پردہ ڈال دیتا ہے، نرم و نازک محبت اس کے لئے دفاع بن جاتی ہے۔ تمام ضربات کو یہ سہ لیتی ہے اور ڈھال بن جاتی ہے، موجوں کے تھپیڑے آکر رک جاتے ہیں۔ شر اور سرکشی کی تمام قوتیں دیکھتے ہی موم ہو

جاتی ہیں ۔ اور کوئی اسے بری نظروں سے دیکھتا ہی نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ ایک طفلک ناتواں ہے ۔ دودھ پینے والا ' نہ چل پھر سکتا ہے ' نہ اپنا دفاع و بچاؤ کر سکتا ہے بلکہ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا ۔

اس منظر کی تصویر میں نمایاں طور پر دو باہم متضاد رنگ ہیں ۔ ایک طرف ایک قہار و جبار اور سرکش قوت ہے جو اس بچے کے قتل کے درپے ہے ۔ ماحول اس قدر کشیدہ اور سخت ہے کہ ہر طرف ورشکستگی ' ظلم ' تابوت ' امواج اور سمندر ہے ' دوسری طرف محبت کی مہین چادر ہے جو اس بچے کے اوپر بچھ گئی ہے ۔ محبت کی چادر ' اللہ کے لطف و کرم کی یہ چادر ! یہ اسے ہر خطرے سے بچاتی چلی جاتی ہے ۔ سمندر ' تابوت ' اور موجوں کی سختی سے اور حکمرانوں کی گرفت سے بھی ۔ موسیٰ کے پاس کوئی لاؤ لشکر نہیں ہے بلکہ اس بچے کے چہرے پر قدرتی کشش ہے ۔

وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ (۲۰ : ۳۹) "کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے" ۔ اس گہرے سایہ عاطفت اور اس دست قدرت کے کرشموں کی کیا تشریح کوئی کرے ۔ قرآن کی یہ تعبیر کہ "تم میری آنکھوں میں پلو" ۔ یہ ایک نہایت ہی معجزانہ انداز تعبیر ہے ۔ ایک انسان اللہ تعالیٰ کی آنکھوں میں پل رہا ہے ۔ انسان اس تعبیر کے پیچھے جو معانی ہیں ان کا تصور کرنے سے قاصر ہے ۔ یہ ایک اونچا مقام ہے ' اعزاز و تکریم ہے کہ کوئی انسان ایک لمحہ کے لئے یہ نظر کرم پالے ' لیکن اس شخص کی خوش نصیبی دیکھئے کہ وہ کسی کی زیر نگرانی میں پل رہا ہے ۔ یہ وہ کرم تھا جس کی وجہ سے موسیٰ کے اندر یہ قوت پیدا ہوئی وہ تجلیات کا متحمل ہو سکے اور اللہ سے ہمکلام ہو کر اس لامحدود ذات سے ہدایات اخذ کر سکے ۔

تاکہ تم میری نگرانی میں پلو ۔ ہم دونوں کے دشمن فرعون کی نظروں میں پلو ' بغیر کسی چوکیدار اور محافظ کے عین دشمن کے دونوں ہاتھوں کے اندر پلو ' دشمن کی آنکھ تمہاری طرف میلی نہیں ہوتی کیونکہ تم اس کی آنکھ کا تارا بن گئے ہو ۔ اس کا ہاتھ برے ارادے سے آگے نہیں بڑھتا ' کیوں ؟ اللہ کی نظر ہے ۔

دیکھو میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ فرعون کے گھر تم مزے سے رہو اور تمہاری ماں گھر میں بے تاب ہو اور ہر وقت خوف اور قلق میں مبتلا ہو ۔ میں نے تم دونوں کو باہم ملا دیا ۔

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓي اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ (۲۰ : ۴۰) "یاد کرو جب تمہاری بہن چل رہی تھی ' پھر جا کر کہتی ہے "میں تمہیں اس کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے ۔ اس طرح ہم نے تجھے پھر اپنی ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو" ۔ اس سلسلے میں اللہ کی تدبیر یوں تھی کہ بچہ کسی دودھ پلانے والی کا پستان منہ میں نہ لیتا تھا ۔ فرعون اور اس کی بیوی نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا ۔ کسی ایسی عورت کی تلاش میں تھے جو اس بچے کی پرورش کرے ' جس کو دریا نے ساحل پر پھینک دیا تھا ۔ لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور موسیٰ کی بہن ماں کی طرف سے اشارہ پاکر کہتی ہے کہ میں تمہیں بتاؤں جو اس کی پرورش اچھی طرح کرے ۔ یوں اس کی ماں وہاں پہنچ جاتی ہے اور وہ اس کے پستان کو منہ میں لے لیتے ہیں ۔ یوں اللہ کی تدبیر اپنے انجام تک پہنچی ہے کہ ماں جس نے الہامی اشارہ پاکر بچے کو صندوق میں بند کر کے سمندر کے اندر بہا دیا تھا اور سمندر کی لہروں نے اسے ساحل پر پھینک دیا تھا ' بچہ پھر اس ماں کی جھولی میں

ہے۔ اللہ اس کے بچے کو دشمن سے لے کر ماں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یوں اس کی پرورش کا محفوظ انتظام کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے فرعون کے خطرے سے بھی بچا لیا جاتا ہے' جو بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ دشمن خود اسے بچا رہا تھا۔ ایک دوسرا احسان وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (٤٠) وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (٤١) (٢٠: ٤٠ – ٤١)
"اور تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا' ہم نے تجھے اس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے نکالا اور تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا۔ پھر ایک ٹھیک وقت پر تو آ گیا ہے' اے موسیٰ۔ میں نے تجھے اپنے کام کا بنا لیا ہے"۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب قصر فرعون میں موسیٰ جوان ہو گئے۔ ایک دن وہ شہر میں تھے کہ ایک مصری اور ایک اسرائیلی کی باہم تکرار ہو گئی۔ اسرائیلی نے موسیٰ سے مدد چاہی اور حضرت موسیٰ نے جلدی میں مصری کو ایک مکہ رسید کر دیا۔ آپ قتل کرنا نہیں چاہتے تھے' صرف اسے دور کرنا چاہتے تھے۔ اس فعل پر آپ بہت رنجیدہ ہو گئے کیونکہ وہ اللہ کی تربیت میں چل رہے تھے' ان کے ضمیر نے ان کو ملامت کی کہ تم نے گناہ کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اللہ نے حضرت موسیٰ کو استغفار سکھایا ہو اور ان کے دل سے یہ کدورت دور ہو گئی ہو' لیکن اس کے باوجود اللہ نے موسیٰ کو بغیر آزمائش اور ابتلا کے نہیں چھوڑا کیونکہ اللہ نے حضرت موسیٰ سے اونچا کام لینا تھا۔ اس لیے خوف' اور ملک چھوڑنے اور قصاص سے بچنے کی مشقت میں ڈالا۔ مسافری' اہل و عیال سے دوری' وطن سے دوری کی مشقتوں میں ڈالا۔ پھر ملازمت اور بھیڑیں چرانے کا مشکل کام لیا۔ اور یہ اس شخص سے لیا گیا جو فرعون کے شاہی محل میں پلا ہے' جو اپنے دور کا شہنشاہ اعظم تھا۔ اور اس کے دربار میں بہت بڑے عیش اور اس کے گھر میں تمام سہولیات تھیں جن کا تصور بھی عام لوگ نہ کر سکتے تھے۔

پھر ایک مقررہ وقت پر' جب ان کی تربیت ہو گئی' وہ پختہ ہو گئے۔ ان ابتلاؤں میں انہوں نے صبر سیکھ لیا۔ امتحان میں پاس ہو گئے' مصر میں حالات ان کے لئے ساز گار ہو گئے۔ بنی اسرائیل پر مظالم انتہا کو پہنچ گئے۔ اس مقررہ وقت پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپس بلایا حالانکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ خود آ رہے ہیں۔

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (٢٠: ٤٠) "تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا' پھر ایک ٹھیک وقت پر تو آ گیا ہے اے موسیٰ"۔ یعنی ایسے وقت میں جو میں نے تیرے لیے مقرر کیا تھا۔ تجھے اپنی نگرانی میں پالا تھا۔ خالص اپنے لئے' اپنے مشن کے لئے اور دعوت کے لئے۔ اس لئے تیری زندگی میں کوئی چیز نہ اس دنیا سے ہے اور نہ اس دنیا کے لئے ہے۔ تیرا سب کچھ میری طرف سے ہے اور اب تو میرے مشن کے لئے ہے۔ تیری حفاظت' تیری تربیت اور اب تیرا مشن بھی میرا مشن ہے۔ اس لئے تیرے نفس میں نہ تیرا حصہ ہے' نہ کسی اور کا کوئی حصہ ہے' نہ تیرے اہل و عیال اور رشتہ داروں کا کوئی حصہ ہے۔ لہٰذا جس چیز کے لئے میں نے تمہیں تربیت دی ہے' جس مشن کے لئے میں نے تمہیں تیار کیا ہے' آپ اس کے لئے اب چل پڑیں۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾

"جا' تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ ۔ اور دیکھو' تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔ جاؤ' تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے ۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے" ۔

تم اور تمہارے بھائی دونوں میرے معجزات کے ساتھ مسلح ہو کر جاؤ' ان میں سے معجزۂ عصا اور ید بیضا کا مشاہدہ تو کرایا جا چکا ہے ۔ تم میرے ذکر میں سستی نہ کرنا کیونکہ یہ اس میدان میں تمہارے لئے اہم سازو سامان ہے' یہ تمہارا بڑا اسلحہ اور سہارا ہے اور مشکلات کے وقت یہی تمہارے لیے جائے پناہ ہوگی۔ جاؤ تم فرعون کے پاس ۔ اس سے قبل میں نے تم کو فرعون کے شر سے محفوظ کیا ہے جبکہ تم ایک بچے تھے ۔ جسے تابوت میں بند کر کے سمندر کی نذر کر دیا گیا تھا اور سمندر نے اسے ساحل پر پھینک دیا تھا تو ان مشکلات نے تمہیں کوئی نقصان نہ دیا۔ ان خوفناک حالات میں تمہیں کوئی اذیت نہ دی گئی۔ اب تو تم تیاریوں کے ساتھ اس دربار میں جا رہے ہو' تمہارے ساتھ تمہارے بھائی بھی ہیں ۔ اس لیے پرواہ مت کرو۔ جبکہ ایسے مشکل حالات میں بھی ہم نے تمہیں نجات دی ہے۔

فرعون کے پاس رسالت لے کر جاؤ' وہ بڑا سرکش' جبار اور سرپھرا ہے ۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (۲۰ : ۴۴) "اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا"۔ اس لیے کہ نرم بات کے ردعمل میں کوئی شخص اپنی بے عزتی سمجھ کر ضد میں نہیں آتا۔ اور سرکش جس جھوٹی کبریائی کے ماحول میں رہتے ہیں' اس کی وجہ سے وہ طیش میں نہیں آتے ۔ نرم بات کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ دلوں کو بیدار کر دیتی ہے' اور ایک سرکش بھی نرم بات کی وجہ سے اپنے موقف پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔

تم فرعون کے پاس جاؤ اور اس بات سے مایوس نہ ہو جانا کہ وہ راہ ہدایت پر کب آسکتا ہے ۔ امید رکھنا کہ وہ نصیحت سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف بھی پیدا ہو سکتا ہے' کیونکہ ایک داعی اگر ذہن میں یہ بات بٹھا لے کہ جس کے پاس وہ جا رہا ہے وہ تو راہ ہدایت پر آ ہی نہیں سکتا تو وہ پرجوش طریقے سے اسے دعوت نہیں دے سکتا۔ اور اگر وہ انکار کر دے تو یہ ثابت قدمی کے ساتھ دعوت کا مشن جاری نہیں رکھ سکتا۔

اللہ کو تو معلوم تھا کہ فرعون کیا جواب دینے والا ہے ۔ لیکن دعوت دینا اور اس کے لئے تمام طریقوں سے جدوجہد اختیار کرنا ضروری ہے۔ اللہ کسی شخص کے بارے میں عملی فیصلہ تب ہی کرتا ہے' جب اس سے خیر و شر عملاً صادر ہو جائے ۔ اگرچہ اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ نتیجہ خیر ہے یا شر۔ اللہ کا علم حادثات مستقبل کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا کہ حاضر کے واقعات کے بارے میں اللہ کا علم ہے یا ماضی کے واقعات کے بارے میں اللہ کا علم ہوتا ہے ۔

--- ○ ○ ○ ---

یہاں تک خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا اور یہ منظر وادی طویٰ میں بندہ و معبود کے درمیان مناجات کا منظر تھا۔ اب یہاں سیاق کلام میں درمیان کے واقعات کو لپیٹ لیا جاتا ہے ۔ زمان و مکان کے فاصلے مٹ جاتے ہیں ۔ اب موسیٰ اور ہارون دونوں ہیں ۔ یہ دونوں دربار میں جانے سے قبل اپنے خدشات کا اظہار پھر کرتے ہیں کہ دربار فرعون میں انہیں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی بات سنتے ہی وہ کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھے اور جب ان کی بات اسے بری لگے تو وہ سرکشی اختیار کر لے ۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى۝ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى۝

"دونوں نے عرض کیا "پروردگار' ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا' یا پل پڑے گا"۔ فرمایا: "ڈرو مت' میں تمہارے ساتھ ہوں' سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں' بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے"۔

اس سے قبل جو طویل بحث ہوئی تھی اور جس میں حضرت موسیٰ رب تعالیٰ کے ساتھ وادی طوی میں ہم کلام تھے' اس میں حضرت ہارون موجود نہ تھے۔ وہ ایک طویل مناجات تھی اور وسیع سوال و جواب اس میں ہوتے رہے۔ اس لیے حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کا یہ جواب

اَنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى (۲۰: ۴۵) "دونوں نے عرض کیا پروردگار' ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا"۔ وادی طوی میں مناجات کی جگہ میں نہ تھا۔ قرآن کریم کا قصص کے بارے میں یہ طریقہ ہے کہ وہ قصص کے غیر ضروری حصے درمیان میں سے کاٹ دیتا ہے اور قصص کے جو مناظر وہ دکھاتا ہے ان کے درمیان ایک واضح خلا (Gap) چھوڑ دیتا ہے۔ یہ خلا عقل انسانی خود پر کر دیتی ہے اور سیاق کلام یا منظر آگے بڑھ کر زیادہ موثر اور زیادہ مفید' زندہ اور متحرک مناظر پیش کرنا شروع کر دیتا ہے جن کا انسان کے وجدان پر اثر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ طور سے واپسی پر' موسیٰ علیہ السلام مصر پہنچے' اللہ نے حضرت ہارون کو بھی یہ منصب دے دیا اور ان کو بھی یہ حکم دے دیا گیا کہ تم حضرت موسیٰ کے معاون پیغمبر ہو۔ اور تمہیں بھی بھائی کے ساتھ فرعون کو دعوت دینے کے لئے جانا ہے۔ اب جب وہ تیاریاں کر کے جانے لگتے ہیں تو پھر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى (۲۰: ۴۵) "دونوں عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب' ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا"۔

فرط کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ کوئی جلدی سے کسی کو اذیت دے ۔ فوراً بات کرتے ہیں اور طغیان کا مفہوم فرط اور اذیت سے زیادہ جامع ہے اور فرعون ان دنوں ایک ایسا جبار حکمران تھا جس سے سب کچھ متوقع تھا۔

یہاں اب ان کو فیصلہ کن تسلی دے دی جاتی ہے جس کے بعد نہ کوئی خوف رہتا ہے اور نہ خدشہ۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰي (۲۰ : ۴۶) "فرمایا ڈرو مت 'میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں"۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' اگر وہ قوی ہے 'بڑا ہے اور سرکش ہے تو اللہ تو اپنے تمام بندوں کے اوپر کنٹرول کرنے والا ہے۔

هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِه وہ تمام کائنات 'تمام انسانوں' تمام حیوانات اور تمام اشیاء کو صرف کن سے پیدا کرتا ہے ۔ کن سے زیادہ اسے کچھ نہیں کہنا پڑتا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں بس یہ اجمالی تسلی کافی ہے ۔ لیکن اللہ ان کے اندر مزید طمانیت اور احساس جگانے کے لئے فرماتے ہیں :

اَسْمَعُ وَ اَرٰي (۲۰ : ۴۶) "میں سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں"۔ فرعون کیا ہوتا ہے ؟ اس کی ملکیت میں کیا ہے ؟ وہ کیونکر زیادتی اور سرکشی کر سکتا ہے ؟ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

یہ اطمینان دلانے کے بعد ان کو انداز دعوت بھی سکھایا جاتا ہے اور مختصر دعوت بھی۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَ السَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰي (۴۷) اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰي (۴۸) (۲۰ : ۴۷ – ۴۸) "جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں' بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے ۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے ۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے"۔

اللہ نے آغاز ہی میں بتا دیا کہ ان کی رسالت کی دعوت کیا ہے ۔

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (۴۷) "ہم تیرے رب کے دو فرستادے ہیں"۔ پہلی آواز میں اس کو یہ بتا دیا جائے کہ تمہارے ساتھ اور ایک ذات تیرا رب ہے 'لوگوں کا بھی رب ہے 'یہ صرف موسیٰ اور ہارون کا خدا اور رب نہیں ۔ نہ وہ صرف بنی اسرائیل کا رب ہے ۔ جیسا کہ اس وقت کی بت پرستانہ خرافات میں یہ عقیدہ ہوتا تھا کہ ہر قوم کا ایک رب ہوتا ہے اور ہر قبیلے کا اپنا خدا یا دیوتا ہوتا ہے ۔ ایک یا زیادہ' خود مصر کی تاریخ میں یہ تصور موجود رہا ہے کہ فرعون بھی رب تھا کیونکہ وہ دیوتاؤں کی نسل سے تھا۔

اس کے بعد ان کی رسالت کے اصل موضوع اور مضمون کی وضاحت کی جاتی ہے ۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰ : ۴۷) "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے"۔ فرعون سے ان کا اصل مطالبہ یہ تھا کہ تم بنی اسرائیل کو رہائی دو' وہ عقیدۂ توحید کی طرف واپس آجائیں' اس سرزمین کی طرف واپس آجائیں جو اللہ نے ان کے لیے لکھی ہے کہ وہ یہاں رہیں گے یہاں تک کہ وہ اس میں فساد برپا کر دیں اور مکمل طور پر تباہ کر دیے جائیں ۔

اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری رسالت کی سچائی پر شہادت یہ ہوگی ۔

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ (۲۰ : ۴۷) "ہم تیرے پاس رب کی نشانی لے کر آئے ہیں"۔ یہ نشانی' یہ معجزہ ہماری سچائی پر دلیل صادق ہے ۔ اللہ کے حکم سے آنا تمہاری سچائی کی دلیل ہے ۔

اس کے بعد اسے ترغیب دی جاتی ہے اور دعوت قبول کرنے کی طرف اسے مائل کیا جاتا ہے ۔

وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰي (۲۰ : ۴۷) "اور سلامتی ہے اس کے لئے جو راہ راست کی پیروی کرے"۔ شاید کہ وہ راہ ہدایت پالے اور ان سے اسلام کی دعوت سیکھ لے ۔

اس کے بعد نہایت ہی عمدہ اور بالواسطہ طرز کلام میں اس کو کہا جاتا ہے تاکہ اسے غصہ نہ آجائے اور اس کو اپنے غرور کی وجہ سے بات بری نہ لگے ۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰي (۲۰ : ۴۸) "ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے"۔ ہوسکتا ہے کہ تم ان میں سے نہ ہو اور یہ بات ہم نہیں کہتے' ہم پر وحی آئی ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ و ہارون کو دولت اطمینان سے مالا مال کر کے' دعوت کا طریق کار سمجھا کر بھیجا تاکہ وہ پوری طرح تیار ہو کر اپنا مشن اچھی طرح جانتے ہوئے جائیں ۔ اب پردہ گر جاتا ہے' اگلا منظر فرعون کا دربار ہے ۔

--- ○○○ ---

اب وہ فرعون کے دربار میں ہیں' قرآن اس بات کا تذکرہ نہیں کرتا کہ وہ کس طرح پہنچے' بہرحال وہ پہنچ گئے ۔ ان کا رب ان کے ساتھ ہے ۔ اور دیکھ رہا ہے ۔ موسیٰ اور ہارون ؑ نے نہایت ہی قوت اور اعتماد سے بات کرتے ہوئے دعوت پہنچائی ۔ فرعون جو چاہے ہو' وہ اسے ملے ۔ انہوں نے' جس طرح اللہ نے بتایا تھا اسے دعوت دی ۔ یہ دوسرا منظر اب اس گفتگو سے شروع ہوتا ہے جو ان دونوں اور فرعون کے درمیان ہوئی :

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾

"فرعون نے کہا اچھا پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ نے کہا' ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی۔ پھر اس کو راستہ بتایا"۔ یہ شخص یہ اعتراف نہیں کرتا کہ موسیٰ و ہارون کا رب ہی اس کا رب ہے' جس طرح انھوں نے کہہ دیا کہ ہم دونوں اللہ تمہارے رب کے رسول ہیں۔ یہ شخص موسیٰ سے مخاطب ہوتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اصل صاحب دعوت موسیٰ ہی ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (۲۰:۴۹) "تم دونوں کا وہ رب کون ہے جس کے نام سے تم بات کرتے ہو اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہو"۔ موسیٰ علیہ السلام اس کے سامنے اللہ کی جس صفت کا ذکر کرتے ہیں وہ اللہ کی صفت تخلیق اور صفت تدبیر ہے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰:۵۰) "موسیٰ نے کہا' ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی۔ پھر اس کو راستہ بتایا"۔ رب وہ ہے جس نے ہر موجود کو وجود بخشا اور ایک مناسب صورت اور فطرت بھی عطا کی۔ اس کے بعد اس کو وہ طریقہ بتایا جس کے مطابق وہ اپنا فریضہ منصبی پوری طرح ادا کر سکے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا اور اسے وہ تمام سہولیات بھی عطا کر دیں جو اس کے فریضہ منصبی کی ادائیگی کے لئے ضروری تھیں۔ یہاں لفظ ثم (تراخی زمانی) کے لئے نہیں ہے یعنی مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے پیدا کیا' بعد میں عقلاً اسے ہدایت دی بلکہ پیدائش کے ساتھ ہی وہ فطری صلاحیت بھی عطا کر دی۔ خلق و ہدایت میں فرق صرف مرتبہ و اہمیت کے اعتبار سے ہے یعنی تخلیق زیادہ اہم ہے اور ہدایت اور فرائض منصبی کی صلاحیت اور اسباب فراہم کرنا اس کے تابع ہے۔ عقلاً یہ خلق کے بعد ثانوی چیز ہے۔

یہ صفت جس کا ذکر قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی کیا' یہ خدا کی تخلیق کے اعلیٰ ترین آثار کا خلاصہ ہے۔ یعنی کسی چیز کی تخلیق اور اسے اپنا فریضہ تخلیق ادا کرنے کے لئے فطری ہدایت اور سہولیات کی فراہمی' انسان جب اس کائنات وسیع و عریض میں اپنی بصارت اور بصیرت دونوں کو کام میں لا کر غور کرتا ہے' اپنے علم و مشاہدے کی حد تک' تو ہر چھوٹی بڑی چیز کے اندر اسے قدرت کی یہ خالقیت اور تدبیر واضح طور پر نظر آتی ہے۔ کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے جسم ذرہ اور بڑے سے بڑے زندہ جسم میں' مساوی طور پر ابتدائی خلیے میں بھی اور انسان جیسے پیچیدہ مخلوق میں بھی یہ سب صفات اور قدرت کے یہ کرشمے نظر آتے ہیں۔

کائنات کا یہ عظیم وجود جس میں لاتعداد ذرے' خلیے' مخلوقات' زندہ اور غیر زندہ' اس کا ہر خلیہ ایک خاص زندگی کا مالک ہے اور متحرک ہے۔ اس کی ہر زندہ چیز متحرک ہے۔ اس کا ہر موجود دوسرے کے ساتھ منسلک ہے' ان میں سے ہر چیز انفرادی طور پر بھی اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی' قوانین قدرت کے مطابق' بغیر کسی ٹکراؤ کے وظیفہ فطرت اور غرض تخلیق پورا کر رہی ہے اور ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس وسیع کائنات کے پیچیدہ نظام میں کوئی خلل نہیں ڈالتی۔

اگر ہم کسی ایک مخلوق و موجود کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اپنی ذات میں ایک کائنات ہے۔ وہ اپنے اندر اپنے ذرات' اپنے خلیوں' اپنے اعضاء اور اپنے اعصاب کے مطابق تقاضائے فطرت پورے کر رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس پوری کائنات کے نظام فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور یہ سب کچھ نہایت ہی باریک انتظام اور توافق کے ساتھ چلتا ہے۔

اس پوری کائنات کو تو ایک طرف رہنے دیں' کائنات کی کسی ایک مخلوق کو آپ لے لیں' اس کے بارے میں

معلومات حاصل کرنے' اس کی حقیقت معلوم کرنے' صحت اور بیماری معلوم کرنے میں انسان اپنی وسیع کوششوں کے باوجود اور وسعت علم کے باوجود قاصر ہے۔ کسی ایک چیز کے مالہ و ماعلیہ کا علم وہ تمام نہیں کر سکا چہ جائیکہ وہ تخلیق کر سکے یا فطرت دے سکے اور ہدایت دے سکے یا اسے ہیئت و شکل دے سکے۔ تمام اشیاء میں سے کسی ایک چیز کو بھی..... واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ واحد کا کام ہے' وہی ہمارا رب ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا اور ہدایت دی۔

اب فرعون نے ایک نیا سوال پیش کیا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

"فرعون بولا" اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟" یعنی جو لوگ تمہاری دعوت سے پہلے گزر گئے ہیں ان کا کیا ہو گا۔ وہ کدھر گئے۔ ان کا رب کون تھا؟ اور وہ تو اس اللہ کے تصور کے بغیر چلے گئے جس کے بارے میں تم بات کرتے ہو"۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

"موسیٰ نے کہا" اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے میرا رب نہ چوکتا ہے' نہ بھولتا ہے"۔

فرعون کے اس دوسرے سوال کو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پر چھوڑ دیا کیونکہ اس کا تعلق زمانہ ماقبل سے تھا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں اللہ خوب جانتا ہے' وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور وہ کبھی بھولتا بھی نہیں۔ وہی ہے جو تمام زمانوں کی بات جانتا ہے' ماضی ہو یا مستقبل ہو' غیب بھی اللہ جانتا ہے اور اپنے بندوں کے بارے میں احکام بھی اللہ صادر کرے گا۔

ان سوالات کے جوابات کے بعد حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے اللہ کا مزید تعارف کراتے ہیں کہ وہ اس کائنات کا مدبر ہے' تمام انسانوں پر اس کی نعمتیں کیا کیا ہیں' چنانچہ کائنات اور مصری ماحول کے بعض اہم شواہد پیش کیے جاتے ہیں' کیونکہ مصری سرزمین ایک سرسبز و شاداب زمین تھی۔ پانی وہاں وافر تھا اور فصل اور مویشی بکثرت تھے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۗ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

"وہی جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے' اور اوپر سے پانی برسایا'

پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لئے"۔

تمام علاقوں میں اور تمام زمانوں میں زمین انسانوں کے لئے ایک گہوارہ رہی ہے۔ ایسا ہی گہوارا جس طرح بچے کا گہوارہ ہوتا ہے' انسانوں کی حیثیت زمین پر اسی طرح ہے کہ جس طرح ماں کے بچے ہوتے ہیں۔ زمین تمام انسانوں کے لیے ماں ہے۔ زمین کا دامن انہیں پناہ دیتا ہے اور زمین کے پستان سے وہ رزق کھاتے ہیں۔ نیز یہ ان کے لئے برائے آرام' برائے سیر' برائے زراعت اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جب سے اللہ نے ہر چیز کو لباس تخلیق پہنایا ہے۔ اس دن سے اس نے اسے ایسا بنایا ہے' زمین کو بھی اس نے یہ شکل و ہیئت دی ہے تاکہ وہ انسانوں کی زندگی کے لئے صالح ہو۔ کیونکہ اللہ کی اسکیم میں انسان نے یہیں رہنا تھا۔ پھر جب انسان کو پیدا کیا تو اسے بھی ایسا ہی بنایا کہ وہ اس کرۂ ارض پر تخلیق کے لئے تیار ہو' کیونکہ اللہ نے زمین کو بھی انسانوں کے لئے تیار کیا تھا اور گہوارہ بنایا تھا۔ دونوں مفہوم مہد یعنی تیار کیا اور مہد یعنی گہوارہ متقارب ہیں۔

زمین کا تیار شدہ ہونا یا گہوارہ ہونا جس طرح مصر میں ظاہر ہے دنیا کے کسی دوسرے خطے میں ظاہر نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی سرسبز اور زرخیز وادی ہے۔ یہاں کے لوگ ہر کام میں کم محنت کر کے بہت کچھ پاتے ہیں' زراعت میں باغات وغیرہ ہیں۔ گویا اطفال انسانیت کے لئے یہ نرم اور آرام دہ گہوارہ ہے۔

خالق کائنات جس نے زمین کو گہوارہ بنایا' اس میں اس نے انسانوں کے لیے راستے بھی بنائے' آسمانوں سے بارشوں کا انتظام کیا' بارشوں کے پانیوں سے نہریں اور دریا چلے' ان میں سے ایک دریائے نیل تھا جو فرعون کے قریب تھا' اور مصریوں کے لیے بہت اہم۔ پھر نباتات بھی جوڑوں کی شکل میں بنائی۔ اور سرزمین مصر بہترین نمونہ ہے فصلوں کی پیداوار اور مویشیوں کے چرانے کے لئے۔

اللہ کی گہری مشیت کو دیکھیے کہ اللہ نے نباتات میں بھی انسانوں کی طرح نر اور مادہ پیدا کیے جس طرح تمام حیوانات نر و مادہ ہیں۔ تمام زندہ چیزوں میں نر و مادہ کا نظام تو بالکل واضح ہے' لیکن نباتات میں بھی یہ نظام ہے۔ اکثر اوقات نباتات میں ایک ہی درخت میں نر اور مادہ کے خلیے ہوتے ہیں اور بعض اوقات نر پودا اور ہوتا ہے اور مادہ پودا اور۔ یوں قوانین قدرت میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی (۲۰ : ۵٤) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے"۔ اس کائنات کا نظام اس قدر سبق آموز ہے کہ جو شخص ذرا بھی معقولیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے اس میں اسے بے شمار دلائل و نشانات نظر آئیں گے۔

حضرت موسیٰ کی اس بات کی تکمیل کے لیے اب اللہ کا یہ فرمان آجاتا ہے :

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾ وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾

"اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے ' اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے ۔ ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا"۔

اس زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے جو تمہارے لئے گوارہ ہے ۔ جس میں تمہارے لئے راستے بنائے ۔ جس پر ہم نے بارشیں برسائیں اور مختلف قسم کے نباتات پیدا کیے ' کھانے کے لیے اور چارے کے طور پر ۔ اس زمین سے تم پیدا کیے گئے ہو ' اس میں تم دفنائے جاؤ گے اور اسی سے ہم تمہیں دوبارہ نکال کر زندہ کر دیں گے ۔

انسان اس زمین کے مادے سے تخلیق کیا گیا ہے ۔ زمین کے اکثر عناصر اس کے جسم میں موجود ہیں ۔ اس کی فصل اور پیداوار اس کی خوراک ہے ۔ اس کا پانی وہ پیتا ہے ' اسی کی ہوا میں سانس لیتا ہے ۔ یہ اسی کا بیٹا ہے اور یہ اس کے لئے گوارہ ہے اور جب یہ اس میں دفن کیا جاتا ہے تو اس کا جسم گل سڑ کے خاک ہو جاتا ہے ' گیس بن کر ہوا میں شامل ہو جاتا ہے ' اس زمین سے اسے پھر نکال کر حیات جدید دی جائے گی جیسا کہ پہلے اسے زندگی دی گئی ۔

فرعون کے ساتھ گفتگو میں زمین کا تذکرہ بہت ہی مناسب ہے ' یہ بہت ہی متکبر تھا ' یہ اپنے آپ کو رب مخلوق سمجھتا تھا ' حالانکہ وہ اس زمین کا بچہ تھا ' اور اس زمین میں اسے جانا تھا ' وہ اس زمین میں تخلیق کردہ اشیاء میں سے ایک شے تھا ' اور زمین اور اس کی ہر چیز کا ایک فرض منصبی مقرر ہے لیکن

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى (۲۰ : ۵۶) "ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا"۔ اس کے ماحول سے حضرت موسیٰؑ نے اسے جو آیات دکھائیں ان کی بھی اس نے تکذیب کی ۔ اس کو عصا اور ید بیضا کی نشانیاں بھی دکھائیں ' جو آیات تکوینی کا ایک حصہ ہی ہیں مگر اس نے انکار ہی کیا ' اور آیات تکوینی اور آیات خارق عادت میں قرآن کے نزدیک کوئی زیادہ فرق نہیں ہے ' اس لیے قرآن نے یہاں دونوں کا ذکر مشترکہ طور پر کر دیا ۔ قرآن نے صرف اس بات کا ذکر کیا کہ فرعون نے ان تمام آیات و معجزات کو رد کر دیا جادو کہہ کر ۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝۵۷ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝۵۸ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝۵۹

"کہنے لگا "اے موسیٰ ' کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے ؟ اچھا ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں ۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے ۔ نہ ہم اس قرارداد سے پھریں گے نہ تو پھریو ۔ کھلے میدان میں سامنے آ جا"۔ موسیٰ نے کہا "جشن کا دن طے ہوا اور دن

چڑھے لوگ جمع ہوں"۔

فرعون نے کوئی مناظرہ نہ کیا' دلیل کا جواب دلیل سے نہ دیا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے دلائل قوی تھے' موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کا تعلق اس کائنات کی نشانیوں سے بھی تھا۔ ان دونوں خارق العادات معجزات سے بھی تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے اس نے بس ہارے ہوئے آدمی کی طرح جھوٹے الزام کا سہارا لیا کہ موسیٰ نے عصا کو سانپ بنا کر پیش کیا ہے' یہ ان کی کھلی جادوگری ہے۔ نیز وہ ہاتھ کو جادوگری سے سفید کر دیتا ہے۔ اس وقت چونکہ مصر میں جادوگری عروج پر تھی اس لیے فرعون نے بھی یہی الزام لگایا۔ یہ دونوں معجزات بھی ایسے تھے کہ سحر شکن تھے حالانکہ سحر تو ایک نظربندی اور تخیل ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ دیکھنے اور سننے والوں کے حواس کو متاثر کر کے دھوکہ دے دیا جاتا ہے اور ایسے آثار نظر آتے ہیں جیسے کہ چیزوں کی حقیقت بھی بدل گئی ہے جیسا کہ بعض اوقات انسان ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یا انسان کو بعض اوقات چیزوں کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو فی الحقیقت ہوتی ہے۔ ایک جادو زدہ شخص پر بھی بعض اوقات ایسے اثرات ہوتے ہیں کہ جسمانی اور اعصابی طور پر تغیر نظر آتا ہے لیکن حقیقت نہیں بدلتی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ایسے تھے کہ حقیقت بدل جاتی تھی۔ وقتی طور پر مکمل حقیقت بدل جاتی تھی۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰي (۲۰ : ۵۷) "کہنے لگا اے موسیٰ تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال دے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں بنی اسرائیل کو سیاسی عمل کے طور پر غلام بنایا گیا تھا۔ اس لیے کہ وہ بڑی کثرت سے تھے' ان کی آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب اقتدار کا سوال آتا ہے تو سرکش حکمران عوام کو شدید سے شدید تر عذاب دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کو ایسی تکلیفیں دیتے ہیں جن کا جواز انسانوں کے کسی تصور میں نہیں ہوتا۔ اور وہ تشدد انسانی ضمیر' انسانی شرافت اور انسانی حقوق کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا' لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا اور ان سے مزدوری لیتا تھا اور بیگار اور مزدوری بھی وہ جو سخت سے سخت ہو۔ جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے یہ مطالبہ کیا کہ

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ "ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو اور انہیں تکلیف نہ دو"۔ تو جواب میں اس نے یہ الزام لگایا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰي (۲۰ : ۵۷) "موسیٰ' تم ہمارے پاس اس لیے آتے ہو کہ ہمیں اپنی سرزمین سے اپنے جادو کے زور سے نکال دو"۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی آزادی اور ہجرت کے یہ معنی ہیں کہ وہ حملہ کر کے مصر پر قابض بھی ہو سکتے ہیں۔

جب اس کے خیال میں موسیٰ علیہ السلام محض جادو کے زور سے بنی اسرائیل کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو قدرتی طور پر جواب یہی ہے کہ ہم بھی ایسا ہی جادو لے آئیں گے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ (۲۰ : ۵۸) "ہم تمہارے پاس ایسا ہی جادو لے آئیں گے"۔ ہمیشہ سرکشوں اور بے دین لیڈروں نے یہی سمجھا ہے کہ دعوت حق دینے والے دراصل ملک کے اندر اقتدار اعلیٰ کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت دراصل ایک پردہ ہے جس کے پیچھے وہ انقلابی کام کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ دیکھتے ہیں کہ داعی کے پاس دلائل و شواہد ہیں یا تو معجزات ہیں جیسے حضرت موسیٰ کے معجزات یا ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جو جادو کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔ چنانچہ سرکش ڈکٹیٹر حکمران پھر اپنے لیے ایسے ہی دلائل فراہم کرتے ہیں۔ سحر کے مقابلے میں سحر' کلام کے مقابلے میں کلام' اصلاح کے مقابلے میں اصلاح' اچھے اعمال کے مقابلے میں اچھے اعمال' لیکن وہ جانتے نہیں کہ اہل حق کے پاس ایمان ہوتا ہے اور ایمان کے مقابلے میں ان کے پاس ایمان نہیں ہوتا۔ اہل حق کو اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے اور ان سرکشوں کو اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ فرعون نے موسیٰ کے ساتھ مقابلے کا وقت مقرر کر لیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم جس وقت چاہو' مقابلہ کر لو' لیکن وقت مقررہ پر دونوں فریق حسب وعدہ ضرور آئیں گے اور چیلنج کو زوردار بنانے کے لئے اس نے یہ شرط لگائی کہ کوئی بھی وقت مقررہ سے پیچھے نہیں ہٹے گا اور مقابلہ بھی کھلے میدان میں عوام الناس کے سامنے ہونا چاہئے۔

مَكَانًا سُوًى (۲۰ : ۵۸) "یعنی کھلا میدان"۔ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فرعون نے چیلنج دیا' اور مقابلے کا دن جشن کا مشہور دن مقرر ہوا۔ جشن کے دن لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور خوب زیب و زینت سے آتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں جمع ہوتے ہیں۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ (۲۰ : ۵۹) "موسیٰ نے کہا جشن کا دن طے ہوا"۔ اور یہ بھی کہا کہ سورج نکلتے ہی لوگ جمع ہوں تاکہ جگہ کھلی ہو' وقت لوگوں کے اجتماع کا ہو' صبح کا وقت اس لیے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ آسکیں' نہ گرمی ہو' نہ رات کا اندھیرا ہو۔ بہت سویرے بھی نہ ہو کہ لوگ گھروں سے نکلنے کے لیے ابھی فارغ ہی نہ ہوئے ہوں۔ دوپہر بھی نہ ہو کہ بہت گرمی ہوتی ہے' شام بھی نہ ہو کہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ لوگ جمع بھی نہیں ہوتے۔ اور پھر روشنی کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ الضحیٰ یعنی دن چڑھنے کا وقت سب سے موزوں ہے۔

اب یہ منظر موسیٰ و ہارون اور فرعون کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات کا منظر یہاں ختم ہوتا ہے۔ ایک طرف ایک مومن داعی ہے اور دوسری طرف ایک متکبر اور سرکش مقتدر اعلیٰ... پردہ گرتا ہے اور آئندہ ملاقات مقابلے کے میدان میں ہوگی۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

"فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کیے اور مقابلے میں آگیا۔ یہاں اب ہم میدان مقابلہ میں ہیں"۔

قرآن مجید نے فرعون کی ہدایات' فرعون کے سرداروں کے مشورے اور پھر اس کے اور جادوگروں کے درمیان جو مکالمہ ہوا' ان سب امور کو مجمل چھوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے باہم جو مشورے ہوئے' جو تیاریاں کی گئیں' جادوگروں سے جو وعدے ہوئے اور ان کی جو حوصلہ افزائی کی گئی یہ سب امور یہاں ترک کر دیئے گئے ہیں۔ صرف ایک

مختصر جملہ کہا کہ "فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کر لیے اور مقابلے میں آگیا" ۔ یہ مختصر اور چھوٹی سی آیت مسلسل تین اقدامات اور حرکات کو ظاہر کرتی ہے 'فرعون گیا' تمام تدابیر اختیار کیں اور مقابلے پر آگیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچا کہ مقابلے میں آنے سے قبل ان لوگوں کو نصیحت کرنا ایک بنیادی فریضہ ہے یہ کہ حق کے مقابلے میں وہ جو افترا باندھ رہے ہیں وہ نہایت ہی خطرناک فعل ہے' اس لیے کہ ہو سکتا ہے وہ باز آجائیں' جادو کے ذریعہ سچائی کے مقابلے میں آنے کا ارادہ ترک کر دیں' یہاں جادو کو افتراء کہا گیا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

"موسیٰ نے (عین موقع پر گروہ مقابل کو مخاطب کر کے) کہا "شامت کے مارو' نہ جھوٹی تہمتیں باندھو اللہ پر' ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیاناس کر دے گا۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا وہ نامراد ہوا"۔

دل سے جو بات نکلتی ہے' اثر رکھتی ہے۔ نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس بات کا اثر بعض جادوگروں پر ہوا تھا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے یہ الفاظ نہایت ہی اخلاص اور دلسوزی سے ادا کیے تھے' اس کا ان پر اثر یہ ہوا کہ وہ اپنے اس اقدام پر نظر ثانی کے لیے تیار ہو گئے لیکن جو لوگ اس مقابلے پر اصرار کر رہے تھے انہوں نے دوسروں کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا لیکن سرگوشی کی شکل میں تاکہ موسیٰ نہ سن سکے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

"یہ سن کر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار کچھ لوگوں نے کہا کہ "یہ دونوں تو محض جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایکا کر کے میدان میں آجاؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا وہی جیت گیا"۔

جب اصرار کرنے والوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ کی نصیحت کا بعض لوگوں پر اثر ہو گیا ہے تو انہوں نے ایک دوسرے کے حوصلے بلند کرنے کے لئے دلائل دینا شروع کیے کہ موسیٰ اور ہارون بہت خطرناک ہیں' یہ مصر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں'

لوگوں کے نظریات بدلنا چاہتے ہیں' لہٰذا ان کا مقابلہ متحد ہو کر کرنا چاہئے۔ اس میں تردد اور نزاع کے بجائے یکسوئی ہونی چاہئے۔ اور آج کا مقابلہ بہت ہی اہم ہے۔ اس میں جو بھی کامیاب ہوا مستقبل اس کا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف ایک بات کی' لیکن یہ بات چونکہ پختہ یقین اور سچائی پر مشتمل تھی اس لیے وہ مخالف کیمپ میں گولے کی طرح گری اور اس نے سب کچھ ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے اندر افراتفری پیدا ہو گئی' ان کو اپنے اوپر اعتماد نہ رہا۔ اپنے عقائد و نظریات پر وہ شک کرنے لگے۔ دعوت حق ہمیشہ ایسی ہوتی ہے اور داعیان حق کو ہمیشہ نہایت ہی زوردار طریقے سے بات کرنا چاہئے۔ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام صرف دو آدمی تھے۔ جادوگر بہت تھے' ان کی پشت پر فرعون' اس کی پوری حکومت' اس کی فوج اور اس کا حکومتی رعب اور اس کے مالی وسائل تھے۔ جبکہ موسیٰ و ہارون کے ساتھ ان کا رب تھا اور یہ عقیدہ محکم تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے' سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے۔

یہی وہ راز ہے جس سے فرعون جیسے قاہر و جابر کے یہ اقدامات اس کی پریشانی اور جادوگروں کی یہ دوڑ دھوپ' اور پوری حکومتی مشینری کا حرکت میں آنا سمجھ میں آ جاتا ہے' کیونکہ موسیٰ اور ہارون گویا تھے کہ فرعون جیسی قوت ان کو چیلنج دیتی ہے' اور ان کے چیلنج کو قبول کرتی ہے۔ پھر یہ حکومت مکمل تیاری کرتی ہے اور میدان میں آتی ہے' تمام جادوگر جمع کرتی ہے' لوگ جمع کیے جاتے ہیں' خود فرعون اور اس کے سردار اس مقابلے کا مشاہدہ کرتے ہیں نیز فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دو افراد کے ساتھ مقابلہ و مباحثہ کرنا قبول کس طرح کیا حالانکہ وہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل مصریوں کے غلام تھے۔ نہایت ذلت کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے اوپر سچائی کی ہیبت ناک چادر ڈال دی تھی اور اللہ ان کے ساتھ کھڑا تھا' سن رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ایک ہی جملہ ان کی صفوں میں زلزلہ برپا کر دیتا ہے' وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ خفیہ مشورے کریں' اس خطرے کو محسوس کریں' ایک دوسرے کی ہمت بندھائیں اور ایک دوسرے کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیں اور اس مقابلے میں ثابت قدمی اختیار کریں۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾

"جادوگر بولے "موسیٰ تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں"۔ یہ ان کی جانب سے میدان میں دعوت مقابلہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادوگر بہت پر اعتماد ہیں اور چیلنج اور اصول کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ

"موسیٰ نے کہا "نہیں تم ہی پھینکو"۔ موسیٰ علیہ السلام نے چیلنج قبول کرتے ہوئے ان کو موقع دیا کہ پہلے پھینکیں اور اپنے لیے آخری وار پسند کیا۔ لیکن بظاہر وہ ایک خوفناک اور عظیم جادو لے کر آئے ہیں۔ اچانک جب انہوں نے جادو شروع کیا تو میدان یوں لگتا تھا کہ سانپوں کی موجیں حرکت میں آ گئی ہوں' خود حضرت موسیٰ خوفزدہ ہو گئے۔

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ﴿٦٧﴾

"یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا"۔

قرآن کریم کا انداز تعبیر بتاتا ہے کہ یہ جادو اس قدر عظیم تھا کہ حضرت موسیٰ بھی دل میں ڈر گئے۔ جبکہ اس کے ساتھ اس کے رب بھی کھڑے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے اور جان رہے تھے۔ موسیٰ تب ہی دل میں خائف ہو سکتے تھے کہ یہ سحر اس قدر خوفناک تھا کہ ایک لمحے کے لیے وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ زیادہ قوی ہیں اور ان کے ساتھ رب عظیم کی عظیم قوت ہے چنانچہ اللہ ان کو یاد دلاتے ہیں:

قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ﴿٦٨﴾ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٦٩﴾

"ہم نے کہا "مت ڈر، تو ہی غالب رہے گا، پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں۔ یہ تو جادوگر کا فریب ہے، اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، خواہ کسی شان سے وہ آئے"۔

موسیٰ تم نہ ڈرو۔ تم ہی یقیناً غالب رہو گے۔ تمہارے ساتھ سچائی ہے، ان کے پاس باطل ہے۔ تمہارے پاس ایک نظریہ، ایک عقیدہ ہے اور ان کے پاس خرافات ہیں، تمہارے پاس دولت ایمان ہے جو اس موقف کی تصدیق کرتی ہے جس پر تم ہو، جبکہ ان کے پاس اس کے مقابلے کی فیس ہے اور کچھ دوسری سہولیات ہیں جو اس دنیا سے متعلق ہیں، تمہارا رابطہ اس کائنات کی عظیم قوت اور سچائی کے ساتھ ہے اور وہ ایک حقیر بشر اور انسان کے خدمت گار ہیں۔ یہ بشر جس قدر قہار و جبار بھی ہو، مگر فانی ہے۔

نہ ڈرو وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ (۲۰ : ۶۹) "پھینک جو تیرے ہاتھ میں ہے"۔ جو تیرے ہاتھ میں ہے، عصا کا نام نہ لینے میں اس کی عظمت کا اظہار ہے (تفخیم کے لیے)

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا (۲۰ : ۶۹) "ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگل جاتا ہے"۔ کیونکہ انہوں نے جو کچھ دکھایا ہے وہ تو ایک جادو ہے، جادوگروں کی کارستانی ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا، چاہے وہ جو طریقہ بھی اپنائے کیونکہ وہ محض تخیل کے تابع ہوتا ہے۔ وہ تخیل پیدا کرتا ہے، اور تخیل یا تخییل اور توہم حقیقت کو نہیں بدلتے۔ ان کا انجام وہی ہوتا ہے جو ایک سچے کے مقابلے میں جھوٹے اور باطل پرست کا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا باطل بظاہر بڑا اور پھولا ہوا نظر آتا ہے اور صرف اس شخص کو ڈرا سکتا ہے جو غافل اور جاہل ہو اور حقیقت سے بے خبر ہو اور

جسے حق کی قوت کا اندازہ نہیں ہوتا جو پوشیدہ ہوتی ہے' جو خوفناک ہوتی ہے' جو تکبر' مبالغہ اور ظاہر مستی سے خالی ہوتی ہے مگر وہ حقیقی قوت ہوتی ہے اور باطل کا آخر کار سر پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ باطل اچانک مٹ جاتا ہے۔ حق کی قوت باطل کو نگل جاتی ہے۔ چنانچہ باطل اپنی بساط لپیٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔

غرض موسیٰ نے عصا پھینکا اور اس عظیم معجزے کا ظہور ہو گیا۔ یہاں قرآن مجید اس عظیم معجزے کے صرف وہ اثرات قلم بند کرتا ہے جو جادوگروں پر ہوئے' کیونکہ مقابلہ وہ کر رہے تھے اس لیے انہی کی کوششیں زیادہ تھیں کہ وہ کامیاب ہوں' اس سے قبل آ گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حوصلے بھی بڑھا رہے تھے اور مقابلے کے لیے ایک دوسرے کو اکسا رہے تھے۔ یہ لوگ اس قدر عظیم ماہر فن تھے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے لیکن انہیں یوں نظر آ رہا تھا کہ ان کے عصا اور رسیاں زندہ سانپ ہیں اور پورا میدان ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ قرآن یہاں ان کی اچانک مکمل تبدیلی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ان کا شعور' ان کا وجدان' ان کی اندرونی دنیا یکسر بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی کو صرف اسٹیج پر عملی ایکشن ہی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں اس کا عکس نہیں دکھایا جا سکتا' چنانچہ ایکشن ہوتا ہے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝

"آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے اور وہ پکار اٹھے "مان لیا ہم نے ہارون اور موسیٰ کے رب کو"۔ حساس اعصاب والے افراد پر بعض اوقات بجلی جیسا اثر ہوتا ہے' بٹن دبایا اور روشنی چمک اٹھی' اندھیرا ختم ہوا۔ ان کے دل کا سوئچ آن ہو گیا اور ایک لحظہ میں ان کی دنیا بدل گئی۔ دل کافر' اب دل مومن تھا۔

لیکن اقتدار کے نشے میں بدمست لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ مردہ دلوں پر کلام نرم و نازک بے اثر ہوتا ہے۔ ان کو کیا پتہ کہ اللہ مقلب القلوب ہے' دلوں میں انقلاب کس طرح آتا ہے۔ اقتدار کے نشے میں بدمست ڈکٹیٹر چونکہ طویل عرصے تک سرکشی اور نافرمانی کی حالت میں رہتے ہیں اس لیے وہ نہیں سمجھتے' پھر ان کے اقتدار کی وجہ سے دنیا ان کے اشاروں پر چلتی ہے اس لیے وہ حق کو بھی مطیع فرمان دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کو کیا پتہ کہ جب دل نور ایمان سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور اللہ سے جڑ جاتے ہیں تو ان پر اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہوتی۔ اب منظر پر ایک جابر حکمران آتا ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝

"فرعون نے کہا "تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا؟ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا

گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی۔ اچھا' اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے"۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۲۰ : ۷۱) "تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا"۔ یہ ایک سرکش حکمران کی سوچ ہے۔ وہ اس قدر بھی نہیں جانتا کہ یہ بیچارے خود بھی اب اپنے نفوس و قلوب کے مالک نہیں رہے۔ ان کے دلوں پر ایمان چھا گیا ہے۔ یہ خود بھی ایمان کو اب دل سے نکال نہیں سکتے۔ دل تو رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہوتا ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (۲۰ : ۷۱) "معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی"۔ اس شخص کی نظروں میں شکست تسلیم کرنے کی اصل وجہ یہ ہے۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان اس راستے سے داخل ہو گیا جس کا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ وجہ بھی نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے قلب و نظر پر پڑے ہوئے پردے ہٹا دیے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقی وجوہات ہیں۔

سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو سخت ترین تشدد کی دھمکی دیتے ہیں اور جب وہ لوگوں کے دلوں کو نہیں بدل سکتے تو وہ لوگوں کے جسم اور بدن کو اذیت دیتے ہیں۔ ان کا آخری حربہ یہی ہوتا ہے۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰ : ۷۱) "اچھا' اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں"۔

ڈکٹیٹر کا ہتھیار اندھی قوت کا استعمال ہے۔ جانوروں اور درندوں کی قوت جو جنگل کے قانون کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ وہ قوت جو کسی کمزور کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے درمیان جو دلیل سے بات کرتا ہے اور اس حیوان کے درمیان جو پنجے سے بات کرتا ہے' کوئی فرق نہیں ہوتا۔

وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى (۲۰ : ۷۱) "پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے"۔

لیکن اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ایمان کے احساس نے اس نہایت ہی حقیر ذرے کو ایک عظیم قوت سے ملا دیا تھا۔ یہ ذرہ اب عظیم قوت کا سرچشمہ تھا۔ اس کے سامنے اب فرعون جیسی عظیم قوت بھی ہیچ ہے۔ اب ان جادوگروں کے سامنے دنیا کی اس مختصر زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان کے دلوں کے سامنے نہایت ہی روشن اور کھلی دنیا کے آفاق کھل گئے تھے۔ اب ان کے سامنے اس دنیا اور اس کے انعام و اکرام کی حقیقت ہی کیا رہ گئی تھی۔ دنیا کا مال و متاع ان کی نظروں میں اب بے وقعت تھا۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۷۳﴾

"یعنی میں تمہیں زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰ ۔ جادوگروں نے جواب دیا "قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آنے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں ۔ تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے ۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے ۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے' تا کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے' جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا' درگزر فرمائے ۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے"۔

یہ ہے ایمان کا احساس' ان دلوں کے اندر جو چند لمحات قبل فرعون کی پوجا کرتے تھے اور فرعون کے قرب کے لیے وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے ۔ لیکن اچانک ان کے دلوں میں قوت کا ایک نیا سرچشمہ پھوٹ پڑا ۔ اب وہ فرعون کی مملکت' اس کی قوت' اس کے مرتبے اور اس کے اقتدار کو چیلنج کر رہے ہیں ۔

قَالُوا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِي فَطَرَنَا (۲۰ : ۷۲) "جادوگروں نے جواب دیا قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی تجھے ترجیح دیں" ۔ یہ بات ہمارے لیے بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اللہ جل شانہ بہت بڑا اور بہت بلند ہے ۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰ : ۷۲) "تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے" ۔ تمہارے پاس جو قوت ہے اسے استعمال کر لو ۔

اِنَّمَا تَقْضِي هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۰ : ۷۲) "تو زیادہ سے زیادہ بس اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے" ۔ کیونکہ تیری حکومت اسی دنیا میں ہے ۔ اس دنیا سے آگے تمہاری حکومت نہ ہو گی ۔ اس دنیا کی زندگی تو بہت ہی مختصر ہے ۔ بہت ہی معمولی ہے' تمہارے پاس جو سزا ہے وہ ان دلوں کے لیے بہت آسان ہے جن کا رابطہ اللہ سے ہو جائے' جن کی امیدیں ابدی زندگی کی بہتری کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں ۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ (۲۰ : ۷۳) "ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تا کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے' درگزر فرمائے" ۔ تم نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم جادوگری کریں اور ہم تیرے حکم سے سرتابی نہ کر سکتے تھے ۔ امید ہے کہ اس ایمان لانے کی وجہ سے اللہ ہمارے گناہ معاف کر دے ۔

وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰي (۲۰ : ۷۳) "اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے" ۔ اللہ نے جادوگروں

کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس سرکش ڈکٹیٹر کے سامنے تم معلم اور مبلغ کا انداز اختیار کر لو"۔

إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ۝ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝

۳ ع ۲۲ ۱۲

"یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گا اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جیسے گا نہ مرے گا اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہو گا جس نے نیک عمل کیے ہوں گے' ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں' سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ جزا ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے"۔

اس نے ان کو دھمکی دی تھی کہ کون سخت ہے اور کس کا اقتدار دائمی ہے تو وہ پیش کرتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے سامنے مجرم بن کر آئے تو اس کو شدید عذاب ملتا ہے اور وہ عذاب دوزخ ہوتا ہے کیونکہ

فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (۲۰ : ۷۴) "اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جیسے گا"۔ نہ وہ مرکر آرام کرے گا اور نہ زندہ رہ کر آرام میں ہو گا ۔ وہ ایسا عذاب ہو گا کہ اس کے نتیجے میں موت بھی واقع نہ ہو گی' نہ آرام کی زندگی ملے گی جبکہ دوسری جانب بلند درجے ہیں ۔ ایسے باغات ہیں اور ان میں ایسے بالا خانے ہیں' جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ۔

وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ (۲۰ : ۷۶) "اور یہ جزاء ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے"۔ اور گناہوں سے اپنے آپ کو دور رکھے ۔ ایک سرکش اور تشدد پسند مقتدر اعلیٰ کی دھمکی جس نے اہل ایمان کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا' لیکن جواب میں انہوں نے بھی قوت ایمانی کے ساتھ جواب دیا ۔ ایمان کی سربلندی کا ثبوت دیا اور اس سرکش کو انجام بد سے ڈرایا اور اسے گہرے ایمان کی چمک دکھائی ۔

یہ منظر اب آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں ایمان داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس دنیا کے حدود و قیود کو پار کر کے' اپنی آزادی اور حریت کا اعلان کر دیتے ہیں ۔ ان دلوں میں پھر طمع و لالچ نہیں رہتا' ان کے سامنے زمین کا اقتدار ہیچ ہوتا ہے ۔ اہل اقتدار کے ڈر سے وہ بے نیاز ہو جاتے ہیں ۔ کوئی بھی انسان اور قلب انسانی آزادی کا یہ اعلان صرف ایمانی قوت کے بل بوتے پر کر سکتا ہے ۔ اب پردہ گرتا ہے' تاکہ اس قصے کی ایک

جدید کڑی کو اسٹیج پر لایا جائے۔

یہ وہ منظر ہے جس میں ایک سچی جماعت کو اس کرۂ ارض پر بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ نظریات اور ایمان کی دنیا میں اخلاقی فتح حاصل کر لیتی ہے۔ سیاق کلام میں عصا کو جادوگری پر فتح حاصل ہو چکی ہے۔ جادوگروں کے ایمان کو فرعون پر اخلاقی فتح حاصل ہو چکی ہے۔ ایمان کے بعد ان کو تمام دنیاوی خوف و خطر پر فتح حاصل ہو چکی ہے۔ وہ اب دھمکی اور دھونس سے نہیں ڈرتے۔ اب حق باطل پر' ایمان ضلالت پر' حق سرکشی پر عالم واقعہ میں فتح حاصل کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ آخری فتح مشروط ہے ایمانی اور نظریاتی فتح کے ساتھ۔ واقعہ اور میدان جنگ میں فتح تب ہوتی ہے جب ضمیر کے اندر کوئی گروہ فاتح ہو۔ اہل حق کو ظاہری فتح' ان کے باطن کی فتح کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور نظریات اپنے اندر ایک حقیقت رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت جب انسان کے شعور اور اس کی سوچ میں مجسم ہوتی ہے تو پھر یہ باہر نکلتی ہے اور لوگ اسے واقعی صورت میں زمین پر دیکھتے ہیں۔ اگر ایمان دلوں کے اندر مجسم شکل میں موجود نہ ہو' اور سچائی ایک شعاع اور عمل کی شکل میں دلوں سے بہہ کر نہ نکلتی ہو تو ایسے حالات میں سرکش اہل باطل ہی غالب ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک ایسی مادی قوت کے مالک ہوتے ہیں جس کے مقابلے کے لئے ایمانی قوت بھی اہل حق کے ساتھ نہیں ہوتی اور قوت کا توازن نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قلب اور دل میں ایمان ایک حقیقی قوت کی شکل میں موجود ہو۔ یہ ایمانی قوت اگر کسی کے اندر موجود ہو تو وہ بڑی سے بڑی مادی قوت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہی موقف تھا جو انہوں نے جادوگروں' فرعون اور سرداران فرعون کے مقابلے میں اختیار کیا۔ وہ ایمانی اور نظریاتی اور اخلاقی کامیابی کے بعد اس سرزمین پر بھی کامیاب ہوئے۔ ذرا اس منظر کو دیکھئے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝

"ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ' اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک بنالے' تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔ پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا' اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا' کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی"۔

یہاں قرآن مجید نے وہ تمام واقعات حذف کر دیے ہیں جو جادوگروں کے ساتھ مقابلے کے بعد پیش آئے۔ فرعون نے جادوگروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جبکہ وہ اپنی قوت ایمانی کے ساتھ فرعون کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ اس کی دھمکیوں سے نہ ڈرے' انہوں نے حیات دنیا کے بارے میں اپنا جدید نظریہ فرعون کے سامنے بڑی بے باکی سے پیش کیا۔ ان سب واقعات کو چھوڑ کر یہاں اب فتح ظاہری کا یہ منظر دکھایا جاتا ہے' تاکہ قلبی اور نظریاتی فتح کے بعد اب میدانی فتح کو

دکھایا جائے اور اللہ کی نصرت اور مدد اہل ایمان کو چشم سرنظر آجائے۔ مکمل اور فیصلہ کن فتح۔یہی وجہ ہے کہ یہاں اس منظر سے قبل بنی اسرائیل کے منظر خروج اور سمندر کے سامنے ان کے کھڑے ہونے کے مناظر کو طول نہیں دیا گیا' جس طرح ان مناظر کو دوسری سورتوں میں مفصل دکھایا گیا۔بلکہ چند جھلکیوں کے بعد مکمل فتح ہمارے سامنے ہے کیونکہ یہ تمام حذف شدہ مناظر ذہن انسانی خود سوچ سکتا ہے۔اس لیے یہ تخیل پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل جائیں۔ سمندر میں ان کو خشک راہ مل جائے گی اور فرعون کے لشکر ان کو نہ پکڑ سکیں گے۔ سمندر میں بننے والے خشک راستوں میں بھی خوف نہ کھاؤ' اللہ نے سمندر میں پانی کو جس قانون کے مطابق رکھا ہوا ہے وہ اسے کچھ دیر کے لیے اپنی طبیعی ڈگر سے ہٹا بھی سکتا ہے۔ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جب موسیٰ نکلے تو:

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (۷۸) وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰي (۷۹) (۲۰: ۷۸ - ۷۹) "پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا' اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا' کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی"۔

قرآن مجید یہاں فرعون کی غرقابی کا بھی مجملاً ذکر کرتا ہے۔ تفصیلات نہیں دی جاتیں تاکہ یہ واقعہ مجمل ہی رہے۔ فرعون نے زندگی بھر اپنی قوم کی قیادت فسق و فجور اور ضلالت میں کی اور اب تباہی اور بربادی کے وقت بھی سمندر میں اس نے اپنی قوم کی قیادت کی۔جس طرح اس واقعہ کی اس کڑی کو یہاں قرآن مجید نے خاص حکمت کے تحت مجمل چھوڑا ہے ہم بھی اسے مجمل ہی رہنے دیتے ہیں۔مناسب ہے کہ اس منظر سے ہمیں جو سبق حاصل ہوتا ہے اور اس منظر میں واقعات کا جو اثر دلوں پر ہوتا ہے اس کے حوالے سے بحث کی جائے۔

اس قصے میں پہلی عبرت یہ ہے کہ دست قدرت نے ایمان اور سرکشی کو آمنے سامنے لاکھڑا کیا ہے اور ان کے درمیان معرکہ برپا کیا گیا ہے' اس معرکہ میں اہل ایمان سے صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ بس وہ فقط احکام کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔حکم ہوا' کہ تم رات کو نکل پڑو' اس لیے کہ دونوں محاذوں کے درمیان جنگی قوت کا توازن نہ تھا۔حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو ان دو قوتوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ضعیف ہیں۔ ان کے پاس کوئی مادی قوت نہیں ہے۔جبکہ فرعون اور اس کی افواج ہر قسم کی قوت رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان کسی مادی جنگ کا کوئی موقع ہی نہیں ہے اس لیے یہ جنگ دست قدرت نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن جب اہل ایمان کے دلوں میں ایمانی قوت مضبوط ہو گئی' ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح داخل ہو گیا اور اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی مادی قوت نہ تھی تو قوت ایمانی نے ایک سرکش مقتدر اعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔اس کی دھمکیوں سے نہ ڈری اور اہل اقتدار کے پاس جو دولت اور عزت تھی اسے خاطر میں نہ لائی۔ سرکش ڈکٹیٹر نے کہا

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ

(۷۱) ”میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالوں گا اور کھجور کے تنوں پر تمہیں سولی دوں گا“۔ تو جواب میں انہوں نے کہا

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۰: ۷۲) ”تو جو کچھ کرنا چاہے کرلے تو زیادہ سے زیادہ بس اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے“۔ جب دلوں کے میدان میں نظریاتی اور ایمانی قوت اور سرکشی اور اقتدار کی قوت کے درمیان معرکہ یہاں تک پہنچ گیا تو اب دست قدرت نے ایمان کا جھنڈا اٹھالیا تاکہ اسے بلند کر دے اور اہل باطل کا جھنڈا سرنگوں کر دیا گیا بغیر اس کے کہ اہل حق اس کے لیے کوئی مادی جدوجہد کریں۔

دوسری عبرت یہ ہے کہ جب تک بنی اسرائیل ذلت اور غلامی کا ٹیکس فرعون کو ادا کرتے رہے ان کے بیٹے قتل ہوتے رہے اور ان کی بیٹیاں زندہ چھوڑی جاتی رہیں تو دست قدرت ان کی امداد کے لیے بلند نہ ہوا اور یہ معرکہ آرائی نہ کرائی گئی۔ کیونکہ وہ یہ ٹیکس محض ذلت' غلامی اور خوف کی وجہ سے ادا کرتے رہے لیکن جب ان لوگوں کے دلوں میں ایمان سربلند ہو گیا اور انہوں نے ایمان کی راہ میں مشکلات اور تشدد برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب انہوں نے سر اٹھا کے چلنے کی رسم ڈال لی۔ کلمہ حق بلند کرنا شروع کر دیا اور فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا شروع کر دیا اور یہ کام انہوں نے ہر قسم کا خطرہ انگیز کرتے ہوئے کیا تو پھر دست قدرت ان کی مدد کے لیے بلند ہوا۔ یہ معرکہ شروع ہوا' اس وقت جبکہ میدانی فتح سے قبل اہل ایمان دل کی دنیا میں فتح پا چکے تھے۔

اس اجمال کے ذریعہ یہاں قرآن کریم یہی عبرت اور سبق دینا چاہتا ہے اور ان مناظر میں تفصیلات یعنی جزوی تفصیلات نہیں دی گئی تاکہ دعوت اسلامی کے حاملین کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کی طرف سے ان کی نصرت کب ہو گی اور باغیوں اور سرکشوں کے مقابلے میں فتح کب نصیب ہو گی۔

---000---

جب بنی اسرائیل فتح و نصرت کے جھنڈے اٹھاتے ہوئے ایک آزاد فضا میں قدم رکھ رہے تھے تو اب ان کو نصیحت کی جاتی ہے' سچائی کا سبق یاد کرایا جاتا ہے اور انجام بد سے انہیں ڈرایا جاتا ہے تاکہ وہ اس سبق کو بھول نہ جائیں جو فرعون و موسیٰ کی کشمکش سے حاصل ہوتا ہے۔ اب آزادی اور اقتدار کی فضائیں ان کو کبر و غرور میں مبتلا نہ کر دے اور وہ اس سازوسامان کو نظر انداز نہ کر دیں جس کی وجہ سے انہیں طاقت کے عدم توازن کے باوجود' فتح نصیب ہوئی کیونکہ یہ اصل قوت' قوت ایمانی ہی ہر میدان میں فتح کی ضامن ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

ثُمَّ اهْتَدٰى ۝

"اے بنی اسرائیل 'ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی' اور طور کے دائیں جانب تمہاری حاضری کے لئے وقت مقرر کیا اور تم پر من و سلوٰی اتارا... کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو' ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا۔ اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے' پھر سیدھا چلتا رہے اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں"۔

اب تو خطرے کا علاقہ گزر گیا۔ بنی اسرائیل کامیابی سے طور کی طرف سینائی کے میدان میں آ گئے۔ فرعون اور اس کی افواج سمندر میں غرق ہو گئیں۔ بنی اسرائیل کی اس نجات پر ابھی تک زیادہ عرصہ نہیں گزرا' یہ ان کے حافظے میں تازہ واقعہ ہے لیکن اس تازہ ترین نعمت کی طرف بھی باری تعالیٰ ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ تم اس واقعہ کو کہیں بھول نہ جاؤ۔ غور کرو اور شکر کرو۔

یہاں بنی اسرائیل کے ساتھ طور ایمن کے جس وعدے کا ذکر ہے' یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ مصر سے اخراج کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے طور پر بلایا تھا تاکہ وہ اللہ کے ساتھ ملاقات کے لئے تربیت حاصل کریں گی اور اللہ وہ تعلیمات سنیں جو الواح میں انہیں دی جاتی تھیں۔ جن کا تعلق دین اور شریعت سے تھا اور بنی اسرائیل اس عالمی کردار کے لئے تیار اور منظم ہوں جو انہوں نے ارض مقدس میں سرانجام دینا تھا۔

پھر ان کے لیے من نازل کرنا' من ایک ایسا میٹھا مادہ تھا جو درختوں کے پتوں پر جمع ہو جاتا تھا اور سلوٰی ایک پرندہ تھا جو وہاں بکثرت ان کے لیے صحرا میں جمع ہو جاتا تھا' جسے بسہولت پکڑا اور کھایا جا سکتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ان کے لیے اس چٹیل میدان اور غیر آباد صحرا میں خصوصی انعام تھیں۔ یہ چیزیں ان کو روز مرہ کے کھانے میں فراہم ہو جاتی تھیں اور بڑی سہولت سے فراہم ہو جاتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو یہ انعامات یاد دلا کر' یہ نصیحت کرتا ہے کہ ان کو کھاؤ لیکن سرکشی مت کرو اور عیش و عشرت میں گم ہو کر ان مقاصد اور اس نصب العین کو نہ بھول جاؤ جس کے لیے تم مصر سے نکلے ہو' اور جس بات سے یہاں خصوصاً انہیں منع کیا جا رہا ہے وہ سرکشی ہے۔ سرکشی کو تو وہ مصر میں دیکھ چکے تھے۔ اس کے تحت وہ مظالم سہہ چکے تھے اور اس کا انجام بھی دیکھ چکے تھے۔

وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى (۲۰ : ۸۱) "سرکشی نہ کرو' ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا اور جن پر میرا غضب ٹوٹا' وہ پھر گر کر ہی رہا"۔ حال ہی میں وہ دیکھ چکے تھے کہ فرعون کس طرح گرا۔ وہ تخت سے بھی گرا اور پھر سمندر میں بھی گرا۔ گرنا جس طرح اوپر سے نیچے کے عمل کو دکھاتا ہے' اسی طرح سرکشی اور تکبر نیچے سے اوپر کی طرف جانے کے عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو قرآن کریم اپنے مخصوص انداز بیان کے مطابق باہم مربوط کر کے پیش کرتا ہے جس میں مفہومات باہم متقابل ہوتے ہیں۔

یہ تنبیہ اور ڈراوا اس قوم کے لیے ہے جو حال ہی میں ایک مخصوص مقصد کے لیے مصر سے نکلی ہے تاکہ آزادی اور عیش پرستی ان کو گمراہ نہ کر دے۔ وہ عیش پرستی اختیار کر کے کمزور نہ ہو جائیں۔ لیکن اس تنبیہ اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ توبہ کا دروازہ بھی کھلا رہتا ہے تاکہ اگر کسی سے غلطی ہو تو وہ واپس آ سکے۔

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (۲۰:۸۲) "البتہ جو توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلے، اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں"۔ یہ یاد رہے کہ توبہ صرف لفظ کا نام نہیں ہے کہ کوئی اسے گائے بلکہ یہ تو قلبی عزم کا نام ہے۔ اس کے مفہوم کا تعین ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ ہی ہوتا ہے اور اس کا ظہور عالم واقعہ میں انسانی طرز عمل سے ہوتا ہے۔ اگر توبہ کر لی، ایمان درست رہا اور عمل نے اس کی تصدیق کی تو تب انسان کو ہدایت یافتہ انسان کہا جاسکتا ہے، انسانی ہدایت اور عمل صالح کی ضمانت غرض جب توبہ کے بعد ہدایت نہ ہو یعنی عملی تبدیلی نہ ہو تو توبہ کا کوئی مفہوم نہیں رہتا۔

یہاں تک ہم بنی اسرائیل کی کامیابی اور اس پر تبصرہ و نصیحت کا منظر دیکھ رہے تھے، اب پردہ گرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے منظر میں حضرت موسیٰ طور ایمن پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام نظر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ طور پر چالیس روز گزاریں اور اس کے بعد اللہ سے ہمکلام ہو کر اس سے احکام لیں۔ یعنی شکست کے بعد فتح حاصل کرنے کے احکام۔ فتح حاصل کرنا کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے۔ ہر نظریہ کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ نیز احکام لینے کے لیے نفسیاتی تیاری اور اپنے اندر استعداد پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔ حضرت موسیٰ پہاڑ پر چڑھ گئے اور قوم کو پیچھے چھوڑ دیا اور حضرت ہارونؑ کو ان میں اپنا نائب مقرر کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو اس ملاقات کا بے حد شوق تھا، اللہ کے سامنے حاضری دینا بڑا اعزاز تھا، وہ اس کے لیے بے تاب تھے۔ اس سے قبل وہ اللہ کے ساتھ ہمکلامی کی مٹھاس چکھ چکے تھے۔ اس لیے وہ بے حد شوق سے جلدی میں طور پر پہنچ گئے۔ اللہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی قوم نے ان کے بعد کیا گل کھلائے ہیں کیونکہ وہ ان کو پہاڑ کے نیچے چھوڑ آئے تھے۔

یہاں موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ بتا دیتے ہیں کہ تمہارے بعد بنی اسرائیل نے کیا حرکت کی ہے۔ ذرا منظر کو دیکھیں اور گفتگو سنیں:

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾

"اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی اے موسیٰ؟ اس نے عرض کیا "وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔

میں جلدی کر کے تیرے حضور آگیا ہوں' اے میرے رب' تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے' فرمایا ''اچھا تو سنو' ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا''۔

موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر حیران رہ گئے۔ وہ رب تعالیٰ کی ملاقات کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے چالیس دن کا وقت بھی گزار لیا تھا اور ملاقات کی تیاری بھی کر لی تھی تاکہ وہ بنی اسرائیل کے لیے نیا نظام زندگی حاصل کر لیں کیونکہ ابھی ابھی وہ آپ کی قیادت میں فرعون کی غلامی سے رہا ہوئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل ایک ایسی امت ہو جس کے پاس ایک پیغام ہو اور اس کے کچھ فرائض ہوں۔

لیکن بنی اسرائیل کی حالت یہ تھی کہ ایک طویل ذلت کی زندگی اور بت پرستانہ فرعونیت کی غلامی نے ان کا ضمیر بدل دیا تھا۔ وہ مشقت برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ نہ مشکلات میں صبر کر سکتے تھے اور نہ کسی قول و قرار پر ثابت قدم رہ سکتے تھے۔ ان کے شعور میں غلامی تقلید اور سہل پسندی رچ بس گئی تھی۔ جونہی موسیٰ ان کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ کر ان سے ذرا دور ہوئے ان کے عقائد بدل گئے اور پہلی ہی آزمائش میں وہ چار شانے چت ہو گئے۔ ان کے لیے تو مسلسل امتحان ضروری تھا اور مسلسل مشکلات اور آزمائشوں میں ان کو بار بار ڈالنا ضروری تھا تاکہ ان کی نفسیاتی تربیت ہو۔ گوسالہ پرستی ان کی پہلی آزمائش تھی' یہ ایک مصنوعی بچھڑا تھا جو سامری نے ان کے لیے تیار کیا تھا۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (۲۰ : ۸۵) ''فرمایا اچھا تو سنو' کہ ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا' اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا''۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس ابتلاء کا پتہ نہ تھا۔ اللہ کے ساتھ ملاقات میں پہلی بار ان کو پتہ چلا۔ حضرت موسیٰ نے یہ تختیاں لیں۔ ان میں ہدایت تھی۔ اس میں بنی اسرائیل کی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک ایسا دستور تھا جو انہیں اس مقصد کے لیے تیار کر کے دیا گیا تھا جس کے لیے انہیں اٹھایا گیا تھا۔

یہاں کوہ طور موسیٰ علیہ السلام کی مناجات کا منظر جلدی سے لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان تاثرات کو قلم بند کیا جائے جو ان پر قوم کی گمراہی کی خبر سن کر طاری ہوئے۔ واپسی کے لیے ان کی جلدی بھی منظر پر آئے اور یہ دکھایا جائے کہ وہ کس قدر غیظ و غضب میں ہیں۔ اس قوم کو تو انہوں نے حال ہی میں فرعون کی غلامی سے چھڑایا تھا اور بت پرستی کی ذلت سے نجات دلائی تھی۔ پھر اللہ نے صحرا میں ان کے لیے کھانے پینے کی سہولتیں مہیا کیں اور صاف صاف ہدایات بھی دیں کہ گمراہی سے بچنا اور گمراہی کے عواقب اور نتائج بھی بتا دیئے۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ وہ پہلی ہی پکار پر بت پرست بن گئے اور پھر مصنوعی گوسالہ کی پرستش میں لگ گئے۔

یہاں قرآن مجید صراحت کے ساتھ یہ نہیں بتاتا کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی ضلالت کی تفصیلات بتا دی تھی یا نہیں لیکن واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غیظ و غضب کا اظہار کرنا' نہایت ہی ناراض ہونا' بھائی پر غصہ ہونا اور قوم کو ملامت کرنا' یہ سب امور یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ نے ان کو سب کچھ بتلا دیا تھا اور وہ جان گئے تھے کہ بنی اسرائیل نے کسی نہایت ہی بری حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔

فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِي ﴿٨٦﴾ قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾ فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَٰذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ﴿٩٠﴾ قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿٩١﴾

""موسیٰ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟ کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں؟ یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟ انہوں نے جواب دیا "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی' معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا"... پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے "یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا' موسیٰ اسے بھول گیا"۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟ ہارون (موسیٰ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ "لوگو' تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو' تمہارا رب تو رحمٰن ہے' پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو"۔ مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ "ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس نہ آ جائے"۔

یہ ہے وہ فتنہ جس کے ذریعہ بنی اسرائیل گمراہ ہوئے' لیکن قرآن اس کا تذکرہ اس وقت کرتا ہے جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے آ کر تحقیق کرتے ہیں۔ اس سے قبل اللہ کے ساتھ مناجات کے موقعہ پر قرآن نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ان تفصیلات کو خفیہ رکھا تاکہ ان کو اس وقت ظاہر کیا جائے جب موسیٰ علیہ السلام خود تحقیقات کر لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ایک ایسے مصنوعی بچھڑے کی پوجا کر رہی جو آواز نکالتا ہے۔ یہ بچھڑا سونے سے بنا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہے تمہارا رب اور یہی ہے موسیٰ کا رب۔ موسیٰ غلطی سے طور پر چلے گئے 'رب سے ملاقات کے لیے حالانکہ رب تو یہ ہے حاضر تمہارے سامنے !!

جب موسیٰ علیہ السلام آئے تو نہایت ہی طیش کی حالت میں ان سے پوچھنے لگے۔

يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا (۲۰ : ۸۶) "اے میری قوم کے لوگو' کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے"۔ اللہ نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم عقیدۂ توحید پر جمے رہے تو تم ارض مقدس میں داخل ہو گے اور تمہیں نصرت ملے گی۔ اس عہد اور اس کے آثار کے ظہور پر کوئی زیادہ طویل عرصہ تو نہ گزر گیا تھا۔ وہ ان کی سخت گوشمالی کرتے ہیں۔

اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲۰ : ۸۶)

"کیا تمہیں دن لگ گئے تھے یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے"۔ کیونکہ تمہارا یہ عمل تو ایسا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اللہ کے غضب کے طلبگار ہو' تم نے گویا عمداً یہ حرکت کی ہے اور قصداً تم اللہ کا غضب چاہتے ہو۔ کیا کوئی بہت ہی طویل عرصہ گزر گیا تھا۔

فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ (۲۰ : ۸۶) "تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی"۔ تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ میرے آنے تک تم میرے عہد پر قائم رہو گے۔ تم اپنے نظریات و عمل میں کوئی تبدیلی نہ کرو گے بغیر میری اجازت کے۔

اب ذرا ان کی معذرت کو دیکھو' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طویل ترین غلامی نے ان کے قلب و نظر کو فاسد کر دیا تھا اور ان کا دماغ بھی صحیح طرح کام نہ کر رہا تھا۔

مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا (۲۰ : ۸۷) "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی"۔ بات اتنی بڑی تھی کہ ہمارے بس میں نہ تھا کہ ہم اس سے باز رہتے۔

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا (۲۰ : ۸۷) "معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا"۔ ان کے پاس مصری عورتوں کے زیورات تھے جو وہ ساتھ لے آئے تھے۔ اس بوجھ کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔ ہم نے ان زیورات کو بوجھ اتارنے کے لیے پھینک دیا تھا کیونکہ یہ ہمارے پاس تھے اور تھے حرام۔ سامری نے ان کو چن لیا اور ان سے یہ بچھڑا بنا دیا۔ سامری مصر کا باشندہ تھا جو ان کا ساتھی بن گیا تھا۔ یا یہ بنی اسرائیل ہی میں سے ایک شخص تھا' جس نے یہ لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس نے اس بچھڑے میں ایسے سوراخ بنائے تھے کہ جب ان سے ہوا نکلتی تو بچھڑے جیسی آواز نکلتی تھی۔ اس بچھڑے میں نہ زندگی تھی اور نہ روح تھی۔ کیونکہ وہ تو ایک مردہ جسم تھا جو اس جسم کو کہا جاتا ہے جس میں زندگی نہ ہو۔ جونہی انہوں نے اس بچھڑے کو

آواز کرتے پایا۔ انہوں نے اس خدا کو بھلا دیا جس نے انہیں مصر سے نجات دی تھی یعنی ذلت کی سرزمین سے۔ چنانچہ انہوں نے سونے کے اس بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اپنی کم عقلی اور حماقت کی وجہ سے یہ کہنے لگے :

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى (۲۰: ۸۸) "یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا"۔ موسیٰ اسے پہاڑ پر ڈھونڈ رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے ہمارے پاس' اور موسیٰ نے رب کا راستہ ہی بھلا دیا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ان کی بے شعوری اور کم عقلی بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس قدر آسانی سے اپنے اس نبی پر تہمت لگا رہے ہیں جس کے زیر قیادت ابھی ابھی اللہ کی زیر نگرانی اور زیر نظر انہوں نے نجات پائی اور عین اللہ کی ہدایات کے مطابق ان کو یہ آزادی حاصل ہوئی۔ ایسے حالات میں ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگانا کہ وہ اپنے رب سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے' انہوں نے راستہ ہی خطا کر دیا اور وہ رب تک پہنچ ہی نہ پائے۔ یہ ایک بہت بڑی جسارت ہے ان کی طرف سے لیکن وہ بنی اسرائیل تھے۔

یہ بات وہ بظاہر تو بطور عذر کر رہے ہیں لیکن دراصل یہ ان کی جانب سے واضح دھوکہ ہے۔

اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (۲۰: ۸۹) "کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وہ تو زندہ بچھڑا بھی نہ تھا کہ وہ ان کی بات سن سکتا اور نہ اس قدر جواب دے سکتا تھا جس قدر ایک زندہ بچھڑا دے سکتا ہے۔ چونکہ یہ بچھڑا تو حیوانیت کے درجے سے بھی نیچے ہے' لہٰذا وہ ان کے نفع و نقصان کا مالک بھی نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی سادہ حقیقت ہے کہ وہ نہ ہل چلاتا ہے نہ کنویں سے پانی نکال سکتا ہے نہ آٹے کی چکی چلا سکتا ہے۔

ان سب امور کو ایک طرف رہنے دیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام موجود تھے۔ وہ ان کے نبی بھی تھے اور اس نبی کے نائب تھے جو ان کا نجات دہندہ تھا۔ اس وقت انہوں نے ان کو متنبہ بھی کیا جب ان پر یہ آزمائش آئی۔ انہوں نے کہا تھا:

یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ (۲۰: ۹۰) "لوگو' تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو' تمہارا رب تو رحمٰن ہے"۔ ان کو انہوں نے نصیحت کی کہ لوگو' میری اطاعت کرو' تم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عہد بھی کر رکھا ہے اور وہ پہاڑ پر اپنے رب کے بلاوے پر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آنے والے ہیں' لیکن انہوں نے نصیحت ماننے کے بجائے منہ پھیر لیا اور اس عہد سے پھر گئے جو انہوں نے موسیٰ سے کیا کہ میرے بعد تم ہارون کی اطاعت کرو گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰى یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰى (۲۰: ۹۱) "مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اس کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آئے"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس نہایت ہی غصے اور رنج کی حالت میں لوٹے۔ انہوں نے ان کی یہ دلیل سن کر ہی معلوم کر لیا کہ کس قدر تھوڑے عرصے

ہیں ان کے عقیدے میں کس قدر عظیم خلل پڑ گیا ہے۔ ان کی فکر میں کس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ نہایت ہی غصے کی حالت میں اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئے' ان کو ان کے سر کے بالوں سے پکڑا اور داڑھی سے پکڑا اور کھینچا۔ سخت اشتعال میں تھے حضرت موسیٰ ۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾

"موسیٰ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف پلٹے اور) بولے "ہارون' تم نے جب کہا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟"

موسیٰ نے ہارون سے کہا' اے ہارون' جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہار ہاتھ پکڑا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو' کیا تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔ سرزنش اس بات پر ہو رہی ہے کہ کیوں آپ نے ان کو اس پرستش پر رہنے دیا کیوں نہ تم نے اس کی ممانعت کی۔ میرے صریح احکام کے مطابق کہ میرے بعد کوئی نئی بات پیدا نہ کرنا۔ نہ کسی کو کوئی نئی رسم ایجاد کرنے کی اجازت دینا۔ حضرت موسیٰ ان کا مواخذہ کرتے ہیں کہ تم نے میرے احکام نافذ کیوں نہ کیے؟ کیا تم نے بھی میری نافرمانی کی؟

اس سے قبل قرآن نے فیصلہ دے دیا ہے کہ حضرت ہارون کا موقف کیا تھا۔ وہ بھائی کو حقیقی صورت حالات بتاتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ ذرا غصہ فرو کیجئے۔ وہ بھائی چارے کا واسطہ دے کر کہتے ہیں۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

"ہارون نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے' میری داڑھی نہ پکڑ' نہ میرے سر کے بال کھینچ' مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا"۔

نظر آتا ہے کہ حضرت ہارون ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور حضرت موسیٰ کے مقابلے میں اپنے جذبات پر قابو رکھتے تھے۔ وہ حضرت موسیٰ کے شعور میں ایک حساس پوئنٹ تلاش کرتے ہیں۔ برادری ایک حساس رشتہ ہے۔ اپنے خیال کے مطابق وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اگر میں آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تو بنی اسرائیل کے اندر فرقہ بندی ہو جاتی۔ ایک گروہ بچھڑے کی حمایت میں اٹھ جاتا دوسرا میرے ساتھ ہو جاتا حالانکہ آپ کا حکم یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی حفاظت اور نگرانی رکھ اور ان میں کوئی نئی بات پیدا ہونے نہ دو' تو ان کو انتشار سے بچانا بھی اطاعت امر ہے۔

حضرت موسیٰ کے غضب اور غصے کا رخ سامری کی طرف مڑ جاتا ہے جس نے اس فتنے کو ایجاد کیا تھا۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ اس کی طرف اس لیے متوجہ نہیں ہوتے کہ لوگوں کا بھی یہ فریضہ تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کی اطاعت

نہ کریں ۔ پھر حضرت ہارون کی ذمہ داری آتی ہے کیونکہ وہ بھی ذمہ دار تھے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کی راہ روکتے ۔ رہے سامری تو ان کی ذمہ داری سب سے آخر میں آتی ہے کیونکہ اس نے ان کو زبردستی بچھڑے کی عبادت کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ نہ اس نے ان کی عقل پر تالا لگا دیا تھا۔ اس نے ان کو گمراہ کیا اور یہ گمراہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے ۔ ان کے بس میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے پہلے نبی کی اطاعت کرتے 'پھر ان کا یہ فریضہ تھا کہ دوسرے نبی کی نصیحت پر عمل کرتے ۔ لہٰذا اصل ذمہ داری پہلے قوم کی ہے 'پھر ان کے نگراں کی 'اور اس کے بعد اس شخص کی ہے جس نے یہ فتنہ پیدا کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ سب سے آخر میں اس کی طرف متوجہ ہوئے ۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾

"موسیٰ نے کہا "اور سامری' تیرا کیا معاملہ ہے ؟" سامری تم بتاؤ تم نے کیا کیا اور کیوں کیا ؟ یہ لفظ بتاتا ہے کہ سامری نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے ۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

"اس نے جواب دیا "میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی' پس میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا"۔

سامری کے اس جواب کی تفسیر میں کئی اقوال و روایات وارد ہیں ۔ اس نے کیا چیز دیکھی جو اوروں نے نہ دیکھی؟ وہ رسول کون تھے جس کے نقش قدم سے انہوں نے مٹھی لی اور پھینک دی؟ پھر اس فعل کا بچھڑا سازی سے کیا تعلق ہے؟ بچھڑے میں اس مٹی نے کیا اثرات کیے؟

ان روایات میں سے بیشتر میں یہ بات ہے کہ سامری نے جبرئیل علیہ السلام کو اس شکل میں دیکھا جس میں وہ زمین پر اترتے ہیں ان کے قدموں کے نیچے سے اس نے خاک اٹھالی ۔ یا اس کے گھوڑے کے قدموں کے نیچے سے خاک اٹھالی اور اسے سونے سے بنائے ہوئے بچھڑے پر ڈالا اور اس سے آواز آنے لگی ۔ یا اس مٹی نے سونے کے ڈھیر سے بچھڑا بنا دیا۔

قرآن کریم نے یہاں اس حقیقت واقعہ کی وضاحت نہیں کی ۔ قرآن کریم نے صرف سامری کا قول نقل کیا ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں یہ سامری کی طرف سے عذر لنگ تھا' اس نے یہ عذر گھڑا تاکہ اپنی اس حرکت کے نتائج سے بچ جائے ۔ بچھڑا تو اس سونے سے بنایا تھا جو بنی اسرائیل مصر سے ساتھ لے آئے تھے اور پھر پھینک دیا تھا۔ سامری نے اس انداز سے بنایا کہ ہوا اس سے ایسی آواز نکالتی تھی جیسا کہ ایک بچھڑے کی آواز آتی ہے ۔ اس کے بعد اس نے رسول کے آثار کی مٹی کا ذکر کیا۔ اس لیے کہ اپنی اس حرکت کو تقدس کا رنگ دے اور اس معاملے کا جوڑ رسول کے نقش قدم سے لگا دے ۔

بہرحال حقیقت جو بھی ہو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے جماعت بنی اسرائیل سے نکال دیا۔ پوری عمر کے لیے اسے ملک بدر کر دیا اور آخرت میں اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس مصنوعی الٰہ کے معاملے میں سامری کے ساتھ سخت برتاؤ کیا اور اس الٰہ کے بارے میں بھی ایسا رویہ اختیار کیا تاکہ لوگ دیکھیں کہ اس الٰہ نے اپنے بنانے والے کو بھی کوئی مدد نہ پہنچائی۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهُ ۚ وَانْظُرْ إِلٰى إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۖ لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

"موسیٰ نے کہا "اچھا تو جا' اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا۔ اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا' اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے"۔

جاؤ تم ملک بدر ہو' تمہیں کوئی شخص بھی ہاتھ نہ لگائے گا' نہ اچھائی سے اور نہ برائی کے ساتھ اور نہ تم کسی کے ساتھ ہاتھ لگاؤ گے۔ موسیٰ علیہ السلام کے دین میں یہ سزاؤں میں سے ایک سزا تھی۔ یہ اچھوت بنانے کی سزا تھی اور مجرم کو گندا قرار دیا جاتا تھا کہ نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے' نہ اس کے ساتھ کوئی ہاتھ لگائے۔ یہ کہ تمہارے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے' تو اس سے مراد قیامت کا وقت جزاء و سزا ہے جس سے اگر کوئی بچنا چاہے بھی تو نہیں بچ سکتا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے بڑی سختی اور غصے میں یہ احکام دیئے کہ اس بچھڑے کو لے جاکر جلاؤ اور اس کی آنکھ کو پانی میں بکھیر دو۔ سختی اور غصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج کا حصہ ہے۔ یہاں ان کی یہ سختی اور غصہ صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ کے دین کے معاملے میں غصہ معیوب نہیں ہوتا۔ دین کے معاملے میں شدت مستحسن سمجھی جاتی ہے۔

جب سامری کا یہ الٰہ جلتا ہوا نظر آتا تھا' تو اس منظر کے سامنے حضرت موسیٰ نے مناسب سمجھا کہ اسلامی عقیدے اور اللہ کے بارے میں حقیقت لوگوں کو بتا دی جائے۔

إِنَّمَا إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

"لوگو' تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے' جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے' ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے"۔

اسلامی عقیدے کے بارے میں اس وضاحت کے ساتھ ہی اس سورہ میں قصہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ حصہ اب ختم ہوتا ہے۔ اس قصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حاملین دعوت اسلامی پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہر طرف سے ہوتی ہے۔ اگرچہ

ابتداء میں ان سے کوئی غلطی بھی ہو جائے۔ اس کے بعد اس قصے کے دوسرے مراحل کو یہاں ترک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ بنی اسرائیل نافرمانیاں کرتے ہیں' اور ان پر ایک کے بعد ایک عذاب آتا ہے۔ چونکہ یہاں رحمت اور مہربانی اور نوازشات کا موضوع ہے اور یہ رحمتیں اللہ کے نیک بندوں پر ہوتی ہیں' اس لیے اس قصے کی وہ کڑیاں جن میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا تذکرہ آتا ہے' ان کا ذکر چونکہ موضوع و مضمون اور سورہ کی فضا کے خلاف ہے اس لیے ان کو یہاں حذف کر کے اس قصہ کو یہاں ختم کر دیا گیا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۳۹ ایک نظر میں

سورہ کے آغاز میں موضوع بحث قرآن مجید تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کی وجہ سے ان کو مصیبت میں ڈالا جائے۔ اس کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو لے کر یہ ثابت کیا گیا کہ اللہ اپنے بندوں اور رسولوں کے ساتھ کس قدر رعایت کرتا ہے اور ان پر کس قدر مہربانیاں ہوتی ہیں جس طرح حضرت موسیٰ' ان کے بھائی اور ان کی قوم پر ہوئی تھیں۔

اس طویل قصے پر اب یہاں تبصرہ کیا جاتا ہے اور موضوع سخن پھر قرآن مجید ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد کیا ہے؟ جو لوگ اس سے منہ پھیریں گے' ان کا انجام کیا ہو گا؟ یہ انجام قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کو پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ دنیا کے شب و روز سکڑ جائیں گے' زمین کے اوپر سے پہاڑ اڑ جائیں گے اور یہ تنگی رہ جائے گی'' بس ایک چٹیل میدان ہو گا' لوگ میدان حشر میں سہمے کھڑے ہوں گے اور تمام چہرے حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوئے اور سرنگوں ہوں گے۔ یہ منظر اور قرآن مجید کے تمام وہ مناظر جن میں لوگوں کو ڈرایا گیا ہے' ان سے غرض و غایت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کیا جائے۔ قرآن مجید کی بحث کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ تسلی بھی دی جاتی ہے کہ آپ قرآن مجید کو نہ بھولیں گے۔ بھول کے خوف سے اس کے دہرانے میں جلدی نہ کیجئے۔ اس کی وجہ سے اپنے اوپر مصیبت نہ لیجئے' اللہ اسے آپ کے لیے آسان کر دے گا اور آپ کو حفظ کرا دیا جائے گا۔ آپ بس یہ دعا کرتے رہیں کہ اے میرے رب' میرے علم میں اضافہ کر۔

جب وحی نازل ہونے لگتی تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی ختم ہونے سے پہلے ہی قرآن کی عبارت کو دہرانا شروع فرما دیتے تھے' اس خوف سے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ اس بارے میں ان کو تسلی دی گئی لیکن موضوع کی مناسبت سے بتایا گیا کہ آدم علیہ السلام اپنے عہد کو بھول گئے تھے۔ ابلیس نے انہیں بھلا دیا تھا اس لیے آدم اور ابلیس کے درمیان جدی دشمنی چلی آرہی ہے۔ اولاد آدم میں سے بعض لوگ اپنے عہد کو بھلاتے ہیں اور بعض اس کو یاد رکھتے ہیں اور اس انجام کو بھی قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ اس سفر کا انجام ہے جو عالم بالا سے شروع ہوا اور اس کا خاتمہ بھی عالم بالا پر جا کر ہوا۔

سورہ کا خاتمہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اے رسول آپ ان لوگوں کے لیے پریشان نہ ہوں جو دعوت کی تکذیب کرتے ہیں یا اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس دنیا میں ایک محدود وقت دیا گیا ہے۔ اس محدود وقت میں ان کو جو ساز و سامان اور متاع دنیا کی وافر مقدار دی گئی ہے' یہ ان کے لیے کوئی بہتری نہیں ہے۔ یہ تو ان کے لیے فتنہ اور آزمائش ہے۔ آپ کو یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی بندگی اور اس کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جائیں' یوں آپ کو

کسی دولت مند کی دولت سے زیادہ اطمینان حاصل ہو گا اور آپ اپنی حالت پر راضی ہوں گے۔ اس سے قبل اللہ نے بہت سی اقوام کو اسی طرح آزمائش میں ڈال کر ہلاک کیا ہے۔ اللہ نے لوگوں کی طرف نبی آخر الزمان اور آخری رسول کو بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب لوگوں کے پاس کیا جواز ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ لہٰذا آپ ان کے انجام کے معاملے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اور اس کو اللہ پر چھوڑ دیں اور کہہ دیں۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰي (۲۰:۱۳۵) "اے محمدؐ ان سے کہو ہر ایک انجام کار کے انتظار میں ہے' بس اب منتظر رہو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں' اور کون ہدایت یافتہ"۔

درس نمبر ۱۳۹ تشریح آیات

۹۹ --- تا --- ۱۳۵

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۚ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

۵
۱۵ع
۱۴

”اے نبیؐ، اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سناتے ہیں، اور ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک ”ذکر“ (درس نصیحت) عطا کیا ہے جو کوئی اس سے منہ موڑے گا وہ قیامت کے روز سخت بار گناہ اٹھائے گا اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے، اور قیامت کے دن ان کے لیے (اس جرم کی ذمہ داری کا بوجھ) بڑا تکلیف دہ بوجھ ہو گا۔ اس دن جبکہ صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہوں گی۔ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ ”دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے“۔۔۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہو گا وہ کہے گا کہ نہیں، تمہاری دنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی“۔

آپ پر جو قصص نازل کیے جا رہے ہیں، یہ ماضی کے واقعات ہیں۔ قرآن میں ان کو بیان کیا جا رہا ہے۔ قرآن کو اسی لحاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قصص بھی دراصل ذکر الٰہی اور آیات الٰہی ہیں اور قرون اولیٰ میں جو آیات الٰہی ظاہر ہوئیں یہ ان کا بھی ذکر ہے۔

جو لوگ اس ذکر سے منہ موڑتے ہیں' ان کو یہاں مجرمین کے نام سے پکارا گیا ہے ۔ یہاں ان کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے ۔ انہوں نے بڑے بڑے بوجھ اٹھا رکھے ہیں' جس طرح مسافر اپنا بوجھ اٹھا رہا ہوتا ہے ۔ لیکن ان کے اس بوجھ میں ان کے لیے کوئی مفید چیز نہیں ہے ۔ جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن مجرمین کے چہرے نیلے ہو جائیں گے ' یعنی خوف کی وجہ سے اور بے حد غم کی وجہ سے ان کے چہرے نیلے نظر آئیں ۔ وہ چپکے چپکے ایک دوسرے سے بات کر رہے ہوں گے ۔ ماحول میں چھائے ہوئے خوف اور قیامت کے ہول کی وجہ سے وہ اونچی بات نہ کریں گے ۔ وہ کیا بات کر رہے ہوں گے ۔ وہ ان دنوں کے بارے میں ہوگی جو انہوں نے زمین پر گزارے ہوں گے ۔ ان کی حس اور شعور میں دنیا کا پورا زمانہ اس قدر سکڑا ہوا اور مختصر ہو گا کہ پوری زندگی یا زمین پر پورا انسانی دور انہیں چند ایام پر مشتمل نظر آئے گا ۔

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (۲۰ : ۱۰۳) "تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے" ۔ ان میں سے جو شخص زیادہ صائب الرائے ہو گا وہ اس سے بھی کم اندازہ لگائے گا کہ صرف ایک دن کی زندگی تھی ۔

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا (۲۰ : ۱۰۴) "تم نے صرف ایک دن زندگی بسر کی" ۔ یوں دنیا کی یہ طویل زندگیاں انہیں نہایت ہی مختصر نظر آئیں گی ۔ یہاں زندگی میں لوگوں نے جو عیاشیاں کی تھیں' وہ زندگی کے غم نظر آئیں گے اور ایک نہایت ہی مختصر زمانہ نظر آئے گا ۔ قدر و قیمت کے اعتبار سے بھی حقیر زمانہ ۔ کیونکہ دس راتوں کی کیا قیمت ہے اگرچہ حد درجہ عیش و عشرت ہو' اور ایک رات کی قدر و قیمت کیا ہے اگرچہ اس کا ایک ایک منٹ خوش بختی سے بھرا پڑا ہو ۔ ان دونوں کی قدر و قیمت بمقابلہ زمانہ لامحدود اور ایام خلود کیا قیمت ہو سکتی ہے' جس میں یہ لوگ اب حساب و کتاب کے بعد جانے والے ہیں یعنی جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ۔

اس ہولناک منظر قیامت سے ہمیں پھر یہاں دنیا میں لایا جاتا ہے' یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ قیامت میں ان پہاڑوں کا کیا ہو گا ۔ ان کو تو بس یہ پہاڑ ہی پڑے نظر آتے ہیں ۔ جواب میں اس وقت بھی نہایت ہی خوفناک اور ہولناک تصویر کشی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے تم پہاڑوں کا غم مت کرو خود اپنی فکر کرو کہ تم پر کیا گزرے گی ۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

"یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو کہ میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔ اس روز سب لوگ منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے' کوئی ذرا اکڑ نہ دکھا سکے گا اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی' ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی' الا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے--- وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے--- لوگوں کے سر اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے۔ نامراد ہوگا جو اس وقت کسی ظلم کا بار گناہ اٹھائے ہوئے ہوگا۔ اور کسی ظلم یا حق تلفی کا خطرہ نہ ہوگا اس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو"۔

یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے اور گرد و غبار بنا کر اڑا دیئے جائیں گے۔ اب بلندیوں کی جگہ ایک سیدھا میدان ہوگا۔ ایسا میدان جس میں کوئی نشیب و فراز نہ ہوگا۔ زمین بالکل ہموار ہوگی۔ یعنی تیز ہوا پہاڑوں کو دھوئیں کی طرح اڑا کر زمین کو بالکل میدان کر دے گی۔ تمام اگلے پچھلے لوگ اس چٹیل میدان میں کھڑے ہوں گے۔ لوگوں کی بات اور ان کی حرکت نہایت ہی خاموش اور بے آواز ہوگی۔ جب بھی کوئی منادی پکارنے والا ان کو کسی طرف بلائے گا تو بھیڑوں کے گلے کی طرح اس کے پیچھے نہایت اطاعت کے ساتھ چل پڑیں گے۔

يَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ (۲۰:۱۰۸) "منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے"۔ یعنی جس طرح زمین ہموار ہوگی اس طرح ان کے دل بھی ہموار ہوں گے' فوراً حکم کی تعمیل کریں گے۔

اس فضا میں پوری طرح خاموشی ہوگی' نہایت ہی خوفناک خاموشی

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۲۰:۱۰۸) "اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی' ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے"۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ (۲۰:۱۱۱) "لوگوں کے سر اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے"۔ جلال خداوندی کا خوف لوگوں پر چھایا ہوا ہوگا۔ یہ میدان جو حد نظر سے آگے پھیلا ہوا ہوگا اس پر خوف' خاموشی چھائی ہوئی ہوگی اور لوگ اس میں سہمے کھڑے ہوں گے۔ بات دھیمی ہوگی' سوال سرگوشی میں' حالت سہمی ہوئی' چہرے جھکے ہوئے' اور اللہ ذوالجلال کا ڈر ماحول پر چھایا ہوا ہوگا۔ کوئی اس میدان میں سفارش نہ کر سکے گا مگر وہ جس کی بات اللہ کو پسند ہو۔ علم سب کا سب اللہ کو ہوگا کوئی دوسرا جانتا نہیں' ظالم اپنے ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان کو شرمساری سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان لوگوں میں اہل ایمان بھی کھڑے ہوں گے۔ ان کو نہ یہ خوف ہوگا کہ ان پر حساب و کتاب میں ظلم ہوگا اور نہ یہ ڈر ہوگا کہ ان کے اعمال میں سے کوئی عمل رہ جائے اور اس کی حق تلفی ہو جائے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

"اور اے نبیؐ اسی طرح ہم نے اسے قرآن عربی بناکر نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات ہیں' شاید کہ یہ لوگ کج روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اس کی بدولت پیدا ہوں"۔

یعنی ہم نے نہایت ہی موثر انداز میں' شاہد قیامت' مناظر عذاب' اور عبرت آموز کہانیاں بار بار پیش کی ہیں تاکہ لوگوں کے اندر نیکی کے لیے جوش پیدا ہو اور جھٹلانے والے ڈر جائیں اور جان لیں کہ قیامت میں ان کا انجام کس قدر ہولناک ہو گا۔یہ مضمون سورہ کے آغاز میں بھی تھا۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓي (۲) اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰي (۲۰:۲ - ۳) "یہ قرآن ہم نے تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ بلکہ یہ تو اس شخص کے لیے یاددہانی ہے جو ڈرے"۔

---ooo---

جب جبرائیل وحی لے کر آتے تھے تو ابھی وہ پوری وحی نہ سنا چکتے کہ حضور دہرانا شروع کر دیتے' اس خوف سے کہ کہیں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے۔ ہر نئی وحی کا یاد کرنا آپ کے لیے شاق ہوتا تھا۔چنانچہ اللہ نے آپ کو یہ اطمینان دلا دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں' اللہ اس کا ضامن ہے کہ آپ نہ بھولیں گے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

"پس بالا و برتر ہے اللہ' پادشاہ حقیقی۔اور دیکھو' قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو' جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر"۔

وہ اللہ تو بہت بلند ہے جس کے سامنے چہرے جھک جاتے ہیں' اس کی جناب میں مایوسی تو ظالموں کو ہوتی ہے' اور مومنین صالحین کے لیے تو وہاں اطمینان ہی اطمینان ہے۔ وہ بلندیوں سے اس قرآن کو بھیجتا ہے۔ آپ اس کے دہرانے میں جلدی نہ کریں۔ قرآن کے نزول میں گہری حکمت ہے۔ اس حکمت اور مقصد کو لازماً پورا کیا جائے گا۔پس آپ رب تعالیٰ سے زیادتی علم کی دعا کرتے رہیں اور جو کچھ آپ کو دیا جا رہا ہے اس کے بارے میں مطمئن ہو جائیں۔ اس کے بارے میں یہ پریشانی نہ دکھائیں کہ وہ مجھ سے چلا جائے گا۔علم تو وہی ہے جو اللہ کے علم میں ہے۔ وہ باقی ہے' وہ ہمیشہ نفع دیتا رہے گا' قائم رہے گا' پھلتا پھولتا رہے گا اور کبھی ضائع نہ ہو گا۔

اسی مناسبت سے یعنی علم و نسیان علم کے مضمون کی مناسبت سے ' یہاں قصہ آدم آتا ہے ۔ آدم سے کہا گیا تھا کہ جنت میں رہو اور ایک درخت کے قریب نہ جاؤ ۔ وہ شیطان کے اس دھوکے میں آگئے کہ یہ تو شجرۃ الخلد ہے ۔ اس لیے انہوں نے اسے چکھ لیا ۔ خلافت فی الارض عطا ہونے سے قبل یہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کی آزمائش تھی اور یہ تجربہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس لیے کرایا کہ بعد میں آنے والے انسانوں کے لیے عبرت ہو ۔ جب یہ آزمائش ہوگئی تو اللہ کی رحمت آگئی ' آدم کو اٹھالیا گیا اور ان کو راہ راست دکھا دی گئی ۔

قرآنی قصص جہاں جہاں بھی آتے ہیں ' سیاق کلام میں ان کے لانے کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے ۔ یہ قصہ یہاں اس واقعہ کے بعد آتا ہے کہ جب رسول اللہ وحی الٰہی کے اخذ میں نسیان کے خوف کی وجہ سے جلدی کرتے تھے ۔ یہاں قصہ آدم میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ آدم سے یہ غلطی بھول کی وجہ سے ہوئی ۔ نیز سورہ کا پورا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو دعوت اسلامی کے لیے منتخب کرتا ہے ان پر اس کی خصوصی نظر ہوتی ہے اور ان پر رحم و کرم کی بارشیں ہوتی ہیں ۔ یوں یہ بتایا جاتا ہے کہ آدم سے بھول ہوگئی تو اللہ نے ان پر رحمت کی اور ہدایت دی ۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک جھلکی آتی ہے کہ جس میں اطاعت شعاروں کا حال بتایا جاتا ہے ۔ نیز نافرمانوں کا حال بھی یعنی آدم زمین پر اترتے ہیں اور قیام کے بعد پھر اصل مقام پر جاکر حساب و کتاب پیش کرتے ہیں ۔

اس قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے :

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۱

۶
۱۵

"ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا ' مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا "۔ آدم علیہ السلام کو حکم یہ تھا کہ وہ جنت کا ہر پھل کھائیں مگر ایک خاص درخت کا پھل نہ کھائیں ۔ انسان کی تربیت اور اس کی قوت ارادی کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے بعض چیزوں کی ممانعت کر دی جائے تاکہ اس کی شخصیت پختہ ہو ۔ یہ انسانی خواہشات اور مادی میلانات پر وہ کنٹرول کر سکے تاکہ وہ جب روحانی ترقی کے لیے اپنی ضروریات مادی کو کم کرنا چاہے تو کم کر سکے ۔ وہ مرغوبات اور خواہشات کا غلام بن کر نہ رہ جائے ۔ یہ وہ معیار ہے جو انسانی ترقی کے لیے ضروری ہے ۔ دنیا میں جن اقوام نے بھی ترقی کی ہے وہ ایسی رہی ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس پر ضبط کیا ہے ۔ ان کے مرغوبات کے استعمال میں اعتدال ہوتا ہے اور خواہشات سے وہ بلند رہے ہیں ۔ انسانی تاریخ میں جب کوئی قوم بندۂ مرغوبات اور دلدادۂ لذات بنی ہے ' وہ روحانی اعتبار سے گرکر حیوانی درجہ تک جا پہنچی ہے ۔

یہی وجہ تھی کہ اللہ نے انسان اول کو اس آزمائش میں ڈالا کیونکہ اس کو منصب خلافت ارضی کے لیے تیار کرنا تھا کیونکہ یہاں انہی انسانوں نے کامیاب زندگی بسر کرنی تھی جو مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوں ۔ وہ لوگ جو شیطانی چمک دمک اور شیطانی وساوس اور مرغوبات کے حصول اور فراوانی کے مقابلے میں ضبط نفس کر سکتے ہیں ۔ یہ تھا انسان کا ' پہلے انسان کا پہلا تجربہ ۔ اب نتیجے کا اعلان ہوتا ہے ۔

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۲۰ : ۱۱۵) "وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا "۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

"یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ تو سب سجدہ کر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا"۔

جہاں یہ قصہ اجمالاً بیان ہوتا ہے۔ دوسری جگہ اس کی تفصیلات ہیں کیونکہ یہاں اس قصے کا صرف وہ پہلو دکھانا ہے جو انبیاء پر انعامات کا ہے۔ لہٰذا انعام کا پہلو جلدی بیان کرنے کے لیے یہ اجمال و اختصار ہے۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

"اس پر ہم نے آدم سے کہا کہ دیکھو' یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو' نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے"۔

اللہ کی مہربانیوں اور عنایات میں سے ایک عنایت یہ تھی کہ اللہ نے حضرت آدم کو قبل از وقت بتا دیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ کیونکہ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اس سجدے کا حکم اللہ نے خود اس کو دیا تھا۔ اشارتاً پہلے ہی تخلیق آدم کا منصوبہ بھی بتا دیا تھا۔

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (۲۰:۱۱۷) "ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ"۔ کیونکہ جنت سے نکل کر انسان کو مشقت' جدوجہد' بدعملی' گمراہی' پریشانیوں' حیرانیوں' شوق اور انتظار' رنج اور محرومی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہوگی' یہ سب چیزیں جنت سے باہر انسان کے انتظار میں تھیں۔ جب تک آدم جنت میں تھے ان مشقتوں اور مصیبتوں سے محفوظ تھے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى (۱۱۸) وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى (۲۰:۱۱۸ - ۱۱۹) "نہ بھوکے اور نہ ننگے رہو' نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستائے"۔ جب تک تم جنت میں ہوگے یہ سب سہولتیں تمہیں حاصل ہوں گی۔ بھوک اور لباس کی نایابی' پیاس اور دھوپ کے بالمقابل ہیں لفظاً اور معناً۔ یہ وہ مجموعہ ضروریات ہے جو ہر انسان کو اس زمین پر مشقت میں ڈالتا ہے۔

لیکن آدم' جنت میں زندگی کی ٹھوکروں سے دوچار نہ ہوئے تھے' تجربات نہ تھے۔ انسانی کمزوری ساتھ تھی' بقائے

دوام کی خواہش انسان کی بڑی کمزوری ہے۔ پھر بقائے دوام کے ساتھ اقتدار مستحکم۔ اس کے سوا انسان کو اور کیا چاہیے۔ چنانچہ شیطان اس دروازے سے اس کے اندر آتا ہے۔

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

"لیکن شیطان نے اس کو پھسلایا" کہنے لگا، "آدم! بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے"۔

شیطان نے انسان کی نہایت ہی حساس رگ پر ہاتھ رکھا۔ انسانی عمر بہرحال محدود ہے۔ انسانی قوت بہرحال محدود ہے۔ انسان طویل زندگی اور طویل اقتدار کا بے حد دلدادہ رہا ہے۔ ان دونوں راستوں سے شیطان اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ آدم بہرحال انسان تھے۔ آدم انسانی فطرت اور انسانی کمزوری کے حامل تھے۔ پھر اس تجربہ کے ساتھ دنیا کے منصوبے اور نظام تقدیر کا بھی تعلق تھا۔ چنانچہ آدم بھول گیا اور اس نے ممنوعہ علاقے میں قدم رکھ لیا۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

"آخر کار دونوں (میاں بیوی) اس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی ان کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا"۔

بظاہر مفہوم یہ ہے کہ انسان کی مخصوص شرمگاہیں مراد ہیں جو ان سے پوشیدہ تھیں۔ دونوں کے جسم میں عفت کے مقامات۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فطری شرم و حیا کی وجہ سے ان مقامات کو چھپانا شروع کیا اور ان پر جنت کے پتے لپیٹنے لگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کے نتیجے میں ان کے اندر جنسی احساس پیدا ہو گیا ہو کیونکہ جب تک کسی انسان میں جنسی احساس پیدا نہ ہو انسان کو شرم و حیا کا احساس نہیں ہوتا۔ انسان کو ان چیزوں کی طرف توجہ تب ہوتی ہے جب جنسی خواہش پیدا ہو۔

ہو سکتا ہے کہ اللہ نے آدم و حوا پر اس مخصوص درخت کا پھل کھانا اس لیے منع کر دیا ہو کہ اس کے نتیجے میں انسان کی جسمانی خواہشات نے پیدا ہونا تھا اور اللہ نے اپنے منصوبے کے مطابق ان کو موخر کیا ہوا تھا۔ آدم سے نسیان کا صدور اس لیے بھی ہو گیا کہ اس کے تعلق باللہ میں کمی آگئی اور ان پر جسمانی خواہشات کے غلبے کی وجہ سے جنسی نظام

بیدار ہو گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا جذبہ خلود جنسی خواہشات کی شکل میں اس درخت کی وجہ سے نمودار ہو گیا ہو کہ اگرچہ اس میں ایک فرد تو خلود نہیں پاتا لیکن نوع انسانی کی بقا تو اسی میں موجود ہے۔ یہ سب تشریحات اس حقیقت کے ہوتے ہوئے معقول نظر آتی ہیں کہ اس پھل کے کھانے سے ان کی شرمگاہیں کھل گئیں۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ

فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰ : ۱۲۱) "ان کی شرمگاہیں کھل گئیں" بلکہ یہ کہا ہے۔

فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰ : ۱۲۱) "ان پر ان کی شرمگاہیں کھل گئیں"۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ان کا احساس ہی نہ تھا۔ یہ پھل کھاتے ہی ان کو اس انسانی داعیہ کا احساس ہو گیا۔ دوسری جگہ قرآن مجید نے اس حقیقت کی تعبیریوں کی ہے۔

لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُوْرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا "تاکہ ظاہر کر دے ان پر وہ چیز جو ان کی شرمگاہوں سے ہم نے خود ان سے چھپا رکھی تھی"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا "ان سے ان کے ستر اتار دیئے تاکہ وہ دکھائے ان کو ان کی شرمگاہیں"۔ یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے عدم شعور کی وجہ سے ستر تھا۔ لباس سے مراد پاکدامنی' طہارت اور اللہ کے ساتھ تعلق کا لباس بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ مختلف تفسیری مفروضے ہیں' ہم ان میں کسی ایک پر زور نہیں دیتے اور نہ کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے اس پہلے انسانی تجربے کی صحیح صورت کا تعین کیا جائے۔

اس کے بعد آدم علیہ السلام اور آپ کی اہلیہ کو اس لغزش کے بعد اللہ کی رحمت نے ڈھانپ لیا کیونکہ یہ انسانیت کا پہلا تجربہ تھا۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

"پھر اس کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور ہدایت بخشی"۔ اور یہ اس وقت ہوا جب آدم نے اللہ سے مغفرت طلب کی' ندامت کا اظہار کیا اور عذر پیش کیا۔ اور ان باتوں کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا تاکہ یہاں صرف رحمت خداوندی ہی نظر آئے۔

اس کے بعد اب دونوں فریقوں آدم و ابلیس کو حکم ہوا کہ زمین پر اترو' تم ایک دوسرے کے تحت دشمن ہو' تمہارے درمیان اب ایک طویل معرکہ ہو گا۔ یہ تو تمہارے معرکہ کی پہلی باری تھی۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ

"اور فرمایا تم دونوں (فریق 'یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے"۔
یوں مخلوق خداوندی کے ان دو گروہوں کے درمیان عداوت ہو گئی اس لیے اب اولاد آدم یہ عذر پیش نہیں کر سکتی کہ مجھے تو خبر نہ تھی کہ شیطان ہمارا دشمن ہے۔ میں تو بے خبری میں مارا گیا۔ اسی لیے انسان کو قبل از وقت پوری طرح خبردار کر دیا گیا اور پوری کائنات میں اعلان کر دیا گیا کہ:۔

بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ (۲۰:۱۲۳) "تم دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن ہو"۔ یہ اعلان جس سے پوری کائنات گونج اٹھی جس پر تمام فرشتے گواہ ٹھہرے ' اللہ کی رحمت کا تقاضا پھر ہوا کہ انسان کی ہدایت اور اسے یاد دہانی کرانے کے لیے وقتاً فوقتاً رسول بھیجے جائیں۔ چنانچہ دشمن کا اعلان ہوا۔ اور پھر فرمایا کہ رسول بھی آئیں گے۔ اور اس کے بعد تمہیں آزادی ہوگی کہ تم کون سی راہ اختیار کرتے ہو۔

فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّكُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی ۬ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشۡقٰی ﴿۱۲۳﴾ وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیۡشَةً ضَنۡكًا وَّ نَحۡشُرُهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اَعۡمٰی ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَ قَدۡ کُنۡتُ بَصِیۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ کَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیۡتَهَا ۚ وَ کَذٰلِكَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی ﴿۱۲۶﴾ وَ کَذٰلِكَ نَجۡزِیۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَ لَمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبۡقٰی ﴿۱۲۷﴾

"اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا اور جو میرے "ذکر" (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہو گی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے"۔ وہ کہے گا "پروردگار' دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا' یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو' جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں 'تو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے"۔ اس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے"۔
یہ منظر اس قصے کے بعد آتا ہے' یوں کہ شاید یہ اس قصے کا حصہ ہے۔ درحقیقت اس کا اعلان بھی عالم بالا میں واقعہ آدم و ابلیس کے بعد ہوا۔ لہٰذا یہ اس پوری کائنات کے لیے زمانہ قدیم سے طے شدہ اصول ہے۔ یہ نہ واپس لیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰:۱۲۳) "تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا"۔ وہ گمراہی اور مصیبت سے محفوظ ہو گا' میری ہدایت کی پیروی کی وجہ سے۔

گمراہی اور معصیت جنت کے دروازے کے باہر بڑی بے تابی سے تمہارے انتظار میں ہیں لیکن جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ ان سے بچا رہے گا۔ اور معصیت دراصل گمراہی کا پھل ہے۔ اگرچہ گمراہ شخص دنیاوی ساز و سامان میں غرق ہو' یہ ساز و سامان بھی ایک گمراہ کے لئے بڑی معصیت ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی معصیت اور آخرت میں بھی معصیت۔ دنیا میں حرام کی روزی جس قدر بھی وافر ہو' اس کے نتیجے میں انسان کی زندگی میں تلخیاں اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ انسان جونہی اللہ کی رہنمائی سے نکلتا ہے وہ اندھیروں میں داخل ہو جاتا ہے' ادھر ادھر ٹانک ٹوئیاں مارتا ہے' قلق اور پریشانی اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ کبھی ادھر بھاگتا ہے' کبھی ادھر بھاگتا ہے' اس کی زندگی واضح طور پر غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ غرض معصیت ایک گمراہ شخص کے ساتھ ہوتی ہے' اگرچہ وہ عیش و عشرت میں ہو۔ اس کے لیے بہت بڑی بد بختی دار آخرت میں انتظار کرتی رہتی ہے اور جو شخص اللہ کی ہدایت پر چلتا ہے وہ دنیا میں بھی گمراہی اور معصیت سے مکمل طور پر نجات پاتا ہے اور آخرت میں تو وہ جنت الفردوس میں ہو گا۔ صرف یوم موعود آنے کی دیر ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰ : ۱۲۴) "اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا' اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہو گی"۔ وہ زندگی جس میں اللہ سے رابطہ نہ ہو اور جس پر اللہ کی رحمت نہ ہو' وہ تنگ ہو گی' اگرچہ بظاہر وہ بہت ہی وسیع ہو۔ یہ تنگ اس لیے ہو گی کہ اس کا رابطہ اللہ کی طرف سے کٹ ہو گا اور اللہ کی رحمت کے میدان کی طرف وہ راہ نہ پائے گی۔ اس میں حیرانی' پریشانی اور بے یقینی کی تنگی ہو گی۔ اس میں حرص اور خوف کی تنگی ہو گی۔ ڈر اس بات پر کہ جو ہے وہ چلا نہ جائے۔ غرض اس بات پر کہ ھل من مزید یوں تنگی ہو گی کہ جہاں سے نفع کی معمولی امید ہو انسان اس کے پیچھے بھاگتا رہے گا اور اگر ایک کوڑی بھی کہیں نقصان ہو جائے' مر جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو اطمینان و قرار صرف اللہ کے ہاں ملتا ہے۔ اسے سکون و اعتماد تب ہی ملے گا جب اس نے مضبوط رسی پکڑی ہو گی جس کے ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اطمینان کو طویل و عریض' گہرا اور اونچا بنا دیتا ہے۔ ہمہ جہت وسعتیں ہوتی ہیں۔ اور جو اس سے محروم ہو جائے اسے ہمہ جہت معصیت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

غرض خلاصہ یہ ہے کہ جو میرے اس ذکر اور نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کے لیے اس دنیا میں تنگ زندگی ہو گی۔ (اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں)۔

وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰ : ۱۲۴) قیامت کے دن اندھا ہونا بھی دنیا کے اندھے پن کی طرح ایک گمراہی ہے۔ یہ اس لیے ہو گا کہ اس نے دنیا میں ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کا اظہار کیا تھا اور وہ وہاں پوچھے گا۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا (۲۰ : ۱۲۵) "پروردگار دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا' یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا"۔ تو جواب آئے گا۔

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (۱۲۶) وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ

اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى (۱۲۷)(۲۰:۱۲۶ ـ ۲۷)

"ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھیں تو نے بھلا دیا تھا اسی طرح تو آج بھلایا جا رہا ہے۔ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو دنیا میں بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے"۔ جو شخص اللہ کی آیات سے منہ موڑتا ہے وہ اسراف کرتا ہے کیونکہ ہدایت اس کے قبضے میں ہوتی ہے اور وہ قیمتی دولت ہے اور یہ اسے پرے پھینک دیتا ہے۔ نیز وہ اپنی نظر کو غلط کاموں میں صرف کرتا ہے اور اس سے ان آیات کو نہیں دیکھتا جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہیں' لہذا اس کی معیشت بھی تنگ ہو گی اور قیامت میں وہ اندھا بھی ہو گا۔

یہاں تعبیر اور تصویر کشی میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ جنت سے اترنا اور بدبختی اور گمراہی میں پڑنا اس کے مقابلے میں جنت کی طرف واپسی اور گمراہی اور مصیبت سے نجات۔ دنیا میں کشادگی رزق اور اس کے مقابلے میں تنگ معیشت۔ ہدایت کے مقابلے میں اندھا ہونا اور راہ نہ پانا۔ یہ تمام باہم مفہوم قصہ آدم و قصہ بشریت کے ضمن میں ہیں جو پوری بشریت کی کہانی ہے۔ چنانچہ اس منظر کا آغاز بھی جنت ہے اور اختتام بھی جنت میں ہوتا ہے اور یہی انداز تعبیر سورہ اعراف میں بھی ہے۔ مگر تعبیرات میں تصویر کشی کا انداز' موقعہ و محل کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں مختلف ہے۔

یہ تو تھا جنت کا ایک منظر اب اس دنیا میں زمانہ ماضی قریب کی ہلاک شدہ اقوام کے واقعات کی طرف اشارہ۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کو آنکھیں دیکھ سکتی ہیں' اور جن کے آثار اب تک موجود ہیں' جبکہ جنت کے مناظر نظروں سے اوجھل عالم غیب میں تھے۔ نظریں ان کے آثار کو نہیں دیکھ سکتیں۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

ع ۱۳ ۱۶

"پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔ اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جاچکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا"۔

جب انسان اپنے دل و دماغ کو زمانہ ماضی کی ہلاک شدہ اقوام کی تاریخ پر مرکوز کرتا ہے اور ان کے کھنڈرات کو' وادیوں اور پہاڑیوں میں دیکھتا ہے تو اگرچہ یہ لوگ کب کے ہلاک ہو گئے ہیں لیکن ان کی بڑی بڑی شخصیات' ان کی بھاگتی ہوئی شکلیں' ان کی حرکات و سکنات' ان کی امنگیں اور آرزوئیں' ان کی پریشانیاں اور ان کے منصوبے' انسان کے ذہن کو بھر دیتے ہیں اور انسان جب تک آنکھیں بند کر کے محض تصور ہی کرے تو یہ پوری دنیا ہمارے ذہن کی اسکرین پر بھی

نظر آتی ہے اور جب انسان اچانک آنکھ کھولے تو نظر آتا ہے کہ ماضی کی عقوبت نے ان سب بستیوں کو ہڑپ کر لیا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ دست قدرت نے کس طرح ان لوگوں کو اور ان تہذیبوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس طرح زمانہ حال کے ان غافلوں کو بھی دست قدرت نابود کر سکتا ہے۔ یوں اس طرز تصور سے اس آیت کا مفہوم اور قرآن کا انداز بیان اور عبرت آموزی اچھی طرح انسان کے ذہن میں آ جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے حالانکہ ان کھنڈرات میں تو عبرت کے بہت بڑے سامان ہیں بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔

اگر اللہ نے پہلے سے فیصلہ نہ کر دیا ہوتا اور یہ بات اللہ کی خاص حکمت کے تحت طے نہ ہو گئی ہوتی تو اللہ اہل قریش کو بھی بعینہٖ اسی طرح نیست و نابود کر دیتا اور یہ بھی نمونہ عبرت بن جاتے لیکن ان کو ایک مقررہ وقت تک مہلت مل چکی ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى (۲۰: ۱۲۹) "اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا"۔ اگرچہ یہ لوگ ایک وقت مقررہ تک مہلت پا چکے ہیں لیکن ان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا۔ ان کو جو شان و شوکت اور جو زیب و زینت دی گئی ہے آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔ یہ ان کے لیے سخت آزمائش ہے اور یہ ان کے لیے بہت بڑا فتنہ ہے۔ اللہ نے جو کچھ تجھے بطور انعام دیا ہے، وہ ان کے اس فتنے کے طور پر دیئے ہونے سے بہتر ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾ وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

"پس اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ، اس کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔ نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے۔ رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے"۔

یہ لوگ کفر اور مذاق اور سرکشی اور اعراض کرتے ہوئے جو کچھ بھی کہتے ہیں اس پر آپ پریشان نہ ہوں اور نہ اپنی جان

ان کے لیے کھپائیں' پس اب ان پر حجت تمام ہے کہ آپ صبح و شام رب کی عبادت کریں۔ صبح کے پر سکون وقت میں خدا کی یاد اور غروب آفتاب کے وقت کے سکون میں خدا کی یاد جس وقت' یہ پوری کائنات آنکھیں بند کرتی ہے اور رات اور دن کے دو پر سکون اطراف میں خدا کی یاد' دلوں کو بہت سکون فراہم کرتی ہے اور اللہ کی رضامندی کا باعث ہوتی ہے۔

اللہ کی تسبیح و ثنا سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ کے قرب سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو نہایت ہی اطمینان بخش اور فرحت بخش ذات کی رفاقت میں محسوس کرتا ہے۔ اور اس کے دامن رحمت میں مامون ہوتا ہے۔ تسبیح و عبادت کا پھل تو رضائے الہی ہے لیکن اس سے قلب مومن میں اندر سے سکون و اطمینان اگتا ہے اور طمانیت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ اس فعل کا نوری انعام ہے۔ اے محمدؐ عبادت کرتے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور۔ وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۲۰:۱۳۱) "اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو' دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے"۔ دنیا کا ساز و سامان' سامان آرائش و زیبائش' مال و متاع' جاہ و مرتبہ۔ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۰:۱۳۱) "حیات دنیا کا پھول" یہ زندگی اس طرح نمودار ہوتی ہے جس طرح کسی پودے پر نرم و نازک پھول' چمکدار اور دلکش' لیکن پھول سریع الزوال شام تک مرجھا جانے والا' اگرچہ بہت ہی دلکش۔ ہم ان کو زندگی کا یہ سریع الزوال پھول دے کر آزماتے ہیں' دیکھتے ہیں کہ اس پھول کے ساتھ یہ لوگ کیا سلوک کرتے ہیں۔

وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۲۰:۱۳۱) ""اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق ہی اچھا اور پائندہ ہے"۔ اللہ کا دیا ہوا رزق ایک نعمت ہوتی ہے' آزمائش نہیں۔ رزق حلال اچھا ہوتا ہے اور باقی رہتا ہے۔ وہ دھوکہ بھی نہیں دیتا اور فتنہ بھی پیدا نہیں کرتا۔

یہ حیات دنیا کو چھوڑ دینے کی دعوت نہیں ہے لیکن اس میں یہ پیغام ضرور ہے کہ حقیقی اور پائیدار اقدار کو اہمیت دو' اور یہ پائیدار اقدار تعلق باللہ اور اللہ کی رضامندی میں ہیں۔ لوگوں کو دنیا کے ساز و سامان کے آگے گر نہیں جانا چاہئے۔ ہم کہیں اعلیٰ اقدار پر فخر کرنے کی صفت کو گم ہی نہ کر دیں۔ دنیا کا وہ ساز و سامان جو نظروں کو چکاچوند کر دیتا ہے۔ یہ کہیں تمہاری نظر بلند کو پست نہ کر دے۔ اس کے مقابلے میں سربلند رہنا۔

وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (۲۰:۱۳۲) "اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو"۔ ایک مسلمان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کو ایک مسلمان کا گھر بنائے۔ اپنے اہل و عیال کو وہ فریضہ ادا کرنے پر ابھارے جو اسے اللہ سے مربوط کرتا ہے تاکہ اس کے گھر میں یکجہتی پیدا ہو اور کیا ہی خوش نصیب ہو گا وہ گھر جس کے اندر پوری یکجہتی ہو۔

وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا (۲۰:۱۳۲) "اور خود بھی اس کے پابند رہو"۔ نماز کو پوری طرح قائم کرو۔ اس کے آثار اپنے اندر پیدا کرو' بے شک نماز فحاشی اور منکرات سے بچاتی ہے۔ یہ ہیں نماز کے صحیح آثار۔ جب کوئی گھرانا نماز پر جم جاتا ہے تو اس سے پھر یہ آثار پیدا ہوتے ہیں' اس کے شعور میں اور اس کے ہر طرز عمل میں۔ اگر نماز کے آثار پیدا نہیں ہوتے تو قائم شدہ نماز نہیں ہے۔ یہ محض حرکات و کلمات ہیں۔

یہ نماز' یہ عبادت' یہ اللہ سے رابطہ اور یہ فرائض اللہ کے لیے مفید نہیں' اللہ تو ان سے غنی ہے' ان کا اللہ کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ (۲۰ : ۱۳۲) "ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے' رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں"۔ یہ عبادات تو اس لیے ہیں کہ تمہارے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو۔

وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰي (۲۰ : ۱۳۲) "اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے"۔ انسان ان عبادات سے دنیا میں بھی مفاد اٹھاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ وہ عبادت کرتا ہے تو خود بھی خوش ہوتا ہے' مطمئن ہوتا ہے' سکون حاصل کرتا ہے اور آخرت میں ان عبادات کا اجر بھی اسے ہی ملتا ہے۔

اب آخر میں ان اہل ثروت اور بااثر لوگوں پر ایک تبصرہ آتا ہے جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ کوئی خارق عادت معجزہ پیش کریں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا یہ قرآن تمہارے لیے کافی نہیں۔

وَقَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

"وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟ اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا"۔

یہ تو ہٹ دھرمی اور مکابرہ ہے۔ محض سوال کرنے کی خاطر یہ سوال کیا گیا' ورنہ قرآن کا معجزہ کیا کافی معجزہ نہیں ہے۔ قرآن موجودہ رسالت کا جوڑ زمانہ ماقبل کی رسالتوں سے ملاتا ہے۔ وہی تعلیمات پیش کرتا ہے' جو پہلے رسولوں نے پیش کی ہیں بلکہ جن باتوں کا وہاں اجمال تھا یہاں ان کی تفصیل دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کو تو بطور اتمام حجت بھیجا ہے۔

وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

"اگر ہم اس کے آنے سے پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے پروردگار' تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے"۔

یہ لوگ اس وقت ذلیل اور رسوا نہیں ہوئے تھے جب ان پر قرآن کی یہ آیات پڑھی جا رہی تھیں بلکہ یہ تو ان کے

فیصلہ شدہ انجام کی ایک تصویر کشی ہے جس میں وہ لازماً رہیں گے۔ یہ آیات ان پر بطور اتمام حجت آگئیں تاکہ وہ قیامت کے دن ایسا نہ کہہ سکیں اور ان کے لیے کوئی عذر و معذرت باقی ہی نہ رہے کہ ہمارے لیے کوئی پیغام نہیں آیا۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کا حتمی انجام یہ ہے کہ یہ ذلیل اور رسوا ہونے والے ہیں تو قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو' ان کا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

حف القلم بما هو كائن پریشان نہ ہوں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اعلان کر دیں کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

۸ ع ۷ ۱۷

"اے نبی" ان سے کہو' ہر ایک انجام کار کے انتظار میں ہے' پس اب منتظر رہو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں"۔

یوں اس سورہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس کا آغاز اس فقرے سے ہوا تھا کہ اے نبی آپ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا گیا کہ آپ کسی مصیبت میں گھر جائیں بلکہ یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جن کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ چنانچہ سورہ کا یہ خاتمہ بھی آغاز سے ہم آہنگ ہے کہ یہ ادنیٰ تذکرہ ہے۔ اس شخص کے لیے جسے کوئی تذکرہ فائدہ دیتا ہو۔ جب یہ تذکرہ تم تک پہنچ گیا تو اب انتظار نتیجہ کے سوا کیا بات رہ جاتی ہے اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۱۷

سورۃ الانبیاء - ۲۱

آیات ۱--- تا--- ۱۱۲

سورۃ الحج - ۲۲

آیات ۱--- تا--- ۷۸

سورۃ الانبیاء ایک نظر میں

یہ مکی سورہ ہے اور اس کا موضوع سخن بھی مکی سورتوں کا موضوع ہے یعنی اسلامی نظریہ حیات ـ یہ اس کے بڑے بڑے موضوعات کو لیتی ہے یعنی عقیدۂ توحید' عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ بعث بعد الموت ـ لیکن اس سورہ نے ان موضوعات کے بیان کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس کائنات میں جاری قوانین قدرت کو بیان کر کے اسلامی نظریہ حیات کو ان کے ساتھ جوڑا جائے' یہ اس لیے کہ اسلامی نظریہ حیات بھی اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ نظریہ قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق اپنا کام کرتا ہے ـ اسلامی نظریہ حیات بھی دراصل اس "حق" پر قائم ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے اور ارض و سما اس پر قائم ہیں ـ یہی وجہ ہی کہ یہ کائنات عبث نہیں اور نہ باطل ہے اور نہ اس کے اندر پیدا شدہ مخلوق عبث اور باطل ہے ـ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱:۱۶) "ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا" ـ یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ انسان کو اور اس کے فکرو نظر کو اس پوری کائنات کی سیر کراتی ہے ـ زمین و آسمان' دشت و جبل' روز و شب اور شمس و قمر کا مشاہدہ کراتی ہے ـ ان کو متوجہ کرتی ہے کہ جو قوانین قدرت اور نوامیس فطرت اس پوری کائنات کو چلا رہے ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک وحدت ہے اور یہ وحدت دلالت کرتی ہے' وحدت خالق اور وحدت مدبر پر ـ ایک ایسے مقتدر اعلیٰ پر جس کے ساتھ اس تدبیر میں کوئی شریک نہیں ہے' لہٰذا جس طرح خلق میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح امر میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہونا چاہیے ـ

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱.۲۲) "اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا" ـ پھر یہ سورہ انسانی قوت مدرکہ کو اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس کائنات کے اندر "حیات" جن قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق چل رہی ہے اور اس حیات کے جو مصادر ہیں وہ اس ارشاد خداوندی کے مطابق ہیں ـ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱:۳۰) "اور پانی سے ہم نے ہر زندہ چیز پیدا کی" ـ اور تمام زندہ چیزیں اسی قانون فطرت کے مطابق ایک متعین انجام کی طرف جاری ہیں ـ

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۲۱ ۳۵) "ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے" ـ اور ان کے لوٹنے کی

جگہ بھی ایک ہے۔

اَلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۱: ۳۵) "آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے"۔
یہ کہ اسلامی نظریہ حیات ان قوانین قدرت کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے' کیونکہ طویل ترین انسانی تاریخ اور متعدد انبیاء ورسل اور مختلف اقوام و زمان کے باوجود یہ عقیدہ ایک ہی رہا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱: ۲۵) "ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو" اور اللہ کی مشیت یہ بھی رہی ہے کہ تمام رسول بشر رہے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ (۲۱: ۲۵) "ہم نے آپ سے قبل جن کو بھیجا وہ بھی بشر ہی تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے"۔ اسلامی نظریہ حیات اگرچہ ان قوانین فطرت سے منسلک ہے جن کے مطابق یہ عظیم کائنات چلتی ہے' لیکن اس نظریہ کا عملی ظہور اس کرۂ ارض پر انسانوں کی عملی زندگی میں ہی ہو گا۔ کیونکہ اس عقیدے کے بارے میں سنت الٰہیہ یہ ہے کہ یہ حق ہے اور جس طرح اس کائنات پر یہ حق غالب ہے اس کرۂ ارض پر بھی اسی کو غالب ہونا ہے کیونکہ یہ سچ ہے۔ اس پر پوری کائنات قائم ہے' لہٰذا حق کا غلبہ سنت الٰہیہ میں بھی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَي الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱: ۱۸) "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے"۔ یعنی ظالم جھٹلانے والے ہلاک ہوں گے اور رسل اور مومنین فلاح پائیں گے"۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۲۱: ۹) "پھر دیکھ کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچا لیا اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر دیا"۔ مطلب یہ ہوا کہ میرے صالح بندے ہی زمین کے اقتدار اعلیٰ کے وارث ہوں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ

(۲۱: ۱۰۵) "اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے"۔
یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ رسولوں کے گروہ پر ایک سرسری نظر ڈالتی ہے' یوں کہ یہ ایک ہی گروہ ہے اور ان کی رسالت بھی ایک ہے۔ بعض کے بارے میں بحث ذرا طویل ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام اور باقی رسولوں نوح' موسیٰ' ہارون' لوط' اسماعیل' ادریس' ذی الکفل' ذوالنون' زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نہایت اختصار سے تبصرہ ہوا۔ ان تمام قصص میں رسولوں اور داعیوں کی زندگی کے واقعات کی شکل میں' دعوت کے اصول عامہ کی شکل

میں اور اس کائنات کے قوانین قدرت کی شکل میں وہ تمام معانی اور حقائق واضح طور پر نظر آتے ہیں جو اس سورہ کا موضوع ہیں۔

اس سورہ میں بھی قیامت کے بعض مناظر پیش کئے گئے ہیں اور یہ معانی اور مضامین اور اصول ' واقعات قیامت کی روشنی میں واضح ہیں۔

ان تمام واقعات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اور سورہ میں فکرو نظر کی تاروں کو جس طرح چھیڑا گیا ہے ' اس کے پیش نظر صرف ایک ہی ہدف ہے کہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین اور نظریہ حیات کو اپنی قوت مدرکہ اور اپنے فہم کے مطابق اپنی گرفت میں لے لیں اور ان معانی ' مضامین اور حقائق پر سے ایک غافل اور لاپرواہ شخص کی طرح نہ گزر جائیں جس طرح آغاز سورہ میں اشارہ کیا گیا۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱ : ۱) مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۲۱ : ۲) لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ (۲۱ : ۳)

"قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ دل ان کے دوسری ہی فکر میں منہمک ہیں"۔ رسالت تمام رسولوں کی رسالت ' ایک عظیم سچائی ہے اور موجود ہے ' جس طرح یہ کائنات ایک عظیم سچائی ہے اور موجود ہے۔ لہٰذا اس عظیم سچائی کو کھیل کے طور پر نہیں لینا چاہئے ' یہاں پیغمبر سے معجزے طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ پوری کائنات اور اس کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت پکار رہے ہیں کہ اس کا ایک واحد قادر مطلق خالق ہے اور تمام انبیاء کا پیغام بھی ایک واحد حق پیغام ہے۔

سورہ انبیاء میں الفاظ کی شوکت اور ان کا صوتی ترنم بھی قابل توجہ ہے۔ انداز بیانیہ ہے جو موضوع سخن کے ساتھ مناسب ہے اور سورہ کی فضا اور موضوعات اور مضامین کے ساتھ لگا کھاتا ہے۔ اس سورہ کے انداز بیان اور موضوع سخن کو سورہ مریم اور طٰہٰ کے ساتھ مقابلہ کر کے فرق کو اچھی طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں سورتوں میں موضوع سخن اور فضا ' نرم و لطیف ' رحمت و محبت کی تھی۔ تو الفاظ بھی نرم و نازک اور دھیمی ترنم والے تھے۔ لیکن یہاں قدرے ٹھوس انداز ہے جو سورہ کے موضوعات سے جوڑ کھاتا ہے۔

اگر دونوں جگہ قصہ ابراہیم علیہ السلام کا باہم موازنہ کیا جائے تو ہماری بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی۔ سورہ مریم میں اس قصے کی جو کڑی لی گئی ہے اور یہاں جو کڑی لی گئی ہے ان میں فرق ہے۔ وہاں ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے ساتھ احترام و محبت سے بھرپور گفتگو ہے ' نرم و نازک الفاظ ہیں۔ لیکن یہاں اس قصے میں بت شکنی اور کھاڑا لیا گیا ہے ' پھر ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کا خوفناک قصہ ' لہٰذا اس کے لیے ٹھوس دو ٹوک اور قدرے سخت الفاظ کی ضرورت تھی تاکہ انداز کلام موضوع سخن اور حالات اور فضا کے مطابق ہو جائے۔

اس سورہ کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ پہلا حصہ آغاز ہی سے جھنجوڑنے والا ہے۔ اس میں فکر و نظر کی تاروں پر سخت ضربات لگائی گئی ہیں اور لوگوں کو

قریب آنے والے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ لوگو! بیدار ہو جاؤ غفلت چہ معنی دارد؟

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ -- (۲۱ : ۱) "قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں"۔ پھر تاریخ انسانی کے غافل لوگوں کی ہلاکتوں کی طرف اشارہ کر کے، دوبارہ لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ظلم و ستم اور عیش و طرب کے بھیانک انجام کی طرف بھی توجہ کرو۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱ : ۱۱)

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۲۱ : ۱۲) لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰي

مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (۲۱ : ۱۳) قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ

(۲۱ : ۱۴) فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰي جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۲۱ : ۱۵)

(۲۱ : ۱۱ تا ۱۵) "کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا۔ جب ان کو ہمارا عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے، "بھاگو نہیں، جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے گا"۔ کہنے لگے ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے"۔ وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا۔ زندگی کا ایک شرارہ بھی ان میں نہ رہا"۔

اس کے بعد دعوت اسلامی کی ٹھوس سچائی، اور نظام کائنات میں موجود ٹھوس سچائی کو باہم جوڑا گیا ہے۔ عالم نظریات میں عقیدۂ توحید اور قوانین قدرت کی توحید، خالق مدبر کی وحدت تدبیر اور تمام رسولوں کی وحدت رسالت کی توحید کے درمیان ربط پیدا کر کے بتایا گیا ہے کہ زندگی کا سرچشمہ بھی اللہ ہے اور اس کی انتہا بھی اللہ کی طرف ہے اور اسی کی طرف رجوع ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس عظیم رسول اور عظیم رسالت کے پیغام کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور اسے ہلکا لیتے ہیں، حالانکہ یہ تو ٹھوس اور بھاری حق ہے۔ ان کا ماحول اور دنیا کے حالات تقاضا کرتے ہیں کہ انسان بیدار ہو۔ یہ لوگ غافل ہیں اور عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کی دہلیز پر ہے۔ اس موقعہ پر قیامت کا ایک نہایت ہی موثر منظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا انجام تاریخ میں کیا ہوا ہے۔ اللہ کے سوا پھر ان کو بچانے والا تو کوئی ہوتا نہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان کے اردگرد ان کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے لیکن یہ اپنی دولت کے نشے میں مست ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ اپنا کام کریں اور کہہ دیں۔

اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ (۲۱ : ۴۵) "میں تو تمہیں وحی سے ڈراتا ہوں"۔ تم غفلت میں ہو اور خطرہ

تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے لیکن تمہاری حالت یہ ہے :

وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ (۲۱ : ۴۵) "مگر بہرے پکار نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے"۔ یہ لوگ ایسے ہی حالات میں ہوں گے کہ میزان نصب ہو جائے گی۔

۳۔ تیسرے حصے میں نبیوں کے گروہ پر ایک نظر ہے ثابت یہ کرنا مقصود ہے کہ ان کی رسالت اور نظریہ حیات ایک ہی رہا ہے۔ اللہ کا رویہ اپنے بندوں سے بھی ہمیشہ ایک جیسا رہا ہے۔ یہ کہ وہ ہمیشہ مکذبین کو پکڑتا رہا ہے۔

۴۔ چوتھے حصے میں انجام اور نتائج بتائے گئے ہیں اور یہ انجام اور نتائج قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی صورت میں ' نہایت ہی موثر ہیں جبکہ سورہ کا خاتمہ بھی آغاز کی طرح کا ہے۔ انسانی سوچ کی تاروں پر ایک جھنجھوڑنے والی ضرب لگائی گئی ہے۔ صاف صاف الفاظ میں ڈراوا اور فریضہ رسالت کی ادائیگی کے بعد لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ اب جو انجام چاہو' منتخب کر لو۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۰ تشریح آیات

آیت ۱--- تا--- ۳۵

سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ (۲۱) مَكِّيَّةٌ (۷۳) آیاتها ۱۱۲ رکوعاتها ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۫ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت‘ اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں‘ ان کے پاس جو تازہ

نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں' دل ان کے (دوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں۔ اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے' پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟" رسولؐ نے کہا میرا رب ہر اس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے' وہ سمیع اور علیم ہے۔

وہ کہتے ہیں "بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں' بلکہ یہ اس کی من گھڑت بات ہے' بلکہ یہ شخص شاعر ہے' ورنہ یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ حالانکہ ان سے پہلے کوئی بستی بھی' جسے ہم نے ہلاک کیا' ایمان نہ لائی۔ اب کیا یہ ایمان لائیں گے؟

اور اے نبیؐ تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں اور جس جس کو ہم نے چاہا' بچا لیا اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر دیا"۔

یہ نہایت ہی زوردار آغاز ہے' کسی بھی غافل شخص کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے کہ حساب سر پر ہے اور لوگ غفلت اور لاپرواہی میں بیٹھے ہیں۔ بڑی بے تابی سے رسول ان کے سامنے آیات الٰہیہ پیش کر رہے ہیں اور وہ منہ موڑ کر دوسری جانب جا رہے ہیں۔ فوراً چوکنا ہونے کی ضرورت ہے اور یہ لوگ ہیں کہ خطرے کا شعور بھی نہیں رکھتے بلکہ جب بھی ان کو متنبہ کرنے کی نئی کوشش کی جاتی ہے یہ مذاق کرتے ہیں اور دعوت کو غیر اہم سمجھ کر کھیل میں لگ جاتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ (۲۱ : ۳) "ان کے دل غافل ہیں"۔ ان کے دل و دماغ اور شعور و وجدان کے تار بالکل خاموش ہیں۔ ان کے اندر کوئی نغمہ نہیں ہے۔ یہ ان شخصیات کی تصویر کشی ہے جو غایت درجہ لاابالی ہیں اور سنجیدگی ان میں مفقود ہے' جو نہایت ہی خطرناک مقامات پر بھی غیر سنجیدہ رہتے ہیں' جو نہایت محتاط رہنے کے مقام پر بھی گپ لگاتے ہیں' نہایت ہی مقدس موقف اور مقدس مقام میں بھی گندگی گراتے ہیں۔ یہ قرآن جو ان کو سنایا جا رہا ہے' یہ تو رب ذوالجلال کی طرف سے ایک پیغام ہے اور یہ اس سے لاپرواہ ہیں۔ کوئی وقار' کوئی پاکیزگی ان میں نہیں ہے۔ جن لوگوں میں سنجیدگی' وقار' پاکیزگی' جدت نظر نہیں ہوتی وہ آخر کار اس قدر ہلکے' خشک ہو جاتے ہیں اور اس طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں کہ وہ کسی اونچے مشن یا اہم فرائض کی ادائیگی اور بھاری بوجھ اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ ان کی زندگی ڈھیلی' ان کے اخلاق گرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی اقدار ارزاں ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں میں ایک قسم کی بے باکی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مقدس سے مقدس قدر کو بھی ہلکا سمجھتے ہیں۔ یہ شتر بے مہار ہوتے ہیں' کسی دستور اور ضابطے کے پابند نہیں ہوتے۔ اور ان کو خیر و شر کا شعور ہی نہیں رہتا۔

اس قسم کے لوگ اس قرآن مجید کو سنجیدگی سے نہ لیتے تھے حالانکہ یہ قرآن مجید تو دستور حیات' نظام زندگی' نظام عمل' نظام معاملہ تھا۔ اس کو سنجیدگی سے دیکھنا چاہئے تھا لیکن ان لوگوں نے اسے نہایت ہی ناہالی پن سے ایک شتر بے مہار شخص کی طرح غفلت سے لیا اور مذاق کرنے لگے۔ ایسے لوگ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ جب روح انسان اس

اس طہارت اور انذار کے اس تقدس کو خیر باد کہہ دے تو پھر معاشرہ مریض انسان پیدا کرتا ہے' شتر بے مہار انسان پیدا کرتا ہے' لاابالی انسان پیدا کرتا ہے' جن کا نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ وہ کسی چیز کو سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان نے اس سورہ کو اس سنجیدگی' اور اس اہمیت سے لیا کہ ان کے دل دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ ترجمہ آمدی میں عامر ابن ربیعہ کا یہ واقعہ آیا ہے کہ ان کے پاس عرب کا ایک آدمی آیا۔ اس نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور عزت سے ٹھہرایا۔ اس کے بعد وہ شخص دوبارہ عامر کے پاس آیا۔ اس وقت اسے زمین الاٹ ہو چکی تھی اور کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرزمین عرب کی ایک پوری وادی بطور جاگیر الاٹ کرائی ہے' میں چاہتا ہوں کہ اس میں سے ایک ٹکڑا تمہیں دے دوں تاکہ وہ تمہیں اور تمہارے بعد تمہاری اولاد کے کام آئے۔ اس پر عامر نے کہا' مجھے تمہاری اس جاگیر میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ آج ایک سورہ نازل ہوئی ہے' اس نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اب دنیا میں ہماری کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔

اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (۲۱ : ۱) "قریب آ گیا ہے' لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں"۔

یہ ہے فرق دلوں میں۔ ایک طرف ہیں زندہ' قبول کنندہ اور اثرگیرندہ دل اور دوسری جانب ہیں مردہ' بجھے ہوئے اور ایسے دل جن میں فکر و شعور کے داخلے کی تمام کھڑکیاں بند ہیں۔ ان مردہ دلوں پر لہو و لعب کے کفن ہیں اور ان کو بے مہاری کے لاابالی پن کے قبرستان میں دفنا دیا گیا ہے۔ قرآن کا ان پر اثر نہیں ہوتا کیونکہ ان کے دل بجھ گئے ہیں اور وہ اس طرح ہو گئے ہیں کہ ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا (۲۱ : ۳) "اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں"۔ اہل مکہ ہر وقت رسول اللہؐ اور آپ کی تحریک کے بارے میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ پھر یہ سرگوشیاں ان کی سازشوں کی شکل اختیار کرتی تھیں اور پھر یوں تبصرے کرتے تھے۔

هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ (۲۱ : ۳) "یہ شخص آخر تم جیسا بشر ہی تو ہے تو کیا پھر تم آنکھوں دیکھتے (بجھتے بوجھتے) جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے"۔ یہ لوگ تو درحقیقت مر چکے ہیں اور ان کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں ہے اس لیے یہ قرآن سے خود تو متاثر ہوتے نہیں تھے لیکن جن دوسرے لوگوں پر قرآن کے اثرات ہوتے تھے ان کو یہ لوگ یوں بدراہ کرتے تھے کہ لوگو دیکھو' یہ محمد تو ہم جیسا انسان ہے' تو اس پر کیوں ایمان لاتے ہو۔ اس کلام کا تم پر جو اثر ہوتا ہے تو وہ ایک جادو ہے۔ تم دیکھتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے اس جادو کا اثر لیتے ہو۔

جب وہ ایسے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے تو رسول اللہ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنا اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں۔ یہ جو مشورے کر رہے ہیں اور قرآن کے اثرات سے بچنے کے لیے جو بہانے اور پروپیگنڈے کرتے ہیں ان کا کوئی اثر نہ ہو گا۔

قٰلَ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲۱ : ۴)
"رسول نے کہا میرا رب ہر اس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے اور وہ سمیع و علیم ہے"۔ زمین کے جس حصے میں بھی تحریک اسلامی کے خلاف کوئی سرگوشی ہو اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے کیونکہ اللہ تو وہ ہے جو زمین و آسمان میں بولے جانے والے تمام اقوال کو جانتا ہے اور اس کے ہاں وہ ریکارڈ ہوتے ہیں اور وہ جو سازشیں بھی پکائیں اللہ اپنے رسول کو پہلے سے بتا دیتا ہے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

انہوں نے بہت سوچا کہ قرآن کے اثرات کو کس پروپیگنڈے سے روکیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سحر ہے۔ یہ ایک مخلوط قسم کی سوچ اور منتشر افکار ہیں، جن کو محمد جمع کر کے پیش کرتا ہے، کبھی شعر کبھی کہانت کیا کہا۔

بَلْ قَالُوْآ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (۲۱ : ۵) "وہ کہتے ہیں بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں بلکہ یہ اس کی من گھڑت بات ہے بلکہ یہ شخص شاعر ہے"۔ یہ بلکہ بلکہ ہی کرتے رہیں گے، کسی ایک بات پر بھی جم نہیں سکتے، نہ ان کی ایک رائے ہے، اصل بلکہ یہ ہے کہ دراصل یہ لوگ مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ قرآن کے ان ولولہ انگیز اثرات کو کس طرح روکیں، جو لوگوں پر اثر کر رہے ہیں اور یہ لوگ دعوے پر دعویٰ کرتے چلے آ رہے ہیں، ایک سبب کے بعد دوسرا سبب لاتے ہیں۔ لیکن سخت حیراں ہیں، کسی ایک بات پر جمتے نہیں، اس لیے تمام حرکتوں اور اقوال کو چھوڑ کر آؤ اس طرف آتے ہیں کہ کوئی ایسا معجزہ دکھا دیا جائے جو گزرے ہوئے رسولوں نے دکھائے تھے۔

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۲۱ : ۵) "ورنہ یہ لائے کوئی ایسی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے"۔ ہاں اس سے قبل رسولوں نے خارق عادت معجزات دکھائے تھے لیکن کیا جن کے سامنے یہ معجزے پیش ہوئے تھے وہ سب ایمان لائے تھے۔ نہیں وہ تو ایمان نہ لائے اسی لیے تو ہلاک ہوئے اور یہ سنت الہیہ ہے۔ اٹل سنت الہیہ کہ جب کوئی خارق عادت معجزہ پیش ہو جائے اور پھر بھی لوگ نہ مانیں تو ان کو تباہ کرنا لازم ہے۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا (۲۱ : ۶) "حالانکہ ان سے پہلے کوئی بستی بھی جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی"۔ یہ اس وجہ سے کہ جب کوئی قوم بغض و عناد کے اس مرتبے تک پہنچ جائے کہ وہ ایک محسوس خارق عادت معجزے کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو پھر تو اسے ہلاک کیا جانا ہی ٹھہرتا ہے۔

بار بار معجزات آئے، بار بار اقوام نے تکذیب کی اور بار بار ان مکذبین کو تاریخ میں ہلاک کیا جاتا رہا۔ تو اگر ان لوگوں کو ویسا ہی معجزہ دکھا دیا جائے اور یہ بھی اسی طرح ایمان نہ لائیں تو پھر ہلاکت کے سوا اور کیا انجام ہوگا۔

اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ (۲۱ : ۶) "کیا یہ ایمان لائیں گے"۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْآ اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ (۲۱:۷) وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ

(۲۱:۸) (۲۱:۷ - ۸) "اور اے نبیؐ تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے"۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ رسول انسان ہوں' وہ اللہ سے وحی اخذ کریں اور لوگوں تک اسے پہنچائیں۔ اس سے قبل جس قدر رسول گزرے وہ جسم و جان رکھتے تھے اور جسم و جان رکھنے کے بعد وہ کھانا بھی کھاتے تھے' کیونکہ کھانا جسم کا لازمی تقاضا ہے اور بشریت کے اعتبار سے اور جسمانیت کے اعتبار سے وہ دائمی زندگی والے بھی نہ تھے۔ اگر تم اس بات کو نہیں جانتے تو رسولوں کی جسدیت' کھانے پینے کے بارے میں اہل کتاب سے معلومات حاصل کر لو کیونکہ اہل کتاب عربوں کے مقابلے میں علوم انبیاء سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ تمام رسول بشر تھے۔ انسانوں کی طرح زندہ رہتے تھے۔ تاکہ ان کی عملی زندگی شریعت کی صورت اختیار کرلے۔ ان کا عملی ماڈل لوگوں کے لیے اعلی زندگی کا ماڈل ہو' کیونکہ جو دعوت زندہ ہو اور زندگی کی عملی شکل میں ماڈل اور نمونہ ہو وہی موثر بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ دعوت عملاً مجسم شکل میں قائم ہے اور اس کو عملی شکل دے دی گئی ہے۔

اگر رسول غیر بشر ہوتے نہ کھاتے پیتے' نہ بازاروں میں پھرتے' عورتوں کے ساتھ ان کی معاشرت نہ ہوتی' ان کے دلوں میں انسانی جذبات و میلانات نہ ہوتے تو ان کے اور لوگوں کے درمیان گہرا تعلق قائم نہ ہو سکتا۔ نہ وہ ان میلانات کو سمجھ سکتے جو انسان رکھتے ہیں اور نہ انسان ان کو اچھی طرح سمجھ سکتے اور نہ ان کی پیروی کرتے کیونکہ ان کی زندگی میں انسانوں کی پیروی کے لئے کوئی ماڈل ہی نہ ہوتا۔

اگر داعی جن لوگوں کو دعوت دیتا ہے ان کے رجحانات کو نہیں سمجھتا' ان کے شعور' جذبات اور خواہشات کو نہیں سمجھتا' اور لوگوں کے اندر نہیں جاتا ان سے دور دور رہتا ہے' وہ لوگوں کے ساتھ نہیں چلتا اور لوگ اس کے ساتھ نہیں چلتے وہ لوگوں کے سامنے جس قدر چلا چلا کر تقریریں کرے تو لوگ اس کی تقریروں سے ہرگز متاثر نہ ہوں گے کیونکہ ان کے درمیان احساس و شعور کے فاصلے ہیں۔

ہر وہ داعی جس کا عمل اس کی بات کی تصدیق نہ کرے' اس کے الفاظ لوگوں کے کانوں سے ٹکرا کر واپس ہوں گے۔ دلوں کے اندر نہ اتر سکیں گے اگرچہ اس کے الفاظ زوردار ہوں اور اس کا کلام بلیغ ہو' وہ سادہ بات جس کی پشت پر عمل ہوتا ہے جس سے کہنے والا خود متاثر ہوتا ہے' وہی مفید ہو سکتی ہے اور لوگوں کے اندر حرکت پیدا کر سکتی ہے۔

جو لوگ یہ تجویز کرتے تھے کہ رسول کو ایک فرشتہ ہونا چاہئے' جس طرح آج کل کے بعض لوگ رسول کو انسانی خواص سے عاری قرار دیتے ہیں' یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ فرشتے اپنی تخلیقی ساخت اور اپنی فطرت کے اعتبار سے انسانوں جیسی زندگی گزار ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ جسم اور اس کے تقاضوں کے مطابق انسان کے احساس و شعور کو سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ لہذا اس اعتبار سے ان کے لیے انسانوں جیسی زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں ہے۔ رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان انسانی احساسات اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور اپنی عملی زندگی میں ان احساسات اور ان تقاضوں پر عمل بھی کرتا ہوتا

کہ وہ لوگوں کے لیے عملی دستور حیات بن سکے۔

یہ باتیں تو اپنی جگہ پر ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر رسول فرشتہ ہوتا اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے جنس بشری کو جو عظیم اعزاز دیا' بشریت اس سے محروم ہو جاتی۔ یہ نہ ہوتا کہ انسانوں میں سے ایک انسان عالم بالا سے رابطہ قائم کرے یا اللہ سے ہمکلام ہو۔

بہرحال رسولوں کے انتخاب میں یہ اللہ کی سنت ہے کہ رسول بشر ہو اور یہ بھی سنت ہے کہ اللہ ان کو نجات دے اور مسرفین اور مکذبین کو ہلاک کر دے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَیْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِیْنَ (۲۱:۹) "پھر دیکھ لو کہ آخر کار ان کے ساتھ ہم نے اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں جس کسی کو ہم نے چاہا' بچالیا اور مسرفین کو ہلاک کر دیا"۔ تو رسولوں کے انتخاب کے لیے جو سنت ہے' اسی طرح مکذبین کے لیے بھی یہ سنت ہے اور اللہ نے ان کو اور ان کے ساتھ فی الحقیقت ایمان لانے والوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ ایسے ایمان لانے والے جن کا عمل ان کے ایمان کی تصدیق نہ کرتا ہو۔ اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرتا ہے جو حد سے گزرتے ہیں۔

مشرکین جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ کے ساتھی مسلمانوں کو ایذا دیتے تھے اور ان کی تکذیب کرنے میں حد سے گزر گئے تھے' ان کو اللہ اس سنت سے ڈراتا ہے اور ان کو سمجھاتا ہے کہ یہ ان پر اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ اللہ نے کوئی مادی خارق عادت معجزہ نہیں بھیجا جس کو اگر یہ جھٹلا دیتے جس طرح اقوام سابقہ نے جھٹلایا تھا تو یہ بھی ہلاک کر دیئے جاتے۔ اس خارق عادت معجزے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرآن کا معجزہ دیا ہے اور یہ کتاب تمہارے لیے باعث عزو شرف ہے کہ یہ تمہاری زبان میں ہے' تمہاری زندگی کو استوار کرتی ہے اور یہ تمہاری تعمیر و تربیت اس طرح کرتی ہے کہ تمہیں وہ ایک قابل ذکر امت بنا دے۔ یہ کتاب لوگوں کے سامنے کھلی پڑی ہے' چاہئے کہ وہ اس پر غور کریں اور اس کے ذریعہ انسانیت کے ارتقاء کی سیڑھی پر چڑھتے چلے جائیں۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۠ ﴿۱۰﴾ ع ۱

"لوگو' ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے' کیا تم سمجھتے نہیں"۔

قرآن ایک ایسا معجزہ ہے کہ یہ تمام نسلوں کے لیے کھلا معجزہ ہے۔ یہ ایسا معجزہ نہیں ہے کہ ایک ہی نسل میں اس کا مظاہرہ ہو' لوگ اس سے متاثر ہوں اور وہ ختم ہو جائے۔ یہ ایک دائم و قائم معجزہ ہے۔

قرآن کریم کے ذریعہ عربوں کو بھی بڑی شہرت ملی جب وہ قرآن کے پیغام کو لے کر مشرق و مغرب تک جا پہنچے۔ اس سے پہلے وہ کوئی قابل ذکر لوگ نہ تھے۔ نہ ان کے پاس انسانیت کو دینے کے لیے کوئی قابل ذکر چیز تھی۔ جب تک عربوں نے اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھا انہوں نے اس کے ذریعہ پوری انسانیت کی راہنمائی کی' تو وہ بھی کامیاب رہے اور اس کی وجہ سے پوری انسانیت کو بھی کامیابی اور خوشحالی نصیب ہوئی' جب عربوں نے اس کتاب کو چھوڑا تو انسانیت نے بھی انہیں چھوڑ دیا اور لوگوں کے اندر عربوں کا ذکر ختم ہونے لگا۔ یہ لوگ قافلہ انسانیت کے دم چھلا بن گئے اور

انسانوں میں سے جو چاہے 'انہیں اچک لیتا ہے لیکن جب یہ کتاب انہوں نے مضبوطی سے تھام رکھی تھی تو لوگ ان کے ماحول میں اچک لیے جاتے تھے اور یہ محفوظ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب قرآن کے سوا انسانیت کو کیا تحفہ دے سکتے ہیں؟ قرآن کے سوا ان کے پاس اور ہے کیا؟ ان کے پاس قرآنی فکر کے سوا انسانیت کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی اور فکر نہیں ہے۔ اگر وہ انسانیت کے سامنے یہ کتاب پیش کریں گے تو انسانیت ان کو پہچان لے گی۔ ان کا ذکر کرے گی اور ان کو سروں پر اٹھائے گی کیونکہ اسے عربوں سے ایک نفع بخش پیغام ملے گا۔ لیکن اگر وہ انسانوں کے سامنے محض عربوں کو بحیثیت ایک قوم پیش کریں گے تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی حیثیت کیا ہے اور وہ کیا ہیں؟ اس کتاب کے سوا ان کے اس نسب نامے کی کیا وقعت ہے۔ انسانیت نے عربوں کو اس کتاب کے ذریعے 'اسلامی نظریہ حیات کے ذریعے اور اس کتاب سے اخذ کردہ نظام حیات کے ذریعے پہچانا تھا۔ انسانیت میں ان کو جو مقام حاصل ہوا تھا وہ اس لیے نہ تھا کہ وہ عرب ہیں۔ کیونکہ صرف عرب ہونا تاریخ انسانیت میں کوئی چیز نہیں ہے اور تہذیب کی ڈکشنری میں لفظ عرب کا کوئی مقام نہیں ہے۔ عربوں کی پہچان اسلامی تہذیب و تمدن سے تھی اور ہے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر 'اسلامی فلسفہ اور اسلامی تمدن کے تو تمدن کی ڈکشنری میں نام ملیں گے لیکن عرب کا اس میں کوئی نام نہیں ہے۔

اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم یہاں اشارہ کر رہا ہے۔ مشرکین کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب تمہاری پہچان ہے۔ لیکن تم اس کتاب میں آنے والی نئی تعلیمات کا استقبال غفلت 'اعراض اور تکذیب اور مذاق کے ساتھ کرتے تھے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱: ۱۰) "لوگو ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے 'کیا تم سمجھتے نہیں ہو"۔

عرب مشرکین پر اللہ کا کرم تھا کہ ان کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ کوئی خارق عادت معجزہ پیش نہ کیا گیا' ورنہ وہ انکار کرتے اور ان کی بیخ کنی اسی طرح سنت الہیہ کے مطابق ہو جاتی جس طرح تاریخ میں کئی اقوام اور کئی بستیوں کی ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ ایک زندہ منظر کی شکل میں ایسی اقوام کے استیصال اور تباہی و بربادی کو دکھاتے ہیں۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

وہ کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا۔ جب ان کو ہمارا

عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ (کہا گیا) "بھاگو نہیں ' جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے ' شاید کہ تم سے پوچھا جائے"۔ کہنے لگے "ہائے ہماری کم بختی ' بے شک ہم خطاوار تھے اور وہ یہی پکارتے رہے ' یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا ' زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا"۔

قصم کا مفہوم ہے شدت سے کاٹنا ' اس لفظ کی آواز کی شدت بھی اس کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لفظ کے تلفظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم بستیوں کو بڑی شدت اور سختی سے اس طرح توڑا پھوڑا گیا کہ ان کا وجود ہی ختم کر دیا گیا اور ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ان کو پیس کر رکھ دیا گیا۔

وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱ : ۱۱) "اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا"۔ یہاں قصم کا فعل بستیوں پر وارد ہوتا ہے اور بستیوں اور ان کے باشندوں سب کو پیس کر رکھ دیا جاتا ہے لیکن انشا کا فعل صرف قوم پر وارد ہوتا ہے ' پہلے قوم پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد وہ بستیاں آباد کرتی ہے۔ یہ تو ہے حقیقت واقعہ کہ تباہی بستیوں پر آتی ہے اور اس میں آبادی بھی ہلاک ہو جاتی ہے۔ اور جب اٹھایا جاتا ہے تو پہلے اقوام کو اٹھایا جاتا ہے اور وہ پھر بستیاں آباد کرتی ہیں لیکن جس انداز میں ' ایک منظر کی شکل میں ہلاکت و بربادی کو پیش کیا گیا ہے ' یہ قرآن کریم کا مخصوص فنی اسلوب ہے۔

جب یہ تباہی آتی ہے تو اس میں لوگوں کا منظر بھی بڑا عجیب ہے۔ ان کی حالت یوں ہوتی ہے جس طرح پنجرے میں چوہے بند ہو جاتے ہیں ' جب تک وہ ہلاک نہ کر دیئے جائیں ' وہ پنجرے کے اندر ادھر ادھر بھاگتے ہی رہتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۲۱ : ۱۲) "جب ان کو ہمارا عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے"۔ یعنی گاؤں سے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ان کو معلوم ہو گیا کہ عذاب الہی آگیا ' گویا یہ بھاگ دوڑ ان کو عذاب الہی سے بچالے گی۔ گویا وہ اس قدر تیز بھاگ سکتے ہیں کہ عذاب الہی ان سے پیچھے رہ جائے گا ' لیکن ان کی یہ بھگدڑ ایسی ہی ہے جس طرح چوہا پنجرے میں دوڑتا ہے۔ وہ بغیر سوچ اور بغیر کسی شعور کے دوڑتا ہے۔

لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰي مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ

(۲۱ : ۱۳) "بھاگو نہیں ' جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے ' شاید کہ تم سے پوچھا جائے گا"۔ یہ تو تمہارا گاؤں ہے اس سے مت بھاگو۔ اس کے اندر وہ سب ساز و سامان ہے اور اس کے اندر تمہارے وہ مسکن ہیں ' جن میں تم عیش پرستیاں کرتے تھے۔ واپس ہو جاؤ شاید کہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ دولت کن امور میں خرچ کی۔ اس سوال کا وہ جواب کیا دیں؟ یہ تو ان کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق تھا۔

اب ذرا جھکتے ہیں تو اب ان کو سمجھ آتی ہے کہ عذاب الہی نے تو انہیں گھیر لیا ہے اور اب یہ بھگدڑ انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ یہ دوڑ انہیں دائرہ عذاب سے باہر نہیں نکال سکتی تو اب وہ بدل جاتے ہیں ' جرم کا اعتراف کرتے ہیں ' توبہ و استغفار کرتے ہیں۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ (۲۱:۱۴) "ہائے ہماری کم بختی' بے شک ہم خطاکار تھے"۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے' اب تو مہلت کی گھڑی ختم ہو چکی ہے۔ اب تو وہ جو چاہیں کہتے رہیں۔ اب یہ لوگ مرتے تک اقرار جرم کرتے رہیں' توبہ کرتے رہیں۔ کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْکَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰی جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ (۲۱:۱۵) "وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کھلیان کر دیا' زندگی کا ایک شرارہ ان میں نہ رہا"۔ یہ آدمیوں کا کھلیان تھا جس میں نہ حرکت تھی نہ حرارت۔ ابھی تک تو وہ ایک ایسا قریہ تھا کہ جس میں ہر طرف زندگی دوڑتی نظر آتی تھی اور یہ گاؤں نہایت خوبصورت تھا۔

یہاں اب قرآن مجید اس نظریہ حیات' جس پر کلام ہوا۔ اور اللہ کی اس تکوینی سنت جس کے مطابق یہ کائنات چلتی ہے' کے درمیان ربط قائم فرماتے ہیں۔ یہ تکوینی سنت ہے جس نے اس کی فصل کو کاٹ کر پھینک ڈالا۔ کیونکہ انہوں نے رب تعالیٰ کی تشریعی سنت کی پیروی نہ کی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جس حق پر یہ کائنات قائم ہے اور جس حق پر پیغمبروں کی دعوت قائم ہے وہ ایک ہے' اور اس کائنات اور زمین و آسمان کا ان دونوں سچائیوں سے رابطہ ہے۔

مشرکین کے پاس دعوت اسلامی کی جو جدید ہدایات آئیں وہ ان کا استقبال مذاق اور استہزاء سے کرتے اور لہو میں مشغول ہو کر منہ موڑ لیتے۔ وہ اس بات سے غافل رہے کہ یہ کس قدر اہم اور سچی دعوت ہے۔ یوم حساب قریب ہے اور وہ اس سے بھی غافل ہیں بلکہ مذاق کرتے ہیں تو اللہ کی تکوینی سنت بھی اپنا کام جاری رکھتی ہے اور وہ بھی مشرکین کے اس انکار اور اعراض کا نوٹس لیتی ہے کیونکہ حق ایک ہے وہ شریعت میں ہو یا کائنات میں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَکُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے' کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک حکمت اور اسکیم کے مطابق پیدا کیا ہے' اس کا ایک مقصد ہے۔ یہ کائنات محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں پیدا کی گئی۔ یہ ایک حکیمانہ فعل ہے' محض اتفاقی عمل نہیں ہے۔ جس سنجیدگی' سچائی اور مقصدیت کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا ہے اسی کے ساتھ رسولوں کو بھی بھیجا گیا ہے۔ کتابیں نازل کی گئی ہیں' فرائض منصبی مقرر ہوئے اور شریعت اور قانون بنائے گئے ہیں۔ لہٰذا مقصدیت اور سنجیدگی اس کائنات کی اساس ہے۔ اس

کے چلانے کا بھی ایک مقصد ہے۔ اس میں انسانوں کو ایک نظریہ دینے میں بھی ایک مقصد ہے اور موت کے بعد حساب و کتاب میں بھی مقصدیت اور سنجیدگی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کوئی کھلونا بنانا چاہتا تو اپنے ہاں بنا لیتا۔ ایک ذاتی کھیل ہوتا اور اللہ کی دوسری مخلوقات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ یہ محض الزامی اور جدلی فرض ہے۔ "اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے پاس ہی سے کر لیتے"۔ جس طرح نحوی لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف امتناع برائے امتناع ہے۔ یعنی "لو" کے بعد ایک فقرہ شرط ہوتا ہے اور دوسرا جواب شرط۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں فقروں کا واقع ہونا ناممکن اور ممتنع ہے۔ چونکہ اللہ نے ارادہ ہی نہیں کیا اس لیے لہو و لعب ہوا ہی نہیں ہے۔ نہ اللہ کے ہاں کوئی ہو ہوا اور نہ خارج میں کسی معاملے میں ہوا۔ اور یہ لہو و لعب ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس کی طرف اللہ کا ارادہ متوجہ ہی نہیں ہوا۔

اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ (۲۱ : ۱۷) کے معنی ہیں مَا کُنَّا فٰعِلِیْنَ یعنی ہم نے ایسا کرنا ہی نہ تھا' ایسا کرنے والے ہی نہ تھے۔ تو یہ ایک فرض ہے برائے مباحثہ اور اس سے یہ حقیقت ثابت کرنا ہے کہ اللہ کی ذات سے متعلق جو امور بھی ہیں وہ اللہ کی ذات کی طرح قدیم ہیں۔ دائمی ہیں' فانی نہیں ہیں۔ اگر اللہ لہو کا ارادہ کرتا تو یہ لہو ایک نیا معاملہ نہ ہوتا۔ یہ بھی ذات باری کی طرح قدیم ہوتا۔ ازلی ہوتا اور ابدی ہوتا کیونکہ اس کا تعلق ذات ازلی اور باقی سے ہوتا۔ اسی لیے "من لدنا" کا لفظ استعمال ہوا "اپنے ہی پاس"۔ لیکن اللہ کا طے شدہ قانون تو یہ ہے کہ کوئی معاملہ کھیل کے طور پر نہ ہو' بلکہ ہر معاملہ سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ ہو۔ اور وہ حق ہو۔ یوں حق باطل پر غالب آتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱ : ۱۸) "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے"۔ نحو میں لفظ بل اضراب کے لیے آتا ہے یعنی ایک بات کو چھوڑ کر متکلم دوسری بات لیتا ہے۔ یعنی لہو کی بات چھوڑ کر بتایا جاتا ہے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش ہے اور سنت الہیہ یہ ہے کہ اس کشمکش میں حق کو غلبہ نصیب ہو۔

اس منظر کا انداز تعبیر نہایت ہی حسی' محسوس ہونے والا' زندگی سے بھرپور اور حرکت سے بھرپور ہے۔ نقشہ کچھ یوں ہے کہ سچائی ایک گولہ ہے جو دست قدرت میں ہے' قدرت اسے پھینکتی ہے' یہ باطل کے سر پر لگتا ہے اور اس کے دماغ کو پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور باطل صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے آناً فاناً۔

یہ ایک طے شدہ سنت ہے' اور سچائی اس کائنات کے اندر اصل ہے۔ کائنات کے وجود میں اس کا گہرا دخل ہے۔ باطل تو دائرہ کائنات سے خارج البلد ہے۔ اگر کہیں نظر آتا ہے تو یہ عارضی ہوتا ہے' اس کی قوت گہری نہیں ہو سکتی' اللہ اس باطل کو بھگاتا رہتا ہے۔ سچائی سے خود اللہ باطل پر بمباری کرتا رہتا ہے اور اس کا سر توڑتا رہتا ہے۔ لہٰذا جس چیز پر اللہ کی بمباری ہو' جس چیز کو دست قدرت فنا کرتا ہو' اس کے لیے بقا نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے!

بعض سطحی لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت عملی صورت حالات اس کرۂ ارض پر اس کے خلاف ہے' جو اللہ علیم و خبیر فرما رہا ہے۔ بلکہ ہر حالات اس کے برعکس ہیں۔ یہ سوال ان تاریخی وقفوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے جن میں کبھی کبھار باطل پھولا ہوا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گویا اس کی حکمرانی رہے گی۔ اور ان وقفوں میں حق اور اہل حق اس قدر

بدحال ' افسردہ اور غبار آلودہ ہوتے ہیں کہ وہ مغلوب نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں بعض مختصر وقفوں میں یوں ہوتا رہتا ہے۔ ان وقفوں کو اللہ تعالیٰ بعض اوقات ذرا طویل بھی کر دیتا ہے مگر یہ اہل حق کی آزمائش کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سنت الہیہ کا دست غیب بمباری شروع کرتا ہے۔ یہ سنت الہیہ ہے اور اسی سنت پر ارض و سما کا نظام قائم ہے اور اسی پر اسلامی دعوتوں کا بھی نظام قائم ہے۔

جن لوگوں کا ایمان پختہ ہے ان کے دل میں تو ذرا شک بھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کی بنیاد سچائی پر ہے۔ وہ یہ شک نہیں کر سکتے کہ اللہ داعیان حق کی نصرت کرتے ہوئے باطل پر گولہ پھینکتا ہے اور اس کا بھیجا نکالا دیتا ہے۔ اہل حق کو اگر اللہ کچھ عرصہ کے لیے آزمائے تو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ان کی آزمائش ہے۔ ان کو راہ حق میں جم جانا چاہئے۔ اور اس آزمائش میں پورا اترنا چاہئے۔ ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان میں کچھ کمزوریاں ہیں اور اللہ چاہتا ہے کہ وہ دور ہوں اور وہ اس حق کے غلبے کے لیے تیار ہوں۔ وہ دست قدرت کا کام کریں ' اپنی کمزوریاں دور کریں ' اپنے اندر کمال پیدا کریں جس قدر وہ جلدی تیاریاں مکمل کریں گے ' ان کی آزمائش کا عرصہ اسی قدر جلدی ختم ہو گا اور پھر اللہ باطل پر جو گولہ باری کرے گا تو انہی کے ہاتھوں سے ہو گی۔ اہل حق کے غلبے کے لیے تیار ہوں۔ وہ دست قدرت کا کام کریں ' اپنی کمزوریاں دور کریں ' اپنے اندر کمال پیدا کریں جس قدر وہ جلدی تیاریاں مکمل کریں گے ' ان کی آزمائش کا عرصہ اسی قدر جلدی ختم ہو گا اور پھر اللہ باطل پر جو گولہ باری کرے گا تو انہی کے ہاتھوں سے یہ ہو گی۔ (وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى) کا منظر ہو گا ' اچانک باطل اس دنیا سے نیست و نابود ہو جائے گا۔ یاد رکھئے کہ باطل کا انجام مقرر ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱ : ۱۸) "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے"۔ اور اللہ جو چاہتا ہے ' وہ کرتا ہے۔

(روس میں دست قدرت نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ مترجم)

---ooo---

قرآن کریم یہ حقیقت مشرکین مکہ کے ذہن نشین کر رہا ہے جو قرآن مجید کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے تھے کہ یہ سحر ہے ' یہ شعر ہے ' یہ افتراء ہے۔ حالانکہ یہ برحق ہے اور قرآن کریم باطل پر حملہ آور ہے ' اس کا سر پھوڑ رہا ہے اور جلد ہی باطل اور شرک (جزیرۃ العرب سے) مٹنے والا ہے۔ ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم قرآن مجید یا تحریک اسلامی کے بارے میں جو باتیں بناتے ہو ' وہ تمہارے لیے سامان ہلاکت ہیں۔ (وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ) اس کے بعد ان کے سامنے ان کی نافرمانی اور روگردانی کے مقابلے میں اطاعت کیش مخلوق کی اطاعت شعاری کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نمونہ ان لوگوں کی زندگی سے پیش کیا جاتا ہے جو ان کے مقابلے میں خدا تعالیٰ سے زیادہ قریب ہیں ' لیکن اس قربت کے باوجود وہ رات اور دن اس کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں اور بندگی کرتے کرتے تھکتے بھی نہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا

يَفْتُرُوْنَ۝۲۰

"زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق بھی ہے اللہ کی ہے اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ' دم نہیں لیتے"۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کے سوا اس کا پورا علم کسی کو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا احاطہ کر سکتا ہے۔ علیم و بشیر ہی صرف انسان کے بارے میں یقین سے جانتا ہے۔ اہل ایمان جن اور ملائکہ کے وجود پر بھی ایمان لاتے ہیں کیونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں ہے لیکن ان دو مخلوقوں کے بارے میں بھی ہم صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں خالق نے علم دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوکب میں اور ذی عقل مخلوق بھی ہو اور اس کی شکل و صورت اس سیارے کے ماحول اور طبیعی حالات کے مطابق ہو 'لیکن یہ علم بھی اللہ ہی کے پاس ہے۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۱:۱۹) "اور زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے ' اللہ کی ہے"۔ تو ہمیں جس جس مخلوق کے بارے میں علم ہے اسے ہم مانتے ہیں اور جس کے بارے میں علم نہیں ہے اسے خالق کائنات پر چھوڑ دیتے ہیں۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ "اور جو اس کے پاس ہیں۔ اس کا قریبی مفہوم تو یہی ہے کہ مراد فرشتے ہیں 'لیکن ہم اس کے مفہوم میں تخصیص کیوں کریں۔ اس میں ملائکہ اور دوسری مخلوقات شامل ہیں۔ اس کے "پاس" یا "عندہ" مفہوم اللہ کے حوالے سے مکانیت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس سے قرب معلوم ہوتا ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱:۱۹) "اور جو اللہ کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی عبادت سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں"۔ جس طرح مشرکین مکہ محض تکبر کی وجہ سے اللہ کی بندگی سے منہ موڑتے ہیں اور نہ جھکتے ہیں یعنی رات اور دن وہ مسلسل اللہ کی بندگی اور تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کی پوری زندگی عبادت بن سکتی ہے اور وہ اپنے آپ کو فرشتوں کی طرح مسلسل عبادت کی حالت میں رکھ سکتا اگر وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے اگرچہ اس کے بعض افعال ذاتی نوعیت کے ہوں 'مثلاً اس کا کھانا پینا۔

یہ کہ اللہ کی تعدد ولا تحصی مخلوق رات اور دن اللہ کی عبادت میں مصروف ہے ' جو بھی زمین اور آسمانوں میں ہے 'لیکن مشرکین اللہ وحدہ کی بندگی سے سرتابی کر کے دوسرے الہوں کی بندگی کرتے ہیں اور انہیں پکارتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت بہت ہی بری ہے۔ حالانکہ رات اور دن کا نظام اور اس پوری کائنات میں چلنے والا ناموس فطرت اس بات پر دلیل مبین ہے کہ مدبر کائنات اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ نیز نقلی استدلال بھی اگر مانگتے ہیں تو قرآن اور تمام کتب سماوی اس پر متفق ہیں کہ اللہ الٰہ واحد ہے اور یہی تمام رسولوں اور کتابوں کی دعوت ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝

"کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ (بے جان کو جان بخش کر) اٹھا کھڑا کرتے ہوں؟ اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

کیا اسے چھوڑ کر انھوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے نبیؐ' ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل' یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی"۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں' اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے' پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو"۔

ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا کہ انھوں نے اللہ کے سوا الٰہ پکڑ رکھے ہیں' استفہام انکاری ہے اور پھر ان الہوں کی یہ صفت بیان کرنا کہ وہ لوگوں کو مارتے ہیں اور پھر زندہ کریں گے۔ یہ ان کے الہوں کے ساتھ مذاق ہے' کیونکہ کسی الٰہ کا سچا تصور ہی یہ ہے کہ وہ موت کے بعد لوگوں کو زندہ کر کے حساب و کتاب لے۔ مذاق کے طور پر پوچھا جاتا ہے کہ کیا ان کے یہ الٰہ حشر و نشر کا کام کرتے رہتے ہیں؟ اگر نہیں' اور مشرکین خود بھی مانتے ہیں کہ نہیں' تو پھر کیوں ان کو الٰہ مانتے ہیں' جبکہ وہ اپنے اندر الٰہ ہونے کی صفت اول ہی نہیں رکھتے۔

یہ عملی استدلال اور عملی منطق ہے۔ اب ایک دوسری حقیقت پسندانہ عملی دلیل ملاحظہ؟

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱ : ۲۲) "اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا"۔ یہ کائنات ایک ایسے قانون قدرت کے اوپر قائم ہے جو اس کے تمام اجزاء کے درمیان ایک مکمل ربط قائم کرتا ہے اور اس کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں۔ ایک ایک جزء کی حرکت کائنات کے کل کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ قانون واحد ایک واحد مقنن کے حکم اور ارادے کا مرہون منت ہے۔ اگر کائنات کی مدبر ہستیاں متعدد ہوتیں تو ارادے بھی متعدد ہوتے اور قوانین بھی متعدد ہوتے۔ ارادہ کرنے والی ذات کا مظہر اور ہوتا ہے اور کوئی قانون اور ضابطہ نافذ کرنے والی ذات کے ارادے کا مظہر اور ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کائنات کا یہ

مکمل نظام کب کا باہم ٹکرا جاتا اور اس میں ہم آہنگی نہ رہتی اور اس کائنات میں آئے دن عظیم اضطرابات ہوتے رہتے کائنات کے اندر یہ ربط' تنظیم اور ہم آہنگی اس قدر محسوس اور مشاہد ہے کہ ملحد سے ملحد شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ دنیا میں جن لوگوں کی فطرت سلیم ہے وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے اور یہ ناموس ایک اہم شہادت ہے کہ پوری کائنات میں ایک ہی ارادہ کام کرتا ہے اور اس کا ایک ہی خالق اور مدبر ہے' اس لیے اس کی ساخت اور رفتار میں کوئی فساد نہیں ہے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۲۱: ۲۲) "پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ یہ باتیں بناتے ہیں کہ اللہ کے شریک ہیں حالانکہ وہ ان باتوں سے منزہ ہے۔ وہ عرش کا رب ہے۔ عرش اللہ کے اقتدار اعلیٰ' اللہ کے قبضے اور احاطے اور اللہ کی بلندی کا رمز اور اشارہ ہے۔ اللہ ان کی بنائی ہوئی باتوں سے پاک ہے اور جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اسی کائنات کی سلامت روی' تنظیم اور ہم آہنگی اور یک رنگی ان کی باتوں کی تکذیب کرتی ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱: ۲۳) "وہ اپنے کاموں کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور دوسرے سب جواب دہ ہیں"۔ جو ذات پوری کائنات کو کنٹرول کر رہی ہو' اسے کب کوئی پوچھ سکتا ہے اور کون ہے جو پوچھ سکتا ہے۔ وہ تو خود اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس کا ارادہ آزاد ہے۔ اس کے اوپر کوئی قید وبند نہیں ہے اور نہ کوئی دوسرا ارادہ آڑے آ سکتا ہے۔ اس کے ارادے کے سامنے وہ قانون قدرت بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا جو اس نے خود جاری کیا ہے۔ سوال اور محاسبہ تو کسی معیار اور کسی پیمانے اور حدود کے مطابق ہوتا ہے جو وضع کیے گئے ہوں اور اللہ تو خود واضع حدود ہے اور معیار اور پیمانے مقرر کرنے والا ہے۔ وہ خود اپنے مقرر کردہ حدود اور معیار و مقیاس کا پابند نہیں ہے۔ لوگوں کے لئے چونکہ اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پابندی ضروری ہے اس لیے وہ سب اس کے سامنے مسئول ہیں۔

بعض انسانوں کو غرور اس قدر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ وہ عجیب احمقانہ سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اللہ نے یہ کام کیوں کیا؟ یہ چیز کیوں بنائی؟ اس کی کیا حکمت ہے' ان کی منشا یہ ہے کہ وہ اس حکمت کو سمجھ نہیں پا رہے۔ ایسے لوگ اس میدان میں خالق کائنات کے بارے میں نہایت بے ادبی کا رویہ بھی اختیار کرتے ہیں' جس طرح وہ انسانی فہم و ادراک کی حدود سے بھی آگے جا رہے ہیں کیونکہ انسان کے محدود قوائے مدرکہ ہر چیز کا سبب اور علت معلوم نہیں کر سکتے۔

اللہ وہ ذات ہے جو ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ تمام کائنات کی ہر چیز کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔ تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہی ہے جو قادر مطلق' مدبر اور حاکم اور حکیم ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱: ۲۳) "وہ اپنے کاموں کے لیے جواب دہ نہیں ہے' اور دوسرے سب جواب دہ ہیں"۔ اب اس تکوینی دلیل کے ساتھ ساتھ اللہ ان سے نقلی دلیل کا بھی مطالبہ کرتے ہیں' کہ وہ کیا نقلی دلیل ہے جس کی بنا پر یہ لوگ شرک کرتے ہیں حالانکہ شرک پر تو کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ (۲۱:۲۴) "کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے نبی ٗ ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل ' یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی"۔ یہ قرآن کریم موجود ہے اور اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے۔ سابقہ رسولوں کی کتابیں بھی موجود ہیں ان میں بھی کم از کم اللہ کے شریکوں کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہ سب ادیان عقیدہ توحید پر قائم ہیں۔ لہذا مشرک جو شرک کرتے ہیں ' اس کا ماخذ کیا ہے ' یہ تو اس کائنات کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱:۲۴) "مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں ' اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں"۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱:۲۵) "ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے ' پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو"۔ اللہ نے جب سے لوگوں کی ہدایات کے لیے رسول بھیجے ہیں ان کی دعوت اور تعلیمات کا قاعدہ و اساسی عقیدہ توحید رہا ہے۔ آج تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یعنی الٰہ اور معبود ایک ہی ہے۔ وہی رب ہے ' الوہیت اور ربوبیت کے درمیان جدائی ممکن نہیں ہے جو الٰہ ہے وہی رب ہے۔ لہٰذا ان تعلیمات میں الوہیت حاکمیت اور بندگی میں کوئی شرک نہیں اور یہ عقیدہ اسی طرح مستحکم ہے جس طرح اس کائنات کا نظام مستحکم ہے۔ یاد رہے کہ رسولوں کی تعلیمات بھی دراصل اس کائنات کے قوانین فطرت کا ایک حصہ ہیں۔

--- ooo ---

اب روئے سخن ایک دوسرے شرکیہ عقیدے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ عقائد جاہلیت میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لیے اولاد پیدا کر رکھی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۲

"یہ کہتے ہیں "رحمٰن اولاد رکھتا ہے"۔ سبحان اللہ ' وہ (یعنی فرشتے) تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے۔ اور بس اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے ' اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو ' اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں اور جو ان میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں ' تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں ' ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے"۔

اللہ کے لیے بیٹا ہونے کا تصور زمانہ جاہلیت میں مختلف لوگوں کے درمیان مختلف تھا۔ مشرکین عرب خیال کرتے تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ مشرکین یہود کہتے تھے کہ عزیر ابن اللہ ہیں اور مشرکین نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ سب شرکیہ عقائد ہیں اور دوسری اقوام مشرک کے ہاں اور طرح کے ہیں۔

یہاں اشارہ عربوں کے عقیدہ کی طرف ہے جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہاں ان کے عقیدے کی تردید فرشتوں کی نوعیت اور حقیقت کے بیان سے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں نہیں ' جس طرح ان لوگوں کا زعم ہے بلکہ یہ اللہ کے ہاں مکرم بندے ہیں۔ یہ ایسی مخلوق ہے کہ اللہ کے سامنے جذبہ اطاعت ' ادب اور خوف خدا کی وجہ سے بات ہی نہیں کرتے۔ پس جو ان کو حکم دیا جاتا ہے ' بے چون و چرا اس پر عمل کرتے ہیں۔ اللہ کا علم پوری طرح ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ لوگ کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے الا یہ کہ اللہ کسی کی سفارش پر راضی ہو جائے۔ وہ مزاجاً اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے خوف سے بھی ڈرتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کے قریب تر ہیں ' پاکباز ہیں ' پوری طرح مطیع فرمان ہیں اور ان کے اندر کوئی انحراف نہیں ہے۔ پھر ان کا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ وہ الٰہ ہیں۔ اور اگر وہ ایسا کوئی دعویٰ کر بھی بیٹھیں ' بفرض محال ' تو وہ بھی ایسی ہی سزا کے مستحق ہوں گے جس کا اعلان دوسروں کے لیے ہے ' یعنی جہنم اور یہ سب ظالم مشرکین کے لیے ہے۔ یہ اس لیے کہ الوہیت کا حق صرف اللہ کا ہے۔۔۔ اس طرح مشرکین عرب کا یہ دعویٰ غلط ' خلاف عقل اور مکروہ ہے ' کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا اور اگر کرے گا تو مقررہ سزا پائے گا۔ جو بھی ہو یہ مدعی ..... یہاں فرشتوں کی اطاعت شعاری کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے خوف میں ڈوبے رہتے ہیں جبکہ مشرکین مکہ جسارت کرتے ہیں۔

یہاں تک انسان کے سامنے توحید کے تکوینی دلائل رکھے گئے ' نیز تمام شرائع کے نقلی دلائل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ سب کی تعلیم توحید ہے اور بعض وجدانی دلائل بھی دیئے گئے جو دلوں میں قدرتاً اتر جاتے ہیں۔ اب قرآن مجید انسان کو اس عظیم کائنات کی سیر کراتا ہے ' وہ کائنات جسے اللہ کا دست قدرت نہایت ہی حکیمانہ انداز میں چلاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ لوگ اس کائنات میں پھیلے ہوئے آیات و معجزات پر غور نہیں کرتے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٠﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ ﴿٣٢﴾

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

"کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے 'غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے 'پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں 'شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا مگر یہ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں"۔

یہ اس نظر آنے والی کائنات کی سیر ہے 'جبکہ انسانوں کے دل و دماغ اس میں موجود دلائل و شواہد سے بالکل غافل ہیں۔ اگر کھلے دل و دماغ سے اس پر غور کیا جائے تو اس میں ایسے شواہد ہیں جو عقل و خرد کے دامن گیر ہو جاتے ہیں ' صرف چشم بینا چاہئے۔

یہ بات کہ زمین و آسمان پہلے ملے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو بعد میں جدا کر دیا ' قابل غور ہے۔ فلکیات کے شعبے میں انسانی علم جس قدر آگے بڑھتا ہے وہ قرآن کے اس فرمان کی توثیق کرتا ہے جو قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے کی۔ آج تک انسانوں نے جو نظریات قائم کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سورج کی کہکشاں جس میں سورج ' چاند ' زمین اور ان کے تابع دوسرے سیارے ہیں وہ پہلے ایک "سدیم" تھے بعد میں جدا ہو کر ان اجرام نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔ اور یہ کہ زمین سورج ہی کا ایک حصہ تھی جس سے وہ جدا ہوئی اور ٹھنڈی ہو گئی۔

لیکن یہ تو فلکی نظریات میں سے ایک نظریہ ہے۔ آج یہ قائم ہے 'کل پھر اڑ جائے گا اور اس کی جگہ ایک دوسرا زیادہ مضبوط نظریہ لے لے گا۔ مسلمانوں کا طریقہ کار یہ نہیں ہے کہ وہ یقینی آیت پر ماہرین فلکیات کا کوئی غیر یقینی نظریہ تھوپ دیں اور پھر اس کی تفسیر اس کے مطابق کریں۔ آج ہم اسے قبول کریں اور کل مسترد کر دیں۔ اس لیے قرآن مجید کی اس تفسیر میں ہم نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ہم قرآن کریم اور جدید سائنسی نظریات کے درمیان تطبیق کریں۔ لیکن سائنسی نظریات اور چیز ہیں اور سائنسی حقائق اور چیز۔ سائنسی حقائق وہ ہوتے ہیں جو تجربے سے ثابت ہوں مثلاً یہ سائنسی حقیقت ہے کہ مادہ گرمی سے پھیل جاتا ہے اور پانی گرم ہونے سے بخارات میں بدل جاتا ہے اور برودت سے پانی جم جاتا ہے۔ اس طرح کے دوسرے تجربات دراصل سائنسی حقائق ہوتے ہیں۔ یہ سائنسی حقائق علمی اور فلکی نظریات سے مختلف چیز ہے۔

قرآن کریم علمی نظریات کی کتاب نہیں ہے۔ نہ قرآن کریم اس لیے نازل ہوا ہے کہ سائنس کی طرح اس کے تجربے کیے جائیں۔ دراصل قرآن زندگی کا ایک پورا نظام ہے ' نیز اسلام عقل کے لیے بھی حدود متعین کرتا ہے تاکہ وہ اپنی حدود میں رہ کر کام کرے۔ اسلام معاشرے کے لیے بھی ایک ضابطہ مقرر کرتا ہے تاکہ وہ عقل کو کام کرنے کی آزادی دے۔ لیکن اسلام سائنسی جزئیات میں مداخلت نہیں کرتا۔ نہ جزئیات میں جاتا ہے۔ عقل کی سمت درست کر کے اسلام ان باتوں کو عقل پر چھوڑ دیتا ہے۔

قرآن کریم کبھی کبھار کائناتی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا

(۲۱: ۳۰) "آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان دونوں کو جدا کیا"۔ ہم اس حقیقت پر محض اس لیے یقین کرتے ہیں کہ یہ قرآن میں مذکور ہے 'اگرچہ تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے کہ یہ کیونکر ہوا؟ زمین آسمان سے کیسے جدا ہوئی یا آسمان زمین سے کیسے جدا ہوئے۔ ہم ان سائنسی نظریات کو بھی اس مجمل حد تک قبول کرتے ہیں جو حقیقت مذکورہ در قرآن کے خلاف نہ ہوں۔ لیکن ہم یہ نہیں کرتے کہ فلکیاتی نظریات کو سامنے رکھ کر آیات قرآنیہ کو ان کے پیچھے دوڑائیں اور قرآن کی صداقت کا سرٹیفکیٹ ان نظریات سے لیں کیونکہ یقینی حقیقت قرآن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کے فلکیاتی نظریات اس آیت کے اس مجمل مضمون کے خلاف نہیں ہیں جو آیت میں آج سے صدیوں پہلے بیان کر دیا گیا تھا۔

اب ہم اس آیت کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱: ۳۰) "اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی"۔ یہ آیت بھی نہایت ہی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سائنس دان اس کے انکشاف اور ثبوت کو ایک عظیم بات خیال کرتے ہیں اور ڈارون کی اس بات پر تعریف کرتے ہیں جس نے کہ یہ دریافت کیا کہ پانی حیات کا بنیادی گہوارہ ہے اور اس حقیقت کو تجربے سے ثابت کیا۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس دان جب اس حقیقت تک پہنچے تو یہ بہت بڑا انکشاف تھا لیکن قرآن مجید میں جو بات آئی ہے یہ ہمارے لیے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے اور نہ سائنس دانوں کے انکشاف اور تجربے سے قرآن پر ایک مسلمان کے عقیدے میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن پر ہمارے اعتقاد کی بنیاد یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بنیاد نہیں ہے کہ جدید سائنسی نظریات قرآن کریم میں دیئے گئے حقائق کو ثابت کرتے ہیں۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور نشوونما اس حد تک درست اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کس حد تک وہ زندگی کے لیے پانی کو ضروری خیال کرتا ہے۔

قرآن کریم نے تو آج سے چودہ سو سال قبل کفار کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ ذرا اس کائنات پر غور کرو' اس کے عجائبات کو دیکھو' قرآن نے تو ان کی جانب سے کائنات کا مشاہدہ نہ کرنے پر سخت تنقید کی تھی اور یہ کہا تھا۔

اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۱: ۳۰) "کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ حالانکہ ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات یہ پکار رہی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔

اور ذرا مزید کائناتی مناظر: وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ "اور زمین پر پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے"۔ یہاں جو بات ثابت کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انسانوں کو لے کر ایک طرف ڈھلک نہ جائے اور اس کے اندر اضطراب نہ ہو۔ توازن مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات داخلی دباؤ جو زمین کے اندر ہوتا ہے' توازن پیدا کرتا ہے اور بعض اوقات خارجی دباؤ توازن پیدا کرتا ہے اور یہ دباؤ مختلف علاقوں میں مختلف ہوتا ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک جگہ پہاڑ بلند ہوں' دوسری جگہ زمین میں

گہرے گھڈے کے ساتھ متوازن ہوتا ہے۔ جو بھی ہو' بہرحال اس آیت سے اجمالاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زمین کے توازن کا پہاڑوں کے ساتھ تعلق ہے اس لیے ہم عقلی علوم اور تجربات کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ قرآن نے ایک حقیقت کے بارے حقیقت ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ آپ اسے ثابت کریں' سائنسی تجربات سے اور یہ ہے عقل انسانی اور سائنسی موضوع کے لیے کام کرنے کا اصل میدان۔ ہمیں قرآن کریم کے اس اعلان پر وجدانی یقین رکھنا چاہئے اور اس کے ثبوت کے لئے اس کائنات میں مزید تحقیقات کرنا چاہئیں۔

وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۲۱: ۳۱) "اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کریں"۔ پہاڑوں کے درمیان کشادہ راہیں اور وادیاں ہیں تاکہ لوگ ان میں اپنے راستے متعین کریں۔ یہاں وادیوں اور شاہراہوں کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ لوگ اس میں چلنے پھرنے کے راستے معلوم کریں لیکن اس میں ایک خفیہ سا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ان ظاہری راستوں سے وہ راہ ہدایت بھی معلوم کریں کیونکہ یہ پوری کائنات انسان کے لیے راہ ہدایت فراہم کرتی ہے۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱: ۳۲) "اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا"۔ آسمان سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اوپر نظر آئے۔ ہم جب سر کی سمت دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے اوپر نیلی چھت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم اسے سقف محفوظ کہتا ہے۔ یہ سقف اس کائنات کے نہایت ہی حساس نظام کی حفاظت کر رہا ہے اور یہ سقف ان ناپاکیوں سے بھی محفوظ ہے اور ان کمزوریوں سے بھی محفوظ ہے جو زمین میں ہیں۔ اوپر کا نظام اس طرح محفوظ ہے کہ آیات قرآنی نہایت ہی حفاظت سے اترتی ہیں۔

وَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (۲۱: ۳۲) "مگر یہ لوگ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ نہیں دیتے"۔ حالانکہ عقل کے لیے یہ ایک وسیع میدان ہے کہ کائنات میں آیات الٰہیہ تلاش کرے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ

(۲۱: ۳۳) "وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا' سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں"۔ رات اور دن اس کائنات کے دو اہم رنگ ہیں اور شمس و قمر دو بڑے اجرام ہیں۔ ان دونوں کا اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے' بلکہ نفس حیات سے ان کا گہرا تعلق ہے' پھر گردش لیل و نہار اور حرکت شمس و قمر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو زمانہ دراز سے یہ نہایت ہی دقیق ٹائم کے مطابق چل رہے ہیں۔ کبھی بھی اس ٹائم ٹیبل میں خلل نہیں پڑا اور مسلسل حرکت ہے بلا کسی معمولی وقفے کے۔ یہ امور اس قابل ہیں کہ انسان ان پر غور کرے اور معلوم کرے کہ اس کائنات کے لیے ایک ہی ضابطہ' ایک مدبر اور ضابطہ نے مقرر کیا ہے اور وہی اللہ خالق ہے اور وہی مدبر کائنات ہے۔

--- ○○○ ---

اب اس سبق کے آخر میں قرآن کریم ان قوانین اور ضوابط کو جو خالق نے اس کائنات میں جاری کر رکھے ہیں اور

جن کے مطابق خالق اس کائنات میں تصرفات کرتا ہے' ان اخلاقی اور شرعی اور دینی ضوابط سے مربوط کر دیتا جو انسانی زندگی کے اختیاری حصے میں جاری کیے جا رہے ہیں - یہ ضوابط تمہارے لیے آزمائش ہیں جس طرح تمہاری طبعی زندگی کا ایک انجام ہے' اسی طرح تمہاری اخلاقی زندگی کا بھی ایک انجام ہے -

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ۞ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ۞

"اور اے نبی" ہیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے' اگر تم مرگئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے ؟ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے' اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں - آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے" -

تم سے پہلے بھی ہم نے کسی بھی بشر کے لیے دائمی زندگی نہیں رکھی - ہر پیدا ہونے والا فنا ہو گا - ہر آغاز کے لیے انجام ہے' اگر رسول کو مرنا ہے تو کیا یہ لوگ لافانی ہیں - اگر یہ لوگ مرنے والے ہیں تو پھر کیوں ایسے شخص کا رویہ نہیں اپناتے جو مرتا ہے - کیا یہ دیکھتے نہیں' غور نہیں کرتے -

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (۲۱ : ۳۵) "ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے" - یہی قانون قدرت اس کرۂ ارض پر حیات پر لاگو ہے اور اس قاعدے میں کوئی استثناء نہیں ہے - لہذا تمام زندوں کو' تمام عقلمند زندوں کو اس مذاق کا خیال رکھنا چاہئے -

موت ہر زندہ چیز کا انجام ہے - زمین میں انسان کا ایک مختصر سفر ہے - سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے - یہاں سفر کے دوران انسان کو جو حالات پیش آتے ہیں یہ تو اس کے لیے آزمائش ہے' ایک امتحان ہے -

وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (۲۱ : ۳۵) "اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں" - شر میں مبتلا کر کے آزمائش سمجھ میں آتی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ کون کس قدر صبر کرتا ہے' کس قدر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اسے کس قدر رحمت خداوندی پر یقین ہے لیکن بھلائی اور خیر میں آزمائش کیسی ؟ اس کی تشریح کی ضرورت ہے -

واقعہ یہ ہے کہ بھلائی اور خیر میں آزمائش زیادہ سخت ہوتی ہے - اگرچہ لوگ اسے شر کی آزمائش سے کم تر سمجھتے ہیں - اکثر لوگ شر میں آزمائش کا مقابلہ تو کر لیتے ہیں لیکن خیر میں ان سے آزمائش کا مقابلہ نہیں ہو سکتا - بیماری اور ضعف میں لوگ شر کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن صحت اور عافیت میں کم لوگ آزمائش کا مقابلہ کر سکتے ہیں - ان کے پاس اشتہا ات کی اندھی قوت ہوتی ہے یا جسمانی اندھی قوت ہوتی ہے - اس کے استعمال میں وہ فیل ہو جاتے ہیں - بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جو فقر و فاقہ برداشت کریں گے اور ان کے نفوس کبھی بھی ان کو ذلت اور برے طریقوں پر رزق

حرام پر آمادہ نہ کر سکیں گے لیکن کم ہیں جو دولتمندی کی آزمائش میں پورے اتریں - دولت کا حق ادا کریں کبر و غرور نہ کریں اور عیش و عشرت سے بچیں -

بہت لوگ ہوں گے جو تشدد کو برداشت کریں گے اور ڈراوے اور دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کریں گے لیکن کم لوگ ہوں گے جو امن و عافیت کے دور میں مرغوبات ' مناصب اور سازوسامان کی کشش کا مقابلہ کر سکیں -

بہت لوگ ایسے ملیں گے جو مار پیٹ اور جسمانی اذیت اور زخموں کا مقابلہ کریں گے لیکن کم ایسے ہوں گے جو عیش و عشرت سے صبر کر سکیں یا طمع و لالچ کے مقابلے میں سیدھے کھڑے ہو سکیں کیونکہ دنیا کا لالچ بڑے بڑوں کی گردنیں جھکا دیتا ہے اور لوگ اس قدر پست پڑ جاتے ہیں کہ ان کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور روحانی طور پر وہ ذلت اختیار کر لیتے ہیں -

تشدد اور جسمانی تعذیب کے نتیجے میں انسان کی خودی بیدار ہو جاتی ہے - اس کے اعصاب میں قوت برداشت پیدا ہو جاتی ہے اور جسم کی تمام قوتیں تشدد و برداشت کرنے کے لیے صف آرا ہو جاتی ہیں - لیکن خوشحالی! یہ بہت ہی خطرناک لتاڑ ہے - اس سے اعصاب ڈھیلے ہو جاتے ہیں - جسمانی قوائے مدافعت پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور بیداری اور جدوجہد کی قوت ختم ہو جاتی ہے - ہم نے بہت سے ایسے تجربے کئے ہیں کہ تشدد اور جسمانی تعذیب میں ایک کارکن بہت ہی کامیاب رہا' مقابلہ کرتا رہا لیکن جب خوشحالی آگئی ' تو خوشحالی اور فراوانی کی آزمائش میں وہ فیل ہو گیا -

یہ ہے انسان کی کہانی - الا وہ لوگ جنہیں اللہ بچالے اور جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے : "مومن کی شان بھی عجیب ہے کہ اس کا کام ہر حال میں کامیابی ہے - اور یہ سہولت صرف اہل ایمان کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں - اگر اسے خوشحالی مل جائے تو وہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے ' تو وہ اس کے لیے خیر ہو جاتی ہے ' اگر اس پر مشکل دن آجاتے ہیں تو وہ صبر کرتا ہے ' تو یہ برے دن بھی اس کے لیے اچھے ہو جاتے ہیں" - لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں -

لہذا انسان کو عموماً اور تحریک اسلامی کے کارکن کو خصوصاً برے دنوں کے مقابلے میں اچھے دنوں میں زیادہ چوکنا رہنا چاہئے البتہ دونوں حالات میں رب تعالیٰ کے ساتھ حقیقی تعلق ہی کامیابی کی اصل ضمانت ہے -

---ooo---

درس نمبر ۱۴۱ ایک نظر میں

اس سے قبل کے سبق میں ہم نے دور تک اس کائنات کا سفر کیا۔ اس کائنات میں قوانین قدرت کا مطالعہ کیا' انسانیت کا انجام تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھا۔ اس سبق میں روئے سخن اسی مضمون کی طرف مڑ جاتا ہے جس کا سورہ کے آغاز میں ہم نے مطالعہ کر لیا ہے کہ مشرکین نے حضورؐ کا اور آپؐ پر آنے والی وحی کا استقبال مذاق سے کیا اور شرک پر اصرار کرتے رہے۔

ں کے بعد اس سبق میں انسان کی فطرت کی عجلت پسندی اور سیمابیت کا ذکر ہوا ہے یہاں تک کہ یہ لوگ عذاب الٰہی کے آنے میں بھی بہت جلدی کرتے ہیں۔ ان کو ان کی اس حرکت پر متنبہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور اکرمؐ کے ساتھ مذاق کرنے کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ ان کو اس سبق میں یہاں بااثر' غالب اور اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے سایہ اقتدار کے سکڑنے کا ایک منظر بھی دکھایا جاتا ہے اور عذاب آخرت کا ایک منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔

سبق کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ یوم آخرت میں مجرمین سے سخت حساب لیا جائے گا۔ چنانچہ آخر میں حساب آخرت' قوانین فطرت' انسان کی فطرت اور انسان کی زندگی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور داعیان اسلام کے بارے میں سنت الٰہیہ کے مضامین کو باہم ملایا جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۱ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۴۷

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

یہ منکرین حق جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنالیتے ہیں۔کہتے ہیں "کیا یہ ہے وہ شخص جو تمہارے خداؤں کا ذکر کرتا ہے؟" اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ رحمن کے ذکر سے منکر ہیں"۔

یہ کفار خود تو رحمن کے وجود ہی کا انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ اس کائنات کا خالق اور مدبر ہے اور رسول اللہؐ کی جانب ان کے الہوں اور بتوں پر جو معقول تبصرہ کیا جاتا ہے اسے یہ پسند نہیں کرتے لیکن وہ خود جب رحمن کا انکار کرتے ہیں تو اس میں کوئی ہرج محسوس نہیں کرتے حالانکہ وہ رحمن کے بندے ہیں اور پھر قرآنی تعلیمات کا انکار کرتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت میں بے حد بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اور وہ جس پیمانے سے دیتے ہیں اس سے لیتے نہیں' اور حقائق کا فیصلہ غلط کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو جس عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں' اس کے بارے میں یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جلدی کیوں نہیں آتا حالانکہ حضورؐ ان کو اس سے ڈراتے ہیں۔یہ جلدی وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں جلد بازی ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾

"انسان جلد باز مخلوق ہے۔ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں' مجھ سے جلدی نہ مچاؤ۔یہ لوگ کہتے ہیں "آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچے ہو"۔

انسان پیدا ہی جلد بازی سے کیا گیا ہے۔ عجلت اس کے مزاج اور اس کی تخلیق میں رکھی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی نظریں اس پر لگائے رکھتا ہے کہ مستقبل کے پردے کے پیچھے سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ مستقبل کے راز بھی یہ ہاتھ میں لے لے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے تمام تاثرات حقیقت کا روپ اختیار کریں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ جو وعدے ہوتے ہیں وہ اس کے سامنے آجائیں اگرچہ ان میں اس کو تکلیف ہی ملے۔ یہ صورت حال تب بدلتی ہے جب انسان کا رابطہ اللہ کے ساتھ قائم ہو جائے۔ اس صورت میں اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے' پھر جلد بازی نہیں کرتا۔ ایمان نام ہی یقین 'صبر اور اطمینان کا ہے۔

یہ مشرکین جو عذاب کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلدی کیوں نہیں آتا' یہ بھی پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی یعنی عذاب آخرت کب ہو گا اور عذاب دنیا کب آئے گا جس سے تم ڈراتے ہو۔ اس موقع پر صرف عذاب آخرت کا ایک منظر ان کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور ڈرایا جاتا ہے کہ تم سے قبل بھی کئی لوگوں نے اس قسم کا مذاق کیا تھا' لیکن جب عذاب آیا تو وہ سامان عبرت بن گئے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝ ۳ ع۱۲

"کاش ان کافروں کو اس وقت کا کچھ علم ہوتا جبکہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچا سکیں گے نہ اپنی پیٹھیں' اور نہ ان کو کہیں سے مدد پہنچے گی۔ وہ بلا اچانک آئے گی اور انہیں اس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ ان کو لمحہ بھر کی مہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اڑایا جا چکا ہے' مگر ان کا مذاق اڑانے والے اسی چیز کے پھیر میں آکر رہے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

اگر ان کو علم ہو جائے کہ ان کی حالت کیا ہو گی 'تو ان کا رویہ یہ نہ ہوتا' جواب ہے۔ یہ عذاب میں نہ جلدی کا مطالبہ کرتے اور نہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے۔ ان کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس وقت ہو گا کیا۔ وہاں ان کی حالت یہ ہو گی کہ ہر طرف سے آگ کے شعلے انہیں نوچ رہے ہوں گے' جھلسا رہے ہوں گے اور یہ اپنے آپ کو بچانے کی ناکام کوششیں کر رہے ہوں گے' قرآن اس کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ چہروں پر شعلے حملہ کریں گے' پیٹھوں پر کریں گے اور یہ کسی طرح کا دفاع نہ کر سکیں گے بلکہ یہ آگ ہمہ جہت ان پر شعلہ بار ہو گی اور یہ کسی شعلے کو رد نہ کر سکیں گے' نہ موخر کر سکیں اور نہ ان کو اس عذاب سے ذرا سی مہلت ملے گی۔

یہ آگ اچانک ان پر آئے گی اس لیے کہ یہ لوگ بہت جلدی کرتے تھے۔ ان لوگوں کا تو تکیہ کلام ہی یہ تھا۔

مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۱ : ۳۸) "یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو"۔ اس کا جواب تو یہ ہوا کہ اچانک ان پر ہر طرف سے شعلہ باری ہوگی۔ وہ حیران ہو جائیں گے اور ان کی عقل اب کچھ نہ کر سکے گی۔ نہ سوچ سکیں اور نہ کوئی دفاع کر سکیں گے اور نہ دفاعی منصوبہ بندی کے لیے کوئی مہلت ملے گی۔

یہ تو ہوگا آخرت کا عذاب۔ رہا دنیا کا عذاب تو وہ اس قسم کے مذاق کرنے والوں پر تاریخ میں بار بار آیا ہے۔ مشرکین مکہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ اللہ نے ان کے لیے سرے سے مٹانے کا عذاب مقدر نہیں کیا لیکن قتل' قید اور مغلوبیت کا عذاب تو تم پر آ سکتا ہے۔ لہٰذا اس کم درجے کے عذاب سے بھی یہ مذاق کرنے والے محفوظ نہیں ہیں۔ ورنہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا انجام تو تاریخ نے بار بار ریکارڈ کیا ہے۔ جب یہ سنت الہیہ کے مطابق آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں ہے اور اس کے نظارے ان لوگوں کی تاریخ میں کئی ہیں جو رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے رہے ہیں۔

آیا رحمٰن کے سوا اور کوئی ہے جو رات اور دن انہیں بے شمار مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ کیا دنیا کے عذاب یا آخرت کے عذاب سے' اللہ کے سوا انہیں کوئی اور بچانے والا ہے کہ یہ اس قدر شتابی کرتے ہیں؟

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

"اے نبی" ان سے کہو "کون ہے جو رات کو یا دن کو تمہیں رحمٰن سے بچا سکتا ہو؟" مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید ان کو حاصل ہے۔

اللہ رات دن ہر ذی روح کو مختلف مضرتوں سے بچانے والا ہے۔ یہ صفت رحمٰن ہے یعنی بہت زیادہ مہربان۔ اللہ کے سوا اور کوئی ذات بچانے والی یا مددگار نہیں ہے۔ اے پیغمبر' ان سے پوچھو کہ اللہ کے سوا ہے کوئی اور تمہارا حامی اور محافظ؟ یہ سوال دراصل سرزنش اور توبیخ کے لیے کیا گیا ہے اور استفہام انکاری ہے یعنی کوئی نہیں ہے۔ تم بہت بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہو' یہ تو اللہ ہی ہے جو رات اور دن تمہیں بچاتا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی بچانے والا یا حفاظت کرنے والا نہیں ہے۔

بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱ : ۴۲) "مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑتے ہیں"۔ اسی سوال کو ایک دوسری صورت میں ان سے پوچھا جاتا ہے۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا (۲۱ : ۴۳) "کیا یہ کوئی ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے

میں ان کی حمایت کریں"۔ تاکہ یہی اللہ دوسرے معاملات میں ان کی حمایت و حفاظت کریں ' ہرگز نہیں ۔ ان کے جو اللہ ہیں ان کی حالت یہ ہے ۔

لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ (۲۱ : ۴۳) "وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے"۔ جب وہ اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے تو دوسروں کی کیا مدد کریں گے ۔

وَلَا هُمْ مِنَّا يُصْحَبُونَ (۲۱ : ۴۳) "اور نہ ہماری تائید ان کو حاصل ہے"۔ اور ان کو نہ ہماری تائید حاصل ہے اور نہ دوستی کہ ایک صاحب قوت سے کوئی قوت حاصل کر لیں ۔ جیسا کہ ہارون اور موسیٰ علیہم السلام نے اللہ سے تائید حاصل کی جب اللہ نے کہا جاؤ فرعون کی طرف ۔

اِنَّنِي مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَ اَرَىٰ "میں تمہارے ساتھ ہوں ' سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں"؟ ۔ یہ الہ تو بذات خود کسی قسم کی قوت نہیں رکھتے ۔ نہ ان کو اللہ کی تائید حاصل ہے لہٰذا وہ کسی کی مدد نہیں کر سکتے ۔

مشرکین کے اعتقادات کی اس کمزوری کی نشاندہی کے بعد اور ان کے ساتھ یہ مذاق کرنے کے بعد اور یہ دیکھنے کے بعد کہ ان کا استدلال دلیل سے خالی ہے سیاق کلام ان کے ساتھ بحث ختم کر کے اس موضوع پر بحث کرتا ہے کہ وہ اس انداز سے کیوں الجھتے ہیں ۔ اس کے بعد ان کو احساس دلایا جاتا ہے کہ کچھ تو غور کرو ' دست قدرت کو دیکھو کہ وہ کس طرح ان کبراء کے اثر و رسوخ کو کم کر کے ان کے پیروں تلے سے زمین نکال رہا ہے ۔ ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے ' حالانکہ وہ وسیع علاقے میں بااثر تھے ۔ ان کو قوت حاصل تھی اور بڑا اقتدار تھا ان کا ۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

"اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو ہم زندگی کا سروسامان دیئے چلے گئے یہاں تک کہ ان کو دن لگ گئے مگر کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں؟ پھر کیا یہ غالب آ جائیں گے"۔ درحقیقت ہم نے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو موروثی طور پر خوشحال بنایا تھا ' اس دولتمندی نے ان کی فطرت کو بگاڑ دیا تھا ۔ ان کا دماغ خراب ہو گیا تھا ۔ اور ان کے احساسات اور میلانات بدل گئے تھے ۔ خدا کے ساتھ ان کا تعلق کمزور پڑ گیا تھا اور اس کائنات میں ذات باری پر دلالت کرنے والے جس قدر دلائل تھے ان پر یہ غور نہ کرتے تھے ۔ یہ تھی ان کی آزمائش مگر یہ آزمائش خوشحالی کے ساتھ کی گئی اور خوشحالی میں اگر اللہ کسی کا امتحان لے تو وہ سخت ہوتا ہے حالانکہ دولتمندی میں یاد الٰہی اور اللہ کے ساتھ تعلق کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے ۔

چنانچہ قرآن مجید ان لوگوں کے احساس کو ایک دوسرا منظر پیش کر کے جگانا چاہتا ہے ۔ یہ منظر بھی ہر وقت اس کرۂ

ارض پر حقیقی واقعات کی شکل میں دہرایا جاتا ہے کہ ایک بڑی مملکت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سکڑ جاتی ہے ایک عظیم مملکت سے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن جاتی ہیں۔ ایک بڑی قوت ہونے اور دنیا پر غالب ہونے کے بعد یہ مغلوب ریاستیں بن جاتی ہے۔ اور ایک نہایت ہی بڑی ریاست چھوٹی ریاست بن جاتی ہے۔ بڑی تعداد کم تعداد ہو جاتی ہے اور مالدار مملکت کے بجائے ایک غریب مملکت بن جاتی ہے۔

انداز کلام یوں ہے کہ دست قدرت ان بڑی بڑی مملکتوں کو سکیڑ دیتا ہے۔ جب تخیل اپنا کام کرتا ہے تو نہایت خوں انگیز منظر سامنے آتا ہے۔ اقوام کے مدوجزر کی دھیمی حرکت نہایت ہی خوفناک نتائج پیدا کرتی ہے۔

اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۲۱ : ۴۴) "کیا یہ غالب ہوں گے"۔ کیا ان کے ساتھ وہی کچھ نہ ہو گا جو دوسری اقوام کے ساتھ رات اور دن ہو رہا ہے۔ اقوام کے مدوجزر کے اس خوفناک منظر کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کو ایک آخری ڈراوا اور وارننگ دے دیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

"ان سے کہہ دو کہ "میں تو وحی کی بنا پر تمہیں متنبہ کر رہا ہوں"۔ مگر بہرے پکار کو نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے"۔ "لوگو خیال کرو، کہیں تم بہرے تو نہیں ہو۔ تم کیوں نہیں سنتے۔ ورنہ تمہارے پیروں تلے سے زمین سرک جائے گی اور دست قدرت تمہیں سکیڑ کر رکھ دے گا۔ ان کو دولت کے گھمنڈ اور مالداری کی مستی سے ڈرایا جاتا ہے۔

سیاق کلام اپنی موثر بات مزید بڑھاتا ہے اور عذاب کے وقت خود ان کی تصویری حالت ان کو بتاتا ہے۔

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

"اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انہیں چھو جائے تو ابھی چیخ اٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے"۔ لفظ نفحۃ کا اطلاق خیر اور رحمت کے مفہوم میں ہوتا ہے یعنی جھونکا۔ یہاں مراد ہے عذاب الٰہی یعنی عذاب الٰہی کا ایک ہلکا جھونکا بھی انہیں چھو جائے تو یہ اعتراف گناہ کرلیں گے لیکن اس وقت پھر اعتراف کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس سے قبل اس سورہ میں بستیوں والوں کی یہ پکار گزر گئی ہے کہ جب ان پر عذاب آیا تو انہوں نے اعتراف کر لیا۔

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۱۴) فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰهُمْ حَتّٰي جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۱۵) (۲۱ : ۱۴ - ۱۵) "ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے اور یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا، زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا"۔ لیکن یہ اعتراف بعد از وقت تھا۔ لہٰذا ان کے لیے بہتر ہے کہ اس تنبیہ کو قبل از وقت قبول کرلیں قبل اس کے کہ عذاب الٰہی کا ایک جھونکا ان پر آ جائے۔

یہ سبق قیامت کے حساب وکتاب کے ایک آخری منظر پر ختم ہوتا ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝

"قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے ' پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا۔جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہو گا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں"۔

رائی کے دانے سے مراد چھوٹی سے چھوٹی چیز ہے جو ترازو میں بہت ہی ہلکی ہو۔یوم حساب میں اسے بھی نظرانداز نہ کیا جاسکے گا اور اس قدر حساس میزان ہو گا کہ حبہ خردل سے بھی ترازو اوپر نیچے ہو گا۔

لہذا ہر نفس کو کل کے لیے زیادہ سے زیادہ بچت کرنا چاہئے۔دلوں کو چاہئے کہ وہ ڈرانے والے کی طرف کان لگا کر سنیں۔غافلوں ' منہ موڑنے والوں اور مذاق کرنے والوں کو چاہئے کہ اس سے پہلے سنبھل جائیں کہ دنیا کے عذاب کا کوئی جھونکا انہیں آئے یا آخرت کے عذاب کا کوئی کوڑا ان کی پشت پر چسپاں ہو چکا ہو۔اگر دنیا کے عذاب سے وہ بچ بھی جائیں تو عذاب آخرت تو ان کے لیے تیار ہے جس کے میزان میں کوئی ظلم نہ ہو گا 'رائی کے دانے کے برابر بھی۔

اس طرح آخرت کے نہایت ہی حساس میزان کو اس کائنات کے نہایت ہی حساس قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا گیا ہے اسی طرح دعوت کے احوال اور انسانوں کی فطرت کو باہم مربوط کر دیا گیا ہے۔لیکن سب امور کو دست قدرت کے تصرفات قرار دے کر ان سے ارادہ واحد ثابت کیا جو اس کائنات کی پشت پر کام کرتا ہے اور یہی دلیل ہے عقیدہ توحید پر۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۲ ایک نظر میں

اس سورہ کا یہ تیسرا سبق تمام رسولوں کے گروہ پر ایک سرسری نظر ہے۔ اس میں تمام رسولوں کا احاطہ تو نہیں کیا گیا لیکن بڑے بڑے رسولوں کا ذکر ہے۔ بعض کی طرف اس میں نہایت ہی مختصر اشارہ ہے اور بعض کے بارے میں ذرا تفصیلی ذکر ہے اور بعض کا مختصر ذکر ہے۔

ان تمام اشارات اور مفصل اور مختصر تذکروں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں پر کیا کیا رحمتیں کیں اور جن لوگوں نے نبیات اور معجزات دیکھ کر بھی ان کی تکذیب کی ان کا انجام کیا ہوا۔ نیز ان میں رسولوں کی آزمائش کے بھی واقعات ہیں۔ بعض اوقات انہیں خیر میں آزمایا گیا اور بعض اوقات شر میں اور یہ کہ وہ ان امتحانوں میں کس طرح کامیاب رہے۔

پھر اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ نے ہمیشہ انسانوں میں سے رسول بھیجے اور ان کا نظریہ بھی ایک ہی رہا۔ عقیدے کے ساتھ ساتھ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں ان کا طریقہ کار بھی ایک رہا اور زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود یوں نظر آتا ہے کہ وہ ایک ہی امت اور گروہ ہیں۔

رسولوں کا ایک نظریہ اور ایک امت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ایک ہے' اس لیے رسولوں کا عقیدہ ایک عقیدہ دینے والا ایک' اس کائنات کے اندر قوانین فطرت پیدا کرنے والا ایک اور ان تمام رسولوں کو' انسانوں کو' کائنات کو ایک ہی جہت میں ایک ہی خدا کے ساتھ مربوط کرنا بھی اس سبق سے معلوم ہوتا ہے۔ انا ربکم فاعبدون "میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری اطاعت کرو"۔

---ooo---

درس نمبر ۲۴۱ تشریح آیات

۴۸ --- تا --- ۹۲

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۚ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"پہلے ہم موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرقان اور روشنی اور "ذکر" عطا کر چکے ہیں' ان متقی لوگوں کی بھلائی کے لیے جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور اب یہ بابرکت "ذکر" ہم نے (تمہارے لیے) نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو"۔

اس سورہ میں یہ بات آئی تھی کہ مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے تھے کہ آپ رسالت کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ آپ ہم جیسے بشر ہیں' پھر وہ قرآن مجید کو وحی ماننے کے بجائے یہ کہتے تھے کہ یہ سحر ہے' یا شعر ہے یا افتراء پردازی ہے۔ چنانچہ اس پورے سبق میں ان کے اس الزام کا جواب ہے کہ رسول اس سے قبل بھی بھیجے گئے اور یہ سنت الہیہ ہے کہ تمام رسول بشر تھے اور کتاب بھیجنا بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی رسولوں کو کتابیں دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو کتاب دی گئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی وہ بھی فرقان تھی۔ فرقان قرآن کی بھی صفت ہے۔ گویا تمام رسولوں کا سلسلہ بھی ایک ہے' کتابیں بھی ایک ہیں' اور ان کی صفات بھی ایک ہیں' کیونکہ اللہ کی نازل کردہ تمام کتب حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی تھیں' اس لیے ان کو فرقان کہا گیا۔ یہ ہدایت و ضلالت کے درمیان تمیز کرتی تھیں۔ یہ اسلامی نظام حیات اور جاہلی نظام کے درمیان فرق کرتی تھیں۔ یہ اسلامی رجحانات اور غیر اسلامی رجحانات میں فرق کرتی تھیں اس لیے ان کو عمومی طور پر فرقان کہا گیا اور تورات اور قرآن کو صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ وہ فرقان ہیں۔

تورات کو یہاں روشنی بھی کہا گیا' اس لیے کہ وہ نظریات و افکار کی ظلمتوں کو روشن کرنے والی تھی' باطل کے اندھیروں کو دور کرنے والی تھی' اور یہ ایسے اندھیرے ہوتے ہیں جن میں عقل و خرد' ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں اور

انسان کی وہی دنیا پر اس وقت تک سورج طلوع نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر شعلہ ایمان روشن نہ ہو اور وہ اپنے ماحول کو روشن نہ کرے ۔ اس کو زندگی کا منہاج نہ دے اور زندگی کے اقدامات کی سمت متعین نہ کر دے تاکہ اقدار' منصوبوں اور مطالب کے درمیان اختلا پیدا نہ ہو۔

تورات بھی قرآن کی طرح متقین کے لیے ذکر اور ہدایت تھی ۔یعنی تورات کے ذریعہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا ذکر آج تک ہے جبکہ تورات سے قبل بنی اسرائیل کی کیا تاریخی حیثیت تھی؟ پہلے وہ فرعون کے غلام تھے ۔ جو ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور ان کو ذلت کے ساتھ اور تشدد کے تحت رکھتا ۔ یہاں متقین کے ساتھ یہ صفت بھی لگائی گئی کہ وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں ۔

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (۲۱ : ۴۹) "جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں" ۔ اس لیے کہ جو لوگ اللہ سے ڈریں اور انہوں نے اللہ کو دیکھا ہی نہ ہو اور

وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (۲۱ : ۴۹) "اور ان کو اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو" ۔ اور اس کے لیے تیاری اور عمل کرتے ہوں تو ایسے ہی لوگ اس روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور راہ ہدایت اختیار کرتے ہیں اس لیے ایسے لوگوں کے لیے کتاب نصیحت بن جاتی ۔ یہ ان کو اللہ کی طرف مڑنے کی یاد دہانی کراتی رہتی ہے ۔ اس کے ذریعے لوگوں کے اندر ان کا تذکرہ ہوتا ہے گویا وہ ان کی پہچان بن جاتی ہے ۔

یہ تھی حضرت موسیٰ اور ہارون کی شان وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ (۲۱ : ۵۰) "اب یہ بابرکت ذکر ہم نے نازل کیا ہے" ۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے 'کوئی عجیب چیز نہیں ہے ۔ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے جو پہلے ہوتا رہا ہے ۔ یہ اللہ کی معلوم و معروف سنت ہے ۔

اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۲۱ : ۵۰) "پھر کیا تم اسے قبول کرنے سے انکاری ہو" ۔ آخر اس میں تمہیں کیا چیز انوکھی لگ رہی ہے ۔کیا اس سے قبل اللہ کے رسول نہیں آتے رہے ۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کے قصے پر ایک نہایت ہی سرسری نظر ڈالنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی ایک مکمل کڑی یہاں دی جاتی ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عربوں کے جد اکبر ہیں ۔ خانہ کعبہ کے بانی ہیں' جس کو قریش نے بتوں سے بھر رکھا تھا اور رات اور دن ان کی بندگی اور پرستش کرتے تھے حالانکہ حضرت ابراہیم تو مشہور ہی اس لیے تھے کہ انہوں نے بت توڑے تھے ۔ یہاں ان کے قصے کو پیش کرنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ تم بتوں کی پرستش کرتے ہو'جبکہ وہ بت شکن تھے ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات زندگی کی یہ کڑی بہت ہی مشہور ہے ۔ اس کے کئی مناظر یہاں پیش کیے گئے ہیں ۔ ان مناظر کے درمیان بے شک چھوٹے چھوٹے گیپ بھی ہیں ۔ آغاز اس سے ہوتا ہے کہ ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت اور ہدایت عطا کر دی تھی اور وہ عقیدہ توحید پر قائم تھے ۔"رشدہ" سے مراد ہی عقیدہ توحید ہے کیونکہ اس فضا

میں سب سے بڑی ہدایت تھی یعنی عقیدۂ توحید کی طرف ہدایت۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

"اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے"۔

ہم نے ان کو ہوشمندی عطا کی تھی' ان کے حالات سے ہم اچھی طرح واقف تھے اور ان کی وہ صلاحیتیں بھی ہماری نظر میں تھیں جو حاملین رسالت کے لیے ضروری ہیں۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

"یاد کرو وہ موقع جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟"

ان کی یہ بات ہی ان کے رشد و ہدایت کی دلیل ہے۔ آپ نے ان پتھروں اور لکڑیوں اور دوسرے مواد کے لیے بڑا صحیح لفظ استعمال کیا یعنی مورتیاں' تماثیل۔ ان کو انہوں نے الہ نہ کہا اور اس بات پر سخت گرفت کی کہ تم لوگ بڑی چاہت سے ان کی پرستش کرتے ہو' عاکف کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلسل ان کے ساتھ جھکے ہوئے رہتے تھے' حالانکہ وہ دوسرے کام بھی کرتے ہوں گے لیکن ان کے دل ان بتوں ہی کے ساتھ تھے۔ اس لیے معنوی طور پر گویا وہ ان کے آگے مسلسل جھکے ہوئے تھے۔ اس لیے تعبیر ان الفاظ میں کی گئی کہ تم رات دن ان کے آگے جھکے ہوئے ہو۔

ان کا جواب اور دلیل صرف یہ تھی۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

انہوں نے جواب دیا "ہم نے اپنے باپ داداکو ان کی عبادت کرتے پایا ہے"۔ اس جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم باپ دادا کی تقلید کرتی ہے تو اس کی سوچ اور اس کی عقل کی قوتیں منجمد ہو جاتی ہیں جبکہ ایمان انسان کو آزادی' فکر و نظر کی وسعت' اور ہر چیز اور ہر صورت حال کا حقیقی جائزہ لینے کی تعلیم دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ ہر بات پر غور کر کے اس کا حقیقی وزن کرو۔ لہٰذا اللہ پر پختہ ایمان کا یہ پہلو بھی بہت اہم ہے۔ یعنی عقیدۂ توحید اور شرک کا کہ انسان اوہام' جامد تقلید اور دہنی تصورات و عقائد سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ موروثی رواج جن کی پشت پر نہ احادیث ہیں اور نہ دلیل ان کو بسہولت ترک کر دیتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

اس نے کہا "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔

محض آباؤاجداد کی جانب سے بتوں کی پوجا ہونا' ان کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت کو نہیں بدل سکتا۔ نہ ان کو وہ تقدس دے سکتا ہے جو دراصل ان کو حاصل نہ ہو۔ کیونکہ قدریں محض آباؤاجداد کے عمل سے وجود میں نہیں آتیں 'بلکہ سچائی اور افادیت سے بنتی ہیں اور آزادانہ سوچ سے ان کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت بے باکی سے یہ باتیں کیں اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور دو ٹوک بات کی تو ان کے عقائد کی دنیا میں زلزلہ آگیا اور پوچھنے لگے :

قَالُوٓا اَجِئۡتَنَا بِالۡحَقِّ اَمۡ اَنۡتَ مِنَ اللّٰعِبِيۡنَ ۝۵۵

انہوں نے کہا "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے"۔

یہ سوال ایک ایسے شخص کا سوال نظر آتا ہے جسے خود اپنے فکر و عمل پر پورا اطمینان نہ ہو۔ کیونکہ وہ جو عقیدہ رکھتا ہے' جو عمل کرتا ہے اس پر اس نے کبھی سوچا نہیں۔ تحقیق نہیں کی۔ یہ کام وہ محض وہم اور تقلید اور بے سوچے سمجھے کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ حق کیا ہے حالانکہ عقائد و عبادات وہ چیز ہے جو مستند دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ جو افراد و اقوام عقیدہ توحید کے صاف ستھرے تصور سے محروم ہوں وہ اسی طرح کے اوہام کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان کے افکار بھی صاف ستھرے اور واضح نہیں ہوتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذرا دیکھیے کہ وہ کس قدر اعتماد و یقین سے بات کرتے ہیں۔ ان کو رب کی صحیح معرفت حاصل ہے۔ وہ ایک مومن کی طرح ٹھوس بات کرتے ہیں۔

قَالَ بَلۡ رَّبُّكُمۡ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الَّذِىۡ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝۵۶

اس نے جواب دیا "نہیں 'بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب ہے اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں"۔

اللہ تو رب واحد ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے' اور وہ اس لیے رب ہے کہ وہ ان کا پیدا کرنے والا ہے یعنی وہ اللہ واحد ہے۔ دو صفات کی وجہ سے اور ان میں جدائی ممکن نہیں ہے۔ ایک یہ کہ وہ زمین و آسمان کا رب ہے۔ ان کو چلانے والا ہے اور دوسری صفت یہ ہے کہ ان کو پیدا بھی اس نے کیا۔ یہ تو درست عقیدہ ہے لیکن مشرکین عرب کا عقیدہ نہایت ہی غیر معقول ہے کہ وہ اپنے بتوں کو رب تو مانتے تھے لیکن خالق نہ مانتے تھے۔ خالق وہ بھی صرف اللہ کو مانتے تھے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ دوسرے انہوں نے کسی چیز کی تخلیق نہیں کی پھر بھی ان کی پوجا کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے گواہ کی طرح گواہی دیتے ہیں جسے کوئی شک نہیں ہوتا۔

وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ (۲۱ : ۵۶) "اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں"۔
زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت حضرت ابراہیم موجود نہ تھے۔ نہ وہ اپنے نفس اور اپنی قوم کی تخلیق پر چشم دید گواہ تھے۔ لیکن یہ معاملہ اس قدر واضح' ثابت شدہ ہے کہ ایک مومن اس پر چشم دید گواہ کی طرح گواہی دے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز وحدت خالق پر ناطق ہے۔ انسانی شخصیت کے جو جو کمالات ہیں 'جسمانی و ذہنی وہ سب کے سب برہان ناطق ہیں کہ خالق ایک ہے اور وہی مدبر ہے۔ وہ قانون قدرت بھی ایک ہی ہے جو اس پوری کائنات کو مع انسان کے چلا رہا ہے اور اس میں متصرف ہے جس طرح چاہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم سے جو شخص یہ گفتگو کر رہا تھا' اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہہ دیا کہ ان کے بتوں کے بارے میں میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ اس پر ضرور عمل ہو گا۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ﴿۵۷﴾

"اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا"۔
انہوں نے ان بتوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ اسے انہوں نے مبہم چھوڑ دیا' اور اس کا ذکر نہ کیا۔ سیاق کلام میں یہ وضاحت بھی نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کو جواب کیا دیا۔ شاید وہ مطمئن ہوں کہ یہ ہمارے بتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ اس لیے انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔ ہوا کیا؟ تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ڈھیر بنا دیے گئے اور جو لکڑی کے تھے وہ ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کی شکل میں رہ گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے سب سے بڑے بت کو رہنے دیا۔

لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ (۲۱ : ۵۸) "شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔ اور اس سے پوچھیں کہ یہ واقعہ کس طرح رونما ہوا اور وہ کیوں ان چھوٹے بتوں کی مدافعت کے لیے نہ اٹھا۔ شاید اس طرح وہ اس پورے مسئلے پر از سر نو غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور راہ راست پر آجائیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ بتوں کی پرستش ایک لغو امر ہے۔
جب لوگ آئے' انہوں نے دیکھا کہ ان کے بت ریزہ ریزہ زمین پر پڑے ہیں۔ صرف بڑا بت کی طرح کھڑا ہے لیکن انہوں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ خود بھی انہوں نے غور نہ کیا کہ اگر یہ خدا تھے تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کیسے ہو گیا اور یہ جو کھڑا ہے اگر بڑا خدا ہے تو اس نے ان چھوٹے خداؤں کی مدافعت کیوں نہ کی؟ انہوں نے اپنے ذہنوں میں یہ سوال

پیدا ہونے نہ دیا یا پیدا ہی نہ ہوا کیونکہ جب عقل میں خرافات بیٹھ جائیں تو عقل معطل ہو جاتی ہے اور وہ اپنا اصل کام چھوڑ دیتی ہے۔ جب لوگ جامد تقلید کرنے لگیں تو بھی ان کی عقلوں پر تالے پڑ جاتے ہیں اور وہ کسی معاملے پر غور و فکر اور تامل و تدبر نہیں کرتے۔

قَالُوا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۹﴾

" (انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے " ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ وہ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ"۔ اب ان لوگوں کو بات یاد آئی کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کے بارے میں اپنے باپ سے بھی جھگڑا کیا ہے۔ باپ کے سوا دوسرے لوگوں سے بھی انہوں نے کہا ہے کہ ان مورتیوں کی پرستش تم کیوں کرتے ہو اور پھر انہوں نے بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ جب لوگ چلے جائیں گے تو میں ان کی خبر لوں گا۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۰﴾

(بعض لوگ) بولے " ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام جواں سال تھے۔ ان کو اللہ نے جوانی ہی میں ہدایت دے دی تھی۔ اس لیے انہوں نے ان بتوں کی عبادت کو ایک قبیح فعل سمجھتے ہوئے ان کے بت توڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت ان کو اس بات کا حکم بذریعہ رسالت اور وحی دے دیا گیا تھا یا نہیں؟ یا یہ کہ یہ ان پر قبل رسالت الہام ہوا تھا۔ اس نے اس الہام کی بنا پر اپنے باپ اور دوسرے لوگوں کو دعوت حق دینا شروع کر دی تھی۔ یہ تو راجح بات ہے البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ان کے لیے سَمِعْنَا فَتًى (٢١ : ٦٠) کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے۔ ایک تو ان کی تحقیر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دوسرے یہ کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ رکھتے تھے۔

یُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِیْمُ (٢١ : ٦٠) " جسے ابراہیم کہتے ہیں"۔ اور یہ تصغیر اور مجہول کا صیغہ وہ اس لیے استعمال کر رہے تھے کہ یہ کوئی اہم آدمی نہیں ہے نہ اس سے کوئی خطرہ ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں پہلی رائے ہی قابل ترجیح ہے کہ حضرت ابراہیم جواں سال تھے۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

انہوں نے کہا " تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ دیکھ لیں اس کی کیسی خبر لی جاتی ہے"۔ اور سب کے سامنے کھلی عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہو۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾

انہوں نے پوچھا "کیوں ابراہیم 'آیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے"؟ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ان کے یہ بت ریزہ ریزہ تھے لیکن پھر بھی ان کو اصرار تھا کہ یہ ہمارے الٰہ ہیں۔ جب ابراہیم ان کے ساتھ یہ مذاق کر رہے تھے وہ اکیلے تھے اور یہ لوگ بہت زیادہ تھے۔ لیکن وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ معاملات کو دیکھتے تھے۔ اس لیے وہ ان بے عقلوں کے سامنے مذاق ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کو ایسا جواب دیا جو ان جیسے لوگوں کے مناسب حال تھا۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾

اس نے جواب دیا "بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے 'ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس جواب میں چبھتا ہوا مذاق تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سنجیدہ مذاق کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے یہ جھوٹی بات کی۔ مفسرین نے اس فقرے کے اسباب اور توجیہات میں جو طویل کلام کیا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معاملہ تو بہت ہی سادہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام چاہتے تھے کہ لوگوں کو بتائیں کہ یہ مورتیاں اتنا بھی نہیں جانتیں کہ ان کو توڑا کس نے ہے؟ میں نے توڑا ہے یا اس بڑے بت نے توڑا ہے؟ جو کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تو محض جمادات ہیں اور ان کے اندر تو قوت مدرکہ ہے ہی نہیں۔ تم آدمی ہوتے ہوئے بھی ایسے ہو کر تمہاری قوائے مدرکہ جامد ہو چکی ہیں۔ تم کسی ممکن الوقوع اور جائز کام میں اور ایک ایسے امر میں فرق نہیں کر سکتے جو ناممکن الوقوع ہے۔ تم یہ انکواری اس لیے کر رہے ہو کہ میں نے ان کو توڑا ہے یا اس بڑے بت نے تو پھر ان سے پوچھو اگر یہ بات کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عجیب مذاق نے ان کو ایک لمحے کے لیے تو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ سوچنے لگے 'کچھ غور کرنے لگے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ۙ

"یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے "واقعی تم خود ہی ظالم ہو"۔ یہ ان کے اندر ایک اچھی سوچ کا آغاز تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے موقف میں بنیادی کمزوری ہے۔ وہ جو بتوں اور مورتیوں کی پوجا کر رہے ہیں یہ دراصل ظلم ہے۔ پہلی مرتبہ یوں لگتا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جس راہ پر وہ بغیر سوچے سمجھے چل رہے ہیں وہ بہت ہی غلط ہے۔

لیکن یہ ان کے فکر و نظر کی دنیا میں ایک چمک ہی تھی۔ اندھیرا حسب سابق پھر غالب آگیا۔ ان کے مردہ دلوں کے اندر ایک دھڑکن سی پیدا ہوئی مگر جلد ہی وہ پھر خاموش ہو کر جمود کا شکار ہو گئے۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

"مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے "تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں"۔ واقعی پہلے فقرے میں وہ اپنے دلوں اور دماغوں کی طرف لوٹ آئے تھے اور دوسرے فقرے میں جو ہے کہ وہ اپنے سروں کو چھوڑ کر الٹے پھرے تو گویا الٹے پاؤں پھرے اور اپنے سروں سے سوچ کا کام لینا بھی انہوں نے چھوڑ دیا۔ پہلی حرکت اپنے ضمیر کی طرف تھی کہ سوچیں اور تدبیر کریں اور دوسری حرکت واپسی کی تھی اور سوچ اور تدبر کو ترک کر کے پھر واپس ہوئے اور ان کے منہ سے جو بے عقلی کی بات نکلی وہی ان کے خلاف حجت تھی۔ حضرت ابراہیم کی دلیل ہی یہ تھی کہ دیکھو یہ بت بھی نہیں کر سکتے۔

جب وہ یہاں تک آ گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا حلیم الطبع شخص بھی ان پر قدرے غصہ کرتا ہے کیونکہ ان کی یہ کم عقلی اس قدر واضح ہے کہ اس پر آدمی کے لیے صبر کرنا مشکل ہے۔

قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـئًا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّـكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

اس نے کہا "پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات سے ان کی دل تنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ قدرے غصے میں نظر آتے ہیں اور ان کو سخت تعجب ہے کہ یہ لوگ اس قدر پوچ اور غیر معقول فکر و عمل میں پڑے ہوئے ہیں۔

اب ان لوگوں کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ ان کی ہٹ دھرمی اب انہیں سخت موقف اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ان کا حال اس شخص جیسا ہو گیا جس کے پاس دلیل کچھ نہ ہو' اور دلیل کی کمزوری اور کمی وہ تشدد کے ذریعہ پوری کر رہا ہو۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اب تشدد پر اتر آئے اور یہ فیصلہ کیا۔

قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۶۸﴾

"انہوں نے کہا "جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے"۔

کیا ہی زبردست خدا ہیں کہ پجاروں کی نصرت ان کے پجاری کر رہے ہیں' وہ خود اپنے نفع و نقصان کے مالک ہی نہیں۔ نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں' نہ اپنے بندوں کی۔ انہوں نے تو یہ حکم دیا کہ اسے جلا دو لیکن دوسری جانب سے بھی ایک حکم صادر ہوا' یہ اصل حاکم مطلق کا حکم تھا' اس نے پہلے حکم کو باطل کر دیا۔

قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ ۙ ﴿۶۹﴾

"ہم نے کہا "اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر"۔

چنانچہ ان کا جلایا ہوا الاؤ ابراہیم کے لیے ٹھنڈا بھی ہو گیا اور ان کے لیے سلامتی کا موجب بنا' یہ کیسے؟ یہ سوال صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام والے الاؤ کے بارے میں کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ لفظ کن اور کوئی سے یہ کائنات وجود میں آگئی' بڑے بڑے جہاں پیدا ہو گئے۔

انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون (۳۶ : ۸۲) "اس کا حکم یہ ہے کہ اس نے جب کسی چیز کا ارادہ کیا تو صرف یہ کہتا ہے کن تو ہو جاتی ہے"۔ اس لیے ہم یہ سوال کرتے ہی نہیں کہ آگ نے کس طرح نہ جلایا' حالانکہ مشہور اور معروف اور زیر مشاہدہ طریقہ تو یہ ہے کہ آگ زندہ جسموں کو جلا دیتی ہے۔ جب ذات باری نے آگ سے کہا کہ جلاؤ تو وہ جلانے لگی۔ اس ذات نے اسے کہا کہ نہ جلاؤ اور سرد ہو جاؤ تو وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی۔ دونوں کلمات کا فرق صرف یہ ہے کہ ایک نتیجے کے ہم عادی ہیں اور دوسرے نتیجے کے ہم عادی نہیں۔

جو لوگ اللہ کے افعال کو انسانی افعال پر قیاس کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے سامنے یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ اور کیسے ممکن ہوا؟ لیکن جو لوگ اس فرق کو سمجھتے ہیں کہ اللہ میں اور انسانوں میں فرق ہے' تو ان کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ایسے واقعات کی علتیں تلاش نہیں کرتے۔ خواہ یہ علت سائنسی ہو یا غیر سائنسی ہو۔ کیونکہ یہ مسئلہ امرالٰہی کا ہے علت اور اسباب کا نہیں ہے' خصوصاً انسانی پیمانوں کے مطابق سبب و مسبب کی تلاش کا نہیں ہے۔ معجزات کے سلسلے میں جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر سائنسی پیمانوں یعنی علت و معلول (Cause and Effect) کے زاویہ سے کرتے ہیں وہ غلط لائن پر جاتے ہیں۔ معجزات کی تفسیر یہی ہے کہ ان کو امرالٰہی کے حوالے کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کے افعال کو ان پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا جن سے ہم انسانی پیمانوں کو ناپتے ہیں۔

ہمیں چاہئے اور یہ ہمارا فرض بھی ہے کہ ہم ان واقعات پر ایمان لائیں' کیونکہ اللہ خالق اور صانع ہے اور ایک صانع اپنی مصنوعات کو جس طرح چاہے بنا سکتا ہے۔ یہ کیونکر ہوا کہ آگ سرد ہو گئی اور اس کے اندر حضرت ابراہیم صحیح و سلامت رہ گئے۔ قرآن کریم نے اس کی کوئی تشریح و تعلیل نہیں کی ہے کیونکہ ہم اپنے انسانی قوائے مدرکہ کے ساتھ اس چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا نص قرآن کے سوا ہمارے لیے نہ کوئی دلیل ہے اور نہ ہمیں مطالبہ کرنا چاہئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھنڈا کر دیا گیا اس کی مثالیں اس دنیا میں بھی واقعہ ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کا ہم نوٹس نہیں لیتے جس طرح اس اہم واقعہ کا نوٹس تاریخ نے لے لیا۔ تاریخ انسانی میں افراد پر اور جماعتوں پر اس سے بھی بڑے بڑے مظالم ہوتے رہے ہیں۔ اتنے ہولناک اور خوفناک مظالم کہ ان سے زندہ بچنے اور صحیح سلامت باہر آنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی لوگ نکل آتے ہیں۔ مظالم اور تشدد کے بڑے بڑے الاؤ جلائے جاتے ہیں اور ان میں ان لوگوں کو ڈالا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ زندہ بچ نکلتے ہیں اور مظالم اور تشدد کا یہ الاؤ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ یہ الاؤ بظاہر تو بہت بڑا شر ہوتا ہے لیکن ان مظلوموں کے لیے وہ بہت بڑا خیر بن جاتا ہے۔

یہ معجزہ ہے کہ "اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے"۔ افراد' جماعتوں اور قوموں کی زندگی میں بار بار دہرایا جاتا ہے' خصوصاً افکار' عقائد اور تحریکات کے راویہ سے جب امرالٰہی آتا ہے تو انسانی اقوال باطل ہو جاتے ہیں۔ تمام سازشیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ امرالٰہی برتر حکم ہے۔

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

"وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا"۔
روایات میں آتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے معاصر بادشاہ کا نام نمرود تھا۔ وہ عراق کے آرامیوں کا بادشاہ تھا۔ وہ اور اس کے سردار عذاب الہٰی سے ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اس کی تفصیلات میں روایات کا اختلاف ہے اور ہمارے پاس بھی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے ہم حقیقت کو پاسکیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اس سازش سے بچالیا جو انہوں نے ان کے خلاف تیار کی تھی اور سازش کرنے والے خسارے میں رہے۔ ان کو کیا خسارہ ہوا اس کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

"اور ہم اسے اور لوط علیہ السلام کو بچاکر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں"۔
یہ شام کی سرزمین ہے جس کی طرف آپ اور آپ کے بھتیجے لوط نے ہجرت کی۔ چنانچہ یہ سرزمین ایک عرصے تک وحی کے نزول کا علاقہ بنی رہی۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے کئی رسول اس علاقے میں مبعوث ہوتے رہے۔ اس علاقے میں ارض مقدسہ اور مسلمانوں کا دوسرا حرم ہے۔ اور یہی علاقہ ہے جو سرسبز و شاداب علاقہ ہے اور اس میں بڑی برکات ہیں یعنی اس علاقے میں روحانی اور مادی برکات نسلاً بعد نسل موجود رہیں۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

"اور ہم نے اسے اسحاق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید' اور ہر ایک کو صالح بنایا اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے"۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وطن' اہل وطن اور قوم کو چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ارض مبارکہ بطور وطن عنایت فرمائی' جو ان کے وطن سے زیادہ بہتر تھی' اور ان کو حضرت اسحاق جیسا بیٹا اور حضرت یعقوب جیسا پوتا دیا جو بہترین اہل و عیال ثابت ہوئے۔ اور پھر ان کی اولاد سے ایک نسل کثرت سے بڑھی کہ وہ دنیا میں ایک مستقل امت بن گئی

تو یہ قوم چھوڑنے کا صلہ تھا اور پھر آپ کی نسل میں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے جو اللہ کے حکم سے لوگوں کو ہدایت دیتے تھے اور اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ بھلائی کے مختلف کام کریں ۔ نماز قائم کریں ' زکوۃ دیں اور اللہ کی اطاعت اور بندگی کریں ۔ چنانچہ اللہ نے ان کو اس کا بہترین معاوضہ دیا اور اس کے ساتھ بہترین انعام دیا ۔ ان کا خاتمہ بھی بہت اچھا ہوا کہ اللہ نے ان کو آزمایا اور انہوں نے صبر کیا اور اللہ نے ان کو صبر جمیل کا اجر دیا ۔

وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ۵ ۲۵ ع

"اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اسے اس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی درحقیقت وہ بڑی ہی بری فاسق قوم تھی ۔ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا ' وہ صالح لوگوں میں سے تھا" ۔

حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ اس سے پہلے مفصل گزر چکا ہے ۔ یہاں اس کی طرف بالکل مجمل اشارہ ہوا ہے ۔ عراق سے شام تک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام دونوں ایک ساتھ آئے ۔ انہوں نے سدوم شہر میں رہائش اختیار کی ۔ اہل سدوم خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کرتے تھے ۔ مرد مردوں کے ساتھ اعلانیہ جنسی تعلقات قائم رکھتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے ۔ چنانچہ یہ گاؤں پوری آبادی سمیت ہلاک کر دیا گیا ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ (۲۱: ۷۴) "درحقیقت یہ بہت ہی بری فاسق قوم تھی" ۔ لوط علیہ السلام اور آپ کی پوری فیملی ماسوائے ان کی بیوی کے ' بچا لئے گئے ۔

وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۱: ۷۵) "اور اسے ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا ۔ وہ صالح لوگوں میں سے تھا ۔ اللہ کی رحمت وہ خوشگوار پناہ گاہ ہے جس میں اللہ اسی شخص کو داخل کرتا ہے جسے وہ خصوصی طور پر چاہتا ہے ۔ جو داخل ہوا وہ عیش و عشرت اور رحم و کرم میں داخل ہوا ۔

اسی طرح یہاں حضرت نوح کی طرف بھی ایک سرسری اشارہ کر دیا جاتا ہے ۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

"اور یہی نعمت ہم نے نوح کو دی ۔ یاد کرو جبکہ ان سب سے پہلے اس نے ہمیں پکارا تھا۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے نجات دی ۔ اور اس قوم کے مقابلے میں اس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ۔ وہ بڑے برے لوگ تھے 'پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی طرف بھی یہ مختصر اشارہ ہے 'جس میں کوئی تفصیل نہیں ہے ۔ نوح علیہ السلام نے رب کو پکارا اور رب نے ان کی دعا کو قبول کیا ۔ یہاں "من قبل" ۔ کا لفظ آیا ہے یعنی "سب سے پہلے" 'اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام سے ان کا دور پہلے گزرا ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے اہل و عیال کو بچالیا اور ان کی پوری قوم نذر طوفان ہوگئی کرب عظیم سے مراد وہ مشکلات ہیں جو ان کو پیش آئیں ۔ سورہ ہود میں تفصیلات موجود ہیں ۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡکُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡہِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ ۚ وَ کُنَّا لِحُکۡمِہِمۡ شٰہِدِیۡنَ ﴿۷۸﴾ فَفَہَّمۡنٰہَا سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ۫ وَّ سَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ یُسَبِّحۡنَ وَ الطَّیۡرَ ؕ وَ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ عَلَّمۡنٰہُ صَنۡعَۃَ لَبُوۡسٍ لَّکُمۡ لِتُحۡصِنَکُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِکُمۡ ۚ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ شٰکِرُوۡنَ ﴿۸۰﴾ وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا ؕ وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ ﴿۸۱﴾ وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ ۚ وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ ﴿۸۲﴾

"اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں 'اور ہم ان کی عدالت خود دیکھ رہے تھے ۔ اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا' حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا ۔ داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے ' اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے اور ہم نے اس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی 'تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے 'پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں 'ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے ' ان سب کے نگران ہم ہی تھے"۔

کھیت کا وہ کیا قصہ تھا جس کے بارے میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے فیصلہ کیا ۔ راوی کہتے ہیں

کہ دو آدمی حضرت داؤد کے پاس آئے - ایک کھیت کا مالک تھا یعنی فصل کا اور انگور کے باغ کا اور دوسرا بکریوں کا۔ کھیت کے مالک نے کہا کہ اس شخص کی بکریاں رات کے وقت میرے کھیت میں پھیل گئیں اور انہوں نے سب کچھ کھا لیا اور کھیت میں کچھ نہ رہا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ وہ باغ کے بدلے اس شخص کی بکریاں لے لے۔ بکریوں والے صاحب حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گئے اور ان کے سامنے قصہ دہرایا اور انہیں بتایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے تو یہ فیصلہ دے دیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام والد کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا اے اللہ کے نبی فیصلہ وہ نہیں ہے جو آپ نے کیا ہے۔ انہوں نے کہا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا آپ یہ بکریاں کھیت یا باغ والے شخص کے حوالے کر دیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بکریوں کے مالک کو دے دیں تاکہ وہ کھیت میں کام کرے اور اسی حالت میں لے آئے جس طرح تھا۔ اس کے بعد ہر شخص وہ چیز دوسرے کو دے دے جو اس کے پاس ہے۔ کھیت والا کھیت لے لے اور بکریوں والا بکریاں لے لے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا، ٹھیک فیصلہ وہی ہے جو آپ نے کیا۔ انہوں نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کو نافذ کر دیا۔

یاد رہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے جج کے طور پر اجتہادی فیصلہ کیا تھا۔ اللہ بھی ان کے فیصلے کو دیکھ رہا تھا۔ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو زیادہ مناسب اور مضبوط فیصلہ الہام کر دیا اور سلیمان اسے جس طرح سمجھے وہ زیادہ اچھا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے نقصان کا محض تاوان ادا کرنے کی طرف خیال کیا۔ یہ تھا نفس انصاف۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے عدل کے ساتھ تعمیر و ترقی کا بھی خیال رکھا اور عدل کے نتیجے میں فریقین کو تعمیر و ترقی کے کام پر لگا دیا۔ عدل کی یہ دوسری صورت زیادہ مثبت، مفید اور تعمیری ہے اور یہ اللہ کی توفیق اور الہام ہے کہ وہ جسے چاہے دے دے۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام دونوں کو حکم، علم اور فیصلے کے اختیارات تھے۔

وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا (۲۱ : ۷۹) "حکم اور علم ہم نے دونوں کو عطا کیا تھا"۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلے میں کوئی غلطی نہ تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ اچھا تھا کیونکہ وہ الہام کے نتیجے میں ہوا تھا۔

اس کے بعد قرآن مجید ان مخصوص امور کا ذکر کرتا ہے جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو علیحدہ علیحدہ دیے گئے تھے، پہلے حضرت داؤد علیہ السلام۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱ : ۷۹) وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (۲۱ : ۸۰) "اور داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے، اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے اور ہم نے اس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟"

حضرت داؤد علیہ السلام کے مزامیر مشہور ہیں۔ یہ اللہ کی حمد تھی جو وہ نہایت ہی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ان کی

آواز کی گونج سے ان کا ماحول بھر جاتا تھا اور ان کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی اسے دہراتے تھے۔

جب کسی بندے کا دل اپنے رب سے جڑ جاتا ہے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اس پوری کائنات کے ساتھ یکجا ہو گیا ہے اور اس پوری کائنات کا دل میرے ساتھ دھڑکتا ہے اور وہ تمام رکاوٹیں اور پردے ہٹ جاتے ہیں جو اللہ کی مخلوقات کے مختلف انواع و اجناس کے درمیان دوئی اور امتیاز کے شعور کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح کائنات کے مختلف انواع اجناس کے درمیان اس دوئی کے شعور کی وجہ سے فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے تو ان تمام انواع کے ضمیر اس کائنات کے ضمیر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

بعض لحات میں ایک ایسی روشنی سامنے آتی ہے کہ روح یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کے ساتھ ایک ہے۔ اس کے اندر سب کچھ آگیا ہے' ایسے لحات میں روح یہ نہیں محسوس کرتی کہ اس سے باہر بھی کچھ ہے۔ وہ یہ بھی محسوس نہیں کرتی کہ وہ اپنے ماحول سے علیحدہ ہے۔ پورا ماحول روح انسانی میں گم اور انسان اپنے ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔

نص قرآنی سے ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام خوش الحانی سے حمد پڑھتے تھے تو وہ اپنے تحیز' منفصل اور مخصوص مقام میں موجود نفس کو بھول جاتے تھے۔ ان کی روح اس سایہ ربی میں چلی جاتی تھی جو اس کائنات پر سایہ فگن ہے۔ اس پوری کائنات پر خواہ وہ جامد مخلوق ہو یا زندہ' اس طرح حضرت داؤد محسوس کرتے تھے کہ ان کے ساتھ یہ پوری کائنات حمد خواں ہے۔ اور جس طرح وہ ثنا خواں ہیں اس طرح وہ بھی ثنا خواں ہے۔ پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ پوری کائنات ایک کورس کی شکل میں' ایک گروپ کی طرح اللہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحلیل گا رہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ "جو چیز بھی ہے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔ اور اس تسبیح کو وہی شخص سمجھتا ہے جس کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں' فاصلے مٹ جائیں اور وہ روح کائنات اور ارواح کون و مکان کے ساتھ چلتا ہو' جو سب کی سب اللہ کی سمت میں رخ کیے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱ : ۷۹) "اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا جو تسبیح کرتے تھے اور اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے"۔ اللہ کے لیے مشکل ہی کیا ہے؟ یا کیا کوئی چیز اللہ کے حکم سے سرتابی کر سکتی ہے جب اللہ چاہے۔ چاہے وہ لوگوں کے ہاں ہوا کرتی ہے یا نہیں ہوا کرتی۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ

(۲۱ : ۸۰) "اور ہم نے اس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی' تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے۔ پھر کیا تم شکر گزار ہو؟" یہ زرہ کی صنعت ہے جس کے حلقے ایک دوسرے سے گزرتے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل وہ ایک جامد چادر کی صورت میں بنائی جاتی تھیں۔ کڑیوں کا ایک دوسرے میں داخل کر کے زرہ بننا زیادہ

نرم اور استعمال میں زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زرہ کی یہ ترقی یافتہ قسم سب سے پہلے اللہ کی تعلیم سے حضرت داؤد علیہ السلام نے ایجاد کی۔ اللہ فرماتا ہے کہ اس نے داؤد علیہ السلام کو یہ صنعت سکھا کر تم پر بڑا احسان کیا کہ تم جنگ کے دوران ایک دوسرے کی مار سے بچ جاتے ہو۔

لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَأْسِكُمْ (۲۱: ۸۰) "تاکہ تمہیں بچائے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کے وقت"۔ یہ احسان جتلا کر اللہ تعالیٰ پھر پوچھتے ہیں کیا تم شکر کرو گے۔ یہ سوال سمجھانے اور شکر پر ابھارنے کے لیے ہے۔

اسلامی تہذیب و تمدن نے ایک ایک قدم کر کے ترقی کی ہے۔ ایک جست میں انسان یکلخت مہذب اور ترقی یافتہ نہیں ہوا۔ دنیا کی ترقی کا فریضہ خلافت ارضی سے تعلق رکھتا ہے اور یہ انسان پر عائد کیا گیا ہے۔ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ قوت رکھی تھی کہ وہ ہر دن ایک قدم آگے بڑھتا رہے اور ہر دن کی ترقی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالتا رہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے مزاج کے یہ بات خلاف ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو نظام جدید کے مطابق ڈھال لے کیونکہ اس طرح یکلخت تبدیلی سے اس کی عادات اور مروج طریق کار بدل جاتا ہے اور بالکل نیا نظام یکلخت دینے سے انسان کو معمول کی زندگی از سرنو شروع کرنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ارادہ یہ ہوا کہ زندگی کے نظام میں ہر بڑی تبدیلی کے بعد انسان کو اگلی تبدیلی کے لیے مناسب وقت دیا جائے بعض اوقات یہ وقت تھوڑا ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادہ لمبا عرصہ ہوتا ہے۔

آج دنیا کے اعصاب پر جو ناقابل برداشت تناؤ ہے اور انسان کے اندر جو بے چینی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سائنسی انکشافات اور سوسائٹی کے نظام میں سرعت کے ساتھ بار بار کی تبدیلیوں کی وجہ سے' انسانیت کو سانس لینے' ستانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا کہ وہ ایک عرصہ تک جدید نظام کی برکات سے متمتع ہو۔ انقلاب پر انقلاب چلا آرہا ہے۔

یہ تو تھا معاملہ داؤد علیہ السلام کا' رہے سلیمان علیہ السلام تو ان کو بھی زیادہ معجزات دیئے گئے تھے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (۲۱: ۸۱) وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (۲۱: ۸۲) "اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں' ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے' ان سب کے نگران ہم ہی تھے"۔

سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بہت سی باتیں' بہت سی روایات اور بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو اسرائیلیات سے لی گئی ہیں یا اوہام و تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن روایات کے اس صحرا میں ہم اپنے آپ کو بے راہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ حدود قرآنیہ تک اپنے آپ کو محدود کر دیں۔ قرآن کریم کے علاوہ سلیمان علیہ السلام کے

بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔

قرآن کریم میں صرف اس حد تک بیان ہوا ہے کہ ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا۔یعنی تیز رفتار ہوا کو۔یہ ہوا ارض متبرک کی طرف چلتی تھی۔ برکت والی سرزمین سے مراد موجودہ شام کی سرزمین ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان کے لیے اس ہوا کو کیونکر مسخر کر دیا گیا تھا۔

ایک قصہ ہوا کے تخت یا ہوا کی چادر کا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے حاشیہ نشین اس پر بیٹھتے تھے اور اڑ جاتے تھے اور شام کی طرف چلے جاتے تھے اور چشم زدن میں وہ شام میں ہوتے تھے۔یہ اس قدر سفر تھا کہ اونٹوں پر ایک ماہ میں طے ہوتا تھا اور اسی طرح وہ واپس آ جاتے تھے۔اس روایت کو سورہ سبا کی اس آیت سے ثابت کیا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (۳۴ : ۱۲) "اور سلیمان علیہ السلام کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا' صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک"۔

لیکن قرآن کریم نے ہوا کی اس چادر کا ذکر کہیں نہیں کیا۔اس کا ذکر کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہوا۔لہٰذا اس قسم کی روایات کے بارے میں ہمیں کوئی مستند ثبوت نہیں ملا۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم تسخیر ہوا کا مفہوم یہ لیں کہ یہ ہوا اللہ کے حکم کے مطابق یوں چلتی تھی کہ ایک طرف سے ایک ماہ کا سفر وہ صبح و شام طے کرتی تھی۔یہ سفر کیسے ہو جاتا تھا؟ تو یہ قدرت الٰہی کے کارنامے ہیں۔اس کے بارے میں ہم نہیں پوچھ سکتے کہ یہ کیسے چلتی تھی۔قوانین قدرت کی تخلیق اللہ نے کی ہے۔وہ جس طرف چاہے ان قوائے قدرت کا رخ پھیر سکتا ہے۔اس کائنات میں قدرت کے اصولوں میں سے ابھی انسان کو کم ہی کا پتہ چلا ہے۔ہو سکتا ہے کہ اللہ کے کچھ خفیہ طبیعی قوانین ایسے ہوں جن کا ابھی تک ہمیں علم نہ ہو اور ان اصولوں کا ظہور اور انکشاف اس وقت ہو جب انسان اس کو برداشت کرنے کے اہل ہوں اور اللہ کا حکم ہو۔

وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِمِينَ (۲۱ : ۸۱) "اور ہم ہر چیز کو جاننے تھے"۔مطلق اور بے قید علم ہمارے قبضے میں ہے۔رہا انسان کا علم تو وہ محدود ہے۔

یہی معاملہ تسخیر جنات کا ہے جو بحر و بر میں ان کے لیے غوطے لگاتے تھے اور سلیمان علیہ السلام کے لیے زمین کے خزانے نکالتے تھے یا وہ ان کے لیے دوسری خدمات سرانجام دیتے تھے۔جن ہر اس مخلوق کو کہتے ہیں جو مخفی ہو۔قرآن مجید کی صریح آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مخلوق ایسی ہے جسے جن کہتے ہیں' جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔اس مخلوق میں سے کچھ لوگوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا جو ان کے لیے غوطے لگاتے تھے اور دوسرے کام کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کنٹرول میں دے دیا تھا کہ نہ وہ بھاگ سکتے تھے' نہ فساد کر سکتے تھے۔وہ نہ ان کی فرماں برداری کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر پوری طرح کنٹرول کر سکتا ہے اور اپنی مخلوق کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔

بس فی ظلال میں ہم اس حد تک جاتے ہیں اور یہی وہ حد ہے جس میں غلطی کا احتمال کم ہے۔ اس لیے ہمیں اسرائیلیات میں تیرنے کی ضرورت نہیں۔

اللہ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو خوشحالی میں آزمایا تھا۔ انعامات میں آزمایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فیصلے میں آزمایا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو گھوڑوں کے بارے میں آزمایا تھا (تفصیلات سورہ ص میں آرہی ہیں لہٰذا ہم یہ مباحث یہاں نہیں چھیڑتے)۔ اپنی جگہ یہ سب بحثیں ہوں گی۔ یہاں نتیجے کا ذکر ضروری ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی صبر کیا' حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی صبر کیا اور آزمائشوں کے بعد اللہ سے معافی اور مغفرت طلب کی اور امتحان و آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ چنانچہ وہ اللہ کے انعامات پر شکر خداوندی بجالانے والے تھے۔

اب ذرا مصائب میں مبتلا کر کے آزمانے کا واقعہ آتا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝

"اور یہی (ہوشمندی اور حلم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو' جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے"۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا' اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے' اپنی خاص رحمت کے طور پر' اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہے عبادت گزاروں کے لیے"۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید کے ابتلاء کے قصوں میں سے ایک بہت ہی خوبصورت قصہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ قصہ آیا ہے۔ یہ مجمل شکل میں آیا ہے۔ تفصیلات نہیں دی گئیں۔ اس جگہ یہاں حضرت ایوب کی دعا اور قبولیت دعا کا ذکر ہے کیونکہ اس سورہ میں موضوع اور مضمون ہی اپنے بندوں پر رحمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور آزمائش میں ان کی امداد ہے خواہ یہ آزمائش قوم کی طرف سے تکذیب کی صورت میں ہو' مثلاً قصہ ابراہیم' لوط اور نوح علیہم السلام میں یا اللہ کی جانب سے انعامات میں آزمائش ہو جس طرح داؤد و سلیمان علیہما السلام یا مرض وغیرہ کی آزمائش ہو جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے میں ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے یہاں جو دعا کی ہے تو اس میں انہوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ اللہ میرا یہ حال ہے اور رب تعالیٰ کی یہ صفت بیان کی ہے:

اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۲۱ : ۸۳) اس کے بعد انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میرے حالات کو بدل دے' یہ اس لیے کہ وہ مصیبتوں پر صبر کرنے والے تھے' وہ اللہ کے سامنے کوئی تجویز یا مطالبہ نہ کرتے تھے۔ یہ ان کی

جانب سے بارگاہ رب العزت میں ادب اور احترام کا رویہ تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام ایک ایسے صابر و شاکر شخصیت تھے کہ سخت سے سخت حالات میں وہ صبر کرتے تھے۔ کوئی فریاد نہ کرتے تھے۔ آپ کا صبر اس قدر مشہور ہوا کہ ہمیشہ ان کی مثال دی جاتی ہے۔ آپ اس قدر صابر اور شاکر تھے کہ آپ نے اس مصیبت کے رفع ہونے کی دعا بھی نہیں فرمائی۔ پورا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم تھا۔ اس لیے سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام اپنے رب کی طرف اس اعتماد کے ساتھ اور اس مؤدبانہ طریقے سے متوجہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کی دعا کو قبول کیا' آزمائش ختم ہوگئی اور رحمت خداوندی آن پہنچی۔ نہ صرف یہ کہ ان کی تکلیف دور ہوئی بلکہ ان کے اہل و عیال بھی ان کو دے دیئے اور اسی قدر مزید بھی دیئے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ (۲۱ : ۸۴) "ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ اس کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے"۔

ان کے جسم کو جو مرض لاحق تھا' وہ دور ہو گیا اور آپ فوراً تندرست ہو گئے۔ ان کے اہل و عیال جن سے وہ محروم ہو گئے تھے اللہ نے ان کو دے دیئے اور ان جیسے اور دے دیئے۔ کہا گیا ہے کہ بیٹوں کے بدلے بیٹے دے دیئے یا بیٹے اور پوتے دے دیئے۔

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا (۲۱ : ۸۴) "اللہ کی ہر رحمت اللہ کا احسان ہے۔ صرف احسان' ورنہ ہم تو مستحق نہیں ہیں۔

وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ (۲۱ : ۸۴) "اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے"۔

آزمائش کے حوالے سے اس کا مطلب بہت اہم ہے' عبادت گزاروں پر آزمائش آتی رہتی ہے۔ مثلاً عبادت کی مشکلات' نظریاتی مشکلات اور ایمان کے تقاضے۔ یہ نہایت ہی سنجیدہ معاملہ ہے' مذاق نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ حیات ایک عظیم امانت ہے اور یہ امانت صرف ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو اس کا بوجھ اٹھا سکیں اور جو اس کے تقاضے اور فرائض پورے کر سکیں۔ محض زبان سے کہنا ہی نہیں ہے یا محض دعویٰ ہی نہیں ہے لہذا صبر ضروری ہے تاکہ عبادت گزار آزمائش میں پورے اتریں۔

---ooo---

اس کے بعد قرآن مجید حضرت اسماعیل' حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل کی طرف صرف اشارہ کرتا ہے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

"اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے اور ان کو ہم نے اپنی

رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے"۔

ان انبیاء کے حالات زندگی میں صبر کا عنصر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں ذبح کر دیا جائے۔ جب ان کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ یہ صبر کا مثالی نمونہ تھا۔

يَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ "اے باپ' آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کریں۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے"۔

حضرت ادریس کے بارے میں اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ ان کا زمان و مکان مجہول ہے۔ ان کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ رائے دی ہے کہ وہ اور ادریس ہیں جن کی وفات کے بعد مصریوں نے ان کی پرستش شروع کر دی تھی اور ان کے ساتھ کئی قصے' اور کہانیاں وابستہ کر دی تھیں مثلاً یہ کہ وہ انسانوں کے معلم اول ہیں' جنہوں نے انسانوں کو زراعت سکھائی۔ صنعت کی تعلیم دی لیکن اس بات پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ ہمیں اس کا یقین ہے کہ انہوں نے بھی کسی مشکل میں مثالی صبر کا مظاہرہ کیا جس کا ذکر اللہ کی آخری کتاب میں ضروری سمجھا گیا۔

حضرت ذوالکفل کے زمان و مکان کے بارے میں بھی معلومات نہیں ہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ صالحین بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے کسی نبی کی کفالت اور خدمت کی اور انہوں نے ان کو اپنی خلافت تین شرائط کی ضمانت دینے پر' ان کے حوالے کی کہ پوری رات عبادت کریں گے' ہر دن روزے سے ہوں گے اور فیصلہ کرتے وقت کسی پر غصہ نہ کریں گے۔ انہوں نے ان ضمانتوں کو پورا کیا اس لیے ان کو ذوالکفل کہا گیا لیکن یہ بھی ایک قول ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم یہاں صرف یہ تصریح کرتا ہے کہ یہ صبر کرنے والے تھے۔

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِي رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۱ : ۸۶) "ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے"۔

اب قصہ یونس علیہ السلام۔ آپ کو ذوالنون بھی کہتے ہیں۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

"اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا۔ یاد کرو جب کہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں پکارا "نہیں ہے کوئی خدا مگر تو' پاک ہے تیری ذات' بے شک میں نے قصور کیا"۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی' اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں"۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ بھی یہاں ایک سرسری اشارے کی شکل میں ہے 'جیسا کہ اس سورہ کا انداز ہے اور سورہ الصافات میں اس کی تفصیلات ہیں لیکن ضروری ہے کہ یہاں ہم بعض ضروری تفصیلات دے دیں تاکہ یہاں کے اشارات اچھی طرح سمجھ میں آجائیں ۔ ان کو مچھلی والے (ذوالنون) اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب ان کو کشتی سے پھینکا گیا تو مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ قصہ یہ تھا کہ ان کو ایک گاؤں میں دعوت اسلامی پھیلانے کے لیے بھیجا گیا۔ گاؤں والوں نے ان کی ایک نہ مانی' ان کو اس پر بہت غصہ آیا۔ اسی غصے کی وجہ سے ناراض ہو کر وہاں سے چلے گئے اور ان میں رہ کر دعوت اسلامی کی مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے صبر اور مصابرت سے کام نہ لیا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست ۔ اللہ کی مخلوقات سے اور گاؤں بھرے پڑے ہیں 'اگر یہ لوگ دعوت کو قبول نہیں کرتے تو اللہ انہیں دوسروں کی طرف متوجہ کر دے گا۔ یہ ہے مفہوم فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ (۲۱ : ۸۷) کا "اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے ،، یعنی "لن نقدر" کا مفہوم ہے "لم نضیق علیہ" - ان کے غصے اور تنگ دلی نے ان کو گاؤں سے نکلنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے ۔ وہاں ایک کشتی تیار تھی ۔ اس میں سوار ہو گئے ۔ کشتی کو امواج بحری نے گھیر لیا۔ ملاح نے کہا کہ اگر اسے ہلکا نہ کیا گیا تو سب لوگ ڈوب جائیں گے ۔ اس پر انہوں نے قرعہ اندازی کی ۔ قرعہ حضرت یونس کا نکل گیا۔ لوگوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا یا خود کود پڑے ۔ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اور وہ مزید تنگ جگہ تک جا پہنچے ۔ اس وقت اندھیروں میں تھے ۔ ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا' دوسرا اندھیرا سمندر کا اور تیسرا اندھیرا رات کا۔ انہوں نے اپنے رب کو یوں پکارا

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱ : ۸۷) "نہیں ہے کوئی الہ مگر تو' پاک ہے ذات تیری' بے شک میں ہی ظالموں میں سے تھا"۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی۔ اس پریشانی سے انہیں نجات دی جس میں وہ تھے ۔ مچھلی نے انہیں ساحل پر پھینک دیا۔ اس کے بعد کے ان کے واقعات سورہ الصافات میں مفصل ہیں ۔ یہاں اسی قدر ضروری تھا ۔

حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کے اس حصے میں عبرت اور غور طلب نکات ہیں لہذا یہاں قدرے توقف ضروری ہے ۔ یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام نے دعوت اسلامی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر نہ کیا۔ ان کا دل بھر آیا' انہوں نے دعوت کی ذمہ داریاں چھوڑ دیں اور غصے میں اس گاؤں سے چل پڑے ۔ جب وہ چلے تو سخت پریشانی اور غصے میں تھے ۔ اللہ نے ان کو ان مشکلات سے دوچار کر دیا جن کے مقابلے میں تکذیب کرنے والوں کی جانب سے آنے والی مشکلات کم تھیں ۔ اگر وہ توبہ نہ کرتے اور اپنے نفس پر' دعوت اسلامی پر اور اپنے فرائض پر ظلم کا اعتراف نہ کرتے تو اللہ ان کو اس مصیبت سے نہ نکالتا لیکن قدرت نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کی حفاظت کی اور ان کو اس غم سے نجات دی۔

دعوت اسلامی کے حاملین کے لیے ضروری ہے کہ وہ دعوت کے فرائض اور مشکلات کو برداشت کریں ۔ اگر لوگ تکذیب کرتے ہیں تو وہ ان پر صبر کریں ۔ اگر ایذا دیتے ہیں تو صبر کریں 'حقیقت یہ ہے کہ ایک سچے آدمی کو جھوٹا کہنے کا اثر اس کے نفس پر بہت ہی کڑوا ہوتا ہے ۔ لیکن رسالت کی ذمہ داریوں کا یہ قصہ ہے کہ لوگ مانیں یا نہ مانیں دعوت اسلامی کے حاملین کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر برداشت پیدا کریں 'صبر کریں اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں۔ ضروری ہے کہ وہ از سرنو دعوت کا کام شروع کریں ۔ دعوت کا آغاز از سرنو کریں اور پروگرام کو پھر سے شروع کریں ۔

ان کا فرض ہے کہ وہ دعوت کے کام سے مایوس نہ ہوں' دلوں میں از سر نو اصلاح کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور لوگوں کی اصلاح کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ قوم بار بار انکار کر دے اور تکذیب کر دے۔ سرکشی کرے اور دعوت کو رد کر دے۔ اگر سو بار کی دعوت دلوں پر اثر نہ کرے تو ہو سکتا ہے کہ ایک سو ایک بار کی دعوت دلوں میں اتر جائے۔ بعض اوقات انسان ایک ہزار ایک بار سعی کرنے پر کامیاب ہوتا ہے۔ اگر داعی صبر کرے' کوشش کرے اور مایوس نہ ہو تو ہزار ہا کوششوں کے بعد وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

دعوت اسلامی کا کام آسان اور سہل نہیں ہے۔ لوگوں کے دلوں کو کسی دعوت کے لیے برانگیختہ کرنا بہت ہی دشوار کام ہے۔ دلوں کا جیتنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے۔ باطل' رسم و رواج اور عادات اور رسوم کا ایک تہ بہ تہ نظام ہے جس نے دعوت کے کام کو روک لیا ہوتا ہے۔ پھر ہر سوسائٹی اپنی موجودہ تنظیم اور اداروں کو بچانا چاہتی ہے۔ دلوں کے اوپر موجودہ عادات اور طرز زندگی رنگ کی طرح جما ہوتا ہے لہٰذا دلوں کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے سب تجربہ کرنا ہوتا ہے تمام حساس مراکز تحریک کو چھونا ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اس رگ کو پکڑا جاتا ہے جس کے ذریعے پیغام پہنچ جاتا ہے۔ ایک ایک پیچ کے لیے بڑے صبر' بڑی برداشت اور بڑی جدوجہد کرنی ہوتی ہے لیکن بعض اوقات صرف ایک سرسری کوشش سے اور جب انسانی سوسائٹی کی دکھتی رگ کو پکڑ لیا جاتا ہے تو پھر بڑی آسانی کے ساتھ انسان منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور سوسائٹی میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

اس بات کو ایک عام مثال سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ آپ ریڈیو کے ریسیور کی سوئی کو گھماتے رہتے ہیں لیکن مطلوبہ اسٹیشن نہیں لگتا۔ بار بار گھمانے کے بعد اچانک اسٹیشن لگ جاتا ہے بار بار کی کوششوں سے بعض اوقات اسٹیشن نہیں لگتا لیکن بعض اوقات سوئی کو محض لاپرواہی سے گھمانے کے نتیجے میں اسٹیشن لگ جاتا ہے اور پروگرام آنے شروع ہو جاتے ہیں۔

انسانی دل ریڈیو کے ریسیور کے مانند ہے اور داعی کو چاہئے کہ وہ مایوس نہ ہو اور ریسیور کو گھماتا رہے۔ دلوں کو ٹٹولتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت لوگوں کے دل اسے قبول کرنے کے لیے اچانک آمادہ ہو جائیں اور لوگ افق سے دراہلند دیکھنے لگ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی ہزار کوششیں ناکام رہیں اور ایک ہزار ایک نمبر پر کی جانے والی کوشش میں ہم منزل مقصود کو پالیں۔

یہ تو بہت آسان ہے کہ ایک داعی غضب میں آ جائے' برہم ہو جائے کہ لوگ میری بات کو قبول کیوں نہیں کرتے۔ وہ لوگوں کو چھوڑ دے' آرام سے بیٹھ جائے' ٹھیک ہے اس کی برہمی دور ہو جائے گی۔ اس کے اعصاب ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ لیکن دعوت اور پھر دعوت اسلامی کا کیا ہو گا؟ کون واپس آئے گا اور جھٹلانے والی اور چھوڑی ہوئی قوم کو دعوت کون دے گا؟

اصل بات دعوت ہے۔ داعی کی شخصیت اصل مقصود نہیں ہے۔ اگر داعی برہم ہوتا ہے یا اس کا سینہ دق ہوتا ہے تو اسے صبر کرنا چاہئے اور اپنی راہ کو نہ چھوڑنا چاہئے۔ اس کی ذات کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ صبر کرے اور لوگوں کی باتوں پر دل کو تنگ نہ کرے۔ بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے اور پھر لوگوں کی تکذیب اور لوگوں کی باتوں کی وجہ سے تو ایسا ہرگز نہ کرے۔

رہی داعی کی ذات تو اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ تو دست قدرت کا ایک ہتھیار ہے۔ دعوت کا اصل کام اللہ خود

کرتا ہے ۔وہی دعوت کا محافظ ہے ۔ داعی کو چاہیئے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں اپنے فریضہ کو پورا کرے ۔ ہر فضا میں کام کے لیے راہیں نکالے ۔ انجام اللہ پر چھوڑ دے ۔ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت ذوالنون کے قصے میں داعیان حق کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے ۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس سبق کو غور سے حاصل کریں ۔ حضرت ذوالنون علیہ السلام نے جب توبہ کی ' اپنے موقف پر نظر ثانی کی اور اپنے کام پر لوٹ آئے تو اس میں دعوت اسلامی کے کارکنوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے ۔ کیا مناسب نہیں ہے کہ داعیان حق اس پر تدبر کریں ۔ پھر حضرت یونس علیہ السلام کی دعا ' اندھیروں کے اندر ان کی دعا اور اللہ کی طرف سے اس کی قبولیت میں داعیان حق کے لیے بھی ایک خوشخبری ہے ۔ کیا یہ نہیں کہا گیا ۔

كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۱ : ۸۸) "اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچالیا کرتے ہیں" ۔

اب حضرت زکریا اور یحیٰ علیہما السلام کے قصے کی طرف سرسری اشارہ اور حضرت زکریا کی دعا کی قبولیت :

وَ زَكَرِيَّاۤ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

"اور زکریا کو ' جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "اے پروردگار ' مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو تو ہی ہے" ۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحیٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا ۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے ' اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے" ۔

حضرت یحیٰ کی پیدائش کا قصہ سورہ مریم اور سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے ' بڑی تفصیلات کے ساتھ ۔ یہاں دوسرے قصص کی طرح فقط اشارات ہی ہیں ۔ اس کا آغاز حضرت زکریا کی اس دعا سے ہوتا ہے ۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا (۲۱ : ۸۹) "پروردگار ' مجھے اکیلا نہ چھوڑ" ۔ کہ میرا کوئی وارث نہ ہو ' جو میرے بعد ہیکل کے معاملات کا نگراں ہو ۔ حضرت زکریا بنی اسرائیل کے ہیکل (عبادت گاہ) کے نگراں تھے ۔ یہ حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کا واقعہ ہے ۔ حضرت زکریا علیہ السلام یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ عبادات ' مقامات عبادات اور تمام لوگوں کے اموال کا آخری وارث تو اللہ ہی ہے ۔ اسی لیے انہوں نے کہہ دیا ۔

وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۱ : ۸۹) "اور بہترین وارث تو تو ہی ہے" ۔ لیکن ان کا اصل مدعا یہ تھا کہ ان کے بعد ان کے اہل و عیال کے لیے ' ان کے دین کے لیے ' اور ان کے مال کے لیے ' ان کو اچھا جانشین ملے کیونکہ خلافت ارضی میں انسان ہی دست قدرت کا کام کرتا ہے ۔

قبولیت دعا بھی فوراً ہی ہوتی ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَ وَهَبْنَا لَهُ يَحْيٰي وَ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۲۱ : ۹۰) "پس ہم نے اس کی دعا قبول کر لی۔ اسے یحییٰ عطا کیا' اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا"۔ وہ بانجھ تھی ولادت کے قابل ہی نہ تھی لیکن یہاں دوسرے قصص کی طرح سیاق کلام میں اختصار کر کے قاری کو انجام یعنی استجابت دعا تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (۲۱ : ۹۰) "یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے"۔ تو اللہ نے قبولیت دعا میں جلدی فرمائی۔

وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا (۲۱ : ۹۰) "اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے"۔ رغبت اس لیے کہ اللہ راضی ہو جائے اور ڈر اس کا کہ اللہ ناراض نہ ہو جائے۔ ان کے دل اللہ کے ساتھ پختہ رابطہ رکھتے تھے۔ اللہ کی رحمت کے وہ ہر وقت امیدوار رہے تھے۔

وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۲۱ : ۹۰) "اور وہ ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے"۔ نہ تکبر کرتے تھے اور نہ ہمارے مقابلے میں زور آور تھے۔ یہ تھیں وہ صفات جن کی وجہ سے حضرت زکریا' بیگم زکریا علیہ السلام اس بات کے مستحق ہوئے کہ انہیں غیر معمولی طور پر یحییٰ جیسا غیر معمولی لڑکا دیا جائے۔ یوں یہ ایک مبارک خاندان تھا' اللہ کی رحمت و رضا کا مستحق۔

سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ان کی والدہ حضرت مریم کا ذکر بھی آتا ہے' اسی اختصار کے ساتھ۔

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝۹۱

"اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا"۔

یہاں مریم کے نام کو بھی حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ انبیاء کے تذکرے کے سلسلے میں ان کے بیٹے کا ذکر اصل مقصود تھا۔ آپ کا تذکرہ ان کے حالات کے ذیل میں آ گیا اور آپ کی صرف اس صفت کو یہاں دہرایا گیا جس کا تعلق آپ کے بیٹے کے ساتھ ہے۔

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱ : ۹۱) "جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی"۔ یعنی اس نے اسے

کسی قسم کی مباشرت سے بچایا۔ احصان اپنے قانونی استعمال میں نکاح کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شادی شدہ ہونا دراصل فحاشی سے بچنے اور پاکدامنی اختیار کرنے کی بہترین صورت ہے۔ یہاں یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔یعنی اپنے آپ کو ہر قسم کی مباشرت سے بچانا خواہ قانونی یا غیر قانونی ہو۔یہ اس لیے کہ یہودیوں نے حضرت مریم پر بدکاری کا الزام لگایا اور انہیں یوسف نجار کے ساتھ متہم کیا تھا جو ہیکل کا ایک خدمتگار تھا۔ متداولہ انجیلیں اس بارے میں یہ کہتی ہیں کہ یوسف نجار نے مریم کے ساتھ نکاح کر لیا تھا لیکن ابھی رخصتی نہ ہوئی تھی اور وہ ان کے قریب نہ گیا تھا۔

جب اس نے پاکدامنی اور عفت اختیار کی فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱:۹۱) ”ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی“۔نفخ روح یہاں بھی عام ہے' اس کا تعین نہیں ہے۔جس طرح سورہ تحریم میں آرہا ہے۔سورہ مریم میں ہم اس کی تفصیلات دے چکے ہیں۔فی ظلال القرآن میں ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم آیات الٰہی تک اپنی بات کو محدود رکھتے ہیں۔اس لیے یہاں بھی ہم تفصیلات میں نہیں جاتے۔آیات کے ساتھ ساتھ ہی ہم آخر تک جاتے ہیں۔

وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱:۹۱) ”اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا“۔یہ ایک ایسا معجزہ اور ایسی نشانی تھی کہ نہ اس سے پہلے ایسا واقعہ ہوا نہ بعد میں ہو گا۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے۔یہ واقعہ اپنی مثال آپ' اس لیے بنا دیا گیا کہ پوری انسانیت کے غور و فکر کے لیے یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔ دست قدرت اپنے بنائے ہوئے قوانین قدرت کے مطابق کام کرتا ہے مگر اللہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کا خود پابند نہیں ہے۔

رسولوں کے اس سلسلے کے بیان کے آخر میں' جس میں رسولوں کی مثالیں' ان کی آزمائشوں کی مثالیں' ان پر اللہ کی رحمتوں کی مثالیں دی گئیں' اب قرآن مجید ایک جامع بات بطور خلاصہ کلام بیان کرتا ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿۹۲﴾

”یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں' پس تم میری عبادت کرو“۔

انبیاء کا گروہ ایک ہی امت اور ایک ہی جماعت ہے۔اس کا نظریہ بھی ایک ہے اور وہ سب ایک ہی نظام زندگی کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں۔ان سب کا رخ اللہ ہی کی طرف ہے۔زمین پر وہ ایک امت ہیں اور آسمانوں پر ان سب کا خدا ایک ہے۔ ان سب کا شعار صرف یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔اس طرح اس سورہ کے ساتھ سبق کا یہ آخری تبصرہ بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے یہ کہ تمام پیغمبر کلمہ توحید کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں اور اس پوری کائنات کا نظام اس پر شاہد عادل ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۳ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے 'پہلے اسباق میں اس کائنات کے اندر جاری تکوینی قوانین قدرت کا ذکر تھا' جو اس بات کے لیے نشانی تھے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے ۔ جن قوانین کے مطابق اللہ تعالیٰ رسولوں کو بھیجتا ہے ' وہ بھی ایک ہیں اور بتاتے ہیں کہ تمام رسولوں کا عقیدہ ایک ہی تھا۔ اس سبق میں مناظر قیامت اور اس کی علامات کا ذکر ہے۔ اس منظر میں مشرکین اور اللہ کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے شرکاء کا انجام بتایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ وحدہ متصرف اور مقتدر ہے جو پوری کائنات کو چلا رہا ہے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اقتدار اعلیٰ عطا کرنے کے لیے بھی قوانین اور سنن الہیہ جاری کر رکھے ہیں اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بھیجا جانا' اس دنیا پر درحقیقت اللہ کی رحمت ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان سے دست بردار ہو جائیں تاکہ یہ لوگ اپنے اللہ کے مقرر کردہ قدرتی انجام تک پہنچ جائیں ۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ ان کے کفر' تکذیب اور استہزاء پر اللہ سے معاونت طلب کریں ۔ انہیں چھوڑ دیں کہ یہ کھیل کود میں مصروف رہیں ۔ یوم الحساب تو دور نہیں ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۳ تشریح آیات

۹۳--- تا--- ۱۱۲

وَ تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾

"مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔ پھر جو نیک عمل کرے گا' اس حال میں کہ وہ مومن ہو' تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی' اور اسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ نہ آئے"۔

رسولوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ ایک ہی نظریہ پر قائم ہے اور ان کی امت بھی ایک ہی امت ہے۔ اس امت کی بنیاد کلمہ طیبہ اور توحید پر ہے۔ اس کی شہادت اس پوری کائنات میں جاری و ساری قوانین قدرت بھی دیتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی کلمہ ہے جس کی طرف ابتداء سے لے کر انتہاء تک تمام رسولوں نے لوگوں کو بلایا ہے۔ اسلام کا یہ اصل کبیر ہے۔ ہاں مختلف رسولوں کے ہاں قائم ہونے والا مفصل نظام زندگی اور نظام قانون بہرحال مختلف ادوار میں مختلف رہا ہے۔ مختلف ادوار میں نظام قانونی اقوام کی استعداد اور ان کے درجہ ترقی کی مناسبت سے تشکیل پایا ہے۔ اس میں ان اقوام کے تجربات اور ان کی ذہنی ترقی اور قوت ادراک کو مدنظر رکھا جاتا رہا ہے۔ حیات' وسائل زندگی اور لوگوں کے باہم ارتباط کے طور طریقوں' سب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

باوجود اس کے کہ رسول ایک تھے' ان کا نظریہ حیات اور عقیدہ ایک تھا' بعد میں آنے والے ان کے متبعین نے اس ایک ہی دین 'نظریہ اور نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہر گروہ دین کا ایک ایک ٹکڑا لے کر علیحدہ ہو گیا اور اس کے بعد ان گروہوں کے درمیان اختلافات زیادہ ہو گئے' عداوت شروع ہو گئی' دشمنی اس قدر بڑھی کہ جنگ و جدال شروع ہو گئی اور لوگ دینی عقائد کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے حالانکہ عقائد ایک تھے' کیونکہ امت ہی ایک تھی۔

انہوں نے دنیا میں تو اپنے ایک دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے لیکن ان کو یہ خیال نہیں ہے کہ یہ سب کے سب

قیامت کی طرف بڑی جلدی سے بڑھ رہے ہیں۔

كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (۲۱:۹۳) "سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے"۔ کیونکہ لوٹنے کی جگہ تو اللہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اللہ ہی ان سے حساب و کتاب لینے والا ہے' اور اس کو علم ہے کہ ان میں حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ

(۲۱:۹۴) "پھر جو نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو' تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی اور اسے ہم لکھ رہے ہیں"۔ یہ ہے قانون عمل اور جزائے عمل۔ عمل صالح اگر قاعدہ ایمان کے اوپر مبنی ہو تو نہ اس کا انکار ہو گا اور نہ اس کی ناقدری ہوگی۔ وہ اللہ کے ہاں لکھا جا چکا ہو گا اور اس میں سے کوئی چیز لکھنے سے چھوٹ نہیں سکتی۔

اور ایمان پر مبنی ہونا اس لیے ضروری ہے کہ ایمان اور عمل کی قدر و قیمت ہو' اگر ایمان نہ ہو تو عمل صالح ایمان موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ عمل صالح ایمان کا ثمرہ ہو بلکہ وہ ایمان کا ثبوت ہو۔ ایمان زندگی کی بنیاد ہے کیونکہ ایمان دراصل انسان اور اس کائنات کے درمیان حقیقی رابطہ ہے۔ ایسا رابطہ جو اس کائنات کو اور اس کے اندر تمام موجودات کو خالق واحد کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس ناموس قدرت کی طرف پھر جاتا ہے جس کے مطابق پوری کائنات چل رہی ہے۔ اور جب تک پختہ اساس نہ ہوگی اس وقت تک اس کے اوپر عمارت کھڑی ہی نہیں ہو سکتی۔ عمل صالح کی مثال اونچی بلڈنگ کی ہے۔ اگر یہ اونچی عمارت کسی مضبوط اساس پر نہ اٹھائی جائے تو وہ کسی بھی وقت دھڑام سے گر جاتی ہے۔

پھر عمل صالح ہمیشہ اس ایمان کا ثمر ہوتا ہے جو اگرچہ دلوں میں ہو لیکن زندہ ایمان ہو۔ اسلام کس چیز کا نام ہے؟ یہ ایک متحرک عقیدہ ہے۔ جس وقت یہ متحرک عقیدہ ضمیر میں اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے تو پھر وہ جسم انسانی سے عمل صالح کی شکل میں نمودار ہوتا ہے بلکہ عمل صالح دراصل ایمان کا ایک پختہ پھل ہوتا ہے۔ یہ پھل لگتا ہی تب ہے اور پختہ بھی تب ہی ہوتا ہے جب درخت زمین کے اندر گہرائی میں جانے والی جڑوں پر کھڑا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جب عمل اور جزاء کا ذکر کرتا ہے تو وہ ایمان اور عمل کو ایک ساتھ لاتا ہے لہٰذا ایسے ایمان پر کوئی جزاء نہیں ہے جو منجمد ہو' بالکل بجھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ بالکل کوئی پھل نہ لگتا ہو۔ اسی طرح اس عمل پر جزاء نہیں ہے جو ایمان سے کٹا ہوا ہو۔

بعض اوقات بغیر ایمان کے بھی ایک اچھا عمل دیکھا جاتا ہے' لیکن یہ ایک عارضی اتفاق ہوتا ہے' کیونکہ یہ عمل ایک مکمل نقشے کے مطابق نہیں ہوتا۔ نہ کسی قاعدے اور قانون پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ دراصل بعض اوقات ایک عارضی جذبے یا عارضی خواہش کے مطابق ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی پشت پر کوئی حقیقی باعث یا سبب نہیں ہوتا جو اس کائنات کے اندر کوئی حقیقت رکھتا ہو۔ مضبوط حقیقت یہ ہے کہ عمل صالح خدائے ذوالجلال کی رضامندی کے لیے کیا جائے۔ ایسا ہی عمل دراصل تعمیری عمل ہوتا ہے۔ ایسا ہی عمل اس کمال اور ترقی کا سبب بنتا ہے جو اللہ نے اس دنیا کی زندگی کی ترقی کے لیے

نے کیا ہے۔ پس عمل صالح وہ بامقصد تحریک ہے جو اس زندگی کے مقصد کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ محض عارضی جذبہ یا محض اتفاقی اثر اس کا باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ بامقصد عمل ہوتا ہے۔ پھر یہ عمل ایسا ہو کہ جس طرح یہ پوری کائنات خالق کائنات کے قانون قدرت کے مطابق چل رہی ہے اسی طرح وہ عمل بھی خالق کائنات کے قانون انسانی اور قانون فطرت کے مطابق ہو۔ دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔

عمل کی مکمل جزاء تو آخرت میں ملتی ہے اگرچہ اس کا ایک حصہ اس دنیا میں بھی مل جائے۔ جن بستیوں کو دنیا میں ہلاک کیا گیا ان کو ان کی بداعمالیوں کی سزا آخرت میں بھی ملے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کو میدان حشر میں نہ اٹھایا جائے۔ لازماً حشر کے میدان میں یہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰي قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲۱:۹۵) "اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا وہ پلٹ کر نہ آئے گی"۔

یہاں ہلاک شدہ بستیوں کا ذکر فرمایا جاتا ہے' خصوصیت کے ساتھ' اس لیے کہ اس سے قبل کہا گیا تھا کہ

كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (۲۱:۹۳) "سب ہماری طرف پلٹ کر آنے والے ہیں"۔ بعض اوقات ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ جن بستیوں کو دنیا میں ہلاک کر دیا گیا ہے شاید وہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئیں اور وہ پلٹ کر نہ آئیں گی اور ان کا حساب و کتاب ختم ہو گیا اس لیے یہاں دوبارہ تاکید کی جاتی ہے کہ یہ بستیاں ضرور واپس لوٹ کر قیامت میں آئیں گی اور نہ ان کا آنا حرام ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہلاک شدہ بستیاں نہ آئیں۔ یہ انداز کلام ذرا عجیب و غریب ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے یہ تاویل کی ہے کہ "لا" یہاں زائد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جب ان بستیوں کو تباہ کر دیا گیا تو پھر وہ واپس نہیں آسکتیں۔ بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ اس ہلاکت کے بعد ان کا رجوع ہدایت کی طرف نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں تاویلوں کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نص قرآنی کی وہی تفسیر بہتر ہے جو اس کی ظاہری ترکیب کے مطابق ہو اور سیاق کلام میں اس مفہوم کے لیے قرینہ بھی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد مناظر قیامت میں سے ایک منظر کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس منظر کا آغاز اس علامت سے کیا جاتا ہے کہ جس کا ظہور قرب قیامت کے زمانے میں ہو گا۔ وہ ہے یاجوج اور ماجوج کا کھل کر ٹوٹ پڑنا۔

حَتّٰٓي اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ

وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدہ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا تو یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے "ہائے ہماری کم بختی 'ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے 'بلکہ ہم خطاکار تھے"۔ بے شک تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو 'جہنم کا ایندھن ہیں' وہیں تم کو جانا ہے۔ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ پھنکارے ماریں گے اور حال یہ ہو گا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو گا 'تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے 'اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے 'وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ "یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے 'اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے"۔

سورہ کہف میں قصہ ذوالقرنین کے بیان میں ہم نے یہ کہا تھا "یاجوج اور ماجوج کے کھلنے کے ساتھ قرب قیامت کے وقت کا جو ذکر آتا ہے 'ہو سکتا ہے کہ قرب قیامت تاتاریوں کے نکلنے سے واقع ہو گیا ہو 'تاتاری نکلے اور آناً فاناً شرق و غرب پر چھا گئے اور انہوں نے تمام ممالک اور بادشاہوں کو روند ڈالا اس لیے کہ قرآن نے حضور اکرمؐ کے زمانے ہی میں کہہ دیا تھا کہ وَ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ "قیامت قریب آ گئی"۔ نیز قیامت کے قریب ہونے سے بھی "قریب" کا تعین نہیں ہوتا کیونکہ زمانے کا حساب انسانوں کے نزدیک اور اللہ کے نزدیک بالکل مختلف ہے۔ اللہ کے ہاں ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے"۔

یہاں اس دن کے مناظر بتائے جا رہے ہیں جب وہ آ جائے گا اور اس دن کے آنے سے قبل زمین کے اندر جو واقعات ہوں گے وہ یہ کہ یاجوج اور ماجوج ہر طرف سے پھوٹ پڑیں گے اور ہر بلندی سے وہ ٹوٹ پڑیں گے۔ قرآن کریم کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ زمین کے مالوف مناظر کو پیش کر کے انسان کو اخروی مناظر کی طرف لے جاتا ہے۔

یہاں قیامت کا جو منظر پیش کیا جا رہا ہے اس میں سرپرائز دینے کا ایک عنصر ہے۔ اس منظر کو اچانک دیکھ کر لوگ مبہوت رہ جائیں گے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۱: ۹۷) "یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا"۔ یہ منظر اس قدر اچانک ہو گا کہ اس کے خوف کی وجہ سے لوگوں کو کچھ نظر ہی نہ آئے گا۔ یہاں قرآن کریم نے ابصار سے پہلے شاخصہ کا لفظ رکھا ہے تاکہ اس منظر کو اچھی طرح ذہن نشین کر دے۔ اب ان کے حالات اور ان کی حالت کو چھوڑ کر قرآن ان کے مکالمے کو نقل کرتا ہے۔ اس طرح یہ منظر اسکرین پر واضح ہو کر آتا ہے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱: ۹۷) "کہیں گے ہائے! ہماری کم بختی' ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ہم خطاکار تھے"۔ یہ ہے فریاد اس شخص کی جس پر غیر متوقع طور پر کوئی مصیبت آجائے۔ ایک خطرناک حقیقت اچانک اس پر کھل جائے۔ وہ دہشت زدہ ہو جائے۔ دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں۔ دیکھے مگر نظر نہ آئے۔ آخر کار چیخ اٹھے کہ مارے گئے۔ اعتراف گناہ کرلے۔ نادم ہو جائے مگر بعد از وقت۔ جب اچانک پکڑے جائے' دہشت زدہ ہوئے' اور حواس بحال ہونے کے بعد اعتراف ہوتا ہے تو حکم الٰہی فی الفور صادر ہوتا ہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۲۱: ۹۸)
"بے شک تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو' جہنم کا ایندھن ہو' وہیں تم کو جانا ہے"۔ اچانک یہ لوگ اب میدان حشر میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ یہ جہنم کے دھانے پر کھڑے ہیں۔ بڑی بے دردی کے ساتھ فرشتے ان کو اور ان کے معبودوں کو پکڑتے ہیں اور جہنم میں پھینکتے ہیں۔ وہاں پھینکے جاتے ہیں اور ایندھن کے ساتھ ایندھن ہو کر جلتے جاتے ہیں۔ صرف اس منظر سے ان کے خلاف استدلال' وجدانی استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر یہ الٰہ ہوتے تو وہ جہنم کا ایندھن نہ بنتے۔ یہ ہے واقعی وجدانی دلیل۔

لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا (۲۱: ۹۹) "اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے"۔ یہ منظر ان کے سامنے تو قرآن اس دنیا میں پیش کر رہا ہے' لیکن اس طرح کہ گویا یہ منظر ہو کر گزر گیا ہے۔ وہ عملاً جہنم کے دھانے تک پہنچ گئے اور وہاں ڈال دیئے گئے تو اب جہنم میں ان کا جو حال ہے' وہ پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ جس طرح کوئی عملاً ایسے حالات میں پڑا ہو۔

وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱: ۹۹) لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ

(۲۱: ۱۰۰) "اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ پھنکارے ماریں گے اور حال یہ ہو گا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی"۔ اب ذرا ان کو یہاں ہی چھوڑئیے اور آئیے دیکھیں مومنین کا حال کیسا ہے۔ ان کے

حق میں تو فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ کامیابی اور نجات ان کا مقدر ہو چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِکَ عَنْھَا مُبْعَدُوْنَ (۲۱:۱۰۱) لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَھَا وَ ھُمْ فِیْ مَا اشْتَھَتْ اَنْفُسُھُمْ خٰلِدُوْنَ (۲۱:۱۰۲) "رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے۔ اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ من بھاتی چیزوں میں رہیں گے"۔ لفظ حَسِیْسَھَا ان الفاظ میں سے ہے جو اپنے صوتی ترنم سے اپنے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لفظ آگ کی اس آواز کو ظاہر کرتا ہے جو جلتی ہے اور جلاتی ہے اور سرسری آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ ایسی آواز ہے کہ اس کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پر اس کے بارے میں سوچتے ہی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان جن کے بارے میں اچھا فیصلہ صادر ہو چکا ہے اس آواز کو بھی نہ سنیں گے۔ دیکھیں گے بھی نہیں کیونکہ وہ اس دن کے عظیم جزع و فزع سے نجات پا چکے ہیں۔ وہ ایسے باغات میں ہوں گے جن میں ان کو تمام مرغوبات فراہم ہوں گی۔ ملائکہ انہیں ہر طرف سے اچھا کہیں گے اور ان کے ساتھ رہیں گے تاکہ یہ لوگ اس دن کے خوف و ہراس سے متاثر نہ ہوں۔

لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَ تَتَلَقّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ھٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۲۱:۱۰۳) "وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو پریشان نہ کرے گا۔ اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں میں لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا"۔

اس منظر کو اس کائنات کے خاتمے کے منظر پر ختم کیا جاتا ہے' یہ کائنات اس دن کی طرف لوٹتی ہے۔ اس دن کے خوفناک منظر میں جس طرح تمام لوگوں کے دل اس خوف کی گرفت میں ہیں اس طرح پوری کائنات بھی اس خوف و ہراس کی گرفت میں ہے۔

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ (۲۱:۱۰۴) "وہ دن جب آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ آسمان اس طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح ریکارڈ کیپر ریکارڈ کو لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور یہ کائنات اس طرح لپیٹ دی جاتی ہے جس طرح ہمارے کاغذات۔ اب کیا ہے ایک نئی دنیا اور ایک نئی کائنات اور نیا جہاں۔

کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ وَعْدًا عَلَیْنَا اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ (۲۱:۱۰۴) "جس طرح ہم نے پہلے تخلیق کی ابتداء کی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے"۔

---ooo---

کائنات کے خاتمہ کے اس خوبصورت منظر کو پیش کرنے کے بعد اور آخرت میں دوبارہ جہان کو پیدا کرنے کے لیے ' روئے سخن پھر اس زمین کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ اللہ کی اٹل سنت بیان کی جاتی ہے کہ اس دنیا کے اقتدار اعلیٰ کی وراثت کا حق میرے صالح بندوں کا ہے اور یہ حق ان کو اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی بندگی کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر چکے ہیں ۔ ان دونوں مناظر کے درمیان پورا ربط ہے ۔ آخرت بھی نیک بندوں کی اور دنیا بھی نیک بندوں کی ۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ

"اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے"۔

زبور ایک الہامی کتاب تھی جو داؤد علیہ السلام کو دی گئی تھی ۔ اس سورہ میں ذکر سے مراد تورات ہو گی ۔ جو زبور سے پہلے نازل ہوئی ۔ یہ کتاب کی صفت ہے یعنی کتاب کا ایک ٹکڑا ۔ اصل کتاب کا حصہ بمعنی لوح محفوظ ' جو ایک مکمل نظام ہے ' جو ایک مکمل مرجع ہے اور اس کائنات کے ساتھ متعلق تمام قوانین اس کے اندر محفوظ ہیں ۔ اس کا حصہ ہیں ۔

بہرحال اصل زیر غور مسئلہ یہ ہے کہ اس سے مراد کیا ہے ۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ

"اور زبور میں نصیحت کے بعد ہم نے لکھ دیا کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے"۔ (۲۱:۱۰۵)

وراثت کیا ہے ' اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمین کی وراثت اور اقتدار اعلیٰ کے بارے میں سنت الہیہ کیا ہے ؟ یہ کہ یہاں اقتدار میرے صالح بندوں کو ملے گا ۔ اب سوال یہ ہے کہ صالح بندے کون ہیں ؟

اللہ نے زمین پر آدم کو خلیفہ بنایا تاکہ وہ اس زمین کی تعمیر کرے اور اس کی اصلاح کرے ۔ اس کو ترقی دے اور اس کے اندر جو خزانے ودیعت کیے ہوئے ہیں ' ان سے استفادہ کرے ' اس کے اندر جو طبیعی قوتیں ہیں ان کو کام میں لائے اور اس ترقی کو اپنی انتہا تک پہنچائے جہاں تک اللہ چاہے ۔

اس خلافت فی الارض کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک منہاج بھی انسان کو دے دیا ' جس کے مطابق انسان نے زمین پر کام کرنا ہے ۔ یہ منہاج نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آخری رسالت میں مکمل و مفصل کر دیا ہے اور اس کے لیے قوانین اور ضوابط مقرر کر دیئے ہیں ۔ اس کے لیے ان قوانین میں مکمل ضمانت ہے ۔

اس نظام کے مقاصد میں صرف یہ بات ہی شامل نہیں ہے کہ انسان زمین کے اندر موجود ذخائر کو کام میں لا کر مادی ترقی پر زور دیتا رہے بلکہ انسانی عقل اور انسانی ضمیر اور اس کی روح کو بھی ترقی دے ۔ تاکہ اس دنیا میں انسان نے جس قدر مادی اور روحانی ترقی کرنی ہے وہ اس کے آخر تک پہنچ جائے ۔ یہ نہ ہو کہ دنیا میں مادی ترقی کرتے کرتے وہ خود محض حیوان بن کر تنزل کا شکار نہ ہو جائے ۔ مادی ترقیات تو آسمانوں کو چھو رہی ہوں اور انسان کی انسانیت پستیوں کی آخری حدوں پر (-------) میں ہو ۔

جب انسان اسلامی نظام زندگی کے مطابق منصب خلافت کے فرائض ادا کرتے ہوئے راہ ترقی پر گامزن ہو ' تو اس

راہ میں مادی ترقی اور روحانی ترقی کا توازن کبھی کبھی بگڑ بھی جاتا ہے۔ کبھی ایک پلڑا بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرا۔ اور توازن باقی نہیں رہتا۔ بعض اوقات اقتدار کے سرچشموں پر ڈکٹیٹر، ظالم اور سرکش لوگ قابض ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان مناصب پر نخت جاہل، اجڈ اور مہم جو قابض ہو جاتے ہیں، کبھی ان مناصب پر کفار اور فجار خالص ہو جاتے ہیں جو پوری دنیا کا مادی اور اخلاقی استحصال کرتے ہیں لیکن یہ صرف راستے کے تجربے ہوتے ہیں۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ زمین کے مناصب کی وراثت اللہ کے صالح بندوں کے لیے ہے۔ جن کا ایمان بھی مکمل ہو اور عمل بھی درست ہو۔ ان کی زندگی میں ایمان اور عمل صالح دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے ہوں۔

امت میں جب بھی ایمان اور عمل اسلامی معیار کے مطابق جمع ہوئے ہیں، تاریخ کے کسی بھی موڑ میں، تو زمین صالح بندوں کی وراثت بنی ہے لیکن جب ایمان و عمل میں جدائی ہوئی ہے یعنی ایمان نہیں رہا یا عمل نہیں رہا، تو یہ وراثت ان کے ہاتھ سے چلی گئی ہے۔ بعض اوقات ایسے لوگوں کو غلبہ مل جاتا ہے جو محض مادی وسائل پر تکیہ کرتے ہیں۔ جو لوگ محض زبانی کلامی مومن ہوتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ نیز بعض اوقات اہل ایمان کے اندر رسمی ایمان تو ہوتا مگر وہ صحیح ایمان نہیں ہوتا جو انسان کو صحیح عمل پر آمادہ کرے اور دنیاوی ترقی کرے تو ایسی صورت میں بھی محض مادی ترقی کرنے والے لوگ زمین کے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل ایمان، ایمان کے ان تقاضوں کو پورا نہیں کر رہے ہوتے جو خلافت فی الارض کے اونچے مقام کے لیے اسلامی نظام کی شکل میں اللہ نے اہل ایمان کے لیے وضع کیے ہیں۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں پر اس وقت ایک ہی فرض ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کا حقیقی مفہوم پیدا کریں۔ ایمان کا حقیقی مفہوم عمل صالح ہے۔ پھر خلافت فی الارض کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ کی سنت اپنے ظہور میں ایک لمحہ بھی دیر نہیں کرتی۔

انّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱:۱۰۵) "زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے"۔ اب آخر میں عقل و خرد کی تاروں پر اسی مضراب کی ضربات لگتی ہیں جن کے نغمات سورہ کے آغاز میں سنے گئے تھے۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۹

"اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔ اے نبیؐ! ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ ان سے کہو "میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے' پھر کیا تم سر اطاعت جھکاتے ہو؟" اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ "میں نے علی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب ہے یا دور۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو باآواز بلند کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ (دیر) تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت خاص تک کے لیے مزے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے"۔ (آخر کار) رسولؐ نے کہا کہ "اے میرے رب' حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور لوگو' تم جو باتیں بناتے ہو' ان کے مقابلے میں ہمارا رب رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے"۔

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ (۲۱: ۱۰۶) "اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے"۔ یعنی قرآن کی تعلیمات میں اس پوری کائنات اور انسانی زندگی کے لیے جو اصول وضع کیے گئے ہیں اور پھر لوگوں کے لیے دنیا (آیت ۱۰۵) اور آخرت میں جو فطری انجام بتائے گئے ہیں' جو اصول عمل اور مکافات عمل رکھے گئے ہیں ان سب میں ان لوگوں کے لیے بڑی خوشخبری ہے۔ صرف ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی ہدایات کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ نے لفظ "عابدین" استعمال کیا ہے کیونکہ عبادت کرنے والا' بندگی کرنے والا شخص ہر بھلائی کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہے اور تدبر کر کے اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانیت کے لیے ایک ہادی بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اللہ کی راہ کی طرف لے آئیں۔ لیکن ہدایت تو وہی پاتے ہیں جو ہدایت پانے کے لیے تیار ہوں' ارادہ کریں' اگرچہ اللہ کی رحمت مومنین اور غیر مومنین دونوں کے لیے عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو نظام اور جو منہاج لے کر آئے ہیں وہ اس دنیا میں بھی پوری انسانیت کے لیے سعادت مندی کا باعث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اس دور میں آئی جس دور میں انسانیت سن رشد اور بلوغ کو پہنچ گئی تھی۔ یہ رسالت ایک کھلی کتاب کی صورت میں آئی اور یہ کتاب اور یہ رسالت تمام آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتی ہے جس میں کسی تبدیلی کی آئندہ بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ نظام انسان کی ان تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے جو قیامت تک اسے پیش آ سکتی ہیں۔ یہ نظام اس خالق کا ارسال کردہ ہے' جو انسانوں کی ضروریات کو خود انسانوں سے زیادہ جانتا ہے' کیونکہ وہ لطیف و خبیر ہے۔

اللہ نے قرآن مجید کے اندر ایسے اصول وضع کیے ہیں جو قیامت تک آنے والی انسانی زندگی کی نئی نئی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ فروع اور جزئیات خود انسان پر چھوڑ دی ہیں کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں قیامت تک آنے والی انسان کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زندگی کی ضروریات کے لیے خود قانون وضع کریں۔ ہر دور کے ظروف و احوال کے مطابق جزوی مسائل کو اجتہاد کر کے اس کے لیے قانون بنائیں بشرطیکہ وہ قوانین قرآن کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں جو دائمی ہیں۔

قرآن انسان کو عقل اور سوچ کی پوری آزادی دیتا ہے وہ ایک ایسا معاشرہ اٹھاتا ہے جس میں لوگوں کے دماغوں پر

تالے نہ پڑے ہوں۔ لیکن آزادی فکر و عمل اس دائرے کے اندر ہے جو اسلامی منہاج نے کھینچ دیا ہے تاکہ انسان اس دنیا کی زندگی میں نشوونما پائے ' ترقی کے عمل کو جاری رکھے اور اسے دائرہ کمال تک پہنچائے۔

آج تک کے انسانی تجربات یہ بتاتے ہیں کہ اسلام نے جو نظام زندگی وضع کیا ہے وہ تمام انسانیت کے فکر و عمل کے نظاموں سے آگے ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کی روشنی میں انسان مسلسل ترقی کر سکے۔ یہ نظام انسان کو ہر لمحہ آگے ہی بڑھاتا ہے ' نہ اسے جامد کرتا ہے اور نہ اسے پیچھے کی طرف لے جاتا ہے ' کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کا مقصد ہی خلافت فی الارض ہے۔ اس دنیا کو ترقی دیتا ہے ' ہمیشہ آگے ہی بڑھتا ہے اور اس کے قدم آگے ہی جاتے ہیں۔

یہ نظام انسان کے داعیہ ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ' اور اس کے آگے بڑھنے کے شوق کو پورا کرتا ہے۔ کسی انسان کی انفرادی یا اجتماعی صلاحیتوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ نہ یہ نظام انسان کو اس کی جدوجہد کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے سے محروم کرتا ہے اور نہ یہ پابندی لگاتا ہے کہ وہ زندگی کی پاک چیزوں سے استفادہ نہ کرے۔

اس نظام کا مقام یہ ہے کہ یہ متوازن اور ہم آہنگ ہے۔ یہ جسم کو اس لیے نہیں کچلتا کہ روح کو بالیدگی نصیب ہو اور روح کو اس لیے نہیں دباتا کہ جسم موٹا ہو۔ انسان کی صحت مند جسمانی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرتا ہے ' اس طرح کہ وہ انفرادی اور اجتماعی ترجیحات کے مطابق ہوں۔ فرد کو اپنی ذاتی خواہشات کو اس قدر بڑھانے ' اس قدر آزاد ' اور بے لگام چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا جن سے سوسائٹی کے حقوق متاثر ہوں ' یا کسی فرد یا افراد کے مفاد میں سوسائٹی کے مفادات کو قربان کیا جائے۔

یہ نظام انسان پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد کرتا ہے ان میں یہ بات پیش نظر ہوتی ہے کہ انسان ان کو برداشت کر سکتا ہے۔ یہ اس کی وسعت اور طاقت کے حدود میں ہیں ' اس کے مفاد میں ہیں اور اس کے اندر ان فرائض کو ادا کرنے کی استعداد موجود ہے۔ پھر یہ فرائض ایسے ہوتے ہیں کہ یہ فرد ان کی ادائیگی پر آمادہ ہو ' بلکہ یہ ایسے فرائض ہیں کہ لوگ نہ صرف یہ کہ دل و جان سے انہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں بلکہ لوگ ان کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں کیونکہ یہ فرائض ان کی خواہشات کے مطابق ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ایک رحمت ہے۔ یہ رسالت جن اصولوں کو لے کر آئی تھی ابتداء میں لوگوں نے انہیں عجیب و غریب سمجھا اور یہ اصول لوگوں کے لیے بوجھ سمجھے گئے کیونکہ ابتداء میں اسلامی اصولوں اور لوگوں کی روحانی اور عملی زندگی کے درمیان بہت بعد تھا۔ لیکن اسلام کے آنے کے بعد انسانیت پوری کی پوری روز بروز اسلامی نظام کے قریب آتی گئی۔ انسانیت اسلامی نظام سے مانوس ہو گئی اور پھر ان اصولوں کو انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاں رائج کیا مگر دوسرے عنوانات سے ' اسلامی عنوان سے نہیں۔

اس آخری رسالت نے انسانیت کے راستے میں حائل ' لسانی ' قومی اور جغرافیائی حدود کو مٹا دیا تاکہ تمام لوگ ایک ہی عقیدے ' ایک ہی نظام میں ' خالص انسانی نظام میں ایک ہو جائیں۔ اس وقت لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب و غریب دعوت تھی۔ اس دور میں اشراف اور بڑے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کو اس مٹی سے نہیں پیدا کیا گیا جس سے غرباء کو پیدا کیا گیا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال قبل اسلام نے جو انسانی اصول وضع کیے تھے ان کی طرف انسانیت آج بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں انسانیت نے بہت بڑی ٹھوکریں کھائیں اس لیے کہ وہ نور اسلام سے محروم

تھی، آج اسے اسلامی اصولوں میں روشنی نظر آتی ہے اور کم از کم زبانی طور پر وہ اسلام کے انسانی اصولوں کی بات بہرحال کرتی ہے اگرچہ یورپ و امریکہ اب بھی قومی، لسانی اور جغرافیائی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔

اسلام جب آیا تو اس نے تمام انسانوں کو قانون اور عدالت کے سامنے مساوی درجہ دیا۔ اس وقت دنیا کی صورت حالات یہ تھی کہ انسانیت کو طبقات میں بانٹ دیا گیا تھا اور ہر طبقے کے لیے جدا قانون تھا۔ بلکہ غلامی، اور جاگیرداری کے دور میں تو مالک کا ارادہ ہی قانون ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اس دور میں لوگوں کو یہ بات عجیب و غریب لگی کہ اسلام میں بندہ و آقا، امیر و غریب سب ایک ہی قانون اور ایک ہی عدالت کے ماتحت ہیں۔ لیکن اسلام نے قانونی مساوات اور عدالتی چارہ جوئی کی مساوات کا جو اصول آج سے چودہ سو سال پہلے دیا، انسانیت آج بھی اسی اصول کی طرف بوجھل قدموں کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔

ان باتوں کے علاوہ بھی بے شمار اجتماعی اور سماجی امور ایسے ہیں جن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت لوگوں کے لیے ایک عظیم رحمت ثابت ہوئی ہے۔ آپؐ انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں چاہے کوئی آپؐ پر ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو کیونکہ جو نظام آپؐ لے کر آئے تھے تمام انسان اس سے متاثر ہوئے چاہے خوشی سے چاہے مجبور ہو کر، دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر۔ اس رحمت کا سایہ اب بھی پھیلا ہوا ہے، جو چاہے اس کے نیچے آکر ستائے۔ اس میں سماوی باد نسیم کے خوشگوار جھونکے ہیں۔ اس کے شجر طیبہ کی گہری چھاؤں ہے جبکہ اس کے اردگرد کی دنیا اس طرح ہے جس طرح سخت گرمی کے موسم میں کوئی چٹیل میدان میں سرگرداں ہو اور گرمی سے جھلس رہا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت جس طرح آج رحمت اسلام کی محتاج ہے اس طرح کبھی نہ تھی۔ وہ اذیت ناک قلق میں مبتلا ہے۔ وہ مادیت کے بے آب و گیاہ میدان میں سرگرداں و پریشان ہے۔ وہ اسلحہ کے ڈھیروں اور جنگل کے قانون جنگ میں گرفتار ہے اور مادیت نے لوگوں کے دلوں کو خشک کر دیا ہے۔ لوگوں کی روح خوفناک حد تک اذیت میں ہے اور ان کے دل پریشان ہیں۔

چنانچہ یہ بتانے کے بعد کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت تمام انسانیت کے لیے رحمت ہے۔ حضورؐ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ مذاق کرنے والوں اور تکذیب کرنے والوں کو بتا دیں کہ آپؐ کی رسالت کے رحمت ہونے کا خلاصہ کیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱:۱۰۸)

"ان سے کہو، میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے، پھر کیا تم سر اطاعت جھکاتے ہو؟"

اس رسالت میں رحمت ہونے کا حقیقی عنصر ہی یہ کلمہ ہے۔ عقیدۂ توحید، جو انسانیت کو جاہلیت کے اوہام، بت پرستی کے بوجھ اور خرافات اور رسومات کے بوجھ سے نجات دلاتا ہے۔ اس رسالت میں پوری زندگی کو اس مضبوط عقیدے کی بنیاد پر استوار کیا جاتا ہے۔ یوں یہ زندگی اس پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ انسانیت اپنی زندگی انہی فطری قوانین پر استوار کرتی ہے جو ایک طرف اس کائنات میں جاری و ساری ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظام اور رسالت رحمت میں جاری ہیں۔ اس نظام کی روشنی میں ہر انسان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر سر اٹھا کے چلے۔ اگر اس کا سر جھکے تو صرف خدائے واحد قہار و جبار کے آگے۔ نہ دنیا کے کسی قہار کے آگے۔ یہی ہے صحیح طریق زندگی۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱:۱۰۸) "کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو"۔
یہی ایک سوال ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذاق کرنے والے مکذبین سے کرنا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰي سَوَآءٍ (۲۱:۱۰۹) "اگر وہ منہ پھیریں تو پھر کہو کہ میں نے علی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے"۔ یعنی میں نے اپنا مدعا پورا پورا تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب میں اور تم برابر ہیں۔ "ایذان" تو دراصل اس اعلان اور الٹی میٹم کو کہتے ہیں جو امن کا زمانہ ختم ہونے کے وقت کیا جاتا ہے اور فریق دوئم سے کہا جاتا ہے کہ اب دونوں فریقوں کے درمیان جنگ ہے۔ یہ سورہ مکی ہے' اس وقت قتال فرض نہ ہوا تھا' تو یہاں اعلان کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا انجام۔ یعنی اب یہ آخری اعلان آگیا ہے اور آئندہ تمہارے لیے عذر و معذرت کا کوئی جواز نہ ہو گا۔ اگر وہ جانتے بوجھتے اپنے راستے پر چلتے رہیں تو اس کا وبال بھی ان پر ہو گا کیونکہ ان کو علم ہے۔

وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۲۱:۱۰۹) "اب میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب ہے یا دور"۔ میں نے تمہیں اعلانیہ کہہ دیا ہے۔ لیکن میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ جس عذاب کے تم مستحق ہو وہ کب آئے گا۔ کیونکہ یہ تو اللہ کے مخفی علوم میں سے ایک غیبی علم ہے۔ اس کے بارے میں صرف اللہ جانتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ تمہیں دنیا میں پکڑتا ہے یا آخرت میں۔ وہ تمہارے راز سے بھی واقف ہے اور کھلی باتوں سے بھی۔ تمہاری کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ (۲۱:۱۱۰) "اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو باآواز بلند کی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو"۔ تمہارے سب معاملات اس کے سامنے کھلے ہیں۔ وہ اگر تمہیں سزا دے گا تو اس لیے دے گا کہ تمہارے ظاہری اور خفیہ سب معاملات سے وہ باخبر ہے۔ اور اگر وہ عذاب کو مؤخر کرتا ہے تو پھر بھی کوئی حکمت اس کے پیش نظر ہو گی۔

وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰي حِيْنٍ (۲۱:۱۱۱) "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت تک کے لیے مزے کرنے کا موقعہ دیا جا رہا ہے"۔ یعنی تمہاری سزا میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ یہ میرے علم کے مطابق تمہارے لیے مزید آزمائش ہے۔ تمہیں مزید مہلت دی جا رہی ہے اور اس کے بعد تمہیں بڑی سختی سے پکڑا جائے گا۔

وقت عذاب کے عدم تعین میں بھی ان کے لیے احساس کرنے کا ایک موقع ہے۔ جب کسی وقت کا تعین نہ ہو تو اس امر کے واقع ہونے کا احتمال ہر وقت رہتا ہے اور ایک عقلمند اس سے ڈر سکتا ہے کہ کہیں اچانک ہی سر پر نہ آ جائے۔ یہ بھی امکان ہے کہ ان کے دل غفلت کے پردوں سے باہر نکل آئیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس آزمائش اور مہلت کے بعد کہیں مصیبت نہ آ جائے۔ اگر کسی مصیبت کو آنا ہو اور وقت معلوم نہ ہو تو ایک سمجھدار انسان کو ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ ابھی

پردہ گرتا ہے اور یہ مصیبت سامنے آتی ہے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان ان امور سے غافل ہوتا ہے جو پردۂ غیب کے پیچھے سے اس کے انتظار میں ہوتے ہیں اور دنیا کا ساز و سامان و عیش و طرب انسان کو مزید دھوکہ دیتا ہے۔ انسان ان امور کو بھول جاتا ہے جو پردے کے پیچھے ہوتے ہیں' لہٰذا وہ عدم علم کی وجہ سے غافل ہو جاتا ہے اس لیے اللہ نے لوگوں کو اور ایسے غافلوں کو متنبہ کرنا ضروری سمجھا ہے تاکہ وہ وقت آنے سے پہلے ہی خبردار ہو جائیں اور اپنے لیے کوئی بندوبست کریں۔

حضور نے امانت پہنچا دی' پیغام لوگوں کو دے دیا اور علی الاعلان دے دیا۔ ان کو اچانک عذاب الٰہی سے بھی خبردار کر دیا۔ اب آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اللہ سے یہ درخواست کریں کہ وہ سچا فیصلہ کر دے اور ان لوگوں کی سازشوں' ان کی تکذیب اور ان کے مذاق کا صلہ خود ان کو دیں۔

قَالَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۲۱:۱۱۲)

"آخرکار رسول نے کہا کہ اے رب حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور لوگو! تم جو باتیں بناتے ہو' ان کے مقابلے میں ہمارا رب رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے"۔ آخر میں صفت رحمت کا ذکر خاص قابل توجہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے آپ کی تکذیب کی' مذاق کیا' اس لیے اللہ ہی رسول پر رحم کر سکتا ہے اور رحم و کرم کا ضامن ہے۔ اس طرح سورہ کا آغاز اور انجام دونوں ایک ہی مضمون سے مملو ہو جاتے ہیں' نہایت ہی موثر انداز میں۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۱۷

سورۃ الحج ۔ ۲۲

آیات ۱--- تا--- ۷۸

سورۃ الحج ایک نظر میں

یہ سورہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ۔ اس کی بعض آیات کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مدنی ہے ۔ خصوصاً اس آیت سے جس میں قتال کی اجازت دی گئی ہے ۔ (۳۸ تا ۴۱) ۔ اور پھر ان آیات سے جن میں بدلہ لینے (۶۰) کی اجازت دی گئی ہے ۔ ان آیات سے یہ قطعی طور پر مدنی معلوم ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو جنگ اور قصاص کی اجازت صرف ہجرت کے بعد دی گئی تھی جب مدینہ میں ایک اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی ۔ اس سے قبل ان باتوں کی اجازت نہ تھی ۔ جب اہل یثرب نے آپ کی بیعت کی تو بیعت کے بعد انہوں نے یہ اجازت چاہی کہ ابھی ہم منیٰ میں کفار مکہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور انہیں ختم کر کے رکھ دیتے ہیں' تو آپ نے فرمایا مجھے تو ابھی اس کی اجازت یا حکم نہیں دیا گیا لیکن جب مدینہ دارالاسلام بن گیا تو اللہ نے قتال کی اجازت دے دی تاکہ مسلمانوں کو کافر جو اذیتیں دیتے تھے اس سے ان کو بچایا جائے' ملک کے اندر آزادی رائے کا حق قائم کیا جائے اور اہل ایمان آزادانہ اللہ کی بندگی کر سکیں ۔

موضوعات کے اعتبار سے یہ سورہ ایسی ہے کہ اس کے موضوعات مکی ہیں اور فضا بھی ایسی ہے جیسے مکی سورتوں کی عمومی فضا ہوتی ہے ۔ توحید' آخرت کا خوف' بعث بعد الموت کا اثبات' شرک کی تردید' قیامت کے مناظر اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے نشانات اور آیات الٰہیہ جیسے موضوعات واضح طور پر اس سورہ پر چھائے ہوئے ہیں ۔ جبکہ مدنی موضوعات بھی اس میں موجود ہیں مثلاً مشرکین سے لڑنے کی اجازت' اسلامی شعائر کے بچانے کا حکم اور ایسے لوگوں کے ساتھ خدا کی نصرت کا وعدہ جن پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ اس ظلم کی مدافعت کر رہے ہوں اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم' یہ مدنی موضوعات ہیں ۔

اس سورہ پر قوت' شدت' سختی' ڈراوے' ترہیب' تقویٰ کے شعور کی بیداری' خدا کا خوف اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا عموماً سایہ فگن ہے ۔ یہ پرتو اور یہ فضا مناظر اور امثال کی صورت میں ہیں ۔ مثلاً بعث بعد الموت کا منظر نہایت ہی خوفناک اور زلزلہ خیز ہے ۔

يَأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ (۱) يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ (۲) (۲۲ : ۱ ـ ۲) "لوگو' اپنے رب کے غضب سے بچو' حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے ۔ جس روز تم اسے دیکھو گے' حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی' ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا' اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا" ۔

عذاب آخرت کا منظر یوں ہے:

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ يُّصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ (۱۹) يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ (۲۰) وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (۲۱) كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۲۲) (۲۲:۱۹ – ۲۲) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں' ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے' اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ"۔

اور مشرکین کی مثال وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲:۳۱) "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اسے ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے"۔

اور جو شخص اللہ کی نصرت سے مایوس ہو اس کا حال یوں ہو گا۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (۲۲:۱۵) "جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا' اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے"۔

اور ایسے شہروں کا نقشہ یوں ہے جنہیں ظلم کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲:۴۵) "کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں کتنے ہی کنوئیں بے کار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں"۔

ان سخت اور خوفناک مناظر کے نتیجے میں احکام اور فرائض نازل ہوتے ہیں اور اس بات کی اجازت دی جاتی ہے کہ ظلم کی مدافعت قوت سے بھی کی جا سکتی ہے اور ایسے حالات میں اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو گی۔ یہ اس طرح کہ کافر

جن الہوں کے لیے لڑ رہے ہیں وہ کمزور ہیں اور تم جس خدا کی راہ میں لڑ رہے ہو وہ اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے۔
احکام و فرائض کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (٣٩) الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (٤٠) الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (٤١) (٢٢: ٣٩ – ٤١) "اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے' اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کثرت سے یاد کیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے' اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ دیں نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔

اور دوسرے مسئلے میں کہ مشرکین کے الٰہ کچھ بھی طاقت نہیں رکھتے کہا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ (٧٣) مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (٧٤) (٢٢: ٧٣ – ٧٤) "لوگو' ایک مثال دی جاتی ہے' غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے' بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے"۔

ان دو باتوں کے علاوہ یہ دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کا خوف اختیار کرو' ہر وقت اس سے ڈرتے رہو اور اللہ کے سامنے جھک کر سر تسلیم خم کرو۔

ایسے ہی موضوعات سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے درمیان میں بھی تقویٰ اور خدا خوفی کے مضامین جا بجا لائے جاتے ہیں۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (۲۲ : ۱) "لوگو اپنے رب کے غضب سے بچو حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے"۔ اور دوسری جگہ فرمایا ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْبِ (۲۲:۳۲) (۲۲) "یہ ہے اصل معاملہ' اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے"۔ اور دوسری جگہ فرمایا فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (۳۴) الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۲۲:۳۵) (۲۲: ۳۴ ۳۵) (۲۲) "پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے پس اس کے مطیع فرمان بنو' اور اے نبی بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰي مِنْكُمْ "نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں اور قیامت کے مشاہد بھی۔ ان لوگوں کے کھنڈرات بھی جو ہلاک کیے گئے اور عبرت کی تاریخی مثالیں بھی اور ایسی تصویر کشی جس کے ذریعے غور و فکر' ایمان و تقویٰ کا شعور' عاجزانہ روش اور اللہ کے حکم کے آگے جھک جانے کی روش بیدار کی جاتی ہے۔ یہ چیزیں اس سورہ کے عمومی مقاصد ہیں اور یہی فضا سورہ کے زیادہ تر مضامین کی ہے۔

اس سورہ کے چار حصے کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ پہلے حصے میں ایک عام پکار ہے کہ لوگو' خدا کا خوف اختیار کرو' قیامت کا زلزلہ ایک عظیم اور خوفناک چیز ہے اور اس کے اندر پائے جانے والے خوف و ہراس کی تصویر کشی کی گئی ہے اور متصلاً کہا گیا ہے کہ جو خدا اس قدر ہولناک مناظر پیدا کرے گا اس کے بارے میں لوگ بغیر علم کے مباحثے کرتے ہیں اور شیطان کی پیروی کرتے ہیں جو حتماً مردود ہے۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک جنین سے کہاں تک ہوئی اور نباتات میں کیا کیا کرشمے ہیں' لوگوں کے درمیان سوشل زندگی اور اخوت اور محبت یہ سب باتیں اس حقیقت پر دلیل ہیں کہ اللہ حق ہے' مردوں کو زندہ کرے گا اور کر سکتا ہے بلکہ سب کچھ کر سکتا ہے' بعث بعد الموت حق ہے اور قیامت آنے والی ہے اور اگر اس کائنات میں جاری نوامیس فطرت پر غور کیا جائے تو یہ سب امور راز خود ثابت شدہ معلوم ہوتے ہیں' حالانکہ اللہ اور اللہ کی ہدایات کے بارے میں لوگ بغیر علم کے بات کرتے ہیں۔ اگر وہ صرف اس کائنات کی تہہ تک ہی پہنچ جائیں تو ان کو اللہ کی قدرت معلوم ہو جائے۔ یہ لوگ حقیقت کو نظریہ افادیت اور نفع و خسارہ کے پیمانوں سے معلوم کرتے ہیں جو غلط ہے۔ پھر جو لوگ مصیبت میں غیر اللہ کو پکارتے ہیں اور اللہ کی نصرت پر ان کو یقین نہیں' حالانکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا فیصلہ وہ جلد ہی میدان حشر میں کر دے گا اور پھر وہاں کافروں کا منظر خوفناک اور مومنین کا انجام ان کے اعمال صالحہ کے مطابق دل خوش کن ہو گا۔

۲- دوسرے حصے کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ کفار اب لوگوں کو مسجد حرام سے روکنے لگے ہیں حالانکہ اللہ نے اسے سب کے لیے دار امن بنایا ہے۔ یہ جگہ مقیم لوگوں کے لیے بھی ہے اور باہر سے آنے والوں کے لیے بھی ہے۔ اس کی تعمیر کا قصہ یہ ہے کہ ابراہیم نے تو اسے دار توحید بنایا تھا۔ لیکن تم نے اس میں بت رکھ کر بت پرستی کرتے ہو۔ بات شعائر حج اور تقویٰ پیدا کرنے تک جا نکلتی ہے۔ جو اس گھر کے بنانے کا اصل مقصد ہے۔ اس حصے کے آخر میں مسلمانوں کو اجازت دی جاتی ہے کہ اب وہ ہتھیار اٹھائیں کہ کفار خانہ کعبہ پر بھی پابندی لگاتے ہیں اور لوگوں کو محض اس لیے گھروں سے نکال رہے ہیں کہ وہ اللہ کو ایک مانتے ہیں۔

۳- تیسرے حصے میں مکذبین کے بھیجنے کے نمونے اور تاریخ میں مکذبین اور ظالمین کی ہلاکتوں کے مناظر و واقعات پیش کیے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ظالموں کی نسبت اللہ کا قانون کیا ہے۔ تکذیب کی وجہ سے حضورؐ کو جو دکھ ہوتا تھا اس پر تسلی، مسلمانوں کو تسلی کہ ان کا انجام اچھا ہونے والا ہے۔ ہر دور میں دعوت اسلامی کے خلاف شیطان کی تدابیر ہوتی رہی ہیں لیکن اللہ کی دعوت کی مضبوطی اور اللہ کے دلائل کی مضبوطی کی وجہ سے اہل ایمان پختہ یقین کرتے ہیں اور ضعیف یقین والے متکبرین کی آزمائش ہوتی ہے۔

۴- آخری حصے میں اللہ کا یہ وعدہ کہ مظلوم جب اپنی مدافعت کرتا ہے تو اللہ کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی قدرت کے کرشمے اس کائنات میں نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل ایمان اس خدا کے بندے ہیں اور اس کے مقابلے میں مشرکین جن خداؤں کے لیے لڑتے ہیں ان کی حالت بہت ہی پتلی ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں، اللہ کے لیے جہاد کریں، اللہ پر اعتماد کریں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقتوں سے جو عقیدہ توحید لے کر وہ چلے ہیں اس کی ذمہ داریاں پوری کریں۔

یوں اس سورہ کے تمام مضامین ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔
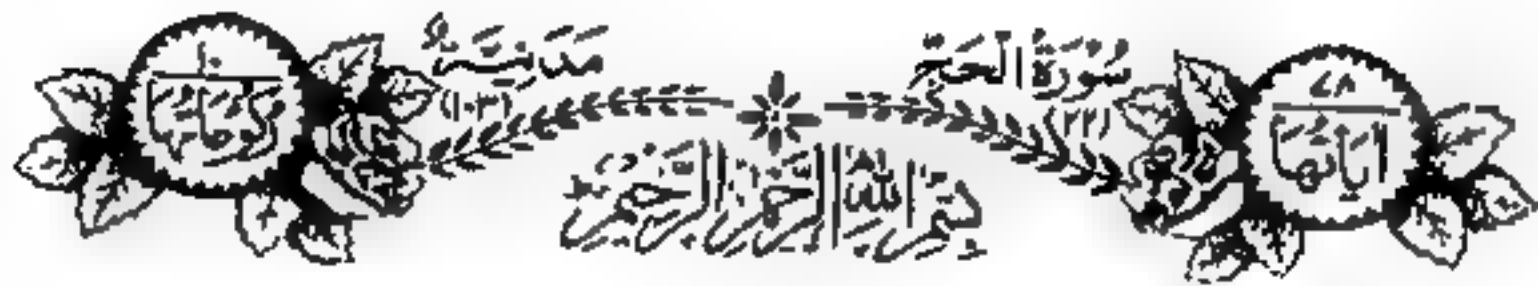
--- ooo---

درس نمبر ۱۴۴ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۴

سُوْرَةُ الحَجِّ (۲۲) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۳)

آیاتها ۷۸ رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝۱ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَی النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”لوگو' اپنے رب کے غضب سے بچو' حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے' حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی' ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا' اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا“۔

الفاظ کی شوکت کے ساتھ یہ ایک خوفناک آغاز کلام ہے' انسان اس قدر خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ دل کانپنے لگتا ہے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے زوردار آواز میں کہا جاتا ہے۔ ”لوگو“ !! یٰاَیُّھَا النَّاسُ ”اللہ سے ڈرو' اللہ سے ڈرو“۔ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ — ”اس دن سے تمہیں ہم ڈراتے ہیں“۔ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ (۲۲: ۱) ”قیامت کا زلزلہ بڑا ہی ہولناک ہے“۔ اس زلزلے اور اس عظیم اور ہولناک چیز کی تفصیلات یہاں نہیں دی جاتیں' اس سے اس کی خوفناکی اور بڑھ جاتی ہے۔ زلزلہ ہے! عظیم ہے! خوفناک ہے! اسے الفاظ میں بیان ہی نہیں جا سکتا۔ بس اس سے ڈرو ”جس طرح ایک شخص پہلے بھاگو بھاگو کہنے کے بعد وجہ بتاتا ہے“۔

اور بعد میں جو تفصیلات مختصر سی بتائی جاتی ہیں تو ان سے اس زلزلے کی خوفناکی میں شدید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا منظر جس میں دودھ پلانے والیاں بچوں کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی ہیں اور انہیں نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ سوجھتا ہے' دوڑ ہی دوڑ ہے۔ اس خوفناکی اور دوڑ میں تمام حاملہ عورتوں کے حمل گر جاتے ہیں' کوئی ادھر پڑی ہے کوئی ادھر اور

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مدہوش نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ نشے میں نہیں ہوں گے۔ ان کی خوابیدہ نظریں اور ڈگمگاتے قدم نشہ بتاتے ہیں لیکن ہیں وہ پریشان۔ یہ منظر حرکت اور افراتفری سے بھرا ہوا ہے۔ لوگوں کی موجیں ادھر سے ادھر بھاگ رہی ہیں لیکن پتہ نہیں کہ کیوں انسانوں کا سیلاب ہے۔ انسانی سوچ قرآنی انداز بیان کے اس منظر سے پیچھے رہ جاتی ہے اور تخیل کی آنکھ انسانوں کے اس متلاطم سیلاب کے آخری حصے تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اس قدر ہولناک منظر ہے کہ اس کے حجم اور ضخامت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک عورت آگ میں بھی اپنے بچے کو سینے سے لگائے رکھتی ہے لیکن یہ کیا عظیم ہولناک منظر ہوگا کہ عورتیں بچوں کو سینے سے اٹھاکر پرے پھینک دیں گی اور تمام حاملہ عورتیں حمل گرا دیں گی اور لوگ مدہوشی کی حالت میں ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ

وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (۲۲ : ۲) "اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہوگا"۔ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جبکہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں--- یہ ہے آغاز سورہ زلزلہ انگیز اور خوفناک!

ایسے مناظر کے ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ ایسے سنگدل ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں بے تکی باتیں کرتے ہیں اور اللہ کا خوف ان کے دل میں نہیں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

"بعض لوگ ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب جہنم کا راستہ دکھائے گا"۔

اللہ کے بارے میں بحث! خواہ اللہ کے وجود کے بارے میں ہو، اللہ کی وحدانیت کے بارے میں ہو، اللہ کی قدرت کے بارے میں ہو، اللہ کے علم کے بارے میں ہو، اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کے بارے میں ہو، اور یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان نے کن خوفناک مناظر سے دوچار ہونا ہے اور کن ہولناک مقامات سے گزرنا ہے، کسی عقلمند آدمی کی جانب سے یہ بحث عجیب اور جسورانہ نظر آتی ہے، یہ منظر ایک خالی اور پر تشبیہات بندے کو ہلاکر رکھ دیتا ہے۔

کاش کہ اللہ کے بارے میں بات کرنے والے علم معرفت اور یقین کی بات کرتے اور علی وجہ البصیرت کرتے، لیکن وہ تو بغیر علم کے اپنے حدود سے بڑھ رہے ہیں اور یہ بحث و جدال شیطان مردود کی اطاعت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ انسانوں میں ہر وقت ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں اور وہ اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں ایسی باتیں کرتے ہیں۔

وَ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ (۲۲:۳) "اور وہ ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں"۔ جو نافرمان، مخالف حق اور متکبر ہے۔

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۲۲:۴) "حالانکہ اس کے تو نصیب میں لکھا ہے کہ جو اسے دوست بنائے گا اسے گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب جہنم کا راستہ دکھائے گا"۔ تو اس کی دوستی کا حتمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے دوست کو جہنم رسید کر دے گا۔ آخر کوئی عقلمند شخص دیکھتے اور بوجھتے ہوئے ایسے شخص سے دوستی کیوں کرتا ہے اور اس سے ہدایات کیوں لیتا ہے؟

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بعث بعد الموت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور پھر قیامت کے زلزلے میں بھی انہیں شک ہے۔ اگر ان کو انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے میں شک ہے تو انسان کی موجودہ زندگی اور خود اپنی زندگی کی نشو و نما کے نظام ہی کو دیکھ لیں۔ اور اپنے آپ کو اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھیں۔ ان کو بے شمار دلائل قیامت ملیں گے۔ لیکن لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ان دلائل پر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝

"لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے

اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے 'پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی"۔

بعث بعد موت کی حقیقت کیا ہے۔ جسم کے اجزاء میں دوبارہ زندگی ڈالنا اور بس ۔ تو انسانی سوچ کے مطابق بھی یہ چیز ابتدائی تخلیق سے آسان ہے 'لیکن اگر انسان اسے مشکل سمجھے تو اللہ کی نسبت سے تو یہ بہت ہی آسان ہے ۔ کوئی مشکل چیز نہیں ہے ۔ دوبارہ پیدا کرنے میں بھی اللہ کو ایسا ہی ارادہ کرنا ہو گا کہ (کن) یعنی ہو جا کہے تو وہ چیز ہو جائے گی۔

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ "اس کا کام یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے"۔ قرآن کریم کا انداز کلام یہ ہے کہ وہ انسانوں کی سوچ 'اور قیاس کے مطابق ہی بات کرتا ہے ۔ لوگوں کے طرز استدلال اور ان کی قوت ادراک کے مطابق بات کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید ان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے سامنے پھیلی ہوئی اور نظر آنے والی کائنات پر غور کریں ۔ یہ ہروقت ان مشہور اور نظر آنے والے واقعات کو دیکھتے رہیں جو ہروقت ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں ۔ اگر ان نظروں کے سامنے سے روز و شب گزرنے والے واقعات پر گہرا غور و فکر کیا جائے تو وہ سب واقعات انسان کو ایک معجزہ نظر آنے لگیں ۔ بشرطیکہ وہ کھلے دل اور چشم بینا کے ساتھ ان کا گہرا مطالعہ کریں لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ان واقعات اور مناظر پر سے گونگے اور بہرے ہو کر گزرتے ہیں یا یہ واقعات اور مناظر لوگوں کے پاس سے ہو کر گزر جاتے ہیں اور لوگوں کو کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے اور سب سے بڑا سوال کہ خود انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس طرح آیا ہے اور وہ کن کن ادوار سے گزرا ہے۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ (۲۲ : ۵) "ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا"۔ انسان اس مٹی کا بیٹا ہے۔ اسی مٹی سے وہ بنا ہے 'اس کا یہ جسم اسی مٹی سے ڈھالا گیا ہے 'مٹی ہی سے اس کی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے ۔ اس کے جسم میں جس قدر عناصر ہیں وہ زمین کے اندر موجود ہیں ۔ صرف وہ ایک عنصر مٹی میں نہیں ہے یعنی "حیات" یعنی روح ۔ یہ امر ربی سے ہے اور اس کے بارے میں ہمارا علم ابھی تک قلیل ہے ۔ اس روح ہی کی وجہ سے یہ مٹی سے جدا ہو گیا ہے لیکن اصلاً ہے تو مٹی ہی ہے ۔ اس کی جسمانی ساخت 'اس کی غذا اور تمام اجزائے جسم مٹی ہی سے ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ مٹی میں اور انسان میں پھر یہ فرق کس طرح ہو گیا۔ مٹی کہاں اور انسان کہاں؟ مٹی تو سادہ ذرات ہیں لیکن انسان تو تخلیق کے بعد (فَسَوّٰھَا) بھی ہے ۔ یہ انسان فاعل بھی ہے اور فعالیت کا اثر بھی لیتا ہے ۔ مؤثر بھی ہے اور متاثر بھی ہے ۔ اس کے قدم زمین پر ہیں اور اس کی اڑان آسمانوں کی طرف ہے ۔ وہ اپنی فکر سے مادہ سے آگے تخلیقات کرتا ہے ۔ مادہ کے اندر بھی اس کی تخلیقات ہیں۔

کیا یہ ایک عظیم معجزہ اور عظیم انقلاب نہیں ہے کہ اللہ نے مٹی سے انسان بنا دیا۔ اسی انسانی مادے کو دوبارہ جمع کرنا اس کے لئے کیا مشکل ہے ۔ عجیب مخلوق مادہ سے پیدا کردہ۔

ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا

نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (۲۲: ۵) "پھر نطفے سے' پھر علقہ سے' پھر خون کے لوتھڑے سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں"۔

اب ذرا مٹی کے ان سادہ عناصر کو دیکھئے۔ پھر نطفے کو دیکھیے جو زندہ مٹی کے خلیوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ کس قدر تبدیلی آگئی۔ اسی کے اندر وہ عظیم راز مضمر ہے یعنی زندگی کا راز۔ وہ راز جس کے بارے میں آج تک انسان کوئی قابل ذکر معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ اربوں سال گزر گئے ہیں۔ انسان یہ معلوم کرنے کی سعی میں ہے کہ روح کیا ہے؟ حیات کیا ہے؟ ان اربوں سالوں کے دوران ہر نطفے میں اربوں زندہ خلیے بنتے ہیں لیکن ان خلیوں کے ملاحظے سے بھی ہم عاجز ہیں چہ جائیکہ ہم ان کی تخلیق کو سمجھ سکیں اگرچہ انسان نظر کو بلند کرے اور محالات کے دامن کو پکڑ لے۔

پھر یہ نطفہ علقہ کس طرح بن جاتا ہے' یہ خون کے لوتھڑے کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ خون بوٹی کی شکل میں کس طرح آتا ہے اور یہ بوٹی انسان کی شکل کس طرح اختیار کرتی ہے۔ نطفہ کیا ہے' مرد کا پانی۔ ایک نطفے میں ہزارہا مادہ منویہ کے حیوانات ہوتے ہیں۔ ان ہزاروں لاکھوں حیوانات میں سے صرف ایک حیوان عورت کے انڈے میں داخل ہوتا ہے جو رحم مادر میں ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ متحد ہوتا ہے اور رحم کی دیوار کے ساتھ لٹک جاتا ہے۔ اس بیضہ میں جو نہایت ہی باریک نکتے کے برابر ہوتا ہے اور جو رحم مادر کی دیواروں کے ساتھ پیوست ہوتا ہے۔ مادہ منویہ میں دوڑنے والا یہ باریک حیوان پیوست ہو جاتا ہے بلکہ اس بیضہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہ کام ایک خودکار نظام کے مطابق ہوتا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں قبولیت اللہ نے رکھی ہے۔ اس نکتے میں اللہ نے تمام انسانی خصائل اور عادات ودیعت کیے ہوئے ہیں۔ آنے والے انسان کی تمام خصوصیات کہ اس کا وزن کیا ہو گا' لمبا کتنا ہو گا' جسامت کتنی ہو گی' موٹاپا کتنا ہو گا' خوبصورت ہو گا یا بدصورت' صحت مند ہو گا یا بیمار۔ اسی کے اندر انسان کی اعصابی خصوصیات' عقلی صلاحیتیں اور نفسیاتی حالات ودیعت کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے میلانات' جذبات' رجحان' اچھائی کی طرف یا برائی کی طرف اس چھوٹے سے حیوان کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔

کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ رحم مادر کے اندر معلق بیضے اور اس چھوٹے سے حیوان کے ملاپ کے اندر یہ سب کچھ موجود ہے۔ اور یہی نکتہ جو خوردبین سے نظر آتا ہے اس کے اندر پورا انسان موجود ہے جس کے جسم کی ساخت ہی پیچیدہ ہے۔ اس قدر کہ دنیا میں کوئی ایک انسان بھی دوسرے کا مکمل ہم شکل نہیں ہوتا۔ اور آدم سے لے کر آج تک کوئی بھی دو انسان مکمل طور پر ہم شکل نہیں ہوتے۔

اب یہ نکتہ علقہ سے مضغہ بن جاتا ہے۔ یہ گاڑھے خون کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے' اس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد یہ مضغہ پھر شکل اختیار کرتا ہے' اور یہ ہڈیوں کے ہیکل کی شکل میں ہو جاتا ہے جس کے اوپر بھی گوشت چڑھتا ہے۔ اگر اس نے پیدا ہونا ہو ورنہ رحم مادر اسے باہر پھینک دیتا ہے۔ اگر اللہ نے اس کے لیے بحیثیت انسان دنیا میں آنا مقرر نہ کیا ہو۔

لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ "تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں"۔ مضغہ اور طفل کے درمیان قرآن مجید جملہ معترضہ کہتا ہے تاکہ ہم تمہیں بتائیں کہ خون کے اس لوتھڑے کے اندر قدرت الٰہیہ نے کیا کیا کمالات رکھے ہیں۔ یہ ہے قرآن مجید کا نہایت ہی مؤثر انداز بیان۔ اس کے بعد پھر رحم مادر میں جنین کے حالات۔ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى (۲۲ : ۵) "ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک خاص مدت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں"۔ جن جنینوں کو اللہ تمام کر دینا چاہتے ہیں وہ رحم مادر میں رہتے ہیں اپنے وقت وضع حمل تک۔ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (۲۲ : ۵) "پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں"۔ ذرا آپ نطفہ معلقہ کو دیکھیں اور طفل مولود کو دیکھیں دونوں کے درمیان کس قدر فرق ہے"۔

اگر اس زمانے کو دیکھا جائے تو بہت ہی تھوڑا ہے صرف ۹ ماہ عموماً اور اگر نطفہ معلقہ کو دیکھا جائے اور طفل مولود کو دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ نطفہ تو خوردبین کے بغیر نظر ہی نہیں آتا جبکہ بچہ ایک نہایت ہی پیچیدہ مکمل مخلوق کی شکل میں ہے جس کے اعضا و جوارح ہیں۔ جس کے اپنے خدوخال ہیں' اپنی صفات اور صلاحیتیں ہیں اور جذبات و میلانات ہیں۔ یہ اس قدر بڑا فرق ہے کہ کوئی سمجھ دار' ذی عقل اور مفکر انسان اس پر بار بار غور کیے بغیر اور قدرت الٰہیہ کو تسلیم کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس کے بعد قرآن مجید اس طفل مولود کے حالات کے ساتھ ذرا آگے جاتا ہے۔ یہ بچہ روشنی دیکھتا ہے اور اس پوشیدہ مقام کو چھوڑ دیتا ہے جس کے اندر اس نے یہ معجزانہ سفر طے کیا اور جہاں یہ نظروں سے اوجھل رہا۔

ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ (۲۲ : ۵) "پھر تمہاری پرورش کرتے ہیں تاکہ تم جوانی کو پہنچو"۔ اور اپنی جسمانی ساخت کو مکمل کرو' اپنی عقل بلوغت تک جا پہنچو' اور نفسیاتی طور پر ترقی یافتہ انسان بنو۔ اس مقام پر یہ بات غور طلب ہے کہ ایک نولود بچے اور ایک مکمل نوجوان اور مضبوط انسان کے درمیان کس قدر درجات ہیں۔ ان کے درمیان کتنا عظیم فاصلہ ہے۔ زمانوں کے فاصلے سے بہت بعید۔ لیکن دست قدرت نے یہ تمام فاصلے طے کرا دیئے۔ اس بچے کو دست قدرت نے تمام انسانی خواص عطا کر دیئے اور رحم مادر کے ساتھ معلق نطفہ جو ایک بے قدر پانی پر مشتمل تھا' اب ایک مکمل انسان ہے۔ اس کے بعد پھر

وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (۲۲ : ۵) "اور تم میں سے کوئی پہلے بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے"۔ جو بلا لیا جاتا ہے یعنی جلدی مرجاتا ہے تو وہ اپنے اس انجام تک جا پہنچتا ہے جو ہر زندہ کا آخری انجام ہے۔ کسی کو نہایت ہی بدترین عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو یہ ہمارے لیے قابل غور و فکر ہے کہ علم اور دانش مندی اور فہم و فراست اور کمال کے بعد وہ پھر ایک بچہ بن جاتا ہے۔ اس کے جذبات' تاثرات اور حافظہ بچوں کی طرح ہوتا ہے' وہ کوئی چیز ہاتھ میں نہیں پکڑ سکتا۔ حافظہ ختم ہو جاتا ہے' اسے کوئی چیز یاد ہی نہیں رہتی۔ یوں بھی بچہ ہوتا ہے کہ وہ

ہر حادثہ کو ایک اکیلا واقعہ سمجھتا اور دیکھتا ہے۔ دو واقعات کے درمیان کوئی ربط نہیں دیکھ سکتا۔ پھر وہ ہر بات کے بارے میں بار بار پوچھتا رہتا ہے۔ کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ جب آخری واقعہ دیکھتا ہے اس کی ابتدائی کڑیاں وہ بھول چکا ہوتا ہے۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (۲۲ : ۵) "تاکہ اسے جاننے کے بعد کچھ نہ جانے"۔ اس کی گرفت سے وہ علوم بھی نکل جائیں جن کا وہ بہت ہی ماہر فن تھا اور کسی وقت تو وہ اللہ کی ذات و صفات میں بھی بحث کرتا تھا۔

اس کے بعد انسانوں کی تخلیق اور ان کی تربیت سے ذرا آگے بڑھ کر زمین کے اندر حیوانوں اور نباتات کے تخلیقی عمل پر بحث کی جاتی ہے۔

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (۲۲ : ۵) "اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے 'پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی"۔

ہمود موت و حیات کے درمیان ایک درجہ ہے۔ زمین بارش یا پانی ملنے سے قبل حالت ہمود میں ہوتی ہے۔ پانی حیوانات اور نباتات میں ایک بڑا عنصر ہے 'جب یہ نازل ہوتا ہے تو یہ زمین اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۲۲ : ۵) حرکت کرتی ہے۔ یہ عجیب حرکت ہے جسے قرآن نے قلم بند کر دیا ہے۔ قبل اس کے کہ سائنسی آلات کے ذریعہ اس کا ملاحظہ کیا جائے۔ جب خشک زمین کو پانی ملے تو یہ حرکت کرتی ہے 'ہلتی ہے 'پانی پیتی ہے 'پھول جاتی ہے۔ اس کے بعد اس میں سے نباتات پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (۲۲ : ۵) "اس نے ہر قسم کے خوش منظر نباتات کے جوڑے اگنا شروع کیے"۔ اس سے زیادہ اور کوئی حسین خوش منظر نہیں ہوتا کہ زمین جمود اور مردہ حالت سے ایک بار پھر زندگی سے بھرپور ہو جائے اور لہلہانے لگے۔

قرآن مجید تمام زندہ چیزوں 'انسان' حیوانات اور نباتات کے درمیان ایک ہی آیت میں ایک ربط پیدا کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کے فکر و نظر کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان چیزوں کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور وہ کیا ہے؟ یہ قرابت اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کا حقیقی سبب ایک ہے 'وہ ایک ارادہ جو اسے جگہ جگہ نمودار کرتا ہے۔ زمین نباتات اور حیوانات اور انسان سب کے بارے میں یہ آیت :

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَأَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَأَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝

"یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے ' اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ' اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی ' اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ' اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں"۔

یہ بات یعنی انسان کو مٹی سے پیدا کرنا ' پھر جنین کو مذکورہ بالا مختلف مراحل سے گزارنا ' پھر بچے کا مختلف مراحل حیات طے کرنا ' پھر خشک اور مردہ زمین کو بارش کے بعد زندہ کرنا ' ان سب امور سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ حق ہے۔ اس لیے کہ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے جو قانون قدرت اس دنیا کے لیے وضع کیا ہے ' وہ حق ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور زندگی کا یوں ترتیب کے ساتھ مرحلہ وار ترقی کرتے چلے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک واحد خالق اور مدبر کا ارادہ اس کائنات میں کام کر رہا ہے۔ یعنی زندگی اور اس پوری کائنات کے اندر جاری وساری قوانین فطرت میں اور اللہ کی سچائی میں گہرا ربط ہے۔

أَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتَى (۲۲ : ٦) "اور یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے"۔ مردوں کو زندہ کرتا ہے یعنی جس طرح پہلے اس نے زمین سے انسان کو پیدا کیا اسی طرح دوبارہ اسی مٹی کو زندگی دینا اس کے لئے مشکل نہیں ہے۔

وَ أَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (۲۲ : ۷) "اور یہ کہ اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں"۔ تاکہ وہ اس انجام تک پہنچیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ کیونکہ اس کائنات کی حکمت تدبیر اور حکمت تخلیق کا تقاضا یہ ہے کہ مردوں کو اٹھایا جائے۔

یہ مختلف مراحل جن سے جنین گزرتا ہے ' پھر جن سے ایک بچہ گزرتا ہے ' جب وہ آنکھ کھولتا ہے یہ تمام مراحل یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ جو ارادہ مدبرہ یہ سب کام کرتا ہے وہ اس انسان کو موجودہ حالت سے نکال کر لازماً دارالکمال تک پہنچائے گا۔ حیات ارضی میں انسان کمال تک نہیں پہنچتا کیونکہ وہ ایک مقام تک پہنچ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر وہ زوال کی طرف آتا ہے۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا "تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے"۔ اس کی روشنی میں ایک اور جہاں اور ایک اور جنم انسان کے لیے ضروری ہے جس میں وہ کمال حاصل کرے۔

تخلیق انسان اور حیوانات ونباتات اور ان کے یہ مدارج اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کو پیدا کرنے والا ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوسرے یہ کہ عملاً ان کو اٹھا کر وہ دوسرے جہاں تک لے جائے گا تاکہ وہ وہاں درجہ کمال تک پہنچ جائیں۔ اس طرح تخلیق کا اصول اور بعث بعد الموت کا ضابطہ باہم مل جاتے ہیں اور پھر آخرت میں حساب و کتاب بھی ان کا ایک طبیعی انجام قرار پاتا ہے۔ اور ان تمام امور سے خالق مدبر کا ثبوت بھی ملتا ہے جس کا ہاتھ ان تمام امور میں کام کرتا ہے۔

ان بے شمار دلائل کے باوجود بعض لوگ پھر بھی اللہ کے بارے میں کلام کرتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۸ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰

ع ۸

"بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے، خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں۔ ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے روز اس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔۔۔ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔

ان دلائل کی موجودگی کے بعد بھی اللہ کے بارے میں کلام کرنا عجیب و غریب لگتا ہے اور نہایت ہی برا فعل ہے۔ نیز یہ جھگڑا جو لوگ کرتے ہیں وہ اہل علم ہی نہیں ہیں۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ نہ اس میدان میں انہیں کوئی خصوصی معرفت ہے۔ نہ وہ ایسی کسی کتاب سے دلیل لائے ہیں جو عقل کو روشن کر دیتی ہو۔ حق کی وضاحت کرتی ہو اور یقینی راہ بتلاتی ہو۔

یہاں ایسے لوگوں کی مخصوص تصویر کشی بھی کی جاتی ہے جنہوں نے غرور کی وجہ سے گردن اکڑائی ہوئی ہے۔

ثَانِيَ عِطْفِهٖ (۲۲ : ۹) "گردن اکڑائے ہوئے"۔ اور اس کی بات دلیل کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ وہ اکڑ کر بات کرتا ہے۔ بدرجہ متکبر ہوتا ہے۔

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۲۲ : ۹) "تاکہ لوگوں کو خدا کی راہ سے بھٹکا دے"۔ ایسے لوگ صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ وہ خود گمراہ ہوں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

لہٰذا ایسا غرور اور ایسی کرخت بڑائی اور گردن فرازی کا توڑنا ضروری ہے اس طرح کہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔

لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ (۲۲ : ۹) "ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے"۔ رسوائی اور شرمندگی کبر اور غرور کے عین متضاد حالت ہے۔ اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ ان منکرین گردن فرازوں اور اکڑ والوں اور گمراہ ہونے والوں اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنے والوں کی اس اکڑ کو توڑ کر رکھ دیتا ہے اگرچہ ایک زمانے کے بعد۔ ہاں ایسے لوگوں کو اللہ مہلت دیتا ہے تاکہ جب زوال آئے تو وہ بہت زیادہ شرمندہ اور ذلیل ہوں اور اس تذلیل کا ان پر زیادہ اثر ہو۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ بہت ہی سخت اور بہت ہی دردناک ہے۔

وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ (۲۲ : ۹) "اور قیامت کے دن ہم اسے جلنے کا عذاب چکھائیں گے"۔ چند لمحے بھی نہیں گزرتے کہ یہ دھمکی حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے یوں کہ دوران کلام انداز کلام کو اچانک حکایتی انداز سے خطاب میں بدل دیا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۲ : ۱۰) "یہ ہے تیرا یہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔ گویا ایک ہی لمحے میں اس کی سرزنش بھی ہو گئی اور وہ عذاب میں بھی جا گرا۔

---ooo---

اب قرآن کریم لوگوں میں سے بعض دوسری قسم کے لوگوں کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کے لوگ اس وقت دعوت اسلامی کے مقابلے پر تھے' لیکن ایسے نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہودی مزاج رکھتے ہیں اور نظریہ کو بھی تاجرانہ انداز میں لیتے ہیں اور شہر مارکیٹ میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

"اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے' اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔ پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ۔ یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ ان کو پکارتا ہے جن کا نقصان ان کے نفع سے قریب تر ہے' بدترین ہے اس کا مولیٰ اور بدترین ہے اس کا رفیق"۔

عقیدہ اور نظریہ ایک مومن کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اور اسی پر مومن کی زندگی قائم ہوتی ہے۔ ایک مومن کے ماحول میں زندگی کے سمندر میں اضطرابات اور تلاطم آتے اور جاتے رہتے ہیں اور تیز طوفانی ہوائیں چلتی رہتی ہیں لیکن مومن ہے کہ وہ سمندر کے بیچ میں ایک چٹان کو مضبوطی سے پکڑ کر جم جاتا ہے۔ اس کے ماحول کے اردگرد سے ایک ایک سہارا گرتا جاتا ہے لیکن وہ ہے کہ اس نے ایک مضبوط سہارا پکڑ رکھا ہوتا ہے اور اس کے پاؤں کو کوئی تزلزل نہیں ہوتا۔ ایک سچے مومن کی زندگی میں نظریہ کی یہ قدر و قیمت ہوتی ہے لہٰذا اسے اس پر جم جانا چاہئے۔ ضروری ہے کہ وہ

اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اسے اس پر یقین ہونا چاہیے کہ یہ عقیدہ سچا عقیدہ ہے۔ اس کے بارے میں اس کے اندر کوئی تذبذب نہ ہو' اور اس پر وہ کسی عطا اور جزاء کا طلبگار بھی نہ ہو' کیونکہ مومن کے لیے اس کا نظریہ اس کا حاصل ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اور نظریہ ہی اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے' یہی اس کا سہارا ہوتا ہے۔ یہ اس کا صلہ ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی وجہ سے اس کے دل کو نور ملا ہے اور وہ راہ ہدایت پر آگیا ہے اور یہ اس پر مطمئن ہو گیا ہے۔ ایک مومن جب اسلامی نظریہ حیات کی پناہ گاہ میں ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کے ارد گرد اس کے ماحول میں لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں' درخت کے گرے ہوئے پتوں کی طرح باد خزاں کبھی انہیں ادھر لے جاتی ہے اور کبھی ادھر۔ طوفانی ہواؤں کے بگولے انہیں اڑائے پھرتے ہیں اور وہ سخت قلق اور بے چینی کا شکار ہیں جبکہ یہ اپنے نظریہ پر قائم و دائم اور مطمئن ہیں۔ وہ ثابت قدم ہیں' ان کی حرکات میں سکون اور ٹھہراؤ ہے اور وہ رضائے الٰہی کے لیے رات اور دن کام کرتے ہیں۔

جن لوگوں کے بارے میں یہاں بات ہو رہی ہے' وہ ایسے لوگ ہیں جو نظریات کی تجارت کرتے ہیں' ایمان و ضمیر کو لے کر بازار میں پھرتے ہیں۔

فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ (۲۲ : ۱۱) "اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا"۔ اور یہ کہا کہ بس ایمان میں تو خیر ہی خیر ہے۔ اب یہ شخص اس نظریہ سے منافع کماتا ہے۔ تھنوں سے دودھ نکالتا ہے۔ فصل بوتا ہے اور کاٹتا ہے اور اس کی تجارت بازار میں ہوتی ہے اور وہ اس کو جاری رکھتا ہے۔

وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰي وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ (۲۲ : ۱۱) "اور اگر کوئی مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی"۔ دنیا تو اس طرح گئی کہ اس پر معمولی مصیبت آئی اور وہ اسے انگیز نہ کر سکا۔ اپنے مقام پر ثابت قدم نہ رہ سکا۔ اس نے برے حالات میں اللہ کی طرف رجوع نہ کیا اور آخرت یوں گئی کہ اس نے پہلے ایمان اور نظریہ کو چھوڑ دیا اور راہ ہدایت کے بجائے راہ ضلالت کو اختیار کر لیا۔

یہاں قرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی بندگی ایک طرف ہو کر کرتے ہیں۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے' دعوت کے کاموں میں ثابت قدم نہیں ہوتے' ان کی پوزیشن کو اس طرح بتایا جاتا ہے کہ وہ نظریاتی موقف میں ایسی جگہ کھڑے ہوتے ہیں کہ ایک معمولی سے جھٹکے سے گر جائیں۔ بس ذرا سی مشکلات آئیں اور یہ بھاگ نکلے۔ ان کا کنارہ پر کھڑا ہونا ہی اس مقصد کے لیے تھا کہ بھاگنا آسان ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ نفع و نقصان سے چیزوں کا ناپنا تجارتی کاروبار میں ہوا کرتا ہے۔ نظریات میں دنیوی سود و زیاں کا معیار نہیں چلتا۔ نظریات میں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ حق کا ساتھ دینا چاہیے کہ نظریات میں حق وہ ہے جس پر ایک کارکن اپنی تحریکی بصیرت سے مطمئن ہو۔ اس کا نفع یہی ہوتا ہے کہ انسان کو حق مل جائے۔ انسان دل سے اس پر مطمئن ہو اور اس میں اسے قلبی سکون اور راحت مل جائے۔ پس یہی منزل مقصود ہوتی ہے ایک مومن کی۔ اس پر ایک سچا مومن کوئی خارجی جزاء نہیں چاہتا۔

سچا مومن اپنے رب کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ اس نے اسے ہدایت بخشی ہے۔ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے لیے ایمان محبوب بنا دیا گیا ہے اور وہ ایمان اور نظریہ کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ اگر اس پر کوئی دنیاوی فائدہ بھی مل جائے

تو یہ جزاء خیر ہے۔ یہ مومن کے لیے بندگی اور ایمان پر صلہ ہو گا۔

ایک سچا مومن اپنے خدا کو سود و زیاں کے زاویہ سے نہیں آزماتا۔ وہ تو جب اسلام کو قبول کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ہر آزمائش کو بھی قبول کرتا ہے۔ وہ راضی ہوتا ہے کہ رب اسے جس طرح چاہے آزمائے وہ تیار ہے۔ خواہ اس پر خوشحالی ہو اور رب اسے آزمائے' چاہے اس پر بدحالی ہو اور رب اسے اس میں آزمائے' وہ ہر حال میں راضی ہو۔ یہ سودا بازار کے بائع اور مشتری کا سودا نہیں ہوتا کہ اس میں ہر وقت وہ سود و زیاں کا حساب کرتا رہے' بلکہ یہاں تو خالق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ اللہ کا اختیار ہے کہ جو چاہے کرے' کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے مومن کو بنایا ہے۔

جو شخص اپنے ایمان اور نظریہ سے دست بردار ہو کر الٹا چلا جاتا ہے وہ ایسے خسارے میں پڑ جاتا ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۲۲ : ۱۱) "اور یہ صریح خسارہ ہے"۔ اس کی زندگی کا اطمینان جاتا رہا' اعتماد جاتا رہا' سکون جاتا رہا اور رضائے الہی سے بھی محروم ہو گیا۔ صحت' مال اور اولاد کے خسارے کے ساتھ ساتھ آخرت کا خسارہ تو بہت بڑا خسارہ ہے۔ دنیا کے اس خسارے کے ساتھ ساتھ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ ان کے اعتماد' ان کے بھروسے سے' ان کے صبر' ان کے اخلاص' اور ان کے اس حوصلے کو آزماتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی تقدیر کے فیصلے ماننے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ اور آخرت کا خسارہ تو بہت بڑا خسارہ ہے کہ وہ آخرت کی دائمی نعمتوں سے محروم ہو گیا۔ اللہ کی رضامندی اور اللہ کے قرب سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ ہے خسران مبین۔

لیکن یہ شخص جو اللہ کو ایک طرف ہو کر پوجتا ہے' یہ جائے گا کہاں؟ اللہ سے دور ہو کر یہ کہاں جائے گا؟

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَ مَا لَا يَنْفَعُهٗ (۲۲ : ۱۲) "پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو اس کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ"۔ یہ بتوں کی پرستش کرے گا' یا کسی شخصیت کی پرستش کرے گا جیسا کہ جاہلیت اولیٰ میں رواج تھا۔ دور جدید میں یہ کسی پارٹی یا کسی ڈکٹیٹر یا کسی مفاد کے پیچھے دوڑے گا جس طرح جدید جاہلیت کی صورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی لوگوں نے اللہ وحدہ کو پکارنا ترک کیا اور اللہ کی رضا اور اس کے نظام زندگی پر چلنا ترک کیا۔ تو ان کا انجام کیا ہوتا ہے؟ ایسے لوگ یکسوئی اور یک جہتی سے محروم ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۲۲ : ۱۲) "یہ ہوتی ہے گمراہی کی انتہا"۔ یعنی ایسے لوگ ہدایت کی راہ سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ (۲۲ : ۱۳) "وہ ان کو پکارتا ہے جن کا نقصان ان کے نفع سے قریب تر ہے"۔ یعنی بت یا شیطان' یا آستانے۔ ان سب چیزوں کی مضرت زیادہ قریب ہے اور نفع بعید ہے۔ مضرت تو یہ ہے کہ انسانی دل و دماغ میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ وہم ذلت اور پسماندگی اس کے نصیب میں آتی ہے اور آخرت کا نقصان تو بہت ہی عظیم ہے۔

لَبِئْسَ الْمَوْلٰى (۲۲: ۱۳) "ایسا آقا بہت ہی برا ہوتا ہے"۔ یعنی ایسا جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔

وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (۲۲: ۱۳) "بدترین ہے اس کا رفیق"۔ یعنی یہ ساتھی جس سے یہ نقصان اٹھایا جا رہا ہے اس میں بت بھی شامل ہیں اور انسان بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بعض لوگ انسانوں کو بھی اللہ یا شبہ اللہ بناتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں ایسے انسان اللہ ہوا کرتے ہیں اور مومنین کے لیے جو انعامات ہیں وہ بہت ہی عظیم ہیں، قیمتی ہیں۔ اگر دنیا میں کوئی مسلمان سب کچھ داؤ پر لگا دے تو بھی ان کے لیے جو اجر رکھا گیا ہے وہ پھر بھی زیادہ عظیم اور قیمتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ⑭

"(اس کے برعکس) اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے"۔

اس لیے اگر فتنوں میں سے کسی فتنے میں کوئی مومن مبتلا ہو جائے یا آزمائشوں میں سے کوئی آزمائش اس پر آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے اور اس کے اندر کوئی تزلزل پیدا نہ ہو۔ امید رکھے کہ اللہ ضرور اس کی امداد کرے گا اور اللہ اس بات پر قادر ہے کہ اس کی اس مصیبت اور آزمائش کو دور کرے اور اس کو جزائے خیر دے۔

جو شخص یہ بھروسہ نہ رکھتا ہو کہ دنیا و آخرت میں اللہ اس کی مدد کرے گا، اور وہ مشکلات میں اللہ کی امداد سے مایوس ہو جائے۔ اگرچہ یہ سختیاں حد سے بڑھ جائیں، تو ایسا شخص اپنے بارے میں جو چاہے کرے۔ جس طرف چاہے اپنے نفس کو لے کر نکل جائے وہ جو جتن بھی کرے، اس کی مشکلات کو اللہ کے سوا کوئی دوسرا دور نہ کر سکے گا۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ⑮

"جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا، اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو روک سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے"۔

یہ ایک نہایت ہی متحرک منظر ہے جس میں انسان کے نفسیاتی غیظ و غضب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایسے حالات میں ہونے والی حرکتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ ایسے حالات کو مجسم کر کے پیش کیا جاتا ہے جن میں انسان کا غصہ اور بے چینی اپنی انتہا پر ہو۔ ایک ایسا شخص جس پر مشکلات آ رہی ہوں اور اس کا تعلق رب تعالیٰ سے نہ ہو، یہ وہ شخص ہے جو مصیبت کے وقت ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اسے کسی طرف کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی، کسی طرف

سے بادنسیم کے کسی جھونکے کے لیے کوئی کھڑکی نظر نہیں آتی۔ یہ شخص ضیق نفس اور دلی درد سے ناقابل برداشت حد تک تنگ آ جاتا ہے اور مایوسی کی اس حالت میں اسے رنج و الم اور پریشانی اور بے اطمینانی مزید تکلیف دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کو قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ بہت تنگ ہے تو کسی رسی کے ذریعے آسمانوں تک پہنچے' اس رسی کے ساتھ یہ لٹک جائے یا تو یہ خودکشی کر لے گا اور باہر گر جائے گا' یا اس کے ذریعہ اس کی جان نکل جائے گی۔ پھر وہ دیکھ لے کہ آیا ایسی تدابیر سے وہ اپنے آپ کو اس بری حالت سے نکال سکتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلسل مصائب صرف ایک ہی صورت میں برداشت کیے جا سکتے ہیں کہ انسان کو رحمت خداوندی کی امید ہو۔ مصائب و مشکلات صرف اس صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ انسان اللہ کی طرف توجہ کرے۔ مصیبتوں اور مشکلات پر قابو پانے اور ان سے نکلنے کی واحد صورت یہی ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے۔ کسی مایوس شخص کی ہر حرکت زیادہ مایوسی اور زیادہ مصیبتوں کا باعث ہوتی ہے اور مصیبت زدہ شخص جب مایوس ہوتا ہے تو اسے مصیبت زیادہ تنگ کرنے لگتی ہے۔ لہٰذا میں ان تمام لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جو مصائب اور تکالیف کی چکی میں پس رہے ہیں کہ وہ اللہ سے امداد طلب کریں۔ صرف یہی راستہ ہے جس سے وہ اطمینان پا سکتے ہیں اور اللہ کی رحمت کی بادنسیم ان پر چل سکتی ہے۔

--- ○○○---

ہدایت و ضلالت کے حالات اور ہدایت و ضلالت کی مثالوں کے ایسے ہی بیانات کی خاطر اللہ نے یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس قرآن کے لیے اپنے دل کھول دیں نور اللہ ان کو ہدایت نصیب کرے۔

وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ ﴿١٦﴾

"ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے"۔

اللہ نے ہدایت اور ضلالت کا فیصلہ پہلے ہی کر دیا ہے' جو ہدایت طلب کرے گا' تو اللہ کا ارادہ اس کی ہدایت کی شکل میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا۔ یہ اللہ کی سنت کے مطابق ہو گا' اور جس نے ضلالت طلب کی تو اسے ضلالت ملے گی۔ یہاں اللہ نے صرف ہدایت ہی کا ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ ان آیات میں مضمون ہدایت ہی کا ہے کہ وہ ایک صحت مند دل میں کس طرح داخل ہوتی ہے۔

رہے وہ فرقے اور مذاہب جو ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں' ان میں سے حق پر کون ہے؟ تو اس کا فیصلہ اس دنیا میں ہونا تو مشکل ہے' قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے عقائد میں حق کہاں ہے اور باطل کیا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾

"جو لوگ ایمان لائے' اور جو یہودی ہوئے اور صابئی اور نصاریٰ' اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا' ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا' ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے"۔

ان فرقوں کا تعارف اور تعریف پہلے گزر چکی ہے۔ یہاں ان کا ذکر اس اصول کے حوالے سے ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہدایت پر کون ہیں اور ضلالت پر کون ہیں؟ آخرت میں اللہ ہی سب کا حساب و کتاب کرنے والا ہے۔ آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز پر اللہ گواہ ہے۔

لوگ اگر اپنی فکر' اپنی خواہشات اور اپنے ذاتی میلانات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں تو دوڑتے رہیں۔ یہ پوری کائنات اپنی فطرت کے ساتھ اللہ کے قوانین قدرت کی مطیع ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ نافرمان اگر کوئی ہے تو انسان ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ﴿۱۸﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں' سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں؟ اور جسے اللہ ذلیل و خوار کر دے اسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے' اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے"۔

جب انسان اس آیت پر غور کرتا ہے تو ایک کثیر التعداد مخلوق خدا' جو نظر آتی' جو نظر نہیں آتی' آسمانوں میں اور اجرام فلکی میں' وہ چیزیں جو نظر آتی ہیں اور جو نظر نہیں آتی ہیں' پھر جو نہایت ہی حساس آلات کی مدد سے نظر آتی ہیں' لاتعداد پہاڑ' درخت' زمین پر چلنے والے حیوانات' اور پرندے چرندے' غرض مخلوقات الٰہی کا یہ سیلاب اللہ کے سامنے سربسجود ہے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہے۔ نہایت ہی اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہے لیکن اگر اس مخلوق میں کوئی نافرمان ہے تو وہ انسان ہے۔ یہ واحد مخلوق ہے جو جسورانہ انداز میں نافرمانی کرتی ہے۔

وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ (۲۲:۱۸) "بہت سے انسان اور بہت سے وہ لوگ بھی عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں"۔ یعنی اللہ کی طرف جھکنے والی اور سجدہ ریز ہونے والی اس مخلوق میں انسان ہی ایک عجیب چیز نظر آتا ہے۔

چنانچہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جس پر میرا عذاب حق ہو گیا یعنی وہ اس کا مستحق ہو گیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔

وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ (۲۲:۱۸) "اور اللہ جسے ذلیل و خوار کر دے اسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے"۔ لہذا عزت وہی ہے جو اللہ دے۔ حقارت وہی ہے جو اللہ نے دی ہو۔ جو اللہ کے سوا کسی کے سامنے بھی جھکا وہ ذلیل و خوار ہوا۔

اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر جس میں اللہ کا اکرام اور اللہ کی تذلیل صاف صاف یوں نظر آتی ہے جیسا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسکرین پر یہ سب کچھ موجود ہے' ذرا اسکرین پر دیکھئے۔

هَٰذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ يُصَبُّ مِن فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُم مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٢٢﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾

"یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں' ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے۔ اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ۔ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہاں وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیے جائیں گے اور ان کے لباس ریشم کے ہوں گے"۔

یہ ایک عجیب' خوفناک اور چیخ و پکار سے بھرپور منظر ہے۔ حرکت سے بھرپور۔ قرآن کریم کا بہترین طرز تعبیر ذہن کے اندر یہ طویل تخیلاتی منظر اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ اسکرین پر واضح نظر آتا ہے۔ یہ منظر بار بار دامن خیال کو پکڑتا ہے اور خیال اس سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔

آگ کے لباس کاٹے جا رہے ہیں' جدا جدا ہر شخص کے لیے۔ دوزخیوں کے سروں پر سخت گرم پانی ڈالا جا رہا ہے۔ پانی ڈالتے ہی ان کے چمڑے بلکہ جسم کے اندر کے حصے بھی گل سڑ جاتے ہیں۔ لوہے کے کوڑے ہیں اور آگ میں گرم ہو رہے

ہیں ۔ عذاب سخت سے سخت ہو رہا ہے ۔ حد برداشت سے بڑھ جاتا ہے ۔ لوگ گھبرا رہے ہیں ' دوڑتے ہیں اور جہنم سے نکلنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں لیکن سختی سے ان کو پھر اندر دھکیل دیا جاتا ہے ۔ سختی سے ان کو ملامت کی جاتی ہے ۔

وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۲۲ : ۲۲) "چکھو جلنے کا مزہ"۔ ان تمام مناظر کو خیال بار بار دہراتا ہے ۔ یہاں تک کہ بھاگنے کی کوشش اور سختی کے ساتھ وہ لوگوں کا جہنم میں دہکیں کر دیا جانا ' یہی خیال ذہن میں دوڑتا ہے کہ اچانک ایک دوسرا منظر آجاتا ہے ' وہ ہے دو فریقوں میں سے دوسرے فریق کا منظر ۔ ایک فریق کی حالت تو ابھی دیکھ چکے ۔ اب اسکرین پر اہل جنت کا نقشہ آتا ہے ۔ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ۔ ان کے لباس آگ سے نہیں بلکہ ریشم سے سیے جا رہے ہیں ۔ اس لباس کے ساتھ ساتھ ان کے جسم کو خوبصورت بنانے کے لیے زیورات بھی ہیں ۔ سونے کے اور موتیوں کے ۔ پھر لباس پر لباس اور وہ شیریں کلام ہیں ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے صراط مستقیم پر ہیں ۔ نہ ان کی بات سخت ہے اور نہ ان کی راہ پر مشقت ہے ۔ گویا شیریں کلامی اور حق گوئی اور راہ راست پر ہونا جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے ۔ یہ اطمینان 'یسر اور توفیق ربانی کی نعمت ہے ۔

وَ هُدُوْۤا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَ هُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝۲۴

"ان کو پاکیزہ بات قبول کرنے کی ہدایت بخشی گئی اور انہیں خدائے ستودہ صفات کا راستہ دکھایا گیا"۔ اللہ کی ذات کے بارے میں دو فریق وجود میں آگئے ۔ ایک گروہ ایسا ہے ' جو بغیر ہدایت کے ' بغیر دلیل کے اور بغیر کتاب منیر کے اللہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور دوسرا گروہ جن کو آیات و ہدایات میں سے کوئی بات نظر نہیں آتی دونوں فریق اپنے انجام کو دیکھ لیں ۔ جو لوگ اللہ کے بارے میں بغیر علم اور بغیر کتاب منیر کے بات کرتے ہیں وہ اپنا انجام دیکھ لیں ۔

---- ○○○ ----

درس نمبر ۱۴۵ ایک نظر میں

پچھلے سبق کا خاتمہ اس پر ہوا تھا کہ ذات باری کے بارے میں لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ کافروں کا انجام قیامت میں کیا ہوگا اور اہل ایمان کے حالات کیسے ہوں گے۔ اسی حوالے سے کفار کے اس طرز عمل پر بحث کی جاتی ہے جو انہوں نے اس دنیا میں اختیار کر رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو مسجد حرام کی زیارت سے اب روکنے لگے ہیں۔ مکہ میں تو انہوں نے دعوت اسلامی کی راہ روکنے کی بے حد جدوجہد کی، مگر جب یہ تحریک مدینہ منتقل ہوئی تو انہوں نے مسلمانوں کو زیارت حرم سے روک دیا۔

اس حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس حرم کو تعمیر کیا تھا تو ان کے پیش نظر کیا مقاصد تھے۔ انہوں نے کن مقاصد کے لیے اس کی تعمیر کے بعد لوگوں میں اعلان کیا تھا کہ وہ اس حرم کی زیارت کے لیے آزادانہ آئیں۔ اس گھر کی تعمیر ہی عقیدۂ توحید پر ہوئی تھی۔ یہ توحید کا گھر تھا۔ اس میں شرک کرنے کا تو جواز ہی نہیں ہے۔ پھر یہ گھر تمام انسانوں کے لیے تھا۔ خواہ اس میں کوئی مقیم ہو یا باہر سے آئے۔ یہ سب کی مشترکہ جگہ ہے۔ کوئی وہاں کسی کو روک نہیں سکتا۔ کوئی اس کا مالک نہیں ہو سکتا۔ یہاں بعض شعائر زیارت و حج بھی بیان کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے پیچھے خدا خوفی اور خدا کے ساتھ تعلق کا کیا جذبہ ہے۔ آخر میں بتایا جاتا ہے کہ حرم کے اندر کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی پر کوئی بھی زیادتی کرے۔ خصوصاً وہ لوگ جو حرم کو ان مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے لیے وہ بنا نہیں ہے۔ ان کو تو کوئی حق ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے متولی ہوں۔ اس حرم کو آزاد کرنے کے لیے جو بھی اٹھے گا اور اس مشن کے تقاضے پورے کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے شامل حال ہوگی۔ یہ جارحیت نہ ہوگی بلکہ مقاصد حرم پر دست درازی کرنے والوں کے مقابلے میں مدافعت ہوگی۔

--- ooo ---

درس نمبر ۱۴۵ تشریح آیات

۲۵ --- تا --- ۴۱

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَ الْبَادِ ۚ وَ مَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۵﴾

۳
ع ۳
۱۰

”جن لوگوں نے کفر کیا اور جو (آج) اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اس مسجد حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے' جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (ان کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے)۔ اس (مسجد حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے“۔

یہ مشرکین قریش کی کارروائی تھی کہ لوگوں کو وہ اللہ کے دین سے اور مسجد حرام سے روکتے تھے' حالانکہ مسجد حرام تمام ہی لوگوں کے لیے تھی چاہے وہ اس میں بسنے والے ہوں یا باہر سے زیارت کے لیے آنے والے ہوں۔ دین الٰہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ انسان اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر لوگوں کے لیے یہ ایک نظام زندگی ہے جس کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے کیونکہ یہ ان کی زندگی کا منہاج ہے۔ قریش لوگوں کو دین اسلام سے بھی روکتے تھے اور مسجد حرام سے بھی روکتے تھے۔ حج و عمرہ سے بھی مسلمانوں کو روکتے تھے حالانکہ مسجد حرام کو اللہ نے دار امن و امان قرار دیا تھا جس میں مکہ کے باشندے اور باہر کے لوگ سب مساوی تھے۔ یہاں کسی کو کوئی امتیازی پوزیشن حاصل نہ تھی۔ نہ اس میں کوئی مالک بن سکتا تھا اور نہ امتیازی حقوق حاصل کر سکتا تھا۔

یہ وہ مقام احترام تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ایک پر امن خطہ قرار دینے کے لیے سب سے پہلے مکہ مکرمہ کو منتخب کیا۔ اس خطے میں لوگ اسلحہ پھینکتے تھے' باہم سخت عداوت رکھنے والے دو شخص بھی یہاں امن سے رہتے تھے۔ یہاں ہر قسم کی خونریزی ممنوع تھی۔ یہ کسی کی جانب سے کوئی مہربانی نہ تھی بلکہ تمام انسانوں کا یہ حق تھا اور اس حق میں سب برابر تھے۔ فقہاء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ مکہ کے وہ گھر جن میں ان کے مالک رہائش نہیں رکھتے' آیا ان کا

کوئی مالک ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور اگر ملکیت کا جواز بھی ثابت ہو تو آیا ان مکانات کا کرایہ لیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ ملکیت بھی جائز ہے ' وراثت بھی جائز ہے 'کرایہ پر دینا بھی جائز ہے۔ وہ حضرت عمر ابن الخطابؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ انہوں نے صفوان ابن امیہ سے ایک مکان مکہ میں چار ہزار درہم کے عوض خریدا تھا اور اس سے انہوں نے جیل خانہ بنایا تھا۔ اسحاق ابن راہویہ اس طرف گئے ہیں کہ نہ ان کا کوئی وارث ہو سکتا ہے اور نہ ہی کرایہ پر دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 'حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فوت ہوئے اس حال میں کہ مکہ کے میدان شاملات کہلاتے تھے 'جس کو ضرورت ہوتی وہ اس میں رہتا اور جس کی ضرورت سے زیادہ ہوتے وہ دوسرے کو اس میں بسا دیتا۔ عبدالرزاق نے مجاہد 'اس کے باپ سے 'عبداللہ ابن عمر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مکہ کے مکانات کا بیچنا جائز نہیں ہے اور نہ ان کا کرایہ لینا جائز ہے۔ انہوں نے ابن جریج سے بھی نقل کیا ہے کہ عطاء حرم میں مکانات کو کرایہ پر دینے سے منع کرتے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ مکہ کے مکانات کے دروازے لگانے سے منع کرتے تھے تاکہ حجاج ان کے صحنوں میں ٹھہر سکیں۔ سب سے پہلے سہیل ابن عمرو نے دروازہ لگایا۔ حضرت عمر ابن الخطابؓ نے اس معاملے میں اسے لکھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ امیرالمومنین میں ایک تاجر آدمی ہوں اس لیے میں نے دو دروازے لگائے ہیں تاکہ میں اپنی سواریاں یہاں بند کروں۔ تو اس پر انہوں نے کہا کہ تمہیں اس کی اجازت ہے۔ مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل مکہ سے کہا' اپنے گھروں کے سامنے گیٹ نہ لگاؤ تاکہ حج کو آنے والا جہاں چاہے اتر جائے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ایک متوسط مذہب اختیار کیا ہے کہ ملکیت اور وراثت تو ان میں چلے گی مگر کرایہ پر دینا جائز نہ ہو گا۔ یوں انہوں نے دلائل میں تطبیق کر دی ہے۔

یوں اسلام نے تمام مذاہب کے مقابلے میں سب سے پہلے ایک خطے کو دارالامن قرار دیا۔ بلکہ اسے تمام انسانوں کا شہر قرار دیا اور اس میں ملکیت اور دوسری حد بندیوں کو ناجائز قرار دیا۔ چنانچہ اس صاف ستھرے اور سیدھے طریقے میں جو شخص ٹیڑھ پیدا کرتا ہے اس کو قرآن کریم دھمکی دیتا ہے کہ اسے سخت سزا دی جائے گی۔

وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۲:۲۵) "اس میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔ یہ سزا تو اس شخص کے لیے ہے جو ارادہ کرے اور جو ارادہ کر کے ظلم کا ارتکاب بھی کرے تو اس کی سزا پھر بہت زیادہ ہو گی۔ صرف ارادے پر سزا کا اعلان بہت زیادہ تاکید کی خاطر ہے۔ یہ قرآن مجید کی نہایت ہی دقیق تعبیر ہے۔

پھر قرآن مجید کے گہرے تاکیدی انداز کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس جملہ میں لفظ ان کی خبر کا ذکر نہیں کیا گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲۲:۲۵)

یہاں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ ان کفار کے بارے میں حکم کیا ہے؟ ان کا کیا انجام ہو گا؟ ان کو کیا سزا ملے گی؟ کفر کے ذکر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی جزاء کیا ہے جبکہ وہ یہاں سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور اسلام کی راہ بھی روک رہے ہیں۔

---ooo---

اب روئے سخن اس گھر کی تعمیر اور تاریخ کی طرف ' جس پر مشرکین کا قبضہ ہے ۔ اس میں یہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں اور اہل توحید کو حق زیارت سے بھی محروم کر رہے ہیں محض اس لیے کہ وہ شرک سے پاک ہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کی ہدایات اور احکام کے مطابق یہ کعبہ کس طرح وجود میں آیا یہ کہ یہ بنایا ہی اس لیے گیا تھا کہ یہ توحید کی بنیاد ہو گا ۔ اور اس کا استعمال یہ ہو گا کہ اس میں اللہ وحدہ کی پرستش کی جائے گی اور یہ کہ وہ یہاں کے مقیم لوگوں اور زائرین دونوں کے لیے مخصوص ہو گا ۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

" یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو' اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو' اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں ' تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں ' اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں ' خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں ' پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں ' اور اس قدیم گھر کا طواف کریں " ۔

پہلے دن سے یہ گھر توحید کے لیے تعمیر کیا گیا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس کی جگہ کی نشاندہی کی اور ان کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ اس بنیاد پر اس کی تعمیر کریں ۔

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا (۲۲ : ۲۶) " میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو " ۔ کیونکہ یہ صرف اللہ کا گھر ہے ۔ اللہ کے سوا اس میں کسی کا حصہ نہیں ۔ اور اسے پاک رکھو حاجیوں اور نماز قائم کرنے والوں کے لیے ۔

وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲۲ : ۲۶) " اور میرے گھر کو

طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کے پاک رکھو"۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بیت اللہ بنایا گیا ہے۔ مشرکین کے لیے نہیں بنایا گیا جو اللہ کے سوا اوروں کی عبادت کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی بیت اللہ کو حکم دیا کہ ان مقاصد کے لیے اس گھر کو تعمیر کرنے کے بعد لوگوں میں اعلان کر دیں کہ وہ حج کے لیے آئیں اور اللہ نے وعدہ کیا کہ لوگ اس اعلان کو قبول کریں گے۔ لہٰذا وہ قطار در قطار اونٹوں پر اور پیدل دور دراز مقامات سے آئیں گے۔ اتنی دور سے کہ ان کے اونٹ دوری سفر کی وجہ سے دبلے ہو جائیں گے۔

اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا وہ آج بھی پورا ہو رہا ہے اور کل بھی ہو گا۔ آج تک لوگوں کے دل خانہ کعبہ کے ساتھ اٹکے ہوئے ہیں۔ بیت اللہ کو دیکھنے اور طواف کے لیے لوگوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ جو غنی ہے' زاد سفر پر قدرت رکھتا ہے سواری کی سہولت رکھتا ہے وہ سواری پر' جدید ترین سواری پر' اور جس کے پاس صرف پاؤں ہیں وہ اپنے پاؤں پر چل کر اس گھر کی زیارت کو آتے ہیں۔ لاکھوں افراد دور دراز علاقوں سے 'فج عمیق' سے 'بلکہ فضائے بلند سے قطار اندر قطار ہر سال ٹوٹ پڑتے ہیں' ہزارہا سال گزر گئے ہیں اور حضرت ابراہیم کا اعلان اور اللہ کا وعدہ پورا ہو رہا ہے۔

یہاں حج کے بعض شعائر اور بعض مقاصد بھی بتا دیئے جاتے ہیں :

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ (۲۸) ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۹) (۲۲ : ۲۸ - ۲۹) "تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں' اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں' خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں' پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں' اور اس قدیم گھر کا طواف کریں"۔

وہ منافع کیا ہیں جو حجاج دیکھتے ہیں؟ حج دراصل ایک عالمی اجتماع اور میلہ ہے' یہ تجارت کا موسم اور عبادت کا موسم ہے۔ یہ ایک ایسا عالمی اجتماع ہے' جس میں تمام دنیا کے مسلمان ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ تمام مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور ان کے درمیان یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں جمع ہوتی ہیں اور یہ دراصل اسلامی نظریہ حیات کے آثار قدیمہ کی زیارت بھی ہے۔ سامان زیارت اور مصنوعات والے لوگوں کے لیے یہ ایک بہترین منڈی ہے۔ آپ دیکھیں کہ دنیا کے سامان خورد و نوش اور دنیا کے پھل اس گھر کی طرف' اطراف زمین سے آتے ہیں اور لائے جاتے ہیں۔ تمام علاقوں سے حجاج کھنچے چلے آتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے علاقوں کی بھلائیاں اور حسن اخلاق بھی آتے ہیں اور پھر یہ خوشبو پورے عالم اسلام میں بکھرتی ہے۔ یہ تمام لوگ بیت الحرام میں مختلف موسموں میں جمع ہوتے ہیں اور ایک موسم

میں بھی جمع ہوتے ہیں گویا یہ ایک تجارتی منڈی ہے اور تجارتی میلہ بھی۔

پھر حج عبادات کا ایک عالمی اجتماع ہے' جس میں روحانی صفائی کی جاتی ہے۔ انسان کی روح یہ محسوس کرتی ہے کہ اللہ کے اس محترم گھر میں وہ اللہ کے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔ یہ روح خانہ کعبہ کی طرف مشتاق ہوتی ہے اور خانہ کعبہ کے ساتھ جو روحانی یادیں وابستہ ہیں' جن برگزیدہ ہستیوں کی ذات اس سے وابستہ ہے ان کی روحیں اسے یہاں گھومتی محسوس ہوتی ہیں' زمانہ قریب کی روحیں اور زمانہ بعید کی روحیں۔

دیکھئے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روح ہے' وہ بیت اللہ میں اپنے جگر گوشہ اسماعیل اور ان کی والدہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وہ اپنے ڈرنے والے اور دھڑکنے والے دل کے ساتھ رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (١٤ : ٣٧) پروردگار' میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں' لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے' شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔

پھر حضرت ہاجرہ کی تصویر پردہ خیال پر آتی ہے' وہ اپنے لیے اور اپنے شیرخوار بچے کے لیے پانی کی تلاش میں' جھلسا دینے والی گرمی میں' بیت اللہ کے گرد گھوم رہی ہیں۔ پھر صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتی نظر آتی ہیں' وہ پیاس سے نڈھال ہیں' تھک کر چور چور ہو گئی ہیں اور ان کو اپنے بچے کی جان کا خطرہ ہے۔ وہ جب ساتویں بار واپس آتی ہیں تو مایوسی کی وجہ سے ٹوٹ چکی ہیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ اس خوبصورت بچے کے سامنے شفاف پانی کا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ یہ ہے چشمہ زم زم۔ خشکی اور مایوسی کے صحرا میں چشمہ رحمت الٰہی ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تصور پردۂ خیال پر نمودار ہوتا ہے۔ آپ خواب دیکھ رہے ہیں کہ آپ حضرت اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ آپ فوراً اپنے لخت جگر کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے بھی تردد نہیں کرتے اور مومنانہ اطاعت شعاری کا بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰي فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰي "اس نے کہا' اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں' تمہارا کیا خیال ہے؟" حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی بڑی فرمانبرداری سے جواب دیتے ہیں :

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ "ابا جان' آپ کو جو حکم دیا گیا ہے' اسے کر گزریں ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔ جب وہ دونوں تیار ہو جاتے ہیں تو اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور اس قربانی کے بدلے فدیہ قبول کر لیا جاتا ہے۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ (١٠٤) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (١٠٥) اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (١٠٦) وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (١٠٧) (٣٧ : ١٠٤

تا ۱۰۷) اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم" تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں - یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

اور پھر حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام دونوں خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نہایت عاجزی اور خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کر رہے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (١٢٧) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(۱۲۸) "اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

یہ خیالی تصویر اور شخصیات پردۂ خیال پر آگے پیچھے آرہی ہیں اور یہ یادیں سامنے آتی ہیں اور جاتی ہیں کہ اچانک حضرت عبدالمطلب سامنے آتے ہیں۔ وہ یہ نذر مانتے ہیں کہ اے اللہ اگر تو نے مجھے دس بیٹے عطا کیے تو میں دسویں بیٹے کو تیرے لیے نذر کر دوں گا۔ دسواں بیٹا عبداللہ ہے۔ عبدالمطلب نذر پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی قوم ان کے ارد گرد جمع ہے۔ اور وہ تجویز دے رہے ہیں کہ آپ فدیہ دے دیں۔ وہ خانہ کعبہ کے گرد وہ تیر نکالتے ہیں اور ہر بار تیر عبداللہ کے ذبح کرنے کا نکلتا ہے۔ وہ فدیہ بڑھاتے جاتے ہیں یہاں تک کہ فدیے کے اونٹ سو تک پہنچ جاتے ہیں حالانکہ فدیہ کا ابتدائی نصاب دس اونٹیاں تھیں۔ آخر کار فدیہ کا تیر نکلا۔ انہوں نے سو اونٹ ذبح کیے اور عبداللہ کی جاں بخشی ہوئی۔ یہ اللہ کی منشاء تھی کیونکہ اللہ نے ان کی پشت اور رحم آمنہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسے جلیل القدر پیغمبر کو پیدا کرنا تھا۔ گویا یہ فدیہ عظیم فدیہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خاطر دلایا۔

اس کے بعد بھی اس گھر کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور تخیل کے پردے پر بار بار نئی شخصیات ابھرتی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدارج طفولیت طے کر رہے ہیں، بیت اللہ کے ارد گرد وہ گھوم رہے ہیں۔ دیکھئے، آپ حجر اسود کو اپنے پاک ہاتھوں سے اٹھا رہے ہیں اور اپنی جگہ پر رکھ رہے ہیں تاکہ اس فتنے کو فرو کر دیں جس کی وجہ سے خیال کے اندر جنگ چھڑنے کا خطرہ تھا۔ آپ نماز پڑھتے نظر آتے ہیں، طواف کرتے نظر آتے ہیں، خطبہ دیتے نظر آتے ہیں، اعتکاف کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کے قدم پردۂ خیال پر ہیں۔ آپ کی صورت ضمیروں پر زندہ ہے۔ قریب ہے کہ ایک حاجی آپ کو آنکھوں سے دیکھ لے جبکہ وہ ان یادوں کی سوچ میں گم اور مستغرق ہوتا ہے۔ پھر ہمارے سامنے آپ کے صحابہ کرام غول کے غول آتے ہیں اور اس مٹی پر گھومتے ہیں۔ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ یہ نقشے ایسے ہیں کہ قریب ہے کہ کان سنیں اور نظریں دیکھیں۔

اور پھر ان یادوں اور تصورات کے علاوہ حج مسلمانوں کا ایک جامع عالمی اجتماع ہے۔ اس میں ان کو اپنی اس اصلیت اور جڑ کا پتہ چلتا ہے جو دور تک تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام تک چلی گئی ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا "اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس میں بھی"۔ یہ مسلمانوں کا محور ہے جس کے ارد گرد وہ گھومتے ہیں، جس نے انہیں متحد کر رکھا ہے۔ یہ ان کے لیے ایک شعار اور ایک جھنڈا ہے۔ اس کے نیچے سب جمع ہوتے ہیں، یہ ایک ایسا نظریاتی شعار اور نظریاتی جھنڈا ہے جس کے سائے میں تمام اقوام کے افراد، تمام نسلوں اور تمام رنگوں اور تمام زبانوں کے لوگ آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ یہاں آکر مسلمان اپنی اس قوت کو ایک محدود وقت کے لیے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ عقیدۂ توحید کی قوت، ایک امت ہونے کی قوت اور اربوں مسلمانوں کے باہم اتحاد و اتفاق کی قوت۔ اس اجتماع میں وہ اپنی بھلائی ہوئی قوت کو ایک محدود وقت کے لیے ہی محسوس کرتے ہیں اور اس طرح محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ ایک ہو جائیں تو ان کے سامنے دنیا کی کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی بشرطیکہ یہ سب لوگ عقیدۂ توحید پر ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

اللہ جو فرماتے ہیں لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲ : ۲۸) "تاکہ وہ اپنے ان مفادات کو دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں"۔ ہر نسل اپنے ظروف و احوال کے مطابق، اپنی حاجت اور ضرورت کے مطابق، اپنے تجربے اور اپنے تقاضوں کے مطابق اس اجتماع سے مفادات حاصل کر سکتی ہے۔ یہ بات اس وقت سے اللہ نے اس اجتماع کے مقاصد میں رکھی ہے جب سے اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو اس گھر کی زیارت کے لیے بلاؤ۔

قرآن مجید اس اجتماع کے لئے بعض مناسک اور بعض بنیادی شعائر دیتا ہے اور سب میں سب کا بھلا ہے۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

(۲۲ : ۲۸) "اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں"۔ اس آیت میں اشارہ ہے قربانی کی طرف جو عید کے دن اور ایام تشریق میں کی جاتی ہے اور قربانی کے مختلف جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ قرآن کریم قربانی کے ذکر میں سب سے پہلے یہ حکم دیتا ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے کیونکہ مقصد اللہ کی بندگی اور اللہ کی رضامندی کا حصول ہے۔ یہاں قربانی کے عمل میں سب سے زیادہ امتیاز کے ساتھ جس عمل کا ذکر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف جانور ذبح کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس پر اللہ کا نام لینا ہے۔ (احناف کا فتویٰ اس پر ہے کہ یوم نحر کے بعد صرف دو دنوں میں قربانی جائز ہے)۔

یہ قربانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح عظیم کی یادگار ہے۔ اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزے اور اللہ کی اطاعتوں میں سے ایک عظیم تعمیل حکم کی بھی یادگار ہے۔ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے یادگار کے طور پر چھوڑی۔ اس یادگار میں فائدہ یہ ہے کہ فقراء اور مساکین کے لیے کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے۔ قربانی کے جانور اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکری ہے۔ (گائے اور بھینس دونوں کے لیے عربی میں بقر کا لفظ آتا ہے)

فَكُلُوا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ (۲۲ : ۲۸) "اس سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں"۔ قربانی کے گوشت کے استعمال کے لیے جو حکم قربانی کرنے والے کو ہے یہ استحبابی ہے لیکن فقیروں کو دینے کے لیے جو حکم ہے وہ وجوبی ہے۔ خود کھانے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ فقراء محسوس کریں کہ یہ پاک صاف اور طیب گوشت ہے۔

قربانی کرتے ہی حاجی کے لیے وہ باتیں جائز ہو جاتی ہیں جو اس کے لیے دوران حج ممنوع تھیں۔ مثلاً بال منڈوانا' کاٹنا' ناخن کاٹنا' بغلوں کے بال کاٹنا اور غسل وغیرہ جو کام بھی احرام کے دوران منع تھے وہ جائز ہو جاتے ہیں' اس کے بارے میں کہا گیا۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوفُوا نُذُورَهُمْ (۲۲ : ۲۹) "پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں"۔ جو نذریں انہوں نے مانی ہوں یعنی حج کی قربانی کے علاوہ جو نذریں انہوں نے مانی ہوں۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (۲۲ : ۲۹) "اور قدیم گھر کا طواف کریں"۔ اس سے مراد طواف افاضہ یا طواف زیارت (جو نام بھی دیں) ہے۔ طواف افاضہ طواف وداع سے علیحدہ ہے۔

بیت عتیق سے مراد مسجد حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کسی بھی جابر کی حکمرانی سے بچایا ہے اور اسی طرح اسے گرنے اور نشانات کے مٹ جانے سے بھی بچایا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے آباد کرنے سے یہ ہمیشہ آباد رہا ہے اور رہے گا۔

یہ تھا قصہ بیت الحرام کی تعمیر کا۔ اور یہ ہے وہ بنیادی عقیدہ جس پر اس کی تعمیر ہوئی' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ اسے توحید کے گھر کے طور پر تعمیر کریں۔ اور اسے شرک و بت پرستی سے پاک رکھیں اور حکم دیا کہ عامتہ الناس کو حکم دیں کہ وہ اس کی زیارت کو آئیں۔ قربانی کے جانوروں پر اللہ کا نام لیں' اس کے سوا کسی دوسرے الہ کا نام نہ لیں۔ قربانی کے گوشت کو خود بھی کھائیں اور تنگ دست اور فقیر کو بھی کھلائیں۔ یہ بیت الحرام ہے اور اس میں اللہ کی حرمتیں محفوظ ہیں۔ ان پر عمل ہو گا اور اللہ کی حرمتوں میں سے پہلی چیز اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید ہے۔ اس گھر کے دروازے تمام لوگوں کے لیے کھلے ہوں اور یہاں سب لوگوں کی جان و مال محفوظ ہوں' یہاں تمام عہد پورے کیے جائیں اور امن و سلامتی کا احترام کیا جائے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

"یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے۔ اور تمہارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے' ماسوا ان چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں۔ بس

بتوں کی گندگی سے بچو' جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو' یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا' اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے"۔

اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا جائے۔ یہ اللہ کے ہاں بہت بڑی نیکی اور خیر ہے۔ انسانی شعور اور انسانی ضمیر کی دنیا میں بھی خیر کثیر ہے۔ واقعی اور عملی زندگی میں بھی یہ خیر ہے کیونکہ جو ضمیر حرمتوں کا شعور رکھتے ہوئے بچنے کی کوشش کرے گا وہی پاک ہو گا۔ جس زندگی میں اللہ کی حرمتوں کا احترام ہو گا۔ وہی زندگی امن و امان اور سلامتی کی نعمت سے مالا مال ہو سکتی ہے۔ اور اس میں کسی پر کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہو سکتی۔ ایسی ہی زندگی میں امن کے مقامات اور اطمینان کے گھر مل سکتے ہیں۔

مشرکین بھی بعض جانوروں کا احترام کرتے تھے۔ مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام۔ ان کے نزدیک یہ جانور محترم تھے اور ان کو ہاتھ لگانا بھی جرم تھا۔ لیکن یہ مشرکین کی خود ساختہ حرمتیں تھیں۔ اللہ کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی حکم نہ تھا۔ تو یہاں کہہ دیا کہ اللہ نے کھانے کے جانوروں میں سے جو حرام قرار دیئے ہیں ان کا ذکر ہو چکا ہے مثلاً مردار' خون' خنزیر۔ اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کی نذر ہو۔

وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۲۲: ۳۰) "تمہارے لیے مویشی حلال کیے گئے ہیں ماسوائے ان چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں"۔ یہ اس لیے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی مقرر کردہ کوئی حرمت نہ ہو۔ اللہ کے سوا کسی کو حلال و حرام قرار دینے کی اجازت نہیں اور اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور شریعت کے مطابق احکام جاری نہ ہوں۔

حلت اور حرمت کی بحث ہی کی مناسبت سے بتوں کی گندگی سے بچنے کی بھی تاکید کر دی گئی۔ مشرکین بتوں پر جانور ذبح کرتے تھے حالانکہ یہ ناپاکی تھی۔ رجس اس ناپاکی کو کہتے ہیں جس کا تعلق انسان کے نفس' ضمیر اور دماغ سے ہو' شرک اسی قسم کی معنوی ناپاکی ہے۔ شرک قلب و ضمیر کو اسی طرح ناپاک کر دیتا ہے جس طرح گندگی کپڑے کو ناپاک کر دیتی ہے۔

پھر شرک اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور سفید جھوٹ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اس بڑے جھوٹ کے ساتھ ساتھ تمام جھوٹوں سے بچو۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲: ۳۰) "بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو"۔ قرآن مجید نے جھوٹ کو شرک کے ساتھ جوڑ کر اس کے گناہ کو اور بھیانک بنا دیا ہے۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ فاتک اسدی نے حضور سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھی اور منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

عدلت شهادة الزور الا شراك بالله عز وجل "اور جھوٹی شہادت کو شرک کے برابر کر دیا گیا ہے"۔ اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کی خواہش یہ ہے کہ لوگ ہر قسم کے شرک کو چھوڑ دیں اور ہر قسم کے جھوٹ کو چھوڑ دیں اور خالص عقیدۂ توحید پر جم جائیں۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (۲۲ : ۳۱) "یکسو ہو کر اللہ کے بندے ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔ اس کے بعد آیت میں ایک خوفناک منظر ایک مثال کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ جو شخص توحید کے بلند افق سے گرا تو اس کا حال کیا ہوتا ہے۔ وہ شرک کی پستیوں میں جا گرتا ہے اور وہ اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان ہی نہیں رہتا۔ گویا وہ تھا ہی نہیں۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲ : ۳۱) "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اسے ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے"۔

یہ منظر ایسے شخص کا ہے جو بہت ہی بلند جگہ سے گر جائے جیسا کہ آسمان سے زمین پر گر کر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور اسے پرندے اچک لے جائیں یا ہوا اسے نظروں سے دور پھینک دے۔ یا ہوا اسے ایسی جگہ پھینک دے ایسے گڑھے میں جہاں اسے کوئی قرار نصیب نہ ہو۔ یعنی اس منظر میں تمام مراحل بڑی تیزی سے سرانجام پاتے ہیں۔ سخت تیزی اور پھر اقدامات لگاتار ہیں اور ہر مرحلے کے . . . کا استعمال ہے۔ جو ترتیب واقعات بغیر فاصلہ وقت پر دلالت کرتی ہے یعنی یہ شخص بڑی تیزی سے منظر سے غائب ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز ہے تصویر کشی کا۔

پھر جس طرح قرآن کریم نے شرک کرنے والے کی تصویر کشی کی ہے فی الواقعہ بھی اس کی حالت کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ توحید اور ایمان کے بلند مقام سے گر جاتا ہے اور اس کی شخصیت منتشر ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس وہ مضبوط اساس یعنی عقیدۂ توحید ہی نہ رہا جس پر وہ کھڑا ہو سکے۔ اب اس کے لیے کوئی جائے قرار ہی باقی نہیں ہے۔ پرندے اس کو اچک لیں گے یعنی خواہشات نفسانیہ اور اوہام و خرافات ہر طرف سے اسے اپنی طرف کھینچیں گے۔ چونکہ اس کے ہاتھ میں مضبوط رسی نہ ہوگی اس لیے وہ ہر طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ کبھی ایک طرف گرے گا اور کبھی دوسری طرف کیونکہ اس کے پاؤں کے نیچے مضبوط بنیاد نہ ہوگی۔

اب بات آگے بڑھتی ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی حرمتوں کا احترام کرو اور ان سے تعرض نہ کرو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو' شعائر اللہ کیا ہیں۔ وہ جانور جو حج کے موقع پر ذبح ہوں گے' ان کی تعظیم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ موٹے تازے ہوں اور قیمتی ہوں۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

"یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ تمہیں ایک وقت مقرر تک ان (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے' پھر ان (کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے"۔

یہاں حاجیوں کی قربانیوں اور دلوں کے تقویٰ کے درمیان تعلق بتایا گیا ہے کہ حج کے تمام شعائر' تمام مناسک اور تمام حرکات سے بڑا مقصد دلوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کرنا ہے۔ بذات خود یہ مناسک اور شعائر کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز وہ غرض و غایت ہے جو ان سے حاصل کرنا مطلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے پیدا کیا جائے۔ ان شعائر اور مناسک کے اندر وہ یادیں ہیں جن کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد کے زمانے سے ہے اور ان کا اصل مقصد اطاعت الٰہی ہے' توجہ الی اللہ ہے۔ اور جب سے یہ امت پیدا کی گئی اس میں اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے دو ہی راستے ہیں: ایک دعا' اور دوسرا نماز۔

یہ مویشی جن کے احترام کی بات ہو رہی ہے' ان کو ایام احرام کے آخر میں ذبح کیا جاتا ہے' اس عرصہ میں ان کے مالک کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان سے نفع اٹھائے۔ اگر اس کو ضرورت ہو تو وہ ان پر سوار بھی ہو سکتا ہے اور اگر ان کے دودھ کی ضرورت ہو تو دودھ بھی استعمال کر سکتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے محل تک پہنچ جائیں۔ اور ان کا مقام بیت عتیق ہے یعنی خانہ کعبہ۔ یہاں پھر ان کو ذبح کیا جائے گا تاکہ لوگ خود بھی کھائیں اور محتاجوں اور فقیروں کو بھی دیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں مسلمان قربانی کے جانور اچھے سے اچھا تلاش کرتے تھے۔ موٹا تازہ اور قیمتی' اس کو وہ تعظیم شعائر اللہ کا حصہ سمجھتے تھے اور خدا خوفی کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بہترین اونٹنی کو قربانی کے لیے خریدا اور تین سو درہم قیمت ادا کی۔ اس نے کہا حضورؐ میں نے ہدی کی خاطر ایک اونٹنی تین صد روپے میں خریدی ہے تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اسے فروخت کر کے اس کی جگہ اور اونٹنیاں خریدوں؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں اسی کو ذبح کرو۔ حضرت عمرؓ زیادہ قیمتی اونٹنی کو فروخت کر کے رقم جیب میں رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسے فروخت کر دیں اور اس کی جگہ اس رقم سے زیادہ جانور خرید کر ذبح کر دیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو پسند کیا کہ آپ اسی نفیس اور قیمتی اونٹنی کو قربانی کر دیں۔ اور اس کو فروخت کر کے زیادہ اونٹنیاں یا گائے نہ خریدیں۔ اگرچہ اس صورت میں گوشت زیادہ ہو جاتا لیکن شعوری زاویہ سے اور خدا کی راہ میں اچھا مال دینے کے لحاظ سے یہ زیادہ بھاری تھا اور شعوری قیمت کی زیادہ اہمیت ہے۔

فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْب (۲۲: ۳۲) "کیونکہ اس کا تعلق دلوں کے خوف سے ہے"۔ یہ تھا مفہوم اسی بات کا جو حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے کہی کہ اسے تبدیل نہ کرو اور اسی کو ذبح کرو۔

یہ مناسک اور شعائر جن کے احترام کا حکم دیا جاتا ہے' قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تمام اقوام کے ہاں رائج ہیں لیکن اسلام جن شعائر کی قدر کرتا ہے' انہیں بحال رکھتا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیتا ہے ان کا رخ اسلام نے خدا کی طرف موڑ دیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

"ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ (اس امت کے) لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ (ان مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اسی کے تم مطیع فرمان بنو۔ اور اے نبیؐ' بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو' جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں' جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

اسلامی نظام زندگی کی پالیسی یہ ہے کہ وہ انسان کے احساسات اور اس کے رجحانات کو اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی اسکیم یہ ہے کہ شعور' عمل' سرگرمی' عبادت' ہر حرکت اور ہر عادت کو ایک نئی سمت دی جائے اور ہر چیز کو اسلامی نظریہ حیات کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ اس نقطہ نظر سے اسلام نے ان مذبوحہ جانوروں کو حرام قرار دے دیا ہے جن پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور یہ لازم کر دیا کہ ذبیحوں پر اللہ کا نام لیا جائے بلکہ عین ذبح کے وقت اونچی آواز سے اللہ اکبر کہا جائے گویا جانور ذبح ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس طرح اللہ کا نام لیا جائے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ

(۲۲ : ۳٤) "ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ اس امت کے لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں"۔

اس کے بعد عقیدۂ توحید کی تصریح آتی ہے۔

فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (۲۲ : ۳٤) "(مقصد صرف یہ ہے) کہ تمہارا ایک ہی خدا ہے"۔ جب خدا ایک ہے تو ہر معاملہ میں اطاعت بھی اسی ایک کی ہونی چاہیے۔

فَلَهُ أَسْلِمُوا (۲۲ ۳٤) "پس اس کے مطیع فرمان بنو"۔ یہ اطاعت جبر کی اطاعت نہیں ہے اور نہ اسلام میں کوئی جبر ہے بلکہ دل کی آمادگی سے سر تسلیم خم کرنا مقصود ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ (۲۲ ۳٤) الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (۲۲ : ۳۵)

"اے نبیؐ' بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو' جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ

اٹھتے ہیں"۔ محض اللہ کا نام سنتے ہی ان کے شعور اور ان کے ضمیر میں اللہ کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کانپ اٹھتے ہیں۔

وَ الصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَآ اَصَابَهُمْ (۲۲:۳۵) "جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں"۔ لہٰذا اللہ ان کے بارے میں جو فیصلہ کرے ان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

وَ الْمُقِیْمِی الصَّلٰوةِ (۲۲:۳۵) "اور نماز قائم کرتے ہیں"۔ اور اللہ کی عبادت اس طرح کرتے ہیں جس طرح عبادت کرنے کا حق ہوتا ہے۔

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲۲:۳۵) "اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ وہ اپنے مال میں اللہ کے مقابلے میں بخل نہیں کرتے۔

یوں عقیدے، نظریات اور دین کے بنیادی شعائر کے اندر ربط پیدا کر کے ذات باری کو ہر چیز کا محور بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اسلامی نظام کا یہ جزء خصوصاً عبادات اس کے عقائد و نظریات کا مظہر اور رمز بن جاتی ہیں۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی پوری زندگی میں اس کے عقیدے کا رنگ ہو، اس طرح ان کی قوت عمل اور ان کی سمت کے درمیان کوئی تضاد نہ ہو اور نفس انسانی شعور انسانی اور عمل انسانی کے درمیان کوئی تضاد اور کوئی کشمکش نہ ہو۔

اب سیاق کلام ذرا مزید آگے جاتا ہے۔ اور اس مفہوم کو مزید تاکیدی انداز میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ محض کھانے پینے کے لیے ذبح کیے جانے والے جانوروں کے اس شعار اور عمل میں بھی اصل روح وہی ہے۔

وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ ۖۗ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۳۷﴾

اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے، پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔ نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس نے ان کو تمہارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔ اور اے نبی، بشارت

دے دے نیکو کار لوگوں کو"۔

یہاں قربانی کے جانوروں میں سے صرف اونٹ کا ذکر کیا جاتا ہے' اس لیے کہ یہ سب سے بڑا ہوتا ہے ۔ اس کا قربانی میں ذبح کیا جانا تمہارے لیے مفید ہے ۔ جب زندہ ہو تب بھی مفید ہے کہ تم اس پر سوار ہوتے ہو اور اس کا دودھ دوہتے ہو اور جب ذبح کر دیا جائے تو بھی تم گوشت کھاتے ہو' لہٰذا اس "خیر" کو ذبح کرتے وقت تمہارا فرض بنتا ہے کہ اس پر اللہ کا نام لو ۔ جب اسے ذبح کے لیے تیار کیا جا رہا ہو تو بھی اس پر اللہ کا نام لو' جب وہ صف کی شکل میں کھڑے ہوں۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (۲۲:۳۶) "پس ان پر اللہ کا نام لو جب وہ صف میں ہوں"۔ اونٹوں کو اس طرح ذبح کیا جاتا ہے کہ وہ تین پاؤں پر کھڑے ہوں اور ایک پاؤں باندھا ہوا ہو ۔ اور جب وہ ذبح کے بعد گر جائیں اور ان کی پیٹھ زمین پر ٹک جائے تو پھر تم ان سے کھانا چاہو تو کھاؤ اور ان کا گوشت اس فقیر کو بھی کھلاؤ جو سوال نہیں کرتا اور اس کو بھی کھلاؤ جو سوال کرتا ہے ۔ اسی لیے اللہ نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ لوگ اس "خیر" پر خدا کا شکر ادا کریں جو ان میں لوگوں کے لیے ہے ۔ زندگی میں بھی اور ذبح ہونے کے بعد بھی۔

كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۲۲:۳۶) "ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو"۔

تمہیں جو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرو تو اس کا مقصد ہے لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا (۲۲:۳۷) "نہ ان کا گوشت اللہ کو پہنچتا ہے نہ خون"۔ خون اور گوشت تو اللہ تک نہیں پہنچتا' نہ اللہ کو ضرورت ہے' اللہ کو مطلوب جذبہ خدا خوفی ہے ۔ اس لیے مشرکین مکہ کی یہ حرکت کہ وہ جانوروں کو ذبح کر کے خون لے جا کر بتوں پر ملتے تھے محض ایک سوقیانہ حرکت ہے ۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے ۔

كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ (۲۲:۳۷) "اس نے ان کو تمہارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی تکبیر کرو"۔ اس نے تمہیں عقیدہ توحید کی ہدایت کی ہے ۔ اس کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت کی ہے' اللہ اور بندے کے درمیان حقیقی تعلق کے قیام کی ہدایت کی ہے اور اپنے اعمال کو صحیح سمت دینے کی ہدایت کی ہے ۔

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ (۲۲:۳۷) "اور بشارت دے نیکو کاروں کو"۔ جن کا تصور بھی حسین ہے' جن کا شعور بھی حسین ہے' جن کی عبادت بھی پر احسان ہے اور اللہ کے ساتھ جن کا ربط بھی خدا خوفی کا ہے ۔

یوں ایک مسلم کا ہر قدم' اس کی ہر حرکت اور اس کی ہر سوچ ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس میں ذات باری کو پیش نظر رکھتا ہے اس میں اس کا دل خوف خدا سے لبالب ہوتا ہے اور وہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا طلبگار ہوتا ہے ۔ غرض اس کی پوری زندگی اس مقصد کو پورا کر رہی ہوتی ہے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے اور دنیا میں بھی اس کی زندگی صحت مند اور مفید اور اس کی غایت کی شاخیں آسمانوں پر ہوتی ہیں ۔

اسلام کے یہ شعائر اور مناسک مقرر ہیں۔ عبادات اور عبادات کے مقامات متعین کیے گئے ہیں اور ان کا احترام ضروری قرار دیا گیا ہے' اس لیے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو ان شعائر کا احترام قائم کرے' آزادی فکر و نظر کے حق کو قائم کرے اور ہر شخص کے لیے ایسے مواقع پیدا کرے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق اللہ کی پرستش کر سکے۔ نیز مقامات عبادات کے تقدس کو بھی قائم رکھ سکے۔ نیز یہ ممکن بنایا جا سکے کہ مومنین' عابدین اور عمل صالح کرنے والے نیک لوگ اپنے نظریہ حیات کے مطابق نظام زندگی قائم کر سکیں جس کا ایک طرف سے رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہو اور دوسری جانب سے وہ نظام اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے موجب خیر و برکت ہو۔ غرض دنیا و آخرت کی بھلائی کا ضامن ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اب اللہ کی راہ میں ہتھیار اٹھا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنی ملت کی مدافعت کر سکیں' اپنے نظریہ اور عقیدہ کی مدافعت کر سکیں' اگر کوئی دشمن ان کے علاقے پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع کر سکیں کیونکہ مسلمانوں پر ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اس قتال کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے بشمول اہل اسلام عقائد و نظریات کی آزادی قائم ہو سکے۔ اللہ کے دین کے نظام کے اندر' اللہ کی نصرت کا وعدہ حقیقت کا روپ اختیار کر سکے اور وہ دین اسلام اور نظام اسلام کے وہ فرائض ادا کر سکیں جن کا ذکر ذیل کی آیات میں آیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾

"یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا۔ اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔

اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوۃ دیں گے 'نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔

اس کرۂ ارض پر شر کی قوتیں ہروقت کام کرتی ہیں۔ خیرو شر اور ہدایت وضلالت کے درمیان معرکہ ہروقت برپا رہتا ہے۔ اور یہ معرکہ اس وقت سے قائم ہے جب سے اللہ نے اس کرۂ ارض پر انسان کو پیدا کر کے بھیجا ہے۔

شر ہمیشہ سرکش ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ قوت اور اسلحہ سے لیس ہوتا ہے۔ شر کی گرفت بے رحمانہ ہوتی ہے اور اس کی مار بے ترسی سے ہوتی ہے۔ اگر اللہ کے کچھ بندوں کو راہ ہدایت معلوم ہو جائے تو وہ ان کی راہ روکتا ہے اور ان کو حق سے دور ہٹاتا ہے 'اگر کسی کا دل حق کے لیے کھل جائے۔ لہذا ضروری ہے کہ ایمان 'حق اور بھلائی کی پشت پر بھی قوت ہو' تاکہ باطل کی پکڑ' سرکشی' فتنے اور زیادتی سے اسے روکا جاسکے۔ اور حق کو دشمنوں اور فتنوں سے بچایا جائے۔

اللہ کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ایمان 'بھلائی اور سچائی کو اس طرح کمزور چھوڑ دیا جائے کہ وہ میدان میں باطل کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں اہل حق کے دلوں میں پائی جانے والی قوت ایمانی پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے اور انسانی فطرت اور انسانی ضمیر میں حق کے ولولہ سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر باطل قوتوں کے مقابلے میں حق کی کوئی قوت نہ ہو تو اہل حق اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ان کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ اہل حق کی فطرت کو بھی بگاڑا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مصائب برداشت کرنے کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے اور ایک حد پر جاکر انسانی قوتیں جواب دے دیتی ہیں۔ اللہ لوگوں کے قلوب ونفوس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ اہل ایمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزمائش میں ڈال دیا جائے۔ ہاں اس حد تک قوت کے استعمال سے روکا جاسکتا ہے کہ جب وہ مقابلے کی تیاری کر رہے ہوں۔ دفاع کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور وسائل جہاد جمع کیے جا رہے ہوں جب وہ یہ کام کر چکیں تو پھر ان کو قتال کی اجازت ہے تاکہ وہ اہل کفر کی دست درازیوں کا رد کر سکیں۔

اذن قتال دینے سے قبل اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ خود اہل ایمان کی طرف سے دفاع کرتے ہیں اور یہ کہ اللہ ان کی نصرت اور تعاون پر قدرت رکھتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲۲ : ۳۸) "یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں"۔ اللہ اہل ایمان کے دشمنوں کو پسند نہیں کرتا کیونکہ انہوں نے حق کا انکار کیا ہے اور وہ خائن بھی ہیں۔ لہذا یقیناً اللہ ان کو رسوا کر کے رہے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (۲۲ : ۳۸) "بے شک اللہ کسی خائن اور کفران نعمت کرنے والے کو پسند نہیں کرتا"۔ اللہ نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ اہل ایمان کو اپنے دفاع کا پورا پورا حق پہنچتا ہے' ان کا موقف درست ہے' آداب جنگ کے اعتبار سے بھی کیونکہ وہ مظلوم ہیں' وہ جارحیت کے مرتکب ہرگز نہیں ہوئے اور نہ ہی وہ سرکشی کرنے والے ہیں۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا (۲۲ : ۳۹) "اجازت دے دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے

خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں"۔ ان کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اس حمایت پر مطمئن ہو جائیں۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ (۲۲ : ۳۹) "اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے"۔ ان کو اس معرکہ آرائی کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ پوری انسانیت کے لیے اس عظیم مہم میں کود رہے ہیں، اس مہم کے نتائج صرف انہی کے لیے مفید نہ ہوں گے، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے مفید ہوں گے کیونکہ اس کے نتیجے میں ایمان اور نظریات کی آزادی کے بنیادی حقوق قائم ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی جواز فراہم کرتی ہے کہ ان کو اپنے گھروں اور اپنے ملک سے بغیر کسی جواز کے نکالا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (۲۲ : ۴۰) "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے"۔ حالانکہ یہ بہت ہی سچی بات تھی جو کبھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ اس بات کی نہایت ہی مستحق تھی کہ اسے بار بار دہرایا جائے۔ جب اس بات کی وجہ سے ان لوگوں کا اخراج عمل میں آیا تو یہ کھلی سرکشی اور ظلم تھا اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جبکہ مظلوموں کی جانب سے کوئی ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ نہ تھی، محض ان کا نظریہ ہی تھا جس کی وجہ سے ان کو نکال دیا گیا۔ اس کشمکش میں اس دنیا کے مفادات میں سے بھی کسی مفاد کا دخل نہ تھا کہ کوئی مفادات، خواہشات یا کسی طمع و لالچ کا بہانہ کر سکے۔ یا ہمدردیوں اور کسی اور ذاتی پسند و ناپسند کا بہانہ بنایا جا سکے۔ یہ صرف نظریاتی جنگ تھی۔

پھر یہ بھی ایک عمومی اصول ہے کہ کسی بھی نظریہ کے لیے قوت مدافعت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲ : ۴۰) "اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں"۔ صومعہ عبادت کی اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں راہب عبادت کرتے ہیں۔ بیع نصاریٰ کی عبادت گاہ ہے۔ یہ صومعہ سے زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ صلوت یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔ مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہوتی ہیں۔

اگرچہ یہ مقامات اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص اور مقدس ہیں لیکن یہ سب مسمار ہو سکتے ہیں اگر ان کی پشت پر قوت مدافعت نہ ہو۔ اہل باطل کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان مقامات پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے بلکہ ان مقامات کی حمایت اور ان کا بچاؤ تب ہی ہو سکتا ہے کہ کسی عقیدے کے حامی اس کی پشت پر ہوں اور ان کے اندر قوت مدافعت بھی ہو۔ اور وہ اپنے عقیدہ کے احترام کو بزور قوت دشمن سے منوا بھی سکتے ہوں۔ باطل تو سرکش ہوتا ہے وہ تب ہی رکتا ہے جب اس جیسی قوت اس کے مقابل کے پاس بھی ہو جس پر باطل حملہ آور ہو رہا ہے۔ محض اس لیے کہ حق 'حق' ہے۔ باطل حملہ آور ہونے سے نہ رکے گا۔ لہٰذا حق کی پشت پر بھی ایک مساوی بلکہ برتر قوت ہونی چاہئے جو اس کا دفاع کر

سکے ۔ یہ ایک کلی قاعدہ ہے جب تک انسان ہے ایسا ہی ہو گا۔

یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان نصوص قرآنیہ پر غور کریں جن کے الفاظ تو بہت کم ہیں لیکن ان کے معانی بہت ہی وسیع ہیں ۔ یہ نصوص انسانی نفس انسانی ' زندگی اور انسانی زندگی کے واقعات کے اہم رازوں پر مشتمل ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قتال کی اجازت دے رہے ہیں جن کے ساتھ مشرکین نے جنگ کی اور ان پر دست درازیاں کیں ۔ یہ اس لیے کہ اللہ اہل ایمان سے مدافعت کی ذمہ داری لیتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ خیانت گر اہل کفر اہل اسلام پر دست درازیاں کریں ۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (۲۲:۳۸)

"اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لاتے ہیں یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا"۔ اللہ نے مسلمانوں کو یہ ضمانت دے دی کہ وہ ان کی جانب سے مدافعت کرے گا اور جس کی مدافعت اللہ کرے تو یہ بات یقینی ہے کہ دشمن اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ اپنے دشمن پر غالب ہو گا' تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ پھر ان کو قتال کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ پھر جہاد کیوں فرض کیا گیا ہے؟ پھر وہ کیوں لڑتے ہیں جس میں وہ قتل بھی ہوتے ہیں ' زخمی بھی ہوتے ہیں اور ان کو جدوجہد اور مشقتیں بھی کرنی ہوتی ہیں اور مشکلات برداشت کرنی پڑتی ہیں اور قربانیاں بھی دینی ہوتی ہیں اور نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب ہوتے ہیں حالانکہ اللہ بغیر ان کی جدوجہد کے بھی اور بغیر کسی مشقت اور قربانی کے بھی اور بغیر کسی قتل و قتال کے بھی ان کی جانب سے مدافعت کر سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی حکمت اس باب میں بہت ہی گہری اور بہت ہی دور رس ہے ۔ اللہ کی حجت اصل مقام تک پہنچنے والی ہے اور بہت ہی اونچی ہوتی ہے لیکن ہم جس قدر سمجھ سکے ہیں اور جس قدر ہماری عقلوں میں سمجھنے کی صلاحیت ہے اور جس قدر ہمارے تجربات ہیں' ان کے مطابق جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ میری دعوت کے حاملین سست اور کاہل رہیں اور وہ نہایت ہی سستی سے بیٹھے رہیں ۔ اور ان پر اللہ کی نصرت آجائے اور وہ شہزادوں کی طرح بیٹھے ہوں۔ محض اس لیے کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں ۔ کیونکہ یہ کام جو سب کے سب ضروری ہیں ان کو اس قابل نہیں بناتے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کی حمایت کریں اور اس کی جانب سے دفاع کریں ۔ نماز' عبادت' اور دعاء تو ایک سپاہی کے لیے زادراہ ہیں اور جنگ میں یہ اخلاقی قوت کا کام دیتے ہیں' اہل ایمان کے پاس یہ مزید اسلحہ ہے جو دشمن کے پاس نہیں ہے۔ دشمن کے پاس جو روایتی اسلحہ ہے وہ مسلمان کے پاس بھی ہے اور تقویٰ ہے اور اتصال باللہ اس پر مزید ہے۔

اللہ کی مشیت یہ ہے کہ مسلمانوں اور اہل ایمان کا دفاع وہ خود مسلمانوں اور اہل ایمان کے ذریعہ سے کرے تاکہ معرکہ آرائی کے دوران مسلمان پختہ ہو جائیں ۔ اس لیے کہ انسانی شخصیت کے اندر موجود خفیہ قوتیں تب ہی بیدار ہوتی ہیں' جب انسان کو خطرہ درپیش ہو' اور انسان اپنی مدافعت کر رہا ہو ۔ مقابلے اور جنگ میں انسان اپنی پوری قوت لے کر دشمن کے مقابلے میں نکل آتا ہے ۔ ایسے حالات میں انسانی قوت کا ہر ہر خلیہ متحرک اور تیار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کرے ۔ دوسرے خلیوں کے ساتھ تعاون کرے اور مشترکہ کارروائیاں کرے ۔ جس قدر قوت کی فراہمی اس سے ممکن ہو' وہ فراہم

کرے۔ غرض وہ اپنی قوت کا آخری ذرہ بھی نکال دے اور انسان اس مقام تک پہنچ جائے جو اس کے لیے مقدر ہوتا ہے۔

جو جماعت دعوت اسلامی کو لے کر اٹھتی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوت کا ہر خلیہ اپنی قوت کا پورا ذخیرہ' اپنی صلاحیتوں کا پورا جوہر' اپنی تمام طاقتوں کو جمع کرتے ہوئے اس راہ پر لگا دے تاکہ خود اس کی تربیت اور ترقی مکمل ہو سکے' وہ پختہ ہو سکے' اور اس طرح وہ اس امانت کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہو سکے جو اس پر ڈالا گیا ہے۔

وہ نصرت اور کامرانی جس میں فتح یاب ہونے والے نے کوئی تکلیف نہ اٹھائی ہو' اور جو کامیابی بڑی آسانی اور بغیر کانٹا چبھے حاصل ہو جائے' اس کے نتیجے میں خود انسانی کارکنوں کی یہ حقیر صلاحیتیں نہیں ابھرتیں کیونکہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محرک نہیں ہوتا' مقابلہ اصل محرک ہوتا ہے۔

نیز جو کامیابی بڑے آرام سے اور بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے' وہ اسی طرح آسانی سے ناکامی میں بدل جاتی ہے اور ضائع ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ مفت میں ہوتی ہے اور کامیاب ہونے والے نے اس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی ہوتی' اس لیے اس کی نظروں میں اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ پھر جن لوگوں کو یہ بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے ان صلاحیتوں کو اس کے دماغ کا تجربہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کی خفیہ قوتیں جب اس کے حصول کے لیے بیدار نہیں ہوتیں تو اس کے دفاع کے لیے کیسے بیدار ہوں گی۔ لہٰذا ان کے لیے دفاع ممکن ہی نہیں رہتا۔

یہ عملی اور یہ وجدانی تربیت انسان کو تب حاصل ہوتی ہے کہ اسے فتح بھی ہوئی ہو اور ہزیمت بھی اٹھانی پڑی ہو۔ اس کا کروفر بھی دیکھا ہو' قوت اور ضعف بھی دیکھا ہو' اقدام اور پسپائی دونوں دیکھی ہوں اور دونوں کی خوشی اور کڑوا پن چکھا ہو۔ امید و بیم' خوشی اور غم' اطمینان اور قلق' ضعف کا احساس اور قوت کا شعور یہ سب کچھ اس نے میدان جنگ میں دیکھا ہو۔

نیز اس نے نظریات کا اتحاد اور نظریاتی انتشار بھی دیکھا ہو۔ مختلف رجحانات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا تجربہ رہ کر چکا ہو۔ جماعت کے اندر قوت کے مراکز اور ضعف کے مقامات سے وہ باخبر ہو اور ہر قسم کے حالات میں معاملات کی تدبیر کو وہ جانتا ہو۔ یہ تمام مراحل اس جماعت اور گروہ کے لیے ضروری ہیں جس نے دعوت اسلامی کو لے کر چلنا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی عملاً معرکے میں نہ اترے۔

اس وجہ سے اور اس کے علاوہ مزید خفیہ حکمتوں کی وجہ سے جنہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے' اللہ نے یہ طے کیا کہ وہ مسلمانوں کا دفاع خود مسلمانوں کے ذریعے کرے اور ایسا نہیں فرمایا کہ یہ ایک لقمہ تر ہو گا جو ان کے لیے آسمانوں سے پکا پکایا اتر جائے۔

بعض اوقات ایسے مظلوموں پر نصرت کا نزول دیر کر دیتا ہے جن کو اپنے گھروں سے نکال دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم محض اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے رب کو ایک سمجھتے ہیں۔ صرف اللہ کو رب سمجھتے ہیں لیکن اس میں اللہ کی گہری حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

بعض اوقات نصرت لیٹ ہو جاتی ہے کیونکہ دعوت اسلامی کے حاملین ابھی پختہ نہیں ہوئے ہوتے اور ان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ان کی قوتیں مجتمع نہیں ہوتیں۔ اسلامی عناصر نے اپنی قوتوں کے تمام ذخائر کو میدان میں نہیں اتارا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایسی ناپختگی کی حالت میں اللہ کی نصرت آجائے تو وہ جلد ہی اسے کھو دیں گی۔

بعض اوقات نصرت اس لیے بھی دیر کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے کہ مومن اپنی پوری قوت اس راہ میں جھونک دیں۔اپنا آخری سرمایہ اور قوت نچوڑ کر ختم کر دیں اور کوئی چیز ذخیرہ کر کے نہ رکھیں اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں۔جب تک انہوں نے ایسا نہیں کیا ہوتا'نصرت نہیں آتی۔

بعض اوقات اس لیے بھی نصرت نہیں آتی کہ اللہ اہل ایمان کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے تمام حربے آزمالیں اور ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ نصرت صرف ان کی قوتوں کی وجہ ہی سے نہیں آتی بلکہ اللہ کی نصرت تب آتی ہے جب اہل ایمان اپنی قوت 'اپنی دولت اور اپنی صلاحیتوں کا آخری ذخیرہ بھی ختم کر دیں اور ان کے سامنے صرف اللہ کی مدد کا ذخیرہ رہ جائے تب مدد آپہنچتی ہے۔

بعض اوقات اللہ کی نصرت اس لیے بھی مؤخر ہو جاتی ہے کہ امت مومنہ کا تعلق باللہ معیار مطلوب تک پہنچ جائے' اسے مشکلات پیش آئیں اور وہ برداشت کرے 'اسے المناک نتائج سے دوچار ہونا پڑے اور وہ صبر کرے اور اسے اپنی پوری قوتیں صرف کرنے کا موقع ملے۔اور حالت یہ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی اور سہارا نہ رہے اور اللہ کے سوا توجہات مرکوز کرنے کا اور کوئی نکتہ نہ رہے۔یہی تعلق باللہ پھر اس بات کی بھی ضمانت ہوتا ہے کہ نصرت آنے اور فتح پانے کے بعد امت سیدھی راہ پر گامزن رہتی ہے۔وہ پھر اپنی راہ نہیں چھوڑتی۔وہ سچائی' عدل اور بھلائی کا راستہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی جس کی وجہ سے اسے فتح نصیب ہوتی ہے۔

بعض اوقات اللہ کی نصرت اس لیے بھی نہیں آتی کہ امت اپنی جدوجہد' اپنے انفاق اور اپنی قربانیوں میں خالص رضائے الہی کے لیے کام نہیں کرتی۔اس کی جنگ مفادات کے لیے ہوتی ہے'یا وہ ذاتی رنجش کی وجہ سے لڑتی ہے'یا اس کی جدوجہد میں دکھاوا ہوتا ہے'حالانکہ اللہ کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد صرف اللہ کے لیے ہو'صرف اللہ کے راستے میں ہو۔اس کے ساتھ کوئی اور سوچ وابستہ نہ ہو'کارکنوں کے شعور اور لاشعور میں رضائے الہی کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کسی حمیت کی وجہ سے لڑتا ہے یا شجاعت کی وجہ سے لڑتا ہے یا شخصیت کے اظہار کے لئے لڑتا ہے تو ان میں سے کون سی جنگ فی سبیل اللہ ہے تو حضورؐ نے فرمایا۔

من قاتل لتکون کلمة الله هي العليا "جس نے اس لیے جنگ کی کہ اللہ کا کلما بلند ہو تو صرف یہ فی سبیل اللہ ہے"۔بعض اوقات اسلامی عناصر کو اس لیے بھی کامیابی نہیں ہوتی کہ جس شر کے مقابلے میں امت کام کر رہی ہوتی اس میں خیر کا کوئی پہلو ہوتا ہے۔اللہ اس شر کو مہلت دیئے جاتا ہے تاکہ شر کو اس خیر سے تہی دامن کر دے تاکہ اگر ہلاکت آئے تو خالص شر پر آئے اور اس میں خیر کا کوئی پہلو نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ شر کے ساتھ خیر کا ایک ذرہ بھی ضائع ہو جائے۔

بعض اوقات اللہ کی نصرت اس لیے بھی نہیں آتی کہ جس باطل کے خلاف امت مسلمہ اور جماعت مومنہ برسرپیکار ہوتی ہے اس کا کھوٹ عوام الناس کی نظروں میں آشکار اور پوری طرح واضح نہیں ہوا ہوتا۔ایسے حالات میں اگر شر کو شکست دے دی جائے تو شر کو بھی معاشرے میں سے بعض ایسے لوگ حامی و مددگار مل جائیں گے جنہوں نے ابھی تک شر کے کھوٹ کو سمجھا نہیں ہوتا۔اور وہ اس کے فساد' زوال کو سمجھے ہی نہیں ہوتے اور اس پر مطمئن نہیں ہوتے لہذا اس شر کی

بعض جڑیں نیک لوگوں کے ذہنوں میں بھی ہوتی ہیں' جو حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ باطل کو ایک عرصہ تک بر سر اقتدار رکھتا ہے تاکہ تمام لوگوں کے ذہن صاف ہو جائیں اور جب وہ نیست و نابود ہو جائے تو اس پر رونے والی ایک آنکھ بھی معاشرے میں موجود نہ ہو۔

بعض اوقات نصرت میں دیر اس لیے بھی ہوتی ہے کہ معاشرہ ابھی تک قبول حق کے لیے ہی تیار نہیں ہوتا اور سچائی کو اٹھانے کے اہل بھی نہیں ہوتا۔ جس کی حامل اور داعی جماعت مومنہ ہوتی ہے۔ اگر ایسے حالات میں حق کو نصرت بھی مل جائے تو بھی اسے قرار نصیب نہیں ہوتا اور خود معاشرہ کے اندر سے ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی مشیت ہوتی ہے کہ کچھ مزید عرصے کے لیے حق و باطل کی کشمکش جاری رہے تاکہ معاشرہ سچائی کے استقبال کے لیے تیار ہو جائے۔

یہ وجوہات ہو سکتی ہیں اور ان کے علاوہ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن کو صرف اللہ جانتا ہے۔ کبھی کبھار 'نصرت الٰہی میں دیر لگ جاتی ہے۔ کارکنوں کو زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں' ان پر مصائب بڑھ جاتے ہیں' لیکن آخر کار فتح و نصرت جماعت مومنہ کے لیے ہوتی ہے اور جدوجہد کے زمانے میں اللہ کی ضمانت دفاع بہرحال اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حصول نصرت کی کچھ شرائط ہیں۔ کچھ تقاضے ہیں جو پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کی ایک قیمت ہے جو ادا کرنی ہوتی ہے۔ اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں جو فراہم کرنے پڑتے ہیں اور اس کے لیے ایک مخصوص فضا ہوتی ہے جو پیدا کرنا پڑتی ہے (یاد رہے کہ یہ محض من اور سلویٰ نہیں ہے)۔

وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (٤٠) اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (٢٢ : ٤١) "اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے' اللہ بڑا طاقتور ہے اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ دیں' نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ کا تاکیدی وعدہ ہے' نہایت ہی بار وثوق وعدہ ہے' اٹل قاعدہ ہے کہ جو اس کی نصرت کرے گا تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا لیکن یہ سوالیہ نشان اپنی جگہ ضرور ہے کہ اللہ کن لوگوں کی نصرت کرتا ہے' تاکہ ان کو نصرت کا مستحق سمجھا جائے۔ کیونکہ اللہ تو قوی ہے' عزیز ہے' اس کے متوالے تو کبھی شکست نہیں کھاتے تو وہ کون ہیں؟ وہ یہ ہیں؟

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (٢٢ : ٤١) "یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم اقتدار دے بخشیں"۔ نصرت آ جائے اور ان کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو جائے تو اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (٢٢ : ٤١) "نماز قائم کریں گے"۔ اللہ کی بندگی کریں گے اور اللہ کی طرف نہایت ہی مطیع فرمان ہو کر' عاجز ہو کر' سر تسلیم خم کرتے ہوئے رجوع کریں گے'

وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (٢٢ : ٤١) "زکوٰۃ دیں گے"۔ مال کا حق ادا کریں گے۔ نفس کی فطری کنجوسی پر قابو پائیں گے۔ اسے حرص و آز سے پاک کریں گے' شیطان کے وسوسوں پر غلبہ پائیں گے' جماعت اور سوسائٹی کے اندر

پائے جانے والے رخنے دور کریں گے۔ ضعیفوں اور محتاجوں کا حق ادا کریں گے' ان کو ایک زندہ جسم کے حقوق دیں گے جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا "مومن باہم محبت' باہم ہمدردی' باہم رحم وکرم میں جسد واحد کی طرح ہوتے ہیں 'اگر جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہو تو پورا جسم بے چین ہوتا ہے اور تمام جسم بے خوابی کا شکار ہوتا ہے۔

وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ (۲۲:۴۱) "نیکی کا حکم دیں گے"۔ وہ نیکی اور اصلاح کے داعی بھی ہوں گے۔ لوگوں کو زبردستی بھی نیکی پر آمادہ کریں گے۔

وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲:۴۱) "اور وہ برائی سے منع کریں گے"۔ شر و فساد کا مقابلہ کریں گے۔ وہ امت مسلمہ کا یہ نشان بحال کریں گے کہ وہ منکر کو برداشت نہیں کرتی اور اگر وہ اسے دفع کر سکتی ہو تو دفع کرتی ہے اور اگر وہ معروف قائم کر سکتی ہے تو قائم کرے گی۔

ایسے لوگ اللہ کی نصرت کے مستحق ہوتے ہیں جو اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے پوری جدوجہد کریں۔ صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہوں' کسی اور پر نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کی مدد ہوگی۔

لہذا اللہ کی نصرت کا وعدہ قائم ہے اسباب نصرت پر۔ نصرت کے تقاضے پورے کرنے پر۔ اس کے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنے پر' اس کے بعد بھی بات اللہ کی مرضی پر ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے اندر جس طرح چاہتا ہے' تصرفات کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ شکست کو فتح میں بدل دیتا ہے۔ اور بعض اوقات فتح کو ہزیمت میں بدل دیتا ہے۔ خصوصاً جب نصرت کے بنیادی عناصر ہیں' خلل آجائے اور لوگ ذمہ داریاں اور تقاضے پورے نہ کریں۔

وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲:۴۱) "اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے"۔ اللہ کی نصرت وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اسلامی نظام زندگی قائم ہو' حق' انصاف' آزادی اور خیر و اصلاح کا دور دورہ ہو۔ پیش نظر اعلیٰ مقاصد ہوں نہ کہ کچھ افراد۔ اشخاص' شخصیات اور ان کے ذاتی مقاصد کو پس پشت ڈال کر بلند اصولوں کو سامنے رکھنا ہوگا تب نصرت الہی حاصل ہوگی۔

بہرحال نصرت الہی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اس کی قیمت پیشگی ادا کرنا ہوتی ہے۔ اس کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ بعض شرائط لازمی ہوتی ہیں۔ یہ نصرت کسی کو مفت میں نہیں ملتی نہ اللہ کو کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے اور نصرت اس شخص کو نہیں ملتی نہ اس جماعت کو ملتی ہے جو اس کے مقاصد اور تقاضے پورے نہ کرتی ہو۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۶ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق کا خاتمہ اس پر ہوا تھا کہ نظریات 'عقائد اور ملت کے شعار کی مدافعت کے لیے جنگ کی اجازت ہے۔ جو لوگ اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے پورے کریں گے ان کو اللہ کی طرف سے پوری پوری نصرت بھی حاصل ہو گی۔ بشرطیکہ انہوں نے خود اپنی جماعت کے اندر اسلامی نظام حیات قائم کر رکھا ہو۔

جب یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کی نصرت کے استحقاق کے لیے شرائط و فرائض کیا ہیں تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ دست قدرت نے آپ ؐ کی اور آپ ؐ کے ساتھیوں کی حمایت میں کام شروع کر دیا ہے جس طرح آپ سے قبل آپ کے بھائی رسولوں کے حق میں دست قدرت نے کیا اور ہر دور میں مکذبین کو بڑی سختی سے پکڑا۔ نیز مکذبین اور مشرکین کو بھی اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا دل و دماغ کام کرتا ہے تو وہ غور و فکر کریں کیونکہ آنکھوں کا اندھا در اصل اندھا نہیں ہوتا' بلکہ حقیقی اندھا وہ ہوتا ہے جس کے سینے میں دھڑکنے والا دل اندھا ہو۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کو شیطان کی سازشوں سے بچاتا ہے۔ اس طرح وہ جھٹلانے والوں کی سازشوں سے بھی بچاتا ہے۔ نیز وہ شیطان کی مکاریوں کو باطل کر کے' اپنی آیات کو سلیم الطبع لوگوں کے ذہن نشین کرا رہا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دل مریض ہیں' یا جن کے دل کافر ہیں تو وہ اسی طرح شک میں گرفتار رہیں گے یہاں تک کہ وہ اپنے برے انجام کو دیکھ لیں۔

یہ پورا سبق دست قدرت کے آثار اور کرشموں پر مشتمل ہے۔ اللہ کا ہاتھ دعوت اسلامی کو آگے بڑھانے کے لیے متحرک ہو گیا ہے لیکن نتائج سامنے تب آئیں گے جب کہ اصحاب دعوت اپنے فرائض کو بطرز احسن پورا کریں اور وہ تقاضے پورے کریں جن کے بارے میں پہلے وضاحت کر دی گئی ہے یعنی اس سے پہلے سبق میں۔

---- ○○○----

درس نمبر ۱۴۶ تشریح آیات

۴۲--- تا--- ۵۷

وَ اِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُۙ۝ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍۙ۝ وَّ اَصْحٰبُ مَدْیَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَیْتُ لِلْكٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ۝

"اے نبی" اگر وہ (یعنی کفار) تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط اور اہل مدین بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ان سب منکرین حق کو میں نے پہلے مہلت دی پھر پکڑ لیا۔اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی"۔

تمام رسولوں کے بارے میں یہ اللہ کی اٹل سنت ہے کہ رسول معجزات لے کر آئے اور ان کی قوموں نے ان کو جھٹلایا۔اس لیے مشرکین مکہ کی طرف سے رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تکذیب کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن تمام جھٹلانے والوں کا انجام بھی تو معلوم ہے۔انجام کے لیے بھی مشرکین مکہ تیار ہو جائیں'

فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُودُ(٤٢) وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيمَ وَ قَوْمُ لُوطٍ(٢٢ : ٤٣) "اس سے پہلے قوم نوح' اور عاد و ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط نے جھٹلایا ہے"۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے علیحدہ فقرہ وکذب موسیٰ (اور موسیٰ جھٹلائے جا چکے ہیں) اس لیے کہ اس کی قوم نے انہیں نہیں جھٹلایا تھا بلکہ فرعون اور اس کے سرداروں نے جھٹلایا تھا۔دوسرے اس لیے کہ جو معجزات حضرت موسیٰ لے کر آئے تھے وہ بہت ہی واضح تھے۔نیز موسیٰ علیہ السلام کو بہت ہی بڑے واقعات پیش آئے۔ان تمام پیغمبروں کے واقعات میں اللہ نے کافروں کو ایک وقت تک مہلت دی۔جیسا کہ اب قریش کو مہلت دی جا رہی ہے اور اس کے بعد اللہ نے بڑی سختی سے ان کو پکڑا۔یہاں سوالیہ انداز مزید ڈرانے اور اظہار تعجب کے لیے ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ (۲۲ : ۴۴) "اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی"۔ نکیر کا مفہوم ہے ایسا سخت انکار جس میں تبدیلی کا شائبہ ہو۔ اس سوال کا جواب معلوم ہے کہ خوفناک عذاب تھا۔ طوفان' خسف تدمیر' ہلاکت' زلزلے' تباہی طوفان اور کڑک کی وجہ سے خوف میں مبتلا کر کے ہلاک کرنا۔

گزشتہ ہلاک شدہ اقوام پر ایک نہایت سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب گزشتہ ہلاک شدہ اقوام پر جامع تبصرہ۔

فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

"کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں' کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں"۔

ایسی ہلاک شدہ بستیاں بے شمار ہیں۔ انداز کلام ان اقوام کی ہلاکتوں کے مناظر کو ایک منظر کی صورت میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان کہتا ہے کہ وہ ہیں ہلاک شدہ بستیوں کے کھنڈرات۔ بڑے بڑے محل چھتوں کے اوپر پڑے ہیں۔ حالانکہ وہ دیواروں پر استوار تھے۔ جب گرے تو چھتیں نیچے اور تمام عمارتی ڈھانچہ ان کے اوپر۔ اس طرح یہ منظر نہایت ہی وحشتناک' دلدوز اور پر تاثیر بن جاتا ہے۔ یہ کہ یہ منظر اس کا مستحق ہے کہ اس کی سابق اور موجودہ صورت حال پر غور کیا جائے۔ کھنڈرات میں جب انسان پھرتا ہے تو وہ بہت ہی وحشتناک نظر آتے ہیں اور ان سے اگر کوئی عبرت حاصل کرنا چاہے تو عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ اور انسان میں خوف خدا پیدا ہو سکتا ہے۔

ان بڑے بڑے گاؤں کے آثار ہمارے سامنے ہیں' ان کی چھتوں پر ان کی بلڈنگیں گری ہوئی ہیں اور ان کے کنوئیں خالی پڑے ہیں۔ نہ ان پر کوئی آنے والا نظر آتا ہے اور نہ جانے والا۔ کسی وقت تو ان پر عوام کا بے حد اژدھام تھا۔ بڑی بڑی عمارات کھڑی ہیں' لیکن کوئی انسان نہیں' کوئی زندہ چیز بھی نہیں ہے' تخیل کے پردے پر صورتیں ابھرتی ہیں کہ کسی وقت تو یہاں گہما گہمی ہوگی!

ان مناظر کو دکھانے کے بعد قرآن کریم سخت تنبیہ کے ساتھ پوچھتا ہے کہ آیا مشرکین نے کبھی ان کھنڈرات پر غور نہیں کیا؟

أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ أَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

گزشتہ زمانے کی ہلاک شدہ اقوام کے کھنڈرات کا تصور ہی مفید اور عبرت آموز ہوتا ہے۔ انسان ان کو پھٹی پھٹی نظروں سے حیرانی کے ساتھ دیکھتا ہے اور یہ کھنڈرات انسان کو خاموشی کی زبان سے بہت کچھ بتاتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (۲۲: ۴۶) "کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں"؟ کہ دیکھیں اور انہیں معلوم ہو کہ کیا کیا لوگ یہاں رہ گئے ہیں۔ یہ کھنڈر ان کو خاموشی کی زبان میں بہت کچھ بتا دیں گے اور کہہ دیں گے کہ دیکھو کہ ہم دیکھنے والوں کے لیے عبرت ہیں۔

فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ (۲۲: ۴۶) "کہ ان کے دل و دماغ سمجھنے والے ہوتے"۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ ان مٹے ہوئے کھنڈرات کی پشت پر تاریخ کیا ہے۔ یہ اللہ کی کس سنت کا پتہ دے رہے ہیں، جو کبھی بدلتی نہیں ہے۔

اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (۲۲: ۴۶) "یا ان کے کان سننے والے ہوتے" تاکہ وہ ان کھنڈرات سے پوچھتے کہ ان کے باسی کہاں گئے، یہ کنویں کیوں خالی پڑے ہیں اور یہ محل کیوں برباد ہوئے۔

کیا ان لوگوں کے پاس عقل نہیں ہے؟ یہ دیکھتے ہیں لیکن کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سنتے ہیں لیکن کوئی عبرت نہیں لیتے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲: ۴۶)

"حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں"۔ یہاں دلوں کی جگہ کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے مزید تاکید کی خاطر کہ وہ سینوں میں ہیں، اور ان کے سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہیں، اگر یہ دل اندھے نہ ہوتے تو وہ نصیحت آموزی میں بڑے پرجوش ہوتے، وہ عبرت لیتے اور ان لوگوں جیسے انجام سے ڈر کر ایمان کی طرف مائل ہوتے، کیونکہ اس قسم کے کھنڈرات ان کے ارد گرد کئی مقامات پر ہیں۔

لیکن ان لوگوں کا رویہ بالکل الٹا ہے۔ عبرت لینے، ایمان لانے، عذاب الٰہی سے ڈرنے کے بجائے یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ عذاب ہم پر جلدی آجائے حالانکہ اللہ نے کسی حکمت کی وجہ سے اسے مؤخر کر دیا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

"یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے"۔ ہر زمانے میں ظالموں کا یہی انداز ہوتا ہے۔ وہ زمانہ ماضی

کے ظالموں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ پڑھتے ہیں اور ان کے انجام ان کے سامنے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے ہیں 'جس کا انجام وہ دیکھتے ہیں۔ جب ان کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ دیکھو تمہارے آباؤ اجداد اس انجام سے دوچار ہوئے تھے' یہی تم سے بھی ہو سکتا ہے تو یہ لوگ اسے مستبعد سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے جو انہیں مہلت کی ایک گھڑی دے رکھی ہے تو یہ کبر و غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سرکشی کی آخری حد پر پہنچ جاتے ہیں۔ جس بات سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور مذاق میں بھی اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ مطالبہ کرتے ہیں کہ لاؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔

وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۲۲ : ۴۷) "اللہ ہرگز وعدے کے خلاف نہ کرے گا"۔ عذاب ضرور اپنے وقت پر آئے گا' اس کی حکمت اور اس کی تقدیر اور منصوبے کے مطابق۔ لوگوں کی طرف سے تاولی کا مظاہرہ ہو رہا ہے لیکن اللہ اسے اپنے وقت پر لائے گا۔ لوگوں کا وقت کا حساب اور ہے اور اللہ کا اور ہے۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲ : ۴۷) "مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے"۔ یہ کھنڈرات اور ان میں ہلاک شدہ اقوام کو بھی اللہ نے مہلت دی تھی لیکن ان کے لیے بھی یہ مہلت مفید نہ رہی کیونکہ اللہ کی سنت کے مطابق ان کی بربادی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

۶ ع ۱۰ ۱۳

"کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظالم تھیں' میں نے ان کو پہلے مہلت دی' پھر پکڑ لیا اور سب کو واپس تو میرے ہی پاس آنا ہے"۔ تعجب ہے کہ مشرکین مکہ عذاب طلب کرتے ہیں اور اللہ کے ڈراوے کے ساتھ مذاق کرتے ہیں' محض اس لیے کہ ان کو اللہ نے مہلت دے دی ہے۔

--- ○○○ ---

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا بیان تھا جو اس نے تکذیب کرنے والوں کے لیے اس کائنات میں جاری کر رکھی ہے اور اسی کے مطابق امم سابقہ کو ہلاک کیا گیا۔ اب خطاب کا رخ رسول اللہ کی طرف جاتا ہے کہ آپ لوگوں کو بہرحال قیامت کے انجام بد سے ڈراتے ہی رہیں۔ اور صاف صاف کہہ دیں کہ میں تو نذیر مبین ہوں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ

اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۝۵۱

"اے نبی" کہہ دو کہ "لوگو' میں تو تمہارے لیے صرف وہ شخص ہوں جو (برا وقت آنے سے پہلے) صاف صاف خبردار کر دینے والا ہو' پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی' اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے وہ دوزخ کے یار ہیں"۔
یہاں قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فریضے کو صرف خبردار کرنے تک محدود کر دیتا ہے۔

اِنَّمَآ اَنَا لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۲۲: ۴۹) "میں تو صرف وہ شخص ہوں جو وقت سے پہلے خبردار کر دینے والا ہو"۔ کیونکہ حالات ایسے تھے کہ لوگ تکذیب کر رہے تھے۔ مذاق کر رہے تھے اور یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں اسے جلدی ہی لے آئیں! اس لیے بتایا گیا کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں اور جو لوگ میری بات کو مان لیں گے اور پھر ایمان کے تقاضے بھی پورے کریں یعنی وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۲: ۵۰) "نیک عمل کریں" تو ان کی جزاء یہ ہوگی کہ اللہ ان کے سابقہ گناہ معاف کر دے گا اور رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۲۲: ۵۰)۔

رزق کریم "عزت کی روزی"۔ یعنی ان کے رزق کا ایسا ذریعہ ہو گا جو باعزت ہو گا اور ذریعہ بھی صاف ہو گا۔
رہے وہ لوگ جو اللہ کی آیات کو لوگوں کے دلوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں اور عوام کو ان پر عمل پیرا ہونے سے بھی روکتے ہیں۔ اللہ کی آیات سے مراد سچائی کے دلائل اور اللہ کی شریعت ہے' تو ایسے لوگوں کو اللہ نے جہنم کا مالک بنا دیا ہے۔ یہی ملکیت اللہ نے ان کو دی ہے۔ یعنی اہل ایمان کے لیے تو رزق کریم ہے اور ان کے لیے جہنم کے مالکانہ حقوق ہیں۔
اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کو جھٹلانے والوں کی تکذیب سے بچاتے ہیں اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں کی رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کو شیطان کی سازشوں سے بھی بچاتے ہیں۔ رسول بہرحال بشر ہوتے ہیں اور انسانوں کی کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ شیطان دعوت اسلامی کے حاملین تک ان آرزوؤں اور خواہشات کی راہ سے پہنچتا ہے۔ رسول اگرچہ معصوم ہوتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں چونکہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی دعوت جلدی پھیلے' اس کو کامیابی حاصل ہو' اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوں' شیطان ایک داعی کی ان معصومانہ خواہشات کی راہ سے حملہ آور ہوتا ہے اور دعوت کو اس کے اصول اور اس کی اقدار و روایات سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے رسولوں کے کام پر نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے اس لئے وہ ان شیطانی چالوں کو باطل کر دیتا ہے' رسولوں کو بتا دیتا ہے کہ دعوت اسلامی کے اصول یہ ہیں' اس کے پیمانے یہ ہیں۔ اس طرح اللہ دعوت کے دلائل کو محکم کر دیتا ہے اور دعوت کے سلسلے میں تمام شبہات کو دور کر دیتا ہے اور اس کی قدریں اور ذرائع متعین کر دیئے جاتے ہیں۔

---ooo---

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ۭ وَاللّٰہُ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۙ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞

"اور اے نبیؐ، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے، اللہ علیم ہے اور حکیم۔ (وہ اس لیے ایسا ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں، یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔"

اس آیت کے نزول کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں اور ان کو بے شمار مفسرین نے نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ یہ سب روایات مرسل ہیں اور ان میں سے کسی کی سند صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

ان روایات میں سے جو زیادہ متصل ہے (ابن ابو حاتم کی ہے اس نے موسیٰ، ابو موسیٰ کوفی، محمد ابن اسحاق شعبی، محمد ابن فلیح، موسیٰ، عقبہ، ابن شہاب کی سند سے نقل کیا ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ جس زمانے میں سورہ نجم نازل ہوئی تو مشرکین کہتے تھے کہ اگر یہ شخص ہمارے الہوں کا ذکر اچھے الفاظ میں کرے تو ہم اس کی باتوں کا اقرار کر لیتے اور اس کے ساتھیوں کو بھی مان لیتے۔ لیکن یہ یہود و نصاریٰ پر اس طرح تنقید نہیں کرتا جس طرح ہمارے الہوں کو گالیاں دیتا ہے اور شر سے ذکر کرتا ہے۔ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ بات شاق گزرتی تھی کہ مشرکین مکہ آپ کو جھٹلاتے تھے اور آپ کے پیروکاروں کو اذیتیں دیتے تھے۔ ان لوگوں کی ضلالت پر آپ بہت ہی دل گرفتہ تھے۔ آپ کے دل میں بڑی خواہش تھی کہ یہ لوگ ہدایت قبول کر لیں۔ جب سورہ نجم نازل ہوئی تو آپ نے تلاوت کی۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰي (۱۹) وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰي (۲۰) اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰي (۲۱)(۵۳ : ۱۹ - ۲۱) تو عین اس وقت شیطان نے ان بتوں کے ذکر کے ساتھ ہی اپنی طرف سے چند کلمات ادا کیے۔ اس نے کہا:

انهن لهن الغرانيق العلي وان شفاعتهن لهي التي ترتجي یہ الفاظ شیطان نے اپنی طرف سے بطور فتنہ ملا دیے۔ یہ الفاظ مکہ کے ہر مشرک کے دل میں بیٹھ گئے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو نقل کرنا شروع کر دیا اور ایک

دوسرے کو خوشخبریاں دینے لگے۔ انہوں نے کہا کہ محمدؐ نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے اور اپنے پہلے دین اور اپنی قوم کے دین پر آگیا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سورہ نجم کی تلاوت کر کے آخر میں پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور جو مسلم اس کو سن رہے تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا اور جو مشرک سن رہے تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ ولید ابن مغیرہ ایک بڑا آدمی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں مٹی لی اور اس پر سجدہ کر لیا۔ دونوں گروہوں کو تعجب ہوا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سجدے کے ساتھ سجدہ کر لیا۔ مسلمانوں کا تعجب تو اس بات پر تھا کہ مشرکین ان کے ساتھ سجدہ ریز ہو گئے بغیر ایمان لانے اور یقین کرنے کے۔ یہ اس لیے کہ شیطان نے جو الفاظ ادا کیے تھے وہ مسلمانوں نے نہیں سنے تھے۔ صرف مشرکین نے سنے تھے۔ اس لیے مشرکین مطمئن ہو گئے کیونکہ شیطان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امنیہ (قرأت) میں اپنے فقرے ملا دیئے اور مشرکین کو تسلی دی کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سورہ میں تلاوت کیے ہیں تو انہوں نے اپنے الہوں کی تعظیم میں سجدہ کر لیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی۔ اس بات کو شیطان نے بہت ہی پھیلایا یہاں تک کہ یہ خبر حبشہ میں پہنچ گئی اور وہاں جو مسلمان تھے انہوں نے سنی۔ وہاں مسلمان عثمان ابن مظعون کی قیادت میں تھے۔ ان کو یہ بات پہنچی کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ یکجا نماز پڑھی ہے اور ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ولید ابن مغیرہ نے اپنی ہتھیلی پر مٹی اٹھا کر اس پر سجدہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب مسلمان مکہ میں امن و چین سے ہیں۔ چنانچہ یہ مہاجرین بڑی جلدی سے وہاں سے لوٹے۔ اللہ نے شیطان کے الفاظ کو منسوخ کر دیا اپنی آیات کو محکم کر دیا اور اس افتراء سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲ : ۵۲) لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ (۲۲ : ۵۳) ”اور اے نبیؐ، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی‘ شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے ‘ اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے ‘ اللہ علیم ہے اور حکیم۔ (وہ اس لیے ایسا ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں“۔ جب اللہ نے اپنا فیصلہ بتا دیا اور شیطان نے جو شوشہ چھوڑا تھا اس سے براءت کر دی تو مشرکین الٹے پاؤں پھر گئے اور گمراہی اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ عداوت شروع کر دی بلکہ اور سختی شروع کر دی۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ بغوی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کے کلام کی پوری روایات جمع کی ہیں اور محمد ابن کعب قرظی

نے بھی اسی طرح جمع کی ہیں اور پھر یہاں انہوں نے سوال کیا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اس معاملے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عصمت کی ضمانت دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف لوگوں کے جوابات نقل کیے ہیں۔ سب سے گہرا جواب یہ ہے کہ شیطان نے مشرکین کے کانوں میں یہ فقرے ڈال دیئے تھے۔ مشرکین نے یہ سمجھا کہ شاید یہ فقرے بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت کیے ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ حضرت شیطان نے ادا کیے اور رسول اللہ ؐ نے یہ نہیں ادا کیے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا ہے۔

فِي أُمْنِيَّتِه کا معنی یہ ہے کہ شیطان نے آپ کی باتوں میں یہ فقرے ڈال دیئے۔ اللہ نے ان کو باطل کر دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

مجاہد کہتے ہیں اذا تمنّى کے معنی ہیں اذا قال اللہ اکہ جاتا ہے امنية قرأته یعنی اس کا پڑھنا۔

بغوی کہتا ہے کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ تمنى کے معنی میں تلا یعنی تلاوت کی اور اللہ کی کتاب پڑھی۔

القى الشيطٰن في أُمْنِيَّتِه کے معنی ہیں "شیطان نے ان کی ملاوٹ میں ڈال دیا"۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ تمنى کے معنی ہیں (تلا) یعنی تلاوت کی اور کلام کے مفہوم کو بیان کرنے کے لیے یہ بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہے خلاصہ کلام روایات اور ان احادیث کا جن کو حدیث "غرانیق" کہتے ہیں۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے کوئی بنیاد نہیں رکھتی۔ علمائے حدیث کہتے ہیں۔ اہل صحاح نے اس حدیث کو نہیں لیا۔ نہ اس کی کوئی سند صحیح و متصل ہے ثقہ راویوں سے۔ ابوبکر بزار کہتے ہیں۔ یہ حدیث ہمارے علم میں نہیں کہ کسی جگہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قابل ذکر اسناد متصل سے نقل کی گئی ہو۔ اور موضوع کے اعتبار سے تو یہ اسلام کے بنیادی اصول سے ٹکراتی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں عقیدہ عصمت سے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ تبلیغ رسالت کے کام میں شیطان دخیل ہو سکتا ہے۔

مستشرقین اور اسلام پر تنقید کرنے والوں نے اس حدیث میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ اس کی انہوں نے بڑی اشاعت کی ہے اور اس کے اردگرد انہوں نے مزید مخالفانہ اقوال جمع کیے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کوئی قابل حجت بات نہیں کی بلکہ اس موضوع پر بات کرنا بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔

خود ان آیات کے اندر ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہو ناممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ایسا کوئی انفرادی واقعہ ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیش آیا ہو۔ آیات کا خلاصہ تو یہ ہے کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ تمام رسولوں کو پیش آتی رہی ہے۔ "اے نبی تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے اور نہ نبی کہ جب اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح شیطان جو کچھ خلل اندازیاں کرتا ہے' اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے"۔ لہٰذا اس آیت میں جس بات کا ذکر ہوا ہے وہ تمام انبیاء و رسل کے درمیان صفت مشترکہ ہے۔ اور اس کا تعلق ان کی صفت بشریت سے ہے اور یہ بات اس عصمت کے خلاف نہیں ہے جو رسولوں کے لیے مقرر ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کے بیان کی ہم یہاں کوشش کریں گے انشاء اللہ۔ اصل مراد تو اللہ ہی جانتا ہے ہم جو تفسیر بیان کرتے ہیں اپنے انسانی قوائے مدرکہ کی حد تک ہی کرتے ہیں۔ جب رسولوں کو یہ ڈیوٹی سپرد کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے

پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے نزدیک محبوب ترین شے یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان کی دعوت پر جمع ہو جائیں اور اس بھلائی کا ادراک کرلیں جو وہ اللہ کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور ان کے تابع ہو جائیں۔ لیکن دعوت کے مقابلے میں بہت سی مشکلات اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ رسول انسان ہوتے ہیں اور انسانوں کی زندگی محدود ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو برق رفتاری سے اپنی دعوت کی طرف کھینچ لائیں۔ مثلاً ان کے دلوں میں یہ بات آتی ہے کہ اگر وہ لوگوں کے ساتھ مصالحت کریں اور جو باتیں ان کے لیے چھوڑنا مشکل ہیں' مثلاً ان کی عادات' رسومات' موروثی شعائر' ان پر وہ خاموش ہو جائیں۔ وقتی طور پر' اور شاید اس طرح لوگ دعوت کی طرف آ جائیں۔ اور جب وہ دعوت کو قبول کرلیں تو ان کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ یہ موروثی عادات چھوڑ دیں' جو اب ان کے لیے بہت عزیز ہیں۔ مثلاً معمولی معمولی باتوں پر وہ ان کے ساتھ نرمی کریں اور کسی انگل سے ان کو دعوت کے اندر لے آئیں۔ اس امید پر کہ اندر لاکر پھر ان کی تربیت کر دی جائے گی۔ اور اس طرح ان کی خلاف اسلام عادات چھوٹ جائیں گی۔

غرض رسول اور نبی اس قسم کی بہت سی تمنائیں کرتے رہے ہیں جن کا تعلق ان کی دعوت کی نشر و اشاعت سے ہوتا ہے جبکہ اللہ کی مرضی یہ تھی کہ دعوت کے حاملین دعوت کو اس کے پورے اصولوں پر جم کر چلائیں۔ دعوت اسلامی کے باریک اقدار کے مطابق' اور اس پیمانے کے مطابق کہ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ "جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے"۔ کیونکہ اللہ کی تقدیر میں دعوت اسلامی کی کارکردگی یہ ہے کہ وہ خالص اصولی انداز کی ہو اور اس میں انسانوں کی کسی تدبیر اور خواہش کی آمیزش نہ ہو کہ دعوت حقیقی اصول پر' الہی پیمانوں کے مطابق چلے' اگرچہ اس طریقے کے مطابق آغاز میں تعداد کا خسارہ ہو گا۔ کیونکہ دعوت اگر اپنے اصول پر سختی سے جمی رہے اور فیصلہ کن بات کرتی رہے تو آخر کار یہ اشخاص بھی دعوت کو قبول کرلیں گے۔ بلکہ ان اشخاص سے بھی زیادہ بااثر اور اچھے لوگ دعوت کو قبول کریں گے اور دعوت بھی خالص اور صحیح و سالم رہے گی' اپنی راہ پر سیدھی ہو گی اور اس کے اندر کوئی کجی پیدا نہ ہو گی۔ نہ اس میں کسی طرح کوئی جھکاؤ ہو گا۔

انسان کی ان خواہشات اور ان خواہشات کے اظہار کے لیے رسول جو کلمات استعمال کرتا ہے یا خواہش کا اظہار کرتا ہے اس میں شیطان کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ سازش کر کے دعوت کو اپنی اصلی راہ سے ہٹا دے۔ اس طرح شیطان دعوت کے پھیلانے کے اجتہادی معاملات میں شبہات پیدا کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ شیطان کی کارستانیوں کا وقیعہ کر دیتا ہے اور ایسے معاملات میں اللہ کی طرف سے حکم محکم آجاتا ہے اور رسولوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ اس محکم فیصلے کو عوام تک پہنچا دیں اور رسولوں اور نبیوں کے دلوں میں اجتہادی امور میں جس کا تعلق دعوت کے پھیلانے سے ہوتا تھا جو لغزش ہو گئی تھی اللہ کی طرف سے اس کا بیان آجاتا ہے' جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض تصرفات میں بیان آیا ہے۔

یہ شیطان کی سازش ہوتی ہے اور اللہ اس کو باطل کر دیتا ہے اور حکم محکم آجاتا ہے اور شبہ نہیں رہتا' اجتہادی حکم کی جگہ محکم آیت آجاتی ہے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق اور انحراف کی بیماری ہے یا جن کے دل پتھر بن گئے ہیں یعنی کفار اور معاندین' وہ ایسے معاملات میں بحث و سوال کا موقعہ پالیتے ہیں۔

إِنَّ الظّٰلِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۲۲:۵۳) "حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ عناد میں دور نکل گئے

ہیں"۔ رہے وہ لوگ جن کو علم و معرفت دی گئی ہے تو ان کے دل اس بیان اور حکم فیصل پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ کے حکم کی حکمت کو پالیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۲: ۵۴) "یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں ہم ایسی مثالیں پاتے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہمیں اس تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی ہے جس طرف ابن جریر نے اشارہ کیا ہے۔

قصہ ابن ام مکتوم میں یہ بات نظر آتی ہے۔ وہ ایک اندھے اور فقیر تھے۔ وہ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول مجھے پڑھائیں اور وہ علم سکھائیں جو آپ کو اللہ نے سکھایا ہے۔ وہ بار بار اس بات کو دہراتے رہے۔ اس وقت رسول اللہؐ ولید ابن مغیرہ کے ساتھ گفتگو فرما رہے تھے اور وہ قریش کے ممتاز اکابرین میں سے تھے اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ ابن ام مکتوم کو معلوم نہ تھا کہ حضورؐ ایسے اہم معاملے میں مشغول ہیں۔ رسول اللہؐ نے اس موقعہ پر ان کی بار بار کی مداخلت کو ناپسند کیا اور ان سے منہ موڑ لیا۔ چنانچہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورہ نازل کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذرا سخت بات کی گئی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى (۱) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (۲) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى (۳) اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى (۵) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (۶) وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى (۷) وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى (۸) وَهُوَ يَخْشٰى (۹) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۱۰) كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) (۸۰: ۱ تا ۱۲)

"ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو۔ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے۔ اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے قبول کرے"۔

یوں اللہ تعالیٰ نے دعوت اسلامی کو اپنے صحیح اور نہایت ہی دقیق اقدار اور پیمانوں کی طرف لوٹا دیا اور یوں رسول اللہؐ کے اس طرز عمل کی تصحیح کر دی جو آپ نے اکابرین قریش کی بابت محض اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اسلام لے آئیں اور ان کے ساتھ عوام کی ایک بڑی تعداد اسلام قبول کر لے۔ اللہ نے اس پر دعوت کا جو صحیح اصول اور طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ اکابر قریش کے اسلام قبول کرنے کے مقابلے میں یہ بات اہم ہے کہ دعوت اسلامی اپنے صحیح خطوط پر کام کرے۔ اس طرح شیطان کے اس وسوسے کو باطل کر دیا جو اس نے رسول اللہؐ کی اس خواہش کے راستے سے ڈال دیا تھا کہ اکابر قریش اگر اسلام قبول کر لیں تو دعوت جلدی پھیل جائے گی۔ اللہ نے اپنی آیات محکمہ نازل کر کے اس رویہ کو درست کر دیا اور اہل ایمان کے دل اس پر مطمئن ہو گئے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ابن ام مکتوم کی بہت قدر کرتے تھے۔ جب بھی اس کو دیکھتے 'یہ فرماتے یہ شخص ہے جس کی وجہ سے اللہ نے مجھے جھڑکا ہے۔ آپ سے حضورؐ ہمیشہ پوچھتے تمہیں کچھ ضرورت ہے۔ دو دفعہ آپ نے اپنی عدم موجودگی میں انہیں مدینہ میں اپنا خلیفہ بنایا۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ بواسطہ ابوبکر' ابن ابوشیبہ' محمد ابن عبداللہ اسدی' اسرائیل' ہندم ابن شرح۔ اس کے والد' سعد ابن ابو وقاص سے وہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ تھے' چھ آدمی تھے۔ مشرکین نے کہا ان کو ذرا ہٹا دو یہ ہم سے آگے بڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں اس وقت میں تھا' ابن مسعود تھے' ہذیل کا ایک شخص تھا۔ بلال تھے اور دو دوسرے لوگ تھے جن کا نام میں بھول گیا۔ اس پر حضورؐ کے دل میں کوئی بات آئی۔ اللہ جانتا ہے کہ کیا بات آئی۔ حضورؐ نے دل میں کوئی بات کی۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ "اور ان لوگوں کو نہ بھگاؤ' جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اور صرف اللہ کی رضامندی چاہتے ہیں"۔ یہاں بھی اللہ نے دعوت اسلامی کے نہایت ہی باریک ناپ و تول کرنے والے پیمانے واپس کر دیئے اور شیطان نے اس نکتے پر جو وسوسہ اندازی کی تھی' اس کے اظہار سے قبل اللہ نے اس کی تصحیح کر دی۔ شاید حضورؐ نے یہ سوچا کہ آئندہ اکابرین قریش کے ساتھ یہ غریب لوگ مجلس میں نہ بیٹھیں جب کہ اللہ کے نزدیک دعوت اسلامی کی اقدار کی افادیت ان اکابر قریش کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی۔ نیز دعوت کی اقدار اور پیمانوں کی اہمیت ان ہزار لوگوں کے اسلام سے بھی زیادہ تھی جو ان اکابرین قریش کی بیعت میں تحریک کا ساتھ دیتے اور جن کی تمنا رسول اللہؐ کرتے تھے۔ اللہ تحریک کے لیے حقیقی قوت کے مراکز کو خوب جانتے تھے۔ تحریک کے لیے اصل قوت یہ تھی کہ وہ اپنی راہ پر استقامت کے ساتھ چلے اور کسی شخصیت یا کسی رسم و رواج کی کوئی پرواہ نہ کرے۔

زینب بنت جحش کے واقعہ میں بھی یہی پیش آیا۔ یہ آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں' رسول اللہؐ نے ان کو زید بن حارثہ کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ زید حضورؐ کے متبنیٰ تھے اور زید ابن محمد کے نام سے مشہور تھے۔ زینب کے ساتھ نکاح کے بعد ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہوئی۔ جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ اگر متبنیٰ فوت ہو جائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کے ساتھ اس کا منہ بولا باپ نکاح نہ کرتا تھا۔ اس کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اس رسم کو ختم کر دیا جائے۔ جس طرح بیٹے کی نسبت والد کے بغیر کسی دوسرے کی طرف کرنے کی رسم کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ اگر زید اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو آپ اس کے ساتھ نکاح کریں تاکہ اس رسم کا ابطال ہو جائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو اپنے دل میں خفیہ رکھا اور کسی کو نہ بتایا۔ زید جب بھی اپنی بیوی کی شکایت کرتے رسول اللہؐ ان کو یہی مشورہ دیتے کہ "تم اپنی بیوی کو رکھو"۔ حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ اگر زید طلاق دیتے ہیں تو مجھے اس سے نکاح کرنا ہوگا اور اس بات کو مطابق رواج عرب پسند نہیں کرتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو اس طرح مخفی رکھا یہاں تک کہ زید نے تنگ آکر زینب کو طلاق دے دی۔ اللہ نے اس کے بارے میں قرآن نازل فرمایا اور اس میں اس بات کی وضاحت کر دی جو حضور اکرم

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دل میں تھی اور متبنیٰ کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کا جو منشا تھا وہ پورا کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۳۳ : ۳۷) "اے نبی ؐ یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ " اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زید ؓ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا"۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام میں سے کسی چیز کو چھپاتے تو وہ اس آیت کو چھپاتے۔

وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ (۳۳ : ۳۷) "اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت اور اس کے احکام کو نافذ کر دیا اور اس بات کو بھی کھول کر رکھ دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دل میں غلجان برپا کر رہی تھی کہ لوگ متبنّیٰ کی بیوی سے نکاح کو برا خیال کرتے ہیں۔ اللہ نے یہاں بھی شیطان کی راہ کو بند کر دیا اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی، یا جن کے دل دعوت اسلامی کے لیے سخت تھے وہ اس واقعہ کو بھی سامان فتنہ بناتے رہے۔ اور آج تک اسلام کے دشمن اسے سامان فتنہ بنا رہے ہیں۔

یہ ہے وہ بات جس پر اس آیت کی تفسیر میں ہمارا دل مطمئن ہو گیا ہے۔ اللہ ہی صحیح راستہ بتانے والا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد دعوت اسلامی کی لیڈر شپ بھی بعض اوقات یہ کوشش کرتی ہے کہ انتہائی بااثر لوگوں کو دعوت اسلامی کی طرف مائل کیا جائے اور ابتداء میں دعوت کے تقاضوں میں سے بعض امور میں چشم پوشی کی جائے۔ یہ کام وہ اس جذبے کے تحت کرتے ہیں کہ دعوت اسلامی کو فروغ حاصل ہو اور وہ جلدی غلبہ حاصل کرے۔ اس لیڈر شپ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ امور دعوت کے بنیادی امور نہیں ہوتے۔ یہ لوگ ان بااثر لوگوں کے ساتھ ان امور میں نرمی کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ

دعوت سے متنفر نہ ہو جائیں اور اس کی مخاصمت اختیار نہ کریں۔

یہ لوگ بعض ایسے وسائل اور ذرائع بھی اپناتے ہیں جو دعوت اسلامی کے باریک پیمانوں اور اقدار کے ساتھ بے جوڑ ہوتے ہیں نہ یہ امور دعوت اسلامی کے سیدھے سادے طریقے سے لگا کھاتے ہیں یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں کہ دعوت جلدی پھیل جائے اور کامیاب ہو جائے۔ یہ لوگ ان امور کو اپنانے کے لیے دعوت کی مصلحت کے تحت بطور اجتہاد یہ کام کرتے ہیں حالانکہ دعوت اسلامی کی مصلحت تو اس میں ہے کہ اس کے حقیقی منہاج سے ذرہ برابر انحراف نہ کیا جائے نہ کم اور نہ زیادہ کسی بات میں بھی۔ رہے نتائج تو وہ تو امر غیبی ہیں۔ ان کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لہذا کسی حال دعوت کو نتائج کا حساب و کتاب اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ حاملین دعوت کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ دعوت اسلامی کو لے کر سیدھے چل پڑیں۔ دعوت اسلامی کے حقیقی راستے پر چلنے میں ہی کامیابی ہے۔

قرآن کریم صراحت سے کہتا ہے کہ قرآن مجید حاملین دعوت اسلامی پر ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے راستے سے داخل ہوتا ہے تاکہ اس طرح وہ دعوت اسلامی کی صفوں کے اندر داخل ہو جائے۔ جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے تو ان کی عصمت کی ضمانت تو اللہ نے دے دی تھی۔ شیطان کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ انبیاء کی فطری تمناؤں کی راہ سے دخل اندازی کر سکے۔ لیکن بعد میں آنے والی لیڈر شپ کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ بہت زیادہ چوکنی رہے اور بہت احتیاط سے کام لے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے خیال میں کوئی کام اسلام کی بہتری' دعوت کے پھیلنے اور کامیاب ہونے کے لیے کر رہے ہوں اور اس میں دعوت کی مصلحت سمجھتے ہوں اور دراصل وہ شیطانی مداخلت ہو۔ داعیان کو چاہیے کہ دعوت کی مصلحت کا لفظ ہی اپنی ڈکشنریوں سے نکال دیں کیونکہ یہ لغزش کا مقام ہے' اس مقام سے شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ جب شیطان افراد کی مصلحتوں کی راہ سے اندر نہیں آسکتا تو پھر وہ دعوت کی مصلحت کی راہ سے حملہ کرتا ہے۔ دعوت کی مصلحت اب ایک بت بن گیا ہے۔ آج کل داعیان حق اس کو بہت پوجتے ہیں' لیکن اس لباس میں وہ دعوت کے اصل منہاج سے جی چراتے ہیں۔ لہذا دعوت اسلامی کی لیڈر شپ کو چاہئے کہ وہ دعوت کے اصل منہاج کو نہ بھولیں اور اس منہاج پر خوب غور کریں اور خصوصاً اس بات کی طرف توجہ نہ کریں کہ فلاں فلاں کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس میں دعوت کے لیے خطرہ ہے' یا کارکنوں کے لیے خطرہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اصل خطرہ یہی ہے کہ دعوت اسلامی کے حاملین دعوت کا حقیقی منہاج چھوڑ دیں' کسی بھی وجہ سے' اور صحیح راستے سے انحراف کریں خواہ یہ انحراف قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اللہ اپنی دعوت کی مصلحت کو ہم سے زیادہ جانتا ہے اور پھر دعوت کے بچانے اور کامیاب کرانے کے ہم ذمہ دار اور مکلف ہی نہیں۔ ہمارا فریضہ صرف ایک ہے کہ ہم اپنے منہاج سے انحراف نہ کریں اور اپنے صراط مستقیم سے بالکل ادھر ادھر نہ ہوں۔

--- ooo ---

آخر میں یہ تنبیہ آتی ہے کہ تم دعوت اسلامی کو شیطانی وسوسوں سے بچانے کی سعی کرو۔ یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ مانیں یا دعوت کامیاب ہو جائے۔ اگر کفار اس کو نہیں مانتے تو وہ دراصل اس کے بارے میں شک میں ہیں اور ان کے انتظار میں دردناک اور توہین آمیز عذاب ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ

السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

ع ۹ ۱۴

"انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو ان پر قیامت کی گھڑی اچانک آ جائے 'یا ایک منحوس دن کا عذاب نازل ہو جائے۔ اس روز بادشاہی اللہ کی ہو گی' اور وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ جو ایمان رکھنے والے اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ نعمت بھری جنتوں میں جائیں گے' اور جنہوں نے کفر کیا ہو گا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا ان کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا"۔

یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو اس قرآن کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس مضمون کا ذکر اس تصریح کے بعد کیا ہے کہ انبیاء و رسل دعوت کے سلسلے میں نہایت شوق اور تمنا رکھتے ہیں اور شیطان ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہے کیونکہ لوگ جن کے بارے میں انبیاء تمنا کرتے ہیں' ان کے دلوں میں شک رہتا ہے اس لیے کہ ان کے دلوں کے اندر دعوت اسلامی اچھی طرح بیٹھ نہیں سکی۔ یہ اسی طرح شک میں رہیں گے یہاں تک کہ اچانک قیامت آ جائے یا ان پر کوئی منحوس دن آ جائے۔ یعنی قیامت کے بعد کا عذاب۔ قیامت کے دن کے لیے یوم عقیم استعمال ہوا' کیونکہ اس کے بعد کوئی دوسرا دن نہ ہو گا۔

اس دن میں تمام اختیارات اللہ وحدہ کے پاس ہوں گے یہاں کسی کی بادشاہت نہ ہو گی۔ دنیا کی ظاہری بادشاہت بھی کسی کے پاس نہ ہو گی۔ صرف اللہ کا حکم چلے گا۔ اس دن تمام لوگوں کے فیصلے ان کی مقررہ جزاء عمل کے مطابق اللہ کرے گا۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۲۲:۵۶) "جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنات نعیم (نعمتوں والی جنتوں) میں ہوں گے"۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۲۲:۵۷) "اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا' ان کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا"۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۱۴۷ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق کا خاتمہ اس مضمون پر ہوا تھا کہ آخرت میں مومنین اور مکذبین کا خاتمہ کیا ہو گا' جہاں بادشاہت صرف اللہ وحدہ کی ہوگی۔ مضمون یہ چل رہا تھا کہ اللہ ہمیشہ اپنے رسولوں کی نصرت کرتا ہے' اپنی دعوت کو خود بچاتا ہے اور جو ایمان لاتا اسے اجر دیتا ہے جو کفر کرتا ہے اسے سزا دیتا ہے۔

اس سبق کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے' اس سے قبل مہاجرین و انصار کو جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے' کیونکہ اسلامی نظریہ حیات کا دفاع بغیر جہاد کے ممکن نہیں۔ جب تک وہ جہاد نہ کریں گے نہ وہ اللہ کی بندگی کر سکتے ہیں' نہ عبادات' نہ اپنی جان کی حفاظت کر سکتے ہیں نہ اپنے دین کی۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ انہیں اپنے شہر سے بغیر کسی جرم کے نکال دیا گیا ہے۔ ہاں انہوں نے یہ "جرم" ضرور کیا تھا کہ وہ صرف اللہ کو رب مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو تسلی دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنا شہر چھوڑا اور مال و جائیداد کو چھوڑا تو اللہ ہی اس کام کا اجر انہیں دے گا۔

اسی حوالے سے ایک عام اصول کے طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ جس پر کوئی ظلم ہو تو وہ اس کے بدلے اسی قدر ظلم کر سکتا ہے۔ اس صورت میں' اگر ظالم مزید ظلم پر اتر آئے اور پھر ظلم کرے تو اللہ مظلوموں کے ساتھ ہو گا۔ اس وعدے پر اللہ تعالیٰ دلائل بھی دیتا ہے کہ اللہ مدد کر سکتا ہے کیونکہ اللہ ہی اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے اور جس سنت اور ناموس کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس کا ایک حصہ اور تقاضا یہ بھی ہے کہ مظلوم کی امداد کی جائے۔

اس کے بعد خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے کہ ہر امت کا ایک منہاج ہے' اس کو اس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ سے کہا جاتا ہے کہ مشرکین کو یہ صاف صاف بتا دیں اور ان کو موقع نہ دیں کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی تنازعہ کریں۔ اگر وہ پھر بھی مجادلہ پر اتر آئیں تو معاملے کو خدا پر چھوڑ دیں۔ وہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا کیونکہ اصل علم تو اس کے پاس ہے جو آسمان و زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ لوگ جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں' اس پر ان کے پاس کیا ثبوت ہے' یہ بغیر ثبوت کے اپنے موقف پر اس لیے ڈٹے ہوئے ہیں کہ ان کو کلمہ حق کے سننے ہی سے نفرت ہے اور یہ نفرت ان پر اس قدر غالب ہے کہ جو لوگ ان کو آیات سناتے ہیں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان پر حملہ نہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ جلدی نہ کرو' تمہارے لیے آگ تیار ہے اور وقت جلدی ہی آنے والا ہے۔

اس کے بعد ان الہوں کے ضعف کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ کے سوا پکارے جاتے ہیں اور یہ تمام انسانوں کے نام ایک پیغام عام کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان الہوں کی بیچارگی کو بڑے توہین آمیز انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ الہ مکھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ سبق اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کو اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ فرائض ہیں کیا؟ یہ کہ وہ پوری انسانیت کی نگران ہے۔ اس کے لیے اخلاقی تیاری رکوع' سجود اور فعل خیرات ہے۔ اور نماز کا نظام قائم کرنا اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا اور اللہ پر بھروسہ کرنا۔ اس کے ساتھ یہ سورہ بھی ختم ہوتی ہے۔

درس نمبر ۱۴۷ تشریح آیات

۵۸ --- تا --- ۷۸

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

"اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی 'پھر قتل کر دیے گئے یا مرگئے' اللہ ان کو اچھا رزق دے گا۔ اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔ وہ انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے بے شک اللہ علیم اور حلیم ہے"۔

اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ان تمام باتوں کو ترک کر دے 'جن کو نفس انسانی چاہتا ہے' جن کو وہ بے حد عزیز سمجھتا ہے اور جن پر وہ بے حد حریص ہوتا ہے۔ فیملی 'شہر' وطن 'ماضی کی یادیں' مال اور زندگی کا سازوسامان۔ ان سب باتوں کو اپنے نظریہ پر قربان کرنا اور اللہ کی رضامندی حاصل کرنا اور اللہ کے ہاں جو کچھ اجر ہے اس کی طرف دیکھنا' یہ ایسا کام ہے کہ یہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔

ہجرت کا حکم فتح مکہ سے قبل تھا اور اس وقت شروع ہوا تھا جب اسلامی حکومت مدینہ میں قائم ہو گئی تھی۔ فتح مکہ کے بعد اگر کوئی دوسرے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ آتا تو اسے ہجرت نہ سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اسے جہاد اور نیک عمل ضرور سمجھا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد اگر کوئی جہاد کرے تو اسے اچھا عمل سمجھا جائے گا اور ثواب ہو گا۔

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا

(۲۲ : ۵۸) "جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل کر دیے گئے یا مرگئے' اللہ ان کو اچھا رزق دے گا"۔ خواہ وہ شہید ہوئے یا اپنی موت آپ مرگئے۔ کیونکہ انہوں نے اپنا ملک اور مال و دولت چھوڑ دیا اور اس انجام کے لیے تیار ہو کر نکل آئے۔ انہوں نے شہادت کو ترجیح دی اور دنیا کے تمام عزیز ترین مال و دولت اور ملک کو قربان کر دیا۔

اس لیے اللہ نے بھی ہر حال میں ان کے لیے عظیم اجر کا فیصلہ کر دیا۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۲۲:۵۸) "اللہ ان کو اچھا رزق دے گا بے شک اللہ اچھا رزق دینے والوں میں سے ہے"۔ اور یہ اللہ نے ان کے لیے جس رزق کا اعلان کیا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اچھا ہے جو انہوں نے چھوڑا ہے۔

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ (۲۲:۵۹) "اور انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہوں گے"۔ وہ اس جگہ کی طرف نکلے جس پر اللہ راضی تھا لہٰذا ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں وہ راضی ہوں گے۔ یہ بات ان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ ان کے لیے ان کی مرضی کی جگہ تیار کرے گا' حالانکہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ خالق ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (۲۲:۵۹) "بے شک اللہ علیم و حلیم ہے"۔ اللہ کے علم میں ہیں وہ مظالم جو ان پر ہوتے رہے۔ اللہ کے علم میں یہ بھی ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ اور حلیم اس طرح کہ وہ سب کو مہلت دیتا ہے اور پھر وہ ظالم اور مظلوم دونوں کو پوری پوری جزاء دے گا۔

انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ جن پر مظالم ڈھائے جائیں تو وہ کبھی صبر کرتے ہیں اور کبھی صبر نہیں کرتے۔ جب صبر نہیں کرتے تو وہ ظلم کا جواب دیتے ہیں۔ وہ بھی ان اذیتوں کے مقابلے میں دشمنوں کو ویسی ہی اذیتیں دیتے ہیں۔ اگر ظالم پھر بھی باز نہیں آتے تو اللہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے کہ وہ مظلوموں کی نصرت کرے گا۔

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

"یہ تو ہے ان کا انجام' اور جو کوئی بدلہ لے' ویسا ہی جیسا اس کے ساتھ کیا گیا' اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو' تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے"۔

اس نصرت کی شرط یہ ہے کہ سزا بطور قصاص دی گئی ہو' اس میں زیادتی نہ ہو اور نہ ہی سرکشی کر کے سزا کو ظلم سے بدل دیا گیا ہو۔ سزا میں غلو نہ کیا گیا ہو۔

اس سزا کے جواز کے بعد یہ جملہ آیا ہے کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ ہر جرم کو معاف بھی کر سکتا ہے لیکن انسانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات کسی قیمت پر جرم کو معاف نہیں کرتے اور قصاص اور سزا کے نفاذ کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اللہ نے ان کو یہ حق دیا ہے۔ معاف نہ کرنا انسان کی بشری کمزوری ہے۔

ایک شخص پر ظلم ہو' وہ اس کے بدلے متوازن قصاص لے' لیکن ظالم اگر پھر ظلم پر اتر آئے تو اللہ کی نصرت کا وعدہ

اس شخص کے ساتھ ہے جس نے قصاص لیا۔ ظالم اور باغی کے ساتھ نہیں ہے لیکن اس وعدے کو اللہ تعالیٰ اس کائنات کے تکوینی نوامیس قدرت کے ساتھ مربوط کرتے ہیں' یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ کائناتی قوانین قدرت اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور وہ نصرت کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس طرح یہ قوانین قدرت اٹل ہیں اور نہایت باریکی سے اپنے فرائض کو پورا کر رہے ہیں اسی طرح اللہ کی نصرت بھی ایک کائناتی حقیقت ہے۔ اس میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسا نہ ہو۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ۝۶۱

"یہ اس لیے کہ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے"۔

یہ ایک طبیعی کائناتی منظر ہے اور رات دن ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ گرمیوں اور سردیوں کی صورت میں ہم اس کے آثار دیکھتے ہیں۔ سورج کے غروب کے وقت رات دن میں داخل ہو جاتی ہے اور سورج کے طلوع کے وقت دن رات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رات دن میں داخل ہوتی ہے اور سردیوں میں دن کے حدود کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ اور دن رات میں داخل ہوتا ہے' گرمیوں میں اور رات کی حدود کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ انسان ان مناظر کو رات اور دن دیکھتا رہتا ہے کہ دن رات میں اور رات دن میں داخل ہو رہے ہیں لیکن بہت زیادہ انس کی وجہ سے اور بہت زیادہ تکرار کی وجہ سے یہ عجیب و غریب مناظر ہمارے لیے دلکش نہیں رہے اور ہم اس نظام پر غور نہیں کرتے کہ یہ نظام کس قدر باریکی سے چل رہا ہے۔ اس میں ایک منٹ کے لیے بھی خلل نہیں پڑتا۔ کبھی یہ نظام موقوف نہیں ہوتا۔ یہ امر شہادت ہے قادر مطلق کی قدرت پر جس نے یہ نظام جاری کیا ہے۔

قرآن کریم اس منظر کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ تم ایسے مناظر کو بہت غفلت سے کیوں دیکھ کر گزر جاتے ہو' تاکہ وہ بتا سکے کہ اللہ کی قدرت کا کیا عالم ہے۔ ایک طرف سے وہ ان کی بساط لپیٹ لیتا ہے' رات کو بجھا دیتا ہے اور دوسری طرف سے وہ تاریکی کو دور کر کے دن کا اجالا پھیلا دیتا ہے۔ یہ نظام اس قدر باریک ہے کہ اس میں کوئی خلل نہیں پڑتا' صدیاں گزر گئیں۔ یہی حال اس نصرت کا ہے جس کا اعلان مظلوموں کی حمایت میں ہوا ہے۔ یہ اس طرح یقینی ہے جس طرح رات اور دن کا یہ نظام یقینی ہے۔ اس طرح اللہ جباروں کی سلطنت کے نظام کو اب لپیٹ رہا ہے اور دنیا میں صالح اور عادل لوگوں کا نظام زندگی نافذ کر رہا ہے۔ یہ سیاسی انقلاب بھی انقلاب روز و شب کی طرح یقینی اور اٹل ہے اور ایک تکوینی سنت ہے۔ یہ سنت بھی رات اور دن جاری و ساری ہے لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔ جس طرح وہ اس کائنات میں دلائل کونیہ سے غافل ہیں حالانکہ یہ دلائل ایک کھلی کتاب کی شکل میں ہر لحظہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ

الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ

"یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں اور اللہ ہی بالادست اور بزرگ ہے"۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ حق ہے اور حق اس نظام کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔ باطل میں خلل پڑتا رہتا ہے اور حق قائم و دائم رہتا ہے لہٰذا یہ اہل حق کی مدد کے لیے کافی دلیل ہے اور یہی بات اس نصرت کی ضمانت ہے۔ یہ باطل اور ظلم کے خلاف اللہ کی نصرت پر دلیل بھی ہے اور یہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اللہ کے تکوینی فیصلے جس طرح اٹل ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کی نصرت کا یہ وعدہ بھی اٹل ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ وعدہ پورا نہ ہو کیونکہ اللہ ان سرکشوں سے بڑا بادشاہ ہے اور وہ ان جباروں سے بہت بڑا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ (۲۲:۶۲) "اور اللہ ہی بالادست اور بزرگ ہے"۔ لہٰذا وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ظلم بند رہے اور طویل عرصے تک عوام پر ظلم ہوتا رہے۔

---ooo---

یہ مضمون کہ دلائل کائنات اللہ کی لامحدود قدرت پر شاہد عادل ہیں' ذرا آگے بھی جاری رہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف و خبیر ہے"۔

آسمانوں سے بارش برسنا' زمین کا سرسبز اور شاداب ہونا' صبح و شام ایسے مناظر کا دہرایا جانا' یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہمارے سامنے بار بار دہرایا جاتا ہے اور ہم اس سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' لیکن اگر ہم اپنے شعور کو ایک شاعر کی طرح بیدار کر لیں تو یہ منظر دلوں اور دماغوں کے اندر بے شمار احساسات پیدا کر دیتا ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا جو زمین کو پھاڑ کر سر باہر نکالتا ہے' مٹی اور کیچڑ سے باہر آتا ہے' یہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے اور اس دنیا کی طرف نکل کر ہنستا ہے اور اس کے منہ پر فرحت بخش تبسم ہوتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا اپنی اس خوشی میں کہیں اڑ نہ جائے۔

جو لوگ ایسا شعور رکھتے ہیں وہی اس آیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ (۲۲:۶۳) "اللہ لطیف و خبیر ہے"۔ لطیف کے معنی ہیں کہ نہایت ہی

باریکی کو بھی دیکھتا ہے اور اس سے خبردار ہے۔ وہ اس منظر کو نہایت ہی لطف اور گہرائی سے دیکھتا ہے اور ان مناظر کی حقیقت اور مزاج کا خالق ہے اور واقف ہے۔ یہ اللہ کا لطف و کرم ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا زمین سے باہر آتا ہے حالانکہ یہ نہایت ہی ضعیف اور بے طاقت ہوتا ہے۔ لیکن دست قدرت اسے ہوا میں بلند کرتا جاتا ہے اور زمین کی جاذبیت اور کشش ثقل کے باوجود اس کے اندر اٹھنے اور پھیلنے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ قدرت الہیہ کا لطف و کرم ہے کہ عین وقت پر بارش ہوتی ہے' مناسب مقدار میں ہوتی ہے اور یہ پانی نہایت ہی میکانیکی طریقے سے مٹی سے ملتا ہے اور نباتی عمل شروع ہوتا ہے اور پھر زندہ نباتی خلیے روشنی کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔

یہ پانی اللہ کے آسمان سے اللہ کی زمین پر نازل ہوتا ہے۔ اللہ ہی اس میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہی اس میں غذا اور ثروت پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہی زمین و آسمان اور مافیہا کا مالک ہے۔ وہ زمین و آسمان اور مافیہا سے غنی ہے۔ یہ زندہ چیزوں کو پانی اور نباتات کا رزق دیتا ہے لیکن وہ خود رزق اور مرزوق دونوں سے غنی ہے۔

۸

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶۴ ع ۷

۱۵

"اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' بے شک وہی غنی و حمید ہے"۔ اسے زمین و آسمان کی کسی مخلوق کی حاجت نہیں ہے۔ وہ تو غنی ہے' حمید ہے' محمود ہے' اور تمام مخلوق پر اس کا کرم ہے۔

مزید بات اس مضمون پر آگے بڑھتی ہے کہ لوگوں کے لیے اس کائنات میں سوچنے کی کئی چیزیں ہیں جو ان کی نظروں کے سامنے پڑی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۵

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے' اور اسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے۔ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے' اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے"۔

اس زمین میں کس قدر قوت ہے' کس قدر ثروت ہے' اور ان قوتوں اور ذخائر کو اللہ نے انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے لیکن انسان اللہ کے ان انعامات سے غافل ہے۔ یہ ان انعامات میں رات اور دن ڈوبا ہوا ہے' لیکن غافل پڑا ہے۔

اللہ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کے لیے مفید بنایا ہے اور مسخر کر دیا ہے۔ اس کائنات کے طبیعی قوانین کو انسانی فطرت کے مطابق اور موافق بنایا ہے۔ اگر اللہ نے اس زمین کے طبیعی حالات کو انسان کے طبیعی حالات کے

خلاف بنایا ہوتا تو انسان کے لیے یہاں زندہ رہنا مشکل ہوتا چہ جائیکہ وہ یہاں اس کائنات کے ذخیروں سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا۔ اگر انسان کی جسمانی تربیت اس سے مختلف ہوتی اور اس کرۂ ارض پر وہ چل نہ سکتی' ہوا نہ کھینچ سکتی' غذا نہ لے سکتی' پانی نہ پی سکتی تو انسان یہاں ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہ رہ سکتا۔ اگر انسان کا وزن اس طرح موزوں نہ ہوتا جس طرح کہ ہے تو اس کے قدم زمین پر نہ ٹکتے یا ہوا میں اڑ جاتا یا زمین میں دھنس جاتا۔ اگر زمین پر ہوا نہ ہوتی یا اس موجودہ حالت سے ذرا بھی کثیف ہوتی تو اس کا گلا گھٹ جاتا' اور فوراً مرجاتا۔ لہٰذا یہ امر الٰہی ہی ہے اور اس لطیف و خبیر کا کارنامہ ہی ہے کہ اس نے ان فطری قوتوں کو انسان کے موافق بنایا اور انسان کو ان کے موافق۔

اللہ نے ایک طرف تو ان کو ایسی طاقت دی کہ وہ اس کرۂ ارض کو مسخر کر سکے اور دوسری طرف کرۂ ارض اور اس کے اندر پوشیدہ قوتوں کو ایسا بنایا کہ وہ انسان کے کنٹرول میں آسکیں۔ پھر زمین کے اندر ظاہری اور پوشیدہ بے شمار قوتوں کو یہ انسان ایک ایک کر کے دریافت کرتا اور ان کو کنٹرول کرتا چلا گیا۔ جب بھی اسے کسی جدید قوت کی ضرورت پیش آئی ہے اس نے وہ جدید قوت ڈھونڈ نکالی ہے۔ جب اس کو خطرہ ہوا کہ زمین کی قوتوں میں سے کوئی ذخیرہ ختم ہونے والا ہے' اس نے جدید ذخیرہ تلاش کر لیا۔ ابھی پٹرول کے ذخائر ختم نہ ہوئے تھے کہ اس نے ایٹمی قوت دریافت کر لی اور ابھی اس پر پورا کنٹرول نہ ہوا تھا کہ ہائیڈروجن قوت دریافت کر لی۔ اگرچہ انسان کی مثال ابھی تک بچے کی سی ہے کہ جس کے ہاتھ میں آگ آجائے تو وہ خود بھی جلتا ہے اور دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ انسان اس وقت معتدل رہ سکتا ہے جب وہ اسلامی نظام زندگی کے سایہ میں زندگی بسر کرے۔ صرف اس صورت میں وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کر سکتا ہے اور منصب خلافت فی الارض کا فریضہ اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔

وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ (۲۲ : ۶۵) "اور اس نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے"۔ کیونکہ یہ قوانین قدرت اسی نے بنائے ہیں جن کے مطابق کشتی سمندر میں چلتی ہے اور انسان کو معلوم ہوا کہ اللہ نے یہ قوانین اس کائنات میں جاری کر دیئے ہیں۔ چنانچہ انسان نے کشتی کو اپنے مفادات کے مطابق چلانا شروع کر دیا۔ اگر سمندر کا کوئی ضابطہ یا کشتی کا مزاج اس کے خلاف ہوتا تو ہم کشتی نہ چلا سکتے یا اگر انسان کی قوائے مدرکہ ایسی نہ ہوتیں جیسی ہیں تو ہمیں پتہ بھی نہ ہوتا کہ سمندروں میں اس طرح بڑے بڑے جہاز چلائے جا سکتے ہیں۔

وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲۲ : ۶۵) "اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا"۔ کیونکہ اس نے اس کائنات کو بنایا اس طرح ہے کہ آسمان جس طرح کہ وہ ہے' قائم رہے اور تمام کرات ساوی ایک دوسرے سے دور اپنی اپنی جگہ قائم رہیں۔ نہ وہ گریں اور نہ ان کے درمیان ٹکراؤ ہو۔

علم فلکیات میں جس قدر ترقی ہوئی ہے اس سے صرف اس بات میں اضافہ ہوا ہے کہ یہ پیچیدہ نظام کائنات جس کے مطابق یہ پوری کائنات کھڑی ہے' خالق کائنات اللہ جل شانہ کا جاری کردہ ہے۔ اگرچہ بعض نادان انسان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحقیقات کے ذریعے نظام فلکی کی جو تفسیر اور تعبیر کرتے ہیں اس سے دست قدرت کی نفی ہوتی ہے' یہ بہرحال ان کا وہم اور سوچ کی کمی اور غور و فکر کی کجی ہے۔ پہلے تو یہ بات ہے کہ جس قدر فلکیاتی نظریات آج تک پیش

ہوئے ہیں یہ محض مفروضے ہیں لیکن اگر ہم ان کو حقیقت بھی مان لیں تو ان میں سے کوئی مفروضہ بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس قانون کو کسی نے وضع نہیں کیا ہے یا یہ کہ ان قوانین کے جاری و ساری رہنے میں کسی مدبر کے دست قدرت کا دخل نہیں ہے۔

وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَي الْاَرْضِ (۲۲:۶۵) "وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ وہ زمین پر نہیں گرتا"۔ یعنی اس قانون کے عمل سے جو اس کائنات میں جاری کر دیا گیا ہے یہ اس کی صنعت کاری ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِه "مگر اس کے حکم کے سوا"۔ یعنی جب اس کا حکم ہوا کہ جو قانون اللہ نے جاری کیا ہے وہ معطل ہو جائے تو پھر یہ قانون قدرت معطل ہو جائے گا اور یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اب قرآن مجید اس کائنات کے دلائل تکوینی بیان کرتے ہوئے ' اس کائنات سے نفس انسانی کی طرف آتا ہے جو اس کائنات کا حصہ ہے۔ اب عالم انسانی کے اندر موت و حیات کے عجیب قوانین قدرت بیان کیے جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶

"وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے ' وہی تم کو موت دیتا ہے اور وہی پھر تم کو زندہ کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی منکر حق ہے"۔ انسان کے ڈھانچے میں زندگی ڈالنا یعنی پہلے انسانی ڈھانچے میں تو ایک عظیم معجزہ ہے ' اور رات اور دن جن چیزوں میں اللہ تعالیٰ زندگی ڈالتا ہے اس سے اس معجزے کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ یہ "حیات" کیا چیز ہے۔ ابھی تک یہ امور غیبیہ سے ہے اور عقل اس کے بارے میں حیراں ہے۔ اس میں بہرحال تامل و تدبر اور سائنسی تحقیق کے لیے بڑی گنجائش ہے۔

پھر موت بھی ایک دوسرا معجزہ ہے کہ انسان اس کی حقیقت سے آج تک عاجز ہے۔ موت نہایت ہی مختصر ٹائم میں واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن زندگی اور موت کے آثار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انسان کے لیے اس میں غور و فکر کے وسیع امکانات ہیں۔

اب تیسرا مرحلہ کہ موت کے بعد زندگی کیسے ہوگی۔ یہ بھی اللہ کے پوشیدہ علوم میں سے ایک غیب ہے۔ لیکن اس پر دلیل بہت آسان ہے کہ جب ایک چیز کو پہلے پیدا کر دیا گیا ' تو دوسری بار اس کی پیدائش میں کیا مشکلات ہو سکتی ہیں۔ اس میں بھی انسان غور و فکر کر سکتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ غور و فکر ان موضوعات پر نہیں کرتا اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا '

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (۲۲:۶۶) "بے شک انسان ناشکرا ہے"۔ بڑا منکر حق ہے۔ قرآن مجید نے یہ تمام دلائل اس موضوع کے گرد پیش کیے ہیں کہ جن لوگوں پر ظلم ہو گا ' اللہ ان کی مدد کرے گا۔ اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے خلاف ہونے والی جارحیت کا جواب دیں۔ یہ طرز استدلال قرآن کریم کے اس

اسلوب کے مطابق ہے کہ قرآن اس کائنات کے قوانین فطرت اور مظاہر قدرت کو دلوں میں ولولہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے کیونکہ نظام اسلامی کے اندر موجود قوانین عدل کو پوری کائنات کے اندر موجود قوانین فطرت کی تائید حاصل ہے۔

---○○○---

اس کائنات کے مظاہر فطرت اور قوانین قدرت کے بیان کے اس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ کر اب قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کرتا ہے کہ آپ مشرکین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی راہ پر چلیں۔ مشرکین کے نزاع اور جدال کی پرواہ نہ کریں۔ اللہ مشرکین کو یہ طاقت نہیں دیتا کہ وہ آپ کو اپنی راہ سے روک سکیں۔ یہ راہ آپ کے لیے اللہ نے چنی ہے اور اس راہ میں آپ صرف دعوت پہنچانے تک محدود رہیں۔ اصل فیصلہ تو اللہ خود قیامت میں کرے گا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾

"ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے، پس اے نبی، وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو۔ یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ "جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ کو خوب معلوم ہے، اللہ قیامت کے روز تمہارے درمیان ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو"۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے"۔

ہر قوم اور ہر امت کا ایک منہاج فکر، منہاج عقیدہ اور ایک منہاج عمل اور ایک نظام زندگی ہوتا ہے۔ یہ نظام ان قوانین کے تابع ہوتا ہے جو اللہ نے انسانوں کے اندر جاری کیے ہیں جن کے مطابق انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور بعض چیزوں کو قبول کر لیتا ہے۔ یہ قوانین تخلیقی قوانین ہیں اور اللہ نے پیدائش کے وقت سے انسان کے اندر ان کا داعیہ رکھا ہے۔ جو امت دل کھول کر ان قوانین فطرت کو سمجھتی ہے اور ان کے مطابق اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر دلائل ہدایت تلاش کرتی ہے، وہ امت ہدایت یافتہ امت ہے کیونکہ وہ اس کائنات سے وہ قوانین دریافت کر لیتی ہے جس کے مطابق وہ اللہ کی معرفت اور اس کی اطاعت کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ جو امت ان قوانین فطرت اور قوانین نفس سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور اسے ان میں خدا تک پہنچنے کی راہ نظر نہیں آتی، وہ امت امت ضالہ ہے اور اس نے خود

اعراض کیا ہے اور سرکشی کی راہ اپنائی ہے۔

اس طرح اللہ نے ہر امت کے لیے کچھ مناسک رکھے ہیں' جن پر وہ عمل کرتی ہے' ایک منہاج رکھا ہے جس پر وہ چلتی ہے۔ لہٰذا مشرکین کے ساتھ مجادلہ میں اب وقت ضائع نہ کیا جائے' کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو راہ ہدایت اختیار کرنے سے روک رہے ہیں۔ وہ منہاج ضلالت میں دور تک چلے گئے ہیں لہٰذا اللہ بھی یہ نہیں چاہتے کہ ان لوگوں کو اسلام کے خلاف مجادلے اور مباحثے کا موقع ملے۔ وہ تو چاہتے ہی یہ ہیں' اے پیغمبرؐ آپ اپنی راہ پر آگے بڑھیں۔ آپ کی راہ سیدھی ہے اور نظام مستقیم ہے۔

وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ اِنَّکَ لَعَلٰی هُدًی مُّسْتَقِیْمٍ (۲۲:۶۷) "تم اپنے رب کی طرف دعوت دو' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو"۔ آپ اپنے منہاج پر مطمئن ہو جائیں اور استقامت کے ساتھ اس پر گامزن رہیں۔ اگر کوئی آپ سے مجادلہ کرے تو بات مختصر کریں اور جہاد کا وقت آیات کلامی پر بحثوں میں ضائع نہ کریں۔

وَاِنْ جٰدَلُوْکَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۲۲:۶۸) "اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ کو خوب معلوم ہے"۔ بحث و مباحثہ تب فائدہ مند ہوتا ہے کہ مخاطب ماننے کے لیے تیار ہو' اور وہ حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہو۔ ایسے افراد کے ساتھ مباحثہ مفید نہیں ہوتا جو اپنی بات پر مصر ہوں۔ اور وہ اس کائنات میں پائے جانے والے تمام دلائل کو جو انفس و آفاق میں موجود ہیں اور قرآن ان کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے' بکسر رد کر کے مکابرہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ کے حوالے کر دو' یہ اللہ ہی ہے جو تمام امتوں کے طریقوں کا فیصلہ قیامت میں کرے گا۔

اَللّٰهُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۲۲:۶۹) "اللہ قیامت کے روز تمہارے درمیان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو"۔ اللہ وہ جج ہے جس کے فیصلے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ قیامت کے فیصلے کے خلاف تو کوئی اپیل نہ ہو گی۔ یہ تو سپریم فیصلہ ہو گا۔

اللہ علم کامل کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اس کی کوئی سبب یا کوئی دلیل جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ عمل و شعور میں سے کوئی بات اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ وہ تو آسمانوں و زمین میں سب کچھ جانتا ہے اس میں لوگوں کے اعمال اور نیات سب شامل ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ (۲۲:۷۰) "کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے"۔ اللہ کا علم نہایت کامل اور نہایت ہی باریک ہے اور اس پر اس کائنات کی کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ وہ ایسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا' جس کی وجہ سے کوئی چیز محو ہو جاتی ہے یا بھول جاتی ہے۔ یہ سب کچھ تو ایک کتاب میں قلم بند ہے اور یہ ریکارڈ رکھنا اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔

انسانی عقل تو تھک جاتی ہے۔ خصوصاً اس کلیاتی نظام پر غور کرتے ہوئے بھی عقل تھک جاتی ہے۔ پھر جب ہم اس

پوری کائنات کے بارے میں اللہ کے علم کی جامعیت پر غور کرتے ہیں اور اسے حافظہ تصور میں لاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ بے شمار اشیاء ' اشخاص ' اعمال 'نیات 'خیالات اور حرکات 'عالم منظور میں اور عالم مخفی میں ہیں تو ہمارے تصور کا دامن تار تار ہو جاتا ہے 'لیکن اللہ کے علم و قدرت کے حوالے سے یہ تو شے یسیر ہے۔

انَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۲ : ۷۰) "یہ اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ہدایت دینے کے بعد کہ آپ مشرکین کو بحث و جدال کا کوئی موقع ہی نہ دیں کہ وہ آپ کی راہ مستقیم پر بحث کریں۔ اب حضور اکرم ؐ کو سمجھایا جاتا ہے کہ خود ان کی جو راہ ہے اور جو منہاج ہے اس میں تو بحث کی گنجائش ہے اور اس میں تو ٹیڑھ 'ضعف ' جہالت 'ظلم اور دوسرے تمام نقائص موجود ہیں اور یہ کہ یہ لوگ باطل پرست ہونے کی وجہ سے اللہ کی نصرت اور معاونت سے بھی محروم ہیں۔ کوئی مددگار ان کا نہیں ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کر رہے ہیں جن کے لیے نہ تو اس نے کوئی سند نازل کی ہے اور نہ یہ خود ان کے بارے میں کوئی علم رکھتے ہیں۔ ان ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس صورت حال یا قانون یا معاشرے کو اللہ کی طرف سے کوئی سند حاصل نہ ہو اس میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ جس چیز کی پشت پر اللہ کی قوت نہ ہو وہ کمزور ہے۔ اس کے اندر قوت کا بنیادی عنصر ہی موجود نہیں ہے جو سلطان الٰہی ہے۔

یہ لوگ بت پرست ' انسان پرست یا شیطان پرست ہیں۔ ان سب چیزوں پر خدائی ہاتھ موجود نہیں ہے اس لیے ایسے لوگ حقیقی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مذکورہ بالا چیزوں کی بندگی کسی دلیل 'کسی علم اور کسی یقین کی اساس پر نہیں کرتے۔ محض وہم اور خرافات کی بنیاد پر ان چیزوں کو مانتے ہیں۔ جب یہ اللہ کی نصرت اور مدد سے محروم ہوگئے تو اب دنیا و آخرت میں ان کا کوئی نصیر و مددگار نہیں ہے۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جس پر اللہ کی طرف سے کوئی سند جواز نہیں ہے 'نہ علم ہے ان کو 'پھر یہ دعوت حق بھی سننے کے لیے تیار نہیں 'نہ اسے قبول کرتے ہیں 'بلکہ یہ لوگ ضد میں آکر گناہ کے کام پر آمادہ ہوئے ہیں اور اس قدر ضد اور عناد میں آگئے ہیں کہ یوں نظر آتا ہے کہ ان کے سامنے کلام الٰہی پیش کرنے والے پر یہ لوگ ٹوٹ پڑیں اور اس کو چبا کر کھا جائیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا

الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ

"اور جب ان کو ہماری صاف صاف آیت سنائی جاتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ منکرین حق کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے جو انہیں ہماری آیات سناتے ہیں"۔

یہ لوگ دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیتے۔ نہ دلیل کو دلیل سے رد کرتے ہیں بلکہ یہ دلیل کے مقابلے میں غصہ کر کے مخالف کو کھا جانا چاہتے ہیں اور یہ دلیل نہ ہونے کی علامت ہے۔ اور سرکشوں کی آخری دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ لڑ پڑتے ہیں اور تشدد کرتے ہیں۔ وہ حق کا کلمہ سننا ہی نہیں چاہتے۔ ڈنڈے کی دلیل سے بات کرتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ڈنڈے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ان کو یہ جواب دیتا ہے:

قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ؀ۧ

۹ ع ۸ ۱۶

"ان سے کہو میں بتاؤں تمہیں کہ اس سے بدتر چیز کیا ہے؟ آگ، اللہ نے اسی کا وعدہ ان لوگوں کے حق میں کر رکھا ہے جو قبول حق سے انکار کریں، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

یہ کہ تم دلیل کا جواب ڈنڈے سے دیتے ہو تو پھر قوت کے مقابلے میں ایک بڑی قوت ہے۔ اس کا سامنا کرو اور انتظار کرو انجام کا۔ لیکن یاد رکھو کہ وہ بہت ہی برا انجام ہے۔

--- ○○○ ---

اب اس سورہ کا اعلان عام، تمام لوگوں کے لیے قرارداد، جراً باآواز بلند کہ لوگو ذرا اپنے معبودوں پر غور تو کرو۔ اللہ کے سوا جو شخص جس قسم کا الٰہ پوجتا ہے اس سے مدد طلب کرتا ہے جس شکل و صورت میں ہو وہ پکارے جانے والے۔ اللہ ان کے ضعف اور کمزوری کو ایک واضح مثال سے ظاہر کرتا ہے جسے دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ مثال کیا ہے ایک چلتے پھرتے متحرک منظر کی تصویر کشی ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور دل خوش ہوتا ہے۔ ذرا اس منظر میں ان خداؤں کی بیچارگی کا نظارہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ؀

"لوگو' ایک مثال دی جاتی ہے' غور سے سنو جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور"۔

یہ عام پکار ہے' بلند آواز سے اعلان عام ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ (۲۲:۷۳) اے لوگو' جب لوگ جمع ہو گئے تو ان کے سامنے ایک مثال ہے۔ ایک عجیب منظر کی شکل میں۔ یہ کوئی مخصوص مجلس نہیں ہے' نہ کوئی اتفاقی بات ہے بلکہ لوگوں کو بلایا گیا ہے۔

ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (۲۲:۷۳) "مثال دی جاتی ہے غور سے سنو' اس کو"۔ یہ مثال ایک قاعدہ اور اصول مقرر کرتی ہے اور حقیقت جاتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (۲۲:۷۳)

"جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے"۔ یعنی اللہ کے سوا تم جن بتوں کو پوجتے ہو' یا جن اشخاص کی بندگی کرتے ہو' یا رسومات اور تقالید کی بندگی کرتے ہو' جن سے تم نصرت طلب کرتے ہو' جن سے تم امداد طلب کرتے ہو اور جن سے تم عزت طلب کرتے ہو' یہ سب کے سب اگر مل جائیں تو ایک مکھی کی تخلیق بھی نہیں کر سکتے۔ مکھی اللہ کی مخلوقات میں سے بہت ہی صغیر و حقیر مخلوق ہے لیکن جن کو یہ الٰہ اور خدا کہتے ہیں وہ اس پر بھی قادر نہیں۔ اگرچہ وہ سب کے سب ایک دوسرے کی مدد پر جمع ہو جائیں تو اللہ کی مخلوقات میں سے اس نہایت ہی معمولی چیز کو وہ نہیں پیدا کر سکتے۔

جہاں تک مکھی کی تخلیق کا تعلق ہے وہ تو اونٹ اور ہاتھی جیسے بڑے حیوانات کی طرح مشکل اور محال ہے۔ کیونکہ مکھی کے اندر بھی وہی راز حیات ہے جو اونٹ اور ہاتھی کے اندر ہے لہٰذا محض محال ہونے میں تو چھوٹی بڑی مخلوق برابر ہے۔ لیکن قرآن کے معجزانہ انداز بیان نے یہاں مکھی جیسی صغیر و حقیر چیز کو مثال کے لیے منتخب کیا ہے کیونکہ اگر کوئی مکھی کی تخلیق سے عاجز ہے تو اس کی عاجزی بمقابلہ اونٹ یا ہاتھی زیادہ سہولت سے سمجھ میں آتی ہے' یہ محض تعبیری انداز ہے ورنہ حقیقت تو دونوں کی ایک ہے۔ قرآن کریم کا یہ نہایت انوکھا اسلوب ہے۔

اب ذرا ان معبودوں کی کمزوری کی سمت میں ایک قدم اور آگے جائیے۔

وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْــًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (۲۲:۷۳) "بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے"۔ ان معبودوں کی حالت تو یہ ہے کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اسے نہیں چھڑا سکتے۔ چاہے بت ہوں' چاہے اشخاص اور اولیاء ہوں۔ بلکہ بڑے بڑے فرعونوں سے مکھی اگر کوئی چیز اٹھا کر لے جائے تو وہ اسے پکڑ نہیں سکتے۔ یہاں بھی مکھی کو اختیار کیا گیا تاکہ اس صغیر و حقیر چیز کا سایہ ان بتوں پر پڑے اور ان کی بیچارگی اچھی طرح واضح ہو جائے۔ جبکہ اس کے اندر خطرناک بیماری ہوتی ہے اور وہ ہم سے قیمتی

چیزیں اڑا کر لے جاتی ہے۔ یہ کبھی ہم سے آنکھیں لے لیتی ہے' کبھی اس کی وجہ کوئی عضو شل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار تو آدمی اس بیماری سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہ سل 'ٹائیفائیڈ' ڈاسینٹری اور ہیضے کے جراثیم کی حامل ہے' لیکن ہم سے وہ چیزیں لے جاتی ہے جو ہم اس سے واپس نہیں لے سکتے۔

قرآن کا معجزانہ انداز کلام اس قسم کے ایک لفظ اور مفہوم کا انتخاب کر کے اس طرح کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ اگر قرآن مجید یہ کہتا کہ اگر درندے ان سے کوئی چیز لے جائیں تو یہ چھڑا نہیں سکتے تو اس سے ضعف کے مقابلے میں قوت کا تصور آتا' حالانکہ درندے مکھی سے زیادہ قیمتی شے نہیں چھین سکتے لیکن مکھی کے لفظ سے ان کی بیچارگی اور حقارت کا تصور زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

مثال کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ (۲۲ : ۷۳) "مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور"۔ تاکہ مکھی کے لفظ سے جو ضعف کی فضا بنی ہے وہ ثابت بھی ہو جائے۔ اب فضا تیار ہے' انسانی سوچ اور فکر میں ان الہوں کی حقارت اور بیچارگی بیٹھ گئی ہے' ایسی فضا میں قرآن اللہ کی قوت کا اعلان کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ انسان نے اللہ کی اس عظیم قوت کا اندازہ نہیں لگایا۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

"ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی' جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے"۔

○ لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی کہ وہ اللہ کے ساتھ ایسے عاجز' حقیر اور بیچارہ چیزوں کو شریک کرتے ہیں' جو اگر سب کے سب بھی جمع ہوں تو مکھی پیدا نہیں کر سکتے۔

○ انہوں نے اللہ کی کوئی قدر نہ پہچانی۔ حالانکہ وہ اللہ کے آثار قدرت دیکھتے ہیں' اس کی عجیب و غریب مخلوق کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسے الہوں کو شریک کرتے ہیں جو مکھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔

○ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی کہ وہ مدد طلب کرتے ہیں تو ان سے جن میں مدد دینے کی قوت ہی نہیں ہے بلکہ اگر ان سے مکھی کوئی چیز لے کر بھاگے تو وہ اسے بھی نہیں چھڑا سکتے۔

یہ ایسے حالات میں ایک سخت تنبیہ ہے کہ جہاں سامع خشوع و خضوع کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ لوہا گرم ہے اور ضرب لگا دی گئی ہے۔ ایسے حالات میں خدا کے اختیارات کے بارے میں جتایا جاتا ہے۔ اللہ ملائکہ میں سے پیغام لانے والے مقرر کرتا ہے اور انسانوں سے پیغام دینے والے مقرر کرتا ہے۔ اور یہ انتخاب اپنے علم اور قدرت کی وجہ سے کرتا ہے۔

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ

بَصِيْرٌ ﴿٧٥﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٧٦﴾

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ وہ سمیع اور بصیر ہے' جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں"۔

ملائکہ اور رسولوں کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں وہ صاحب قوت بادشاہ کے دربار سے ملے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عزیز و جبار کے نمائندے ہیں۔ ان کے پاس بادشاہ کے اختیارات ہیں۔ ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو ان بیچارہ بتوں کے آگے جھکتے ہیں۔ اللہ تو سمیع و بصیر ہے' سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔ جو لوگوں کے سامنے ہو وہ بھی جو ان کے پیچھے ہو' یا ان سے خفیہ ہو اس کو بھی۔ اس کا علم کامل و شامل ہے۔ اس سے کوئی قریب و بعید کی چیز غائب نہیں ہو سکتی۔ تمام باتوں اور مقدموں کا رجوع اور آخری فیصلے کا اختیار اللہ ہی کا ہے۔

ہر قوم کے مناسک ہوتے ہیں اور مشرکین کے یہ مناسک ہیں جو کسی سے بھی فروتر ہیں اور ان کی بندگی کی رسمیں کس قدر پوچ ہیں۔ امت مسلمہ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم تو ایک اعلیٰ اور برتر پیغام کے حامل ہو' اس پیغام کو اور اس دعوت کو غالب کرنے کے لیے عبادات کرو اور جہاد کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٧٧﴾ۚ۩ وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٧٨﴾

ع ۱۰

۱۷

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' رکوع اور سجدہ کرو' اپنے رب کی بندگی کرو' اور نیک کام کرو' اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو' اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"۔

ان دو آیات میں ایک پورا منہاج امت مسلمہ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ فرائض اور تقاضے بھی رکھ دیئے جو اس منہاج اور نظام کے ساتھ لازمی شرط کے طور پر لگے ہوئے ہیں۔ اس کی اہمیت کیا ہے؟ اور ماضی اور حال میں اس کی

جڑیں کہاں تک پھیلی ہیں' جب اس منہاج اور نظام کو اللہ کی خواہش کے مطابق قائم کر دیا گیا' یہ منہاج کیا ہے؟

○ اہل ایمان کو سب سے پہلے رکوع و سجود کا حکم دیا جاتا ہے۔ رکوع و سجود اسلام کے ممتاز بنیادی ارکان ہیں۔ قرآن کریم نماز کی تعبیر اکثر رکوع و سجود سے کرتا ہے کیونکہ یہ نماز کے اہم اجزاء اور نماز کا منظر پیش کرتے وقت ظاہری افعال ہیں جن کا تعلق منظرکشی سے ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا اسلوب اظہار منظر کی شکل میں ہے جو ایک دلنشیں انداز ہے۔ شعور پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

○ ممتاز ترین عبادت کے ممتاز ترین ارکان کے بعد ایک عام حکم جو پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بندگی جو نماز سے زیادہ جامع ہے۔ کیونکہ عبادت میں فرائض بھی شامل ہیں اور ہر وہ عمل بھی شامل ہے جس کے بارے میں اللہ کا کوئی حکم ہے اور اللہ کی رضامندی کے لیے اس کی تعمیل ہو۔ اسی طرح انسانی زندگی کی تمام حرکات کو عبادت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اگر یہ حرکات اللہ کی رضامندی کی نیت سے کی جائیں یہاں تک کہ زندگی کے وہ امور جن کا تعلق لذت سے ہے وہ بھی عبادت بن سکتے ہیں اگر ان پر اللہ کا ذکر کیا جائے' اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔ اور یہ نیت کی جائے کہ یہ نعمتیں استعمال کر کے ہم مزید عبادت اور جہاد کریں گے۔ محض نیت سے ہر چیز عبادت بن سکتی ہے اور محض نیت سے خالص عبادت کھیل بن سکتی ہے۔

○ یہ کہ اسلام خیر ہی خیر ہے' تمام اچھائی کے کام اسلامی نظام زندگی ہے۔ نماز' بندگی اور خیر خلاصہ ہے اسلامی نظام کا۔ اب اس اسلام کو عملی دنیا میں نافذ کرنا ہے اور اس میں تم کامیاب اس طرح ہو سکتے ہو کہ خیر کے کام کرو۔ اللہ کی بندگی اور عبادت سے تمہارا تعلق باللہ مضبوط ہو گا اور اچھے کام کرنے سے تمہاری عملی زندگی درست ہوگی۔ اس سے تمہاری اجتماعی زندگی کا رخ ایمان کی راہ پر پڑ جائے گا۔ جب امت کی تربیت یوں ہوگی کہ اس کا تعلق باللہ عبادت کے ذریعہ پختہ ہو گیا۔ اس کی عملی زندگی اللہ کی اطاعت اور عمل خیر کے ذریعے استوار ہو گئی تو تب امت یا امت میں سے کوئی جماعت اس ذمہ داری کے سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گی جو اسلامی نظام کے قیام کا واحد طریقہ ہے اور وہ کیا ہے؟

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲ : ۷۸) "اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے"۔ یہ نہایت ہی جامع تعبیر ہے' جہاد کا حق ادا کرو' اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری بہت ہی بڑی ہے۔ اس کے لیے بہت بڑی تیاری کی ضرورت ہے اور اس کے بہت بڑے تقاضے ہیں۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے' اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرو خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرو' شر و فساد اور ہر برائی کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو' تمہیں تو تیاری جہاد کے لیے' اس عظیم ڈیوٹی کے لیے کیا گیا ہے۔ تمام انسانوں میں سے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔

هُوَ اجْتَبٰكُمْ (۲۲ : ۷۸) "اس نے تمہیں چنا ہے"۔ پھر اللہ نے جو تمہیں چن لیا ہے تو تمہاری ذمہ داری دوسروں کے مقابلے میں بڑھ گئی ہے۔ اب اعتذار اور فرار کی تو کوئی راہ باقی نہیں رہی۔ یہ تو اس امت اور جماعت کے لیے اللہ کی طرف سے اکرام ہے اور چاہئے کہ ہم اللہ کا شکر ادا کریں اور اس کام کو اچھی طرح انجام دیں۔

پھر اللہ کی رحمت بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔ کام بھی آسان ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲:۷۸) "دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی گئی" ۔یہ دین اور اس کے فرائض اس کی عبادات' اس کے قوانین اور اس کے اخلاق میں انسانی فطرت کو مدنظر رکھا گیا ہے اور انسان کی فطری قوتوں کو تعمیری کاموں میں لگایا گیا ہے ۔ان کو اس طرح بند نہیں کیا گیا جس طرح گیس کو بند کیا جاتا ہے اور نہ ان قوتوں کو حیوانات کی طرح آزاد چھوڑا گیا ہے ۔ پھر یہ دین ایک ایسا منہاج ہے کہ اس کی جڑیں ماضی کی تاریخ میں بھی دور تک موجود ہیں۔

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرٰهِيمَ (۲۲:۷۸) "قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر"۔

یہ دین تو توحید کا سرچشمہ ہے اور اس کا سرا حضرت ابراہیم سے ملتا ہے ۔ لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ اس کی جڑیں زمین پر نہ ہوں اور اس کی تاریخ کے اندر بھی کوئی بڑا خلا (GAP) نہیں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کی رسالتوں میں تھا۔اور نام بھی اس کا تاریخی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تمہیں مسلمان کا نام دیا ہے اور اس ملت کا نام ملت اسلامیہ رکھا ہے ۔

اسلام کا مفہوم ہی یہ ہے کہ چہرے' نیت اور اعمال سب کو خدا کی طرف موڑ دو ۔ لہٰذا امت مسلمہ کا روز اول سے ایک ہی نظریہ' ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی قبلہ ہے ۔ حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک ہی سلسلہ' ایک ہی نظام اور ایک ہی پیغام ہے ۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے آخر میں یہ امانت دی گئی اور حکم دیا گیا کہ یہ پیغام تمام انسانیت تک پہنچانا ہے ۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲۲:۷۸) "تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو"۔ تو رسول امت پر گواہ ہے یعنی وہ اس کے لیے نظام وضع کرے گا' صحیح و غلط اور نیک و بد کی تمیز سکھائے گا' اور یہی فریضہ یہ امت دوسرے لوگوں کے حوالے سے ادا کرے گی ۔ یہ امت گویا پوری انسانیت کی نگران ہے ۔اس امت کی شرعی قدریں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی تربیت اور اس کی سوچ بھی اس لائن پر ہے ۔یہ امت' امت مسلمہ نہ ہوگی اگر وہ تمام انسانیت کی نگرانی نہ کرے اور اپنا اصلی فریضہ نہ ادا کرے ۔

امت مسلمہ نے جب تک اسلامی نظام زندگی کو اپنے ہاں اپنی زندگیوں میں نافذ کیے رکھا' وہ پوری دنیا کی نگران رہی۔ جب اس امت نے شریعت کے نظام سے انحراف کیا اور اپنے فرائض ادا کرنے ترک کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے اسے مقام قیادت سے ہٹا کر دوسروں کا دم چھلا بنا دیا اور اب وہ ہمیشہ ایسے ہی رہے گی جب تک وہ اسلامی نظام کی حامل نہیں ہوتی۔

یہ فریضہ وہ تب تک ادا نہیں کر سکتی جب تک اس کے لیے تیاری نہ کرے اور تیاری کا نسخہ اللہ بتاتے ہیں ۔یہ کہ نماز پڑھو' یہ کہ زکوٰۃ دو اور یہ کہ اللہ پر مکمل بھروسہ کرو۔

فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ (۲۲:۷۸) "پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔وہ ہے تمہارا مولیٰ' بہت ہی اچھا ہے

وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"۔

○ نماز ایک فانی اور کمزور انسان کا رابطہ اس ذات کے ساتھ استوار کرتی ہے جو قوی ہے اور مقتدر قوت ہے۔

○ زکوٰۃ امت مسلمہ اور جماعت مسلمہ کے افراد کے درمیان صلہ رحمی کا قیام ہے۔ حاجات اور ضروریات میں افراد جماعت کی کفالت کا انتظام ہے تاکہ فساد پیدا نہ ہو۔

○ اور اللہ پر بھروسہ وہ مضبوط رسی ہے جس کو کبھی ہاتھ نہ چھوڑنا چاہیے۔

یہ ہیں وہ سامان جنگ جن کے ذریعہ یہ امت وہ فریضہ شہادت علی الناس ادا کر سکتی ہے۔ جس کے لیے اسے اٹھایا گیا تھا اور ان اخلاقی اسلحہ کے علاوہ امت کے لیے عمومی ہدایت ہے کہ وہ حد استطاعت تک روایتی زمینی اسلحہ بھی جمع کر سکتی ہے۔ قرآن اس سے غافل نہیں رہا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ اس قوت' اس فوجی تربیت اور اس سازوسامان کے جمع کرنے پر زور دیتا ہے جو امت مسلمہ کا واحد اسلحہ ہے اور کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ رابطہ' صلاح اور اصلاح اور نظر بلند اور سربلندی۔

اسلامی نظام کے پیش نظر اصل مقصد یہ ہے کہ انسانیت کو اس کمال تک پہنچایا جائے جو اس زمین میں حاصل کرنا ممکن ہو۔ اسلام یہاں محض جانوروں کی طرح حیوانی ترقی پر زور نہیں دیتا بلکہ روحانی ترقی پر بھی زور دیتا ہے۔

انسانیت کی بلند اقدار انسان کی مادی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھتی ہیں لیکن وہ اپنی سرگرمیوں کو صرف مادی ضروریات تک محدود نہیں رکھتیں اور یہی اسلام کا مطالبہ ہے امت مسلمہ سے 'کہ دنیا کی قیادت اسلام کے جامع نظام کی روشنی میں کی جائے۔ صدق اللہ العظیم

---000---

فی ظلال القرآن

جلد ---- چہارم

پارہ ------ ۱۸

سورۃ المؤمنون ـ ۲۳

۱--- تا--- ۱۱۸

سورۃ النور ـ ۲۴

۱--- تا--- ۶۴

سورۃ الفرقان ـ ۲۵

۱--- تا--- ۲۰

سورۃ المومنون ایک نظر میں

یہ سورہ المومنون ہے' اس کا نام ہی اس کے موضوع اور مضمون کو متعین کر دیتا ہے ۔ مضمون کا آغاز ہی مومنین کی صفات سے ہوتا ہے اور اس کے بعد نفس انسانی سے اور اس کائنات کی وسعتوں سے دلائل ایمان دیئے جاتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت بیان کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء اسی ایمان کی طرف دعوت دیتے چلے آئے ہیں ۔ بتایا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی اقوام کے لوگوں نے اس ایمان کی بابت کیا کیا شبہات بیان کیے 'کیا کیا اعتراضات کیے ' اس دعوت ایمانی کی راہ کس کس طرح روکتے رہے اور انہوں نے کن وجوہات کی بنا پر رسولوں کی تکذیب کی' رسولوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کی اور اللہ ہمیشہ کس طرح مومنین کو نجات دیتا رہا اور مکذبین کو ہلاک کرتا رہا۔ نیز یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جب بھی رسول آئے ' انہوں نے لوگوں کے دلوں میں ایمان بٹھایا اور تمام رسولوں نے اسی ایک حقیقت کی طرف دعوت دی لیکن جب رسول اس دنیا سے اٹھ گیا تو اس کے بعد لوگوں نے اپنے ایمان کے اندر اختلافات شروع کر دیئے ۔ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو موقف اختیار کیا وہ بعینہ وہی ہے جو تمام قوموں نے اپنے رسولوں کے خلاف اختیار کیا۔ یہ موقف نہایت ہی مکروہ موقف ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ آخر میں مناظر قیامت میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انبیاء کی تکذیب کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ یوں کفار کو ملامت کی جاتی ہے کہ ان کا یہ موقف مکروہ اور مشکوک ہے اور اس کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ آخر میں اس بات کی توثیق کی جاتی ہے اور اہل اسلام کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت کے طلبگار ہوں۔ غرض سورہ المومنون میں ' ایمان کے مسائل' ایمان کے دلائل اور ایمان کی صفات بیان کی گئی ہیں اور یہی اس سورہ کا موضوع ہے اور اسی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔

اس سورہ کے بھی کئی دائرے ہیں۔ پہلا دائرہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اہل ایمان یقیناً فلاح پائیں گے ۔ اس کے بعد مومنین کی صفات کا بیان شروع ہوتا ہے جن کی کامیابی کا اعلان یہاں کیا جا رہا ہے ۔ اس کے بعد بیان کا یہ سلسلہ انفس اور آفاق میں پائے جانے والے دلائل ایمان کے موضوع میں داخل ہو جاتا ہے ' چنانچہ سب سے پہلے تخلیق انسان کے عمل میں جنین کے مختلف حالات غور کے لیے پیش کیے جاتے ہیں ' اور پوری انسانی زندگی کا آغاز اور اس کا انجام مجملاً زیر بحث لایا جاتا ہے ۔ زندگی کے دوسرے مراحل کے مقابلے میں جنین کے مختلف مراحل کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور آخر میں انسانی زندگی کا یہ سلسلہ یوم آخرت کی طرف چلا جاتا ہے کہ اسی طرح آخرت میں دوبارہ تمہاری تخلیق ہو گی۔

اس کے بعد بیان کا رخ آفاقی دلائل کی طرف پھر جاتا ہے کہ ذرا آسمانوں کی تخلیق پر غور کرو' آسمانوں سے پانی برسنے کے نظام پر غور کرو' پھر ان پانیوں سے مختلف قسم کی زرعی پیداوار اور پھلوں کی پیداوار پر غور کرو' پھر مختلف قسم کے جانوروں پر غور کرو' اور خصوصاً ان جانوروں پر غور کرو جن کو تم سواری کے لیے استعمال کرتے ہو اور کشتیوں پر غور کرو

جن میں تم بحری سفر کرتے ہو۔

دوسرے دور میں انفس اور آفاق میں دلائل ایمان سے روئے سخن حقیقت ایمان کی طرف پھر جاتا ہے کہ وہ حقیقت کیا ہے جس کی طرف تمام انبیاء بلا استثناء دعوت دیتے چلے آئے ہیں وہ یہ ہے ۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارے لیے کوئی اور حاکم نہیں ہے"۔ یہی کلمہ اور یہی دعوت حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کے سامنے پیش کی۔ آپ کے بعد آنے والے تمام رسولوں نے بھی یہ دعوت اپنی اپنی اقوام کے سامنے پیش کی۔ اور یہی دعوت آخر کار خاتم النبین نے پیش کی اور اس دعوت پر تمام زمانوں میں تکذیب کرنے والوں نے یہی ایک اعتراض کیا۔

مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنْكُمْ "یہ کچھ بھی نہیں ہے مگر تم ہی میں سے ایک شخص"۔ اور یہ اعتراض کہ

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (۲۳ : ۲٤) "اگر اللہ چاہتا تو وہ اپنے فرشتے نازل کر دیتا"۔ اور پھر تمام لوگوں کا اعتراض یہ تھا۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ (۲۳ : ۳٥) "یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جاؤ گے' اس وقت تم نکالے جاؤ گے"۔ تمام رسولوں نے آخر کار اللہ کی بارگاہ میں پناہ لی اور اللہ کی نصرت طلب کی۔ اللہ نے ہمیشہ رسولوں کی دعا کو قبول کیا اور مکذبین کو ہلاک کر دیا۔ یہ دور رسولوں کی پکار پر اس ربانی ہدایت پر ختم ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (٥١)

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳ : ٥۲) "اے پیغمبرو' کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح' تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اسے خوب جانتا ہوں اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے' اور میں تمہارا رب ہوں' پس مجھ ہی سے ڈرو"۔

تیسرے دور میں یہ کہا گیا ہے کہ رسولوں کے بعد پھر لوگوں کے اندر کس طرح تفریق پیدا ہو گئی اور کس طرح فرقہ واریت اور تنازعات پیدا ہو گئے۔ حالانکہ امت ایک تھی اور ایمان کی حقیقت بھی ایک تھی۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۲۳ : ٥۳) "مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔ وہ اپنی غفلت میں مگن ہیں۔ اللہ نے اہل ثروت کو جو انعامات دیئے وہ ان میں مگن ہیں اور کفار دنیا کے ساز و سامان میں مگن ہیں۔ ان کے مقابلے میں جن لوگوں کو دولت ایمان دی گئی ہے وہ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی بندگی

کرتے اور اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کرتے۔ ہر وقت وہ خوف خدا اور خشیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ (۲۳: ۶۰) "اور ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ ان غافلوں، مغروروں اور منکرین کا اس وقت کا منظر پیش کرتا ہے جب ان کو اللہ کی پکڑ آلیتی ہے اور وہ فریاد کرنے لگتے ہیں۔ اس منظر میں ان کو دکھاتے ہوئے سخت تنبیہ اور توبیخ کی جاتی ہے۔

قَدْ كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ (٦٦) مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ (۲۳: ۶۷) "میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگ نکلتے تھے، اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ اپنی چوپالوں میں اس پر باتیں چھانٹتے تھے اور بکواس کیا کرتے تھے۔ رسول امین کے بارے میں ان لوگوں نے جو موقف اختیار کیا ہوا تھا اس پر سخت گرفت کی جاتی ہے۔ حالانکہ رسول امین ان کے لیے کوئی نئی شخصیت نہ تھے، وہ انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ تو ان کے پاس ایک سچی دعوت لے کر آئے تھے، پھر آپ اس پر ان سے کوئی اجر بھی نہ طلب فرماتے تھے تو ان لوگوں کو آپ کی دعوت میں سے کس چیز پر اعتراض تھا؟ وہ تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمانوں کا مالک صرف اللہ ہے، وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ صرف اللہ ہی رب ہے زمین و آسمانوں کا خالق ہے اور صرف اللہ ہی ہے جس نے اس پوری کائنات کو تھام رکھا ہے۔ ان امور کو تسلیم کرنے کے بعد وہ جس چیز کا انکار کرتے تھے وہ یہ تھی کہ مرنے کے بعد دوبارہ کس طرح ہم زندہ ہو سکتے ہیں، نیز وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ اللہ کی اولاد ہے اور اس کے سوا بھی وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک ٹھہراتے تھے۔

فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۲۳: ۹۲) "اللہ بلند ہے ان الہوں سے، جن کو وہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں"۔ آخری دور میں ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے اور یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ برائی کو اس طریقے سے دفع کریں جو بہترین ہو اور شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگیں۔ غصہ نہ کریں اور نہ اپنے آپ کو پریشان کریں۔ وہ لوگ جو کچھ بکتے ہیں بکتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیامت کے ایک منظر کی جھلک دکھا دی جاتی ہے جس میں ان کے لیے ایک خوفناک عذاب انتظار میں ہے، جہاں ان کے ساتھ نہایت ہی توہین آمیز سلوک ہو گا اور ان کی سخت سرزنش کی جائے گی۔ یہ سبق اللہ کی پاکی کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ (۲۳: ۱۱۶) "پس بالاتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی، کوئی حاکم اس کے سوا نہیں ہے وہ مالک ہے عرش بزرگ کا"۔ سورہ کے آخر میں اس بات کی نفی کر دی جاتی ہے کہ کفار کو کوئی کامیابی ہو گی جس طرح اس سورہ کے آغاز میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اہل ایمان کو کامیابی ہو گی۔

وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۲۳ : ۱۱۷) "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے"۔اور یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رحمت اور مغفرت کی طلب کرو۔

وَقُل رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ (۲۳ : ۱۱۸) "اور اے نبی کہو میرے رب درگزر فرما اور رحم کر تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے"۔ سورہ کا انداز بیان اور اس کی فضا ایسی ہے کہ اس میں فکر و ضمیر کو بیدار کیا جاتا ہے' وجدانی طرز استدلال کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور حقائق کو فیصلہ کن تقریری اور قرارداد کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پوری سورہ پر ایمان کی فضا چھائی ہوئی ہے کیونکہ ایمان ہی سورہ کا اہم موضوع ہے۔ آغاز سورہ میں مومنین کی یہ صفت آتی ہے۔

الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (۲۳ : ۲) "وہ لوگ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔ سورہ کے درمیان میں مومنین کی یہ صفت بیان ہوئی ہے :

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ (۲۳ : ۶۰) "وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔اور وجدانی رخ یوں دیا جاتا ہے :

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۲۳ : ۷۸) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم کم ہی شکرگزار ہوتے ہو"۔ غرض یہ تمام سورہ ایک لطیف ایمان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۴۸ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۲

آیاتها ۱۱۸ — سورۃ المؤمنون مکیۃ — رکوعاتها ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ وَ الَّذِيْنَ
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۷﴾ وَ الَّذِيْنَ
هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں' لغویات سے دور رہتے ہیں' زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں' اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں' اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں' اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی

لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

یہ ایک پختہ وعدہ ہے بلکہ یہ عالم بالا کی ایک دو ٹوک قرار داد ہے کہ مومنین لازماً فلاح پائیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ تو کبھی اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ پھر یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اللہ کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا کہ مومنین دنیا میں بھی فلاح پائیں گے اور آخرت میں بھی فلاح پائیں گے۔ ایک مومن انفرادی طور پر فلاح پائے گا اور اہل ایمان کی جماعت بھی فلاح پائے گی۔ لیکن کامیابی جسے ایک مومن اپنے دل اور اپنی حقیقی زندگی میں محسوس کرتے ہوں اور اس کے اندر فلاح کے وہ تمام مفہوم پائے جاتے ہوں جن سے دنیا باخبر ہے اور وہ مفاہیم بھی پائے جاتے ہوں جن سے اہل ایمان باخبر بھی نہ ہوں اور اللہ نے مستقبل میں ان کے لیے اس کا فیصلہ کر رکھا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ مومنین کون ہیں جن کے ساتھ اللہ نے اس قدر پختہ وعدہ کر لیا ہے اور پیشگی ان کی فلاح اور کامیابی کا اعلان کر دیا ہے۔

یہ کون لوگ ہیں جن کے لیے بھلائی' نصرت' سعادت' توفیق اور دنیا کا سازوسامان لکھ دیا گیا ہے' اور جن کے لیے آخرت کا اجر' کامیابی اور نجات لکھ دی گئی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے رب نے ان سے راضی ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور ان کے لیے اللہ نے اس جہان اور اس جہاں کی فلاح لکھ دی ہے اور وہ کچھ لکھ دیا ہے جس کے بارے میں انسانوں کو علم ہی نہیں ہے۔

یہ کون لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہونے والے ہیں اور جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کے بارے میں سیاق کلام یہ تفصیلات دیتا ہے۔

- جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔
- جو لغویات سے دور رہتے ہیں۔
- جو زکوٰۃ کے طریقے پر عامل رہتے ہیں۔
- جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے' اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں۔
- جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں۔
- جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان صفات کی قدر و قیمت کیا ہے؟

یہ صفات ایک مسلمان کی شخصیت کے مختلف رنگ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مسلم انسانیت کے افق پر تمام انسانوں کے مقابلے میں بلند نظر آتا ہے۔ وہ افق جس کا معیار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہے' کیونکہ آپ تمام مخلوقات سے برتر اخلاق کے مالک تھے۔ آپ کی تربیت اللہ نے فرمائی تھی اور بہترین تربیت فرمائی تھی اور اس امر کی شہادت اپنی کتاب میں دی۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "اے محمدؐ آپ خلق عظیم کے مالک ہیں"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

جب آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن "آپ" کا اخلاق قرآن تھا"۔ اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے سورہ المومنون کی یہ (۱۱) آیات تلاوت فرمائیں اور فرمایا ایسے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲۳ : ۲) "وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو ان کے دلوں میں یہ خوف بیٹھا ہوتا ہے کہ وہ رب ذوالجلال کے سامنے کھڑے ہیں' نہایت سکون اور نہایت ہی دھیمے پن کے ساتھ۔ ان کی حرکات' ان کے انداز قیام' ان کے انداز سجود سے خوف خدا اور خشوع عیاں ہوتا ہے ان کی روح اللہ کی عظمت اور جلال سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے ذہن سے تمام دوسرے مشاغل غائب ہو جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں حضوری کے سوا تمام تصورات اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ان کے پردۂ احساس سے ان کا پورا ماحول اور ان کے تمام دوسرے حالات اور تعلقات ان کے جسم و خیال سے محو ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اللہ کا احساس رکھتے ہیں اور صرف ذات باری کی معرفت کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا وجدان تمام کثافتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ وہ تمام دنیاوی روابط کو کچھ دیر کے لیے جھٹک دیتے ہیں۔ غرض نماز کے وقت اللہ کے جلال کے سوا ان کی نظروں میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یوں یہ حقیر ذرہ اپنے حقیقی مصدر سے مل جاتا ہے۔ ایک حیران روح کو طاقت پرواز مل جاتی ہے۔ ایک پریشان دل کو جائے قرار مل جاتی ہے۔ اس مقام پر تمام چیزیں' تمام دنیاوی قدریں اور تمام افراد و اشخاص نظروں سے گر جاتے ہیں اور ان چیزوں کا وہی پہلو نظروں میں ہوتا ہے جس کا تعلق اللہ سے ہو۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳ : ۳) "جو لغویات سے دور رہتے ہیں"۔ ایسی باتوں سے دور رہتے ہیں جو لغو ہوں۔ ایسے افعال سے دور رہتے ہیں جو لغو ہوں' ایسی ترجیحات سے دور رہتے ہوں جو لغو ہوں' ایسے خیالات سے دور رہتے ہیں جو لغو ہوں۔ ایک مومن کے دل میں وہ چیز ہوتی ہے جو اسے لہو و لعب اور لغو باتوں سے دور رکھتی ہے۔ یعنی وہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ اللہ کی جلالت قدر کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ وہ نفس انسانی اور آفاق کائنات میں موجود آیات الٰہیہ کے تدبر میں مصروف رہتا ہے۔ اس کائنات کے مناظر میں سے ہر منظر اس کے دماغ کو مصروف رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کی فکر ہر وقت ان مناظر میں غور کرتی رہتی ہے اور اس کا وجدان ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ ہر وقت اپنے قلب و نظر کی تطہیر میں لگا رہتا ہے' تزکیہ نفس کرتا رہتا ہے اور ضمیر کو پاک کرتا رہتا ہے۔ نیز ایک مومن نے اپنے طرز عمل میں جو تبدیلی لانی ہوتی ہے وہ رات اور دن اسی میں مصروف رہتا ہے۔ پھر ایمان کی راہ میں اسے جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ان کے دور کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی اسے کرنی ہوتی ہے۔ پھر اس نے اپنی جماعت کی صف بندی بھی کرنی ہوتی ہے اور اسے فتنہ و فساد سے بچانا ہوتا ہے۔ ایک مسلم کو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ اسلامی سوسائٹی کی نصرت اور حمایت کرنی ہوتی ہے اور اسلامی سوسائٹی کے مخالفین اور معاندین سے اسے بچانا ہوتا ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو ایک مسلمان کے لیے ہر حال میں واجب الاداء ہیں۔ یہ تمام کام فرض عین ہیں یا فرض کفایہ ہیں۔ یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر ان کو صحیح طرح سرانجام دیا جائے تو انسان کی پوری

زندگی کی تمام سعی وجہد کے لیے یہ کام کفایت کرتے ہیں کیونکہ انسان کی عمر محدود ہے اور اس کی طاقت بھی محدود ہے۔ اس طاقت کو کوئی شخص یا تو مذکورہ بالا کاموں میں صرف کر کے انسانی زندگی کی نشوونما' ترقی اور اصلاح میں کھپائے گا یا اس محدود قوت کو لہو ولعب میں اور فضولیات میں خرچ کرے گا۔ جبکہ اسلام کی جانب سے ایک مسلم کا یہ فریضہ ہے کہ اپنی قوتوں کو تعمیر و ترقی' نشوونما اور اصلاحی کاموں میں خرچ کرے گا۔ یاد رہے کہ یہ تمام فرائض اور شریعت کی تمام ہدایات کسی مسلمان کو وقتاً فوقتاً جائز تفریح سے نہیں روکتے۔ کیونکہ جائز تفریح اور لہو ولعب اور زندگی کو بالکل بے معنی بنانے کے درمیان بہت فرق ہے۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳ : ٤) "وہ لوگ جو زکوۃ کے طریقے پر عمل پیرا رہتے ہیں"۔ اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور لہو ولعب اور بے معنی زندگی سے دور ہونے کے بعد وہ زکوۃ پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ زکوۃ انسانی دل اور انسانی دولت دونوں کے لیے پاکیزگی کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان کا دل کنجوسی سے پاک ہوتا ہے اور انسان ذاتی مفاد کو قربان کر دیتا ہے اور شیطان کی اس وسوسہ اندازی کا بھی مقابلہ کرتا ہے کہ تم غریب ہو جاؤ گے نیز زکوۃ کی وجہ سے سوسائٹی کا یہ روگ بھی دور ہو جاتا ہے کہ اس میں کچھ لوگ تو مالدار ہوں اور کچھ ایسے ہوں جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ گویا یہ ایک لحاظ سے سوشل سیکورٹی کا ایک نظام ہے اور غریبوں کے لیے اجتماعی کفالت کا ذریعہ۔ اس کے ذریعے تمام لوگوں اور پوری سوسائٹی کے درمیان امن و اطمینان اور اتحاد و اتفاق کا سامان کیا جا سکتا ہے اور طبقاتی کشمکش کو دور کیا جا سکتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳ : ۵) "وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں"۔ یہ روح کی پاکیزگی ہے' یہ ایک خاندان کی پاکیزگی ہے۔ اور پھر پوری سوسائٹی کی طہارت ہے۔ اس کے ذریعے ایک نفس' ایک خاندان اور ایک معاشرے کو گندگی سے بچانا مقصود ہے۔ انسان کی شرمگاہ کو غیر حلال اور ناجائز مباشرت سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ انسانی دل حرام کاری سے محفوظ رہتا ہے اور سوسائٹی سے جنسی بے راہ روی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے خاندان اور ان کا نسب خراب ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنسی تسکین کے لیے ایک سخت ضابطہ تجویز کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جن سوسائٹیوں میں آزاد شہوت رانی کا رواج ہوتا ہے ان کا نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور ایسی سوسائٹیاں فساد کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کسی بھی ایسی سوسائٹی میں خاندانی نظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے اور خاندان کا کوئی احترام نہیں رہتا۔ جبکہ فیملی کسی بھی سوسائٹی کے لیے پہلی وحدت اور پہلا یونٹ ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ نرسری ہوتی ہے۔ جس میں انسانی پود پروان چڑھتی ہے اور درجہ بدرجہ بڑھتی ہے۔ لہٰذا خاندان کے ماحول میں امن و سکون اور پاکیزگی کا دور دورہ ہونا ضروری ہے تاکہ یہ نرسری تدریج کے ساتھ نشوونما پائے اور والدین ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے نئی انسانی پود کی پرورش کریں۔ خصوصاً نہایت ہی چھوٹے بچوں کی پرورش اور خاندانی نظام کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔

پھر جس سوسائٹی کے اندر آزاد شہوت رانی بے حد و حساب اور بے روک ٹوک ہو وہ ایک گندی اور غلیظ سوسائٹی ہوتی ہے۔ اس کے افراد گرے ہوئے اور بے ہمت ہوتے ہیں کیونکہ وہ معیار جس میں انسانی ترقی میں کوئی غلطی نہیں ہوتی

یہ ہے کہ انسان کی قوت ارادی اس کے تمام امور اور تمام میلانات پر حاوی ہو۔ انسان کے تمام فطری تقاضے اس طرح منظم ہوں کہ وہ پاک و صاف ہوں اور اس سوسائٹی کے اندر انسانی پودکی جو نرسری تشکیل پائے وہ شرمندہ طریقوں کے مطابق نہ ہو۔ اور بچے اس دنیا میں ایسے پاک طریقے کے مطابق آئیں کہ ہر بچے کو اپنا باپ معلوم ہو۔ اور یہ نہ ہو کہ اس میں ایک مادہ حیوان کسی بھی نر حیوان سے نطفہ لے اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حیوان کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس طرح آیا ہے اور کون اسے لایا ہے۔

یہاں قرآن کریم متعین طور پر بتا دیتا ہے کہ انہوں نے اس نرسری کے لیے بیج کس طرح بونا ہے اور زندگی کی یہ تخم ریزی کہاں کرنی ہے۔

اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (۲۳ : ۶) "سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں۔ جہاں تک بیویوں کا تعلق ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ اس میں کوئی قیل و قال ہے۔ یہ تو ایک معروف اور قانونی نظام ہے لیکن ملک یمین کے مسئلے کی تشریح ضروری ہے۔ غلامی کے مسئلے پر ہم 'فی ظلال القرآن' کی جلد دوئم میں مفصل بحث کر آئے ہیں جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جب اسلامی نظام آیا تو غلامی ایک عالمی نظام کے طور پر رائج تھی۔ اسی طرح جنگی قیدیوں کو غلام بنانا بھی ایک عالمی مسئلہ تھا۔ اسلام اور کفر کی کشمکش میں دشمنان اسلام اپنی پوری مادی قوت لے کر میدان میں اترے ہوئے تھے' اس لیے اسلام کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس نظام کو یکطرفہ طور پر ختم کر دے اور صورت حال یہ ہو جائے کہ مسلمان تو قیدی بن کر کفار کے غلام بن جائیں اور کفار قیدی ہو کر آئیں تو وہ اس قانون کی رو سے آزاد ہو جائیں۔ اسلامی نظام نے بامر مجبوری جنگی قیدیوں کی غلامی کا قانون تو بحال رکھا جبکہ غلامی کے دوسرے سرچشمے بند کر دیئے۔ اور یہ بھی اس وقت تک کہ قانون بین الاقوام میں غلامی کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں ہو جاتا۔

چنانچہ اس قانون کے مطابق اسلامی کیمپ میں بعض قیدی عورتیں آجاتی تھیں جو غلام ہوتی تھیں اور اس غلامی کی وجہ سے ان کا درجہ ایک آزاد منکوحہ عورت کے برابر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اسلام نے ان کے ساتھ مباشرت کی اجازت صرف اس شخص کو دے دی جو ان کا مالک ہوتا۔ یہاں تک کہ ان کو ان طریقوں کے مطابق آزادی مل جائے جو اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے وضع کیے اور یہ طریقے متعدد تھے۔

اسلام نے ملک یمین میں مباشرت کی جو آزادی دی ہے' اس میں خود اسیر عورتوں کی فطری ضروریات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ یہ قیدی عورتیں اسلامی معاشرے میں آزاد شہوت رانی کرتی پھریں۔ جس طرح آج ہمارے دور میں جنگی قیدی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خصوصاً اس دور کے بعد جبکہ جنگی قیدیوں کو غلام نہ بنانے کا بین الاقوامی معاہدہ ہو گیا۔ اسلام نے یہ قانون اس لیے جاری رکھا ہے کہ اسلام آزاد شہوت رانی اور جنسی بے راہ روی کے خلاف ہے۔ یہ ایک عارضی نظام تھا اور اس وقت تک کے لیے تھا جب تک اللہ کی طرف سے ان کی آزادی کا انتظام نہیں کر دیا جاتا۔ اور یہ غلام عورتیں آزادی کے مقام تک نہیں پہنچ جاتیں۔ اسلام نے ایسے قوانین بنائے کہ کوئی غلام عورت بہت سے ذرائع استعمال کر کے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر اس کے مالک سے اس کا لڑکا یا لڑکی پیدا ہو جائے اور یہ مالک فوت ہو جائے تو یہ غلام

عورت آزاد ہو جائے گی یا یہ مالک خود اسے آزاد کر دے یا کسی کفارہ میں وہ آزاد ہو جائے۔ نیز مکاتبت کے ذریعے بھی غلام عورت آزاد ہو سکتی ہے۔ مکاتبت وہ تحریری معاہدہ ہوتا ہے جس میں ایک غلام اپنی آزادی کے لیے اپنے مالک کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے میری کتاب شبہات حول الاسلام)

بہر حال غلامی ایک عارضی جنگی ضرورت تھی اور یہ اس طرح تھی کہ بین الاقوامی سطح پر جنگی قوانین مثل بالمثل ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح دشمن قوم جنگی قیدیوں سے سلوک کرے گی' اسلام بھی ویسا ہی سلوک کرے گا۔ غرض آزاد لوگوں کو غلام بنانا اسلامی نظام کا کوئی مستقل اصول نہ تھا کیونکہ یہ ایک بین الاقوامی ضرورت تھی۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۲۳:۷) "البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں"۔ یعنی جو شخص اپنی منکوحہ بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے علاوہ دوسرے کسی طریقے سے بھی شہوت رانی کرے گا وہ جائز دائرہ سے تجاوز کرنے والا ہو گا۔ وہ حرام میں پڑ جائے گا۔ تعدی یوں ہوگی کہ نکاح اور جماع کے بغیر وہ دوسرے طریقے سے شہوت رانی کر رہا ہے۔ یوں اس کا ضمیر بھی اسے ملامت کرے گا کیونکہ وہ ایک ایسی چراگاہ میں چر رہا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ پھر اس حرام کاری کے نتیجے میں جو نرسری ہوگی وہ بھی شتر بے مہار ہوگی اور اس کی وجہ سے پوری سوسائٹی فساد کا شکار ہو جائے گی۔ اس سوسائٹی کے بھیڑیے آزاد ہو جائیں گے اور جہاں سے چاہیں گے' گوشت نوچ لیں گے۔ یہ تمام ایسی صورتیں ہیں جنہیں اسلام ناپسند کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۲۳:۸) "جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں"۔ یعنی انفرادی طور پر بھی وہ اپنے عہد و پیمان کے محافظ ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی وہ عہد و پیمان کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں۔

امانتوں میں وہ تمام ذمہ داریاں آتی ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے ذمہ لازم ہوتی ہیں۔ پہلی امانت تو فطرت انسانی ہے۔ فطرت انسانی کو اللہ نے نہایت ہی سیدھا بنایا ہے اور فطرت انسانی ناموس کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ اور یہ دونوں پھر اللہ کی وحدانیت اور اس کی تخلیق پر شاہد عادل ہیں کیونکہ اس پوری کائنات میں ایک ہی قانون قدرت کام کر رہا ہے جس میں خود ذات انسانی بھی شامل ہے اور یہ وحدت ناموس فطرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ہی ارادہ مدبرہ کام کر رہا ہے۔ اہل ایمان کا یہ فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ کائنات کی اس فطرت کو تبدیل نہ ہونے دیں۔ کیونکہ یہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور ذات باری پر یہ شاہد عادل بھی ہے اور اس کے بعد پھر تمام دوسری امانتوں کا یہی حکم ہے۔

عہد کی رعایت کا مطلب بھی یہ ہے کہ سب سے پہلے اس عہد کی رعایت کی جائے جو ازروئے فطرت انسان پر عائد ہے۔ انسان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اللہ وحدہ کو ازروئے فطرت پہچانے کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے۔ پھر اس عہد کے بعد تمام عہد و پیمان آتے ہیں۔ ان عقود کی رعایت اس لیے ضروری ہے کہ ایک مومن اپنے عہد پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ اور ہر عہد کا وفا کرنا ایک شرعی فریضہ ہے۔ اور اس کا تعلق تقویٰ اور عبادت سے ہے۔

اسلامی سوسائٹی اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ان امور کو سرانجام دے جو اس کی امانت عامہ کے دائرے میں آتے

ہیں' کیونکہ یہ اس کی جانب سے اللہ کے ساتھ عہد و پیمان ہے۔ اس امانت عامہ کے عہد کے نتیجے میں جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسلامی سوسائٹی کے لیے ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس آیت نے امانت اور عہد کو مجمل رکھا ہے تاکہ اس کے دائرے کے اندر تمام عہد و پیمان آ جائیں۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اہل ایمان وہ ہوتے ہیں جو اپنے عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں۔ گویا یہ اہل ایمان کی صفت دائمہ اور قائمہ ہے اور کسی بھی سوسائٹی کا نظم و نسق اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے افراد امانتوں میں استقامت نہ اختیار کریں۔ اپنے عہد و پیمان کا خیال نہ رکھیں اور اس مشترکہ نظام زندگی پر اس سوسائٹی کے تمام افراد مطمئن نہ ہو جائیں تاکہ تمام لوگوں کو امن و اطمینان حاصل ہو اور وہ اعتماد سے زندگی بسر کریں۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (۲۳ : ۹) "جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں"۔ وہ اپنی نماز ہرگز قضا نہیں کرتے' نہ وہ انہیں ضائع کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی نمازوں کی کیفیت میں کمی نہیں کرتے۔ وہ ان نمازوں کے فرائض' سنن اور مستحبات کو پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ پورے ارکان اور آداب کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کی نمازیں زندہ نمازیں ہوتی ہیں اور پوری توجہ سے وہ ان میں غرق ہوتے ہیں' ان کی روح اور ان کا وجدان نمازوں سے اچھا تاثر لیتا ہے۔ نماز دراصل بندے اور رب کے درمیان ایک رابطہ ہوتی ہے۔ جو شخص نماز کی حفاظت نہیں کرتا وہ درحقیقت اپنے اور اپنے رب کے درمیان اس رابطے کو کاٹ دیتا ہے۔ اور ایسا شخص پھر دوسرے بنی نوع انسان کے ساتھ بھی اچھے روابط نہیں رکھتا۔ بیان صفات اہل ایمان کا آغاز بھی نماز کے ذکر سے ہوا اور اختتام بھی نماز کے ذکر سے ہوا۔ مقصد یہ بتلانا ہے کہ اسلام اور ایمان کے بعد نماز سب سے اہم فریضہ ہے۔ یہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نماز کو اپنی پوری صفات کے ساتھ ادا کیا جائے اور اس میں اپنی پوری توجہ اللہ کی طرف مبذول کر دی جائے کہ اسلام میں اول بھی نماز ہے اور آخر بھی نماز ہے۔

یہ ان اہل ایمان کی صفات ہیں جن کے لیے اللہ نے فلاح لکھ دی ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو یہ طے کرتی ہیں کہ اہل ایمان کی زندگی کے خدوخال کیا ہوتے ہیں اور اہل ایمان کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہیے۔ یعنی ایسی زندگی جو ایک ایسے انسان کے ساتھ لائق ہے جسے پوری مخلوق پر کرامت اور شرف عطا کیا گیا ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ کی پسند یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو مزید ترقی دے اور محض حیوانات کی طرح زندگی بسر نہ کرے۔ نہ زندگی سے اس طرح لطف اندوز ہو جس طرح حیوانات ہوتے ہیں اور نہ اس طرح کھاتا پیتا ہو جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں۔

لیکن دنیا کی اس ہمہ گیر ترقی کے باوجود وہ ترقی اور کمال اس دنیا میں حاصل نہیں کیا جا سکتا جو اہل ایمان کے لائق ہے اس لیے اللہ نے انسان کو راہ ترقی پر مزید آگے بڑھاتے ہوئے' کمال اور ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک یعنی جنت الفردوس میں پہنچایا۔ ترقی و کمال کے ان اعلیٰ مدارج پر' پھر اہل ایمان ہمیشہ فائز رہیں گے۔ یہاں ان کے لیے کوئی خوف و خطر نہ ہو گا اور وہاں وہ بلا زوال قرار و سکون میں رہیں گے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ (۱۰) الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ

"یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے" ۔ یہ وہ آخری مطلوب ہے جو اہل ایمان کے لیے لکھا گیا ہے ۔ اس کے سوا ایک مومن کا کوئی نصب العین نہیں ہے اور نہ اس کے حصول کے بعد اس کا کوئی اور نصب العین رہتا ہے جس کی وہ آرزو کرے ۔

--- ○○○ ---

اہل ایمان کی صفات میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ وہ خود اپنے نفوس کے اندر پائے جانے والے دلائل ایمان پر غور کریں ۔ سب سے پہلے وہ ذرا اپنے وجود اور اس کی نشوونما کی حقیقت پر غور کریں کہ اس کی شخصیت کا آغاز کس چھوٹے سے جرثومے سے ہوا اور پھر بعث بعد الموت اور آخرت کی زندگی کا حال کیا ہوگا ۔ ان دونوں زندگیوں کی دنیاوی اور اخروی کیفیت کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے ؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا ' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا ' پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی ' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا ' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں ' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا ۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ 'سب کاریگروں سے اچھا کاریگر ۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے ' پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے" ۔

یہ انداز تخلیق ' یہ منظم انداز نشوونما اور اس کے اندر پایا جانے والا یہ تسلسل ۔ سب سے پہلے تو یہ بتاتا ہے کہ اس پورے نظام کا ایک خالق ہے اور پھر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا عمل اس کے ارادۂ مدبرہ کے مطابق ہے ۔ یہ نہایت ہی پیچیدہ عمل محض اتفاق سے یونہی نہیں ہو جاتا اور نہ یہ پورا عمل بغیر کسی ارادے اور تدبیر کے یونہی اتفاقاً ہوتا ہے ۔ خصوصاً اس کا یہ پہلو کہ اس پورے نظام واقعات میں کبھی بھی یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا ۔ انسان کا یہ نظام تخلیق عقلاً کئی دوسرے طریقوں سے ممکن ہے لیکن کبھی یہ طریق کار تبدیلی کو قبول نہیں کرتا ۔ یہ پہلو خصوصاً اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ایک مخصوص ارادہ ہے جو اس نظام کی پشت پر ہے ۔

حیات انسانی کی یہ تدریجی نشوونما اپنے اس تسلسل کے ساتھ بظاہر ایک اعجوبہ ہے اور اسے صرف اس صورت میں حل کیا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کے پہلے پیراگراف کے مطابق ایک انسان سیدھی طرح اللہ کی ذات پر ایمان لے آئے ۔ بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس تخلیق اور اس نشوونما کو اپنے کمال تک پہنچانے کا تصور دیا جا سکتا ہے ۔ صرف ایمان باللہ ہی کی صورت میں دنیا و آخرت کی زندگی ' بامعنی اور بامقصد ہو سکتی ہے ۔ صفات مومنین کے بعد یہاں زندگی کی اس

عجیب نشو و نما کے مدارج کو کیوں لایا گیا ہے؟

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳ : ۱۲) "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا"۔ یہ آیت انسانی زندگی کی نشو و نما کے انداز کو نہایت ہی تعین کے ساتھ بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان موجودہ انسانی شکل تک کئی مراحل طے کر کے پہنچا ہے۔ یوں وہ پہلے مٹی سے انسان تک پہنچا' کیچڑ گویا انسان کی تخلیق درجہ اول ہے۔ اور انسان اپنی موجودہ شکل میں اس عمل تخلیق کا فائنل مرحلہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی قرآن کریم صراحت کرتا ہے۔ ہم انسان کے اس عمل تخلیق کی تصدیق ان سائنسی مشاہدات سے کرنا نہیں چاہتے جنہوں نے اس عمل تخلیق کا بڑی باریکی سے مشاہدہ کیا ہے کہ انسانی زندگی کس طرح نشو و نما پاتی ہے۔

قرآن کریم نے تخلیق انسان کے مدارج کو صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ انسان غور و فکر کرے کہ اللہ کا عمل تخلیق کس قدر پیچیدہ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کیچڑ سے اسان کی تخلیق تک کس قدر عظیم تبدیلی ہے۔ قرآن کریم نے اس سے زیادہ تفصیلات نہیں دی ہیں کیونکہ قرآن کریم کا مقصد ان موٹے موٹے مدارج تخلیق کے ذکر ہی سے پورا ہو جاتا ہے۔ رہے موجودہ سائنسی مشاہدات تو ان کے پیش نظر نشو و نما کے نہایت ہی مفصل مدارج کا بیان ہوتا ہے تاکہ وہ کیچڑ سے مکمل انسان کی تخلیق تک مدارج کو تفصیل سے لیں۔ سائنس دانوں کے مشاہدات درست بھی ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات وہ غلط مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ آج وہ زیادہ مدارج بتاتے ہیں اور کل ان میں کمی کر دیتے ہیں کیونکہ آلات مشاہدہ میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

قرآن کریم کبھی تو ان مدارج کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے اور کبھی ان کی تفصیلات دیتا ہے۔ بعض اوقات صرف یہ فقرہ ہوتا ہے۔

وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲ : ۷) "انسان کی ابتدائی تخلیق مٹی سے کی گئی"۔ اب اس میں مراحل کا ذکر بالکل نہیں ہے اور جس آیت میں تفصیلات دی گئی ہیں اس میں کہا ہے۔

مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳ : ۱۲) "مٹی کے ست سے"۔ دوسری آیت میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ انسان مٹی سے کس طرح تسلسل کے ساتھ اپنی موجودہ کامل حالت تک پہنچا' تو قرآن کریم نے اس کی تفصیلات نہیں دی ہیں اور جیسا کہ ہم نے دوسری جگہ تفصیلات دے دی ہیں یہ امور قرآن کریم کے مقاصد میں شامل ہی نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے جو مدارج حیات بیان کیے ہیں وہ سائنسی مشاہدات کے مطابق بھی ہو سکتے ہیں اور خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عمل کسی نامعلوم ذریعہ سے ہوا ہو اور ابھی انسان نے اسے دریافت نہ کیا ہو یا کچھ ایسے فیکٹر ہوں جو ابھی انسان کے علم سے باہر ہوں۔ لیکن قرآن انسان کو جس نظر سے دیکھتا ہے اور یہ دوسرے سائنسی نظریات اسے جن مقاصد کے لیے مشاہدہ کرتے ہیں ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کریم انسان کو ایک نہایت ہی مکرم اور برگزیدہ مخلوق قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس ذات کے اندر اللہ کی روح پھونکی گئی ہے اور اس روح ہی نے اسے مٹی سے انسان بنا دیا اور اسے وہ خصوصیات عطا کیں جن کی وجہ سے وہ انسان کہلایا اور حیوان سے ممتاز قرار پایا۔ یوں قرآن کا

نقطہ نظر انسان کے بارے میں مادہ پرستوں کے نقطہ نظر سے بالکل جدا ہے اور اللہ کا قول تمام لوگوں سے زیادہ سچا ہے۔ (دیکھئے الانسان بین المادیۃ والاسلام محمد قطب) یہ ہے جنس انسانی کی اصل تخلیق' مٹی کے ست سے۔ رہا بعد کا سلسلہ نسل انسانی تو اس کا طریق کار بالکل جدا ہے اور ایک معروف اور مشاہدہ کیا ہوا طریقہ ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (۲۳: ۱۳) "پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کر دیا"۔ اللہ نے جنس انسانی (آدم) کو تو مٹی کے ست سے بنایا۔ رہا سلسلہ تناسل تو اس سلسلے کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے ایک قطرے سے چلایا۔ پانی کا یہ قطرہ مرد کی صلب سے نکلتا ہے۔ یہ قطرہ رحم مادر میں ٹھہرتا ہے۔ یہ پانی کا نہایت ہی چھوٹا نکتہ ہوتا ہے بلکہ یہ ہزارہا خلیوں میں سے ایک خلیہ ہوتا ہے اور پانی کے اس قطرے میں یہ خلیے ہزارہا کی تعداد میں ہوتے ہیں۔

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (۲۳: ۱۳) "محفوظ جگہ میں"۔ یہ نقطہ رحم میں جا کر رحم کی ہڈیوں کے درمیان ایسی محفوظ جگہ میں ہوتا ہے کہ اس پر جسم کی حرکات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ جگہ ایسی ہوتی ہے کہ انسان کی پیٹھ اور پیٹ کو جو جھٹکے اور اور چوٹیں اور حرکات اور تاثرات پہنچتے ہیں یہ جگہ ان سے محفوظ ہوتی ہے۔

قرآن کریم اس نقطے کو انسان کی تخلیق کا ایک مرحلہ قرار دیتا ہے اس نقطے سے بڑھ کر انسان ایک مکمل انسان بنتا ہے۔ یہ ایک سائنسی حقیقت ہے لیکن یہ عجیب اور قابل غور حقیقت ہے۔ جب اس عظیم الجثہ انسان کو ہم ملخص کر کے اس نقطے تک لے جاتے ہیں اور اس نقطے کے اندر وہ تمام انسانی خصائص پائے جاتے ہیں تو پھر ایک کامل انسان کے اندر سے اس قسم کے اور جنین تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔ سلسلہ تخلیق کا یہ ایک عجیب نظام ہے۔

اس نقطے سے انسان پھر علقہ بن جاتا ہے یعنی خون کا ایک لوتھڑا۔ اس مرحلے میں مرد کا جرثومہ عورت کے انڈے کے ساتھ مکس ہو جاتا ہے اور ابتداء میں رحم مادر کے ساتھ معلق یہ ایک باریک نقطہ ہی ہوتا ہے۔ یہ نقطہ رحم مادر کے خون سے غذا پاتا ہے۔ علقہ سے پھر یہ الْمُضْغَةَ "خون کی بوٹی" کی شکل میں آ جاتا ہے۔ بوٹی کی شکل میں اب یہ نقطہ قدرے بڑا ہو جاتا ہے۔ اب یہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ یہ خون کا ایک موٹا ٹکڑا ہوتا ہے۔

یہ چھوٹی سی مخلوق اپنی اس راہ پر چلتی ہے۔ یہ اپنی ڈگر تبدیل نہیں کرتی۔ نہ اپنی راہ سے ادھر ادھر جاتی ہے۔ اس کی حرکت منظم اور مرتب ہوتی ہے اور یہ اس ناموس کے مطابق ہوتی ہے جو پہلے سے اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ یعنی اللہ کی تدبیر و تقدیر کے مطابق۔ اس کے بعد ہڈیوں کا مرحلہ آتا ہے۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۲۳: ۱۴) "پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں"۔ اور اس کے بعد یہ مرحلہ آیا کہ ہڈیوں پر گوشت چڑھ آیا۔

فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳: ۱۴) "پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا"۔ ان مراحل کو پڑھ کر اور پھر دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم نے جنین کے ان مراحل کو جس تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ سائنس دانوں

کے مشاہدہ میں بہت بعد میں آئی ہے۔ سائنس دانوں نے بعد میں یہ بات معلوم کی کہ ہڈیوں کے خلیے اور ہیں۔ اور گوشت کے خلیے اور ہیں۔ اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ جنین کے اندر ہڈیوں کے خلیے پہلے چڑھتے ہیں اور بعد میں ان پر گوشت کے خلیے چڑھتے ہیں اور جب تک ہڈیوں کے خلیے مکمل نہیں ہوتے اس وقت تک گوشت کے خلیے ناپید ہوتے ہیں اور بعد میں جنین کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ یہ وہ حیران کن حقیقت ہے جسے قرآن کریم یوں ریکارڈ کرتا ہے۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳:۱۴) "پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا"۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳:۱۴) "پھر اسے ایک دوسری مخلوق بنا کھڑا کیا"۔ اور یہ مخلوق انسان ہے۔ یہ امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ ابتداء میں انسان کا جنین اور حیوان کا جنین جسمانی ساخت کے اعتبار سے ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن آخر میں جا کر انسان کا جنین ایک دوسری مخلوق کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک مکرم اور صاحب امتیاز مخلوق ہوتی ہے اور یہ ارتقاء اور ترقی کی بے پناہ استعداد اپنے اندر رکھتی ہے۔ حیوان کا جنین حیوان ہی کے درجے میں رہ جاتا ہے۔ وہ انسانی خصائص کو اخذ نہیں کر سکتا۔ اور ان کمالات تک نہیں پہنچ پاتا جن تک انسان پہنچتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی جنین کو متعین اور مخصوص خصوصیات دی گئی ہیں اور یہی خصوصیات ہیں جو بعد کے زمانے میں انسان کو انسانیت کی راہ پر ڈالتی ہیں۔ اس طرح انسان "ایک دوسری" مخلوق بن جاتا ہے۔ اور یہ اس وقت ہی بن جاتا ہے جب یہ جنین اپنے آخری دور نشوونما میں ہوتا ہے۔ حیوان اپنے آخری دور میں انسان سے پیچھے رہ جاتا ہے اس لیے کہ اس کو انسانی خصوصیات نہیں دی گئیں۔ چنانچہ کسی حیوان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے حیوانی مقام سے آگے بڑھ پائے اور اس طرح آگے بڑھتے بڑھتے حیوان سے انسان بن جائے جیسا کہ مادی نظریہ کے قائلین اس پر یقین کرتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان اور تمام حیوانات مختلف انواع کی مخلوق ہیں اور جب اللہ نے ان کو مٹی کے ست سے بنایا اور ان میں اللہ نے اپنی روح پھونکی تو اس وقت ہی سے ہر ایک نوع کو علیحدہ خصائص دیئے گئے۔ اگرچہ انسان اور حیوانات اپنے تخلیقی مدارج میں ایک ہی انداز نشوونما رکھتے ہیں لیکن انسان اپنی انسانی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مقام پر جا کر رک جاتا ہے اور انسان "خلق آخر" بن جاتا ہے اور ان ذمہ داریوں کے اٹھانے کے قابل بن جاتا ہے جو اس نے اس کرۂ ارض پر ادا کرنی ہیں۔ یہ فرق ان امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہیں۔ اس معاملے میں یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ حیوانات نے ترقی کرتے کرتے درجہ انسانی تک بلندی حاصل کی ہے۔ (۱)

---

(۱) نظریہ ارتقاء اسلام کے نظریہ سے متضاد تصور پر قائم ہے۔ یہ نظریہ فرض کرتا ہے کہ موجودہ انسان حیوانی ارتقاء کا ایک درجہ ہے' اور یہ کہ حیوان بھی ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے لیکن واقعی صورت حالات یہ ہے کہ واضح طور پر یہ نظریہ محض مفروضہ اور جھوٹ نظر آتا ہے۔ حیوان کبھی بھی انسانی خصوصیات کا حامل نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنی حدود میں رہتا ہے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی نوع کے اندر شکلی اعتبار سے کوئی نوع حیوان ترقی کرے جس طرح ڈارون کہتا ہے۔ لیکن ہر نوع اپنے نوعی حدود کے اندر ہی رہتی ہے۔ وہ نوعی خصوصیات کو بدل نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر نوع حیوانی کی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں اور کسی خارجی قوت نے اسے دی ہوتی ہیں جبکہ نوع انسانی بالکل ایک علیحدہ نوعیت اور خصوصیات کی حامل ہے اور یہ خصوصیات اسے بعض مخصوص مقاصد کے لیے اللہ کی قوت نے دی ہیں۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳ : ۱۴) "پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ 'سب کاریگروں سے اچھا کاریگر"۔ جس نے انسان کے جنین کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اس انداز نشوونما کے مطابق ایک خود کار نظام کے مطابق آگے بڑھتا ہے۔ ایک نہایت ہی پیچیدہ سنت الٰہیہ کے مطابق جس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ اس کے مراحل میں سے کوئی مرحلہ حذف ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان ترقی و کمال کے مقررہ درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔

لوگ سائنس کے انکشافات کو معجزہ قرار دیتے ہیں اور ان کو سن سن کر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ خصوصاً جب انسان ایک ایسا آلہ یا مشین تیار کرتا ہے جو خود کار طریقے کے مطابق چلتا ہے اور انسان کی مداخلت کے بغیر کام کرتا ہے۔ کیا یہ لوگ اس جنین کو نہیں دیکھتے کہ یہ نہایت ہی خود کار طریقے کے مطابق اپنے مختلف مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ بظاہر ان مراحل سے گزرنے میں اسے گزارنے والا نظر نہیں آتا۔ جب وہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی ماہیت میں بھی مکمل تبدیلی آجاتی ہے۔ پھر نظر آتا ہے کہ ان دونوں مراحل میں اس کے اندر ایک عظیم تبدیلی آگئی ہے۔ لوگ رات دن ان تغیرات اور واقعات کو دیکھتے ہیں لیکن اپنی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں 'ان کے دل و دماغ اس عظیم خود کار نظام پر غور نہیں کرتے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ہم اس نظام کے عادی ہو گئے ہیں حالانکہ یہ اپنی جگہ حیرت انگیز نظام ہے۔ محض انسان کی اس پیچیدہ تخلیق پر غور و فکر ہی انسان کی ہدایت کے لیے کافی ہے جس کی تمام خصوصیات 'تمام خدوخال 'اس چھوٹے سے نکتے کے اندر موجود ہوتے ہیں جو اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ انسان خوردبین کے بغیر اسے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ یہ تمام خصوصیات اور تمام خدوخال آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور اپنے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے پھر ہماری نظروں میں آجاتے ہیں۔ جب انسان بچے کی صورت میں ہوتا ہے تو انسان کے انسانی خصائص نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر بچہ عام انسانی خصائص کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کی مخصوص خصوصیات کو بھی وراثت میں پاتا ہے اور یہ دونوں قسم کی خصوصیات اس چھوٹے سے نکتے کے اندر مرکوز ہوتی ہیں۔ غرض یہ عمل جو رات اور دن ہمارے درمیان اور ہمارے سامنے قدرت دہراتی ہے 'انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے اور انسانی غور و فکر کے لیے اس میں عظیم مواد موجود ہے۔

اب سیاق کلام ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے تاکہ زندگی کے اس سفر کو انتہا تک پہنچا دے۔ اب زندگی کے ایک نئے مرحلے کا ذکر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی جس کی تخلیق اس مٹی سے کی گئی ہے اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتی 'کیونکہ یہ صرف مٹی نہیں ہے بلکہ اس میں روح کا آمیزہ کیا گیا ہے 'لہٰذا اس کو اس سے بھی آگے بڑھنا ہے۔ اس زندگی میں چونکہ عالم بالا کی طرف سے روح پھونکی گئی ہے اس لیے اس کی آخری منزل یہی جسمانی منزل نہیں ہے۔ خون اور گوشت کی اس قریبی منزل سے آگے اور جہان بھی ہیں۔ چنانچہ زندگی کا آخری مرحلہ سامنے آتا ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ (۲۳ : ۱۵) ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ

(۲۳ : ۱۶) "پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے 'پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے"۔ یہ موت دنیا کی زندگی کا اختتام ہے اور دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی کے درمیان بھی ایک مرحلہ ہے۔ لہٰذا برزخ کی زندگی بھی حیات انسانی کی ترقی کا ایک مرحلہ ہے۔ اور برزخ انسانی زندگی کا اختتام نہیں ہے۔

اس کے بعد انسان نے حکم الہٰی کے مطابق دوبارہ اٹھنا ہے۔ یہ بھی زندگی کا ایک دور ہو گا' ایک مرحلہ ہو گا لیکن یہ ایک کامل زندگی ہوگی۔ اس زندگی میں کوئی نقص نہ ہو گا' اس میں خون اور گوشت کی زندگی کی ضروریت درکار نہ ہوں گی۔ نہ اس میں خوف اور بے چینی ہوگی' نہ اس میں کوئی تبدیلی ہو گی اور نہ نشیب و فراز ہوں گے بلکہ یہ انسان کے لیے ایک آخری آرام گاہ ہوگی لیکن یہ کامل زندگی اس شخص کے لیے ہوگی جو ترقی و کمال کی راہوں پر چلنے والا ہو۔ وہ زندگی کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں جس کے خدوخال طے کر دیئے گئے ہیں یعنی ایمان والوں کی زندگی' لیکن جس نے اپنی زندگی کے دنیاوی مرحلے کو ترقی نہ دی بلکہ اسے تنزل سے دوچار کر کے اسے حیوانی زندگی جیسا بنا دیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح ترقی معکوس کرے گا۔ وہاں اس کی انسانیت جمادات کا کام کرے گی۔ وہ جہنم کا ایندھن ہو گا۔ جبکہ جہنم کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے تو اس قسم کے لوگ جمادات سے بھی نیچے پتھر ہو جائیں گے۔

--- ○○○---

اب سیاق کلام نفس انسانی کے اندرونی دلائل ایمان سے آفاق کائنات میں موجود دلائل ایمان کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لوگ ان آفاقی دلائل کو رات اور دن دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں لیکن پھر بھی غافل ہو کر گزر جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

ع ۲۲

"اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے' تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا' ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔ پھر اس پانی کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیئے' تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا ہے'

تیل بھی لیے ہوئے اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں' اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو"۔

سیاق کلام ان دلائل کو پیش کرتا ہے اور ان تمام دلائل کو باہم مربوط کرتا ہے کہ یہ تمام دلائل قدرت الٰہیہ کے نشانات ہیں۔ پھر یہ سب نشانات یہ بھی دکھاتے ہیں کہ اس کائنات کو کس شان اور تدبیر کے ساتھ چلایا جاتا ہے۔ قدرت کے یہ تمام مظاہر ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ان نشانات کے کام اور فرائض منصبی بھی باہم مربوط ہیں اور جس سمت کی یہ نشاندہی کرتے ہیں وہ بھی ایک ہے یعنی ایک خالق۔ سب کے سب ایک ہی ناموس فطرت کے مطیع ہیں' اپنے فرائض تکوینی میں باہم متعاون ہیں اور ان کی خدمات سب کی سب اس حضرت انسان کے لیے ہیں جسے اللہ نے معزز اور مکرم بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تخلیق انسان اور دوسرے مظاہر فطرت کو یکجا کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۲۳ : ۱۷) "اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے' تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے"۔ یہ سات راستے طَرَائق کیا ہیں' یہ دراصل طبقات ہیں' بعض' بعض کے اوپر ہیں یا بعض دوسرے کی نسبت بہت دور ہیں۔ سبع طرائق سے مراد سات اہم فلکی مدار بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان سے مراد وہ سات کہکشاں بھی ہو سکتے ہیں جس طرح ہم سورج کی کہکشاں میں رہتے ہیں' یا ان سے سات سدم بھی مراد ہو سکتے اور سدم سے مراد فلکیات والوں کے نزدیک ستاروں کے مجموعے (Nebula) ہیں۔ غرض مراد جو بھی ہو' یہ سات فلکی مخلوق ہے اور یہ انسانوں کے اوپر ہے' بہرحال یہ سبع طرائق زمین سے بلندی پر ہیں اور اسی فضائے کائنات میں ہیں۔ اللہ نے اپنی شان حکیمانہ سے ان کو پیدا کیا ہے اور وہ اللہ اپنی تخلیق سے غافل نہیں ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰي ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ

(۲۳ : ۱۸) "اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا' ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں"۔ یہاں یہ سات راستے زمین کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ پانی آسمان سے اترتا ہے۔ ان سات افلاک کے ساتھ پانی کا تعلق ہے۔ کیونکہ اس کائنات کا اس انداز پر پیدا کیا جانا ہی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ آسمانوں سے پانی اتارتا ہے' پھر یہ پانی زمین کے اوپر ٹھہرتا ہے۔

یہ نظریہ کہ زمین کے اندر جو پانی ہے وہ بارشوں ہی کا پانی ہے۔ یہ پانی مختلف راہوں سے زمین کے اندر جذب ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ بالکل ایک جدید نظریہ ہے۔ ماضی قریب تک لوگ یہ سوچتے تھے کہ بارش کے پانی اور زمین کے اندر کے پانی کا باہم کوئی تعلق نہیں ہے لیکن قرآن نے آج سے تقریباً تیرہ سو سال پہلے اس حقیقت کو بیان کر دیا تھا۔

پھر اللہ نے اس پانی کو ٹھیک ٹھیک حساب کے مطابق اتارا' نہ زیادہ اتارا کہ طوفان کی شکل میں سب کچھ غرق کر دے اور نہ ضرورت سے کم اتارا کہ ملکوں کے اندر خشک سالی ہو جائے اور تروتازگی اور شادابی ختم ہو جائے۔ نہ بے موسم اتارا کہ پانی ضائع چلا جائے۔

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (۲۳: ۱۸) "اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا"۔ تو یہ پانی بھی زمین میں ٹھہرا ہوا ہے اور انسان کا نطفہ بھی قرار مکین میں ٹھہرا ہوا ہے اور ان دونوں کے درمیان بہترین مشابہت اور تقابل ہے۔ دونوں اللہ کی تدبیر سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ایک زمین میں اور ایک رحم میں۔

وَ اِنَّا عَلٰي ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ (۲۳: ۱۸) "اور ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں"۔ یوں کہ وہ زمین کے اندر دور تک گہرائیوں میں چلا جائے 'اور جن محفوظ مقامات کے اندر یہ پانی محفوظ رہتا ہے ' ان میں شگاف پڑ جائیں اور پانی گہرائیوں میں سے نکل کر غائب ہو جائے یا کسی اور طریقے سے ناپید ہو جائے۔کیونکہ جس خدا نے اپنی قدرت سے پانی کو زمین میں ٹھہرایا ہے وہ اپنی قدرت سے اسے غائب بھی کر سکتا ہے۔یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اسے روک رکھا ہے۔

اور یہ زندگی کی بوقلمونیاں تو قائم ہی پانی سے ہیں۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۳: ۱۹) "پھر اس پانی کے ذریعے سے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیئے۔ تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو"۔ کھجور اور انگور دو نمونے ہیں ان نباتاتی اشیاء کے جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ انسان اور حیوان نطفے کے پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔یہ دونوں نمونے ایسے ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں اسی دور میں رچے بسے تھے جبکہ دوسرے تمام قسم کے فواکہ اور حیوانات بھی پانی ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسری تمام پیداوار میں زیتون کے درخت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۳: ۲۰) "اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا ہے 'تیل بھی لیے ہوئے نکلتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی"۔ یہ اکثر درختوں سے زیادہ مفید ہے 'اس کا تیل 'اس کا پھل اور اس کی لکڑی سب ہی مفید ہیں۔اور عربستان کے قریب ترین مقامات جہاں یہ اگتا ہے 'طور سینا ہے۔یہ اس وادی مقدس کے قریب ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔لہٰذا اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا۔یہ درخت بھی وہاں اس پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو زمین کے اندر محفوظ ہے۔

اب نباتات سے آگے عالم حیوانات پر ایک نظر

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۱) وَعَلَيْهَا وَعَلَي الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۲۳: ۲۲) "اور حقیقت یہ ہے کہ

تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے ۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں 'اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں ۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو"۔ یہ تمام مخلوقات انسان کے لیے اللہ کی قدرت نے مسخر کر دی ہے اور اس کائنات میں یہ مخلوق مختلف قسم کے مقاصد پورے کر رہی ہے ۔ ان چیزوں میں عبرت ہے 'اس شخص کے لیے جو چشم بصیرت کے ساتھ ان کو دیکھے اور پھر عقل کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھے اور ان پر غور کرے ۔ انسان دیکھتا ہے کہ وہ جو خوشگوار دودھ پیتا ہے وہ ان جانوروں کے پیٹ سے نکلتا ہے ۔ یہ ہے خلاصہ اس غذا کا جو یہ جانور ہضم کرتے ہیں ۔ اور پھر دودھ کے غدود اسے اس پاک و صاف سفید سیں مادے کی شکل میں نکالتے ہیں جو نہایت ہی خوشگوار اور لطیف غذا ہے ۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ (۲۳ : ۲۱) "اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے ہیں"۔ یہاں تمام فوائد کا ذکر اجمالاً کر دیا گیا اور اس کے بعد بعض مخصوص و ممتاز فائدے گنوا دیئے ۔

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۲۱) وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ (۲۳ : ۲۲) "ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو"۔ اللہ نے انسانوں کے لیے مویشیوں کا کھانا حلال قرار دیا ۔ مثلاً اونٹ 'گائے اور بھیڑ بکری ۔ لیکن اللہ نے ان کو عذاب دینا اور مثلہ بنانے کی اجازت نہیں دی کیونکہ کھانے سے تو ایک ضرورت پوری ہوتی ہے لیکن ان کو عذاب دینا 'تکلیف پہنچانا اور مثلہ بنانا بے فائدہ فعل عیب ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے قلب و نظر میں فساد ہے اور اس کی فطرت فطرت سلیمہ نہیں رہی ہے جبکہ اس فعل سے زندگی کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا ۔

یہاں مویشیوں پر سواری کی مناسبت سے کشتیوں کی سواری کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے ۔ کشتی بھی ایک کائناتی نظام کے تحت انسان کے لیے مسخر بنا دی گئی ہے اور اس نظام یعنی بحری سفر کے نظام میں بھی انسانوں کا مفاد ہے ۔ پانی کو بھی انسان کے لیے مفید بنایا ۔ پھر کشتی کو اس قابل بنایا کہ وہ پانی کے اوپر تیر رہی ہے اور ہواؤں کو اس طرح چلایا کہ وہ کشتیوں کو منزل مقصود تک لے جا رہی ہیں ۔ اگر ان امور میں سے کوئی امر بھی نہ ہو یعنی پانی 'کشتی اور ہوا تو بحری سفر مشکل ہو جائے ۔ آج بھی بحری سفر انہی سہولیات پر مبنی ہے ۔

یہ تمام امور دلائل ایمان کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں 'بشرطیکہ کوئی فہم و ادراک اور تفکر و تدبر کر کے ان پر غور کرے اور ان سب امور کا تعلق اس سورہ کے پہلے اور دوسرے پیراگراف کے ساتھ ہے ۔ ان امور سے تمام پیراگراف مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ۔

---○○---

درس نمبر ۱۴۹ تشریح آیات

۲۳ --- تا --- ۵۲

اس سبق کا مضمون اب دلائل انفس و آفاق سے براہ راست عقیدہ توحید کی طرف آ جاتا ہے جو تمام انبیاء کا مدار دعوت رہا ہے اور تمام رسول اسی کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ تمام رسولوں نے تمام زمانوں میں لوگوں کو اسی عقیدے کی طرف بلایا اور تمام رسولوں کا استقبال ان کی امتوں نے کس طرح کیا۔ اس دعوت کے مقابلے میں ان کا ردعمل کیسا رہا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخر تک تمام رسولوں نے کلمہ توحید کی طرف دعوت دی جس کا مفہوم عربی زبان میں یوں رہا کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے کیونکہ تمام رسول دعوت اپنی قوم کی زبان ہی میں دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی وہی بات کی جو آپ کے بعد دوسرے رسولوں نے اپنی اپنی اقوام کے سامنے کی اور تمام امتوں نے ایک ہی جواب دیا۔ حالانکہ ان امم کے درمیان زمان و مکان کے طویل فاصلے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

”ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے' کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟“ اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ ”یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔ کچھ نہیں' بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے۔ کچھ مدت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۲۳:۲۳) "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے"۔ یہ وہ کلمہ ہے جو تمام رسولوں کی دعوت ہے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ پوری کائنات اس کلمے پر قائم ہے۔ یہ پوری کائنات اس کے لیے شاہد بھی ہے۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳:۲۳) "کیا تم ڈرتے نہیں ہو"۔ یعنی تم اس انکار کے انجام بد سے نہیں ڈرتے جو تم اس عظیم حقیقت کے حوالے سے کرتے ہو۔ حالانکہ تمام دوسرے حقائق اس حقیقت کا نتیجہ ہیں اور تمہارا انکار اس عظیم حقیقت پر دست درازی ہے اور جو قوم اس حقیقت کا انکار کرے' وہ لازماً عظیم عذاب کی مستحق بن جاتی ہے۔

لیکن حضرت نوح کی قوم کے یہ کبراء اور بااثر لوگ اس کلمے کے سچ ہونے میں شک و شبہے کا اظہار نہیں کرتے نہ وہ اس کلمے کے بارے میں کسی ثبوت کا مطالبہ کرتے ہیں' نہ اس پر غوروفکر کرتے ہیں۔ وہ دراصل اپنی شخصیات کی تنگ نظری میں گرفتار ہیں اور اس سے وہ اپنے آپ کو نہیں چھڑا سکتے۔ ان کی سوچ داعی کی شخصیت تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہے کہ ذرا اس محدود سوچ سے بلند ہو کر اس عظیم حقیقت پر غور کریں جسے حضرت نوح علیہ السلام پیش فرماتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت نوح کی اصولی اور عظیم دعوت کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے حضرت نوح کی شخصیت پر اظہار خیال شروع کر دیا حالانکہ یہ پوری کائنات حضرت نوح کے نظریہ اور دعوت پر شاہد عادل ہے اور دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کہتا کیا ہے۔ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ کہتا کون ہے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (۲۳:۲۴) "اس کی قوم کے سرداروں نے ماننے سے انکار کیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا' اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے"۔ حضرت نوح کی قوم نے ان کے معاملے کو اور اس عظیم دعوت کو نہایت ہی تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے دیکھا چنانچہ اپنی اس تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی وجہ سے وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ اس دعوت کی حقیقت کو سمجھ سکتے یا اس کے نتائج کا ادراک کر سکتے۔ ان کی متکبر اور جھوٹی شخصیات نے اس دعوت کی حقیقت اور اس کے جوہر کو ان کی نظروں سے اوجھل رکھا۔ وہ اندھے بنے رہے اور ان کے اور اس دعوت کے درمیان ان کے اس اندھے پن کی وجہ سے پردے حائل ہو گئے۔ ان کا نقطہ نظر داعی کی شخصیت کے دائرے سے نہ نکل سکا۔ بس وہ یہ سمجھ سکے کہ اگر ہم اس دعوت کو قبول کریں تو نوح جیسا عام شخص ایک عظیم شخص بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ایمان لاتے ہی وہ ہمارا پیشوا اور بڑا آدمی بن جائے گا۔

ان لوگوں نے اپنی تنگ نظری کی وجہ سے یہ سمجھا کہ حضرت نوح صرف اپنی شخصیت کے لیے کام کر رہے ہیں اور انہوں نے اسی لیے نبوت کا دعویٰ بھی کیا ہے لیکن اپنی اس کوتاہ بینی کی وجہ سے وہ صرف حضرت نوح کی فضیلت ہی کا انکار نہیں کر دیتے بلکہ دراصل لوگ انسانیت کو ملنے والی ایک عظیم فضیلت کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو جنس بشر کو یہ عزت اس لیے دی تھی کہ وہ اس نے ایک سوچنے والی مخلوق پیدا کی تھی۔ ان لوگوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر اللہ کسی کو نبی بنا کر بھیجتا تو لازماً اس شخص کو ملائکہ میں سے ہونا چاہیے تھا۔ گویا یہ لوگ انسانیت کو اس شرف سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (۲۳ : ۲۴) "اللہ کو اگر رسول بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا"۔ یہ بات وہ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی روح میں وہ قوت نہیں ہے جو انہیں عالم بالا سے مربوط کرے تاکہ وہ اس بات پر یقین کر سکیں کہ انسانوں میں سے مختار لوگ عالم بالا سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنے دوسرے بھائیوں کو ہدایت دے سکتے ہیں اور انہیں اللہ سے جوڑ سکتے ہیں۔

یہ لوگ اس اہم معاملے کو اب اپنے آباؤ اجداد سے مالوف افکار کی روشنی میں سوچتے ہیں۔

مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ (۲۳ : ۲۴) "یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں نہیں سنی"۔ جب تقلید انسان کے قلب و نظر کی روشنی کو بجھا دیتی ہے جس طرح آگ بجھ جاتی ہے اور جب انسانی سوچ اپنا کام چھوڑ دیتی ہے تو لوگ انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں سوچنا بند کر دیتے ہیں اور وہ اپنے مسائل کا کوئی معقول حل تلاش نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ اپنی تاریخی روایات کے زاویے سے تمام امور کو سوچتے ہیں۔ اگر ان کو اپنی جاہلی روایات میں کوئی بات نہ ملے تو وہ اس بات کو ماننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ بس یہ لوگ پیچھے ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔

ان جامد اور بجھی ہوئی سوسائٹیوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے اور ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو بات ایک بار ہو جائے تو وہ دوبارہ ہو سکتی ہے اور جو بات کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی اس کا وقوع ممکن نہیں ہے۔ یوں ان کی زندگی میں جمود آ جاتا ہے۔ زندگی متحرک نہیں رہتی اور لوگ صرف ان اقدامات کے تنگ دائرے تک محدود ہو جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد میں کبھی ہوئے تھے۔

اے کاش کہ اس قسم کے لوگ یہ سوچ سکتے کہ وہ جامد اور مقلد ہیں اور وہ الٹے ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں جو حریت فکر اور سوچ کی دعوت دیتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ وجود کائنات میں پائے جانے والے دلائل ایمان پر غور و فکر کریں۔ لیکن یہ لوگ حریت فکر کی اس دعوت کا جواب نہایت ہی مذاق اور الزام تراشیوں سے دیتے ہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِیْنٍ (۲۳ : ۲۵) "کچھ نہیں بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے"۔ کچھ مدت دیکھو تو یعنی ذرا انتظار کر لو کہ یہ مرجائے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ اس سے بھی اور اس کی دعوت سے بھی۔ اور تمہیں اس کی دعوت کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

ان لوگوں کا انکار اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ان کے دلوں تک دعوت اسلامی کو پہنچانے کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے اور ان کی جانب سے مذاق اور ایذا رسانی سے بھی ان کو کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی ہے۔ اب وہ اپنے رب کی طرف ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رب سے اپنی مشکلات پر نصرت کے طلبگار ہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

نوح نے کہا "پروردگار' ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے' اس پر اب تو ہی میری نصرت فرما"۔

جب زندہ انسان اس طرح پتھروں کی طرح جمود اختیار کر لیں۔ زندگی آگے بڑھنا رک جائے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ترقی و کمال کے جو مدارج مقرر کر رکھے ہیں۔ انسان اس کی طرف بڑھنا چھوڑ دیں تو ایسے انسان انسانی ترقی کی راہ میں روڑہ بن جاتے ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو زندگی کو اس جگہ پر جامد چھوڑ دیا جائے اور یا پھر اس پتھر کو پاش پاش کر دیا جائے جس نے زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا کہ اسے انسانیت کی راہ سے برطرف کر دیا جائے۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کا دور آغاز انسانیت کا دور ہے۔ اس لیے اللہ نے انسانیت کی راہ میں اس بھاری پتھر کو ایک طرف پھینک دیا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

"ہم نے اس پر وحی کی کہ "ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر۔ پھر جب ہمارا حکم آ جائے اور وہ تنور ابل پڑے تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جا' اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے' سوائے ان کے جن کے خلاف پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے' اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا' یہ اب غرق ہونے والے ہیں۔

یوں سنت الہیہ نے زندگی کی ترقی اور نشوونما کی راہ سے یہ روڑا' قوم نوح کا روڑا دور کیا۔ تاکہ انسانی زندگی شاہراہ ترقی پر آگے بڑھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں انسانیت کی نشوونما کا آغاز ہوا تھا' اور آغاز کے ساتھ ہی اس میں ٹھہراؤ اور جمود پیدا ہو گیا جس طرح کسی نازک پودے کو زمین سے نکلتے ہی آفات سماوی یا اور کوئی مشکلات درپیش ہو جائیں تو وہ مرجھا جائے اور خشک ہو جائے جبکہ وہ ناتواں ہو۔ ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے طوفان ایک بہترین علاج تھا۔ یاد رہے کہ طوفان زمین کو دھو ڈالتا ہے اور طوفان کے بعد اس زمین میں خوب فصل اگتی ہے۔ اسی طرح زمین کو قوم نوح کی گندگی سے پاک کر دیا گیا تاکہ اس کرۂ ارض پر درست زندگی کا آغاز از سر نو کیا جائے اور انسانی زندگی بحسن و خوبی شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا (۲۳ : ۲۷) "ہم نے اس پر وحی کی کہ ہماری نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر"۔ یہ کشتی طوفان سے نجات کا ذریعہ تھی اور پھر ان لوگوں کے بچنے کی تدبیر بھی تھی جو ایمان لا چکے تھے تاکہ آئندہ کے لیے انسانی نسل کی بقا کا سامان ہو جس طرح کسی چیز کا بیج محفوظ کر کے بویا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت نوح یہ کشتی اپنے ہاتھ سے تیار کریں۔ اس میں یہ سبق تھا کہ انسان نے اس زمین پر

زندگی اسباب و وسائل کے مطابق گزارنی ہے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ہر انسان نے پوری جدوجہد کرنی ہے تا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے امداد کا مستحق ہو جائے کیونکہ اللہ کی امداد صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو ان تھک جدوجہد کرتے ہیں' ان کو نہیں ملتی جو ہروقت عیش و عشرت میں مگن رہتے ہیں اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو صرف دوسروں کا انتظار کرتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور چیز کے لیے جدوجہد نہیں کرتے۔ حضرت نوح کے بارے میں اللہ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ انسانوں کے آدم ثانی ہوں۔ اس لیے آپ کو یہ سبق دیا گیا کہ آپ اپنی زندگی کے لیے اسباب و وسائل خود اختیار کریں۔ اللہ کی نگرانی تمہارے شامل حال رہے گی۔ اللہ آپ کو وسائل اختیار کرنے کی تعلیم بہرحال دے رہا ہے۔ یہ کشتی تیار کریں تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کی مشیت پوری ہو۔ اس کرۂ ارض کی صفائی کے اس عمل کے آغاز کے لیے اللہ نے نوحؑ کے لیے ایک علامت مقرر فرما دی تھی۔

وَ وَحْیِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (۲۳ : ۲۷) "پھر جب ہمارا حکم آ جائے اور وہ تنور ابل پڑے"۔ یعنی تنور سے پانی ابل پڑے تو یہ ہو گی طوفان آنے کی علامت اور تب حضرت نوح کا فرض ہو گا کہ وہ جلدی سے کشتی پر سوار ہوں اور اپنے ساتھ کشتی میں زندگی کا تخم بھی سوار کر لیں۔

فَاسْلُكْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ (۲۳ : ۲۷) "تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جاؤ"۔ یعنی تمام حیوانات' تمام پرندوں' تمام نباتات وغیرہ سے جو اس وقت انسان کو معلوم تھے اور جن سے بنی نوع انسان استفادہ کرتا تھا۔

وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ (۲۳ : ۲۷) "اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ سے سوائے ان کے جن کے خلاف پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے"۔ اور یہ فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جنہوں نے کفر کیا تھا اور حضرت نوح کی تکذیب کی تھی۔ اور ان کے بارے میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان کو ہلاک کر دیا جائے کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی تھی اور مکذبین کے بارے میں یہ اللہ کی سنت ہے کہ انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو آخری حکم دیا گیا کہ وہ اب ان لوگوں کے ساتھ کوئی مباحثہ اور مجادلہ نہ کریں اور نہ کسی کو بچانے کی کوشش کریں اگرچہ ان میں سے کوئی قریبی رشتہ دار ہو کیونکہ اللہ نے سب کافروں کی ہلاکت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۲۳ : ۲۷) "اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا' یہ اب غرق ہونے والے ہیں"۔ کیونکہ اللہ کی سنت کسی دوست یا رشتہ دار کی رو رعایت نہیں کرتی۔ اس کی راہ بالکل سیدھی ہے۔ اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیلات یہاں نہیں دی جاتیں کیونکہ یہ کہہ دیا گیا کہ یہ سب کے سب غرق ہونے والے ہیں۔ اب حضرت نوح کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے انعامات پر شکر کس طرح ادا کریں گے کس طرح اللہ کی حمد پڑھیں گے اور کس طرح اللہ سے ہدایت کے طلبگار ہوں گے۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝

"پھر جب تو اپنے ساتھیوں سمیت کشتی پر سوار ہو جائے تو کہہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی اور کہہ ' پروردگار ' مجھ کو برکت والی جگہ اتار اور تو بہترین جگہ دینے والا ہے"۔

اس طرح آپ اللہ کی حمد کریں ' اللہ کی طرف متوجہ ہوں ' اللہ کی صفات بیان کریں اور نشانات الہیہ کا اعتراف سیکھیں اور سکھائیں۔ یہ ہے اللہ کی تعلیم اپنے بندوں کے لیے۔ اللہ پہلے نبیوں کو سکھاتا ہے اور وہ عوام الناس کو تعلیم دیتے ہیں اور یہ نبی ہمیشہ عوام کے لیے ایک نمونہ بن جاتے ہیں۔

اب اس پورے قصے پر ایک تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ اس قصے کے مختلف مراحل میں جو سبق ہے اور جو حکمتیں ہیں انسان ان پر غور کریں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ۝

"اس قصے میں بڑی نشانیاں ہیں ' اور آزمائش تو ہم کر کے ہی رہتے ہیں"۔

ابتلاء کی بہت سی قسمیں ہیں ' بعض آزمائشیں صبر کے لیے ہوتی ہیں ' بعض آزمائشیں شکر کے لیے ہوتی ہیں۔ بعض آزمائشیں اجر کے لیے ہوتی ہے۔ قصہ نوح میں آنے والوں کے لیے ہر قسم کی آزمائش اور نصیحت ہے۔

--- ooo ---

اب ایک دوسری رسالت کا منظر اور تکذیب کے نتائج جبکہ دعوت بھی ایک ہے اور رسالت بھی وہی ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا

تَخْسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَیَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ اِفْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾

”ان کے بعد ہم نے ایک دوسرے دور کی قوم اٹھائی۔ پھر ان میں خود انہی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انہیں دعوت دی) کہ اللہ کی بندگی کرو' تمہارے لیے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے' کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا' جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا' وہ کہنے لگے ”یہ شخص کچھ نہیں ہے' مگر ایک بشر تم ہی جیسا' جو کچھ تم کھاتے ہو' وہی یہ بھی کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو' وہی یہ بھی پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہے۔ یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید' بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے' زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں“۔ رسول ؑ نے کہا ”پروردگار' ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے' اس پر اب تو ہی میری نصرت فرما“۔ جواب میں ارشاد ہوا ”قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے“۔ آخر کار ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامہ عظیم نے ان کو آ لیا اور ہم نے ان کو کچرا بنا کر پھینک دیا --- دور ہو ظالم قوم!“

اس سورہ میں قصص نہ محض قصہ گوئی کے لیے لائے گئے ہیں اور نہ ان کی تفصیلات دی گئی ہیں' بلکہ یہاں مقصد یہ بتانا ہے کہ تمام پیغمبروں نے ایک ہی دعوت پیش کی اور تمام رسولوں کی اقوام نے ان کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بات کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام کے قصے سے کی گئی اور انجام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ہوا۔ جبکہ خطاب رسول آخر الزمان کو تھا۔ رسولوں کے طویل سلسلے کے نام یہاں نہیں دیئے گئے کیونکہ تمام رسولوں کا معاملہ دراصل ایک ہی جیسا تھا' مقصد یہ تھا کہ ان کا کلمہ ایک ہی تھا' ان کی دعوت ایک تھی اور اس کے ساتھ عوام کا سلوک بھی ایک ہی تھا' یہی تھا اس سورہ کا مقصد۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ (۲۳ : ۳۱) ”اس کے بعد ہم نے دوسرے دور کی قوم

الثانی"۔یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ قوم کون تھی۔راجح قول یہ ہے کہ یہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی۔

فَاَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

(۲۳: ۳۲) "پھر ان میں خود انہی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انہیں دعوت دی) کہ صرف اللہ کی بندگی کرو تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" یہ بھی وہی دعوت ہے جو حضرت نوحؑ نے پیش کی تھی اور الفاظ بھی ایک ہی ہیں۔ حالانکہ حضرت نوحؑ کی زبان اور تھی اور زیر بحث رسول کی زبان اور تھی کیونکہ ان دونوں رسولوں کے درمیان "قرون" کا فرق تھا۔

اس قوم کا جواب کیا تھا؟ وہی جواب یعنی انکار وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (۲۳: ۳۳) وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۲۳: ۳۴) "اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا' جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا' وہ کہنے لگے "یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا' جو کچھ تم کھاتے ہو' وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو' وہی یہ پیتا ہے۔اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہے"۔

یہ وہی اعتراض ہے جو تمام امتوں نے پیش کیا کہ یہ رسول تو تم جیسا بشر ہے۔یہ اعتراض اس لیے پیدا ہوا کہ کسی بھی معاشرے کے کھانے پیتے لوگوں کا تعلق خدا سے نہیں رہتا' اس لیے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک انسان کا تعلق خدا سے کیسے قائم ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ معاشی خوشحالی انسان کی فطرت کو بگاڑ دیتی ہے دماغ موٹا کر دیتی ہے۔دل کے دروازے بند کر دیتی ہے۔اور عیاش لوگوں کے دل پتھر بن جاتے ہیں۔ان کے اندر احساس نہیں رہتا۔اس لیے وہ کسی بات سے متاثر ہوتے ہیں اور نہ مان کر دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ خوشحال لوگ ہمیشہ تحریک اسلامی کی مخالفت کرتے ہیں اور اس لیے اسلام عیاشی کی مخالفت کرتا ہے اور اپنا اجتماعی نظام اس طرح تشکیل دیتا ہے جس میں مترفین کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی' کیونکہ یہ لوگ معاشرے کی سڑاند ہوتے ہیں' پورے ماحول کو متعفن کر دیتے ہیں اور معاشرے کو اس قدر گندا کر دیتے ہیں کہ اس کے اندر گندے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے معاشرے کو بالآخر یہ گندے کیڑے چاٹ جاتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ وہ بعث بعد الموت کے قائل نہیں تھے۔وہ کہتے تھے کہ موت کے بعد اور مٹی ہو جانے کے بعد انسانوں کو کس طرح اٹھایا جائے گا۔یہ تو بعید از امکان ہے اور جس بات کی اطلاع یہ رسول دے رہا ہے' یہ عجیب ہے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ (۲۳: ۳۵)

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۳: ۳۶) اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا

مَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِيْنَ (۲۳:۳۷) "یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مرکر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید' بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے' زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی سوچ رکھنے والے لوگ آخرت کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ زندگی کے گہرے حقائق پر نہ انہوں نے غور کیا ہے اور نہ اس کے پیچیدہ نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ یہ لوگ ایک اعلیٰ اور ارفع زندگی کی ترجیحات کو سمجھتے ہیں۔ زندگی کے یہ اعلیٰ مقاصد ظاہر ہے کہ اس دنیا میں پورے نہیں ہو سکتے۔ اس دنیا میں نہ بھلائی کو اس کی پوری جزا ملتی ہے اور نہ شر کو اس کی پوری سزا ملتی ہے۔ یہ جزا و سزا آخرت میں مکمل طور پر ملیں گی۔ آخرت میں اہل ایمان اعلیٰ ترین معیاری زندگی تک پہنچیں گے جہاں نہ خوف ہو گا اور نہ تھکاوٹ ہو گی۔ اسی طرح اہل کفر اور پسماندگی اختیار کرنے والے بھی نہایت ہی ذلیل ترین زندگی تک پہنچیں گے جس میں ان کی انسانیت تباہ ہو گی اور وہ وہاں لکڑیوں کی طرح جلتے اور جلائے جاتے رہیں گے۔ نہ ان کے لیے اس سزا میں کمی ہو گی اور نہ اہل ایمان کے لیے جزاء میں کمی ہو گی۔

اس قسم کے منکرین ان اعلیٰ مقاصد اور ایسے گہرے معانی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ خود اپنی اس موجودہ زندگی کے مختلف ادوار اور مراحل پر غور نہیں کرتے جو ابھی ابھی اسی سورہ میں ان کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ یہ اس عجیب و غریب خودکار نظام تخلیق سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ اسی نظام جیسے ایک خودکار نظام کے ذریعے اللہ مٹی اور ہڈیوں کے پنجر کو پھر زندہ کر دے گا۔ اس لیے ان کو اس رسول کی اس اطلاع پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کو قبروں سے نکالا جائے گا۔ اب وہ نہایت ہی کبر و غرور سے اپنی حکمت و دانائی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی موت ہے۔ ایک نسل مرتی ہے اور دوسری نسل زندہ رہتی ہے۔ جو مر گئے اور مٹی بن گئے اور ہڈیاں رہ گئے تو یہ بات بعید از امکان ہے کہ وہ دوبارہ واپس ہو جائیں گے۔ یہ اطلاع جو یہ رسول دے رہا ہے اور ہم سے دوبارہ اٹھائے جانے کا وعدہ کر رہا ہے بعید از امکان ہے۔

یہ لوگ اپنی اس جہالت پر ہی نہیں رکتے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا بلکہ یہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے رسول پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ رسول اپنی جانب سے اللہ پر افتراء باندھتا ہے حالانکہ وہ اللہ کو جانتے ہی نہیں۔ وہ صرف اس وقت اللہ کا نام لے رہے ہیں اور یہ نام بھی اس لیے لے رہے ہیں کہ رسول پر الزام لگائیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲۳:۳۸) "یہ شخص خدا کے نام پر جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی بات ماننے والے نہیں ہیں"۔ ایسے حالات میں یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے رب سے نصرت طلب کرے جس طرح اس سے قبل حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے نصرت طلب کی تھی۔ حضرت نوح کی دعائے نصرت بھی یہی تھی۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنَ (۲۳:۳۹) رسول نے کہا پروردگار ان لوگوں نے میری جو تکذیب کی ہے اس پر اب تو میری نصرت فرما"۔ اللہ کی طرف سے دعا قبول ہوتی ہے۔ اس قوم کی مہلت ختم ہو جاتی ہے

کیونکہ اس میں کوئی بھلائی وتی نہیں رہی ہے یہ لوگ غفلت ' تکذیب اور عناد میں مبتلا ہیں۔

قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَٰدِمِينَ (۲۳ : ۴۰) "جواب میں ارشاد ہوا' قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے"۔ لیکن اس وقت ان کی یہ ندامت ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَٰهُمْ غُثَآءً (۲۳ : ۴۱) "آخر ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامہ عظیم نے ان کو آلیا اور ہم نے ان کو کچرا بنا کر پھینک دیا"۔ غثاء اس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں جسے سیلاب بہا کر پھینک دیتا ہے اور اس میں کوئی چیز کام کی نہیں ہوتی۔ یہ کچرا کسی کام کا نہیں ہوتا اور ہر قسم کی گندی اور بیکار چیزوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔ یہ لوگ چونکہ ان انسانی اوصاف سے دستبردار ہو گئے تھے جن کی وجہ سے وہ انسان بکرم تھے' وہ اپنے وجود دنیاوی اور وجود اخروی کی حکمت کو نہیں پا رہے تھے اور انہوں نے اپنے خالق کے ساتھ تمام روابط کاٹ دیئے تھے اس لیے ان میں کوئی ایسی بات باقی نہیں تھی جن کی وجہ سے ان کی تکریم ہوتی اور اس دنیا میں وہ باقی رہتے۔ لہٰذا وہ سیلاب کے کوڑے کرکٹ کی طرح بہا دیئے گئے۔ اس طرح کر دیئے گئے کہ کوئی ان کو پوچھنے والا نہ تھا۔ یہ قرآن کا منفرد انداز کلام ہے جو کسی حقیقت کا اظہار نہایت ہی دقت کے ساتھ کرتا ہے۔

ان لوگوں کی مزید توہین کے لیے اللہ کی جانب سے ان کی ملک بدری کا حال بتانے کے لئے یہ فقرہ کافی ہے کہ یہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیئے گئے۔

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّٰلِمِينَ (۲۳ : ۴۱) "دور ہو ظالم قوم!" زندگی سے بھی دور' ذکر خیر سے بھی دور' عالم واقعہ سے بھی دور اور عالم ضمیر سے بھی دور۔

---ooo---

اس کے بعد سیاق کلام مضمون کو آگے بڑھاتا ہے۔ منظر پر اقوام آتی ہیں اور جاتی ہیں۔

ثُمَّ أَنشَأْنَا مِنۢ بَعْدِهِمْ قُرُونًا ءَاخَرِينَ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَـْٔخِرُونَ ۝ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۖ كُلَّ مَا جَآءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ ۚ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا وَجَعَلْنَٰهُمْ أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝

"پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اٹھائیں۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھہر سکی۔ پھر ہم نے پے درپے اپنے رسول بھیجے۔ جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا' اس نے اسے جھٹلایا' اور ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے' حتیٰ کہ ان کو بس افسانہ ہی بنا کر چھوڑا۔۔۔ پھٹکار ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے!"

ینار، دعوت اسلامی کی پوری تاریخ کا خلاصہ بیان کر دیا جاتا ہے اور اس خلاصے میں اللہ کی اس سنت کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس تاریخ کا آغاز قوم نوح اور قوم ہود "عاد" سے ہوا اور اختتام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا۔ درمیان کے قرون کا یہ خلاصہ تھا اور سنت الٰہیہ یہ ہے :

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۲۳ : ۴۳) "کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھہر سکی"۔ تمام اقوام نے رسولوں کی تکذیب کی۔

كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ (۲۳ : ۴۴) "جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا اس نے اسے جھٹلایا"۔ اور جب بھی اقوام نے رسولوں کو جھٹلایا اللہ نے ان اقوام کو پکڑا۔ یہی اللہ کی سنت پوری انسانی تاریخ میں جاری رہی ہے۔

فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا (۲۳ : ۴۴) "ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے"۔ اور ان کی ہلاکتوں کے بعد صرف عبرت ہی باقی رہی اور کچھ بھی نہ رہا۔

وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (۲۳ : ۴۴) "حتیٰ کہ بس ان کو افسانہ بنا کر رکھ چھوڑا"۔ لوگوں کے اندر ان کی عبرت انگیز کہانیاں ہی رہ گئیں۔ یہ تلخیص بھی ایک توہین آمیز ملک بدری اور پھٹکار پر ختم ہوتی ہے کہ دور ہو جائیں ایسے نالائق۔

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۲۳ : ۴۴) "پھٹکار ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے"۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک تلخیص دی جاتی ہے اور یہ رونیدادبھی اسی ہدف کی طرف اسی انداز میں یوں بڑھتی ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

"پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا مگر انھوں نے تکبر کیا اور بڑی ڈون کی لی۔ کہنے لگے "کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں ؟

اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری غلام ہے"۔ پس انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والوں میں جا ملے"۔

اس خلاصہ میں بھی ان کا یہ اعتراض نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ یہ رسول ہم جیسے انسان اور بشر کیوں ہیں۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۲۳ : ۴۷) "کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اور ان کی قوم ہماری غلام ہے"۔ یعنی ایک تو وہ انسان ہیں اور دوسرے یہ کہ انسان بھی غلام قوم سے تعلق رکھنے والے۔ وہ ہمارے پابند ہیں اور مطیع فرمان ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے لیے یہ بات توہین آمیز تھی کہ وہ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں پر حضرت موسیٰ اور ہارون کی پیش کردہ آیات اور عظیم معجزات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ اس لیے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں۔ یہ لوگ اس کرۂ ارض کے حالات اور کروفر میں غرق تھے حالانکہ یہ پوری دنیا اور اس کا کروفر ایک بے حقیقت چیز ہے اور ایمان کے مقابلے میں پرکاہ کی قیمت نہیں رکھتا۔

---ooo---

اب ایک مجمل اشارہ حضرت عیسیٰ ابن مریم کی طرف بھی آتا ہے۔ وہ تو بذات خود ایک معجزہ تھے۔ ان کی بھی اسی طرح تکذیب کی گئی جس طرح حضرت موسیٰ کی آیات کی تکذیب کی گئی تھی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۴۹ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝۵۰

۴
۱۸ع
۳

"اور موسیٰ کو ہم نے کتاب عطا فرمائی تاکہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں اور ابن مریم اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشانی بنایا اور ان کو ایک سطح مرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے"۔

اس آیت میں جس ربوہ کا ذکر ہے اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں کہ یہ کہاں ہے۔ آیا یہ مصر میں یا دمشق میں تھا یا بیت المقدس میں تھا۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں حضرت مریم اپنے بچے کو لے کر گئی تھیں، حضرت عیسیٰ کے بچپن میں۔ عیسائیوں کی کتابوں میں مفصل تذکرے موجود ہیں۔ یہاں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ یہ ربوہ کہاں تھا۔ مقصود یہ تھا کہ مریم اور ابن مریم کو اللہ نے اس پورے عرصہ میں نہایت ہی پاکیزہ مقام پر رکھا۔ یہ مقام سرسبز تھا۔ پانی عام تھا اور وہ یہاں بہت ہی خوشی اور آرام سے رہتے تھے۔

---ooo---

بات یہاں تک آپہنچی ہے تو تمام رسولوں کی اس امت اور جماعت سے اللہ یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ گویا وہ پوری جماعت ایک ہی میدان اور ایک ہی جلسہ گاہ میں موجود ہے اور ان کے درمیان سے زمان و مکاں کے فاصلے مٹا دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ اپنے مشن اور دعوت کے اعتبار سے وہ ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاتَّقُوۡنِ ۝

"اے پیغمبرو' کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح' تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اس کو خوب جانتا ہوں۔ اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں' پس مجھی سے تم ڈرو"۔

یہاں رسولوں کے خطاب میں رسولوں کی بشریت کو نمایاں کیا جاتا ہے کیونکہ رسولوں کی قوموں کو اعتراض اس پر تھا کہ رسول بشر کیوں ہیں؟۔

كُلُوۡا مِنَ الطَّيِّبٰتِ (۲۳ : ۵۱) "پاک چیزیں کھاؤ"۔ کیونکہ کھانا خاصہ بشریت ہے لیکن یہاں طیبات کی قید لگا کر بتایا گیا کہ رسولوں کی بشریت ارفع ہوتی ہے اور وہ تمام انسانیت کو ارفع بناتے ہیں اور تمام انسانوں کو پاک کرتے ہیں اور ان کو عالم بالا سے جوڑتے ہیں۔

پھر اس نداء میں کہا جاتا ہے کہ اچھے اعمال کرو' یعنی اس زمین کی اصلاح کرو' لہٰذا کام بھی بشریت ہی کا تقاضا ہے لیکن لوگ اچھے کام بھی کرتے ہیں اور برے کام بھی کرتے ہیں جبکہ رسول لوگوں کو اچھے کاموں پر آمادہ کرتے ہیں۔ رسول لوگوں کے اعمال کے لیے ضابطہ متعین کرتے ہیں' اعمال کے مقاصد متعین کرتے ہیں اور اپنے اعمال کے ذریعہ وہ عالم بالا سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

رسولوں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ بشریت سے پاک ہو جائیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بشریت کو سربلند کر دیں۔ اس کے لیے بلند افق اور بلند مقاصد مقرر کر دیں۔ اللہ کی یہی خواہش ہے کہ دنیا میں انسان صالح' پاک اور برگزیدہ ہوں اور رسول ان کے قائد ہوں اور انسانوں کو بلندیوں تک پہنچائیں اور آخرت میں اللہ ہی ہے جو اپنے نہایت ہی باریک پیمانے سے ان کے اعمال کی قدر و قیمت مقرر کرے گا۔

اِنِّيۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ (۲۳ : ۵۱) "تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اسے خوب جانتا ہوں"۔ یہاں زمانے کی دوریوں کو مٹا دیا جاتا ہے اور مسافت کی دوریاں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ پیغام ایک ہے جسے یہ رسول لے کر آئے۔ ان کا مزاج ایک ہے اور وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں اور تمام رسولوں کا رخ ایک ہی طرف ہے۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاتَّقُوۡنِ (۲۳ : ۵۲) "اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس مجھ ہی سے ڈرو"۔

---ooo---

درس نمبر ۱۵۰ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا تیسرا سبق ہے۔ رسولوں کے حالات بیان کرنے کے بعد اب اس میں لوگوں کے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جب رسول آخر الزمان تشریف لائے تو لوگوں کے یہ حالات تھے۔ لوگوں کے درمیان شدید مذہبی اختلافات تھے۔ عقیدہ توحید جسے تمام رسول بالاتفاق بیان کرتے آئے تھے اس میں بھی اختلافات تھے۔

رسول خاتم النبیین جس حق کو لے کر آئے ہیں اس کے ساتھ بھی لوگوں نے ایسا غفلت کا سلوک کیا حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ وہ اس نئی دعوت اور اس کے ماننے والوں پر غور کرتے۔ اہل ایمان کا کردار ان کے سامنے تھا۔ وہ اللہ کی بندگی کرتے تھے 'نیک کام کرتے تھے' خوف آخرت رکھتے تھے۔ اس تصور آخرت سے ان کے دل کانپتے رہتے تھے کہ ایک دن انہوں نے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یہ دو کردار ہیں دو قسم کے 'ان لوگوں کے درمیان مکمل تقابل ہے۔ اہل ایمان جاگتے ہیں اور ڈرتے ہیں اور اہل کفر غافل اور مدہوش ہیں۔ اس سورہ کے اس سبق میں ان کے موقف پر تنقید کی گئی ہے۔ ان کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کے وجدان کو جگایا گیا ہے کہ وہ انفس و آفاق میں موجود دلائل ایمان پر غور کریں۔ پھر ان کے ہاں مسلمہ عقائد کو لیا گیا ہے اور انہی سے ان کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے۔ آخر میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ چھوڑ دو انہیں ان کے حال پر کہ یہ اپنے مقررہ انجام تک پہنچ جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے کہ آپ اپنی راہ پر گامزن رہیں اور ان کے اس عناد اور ہٹ دھرمی سے دل گرفتہ و پریشان نہ ہوں بلکہ ان کے برے رویے کے مقابلے میں اچھا رویہ اختیار کریں اور شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کریں جو ان لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۵۰ تشریح آیات

۵۳ --- تا --- ۹۸

فَتَقَطَّعُوٓا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾ فَذَرْهُمْ فِى غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥٤﴾ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾

"مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔ اچھا' تو چھوڑو انہیں ' ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں ایک وقت خاص تک ۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال و اولاد سے مدد دیئے جا رہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں ' اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے"۔

رسولوں کے بیان میں یہ کہا گیا کہ وہ ایک ہی امت تھے ۔ اور ان کا کلمہ بھی ایک تھا اور ان کی دعوت بھی ایک تھی۔ ان کی بندگی اور عبادت بھی ایک اللہ کے لیے تھی۔ ان کی نظریاتی سمت بھی ایک تھی ۔ لیکن رسولوں کے بعد لوگ گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے' گروہ گروہ بن گئے تھے اور وہ کسی ایک منہج پر متفق نہ رہے۔

لوگوں کے اس افتراق کی تصویر کشی قرآن مجید نہایت عجیب حسی انداز میں کرتا ہے۔ انہوں نے آپس میں اپنے دین کو پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا لے لیا۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کے ہاتھ جو ٹکڑا آیا وہ اس کو لے کر بھاگ گئی ۔ بس وہ خوش تھی کہ اصل ٹکڑا اسی کے ہاتھ میں ہے اور یوں اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہر گروہ اپنی جگہ اس ٹکڑے کو لے کر بیٹھ گیا اور دوسرے امور کے بارے میں سوچنا بھی بند کر دیا مبادا اس طرح ان کے دماغ تک کوئی بات یا کوئی دلیل یا کوئی روشنی پہنچ جائے ۔ بس اپنے ہاں جو کچھ تھا اس میں مست ہو گئے اور ہر قسم کی روشنی اور ہدایت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ تحزب اور فرقہ بندی کی یہ کیا خوب تصویر کشی ہے۔

یہ تصویر کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں خطاب کیا جاتا ہے۔

فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ (٢٣ : ٥٤) "تو چھوڑو انہیں ' ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں ایک وقت تک"۔ یعنی ان کو چھوڑ دیں کہ جن حالات میں وہ مگن ہیں ان میں ڈوبے رہیں اور ان کا جو انجام ہونے والا ہے وہ

اچانک ان کو آلے۔ کیونکہ مہلت کے بعد یہ انجام حتمی ہے۔

یہاں قرآن ان کی غفلت اور جمود پر بطور مذاق یہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کو جو مہلت دی جا رہی ہے اور مال و دولت اور آل و اولاد سے جو نوازا جا رہا ہے تو اس کے بارے میں یہ کیا سمجھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے بہت خوش ہے اور انہیں نواز رہا ہے اور یہ مقبول بندے ہیں کہ ان پر عطا کی بارش ہو رہی ہے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ (۲۳:۵۵) نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ (۲۳:۵۶) "کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال و اولاد سے مدد دیئے جا رہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں" ۔ بلکہ یہ تو ان کے لیے آزمائش ہیں۔

بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۲۳:۵۶) "اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے"۔ یعنی وہ یہ تصور بھی نہیں کرتے کہ اس مال اور اولاد کے بعد ان پر کیا مصیبت آنے والی ہے اور یہ مصیبت کس قدر عام اور ہمہ گیر ہوگی وہ"۔

ایک طرف یہ لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور گمراہ ہیں ' ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر وقت بیدار ہیں اور رب کے معاملے میں بہت محتاط ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

"حقیقت میں جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہوتے ہیں ' جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں ' جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ' اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے ' وہی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے انہیں پا لینے والے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دل پر ایمان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔ انتہائی خوف اور حد درجہ احتیاط اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس دنیا میں انسان کمال اور بلندیوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ آخرت کی فکر کرتا ہے اگرچہ وہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض و واجبات پر عمل پیرا ہوتا ہے یعنی یہاں رہبانیت اختیار نہیں کرتا۔

ذرا ملاحظہ کیجئے۔ یہ مومن اللہ کے خوف کے بارے میں کانپ رہے ہیں۔ نہایت احتیاط سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اللہ کی آیات پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر رہے۔ اللہ کی طرف سے عائد شدہ فرائض اور واجبات ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ دیگر تمام عبادات میں حد استطاعت تک مشغول ہیں۔ لیکن ان سب کاموں کے باوجود۔ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ (۲۳ : ۶۰) "دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ ان کو احساس ہوتا ہے کہ اللہ کے معاملے میں ان سے ضرور کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی۔ حالانکہ وہ مقدور بھر بندگی کرتے رہتے ہیں مگر ان کی نظروں میں ان کا عمل قلیل ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا بلے رسول اللہ ' وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ (۲۳ : ۶۰) "وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے کانپ رہے ہوتے ہیں" سے کیا وہ شخص مراد ہے جو چوری کرتا ہے ' زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے لیکن پھر وہ اللہ سے ڈرتا ہے؟ تو آپ ؐ نے فرمایا نہیں صدیق کی بیٹی بلکہ مراد وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے ' جو روزے رکھتا ہے ' جو اپنا مال خرچ کرتا ہے اور پھر بھی اللہ سے ڈرتا ہے۔ (ترمذی)

ایک مومن کا دل یہ شعور رکھتا ہے کہ اللہ کا ہاتھ اس کے اوپر ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر سانس میں اللہ کی نعمتیں اس پر بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ صرف دل کی حرکت پر ہی غور کر لو کہ کس قدر عظیم رحمت ہے اس لیے مومن اپنی بندگی طاعت کو کم سمجھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے رحم و کرم کے مقابلے میں اس کی جانب سے بندگی کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے وجود کے ذرے ذرے میں اللہ کے جلال اور عظمت کو پاتا ہے۔ اس کے شعور میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ ہر چیز میں اللہ کا ہاتھ ہے اور اسی لیے وہ ہر وقت خائف رہتا ہے ' کانپتا رہتا ہے۔ اسے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اچانک وہ اللہ کے سامنے پیش ہو اور اس کی تقصیرات کی گٹھڑی پیش ہو۔ اور اس کے سامنے کھلے اور نتیجہ یہ سامنے آئے کہ اس نے عبادت کا حق ادا نہ کیا ہو اور اللہ کے انعامات و اکرامات کا شکر اس نے ادا نہ کیا ہو تو اس کا پھر کیا حال ہوگا اور کیا جواب ہوگا؟

ایسے لوگ ہی دراصل بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتے ہیں اور ایسے ہی لوگ بھلائی میں سب سے آگے ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ اسلام کے ہراول دستے کا کام کرتے ہیں۔ بیدار مغز ' فعال اور آگے بڑھنے والے ' مطیع فرمان۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے جو عیش و طرب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو سخت غفلت میں ہوتے ہیں ' جو اس غرے میں ہوتے ہیں کہ وہ تو اللہ کی طرف سے بالارادہ مراعات یافتہ ہیں۔ ان کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اس طرح غافل ہیں کہ جس طرح شکار اپنی غفلت میں چر رہا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اپنے پھندے کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کو غذا مل گئی مگر اچانک پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے اندر بے شمار لوگ ہیں جو ایسے پھندے میں گرفتار ہیں۔ خوشحالی ان کو غافل کر دیتی ہے۔ اللہ کی نعمتیں ان کو برے کاموں میں مشغول کر دیتی ہیں۔ مالداری ان کو سرکشی پر آمادہ کرتی ہے ' غرور ان کو آپے سے باہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے برے انجام کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ بیداری جو اسلام ہر زندہ دل انسان میں پیدا کرتا ہے اور جب ایمان دلوں میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ دلوں میں بیداری اور تقویٰ کو ابھارتا رہتا ہے۔ یہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے جسے حاصل نہ کیا جا سکتا ہو۔ یہ کوئی ایسی حالت نہیں ہے

جس میں عام سے عام آدمی نہ داخل ہو سکتا ہو۔ بس صرف یہ احساس و شعور پیدا کرنا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ ہم اس کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہمارے ظاہر و باطن سے وہ اچھی طرح خبردار ہے۔ یہ احساس اور شعور پیدا کرنا' انسان کے حد استطاعت میں ہے بشرطیکہ ایمان کا چراغ قلب میں روشن ہو جائے۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتَٰبٌ يَنطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٢﴾

"ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے' اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے' جو (ہر ایک کا حال) ٹھیک ٹھیک بتا دینے والی ہے' اور لوگوں پر ظلم بہرحال نہیں کیا جائے گا"۔

اللہ نے انسان پر کچھ فرائض عائد کیے ہیں' لیکن اللہ نے یہ فرائض اور تکالیف انسانی استعداد کے مطابق عائد کی ہیں۔ اور یہ بات اللہ خوب جانتا ہے کہ انسان اس کی مخلوق ہے اور حساب بھی اللہ اس عمل کا لے گا جو ان کے حد استطاعت میں ہو۔ اللہ انسانوں پر یہ ظلم نہیں کرتا کہ ان پر اس قدر بوجھ لاد دے جس کو وہ اٹھا نہیں سکتے۔ نہ اللہ ان کے اعمال میں سے کسی بھی چیز کو چھوڑ دے گا یا ساقط کر دے گا۔ جو بھی وہ کریں گے اس کا حساب درج ہو گا۔

يَنطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳ : ۶۲) "ٹھیک ٹھیک بتا دے گی"۔ ہر چیز کو وہ کھول کر رکھ دے گی۔ اللہ بہترین حساب کرنے والا ہے۔ پھر لوگ غفلت کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ ان کے دل حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ان میں وہ روشنی داخل ہی نہیں ہوئی جو دلوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اس روشنی کو چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے ہیں اور اپنی ان مشغولیات میں بہت ہی آگے جا چکے ہیں جس وقت انہیں ہوش آئے گا تو ان کے سامنے عذاب الیم ہو گا اور اس عذاب کے ساتھ توبیخ اور سرزنش بھی ہوگی اور ان کو ایک حقارت آمیز سلوک کا سامنا کرنا ہو گا۔

بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا عَامِلُونَ ﴿٦٣﴾ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْأَرُونَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْأَرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ ﴿٦٧﴾

"مگر یہ لوگ اس معاملے سے بے خبر ہیں اور ان کے اعمال بھی اس طریقے سے (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) مختلف

ہیں ۔ (وہ اپنے یہ کرتوت کیے چلے جائیں گے) یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاشوں کو عذاب میں پکڑ لیں گے تو پھر وہ ڈکرانا شروع کر دیں گے اب بند کرو اپنی فریاد و فغان ' ہماری طرف سے اب کوئی مدد تمہیں نہیں ملتی ۔ میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم (رسول کی آواز سنتے ہی) الٹے پاؤں بھاگ نکلتے تھے ' اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے ' اپنی چوپالوں میں اس پر باتیں چھانٹتے اور بکواس کیا کرتے تھے "۔

یعنی یہ لوگ جن حالات میں مشغول ہیں ان میں وہ اس لیے غرق نہیں ہیں کہ پیغمبر ان کو ان کی طاقت سے زیادہ احکام دیتے ہیں بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس سچائی کی طرف متوجہ ہی نہیں ہیں جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے بلکہ وہ ان دوسری راہوں پر بہتے چلے جاتے ہیں ۔ اور یہ راہیں اسلام سے متصادم راہیں ہیں ۔

وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ (۲۳ : ۶۳) "اور ان کے اعمال اس طریقے سے مختلف ہیں اور یہ لوگ وہ اعمال کرتے چلے جاتے ہیں "۔ اب اس منظر کو پیش کیا جاتا ہے کہ جب اللہ کا عذاب ان کو آلیتا ہے ۔ یہ عذاب بہت ہی تباہ کن ہے ' اچانک ہے دفعتہ ان کو گھیر لیتا ہے ۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ (۲۳ : ۶۴) "یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاشوں کو عذاب میں پکڑ لیں گے تو پھر وہ ڈکرانا شروع کر دیں گے "۔ مالدار لوگوں کی روش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ بسااوقات عیاشیوں ' مدہوشیوں اور خرمستیوں میں بہت زیادہ غرق ہوتے ہیں اور یہ لوگ ان خرمستیوں کے انجام کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ۔ اب ذرا ان کی حالت کو دیکھ لو کہ ان کو اچانک خدا کا عذاب آلیتا ہے اور وہ چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں ۔ اب وہ فریاد کرتے ہیں اور رحم کے طلبگار ہوتے ہیں ۔ ان کی یہ حالت اس لیے ہوتی ہے کہ عیاشی میں بدمست ' غافل اور متکبر اور مغرور تھے ۔ اب اس شور و فغاں اور فریاد پر کچھ نرمی کرنے اور رحم کرنے کے بجائے ان کی تواضع زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ سے کی جاتی ہے ۔

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ (۲۳ : ۶۵) "اب بند کرو اپنی فریاد و فغاں ' ہماری طرف سے اب کوئی مدد تمہیں نہیں ملتی "۔ یہ منظر سامنے ہے ۔ ان مجرموں کو ڈانٹ پلائی جارہی ہے ' ان کو کسی قسم کی امداد اور نرمی سے مایوس کن جواب دیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ان کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ وہ کس طرح غفلت میں غرق تھے اور دعوت اسلامی کے بارے میں ان کا ردعمل کیا تھا ۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ (۲۳ : ۶۶) "میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے "۔ یعنی الٹے پاؤں ہٹ کر تم بھاگ جاتے تھے گویا جو کچھ پڑھ کر تمہیں سنایا جا رہا تھا وہ کوئی خطرناک بات تھی یا نہایت ہی مکروہ امر تھا جس سے علیحدہ ہونا ضروری تھا ۔ حق پر ایمان لانے سے وہ اپنے آپ کو بہت ہی برا سمجھتے تھے ۔ نہ صرف یہ کہ وہ الٹے پاؤں پھر کر بھاگ جاتے تھے بلکہ وہ اپنی چوپالوں میں رات کو جو مجالس منعقد کرتے تھے ان میں دعوت اسلامی کے بارے میں سخت نازیبا الفاظ استعمال کرتے تھے اور یہ ان کے لیے مذاق کا ایک موضوع تھا ۔

یہ لوگ اپنی مجالس میں اسلام کے بارے میں نہایت ہی گھٹیا زبان استعمال کرتے تھے - یہ مجالس وہ خانہ کعبہ میں اپنے بتوں کے اردگرد بیٹھ کر منعقد کیا کرتے تھے - قرآن کریم ان کی مشغولیتوں کی بہت ہی خوبصورت تصویر کشی کرتا ہے ' جبکہ اب عذاب آنے کے بعد وہ سخت فریاد کرتے ہیں اور مدد طلب کرتے ہیں - قرآن ان کو یاد دلاتا ہے کہ ذرا ان مجالس کو تو یاد کرو - یہ تصویر کشی اس انداز میں کی جاتی ہے گویا یہ واقعہ ابھی ہو رہا ہے اور وہ اسے دیکھ رہے ہیں اور ان ہی حالات میں زندہ ہیں - قیامت کے مناظر کی ایسی تصویر کشی قرآن کا مخصوص اسلوب ہے - (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن) -

مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر اپنی مجلسوں میں اعتراضات کرتے تھے اور ایام جاہلیت کے اخلاق کے مطابق اپنے اس رویہ پر فخر کرتے تھے ' وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ قرآن کی سچائی کو سمجھتے کیونکہ وہ بصیرت کے اندھے تھے - حق قبول کرنا تو کجا وہ تو قرآن کے ساتھ مذاق کرتے تھے - نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزامات لگاتے تھے - یہی بات ہر زمانے میں ہوتی رہتی ہے - ہر جاہلیت میں یہی ہوتا ہے اور یاد رہے کہ عرب جاہلیت بھی دوسری جاہلیتوں میں سے ایک جاہلیت تھی اور نزول قرآن تک کئی جاہلیتیں آتی رہیں اور اس کے بعد بھی آتی رہیں گی -

---(۱۰)---

قیامت کے اس منظر سے قرآن کریم ان لوگوں کو دنیا کی طرف منتقل کرتا ہے - یہ از سر نو اب دنیا میں ہیں - اس منظر میں خود ان سے پوچھا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ عجیب و غریب اور غیر معقول موقف کیوں اختیار کیا اور یہ کہ وہ کیا معقول وجہ ہے کہ یہ لوگ رسول امین پر ایمان نہیں لاتے - آخر وہ کیا شبہات ہیں جو ان کے دلوں میں خلجان پیدا کرتے ہیں - اور ان کو راہ ہدایت سے روکتے ہیں، وہ کیا دلائل ہیں جن کی وجہ سے وہ اعراض کرتے ہیں اور اپنی مجالس میں ہجو اس کرتے ہیں حالانکہ دین اسلام ایک سیدھا سادھا دین حق اور صراط مستقیم ہے -

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾ اَمْ تَسْـَٔـلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ڰ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾

"تو کیا ان لوگوں نے کبھی اس کلام پر غور نہیں کیا؟ یا وہ کوئی ایسی بات لایا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کے پاس نہ آئی تھی؟ یا یہ اپنے رسول سے کبھی واقف نہ تھے کہ (ان جانا پڑا آدمی ہونے کے باعث) اس سے بدکتے ہیں؟ یا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ مجنون ہے؟ نہیں بلکہ وہ حق لایا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا نہیں بلکہ ہم ان کا اپنا ہی ذکر ان کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا تو ان سے کچھ مانگ رہا ہے؟ تیرے لیے تو تیرے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔ تو تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات پیش کی ہیں اگر ان پر کوئی ذرا بھی غور کرے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان سے منہ پھیرے کیونکہ اس کلام میں بہت ہی خوبصورتی' بہت ہی کمال' بہت ہی جاذبیت ہے۔ اس کی تعلیمات نہایت ہی فطری اور انسانی عقل و وجدان کے مطابق ہیں۔ اس میں دل و دماغ کی غذا موجود ہے' ان کا رجحان بہت ہی تعمیری ہے۔ یہ جو نظام و قانون پیش کرتی ہیں وہ نہایت ہی مستحکم ہے۔ ان پوری تعلیمات کو دیکھ کر انسانی فطرت ان کو تسلیم کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منکرین نے اس کلام پر تدبر ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے منہ موڑتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ (۲۳ : ۶۸) "تو کیا انہوں نے کبھی اس کلام پر غور نہیں کیا"۔

اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۳ : ۶۸) "یا وہ کوئی ایسی بات لایا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کے پاس نہ آئی تھی"۔ یا یہ بات کہ پیغمبر کا بھیجنا ان کے اور ان کے آباء کی روایات میں کوئی مانوس بات نہیں ہے۔ ان کی روایات میں یہ بات نہیں ہے کہ کوئی رسول آئے یا ان کے سامنے کوئی کلمہ توحید جیسے افکار و نظریات پیش کرے۔ رسولوں کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ رسول پے درپے آتے رہے ہیں اور تمام رسولوں نے یہی تعلیم دی ہے جو نبی آخر الزمان دے رہے ہیں اور ان رسولوں میں سے کئی کے بارے میں وہ معلومات بھی رکھتے ہیں۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۲۳ : ۶۹) "یا یہ اپنے رسول سے کبھی واقف نہ تھے اور اب یہ اس سے بدکتے ہیں"۔ یعنی ان کے اعراض کا یہ سبب بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ جو رسول آیا ہے اس سے ان کی جان پہچان نہیں ہے۔ وہ تو اس رسول کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کی شخصیت کو جانتے ہیں۔ اس کے نسب کو جانتے ہیں' وہ اس کی ذات و صفات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ وہ یقین سے جانتے ہیں کہ وہ صادق و امین ہیں اور رسالت سے پہلے ہی خود انہوں نے ان کو صادق و امین کے لقب سے نوازا تھا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ (۲۳ : ۷۰) "یا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ مجنوں ہے"۔ ان میں سے بعض بے وقوف آپ پر یہ الزام لگاتے بھی تھے لیکن یہ محض الزام تھا' دل سے تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ عاقل اور کامل ہے کیونکہ پوری زندگی میں انہوں نے اس کے حوالے سے کسی لغزش کا نہ سنا تھا۔

مذکورہ بالا شبہات میں سے کسی شبہ کی کوئی گنجائش تو نہ تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سچائی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ جو سچائی آپ لائے تھے وہ ان سے وہ باطل اقدار چھین رہی تھی جن میں وہ زندگی بسر کرتے تھے جن کو وہ مقدس سمجھتے تھے اور یہ سچائی ان کی خواہشات نفس اور ان کی زندگیوں میں رچی بسی اور جمی ہوئی عادات کے خلاف تھی۔

بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (۲۳ : ۷۰) "بلکہ وہ حق لایا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے"۔ سچائی تو سچائی ہوتی ہے۔ وہ ان کی خواہشات کے ساتھ بدل نہیں سکتی۔ سچائی پر تو زمین و آسمان کا قیام ہے۔ اس کائنات پر نافذ ہونے والا ناموس دراصل حق ہے۔ اسی ناموس اور اسی حق کے مطابق یہ کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی تمام موجودات چل رہی ہیں۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ (۲۳ : ۷۱) "اور حق اگر ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا"۔ حق ایک ہے اور ثابت ہے۔ خواہشات تو ہر انسان کی جداجدا ہوتی ہیں' بدلتی رہتی ہیں۔ یہ پوری کائنات حق پر چلتی ہے اور اس کی چال ایک ہے۔ اس کا اصول اور ناموس نہیں بدلتا۔ اور نہ کسی عارضی خواہش کے مطابق اس ناموس میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ اگر کائنات کا یہ نظام لوگوں کی تمناؤں اور بدلتی ہوئی خواہشات کے تابع ہو جائے اور لوگوں کی عارضی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے تو دنیا کا یہ پورا نظام فساد پذیر ہو جائے۔ لوگوں کے حالات اور طریقے بگڑ جائیں۔ اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے بدل جائیں۔ اگر کوئی خوش ہوتا ہے تو اقدار و پیمانے اور ہوتے ہیں اور اگر کوئی خفا ہوتا تو اقدار و پیمانے اور ہوتے۔ اسی طرح لوگوں کے پیمانے ان کی پسند و ناپسند' رغبت اور خوف' خوشی اور غم کے مختلف حالات میں بھی بدلتے رہتے ہیں کیونکہ انسانی مزاج ایک حال میں نہیں رہتا۔ اس پر عوارض آتے رہتے ہیں جبکہ حق اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور یہ نظام کائنات اور اس کے مقاصد یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے نظام میں ثبات' یکجہتی اور تسلسل قائم رہے اور نہایت ہی پختہ اور ناقابل تغیر ضوابط کے مطابق یہ کائنات چلے اور تغیرات اور بے یقینی سے اس کا نظام پاک ہو۔

اس کائنات کا نظام چونکہ حق پر ہے اور اس کو حق کے مطابق ہی چلایا جا رہا ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کو چلانے کے لیے بھی اللہ نے ایک سچائی پر مشتمل ضابطہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ ضابطہ بھی اس ذات نے مقرر کیا ہے جو اس پوری کائنات کو چلا رہی ہے۔ جس طرح کائنات کا ضابطہ اٹل ہے اسی طرح یہ انسانی ضابطہ بھی اٹل ہے کیونکہ انسان بھی کائنات کا ایک جزء ہے تاکہ انسانی طرز عمل اور اس کائنات کی رفتار کے درمیان ہم آہنگی ہو۔ اس لیے حق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات کا شارع ہی انسانی ضابطہ حیات کا شارع اور مصنف ہو تاکہ انسان کی چلت کائنات کی چلت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اگر انسانوں کی زندگی کی ضابطہ بندی ان کی خواہشات پر چھوڑ دی جائے تو انسانوں کی زندگی کا نظام فساد پذیر ہو جائے گا اور اس میں خلل واقع ہو جائے گا۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ

فِيْهِنَّ (۲۳ : ۷۱) "اور حق کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین و آسمان اور ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا"۔ لہذا یہ نظام کلی طور پر حق کے تابع ہے' حق کا مطیع فرمان ہے اور مدبر کائنات کی مشیت کے مطابق چل رہا ہے۔

یہ امت جس کے پاس یہ حق آیا ہے' اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ وہ اس کی مطیع ہو جائے۔ایک تو یہ کہ یہ ایک حق بات ہے' دوسرے یہ کہ اس امت کے لیے یہ بہت ہی بڑا اعزاز بھی ہے۔پھر یہ سچائی اس امت کی شناخت بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام نہ ہوتا تو اقوام عالم میں عربوں کی اور کیا شناخت ہوتی اور اسلام نہ ہوتا تو مسلمان ہوتے کہاں؟
اسلام سے قبل تاریخ اقوام میں عربوں کا کوئی ذکر نہ تھا اور نہ ان کا کوئی کردار تھا۔پھر جب تک عرب قرآن کا دامن تھامے رہے ان کی آواز پوری کائنات میں گونج رہی تھی اور جب عربوں نے قرآن کو چھوڑا تو تاریخ امم میں ان کا کردار بھی گھٹتا گیا اور مٹتا گیا حتیٰ کہ وہ قابل ذکر ہی نہ رہے اور نہ آئندہ کبھی وہ کوئی مقام حاصل کر سکتے ہیں الا یہ کہ وہ اپنے اصل عنوان کو اختیار کر لیں اور اپنی اصل شناخت کو اختیار کر لیں۔
چونکہ ان لوگوں کو دعوت حق دی گئی اور انہوں نے اس کا انکار کیا اور الٹا داعی حق پر الزام لگانا شروع کر دیا اور غلط موقف اختیار کیا تو اس مضمون کی مناسبت سے اب روئے سخن ان کے اس غلط موقف کی طرف پھر جاتا ہے۔ان کے اس غلط رویے کی مذمت کی جاتی ہے اور وہ رسول امین پر جو الزامات لگاتے تھے ان کی تردید کی جاتی ہے۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا (۲۳ : ۷۲) "کیا تو ان سے کچھ مانگ رہا ہے"؟ کیا اس ہدایت و تعلیم کی کوئی بھاری فیس تم مانگ رہے ہو اور وہ اس کی ادائیگی کی استطاعت نہیں رکھتے اور اس سے بھاگ رہے ہیں۔تم تو ان سے کچھ بھی طلب نہیں کرتے ہو کیونکہ تمہارا اجر تو اللہ پر ہے۔

فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۲۳ : ۷۲) "تیرے لیے تو رب کا دیا بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے"۔کوئی نبی لوگوں سے کسی معاوضے کا طلبگار نہیں ہوتا جبکہ انسان بہت ہی ضعیف' فقیر اور محتاج ہوتے ہیں۔نبی تو اللہ سے متصل اور مربوط ہوتا ہے جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ نبی کے متبعین بھی اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد کے طلبگار نہیں ہوتے کیونکہ ان کی نظریں بھی اس اجر پر ہوتی ہیں جو اللہ کے ہاں ان کے لیے تیار ہے اور دنیا میں تو قلیل ہو یا کثیر ہو' وہ اس پر راضی ہوتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کی روح اللہ سے مل جائے تو اس کے لیے پھر یہ پوری کائنات اور مافیہا پر کاہ کے برابر نہیں رہتی۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ تو ان لوگوں کی راہنمائی اس نظام زندگی کی طرف کر رہے ہیں جو نہایت ہی مستحکم ہے۔

وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۳ : ۷۳) "اور تو' تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہا ہے"۔آپ ان کو اس ناموس فطرت کی طرف بلا رہے ہیں جو اس کائنات اور خود ان کی فطرت پر حاکم ہے۔ان کو اس پوری کائنات کی طرف بلا رہے ہیں اور ان کو اس قافلہ وجود کے ساتھ ہم آہنگ کر رہے ہیں اور سیدھا خالق کائنات

کی طرف لے جارہے ہیں۔

ان لوگوں کی حالت بھی ایسی ہے جس طرح ان تمام لوگوں کی ہوتی ہے جو ایمان نہیں لاتے اور راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (۲۳: ۷۴) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں"۔ اگر یہ ہدایت پر ہوتے تو وہ اپنے دل و دماغ سے اس زندگی پر غور کرتے 'جس کے نتیجے میں انسان حتمی طور پر آخرت پر ایمان لاتا ہے۔ ایک ایسے جہان کا وہ ضرور قائل ہو جاتا ہے جس میں یہ زندگی اپنی نہایت ہی مکمل حالت میں ہوگی اور جس کے اندر لوگوں کے ساتھ مکمل انصاف ہوگا کیونکہ آخرت ناموس کائنات کا ایک آخری حصہ ہے جس میں اللہ کی تدبیر کائنات اپنے اختتام کو پہنچے گی۔

یہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے 'جو راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں 'اگر ان کو بہت دولت دی جائے اور آزمایا جائے تو بھی وہ راہ راست پر نہیں آتے اور اگر ان کو مشکلات سے دوچار کر کے آزمایا جائے تو بھی راہ راست پر نہیں آتے۔ اگر ان کو نعمت سے نوازا جائے تو کہتے ہیں۔

اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ (۵۵) نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ (۲۳: ۵۶) "یہ جو ہم نے انہیں مال اور اولاد دے کر امداد دی ہے وہ اس لیے کہ ہم ان کے لیے بھلائی میں جلدی کرنے والے ہیں"۔ اور اگر ان پر عذاب آجائے تو بھی ان کے دل نرم نہیں ہوتے 'ان کے ضمیر نہیں جاگتے اور اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے اللہ کے سامنے عاجزی نہیں کرتے کہ وہ ان کی اس مصیبت کو دور کرے۔ یہ اسی طرح رہیں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن ان کو عذاب الہی آلے اور وہاں مایوس اور حیران رہ جائیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝ ع ۲۷

"اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آج کل یہ مبتلا ہیں 'دور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں تکلیف میں مبتلا کیا 'پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو یکایک تم دیکھو گے کہ اس حالت میں وہ ہر خیر سے مایوس ہیں"۔

یہ ہے بعض لوگوں کا مستقل رویہ ۔ یہ سخت دل لوگ ہوتے ہیں ۔ اللہ سے غافل ہوتے ہیں' آخرت کی تکذیب کرتے ہیں ۔ مشرکین مکہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جن سے حضور اکرم کو سابقہ تھا۔

اگر کسی پر مصیبت آ جائے اور وہ اللہ کے سامنے عاجزی اور تضرع کرنے لگے تو یہ رجوع الی اللہ کی دلیل ہوتا ہے ۔ یہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے دل میں خدا کا شعور ہے اور یہ تصور بھی ہے کہ آخری سہارا اللہ ہے ۔ جو دل اس طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ نرم ہوتا ہے' بیدار ہوتا ہے اور نصیحت اس کو فائدہ دیتی ہے ۔ یہی احساس انسان کو غفلت اور لغزش سے بچاتا ہے ۔ ایسے ہی لوگ مصائب اور مشکلات سے فائدہ اور نصیحت حاصل کرتے ہیں ۔ لیکن جب کوئی اپنی گمراہی اور سرکشی میں بہت ہی آگے چلا جائے اور اندھا ہو جائے تو اس شخص سے مایوس ہو جانا چاہئے ۔ اس کی اصلاح کی پھر کوئی امید نہیں رہتی ۔ اسے چھوڑ دیا جائے کہ وہ عذاب آخرت کا شکار ہو اور یہ آخرت بہت ہی اچانک ہو گی ۔ اچانک ہر کسی کے سامنے آ جائے گی اور تمام لوگ اس وقت حیران و پریشان ہوں گے اور اس بات سے مایوس ہوں گے کہ اب کوئی خلاصی ممکن ہے ۔

--- (۱) ---

ایک بار پھر ان کے شعور اور وجدان کو جگانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ انفس و آفاق میں دلائل ایمان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے ۔ ایسے امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو پیش پا افتادہ ہیں ۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنۡشَاَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَةَ ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾ وَ هُوَ الَّذِىۡ ذَرَاَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ هُوَ الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَ يُمِيۡتُ وَلَهُ اخۡتِلَافُ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۸۰﴾

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو ۔ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا' اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے ۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے ۔ گردش لیل و نہار اسی کے قبضہ قدرت میں ہے ۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ؟"

انسان اگر اپنی تخلیق اور اپنی شکل و صورت ہی پر غور کرے' اور اپنے اعضاء و جوارح پر غور کرے' اپنے حواس اور اپنی عقل پر غور کرے اور اللہ نے انسان کو جو دوسری بے شمار صلاحیتیں دی ہیں صرف ان پر غور کرے تو اس کے لیے ہدایت تک پہنچنا کوئی مشکل امر نہیں ہے ۔ ان عجیب امور پر غور کر کے وہ خالق کائنات کی معرفت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اللہ کے علاوہ کون ہے جس نے یہ معجزے دکھائے ہیں ۔ اس کائنات میں بے شمار عجوبے ہیں' چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی ۔

ذرا انسان صرف اپنی قوت سامعہ ہی پر غور کرے ۔ یہ قوت کس طرح کام کرتی ہے ۔ کس طرح یہ آوازوں کو وصول کرتی ہے اور آوازوں سے معانی اخذ کرتی ہے ۔ ذرا قوت باصرہ پر غور کرے ۔ انسان کس طرح دیکھتا ہے ۔ کس طرح آنکھ روشنی کو لیتی ہے اور تصاویر دیکھتی ہے ۔ پھر انسان کا دماغ اور اس کا ادراک اشیاء اور شکلوں کی قدر و قیمت

کا تعین کرتا ہے - مفہوم 'اقدار اور پیمانوں کا تعین کرتا ہے - غرض تمام مشاعر و مدرکات اور محسوسات پر اگر غور کیا جائے تو ہر ایک اعجوبہ ہے -

صرف حواس خمسہ اور ان کے کام کرنے کے طریقے پر ہی اگر غور کیا جائے تو عالم بشریت کے اندر یہ ایک عظیم معجزہ ہے - رہی ان قوتوں کی تخلیق اور پھر موجودہ انداز اور شکل و صورت پر ان کی ساخت اور پھر اس پوری کائنات کے ساتھ ان کی ہم آہنگی 'کہ اگر اس کائنات کی قوتوں اور انسانی قوتوں میں جو نسبتیں پائی جاتی ہیں 'ان میں سے ایک نسبت بھی اگر غائب ہو جائے تو پورا نظام ہی بگڑ جائے 'کان سن نہ سکے ' آنکھ دیکھ نہ سکے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت مدبرہ نے ان کو ایسا بنایا ہے کہ یہ قوتیں اس کائنات میں کام کر سکتی ہیں اور کائنات کی قوتوں کو انسانی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ بنایا ہے لیکن انسان ایسا ناشکرا ہے کہ وہ اللہ کے ان انعامات پر غور ہی نہیں کرتے -

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۲۳:۷۸) "تم میں سے کم لوگ ایسے ہیں جو شکر کرتے ہیں"- شکر تب ہی ہو سکتا ہے کہ انسان کسی نعمت کے بخشنے والے کے بارے میں جانتا ہو - اس کی ذات و صفات کو جانتا ہو - پھر وہ اللہ وحدہ کی عبادت اور بندگی بھی کرتا ہو اور پھر وہ یہ بات بھی جانتا ہو کہ یہ قوتیں انسان کو اسی ذات والاصفات نے دی ہیں جن کے ذریعے وہ اس کرۂ ارض پر عیش و عشرت سے ہمکنار ہے اور ہر چیز سے استفادہ کر رہا ہے -

وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۳:۷۹) "وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اور اس زمین پر اپنی طرف سے خلیفہ اور مختار بنایا - اور پھر تمہیں اس نے دیکھنے اور سننے کی قوت دی 'سوچنے کی قوت دی اور تمام دوسری صلاحیتیں دیں جو یہاں فریضہ خلافت ارضی کی ادائیگی کے لیے ضروری تھیں -

وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۲۳:۷۹) "اور اسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے"- پھر وہاں وہ تم سے حساب و کتاب لے گا کہ تم نے زمین پر فریضہ خلافت اللہ کی ہدایات کے مطابق ادا کیا یا نہیں - اچھے کام کیے یا برے - کام کیے - ہدایت پر رہے یا ضلالت کی راہ اختیار کی - کیونکہ تم کو عبث پیدا نہیں کیا گیا - اور نہ ہی اس زمین پر تمہیں شتر بے مہار پیدا کر کے چھوڑ دیا گیا ہے - بلکہ تمہاری تخلیق ایک حکمت اور تدبیر کے تحت ہوئی ہے -

وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ (۲۳:۸۰) "وہی ہے جو زندگی دیتا اور موت دیتا ہے"- موت اور حیات ایسے واقعات ہیں جو رات اور دن نمودار ہوتے رہتے ہیں - موت و حیات کا مالک صرف اللہ ہے - انسان جو زیادہ ترقی یافتہ حیوان ہے اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ زندگی کا ایک خلیہ پیدا کر سکے اور انسان کسی زندہ مخلوق سے زندگی چھین بھی نہیں سکتا - کیونکہ جو ذات حیات عطا کرتی ہے وہی اس کی حقیقت کو جانتی ہے - یہ اسی ذات کی قدرت میں ہے کہ وہ زندگی بخشے اور زندگی واپس لے - انسان کبھی اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ کسی سے زندگی چھن جائے لیکن درحقیقت انسان کسی سے اس کی زندگی چھین نہیں سکتا - حقیقت میں حیات و ممات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے - اس کے سوا کوئی بھی حیات و ممات کا واحد "مختار" نہیں ہے -

وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۳:۸۰) "گردش لیل و نہار اسی کے قبضہ

قدرت میں ہے"۔ وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس میں متصرف ہے' جس طرح موت و حیات کا مالک وہی ہے۔ گردش لیل و نہار بھی ایک کائناتی سنت الٰہیہ ہے جس طرح موت و حیات کی کارکردگی اللہ کی سنت کے مطابق ہے۔ یہ نفس انسانی اور جسم انسانی' یہ کائنات اور یہ افلاک سب کے سب اسی سنت کے مطابق چل رہے ہیں۔ اگر اللہ کسی کے جسم سے حیات نکال دے تو اس کا جسم ٹھنڈا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ زمین سے روشنی واپس لے لے تو یہ تاریک رہ جائے گی۔ یہاں اللہ نے زندگی پیدا کی اور روشنی پیدا کی اور ان دونوں سے زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے۔ اور یہ اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (۲۳ : ۸۰) "کیا تم عقل نہیں رکھتے"۔ کہ تم ان چیزوں کی حقیقت کو سمجھ سکو۔ یہ سب چیزیں تو وجود باری اور صنعت باری کے شواہد ہیں کہ وہ خالق و مدبر ہے اور وہ اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے۔

اب ان کے ساتھ سلسلہ کلام ختم کر کے اس پر ایک مثبت تبصرہ کیا جاتا ہے کہ بعث بعد الموت اور حساب و کتاب کے بارے میں ان لوگوں کے جو اقوال ہیں ایسے ہی مقولات سابقہ لوگوں کے بھی رہے ہیں۔

بَلۡ قَالُوۡا مِثۡلَ مَا قَالَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوۡۤا ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۸۳﴾

"مگر یہ لوگ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے پیش رو کہہ چکے ہیں۔ یہ کہتے ہیں "کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہائے پارینہ ہیں"۔

بادی النظر میں یہ بات نہایت مکروہ ہے' اس لیے کہ ان آیات بینات اور ان دلائل انفس اور دلائل کائنات کے باوجود لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں وہ مکروہ باتیں ہیں۔ خود انسانی قوتیں' انسان کی قوت سماعت' اس کی قوت بینائی اور اس کی قوت غور و فکر اسے اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ ایک ذمہ دار اور مسئول ہستی ہے۔ وہ اپنے اعمال و افکار کے بارے میں ذمہ دار ہے۔ اگر وہ اچھے کام کرے گا تو اس کی جزاء کا مستحق ہو گا اور اگر برے کام کرے گا تو سزا کا مستحق ہو گا۔ دنیا میں صاف نظر آتا ہے کہ بعض اوقات انسان کو وہ جزاء نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ سزا نہیں ملتی جس کا وہ سزاوار ہوتا ہے لہٰذا آخرت کا برپا ہونا عقلاً بھی لابدی ہے۔

اللہ ہر وقت مارتا بھی رہتا ہے اور زندگی بھی عطا کرتا رہتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے کہ وہ دوبارہ کس طرح اٹھائے گا جبکہ اللہ ہر وقت مختلف چیزوں کو حیات دیتا رہتا ہے اور زندگی کا سیل رواں اس زمین پر جاری ہے۔

رہے اہل کفر تو نہ صرف یہ کہ ان کے قوائے مدرکہ بعث بعد الموت کا ادراک نہیں کر سکے اور اس میں پائے جانے والی اللہ کی حکمت کو سمجھ نہیں سکے بلکہ وہ اس عقیدے کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے آباء و اجداد کو بھی قیام قیامت سے ڈرایا جاتا رہا ہے لیکن ابھی تک تو یہ قیامت آئی نہیں ہے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۳ : ۸۳)

"ہم نے بھی یہ وعدے بہت سنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں"۔ لیکن بعث بعد الموت کے لیے تو ایک وقت مقرر ہے۔ یہ اللہ نے اپنی تدبیر اور اپنی حکمت سے مقرر کیا ہے۔ اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ یہ گھڑی وقت سے قبل نہیں آسکتی الا یہ کہ اللہ چاہے 'اگرچہ تمام مخلوق اس کا مطالبہ کر دے یا غافلین کا کوئی گروہ اس نظریہ سے مذاق ہی کرتا رہے۔

--- 0 0 ---

مشرکین عرب کے عقائد میں بڑا ہی اضطراب تھا۔ وہ اللہ کے وجود کا انکار نہ کرتے تھے۔ وہ اس بات کا انکار بھی نہ کرتے تھے کہ اللہ مالک سماوات والارض ہے۔ وہ مدبر سماوات ہے اور زمین اور آسمانوں کو تھامنے والا وہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ اور ان کا نظریہ یہ تھا کہ دوسرے الہوں کی بندگی وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انہیں اللہ کے قریب کرتے ہیں۔ پھر وہ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے تھے حالانکہ اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ اللہ کی طرف نسبت کرتے تھے۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے مسلمہ عقائد کا ذکر کر کے ان پر گرفت کرتے ہیں تاکہ ان کے عقائد کے اندر جو اضطراب پایا جاتا ہے' اسے دور کر دیا جائے اور انہیں اس عقیدۂ توحید کی طرف لایا جائے جس کی طرف ان کے مسلمہ عقائد بھی راہنمائی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی فطرت پر قائم ہوں اور انحراف نہ کریں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

"ان سے کہو' بتاؤ' اگر تم جانتے ہو' کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی۔ کہو' پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟ ان سے پوچھو' ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ ضرور کہیں گے

اللہ۔ کہو 'پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟ ان سے کہو' بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہو 'پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے"۔

ان کے عقائد کے اندر جو اضطراب تھا وہ کسی عقلی دلیل پر مبنی نہ تھا نہ کسی منطق کا تقاضا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے اندر مشرکین کے عقائد اور افکار کس قدر بگڑ گئے تھے حالانکہ وہ دین ابراہیم پر ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳: ۸٤) "ان سے کہو' اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟" یعنی زمین کا مالک کون ہے اور زمین کے اندر موجود آبادی کا مالک کون ہے؟

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (۲۳: ۸۵) "یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ مالک ہے"۔ لیکن اپنے عمل میں وہ اس حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھتے اور پھر بھی بندگی غیر اللہ کی کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سے کہو۔

قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳: ۸۵) "پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے"۔ اس حقیقت کو اپنے طرز عمل میں کیوں نہیں لاتے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۳: ۸٦) "ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے"۔ یہ سوال اس کائنات کی ربوبیت کے بارے میں ہے کہ آسمانوں اور عرش عظیم کا متصرف کون ہے۔ سات آسمانوں سے مراد سات افلاک بھی ہو سکتے ہیں یا سات ستاروں کے مجموعے بھی ہو سکتے ہیں۔ یا سات آسمان بھی ہو سکتے ہیں اور سات جہان بھی ہو سکتے ہیں یا کوئی سات فلکی مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔ غرض دراصل یہ رمز ہے قبضے اور کنٹرول اور اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کی طرف۔ یعنی کون ہے جو سات آسمانوں اور عرش عظیم کا کنٹرولر ہے؟

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (۲۳: ۸۷) "یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ"۔ لیکن اس اقرار کے باوجود یہ لوگ رب عرش عظیم سے ڈرتے نہیں۔ نہ رب سماوات سے ڈرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ پھر دوسروں کو شریک بھی کرتے ہیں۔ ایسے بتوں کو جو زمین پر گرے ہوئے ہیں۔

قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳: ۸۷) "تو پھر تم ڈرتے کیوں نہیں"۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(۲۳: ۸۸) "ان سے کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟" یہ سوال قبضے' اقتدار اعلیٰ اور بادشاہت کے بارے میں ہے' کہ کون ہے مقتدر

اسی؟ کون ہے جو سب چیزوں کا مالک ہے اور سب پر اس کا قبضہ و اقتدار ہے۔ کون ہے جو ہر کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ جس کو پناہ دے اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور جس کو وہ پکڑنا چاہے کوئی نہیں ہے جو اسے اللہ کی پکڑ سے بچا سکے۔

سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ (۲۳ : ۸۹) "تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ ہی ہے"۔ اگر تم یہ باتیں تسلیم کرتے ہو تو پھر راہ ہدایت سے کیوں پھرے جا رہے ہو۔ کیا جواز ہے پھر اس گمراہی کا؟

فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ (۲۳ : ۸۹) "پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے؟" حالانکہ اگر تم ان مذکورہ حقائق کو جانتے ہو تو تمہیں دھوکہ نہیں لگنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے عقائد میں اضطراب ہے اور یہ لوگ خبط میں مبتلا ہیں۔

اب مناسب وقت آگیا ہے کہ ان کے شرکیہ عقائد کی تردید کر دی جائے اور اللہ کی ذات سے اولاد کی نفی کر دی جائے اور یہ فیصلہ سنا دیا جائے کہ حقیقی عقائد وہی ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔

بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۹۲﴾ ۵ ۱۵ع

۵ "جو امر حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں' اور کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے' اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ کھلے اور چھپے کا جاننے والا' وہ بالا تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کر رہے ہیں۔

یہ فیصلہ مختلف اسالیب میں آتا ہے۔ ان کے ساتھ اس مباحثے کو ختم کر دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ (۲۳ : ۹۰) "جو امر حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں اور کوئی شک نہیں ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں"۔ اس کے بعد ان کے جھوٹ کی تفصیل دی جاتی ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ إِلٰهٍ (۲۳ : ۹۰) "اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں"۔ اور اس کے بعد پھر ان کے دعوے کے رد میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ان

کے عقیدۂ شرک میں کس قدر کمزوری ہے۔

اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ (۲۳: ۹۰) "تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا"۔ وہ اپنی مخلوقات میں ایک مستقل خدا ہوتا اور وہ اپنی مخلوقات میں اپنے مخصوص قانون قدرت کے مطابق تصرفات کرتا۔ اس طرح مختلف کائناتوں میں مختلف قوانین قدرت نظر آتے اور وہ دوسرے خدا کے قوانین اور نوامیس سے علیحدہ نظر آتے۔ پھر تضاد کی صورت میں

وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲۳: ۹۰) "پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے"۔ تضاد کی صورت میں بعض خدا بعض پر غالب ہوتے۔ یوں آخرکار ایک ہی خدا متصرف اور مقتدر اعلیٰ رہتا اور دنیا میں آخرکار ایک ہی نظام چلتا کیونکہ ایک ملک میں دو مقتدر اعلیٰ تو ہو نہیں سکتے۔

چونکہ کائنات میں اس قسم کا تضاد نہیں ہے' اس کی وحدت ساخت' اور اس کی حرکت کی یگانگت اور اس کے ناموس اور قانون قدرت کی وحدت اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مقتدر اعلیٰ ایک ہے کیونکہ اس کائنات کے اندر اور اس کے اجزاء کے اندر کوئی تصادم نظر نہیں آتا۔ یہ کامل ہم آہنگی کے ساتھ چل رہی ہے اس لیے اس کا رب اور متصرف بھی ایک ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۳: ۹۰) "وہ بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں"۔ وہ عالم الغیب ہے اور عالم شہادت ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی کوئی مخلوق نہیں ہے اس لیے اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کرتے ہیں۔

---()()()---

اب یہاں سے روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اے محمدؐ اس بات سے اللہ کی پناہ طلب کریں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ آپؐ شامل ہو جائیں اگرچہ اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان لوگوں کو جو سزا ملنے والی ہے وہ اللہ آپ کو دکھائے گا۔ بہرحال آپ شیطان کے وسوسوں سے پناہ مانگیں اور یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ان پر صبر کریں۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ اِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

"اے نبیؐ دعا کرو کہ "پروردگار' جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے' تو

لے میرے رب' مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو" - اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی وہ چیز لے آنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں جس کی دھمکی ہم انہیں دے رہے ہیں - لے نبیؐ برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو - جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں - اور دعا کرو کہ "پروردگار' میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں' بلکہ لے میرے رب' میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں"۔

جب ان لوگوں کو وہ عذاب دیا جائے گا جس کی دھمکی ان کو دی جارہی ہے تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے نجات پائیں گے لیکن پھر بھی حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو مزید محفوظ کرنے کے لیے دعا کرتے رہیں اور بعد کے آنے والے اہل ایمان کو بھی یہ ایک قسم کی تعلیم ہے کہ وہ اللہ کے عذاب اور شیطان کی چالوں سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں - ہر وقت بیدار رہیں اور اللہ سے پناہ مانگتے رہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ حیات محمدؐ کے دوران ہی ان پر عذاب لے آئے۔

وَاِنَّا عَلٰٓي اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ (۲۳:۹۵) "اور یہ کہ ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ چیز لانے کی قدرت رکھتے ہیں جس کی دھمکی انہیں دے رہے ہیں" - اور غزوۂ بدر میں اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ایک جھلک دکھا بھی دی - اس کے بعد فتح مکہ میں بھی ایک رنگ دکھایا گیا۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ (۲۳:۹۶) "اے نبیؐ برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو' جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں"- اس سورہ کے نزول کے وقت مکہ مکرمہ میں دعوت اسلامی کے لیے یہ منہاج اختیار کیا گیا تھا کہ برائی کا دفعیہ بھلائی کے ساتھ کیا جائے - اللہ کا حکم آنے تک صبر کیا جائے اور تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ دعا کہ لے رب میں تجھ سے شیطان کی اکساہٹوں سے پناہ مانگتا ہوں' جب کہ آپ خدا کی طرف سے حفاظت میں تھے اور معصوم تھے' یہ بات زیادہ احتیاط اور زیادہ تقویٰ کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ التجاء اور امت کو تعلیم دینے کی خاطر ہے' کیونکہ حضور ہی اپنی امت کے لیے اسوہ ہیں - یہ دراصل امت کو تعلیم ہے کہ شیطان کی اکساہٹوں اور وسوسوں سے اللہ کی پناہ ہر وقت مانگتے رہو - بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ شیطان کے قرب سے بھی پناہ طلب کریں - چنانچہ کہا جاتا ہے۔

وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (۲۳:۹۸) "بلکہ میں تو لے رب' اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے قریب آئیں" - یہ بھی احتمال ہے کہ وفات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے پناہ مانگتے ہوں کہ شیطان اس وقت آموجود ہو - اس آیت کے بعد اگلی آیت جو اگلے سبق میں ہے اس طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ (۲۳:۹۹) "یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے" - یہ قرآن کا انداز کلام ہے کہ ایک مفہوم سے دوسرا مفہوم بڑی ہم آہنگی سے نکلتا چلا جاتا ہے۔

درس نمبر ۱۵۱ تشریح آیات

۹۹--- تا --- ۱۱۸

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ "اے میرے رب، مجھے اسی دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں؟ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ ہرگز نہیں، یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔ اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک"۔

اس آخری سبق میں بھی مشرکین کے برے انجام کی بات آگے بڑھ رہی ہے۔ اب یہ لوگ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں ہیں۔ اس میں آغاز دنیا میں روح قبض کرنے کے وقت سے ہوتا ہے اور نفخ صور پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں سورہ کے اختتام پر اصل مضمون کی طرف آتے ہوئے اس بات سے ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو کیونکہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے۔ سورہ کا خاتمہ اس ہدایت پر ہوتا ہے کہ خود حضورؐ اللہ کی مغفرت طلب فرمائیں۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ (۲۳:۹۹) لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ (۲۳:۱۰۰) "(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ "اے میرے رب، مجھے اسی دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں؟ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا"۔

یہ منظر حالت نزع کا ہے۔ جب موت آتی ہے تو ہر شخص توبہ کرتا ہے۔ رجوع الی اللہ کرتا ہے، یہ درخواست کرتا ہے کہ اے اللہ ایک موقعہ اور دیجئے۔ ایک بار اور زندگی دیجئے تاکہ ہم ان کوتاہیوں کی تصحیح کرلیں اور جو اہل و عیال اور

مال و دولت ہم نے چھوڑے ہیں ان میں تیری مرضی کا تصرف کریں - یہ ایک منظر ہے جسے سب دیکھ رہے ہیں اور مرنے والا یہ درخواست کر رہا ہے اور جواب بھی اعلانیہ آجاتا ہے -

كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا (۲۳ : ۱۰۰) "ہرگز نہیں' یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے"- یہ ایک بات ہے جو وہ کر رہا ہے - اس کا کوئی مصداق وجود میں آنے والا نہیں ہے - یہ لفظ اور اس کا قائل قابل توجہ نہیں ہیں - یہ تو حالت خوف کی ایک چیخ ہے جو منہ سے نکل رہی ہے - یہ کسی اخلاص پر مبنی نہیں ہے - نہ حقیقی توبہ ہے - مشکلات میں ہر کوئی یہ بات کرتا ہے - دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی نہ ارادہ ہوتا ہے -

اب حالت نزع کا خاتمہ ہو جاتا ہے - یہ بات کہنے والے اور دنیا کے درمیان پردہ حائل ہو جاتا ہے - معاملہ ختم ہو گیا - تعلقات ختم ہو گئے - دروازے بند ہو گئے اور پردے گر گئے -

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۲۳ : ۱۰۰) "اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک" - برزخ یعنی پردہ حائل ہے - نہ وہ اہل دنیا سے ہوتے ہیں اور نہ اہل آخرت سے ہوتے ہیں - یہ اس برزخ کے عالم میں ہیں اور قیام قیامت تک یہ لوگ یہاں رہیں گے - اب سیاق کلام قیامت میں داخل ہو جاتا ہے جب کہ صور پھونکا جاتا ہے -

فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

"پھر جونہی کہ صور پھونک دیا گیا' ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے" - تمام رابطے کٹ جائیں گے - وہ اقدار ختم ہو جائیں گی جن کے مطابق وہ دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے -

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (۲۳ : ۱۰۱) "اس دن ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ رہے گا" - اس قدر خوف چھا جائے گا کہ سب خاموش ہوں گے - چپ کھڑے ہوں گے ' کوئی بات ہی نہ کرے گا - اب یہاں نہایت سرعت اور اختصار کے ساتھ حساب و کتاب کا میزان پیش کیا جاتا ہے -

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِىْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں

گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ آگ ان کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے باہر نکل آئیں گے"۔ یہ کہ تمام اعمال کو ترازو میں تولا جائے گا' یہ بھی قرآن مجید کا ایک مخصوص انداز کلام ہے کہ وہ کسی بھی مفہوم کو حسی انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ نہایت ہی مجرد معانی کو ہر شخص سمجھ جائے۔

نیز ان اعمال کے ساتھ ذرا دیکھئے کہ ان کے چہروں پر سے آگ گوشت کو چاٹ جائے گی اور وہ اس طرح نظر آرہے ہونگے جس طرح کسی مردے کے منہ کی ہڈیاں نظر آتی ہیں' دانت نکلے ہوئے۔

یہ لوگ ہیں جن کا میزان اعمال ہلکا ہو گیا ہے۔ یہ ہار گئے ہیں سب کچھ' اپنے نفسوں کو بھی ہار گئے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی جان ہی ہار جائے تو پھر وہ کس چیز کا مالک رہ جاتا ہے۔ اس کی ملکیت میں کیا چیز رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے نفس کو ہار گیا۔ اس کی ذات چلی گئی ہے۔ گویا اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔

اب حکایتی انداز کلام اچانک بدل جاتا ہے اور خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی سرزنش کی جاتی ہے۔ جسمانی عذاب اس قدر دردناک نہیں جس قدر یہ سرزنش اذیت ناک ہے۔ اب گویا ہم پھر ایک منظر میں دیکھ رہے ہیں کہ ان کی سرزنش کی جارہی ہے اور ان کو ملامت کی جارہی ہے۔

أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٠٥﴾

"کیا تم وہی لوگ نہیں ہو کہ میری آیات تمہیں سنائی جاتی تھیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے"۔ جب انہوں نے یہ سوال سنا تو ان کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کو بات کرنے کی اجازت ہے اور وہ جواب دے سکتے ہیں اور شاید اپنے گناہوں کا اعتراف انہیں کوئی فائدہ دے دے۔

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿١٠٧﴾

"وہ کہیں گے "اے ہمارے رب' ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔ اے پروردگار' اب ہمیں یہاں سے نکال دے۔ پھر ہم ایسا قصور کریں تو ظالم ہوں گے؟" یہ نہایت ہی تلخ اعتراف ہے اور ان کی بدبختی اس میں عیاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا اور سوئے ادب کا ارتکاب کیا کیونکہ ان کو صرف سوال کا جواب دینے کی اجازت تھی۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سوال ہی محض ذلیل کرنے کے لیے ہو۔ جواب مطلوب ہی نہ ہو۔ اس لیے ان کی اس درخواست کا جواب سختی سے دیا جاتا ہے کیونکہ درخواست ان سے طلب ہی نہ کی گئی تھی۔

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿١٠٨﴾

"اللہ تعالیٰ جواب دے گا" دور ہو میرے سامنے سے 'پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو"۔ خاموش ہو جاؤ' ایک ذلیل شخص کی طرح خاموشی اختیار کرو۔ جس عذاب میں تم لوگ پڑے ہوئے 'تم اس کے پوری طرح مستحق ہو۔ یہی توہین آمیز پوزیشن تمہارے لیے بہتر ہے۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿١١٠﴾

"تم وہی لوگ تو ہو کہ میرے کچھ بندے جب کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار' ہم ایمان لائے' ہمیں معاف کر دے' ہم پر رحم کر' تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے' تو تم نے ان کا مذاق بنا لیا۔ یہاں تک کہ ان کی ضد نے تمہیں یہ بھی بھلا دیا کہ میں بھی کوئی ہوں' اور تم ان پر ہنستے رہے"۔ تمہارا جرم صرف یہی نہیں ہے کہ تم نے کفر کیا اور خود اپنی ذات کو کفر میں رکھا۔ اگرچہ یہ بھی جرم عظیم تھا مگر تم نے اس سے بھی عظیم تر جرم کیا ہے۔ وہ یہ کہ تم نے ایمان لانے والوں کے ساتھ مزاح کیا۔ جو ایمان لائے تھے اور رحمت رب کے طلبگار تھے تم ان کا مذاق اڑاتے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو ذکر الٰہی اور نصیحت آموزی سے محروم کرتے تھے حالانکہ اس کائنات میں دلائل ایمان موجود تھے۔ آج دیکھو' تمہارا مقام کیا ہے اور ان لوگوں کا مقام و مرتبہ کیا ہے جن سے تم مذاق کرتے تھے۔

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿١١١﴾

"آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں"۔ اس سخت اور توہین آمیز جواب کے بعد ایک نئے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جبکہ اس سوال و جواب میں ان کے ساتھ نہایت ہی توہین آمیز سلوک کیا گیا اور ان کو لاجواب کر دیا گیا ہے۔ اب نیا سوال یہ آتا ہے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾

"پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا' بتاؤ زمین میں تم کتنے سال رہے"۔ اللہ کو تو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے کتنا عرصہ دنیا میں گزارا ہے لیکن مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی کس قدر مختصر ہے' کس قدر حقیر ہے اور دنیا کے دن کس قدر چھوٹے ہیں۔ انہوں نے دنیا کی اس مختصر زندگی کے لیے آخرت کی دائمی زندگی کو خراب کیا۔ وہ تو آج محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا کس قدر مختصر ہے۔ کس قدر معتبر ہے لیکن وہ مایوس ہیں اور ان کے سینے تنگ ہیں۔ اب ان کو کیا پڑی ہے

کر حساب کریں۔

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

"وہ کہیں گے "ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم ٹھہرے' شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے"۔ یہ اس شخص کا جواب ہے جو حد درجہ پریشان' مایوس اور تنگ دل ہو۔

لیکن جواب نہایت ہی حقیقت پسندانہ ہے یہ کہ تم نے بہت ہی کم وقت گزارا ہے بہ نسبت اس کے جواب تم جہنم میں گزارو گے۔ اے کاش کہ دنیا میں تم صحیح اندازہ کر سکتے۔

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

"ارشاد ہو گا تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہو نا' کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا"۔ اب دوبارہ ان کی سرزنش کی جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ بعث بعد الموت کی حکمت کیا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟" معلوم ہونا چاہئے۔ حکمت تخلیق کا لازمی تقاضا ہے کہ بعث بعد الموت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا قیام مقدر کر دیا ہے۔ اس کے مقاصد تدبیر کائنات کا حصہ ہیں۔ قیامت تخلیق کا منطقی نتیجہ ہے۔ بعث کے ساتھ تخلیق کائنات اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے اور مقصد تخلیق پورا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت سے وہی لوگ غفلت کر سکتے ہیں جن کے دلوں پر پردے آگئے ہوں اور جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہو' جو حکمت الہیہ پر کبھی غور و فکر کرنے کی تکلیف ہی نہیں کرتے حالانکہ یہ حکمت اس کائنات کے اندر بکھری پڑی ہے۔

---()()()---

سورہ کا خاتمہ عقیدہ توحید کے اعلان پر ہوتا ہے اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے شرک کیا وہ عظیم خسارے میں پڑ گئے جبکہ اہل توحید فلاح پائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ سے مغفرت طلب کریں اور اللہ کی رحمت کے طلبگار ہوں۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ

۶

ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ

ع ۲۶

۶

”پس بالا و برتر ہے اللہ 'بادشاہ حقیقی 'کوئی خدا اس کے سوا نہیں 'مالک ہے عرش بزرگ کا۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے 'جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں 'تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ اے نبی "کہو 'میرے رب درگزر فرما اور رحم کر 'تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے"۔ اس سے پہلے قیامت کا منظر گزر چکا ہے۔ اس پر یہ تبصرہ ہوتا ہے 'نیز اس سے قبل کے مناظر میں بحث و مباحثہ اور دلائل و بینات کا مفصل ذکر ہو چکا تھا۔ یہ تبصرہ اس پوری سورہ کا منطقی نتیجہ ہے کہ اللہ شرک سے پاک ہے۔ وہ مالک حق ہے اور وہی مقتدر اعلیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ بادشاہت اس کی ہے اور وہی بلندی کا مستحق ہے۔ وہ رب عرش عظیم ہے۔

اب جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور شخصیت کی الوہیت اور حاکمیت کو مانتے ہیں ان کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نہ اس کائنات میں اس کا کوئی ثبوت ہے 'نہ انسانی فطرت اس کو مانتی ہے اور نہ انسانی عقل اس پر آمادہ ہوتی ہے۔ جو لوگ ایسا دعویٰ کریں گے ان کو اپنے رب کے سامنے حساب دینا ہو گا اور حساب کا نتیجہ یہی ہے کہ کافر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور یہ اٹل ہے۔ اس کے بالمقابل اہل ایمان فلاح پائیں گے اور یہ تقاضائے فطرت و تقاضائے ناموس کائنات ہے۔

اب کافروں کے پاس جو انعامات ہیں 'دنیا کا ساز و سامان ہے اور دنیا کا اقتدار ہے جو بعض اوقات قائم ہوتا رہتا ہے تو یہ ان کی کامیابی نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے فتنہ اور آزمائش ہے۔ اگر ان میں سے بعض اس دنیا میں بلاحساب چلے جائیں تو آخرت میں حساب ان کے لیے تیار ہے 'وہاں ان کو پورا پورا حساب دینا ہو گا۔ آخرت کا حساب اس تخلیق کا آخری منظر ہو گا۔ اللہ کی تخلیق کے نظام میں آخرت اس دنیا سے علیحدہ اور دور نہیں ہے۔ یہ اس دنیا کا آخری صفحہ ہے اور اس کا حصہ ہے۔

--- ○○○ ---

سورہ مومنون کی آخری آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمت کی طلب کرتے رہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۲۳:۱۱۸) "اور اے نبی "کہو 'میرے رب درگزر فرما اور رحم کر 'تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے"۔ دیکھیے سورہ کا آغاز اور انجام ایک ہی مضمون پر ہوتا ہے۔ آغاز بھی اس مضمون سے ہے کہ مومنین کامیاب ہوئے اور کافرین خسارے میں پڑ گئے۔ آغاز میں بھی یہ مضمون تھا کہ نماز میں خشوع و خضوع اختیار کیا جائے اور یہاں بھی اللہ کے سامنے دعاء اور طلب رحمت ہے۔ یوں سورہ کا آغاز اور انجام یکساں ہو جاتے ہیں۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۱۸

سورۃ النور ۔ ۲۴

۱--- تا--- ۶۴

سورۃ النور ایک نظر میں

یہ سورہ نور ہے' اس میں لفظ نور آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۴ : ۳۵) میں ذکر ہوا ہے۔ پھر اس سورہ میں جو مضامین ہیں وہ قلب و نظر اور ضمیر و اخلاق کے لیے نور ہیں اور ان کے نتیجے میں انسانوں میں نورانی آداب پیدا ہوتے ہیں۔ اس سورہ میں جو نفسیاتی اخلاق' عائلی ضوابط اور اجتماعی قوانین وضع کیے گئے ہیں وہ نور ہی نور ہیں اور یہ نور پھر ایک کائناتی نور سے مربوط ہے اور وہ نور روح کا نور ہے' دلوں کی روشنی ہے اور ضمیر کے لیے میقل ہے۔ یہ سب کچھ اس عظیم نور کا پرتو ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۴ : ۳۵) اس سورہ کا آغاز ایک زوردار اعلان شاہی سے ہوتا ہے کہ اس سورہ کو ہم نے فرض قرار دیا ہے۔ اس کے اندر جو فرائض و حدود ہیں اور جو آداب و اخلاق ہیں اور جو احکام و قوانین ہیں وہ قدرتی ہیں۔

سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَ فَرَضْنٰھَا وَ اَنْزَلْنَا فِیْھَآ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۲۴ : ۱) "یہ ایک سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایت نازل کی ہیں' شاید کہ تم سبق لو"۔ اس آغاز سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی میں اخلاق و آداب کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ نیز اسلامی نظریہ حیات میں اور اسلامی کلچر میں اعلیٰ اخلاق اور اچھے اور صاف طرز عمل کو کس قدر بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

اس سورہ کا محور مومنین کی اخلاقی تربیت ہے اور ان اخلاقی احکام کو تعزیری قوانین جیسی اہمیت دی گئی ہے۔ پھر یہ اخلاقی تعلیمات محض اخلاق اور قانون سے بلند ہو جاتی ہیں اور روحانی انداز اختیار کر کے اعلیٰ وجدانی طرز عمل اختیار کر لیتی ہیں کہ انسانی زندگی اور یہ پوری کائنات اللہ کے نور سے جا ملتی ہے۔ ان تعلیمات میں شدت بھی ہے اور نرمی بھی ہے۔ مگر شدت اور نرمی دونوں سے نفس انسانی اور شعور انسانی کی تربیت مقصود ہے۔ اخلاقی معیاروں کو اس قدر بلند کرنا مطلوب ہے کہ وہ شفاف بن کر اللہ کے نور کا حصہ بن جائیں۔ انسان کے انفرادی اعمال اور افکار گھرانوں کے اخلاق و آداب اور معاشرے' سوسائٹی اور قیادت کے اخلاق و آداب سب کے سب ایک ہی سرچشمے یعنی نور ربی سے ماخوذ ہیں جو نور سماوات والارض ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہ پوری کائنات روشن ہے۔ آسمان روشن' زمین روشن' انسانی نفس' انسانی روح اور اخلاق روشن۔

اپنے محور اور موضوع کے گرد اس سورہ کے پانچ اور اسباق ہیں :

پہلے دور میں ایک ایسا دو ٹوک اعلان ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے' متصلاً حد زنا کے قانون کا اعلان ہے اور یہ

بتایا گیا ہے کہ چغلی نہایت ہی مکروہ فعل ہے۔ زانی اسلامی معاشرے کا حصہ نہیں ہو سکتے۔اس کے بعد حد قذف اور اس کے لیے سخت قانون سازی کا بیان ہے۔ اور زوجین کو حد قذف سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔البتہ ان کے لیے لعان کا قانون پاس کر کے ان کے درمیان جدائی کی گئی ہے۔اس کے بعد افک کی کہانی آتی ہے اور یہ سبق ختم ہوتا ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ خبیث لوگوں کے ساتھ خبیث ملتے ہیں اور نیک اور پاک لوگوں کے ساتھ نیک اور پاک لوگ ملتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں کو باہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہئے۔

دوسرے سبق میں ان انسدادی ذرائع کا ذکر ہے جو اس جرم سے بچاتے ہیں اور ان تدابیر کا ذکر ہے جن کے ذریعہ اسلام انسان کو ان برائیوں میں پڑنے سے بچاتا ہے۔مثلاً دوسروں کے گھروں میں بغیر اذن و اجازت داخل نہ ہونا۔ مثلاً غض بصر کے احکام' غیر محارم کے سامنے زیب و زینت کا اظہار نہ کرنا' نوجوان عورتوں کا جلدی سے نکاح کر دینا' عورتوں اور لونڈیوں کو حرام کاری سے منع کرنا۔ غرض وہ تمام ذرائع اختیار کرنا جن سے قلب و نظر اور ضمیر و شعور میں پاکیزگی پیدا ہو اور ان چیزوں سے بچنا جن کی وجہ سے حیوانی خواہشات ان میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کا کسی پاکیزہ شخص کے طرز عمل پر اثر ہوتا ہے۔جبکہ وہ ہر قسم کے دامن گیر موثرات سے دامن بچائے پھرتے ہیں۔

تیسرا دور اللہ کے نور سے متعلق ہے جو ان آداب کے درمیان میں آتا ہے جو اس سورہ کا خاص موضوع ہیں۔اس طرح ان آداب کو اللہ کے نور سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔اللہ کے پاک گھروں میں ذکر کرنے والے پاک لوگوں کا ذکر اس سبق میں ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ذکر الٰہی کرنے والے یہ لوگ اس نور الٰہی سے ہدایت یافتہ ہیں جبکہ اہل کفر کی مثال یوں ہے کہ وہ سراب کو حقیقت سمجھتے ہیں یا وہ ظلمتوں کے تہ بہ تہ اندھیروں میں ہیں۔اللہ کے اس نور سے آفاق کائنات بھرے ہوئے ہیں اور تمام مخلوق اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔اس فضائے کائنات میں اللہ بادلوں کو چلاتا ہے۔رات اور دن کی گردش کا ذکر' پانی سے تمام قسم کے جانوروں کی تخلیق کا ذکر جن کی شکلیں اور کام مختلف ہیں۔یہ سب چشم بینا کے لیے بصیرت افروز امور ہیں۔

پانچویں سبق میں یہ بتایا گیا کہ منافقین کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کا احترام نہیں ہے۔وہ رسول ؐ اطاعت نہیں کرتے' اپنے فیصلے رسول ؐاللہ سے نہیں کراتے جبکہ اہل ایمان مطیع فرمان ہیں اور اسی راہ پر چل کر وہ اس کرۂ ارض پر بطور مقتدر اعلیٰ فائز ہوں گے اور دین کو غلبہ اور کافروں کے مقابلے میں ان کو نصرت حاصل ہوگی۔

پانچویں سبق میں کسی دوسرے شخص کے گھر میں داخل ہونے کے آداب' اقارب کے درمیاں ضیافت کے آداب اور پھر یہ کہ اہل ایمان ایک ہی خاندان ہیں اور ان کے سربراہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا اہل ایمان کی سوسائٹی ایک ہی فیملی ہے۔

خاتمہ کلام اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمانوں کے مقتدر اعلیٰ ہیں۔ وہ لوگوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔خفیہ حالات ہوں یا ظاہری' ایک دن آنے والا ہے کہ لوگ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔وہ ان سے حساب و کتاب لے گا اور اللہ علیم و خبیر ہے۔

---()()()---

درس نمبر ۱۵۲ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۶

سورۃ النور مدنیۃ (۲۴) (۱۰۲) آیاتھا ۶۴ رکوعاتھا ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
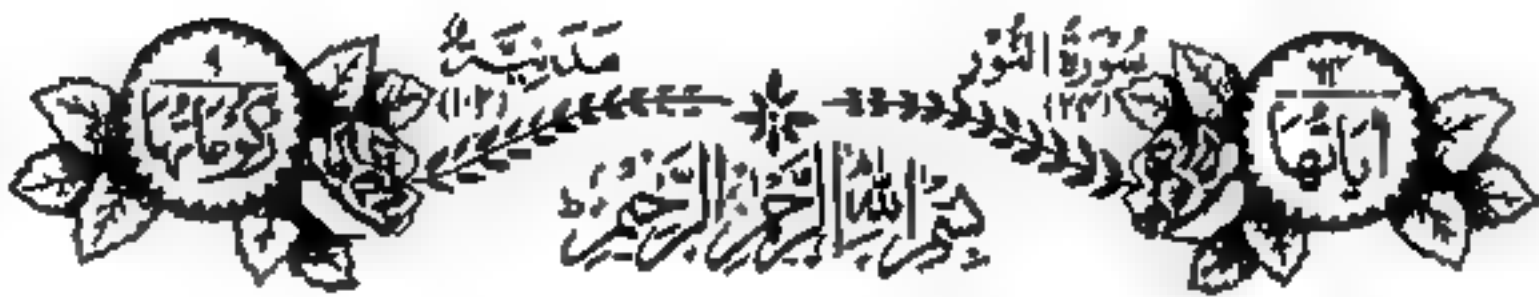
سُورَةٌ أَنزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"یہ ایک سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے' اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں شاید کہ تم سبق لو"۔

یہ پورے قرآن مجید میں اپنی نوعیت کا واحد مطلع کلام ہے۔ اس میں جو نیا لفظ ہے وہ فَرَضْنٰھَا کا ہے' جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورہ میں جو کچھ ہے اس کا اخذ کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یعنی اس کے اندر مذکور آداب پر عمل کرنا بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح حدود پر عمل کرنا لازمی ہے۔ یہ اخلاق و عادات نہایت ہی فطری ہیں۔ ان آداب اور اخلاق کو لوگ بعض ایسے عارضی حالات کی وجہ سے بھول جاتے ہیں جو انسان کو دھوکہ دے کر بدراہ کر دیتے ہیں' یہ آیات ایسے لوگوں کو یاد دہانی کرا کے راہ راست دکھاتی ہیں اور پھر ان کو راہ فطرت پر واپس لاتی ہیں جو بالکل واضح ہے۔

--- ○○○ ---

اس دو ٹوک تمہید کے بعد قانون حد زنا کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس فعل کو نہایت ہی قبیح گردانتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ زانی اور اسلامی سوسائٹی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں رہتا۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾ الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣﴾

"زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔ زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر"۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں حد زنا وہ تھی جو جس کا تذکرہ سورہ نساء کی آیت میں ہوا۔

وَالَّتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا (۴: ۱۵)

"اور وہ تمہاری عورتیں جنھوں نے فاحشی کا ارتکاب کر لیا تو ان پر چار گواہ گزارو' اگر چار گواہ شہادت دے دیں تو انہیں گھروں میں روک رکھو' یہاں تک کہ انہیں موت آ لے یا ان کے لیے اللہ کوئی راستہ نکال دے"۔ عورت کے لیے سزا یہ تھی کہ اسے گھر میں بند کر دیا جائے اور ملامت کر کے اذیت دی جائے۔ اور مرد کو بھی لعنت و ملامت کی جاتی تھی۔

اس کے بعد پھر سورہ نور میں حکم آ گیا اور یہ تھا وہ راستہ جو زنا کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے نکال دیا گیا جس کے بارے میں اللہ نے سورہ نساء میں اشارہ فرمایا تھا۔

کوڑوں کی یہ سزا ان مردوں اور عورتوں کے لیے ہے جو شادی شدہ نہ ہوں یعنی شادی کے ذریعے ارتکاب جرم سے محفوظ نہ کر دیئے گئے ہوں۔ اور یہ سزا تب نافذ ہو گی جب مجرم مسلم' بالغ اور آزاد ہو۔ رہا وہ شخص جو محصن ہے یعنی جس نے شادی کر لی ہے اور شادی کے نتیجے میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کر چکا ہو۔ مسلم ہو بالغ ہو اور آزاد اور نکاح بھی شرعاً نکاح صحیح ہو تو اس کی حد' حد رجم ہے۔

حد رجم سنت سے ثابت ہے جبکہ کوڑوں کی حد قرآن کریم سے ثابت ہے۔ قرآن کی یہ آیت عام تھی اور مجمل تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محصن زانیوں کو رجم کی سزا دیتے تھے اس لیے ثابت ہو گیا کہ کوڑوں کی سزا غیر محصین کے لیے ہے۔

یہاں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا محصن کو رجم سے قبل کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی یا نہیں۔ جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ دونوں سزاؤں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ جب غیر محصن زانی کو کوڑوں کی سزا دی جائے گی تو پھر اسے بموجب حدیث جلاوطن بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ اسی طرح غلام زانی کی حد میں بھی اختلاف ہے۔ یہ اختلافات بہت طویل مباحث چاہتے ہیں۔ مناسب ہے کہ قارئین ان کے بارے میں معلومات کتب فقہ سے حاصل کریں۔ ہم یہاں صرف اس قانون کی تہ میں موجود فلسفہ اور حکمت سے بات کریں گے۔ آپ نے پڑھا کہ کنواروں کی سزا کوڑوں تک محدود ہے اور شادی شدہ محصنین کی سزا رجم ہے۔ یہ اس لیے کہ جس شخص نے مسلم' بالغ اور حر ہوتے ہوئے نکاح صحیح میں عورت کے ساتھ مجامعت کر لی اس کو توصیح پاک اور شریفانہ طریقہ معلوم اور میسر ہو گیا ہے۔

ایسا شخص اگر جنسی بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر فطری بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ شخص راہ فطرت اور راہ اسلام سے منحرف ہے لہٰذا اسے سخت سے سخت سزا ملنی چاہئے۔ رہا غیر شادی شدہ غیر محصن تو ان سے غلطی کے وقوع کا امکان زیادہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو سکتا ہے جبکہ اس پر ابھی نادانی کا دور ہے۔ پھر یہاں نفس جرم میں بھی فرق ہے محصن چونکہ اس کام میں سابق تجربہ رکھتا ہے اس لیے وہ اس فعل سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے بہ نسبت کنوارے کنواروں کے جو زیادہ تجربہ کار نہیں ہوتے۔

قرآن کریم یہاں صرف غیر محصن یعنی کنواروں کی سزا کا ذکر کرتا ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تصریح کر دی ہے اور یہاں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے۔

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۲) "زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے"۔

حکم یہ ہے کہ اسلامی حدود کا نفاذ سختی سے کیا جائے اور اس معاملے میں کسی قسم کی رعایت یا نرمی اور رحمدلی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ معاملہ اللہ کے دین کے ساتھ متعلق ہے۔ اور دین کے معاملے میں نرمی ناقابل برداشت ہے۔ نیز نفاذ سزا کے وقت مومنین کی ایک تعداد کو حاضر ہونا چاہئے تاکہ سزا کا اثر مجرم پر زیادہ ہو۔ روحانی لحاظ سے بھی اسے اذیت پہنچے اور دیکھنے والوں کے لیے بھی عبرت انگیز ہو۔

اس کے بعد اس فعل کی کراہت اور ناپسندیدگی کو ظاہر کرنے کے لیے اس فعل کے مرتکبین کو اسلامی معاشرت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے یعنی یہ فعل اس قدر شنیع ہے کہ کوئی شخص ایسے مجرموں کے ساتھ نکاح نہ کرے۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۳) "زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر"۔ تو معلوم ہوا کہ اس فعل بد کا ارتکاب جب کوئی کرتا ہے تو وہ اس وقت نہیں کرتا جب وہ مومن ہو۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے ایسی نفسیاتی حالت میں ہوتے ہیں کہ اس وقت ان کے شعور اور دل سے ایمان دور ہو جاتا ہے اور اس فعل کے ارتکاب کے بعد کسی نفس مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرے جو اس فعل شنیع کی وجہ سے دائرہ ایمان سے نکل گیا ہے۔ ایک مومن ایسے رابطے سے نفرت کرتا ہے اور اس کا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے یہاں تک کہ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ زانی اور عفیفہ کے درمیان نکاح کو حرام سمجھتے ہیں۔ اسی طرح عفیف اور زانیہ کے درمیان بھی وہ نکاح کو حرام

سمجھتے ہیں۔ الا یہ کہ دونوں کے درمیان توبہ کے ذریعے صفائی ہو جائے اور یہ گندگی دور ہو جائے۔ بہرحال ایک پاکباز مومنہ ایک زانی سے نکاح کرنے سے ابا کرتی ہے اور اسی طرح ایک پاکباز مومن بھی ایک زانیہ سے نکاح کو قابل نفرت سمجھتا ہے۔ اس قسم کے نکاح کے لیے چونکہ حرام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لیے شریعت اور دینی مزاج اس کو بہرحال مستبعد سمجھتا ہے۔

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۳) "اور اسے مومنین کے لیے حرام کر دیا گیا ہے"۔ یوں اسلامی سوسائٹی سے ناپاک اور گندے لوگوں کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

اس آیت کی شان نزول میں روایت ہے کہ ایک شخص مرثد ابن ابو مرثد مکہ سے ضعیف اسیروں کو اٹھا کر مدینہ لانے کا کام کرتا تھا۔ "وہ لوگ جن کو اہل مکہ نے مدینہ ہجرت کر کے جانے سے روک دیا تھا"۔ مکہ میں ایک بدکار عورت تھی جس کا نام عناق تھا' جو مرثد کی دوست تھی۔ مرثد نے مکہ کے نظربندوں میں سے ایک شخص کے ساتھ وقت مقرر کر رکھا تھا کہ وہ اسے رات کو اٹھا کر لے جائے گا کہتے ہیں کہ چاندنی رات تھی اور میں مکہ کے ایک گھر کی دیوار کے سایہ میں تھا۔ عناق آگئی اور اس نے دیوار کے ساتھ لگا ہوا سایہ دیکھ لیا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور بولی "مرثد ہو"۔ میں نے کہا "مرثد ہوں"۔ تو اس نے کہا مرحبا اہلا وسہلاً۔ پھر اس نے کہا آؤ اور ہمارے ساتھ آج رات رہو۔ تو میں نے اس سے کہا عناق! اللہ نے تو زنا کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اس نے علاقے میں شور کر دیا کہ دیکھو مرثد تمہارے نظربندوں کو لے جا رہا ہے۔ چنانچہ میں باغ میں داخل ہو گیا اور آٹھ افراد مرے پیچھے نکل پڑے۔ میں ایک غار یا کیف میں پہنچ گیا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ لوگ آئے اور انہوں نے میرے سر پر کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ ان کا پیشاب میرے سر پر گر رہا تھا لیکن اللہ نے ان کو ایسا اندھا کر دیا تھا کہ انہوں نے مجھے نہ دیکھا۔ مرثد کہتے ہیں کہ یہ لوگ واپس ہو گئے اور میں نے بھی واپس آکر اپنے آدمی کو لیا۔ یہ بہت بھاری شخص تھا۔ "اذخر" تک میں پہنچا۔ میں نے اس شخص کی رسیاں کھولیں۔ میں اس کو اٹھاتا اور وہ بھی میری مدد کرتا۔ یہاں تک کہ ہم مدینہ پہنچ گئے۔ میں رسول اللہؐ کے پاس آیا اور میں نے آپؐ سے درخواست کی حضورؐ میں عناق کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دو بار حضورؐ سے یہ سوال کیا اور حضورؐ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۳) "زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر"۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے مرثد زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ لہذا تمہیں چاہئے کہ اس کے ساتھ نکاح نہ کرو"۔ (ابوداؤد' نسائی' ترمذی)۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زانیہ کے ساتھ مومن کا نکاح اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک توبہ نہ کرے۔ اس طرح کوئی مومنہ بھی زانی سے نکاح نہیں کر سکتی الا یہ کہ وہ توبہ کرے۔ یہ امام احمد کی رائے ہے۔ دوسرے

فقہاء نے دوسری آراء کو لیا ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بہرحال زنا ایک ایسا فعل ہے کہ اس کا مرتکب اسلامی سوسائٹی میں رہنے کا اہل نہیں رہتا۔ اسلامی سوسائٹی سے اسے دور ہونا چاہئے اور دور کر دیا جانا چاہئے۔ یہ بھی ایسے مجرموں کے لیے ایک قسم کی سزا ہے جس طرح کوڑوں کی سزا ایک سزا ہے۔

اسلام نے اس مکروہ اور شنیع فعل پر اس قدر سخت اور دوٹوک سزا تجویز کی ہے' یہ اس لیے نہیں ہے کہ اسلام انسان کے فطری تقاضوں کے خلاف کوئی جنگ لڑنا چاہتا ہے۔ اسلام تو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے فطری میلانات اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے کا انتظام ہونا چاہئے۔ اسلام اس امر میں انسانیت کی بھلائی نہیں دیکھتا کہ انسان کے فطری میلانات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ نہ اسلام انسان کے ان فطری دواعی کے خلاف ہے جو خالق کائنات نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر رکھے ہیں اور یہ اس کائنات کی عظیم زندگی کے قواعد کا ایک حصہ ہیں۔ انہی فطری میلانات کے نتیجے میں سلسلہ حیات کا تسلسل قائم ہے اور زمین کی تعمیر و ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ جو فریضہ خلافت ارضی کا ایک حصہ ہے بلکہ اسلامی نظام حیات کی جنگ دراصل حیوانیت کے خلاف جنگ ہے۔ ایک حیوان کے نزدیک ایک جسم اور دوسرے جسم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ نہ حیوانات کی کوئی فیملی ہوتی ہے۔ نہ ان کے درمیان مشترکہ جائے رہائش ہوتی ہے اور نہ مشترکہ زندگی ہوتی ہے۔ بس چند لمحوں کا جسمانی ملاپ ہوتا ہے فقط۔ اسلام انسانی زندگی کو اس قدر عارضی میلانات پر استوار کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسلام جنسی تعلق کو ترقی یافتہ انسانی شعور کی بنیاد پر استوار کرتا ہے کہ دو پاک اور نفیس جسم ایک دوسرے کے ساتھ ملیں۔ دو دل اور دو روحیں اکٹھی ہو جائیں۔ دو انسان مل جائیں۔ ان کے درمیان ایک مشترکہ زندگی کی تعمیر ہو۔ ان کے درمیان مشترکہ امیدیں ہوں' ان کا دکھ درد مشترک ہو۔ ان کا مستقبل مشترک ہو۔ اور دونوں کی آنے والی اولاد ہو۔ ان کی خوشیوں اور ان کی ذمہ داریوں میں وہ شریک ہوں اور یہ جدید آنے والی نسل ایک ہی مشترکہ جائے رہائش میں پروان چڑھے اور دونوں والدین اس نرسری کی حفاظت اور نشوونما کے لیے کھڑے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زنا کی سزا میں اس قدر شدت اختیار کی ہے کیونکہ جنسی تعلقات میں زنا حیوانیت کی سطح تک گرنے کے مترادف ہے۔ اس سے ان تمام اعلیٰ قدروں کی نفی ہو جاتی ہے جو اسلام کے پیش نظر ہیں اور وہ تمام معاشرتی مقاصد فوت ہو جاتے ہیں جن کو اسلام بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ اس سے انسان محض حیوانیت کے مقام تک گر جاتا ہے۔ کیونکہ اگر عورت اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہ ہو اور مرد اور مرد کے درمیان فرق نہ کیا جائے تو یہ حیوانی سطح ہے۔ آزاد شہوت رانی کے نظام میں انسانیت اس قدر مسخ ہو جاتی ہے کہ لوگ گوشت اور خون کی ایک لمحاتی بھوک پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ اور اس وقتی اور حیوانی جنسی ملاپ کے نتیجے میں' زندگی کی تعمیر کا جذبہ نہیں ہوتا' اس کرۂ ارض کی تعمیر کا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ نہ اس ملاپ سے اولاد کے حصول کا کوئی جذبہ ہوتا ہے بلکہ اس کی پشت پر کوئی حقیقی اور بلند جذبہ ہوتا ہی نہیں۔ کیونکہ محبت اور میلان کے اندر بھی ایک قسم کا دوام ہونا چاہئے جبکہ زنا کے پیچھے جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ سب کا سب وقتی ہوتا ہے۔ بعض معاشروں میں اگرچہ دوستی اور محبت کے طویل تعلقات ہوتے ہیں لیکن ان کی پشت پر اعلیٰ انسانی اقدار نہیں ہوتیں۔ ان کی پشت پر محض حیوانیت ہی ہوتی ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق وہ نہ فطری میلانات اور خواہشات کو دباتا ہے اور نہ ان کو کوئی ناپاک چیز سمجھتا ہے۔ اسلام

ان کو منظم اور منضبط کر کے پاکیزگی عطا کرتا ہے اور حیوانی مقام سے بلند کر کے اسے ایک ادارہ اور محور بنا دیتا ہے جس کے ارد گرد بے شمار نفسیاتی اور اجتماعی آداب جمع ہو جاتے ہیں۔ رہا زنا اور خصوصاً عصمت فروشی تو اس سے یہ فطری جذبات پاکیزگی اور روحانیت اور اعلیٰ خواہشات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ نیز نسل انسانی کی تاریخ میں اس ادارے سے ہمیشہ جو آداب و اقدار وابستہ رہتی ہیں' وہ اس ادارے سے چھن جاتی ہیں اور یہ محض حیوانی لذتیت تک گر جاتا ہے بلکہ حیوان سے بھی زیادہ غلیظ گندا اور گرا ہوا ہوتا ہے اس لیے کہ بے شمار حیوانات اور پرندے ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کی منظم ازدواجی زندگی ہوتی ہے۔ اور اس زندگی میں جنسی تعلق میں طوائف الملوکی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ دو انسان زناکاروں کے درمیان ہوتی ہے خصوصاً جسم فروش عورتوں کے معاملے میں تو فریقین حیوانوں سے بھی پیچھے ہوتے ہیں۔

اسلام چونکہ انسانی معاشرے سے اس گراوٹ کو دور کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے زنا کی سزا میں اس قدر سختی برتی ہے۔ زنا کے جرم کے خلاف علماء نے بعض دوسرے اسباب بھی گنوائے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سبب بھی ایک پورا جواز فراہم کرتا ہے کہ زنا کے جرم پر اس قسم کی سخت سزا دی جائے' مثلاً یہ کہ اس سے نسب میں اختلاط پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان بغض اور کینہ اور دشمنی پیدا ہوتی ہے اور یہ کہ مطمئن گھرانوں کے اطمینان کے اندر فرق پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے خیال میں اس سزا کا اصل اور جامع سبب یہی ہے کہ انسان کو حیوانی جنسی ملاپ کی گراوٹ سے بلند کیا جائے اور ان اقدار و آداب کو محفوظ کیا جائے جو جنسی ملاپ کے انسانی ادارے سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں۔ نیز یہ کہ اس ادارے کو دوام بخشا جائے اور زوجین اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ مقاصد کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ زندگی بسر کریں۔ یہ سب سے اہم اور جامع وجہ ہے جو جامع الوجوہ والاسباب ہے۔

پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام اس جرم کی سزا میں تشدد اس وقت کرتا جب اس جرم کے وقوع کے خلاف تمام احتیاطی اور انتہائی تدابیر اختیار کر لی جائیں۔ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور جب قائم ہوتا ہے تو اس میں سوسائٹی ایسے خطوط پر منظم ہو چکی ہوتی ہے کہ پاکیزہ زندگی گزارنے کے مواقع عام ہوتے ہیں اور گندی اور غلیظ زندگی گزارنے کے مواقع محدود ہوتے ہیں۔ تب اسلام ان لوگوں پر یہ سزا نافذ کرتا ہے جو پاکیزہ طریقوں کو چھوڑ کر گندے طریقے اپناتے ہیں۔ اور اس صورت میں کئی ایسے نمونے اور مثالیں موجود ہیں جن سے ہماری اس بات کی تصدیق ہوگی۔

نیز اگر یہ جرم واقع بھی ہو جائے تو بھی اسلام نے اس کے ثبوت کے لیے اس قدر مشکل طریق کار رکھا ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں شبہ پیدا ہو ہی جاتا ہے اور اسلام کے قانون جرائم کے سلسلے میں یہ اہم اصول وضع کیا گیا ہے کہ شبہات کے ذریعہ الزام جرم ساقط کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں پر سے حدود کو ساقط کر دو جہاں تک تم سے ہو سکتا ہے۔ اگر ملزم کے چھوڑے جانے کی کوئی سبیل اور راستہ ہو تو اسے نکلنے دو کیونکہ قاضی اگر معاف کرنے میں غلطی کر جائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام چار گواہ طلب کرتا ہے جو عادل بھی ہوں اور جو یہ شہادت دیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے فعل ہوتے دیکھا ہے یا یہ کہ ملزم کی طرف سے ایسا اعتراف ہو جس میں کوئی شبہ نہ ہو۔

بعض اوقات یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ پھر اسلام نے چار آدمیوں کی شہادت کی جو شرط لگائی ہے تو یہ سزا پھر خیالی سزا ہو گی اور اس سزا کے نفاذ کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا اسلام ،سلامی سوسائٹی سے جرم زنا کو

صرف سزا کے ذریعے نہیں مٹاتا بلکہ اسلامی نظام دوسرے انسدادی اسباب بھی اختیار کرتا ہے جن کی وجہ سے یہ جرم واقع ہی کم ہوتا ہے۔ اسلام انسان کی تہذیب و تربیت پر زور دیتا ہے۔ انسانوں کے ضمیر کو پاک کرتا ہے۔ اسلام لوگوں کے اندر یہ ڈر پیدا کرتا ہے کہ جو شخص اس جرم کا ارتکاب کرے اگر اس کا یہ جرم افشا ہو گیا تو وہ اس سوسائٹی کا ایک بدکردار شخص مشہور ہو گا' کوئی اسے اپنی بیٹی ـــــ نہ دے گا یا کوئی اس کی بیٹی کو بیوی نہ بنائیگا۔ اسلامی سوسائٹی سے وہ کٹ جائے گا۔ اسلام سزا صرف ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس جرم کا ارتکاب اس قدر دلیری سے کریں کہ انہیں چار افراد دیکھ لیں یا ایسے لوگوں پر یہ سزا نافذ کرتا ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں اور جو اپنے آپ کو سزا کے ذریعے سے پاک کرنا چاہتے ہوں اور وہ اقرار جرم کر لیں جیسا کہ حضرت ماعز اور غامدیہ کے ساتھ ہوا۔ یہ دونوں خود حضورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ حضورؐ ہمیں پاک کر دیں۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں چار مرتبہ اعراض فرمایا اور چار مرتبہ اقرار و اصرار کرنے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ اب حد قائم کر دی جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "آپس میں حدود کو معاف کر دیا کرو' اگر حدود کا کوئی معاملہ مجھ تک پہنچ گیا تو پھر اس کا نفاذ واجب ہو جائے گا" (ابو داؤد)۔

لیکن جب ارتکاب جرم کا یقین ہو گیا اور معاملہ حکام مجاز تک پہنچ گیا تو پھر اس میں کسی نرمی کی اجازت نہیں ہے۔ پھر حدود کا نفاذ واجب ہو جاتا ہے اور پھر یہ دین کا معاملہ بن جاتا ہے اور اس میں رحم کرنا جائز نہیں ہے۔ ثبوت جرم کے بعد رحمدلی کے معنی یہ ہیں کہ مجرم پر رحمدلی کی جائے اور سوسائٹی کے ساتھ سنگدلی کی جائے اور انسانی آداب اور انسانی ضمیر پر ظلم کیا جائے۔ یہ دراصل ایک مصنوعی رحمدلی ہوگی۔ ہمارے مقابلے میں اللہ اپنے بندوں پر زیادہ رحمدل ہے اور اللہ نے یہ سزا تجویز کی ہے اور کسی مومن اور مومنہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کر دیں تو انہیں ان کے لیے اس میں کوئی اپنا اختیار ہو۔ اللہ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے۔ نیز اللہ بندوں کے مزاجوں سے بھی ہم سے زیادہ واقف ہے اس لیے کسی بکنے والے کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی سزا کے بارے میں یہ کہے کہ یہ سخت ہے۔ ہم کہتے ہیں سوسائٹی میں اس گھناؤنے جرم کے پھیلانے کے مقابلے میں یہ بہت ہی نرم سزا ہے۔ کیونکہ اس جرم کے پھیلنے سے سوسائٹی زوال' پسماندگی اور فساد فطرت اور بے غیرتی جیسے مصائب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

صرف زنا کی سزا میں تشدد سے ہی اسلامی سوسائٹی کو بچانا مقصود نہیں ہے۔ نہ اسلامی نظام اسلامی معاشرے کو پاک و صاف رکھنے میں صرف سزاؤں پر اعتماد کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے اسلام سوسائٹی کو اس جرم سے بچانے کے لیے دوسرے اقدامات بھی کرتا ہے۔ اسلام ان تمام کاموں سے منع کرتا ہے جن سے اس جرم کی بو بھی آتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ زانیوں کو امت مسلمہ کے جسم سے دور کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا جاتا ہے کہ پاک دامن عورتوں پر زنا کے الزام لگانے کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے الا یہ کہ کوئی چار گواہ پیش کر دے۔ یہ اس لیے کہ اس گھناؤنے جرم کا الزام لگانے میں لوگ بے باک نہ ہوں۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ

فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِيۡنَ جَلۡدَةً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۙ‏

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں ' پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ' ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو ' اور وہ خود ہی فاسق ہیں"۔

زبانوں کو کھلا چھوڑ دینا کہ وہ بے ... عورتوں (محصنات) پر تہمتیں لگاتے پھریں۔ محصنات وہ کنواری اور شادی شدہ عورتیں ہوتی ہیں جن پر زنا کے جرم کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے لیکن اس الزام کی پشت پر کوئی دلیل قاطع نہ ہو۔ اس طرح کہ بغیر کسی ثبوت کے کوئی کسی بے گناہ مرد یا عورت پر اس گھناؤنے جرم کا الزام لگاتا پھرے اور اس پر اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ یوں صبح و شام معاشرے میں لوگوں کی عزتوں پر حملہ ہوتا رہے' معاشرہ بدنام ہوتا رہے اور ہر شخص پر الزام لگنے کے مواقع عام ہوں۔ یا مرد اپنی بیوی پر شک کرے۔ ہر شخص کو اپنے اصل و نسل کے بارے میں شک ہو جائے۔ ہر خاندان کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔ تہمت' الزام اور شک کے یہ وہ حالات ہوں گے جن میں کسی شخص کو کوئی اطمینان نہ ہو گا۔

پھر اگر زناکاری کے الزامات اس طرح لگائے جاتے رہیں تو عام لوگوں کو اس جرم کے ارتکاب کی جراءت ہو گی۔ لوگ کہیں گے کہ سوسائٹی میں ہر طرف اس جرم کا چرچا ہے۔ اس طرح جو شخص اس سے بچنا بھی چاہتا ہو گا' وہ بھی اس میں ملوث ہو جائے گا۔ کم از کم بار بار کے الزامات کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں اس کا ارتکاب اس قدر گھناؤنا نہ رہے گا۔ ایک عام آدمی کا تاثر بھی یہ ہو گا کہ عام لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اگر الزام زنا بلاثبوت کو جرم نہ قرار دیا جائے تو پھر زنا کی اس شدید سزا کا بھی کوئی فائدہ نہ ہو گا اور پوری سوسائٹی کی فضا اس جرم میں ملوث ہو گی اور فحاشی کے ارتکاب میں اضافہ ہو گا۔

ان وجوہات کی بناء پر' لوگوں کو ناجائز تہمتوں سے بچانے کی خاطر' اور اس الزام کی وجہ سے لوگوں کی عزت کو بچانے کی خاطر قرآن کریم نے حد قذف کی سزا میں سختی کی ہے۔ اس قدر سختی کہ اس کی سزا کو ارتکاب جرم کی سزا کے قریب قریب قرار دیا ہے۔ یعنی ۸۰ کوڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ایسا شخص فاسق قرار پائے گا اور آئندہ کبھی بھی اس کی شہادت قبول نہ ہو گی۔ پہلی سزا یعنی ۸۰ کوڑے تو جسمانی سزا ہے اور دوسری سزا تادیبی سزا ہے کہ سوسائٹی کے اندر زنا کا الزام لگانے والے کی بات بے وقعت ہو جائے کہ آئندہ اس کی کسی بات پر کوئی اعتبار نہ ہو گا۔ تیسری سزا دینی سزا بھی ہے کہ وہ اسلام کی سیدھی راہ سے پھر گیا ہے الا یہ کہ وہ چار گواہ لائے یا تین گواہ اپنے ساتھ لائے اگر اس نے خود دیکھا ہو۔ اس وقت اس کی بات درست سمجھی جائے گی اور ملزم پر پھر حد زنا نافذ ہو گی۔

جہاں تک اسلامی سوسائٹی کی ترجیحات کا تعلق ہے اگر اس میں ایسے الزام کو دبا دیا جائے جس کی پشت پر کوئی ثبوت نہ ہو' تو اس صورت میں کوئی نقصان نہ ہو گا جس طرح کا نقصان اس صورت میں ہو گا کہ فحاشی کا چرچا ہو جائے اور اس پر کوئی ثبوت نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں کئی لوگ اس گندے جرم کے ارتکاب پر آمادہ ہو سکتے ہیں' جبکہ عام طور پر

وہ اس سے بچتے تھے' اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ نہایت ہی ممنوع فعل ہے اور اس کا ارتکاب نادرست ہے رہی یہ بات کہ پاک دامن عورتوں پر اس الزام کی وجہ سے کیا گزرتی ہے اور اس سے معاشرے کے اندر جو بے اطمینانی پھیلتی ہے اور جس طرح گھرانے تباہ ہوتے ہیں یہ ایک عام بات ہے اور اسے ہر شریف آدمی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ غرض الزام لگانے والے (قاذف) کے سر پر سزاؤں کی تلوار بروقت سونتی رہتی ہے۔ الا یہ کہ :

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥﴾

"سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کرلیں تو اللہ ضرور (ان کے حق میں) غفور درحیم ہے"۔

فقہاء کے درمیان اس استثناء کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اس کا تعلق صرف آخرت کی سزا سے ہے یعنی اس شخص سے صفت فسق دور ہو جائے گی اور شہادت کے لیے وہ بدستور نااہل رہے گا یا یہ کہ اس کی شہادت بھی توبہ کے بعد قبول ہو گی۔ امام احمد' امام شافعی اس طرف گئے ہیں کہ اگر تائب ہو جائے تو اس کی شہادت قبول ہو گی کیونکہ فسق کا حکم اٹھ چکا ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء صرف آخری جملے میں ہے یعنی فسق اٹھ جائے گا لیکن یہ شخص بدستور شہادت کے لیے نااہل ہو گا۔ شعبی اور ضحاک نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے کہ اس کی شہادت قبول نہ کی جائے گی اگرچہ توبہ کرے' اس وقت تک جب تک وہ اپنے خلاف یہ اعتراف نہ کرلے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے بعد اس کی شہادت قبول ہو گی۔

میرے خیال میں ضحاک اور شعبی کا مذہب زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں جس شخص پر الزام لگایا گیا تھا وہ معاشرتی طور پر اس الزام سے براہ راست بری الذمہ قرار پائے گا۔ اس طرح قذف کے تمام آثار ختم ہو جائیں گے۔ پھر کوئی یہ نہ کہے گا کہ قاذف پر حد اس وجہ سے لگ گئی کہ اس نے شہادت پیش نہ کی اور نہ کسی کے دل میں یہ برا خیال آئے گا کہ ہو سکتا ہے الزام درست ہو لیکن قاذف کو شہادت دستیاب نہ ہو سکی۔ اس طرح مقذوف کی عزت بھی بحال ہو جائے گی اور قاذف کا معاشرتی اعتبار بھی بوجہ توبہ بحال ہو جائے گا۔ یوں اس سابقہ مقدمہ کے تمام آثار ختم ہو جائیں گے۔ اب اس بات کا کوئی جواز باقی نہ رہے' تاکہ توبہ کے بعد بھی قاذف کی شہادت مقبول نہ ہو جبکہ اس نے بہتان طرازی کا اعتراف بھی کرلیا ہو اور توبہ کے ذریعہ اصلاح بھی کرلی ہو۔

یہ تو تھا عام الزام زنا کا معاملہ۔ رہا الزام مابین زوجین یعنی کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگا دے تو یہ الگ صورت ہو گی۔ اس مرد سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ چار گواہ لائے یہ بہت بڑی سختی ہو گی لہٰذا شریعت میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ اس میں خود اس کی اپنی عزت اور اپنی شرافت خطرے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا شریعت میں اس قسم کے الزام کے لیے ایک خاص قانون لعان تجویز کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝

ع ۱۰

''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام) میں سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس بندے پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔ تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)''۔

ان آیات میں حد قذف کے قانون میں میاں بیوی کے لیے قدرے سہولت پیدا کی گئی ہے اور یہ سہولت میاں بیوی کے نازک تعلقات کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اگر خاوند کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور اس بات پر گواہ صرف وہ خود ہو تو اس صورت میں طریق کار یہ ہو گا کہ وہ چار بار قسم اٹھا کر یہ کہے گا کہ اس کا دعویٰ درست ہے یعنی الزام زنا اور پانچویں مرتبہ یہ کہے گا کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں۔ اور اس شہادت کو شہادات اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایک ہی گواہ کی زیادہ شہادتیں ہیں۔ اگر خاوند نے ایسا کیا تو وہ سزا ادا کرے گا اور عورت پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اور اس پر حد زنا یعنی رجم جاری ہو گی۔ ہاں اگر عورت اپنے اوپر سے اس سزا کو معاف کرانا چاہتی ہے تو وہ سابقہ شہادت کے بالمقابل چار مرتبہ حلف اٹھا کر کہے کہ الزام لگانے والا کاذب ہے اور پانچویں مرتبہ وہ حلف اٹھا کر کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر میں جھوٹ بولوں۔ اس طرح اس پر سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اور لعان کے ذریعے وہ اپنے خاوند سے جدا ہو جائے گی۔ اس کے بیٹے کا نسب والد کے ساتھ لاحق نہ ہو گا اگر وہ حاملہ ہو بلکہ بیٹے کی نسبت ماں کی طرف ہو گی اور اس قسم کے بیٹے پر ولد الزنا کا الزام موجب حد قذف ہو گا۔

اس پر یہ تعقیب اور تبصرہ آتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (۲۴ : ۱۰) ''تم پر اللہ کا فضل اور رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا **معاملہ** تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)''۔ یہاں اللہ نے بیان نہیں فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اللہ نے مجمل اس لیے

چھوڑ دیا کہ لوگ اس سے ڈرتے رہیں۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا ہی شر ہوتا لیکن اللہ نے اسے دفع کر دیا۔

اس سلسلے میں بعض صحیح احادیث میں اس قانون سازی کا شان نزول وارد ہے۔ امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرمائی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا (٢٤ : ٤) "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں' پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں' ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔

تو سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ جو انصار کے سردار تھے' نے کہا کیا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے گروہ انصار' تم نہیں سنتے تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا' اے رسول خدا! اس شخص کو ملامت نہ کریں۔ یہ نہایت ہی غیور آدمی ہے۔ اس نے کبھی بھی کنواری عورت کے سوا کسی عورت سے نکاح نہیں کیا۔ اور اس نے جب کسی عورت کو طلاق دی تو کسی شخص کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس کے ساتھ نکاح کرلے کیونکہ وہ اس کی غیرت سے ڈرتا۔ اس پر سعدؓ نے کہا اے رسول خدا! واقعہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ حق ہے اور یہ اللہ کی جانب سے ہے لیکن مجھے تعجب اس پر ہے کہ میری بیوی کی ران پر ایک شخص ران رکھ دے اور مجھے اجازت نہ ہو کہ میں اسے چھیڑوں اور نہ میں اسے اپنی جگہ سے ہلاؤں یہاں تک کہ جب تک کہ میں چار گواہ تلاش کر کے نہ لاؤں۔ خدا کی قسم جب تک میں چار گواہ لاؤں گا تو وہ اپنا کام کر کے چلا گیا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ہلال ابن امیہ آ گیا۔ یہ اپنی اراضی سے کام کر کے عشاء کے وقت لوٹا۔ اس نے اپنی اہلیہ کے پاس ایک شخص کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا اور اپنے کانوں سے اس نے سنا تو اس نے اس شخص کو نہ چھیڑا۔ صبح ہوتے ہی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا حضور میں رات کو عشاء کے وقت اپنے گھر آیا۔ میں نے اپنی اہلیہ کے پاس ایک شخص کو دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں کے ساتھ سنا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی اس اطلاع کو بہت ہی ناپسند فرمایا۔ آپؐ پر یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن انصار اس پر جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا: سعد ابن عبادہ نے جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے لیے بڑی آزمائش تھی۔ اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہلال ابن امیہ کو کوڑے لگائیں اور لوگوں کے اندر ان کی شہادت ہمیشہ کے لیے غیر مقبول ہو جائے۔ اس پر ہلال ابن امیہ نے کہا: خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ ضرور نکالے گا۔ ہلال نے حضور اکرمؐ سے کہا کہ رسول خدا! میں جانتا ہوں کہ میری اس بات سے آپؐ پر کس قدر ناگواری کی حالت آ گئی ہے لیکن اللہ جانتا ہے کہ میں سچا ہوں۔ خدا کی قسم رسول خدا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ہلال ابن امیہ پر حد قذف نافذ کرنے کا حکم دیں کہ اچانک وحی آ گئی۔ اور جب آپؐ پر وحی آتی تھی تو صحابہ کرام فوراً سمجھ لیتے تھے کہ نزول وحی شروع ہے۔ تمام صحابہؓ آپؐ سے علیحدہ ہو جاتے تھے یہاں تک کہ نزول وحی کا عمل مکمل ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ

رَبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ (۲۴ : ۶) "اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام) میں سچا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے حالت وحی دور ہوگئی تو آپ ؐ نے فرمایا ہلال! مبارک ہو۔ اللہ نے تیرے لیے آسانی پیدا کر دی ہے اور اس مشکل سے نکلنے کی راہ نکالی ہے۔ تو ہلال نے کہا میں امید کر رہا تھا کہ اللہ میرے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس عورت کو بلایا جائے۔ وہ آگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات دونوں کو پڑھ کر سنائیں۔ ان کو نصیحت کی اور ان کو بتایا کہ دنیا کا عذاب آخرت کی سزا سے بہت ہی تھوڑا ہے تو ہلال نے کہا رسول خدا! اللہ کی قسم میں نے اس کے بارے میں سچ کہا ہے اور اس عورت نے جواب میں کہا۔ یہ جھوٹ کہتا ہے۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا ان دونوں کے درمیان لعان کرا دو۔ تو ہلال کو کہا گیا تم چار بار شہادت دو کہ تم سچ کہتے ہو۔ جب پانچویں بار شہادت دینے لگا تو اسے کہا گیا: اللہ سے ڈرو' دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ اور یہ شہادت جو فریق مخالف پر سزا واجب کرنے والی ہے' تیرے لیے موجب عذاب ہوگی۔ تو ہلال نے کہا خدا کی قسم اس کے بارے میں مجھے اللہ ہرگز عذاب نہیں دے گا۔ جس طرح اس نے مجھے کوڑوں کی سزا نہیں دی تو پانچویں مرتبہ ہلال نے شہادت دی کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس کے بعد عورت سے کہا گیا کہ تم چار شہادتیں دو کہ وہ جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہا گیا خدا سے ڈرو اور دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہی ہلکا ہے اور یہ پانچویں بار عذاب کو واجب کرنے والی ہے اور یہ تم پر عذاب کو واجب کر دے گی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ہچکچائی اور ارادہ کر لیا کہ اعتراف کر لے۔ اس کے بعد اس نے کہا میں اپنی قوم کو شرمندہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ اس نے پانچویں مرتبہ شہادت دی کہ اس پر اللہ کا غضب ہو گا۔ اگر وہ سچا ہو۔ رسول اللہ نے دونوں کے درمیان تفریق کر دی اور یہ فیصلہ کیا کہ اس کے بچے کو باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے گا۔ نہ اس کے بچے پر تہمت لگائی جائے گی۔ جس نے اس کے بچے کو ولد الزنا کہا' اس پر حد جاری ہوگی۔ یہ بھی حکم دیا کہ اس عورت کے لیے خاوند کے ذمہ رہائش کی جگہ فراہم کرنا لازم نہ ہوگا نہ خوراک لازم ہوگی۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان بغیر طلاق کے تفریق کر دی گئی ہے۔ اور حضور ؐ نے فرمایا کہ اگر اس کا بچہ قدرے سرخ بالوں والا' دبلے چوتڑ والا اور پتلی ٹانگوں والا ہوا تو وہ ہلال کا بچہ ہو گا اور اگر گندم گوں رنگ' پیچدار بالوں والا' موٹے اعضا والا' موٹی پنڈلیوں والا ہوا' بھرے ہوئے چوتڑ والا ہوا تو پھر یہ اس شخص کا بیٹا ہو گا جس کے ساتھ وہ بدنام ہوئی۔ تو جب اس کا بچہ پیدا ہوا تو وہ گندرے' پیچدار بالوں والا' موٹے اعضا والا اور موٹی ٹانگوں والا اور بھرے ہوئے چوتڑ والا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایمان نہ ہوتا تو میں اس عورت کے ساتھ دیکھ لیتا"۔

یہ قانون لعان تھا اور یہ ایک عملی ضرورت کے تحت نازل ہوا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے درپیش ایک مشکل مسئلے کو حل کر دیا۔ یہ مسئلہ اس قدر مشکل تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ جیسا کہ روایت بخاری میں آتا ہے۔ آپ ؐ نے ہلال ابن امیہ سے کہا کہ یا تو گواہ لاؤ اور یا تمہاری پیٹھ پر حد جاری ہوگی۔ اور ہلال یہی کہتے رہے کہ حضور ؐ ایک شخص دیکھے کہ اس کی بیوی پر ایک شخص چڑھا ہوا ہے کیا وہ جائے گا کہ گواہ تلاش کرے۔

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو علم نہ تھا کہ حد قذف کے عام قانون کے بعد اس قسم کا

مسئلہ پیدا ہو گا تو یہ استثناء اللہ نے پہلے کیوں نہ نازل کر دی اور کیوں اللہ تعالیٰ نے ایسی مشکل پیدا ہونے دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے تشریع کے لیے یہ حکمت وضع کی تھی کہ قانون اس وقت نازل ہو جب لوگوں کے اندر اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے تاکہ لوگ اسے نہایت ہی بے تابی کے ساتھ قبول کریں۔ اور ان کو اس قانون کے اندر پائے جانے والی حکمت کا اچھی طرح علم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد یہ تبصرہ آیا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (۲۴ : ۱۰) "اگر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتی اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بہت ہی التفات کرنے والا اور رحیم ہے تو ....." اب ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے۔ دیکھئے کہ اسلام کس طرح کام کر رہا تھا اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کس طرح کام کر رہی تھی اور کس قدر مؤثر تھی اور اس قرآن کے ذریعے کس طرح ایک بالکل نئی سوسائٹی کو تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اسلام نے عربوں جیسی غیور قوم کی کس طرح تربیت کر دی تھی۔ کس طرح ان کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ لوگ اس قدر غیور اور جذباتی تھے کہ قانون حد قذف نازل ہو گیا۔ ان جذباتی لوگوں کے لیے یہ نہایت ہی مشکل قانون ہے وہ تو مشتعل ہوتے ہی عظیم سے عظیم کام کر گزرنے والے تھے۔ ان پر یہ نہایت ہی شاق گزرتا ہے۔ اس قدر شاق کہ حضرت سعد ابن عبادہ رسول اللہؐ سے پوچھتے ہیں کہ آیا فی الواقع یہ قانون اسی طرح نازل ہوا ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں لیکن ان کو معلوم ہے کہ قانون تو نازل ہو گیا ہے۔ اس سوال سے دراصل وہ اس مشکل کا احساس کرتے ہیں کہ اگر یہ صورت حالات ان کے اپنے گھر میں پیش آ جائے تو وہ اسے کس طرح برداشت کریں گے۔ وہ اس تلخ حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ رسول خدا میں جانتا ہوں کہ یہ حق ہے اور یہ اللہ کی جانب سے ہے لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اگر میں ایک شخص کو دیکھوں کہ اس نے (مکاع) کی ران کے ساتھ ران ملا دی ہے اور مجھے یہ اجازت نہ ہو کہ اسے پریشان کروں یا اسے اپنی جگہ سے ہٹاؤں جب تک میں چار گواہ نہ لاؤں۔ خدا کی قسم میں چار گواہ لاؤں گا مگر اس نے اپنا کام پورا کر لیا ہو گا۔

یہ تو تھا سعد ابن عبادہ کا نظریاتی خیال اور سوچ۔ لیکن ایک متعین شخص اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے کہ اس کی بیوی کے ساتھ یہ بدکاری ہو رہی ہے اور وہ رک گیا ہے بلکہ قرآن نے اسے روک دیا ہے۔ یہ شخص اپنے جذبات 'جذبہ انتقام' سخت عربی غیرت اور خون کے اندر پیدا ہونے والے فوری جوش اور اعصاب کی ناقابل کنٹرول حرکت کو قابو میں لاتا ہے۔ اپنے اوپر ناقابل شکست کنٹرول کرتا ہے جس کا کوئی عربی معاشرے میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بے بس ہو کر آتا ہے اور رسول اللہؐ کے حکم کا انتظار کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے یہ مسئلہ نہایت ہی شاق گزر رہا ہے لیکن قرآن کریم نے ان لوگوں کی ایسی تربیت کر دی ہے کہ یہ شخص جذبات کے اس طوفان کو پوری طرح کنٹرول کرتا ہے تاکہ حکم وہی ہو جو اللہ کی طرف سے آئے۔ اس کے نفس میں اور اس کی ذلت کے تمام معاملات میں۔

یہ تربیت کیسے ممکن ہوئی؟ یہ اس طرح ہوئی کہ ان کو یہ پورا یقین تھا کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور یہ کہ وہ لوگ اللہ کی نگرانی اور حفاظت میں ہیں۔ اللہ ان کی رعایت کرتا ہے اور ان کو ایسی مصیبت میں نہیں ڈالتا جسے وہ برداشت نہ کر سکیں اور یہ کہ اللہ ان کو ایسی مشکلات میں نہیں چھوڑتا کہ وہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوں۔ اللہ کبھی بھی انسانوں پر ظلم

نہیں کرتا۔ یہ لوگ ہمیشہ اللہ کے زیر سایہ رہتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اللہ کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جس طرح ایک بچہ اپنے رحیم و کریم باپ کی طرف دیکھتا ہے۔ ہلال ابن امیہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور کانوں سے سن رہا ہے۔ یہ اکیلا ہے وہ رسول اللہؐ سے شکایت کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون میں کوئی صورت ماسوائے نفاذ حد قذف کے اور نہیں پاتے۔ حضورؐ اعلان بھی کر دیتے ہیں کہ شہادت یا حد ہے اور تمہاری پیٹھ پر ہے لیکن ہلال ابن امیہ کو یقین ہے کہ اللہ اسے ایسے حالات میں بے سہارا نہیں چھوڑے گا جبکہ وہ ہے بھی سچا۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے یہ استثناء آجاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال ابن امیہ کو خوشخبری دیتے ہیں اور وہ اپنے اس اطمینان کو پھر دہراتے ہیں کہ مجھے رب عزوجل سے یہی امید تھی۔ ان لوگوں کو پورا پورا اطمینان تھا کہ وہ اللہ کی نگرانی میں ہیں اور اللہ دیکھ رہا ہے اور یہ کہ وہ خود اپنے اختیار میں چھوڑ نہیں دیئے گئے کہ معاملات کو خود طے کریں۔ وہ تو اللہ کے سامنے اس کے دربار میں ہیں۔ یہ ہے حقیقی ایمان 'اطاعت اور تسلیم و رضا۔ جو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔

اب سیاق کلام حد قذف کے قانون کے درمیان سے آگے بڑھتا ہے اور جرم قذف کے گھناؤنے پن کی ایک اور جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اس میں داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ حضور اکرمؐ اللہ کے مکرم ترین بندے ہیں۔ پھر اس واقعہ میں حضرت صدیقؓ کی عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے مکرم ترین انسان ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوسرے ساتھی صفوان ابن المعطلؓ کی عزت کا بھی مسئلہ ہے۔ حضور اکرمؐ خود شہادت دیتے ہیں کہ صفوان کے بارے میں آپ بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ یہ واقعہ ایسا ہے جس میں مدینہ کے اہل اسلام ایک ماہ تک بے حد پریشانی میں مبتلا رہے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١﴾ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ﴿١٢﴾ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٣﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٤﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ وَلَوْ

لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۗ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ

عَظِيْمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ

فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ

لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۗ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ

يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ

مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢١﴾ وَلَا

يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ

اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ

الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ

عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ

يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿٢٥﴾

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ

لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۗ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾

”جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ وہ لوگ (اپنے الزام کے

ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں 'اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں ـ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آ لیتا ـ (ذرا غور تو کرو 'اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا ـ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے 'حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی ـ

کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا 'سبحان اللہ 'یہ تو ایک بہتان عظیم ہے ـ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو ـ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے ـ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں 'اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ـ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے '(تو یہ چیز جو ابھی تمہارے اندر پھیلائی گئی تھی 'بدترین نتائج دکھا دیتی) ـ

اے لوگو 'جو ایمان لائے ہو 'شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو ـ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ـ

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار 'مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے ـ انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے ـ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے ـ

جو لوگ پاک دامن 'بے خبر 'مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے ـ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا ـ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ـ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ـ ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں 'ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ـ

یہ افک کا واقعہ ہے ـ اس واقعہ نے تاریخ انسانی کے پاکیزہ ترین لوگوں کو انتہائی درجہ کی تکلیف دہ اور اذیت دہ صورت حال سے دوچار کیا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو سخت ترین امتحان میں ڈال دیا ـ پورے ایک ماہ تک حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم 'آپ کی محبوب ترین اہلیہ حضرت عائشہؓ 'ان کے والد حضرت ابوبصدیقؓ جیسے ایک مومن مخلص کے دلوں کو ہوا میں معلق رکھا ـ یہ پاکیزہ دل ایک مہینے تک درد و رنج میں مبتلا رہے ـ

مناسب یہ ہے کہ ہم اس پورے قصے کو خود حضرت عائشہؓ کی زبانی سنیں ـ حضرت عروہ ابن زبیر ان سے یوں روایت کرتے ہیں :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ کی بیویوں میں سے کون آپ کے ساتھ جائے ـ غزوہ بنی المصطلق کے موقعہ پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپؐ کے

ساتھ گئی۔ واپسی پر جب مدینے کے قریب تھے تو ایک منزل پر رات کے وقت رسول اللہؐ نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاری شروع ہوگئی۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار کہیں ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اٹھاکر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس وقت غذا کی کمی کے سبب بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ میرا ہودہ اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودہ اونٹ پر اٹھاکر روانہ ہوگئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہاں ہی لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جاکر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اس حالت میں مجھے نیند آگئی۔ صبح کے وقت صفوان ابن معطل سلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ (یہ شخص بدری صحابیوں میں سے تھے اور انہیں صبح دیر تک سونے کی عادت تھی اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں پڑے سوئے رہ گئے اور اٹھ کر مدینے چلے جارہے تھے) مجھے دیکھ کر انہوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ زبان سے نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رسول اللہ کی بیوی یہیں رہ گئیں۔ اس آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے اٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ لاکر اپنا اونٹ میرے سامنے بٹھا دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ میں اونٹ پر سوار ہوگئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہوگئے۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جالیا کہ جب وہ اپنی جگہ پر جاکر ٹھہرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتہ نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دیئے اور ان سب میں پیش پیش عبداللہ ابن ابی تھا۔ مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔ مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی۔ آپ گھر میں آتے تو گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے کہ

کَیْفَ تِیکُم "کیسی ہیں یہ"۔ خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے سے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے تھے۔ اور ہم لوگ جنگل میں جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح ابن اثاثہ کی ماں تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ راستے میں ان کو ٹھوکر لگی۔ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا غارت ہو مسطح۔ میں نے کہا اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو اور بیٹا بھی وہ، جس نے بدر میں حصہ لیا ہو۔ انہوں نے کہا "بیٹی تجھے کیا معلوم کہ وہ کیا باتیں کرتا ہے۔ پھر انہوں نے سارا واقعہ سنایا کہ افتراء پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ میں گھر گئی اور رات بھر رو کر کاٹی۔ میرے پیچھے رسول اللہؐ نے حضرت علی اور اسامہ ابن زید کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اسامہ نے میرے حق میں کلمہ خیر کہا اور عرض کیا، یارسول اللہ بھلائی کے سوا آپ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں دیکھی۔ یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے

جو اڑایا جا رہا ہے ۔ رہے حضرت علیؓ تو انہوں نے کہا یارسول اللہؐ عورتوں کی کمی نہیں ہے ۔ آپؐ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گزار لونڈی کو بلاکر حالات دریافت کر لیں ۔ چنانچہ خدمتگار کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی ۔ اس نے کہا اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے ۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندکر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بی بی ذرا آٹے کا خیال رکھنا مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے ۔ اسی روز رسول اللہؐ نے خطبہ فرمایا "مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزام لگاکر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے ۔ بخدا میں نے تو اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جا رہی ہے ۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں ۔ اس پر اسید ابن حضیر (بعض روایات میں سعد ابن معاذ) نے اٹھ کر کہا "یارسول اللہؐ اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں گے اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو بھی آپ حکم دیں ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں" ۔ یہ سنتے ہی سعد ابن عبادہ رئیس خزرج اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "جھوٹ کہتے ہو تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے ۔ تم اس کی گردن مارنے کا نام اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خزرج میں سے ہے ۔ اگر وہ تمہارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم کبھی نہ کہتے "کہ ہم اس کی گردن مار دیں گے" ۔ اسید ابن حضیر نے جواب میں کہا "تم منافق ہو اس لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو" ۔ اس پر مسجد نبویؐ میں ہنگامہ برپا ہو گیا حالانکہ رسول اللہؐ ممبر پر تشریف رکھتے تھے ۔ قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد میں ہی لڑ پڑیں مگر رسول اللہؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر ممبر سے اتر آئے ۔

اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا تھے ۔ میں روتی رہی ۔ میرے والدین انتہائی پریشان اور رنج و غم میں مبتلا تھے ۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے ۔ اس پوری مدت میں وہ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے ۔ حضرت ابوبکر اور ام رومان نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے اس لیے وہ دونوں بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے ۔ حضورؐ نے فرمایا عائشہؓ مجھے تمہارے متعلق یہ خبر پہنچی ہے ۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری برات ظاہر کر دے گا اور اگر واقعی تم گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو ۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے ۔ یہ باتیں سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے ۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہؐ کو جواب دیں ۔ انہوں نے فرمایا بیٹی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں ۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ ہی کچھ کہیں ۔ انہوں نے بھی کہا میں حیران ہوں کہ کیا کہوں ۔ اس پر میں بولی کہ آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے ۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ لوگ نہ مانیں گے ۔ اور اگر خواہ مخواہ ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی اور اللہ جانتا ہے کہ نہیں کی تو آپ لوگ مان لیں گے ۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوب کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا ۔ آخر میں نے کہا 'اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں وہی بات کہوں جو حضرت یوسف کے والد نے کہی تھی فَصَبْرٌ جَمِيلٌ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی ۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے وہ ضرور حقیقت کھول دے گا ۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے

میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب دیکھیں گے کہ جس میں اللہ میری برات ظاہر کر دے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں موتی کی طرح آپؐ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیں اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضور بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے جو پہلی بات فرمائی وہ یہ تھی۔ مبارک ہو عائشہؓ۔ اللہ نے تمہاری براءت نازل فرما دی۔ اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں سنائیں۔ میری والدہ نے کہا اٹھو اور رسول اللہؐ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا' بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو بہتان کا انکار تک نہ کیا۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسم اٹھائی کہ وہ اب کبھی مسطح پر کچھ خرچ نہ کریں گے۔ یہ غریب آدمی تھا اور حضرت صدیقؓ کا رشتہ دار تھا' آپ ان کی کفالت کرتے تھے۔ اس نے بھی حضرت عائشہ پر الزام لگانے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۴ : ۲۲) تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا' ہاں میں چاہتا ہوں اور پسند کرتا ہوں کہ اللہ میرے گناہ بخش دے۔ پھر انہوں نے مسطح کا وہ وظیفہ جاری کر دیا جو وہ انہیں دیا کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں اس امداد کو کبھی بھی بند نہ کروں گا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بن جحش سے بھی میرے بارے میں پوچھ۔ حضورؐ نے فرمایا "زینب تم کیا جانتی ہو اور تم نے کیا دیکھا ہے؟ اس نے کہا' یا رسول اللہ میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو بچاتی ہوں۔ خدا کی قسم' میں نے اس کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانا۔ یہ زینب بن جحش ہی تھی جو ازواج مطہرات میں سے میرے مدمقابل تھی۔ اللہ نے اس کو اس کی خداخوفی کی وجہ سے بچایا۔ لیکن اس کی بہن حمنہ بنت جحش اس کے لیے لڑ رہی تھی' تو وہ ہلاک ہوئی ان لوگوں کے ساتھ' جو افک کے معاملے میں ہلاک ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ دن رسول اللہؐ نے کس طرح گزارے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے خاندان نے یہ دن کس طرح گزارے۔ اور حضرت صفوان ابن معطل بیچارے پر کیا گزری ہوگی اور تمام مسلمانوں پر یہ دن ایسے گزرے کہ ان کی سانس گھٹ رہی تھی اور ہر شخص شدید مصیبت میں تھا۔ یہ حالات تھے جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

اس پریشان کن صورت حالات کے سامنے انسان نڈھال ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک المناک واقعہ تھا۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ آپ کی زوجہ محترمہ کے لیے یہ صورت حالات کاٹ کھانے والی ہے جبکہ وہ نہایت ہی جواں سال اور کم عمر ہے۔ ان کی عمر کا غالباً سولہواں سال تھا۔ یہ نہایت ہی حساس عمر ہوتی ہے اور زوجین کے درمیان نہایت ہی گہری محبت کا دور ہوتا ہے۔

یہ کم عمر لڑکی بے گناہ ہے۔ اس کا ضمیر صاف ہے۔ اس کے خیالات پاکیزہ ہیں لیکن اس پر یہ الزام نازک ترین اور حساس ترین معاملے میں لگایا جا رہا ہے۔ اس کی شرافت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ صدیق کی بیٹی ہے اور وہ نہایت ہی پاکیزہ اور ارفع مقام پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی امانت کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ وہ حضرت محمد ابن عبداللہ سردار بنی ہاشم کی بیوی ہے اور اس کی وفاداری کو مشکوک بنایا جا رہا ہے یہ ایک عظیم پیغمبر کی محبوب ترین بیوی ہے لیکن اس بچاری کے اس رشتہ محبت کے ٹوٹنے کا خطرہ ہے بلکہ اس کے ایمان کو خطرہ لاحق ہے۔ جبکہ اس نے پرورش ہی ایمان کے مرکز میں پائی ہے۔ جب سے اس کی آنکھ کھلی ہے اس نے ایمان ہی ایمان دیکھا ہے اور پھر وہ نبی آخر الزمان ﷺ کی زوجہ ہے۔

اس پر الزام لگایا گیا ہے۔ کس قدر عظیم الزام جس سے وہ بری الذمہ اور بے خبر ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کرے اور کیا شہادت لائے کہ وہ پاک دامن ہے۔ بس صرف اللہ سے امید ہے۔ وہ امید کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت کو خواب میں دیکھ لیں گے کہ وہ اس الزام سے بالکل بری الذمہ ہے۔ لیکن خواب ہے کہ نہیں آتا اور وحی ہے کہ بند ہو گئی ہے۔ اس میں بھی اللہ کی حکمت تھی۔ پورا ایک ماہ گزر گیا ہے اور یہ بچاری اس عذاب عظیم میں غوطے کھا رہی ہے۔

اس کی حالت اس وقت دگرگوں ہو جاتی ہے جب وہ ام مسطح سے پورے حالات سن لیتی ہے۔ وہ بیماری میں مبتلا ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے' وہ نہایت ہی کرب سے ماں کو کہتی ہے سبحان اللہ 'کیا لوگ یہ باتیں کر رہے ہیں؟ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ وہ نہایت ہی کرب سے پوچھتی ہیں کہ میرے باپ کو بھی اس کا علم ہو گیا ہے تو ماں کہتی ہیں ہاں؟ تو وہ پوچھتی ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ کو بھی اس کا علم ہو گیا ہے؟ تو ماں کہتی ہیں 'ہاں۔ اور پھر اس پر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ کا نبی جس پر وہ ایمان لائی ہے اور جو آپ کا خاوند ہے' جس کے ساتھ اسے شدید محبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود اس سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔ "اما بعد' مجھ تک تمہارے بارے میں یہ یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم پاک دامن ہو تو خود اللہ جلد ہی تمہاری پاکی بیان کر دے گا۔ اور اگر تم سے کوئی گناہ ہو گیا ہے تو اللہ سے توبہ کرو اور مغفرت طلب کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے' اور پھر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ اسے معاف کر دیتا ہے"۔ اس کلام سے وہ اچھی طرح جان لیتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ بھی اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ آپ بے گناہ ہیں۔ آپ پر جو الزام لگ چکا ہے اس کے بارے میں آپ فیصلہ بھی نہیں فرماتے۔ رب کریم کی طرف سے بھی وحی بند ہے۔ اللہ کی طرف سے بھی براءت نہیں آ رہی ہے جس کا اسے خوب یقین ہے کہ وہ بری الذمہ ہے۔ لیکن بچاری کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ پیش کرے۔ رات اور دن ایسے ہی گزر رہے ہیں اور اس عظیم قلب میں بھی وہ ملزمہ ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے جگری محبت ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے وفادار ساتھی' نہایت ہی حساس اور پاک نفس' ایسی حالت میں ہیں کہ یہ غم ہر

وقت انہیں کاٹ کھا رہا ہے ان کی عزت پر حملہ ہو چکا ہے۔ ان کی محبوب بیٹی اور پھر رسول اللہؐ کی بیوی۔ یاد رہے کہ حضرت محمدؐ آپ کے وہ ساتھی ہیں جن پر انہیں پورا یقین و اطمینان ہے۔ دوست کے ساتھ ساتھ وہ اس کے نبی ہیں 'جن پر وہ ایمان لائے ہیں۔ وہ آپ کی ہربات کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ وہ تو آپ کے بارے میں کسی خارجی دلیل کے طلبگار ہی نہیں ہیں۔ ان کی باتوں ہی سے ان کے دل کا درد ظاہر ہے لیکن وہ صبر کرتے ہیں۔ درد پر قابو پاتے ہیں اور اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا کی قسم دور جاہلیت میں بھی ہم پر یہ الزام نہیں لگا۔ کیا اسلام میں ہم اس پر راضی ہوں گے۔ یہ وہ بات ہے جس میں سخت تلخی چھپی ہوئی ہے یہاں تک کہ ان کی بیٹی جو بیمار بھی ہے سخت عذاب میں گرفتار ہے۔ وہ درخواست کرتی ہے کہ آپ رسول اللہؐ کی بات کا جواب دیں تو صدیق کہتے ہیں خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

ام رومان زوجہ صدیقؓ وہ اپنی زخم خوردہ بیٹی کو ہر قسم کی تسلی دیتی ہے۔ اس کی بیمار بیٹی اس قدر روتی ہے کہ شاید اس کا کلیجہ نکل آئے۔ وہ کہتی ہے بیٹی ذرا اپنے اوپر رحم کرو۔ خدا کی قسم جب بھی کوئی خوبصورت عورت کسی مرد کو محبوب ہوئی ہے اور اس کی سوکنیں ہوتی ہیں تو انہوں نے اس پر طرح طرح کے الزام لگائے ہیں۔ لیکن ان کی یہ تسلیاں اس وقت کافور ہو جاتی ہیں جب عائشہؓ والدہ سے کہتی ہیں کہ تم میری طرف سے رسول اللہؐ کو جواب دو۔ تو وہ بھی یہی کہتی ہیں جو اس کے خاوند نے کہا تھا کہ خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا بات کر سکتی ہوں۔

اور وہ مسلم' پاکباز اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی عجیب پوزیشن میں ہے۔ اس پر اپنے نبی کی بیوی کے ساتھ برائی کا الزام ہے؟ اسلام کے ہوتے ہوئے یہ عظیم الزام۔ اس کی دیانت و امانت' اس کا شرف اور اس کی حیثیت داؤ پر لگی ہے۔ بلکہ اس کا اسلام خطرے میں ہے۔ جب وہ اس الزام کے بارے میں سنتا ہے تو بے ساختہ کہتا ہے کہ خدا کی قسم میں نے تو کسی عورت کے کاندھے کو بھی ننگا نہیں کیا۔ وہ تو اس گناہ کے تصور سے بھی پاک ہے۔ پھر وہ سنتا ہے کہ حسان ابن ثابت اس کے بارے میں نازیبا الفاظ کہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر اڑا دے مگر وہ رک جاتا ہے کیونکہ وہ مسلمان اور ایک مومن ہے اور مومن پر تلوار اٹھانا حرام ہے۔ اس پر جو گزر رہی ہے وہ اس کی برداشت سے زیادہ ہے وہ تو بے قابو ہوا چاہتا ہے۔

پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم' جو اللہ کے رسول ہیں۔ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے گھرانے پر حملہ ہوا ہے۔ گھرانے میں سے بھی عائشہؓ پر؟ آپ کے گھر پر اور آپ کی محبوب ترین بیوی پر۔ کوئی غیور عرب اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک ماہ گزر گیا ہے۔ مدینہ کے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ لیکن آپ برداشت کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک ماہ گزر جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو انسان ہیں۔ ان کو بھی ایک انسان کی طرح درد اور دکھ محسوس ہوتا ہے۔ ان کا دل بھی دکھا ہوا ہے۔ آپ بھی وحشت محسوس کرتے ہیں کیونکہ اللہ کا نور جو ہر معاملے میں آپ کے دل کو ہمیشہ روشن کر دیتا ہے اور راستہ صاف کر دیتا ہے اس میں دیر ہو رہی ہے۔ اگرچہ آپ کی بیوی کی براءت کے قرائن موجود تھے۔ مگر انسان کا دل بہرحال شک کا محل ہوتا ہے۔ صرف قرائن سے مکمل اطمینان نصیب نہیں ہوتا جبکہ مدینہ کی پوری بستی اس آگ میں جل رہی ہے۔ آپ کے دل میں بھی اپنی محبوب بیوی کے بارے میں شک گزرتا ہے۔ آپ اس شک کو دل سے دور نہیں کر سکتے۔ بہرحال آپ بھی انسان

اور بشر ہیں ۔ انسانوں کی طرح آپ بھی متاثر ہوتے ہیں ۔ آپ خاوند ہیں لیکن بیوی کے پاس نہیں جا سکتے اور جب کسی انسان کے دل میں شک کا بیج بو دیا جاتا ہے اور وہ مستقلاً دل میں بیٹھ جاتا ہے تو یہ شک پھر دلیل قطعی اور فیصلہ کن واقعہ ہی سے نکل سکتا ہے ۔

آپؐ کے دل پر یہ بوجھ طاری ہو جاتا ہے ۔ آپؐ اپنے محبوب اسامہ ابن زید جو آپؐ کو بہت محبوب اور آپؐ کے دل کے قریب تھے ۔ آپ اپنے داماد اور چچازاد علیؓ ابن ابی طالب کو بھی بلاتے ہیں ۔ ان کے ساتھ بھی آپؐ مشورہ کرتے ہیں ۔ جہاں تک حضرت علیؓ کا تعلق ہے آپ تو حضورؐ کے عصبات میں سے ہیں ۔ اس وجہ سے بھی ان کے جذبات بہت تیز ہیں ۔ پھر حضور اکرمؐ جس کرب اور رنج اور اذیت کو جھیل رہے ہیں وہ بھی حضرت علیؓ پر بارگراں ہے ۔ کیونکہ آپ چچازاد ہیں ۔ آپ مشورہ دیتے ہیں کہ اللہ نے آپؐ پر کوئی تنگی نہیں کی ہے لیکن حضورؐ کے دلی اطمینان کے لیے یہ بھی فرماتے ہیں کہ آپ حضرت عائشہؓ کے بارے میں لڑکی سے پوچھیں' خدمتگار لڑکی سے ۔

جہاں تک اسامہ کا تعلق ہے وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی بیوی کی کس قدر محبت ہے اور آپ ایک عرصہ سے اپنی اہلیہ سے جدا ہیں تو وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ام المومنین پاک وصاف ہیں اور جو لوگ الزام لگاتے ہیں وہ جھوٹے ہیں ۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس انسانی پریشانی اور اس انسانی تعلق میں حضرت اسامہ اور لڑکی کی باتوں اور شہادت سے حوصلہ پاتے ہیں ۔ اور آپ لوگوں کو مسجد میں بلا کر ان کے سامنے یہ معاملہ رکھ دیتے ہیں ۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: ''کون ہے جو ان لوگوں سے پوچھے جنہوں نے ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے ۔ ان کی بیوی پر الزام لگایا ہے اور مسلمین میں سے ایک فاضل اور شریف شخص پر الزام لگایا ہے ۔ ایسا شخص جس کے بارے میں کوئی بری بات نہیں جانتا'' ۔ اس موقعہ پر اوس اور خزرج کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ وہ مسجد رسولؐ میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود موجود تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عجیب و غریب وقت میں مسلمانوں پر کیسے خوفناک سائے منڈلا رہے تھے اور مدینہ کی فضا کیسی تھی ۔ خود قیادت کا تقدس داؤ پر لگا ہوا تھا ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی چبھن تھی اور جو روشنی (وحی) ایسے حالات میں راستہ دکھاتی رہتی تھی وہ بھی بند تھی ۔ ایسے حالات میں حضورؐ عائشہؓ کے پاس جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور آپ سے بیان لیتے ہیں ۔ مفصل بیان ۔

جب یہ مصائب اس طرح اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ پر اور مسلمانوں پر رحم فرماتے ہیں ۔ قرآن مجید نازل ہوتا ہے اور عائشہ صدیقہ کی براءت کا اعلان ہوتا ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کی صفائی میں کلام الٰہی آ جاتا ہے اور ان منافقین کا پول کھل جاتا ہے جنہوں نے اس فتنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ پھر اسلامی سوسائٹی کو ایسے حالات میں مستقلاً ہدایات دے دی گئیں اور قانون سازی اور اخلاقی ضابطہ بندی کر دی گئی ۔

قرآن کریم کی ان آیات کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ۔ میں تو جانتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ تعالیٰ میری بے گناہی کی شہادت دے دے گا ۔ لیکن میرا خیال یہ نہ تھا کہ میرے اور میری بے گناہی کے بارے میں قرآن کریم نازل ہو گا اور پھر یہ قرآن قیامت تک پڑھا جائے گا ۔ میرے خیال میں' میں اس قابل نہ تھی کہ میرے بارے میں اللہ تعالیٰ کلام کرے گا اور وہ کلام پڑھا جائے گا ۔ ہاں یہ بات میں جانتی تھی اور امید کرتی تھی کہ شاید رسول اللہؐ کوئی

خواب دیکھ لیں اور اس میں میری براءت ہو جائے"۔

اس تفصیلی بیان سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ معاملہ صرف حضرت عائشہؓ کی ذات کا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعلق تھا۔ اس واقعہ نے امت مسلمہ کی قیادت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا بلکہ اس کی زد رسول اللہؐ اور ذات باری کے تعلق پر پڑ رہی تھی۔ یہ صرف حضرت عائشہؓ کی ذات پر الزام نہ تھا بلکہ یہ اسلامی نظریہ حیات، اسلام کے نبی اور اسلام کے بانی پر الزام تھا اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں خود اپنا فیصلہ نازل کیا تاکہ اس سازش کے تار و پود بکھیر دیے جائیں۔ اور اسلام اور رسولؐ اسلام کے خلاف جو سازش منافقین نے تیار کی تھی اسے ختم کر دیا جائے اور اس کے پیچھے جو راز اور حکمت تھی، اللہ اسے ظاہر کر دے کیونکہ اس کا علم صرف اللہ کو تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ

(۲۴ : ۱۱) "جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے"۔

یہ چند لوگ نہ تھے بلکہ ایک ٹولہ تھا۔ یہ لوگ آپس میں ملے ہوئے تھے اور ان سب کا ایک ہی ہدف تھا۔ صرف عبداللہ ابن ابی ابن السلول واحد شخص نہ تھا جس نے یہ جھوٹ پھیلایا۔ ہاں یہ شخص اس کے بڑے حصے کا ذمہ دار تھا۔ یہ گروہ کون تھا۔ یہ یہودیوں اور منافقین کا گروہ تھا۔ یہ لوگ میدان جنگ میں اسلام کے مقابلے پر شکست کھا گئے تھے اور اب پس پردہ رہ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ افک کا یہ واقعہ ان کی سازشوں میں سے ایک سازش تھی اس معاملہ میں بعض مومنین بھی شامل ہو گئے تھے۔ مثلاً حمنہ بنت جحش، حضرت حسان ابن ثابت، مسطح ابن اثاثہ۔ لیکن اصل سازش اس گروہ نے تیار کی تھی۔ اور اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی ابن السلول تھا۔ یہ اس قدر مکار تھا کہ وہ اس مہم میں خود ظاہر ہو کر نہ آیا تھا۔ بظاہر اس نے کوئی بات نہ کی تھی کہ اسے پکڑا جا سکے اور اس پر حد جاری کی جا سکے۔ یہ ان لوگوں کے ساتھ کانا پھوسی کرتا تھا جو اس کے معتمد علیہ تھے اور اس کے خلاف شہادت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یہ مہم اس قدر مہارت سے چلا رہا تھا کہ پورا مدینہ ایک ماہ تک آتش فشاں اور زلزلہ خیز فضا میں جلتا رہا۔ لوگ اس دنیا کے پاکیزہ ترین گھر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہاں آیات میں آغاز کلام ہی میں اس اصل موضوع کے بارے میں کہا جاتا ہے تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو۔ اور لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی پشت پر ایک گروہ ہے جو اسلام کے خلاف اس قدر گہری سازش تیار کر رہا ہے اور یہ ایک عظیم حملہ تھا اسلام اور اہل ایمان اور ذات نبی کے خلاف۔

اس کے بعد جلدی سے مطمئن کر دیا جاتا ہے۔

لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲۴ : ۱۱) "اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ

یہ تمہارے لیے خیر ہی ہے"۔ یہ تمہارے لیے خیر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے اہل بیت کے عنوان سے یہ دراصل اسلام کے دشمن ہیں جنھوں نے افک کی سازش کو تیار کیا۔ اس واقعہ سے اس بات کی ضرورت کو بھی تسلیم کر لیا گیا کہ حد قذف اسلامی نقطہ نظر سے کس قدر ضروری ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر زبانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پاک دامن عورتوں پر کس قدر زبانیں اٹھیں گی اور اسلامی جماعت اور نئی اسلامی سوسائٹی کے لیے کس قدر خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ الزامات رسول کے گھر تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور اعلیٰ گھرانوں کو بھی تباہ کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں سوسائٹی کے اندر شرم و حیا اور احتیاط اور پاکیزگی اور احترام آدمیت ختم ہو سکتے ہیں۔

نیز اس سے اسلامی سوسائٹی کو یہ سبق بھی سکھایا گیا کہ اس نے اس قسم کے جذباتی اور اشتعال انگیز امور سے کس طرح نمٹنا ہے اور جذباتی معاملات میں بھی وقار اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔

رہے وہ آلام اور اذیتیں جو رسول اللہ' ان کے گھرانے' اور تمام مومنین نے برداشت کیے تو وہ ایسے تجربات کی قیمت ہوتے ہیں جو ان آزمائشوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ آزمائش میں اس قسم کی قربانی دینا پڑتی ہے اور فرائض کی ادائیگی میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں۔

وہ لوگ جو اس افک کے معاملے میں سرگرم رہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے جرم کے مطابق اس میں سے حصہ پایا۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ (٢٤ : ١١) "جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا"۔ اسے اپنے جرم کے مطابق قیامت میں سزا ملے گی۔ انھوں نے جو کچھ کمایا وہ ان کے لیے اچھا نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس پر ان کو دنیا کی زندگی میں بھی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی سزا ملے گی۔

وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ (٢٤ : ١١) "اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے عذاب عظیم ہے"۔ وہ شخص جس نے اس گناہ کے بڑے حصے کو اپنے سر لیا' جس نے اس حملے کی قیادت کی' اس مہم کو چلاتا رہا اور اس نے اس مہم کو گرمایا وہ عبداللہ بن ابی ابن السلول تھا۔ یہ رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا اور ہے۔ اس نے اس سازش کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ یہ شخص خوب جانتا تھا کہ وہ کس جگہ میدان جنگ گرمائے۔ اگر اللہ تمام امور پر محیط نہ ہوتا۔ اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا ہوتا اور اپنے رسول کے لیے بچاؤ کا انتظام نہ کرتا تو یہ شخص کیا کچھ بنا دیتا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب صفوان ابن معطل ام المومنین کے کجاوے کو لے کر کیمپ میں پہنچے تو ابن السلول اپنے کچھ لوگوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو اس نے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے تو لوگوں نے کہا یہ عائشہؓ ہے تو اس نے کہا خدا کی قسم یہ اس سے نہ بچ سکی ہوگی اور نہ وہ اس سے بچ سکا ہوگا۔ اور پھر کہا دیکھو تمہارے نبی کی بیوی' وہ رات ایک مرد کے ساتھ رہی۔ صبح تک اور وہ ہے کہ اب اسے لے کر آ رہا ہے۔

یہ باتیں وہ رات اور دن اپنے اعتمادی لوگوں کے درمیان پھیلاتا رہا اور گہری منافقانہ چالیں چلتا رہا۔ اس کی چالیں اس قدر کامیاب رہیں کہ مدینہ میں یہ ناقابل تصدیق افتراء جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ حالانکہ قرآن سب کے سب اس کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ غیر محتاط دیندار مسلمانوں نے بھی باتیں شروع کر دیں اور پورے ایک ماہ تک

مدینہ میں یہی بات موضوع سخن رہی حالانکہ یہ اس قدر سطحی قسم کا افتراء تھا کہ اس کو سنتے ہی رد کیا جا سکتا تھا۔

انسان آج بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا اور حیران رہ جاتا ہے کہ اس قسم کا گھٹیا الزام کس طرح مدینہ کے اندر پھیل گیا اور پھر جماعت مسلمہ کے اندر بھی بعض غیر محتاط لوگوں نے اس میں کلام کرنا شروع کر دیا۔ یوں ان بلند ترین پاکیزہ ہستیوں کو ایسی افتراء سے اس قدر اذیت جھیلنا پڑی۔ خصوصاً سرور کونین کو۔

یہ ایک عظیم اعصابی جنگ تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بے جگری سے یہ جنگ لڑی۔ جماعت مسلمہ نے یہ جنگ لڑی اور پورے اسلام نے یہ جنگ لڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اور کفر کے معرکوں میں سے یہ سخت معرکہ تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اس معرکے سے سرخرو ہو کر نکلے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وقار کا دامن تھامے رکھا۔ صبر جمیل کا دامن تھامے رکھا اور یہ ثابت کر دیا کہ آپؐ عظیم انسان ہیں۔ اس پورے عرصے میں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ نے کسی بھی مرحلے میں بے صبری کا مظاہرہ کیا ہو۔ جس طرح کا درد اور دکھ اور چبھن آپؐ محسوس کر رہے تھے وہ پوری زندگی میں آپ نے کبھی نہ جھیلے تھے۔ لیکن آپ نے سب کچھ چھپائے رکھا۔ اسلام بھی کبھی اس قسم کے فتنے سے دوچار نہ ہوا تھا۔ اس طرح اس اعصابی جنگ اور پروپیگنڈے کی جنگ کی وجہ سے امت مسلمہ کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

حالانکہ اگر کوئی اپنے دل میں ذرا بھی غور کرتا تو وہ صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر کوئی دل سے فتویٰ پوچھتا تو دل اس کو فتویٰ دے دیتا۔ اگر فطری انداز کوئی اختیار کرتا تو فطرت کا استدلال اس کی سمجھ میں آ جاتا۔ قرآن کریم کی تعلیم تو یہی تھی کہ تم لوگ حالات کا تجزیہ کرو، غور و فکر کرو اور قاضی عقل کے سامنے بھی اپنے معاملات کو پیش کرو۔

لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (٢٤ : ١٢) ”جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟“ ہاں یہ درست ہے کہ اہل ایمان سنتے ہی یہ کہہ دیتے۔ وہ اپنے بھائیوں کے بارے میں حسن ظن سے کام لیتے تو یہ ان کے لیے اچھا ہوتا۔ اور یہ فرض کر لیتے کہ ایک مسلمان اس قدر گندے کام میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کے نبی کی پاک بیوی اور ان کے بھائی مسلم۔ یہ تو خود ان میں سے تھے۔ نہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حریم اور نہ اس صحابی کے ساتھ یہ بات لائق تھی جو انہوں نے سنی۔ ان کو حسن ظن کا معاملہ رکھنا چاہیے تھا جیسا کہ ابو ایوب خالد ابن زید انصاری اور ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ امام ابن اسحاق نے روایت کی ہے۔ ابو ایوب کو اس کی بیوی ام ایوب نے کہا تم سنتے نہیں ہو کہ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہاں میں بھی سنتا ہوں لیکن یہ جھوٹ ہے۔ ام ایوب کیا تم ایسا کرتیں ہو؟ تو اس نے کہا نہیں خدا کی قسم میں تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔ تو پھر عائشہ تو تم سے بہتر ہیں۔ امام محمود ابن عمر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں نقل کیا ہے۔ کہ ابو ایوب نے ام ایوب سے یہ کہا کہ تم دیکھتی ہو لوگ کیا کہتے ہیں تو اس نے کہا اگر تم صفوان کی جگہ ہوتے تو کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ تو اس نے کہا ہرگز نہیں۔ اگر میں عائشہ کی جگہ ہوتی تو میں رسول اللہؐ کے ساتھ خیانت نہ کرتی۔ عائشہؓ مجھ سے اچھی ہیں اور صفوان تم سے اچھے ہیں۔

یہ دونوں روایات یہ بتاتی ہیں کہ بعض مسلمانوں نے اس مسئلے پر اپنے ہاں غور کیا تھا۔ اپنے دل سے استفتاء کیا تھا اور ان کے عقل نے ان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اور یہ بات غلط ہے کہ مسلمانوں میں سے کسی کی طرف اس قسم کی گراوٹ کو منسوب کیا جائے اور وہ بھی محض شبہے کی بناء پر محض بدظنی کی بناء پر۔

یہ تو پہلی راہ ہے جس کی نشاندہی قرآن مجید کرتا ہے کہ کسی بھی معاملے میں ذرا گہرے غور اور قیاس کے بعد کوئی رائے قائم کرو۔ اپنے نفس سے پوچھو' اپنے وجدان سے پوچھو' اور دوسری جگہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ کسی بھی معاملے میں تمہارے پاس دلیل ہونا چاہئے۔ بغیر دلیل و برہان کے ایسے نازک معاملات میں فیصلہ نہیں ہونا چاہئے۔

لَوْ لَا جَآءُ وْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۲۴ : ۱۳) "یہ افتراء جس نے زیادہ ہی بلند مقامات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے' پاک ترین لوگوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اسے تو اس قدر آسان اور سہل نہ سمجھنا چاہئے تھا۔ بغیر ثبوت کے اس کی اشاعت کیوں ہوئی اور کیوں اس قدر چرچا ہوا۔ کیوں یہ نقل در نقل ہوتی رہی بغیر شہادت کے۔ اس الزام کے حق میں تو کوئی شہادت نہ تھی لہٰذا سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ جھوٹ بکا جا رہا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔ حقیقت واقعہ کے مطابق جھوٹے ہیں اور اللہ کا فیصلہ اور اللہ کا حکم تو بدلتا نہیں۔ اس لیے یہ ان لوگوں کی اب دائمی صفت ہے جنہوں نے افتراء میں حصہ لیا اور یہ کبھی بھی اس کے نتائج سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔

یہ ہیں دو طریقے۔ ایک یہ کہ کسی بھی معاملے کو سب سے پہلے عقل و قیاس کے منطق کے سامنے پیش کر دو۔ خود اپنے قلب و ضمیر میں اس کا فیصلہ کرو۔ اور دوسرا طریقہ ہے قانون ثبوت کا۔ حادثہ افک میں عام لوگوں نے یہ دونوں طریقے استعمال نہ کیے اور منافقین کی چال میں سب لوگ آگئے۔ پھر بعض اہل ایمان بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چلائی ہوئی اس مہم میں شریک ہو گئے۔ جبکہ یہ ایک عظیم معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ڈراتے ہیں کہ وہ آئندہ محتاط رہیں۔ دوبارہ یہ حرکت نہ کریں۔

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲۴ : ۱۴) "اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا"۔ اللہ تعالیٰ نے نئی تشکیل پانے والی جماعت مسلمہ کے لیے یہ واقعہ بطور آزمائش رونما کرایا تو اللہ نے اس کو اپنے فضل اور رحم و کرم کے ذریعہ یوں خوش اسلوبی سے حل کرا دیا۔ اس عظیم غلطی پر کسی کو سزا نہ دی ورنہ یہ فعل تو سخت سزا کا مستحق تھا کیونکہ اس واقعہ کے ذریعہ اہل مدینہ نے محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اذیت دی تھی۔ لہٰذا مناسب تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سخت سزا دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اس واقعہ میں آپ کے صدیق ساتھی' آپ کی محبوب اہلیہ اور ایک صادق اور پاکباز مسلمان کو اذیت دی گئی۔ پھر اس عظیم شر کی وجہ سے اسلام کے تمام مقدسات کو ہلا کر رکھ دیا گیا۔ منافقین نے یہ سازش اس قدر گہرائی

سے تیار کی تھی کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی بنیادوں ہی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اگر نبی پر اہل ایمان کا اعتماد ہی نہ رہے اور نبی کے خاندان پر نہ رہے اور پھر وحی الٰہی پر نہ رہے تو ظاہر ہے کہ اسلام ختم ہی سمجھا جائے گا اور ایسے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس فتنے کے حامیین کو سخت سزا دی جاتی اور ان پر اللہ کا عذاب بھی آتا مگر اللہ نے فضل و کرم کیا کہ اس آزمائش میں مسلمان کامیاب رہے۔

اس پورے مہینے میں مدینہ کی جو صورت حالات تھی اس کا اظہار قرآن کریم کے ان الفاظ سے اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں کس قدر فکری انتشار تھا۔ لوگوں کے معیار کس قدر بدل گئے تھے۔ ان کی اقدار اور پیمانے کس طرح بدل گئے تھے۔ اس وقت وہ کیسی غلطی کر رہے تھے۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (۲۴: ۱۵) "جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی"۔ یعنی لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ نہایت ہی اہم اور حساس موضوع پر نہایت ہی لاابالی پن سے گفتگو کر رہے تھے اور بالکل غیر محتاط ہو گئے تھے۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ (۲۴: ۱۵) "جب تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی"۔ بغیر کسی تدبر، بغیر کسی غور و فکر، بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے ایک بات تھی جو لوگ کہتے چلے جاتے تھے۔ گویا یہ بات کانوں کے ذریعے دل و دماغ تک غور کے لیے پہنچ نہ پاتی تھی کہ اسے دوسری زبان اچک لیتی تھی۔

وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ (۲۴: ۱۵) "اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جس کا تمہیں علم نہ تھا"۔ منہ سے کہتے تھے مگر اس کا تمہیں یقینی علم نہ تھا۔ تمہارے دل و دماغ اسے حقیقت کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ الفاظ تھے جو زبانوں پر جاری ہو گئے۔ کسی علم و ادراک سے یہ باتیں ثابت نہ تھیں۔ پھر وَ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (۲۴: ۱۵) "تم اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بڑی بات تھی"۔ یعنی تم رسول اللہؐ کی حریم پر الزام لگا رہے تھے۔ تم رسول اللہؐ اور ان کی اہلیہ کے لیے وہ درد پیدا کر رہے تھے جس سے ان کا خون خشک ہو رہا تھا۔ پھر تم حضرت صدیق اکبرؓ کے گھر پر الزام لگا رہے تھے جن پر جاہلیت کے دور میں بھی کوئی الزام نہ لگا تھا۔ تم رسول اللہؐ کے ایک مجاہد صحابی پر یہ الزام لگا رہے تھے جبکہ وہ پاک تھا۔ پھر ان الزامات سے رسول اللہؐ کی رسالت کی توہین ہو رہی تھی۔ یہ تمام باتیں اللہ کے نزدیک اس قدر عظیم تھیں کہ قریب تھا کہ پہاڑ ہل جائیں اور آسمان تم پر ٹوٹ پڑے اور تمہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا جائے۔

مناسب تو یہ تھا کہ یہ بات سنتے ہی مسلمانوں کے دل اس سے بدک جاتے۔ اس بات کو زبان پر نہ لایا جاتا اور اس کو موضوع بحث بنانے سے گریز کیا جاتا۔ اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول پر چھوڑ دیا جاتا اور اس جھوٹی سازش کو

مدینہ کی پاک اسلامی فضا سے گند کی طرح دور پھینک دیا جاتا۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴: ۱۶) "کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا' سبحان اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے۔ جب یہ بات مسلمانوں کے دلوں میں اتار دی جاتی ہے کہ لوگوں سے کس قدر عظیم کوتاہی ہوئی ہے اور دلوں کو اچھی طرح جھنجھوڑ دیا جاتا ہے۔ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ان سے کس قدر عظیم کوتاہی ہوئی ہے تو پھر لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ دیکھو آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ یہ تم نے بہت ہی عظیم جرم کیا ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ (۲۴: ۱۷) "اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو"۔

يعظكم الله "اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے"۔ مؤثر ترغیبی انداز میں بات ہو رہی ہے۔ ایسے حالات میں کہ غلطی کے بعد لوگوں کو احساس ہو گیا کہ تم نے کس قدر عظیم غلطی کی ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ لوگ سمع و اطاعت اور اعتبار کے لیے تیار ہیں۔ ان کو سخت الفاظ میں تنبیہ بھی کر دی جاتی ہے کہ اس حرکت کا اعادہ نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا ایمان خطرے میں ہو گا کیونکہ مومن نصیحت قبول کرتے ہیں اور جب ان کو کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ انہوں نے کس قدر برا کام کیا ہے تو اب ان کا فرض ہے کہ اگر وہ مومن ہیں تو اس کا اعادہ نہ کریں۔

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۴: ۱۸) "اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے وہ علیم و حکیم ہے"۔ جیسا کہ افک کے معاملے میں اس نے تمہیں ہدایات دیں' اس کی تہ میں پوشیدہ مقاصد کو واضح کیا اور خود اہل اسلام سے جو کوتاہیاں ہوئیں اور اللہ چونکہ علیم ہے اس لیے وہ تمام لوگوں کی نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ ہر شخص نے اس معاملے میں جو حصہ لیا اور اس کے پیش نظر جو مقصد تھا اس کو اللہ جانتا ہے کیونکہ وہ دلوں کے خفیہ بھیدوں کو جانتا ہے اور اس معاملے میں اللہ نے جو جوابی تدابیر اختیار کیں وہ حکمت پر مبنی ہیں۔ نیز وہ جو قانون وضع کرتا ہے وہ گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں لوگوں کی اصلاح و فلاح ہوتی ہے۔

--- ○○○---

اس کے بعد اب واقعہ افک پر ایک تبصرہ آتا ہے۔ اس واقعہ کے جو آثار اور اثرات معاشرے کے اندر رہ گئے تھے ان کو بالکلیہ مٹانے اور نفوس مسلمہ کو اس سے پاک کرنے کے لیے مکرر طور پر مسلمانوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ ایسا سانحہ دوبارہ واقع نہ ہونا چاہیے۔ اس بار تو اللہ نے فضل و کرم کر دیا لیکن آئندہ جو لوگ بے خبر پاک دامن عورتوں پر اس قسم کے الزامات عائد کریں گے دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب الہی سے بچ نہ سکیں گے۔ یہ وعید اس لیے لائی گئی کہ دنیاوی تعلقات اور دنیاوی موجوں سے بلند ہو کر ان کی صفوں میں از سر نو تطہیر اور روشنی آ جائے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ایک قریبی رشتہ دار مسطح ابن اثاثہ کے درمیان تعلقات کی تطہیر ہوئی۔ یہ شخص بھی ان دنوں اس بحران میں بہت

ہی سرگرم ہو گیا تھا۔

انَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا

وَ الْاٰخِرَةِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲٤ : ۱۹) "جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔ وہ لوگ جنہوں نے پاک دامن عورتوں پر الزامات عائد کیے خصوصاً وہ لوگ جنہوں نے حریم نبوی پر بے بنیاد الزام لگانے کی جرأت کی ان لوگوں کی اصل خواہش یہ ہے کہ یہ جماعت مسلمہ کے اندر سے بھلائی اور عفت اور پاکیزگی کے اعتماد کو متزلزل کر دیں اور فحاشی کا اس قدر جھوٹا ڈھنڈورا کریں کہ لوگ اس کے بارے میں دلیر ہو جائیں۔ لوگ یہ کہیں کہ یہ بے حیائی تو بڑے لوگوں میں عام ہے۔ اس طرح وہ جھوٹے قصوں سے فحاشی کی مجالس گرم کر کے اس کو عام کر دیں۔

یہ ہے ان جھوٹے الزاموں کا اثر۔ قرآن کریم یہ سکھانا چاہتا ہے کہ جھوٹے الزامات کی وجہ سے فحاشی پھیلتی ہے اس لیے ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب الیم تجویز کیا گیا ہے۔

قرآن کے انداز تربیت کا یہ ایک انداز ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ قانون اور سزا انسدادی تدابیر میں سے ایک تدبیر ہے اور یہ تدابیر اللہ ہی اختیار کر سکتا ہے جو انسانی نفسیات کا خالق ہے اور وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ انسانی شعور کو ان کیفیات میں رنگا جا سکتا ہے اور اس کے رخ کو کس انداز سے اچھی سمت دی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ فرماتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲٤ : ۱۹) "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو"۔ انسانی نفسیات کو اس ذات سے زیادہ کون جانتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور انسانی طرز عمل کو اچھے انداز میں کون چلا سکتا ہے ماسوائے اس کے جس نے اس کو وجود بخشا ہے۔ کون ہے جو ظاہر اور باطن سے واقف ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے وہی تو علیم و خبیر ہے۔

اللہ تعالیٰ دوبارہ مسلمانوں کو اپنے فضل و کرم کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۲٤ : ۲۰) "اور اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ شفیق و رحیم ہے تو....." تو یہ حادثہ بڑا ہی عظیم تھا اور جو غلطی تم سے ہو گئی وہ کوئی معمولی غلطی نہ تھی۔ اور اس کے اندر جو شرارت پوشیدہ تھی وہ تمہیں خوب نقصان پہنچا دیتی۔ لیکن یہ اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تھا اور اس کی مہربانی اور اس کی نگرانی تھی کہ اس نے اس امر عظیم کے برے نتائج کو کنٹرول کر لیا۔ یہ بات اللہ بار بار ذکر فرماتا ہے۔ اس واقعہ کو اللہ ذریعہ تربیت بنا رہا ہے کیونکہ اس کے اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر پڑ رہے تھے۔

جب یہ باور کرا دیا گیا کہ یہ عظیم فتنہ قریب تھا کہ تحریک اسلامی کے اجتماعی نظام کو تس نہس کر دے اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو اب بتایا جاتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تم تو شیطانی نقوش قدم پر چل پڑے تھے جو تمہارا ابدی دشمن ہے۔

تمہیں شیطان کے قدموں پر نہیں چلنا چاہئے۔ آئندہ کے لیے اس قسم کی شیطانی حرکات سے باز رہو جن کے نتیجے میں پوری سوسائٹی ایسے شر کا شکار ہو جائے جس طرح جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰي مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۴ : ۲۱) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔ مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

کیا یہ کوئی اچھا منظر ہو گا کہ شیطان قدم رکھتا جائے اور اس کے نقوش قدم پر ایک مومن قدم رکھتا جائے حالانکہ تمام انسانوں کے مقابلے میں مومن اس کا زیادہ مستحق ہے کہ وہ شیطان سے نفرت کرے اور شیطان کی مقرر کردہ راہ سے دور جا کر سیدھی راہ پر چلے۔ یہ تو ایک مکروہ صورت ہے جس سے ایک مومن نفرت کرتا ہے۔ اس کا وجدان اور شعور ہی اس منظر سے کانپ اٹھتا ہے۔ اس کا خیال کرتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتباع شیطان کی یہ تصویر کشی ایک مومن کو چوکنا کر دیتی ہے اور وہ شیطان کی راہ پر چلنے سے حساس ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۴ : ۲۱) "شیطان کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فحش اور منکر ہی کا حکم دے گا"۔ اور واقعہ افک اس کا بہت ہی خوبصورت نمونہ ہے کہ اس میں اس نے پورے اہل مدینہ کو ملوث کر دیا۔ شیطان کے کارناموں میں سے یہ ایک مکروہ کارنامہ ہے۔

انسان بہت ہی ضعیف ہے۔ یہ شیطانی اکساہٹ کا شکار ہو سکتا ہے اور پھر گناہ میں ملوث بھی ہو سکتا ہے۔ صرف اللہ کا فضل و کرم ہی اسے بچا سکتا ہے لیکن اللہ کا فضل و کرم بھی اسے تب بچائے گا کہ یہ اللہ کے فضل و کرم کی طرف متوجہ تو ہو اور اللہ کے منہاج پر چلنے کی سعی تو کرے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰي مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ (۲۴ : ۲۱) "اگر اللہ کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص بھی پاک نہ ہو سکتا"۔ اس لیے کہ یہ نور ربانی ہی ہوتا ہے جو قلب میں روشنی پیدا کرتا ہے اور اسے پاک و صاف کر دیتا ہے۔ اگر اللہ کا فضل و کرم اور یہ نور نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی پاک و صاف نہ رہ سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے' پاک کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر بھلائی کی استعداد ہو۔

اس تزکیہ اور طہارت کی تلقین کے بعد اب اہل ایمان کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس شر کے نتیجے میں جو تلخیاں پیدا ہو گئی

ہیں ان کو دور کر دو جس طرح تم اللہ سے معافی کے امیدوار ہو۔ اسی طرح آپس میں بھی ایک دوسرے کو معاف کر دو۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۲۴ : ۲۲) "تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے"۔

یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت عائشہ صدیقہؓ کی براءت کا اعلان ہو چکا تھا۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ مسطح ابن اثاثہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے افک کے معاملے میں باتیں کیں۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قریبی رشتہ دار تھے اور فقرائے مہاجرین میں سے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت نے قسم اٹھالی کہ وہ آئندہ مسطح کو کوئی فائدہ نہ دیں گے۔

یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ اور مومنین کو یاد دہانی کرائی گئی کہ وہ خود جب غلطیاں کرتے ہیں تو یہ امید رکھتے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دیں گے تو خود بھی ان میں بعض اگر بعض لوگوں کے بارے میں غلطی کریں تو ان کو معاف کرنا چاہئے۔ اور وہ جو بھلائی بھی کسی کے ساتھ کرتے تھے اسے نہ روکیں اگرچہ اس معاملے میں اس شخص سے غلطی ہوئی ہو۔

یہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ پاک دل لوگ کس قدر اونچی سطح کے لوگ تھے۔ ان کے دلوں کو نور ربانی نے پاک کر دیا تھا۔ حضرت صدیقؓ کا نفس کس قدر بلند اخلاقی کا نمونہ پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کے متاثرین میں سے وہ نہایت ہی گہرائی کے ساتھ متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بہتان کی تلخیوں کو بہت ہی زیادہ جھیلا تھا۔ جب وہ اپنے رب کی نصیحت سنتے ہیں۔ جب یہ سوال ان کے پردۂ وجدان کے ساتھ ٹکراتا ہے۔

أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (۲۴ : ۲۲) "کیا تم پسند نہیں کرتے ہو کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے" تو ان کی تمام رنجشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب قبائلی اور خاندانی سوچ ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ان کی روح شفاف اور صاف ہو جاتی ہے۔ ان کے دل کی دنیا روشن ہو جاتی ہے۔ وہ پکار اٹھتے ہیں ہاں میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ میرے گناہوں کو بخش دے۔ وہ مسطح کی امداد بحال کر دیتے ہیں اور قسم اٹھاتے ہیں کہ جب تک وہ زندہ ہے اسے یہ امداد ملتی رہے گی۔ یہ فیصلہ اس قسم کے بدلے میں ہے کہ میں کبھی اسے کوئی نفع نہ پہنچاؤں گا۔

یوں اللہ تعالیٰ اپنے رحم سے ان رنجیدہ دلوں کو جوڑتے ہیں اور اس معرکے کی وجہ سے ان کے اندر جو کدورتیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دھو ڈالتے ہیں تاکہ یہ معاشرہ جس طرح پاک اور روشن تھا دوبارہ اسی طرح پاک اور روشن ہو جائے۔

---ooo---

یہ مغفرت جس کا ذکر کیا گیا ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے غلطی کی اور پھر توبہ کر لی اور آئندہ کے لیے وہ کسی پر

الزام لگانے سے رک گئے۔ فحاشی کے پھیلانے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا۔ رہے وہ لوگ جو اپنی خباثت کی وجہ سے پاک دامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں۔ پھر اس پر اصرار کرتے ہیں مثلاً عبداللہ بن ابی ابن السلول اور اس جیسے دوسرے منافق تو ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ ہوگی اور نہ انہیں معاف کیا جائے گا۔ اگر وہ اس دنیا میں قانون حد قذف سے بچ نکلے اس وجہ سے کہ ان کے خلاف اسلامی حکومت کے پاس گواہی نہیں ہے۔ آخرت کا عذاب تو ان کے انتظار میں ہے۔ وہاں تو گواہیوں کی ضرورت نہ ہوگی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲۳) یَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۲۴) یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ وَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ (۲۴، ۲۵) "جو لوگ پاک دامن' بے خبر' مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا"۔

اللہ یہاں ان لوگوں کے جرم کو اس طرح پیش کر رہا ہے کہ کوئی عورت بے خبر اپنے کسی کام میں مشغول ہو اور اچانک اس پر تیروں کی بارش شروع کر دی جائے جس کی اسے توقع نہ ہو اور نہ اس نے اس کا کوئی دفاع سوچا ہو۔ اس طرح موجودہ مقدمہ میں ایک مطمئن بے گناہ عورت پر تیروں کی بارش شروع کر دی گئی جبکہ اسے اس طرح کی کسی بات کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ اس قسم کا جرم ہے جو نہایت ناپسندیدہ' منکر اور ظالمانہ حملہ تھا۔ اس وجہ سے ایسی پلاننگ کرنے والوں کی سزا کا آغاز اللہ کی لعنت سے ہوگا۔ ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور دنیا اور آخرت دونوں میں وہ رحمت خداوندی سے محروم ہوں گے۔ پھر قیامت میں ان کا یہ حال ہوگا۔

یَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ (۲۴ : ۲۴) "وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے"۔ ان میں سے بعض بعض پر الزامات عائد کر دیں گے کہ تم لوگ پاک دامن' بے خبر مومن عورتوں پر بہتان تراشی کرتے تھے۔ یہ اس منظر میں ایک نہایت ہی موثر تقابل ہے کہ جس طرح وہ جھوٹے الزامات لگاتے ہیں' اسی طرح ان کے خلاف سچے الزام ہوں گے۔

یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ (۲۴ : ۲۵) "اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں"۔ اور اس دن اللہ ان کو شرمندہ کرے گا' اور یہ ان کی مناسب سزا ہوگی کیونکہ انہوں نے بے گناہوں کو شرمندہ کیا تھا۔ ان کا پورا پورا حساب ان کو دیا جائے گا اور اس دن ان کو پھر ان باتوں کا یقین آ جائے گا جن کا انہیں یقین نہ آ رہا تھا۔

و یعلمون ان اللہ ھو الحق المبین "اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا"۔

واقعہ افک کے اس سلسلہ کلام کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیار دیا ہے اور جو لوگوں کی عملی زندگی میں موجود ہے اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ ایک خبیث نفس کا جوڑ خبیث نفس سے ہوتا ہے اور ایک طیب اور پاک نفس کا جوڑ پاک نفس سے ہوتا ہے اس اصول کے مطابق یہ ممکن ہے کہ حضرت عائشہؓ کا جوڑ پاک ترین نفس سے ہو جائے' لہٰذا ان لوگوں کا یہ الزام اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ قدرت کی تقسیم میں عائشہ صدیقہؓ حضرت محمدؐ کے حصے میں آئیں اس لیے وہ طیبہ ہیں۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۴:۲۶) "خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں' ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم"۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے بے حد محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نبی کے لیے کس طرح چن سکتا تھا اگر وہ پاک نہ ہوتیں۔ یہ پاک لوگ اپنی فطرت کے اعتبار سے ان باتوں سے پاک ہیں اور ان کی طرف جن گندی باتوں کی نسبت کی جاتی ہے' وہ ان سے مبراء ہیں۔

ان کے لیے رزق کریم ہے قیامت میں اور گناہوں سے مغفرت ہے یعنی ان کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں اللہ کے ہاں معاف ہو جاتی ہیں۔ ان آیات پر افک کے واقعات اب اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی وجہ سے امت مسلمہ نہایت ہی مصیبت میں گھر گئی تھی۔ اس واقعہ کے نتیجے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گھر کی طہارت اور عزت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اور بڑی بڑی جنگوں کی آزمائشوں کے ساتھ ساتھ' داخلی محاذ کو مضبوط بنانے کے لیے یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی جس میں سے ابتدائی اسلامی جماعت کو گزارا گیا۔

---ooo---

درس نمبر ۱۵۳ ایک نظر میں

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا ہے کہ اسلام ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے میں صرف سخت سزاؤں پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسلام سب سے پہلے جرائم کے لیے انسدادی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ نیز اسلام انسان کی فطری خواہشات کو نہ دباتا ہے اور نہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے بلکہ وہ انسان کی فطری خواہشات کے لیے بھی ایک نہایت ہی پاکیزہ اور نارمل ماحول فراہم کرتا ہے جس میں کوئی جعلی اکساہٹ نہ ہو۔

اس سلسلے میں اسلام کے نظام تربیت کا بنیادی اصول سد باب کا ذریعہ ہے۔ اسلام بدراہ ہونے کے دروازے ہی بند کر دیتا ہے اور ان اسباب کو ختم کرتا ہے جو انسان کو بدراہ کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں یا فتنے کے اسباب فراہم کرتے ہیں یا جن کی وجہ سے انسان کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اسلام لوگوں کو فطری تشفی کے اسباب بھی فراہم کرتا ہے' قانون کے دائرے کے اندر اندر۔

اسلام فیملی اور گھروں کی چار دیواری کا بے حد احترام کرتا ہے۔ چنانچہ پہلا اصول یہ طے کیا جاتا ہے کہ کسی کے گھر کے اندر اہل خانہ کی اجازت کے بغیر کوئی داخل نہ ہو۔ یہ محض اس لیے کہ آنے والے کی آنکھیں کوئی ایسا منظر نہ دیکھ لیں جس کو اہل خانہ خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اچانک داخل ہوتا ہے اور اہل خانہ غافل ہیں تو وہ اس منظر کو پسند نہ کریں گے۔ نیز اسلام یہ حکم بھی دیتا ہے کہ تمام مرد اور عورتیں نظریں نیچی رکھیں اور زیب و زینت کے ساتھ عورتیں باہر نہ نکلیں۔

اس کے ساتھ اسلام فقراء اور مساکین کو شادی کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے کیونکہ فحاشی کے خلاف بہترین ہتھیار یہ ہے کہ تمام لوگوں کو شادی کے محفوظ قلعے کے اندر داخل کر دیا جائے۔ نیز یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ لونڈیوں کو بھی بدکرداری پر مجبور نہ کرو کیونکہ لونڈیوں کے ذریعہ فحاشی کو بڑی آسانی کے ساتھ پھیلایا جا سکتا ہے۔

درس نمبر ۱۵۳ تشریح آیات

۲۷ --- تا --- ۳۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨﴾ لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٢٩﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو' یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے ۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے ۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ گے تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے' اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ' یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے ۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اسے خوب جانتا ہے ۔ البتہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو ۔ تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو' سب کی اللہ کو خبر ہے"۔

گھروں کو اللہ نے انسانوں کے لیے جائے سکون بنایا ہے' لوگ کام کاج کر کے ان کی طرف لوٹتے ہیں ۔ ان کی روح کو وہاں سکون ملتا ہے اور ان کے نفوس کو وہاں آرام ملتا ہے ۔ یہاں وہ اپنے خفیہ اور پوشیدہ امور کے بارے میں مطمئن ہوتے ہیں' ان کی عزت یہاں محفوظ ہوتی ہے اور یہاں وہ آرام کر کے اپنے اعصاب کو تسکین پہنچاتے ہیں ۔

لیکن گھر میں اس قسم کا آرام اور سکون تب ہی مل سکتا ہے جب کوئی غیر شخص چار دیواری کی حرمت پر ہاتھ نہ ڈالے اور اہل خانہ نہایت امن و سکون سے رہیں' الا یہ کہ باہر کا کوئی شخص ان کی اجازت سے گھر کے اندر داخل ہو ۔

اور اس وقت داخل ہو جس وقت وہ چاہیں اور ایسے حالات میں داخل ہو جن میں اہل خانہ اجازت دیں۔

اب اگر کسی کو کسی کے گھر میں داخلے کی اجازت دے دی جائے اور اس کی نظر میں کسی ایسے منظر کو دیکھ لیں جو دونوں کے لیے فتنہ ہو اور اچانک داخلہ اس شخص کے لیے اس فتنہ کا باعث بن جائے تو اس طرح معاشرے میں فحاشی پھیلنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسی نظروں کا تکرار پھر ابتلاء بن جاتا ہے۔ اگرچہ پہلی نظر میں ملاقات بعض اوقات بلاقصد و ارادہ ہوتی ہے لیکن بعد میں فتنہ بن جاتی ہے۔ جب فریقین ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں تو اس کے نتیجے میں فساد اور فحاشی اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔

جاہلیت کے دور میں دوسرے کے گھر لوگ اچانک داخل ہو جاتے تھے۔ پہلے آنے والا آ جاتا اور پھر کہتا میں آ گیا ہوں۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ صاحب خانہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایسی حالت میں ہوتا کہ ایسے حالات میں باہر سے داخل ہونا معیوب ہوتا لیکن وہ پروا نہ کرتے۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ گھر میں عورت ننگی ہے یا اس کے ستر کے مقامات ننگے ہیں۔ یا مرد اس طرح ہے۔ اس سے صاحب خانہ کو اذیت پہنچتی اور دوسرے کے گھر کا امن و سکون تباہ ہو جاتا۔ جبکہ بعض اوقات ایسا بے ہنگم واقعہ فتنے کا باعث بن جاتا جب آنکھ ایسا منظر دیکھ لیتی جس سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو ان آداب کا پابند کر دیا کہ کسی کے گھر کے اندر بغیر اجازت کے داخل ہونا ممنوع ہے۔ مناسب ہے کہ باہر سے سلام کیا جائے تاکہ ان کو پتہ چل جائے کہ فلاں صاحب آنا چاہتے ہیں۔ نیز اس انداز سے ایک قسم کی مانوسیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰي تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَهْلِهَا (۲۴:۲۷) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو"۔ یہاں اذن و اجازت کے لفظ کی تعبیر لفظ "انس" سے کی گئی ہے۔ اس انداز تعبیر سے اجازت کے مہذب ترین طریقے کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس طرف اشارہ ہے کہ آنے والے کو نہایت ہی مہذب انداز میں آنا چاہئے۔ لوگوں کے ساتھ وہ نہایت انس و محبت سے اور مہذب طریقے سے بات کرے تاکہ وہ اس کے استقبال کے لیے تیار ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف اور دقیق اخلاقی اصول ہے لوگوں کی سہولت کے لیے اور ان کے گھروں میں ان کی عزت و وقار کو بحال کرنے کے لیے اور اس لیے کہ رات دن اہل خانہ آنے جانے والوں سے تنگ ہی نہ ہو جائیں کہ ایک آ رہا ہے اور دوسرا جا رہا ہے اور وہ بھی بلا اجازت۔

اجازت کے نتیجے میں اب صورت حالات یہ ہو گی کہ یا تو اس میں کوئی گھر میں ہو گا اور اجازت دے دے گا تو یہ شخص گھر کے اندر چلا جائے گا اور اگر کوئی نہیں ہو گا تو پھر اس شخص کے لیے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰي يُؤْذَنَ لَكُمْ (۲۴:۲۸) "اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دی جائے"۔

اگر اندر اہل خانہ میں سے کوئی موجود ہو تو صرف اجازت طلب کرنے ہی سے داخلے کی اجازت نہیں ہو جاتی جب

تک کوئی صریح اجازت نہ دے۔ اگر اندر والے اجازت نہ دیں تو بغیر کسی جھجک کے واپس ہو جانا چاہیے۔ اور انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ (۲۴ : ۲۸) "اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے"۔ یعنی واپس ہو جاؤ بغیر کسی تنگی کے۔ بغیر اس تاثر کے کہ اہل خانہ نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے' یا تم سے کوئی نفرت کی ہے کیونکہ اہل خانہ کے اپنے اسرار اور اعذار ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ حق ان کو دینا ضروری ہے کہ اس وقت وہ مہمان کا استقبال کر سکتے ہیں یا نہیں۔

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۴ : ۲۸) "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ خوب جانتا ہے"۔ اللہ تو دلوں کے خفیہ بھیدوں کو جاننے والا ہے' یا یہ کہ دلوں میں جو جذبات و خیالات ہیں ان سے بھی وہ باخبر ہے۔

رہے وہ مقامات جو مقامات عامہ ہیں مثلاً ہوٹل' سرائے اور ضیافت کے گھر ہاسٹل وغیرہ جو پرائیویٹ رہائش گاہوں سے علیحدہ ہوں تو ان میں بغیر اجازت کے داخل ہونا جائز ہے جب اجازت کا کوئی سبب موجود نہ ہو۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ (۲۴ : ۲۹)
"البتہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے کی کوئی چیز ہو"۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ (۲۴ : ۲۹) "تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو' سب کی اللہ کو خبر ہے"۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہے اور وہ تمہارا نگران ہے۔ تمہارے دلی خیالات سے وہ باخبر ہے کہ تمہارے دلی ارادے کیا ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں تمہارے لیے ایک نہایت ہی مہذب انداز زندگی تجویز کرتا ہے۔ اس کا وہ نگران بھی ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم قلبی اطاعت کرو۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل نظام حیات ہے اس لیے وہ انسانی زندگی کے ایک نہایت ہی جزئی مسئلے کو اس قدر تفصیل سے لیتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کا موضوع انسانی زندگی کا طرز عمل ہے خواہ وہ جزئی ہو یا تفصیلی۔ اس طرح اسلامی نظام کے اصول و فروع کے درمیان ایک توازن قائم کر دیا جاتا ہے۔ استیذان کا قانون گھروں کو امن و سکون کی جگہ بنانے کی ایک تدبیر ہے۔ یہ تدبیر کرنا مقصود ہے کہ کسی گھر کے باشندے کو اچانک کسی ناپسندیدہ صورت حال سے دوچار ہونا نہ پڑے کیونکہ جب اچانک کوئی در آئے تو معلوم نہیں ہوتا کہ اندر کے لوگ کس حال میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کا سر کھلا ہو یا کسی کا ستر کھلا ہو۔ "عورات" کے لفظ سے وسیع تر مفہوم مراد ہے۔ اس سے صرف بدنی برہنگی ہی مراد نہیں ہے۔ اس سے کھانے پینے کے انتظامات' لباس' سازوسامان نشست و برخاست کے مقامات و اثاث البیت بھی مراد ہے جس کے بارے میں اہل بیت یہ نہیں چاہتے کہ جگہ اور حالات کی تیاری کے بغیر کوئی اندر آ جائے اور اندر کی کیفیت کو وہ کمتر نفسیاتی حالات میں پائے۔ مثلاً کم لوگ اس بات کو پسند کریں گے کہ کوئی اندر آئے اور اندر کوئی رو رہا

ہو یا کوئی اندر آئے اور گھر والا غصے میں ہو۔ یا وہ کسی ایسے درد اور دکھ میں مبتلا ہو جسے وہ عوام سے خفیہ رکھنا چاہتا ہو۔ یہ سب عورات ہیں۔

اس ایک "ادب" کے ذریعے قرآن مجید بے شمار فوائد کو سمیٹ لیتا ہے۔ بعض کو ہم جانتے ہیں اور بعض کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ پھر اہم بات یہ کہ اچانک نظربازی سے بھی انسان بچ سکتا ہے جس کے نتیجے میں ناجائز خواہشات کے ابھرنے کے مواقع ہوتے ہیں اور بعد میں پھر یہ تعلقات برے تعلقات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض نظروں کے بہکنے اور دلوں کی اچانک کشش کو قابو میں رکھنے کے لیے ادب قرآنی نہایت ہی مفید اور اہم ذریعہ اصلاح ہے۔

اس کی حقیقت اور اہمیت صرف وہ لوگ جانتے ہیں جن کے اندر سب سے پہلے یہ ادب اترا اور اس کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے کیا۔

امام ابو داؤد اور نسائی نے ابو عمر اوزاعی کی حدیث نقل کی ہے۔ وہ قیس ابن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری رہائش گاہ پر تشریف لائے اور باہر سے کہا "السلام علیکم" تو سعد نے نرمی سے وعلیکم السلام کہا۔ قیس کہتے ہیں میں نے سعد سے کہا کیا تم رسول اللہ ؐ کو اجازت دینا نہیں چاہتے ہو۔ تو اس نے کہا چھوڑو ہم پر زیادہ سے زیادہ سلام کہہ دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو سعد نے پھر چپکے سے کہا وعلیکم السلام۔ اس کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اور پھر آپ لوٹ گئے۔ سعد گھر سے نکلے اور آواز دی حضور ؐ میں سن رہا تھا اور سلام کا جواب بھی آہستگی سے دے رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ کثرت سے ہم پر سلام کہہ دیں۔ کہتے ہیں حضور اکرم ؐ آپ کے ساتھ لوٹ آئے۔ سعد نے حکم دیا کہ حضور اکرم ؐ کے لیے غسل کا پانی تیار کرو۔ آپ ؐ نے غسل کیا۔ اس کے بعد سعد نے اون کا ایک پھولدار کپڑا حضور ؐ کو پیش کیا۔ یہ زعفران یا ورس گھاس سے رنگا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اوڑھا۔ پھر حضور ؐ نے ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا کی۔

اللهم اجعل صلاتك ورحمتك علي آل سعد ابن عبادة .... "اے اللہ اپنا کرم اور رحمت ڈال دے آل سعد ابن عبادہ پر"۔ ابو داؤد نے عبداللہ ابن بشر کی حدیث نقل کی ہے۔ کہتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم کے دروازے پر آتے تو دروازے کے سامنے منہ کر کے نہ کھڑے ہوتے یا اس کے دائیں طرف یا بائیں طرف کھڑے ہوتے اور فرماتے السلام علیکم .... السلام علیکم۔ ان دنوں گھروں میں پردے نہ ہوتے تھے۔

ابو داؤد نے حضرت ہذیل سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی آیا (عثمان کہتے ہیں سعد تھا) تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور داخلہ کی اجازت چاہنے لگا۔ تو وہ دروازے کے سامنے منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ (عثمان نے کہا دروازے کے سامنے)۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طریقہ بتایا اور کہا اس طرح کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ اجازت طلب کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ تم اندر کچھ دیکھ نہ سکو۔

صحیحین میں ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا اگر تمہارے گھر کے اندر کوئی شخص بغیر اجازت کے اندر آ جائے اور تم ان پر ایک پتھر پھینکتے ہو اور اس سے اس کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے تو تم پر کوئی جرم عائد نہ ہو گا۔

ابو داؤد نے حضرت ربعی سے روایت نقل کی ہے کہ بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ ؐ سے اندر آنے کی اجازت

چاہی۔ جبکہ حضورؐ اپنے گھر میں تھے۔ تو اس نے کہا کیا میں "گھس جاؤں"۔ تو حضورؐ نے اپنے خادم سے کہا نکلو اور اس شخص کو اندر آنے کی اجازت طلب کرنے کا طریقہ سکھاؤ۔ اس سے کہو کہ تم یوں کہو "السلام علیکم"۔ کیا میں داخل ہو جاؤں۔ حضورؐ کی اس بات کو اس شخص نے سن لیا تو کہا "السلام علیکم 'کیا میں داخل ہو جاؤں"۔ تو اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور وہ اندر آیا۔

ہیثم نے کہا ہے کہ مغیرہ نے کہا اور مغیرہ نے کہا مجاہد نے کہا 'عمر ایک ضرورت سے آئے اور اسے گرمی نے تنگ کر رکھا تھا وہ قریش کی ایک عورت کے خیموں کے سامنے گئے اور کہا "السلام علیکم 'کیا میں اندر آ جاؤں"۔ تو اس نے کہا "سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ"۔ حضرت عمرؓ نے پھر اجازت چاہی۔ اس نے بھی پھر یہی جواب دیا حالانکہ وہ اس کے قدموں کے پاس کھڑا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا تم اس طرح کہو "ادخل" داخل ہو جاؤ۔ اس پر اس عورت نے کہا "داخل ہو جاؤ" تو بعد میں وہ اندر آئے۔

عطا ابن ابی رباح نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں میں نے کہا' کیا میں اپنی یتیم بہنوں سے بھی اجازت طلب کروں جو میرے ہی گھر میں میری نگرانی میں ہیں۔ تو آپ نے فرمایا' ہاں۔ میں نے پھر اس پر یہ سوال کیا تا کہ مجھے اس میں رخصت دے دی جائے۔ اس پر اس نے کہا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ اسے ننگی حالت میں دیکھو۔ تو میں نے کہا' نہیں۔ تو اس نے کہا پھر اجازت طلب کرو۔ تو میں نے پھر اس سے بحث کی تو انہوں نے کہا کہ کیا تم اللہ کے حکم کی اطاعت چاہتے ہو یا نہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ "تو پھر اجازت چاہو" انہوں نے کہا۔

اور حدیث صحیح میں آتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کوئی اپنے گھر بھی رات کے وقت اچانک نہ جائے۔ بعض روایات میں آتا ہے۔ لیلا یتحو نھم اور ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت مدینہ پہنچ گئے تو مدینہ کے سامنے آپ نے اونٹوں کو بٹھا دیا۔ آپ نے فرمایا انتظار کرو عشاء تک یعنی دن کے آخری حصے تک تا کہ ایسی عورت جس کے بال بکھیرے ہوں وہ بال سنوار لے۔ اور ایسی عورت جس کے بال صاف نہ ہوں وہ صاف کر لے۔

اسلام نے نہایت ہی مہذب طریقے مسلمانوں کو سکھائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر ان سے تجربہ کرالیا۔ یہ آداب بلند ان کو دیئے جو نہایت ہی روشن اور نور ربی سے منور تھے۔

آج ہم بھی مسلمان ہیں لیکن ایسے معاملات کے بارے میں ہمارا احساس غلیظ ہے۔ ہم اجڈ ہو گئے ہیں۔ ایک شخص اپنے بھائی کے گھر جاتا ہے اور تیر کی طرح اندر گھس جاتا ہے اور رات اور دن کے کسی بھی وقت اس کا جی چاہے گھس جاتا ہے۔ وہ بار بار گھنٹیاں بجاتا ہے۔ اور تب چھوڑتا ہے کہ کوئی بادل نخواستہ اٹھے اور اس کے لیے دروازے کھولے۔ بعض اوقات گھر میں ٹیلیفون بھی ہوتا ہے۔ یہ بڑی سہولت سے آنے کی اجازت طلب کر سکتا ہے' وقت مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن ہم نے اسلام کے نظام استیذان کو ترک کر دیا ہے اور وقت بے وقت ہم دوسرے کے ہاں وارد ہو جاتے ہیں اور اب تو ہم نے بغیر ملاقات چلے جانے کو معیوب سمجھ لیا ہے۔ اگرچہ اہل بیت نہ چاہتے ہوں۔ ہمارا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب ہم آ گئے تو ہمیں گھس جانا ہی ہے۔ بغیر کسی باک اور انتظار کے۔

ہم مسلمان ہیں لیکن ہم اس وقت اپنے بھائیوں کو ڈسٹرب کر دیتے ہیں جب وہ کھانا کھانے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اب اگر وہ بھائی کھانا پیش نہیں کرتا تو ہم خفا ہو جاتے ہیں۔ ہم رات دیر تک ملنے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے ہاں رات گزارنے

کی دعوت نہیں پیش کرتا تو ہم خفا ہو جاتے ہیں اور ہم اس معاملے میں کسی کا کوئی عذر سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ ہم اسلامی آداب کے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم اپنی خواہشات کو اس ضابطے کے تابع کرنا نہیں چاہتے جو رسول اللہ ؐ لائے ہیں۔ اور ہم دراصل ایک غلط جاہلی رواج کے غلام بن گئے ہیں جس پر اللہ کی جانب سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

پھر زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ وہ بعض ایسے آداب پر عمل پیرا ہیں جو ہمارے دین جیسے ہیں۔ اور وہ ایسے ہی آداب ہیں جو ہمارے دین نے ہمیں سکھائے ہیں۔ ہم ان غیر مسلموں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے دین کے آداب اپنا رکھے ہیں اور ہمیں اپنے دین کا پتہ نہیں ہے۔ لئے ہم ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کو نادر آداب سمجھتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بھی ہم اپنے دین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور مطمئن ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

--- ooo---

گھروں میں داخل ہونے کی اجازت کے آداب کے بعد جس کے ذریعے احتیاطی اور احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں کہ کوئی نظر کے فتنے میں نہ پڑ جائے اور اس کے برے نتائج بر آمد ہوں۔ اب اہل ایمان کو عمومی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنی نظروں کی حفاظت کریں کیونکہ نظربازی ہی انسان کو گمراہی اور بے راہ روی تک لے جاتی ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۱

”اے نبی ؐ مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ' یہ ان کے لیے

زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے' جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔اور اے نبیؐ "مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں' اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں' اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں۔بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے' اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے : شوہر' باپ' شوہروں کے باپ' اپنے بیٹے' شوہروں کے بیٹے' بھائی' بھائیوں کے بیٹے' بہنوں کے بیٹے' اپنے میل جول کی عورتیں' اپنے لونڈی غلام' وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں' اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو' اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔اے مومنو' تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو' توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔

ان آیات کا نصب العین یہ ہے کہ ایک نہایت ہی پاک و صاف سوسائٹی قائم کی جائے جس کی حالت یہ نہ ہو کہ ہر جگہ اور ہر وقت شہوت ہی کا ہیجان ہو اور ہر وقت گوشت و پوست کی لذت اندوزی کے سامان ہوں' کیونکہ ایسے اقدامات جن سے ہر وقت جنسی ہیجان پیدا کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس قدر جنسی پیاس پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پھر کبھی بجھتی نہیں۔ایک نظر بد یا فتنہ انگیز ادا یا زیب و زینت کی نمائش اور عریانی جسم کی نمائش دوسروں کے جذبات میں آگ لگا سکتی ہے اور انسان کی خوابیدہ حیوانیت کو نہ صرف جگا دیا جاتا ہے بلکہ دوسرے کے اندر بے چینی پیدا کر دی جاتی ہے۔دوسرے فریق کو پھر اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔یا تو پھر انسان بے قید شہوت رانی کا شکار ہوتا ہے اور یا پھر اس کے اعصاب اور نفسیات کے اندر ہیجانی امراض پیدا ہو جاتی ہیں اور اس طرح ایک انسان عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلام جو پاک اور صاف ستھری سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کے قیام کے لیے وہ پہلی تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ جذبات کو ہیجان سے بچایا جائے۔وہ فریقین کے اندر پائے جانے والے فطری میلان کو اپنی جگہ باقی رکھتا ہے اور اپنے فطری انداز کے مطابق اس فطری جذبہ کو محفوظ اور تعمیری انداز دیتا ہے۔

انسانیت پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ نظریہ اباحیت پھیل گیا۔جنسین کے درمیان آزادانہ گفتگو' آزادانہ اختلاط گپ شپ کو عام کر دیا گیا' یہاں تک کہ بچوں کو جنسی تعلیم دی جانے لگی اور خفیہ ترین باتوں سے پردہ اٹھا دیا گیا۔یہ باتیں اور اقدامات اسی نظریہ کے تحت کیے گئے کہ یہ امور جنسی میلان اور جنسی جذبات کو دبانے کے نقصانات سے بچاتے ہیں اور لوگوں کو یہ مواقع ملتے ہیں کہ وہ آزادانہ طور پر جو چاہیں جنسی معاہدے کریں۔یہ اجازت ان نظریات نے اس لیے دی کہ لوگ جنسی میدان میں تشدد اور دوسری غلط کاریاں نہ کریں۔

یہ جنسی آزادی اس وقت رائج ہوئی جب انسان کے بارے میں خالص مادی نظریات رائج ہوئے اور انسان کو محض حیوان قرار دیا گیا۔خصوصاً فرائیڈ کے جنسی خیالات کی ترویج کے بعد۔لیکن میں نے خود ان نظریات کو ایک ایسے ملک میں دیکھا جس میں مکمل اباحیت تھی اور جس میں مذہبی' اخلاقی اور انسانی قیود میں سے کوئی قید نہ تھی لیکن میں نے مشاہدہ کیا کہ یہ تمام نظریات محض مفروضے ہیں اور ایسے ممالک کے حالات ان کی پوری پوری تکذیب کرتے ہیں۔

ایسے ممالک کا ہم نے ملاحظہ کیا ہے جن میں جسمانی ملاپ' عریانی اور جنسی بے راہ روی پر کوئی قید و بند نہیں ہے۔ وہاں اس کی تمام ممکن شکلیں جائز ہیں لیکن ان ممالک میں جنسی تعلقات نہ مہذب ہو سکے' نہ ان کے اندر کوئی باقاعدگی پیدا ہوئی بلکہ جنسی پیاس جنون کی حد تک بڑھ گئی اور اس قدر بڑھی کہ تسکین کا نام و نشان ختم ہو گیا۔ان ممالک میں

جنسی اور نفسیاتی بیماریوں کا طوفان لڈ آیا اور ایسے مسائل دیکھنے میں آئے جو جنسی محرومی سے پیدا ہوتے ہیں - یہ مسائل ان معاشروں میں بکثرت پائے جاتے ہیں جن میں جنسی انارکی پر کوئی قید نہیں ہے - یہ مسائل محض اس لیے پیدا ہوئے کہ ایسے ممالک میں کوئی جنسی قید اور ضابطہ نہ تھا - جنسی دوستیاں بغیر کسی رکاوٹ کے آزاد تھیں اور جنسی تعلقات اور ملاپ مویشیوں کی طرح راستوں میں دیکھا جاتا تھا - جنسی حرکات اور نظربازیاں تو بالکل معمولی چیز تھیں - ان ممالک کے تفصیلی واقعات اور تفصیلی حرکات پر بحث کا یہاں موقع نہیں ہے - تفصیلات کے لیے دیکھئے محمد قطب کی کتاب (الانسان بین المادیہ و الاسلام) باب مسائل جنس - مزید تفصیلات میری زیر طبع کتاب (امریکا الحق رابت) میں دیکھئے -

مرد اور عورت کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش ایک فطری امر ہے اور یہ انسان کے اندر تخلیقی طور پر ودیعت کی گئی ہے کیونکہ اس کرۂ ارض پر زندگی کے تسلسل کا دارومدار اسی پر ہے - انسان نے اس زمین پر منصب خلافت ارضی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے - اس ذمہ داری کا بڑا اور اہم حصہ یہاں زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے - اس لیے یہ کشش ایک دائمی کشش ہے - بعض اوقات یہ کشش سو جاتی ہے - پھر جاگ اٹھتی ہے - جونہی یہ جاگتی ہے تو یہ فرد تب ہوتی ہے جب جنسین کے درمیان ملاپ ہو کر تسکین ہو جائے - اگر یہ جسمانی تسکین نہ ہو تو اس کا اثر انسانی اعصاب پر پڑتا ہے اور ایسے حالات میں انسان پھر شدید گھٹن محسوس کرتا ہے - پھر انسان کو ایک نظر بھی اکساتی ہے' ایک حرکت بھی اکساتی ہے - ایک معمولی سی ہنسی بھی ابھارتی ہے - محض گپ شپ کے نتیجے میں انسان بے قابو ہو جاتا ہے اور ایک خوبصورت آواز بھی تڑپا دیتی ہے لہٰذا محفوظ طریقہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر انسان کو ایسے مواقع سے محفوظ رکھا جائے تاکہ اس کا جنسی میلان طبعی حدود کے اندر رہے اور جائز اور قدرتی ذرائع سے اس کی تسکین کے مواقع فراہم کیے جائیں - اسلام یہی منہاج اختیار کرتا ہے - اس کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کی قوتوں کو دوسری تعمیری سمتوں کی طرف بھی موڑ دیتا ہے - زندگی کے دوسرے کام ایسے ہوتے ہیں جو جسم و جان اور خون اور پوست کے اس ملاپ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں' لہٰذا انسان کے سامنے صرف شہوانی تسکین ہی واحد مقصد نہیں رہتا - زیر تفسیر آیات میں اسلام کی ایسی ہی پالیسیوں کو جاری کیا گیا ہے یعنی ایسے مواقع کم کیے جائیں جن میں ہیجان پیدا ہوتا ہو - لوگوں کو اعلیٰ مقاصد میں مصروف کیا جائے اور پھر فریقین کے لیے جائز تسکین کے موقع پیدا کیے جائیں -

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰي لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۲۴ : ۳۰) "اے نبیؐ مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں' یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے' جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے"۔

مردوں کی طرف سے غض بصر ایک نفسیاتی ادب اور تہذیب ہے اور دوسرے انسانوں کے اندر فطری محاسن اور جسمانی محاسن اور چہرے کے محاسن کی تلاش ہر انسان کے اندر ایک فطری داعیہ ہوتا ہے - اس طرح ایک مومن اپنے اس داعیہ پر قابو پاتا ہے - نیز یہ غلط روی کے پہلے دریچے کی بندش کا اقدام ہے - اگر غض بصر سے کام نہ لیا جائے تو انسانی نظر انسان کو فتنے میں ڈال سکتی ہے - گویا زہریلے تیر سے بچنے کی یہ پہلی کوشش ہے -

جب انسان اپنی نظروں پر قابو پالے تو اس کے نتیجے میں اس کی شرمگاہ خود بخود زیر کنٹرول ہو گی - غض بصر کے نتیجے

میں بے راہ روی کے اس دوسرے مرحلے میں داخل ہونے ہی سے انسان بچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غض بصر اور حفظ فروج کو ایک ہی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ غض بصر سبب ہے اور حفظ فرج مسبب ہے۔ بلکہ عالم ضمیر اور عالم واقعہ دونوں میں یہ پہلا اور دوسرا قدم ہیں اور ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔

ذٰلِكَ اَزْكٰي لَهُمْ "یہ ان کے لیے پاکیزہ طریقہ ہے"۔ یہ ان کے جذبات کے لیے پاکیزہ طریقہ ہے' اس طریقے سے وہ برائی میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں گے اور ان کا میلان اپنے جائز راہ تک محدود ہو گا۔ اللہ ہی ہے جو تمہیں یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ فطری اور نفسیاتی تعلیم و تربیت ہے۔ اللہ تمہاری تمام حرکات سے واقف ہے اور وہ علیم و خبیر ہے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴: ۳۱) "اور اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"۔ وہ اپنی بھوکی نظروں کو آزاد نہ چھوڑیں نہ وہ دریدہ نگاہوں سے مردوں کو دیکھیں۔ نہ اچانک ان پر نگاہ ڈالیں اس طرح کہ مردوں کے خوابیدہ میلانات کے اندر اشتعال پیدا ہو جائے اور وہ اپنی شرمگاہوں اور غیر قانونی اور غیر جائز مردوں کے لیے مباح نہ کر دیں۔ اپنے فطری میلانات کو جائز طریقے سے استعمال کر کے حلال بچے پیدا کریں اور یہ نہ ہو کہ حرام بچے پیدا ہوں اور معاشرے کے لیے وہ شرم کا باعث ہوں اور معاشرہ ان کے لیے شرمسار کنندہ ہو۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴: ۳۱) "اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو ظاہر ہو"۔ زینت اور بناؤ اور میک اپ عورتوں کے لیے جائز ہے کیونکہ یہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر عورت کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ بہت ہی خوبصورت نظر آئے۔ ہر زمانے میں زینت کے معیار بھی بدل جاتے ہیں لیکن زینت کا داعیہ فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنائے۔

اسلام عورت کی اس فطرت کو بھی جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکتا۔ وہ اسے تسلیم کرتا ہے لیکن اسلام اس کی تنظیم اور ضابطہ بندی ضرور کرتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ یہ زیب و زینت صرف ایک مرد یعنی اپنے خاوند اور شریک حیات کے لیے مخصوص ہو جائے اور اس زینت کو صرف وہ دیکھے۔ اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔ ہاں بعض محارم بھی اس زینت میں شریک ہو سکتے ہیں جن کا ذکر بعد میں آتا ہے اور جن سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ عورت ان کے لیے شہوت انگیز ہو گی۔

ہی وہ زینت جو چہرے پر ہے یا جو ہاتھوں پر ہے تو اس کا ظہور جائز ہے۔ کیونکہ چہرے اور ہاتھوں کا کھولنا عورتوں کے لیے مباح ہے۔ حضورؐ نے اسماء بنت ابوبکر سے یہ فرمایا "اسماء عورت جب حیض کی حد تک پہنچ جائے تو یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے "ان" مقامات کے سوا کوئی جگہ کھلی ہو۔ آپ نے اس وقت چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ (۲۴: ۳۱) "اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل

ڈالے رکھیں"۔ جیب اس شگاف کو کہتے ہیں جو قمیض میں سینے پر ہوتا ہے۔ اور "خمار" اس چادر کو کہتے ہیں جو سر پر اوڑھی جاتی ہے تاکہ اس سے سینہ چھپ جائے اور وہ بھوکی نظروں سے اوجھل رہے اور اچانک نظر سے بھی یہ مقامات بچ جائیں۔ متقی لوگ تو اس اچٹتی نظر کو طول نہیں دیتے نہ دوبارہ نظر ڈالتے ہیں لیکن اس نظر سے بھی بعض اوقات بڑے فتنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان مقامات کو کھلا رکھا جائے جن سے جنسی میلان کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں کسی انسان کو آزمانا نہیں چاہتا کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان کے لیے یہ ایک عظیم فتنہ ہے۔

اور وہ مومن عورتیں جو اللہ کی طرف سے یہ ہدایت پا رہی تھیں اور ان کے دل اللہ کے نور سے منور تھے انہوں نے ان احکام کی تعمیل میں ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ اگرچہ ان کی فطری رغبت اور خواہش یہی تھی کہ وہ ایسے جمال و کمال کا اظہار کریں جس طرح ہر عورت کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے۔ جاہلیت میں یہ رواج تھا جس طرح آج کی جدید جاہلیت کا رواج ہے کہ عورتیں مردوں کے درمیان سینہ تان کر پھرتی تھیں اور ان کے سینہ پر کچھ نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو اس کی گردن اور بالوں کی لٹیں بھی کھلی ہوتی تھیں اور کان کی بالیاں بھی کھلی ہوتی تھیں۔ جب اللہ کی طرف سے یہ حکم آیا کہ وہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں لٹکائیں اور اپنی زینت کے صرف ان حصوں کو ظاہر کریں جو ظاہر ہوں تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں مطلق تامل نہ کیا۔ اس کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا قول خوب وضاحت کرتا ہے کہ اللہ دور اول کی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴: ۳۱) "اور اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں" تو انہوں نے اپنی ریشمی چادریں پھاڑ دیں اور ان کو اوڑھ لیا"۔ صفیہ بنت شیبہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھی تھی تو انہوں نے قریش کی عورتوں کا ذکر کیا اور ان کے فضائل بیان کیے تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ قریش کی عورتوں کو فضیلت حاصل ہے لیکن خدا کی قسم میں نے انصار کی عورتوں سے زیادہ تصدیق کرنے والی عورتیں نہیں دیکھیں اور نہ ان سے زیادہ عاقل عورتیں دیکھی ہیں۔ جب سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴: ۳۱) "اور اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچلے ڈالے رہیں"۔ تو جب ان کے مرد عورتوں کے پاس گئے اور انہوں نے ان پر یہ آیت تلاوت کی تو ایک انقلاب آگیا۔ ایک شخص اپنی بیوی، بہن اور لڑکی کے سامنے یہ تلاوت کرتا یا دوسری قریبی رشتہ دار عورت کے سامنے' تو ان عورتوں نے اپنی نقش و نگار والی ریشمی چادروں کو پھاڑا اور سر پر اوڑھ لیا۔ یہ انہوں نے ایمان اور تصدیق کے جذبے سے کیا۔ (یعنی اللہ کا جو حکم آیا انہوں نے اس پر عمل کیا)۔ اور وہ عورتیں رسول اللہؐ کے پیچھے صفوں میں یوں کھڑی نظر آتی تھیں کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔

اسلام نے اسلامی معاشرے کا ذوق ہی بدل دیا اور اس معاشرے میں لوگوں کے جمالی احساسات ہی بدل گئے۔ اب جمال اور حسن کی حیوانی ادائیں مطلوب اور مستحسن نہ رہیں بلکہ حسن و جمال کا ایک انسانی اور مہذب رنگ ڈھنگ اور معیار قائم ہو گیا جس میں عریانی معیار حسن نہ رہی۔ جہاں تک عریانی کا تعلق ہے یہ حسن و جمال کا حیوانی معیار ہے۔ انسان اس کی طرف تب مائل ہوتا ہے جب اس کے احساسات حیوانی بن جائیں۔ اگرچہ یہ عریاں جمال بہت ہی اعلیٰ درجے کا حسن

پیش کرتا ہو۔ سنجیدگی اور وقار کا جمال تو وہی پاکیزہ جمال ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس سے ذوق ترقی پاتا ہے اور وہ انسان کے لائق ہوتا ہے۔ یہ ظاہری بھی ہوتا ہے' اور تصوراتی بھی ہوتا ہے۔

آج بھی اسلام سچی مومنہ عورتوں کی تربیت اسی انداز سے کرتا ہے اگرچہ آج کا ماحول بہت ہی بدل گیا ہے۔ عمومی طور پر لوگوں کا ذوق گر گیا ہے اور اس میں حیوانی رنگ کا غلبہ ہے۔ آج کے جمالیاتی مظاہر میں عریانی اور حیوانی رنگ ڈھنگ اپنے عروج پر ہے لیکن ہماری مومنہ عورتیں آج بھی اپنے مقامات کشش اور مقامات فتنہ کو چھپاتی ہیں۔ وہ یہ جہاد ایسے ماحول میں کر رہی ہیں جہاں عریانی ہی عریانی ہے۔ عورتوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مردوں کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں اور اس طرح پکار رہی ہیں اور دعوت دے رہی ہیں جس طرح حیوان حیوان کو پکارتا ہے۔ یہ پردہ سنجیدگی اسلامی فرد اور ایک معتدل اسلامی سوسائٹی کے لیے بے حیائی سے بچاؤ کی واحد تدبیر ہے۔ لیکن جہاں فتنے اور فحاشی اور بے راہ روی کا ڈر نہ ہو وہاں اسلام کشف و ظہور' زینت کی ممانعت نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ مرد جن کا میلان بالعموم محرم عورتوں کی طرف نہیں ہوتا' ان کے سامنے اظہار زینت کی ممانعت نہیں ہے۔

آباء' ابناء' سسر' خاوند کے بیٹے' بھائی' بھتیجے' بھانجے اور مومن عورتیں ان احکام سے مستثنیٰ ہیں۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ (۲۴: ۳۱) "ان کی عورتیں" یعنی مومن عورتیں۔ رہیں غیر مومن عورتیں تو وہ مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتیں اپنے خاوندوں کے سامنے یا بھائیوں کے سامنے یا لڑکوں کے سامنے مسلمان عورتوں کی خفیہ زیب و زینت کی داستانیں سنائیں۔ صحیحین میں ہے

لا تباشر المراة المراة تنعتها لزوجها كانه يراها "کوئی عورت دوسری عورت کے سامنے ننگی نہ ہو کہ وہ اس کا بیان اپنے خاوند سے اس طرح کرے کہ گویا وہ اسے ننگا دیکھ رہا ہے"۔ لیکن مسلمان عورتیں اس سے اس لیے مستثنیٰ ہیں کہ وہ امین ہیں۔ ان کا دین اور ان کا اخلاص ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ایک مسلم عورت کی جسمانی ساخت اور زیب و زینت کا بیان اپنے خاوندوں کے سامنے کریں۔ اور اس سے وہ بھی مستثنیٰ ہیں۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ (۲۴: ۳۱) "وہ جو تمہارے مملوک غلام ہیں"۔ ان کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں دوسرا یہ کہ غلام اور لونڈیاں دونوں اس حکم میں شامل ہیں کیونکہ ایک غلام بالعموم اپنی مالکہ کی طرف شہوانی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ لیکن پہلی رائے درست ہے کیونکہ غلام بھی بہرحال انسان ہے اور سیدہ کی زیب و زینت کے مقامات دیکھ کر اس کے اندر بھی شہوانی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ وہ معاشرتی اعتبار سے ایک فرو تر مقام رکھتا ہو اور اس سے وہ زیر دست مرد بھی مستثنیٰ ہیں جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں۔ یعنی

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ (۲۴: ۳۱) "اور وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں"۔ یا وہ کسی سبب سے عورتوں کی خواہش ہی نہ رکھتے ہوں مثلاً وہ نامرد ہوں' یا احمق ہوں یا مجنوں ہوں یا اور کوئی ایسی وجہ ہو جس کی بناپر وہ عورت کو نہ چاہتے ہوں اور کسی فتنہ اور بے راہ روی کا کوئی خطرہ نہ ہو۔

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (۲۴: ۳۱) "اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں"۔ وہ بچے کہ اگر وہ عورت کو ننگا دیکھ لیں تو اس کے اندر جسمانی خواہش پیدا نہ ہو۔ اگر ان کے اندر جنسی شعور پیدا ہو گیا ہو' اگرچہ وہ بالغ نہ ہوئے ہوں تو ان سے پردہ ضروری ہے اور وہ اس استثناء میں داخل نہیں ہیں۔

یہ سب خاوندوں کے علاوہ ہیں۔ ان کے لیے یہ اجازت ہے کہ یہ اگر عورت کے ناف کے نیچے اور گھٹنے کے اوپر کے حصے' کے ماسوا کسی جگہ کو دیکھ لیں' جب کہ ان لوگوں سے ایسا کوئی ڈر نہ ہو کہ یہ کسی فتنے میں مبتلا ہوں گے۔ رہا خاوند تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی کے جسم کا ہر حصہ دیکھ سکے۔

پردہ کے ان احکام سے مراد اور مقصود یہ تھا کہ کوئی بے راہ روی اور فحاشی میں مبتلا نہ ہو۔ اس لیے اب یہاں ایسی حرکات کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جس سے کوئی فتنے میں پڑ سکتا ہے' جن کی وجہ سے شہوت کا ہیجان پیدا ہو سکتا ہے اور جن کی وجہ سے خفیہ جذبات بھڑک سکتے ہیں اگرچہ عملاً وہ عورتیں پردے میں ہوں۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۲۴: ۳۱) "اور وہ اپنے پاؤں کو زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ اپنی زینت جو انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے"۔ یہ آیت نفس انسانی کی تشکیل' اس کے تاثر اور انفعال اور جنسی معاملات میں اس کے ردعمل کی گہرائی تک اتر جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سوچ اور تصور بعض اوقات ایک منظر کے دیکھنے سے بھی زیادہ متاثر کر دیتی ہے۔ کئی لوگ ایسے حساس ہوتے ہیں کہ عورت کے جسم کو دیکھنے کے مقابلے میں اس کے جوتوں' اس کے کپڑوں اور اس کے زیورات کو دیکھ کر ہی متاثر ہوتے ہیں۔ نیز بعض افراد کو عورت کا خیال زیادہ متاثر کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ان کے سامنے ہو۔ امراض نفسی کے علماء کے ہاں ان امور کے بارے میں بڑی ہی معلومات ہیں۔ اس طرح دور سے گھنگروؤں کی آواز اور عطر کی خوشبو بھی انسانی حواس کے اندر ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور ان کے اعصاب پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اثرات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ انسان کا اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ قرآن کریم ان تمام تاثرات کے راستے بند کرتا ہے کیونکہ قرآن کا نازل کرنے والا وہی ہے جو انسان کا خالق ہے۔ وہی ہے جو اپنی مخلوقات کے بارے میں سب سے اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ نہایت ہی گہرائی کے ساتھ خبردار ہے۔

اور آخر کار تمام نیکیوں کا سرچشمہ آتا ہے' کہ لوگوں کا تعلق باللہ مضبوط ہونا چاہئے اور توبہ و استغفار کا دروازہ بھی ان کے لیے کھلا چھوڑا جاتا ہے۔ یعنی وہ گناہ اللہ معاف کر دے گا جو نزول قرآن سے قبل تم لوگوں سے صادر ہوتے رہے ہیں۔

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲۴: ۳۱) "اے مومنو' تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو' توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔ چنانچہ اس فقرے کے ذریعے اللہ کی نگرانی کا احساس دلایا جاتا ہے اور اللہ کی عظمت' اس کی مہربانی کی اہمیت بتائی جاتی ہے کیونکہ شیطان کی اس کشمکش کے مقابلے میں وہی مددگار ہے اور اس کا خوف اور اس کی نگرانی کا شعور ہی انسان کو ان خرابیوں سے بچا سکتا ہے۔

یہاں تک اس مسئلے کا انسدادی علاج کیا گیا تھا لیکن انسان کی جنسی خواہش درحقیقت ایک حقیقی خواہش ہے جو

انسان کے اندر رکھی گئی ہے۔اس لیے جنسی تشنگی کے حقیقی علاج یعنی مثبت علاج کی بھی ضرورت ہے۔یہ مثبت علاج یوں ہو گا کہ معاشرے میں شادی کو آسان کر دیا جائے اور اس معاملے میں معاونت کی جائے اور شادی اور جائز تعلق کے مقابلے میں تمام دوسرے ذرائع اور تعلقات کے معاملے میں سختی کی جائے۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ۚ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں' ان کے نکاح کر دو۔اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا' اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں' یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔

اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے"۔

جنسی میلان کی تسکین کا بہترین طریقہ شادی ہے۔اس گہری خواہش کے اندر فطرت اور قدرت کا یہ راز ہے کہ لوگ نسل انسانی کے تسلسل کے مشکل کام کو خوشی خوشی سرانجام دیں۔لہذا ہمیں چاہئے کہ ہم شادی کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹیں دور کر دیں تاکہ زندگی فطری انداز کے مطابق سادگی سے چلتی رہے۔کسی خاندان کی تشکیل کے لیے پہلی رکاوٹ مالی رکاوٹ ہے اس طرح لوگ محفوظ اور قلعہ بند نہیں ہو سکتے۔اسلام چونکہ ایک مکمل نظام زندگی ہے اس لیے وہ عفت اور پاکیزگی کو تب ہی لازم کرتا ہے جب اس کے لیے اسباب بھی فراہم کر دے اور سوسائٹی کے تمام افراد کو فراہم کر دے تاکہ جو لوگ معتدل اور فطری راستے سے انحراف کرتے ہیں وہ اس کے لیے مجبور نہ ہوں بلکہ ان کے سامنے

جنسی تسکین کا صحیح راستہ موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام حکم دیتا ہے کہ ایسے نوجوانوں کے لیے شادی کی راہ ہموار کی جائے جو شادی شدہ نہ ہوں۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴ : ۳۲) ”تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں' ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا' اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے“۔ اور ایامیٰ وہ لوگ ہیں جن کا جوڑ نہ ہو یعنی عورت کا خاوند نہ ہو اور مرد کی بیوی نہ ہو' وہ مجرد ہوں۔ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو آزاد ہیں۔ اس کے بعد غلاموں کا ذکر خصوصیت سے کر دیا گیا ہے۔

وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ (۲۴ : ۳۲) ”اور تمہارے لونڈی اور غلاموں میں سے جو صالح ہوں“۔ لیکن یہ لوگ ایسے ہیں جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہوتی۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ (۲۴ : ۳۲) ”یہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا“۔ یہ حکم اسلامی سوسائٹی کے لیے ہے کہ وہ شادی کا انتظام کر دے اور جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ مستحب امر ہے۔ کیونکہ حضورؐ کے دور میں ایسے مجرد لوگ تھے جنہوں نے شادی نہ کی تھی۔ اگر یہ حکم فرض ہوتا تو حضور اکرمؐ ضرور ان کی شادی کا انتظام فرماتے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ حکم واجبی ہے' اس معنی میں نہیں کہ کسی مجرد کو شادی پر مجبور کیا جائے بلکہ اس معنی میں کہ اسلامی سوسائٹی کے لیے واجب ہے کہ جو لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس معاملے میں اعانت کی جائے تاکہ وہ شادی کے قلعے میں محفوظ ہو سکیں۔ فحاشی اور بدکاری میں مبتلا ہونے سے یہ عملی بچاؤ ہے اور صرف اس صورت میں معاشرے کو بدعملیوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر معاشرے کو بدعملی سے بچانا فرض ہے تو اس فرض کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرنا بھی فرض ہو گا۔

اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اسلام چونکہ ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی ہے اس لیے وہ ایک ایسا اقتصادی نظام زندگی وضع کرتا ہے کہ اس میں ہر شخص کے لیے معاشی جدوجہد کرنے کے مساوی مواقع موجود ہوں تاکہ کسی شخص کو اپنی ضرورت کے لیے بیت المال کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ بعض استثنائی حالات میں بیت المال کو بھی امداد کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ اسلامی اقتصادی نظام میں بنیادی اصول تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کسب سے کھائے۔ سوسائٹی پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب کے لیے کام کے مواقع فراہم کرے۔ رہی یہ بات کہ لوگوں کو بیت المال سے امداد دی جائے تو یہ محض استثنائی صورتوں میں ہوتا ہے۔

اگر لوگ اسلامی نظام کے مطابق سعی کرتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اور پھر بھی ایسے حالات آجائیں کہ اسلامی معاشرے میں محض معاشی مجبوری کی وجہ سے مجرد نوجوان' مرد اور عورتیں پائی جاتی ہوں تو پھر اسلامی سوسائٹی اور اسلامی

حکومت پر فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو مالی امداد دے۔ یہی حکم غلام مردوں اور لونڈیوں کا بھی ہے کہ ان کے مالکان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی شادی کا انتظام کریں اگر وہ ایسا کر سکتے ہوں۔

اسلامی سوسائٹی کا یہ بھی فرض ہے کہ دیکھے کہ اگر لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں' مرد ہوں یا عورتیں ہوں لیکن ان کی راہ میں غربت رکاوٹ بنی ہوئی ہے تو سوسائٹی ان رکاوٹوں کو دور کرے کیونکہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ ان کو غنی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ عفت کا طریقہ اختیار کریں۔

انْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِه (۲۴ : ۳۲) "اگر وہ غریب ہیں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ پر ان کا حق ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے۔ مجاہد فی سبیل اللہ کی اللہ مدد کرتا ہے۔ وہ غلام جو اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے مالی ادائیگی کا معاہدہ کرتا ہے اور وہ شادی کرنے والا جو اپنے آپ کو بری راہوں سے بچانے والا ہو"۔ (ترمذی و نسائی)

اور جب تک مجرد لوگوں کے حالات درست نہیں ہوتے اور اسلامی سوسائٹی ان کے لیے کوئی انتظام نہیں کرتی' اللہ ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ عفت اور پاکیزگی کا دامن تھامے رکھیں۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰي يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِه (۲۴ : ۳۳)
"اور جو لوگ نکاح کا موقعہ نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے"۔ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص پر تنگی نہیں کرتا کیونکہ اللہ تو وسیع علم رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ "اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے"۔ یوں اسلام اس مسئلے کا نہایت ہی عملی حل تلاش کرتا ہے۔ ہر شخص جو شادی کر سکتا ہے اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ شادی کرے۔ اگرچہ وہ مالی لحاظ سے کمزور ہو کیونکہ مالی مسئلہ حل کرنے والا اللہ ہے"۔

اس وقت اسلامی نظام میں مجبوراً غلامی کا ادارہ موجود تھا اور غلاموں کے اندر چونکہ اخلاقی قدریں کمزور ہوتی ہیں اس لیے اسلامی معاشرے کے اندر موجود غلام معاشرے کے اندر اعلیٰ اخلاقی معیار کے قیام میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ غلامی کا ادارہ اسلام نے ابتداء میں اس لیے قائم رکھا ہوا تھا کہ اہل کفر کے ہاں غلام موجود تھے اور جو مسلمان ان کے ہاتھ آجاتے تھے وہ بھی غلام بنا لیے جاتے تھے۔ موجودہ پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام نے جنسی مسئلہ کو حل کرنے کی سعی کی یعنی یہ کہ غلاموں کی شادیاں کی جائیں۔ خود غلامی کو اپنے طور پر ختم کرنے کے لیے مکاتبت کا طریقہ نکالا یوں کہ اگر کوئی غلام مالی معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے تو مالک پر اسے قبول کرنا لازم ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا (۲۴ : ۳۳) "اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں' ان سے مکاتبت کر لو' اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے"۔ اس کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ آیا یہ واجب ہے یا نہیں۔

یعنی اگر غلام پیشکش کرے تو مکاتبت کرنا لازم ہے یا مالک کے اختیار میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واجب ہے کیونکہ وجوب کا قول ہی اسلام کی مجموعی پالیسی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اسلام انسان کو ایک مکرم مخلوق سمجھتا ہے اور غلامی کا وجود شرافت انسانی کے خلاف ہے۔ معاہدہ کرنے کے بعد غلام جو کمائے گا وہ مالک کا ہو گا تاکہ معاوضہ معاہدہ کی رقم کی ادائیگی ہو سکے اور اسی طرح زکوٰۃ کی مد سے بھی ایسے غلام کی امداد ضروری ہو جاتی ہے تاکہ جلد از جلد یہ غلام آزادی حاصل کر سکے۔

وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (۲۴ : ۳۳) "اور اس کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے"۔ اس شرط پر کہ مالک یہ سمجھے کہ اس میں بھلائی ہے۔ خیر سب سے پہلے اسلام ہے۔ اس کے بعد خیر یہ ہے کہ غلام کمانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ آزادی کے بعد وہ لوگوں سے بھیک مانگتا پھرے۔ بعض اوقات وہ اخلاق سے گرے ہوئے ذرائع معیشت بھی اختیار کر سکتا ہے جن سے وہ صرف اس قدر کما سکتا ہو جس سے اس کی زندگی قائم رہ سکے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل اور ہم آہنگ نظام ہے اس لیے وہ حقیقی صورت حال کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ یہ شعور ہو جائے کہ ایک غلام آزاد ہو گیا۔ محض عنوان اور نام اسلام میں اہمیت نہیں رکھتا۔ اسلام حقیقت قضیہ کو دیکھتا ہے کہ آیا فی الواقع یہ غلام آزادی کے بعد معاشرے کے اندر کوئی تعمیری کردار ادا کر سکے گا یا نہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب یہ شخص کچھ کما سکے۔ لوگوں پر بوجھ نہ بن جائے اور نہ گندے وسائل رزق اختیار کرے۔ وہ ایسی چیزیں فروخت کرنا شروع کر دے جو آزادی سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ (مثلاً عصمت فروشی) جبکہ اسے آزاد اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس سے معاشرہ پاک ہو نہ یہ کہ اس کے ذریعہ معاشرہ گندہ ہو اور اس کا یہ فعل معاشرے کے لیے زیادہ سخت مصیبت ہو۔ (دور جدید میں بین الاقوامی معاہدات کی وجہ سے چونکہ غلامی ختم ہو گئی ہے اس لیے اب عملاً اسلام میں بھی غلامی نہیں رہے گی)۔

اسلامی معاشرے میں غلامی سے بھی خطرناک بیماری اس بات کو سمجھا جاتا ہے کہ غلاموں کو عصمت فروشی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اہل جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جس کی کوئی لونڈی ہوتی وہ اسے یہ پیشہ کرنے دیتا اور اس پر ٹیکس عائد کر دیتا اور یہ پیشہ آج تک دنیا میں رائج ہے۔ اسلام نے چونکہ اسلامی سوسائٹی کو ہر قسم کے زنا سے پاک کرنے کا حکم دیا تھا اس لیے اس قسم کے زنا کا ذکر قرآن نے خصوصیت کے ساتھ کیا۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۴ : ۳۳) "اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاکدامن رہنا چاہتی ہوں۔ اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے"۔ اس آیت کے ذریعے ان لوگوں کو منع کر دیا گیا جو اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتے تھے اور ان کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ اس قسم کے خبیث ذریعوں سے دنیا کی دولت جمع نہ کریں۔ جن لونڈیوں کو اس طرح مجبور کر دیا گیا ہو ان کے ساتھ وعدہ کیا کہ ان کے گناہ بخش دیے جائیں گے کیونکہ اس صورت میں

وہ مجبور تھیں۔ سدی کہتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی ابن السلول کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ منافقین کا رئیس تھا۔ اس کی ایک لونڈی تھی جس کا نام "معاذہ" تھا۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ اس کا کوئی مہمان آتا تو یہ اس لونڈی کو اس کے پاس بھیج دیتا' جس میں اس کے دو مطلب ہوتے۔ ایک یہ کہ وہ شخص کوئی انعام دے اور دوسرا یہ کہ اس طرح وہ مہمان کا اکرام کرتا تھا۔ یہ لونڈی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور اس نے اس بات کی شکایت کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس لونڈی کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے اپنی قوم کو پکارا کہ کون ہے جو ہمیں محمدؐ سے چھڑائے۔ اب اس نے ہماری مملوکات پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ اقدام کہ لونڈیوں کو بدکاری کے لیے استعمال نہ کیا جائے اسلامی نظام کے ان اقدامات میں سے ایک ہے' جن کے ذریعے اسلامی معاشرے کو بدکاری سے پاک کیا گیا تھا اور جنسی تسکین کے تمام غیر فطری اور گندے راستوں کو بند کر دیا گیا تھا اس لیے کہ بدکاری کا پیشہ اگر موجود ہو تو کئی لوگ اس کی سہولت کی وجہ سے اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو گا تو لوگ پھر شادی کر کے پاک زندگی گزارنا چاہیں گے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس پیشے کی موجودگی شرفاء کے گھروں میں امن و امان کی ضمانت ہے۔ کیونکہ اگر نکاح مشکل ہو جائے تو پھر انسان اس گندے راہ ہی سے اپنی فطری ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اگر یہ راستہ جائز نہ رکھا جائے تو پھر بھیڑیئے شریف لوگوں کی عزت سے کھیلنے لگیں گے۔

جو لوگ اس لائن پر سوچتے ہیں وہ دراصل سبب اور مسبب کے تعلق کو الٹ رہے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ لوگوں کے جنسی میلانات کو پاک رکھا جائے اور انہیں اس طرح منظم کیا جائے کہ وہ سلسلہ حیات کے تسلسل کا سبب بنیں۔ یہ فریضہ ہر سوسائٹی کا ہو کہ وہ اپنے اندر ایسا معاشی نظام جاری کرے جس کے ذریعہ سے ہر شخص اس قابل ہو کہ وہ شادی کے بندھن میں باندھا جا سکے۔ اگر پھر بھی کسی کے لیے نکاح میں مشکلات ہوں تو ایسے واقعات کا خصوصی علاج کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی اس گندے پیشے پر مجبور نہ ہو گا اور صورت حال یہ نہ ہو گی کہ ہر جگہ گندگی پائی جائے' گلی گندگی کا ایک ڈھیر ہو اور اس پر سے جو کوئی گزرے وہاں گندگی ڈال دے اور سوسائٹی اسے دیکھ رہی ہو۔

کسی ملک کا اقتصادی نظام ہی ایسی گندگیوں کو ختم کر سکتا ہے اس طرح کہ ایسی گندگی کسی جگہ جمع نہ ہو۔ یہ صورت نہ ہو کہ محض اقتصادی وجوہات سے اس گندگی کے لیے جواز فراہم ہو۔ انسانوں کے لیے غلاظت کے ڈھیر فراہم ہوں۔

یہ ہے وہ پالیسی جو اسلام معاشرے کی تطہیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے کسی بھی معاشرے میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ زمین آسمان میں بدل جاتی ہے اور تمام انسانوں کی نظر بلند مقاصد کے لیے بلند افق پر ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں اور اس سے ان کے آفاق روشن ہوتے ہیں۔

اس سبق پر اب یہ آخری تبصرہ آتا ہے جو اس کے موضوع کے ساتھ خوب متناسب ہے۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع ۸ ۴ ۱۰

"ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمہارے پاس بھیج دی ہیں 'اور ان قوموں کی عبرتناک مثالیں بھی ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں"۔

یہ آیات ایسی ہیں جو بات کو کھول کھول کر بتاتی ہیں ۔ان کے اندر کوئی پیچیدگی اور مشکل نہیں ہے کہ ان کو سمجھا نہ جا سکے ۔یا ان کے اندر جو مستحکم نظام زندگی تجویز ہوا ہے وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے ۔یہ نظام ایسا ہے کہ اس کی صحت پر گزری ہوئی اقوام کے تجربات بھی شہادت دیتے ہیں اور قرآن کریم نے ایسی اقوام کی تاریخ بیان بھی کی ہے ۔پھر دنیا میں ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ ایک اعلیٰ ترقی یافتہ اور پاک و صاف سوسائٹی قائم ہو جو خدا خوفی پر مبنی ہو ۔اسلام ایسا ہی نظام زندگی ہے ۔

اس پورے سبق میں جو فیصلے اور جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ اس تعقیب اور تبصرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں کے اندر خدا کا خوف اور خدا سے تعلق پیدا کیا جائے ۔

---000---

درس نمبر ۱۵۴ ایک نظر میں

اس سورہ کے دونوں سابق اسباق میں انسان کی ان مادی خواہشات کا علاج کیا گیا تھا جو انسانی شخصیت کی طبیعی خواہشات ہیں اور انسانی شخصیت پر ان کی گہری گرفت ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ان خواہشات کو پاک و صاف کیا جائے اور ان کو نورانی افق تک بلند کیا جائے۔ گوشت و پوست کی شہوتوں' آنکھوں اور شرمگاہوں کی خواہشات۔ ان باتوں کی تشہیر اور تنقید۔ اس سلسلے میں پیدا ہونے والے غضب' اشتعال اور دشمنی کے مسائل کو حل کیا گیا تھا اور ہدایات دی گئی تھیں۔

یہ حکم دیا گیا تھا کہ اسلامی معاشرے میں فحاشی کے پھیلانے سے اجتناب کیا جائے۔ عملی زندگی اور انسان کے اقوال میں فحاشی کی ممانعت کی گئی۔ ان امور کے انسداد کے سلسلے میں سزاؤں میں بھی سخت تشدید کی گئی۔ حد زنا اور حد قذف کے تحت قوانین بنائے گئے۔ پھر بے خبر اور پاکدامن شادی شدہ عورتوں پر الزام اور بہتان کا نمونہ پیش کر کے سمجھایا گیا۔ ان امور کے لیے انسدادی قوانین بھی بنائے گئے اور اخلاقی ہدایات بھی دی گیں۔ غض بصر اور استیذان کے قواعد نافذ کیے گئے۔ تمام ایسے امور سے منع کیا گیا جن سے فتنے میں پڑنے کے امکانات ہو سکتے تھے یا شہوت کے اندر ہیجان پیدا ہونے کا امکان تھا۔ پھر شادی کرنے کی ترغیب' جسم فروشی کی ممانعت' غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب یہ سب امور اس بات سے تعلق رکھتے ہیں کہ گوشت اور خون کے ہیجانات کو فرو کیا جائے اور لوگوں کے اندر پاکیزگی کا شعور' ضبط نفس اور صفائی اور نورانیت اور روحانیت کی طرف بڑھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

افک کے واقعہ کے بعد سوسائٹی کے اندر غیظ و غضب' دشمنی اور کدورت کے جو آثار رہ گئے تھے ان سب کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور نفوس مومنین کے اندر جو قلق اور بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور جس کی وجہ سے اعلیٰ انسانی پیمانے متزلزل ہو گئے تھے ان کا علاج کیا گیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح اطمینان ہو گیا اور ان کی بے چینی دور ہو گئی۔ حضرت عائشہؓ نہ صرف راضی اور مطمئن ہو گئی بلکہ خوش ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ بھی مطمئن اور پر سکون ہو گئے۔ صفوان ابن معطل ایک عظیم بوجھ کے نیچے سے نکل آئے۔ تمام اہل اسلام کے شبہات دور ہو گئے اور جن لوگوں نے اس واقعہ میں غلط باتیں کی تھیں انہوں نے رجوع کر کے توبہ کر لی۔ سب لوگوں کے شبہات دور ہو گئے اور اللہ کے فضل و کرم اور ہدایت و رحمت کی بارش سب پر ہو گئی۔ اس تعلیم و تہذیب اور اس ہدایت و رہنمائی کے ذریعے نفس انسانی کو پاک و صاف کر کے منور کر دیا گیا۔ اب اس کی نظریں اس نئی روشنی کی سمت میں بلند افق پر لگ گئیں اور زمین و آسمان میں ہر سو اہل ایمان کو نور ربی نظر آنے لگا۔ اللہ نے اہل اسلام کو یہ استعداد دی کہ وہ آفاق کائنات میں سے اس نورانیت کو اخذ کر سکیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۴ : ۳۵) "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔ یہ عجیب آیت مسلسل روشنی بکھیر رہی ہے۔ یہ اپنی خوشگوار روشنی سے پوری کائنات کو روشن کر رہی ہے۔ انسان کے اعضاء اور

جوارح اور انسان کی سوچ اور شعور اور انسان کا دل اور اس کا اندرون' روشن روشن ہوتے ہیں یہاں تک کہ یہ پوری کائنات پرنور اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ انسان کی نظریں اور اس کے نظریات اس نور سے منور ہوتے ہیں۔ تمام پردے سرک جاتے ہیں' دل دھڑکتے ہیں اور روح پھڑپھڑاتی ہے۔ ہرچیز نور کے سمندر میں تیرتی نظر آتی ہے اور ہرچیز نور کے فیض میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہرچیز سے اس کی کثافت دور ہو جاتی ہے اور وہ ہلکی ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ انسان آزاد ہو جاتا ہے اور اڑتا ہے۔ وہ اللہ کی معرفت اور ملاقات میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ عالم بالا سے امتزاج اور الفت رکھتا ہے اور خوشی اور سرور میں ڈوب جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ پوری کائنات کل کی کل نور مطلق ہے۔ اس ہمہ گیر نور کے لیے کوئی حدود قیود نہیں ہیں۔ آسمان' زندہ مخلوق اور جمادات سب کے سب باہم ایک ہو جاتے ہیں۔ قرب اور بعد کی مسافتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ نشیب و فراز مٹ جاتے ہیں' ظاہر و باطن کے فرق مٹ جاتے ہیں اور حواس اور عقل ایک ہو جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (٢٤: ٣٥) "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔ اس نور ہی سے اس کائنات کا قوام اور نظام ہے۔ کائنات کا جو ہر وجود اسی نور سے ہے۔ یہی نور اس کائنات میں اس اٹل ناموس کی تخلیق کرنے والا ہے۔ انسانوں نے تو اس عظیم حقیقت نورانی کے ایک محدود حصہ کا ادراک حال ہی میں کیا ہے۔ انسان نے جب ماضی قریب میں اس چیز کو توڑا جسے وہ مادہ کہتے تھے تو اس توڑ پھوڑ کی وجہ سے یہ مادہ ناقابل کنٹرول نوری شعاعوں کی شکل اختیار کر گیا اور یہ شعاعیں کیا تھیں نور ہی نور' ان شعاعوں کا مادہ اور قوام ہی نور نکلا۔ ایک ذرہ یعنی مادے کا آخری یونٹ ذرہ کیا ہے؟ یہ کہرباء اور الیکٹرون ہیں جو ایٹم کے ٹوٹنے کے وقت محض روشنی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ رہا انسانی دل تو وہ سائنس دانوں کے ان انکشافات سے بہت پہلے' صدیوں پہلے یہ جانتا تھا کہ جب اس قلب کو دنیاوی کثافتوں سے پاک کر دیا جائے اور وہ شفاف ہو جائے اور اس کائنات کے نورانی آفاق میں داخل ہو جائے تو وہ نور کو پالیتا ہے۔ قلب محمدؐ نے بھی اس کائناتی نور کو پا لیا تھا۔ اس وقت پالیا تھا جب آپؐ طائف سے نامراد لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے اپنے ہاتھ جھٹک کر اس نور کے ہاں پناہ لی اور کہا اعوذ بنور وجهك الذي اشرقت به الظلمت وصلح عليه امر الدنيا والاخرة "میں تیرے چہرے کے نور میں پناہ مانگتا ہوں جس کی وجہ سے تمام ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں اور جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کی اصلاح ہو جاتی ہے"۔ اور اسی نور سے آپ شب معراج کے سفر میں بھی فیض یاب ہوئے۔ جب حضرت عائشہؓ نے پوچھا۔ هل رأيت ربك "کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے"۔ تو آپ نے فرمایا۔ نور اني اراه "وہ نور ہے میں اسے کس طرح دیکھ سکتا ہوں"۔ لیکن انسانی شخصیت ہمیشہ اس نور کے پانے کی طاقت نہیں رکھتی اور وہ ہر وقت اس کائنات کے آفاق میں اس نور تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس آیت میں قرآن نے انسانی ذہنوں کے قریب لانے کے لیے اس نور کا بیان یوں کیا ہے کہ وہ انسانی قلب و نظر اور محدود انسانی مشاہدے کے قریب ہو جائے اور انسان اس نور قریب کو محسوس کرے۔

---0-0-0---

درس نمبر ۱۵۴ تشریح آیات

۳۵ --- تا --- ۴۵

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ

”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو' چراغ ایک فانوس میں ہو' فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا' اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو۔ چاہے آگ اس کو نہ لگے' (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جو انسان کے محدود ادراک کے لیے ایک غیر محدود ذات کے تصور کو قریب کرتی ہے اور ایک نہایت ہی چھوٹے نور کی مثال کو پیش کیا جاتا ہے جس کو انسانی تصور سمجھ سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اصل نور کا ادراک انسانی تصور کے لیے ممکن نہیں۔ نور کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کی جاتی ہے جبکہ انسانی ادراک نور کے ان آفاق کا احاطہ نہیں کر سکتا جو اس کی حدود سے وراء ہیں۔

اس پوری کائنات کی وسعتوں سے ہم اب ایک طاق کی طرف آتے ہیں' جو ایک دیوار میں ہے جہاں چراغ رکھا جاتا ہے' اس طرح اس کی روشنی پورے کمرے کو روشن کرتی ہے۔ چراغ طاق میں' چراغ ایک فانوس میں' یہ شیشہ اس چراغ کو ہوا سے بچاتا ہے' اس طرح اس کا نور صاف ہو جاتا ہے اور نورانیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ فانوس ایسا ہے جس طرح چمکتا ہوا تارہ ہوتا ہے۔ یہ فانوس بذات خود بھی صاف و شفاف و چمکدار پارے کی طرح ہے۔ یہاں مثال اور حقیقت کے درمیان ربط قائم ہوتا ہے۔ اصل اور نمونے کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ تصور کو ایک چھوٹے سے فانوس سے ایک بڑے ستارے کی طرف لے جاتا ہے تاکہ انسانی سوچ کہیں اس چھوٹے سے نمونے تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس چھوٹے سے چراغ کی مثال تو اس حقیقت کی طرف اشارے کے لیے اختیار کی گئی ہے' کَوْكَبٌ دُرِّیٌّ کی طرف

اشارہ کر کے اب بیان پھر اسی چھوٹی سی مثال کی تشریح کی طرف آتا ہے۔

يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ (۲۴: ۳۵) "اور یہ چراغ زیتون کے ایک مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے"۔ اس دور تک زیتون کے تیل کی روشنی تمام روشنیوں سے صاف ترین روشن تھی۔ لیکن یہ مثال صرف اس لیے نہیں دی گئی کہ زیتون کے تیل کی روشنی سب سے زیادہ صاف ہوتی ہے۔ بلکہ زیتون کے درخت کو جو اپنا تقدس حاصل ہے اس کی طرف اشارہ مطلوب ہے کہ یہ درخت وادی مقدس طوی میں پیدا ہوتا ہے۔ عربوں کے اندر جو زیتون آتا تھا وہ طور کی وادی مقدس سے آتا تھا۔ قرآن مجید میں اس درخت کی طرف اشارہ موجود ہے۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ "اور وہ درخت جو طور سینا پر پیدا ہوتا ہے' جو تیل پیدا کرتا ہے جو کھانے والوں کے لیے اچھا سالن ہے"۔ یہ نہایت ہی طویل العمر درخت ہوتا ہے اور اس درخت کے تمام حصے انسانوں کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ اس کا تیل' اس کی لکڑیاں' اور اس کے پتے اور اس کے پھل سب کے سب مفید ہیں۔ اب بیان پھر اس چھوٹی سی مثال سے ذرا بلند ہوتا ہے اور اصل کی طرف ذہن کو موڑا جاتا ہے۔ یہ کوئی مخصوص درخت نہیں ہے۔ "نہ شرقی ہے اور نہ غربی ہے"۔ اور نہ یہ محدود اور مشخص تیل ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا کوئی اور ہی تیل ہے۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (۲۴: ۳۵) "اس کا تیل خود بخود بھڑک اٹھتا ہے' اگرچہ اس کو آگ نہ لگائی گئی ہو"۔ یعنی اس کے اندر نورانیت کوٹ کوٹ بھری ہوئی ہے۔ نور علیٰ نور ہے۔ لفظ نور علیٰ نور سے ہم ذات باری کے اعلیٰ نورانیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یہ وہ خدائی نور ہے جس سے اس پوری کائنات کی ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ نور ہے جس کی حقیقت تک انسانی دماغ نہیں پہنچ سکتا۔ بس یہ ایک کوشش ہے کہ دل اس کے ساتھ متعلق ہوں اور اس کے ادراک کے لیے سعی کریں اور اس کے دیکھنے کی امید رکھیں۔

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝

"اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے' رہنمائی فرماتا ہے' وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے' وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے"۔

اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف راہنمائی فرماتا ہے لیکن صرف اس شخص کو جو اپنے دل و دماغ کو اس نور کو قبول کرنے کے لیے کھولتا ہے۔ یہ نور تو زمین و آسمان میں عام ہے۔ زمین و آسمان میں اس کے فیوض و برکات موجود ہیں۔ اور ہر

وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ نور کبھی ختم نہیں ہوتا' مدھم نہیں پڑتا اور بند نہیں ہوتا۔ انسان جب بھی اس کی طرف متوجہ ہو' اسے دیکھتا ہے اور بے راہ شخص جب بھی اس کی طرف رخ کرے وہ اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور جب بھی کوئی اس نور سے رابطہ قائم کرے وہ اسے ہدایت دیتا ہے۔

اللہ کے نور کی اس آیت میں جو مثال دی گئی ہے یہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہے۔ "وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے"۔ اس لیے کہ وہ علیم ہے اور انسانی قوت مدرکہ کی حدود کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ان مثالوں میں جو نور سمجھایا گیا ہے وہ مطلق نور ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں عام ہے۔ آسمانوں اور زمین پر اس کا فیضان ہے اور یہ نور ان گھروں میں روشن اور چمکتا ہوا نظر آتا ہے جن میں لوگوں کے دل اللہ کے ساتھ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن میں اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور جن گھروں کے باشندے اللہ والے ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں دنیا کی ہر چیز سے اس نور سماوات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ۙ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

"اس کے نور کی طرف (ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا' اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی' (اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے' اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے"۔

یہاں اللہ کے نور کی تمثیل اور ان گھروں کی تمثیل میں ایک خاص تعلق ہے اور یہ قرآن کریم کے انداز بیان کا فنی کمال ہے۔ طاق کے اندر چراغ روشن ہے اور گھروں کے اندر دل مومن روشن ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان مشاکلت ہے۔

یہ گھر ایسے ہیں کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کی دیواروں کو بلند کیا جائے اور ان کی تعمیر کی جائے۔ ان کو بلند کرنے کے اذن سے مراد ان کو تعمیر کرنے کا حکم دینا ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کریں۔ چنانچہ یہ گھر قائم کر دیئے گئے ہیں' بلند ہیں اور پاک اور ستھرے ہیں۔ ان کا منظر اس کائنات کے منظر سے مشابہ ہے جہاں نور ربی پھیلا ہوا ہے۔ ان گھروں کی بلندی

اس لیے ہے کہ یہاں اللہ کا نام لیا جائے۔

وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (۲۴: ۳۶) "اس میں اللہ کا نام یاد لیا جائے"۔ اور یہ پاک دل اللہ کے ساتھ وابستہ ہوں' اللہ کی تسبیح کرتے ہوں۔ اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ نماز بھی پڑھنے والے ہوں۔ اللہ کی راہ میں دینے والے بھی ہوں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (۲۴: ۳۷) "ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت صلوٰۃ سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر دیتی"۔ تجارت اور خرید و فروخت کمانے اور دولت جمع کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کاموں میں مشغول رہنے کے باوجود اللہ کے حقوق یعنی نماز اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی یعنی زکوٰۃ سے غافل نہیں ہوتے۔

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ (۲۴: ۳۷) "وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرانے کی نوبت آ جائے گی"۔ دل لٹے ہوں گے یعنی ان کے اندر خوف و ہراس کی وجہ سے کوئی قرار نہ ہو گا' اور یہ دل چونکہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں اس لیے تجارت اور خرید و فروخت انہیں اللہ کے ذکر سے روک نہیں سکتے۔

لیکن اس خوف کے ساتھ امید بھی وابستہ ہے۔ وہ مایوس نہیں ہوتے۔ وہ اللہ سے امیدیں باندھے ہوئے ہوتے ہیں۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (۲۴: ۳۸) "تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو دے اور مزید فضل سے نوازے"۔ ان کی امید ناکام بھی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ

وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۴: ۳۸) "اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے" کیونکہ اللہ کے فضل کے کوئی حدود و قیود نہیں ہیں۔

---ooo---

آسمانوں اور زمین کے اندر روشن ہونے والے اس نور کے بالمقابل' اللہ کے ان گھروں میں پائے جانے والے اس نور کے بالمقابل اہل ایمان کے دلوں میں روشن نور کے بالمقابل' یہاں قرآن مجید ظلمات اور تاریکیوں کے ایک جہان کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس جہان میں کوئی روشنی نہیں ہے۔ اس جہان میں کوئی امن و سکون نہیں ہے۔ ہر طرف خوف کے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ اس میں ہر طرف بربادی ہی بربادی ہے۔ کوئی خیر نہیں ہے۔ یہ اہل کفر کا جہان ہے اور ایک کافر کی دنیا ہے۔ اس کے خدوخال اور رنگ ڈھنگ کچھ یوں ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ۙ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ۧ

ع ۶ ۵ ۱۱

"(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا' مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا' بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا' جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا' اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی - یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا' کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے' اس پر ایک اور موج' اور اس کے اوپر بادل' تاریکی پر تاریکی مسلط ہے' آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں"۔

یہاں قرآن کریم نے اہل کفر کی زندگی اور ان کے نظریات اور سرگرمیوں کی تصویر کشی دو طرح کی ہے - یہ دو مشاہد ہیں جو بطور تمثیل دیئے گئے ہیں۔

پہلی تمثیل ہے ان کے اعمال کی - یہ اعمال ایسے نظر آتے ہیں جس طرح چٹیل وسیع ریگستان میں سراب نظر آتا ہے - یہ سراب نیلے پانی کی طرح دکھائی دیتا ہے - پیاسا اس کے پیچھے بھاگتا ہے - وہ توقع تو یہ کرتا ہے کہ سراب تک پہنچ کر پانی پیئے گا لیکن وہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ وہاں تک پہنچ کر وہ وہاں کیا پانے والا ہوتا ہے - یہاں منظر میں اچانک تبدیلی آجاتی ہے - یہ شخص جو سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے پیاسا ہے' پانی کی تلاش میں ہے - اور غافل ہے اس معاملے سے جو اسے پیش آنے والا ہے - یہ جب منزل تک پہنچتا ہے تو وہاں اسے پانی نہیں ملتا - وہاں اسے وہ چیز ملتی ہے جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا - اب یہ اس نئی حقیقت سے دوچار ہو کر خوفزدہ ہو جاتا ہے - امیدیں کٹ جاتی ہیں۔

وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ (۲۴ : ۳۹) "وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا" - وہ اللہ موجود ہے جس کا وہ منکر تھا اور یہ شخص اللہ وحدہ کا دشمن تھا - اس سراب میں اس کا منتظر اللہ تھا - اگر اس سراب میں یہ شخص اپنے کسی دنیاوی دشمن کو پائے تو پھر یہ سخت خوفزدہ ہو جائے لیکن یہ وہاں خالق کائنات کو پا رہا ہے جو جبار ہے - بڑی قوت والا ہے اور سخت انتقام لینے والا بھی ہے - وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے - پانی کے بجائے اس کا وہاں حساب و کتاب شروع ہو جاتا ہے۔

فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۴ : ۳۹) "جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب لیتے میں دیر نہیں لگتی" - یہ منظر سرعت اور شتابی کے ساتھ اچانک سرپرائز کو پیش کرتا ہے اور سرعت اور سراب کے ساتھ' جلدی سے حساب چکانا اور اچانک خوف میں مبتلا ہونا' فنی ہم آہنگی ہے۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ اس میں جھوٹی روشنی کے بعد اندھیرے چھا جاتے ہیں' یوں کہ ایک انسان سمندری جہاز میں ہے۔ یہ جہاز سمندر کی ظالم لہروں میں گھرا ہوا ہے' خوفناک موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہے' ان کے اوپر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ایسا خوفناک اندھیرا ہو گیا ہے کہ کوئی شخص اگر اپنے ہاتھ کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ دیکھ نہیں سکتا' شدت خوف اور شدت تاریکی کی وجہ سے۔

کفر کیا ہے' یہ دراصل امواج زندگی میں ایک گھمبیر اندھیرا ہے۔ یہ اندھیرا اللہ کے نور کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ یہ اس قدر گہری گمراہی ہے کہ اس میں انسان کو ہاتھ کی طرح قریبی دلائل بھی نظر نہیں آتے۔کفر اس قدر خوفناک صورت حال کا نام ہے کہ اس میں انسان کے لیے سکون و قرار نہیں ہوتا۔

وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (۲۴ : ۴۰) "جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے"۔ اللہ کا نور کیا ہے' وہ ہدایت جو اللہ دل مومن میں ڈال دیتا ہے وہ اللہ کا نور ہے۔ یہ ہدایت انسان کے دل کو کھول دیتی ہے اور انسان کی فطرت نوامیس قدرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یوں انسانی قلب میں موجود نور الٰہی اس کائنات میں موجود نور الٰہی کے ساتھ یکجا ہو جاتا ہے اور جس شخص کا اتصال اس نور کائنات سے نہ ہو سکا تو وہ اندھیروں میں ہے اسے کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہ ہمیشہ خوفناک حالات میں ہو گا جن میں کوئی امن نہ ہو گا۔ یہ شخص ایسی گمراہی میں پڑ جائے گا جس سے اس کا نکلنا مشکل ہو گا اور اس کے اعمال کا انجام سراب ہو گا اور سراب کے پیچھے بھاگنے والا ظاہر ہے کہ ہلاک ہو جائے گا۔کیونکہ کفار کے اعمال کے پیچھے کوئی نظریہ اور کوئی نور نہیں ہوتا۔ نور ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا اس لیے کوئی اصلاحی کام بغیر ایمان کے نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی ہدایت ہی نور ہے اور اللہ کا دین نور ہے۔

یہ تھے مناظر کفر و ضلالت اور مناظر تاریکی۔ اس کے بعد پھر اس کائنات میں ایمان اور نور کے مناظر آتے ہیں۔ یہاں پوری کائنات میں نور ہی کا عالم ہے۔ تمام موجودات اس نور میں تسبیح پڑھ رہی ہیں اور عالم نماز میں ہیں۔ انس ہوں' جن ہوں' زمین ہو یا افلاک ہوں۔ زندہ ہوں یا جمادات ہوں' تمام کائنات تسبیح پڑھ رہی ہے اور تمام موجودات اس زمزمے میں ہمقدم ہیں' یوں کہ ایک دانا کا وجدان اس سے ارتعاش میں آ جاتا ہے اور دل معرفت سے بھر جاتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ ۖ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۴۱﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں' وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے' اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے"۔

اس وسیع کائنات میں انسان صرف منفرد نہیں ہے۔ اس کا ایک ماحول ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ بڑا ہی وسیع ماحول ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں ہر طرف اللہ کی بندگی ہو رہی ہے۔ اس کے آگے اور پیچھے اور اوپر اور نیچے جہاں

جہاں تک نظر جاسکتی ہے۔ پھر نظر کی حدود سے آگے جہاں جہاں تک خیال جاسکتا ہے' اس وسیع کائنات میں انسان کے بھائی بند موجود ہیں۔ یہ مختلف شکلیں اور مختلف طبیعتیں رکھتے ہیں۔ لیکن ایک بات میں سب ایک ہیں۔ یہ کہ یہ سب اللہ کی مخلوقات ہیں۔ یہ سب اللہ کے مطیع فرمان ہیں اور اللہ کی حمد اور تسبیح میں رطب اللسان ہیں۔

وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ (۲۴: ۴۱) "اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے"۔ قرآن کریم کا یہ مخصوص انداز استدلال ہے کہ وہ انسان کو اپنے ماحول کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انسان کے ماحول میں ان سہولتیں میں جو اللہ کی تخلیق ہے یہ سب کی سب اللہ کی ثنا خواں ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اس کائنات کے مشاہد میں غور کرے کیونکہ انسان اپنے ماحول کو روز دیکھتا ہے۔ اور طول الفت کی وجہ سے اس کا دل و دماغ اس ماحول سے متاثر نہیں ہوتے۔ ذرا دیکھو کہ بعض پرندے اس ہوا میں اڑتے ہیں اور ان کی اڑان صفوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ اپنی اس صف بندی اور منظم پرواز میں دراصل اللہ کی حمد بیان کر رہے ہوتے ہیں اور نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسۡبِیۡحَهٗ (۲۴: ۴۱) "ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے"۔ لیکن انسان ہے کہ اس عقل و بینش کے ساتھ بھی اللہ کی تسبیح سے غافل ہے۔ حالانکہ وہ تمام مخلوقات سے زیادہ اس بات کا مکلف ہے کہ ہر وقت تسبیح اور نماز میں مصروف ہو۔

اس منظر میں پوری کائنات نہایت ہی خشوع سے سجدہ ریز نظر آتی ہے اپنے خالق کے آگے۔ تسبیح اور نماز میں کھڑی ہے۔ یہ بات تو فطرت کائنات ہے کہ وہ ایسا کرے اور اللہ کے نوامیس فطرت کی اطاعت کرتے ہوئے چلے۔ انسانی وجدان جب صاف اور شفاف ہو جاتا ہے اور جیسے وہ صبح و شام چڑیوں کو چہچہاتے سنتا ہے تو وہ یہ منظر دیکھ سکتا ہے کہ یہ کائنات پوری کی پوری حمدی خواں ہے اور انسان اپنے کانوں سے اس کائنات کی آواز اور تسبیح سن سکتا ہے۔ اگر انسان کو معرفت کردگار حاصل ہو جائے تو وہ پھر اس پوری کائنات کے ساتھ اس محفل اور مجلس صلوۃ و تسبیح میں ہم رنگ اور ہم آہنگ اور نغمہ سرا ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاؤں کے نیچے جب کنکریوں کی تسبیح سنی' اور حضرت داؤد جب زبور کے ساتھ زمزمہ سرا ہوتے تھے تو یہ پوری کائنات ان کے ساتھ روحانی نغمے گاتی تھی۔ وہ سنتے تھے اور ان کے ساتھ وحوش و طیور سب گاتے تھے۔

وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ اِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۴۲﴾

"آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔ لہٰذا اظہار افرض ہے کہ ہم اپنی تمام تر توجہات اس کی طرف کر دیں۔ اس کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے عذاب سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں ہے اور سب نے اسی کی طرف جانا ہے۔

---))) ---

اب اس کائنات کے مناظر میں سے ایک دوسرا منظر۔ لوگ رات اور دن اس منظر کو دیکھتے ہیں اور غفلت کے ساتھ

گزر جاتے ہیں' حالانکہ یہ منظر دامن نظر کو پکڑ پکڑ کر کھینچتا ہے کہ ذرا دیکھو تو سہی' دل میں سوچو تو سہی' اللہ کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات میں غور تو کرو۔ دلائل نور اور دلائل ہدایت پر غور تو کرو۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے' پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے' پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے' پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے' ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے' پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے۔ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے"۔

یہ منظر نہایت ہی آرام سے اور طوالت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ دعوت دی جاتی ہے کہ اس منظر کے ہر جزء پر غور کرو۔ اس منظر کے اجزاء پھر جمع ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس پر گہرے مشاہدے اور غور و فکر کی وجہ سے انسانی احساس کو جگایا جائے اور اس گہری صنعت کاری کے اندر جو گہری بصیرت ہے اس کے بارے میں انسانی احساس کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ انسان عبرت آموز نگاہوں سے اس منظر کو دیکھے۔

اللہ بادلوں کو چلاتے ہیں' ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف۔ یہ بادل آسمان میں ٹکڑیوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ پھر یہ جمع ہوتے ہیں۔ اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ تہوں کے اوپر تہیں جم جاتی ہیں۔ جب یہ اچھی طرح بوجھل ہو جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے تم گرتے دیکھتے ہو۔ یہ بادل بڑے بڑے پہاڑوں کی شکل میں آسمانوں میں نظر آتے ہیں۔ جب یہ بہت اوپر چلے جاتے ہیں تو ان میں برف جم جاتی ہے۔ یہ بادل پہاڑوں کی طرح خوب نظر آتے ہیں۔ جب طیارہ ان سے اوپر چلا جاتا ہے اس وقت فی الواقعہ یہ بادل پہاڑ نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اور ان کے اندر بڑے بڑے نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ انسان نے اس کو اچھی طرح اس وقت سمجھا جب وہ طیارے پر سوار ہو کر بادلوں سے اوپر چلا گیا۔

بادلوں کے یہ پہاڑ' اللہ کے احکام میں' اللہ کے نظام میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ اس کے کائناتی ناموس کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے ان کے ذریعے پانی دے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے' اس سے ان کا رخ پھیر دیتا ہے۔ اس منظر کا تکملہ یوں آتا ہے۔

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ (٢٤ : ٤٣) "اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی

ہے"۔ یہ منظر اس لیے لایا گیا ہے کہ کائنات کے نور اعظم کے ساتھ بجلی کا نور ایک ہو جائے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ ہم جنس معانی کو ایک جگہ لاتا ہے کیونکہ یہ سورہ 'سورۂ نور ہے۔

--- ooo ---

اب تیسرا کائناتی منظر گردش لیل و نہار کا منظر ہمارے سامنے ہے۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

"رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے"۔

گردش لیل و نہار کے نظام پر غور و فکر قرآن مجید کا ایک اہم موضوع ہے۔ رات اور دن کے بدلنے کا یہ نظام مسلسل چل رہا ہے اور اس کے اندر ایک لمحے کا تغیر و تبدل نہیں ہے۔ اس سے وہ ناموس' کائنات اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں متصرف ہے۔ اس ناموس پر غور و فکر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ نے کس باریکی کے ساتھ اس نظام کو چلا رہا ہے۔ قرآن کریم اپنے مؤثر انداز بیان کے ساتھ ان مناظر کے ان اثرات کو تازہ کر دیتا ہے جو بالعموم مانوس ہونے کی وجہ سے مٹ گئے ہوتے ہیں۔ انسان پھر ان مناظر کو ایک نئے احساس کے ساتھ دیکھتا ہے اور ہر بار اس سے بالکل نیا تاثر لیتا ہے۔ یہ سوچنا یوں ہے کہ اگر انسان گردش لیل و نہار کے اس نظام کو پہلی مرتبہ دیکھے تو اس کا تاثر کیا ہو۔ اس نظام میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ تبدیلی اگر ہے تو صرف انسان کی نگاہ میں ہے۔ انسانی احساس اور ادراک گردش لیل و نہار کے مناظر کو دیکھتے دیکھتے بجھ سا گیا ہے جبکہ رات اور دن کے اس نظام نے اپنی خوبصورتی اور انوکھے پن میں سے کسی چیز میں کمی نہیں کی ہے۔ جب انسان اس کائنات پر سے غافلوں کی طرح گزر جاتا ہے تو وہ زندگی کی ایک بڑی مسرت کو گنوا دیتا ہے بلکہ اس کائنات کی حقیقی خوبصورتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ مناظر جو انسان کے سامنے اگر از سر نو پیش ہوں تو بہت ہی اثر انگیز ہوں اور حسین نظر آئیں۔

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہماری بجھی ہوئی حس کو تازہ کر دیتا ہے اور ہمارے چھپے ہوئے شعور اور خوابیدہ احساسات کو تجدید بخشتا ہے۔ ہمارا ٹھنڈا دل گرم ہو جاتا ہے اور ہمارا کند وجدان تیز ہو جاتا ہے۔ پھر ہم اس کائنات کو یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ گویا ہم نے اس کائنات کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ ہم پھر اس کائنات کے مظاہر پر غور کرتے ہیں اور اس کے سربستہ اور پوشیدہ کمالات کو معلوم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ہمیں نظر آتا ہے کہ دست قدرت ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ ہمارے ماحول کی ہر چیز میں اس کی صنعت کاری ہے اور اس کائنات کی ہر چیز میں اس کے نشانات ہیں اور ہمارے لیے عبرتیں ہی عبرتیں ہیں۔

للہ ہم پر احسان کرتا رہتا ہے کہ جب بھی ہم اس کائنات کے مناظر میں سے کسی منظر پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایک حیات تازہ مل جاتی ہے۔ ہمیں اس کائنات کی ہر چیز کے بارے میں ایک نیا احساس ملتا ہے اور یوں مسرت ملتی ہے کہ گویا ہم اس منظر کو پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ گویا اس احساس کے ساتھ ہم اس کائنات کو کئی مرتبہ اور بے شمار مرتبہ دریافت کرتے ہیں اور خوشی پاتے ہیں۔ اگر حساس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ کائنات بہت ہی خوبصورت ہے اور ہماری فطرت'

فطرت کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ہماری فطرت اس سرچشمے سے پھوٹی ہوئی ہے جس سے اس کائنات نے وجود اور فطرت اور ناموس فطرت اخذ کیا ہے۔جب ہم اس کائنات کی روح کے ساتھ پیوستہ ہو جاتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب اطمینان و سکون مل جاتا ہے' نہایت ہی گہرا رابطہ اور خوشی ملتی ہے۔انس اور طمانیت ملتی ہے۔یوں جس طرح ایک شخص اپنے محبوب کو بلاواسطہ مل جاتا ہے۔

اس کائنات کی گہری معرفت کے نتیجے میں اس میں ہمیں اللہ کا نور نظر آتا ہے اور یہ ہے مفہوم اللہ کے نور سماوات والارض کا۔جب ہم اپنے وجود' اپنے نفس اور اس کائنات کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس میں اللہ کا نور نظر آتا ہے اور ہم اس وقت اصل حقیقت سے مل چکے ہوتے ہیں اور ہمیں نظر آتا ہے کہ تدبیر کائنات کی حقیقت کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ ہم اس کائنات کے روز مرہ کے مناظر کو ذرا گہرے غور و فکر کے ساتھ دیکھیں۔ہمارے احساس اور ہمارے تدبر کے لیے قرآن کریم بار بار اور مختلف قسم کے مناظر و مظاہر پیش کرتا ہے جو نہایت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔قرآن دعوت دیتا ہے کہ ان مظاہر و مناظر پر سے غافل لوگوں کی طرح نہ گزر جاؤ' آنکھیں بند کر کے کیونکہ اس دنیا میں تمہارا یہ سفر نہایت ہی بامقصد ہے۔یہاں سے کچھ لے کر جاؤ لیکن انسان ہیں کہ خالی ہاتھ جا رہے ہیں۔

---ooo---

مزید مشاہد قدرت پیش کیے جاتے ہیں اور ہمارے احساس کو مزید تیز کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک ہی اصول پر یہ زندگی قائم ہے۔اس کا ایک ہی مزاج ہے۔اس کی ایک جیسی تخلیق کے بعد پھر زندگی کے بھی کئی مشاہد اور مظاہر ہیں اور اس میں تنوع ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

"اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے' وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کو قرآن کریم نہایت ہی سادہ الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔یہ حقیقت کہ ہر زندہ مخلوق کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔یہ بتاتی ہے کہ حیات کے بنیادی عناصر ایک ہی ہیں اور یہ کہ زندگی کے قیام کا بنیادی عنصر پانی ہے۔جدید سائنس بھی اس بات کی طرف جا رہی ہے کہ زندگی کی اصل تخلیق پانی میں ہوئی۔یعنی سمندر میں۔یعنی ابتدائی حالت میں زندگی پانی میں تھی۔اس کے بعد زندگی کے اندر رنگا رنگی پیدا ہوئی۔یہ تو ہے سائنس دانوں کی سوچ۔

ہماری سوچ مختلف ہے۔ہم قرآنی حقائق کو سائنس کی خراد پر نہیں چڑھاتے۔کیونکہ سائنس کے اصول اور معیار

بدل جاتے ہیں جبکہ قرآن ناقابل تغیر اور آخری حقائق بتاتا ہے۔ ہم بس یہی کہتے ہیں کہ حیات کا اصل پانی ہے۔ اس لیے کہ قرآن یہ کہتا ہے۔ اگرچہ حیات کی شکلیں مختلف نظر آتی ہیں لیکن اس کا اصلی مادہ پانی ہی ہے۔ پانی ہی سے حیوان زمین پر چلنے لگا ہے۔

يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (٢٤: ٤٥) " اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے"۔ مختلف ہیئت اور مختلف شکل کے جانور پیدا کرتا ہے اور یہ اللہ کی مشیت ہے کہ وہ کیا پیدا کرتا ہے اور کس شکل میں پیدا کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٢٤: ٤٥) "بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ اگر ہم تمام زندہ چیزوں پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ حیات کی اصل تو ایک ہے لیکن اس ایک ہی مادے سے اللہ نے کیا کیا چیزیں ' کس کس شکل پر بنائی ہیں۔ مختلف حجم والی مختلف رنگوں والی' مختلف شکل و صورت والی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خالق اور مدبر ہے جو یہ رنگا رنگی پیدا کر رہا ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس گہرے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی کوئی چیز محض اتفاق سے بلا ارادہ اس طرح پیدا نہیں ہو گئی ہے بلکہ ایک تدبیر اور ارادے سے ایسا ہوا ہے۔ اگر تدبیر اور ارادۂ خالق کو تسلیم نہ کیا جائے تو وہ کیا اتفاق ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ پھر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر چیز کے اندر خود بخود ایک تدبیر اور تقدیر پیدا ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق بخشی اور ہر چیز کو ہدایت' وجدان اور شعور بخشا ہے کہ اس کا فرض منصبی کیا ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۱۵۵ ایک نظر میں

سابق عظیم دور اور طویل سبق نور کے موضوع پر تھا اور یہ نور اس کائنات کے مظاہر میں سے بھی تھا۔ اب کلام کا رخ پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آجاتا ہے' یعنی وہ آداب جن پر قرآن کریم اسلامی سوسائٹی کی تعمیر چاہتا ہے۔ اور جن کے مطابق مسلمانوں کے ظاہر و باطن کو پاک کرنا مطلوب ہے۔ اور اسلامی سوسائٹی کو اس نور سے منور کرنا مطلوب ہے جس نور سے یہ پوری کائنات منور ہے (گویا اسلامی نظام بھی ایک نور ہے کیونکہ اس کا نازل کرنے والا بھی ایک نور ہے)۔

جو لوگ اللہ کے نور سے منور ہوں وہ کیسے ہوتے ہیں' درس سابق میں اس کی ایک جھلک دکھائی گئی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کر سکتے اور وہ دنیاوی کاموں کی وجہ سے اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں ہوتے اور جو لوگ اس نور کائنات سے محروم تھے وہاں ان کی بھی ایک جھلک دکھائی گئی تھی کہ وہ جن دنیاوی مقاصد کے پیچھے رات اور دن بھاگ رہے ہیں وہ تو سراب ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اور ان کی زندگی اس طرح ہے جس طرح موجوں میں گھری ہوئی کشتی جس کے اوپر گہرے بادل ہوں اور کچھ نظر نہ آرہا ہو۔

اب یہاں ان منافقین کا ذکر ہے جو اللہ کی روشن نشانیوں سے کوئی سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اسلام کو ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ آداب مومنین کو نہیں اپناتے۔ مومنین تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے بروقت تیار ہوں' اور نہایت ہی اطمینان' سنجیدگی اور رضامندی سے مطیع فرمان ہوں۔ یہاں ان کے اور مومنین صادقین کے ایمان کے درمیان موازانہ کیا جاتا ہے۔ اہل ایمان کے ساتھ اللہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دی جائے گی اور ان کا اقتدار اس زمین پر مستحکم کر دیا جائے گا۔ یہ انعام ان کو اس لیے دیا جائے گا کہ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت ہی ادب اور اطاعت کا تعلق رکھتے ہیں اور اللہ اور رسول اللہؐ کا احترام کرتے ہیں۔ اللہ اور رسول اللہؐ کے ساتھ ان کا یہ تعلق اس حقیقت کے باوجود ہے کہ کافر اللہ اور رسول اللہؐ کے دشمن ہیں اور یہ کہ اہل کفر اللہ اور رسول اللہؐ کو اس کرۂ ارض پر عاجز نہیں کر سکتے۔ کفار کا تو خود اپنا انجام برا ہونے والا ہے۔

--- ooo ---

درس نمبر ۱۵۵ تشریح آیات

۴۶ --- تا --- ۵۷

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

”ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں۔ آگے صراط مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے ' دیتا ہے“۔

اللہ کی بات صاف صاف حقیقت بتلانے والی ہے۔ ان سے اللہ کا نور معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہدایت کے سرچشمے بتانے والی ہیں۔ ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ طیب کیا ہے اور خبیث کیا ہے۔ یہ آیات اسلامی نظام زندگی کو نہایت ہی مفصل طریقے سے کھول کھول کر بتاتی ہیں۔ یہ آیات زمین پر رائج کیے جانے والے احکام و قوانین کو بالکل ظاہر کر کے بتاتی ہیں کہ جب بھی لوگ اپنے فیصلے کرنا چاہیں تو احکام اور قوانین واضح ہوں۔ ان قوانین میں کسی فریق کی کوئی حق تلفی نہیں ہے۔ نہ ان میں حق و باطل کے درمیان کوئی التباس ہے۔ نہ حلال و حرام کا التباس ہے۔ ہر چیز واضح اور مفصل ہے۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۴ : ۴۶) ”اور اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دے دیتا ہے“۔ اللہ کی مشیت بے قید ہے ' اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہاں اللہ نے ہدایت کے لیے ایک ضابطہ مقرر کیا ہوا ہے جو شخص اپنے نفس کو اس طریق ہدایت کی طرف متوجہ کر دے وہ راہ ہدایت کو پا لیتا ہے لیکن ہدایت کی راہوں پر چل نکلتا ہے۔ تو وہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہدایت پا لیتا ہے اور جو شخص منہ موڑ لیتا ہے اور اس روشنی میں راہ نہیں ڈھونڈتا جو اس کائنات میں اللہ نے بکھیر رکھی ہے وہ ضلالت کے طریق پر چل نکلتا ہے۔ یہ ضلالت بھی اللہ کی مشیت کے مطابق ہی ہوتی ہے۔

اگلی آیات میں ایک ایسے فریق کا ذکر ہے جو مدینہ میں بہت ہی متحرک تھا۔ یہ فریق منافقین تھے جو بظاہر مسلمان تھے اور اسلامی طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے لیکن اندر تاریک تر تھا۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ

مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓـئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنۡ يَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَـقُّ يَاۡتُوۡۤا اِلَيۡهِ مُذۡعِنِيۡنَ ﴿۴۹﴾ اَفِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّحِيۡفَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾

الثلثة ۱۰ ع ۶ ۱۲

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت کی' مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسولؐ کی طرف' تاکہ رسولؐ ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آ جاتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں"۔

جب صحیح ایمان دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے آثار عمل کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسلام تو ایک متحرک نظریہ ہے اس کا کوئی منفی پہلو نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے کہ جب کسی انسان کے شعور میں یہ بیٹھ جائے تو یہ خود بخود حرکت پذیر ہوتا ہے اور خارج میں اس کے آثار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلام خود بخود اپنی ترجمانی اسلامی اعمال کے ذریعے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ خود اسلامی نظام زندگی کا طریق کار بھی یہی ہے کہ وہ ایک عملی نظام ہے' وہ عمل اور تحریک کے ذریعے وجود میں آتا ہے یعنی اسلام ایک شعور ہے جو اپنے آپ کو عمل اور سلوک کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ اور پھر وہ پر مستقل دستور اور قانون کی شکل اختیار کر کے تہذیب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کی زندگی اس کے شعور اول پر موقوف ہے۔ اس شعور اور ایمان کو زندہ اور متحرک رکھنا ضروری ہے۔

لیکن جس مخلوق کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ کیسی مخلوق تھی وہ کہتے تو تھے

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوۡلِ وَاَطَعۡنَا (۲۴: ۴۷) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی"۔ یہ بات وہ اپنے منہ سے کہتے تھے لیکن ان کے طرز عمل میں اس کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ چنانچہ وہ الٹے پاؤں پھر جاتے تھے جو بات وہ زبان سے کہتے تھے ان کے اعمال اس کی تکذیب کرتے تھے۔

وَمَاۤ اُولٰٓـئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ (۲۴: ۴۷) "ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں"۔ مومن تو وہ ہوتے ہیں جن کے اعمال ان کے اقوال کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایمان کوئی کھیل تو نہیں ہے کہ ایک شخص بس ایمان کا اقرار کر لے اور

اس کے بعد اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ ایمان کے بعد اس کا نفس بھی ایمانی کیفیات میں رنگ جانا چاہئے۔ اس کا دل دماغ اور سوچ بھی ایمانی بن جائے۔ اور اس کے بعد پھر لازم ہے کہ اس شخص کے اعمال بھی ایمانی ہوں اور جب ایمان کسی کے ضمیر میں بیٹھ جائے تو پھر اس کے لیے ایمانی راہ سے پلٹنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

یہ لوگ ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن عملاً یہ لوگ ایمان کے مفہوم اور مدلول کے خلاف ہوتے تھے جب ان سے کہا جاتا تھا کہ آؤ اپنا فیصلہ اللہ اور رسولؐ کے قانون کے مطابق کریں اور اس شریعت کے مطابق جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو وہ منہ موڑ لیتے ہیں۔

وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ

(۲۴: ۴۸) وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴: ۴۹) "جب ان لوگوں کو بلایا جائے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آتے ہیں"۔ کیونکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اللہ اور رسول اللہؐ کا حکم حق سے دور نہ تھا اور ہوائے نفس کے لیے رسولؐ کے ہاں کوئی دخل نہ ہوتا تھا اور اگر دشمنی بھی ہوتی تو رسول اللہ حق پر فیصلہ کرتے۔ اس لیے یہ لوگ جب جانتے تھے کہ ان کا موقف حق کے خلاف ہے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے دور بھاگتے تھے اور آپ کے سامنے آنے سے انکار کرتے تھے اور اگر وہ حقدار ہوتے تو بھاگ کر رسول اللہؐ کے پاس بڑے برخوردار بن کر آتے تھے۔ خوشی خوشی سے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ حضورؐ حق سے ادھر ادھر نہیں جاتے۔ اور شریعت کی عدالت میں کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی۔

یہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اور پھر بھی یہ دو رخی اختیار کرتے تھے، ہر دور میں اہل نفاق کو معلوم کرنے کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ اور معیار ہیں۔ یہ لوگ اس قدر جرأت نہیں رکھتے کہ جہراً اپنے کفر کا اعلان کر سکیں بظاہر یہ لوگ مسلمان ہوتے ہیں، لیکن وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ معاشرے کے اندر اسلامی رنگ پیدا ہو اور اسلامی قوانین کے مطابق عدالتی نظام قائم ہو۔ جب ایسے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے آجائیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور عذرات پیش کرتے ہیں۔

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴: ۴۷) "یہ لوگ مومن نہیں ہیں"۔ اس لیے کہ ایمان اور اسلامی شریعت پر فیصلے کرنے سے انکار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے الا یہ کہ اسلامی شریعت پر فیصلہ کرانا ان منافقین کے مفاد میں ہو، تو یہ دوڑ کر آجاتے ہیں۔

اللہ اور رسول اللہؐ کے فیصلوں کے مطابق زندگی گزارنا ایمان کی علامت ہے۔ یہی وہ علامت ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایمان کی حقیقت دلوں میں بیٹھ گئی ہے اور اللہ اور رسول اللہؐ کے حوالے سے مسلمانوں کے لیے یہ رویہ اختیار کرنا لازمی ہے۔ اللہ اور رسول اللہؐ کے حکم کو وہی شخص رد کر سکتا ہے جو بے حد گستاخ اور نافرمان ہو۔ جن کی کوئی اسلامی تربیت نہ ہوئی ہو اور جس کا دل نور ایمان سے منور نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے اس فعل کے نتیجے میں ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جن سے ان کے دلوں کی یہ بیماری ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان سوالات میں تعجب کیا جاتا ہے کہ وہ کیوں شک میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا طرز عمل کیوں غلط اور قابل نفرت ہے۔

أَفِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوٓا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَّحِيفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُولُهُ

(٢٤ : ٥٠) "کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان پر ظلم کرے گا؟" پہلا سوال تو اثبات کے لیے ہے یعنی درحقیقت یہ منافق ہیں اور یہ نفاق ہی کا اثر ہے۔ کوئی سلیم الفطرت شخص یہ نفاق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ فطری فرائض ہیں اور ان کی فطرت صحت مند نہیں رہی ہے۔ درحقیقت انہوں نے ایمان کی حقیقت کو نہیں دیکھا اور یہ لوگ ابہام کی شاہ راہ پر گامزن ہیں۔

دوسرا سوال تعجب کے لیے ہے۔ تعجب یہ ہے کہ دعوائے ایمان کرتے ہوئے بھی ان کو اللہ کے فیصلوں میں شک ہے۔ کیا ان کو اس امر میں شک ہے کہ یہ احکام اللہ کی طرف سے آتے ہیں۔ یا ان کو اس معاملے میں شک ہے کہ اسلام عدل کا نظام قائم کر سکتا ہے یا نہیں۔ یہ دونوں باتیں مومنین کے طریقوں کے خلاف ہیں۔

تیسرا سوال اظہار نفرت اور اظہار تعجب دونوں کے لیے ہے۔ تعجب اور نفرت اس بات پر ہے کہ یہ لوگ شک کرتے ہیں کہ شاید اللہ اور رسول اللہؐ ان پر ظلم کریں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کوئی انسان اس بارے میں شک کرے یا یہ خوف کرے کہ اللہ انصاف نہ کرے گا۔ اللہ ہی تو ہے جو سب کا خالق اور سب کا رب ہے۔ لہٰذا وہ اپنی مخلوق کے درمیان فرق و امتیاز کس طرح کر سکتا ہے۔

اللہ کا حکم ایک ہوتا ہے اس کی تہ میں کسی ظلم و زیادتی کا شائبہ تک نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تو وہ منصف ہے جو کسی پر کسی طرح ظلم نہیں کرتا۔ اس کی تمام مخلوق اس کے سامنے برابر ہے لہٰذا وہ کسی ایک بندے کی مصلحت کے لیے کسی دوسرے بندے پر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ کے سوا تمام دوسرے افراد اور اداروں کے احکام کے بارے میں یہ شک ہو سکتا ہے کہ وہ ظالمانہ ہوں کیونکہ اگر انسان خود اپنے لیے قانون سازی کر رہا ہو تو اس سے یہ شک ہو سکتا ہے کہ قانون سازی کرنے والا انسان خود اپنے مفادات کا خیال رکھے۔ قانون سازی کرنے والا انسان ایک فرد ہو یا ایک ادارہ ہو' یہ بدگمانی ہو سکتی ہے۔

جب ایک انسان اور فرد واحد حکمران ہو تو اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنے حق میں اور اپنی مصلحت کے لیے قانون سازی کرے گا۔ نیز اگر ایک حکومت دوسروں کے لیے قانون سازی کرے یا ایک طبقہ دوسروں کے لیے قانون سازی کرے یا ایک بلاک دوسرے بلاکوں کے لیے قانون سازی کرے تو قانون سازی کرنے والا اپنے مفادات کا خیال کر سکتا ہے۔ لیکن جب اللہ قانون سازی کرے تو اس میں کسی فرد' کسی گروہ' کسی طبقے ...... یا کسی بلاک کی حمایت کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ مطلق انصاف ہوتا ہے اور یہ خصوصیت یعنی بے قید عدل کی خصوصیت صرف اللہ کی قانون سازی میں ممکن ہے۔ اللہ کے فیصلے کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ اس خصوصیت کا حامل نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول اللہؐ کے حکم پر راضی نہیں ہوتے' وہی ظالم ہیں۔ یہ لوگ زمین پر عدل مطلق کو جمنے نہیں دینا چاہتے۔ یہ لوگ سچائی کا اقتدار نہیں چاہتے۔ یہ لوگ اس بات میں یہ شک کرتے ہوئے نہیں ڈرتے کہ

اللہ کے حکم میں کوئی ظلم ہو گا یہ کہ نہ ان کو اللہ کی عدالت میں شک ہے۔

بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۴: ۵۰) "بلکہ یہ لوگ دراصل ظالم ہیں"۔ اس لیے عدل نہیں چاہتے۔ رہے وہ لوگ جو حقیقی مسلمان ہیں تو اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ جب ان کو بلایا جائے کہ آؤ اللہ اور رسول اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرائیں تو وہ بالکل مختلف بات کرتے ہیں۔ یہ قول مومنین کے لائق ہے اور یہ قول بتاتا ہے کہ ان کے دل ایمان سے روشن ہیں اور وہ چمک رہے ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵۱

"ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

ان لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ بلاچون وچرا اور بغیر کسی ذرہ بھر انحراف کے وہ سمع و اطاعت کرتے ہیں۔ یہ سمع و اطاعت وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں پورا اعتماد و پورا یقین ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کا فیصلہ ہی حقیقی فیصلہ ہے اور اس میں مطلق عدل و انصاف ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ خواہشات نفسانیہ پر مبنی ہے۔ یہ سمع و اطاعت وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی اللہ زندگی بخشنے والا ہے 'یہی اللہ اس کائنات میں متصرف ہے اور ان کو اس بات پر اطمینان حاصل ہے کہ اللہ لوگوں کے لیے جو چاہتے ہیں وہی بہتر ہے بہ نسبت اس کے 'جو لوگ خود اپنے لیے چاہتے ہیں کیونکہ وہ ذات جس نے پیدا کیا وہ اپنی مخلوق کے بارے میں بہتر جانتی ہے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۴: ۵۱) "ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ یہ فلاح پانے والے اس لیے ہیں کہ ان کے امور کی تدبیر خالق کائنات ہی کرتا ہے اور ان کے باہم تعلق کو وہی منظم کرتا ہے۔ اپنے علم اور عدل کے ساتھ وہ ان کے درمیان وہی فیصلے کرتا ہے۔ اس لیے ان کو ان لوگوں سے بہتر ہونا چاہیے جو اپنے امور کے فیصلے خود کرتے ہیں یا ان جیسے افراد کرتے ہیں۔ یہ لوگ اور خود ان کے بھائی دوسرے بشر وہ علم و حکمت نہیں رکھتے جو اللہ رکھتا ہے۔ پھر وہ اس لیے بھی کامیاب ہوں گے کہ وہ ایک ہی منہاج پر چل رہے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھ اور ستم نہیں ہے۔ وہ اپنے اس منہاج پر مطمئن ہیں۔ وہ اس منہاج کے مطابق سیدھے چل رہے ہیں۔ ادھر ادھر نہیں بھٹکتے۔ لہٰذا ان کی قوتیں منتشر نہیں ہوتیں 'ان کی خواہشات کے اندر کوئی تضاد نہیں ہے۔ خواہشات اور مفادات کے ہاتھ میں ان کی نکیل نہیں ہوتی بلکہ ان کی نکیل اسلامی منہاج کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ ان کے آگے ہوتا ہے اور یہ اس کے پیچھے چلتے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ ”اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

آیت سابقہ میں موضوع سخن یہ تھا کہ اہل ایمان اللہ اور رسول اللہؐ کے فیصلوں میں مطیع فرمان ہوتے ہیں۔ اب یہاں کہا جاتا ہے کہ اہل ایمان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قانونی فیصلوں کے علاوہ بھی اللہ کے احکام و نواہی کی پابندی کرتے ہیں اور یہ اطاعت وہ قانونی گرفت کے خوف سے نہیں کرتے بلکہ اللہ کی گرفت کے خوف سے وہ یہ اطاعت کرتے ہیں۔ تقویٰ خشیت سے ذرا عام لفظ ہے کیونکہ خشیت اور خوف سے ذرا آگے بڑھ کر تقویٰ میں چھوٹے اور بڑے معاملات میں احتیاط کا شعور انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے جبکہ خشیت میں خوف اور ڈر کا پہلو ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ سے ڈرتا ہے اور اطاعت کرتا ہے تو وہی کامیاب ہوتا ہے۔ یہ شخص دنیا اور آخرت میں نجات پالیتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی مخالفت نہیں کرتا۔ اور ایسے لوگ یقیناً کامیابی کے اہل بھی قرار پاتے ہیں اور ایسے لوگوں کی زندگی کے اندر ایسے اسباب ہوتے ہیں جو ان کی کامیابی کا سبب بنتے ہیں کیونکہ جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کے طے کردہ سیدھے منہاج پر چل رہا ہوتا ہے۔ یہ منہاج اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ یہ خود اللہ نے علم و حکمت کی بنیاد پر طے کیا ہوتا ہے۔ اس منہاج کا مزاج اور اس کی فطرت کے اندر یہ کامیابی مضمر ہوتی ہے۔ دنیا کی کامیابی بھی اور آخرت کی بھی۔ پھر اس نظام میں اللہ کا خوف اور تقویٰ وہ چوکیدار ہوتے ہیں جو اس نظام پر انسانوں کو چلاتے ہیں اور یہ نظام درست رہتا ہے۔ یہ جس جادۂ مستقیم پر چل رہے ہوتے ہیں اس پر ہر جگہ دھوکہ دینے والی چیزیں ان کے لیے دامن گیر ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ لوگ اپنی راہ سے انحراف نہیں کرتے۔

یہ آداب کہ انسان اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت ' خدا خوفی' تقویٰ اور خشیت کے ساتھ کرے نہایت ہی بلند آداب زندگی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے انسانوں کے دل نور ربانی سے روشن ہیں۔ یہ دل اللہ سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے شعور میں خوف خدا بسا ہوا ہے اور ان آداب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دل نہایت ہی معزز اور سربلند ہیں۔ کیونکہ کوئی شریف آدمی یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو اس لیے ایک مومن کا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے۔ حقیقی اطاعت تو ہے ہی وہی جس میں اطاعت کرنے والا اس نظر سے اطاعت کرے کہ وہ ذات کبریا کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ ایک سچا مومن صرف اللہ کے سامنے اپنے سر کو جھکا سکتا ہے۔

اہل ایمان کے ان اچھے آداب اور اہل نفاق کے ان برے آداب کے درمیان اس تقابل کے بعد کہ مومنین وہ ہوتے ہیں جو صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں اور منافقین وہ ہوتے ہیں جو دعوائے ایمان تو کرتے ہیں لیکن مومن نہیں ہوتے' اب منافقین کے بارے میں بقیہ بات مکمل کی جاتی ہے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ

تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۵۴﴾

"یہ (منافق) اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں"۔ ان سے کہو "قسمیں نہ کھاؤ' تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے۔ تمہارے کرتوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے"۔ کہو "اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے"۔

منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر قسمیں کھاتے تھے کہ اگر آپ ہمیں لڑنے کے لیے حکم دیں تو ہم ضرور نکلیں گے۔ حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس یقین دہانی کو نہایت ہی حقارت رد فرماتا ہے۔

قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ (۲۴ : ۵۳) "ان سے کہو' قسمیں نہ کھاؤ' تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے"۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ تم کیسی اطاعت کرتے ہو۔ اور اس اطاعت پر قسمیں اٹھانے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات ایسے شخص سے کہی جاتی ہے کہ جس کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ مشہور جھوٹا ہو۔ کہا جاتا ہے جی بس قسم نہ اٹھاؤ تم تو معروف و مشہور سچے ہو۔ قسم کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس مذاقیہ انداز کے بعد یہ بھی کہا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۲۴ : ۵۳) "اللہ تمہارے تمام اعمال سے خبردار ہے"۔ لہٰذا تمہیں قسموں اور تاکیدات کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کو تو علم ہے کہ اگر حکم دیا گیا تو نہ تم نکلو گے اور نہ لڑو گے"۔

چنانچہ دوبارہ ان کو اطاعت کا حکم سنجیدگی سے دیا جاتا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ حقیقی اطاعت کرو۔ وہ اطاعت نہ کرو جو تمہارے بارے میں معروف ہے۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (۲۴ : ۵۴) "ان سے کہو اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان ہو کر رہو"۔ اگر تم منہ موڑتے ہو اور اللہ و رسولؐ کے احکام کی خالفت کرتے ہو اور ان کو نافذ نہیں کرتے تو

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ (۲۴ : ۵۴) "تو رسول پر جو فرض عائد ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے"۔ یعنی اس کے ذمہ پیغام رسالت کی تبلیغ کرنا ہے اور یہ فرض اس نے بحسن و خوبی ادا کر دیا ہے۔

وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ (۲۴ : ۵۴) "اور تم پر جو فرض عائد کیا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو"۔ اور تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم اطاعت کرو اور خلوص کے ساتھ ایمان لاؤ۔ تم نے اس سے منہ موڑ لیا ہے اور تم نے یہ ذمہ داری پوری پوری ادا نہیں کی ہے۔

وَ اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (۲۴:۵۴) "اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے"۔ راہ راست پر آجاؤ گے اور ایک صحیح نظام کے تحت زندگی بسر کر کے دنیا و آخرت میں فلاح پاؤ گے۔

وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۲۴:۵۴) "رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ صاف صاف حکم پہنچا دے"۔ رسولؐ سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم ایمان لائے تھے یا' اگر تم منہ پھیرلو تو اس فعل کی وجہ سے رسول کو مجرم نہ گردانا جائے گا۔ تم مجرم ہو گے اور تمہیں ہی اس پر سزا دی جائے گی۔ تم پر یہ فرد جرم عائد ہو گی کہ تم نے اللہ اور رسول اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔

---OOO---

منافقین کے معاملے کی تشریح کے بعد' اب سیاق کلام ان کو ایک طرف چھوڑ دیتا ہے۔ اور اب کلام کا رخ اطاعت کیش مومنین کی طرف پھر جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی اس اطاعت کی جزاء کیا ہو گی یعنی قیامت کے انعامات و اکرامات سے ادھر اس جہان میں ان کا صلہ کیا ہو گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْــٴًـا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"اس نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے' ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے' اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا' بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔

یہ وعدہ ہے امت محمدیہ کے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیا۔ وعدہ یہ ہے کہ ان کو اس زمین پر اقتدار اعلیٰ دیا جائے گا اور جس دین اسلام کو اللہ نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو غلبہ نصیب ہو گا۔ ان کی حالت خوف کو حالات امن و سکون سے بدل دے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچ ہوتا ہے اللہ کا وعدہ ہمیشہ واقع ہوتا ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے مومن ہیں جن کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین پر اقتدار دیا جائے گا۔

اس ایمان کی حقیقت جس کے نتیجے میں اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ مومنین کو زمین کا اقتدار اعلیٰ عطا کیا جائے گا' ایک عظیم حقیقت ہے اور وہ حقیقت پوری انسانی زندگی کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت جب کسی انسان کے دل میں

بیٹھ جاتی ہے تو اس کا ظہور اور اعلان عملی شکل میں ہوتا ہے۔اس شخص کی تمام سرگرمیاں اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ یہ مرد مومن رضائے الہی کے لیے کام شروع کر دیتا ہے۔اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام و قوانین کے سامنے 'چھوٹے اور بڑے معاملات میں سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔پھر کسی معاملے میں اس کے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہتی۔نہ اس کے دل میں کوئی شہوت ہوتی ہے نہ اس کی فطرت میں کوئی کجی رہتی ہے اور یہ مومن ان تمام باتوں میں اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت شروع کر دیتا ہے۔

یہ ایمان ایسا ہوتا ہے کہ جس کے اندر انسان پوری طرح غرق ہو جاتا ہے۔اس کے خیالات اس ایمان میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں' اس کے دل کی دھڑکن ایمان ہوتی ہے۔اس کی روح کی دلچسپیاں ایمانی معاملات میں ہوتی ہیں۔اس کی فطرت کے میلانات اور اس کے جسم کی حرکات اور اس کے اعضائی گردشیں' اس کا اپنے رب کے ساتھ سلوک اور اس کا عوام الناس کے ساتھ برتاؤ سب کے سب اللہ کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور یہ باتیں سب کی سب آیت استخلاف میں موجود ہیں۔اللہ تعالیٰ خود بیان کرتے ہیں کہ اس اقتدار اعلیٰ کی اصل کیا ہو گی۔

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (٢٤: ٥٥) ''وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں''۔شرک کی کئی اقسام ہیں۔اللہ کے سوا کسی اور کی طرف عقائد میں 'عمل میں 'شعور میں متوجہ ہونا بھی شرک ہے۔

معلوم ہوا کہ ایمان ایک مکمل نظام زندگی کا نام ہے۔اس میں اللہ کے تمام احکام و اوامر شامل ہیں۔اور جب یہ تمام احکام انسانی زندگی میں عملاً قائم ہوں تو اقتدار اعلیٰ کے تمام اسباب فراہم ہو جاتے ہیں۔تیاری مکمل ہو جاتی ہے' وسائل فراہم ہو جاتے ہیں اور انسان پھر امانت کبریٰ اور اقتدار اعلیٰ کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے یعنی زمین پر اللہ کے خلیفہ ہونے کی امانت اس کے سپرد ہو جاتی ہے۔

استخلاف فی الارض یا زمین کے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم کیا ہے؟ اس سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کسی قوم کو حکومت' اقتدار اور آرڈر نافذ کرنے کے اختیارات مل جائیں بلکہ اللہ کا خلیفہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ان قوتوں کو کوئی اصلاح 'تعمیر اور ترقی کے لیے استعمال کرے۔اس کے ذریعے اس نظام زندگی کی راہ ہموار کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے بھیجا ہے تاکہ تمام انسانیت اس راہ پر چل نکلے اور انسان اس کرۂ ارض پر وہ کمال حاصل کرے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اور جس کی وجہ سے انسان مکرم ہوا ہے۔

اللہ کا خلیفہ وہ نہیں ہے جو دنیا میں فساد اور تخریب کا کام کرے بلکہ وہ ہوتا ہے جو اس دنیا کی اصلاح 'تعمیر اور ترقی میں حصہ لے اور دنیا کو انصاف اور عدل دے۔یہ نہ ہو کہ وہ انسانوں پر ظلم کرے اور انسانیت کے معیار کو بلند کرنے کے بجائے گرائے۔وہ انسانوں کے اندر پائے جانے والے نظام کی اصلاح کرنے کے بجائے ظلم کرے۔وہ یہ نہ کرے کہ اچھے انسانوں کو مقام حیوانیت تک گرائے بلکہ جو انسان حیوانیت تک گر گئے ہیں ان کو اٹھائے۔

یہ اقتدار' اقتدار اعلیٰ ہے جس کا وعدہ اللہ اہل ایمان سے کرتے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں اس قسم کا اقتدار دیتا رہا ہے تاکہ اس کرۂ ارض پر اللہ کی منشا کو پورا کریں اور اللہ کی منشا کیا ہے؟ یہ کہ وہ یہاں انسانیت کو کمال انسانیت تک پہنچائیں' جس کمال تک پہنچنا اللہ نے یوم تخلیق ہی سے اس کے لیے مقدر کر دیا تھا۔مگر وہ لوگ جو زمین میں اقتدار پر

آتے ہیں اور اس کی وجہ سے فساد پھیلاتے ہیں ' زمین میں سرکشی اور ظلم کو رائج کرتے ہیں اور انسانیت کو حیوانیت کے درجے تک گراتے ہیں تو یہ لوگ اللہ کی طرف سے اس زمین پر خلفاء نہیں ہیں بلکہ وہ شیطان کے پیروکار ہیں۔ ان کو یہ مقام بطور آزمائش دیا گیا ہے اور لوگوں پر ان کو بطور سزا مسلط کیا گیا ہے۔

ہم نے اس استخلاف کا جو مفہوم سمجھا ہے اس کی طرف خود اس آیت کے اندر اشارہ موجود ہے۔ کہا گیا ہے۔

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴:۵۵) "ان کے لیے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے"۔ اور دین تب متمکن ہو سکتا ہے کہ جب یہ مومنین کے دلوں کے اندر بیٹھ جائے۔ جب ان کی زندگی کے ہر عمل میں وہ مضبوطی سے نافذ ہو جائے۔ جب ان کی زندگیوں میں اور ان کے قلوب میں ایمان اچھی طرح بیٹھ جائے گا تو انہیں استخلاف فی الارض نصیب ہو گا۔ اللہ نے ان کے لیے جو دین پسند کیا ہے وہ زمین پر غالب ہو جائے اور ان کا دین جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان میں اصلاح ' عدل اور انسانی خواہشات پر کنٹرول شامل ہیں۔ نیز زمین کی تعمیر و ترقی اور زمین کے اندر جس قدر سہولیات اللہ نے رکھی ہیں ان سے استفادہ بھی دین کا حصہ ہے۔ نیز زمین کے اندر جس قدر نعمتیں رکھی ہیں اس سے استفادہ اور ان کی تلاش بھی اس میں شامل ہے بشرطیکہ ان تمام سرگرمیوں میں انسان کی سمت اور قبلہ اللہ ہی ہو۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۲۴:۵۵) "اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا"۔ مسلمان مکہ میں خائف تھے۔ امن و امان کی حالت نہایت مشکوک تھی۔ وہ ہر وقت مسلح رہتے تھے اور کسی وقت بھی ان کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ہجرت کے بعد بھی وہ اسلحہ بند رہتے تھے۔ ربیع ابن انس نے اس آیت کے بارے میں ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مکہ میں دس سال سے زیادہ عرصہ صرف ایک خدا کی طرف دعوت دیتے رہے ' صرف اللہ وحدہ کی عبادت کی طرف بلاتے رہے اور ہر قسم کے شرک سے ممانعت کرتے رہے۔ یہ دعوت وہ چھپ کر دیتے تھے ان کو ہر وقت خوف لاحق رہتا تھا۔ مسلمانوں کو جنگ کرنے کی ممانعت تھی۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں ان کو لڑنے کی اجازت دی گئی تو مدینہ میں بھی وہ اکثر حالت خوف میں رہتے تھے۔ وہ صبح و شام اسلحہ بند رہتے تھے۔ اس قسم کی زندگی پر انہوں نے طویل عرصہ تک صبر کیا۔ صحابہ کرام میں سے ایک شخص نے کہا ' اے رسول اللہ " کیا ہم ہمیشہ اسی طرح خائف رہیں گے؟ کیا ایسا دور نہ آئے گا کہ ہم اس میں اپنے اسلحہ کو رکھ دیں اور امن و امان سے رہیں تو رسول اللہ نے فرمایا " ذرا تھوڑا سا اور صبر کرو ' تم میں سے ایک شخص ایک عظیم مجمع میں ہو گا اور کسی کے پاس ایک چھوٹا سا لوہا بھی نہ ہو گا"۔ اس موقعہ پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیرۃ العرب پر غلبہ نصیب ہوا تو وہ ایمان لائے اور اسلحہ رکھ دیا۔ اس کے بعد اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا تو مسلمان حضرت ابوبکرؓ ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان کی امارت میں امن سے رہے۔ اس کے بعد وہ ان واقعات میں پڑ گئے جن میں پڑ گئے تو اللہ نے پھر ان کو خوف میں مبتلا کر دیا تو انہوں نے پہرے ' شرطے وغیرہ اپنا لیے۔ وہ بدل گئے تو اللہ نے بھی ان کو بدل دیا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴ : ۵۵) "اور اس کے بعد جو کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں"۔ یہ لوگ اللہ کی شرائط کے ترک کرنے والے ہیں اور اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو توڑنے والے ہیں۔ اللہ کا وعدہ ایک بار پورا ہو گیا اور یہ قائم رہا' اس وقت تک جب مسلمان اللہ کی شرائط کو پورا کرتے رہے۔ یعنی

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (۲۴ : ۵۵) "وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے"۔ نہ ان کی خواہشات نفسانیہ ان کے لیے الہ ہوں گی۔ وہ شرک نہ کریں گے اور اللہ کی بندگی پر قائم رہیں گے۔ اللہ کا یہ وعدہ اب بھی ہر گروہ مومن کے لیے قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ کسی بھی وقت جب گروہ مومن اللہ کا خلیفہ نہیں ہوتا' متمکن فی الارض نہیں ہوتا اور امن سے نہیں ہوتا تو وہ اس لیے کہ وہ اس وعدے اور اس پیمان کی وسیع تر شرائط کو پورا نہیں کر رہا ہوتا۔ ایمان اور عہد الٰہی کے تقاضے وہ پورے نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن جب امت آزمائش میں کامیاب ہو جاتی ہے اور امتحان پاس کر لیتی ہے یا خوف میں مبتلا ہوتی ہے تو اللہ سے امن طلب کرتی ہے۔ وہ ذلیل ہوتی ہے تو اللہ سے عزت طلب کرتی ہے۔ وہ پسماندہ رہ جاتی ہے تو خلافت فی الارض کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہ کام وہ ان وسائل کے ساتھ کرتی ہے جو اللہ نے تجویز کیے ہیں اور ان شرائط کے ساتھ کرتی ہے جو اللہ نے مقرر کی ہیں تو پھر اس وقت اللہ کا وہ وعدہ محقق ہوتا ہے جو اٹل ہوتا ہے۔ پھر امت مسلمہ کی راہ میں دنیا کی کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وعدے کے بعد حکم دیا جاتا ہے۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کرو۔ اور مومن اور رسول اللہ ان کفار سے ہرگز مرعوب نہ ہوں جو اللہ' رسول اللہ اور دین اسلام کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۖ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

ع ۷ / ۱۳

"نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے"۔

اللہ کی جانب تیاری کی یہ ہیں نہایت ہی مختصر شرائط۔ اتصال باللہ' تعلق باللہ اور نماز کے ذریعہ دل کو درست کرنا اور ایتائے زکوٰۃ کے ذریعہ بخل اور دولت پرستی کے جذبات پر قابو پانا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا' نہایت ہی خوشدلی کے ساتھ۔ چھوٹے اور بڑے معاملات میں اللہ کے احکام کو نافذ کرنا اور زندگی کا وہ منہج اختیار کرنا جو اللہ نے زندگی گزارنے کے لیے تجویز کیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۴ : ۵۶) "امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا"۔ یعنی زمین میں تمہیں فساد'

خوف ' بے چینی اور گمراہی سے بچائے گا۔ اور آخرت میں غضب الٰہی 'عذاب الٰہی اور اللہ کے انتقام سے تمہیں بچائے گا۔

جب تم اپنے آپ کو اس طریقہ کار پر درست کر لو ' تو پھر تمہارے لیے کفار کی قوت سے ڈرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کی زمین پر اللہ اور اللہ والوں کو عاجز نہیں کر سکتے۔ ان کی ظاہری قوت تمہاری راہ نہیں روک سکتی کیونکہ تمہارا ایمان قوی ہو گا۔ تمہارا نظام اور منہاج قوی ہو گا۔ تمہاری تیاری قوی ہو گی تمہاری قوت صرف مادی قوت تک محدود نہ ہو گی بلکہ تمہارے ساتھ روحانی قوت بھی ہو گی۔ جب تم ایک مومن کی طرح کفر سے ٹکراؤ گے تو تم عجیب و غریب خارق عادت معجزات صادر کرو گے۔

ان آیات میں اللہ نے جو وعدہ کیا ہے جو لوگ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ عظیم ایمانی حقیقت اپنے اندر پیدا کر لیں۔ تاریخ انسانی میں اس وعدے کی ایک تعبیر تو ضروری ہے بشرطیکہ جو شخص اس کی تعبیر چاہتا ہے وہ اس وعدے کی شرائط پر عمل پیرا ہو۔ جب بھی ان شرائط کو مکمل کیا جائے گا بغیر کسی شک ' بغیر کسی دیر کے ' یہ وعدہ پورا ہو جائے گا۔

جب بھی امت مسلمہ نے اللہ کی راہ اور اللہ کے منہاج پر چلنا شروع کیا ہے یا کرے گی ' اور جب بھی اس نے اسلامی نظام حیات کو اپنی زندگی کا حکمران تصور کیا ہے اور کرے گی اور جب بھی امت اس دین پر راضی ہوئی ہے اور ہو گی ' کہ اس کے تمام معاملات اسلامی نظام کے مطابق ہوں تو اللہ کا وعدہ محقق ہو گیا ہے اور ہو گا۔ اس کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا ہے اور ہو گا۔ جب بھی امت نے ان شرائط کی مخالفت کی ہے اور کرے گی تو وہ ذلیل ہوئی ہے اور ہو گی۔ وہ دوسری اقوام کی دم چھلا بنی ہے اور بنی رہے گی۔ ذلیل ہوئی ہے اور ہو گی۔ دنیا کی اقوام کے مقام قیادت سے اسے گرایا گیا ہے اور گرائی جائے گی۔ اس پر خوف طاری ہوا ہے اور ہو گا۔ دشمنوں نے اسے اچک لیا ہے اور اچک لیا جائے گا۔

خبردار! یاد رکھو اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کی شرائط معروف و معلوم ہیں۔ جو بھی چاہے شرائط پوری کر کے آزمالے اور جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرے گا تو اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۱۵۶ ایک نظر میں

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے ۔ وہ انسانی زندگی کے مختلف طور طریقوں کو منظم کرتا ہے ۔ تمام تعلقات ' تمام رابطوں ' تمام حرکات و سکنات ' اور تمام مسائل میں انسانی زندگی کی تنظیم کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام روز مرہ کے انسانی آداب بھی سکھاتا ہے جس طرح وہ عمومی فرائض اور بڑے بڑے معاملات کی تعلیم دیتا ہے وہ ان تمام امور کے اندر نظم اور یکجہتی پیدا کرتا ہے اور زندگی کے تمام امور کو اللہ کی سمت موڑ دیتا ہے ۔

یہ سورہ اس امر کا ایک بہترین نمونہ ہے ۔ اس سورہ میں ایک طرف تو اسلام کے قوانین و حدود بتائے گئے ہیں اور دوسری طرف ایک جگہ بسنے والے انسانوں کے باہم ملاقات کے آداب سکھائے گئے ہیں یعنی قانون استیذان ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پوری کائنات پر غوروفکر کے خالص فلسفیانہ اور سائنسی مضامین بھی لائے گئے ہیں ۔ پھر اس میں اسلامی انقلاب کو روبعمل لانے کا دائمی منہاج بھی دیا گیا ہے کہ جب بھی تم اس پر عمل کرو گے زمین کا اقتدار اعلیٰ تمہیں مل جائے گا ۔ اس سبق میں یہ آداب بھی سکھائے جاتے ہیں کہ جب تم کسی کے گھر بیٹھنے کے لیے جاؤ تو اجازت طلب کرنے کے آداب یہ ہیں ۔ پھر مجلس رسولؐ کے آداب یہ ہیں ۔ پھر یہ کہ ملاقات اور کھانے پینے اور ضیافت کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کے آداب یہ ہیں ۔ پھر باہم خطاب اور ہم کلام ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمکلام ہونے کے آداب یہ ہیں ۔ یہ تمام آداب اور ہدایات ایسی ہیں جن کا تعلق اسلامی سوسائٹی کی تنظیم اور تربیت سے ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم اسلامی سوسائٹی کو چھوٹے بڑے تمام معاملات میں ترتیب دیتا ہے ۔

---o0o---

درس نمبر ۱۵۶ تشریح آیات

۵۸ --- تا --- ۶۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' لازم ہے کہ تمہارے لونڈی غلام اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں' تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو' اور عشاء کی نماز کے بعد ۔ یہ تین وقت تمہارے لیے پردے کے وقت ہیں ۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے' نہ ان پر ۔ تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے' اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے' اور وہ علیم و حکیم ہے ۔ اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ اسی طرح اجازت لے کر آیا کریں جس طرح ان کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں' اس طرح اللہ اپنی آیات تمہارے سامنے کھولتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے“ ۔

اس سورہ میں گھروں میں داخلہ کے طریق کار پر اس سے قبل بحث ہو چکی ہے ۔ شق [illegible] میں داخلہ سے قبل طلب اجازت

یہاں اب گھروں میں اندر آنے یا ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے گھروں کے اندر پردہ لازمی نہیں ہے جبکہ داخل ہونے کے احکام استیذان ان پر بھی لازمی ہیں۔

مثلاً خدام ' غلام ' وہ لڑکے جو عورتوں کے معاملات سے ابھی تک اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ بلا روک ٹوک گھروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ الا یہ کہ تین اوقات میں یہ بھی نہیں آ سکتے جن میں لوگ کپڑے اتار کر آرام کرتے ہیں۔ ان مخصوص اوقات میں ان لوگوں کو بھی اجازت سے اندر آنا چاہئے۔ وہ اوقات یہ ہیں ' یعنی نماز فجر سے پہلے جب لوگ عموماً سونے کے کپڑوں میں ہوتے ہیں یا انہوں نے یہ کپڑے تبدیل نہیں کیے ہوتے اور باہر نکلنے کے کپڑے نہیں پہنے ہوتے اور دوپہر کے وقت جب لوگ قیلولہ کرتے ہیں اور عادی لباس اتار کر آرام کرتے ہیں اور نماز عشاء کے بعد کے وقت جب سب لوگ آرام کرتے ہیں اور گھروں کے لباس میں ہوتے ہیں۔

یہ اوقات "اوقات عورات" ہیں یعنی ان اوقات میں لوگ کپڑے اتار دیتے ہیں۔ ان اوقات میں خانگی نوکروں کے لیے لازم ہے کہ وگھر کے اندر اجازت لے کر جائیں اور ان نوعمر لڑکوں کے لیے بھی اجازت ضروری ہے جو اگرچہ بالغ نہ ہوئے ہوں لیکن سیانے ہو گئے ہوں۔ یہ اس لیے کہ ان کی نظریں اہل خانہ کے ننگے اجسام پر نہ پڑ جائیں۔ یہ وہ آداب ہیں جن کے سلسلے میں آج کے دور جدید میں بھی خانگی زندگی میں عمل نہیں کیا جاتا اور یہ پابندیاں نہ کرنے کے نفسیاتی ' اعصابی اور اخلاقی اثرات کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ نوکروں کی نظریں مالکان خانہ پر نہیں پڑتیں اور یہ کہ قبل از بلوغ مراہق لڑکے ایسی باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں حالانکہ ماہرین نفسیات یہ کہتے ہیں کہ بچپن میں بچوں کی نظریں جن مناظر پر پڑتی ہیں بعد کے زمانے میں ان کا اثر بھی بچے کی زندگی پر پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے وہ ایسی نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا علاج ہی نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ ہمارے دور میں علم النفس نے خوب ترقی کر لی ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے۔ اس نے اہل ایمان کو اس قسم کے بلند آداب سکھائے کیونکہ وہ ایک ایسی امت پیدا کرنا چاہتا تھا جس کے اعصاب صحیح و سلامت ہوں ' جس کا سینہ صحیح ہو ' جس کا شعور پاکیزہ ہو ' جس کے دل پاک ہوں اور جس کے تصورات صاف اور ستھرے ہوں۔

ان تین اوقات کو اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ ان میں بالعموم لوگ لاپرواہی کی حالت میں ہوتے ہیں اور اس گمان پر کہ ان اوقات میں باہر کا کوئی آدمی اندر نہیں آتا ' لوگ تن ڈھانپنے کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر تمام اوقات میں ملازمین خانہ اور چھوٹے لڑکوں کے لیے اجازت لینے کو لازم کر دیا جاتا تو اس پر عمل کرنے میں بڑی وقت ہوتی کیونکہ ملازم اور چھوٹے بچے ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔

طوّفُونَ عَلَيكُم بَعضُكُم عَلى بَعضٍ (٢٤: ٥٨) "تمہیں ایک دوسرے کے پاس آنا جانا رہتا ہے"۔ یوں اللہ تعالیٰ نے پردہ داری کا بھی انتظام کر دیا ' مشکل کو بھی دور کر دیا اور مشقت اور حرج کو بھی دور کر دیا۔ اگر دوسرے اجنبی بالغوں کی طرح ہر وقت ان کے لیے بھی اجازت لینا لازم کر دیا گیا ہوتا تو اس میں تمہارے لیے مشکلات ہوتیں۔

چھوٹے لڑکے جب سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اجنبی لوگوں کے حکم میں آ جائیں گے اور وہ اسی حکم میں آ جائیں گے جو عام حالت استیذان میں لوگوں کے لیے مقرر ہے۔

آخر میں کہا جاتا ہے۔

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٢٤ : ٥٨) "اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔کیونکہ قانون سازی اور اخلاقی رویہ کے اثرات کے بارے میں انسانوں کے مزاج کو اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے لیے کیا مفید ہے اور کیا مفید نہیں ہے۔

---ooo---

اس سے پہلے یہ حکم آیا تھا کہ عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں تاکہ اسلامی معاشرے کے اندر کوئی جنسی فتنہ نہ آئے۔ یہاں ایسی بوڑھی عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے جن کے اندر مردوں کے ساتھ معاشرت کی کوئی رغبت باقی نہیں رہتی ہے اور ان کے اجسام کے اندر بھی ایسی کوئی فتنہ سامانی نہیں ہے۔

وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۶۰﴾

"اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں' نکاح کی امیدوار نہ ہوں' وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں 'بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

یہ عورتیں جو جوانی گزار بیٹھی ہیں' یہ اگر اپنے خارجی کپڑے اتار دیں تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔ہاں ان پر بھی لازمی ہے کہ وہ اپنی عورات کو ظاہر نہ کریں اور نہ اپنی زینت کو ظاہر کریں۔تاہم ان کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ ڈھکی چھپی رہیں اور اپنے کشادہ کپڑے اوڑھے رہیں۔اس کو زیادہ عفت مآبی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی عفت اور پاکیزگی کے لیے زیادہ قابل ترجیح امر ہے۔کیونکہ تبرج اور اظہار زینت اور جنسی فتنے کے درمیان گہرا تعلق ہے اور حجاب اور پردے اور عفت و پاکیزگی کے درمیان گہرا تعلق ہے۔یہ ہے اسلامی نظریہ پاکیزگی اور عفت۔خلاصہ یہ کہ اسلام ان امور کو پردے میں رکھتا ہے جو دیکھنے والے کے لیے شہوت انگیز ہوں۔

وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (٢٤ : ٦٠) "اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ اسے وہ باتیں بھی معلوم ہیں جو زبان سے ادا ہوتی ہیں اور وہ بھی معلوم ہیں جو دلوں میں گزرتی ہیں۔اسلامی احکام کا دارو مدار نیت اور ضمیر کے احساس پر ہوتا ہے۔

---ooo---

اب قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے احکام۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦١﴾ ع ۸ ۱۴

"کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا' یا لنگڑا' یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے' یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے' یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے' یا اپنی بہنوں کے گھروں سے' یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے' یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے' یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے' یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے' یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہوں' یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ البتہ جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو' دعائے خیر' اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی' بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لوگے"۔

روایات میں آتا ہے کہ لوگ ان مذکورہ گھروں سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ اجازت نہ لیا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ وہ فقراء اندھوں' لنگڑوں اور مریضوں کو بھی کھانا کھلاتے تھے۔ اب لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مذکورہ بالا گھروں کے مالکوں سے بھی اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں اس وقت پیدا ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "اور آپس میں اپنے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ"۔ اہل ایمان اس قدر حساس تھے کہ وہ ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ کہیں ان سے قرآن کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان کو اجازت دے دی کہ ان گھروں سے وہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس طرح اندھے' لنگڑے اور مریض فقراء کو بھی مالکان سے کھانے کی حد تک اجازت لینے سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور قریبی رشتہ داروں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اکیلے یا ان غرباء کے ساتھ اپنے رشتہ دار کے ہاں کھانا کھالیں۔ یہ ایسے حالات ہیں کہ اہل خانہ بالعموم ایسے

لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور لوگوں کا عام رویہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کے گھروں سے کھانا کھاتے اور کھلاتے ہیں لیکن اس میں اسلامی معاشرے کے عمومی قواعد کا لحاظ رکھا جائے گا۔ یعنی

لا ضرر و لا ضرار "نہ نقصان دیتا ہے اور نہ نقصان اٹھاتا ہے"۔ اور لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس "حلال نہیں کسی مسلمان کا مال مگر اس کے دل کی خوشی کے ساتھ"۔ یہ آیت چونکہ ایک قانونی آیت ہے۔ اس لیے ہم اس کے طرز ادا پر قدرے بحث کریں گے۔ فقروں کی ترتیب اور تشکیل ایسی ہے کہ مفہوم شیشہ کی طرف صاف صاف ذہن میں آجاتا ہے۔ نیز رشتہ داریوں کی ترتیب کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ آغاز میں بیٹوں اور خاوند اور بیوی کے گھروں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن ان سے مضمون کا آغاز کیا گیا اور ان کو بُیُوْتِکُمْ "تمہارے گھروں" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ بیٹوں کے گھر اپنے گھر ہوتے ہیں اور بیوی کے لیے خاوند کا گھر اور خاوند کے لیے بیوی کا گھر اپنا گھر ہوتا ہے۔ اس کے بعد آباء و اجداد کے گھر کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ماں اور نانی کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بھائیوں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بہنوں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چچاؤں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد پھوپھیوں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ماموں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد خالاؤں کے گھروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد اس شخص کے حق کا ذکر ہے جو اموال پر خازن اور نگران ہے۔ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بقدر ضرورت مال زیر نگرانی سے کھائے۔ اس کے ساتھ دوستوں کے گھر کا بھی ذکر ہے کہ ایک دوست' دوست کے گھر سے کھانا کھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ دوست کے لیے اذیت اور ضرر کا باعث نہ بنے کیونکہ بسااوقات دوست' دوست کے گھر بغیر اجازت کے کھا پی سکتے ہیں۔

اب ان گھروں کے بیان کے بعد جن میں کھانا جائز ہے' یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کھانا کس حال میں کھایا جائے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (٢٤ : ٦١) "اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ"۔ عربوں میں سے بعض لوگوں کا ایام جاہلیت میں رواج تھا کہ ان میں سے کوئی شخص بھی کسی ساتھی کے بغیر کھانا نہ کھاتا تھا۔ اگر کوئی مہمان یا ساتھی نہ ملتا تو وہ کھانا ہی نہ کھاتے تھے۔ اس رسم کو اللہ نے ختم کر دیا کیونکہ بعض اوقات اس سے مشکلات پیدا ہوتی تھیں۔ معاملے کو آسان کر دیا کہ کوئی اکیلے کھاتا ہے یا دوسروں کے ساتھ کھاتا ہے دونوں صورتیں مناسب ہیں۔

گھروں اور حالت طعام کے بیان کے بعد اب یہاں ان گھروں میں داخل ہونے کا طریقہ بتایا جاتا ہے جن میں کھانا کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً

(٢٤ : ٦١) "البتہ جب تم گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو' دعائے خیر اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی' بڑی بابرکت اور پاکیزہ"۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف تعبیر ہے اس قوی رابطے کی جو ان کو رشتہ داروں کے اندر

پایا جاتا ہے ـ یعنی اپنے نفسوں پر سلام کرو کیونکہ جو شخص اپنے رشتہ داروں یا دوستوں پر سلام کرتا ہے وہ دراصل اپنے اوپر سلامتی بھیجتا ہے اور جو سلام وہ کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے ـ سلام کے اندر اللہ کی طرف سے ایک روحانی پھونک ہے اور دونوں فریقوں کے درمیان دین کا مضبوط رشتہ ہے' یہی رشتہ جو سلام کی وجہ سے قائم ہوتا ہے ـ یہ نہایت ہی اٹوٹ رشتہ ہے ـ

یوں اہل ایمان کو اپنے رب کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے ـ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۴ : ۶۱) ''اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لوگے''ـ تمہیں یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے طے کردہ نظام زندگی میں کس قدر حکمت پیش نظر رکھی گئی ہے اور کس قدر موزوں اور مقدس نظام ہے ـ

---- 000 ----

اب روئے کلام رشتہ داروں کے درمیان تعلقات کے موضوع سے آگے بڑھ کر' اس عظیم خاندان کی شیرازہ بندی میں داخل ہوتا ہے جسے امت مسلمہ کہتے ہیں ـ اس خاندان کے سربراہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ـ مسلمانوں کے سربراہ اور قائد ہیں ـ آپ کی مجلس کے بعض آداب کی تعلیم یہ ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

۹ ۲ع ۱۵

''مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں ـ تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں ـ اے نبیؐ' جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے ہیں' پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو' اجازت دے دیا کرو ـ اور ایسے لوگوں

کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو' اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے۔ مسلمانو' اپنے درمیان رسولؐ کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے سٹک جاتے ہیں۔ رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔ خبردار رہو' آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

ابن اسحاق نے اس آیت کی شان نزول میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جنگ احزاب کے موقع پر جب قریش تمام اقوام کو جمع کر کے مدینہ پر چڑھا لائے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دفاع میں مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا۔ خندق کھودنے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کام شروع کیا تاکہ اہل ایمان جوش و خروش سے کام کریں۔ خندق کھودنے کے کام میں مسلمانوں نے خوب جوش و خروش سے کام کیا۔ آپ نے بھی ایک نمونہ اور مثال قائم کی اور انہوں نے بھی مثال قائم کر دی۔ بعض منافقین نے اس کام میں رسول اللہؐ اور مسلمانوں سے پیچھے رہنے اور سست روی اختیار کرنے کا مظاہرہ کیا۔ وہ چھوٹے بڑے کاموں کا بہانہ بنا کر نکل جاتے اور بعض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیے بغیر کھسک جاتے تھے جبکہ مسلمانوں کا عمل یہ تھا کہ جب ان کو کوئی ضروری کام پیش آتا تو وہ رسول اللہؐ سے ذکر کرتے۔ آپؐ اجازت دیتے اور وہ شخص کام کر کے جلدی واپس کام پر آ جاتا۔ اور یہ رویہ مسلمان زیادہ ثواب کمانے کی غرض سے اختیار کرتے۔ اس موقع پر اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ سے آخر تک سبب نزول جو بھی ہو' بہرحال ان آیات کے اندر جماعت مسلمہ کے تنظیمی قواعد و آداب کا ذکر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے قائد کے احکام کے سلسلے میں آداب بتائے گئے ہیں۔ اور جب تک کوئی جماعت اپنے امیر کے ساتھ ایسے ہی اصولوں کی گہرے جذبات اور ضمیر کی گہرائیوں سے پابندی نہ کرے گی اس وقت تک جماعت کا نظم و نسق درست نہیں ہو سکتا۔ ان آداب کو جماعت مسلمہ کے اندر ایک پختہ روایت' ایک معمول بہا عادت اور سخت قانون کی طرح جاری ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو وہ جماعت نہ ہو گی بلکہ منتشر افراد کا ایک انبوہ ہو گا۔

وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓي اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰي يَسْتَاْذِنُوْهُ (۲۴: ۶۲) "اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اس کی اجازت کے بغیر نہ جائیں"۔ امر جامع سے مراد وہ امر ہے' جس میں تمام جماعت مسلمہ کا اشتراک ضروری ہو۔ کسی مشاورت کا موقع ہو یا جنگ کا موقع ہو۔ یا عام اجتماعی کاموں کا موقع ہو۔ ایسے مواقع پر اہل ایمان کا فرض ہے کہ رسول اللہؐ سے اجازت لے کر جائیں۔ آپ کے بعد اپنے امام اور اپنے انچارج سے اجازت لے کر جائیں تاکہ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے ادارے منظم طریقے سے چل سکیں اور ان میں طوائف الملوکی نہ ہو اور کوئی بھی کام پورے نظم اور وقار کے ساتھ ہو۔

یہ لوگ جو اس قسم کا ایمان لاتے ہیں' پھر اس قسم کے آداب پر عمل کرتے ہیں اور تحریک کی ڈیوٹی سے صرف اس وقت رخصت مانگتے ہیں جب وہ مجبور ہوں۔ اپنے ایمان اور اپنی تربیت کی وجہ سے وہ ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں بھاگتے جبکہ

امت اور جماعت کو اجتماعی جدوجہد کی سخت ضرورت ہو لیکن قرآن مجید اجازت دینے اور نہ دینے کے فیصلے کا اختیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتا ہے۔ آپ ؐ کے بعد یہ اختیار اب جماعت کے سربراہ کو حاصل ہے کہ وہ اجتماعی کاموں سے کسی کو مستثنیٰ کرتا ہے یا نہیں۔

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (۲۴ : ۶۲) "پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو"۔ اس سے قبل اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ کیوں آپ نے ان منافقین کو اجازت دی۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الْخَبِيْثُ مِنَ الطَّيِّبِ "اللہ نے تمہیں معاف کر دیا کہ کیوں تم نے ان کو اجازت دی تاکہ تم پر یہ امر واضح ہو جاتا کہ خبیث کون ہے' اور پاک کون ہے"۔ یہاں یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہے کہ آپ کسی کو اختیار دیں یا نہ دیں۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے ایک اور آسانی پیدا کر دی گئی کیونکہ بعض اوقات نہایت ہی اہم ضروریات لاحق ہو جاتی ہیں اس لیے جماعت کی قیادت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ موازنہ کرے کہ کسی کے لیے درپیش مہم میں جانا ضروری ہے یا کسی خصوصی ضرورت کے لئے پیچھے رہنا ضروری ہے۔ آخری اختیار قائد کو دے دیا گیا تاکہ وہ حالات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرے۔

یہاں بہرحال اس طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ انفرادی ضرورتوں پر قابو پایا جائے' مسائل کا حل نکالا جائے اور اجتماعی مہم کو ترجیح دی جائے۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنی کسی جائز ضرورت کے لیے بھی پیچھے رہتا ہے تو یہ امر جائز ہونے کے باوجود بھی ایک قصور ہے اور اس پر اللہ سے مغفرت طلب کرنا ضروری ہے۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۴ : ۶۲) "اور ایسے لوگوں کے حق میں' اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو' اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے"۔ یوں ایک مومن کے ضمیر پر پابندی لگائی جاتی ہے کہ وہ اجازت طلب نہ کرے' اگر کوئی بھی صورت نکلے تو وہ اپنے آپ کو عذر طلب کرنے سے بچانے کی کوشش کرے۔

نیز یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ جو لوگ اجازت طلب کرتے ہیں وہ درخواست استیذان نہایت ہی مؤدبانہ الفاظ میں پیش کریں اور عوام الناس کی طرح (یا محمد) یا (ابو القاسم) یا اور عوامی طریقے سے خطاب نہ کریں بلکہ مودبانہ الفاظ یارسول اللہ' یا نبی اللہ کے الفاظ سے مخاطب کریں۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (۲۴ : ۶۳) "مسلمانو' اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا بلانا نہ سمجھ بیٹھو"۔ چاہئے کہ تمہارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھرے ہوئے ہوں۔ لہٰذا رسول اللہ ؐ کے احترام میں مناسب ترین الفاظ کا انتخاب کرو۔ یہ قیادت کے لیے ایک نہایت ہی ضروری اصول ہے اس لیے کہ کسی مربی' کسی استاد' کسی قائد کا مناسب احترام لازم ہے اور کارکنوں کے شعور اور سلوک میں نمائندہ کے احترام اور محبت ہو۔ ایک کارکن اپنے قائد کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف نہ ہو۔

اس کے بعد منافقین کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کھسک جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی اوٹ لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں اور رسول اللہؐ کی نظروں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں تو اللہ کی نظروں سے تو وہ چھپ نہیں سکتے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (٢٤: ٦٣) "اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں سے ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں"۔ یہ اس شخص کی عجیب تصویر کشی ہے جو مجلس کی نظروں سے چھپ چھپا کر کھسک جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ یہ شخص سامنے آکر اجازت لے کر نہیں جاتا بلکہ چور کی طرح چھپ کر نکلتا ہے اور اس کی یہ حرکت شعور کے اندر اس شخص کے لیے حقارت پیدا کر دیتی ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(٢٤: ٦٣) "رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے"۔ یہ ایک سخت تہدید آمیز تنبیہ اور مرعوب کن ڈراوا ہے۔ ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو امر رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں' جو رسول اللہؐ کے طریقوں سے مخالف طریقوں پر چلتے ہیں اور ذاتی کاموں اور ذاتی مفادات کے لیے اجتماعی مہموں کی صف سے چپکے سے نکل جاتے ہیں۔ ان کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان کے اندر اختلافات پیدا ہو کر وہ فتنہ عظیم میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ان کی اقدار ہی نہ بدل جائیں' حق و باطل میں تمیز نہ رہے اور ان کا نظام متزلزل نہ ہو جائے۔ ان کے اندر پاک لوگوں اور خبیث لوگوں کا امتزاج ہو جائے' جماعتی معاملات میں فتور پڑ جائے اور جماعتی زندگی کی چولیں ڈھیلی ہو جائیں۔ اس طرح کہ کوئی شخص اپنے نفس کے بارے میں مطمئن نہ ہو۔ کوئی کسی حد پر نہ رکتا ہو۔ اور جماعت کے اندر سے خیر و شر کا معیار مٹ جائے۔ ایسے حالات تمام افراد جماعت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٢٤: ٦٣) "یا ان پر دردناک عذاب آجائے"۔ چاہے یہ عذاب دنیا میں آجائے یا آخرت میں آئے۔ یہ عذاب اس لیے آئے گا کہ ان لوگوں نے حکم الٰہی کی مخالفت کی اور اس نظام کو ترک کر دیا جسے اللہ نے ان کے لیے پسند فرمایا تھا۔

یہ تنبیہ اور شدید ڈراوا یہاں ختم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سورہ نور بھی ختم ہوتی ہے اور خاتمہ کلام پر لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اللہ تمہارے تمام کرتوتوں سے واقف ہے۔ جو اچھے کام کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور جو انحراف کی راہوں پر چل نکلے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور ایک دن وہ تمہارے سامنے تمہارا مکمل نامہ اعمال پیش کر دے گا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٢٤: ٦٤) "خبردار رہو' آسمان و زمین میں جو کچھ ہے

اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

یوں اس سورہ کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی نظریں اللہ سے متعلق ہو جاتی ہیں اور ان کو اللہ کے خوف اور خشیت سے ڈرایا جاتا ہے کیونکہ صرف خدا اور خشیت الٰہی اور تقویٰ انسان کو درست رکھنے کی آخری گارنٹی ہے۔ اللہ نے جو احکام اور نواہی دیئے ہیں ان پر عمل کرانے کا یہ آخری نگران ہے جو ہر مومن کے دل میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں جو اخلاق' جو آداب اور جو قوانین وضع کیے گئے ہیں اور سب کو اسلامی نظام کا برابر حصہ بنایا گیا ہے ان کا محافظ تقویٰ اور خدا خوفی کو قرار دیا گیا ہے۔

ڈیفنس کراچی' جنوری ۱۹۹۴ء

---000---

فی ظلال القرآن

جلد ----- چہارم

پارہ ------ ۱۸

سورۃ الفرقان ـ ۲۵

۱ --- تا --- ۲۰

سورۃ الفرقان ایک نظر میں

یہ سورت پوری کی پوری بظاہر تسلی نظر آتی ہے۔ اس پوری سورت میں 'مشرکین مکہ کی اسلام دشمنی' عناد 'ہٹ دھرمی اور آپ کے خلاف مسلسل دست درازیوں 'کج بحثیوں اور اسلام کی راہ کو مسلسل روکنے کی مخالفانہ کارروائیوں پر آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ اور اطمینان دلایا گیا کہ اس مقابلے اور کشمکش میں آپ کو کامیابی ہو گی۔ بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں کہ نظریوں آ رہا ہے کہ گویا حضور اکرمؐ کے زخموں پر مرہم لگائی جا رہی ہے۔ آپ کے درد اور دکھ کا درماں کیا جا رہا ہے۔ آپ کے سر پر قدرت کا دست شفقت ہے۔ آپ کو تسلی دی جا رہی ہے اور آپ کے کاسہ دل کو اعتماد و اطمینان کے شراب طہور سے بھرا جا رہا ہے اور اللہ کی گرانی 'رعایت و شفقت اور لطف و کرم کی باد نسیم کے خوشگوار جھونکے آپؐ کے چہرۂ مبارک کو چھو رہے ہیں۔

پھر یہ سورت 'اس شدید جنگ کی تصویر کشی بھی کر رہی ہے' جو اللہ کے یہ بندے اور رسول ایک منکر حق انسانیت کے ساتھ برپا کیے ہوئے ہیں۔ یہ انسانیت اللہ و رسولؐ کی دشمنی پر اتر آتی ہے 'اسلام کے خلاف سخت مجادلہ کر رہی ہے' اہل ایمان کو گھروں سے نکال رہی ہے نہایت ہی مکروہ انداز میں ' مسلمانوں پر دست درازی کر رہی ہے اور سخت سرکشی اور عناد میں مبتلا ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جو واضح ' ناطق اور مبین دلائل کے ساتھ راہ حق اور صراط مستقیم کی طرف بلا رہے ہیں وہ اس راہ سے دور جا رہی ہے۔

جس سوسائٹی کے سامنے حضور محترمؐ ان مشکل ترین حالات میں دعوت اسلامی پیش کر رہے ہیں اس عظیم دعوت کے بارے میں اس سوسائٹی کا تبصرہ یہ ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (۲۵ : ۴) "جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے"۔ یا ان کا تبصرہ یوں ہے :

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۲۵ : ۵) "یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ صبح و شام اسے لکھائی جاتی ہیں"۔ اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تبصرہ کچھ یوں ہے۔

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا "تم تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"۔ اور رسول تو رسول ہیں ایک بشر ہیں۔ یہ لوگ خود اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ بات کرنے کی جرات کرتے ہیں۔

وَ اِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا (۲۵: ۶۰) "ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہوتا ہے کیا بس تو کہہ دے اسے ہم سجدہ کرتے پھریں۔ یہ دعوت ان کی نفرت میں اور اضافہ کر دیتی ہے"۔ اور ان کی ہٹ دھرمی کو یہ سورت یوں ریکارڈ کرتی ہے۔

لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا (۲۵: ۲۱) "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے گئے یا کیوں نہ یوں ہوا کہ ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ یہ تھا اس سوسائٹی کا دعوت اسلامی کے بارے ردعمل۔

لیکن انسانیت کا یہ طرز عمل کوئی نیا نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان تک انسانوں نے تمام رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہمیشہ ہر رسول کی بشریت ہی پر اعتراض ہوا اور اب رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر بھی وہی اعتراض ہے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۲۵: ۷) "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے' اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا"۔ انہوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ اس رسول کے پاس وافر مقدار میں مال بھی نہیں۔

اَوْ يُلْقٰٓي اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (۲۵: ۸) "یا اس لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا"۔ اور انہوں نے قرآن کے طریقہ نزول پر بھی اعتراض کیا۔

لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (۲۵: ۳۲) "اس شخص پر پورا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا"۔ اس تکذیب' استہزاء' افتراء اور بے حیائی کا مقابلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ یہ مقابلہ آپ اکیلے کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں کر رہے تھے کہ نہ آپ کے پاس کوئی مال تھا اور نہ جاہ و مرتبہ تھا۔ اور آپ ان حالات پر راضی برضا تھے اور رب ذوالجلال سے کوئی شکوہ و شکایت نہ کرتے تھے۔ آپ اللہ کی طرف متوجہ تھے' صرف اس کی رضا اور خوشنودی کے طلبگار تھے اور اس کے سوا آپ کا کوئی مقصد و مطلوب نہ تھا۔ طائف سے واپس ہوتے ہوئے نہایت مشکلات میں آپ اپنے رب سے یوں ہمکلام ہوئے "اے رب اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تجھے اس وقت تک آزمانے کا حق ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے"۔

ان مشکل حالات کے مقابلے میں' اس سورت سے یوں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پناہ میں لے رہا ہے۔ اللہ حضور اکرم کی مشکلات اور تکالیف پر آپ کو تسلی دیتا ہے۔ آپ کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مشکلات' آپ کی پریشانیوں کو کم کیا جاتا ہے۔ آپ کو ہمت دی جاتی ہے کہ آپ اپنی

قوم کی ہٹ دھرمی، بے ادبی، گستاخی اور دست درازی کو برداشت کریں۔ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ دراصل اپنے خالق اور رازق کے ساتھ گستاخی اور دست درازی کر رہے ہیں جبکہ ان کا خالق اس پوری کائنات کا مدبر اور خالق بھی ہے اور وہ اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے تو یہ لوگ اگر اپنے رب کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں تو رسول اللہ کو چاہئے کہ وہ ان کی ان حرکات کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (۲۵:۵۵) "اور اس خدا کو چھوڑ کر لوگ ان کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں ' نہ نقصان اور مزید یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵:۳) "لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ' جو نہ مارتے ہیں اور نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ (۲۵: ٦) "ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمن کیا ہوتا ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورت میں ایک دوسرے انداز سے بھی تسلی دی جاتی ہے وہ یہ کہ کفار جس قدر گرے ہوئے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ قابل نفرت ہے۔ یعنی آپ اعلیٰ زندگی اور اعلیٰ ماحول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۴۳) اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵:۴۴) "کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو 'کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔

کفار آپ کے ساتھ جو مجادلہ اور مباحثہ اور کٹ حجتی کرتے تھے۔ اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کے ان پوچ سوالات کا تسلی بخش جواب دیا جائے گا۔

وَ لَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۲۵:۳۳) "اور جب بھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات لے کر آئے اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی"۔ آپ کی جدوجہد سے قبل بھی نبیوں نے یہ کام کیا ' ان کی تکذیب کی گئی اور اللہ نے مکذبین کو ٹھکانے لگایا۔

قوم موسیٰ، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، اصحاب الرس، اور ان پیغمبروں کے زمانوں کے درمیان اور پیغمبروں کی اقوام کے حالات کو ذرا پڑھیے۔

اور قیامت! ذرا یہ بھی دیکھ لو کہ وہاں ان کا حشر کیا ہو گا۔

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ اِلٰي جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا

(۲۵ : ۳۴) "جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط ہے"۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا (۱۱) اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا (۱۲) وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا (۱۳) لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا

(۲۵ : ۱۴) "اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس گھڑی کو جھٹلا چکے ہیں اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے جب وہ دور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آواز سن لیں گے اور جب یہ دست و پابستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو"۔

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰي يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (۲۷) يٰوَيْلَتٰي لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (۲۵ : ۲۸) "اور منکرین حق کے لیے بڑا سخت دن ہو گا ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کاش میں نے رسولؐ کا ساتھ دیا ہوتا، ہائے میری کم بختی، کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا"۔

پھر آپؐ کو یوں بھی تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو جن مشکلات سے سابقہ درپیش ہے۔ یہ تمام حالات رسولان سابقہ کو بھی پیش آئے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (۲۵ : ۲۰) "اے نبیؐ، ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ تھے"۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَ كَفٰي بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا

"اے نبی، ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے"۔
ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر کریں اور اپنے پیروکاروں کو بھی صبر کرنے کی تلقین فرمائیں اور کافروں کے ساتھ قرآنی دلائل و براہین کے ذریعہ جہاد کریں۔ کیونکہ قرآن کے دلائل واضح، قوی اور وجدان کو گہرائی تک متاثر کرنے والے ہیں۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۲۵ : ۵۲) "پس اے نبی کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔ اور آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ راہ جہاد میں مشکلات کو برداشت کرتے چلے جائیں اور اپنے رب اور مولیٰ پر توکل فرمائیں۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا (۲۵ : ۵۸) "اے نبی اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اس کا باخبر ہونا کافی ہے"۔
یوں اس سورت کے مضامین چلتے ہیں۔ ایک لمحے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی، تشفی، اطمینان اور اللہ کی طرف سے پناہ دی جاتی ہے۔ اگلے ہی لمحے میں مشرکین کی طرف سے اذیت رسانی، اور مشکلات آجاتی ہیں۔ پھر مکذبین کی ہلاکت و تباہی آجاتی ہے۔ یوں یہ سورت اپنے خاتمے کے قریب آپہنچتی ہے۔ اس میں خوشگوار باد نسیم کے جھونکے بھی ہیں۔ نرمی، خوشی اور مسرت کے لمحات بھی ہیں۔ اطمینان و سلامتی کے اوقات بھی ہیں۔ یوں یہ سورت آپہنچتی ہے۔ عباد الرحمن کی تصویر کشی کی پینٹنگ پر۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵ : ۶۳) "رحمن کے اصلی بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اس گمراہ سرکش اور کینہ پرور انسانیت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے پاک و صاف ہوگئے ہیں اور وہ گویا انسانیت کے شجرۂ طیبہ کے پکے ہوئے پھل ہیں۔ جو بہت ہی میٹھا اور بہت ہی مفید اور موجب خیر و برکت ہے۔
سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی نظروں میں یہ پوری انسانیت پر کاہ کے برابر بھی نہیں ہے اگر اس بشریت میں یہ پاک لوگ اور موجب خیر و برکت افراد ہروقت دست بدعا نہ ہوتے تو اللہ کبھی کا انسانیت کو نیست و نابود کر دیتا۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا (۲۵ : ۷۷) "اے نبی، لوگوں سے کہو میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے۔ اگر تم اس کو نہ پکارو، اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے۔ عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی۔

---(۱)---

یہ تھے اس سورت کے سائے اور موضوعات - یہی اس سورت کے محور تھے اور یہی اس کے موضوعات ہیں جس پر یہ بحث کرتی ہے - یہ سب مضامین و موضوعات باہم مربوط ہیں - اور ان کو منقسم نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے باوجود سورت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں مذکورہ بالا موضوعات لیے گئے ہیں -

کلام کا آغاز حمد باری سے ہوتا ہے کہ جس نے از راہ کرم اپنے برگزیدہ بندے پر قرآن کریم نازل کیا ہے تاکہ یہ قرآن جہان والوں کے لیے ڈراوے کا سامان ہو - اور ان کو عقیدۂ توحید کی تعلیم دی جائے کہ اللہ وحدہ زمین و آسمانوں کا مالک و خالق ہے - اور وہ اپنی حکمت اور تدبیر سے اس کائنات کو چلا رہا ہے - اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے - اور نہ اس کی بادشاہت میں اس کا کوئی شریک ہے لیکن ان حقائق کے باوجود لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ایسی مخلوقات کو الٰہ بناتے ہیں جو اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں قوت تخلیق نہیں ہے - یہ نظریاتی قرار داد ان الزامات و اتہامات کے بعد لائی گئی ہے جو انہوں نے حضور اکرمؐ پر عائد کیے اور جو بے حد اذیت ناک تھے - یہ کہ حضور اکرمؐ افتراء باندھتے ہیں' یہ کہ یہ پرانی کہانیاں ہیں جو کہیں سے نقل کرتے ہیں اور یہ کہ آپ تو ایک انسان ہیں جو بازاروں میں چلتے پھرتے اور کھانا کھاتے ہیں' پھر یہ کہ کیوں نہ ان کے ساتھ ایک فرشتہ نازل ہوا اور کیوں نہ ان پر بھاری خزانہ نازل ہوا' یا کیوں ان کے پاس باغات نہیں ہیں جن سے وہ کھاتے پیتے اور پھر انتہائی بے حیائی کے ساتھ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ آپ پاگل ہیں - یہاں اللہ کے بارے میں ان کی گستاخیاں پہلے لائی گئی ہیں - اور رسول اللہؐ کے بارے میں ان کی یہ گستاخیاں بعد میں تاکہ رسول اللہؐ کے لیے یہ بات باعث تسلی ہو کہ یہ تو اللہ کے بارے میں بھی یہ کچھ کہتے ہیں - ان وجوہات کی بنا پر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اور قیامت کے منکر ہیں - اور یہ اس عذاب کے مستحق ہیں جو ان کے لیے تیار کیا گیا ہے - یعنی جہنم کا عذاب جس کی نہایت تنگ جگہ میں ان کو باندھ کر گرایا جائے گا - اس کے بالمقابل مومنین کی حالت بتائی جاتی ہے جو کھلے اور وسیع باغات میں ہوں گے اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے - پھر قیامت کے دن ان لوگوں کے سامنے ان کے وہ معبود بھی پیش ہوں گے - وہ ان تمام باتوں کی تردید و تکذیب کر دیں گے جو یہ کرتے تھے اور جو غلط عقائد و نظریات یہ رکھتے تھے اور سب سے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور منکرین کو جواب دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ تمام رسول کھانا کھاتے رہے ہیں اور بازاروں میں اپنی ضروریات کے لیے جاتے رہے ہیں -

دوسرے سبق میں مکذبین کی اس دست درازی اور سرکشی کو لیا جاتا ہے کہ رسول اللہ پر فرشتے کیوں نازل نہیں ہوئے یا یہ کہ ہم کو رب تعالیٰ دکھایا کیوں نہیں جاتا - اس کے بعد ان کے سامنے قیامت کا وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں فرشتوں کو دیکھ لیں گے لیکن ان کافروں پر وہ دن بہت ہی سخت ہو گا - اس دن کو ظالم اپنے ہاتھ کاٹیں گے - مارے حسرت کے اور یہ تمنائیں کریں گے کہ کاش وہ رسولؐ کے ساتھ راہ ہدایت لیتے اور یہ منظر بھی رسول اللہؐ کو تسلی دینے کے لیے لایا گیا' کہ آپ پریشان نہ ہوں' نہ ماننے والے قرآن کو چھوڑ کر خود اپنا نقصان کر رہے ہیں' وہ قرآن کے طریقہ نزول پر اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ نے پورے قرآن کریم کو ایک بار کیوں نہیں اتارا؟ ان کے سوال کے جواب میں قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں ان مکذبین کو منہ کے بل جہنم میں گرایا جاتا ہے - اور ان سے قبل قوم موسیٰ' قوم نوح' اقوام

عاد و ثمود' اصحاب الرس اور دوسری اقوام کا انجام بھی بتایا جاتا ہے۔ اور بڑے تعجب سے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ قوم لوط کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہیں لیکن عبرت نہیں پکڑتے۔ ان باتوں سے حضورؐ کو تسلی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ انتہائی تحقیر کے ساتھ کہتے تھے۔

اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا (۲۵ : ۴۱) "کیا یہ شخص اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے"۔ اللہ ان کے اس توہین آمیز ریمارکس کے بدلے ان کی تعریف یوں فرماتا ہے کہ یہ لوگ حیوان ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵ : ۴۴) "یہ نہیں ہیں مگر مویشیوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ"۔ چوتھا سبق مظاہر کائنات کو لیتا ہے کہ کس طرح سایہ اپنا کام کرتا ہے۔ گردش لیل و نہار کا نظام' خوشگوار ہوائیں' بادلوں کو اٹھاتی ہوئی اور بارش برساتی ہوئی۔ پھر پانی سے انسان اور دوسری مخلوقات کی تخلیق کا عمل اور پھر ایسے احسن الخالقین کو چھوڑ کر لوگوں کی طرف سے ایسے معبودوں کی بندگی کرنا جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ پھر منکرین کس طرح اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر سرکشی کرتے ہیں اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ رحمٰن کی بندگی کرو تو نہایت ہی بے حیائی کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ حالانکہ رحمٰن تو یہ ہوتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا (۲۵ : ۶۱) وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا

(۲۵ : ۶۲) "بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور چمکتا ہوا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا' ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکرگزار ہونا چاہئے"۔ اور آخری سبق میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے صحیح بندے کیسے ہوتے ہیں' جو اس کی بندگی کرتے ہیں' سجدے کرتے ہیں اور وہ تمام صفات بتائی جاتی ہیں جو ان بندوں میں پائی جاتی ہیں اور لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ گناہوں سے توبہ کر کے عباد اللہ اور عباد الرحمٰن کی راہ اپنا سکتے ہیں۔ اور یہ مقام پا سکتے ہیں۔ اور اس جزاء کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا (۲۵ : ۷۵)
"یہ لوگ ہیں جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہو گا"۔ آخر میں کہا جاتا ہے کہ اس دنیا میں اگر اللہ کے برگزیدہ بندے نہ ہوتے تو اللہ ان گمراہ انسانوں کی کوئی پرواہ ہی نہ کرتا۔ جو انکار اور تکذیب کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی اس حقارت اور ناقابل التفات ہونے کو بھی یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ حضورؐ کو تسلی ہو کہ یہ لوگ اگر نہیں مانتے تو یہ ہیں ہی ایسے۔ اس سورت کی فضا اور حضورؐ کو تسلی دینے کے لیے یہ آخری ریمارکس سورت کے مضامین کے ساتھ نہایت ہی موزوں اور ہم آہنگ ہے۔ (یعنی اے پیغمبر' نہ اللہ ان کو اہمیت دیتا ہے اور نہ آپؐ دیں)

درس نمبر ۱۵۷ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۰

سُورَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ — آیاتها ۷۷ — رکوعاتها ۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝۱ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝۲ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو۔ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے' جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے' جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں' جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے' جو نہ مار سکتے ہیں' نہ جلا سکتے ہیں' نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔

یہ آغاز ہی صاف صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ اس سورت کا بڑا محور اور موضوع کیا ہے؟ یہ کہ یہ کتاب من جانب اللہ نازل شدہ ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ یہ کہ اس دعوت کا

بنیادی پیغام یہ ہے کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے' اس کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی شریک ہے' وہ وحدہ اس پوری کائنات کا مالک ہے' وحدہ مدبر ہے اور اپنی حکمت و تدبیر کے ساتھ اسے چلا رہا ہے۔ ان حقائق کے باوجود شرک کرنے والے شرک کرتے ہیں۔ افتراء پردازی کرنے والے افتراء باندھتے ہیں اور جھگڑنے والے جھگڑتے ہیں اور حد سے بڑھنے والے حدود پار کرتے رہتے ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) "نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان' اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو"۔ تبارک' برکت سے باب مفاعلہ ہے یعنی نہایت متبرک ہے۔ یعنی وہ بہت زیادہ فیوض و برکات والا ہے۔ یہاں اللہ جل شانہ' کا نام لینے کے بجائے اسم موصول سے ذات باری کو اَلَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (۲۵ : ۱) لایا گیا ہے' کیونکہ یہاں سورت میں مباحثہ "صداقت و رسالت" پر ہے۔ اور اس کے ساتھ ذات باری کا گہرا تعلق ہے نیز نزول قرآن کے ساتھ بھی ذات باری کا تعلق ہے کہ یہ ذات ہی نازل کرنے والی ہے۔

یہاں قرآن مجید کو فرقان اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں جو تعلیمات دی گئی ہیں وہ حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے درمیان بہت ہی واضح فرق کر دیتی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ اسلامی نظام زندگی اور غیر اسلامی نظام زندگی کے درمیان اور عہد جاہلیت اور عہد اسلام کے درمیان واضح فرق و امتیاز دکھایا گیا ہے اس لیے کہ اسلام انسانی شعور اور انسانی ضمیر کے اندر ایک واضح طریق زندگی بٹھاتا ہے۔ پھر اس طریق زندگی کو انسانی زندگی کے اندر عملاً قائم کرتا ہے۔ اس طرح اس نظام کو اس کتاب و فرقان نے دنیا کے تمام نظاموں سے علیحدہ اور ممتاز کر کے رکھ دیا ہے۔ گویا قرآن فرقان بایں معنی ہے کہ یہ انسانیت کے لیے ایک عہد جدید ہے۔ تصورات و خیالات کے اعتبار سے بھی اور عملی زندگی کے اعتبار سے بھی یہ عہد جدید' عہد قدیم سے جدا اور ممتاز ہے۔ قرآن کریم اس وسیع مفہوم میں بھی فرقان ہے۔ یہ ایک نکتہ افتراق ہے کہ جہاں سے آگے اب انسانیت نے بلوغ حاصل کر لیا ہے اور اس کا زمانہ طفولیت اب ختم ہے۔ اب وہ دور ختم ہو گیا ہے کہ لوگوں کو مادی معجزات دکھائے جاتے تھے اور حق و باطل کا فرق سمجھایا جاتا تھا۔ اب تو قاضی عقل کے ذریعہ یہ فرق سمجھایا جائے گا۔ پھر اس سے قبل رسالتوں کا دائرہ محدود اور مقامی ہوتا تھا اور اب یہ رسالت عمومی رنگ اختیار کر گئی ہے۔ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) "تاکہ تمام جہاں والوں کے لیے ڈرانے والا ہو"۔ غرض ان تمام معنوں اور دائروں میں یہ کتاب فرقان ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور تعظیم کے مقام پر ان کے لیے عبدہ' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا بندہ' عبدہ کے لفظ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور تکریم اسراء اور معراج کے موقعہ پر بھی کی گئی تھی۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰي

(۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی"۔ اور سورت جن میں جب آپ کو رب کریم کے سامنے کھڑے ہو کر دعا اور مناجات کی حالت میں دکھایا گیا ہے وہاں بھی آپ کے لیے

لفظ عبد اللہ استعمال ہوا ہے اور جس طرح یہاں آپ کے لیے تنزیل قرآن کے وقت عبدہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح سورت کہف میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا "تعریف ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہ چھوڑی"۔ ان مقامات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بندے کا لفظ استعمال کرنا رفعت شان ہے۔ اور آپ کی بہت بڑی تکریم ہے۔ انسان کے لیے اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے۔ اس لیے یہاں آپ کے لیے بندے کا لفظ استعمال ہوا۔ اس سے آگے مقام الوہیت ہے جو اللہ وحدہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اللہ کے ساتھ نہ کوئی شریک ہے اور نہ اللہ کے ساتھ مشارکت کا کوئی شبہ ہو سکتا ہے چاہے نزول قرآن کا مقام ہو' چاہے انسان کو آسمانوں پر لے جایا گیا ہو' چاہے ایک بشر اپنے اعلیٰ مقام معرفت و مناجات میں ہو' ایسے مقامات ہی بعض متبعین انبیائے سابقہ کے لیے مغالطے کا سبب بنے ہیں۔ ایسے ہی مقامات پھسل کر عقیدت مندوں نے بعض انبیاء کو خدا کا بیٹا قرار دینے کے افسانوی عقائد گھڑے یا انہوں نے بندے اور خدا کے درمیان بندگی اور خدائی کے تعلق کے سوا کسی اور قسم کے رابطے کا تصور اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انبیاء کی تکریم اور اعزاز کا مقام آتا ہے تو قرآن کریم میں ان کے لیے بندے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تصور یہ دلانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ اور بلند مقام ہے جس تک کوئی بشر ترقی کر سکتا ہے۔

یہاں بتایا جاتا ہے کہ اپنے اس برگزیدہ بندے پر قرآن نازل کرنے کا مقصد لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) "تاکہ وہ سارے جہاں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو"۔ یہ آیات مکی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء ہی سے پوری دنیا کے لیے رسول مقرر کر دیا گیا تھا۔ بعض مستشرقین نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ دعوت اسلامی ابتداء میں ایک مقامی دعوت تھی لیکن بعد میں جب اسے عالمی فتوحات حاصل ہوگئیں تو اس نے ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ان لوگوں کی یہ رائے غلط تھی' یہ دعوت ابتداء ہی سے عالمی تھی۔ اگر قرآن کی تعلیمات پر پوری طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مزاج ہی عالمی ہے۔ اس دعوت کو پھیلانے کے لئے اسلام نے جو طریق کار اور جو وسائل اختیار کیے وہ سب کے سب عالمی تھے۔ اور ان تعلیمات کا مقصد ہی یہ تھا کہ پوری انسانیت کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کیا جائے۔ اس کے اندر سے ایک نظام کو ختم کر کے اسے ایک دوسرا نظام دیا جائے اور یہ کام اس کتاب فرقان کے ذریعے کیا جائے جو اللہ نے تمام جہاں کے لوگوں کو انجام بد سے خبردار کرنے کے لیے نازل کی ہے۔ اور اپنے بندے پر نازل کرے تاکہ وہ تمام لوگوں کے لیے خبردار کرنے والے کا کام کرے۔ یہ دعوت تو عالمی تھی لیکن رسول اللہؐ چونکہ مکہ میں رہنے والے تھے اس لیے ان کا پہلا مقابلہ اہل مکہ ہی سے ہونا تھا۔ اس لیے اس دعوت کا انکار اور مقابلہ اہل مکہ نے کیا تھا۔

غرض وہ ذات بڑی متبرک ہے جس نے اپنے اس عظیم بندے پر یہ کتاب نازل کی جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے اور جو ایک معیار حق ہے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ

فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵ : ۲) "وہ جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے' جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا' جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے' جس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اس کی تقدیر مقرر کی"۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے اسم ذات کے استعمال کے بجائے اسم موصول کا استعمال ہوا یعنی الذی مقصد یہ ہے کہ جن صفات کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کے ساتھ اللہ کا دائمی اور مسلسل تعلق ہے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۵ : ۲) "وہ جو زمین و آسمان کا مالک ہے"۔ زمین و آسمان پر اس کا مکمل کنٹرول ہے۔ یہ اس کے قبضہ میں ہیں۔ وہ ان کے اندر پوری طرح متصرف ہے اور زمین و آسمان کے اندر تمام تغیرات اس کی مرضی اور حکم سے رونما ہوتے ہیں۔

وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا (۲۵ : ۲) "اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا"۔ تناسل تو وہ قدرتی قانون ہے جسے اللہ نے اپنی مخلوق کے اندر جاری کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ "زندگی" کا تسلسل قائم رہے۔ جہاں تک ذات باری کا تعلق ہے تو وہ جب ہمیشہ باقی ہے اور لازوال ہے تو وہ سلسلہ تناسل کی محتاج ہی نہیں ہے۔

وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (۲۵ : ۲) "جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے"۔ زمین و آسمان کے اندر جس قدر مخلوق ہے اگر اس کا مشاہدہ اور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کا نقشہ کسی ایک ہی خالق نے تخلیق کیا ہے۔ ہر چیز کے اندر ایک ہی ناموس قدرت ہے اور تمام مخلوق کے اندر تصرف اور تغیر بھی ایک ہی ذات کا نظر آتا ہے۔

وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵ : ۲) "جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ اس کا ایک حجم اور اس کی ایک شکل مقرر کی۔ اس کے لیے ایک کام اور فرض منصبی متعین کیا۔ اس کا زمان و مکان متعین کیا۔ اور اس کو اس کائنات کے عظیم وجود کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔

اس کائنات کے وجود اور انداز کے انداز تخلیق و ترکیب پر جن علماء نے غور کیا ہے اور جو انسان بھی اس پر کبھی غور کرے گا وہ حیران رہ جائے گا۔ جوں جوں تخلیق کائنات کے رازہائے نہفتہ واشگفتہ ہوں گے اس کو یقین ہوتا جائے گا کہ یہ کائنات از خود بطور اتفاق وجود میں نہیں آگئی ہے۔ اس کی ترکیب اس قدر دقیق اور باریک ہے کہ انسان اس کے مظاہر اور اثرات ہی کو معلوم کرنے سے عاجز ہے جبکہ ہم نے ابھی تک اس کائنات کا ایک حقیر پہلو ہی مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن جوں جوں ہماری دریافت آگے بڑھتی ہے۔ ہمیں اس کائنات کے اندر نہایت ہی حکیمانہ ضوابط کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہ ضوابط اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ہمارا علم جس قدر آگے بڑھتا ہے ہمیں یہ آیت اچھی طرح سمجھ آجاتی ہے۔

وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵ : ۲) "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک مکمل تقدیر مقرر کی"۔ مسٹر اے کریسی موریسن' صدر سائنس اکیڈمی نیویارک' اپنی کتاب "انسان اکیلا نہیں کھڑا ہے" میں لکھتے ہیں:

"اس حقیقت کو دیکھ کر انسان حیرت سے دہشت زدہ ہو جاتا جب وہ اس کائنات کی موجودہ شکل میں منظم کیے جانے پر غور کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی حکیمانہ تنظیم ہے۔ اگر زمین کا چھلکا اپنی موجودہ مقدار کے مقابلے میں چند قدم اور زیادہ دبیز

ہوتا تو اور نباتات کا وجود ہی ختم ہو جاتا"۔

"اگر ہوا اپنے موجودہ مقام سے ذرا زیادہ اونچی ہوتی تو آج جو لاکھوں شہاب ثاقب بالائی فضا میں جل جاتے ہیں ' ان کی زد اس کرہ ارضی پر پڑتی کیونکہ ان شہابوں کی رفتار ۶ ۔ ۴ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے ۔ اس طرح یہ جہاں گرتے ' وہاں پر اس چیز کو جلا دیتے جو جلنے کے قابل ہوتی اور اگر ان کی رفتار کم ہو کر بندوق کی گولی کی مقدار پر آ جائے تو یہ سب زمین پر آ کر چپک جاتے اور اس کے خوفناک نتائج نکلتے ۔ رہا انسان تو اس کے پاس سے اگر ایک چھوٹا سا شہاب ثاقب گزر جائے جس کی رفتار بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ ہوتی ہے تو صرف اس کے گزرنے کی رفتار کی گرمی سے وہ چھوٹے چھوٹے ذروں میں بدل جائے"۔

"اللہ نے اس ہوا کو ایک خاص مقدار کے مطابق کثیف بنایا ہے اور اس کی اس کثافت سے وہ شعاعیں گزر سکتی ہیں جو فصلوں پر وہی اثرات ڈالتی ہیں ' جو جراثیم کو قتل کرتی ہیں اور وٹامن پیدا کرتی ہیں ' لیکن یہ شعاعیں انسان کو نقصان نہیں پہنچاتیں الا یہ کہ انسان ان کے اندر ضرورت سے زیادہ رہے ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ زمین سے ہر وقت زہریلی گیس نکلتی رہتی ہیں لیکن ہوا ان گیسوں سے متاثر ہو کر اس مسلسل آلودگی کی وجہ سے بھی اس کی وہ نسبت نہیں بدلتی جو صحت انسانی کے لیے ضروری ہے ۔ اور اس توازن کو یہ وسیع سمندر قائم رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ہر قسم کی زندگی 'غذا' بارش 'معتدل جائے رہائش اور نباتات کو زندگی حاصل ہوتی ہے اور خود انسان کی زندگی قائم ہے"۔

"اس ہوا میں اس وقت آکسیجن ۲۱ فیصد ہے ' اگر یہ بڑھ کر ۵۰ فیصد ہو جائے تو وہ تمام مواد جو اس وقت جلنے کے قابل ہے سب کا سب آگ پکڑ لے ۔ ایک چنگاری جنگلات کو آگ لگا دے اور تمام جنگلات ایک دھماکے سے اڑ جائیں اور اگر ہوا کے اندر آکسیجن کی مقدار ۱۰ فیصد ہو جائے یا اور کم ہو جائے تو انسانی زندگی شاید صدیوں بعد اپنے آپ کو اس نسبت کے ساتھ ہم آہنگ تو کر لیتی لیکن انسانی تمدن موجودہ بے شمار چیزوں سے محروم ہو جاتا ' مثلاً آگ اور دیگر ازقبیل سے"۔

"ان مخلوقات کی ضابطہ بندی اور ان کے اندر قدرتی توازن بھی نہایت ہی عجیب ہے کہ کوئی حیوان ' خواہ وہ جس قدر عظیم الجثہ اور ہوشیار کیوں نہ ہو ' اس کے لیے اس جہاں پر غلبہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے ۔

ہاں انسان نے یہ کام کیا کہ اس نے نباتات اور حیوانات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے قدرت کے پیدا کردہ اس توازن کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ۔ اور انسان کو اس کی اس حرکت کی سخت سزا بھی ملی اس طرح کہ اس توازن کو خراب کرنے کی وجہ سے حیوانات ' حشرات اور نباتات کو مختلف بیماریوں کو سامنا کرنا پڑا"۔

"وجود انسان کے حوالے سے اس توازن کی جو اہمیت ہے اس کی حقیقت درج ذیل واقعہ سے اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے ۔ کئی سال ہوئے آسٹریلیا میں ایک قسم کے خاردار خربوزے کی کاشت کی گئی ۔ یہ کاشت بطور حفاظتی باڑ کی گئی لیکن یہ فصل اس قدر پھیل گئی کہ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر رقبے کو گھیر لیا جو انگلینڈ کے برابر تھا ۔ اس نے شہروں کے شہر اجاڑ دیئے اور لوگوں کی فصل تباہ ہو گئی ' یہاں تک کہ لوگوں کے لیے فصل بونا مشکل ہو گئی ۔ لوگوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس کے پھیلاؤ پر کنٹرول کیا جائے مگر ممکن ہی نہ ہوا ۔ پورے آسٹریلیا کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس پر خاردار خربوزے کی یہ فصل قابض ہو جائے ' کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ نہ تھی"۔

"علماء حشرات لارض پوری دنیا میں پھیل گئے تحقیقات شروع کر دی یہاں تک کہ انہوں نے ایک کیڑا دریافت کر لیا جس کی خوراک صرف یہ خربوزہ تھا۔ یہ کیڑا بھی اسی تیزی سے پھیل رہا تھا جس تیزی سے یہ خاردار خربوزہ پھیلا تھا۔ آسٹریلیا میں اس کیڑے کے سامنے بھی کوئی طبعی رکاوٹ نہ تھی' یہ کیڑا اس قدر پھیلا کہ اس نے خاردار خربوزے کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جونہی یہ خربوزہ ختم ہوا اس کیڑے نے بھی ختم ہونا شروع کر دیا۔ اس کی نہایت ہی قلیل مقدار باقی رہ گئی۔ یہ گویا قدرت نے اس خربوزے کے پھیلاؤ کے خلاف باقی رکھی۔ یوں قدرت نے ضابطے اور توازن کو قائم رکھنے کا یہ انتظام کیا"۔

"سوال یہ ہے کہ ملیریا کے مچھرنے کیوں نہ اس پوری دنیا پر غلبہ پایا کہ ہمارے آباء و اجداد اس سے مرجاتے۔ یا اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر وہ حاصل کر لیتے۔ اسی طرح زرد بخار کے مچھر کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے' ایک موسم میں تو اس نے اس قدر پیش قدمی کی کہ نیویارک تک پہنچ گیا۔ بحر منجمد میں بھی کئی قسم کے مچھر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح .... کا زیادہ پھیلاؤ کن اسباب کی وجہ سے نہ ہوا۔ اور یہ اپنے گرم منطقوں تک ہی محدود رہی اور اس طرح اس کی افواج کی زد سے انسان بچ سکا ورنہ کرۂ ارض پر سے انسان کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ انسان طاعون' دوسری مہلک وباؤں 'مہلک جراثیم کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ خود انسان کے پاس ان چیزوں سے بچنے کی دوائیں تو کل تک نہ تھیں پھر کیسے بچا۔ پھر کل تک تو انسان حفظان صحت کے بنیادی اصولوں سے بھی نابلد تھا۔ کیا ایسے حالات میں نوع انسان کا باقی رہنا ایک معجزہ نہیں ہے"۔

"پھر دیکھئے کہ حشرات لارض کے اس طرح کے پھیپھڑے نہیں ہیں جس طرح کہ انسان کے ہیں۔ یہ حشرات بعض نالیوں کے ذریعے سانس لیتے ہیں جو ان کے جسم میں ہیں۔ جب یہ حشرات ایک حد تک بڑے ہو جاتے ہیں تو ان نالیوں سے اس قدر آکسیجن داخل نہیں ہو سکتی جو ان کے جسم کے لیے کافی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا چند انچ سے زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان حشرات کے پر بھی زیادہ طویل نہیں ہوتے۔ ان کیڑے مکوڑوں کی تخلیق اور تشکیل کے نظام کی رو ہی سے وہ ایک مقدار سے زیادہ بڑے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قدرت کے نظام نے ان کے پھیلاؤ کو روک دیا ہے۔ اس طرح اس دنیا کو ان کی زد سے بچا لیا گیا۔ اگر حشرات لارض کے لیے تحدید کا یہ اصول نہ رکھا گیا ہوتا تو اس کرۂ ارض پر انسان کا زندہ رہنا ہی ممکن نہ تھا۔ ذرا فطری انسان کے بارے میں سوچیں کہ اس کے مقابلے میں شیر کے جسم کے برابر سرخ مکھی یا اس کے مقابلے میں شیر کے جسم کے برابر مکڑی آجائے تو کیا انسان ایسی چیزوں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟"

"حیوانات کی جسمانی طبیعی ساخت میں بعض دوسرے معجزات بھی ہیں کہ اگر حیوانات کے لیے یہ قدرتی انتظامات نہ ہوتے تو کوئی حیوان بلکہ کوئی پودا اس جہان میں موجود ہی نہ ہوتا"۔

آئے دن انسانوں پر ایسے انکشافات ہو رہے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مخلوق کے اندر نہایت دقیق اور لطیف توازن رکھا ہوا ہے اور کائنات کی تمام مخلوقات کے لیے ایک متعین مقدار اور وزن مقرر ہے۔ جوں جوں انسانی علم آگے بڑھتا ہے انسان اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے لگتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵ : ۲) "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی"۔ لیکن یہ بے حد افسوسناک بات ہے کہ مشرکین اس حقیقت کو پا نہیں رہے۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا (۲۵ : ۳) "لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے' جو نہ مارتے ہیں اور نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔

یوں اللہ تعالیٰ ان کے خود ساختہ خداؤں کو' خدائی کے تمام خصائص سے عاری کر دیتا ہے۔

لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا (۲۵ : ۳) "وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے"۔ جبکہ رب تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے۔

وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ (۲۵ : ۳) "وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں"۔ یعنی ان کو خود اللہ نے پیدا کیا ہے' اور ان کو وجود بخشا ہے۔ سب کا خالق اللہ ہے' چاہے وہ ملائکہ ہوں' جن ہوں' بشر ہوں' درخت ہوں یا پتھر ہوں۔

وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا (۲۵ : ۳) "وہ خود اپنے لیے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے"۔ ان کی بندگی کرنے والوں کا نفع و نقصان تو دور کی بات ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کوئی اپنے لیے نفع کا اختیار نہیں رکھتا مگر نقصان تو دے سکتا ہے مگر یہ الہ ایسے ہیں کہ اپنے لیے کسی نقصان کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس لیے اس کو نفع سے بھی پہلے لایا گیا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو نقصان پہنچانا تو بہت ہی آسان کام ہے لیکن یہ لوگ وہ بھی نہیں پہنچا سکتے۔ اس کے بعد ان خصائص کا ذکر کیا جاتا ہے جو صرف اللہ کی خصوصیات میں سے ہیں۔

لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا (۲۵ : ۳) "جو نہ مار سکتے ہیں' نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مارے ہوؤں کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔ نہ وہ زندہ کو مار سکتے ہیں' نہ زندگی کو پیدا کر سکتے ہیں' اور نہ مردے کو دوبارہ زندگی دے سکتے ہیں۔ اگر وہ یہ کام نہیں کر سکتے تو پھر وہ کس چیز کے خدا ہیں۔ اور وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے مشرکین نے ان کو خدا بنا رکھا ہے۔

یہ کھلی گمراہی ہے اور اس کے بعد ان سے وہ باتیں بعید نہیں جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کہتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ اللہ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں تو رسول اللہ کے بارے میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان سے مستبعد نہیں ہے۔ کسی انسان کی کیا اس سے بھی کوئی بات قبیح ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ پر الزام لگائے' حالانکہ اللہ مالک خالق اور مدبر اور مقدر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا گناہ سب سے گھناؤنا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تمہاری تخلیق کی ہے"۔ ان تجعل للہ ندا وھو خلقك (متفق علیہ)۔

مقام الوہیت پر ان کی گستاخی کے ذکر کے بعد اب مقام رسالت پر ان کی دست درازی کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس پر

کی تنقید کی جاتی ہے۔جس سے ان کے اس اعتراض کا چھوٹا اور پوچ ہونا اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶

"جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے"۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں "یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں"۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے' اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہ تھا وہ جھوٹ جو اہل قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھتے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بہت ہی بڑا افتراء ہے۔ کیونکہ قریش کے کبراء عوام کو جن باتوں کی تعلیم دیتے تھے' ان سے یہ بات کس طرح مخفی رہ سکتی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قرآن کی تلاوت فرما رہے ہیں وہ بشری اسالیب کلام سے بالکل ایک مختلف کلام ہے۔ وہ اس بات کو اپنے دل میں اچھی طرح محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ انسانی اسالیب کلام سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب وہ قرآن سنتے تھے تو وہ خود بھی اس سے بے حد متاثر ہو جاتے تھے۔ پھر بعثت سے قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کو پورا پورا یقین تھا کہ حضرت محمدؐ صادق اور امین ہیں۔ وہ نہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ نہ خیانت کرنے والے تھے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھیں۔ ایک بات اللہ نے نہیں کی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

وہ ایک تو عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ الزام لگاتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو دوسرے عرب کے مقابلے میں مکہ میں ایک قسم کی دینی سیادت حاصل تھی اور اس کی وجہ سے عربوں میں ان کا ممتاز مقام تھا' اس وجہ سے وہ عام عربوں میں یہ الزام پھیلاتے تھے کیونکہ عام عرب اسالیب کلام سے واقف نہ تھے۔ اور نہ وہ قرآن اور عام کلام میں فرق کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ کہتے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (۲۵ : ۴) "یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے اور اس پر اسے خود گھڑ لیا ہے اور اس پر کچھ دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے"۔ روایات میں تین یا زیادہ عجمی غلاموں کے نام لیے گئے ہیں کہ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (۲۵ : ۴) میں یہ لوگ اس طرف اشارہ کرتے تھے۔ یہ بات کس قدر بے تکی تھی۔ یہ اس قابل ہی نہ تھی کہ اس پر کوئی بحث کی جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کلام چند عجمی

غلاموں کی امداد سے بنایا جا سکتا تھا تو آخر انہوں نے اس کے جواب میں کیوں ایسا کلام نہ بنایا۔اس طرح تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کو باطل کر سکتے تھے جبکہ قرآن کریم نے ان کو بار بار چیلنج بھی کیا اور وہ بار بار ایسا کلام لانے میں ناکام بھی رہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہاں ان کی اس بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا بلکہ اس کی واضح تردید کر دی۔

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا (۲۵ : ۴) "بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں"۔ یہ سچائی پر ظلم کرتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرتے ہیں' اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں' ان کا جھوٹ واضح ہے اور بادی النظر میں باطل ہے۔جس کی تردید کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

مزید الزامات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن مجید کے متعلق

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰي عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۲۵ : ۵) "کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں"۔ قرآن کریم نے اقوام سابقہ کے قصص نقل کیے ہیں۔ یہ عبرت 'نصیحت' تربیت اور ہدایت کی خاطر۔ ان سچے قصوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۵ : ۵) کہ یہ پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ یہ اس کے لیے نوٹ کر لی جائیں تاکہ اس پر صبح و شام پڑھی جائیں کیونکہ حضورؐ خود تو امی تھے 'لکھ پڑھ نہ سکتے تھے اور خود حضور اکرمؐ ان کہانیوں کو پھر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ان کے اس دعویٰ کے اندر ہی شکست پوشیدہ ہے کیونکہ ان کا دعویٰ ہی بے بنیاد ہے۔اس قدر پوچ کہ اس پر بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔قرآن کریم نے قصص کو جس انداز میں پیش کیا ہے۔وہ جس مقصد کے لیے لائے جاتے ہیں۔ان سے جو استدلال کیا جاتا ہے اور جس طرح نفاست کے ساتھ وہ اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ان سے جس گہرائی کے ساتھ مقاصد عالیہ ثابت ہوتے ہیں' ان میں اور پرانے قصے کہانیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔کیونکہ پرانے قصوں میں کوئی فکر اور کوئی نظریہ نہیں ہوتا' نہ ان قصوں کے پیش نظر کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔یہ قصے محض تفریح کی لیے اور فارغ اوقات میں اپنے آپ کو مصروف کرنے کے لیے 'لکھے اور پڑھے جاتے ہیں فقط۔(تفصیلات کے لیے دیکھیے "التصویر الفنی فی القرآن" کا فصل "القصہ")۔

انہوں نے قرآن کریم کو اساطیر الْاَوَّلِيْنَ (۲۵ : ۵) کہا ہے' اشارہ اس طرف ہے کہ یہ قصے بہت ہی پرانے زمانے کے ہیں۔ لہٰذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لازماً وہ لوگ پڑھتے ہوں گے۔ان کا علم حاصل کرتے چلے آتے ہیں۔لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کے اس الزام کا رد یوں کرتا ہے کہ بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا نزول اس ذات کی طرف سے ہو رہا ہے جو ہر علم والے سے زیادہ علیم ہے۔وہ تمام اسرار و رموز کا جاننے والا ہے یعنی اللہ اور اللہ پر اولین اور آخرین کا کوئی علم پوشیدہ نہیں ہے۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۵ : ۶) "اے نبی ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے"۔ قصص گویان دنیا کہاں اور وہ علیم و خبیر کہاں۔ انسان کا محدود علم اور ارض و سما کے وسیع علم رکھنے والے اللہ کے علم کامل و شامل کا مقابلہ ہی کیا ہے۔ ایک حقیر قطرے اور ایک بحر ناپید کنار کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بڑی غلطی کر رہے ہیں جو رسول اللہ پر یہ بوگس اور پوچ الزام عائد کرتے ہیں جبکہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کے قائل ہیں حالانکہ اللہ نے ان کی تخلیق کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس عظیم گناہ سے وہ باز آ سکتے ہیں۔ اللہ جو زمین و آسمانوں کے بھیدوں کا واقف ہے۔ وہ ان کی افترا پردازیوں اور ان کی سازشوں سے خوب خبردار ہے لیکن اس کے باوجود وہ غفور و رحیم ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۵ : ۶)

--- ()()() ---

اسی موضوع پر بات مزید آگے بڑھتی ہے۔ رسول اللہ کے بارے میں ان کے مزید اعتراضات کہ آپ بشر کیوں ہیں اور دوسرے لغو مطالبات کو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝

"کہتے ہیں" یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا' اور یہ ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحرزدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"۔ دیکھو' کیسی کیسی حجتیں یہ لوگ تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں' ایسے بہکے ہیں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔ بڑا بابرکت ہے وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے' (ایک نہیں) بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں' اور بڑے بڑے محل"۔

یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا' چلتا پھرتا انسان ہے اور تمام تصرفات و حرکات انسانوں جیسے کرتا ہے۔ یہ وہی گھسا پٹا

اعتراض ہے جو لوگ ہمیشہ رسولوں پر کرتے چلے آئے ہیں کہ فلاں شخص نے رسول ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ دیکھو بھائی فلاں کا بیٹا بھی اب رسول بن گیا۔ یہ تو ہم جیسا انسان ہے جس طرح ہم کھاتے پیتے ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔ یہ بھی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ ہو اور اللہ کی طرف سے اس پر وحی آ رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا اتصال اور رابطہ عالم بالا سے ہو جائے۔ اور یہ عالم بالا سے ہدایات لے رہا ہو۔ جبکہ وہ ہمارے جیسا گوشت و پوست کا بنا ہوا انسان ہے۔ آخر ہماری طرف وحی کیوں نہیں آتی۔ اور وہ جس علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتا۔ جبکہ ہمارے اور اس رسول کے درمیان کوئی بات ایسی نہیں ہے جو امتیازی ہو۔

اس لحاظ سے یہ بات واقعی انوکھی معلوم ہوتی ہے اور مستبعد نظر آتی۔ لیکن دوسرے لحاظ سے طبعی اور معقول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی ہے اور اسی روح کی وجہ سے انسان' انسان بنا ہے اور اسی وجہ سے اللہ نے اسے خلافت ارضی سپرد کی ہے حالانکہ انسان ایک محدود علم رکھتا ہے۔ اس کا تجربہ محدود ہے اور اس کے پاس بہت کم وسائل ہیں اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ عظیم فریضہ ادا کرنے کے لیے بے آسرا اور بغیر معاونت کے چھوڑ دے اور بغیر ہدایت اور راہنمائی کے یوں ہی چھوڑ دے۔ جبکہ اس کے اندر اللہ نے یہ صلاحیت بھی رکھی کہ وہ عالم بالا سے تعلق بھی قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک انسان کو اس مقصد کے لیے چن لے کہ وہ عالم بالا کی ہدایات اخذ کرے اور لوگوں تک پہنچائے۔ اور اس شخص کو اللہ اس مقصد کے لیے خصوصی استعداد بھی دے تاکہ جب بھی ان پر کوئی مسئلہ مشتبہ ہو تو یہ شخص اللہ کی ہدایت کی روشنی میں اسے حل کر دے اور جب بھی راہ ہدایت کے اختیار کرنے میں ان کو ضرورت ہو وہ ان کی معاونت کرے۔

یہ تو انسان کے لیے' اس پہلو سے' اور اس شکل میں ایک بہت بڑا اعزاز ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اس اعزاز کو سمجھتے نہیں ہیں۔ نہ وہ انسان کے اس اعزاز اور تکریم کی قدر کرتے ہیں۔ اس لیے جن لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھتی۔ وہ اس اعزاز کا انکار کرتے ہیں کہ انسانوں میں سے کوئی شخص کس طرح رسول ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے مقابلے میں اس مقصد کے لیے فرشتہ زیادہ موزوں تھا۔

لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۲۵ : ۷) "کیوں نہ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا اور نہ ماننے والوں کو دھمکاتا"۔ جبکہ اللہ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ انسان کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ نے انسان کو اس کی بعض خصوصیات کی وجہ سے مکرم بنایا تھا اور یہ خصائص خود انسان کے اندر عالم بالا کی طرف سے پھونکی ہوئی روحانیت کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

پھر ایک انسان کو انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجنے کی ایک اور حکمت بھی ہے۔ ایک انسان انسانوں جیسے احساسات رکھتا ہے وہ انسان جیسا ذوق رکھتا ہے۔ پھر اس کے تجربات بھی ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ وہ ان کے دکھ درد اور ان کی خواہشات کو انسان ہونے کے ناطے سمجھ سکتا ہے۔ وہ ان کے جذبات اور میلانات کو بھی سمجھ سکتا ہے۔ وہ انسانوں کی ضروریات اور ان کی ذمہ داریوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کی کمزوریوں اور نقائص کا خیال کرتا ہے' وہ ان کی قوت اور ان کی استعداد سے پرامید بھی ہوتا ہے۔ اور ان کو لے کر قدم بقدم آگے چلتا ہے۔ وہ ان

کے تاثرات اور ان کے ردعمل سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے ۔ کیونکہ وہ بھی انہی میں سے ایک ہے ۔ اور انہی کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے مبعوث ہوا ہے اور اللہ کی ہدایت اور امداد سے ان کی راہنمائی کر رہا ہے ۔

پھر ان لوگوں کے لیے بھی ممکن ہے کہ وہ حضرت رسول اکرم ؐ کی پیروی کریں کیونکہ وہ انہی جیسا انسان ہے ۔ وہ ان انسانوں کو لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے ۔ وہ ان کے اندر رہ کر ایک اخلاقی نمونہ پیش کرتا ہے ۔ اور ان کو عملاً ان اخلاق و فرائض کی تعلیم دیتا ہے جو اللہ نے ان پر فرض کیے ہیں اور جن کا اللہ ان سے مطالبہ فرماتا ہے ۔ گویا وہ اس نظریہ اور عمل کا ایک نمونہ ہوتا ہے جسے وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اس کی زندگی ' اس کے اعمال اور اس کی تمام حرکات ایک کھلی کتاب ہوتی ہے ' جسے وہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ اس کتاب کی ایک ایک سطر کو نقل کرتے ہیں اور اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو حقیقت کا روپ عطا کرتے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا رسول ہر بات کو عملاً پیش کرتا ہے تو وہ بھی اس کی تقلید کرتے ہیں کیونکہ یہ نظریہ اور ہدایت ایک شخص کی زندگی میں عملاً نظر آتی ہے ۔ اگر رسول کوئی فرشتہ ہوتا تو لوگ نہ اس کے عمل دیکھ سکتے اور نہ اس کی تقلید کے بارے میں سوچ سکتے ۔ کیونکہ ان کے اندر آغاز ہی سے یہ بات آجاتی کہ وہ تو ایک فرشتہ ہے ۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے اور ہم ضعیف انسان ہیں ۔ ہم اس جیسا طرز عمل کب اختیار کر سکتے ہیں ۔ یا ہم اس کی تقلید کس طرح کر سکتے ہیں یا اس جیسا نمونہ وہ کس طرح پیش کر سکتے ہیں ۔

یہ تھی اللہ کی حکمت جس نے ہر چیز کی تخلیق کی اور اسے پوری پوری طرح برابر کیا ۔ یہ اس کی حکمت تھی کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ ان کی قیادت کر سکے اور رسول کے بشر ہونے پر اعتراض دراصل اس حکمت سے جہالت کی وجہ سے کیا جاتا ہے ۔ پھر اس میں اللہ کی طرف سے انسان کی عزت افزائی بھی ہے اور جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ انسان کی تکریم کی نفی کرتے ہیں ۔

ان کا دوسرا اعتراض اس سے بھی زیادہ سادگی اور جہالت پر مبنی تھا کہ یہ رسول بازاروں میں پھرتا ہے اور اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرتا ہے اور محنت کرتا ہے تو کیوں اللہ نے اسے اس قدر دولت نہ دی کہ وہ اپنی ضروریات کی طرف سے بے غم ہو جائے ۔ اور بغیر محنت کے اسے ضروریات ملتی رہیں ۔

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (۲۵ : ۸) "یا اس کے لیے کوئی خزانہ ہوتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا" ۔ اللہ نے یہ نہ چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی خزانہ ہوتا یا آپ کسی بڑے باغ کے مالک ہوتے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے لیے ایک نمونہ بنا رہا تھا تاکہ آپ ؐ رسالت کے منصب کے فرائض کو اٹھائیں اور ان فرائض کے ساتھ ساتھ آپ ؐ اپنی امت کے دوسرے انسانوں کی طرح بطور انسان اپنی ذمہ داریاں خود اٹھائیں ۔ اپنے رزق کے لیے خود سعی کریں تاکہ امت میں سے کوئی شخص یہ اعتراض نہ کر سکے کہ یہ شخص کوئی کاروبار نہ کر پاتے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قناعت اختیار کرنے والے تھے ۔ اس لیے آپ کو ضروریات زندگی کے لیے بہت زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ تبلیغ رسالت کے فرائض کی ادائیگی کے لیے فارغ ہو گئے تھے ۔ لہٰذا اس سلسلے میں آپ ؐ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں آئی ۔ چنانچہ آپ اپنی ضروریات کے لیے بھی بقدر ضرورت جدوجہد فرماتے تھے ۔ اور رسالت کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے

تاکہ آپ کو نمونہ بناکر آپ کی امت کا ہر فرد تبلیغ رسالت کے فرائض کا کچھ حصہ اپنے ذمہ لے اور اپنی ضروریات کے لیے بھی جدوجہد کرے۔ بعد کے ادوار میں دولت کا ایک سیلاب آپ کے قدموں میں جاری ہو گیا۔ اور اللہ نے رسول کی زندگی کو اس پہلو سے بھی آزمایا تاکہ لوگوں کے لیے یہ پہلو بھی نمونہ ہو۔ چنانچہ آپ نے کبھی دولت کے اس سیلاب کی طرف توجہ نہیں دی۔ آپ ہوا کے طوفان کی طرح سخی تھے۔ چنانچہ آپ نے دولت مندی کے فتنے پر بھی قابو پایا۔ یوں لوگوں کے دلوں سے دولت مندی کی ہوس کو بھی نکال دیا۔ تاکہ لوگ یہ اعتراض نہ کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغام لے کر نکلے 'ایک غریب آدمی تھے' آپ کی کوئی مالی سرگرمی نہ تھی' نہ مالی حیثیت تھی اور اب آپ لاکھوں اربوں میں کھیل رہے ہیں۔ ہر طرف سے آپ پر مال و دولت کی بارش ہے لیکن حضورؐ نے دولت کے اس سیلاب کو بھی اپنے آپ سے دور رکھا اور دعوت اسلامی کے کام میں اسی طرح مشغول ہو گئے جس طرح کہ وہ زمانہ فقر میں مشغول تھے۔

مال کیا چیز ہے' خزانوں کی حقیقت کیا ہے؟ باغات کی کیا حیثیت ہے۔ جب ایک ضعیف اور فانی انسان خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے لئے اس پورے کرۂ ارض اور مافیہا کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے نزدیک اس پوری کائنات میں بسنے والی اس پوری مخلوقات کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی یہ حالت تب ہوتی ہے کہ جب اس نے خالق کائنات تک رسائی حاصل کر لی جو قلیل و کثیر کا بخشنے والا ہے لیکن اس وقت لوگ اس حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر تھے۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۲۵:۸) "اور یہ ظالم کہتے ہیں تم تو ایک سحرزدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے"۔ یہ وہ ظالمانہ بات ہے جو اللہ نے ان لوگوں کی زبان سے نقل کیا ہے۔ سورت اسرا میں بھی ان لوگوں کا یہ الزام لفظاً لفظاً نقل فرمایا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (۲۵:۹) "دیکھئے' یہ لوگ آپ کے بارے میں کیسی باتیں کرتے ہیں' یہ گمراہ ہو چکے ہیں' اب ان کی استطاعت ہی میں یہ بات نہیں رہی کہ یہ راہ راست پالیں"۔ اس سورت اور سورہ اسرا کا مضمون و موضوع ایک ہی جیسا ہے اور یہ دونوں سورتوں کی بات ایک ہی ماحول میں ہو رہی ہے۔ دونوں جگہ ان لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے' انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملہ کیا ہے اور ذاتی نقص نکالا ہے یعنی وہ لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس شخص کی عقل ماری گئی ہے' کیونکہ یہ عجیب و غریب باتیں کرتا ہے' ایک عام نارمل شخص ایسی باتیں نہیں کیا کرتا۔ لیکن اس اعتراض سے ان کے لاشعور سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو گئی کہ رسول اللہ جو باتیں فرماتے ہیں وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ عام طور پر بڑے سے بڑا عقلمند شخص بھی ایسی باتیں نہیں کرتا۔ یہ باتیں انسانی طاقت سے بالا باتیں ہیں۔ اس لیے ان پر رد کرتے وقت بھی اللہ نے ان کے اس رویے پر صرف تعجب کا اظہار کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ (۲۵:۹) "دیکھو' یہ تمہارے بارے میں کیا حجتیں کرتے ہیں"۔ آپ کو سحرزدہ لوگوں کے ساتھ مشابہ قرار دیتے ہیں' کبھی کہتے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے باتیں بناتے ہیں' کبھی کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں جو آپ لکھواتے ہیں۔ یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں۔ اور سچائی سے دور کی باتیں ہیں۔ یہ

سچائی کے تمام راستوں سے بے راہ ہو گئے ہیں۔ اور اب ان کے اندر ہدایت کی راہ پانے کی استطاعت ہی نہیں رہی۔

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا (۲۵: ۹) اب یہ بحث یوں ختم کی جاتی ہے کہ یہ لوگ جو تجاویز دیتے ہیں وہ احمقانہ ہیں۔ ان کے تصورات دنیا پرستی کے محدود دائرے میں محدود ہیں۔ یہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنی دنیا ہی میں مگن ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ رسالت کے مقابلے میں چند ٹکوں کی قیمت زیادہ ہے لہذا رسولؐ کے پاس ٹکے ہونے چاہئیں۔ اس پر ہدایت الٰہی کے بجائے خزانہ عامرہ نازل ہونا چاہئے تھا' یا اس کے مقابلے میں ایک باغ اس کے پاس ہونا چاہئے تھا جس میں وہ صبح و شام کھاتا۔ یہ تھی ان کی سوچ' لیکن اگر اللہ چاہتا اور اس کی اسکیم یہ ہوتی تو وہ اپنے رسولؐ کو اس سے بھی زیادہ دیتا جس کا یہ کہتے ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (۲۵: ۱۰) "بڑا بابرکت ہے وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے۔ بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور بڑے بڑے محل"۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ تھی کہ آپ کو ایسے باغات و محلات سے بھی زیادہ قیمتی دولت دے۔ یعنی باغات اور محلات دینے والے کے ساتھ تعلق اور دوستی۔ یہ شعور کہ محمد اس کی نگرانی میں ہیں۔ اس کے قبضے میں ہیں اس کی ہدایت اور توفیق کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اور آپؐ اس مٹھاس کو ہروقت چکھتے رہتے ہیں۔ یہ روحانی غذا آپ کو ہروقت دی جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں جسمانی غذا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کا مال و منال خواہ کم ہو یا زیادہ' اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اے کاش کہ وہ اس فرق کو سمجھتے کہ آپ کو جو دولت دی گئی ہے وہ کس قدر قیمتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دنیا کے باغ و راغ کچھ بھی نہیں۔

---000---

یہاں تک تو قرآن نے خدا اور رسول اللہؐ پر ان کے اعتراضات کو نقل فرمایا' اب بات ان کے فکر و نظر کے فساد کے ایک دوسرے میدان میں داخل ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ضلال بعید میں مبتلا ہیں اور یہ تو قیام قیامت کے منکر ہیں۔ یہ چونکہ قیامت کی جوابدہی کے منکر ہیں اس لیے یہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں۔ ظلم کرتے ہیں افتراء باندھتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ان کو قیامت کی جوابدہی کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ اگر ان کے دل میں اللہ کے سامنے حاضر ہونے اور حساب دینے کا ڈر ہوتا تو وہ یہ افتراء پردازیاں ہرگز نہ کرتے۔ یہاں اب قیامت کے مناظر میں سے ایک ایسا منظر لایا جاتا ہے جو سخت سے سخت دل کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ جس کو دیکھ کر پوری طرح بجھے ہوئے دلوں میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔ اور وہ بھی اس دن کی ہولناکی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کافروں کے لیے یہ ہولناکی اور اہل ایمان کے لیے یہ حسن انجام۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝۱۱

إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿١٢﴾ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ﴿١٣﴾ لَّا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ﴿١٤﴾ قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَمَصِيرًا ﴿١٥﴾ لَّهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا ﴿١٦﴾

"اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اس گھڑی" کو جھٹلا چکے ہیں --- اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ وہ جب دور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے اور جب یہ دست و پابستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے' (اس وقت ان سے کہا جائے گا) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو"۔ ان سے پوچھو یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیز گاروں سے کیا گیا ہے' جو ان کے عمل کی جزا اور ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی' جس میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی' جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے' جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے"۔

یعنی وہ کفر اور ضلالت کی حدوں کو پار کر کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ قیامت کا انکار کر رہے ہیں۔ قرآن کا انداز تعبیر "بل" کا لفظ استعال کر کے' ان کی گمراہی یوں مجسم کرتا ہے کہ وہ اس راہ پر بہت دور چلے گئے ہیں یعنی پہلی باتوں کو چھوڑو' انہوں نے تو قیامت کا انکار کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ ان فتنہ پردازوں کے لیے کس قدر خوفناک عذاب تیار کیا گیا ہے۔ یہ آگ ہے جو حاضر ہے' دہکائی ہوئی ہے۔

وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا (٢٥ : ١١) "اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے' اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے"۔ یہاں قرآن کریم مجسم اور مشخص انداز میں آگ کو پیش کرتا ہے۔ تجسیم اور تشخیص قرآن مجید کا وہ انداز ہے جس میں ایسی اشیاء' ایسے معانی اور ایسے مفہومات کو زندہ شخص کے انداز میں پیش کرتا ہے جن کے لیے زندہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید مفاہیم و مناظر کو زندہ اشخاص کی شکل میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ کلام کے اندر اعلیٰ درجے کا اعجاز پیدا ہو جاتا ہے۔

ذرا سوچئے۔ ہم دہکتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ آگ ہمارے سامنے ایک زندہ غضبناک شخص کا روپ اختیار کرتی ہے کہ یہ دور سے ان مکذبین کو دیکھتی ہے۔ دیکھتے ہی یہ آگ غیظ و غضب میں مبتلا ہو جاتی ہے اور یہ لوگ دور سے اس کے اظہار غضب اور سخت کلامی کو پالیتے ہیں گویا وہ دور ہی سے ان پر حملہ آور ہونے کے لیے جوش دکھاتی ہے۔ اور جوش انتقام میں آپے سے باہر ہو رہی ہے حالانکہ یہ لوگ ابھی تک راستے میں ہوتے ہیں' پہنچے نہیں ہوتے۔ غرض یہ ایک نہایت ہی جھنجوڑنے والا منظر ہے جسے دیکھنے والوں کی ٹانگوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

دیکھئے اب یہ پہنچ گئی اپنی منزل تک - اب یہ لوگ کھلے نہیں چھوڑے جاتے کہ ہاتھ پاؤں سے یہ آگ کے ساتھ مقابلہ کریں اور آگ انہیں شکست دے دے - یہ اس سے بچنے کی کوشش کریں - اور وہ انہیں پکڑ لے - بلکہ انہیں پکڑ کر اس میں پھینک دیا جاتا ہے - اس حال میں کہ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کو آگ کے کھلے بال میں بھی نہیں پھینک دیا جاتا بلکہ دوزخ کی آگ کے ایک نہایت ہی تنگ مقام پر ان کو اندر کر دیا جاتا ہے - جس میں یہ بمشکل سماتے ہیں' اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے - اب یہ لوگ اس آگ سے رہائی پانے کے بارے میں بے حد مایوس ہوگئے ہیں - نہایت ہی کرب میں ہیں - اب مایوس ہوکر یہ صرف ہلاکت اور موت کی دعا کرتے ہیں -

وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا (۲۵ : ۱۳) "اور جب یہ اس میں تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے" - لیکن اب جہنم میں موت تو نہ پوری ہونے والی آرزو ہے - جبکہ یہ لوگ اس عذاب سے صرف موت کے ذریعہ ہی خلاصی پا سکتے ہیں کیونکہ یہ درد و کرب ناقابل برداشت ہے لیکن ان کو ان کی اس درخواست اور اس تمنا کا جواب بھی استہزاء اور مذاق کے ساتھ دیا جاتا ہے - جس طرح وہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے - یہ ایک تلخ مذاق ہے -

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (۲۵ : ۱۴) "آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو" - کیونکہ ایک بار کی ہلاکت تو تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گی - نہ ایک بار کی موت تمہارے لیے کافی ہے - تم بار بار مرو گے اور بار بار زندہ ہو گے -

ان کے اس حال کو پیش کرنے کے بعد اب ان کے بالمقابل متقین مومنین کے انجام کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے' جو اللہ سے ڈرتے تھے جو اللہ کے سامنے حاضر ہونے کی امید رکھتے تھے اور قیامت پر ان کا پختہ ایمان تھا - یہ انجام بھی ان کفار کو خطاب کرتے ہوئے نہایت ہی تلخ انداز میں پیش کیا جاتا ہے -

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا

(۲۵ : ۱۵) لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا

(۲۵ : ۱۶) "ان سے پوچھو یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے' جو ان کے عمل کی جزا اور ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی' جس میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی' جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے" - یہ شرمسار کنندہ عذاب بہتر ہے یا وہ باغات دائمی بہتر ہیں جو اللہ نے متقین کے لیے تیار کر رکھے ہیں - اللہ نے متقین کو یہ حق دیا ہے کہ یہ اس کا مطالبہ کریں - اور یہ طلب کریں کہ اے اللہ اپنا وعدہ پورا کیجیے اور اللہ وعدہ خلافی کرنے والا تو ہے نہیں - پھر یہ بھی ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو چاہیں وہاں طلب کریں - کیا ان دونوں مقامات کے درمیان موازنہ کرنے کی بھی کوئی بات ہے کہ ان سے موازنے کے لیے کہا جا رہا ہے - دراصل یہ ان کے ساتھ نہایت ہی تلخ مذاق ہے اور یہ ان کے اس مذاق کا جواب

ہے جو وہ یہاں اس رسول مقبول سے کرتے تھے۔

اب آخرت کا ایک دوسرا منظر جس کی تکذیب کرنے والے تکذیب کرتے تھے۔ یہ مشرکین کا اجتماع ہے ان کے ساتھ ان کے شرکاء بھی موجود ہیں جن کو یہ لوگ الٰہ اور شفیع سمجھتے تھے۔ یہ سب اللہ کے سامنے کھڑے اپنی اپنی جوابدہی کر رہے ہیں۔ سوال ہو رہے ہیں اور وہ جواب دے رہے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ﴿١٧﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ﴿١٨﴾ فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَظْلِمْ مِنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ﴿١٩﴾

"اور وہی دن ہو گا جب کہ (تمہارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے ان معبودوں کو بھی بلا لے گا جنہیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں' پھر وہ ان سے پوچھے گا "کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہ راست سے بھٹک گئے تھے؟" وہ عرض کریں گے "پاک ہے آپ کی ذات' ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں۔ مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے"۔ یوں جھٹلا دیں گے وہ (تمہارے معبود) تمہاری ان باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو' پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے اور جو بھی تم میں سے ظلم کرے اسے ہم سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے"۔

جن لوگوں کی مشرکین بندگی کرتے تھے بعض اوقات تو وہ بت ہوتے تھے' کبھی وہ ملائکہ اور جن ہوتے تھے اور کبھی دوسرے معبود ہوتے تھے۔ جن کو اللہ خوب جانتا ہے' لیکن اس کھلے میدان میں ان سے یہ سوال کرنا جواب طلب کرنا جب کہ سب کو اس مقصد کے لیے جمع کیا گیا ہو گا' زیادہ تشہیر اور شرمندہ کرنے کے لیے ہو گا۔ تشہیر جرم اور شرمندہ کرنا بھی دراصل ایک قسم کی سزا ہے اور جواب جو آ رہا ہے وہ ان تمام نمادالہوں کی طرف سے اللہ کے سامنے مکمل طور پر جھکنا ثابت کرتا ہے۔ اب یہ اللہ قہار اور مالک الملک کے سامنے مطیع فرمان کھڑے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی الوہیت کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی انکار کرتے ہیں کہ ان بے وقوفوں سے ان کی کوئی دوستی یا تعلق تھا۔ اس سے زیادہ مشرکین کے لیے اور شرمندگی کیا ہو گی کہ جن کو وہ الٰہ سمجھتے ہیں وہ ان کے اس تعلق سے بھی منکر ہوں گے۔

قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا (۲۵ : ۱۸) "وہ عرض کریں گے "پاک

ہے آپ کی ذات ' ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں ۔ مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا حتی کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے"۔ تو زندگی کا یہ مال و متاع جو مسلسل ان لوگوں کو حاصل رہا' جبکہ ان کو یہ معرفت بھی نہ تھی کہ یہ انعامات دینے والا بھی کوئی ہے اور نہ وہ دینے والے کا کوئی شکر ادا کرتے تھے تو اس غفلت نے ان کے دلوں سے ان انعامات کا احساس ہی دور کر دیا ۔ یہ لوگ سب کچھ بھول گئے ۔ چنانچہ ان کے دل اس طرح خشک اور غیر آباد ہو گئے جس طرح خشک سالی کے نتیجے میں زمین غیر آباد ہو کر بے آب و گیاہ ہو جاتی ہے ۔ یہاں لفظ بوار استعمال ہوا ہے جو ہلاکت کے معنی میں آتا ہے ۔ لیکن ہلاکت کے ساتھ اس کے مفہوم میں خشک سالی اور بے آب و گیاہ ہونا بھی داخل ہے یعنی دلوں کی خشکی اور زندگی کا خلا۔

چنانچہ یہاں اس مقام پر انہیں توہین آمیز خطاب کے ذریعہ شرمسار کیا جاتا ہے :

فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا (۲۵ : ۱۹) "یوں جھٹلا دیں گے وہ (تمہارے معبود) تمہاری ان باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو' پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے"۔ یعنی نہ اس مصیبت کا منہ کسی اور طرف موڑ سکو گے اور نہ کسی جانب سے تمہیں کوئی امداد مل سکے گی۔

یہ منظر تو آخرت کا چل رہا ہے اور حشر کا میدان ہے لیکن بیچ میں ایک جھلک دنیا کی بھی دکھا دی جاتی ہے ۔ یہ مکذبین اب زمین پر اس دنیا ہی میں نظر آتے ہیں ۔ اور ان سے کہا جاتا ہے ۔

وَمَنْ يَظْلِمْ مِنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا (۲۵ : ۱۹) "اور جو تم میں سے ظلم کرے اسے ہم سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔ اور قرآن کریم کا ایک مخصوص اسلوب ہے کہ وہ دلوں کو اس وقت چھوتا ہے جب وہ قبولیت کے لیے تیار ہوتے ہیں اور قیامت کا خوفناک منظر دیکھ کر وہ بات ماننے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔

--- ○○○ ---

اب جبکہ انہوں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے افتراء' تکذیب اور استہزاء کی انتہا کر دی ہے اور یہاں تک انہوں نے رسول اللہ کی بشریت' اس کی بازاروں میں چلت پھرت اور کھانے پینے پر بھی اعتراض کر دیا ہے' تو حضور اکرم کی طرف روئے سخن پھر جاتا ہے اور آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ صرف آپ ہی کو رسول ایسا نہیں بنایا گیا کہ ان لوگوں کو تعجب ہو رہا ہے بلکہ تمام رسول ایسے ہی تھے جس طرح آپ ہیں اور ان کے حالات بھی ایسے تھے جس طرح آپ کے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝۲۰

۲
ا اع

"اے نبی، تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔ دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ کیا تم صبر کرتے ہو؟ تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے"۔

اگر یہ لوگ اعتراضات کر رہے ہیں تو یہ آپ کی ذات پر معترض نہیں ہیں۔ یہ تو ان کی ایک سنت اور اللہ کے ایک مستقل طریقہ کار پر یہ لوگ معترض ہیں۔ یہ طریق کار طے شدہ ہے۔ مقرر اور متعین ہے۔ اور اس کا ایک متعین انجام ہے۔

وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (۲۵ : ۲۰) "دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے"۔ تاکہ جو لوگ اللہ کی حکمت اور تدبیر کو نہیں جانتے۔ وہ اعتراض کرتے رہیں اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اس کی حکمت اور اس کے تصرفات کو جانتے ہیں وہ صبر کرتے رہیں اور دعوت اسلامی غالب ہو اور غلبے کا مقابلہ کرنے اور اس مقابلے اور کشمکش میں انسانی وسائل استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس کشمکش میں جو شخص ثابت قدم رہے وہ کامیاب ہوئے۔

اَتَصْبِرُوْنَ (۲۵ : ۲۰) "کیا تم صبر کرتے ہو؟" یعنی کیا تم مشکلات پر صبر کرو گے۔ تو

وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا (۲۵ : ۲۰) "تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے"۔ وہ تمام لوگوں کے مزاج کو دیکھ رہا ہے۔ تمام دلوں کو دیکھ رہا ہے، اور تمام لوگوں کے حالات اور انجام کا اسے علم ہے۔ تمہارا پورا اجر ملے گا۔

وَ كَانَ رَبُّكَ (۲۵ : ۲۰) میں اللہ نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب کہہ کر پکارا ہے۔ اس انداز بیان سے دل پر خوب اثر ہوتا ہے۔ دل تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اسے تسلی ہوتی ہے اور سکون ملتا ہے۔ اور وہ از سر نو جدوجہد کے لیے تیار ہوتا ہے۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اے محمدؐ ہم دیکھ رہے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، قدر مت کرو، نہ صرف یہ کہ ظاہری حالات ہماری نظر میں ہیں بلکہ نہایت خفیہ اور دلوں کی بات بھی ہماری نظر میں ہے۔ اس انداز بیان سے اللہ اپنے آپ کو اپنے بندوں کے قریب بتاتا ہے۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

پارہ ۔۔۔۔۔ ۱۹

سورۃ الفرقان ۔ ۲۵

۲۱۔۔ تا۔۔ ۷۷

سورۃ الشعراء ۔ ۲۶

۱۔۔ تا۔۔ ۲۲۷

سورۃ النمل ۔ ۲۷

۱۔۔ تا۔۔ ۱۵۹

درس نمبر ۱۵۸ ایک نظر میں

اس سبق کا آغاز بھی اسی انداز سے ہوتا ہے جس سے درس سابق کا ہوا تھا اور مضمون بھی اسی انداز سے چلتا ہے ' البتہ یہاں مشرکین کے اعتراضات کا رخ رب تعالیٰ کی طرف ہے۔ یہاں وہ اللہ پر اعتراضات کرتے ہیں اور اللہ کو اپنا مائحہ عمل دیتے ہیں۔ گویا اس سبق میں وہ اپنی سرکشی میں ترقی کرتے ہوئے رسول اللہؐ پر اعتراضات کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور خدا پر اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور دل جوئی کا ایک انداز ہے کہ یہ لوگ صرف آپ ہی پر اعتراضات نہیں کرتے بلکہ ان کی گستاخی اللہ کے جناب میں بھی ہے۔ البتہ یہاں جواب دینے کے بجائے نہایت ہی شتابی سے ان کو قیامت کے مناظر میں سے بعض مناظر کی جھلکیاں دکھا دی جاتی ہیں۔ اور یہی ان کی گستاخی کا مناسب جواب ہے۔ ان کی گستاخی یہ تھی۔

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا (۲۵ : ۲۱) "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں یا ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ اس کے بعد ان کا یہ اعتراض نقل کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم ٹکڑوں کی شکل میں کیوں اترا ہے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے اور یہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ کیوں قرآن مجید مسلسل ٹکڑوں کی شکل میں اترا۔ رسول اللہؐ کو تسلی دی جاتی ہے کہ جب بھی وہ مباحثہ کر کے کوئی بات لاتے ہیں' ہم بھی نئی تاویل آپ کو دے دیتے ہیں اور بہترین تفسیر اور تشریح کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد حضورؐ اور آپؐ کے مخاطبین کے غور کے لیے بعض مکذبین کی ہلاکت کے وقت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے کہ یہ اقوام کس طرح ہلاک کی گئیں۔ ذرا قوم لوط کے کھنڈرات پر تو غور کرو۔ تم رات دن ان پر سے گزرتے ہو۔ قرآن کریم ان پر سخت گرفت کرتا ہے کہ جب یہ رات دن ان کھنڈرات کو دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ سب باتیں اس لیے لائی گئی ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جو اعتراضات کرتے تھے' اس کا ایک بیان یہاں دے دیا جائے۔ یہ واقعات دے کر ان پر ایک زوردار تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں ان کا نہایت ہی حقارت آمیز نقشہ کھینچا جاتا ہے اور نہایت ہی حقیقت پسندانہ '

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۲۵ : ۴۴) "یہ تو بس حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں"۔

---000---

درس نمبر ۱۵۸ تشریح آیات

۲۱ --- تا --- ۴۴

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

"جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟ یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ بڑا گھمنڈ لے بیٹھے یہ اپنے نفس میں اور حد سے گزر گئے اپنی سرکشی میں۔ جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن نہ ہو گا۔ چیخ اٹھیں گے کہ 'پناہ بخدا' اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے بس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اس دن اچھی جگہ ٹھہریں گے اور دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے۔ آسمان کو چیرتا ہوا ایک بادل اس روز نمودار ہو گا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اتار دیئے جائیں گے۔ اس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمٰن کی ہو گی اور وہ منکرین کے لیے بڑا سخت دن ہو گا۔ ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا "کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی' کاش میں نے فلاں شخص کو

دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی' شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"۔

مشرکین کو ہماری ملاقات کی امید نہیں ہے اور نہ وہ اس کا انتظار کرتے ہیں اور نہ وہ اس کو کوئی اہمیت دیتے ہیں نہ اپنی زندگی اور اس کی سرگرمیوں کو وہ اس نظریہ کے مطابق قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دلوں میں نہ اللہ کا خوف ہے' نہ اللہ کی محبت اور وقار ہے۔ اس لیے اللہ کے حوالے سے بھی ان کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو کبھی بھی ایسے شخص کی زبان سے نہیں نکل سکتے جسے خدا کا خوف ہو۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا

(۲۵ : ۲۱) "جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟ یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ یہ لوگ اس بات کو مستبعد سمجھتے تھے کہ کوئی رسول بشر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ مطالبہ کرتے تھے کہ جس عقیدے کی طرف ہمیں دعوت دی جا رہی ہے' کوئی فرشتہ اترے اور وہ اس پر شہادت دے۔ یا یہ کہ وہ خود باری تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی تصدیق کریں۔ یہ دراصل اللہ کے مقام اور مرتبہ پر دست درازی ہے اور اس جاہل اور سرکش کا مطالبہ ہے جو مقام رب العالمین کا کوئی احساس نہیں رکھتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدر اس طرح نہیں کرتا جس طرح حق تعالیٰ کی قدر ہونا چاہئے۔ یہ گستاخی کرنے والے کون ہوتے ہیں اور ان کی اللہ کے مقابلے میں حیثیت ہی کیا ہے جو برگزیدہ' جبار اور کبیر ہے۔ یہ اللہ کی عظیم مملکت اور اللہ کی اس عظیم کائنات میں حیثیت ہی کیا رکھتے ہیں۔ ایک حقیر ذرے کی حیثیت تو ان کی ہے۔ انسان کی اس کائنات میں کوئی حیثیت اگر بنتی بھی ہے تو تب بنتی ہے کہ وہ اپنا تعلق اللہ سے جوڑ کر اور اپنے وزن ایمان کے ذریعہ بڑھا کر اپنی کچھ حیثیت پیدا کرے۔ چنانچہ اس آیت کے اندر بات ختم کرنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ بتا دیتا ہے کہ اس گستاخی کا سبب کیا ہے۔

لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا کَبِیْرًا (۲۵ : ۲۱) "بڑا گھمنڈ لیے بیٹھے ہیں یہ اپنے نفسوں میں اور حد سے گزر گئے ہیں یہ اپنی سرکشی میں"۔ وہ اپنے خیال میں بہت بڑی شے ہیں۔ چنانچہ وہ گھمنڈ میں مبتلا ہیں اور اس گھمنڈ کی وجہ سے بہت ہی بڑی سرکشی میں مبتلا ہیں۔ یہ اپنے اندر اس قدر مست ہیں کہ حقیقی قدروں کا صحیح وزن نہیں کر سکتے۔ اب ان لوگوں کی عادت یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے نفس کا احساس کرتے ہیں۔ ان کا نفس ان کی نظروں میں اس قدر بڑی چیز ہے کہ اس کائنات میں وہ اپنے نفس ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ اس قدر بڑی چیز کہ اللہ جل شانہ کو بھی اس کے سامنے ظاہر ہونا چاہئے تاکہ وہ اسے دیکھ کر اس کی تصدیق کریں اور اس پر ایمان لائیں۔

ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اللہ بطور مذاق اور استہزاء ان کے سامنے ان کی بدحالی اور لاچاری کا ایک نقشہ پیش کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب قیامت کے دن یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (ملائکہ کا دیکھنا بھی ان کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ تھا) تو اس دن ان پر برا دن ہو گا۔ ان کا حال یہ ہو گا کہ ان کے سامنے وہ عذاب موجود ہو گا جو ٹلنے والا نہ ہو گا' اس سے نجات کی ان کو کوئی صورت نظر ہی نہ آئے گی اور یہ عذاب اور جزاء کا دن ہو گا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا

(۲۵ : ۲۲) وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵ : ۲۳) "جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن ہو نہ گا۔ چیخ اٹھیں گے کہ پناہ بخدا اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے"۔ جس دن ان کے اس مطالبے پر عمل ہو گا اور فرشتے سامنے آ جائیں گے۔ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ یہ ان فرشتوں کو دیکھ لیں گے۔ لیکن اس دن ان کے لیے کوئی خوشخبری نہ ہو گی بلکہ ان کے لیے عذاب کی خبر ہو گی۔ تو ان کا مطالبہ عجیب انداز میں پورا ہو گا۔ اس دن تو وہ یوں گویا ہوں گے۔ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵ : ۲۲) "خدا کی پناہ"۔ حرام اور ممنوع۔ یہ جملہ وہ شر سے بچنے کے لیے کہتے تھے۔ دشمنوں کو کہتے تھے۔ یہ وہ دشمنوں کے ہلاک ہونے اور ان کے شر سے محفوظ ہونے کے لیے کہتے تھے۔ یہ فقرہ قیامت میں ان کی زبان سے نکل پڑے گا۔ جس طرح یہ فقرہ وہ دنیا میں شر سے پناہ مانگنے کے لیے بول دیتے تھے۔ آج ان کو خدا کی پناہ نصیب کب ہو سکتی ہے۔ آج وہ لاکھ مرتبہ خدا کی پناہ مانگیں' ان کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵ : ۲۳) "اور وہ جو انہوں نے کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے"۔ یہ عمل ایک لحظہ میں مکمل ہو جائے گا۔ ان کے تمام اعمال غبار کی شکل میں اڑا دیے جائیں گے۔ انداز تعبیر کو ذرا دیکھیے۔ ہمارا خیال اس طرح دیکھتا ہے کہ ایک صاحب جسم ذات آتی ہے اور ان کے اعمال کو لے کر غبار کی طرح اڑا دیتی ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا انداز تجسیم اور تخییل۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دنیا میں اعمال صالحہ کی شکل میں جو کچھ جمع کیا تھا وہ غبار کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ ان کے یہ اعمال ایمان پر مبنی نہ تھے۔ ایمان کے ذریعہ ہی انسان اللہ تک پہنچتا ہے۔ ایمان اعمال صالحہ کو ایک منہاج اور ایک پختگی اور دوام بخشتا ہے اور یہ اعمال ایک مقصد اور ایک سمت رکھتے ہیں۔ نہ یہ کسی وقتی جذبے کے تحت صادر ہوتے ہیں اور نہ کسی ایسے شخص کی دوڑ دھوپ ہوتی ہے جس کو صحیح راہ اور سمت معلوم ہی نہیں ویسے ہی ادھر ادھر بھاگتا ہے۔ یا محض بے مقصد دوڑ دھوپ ہے۔ اسلام میں کسی ایسے عمل صالح کی کوئی قیمت نہیں ہے جس کی کوئی سمت' کوئی مقصد اور کوئی روح متعین نہ ہو۔ کیونکہ ایسے اعمال کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔

اس کائنات میں انسان کا وجود' اس کے اعمال' اس کی زندگی کی دوڑ دھوپ دراصل اس کائنات کی حقیقت سے مربوط ہیں۔ یہ انسان بھی ناموس فطرت کا ایک پرزہ ہے۔ اور یہ پوری کائنات ذات باری سے مربوط ہے۔ اس میں انسان اور اس کی تمام سرگرمیاں شامل ہیں۔ اگر انسان کی تگ و دو اور اس کی حرکت اور دوڑ دھوپ اس اصلی نور سے کٹ جائے تو وہ بے مقصد ہو جاتی ہے۔ وہ ضائع ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی وزن اور قدر و قیمت عند اللہ نہیں ہوتی۔ اس کے اعمال کا نہ کوئی حساب ہو گا اور نہ ہی اس کی کوئی قدر و قیمت ہو گی بلکہ اسلامی نظر میں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ محض ہوا اور غبار ہے۔

ایمان انسان کو رب تک پہنچاتا ہے۔ اس طرح پھر اللہ رب العالمین کے ہاں اس کے اعمال کا بھی وزن ہوتا ہے۔ اور اس کائنات کے حساب میں اس کا حساب رکھا جاتا ہے اور اس کے اعمال اس کائنات کی تعمیر و ترقی میں دکھائے جاتے

ہیں۔ ان مشرکوں کا چونکہ ایمان نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے اعمال کو کالعدم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نہایت ہی مجسم اور حسی انداز تعبیر اختیار کیا ہے۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵ : ۲۳) "اور ہم ان اعمال کی طرف بڑھے جو انہوں نے کیے تھے تو ان اعمال کو غبار کی طرح اڑا دیا"۔

اور مومنین کا حال کیا ہو گا۔ تقابل کے لیے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ اصحاب جنت ہیں۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا (۲۵ : ۲۴) "پس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اس دن اچھی جگہ ٹھہریں گے اور وہ دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے"۔ وہ نہایت آرام' خوشی اور استقلال کے ساتھ گھنے سایوں میں رہیں گے۔ اور یہاں مستقر کا لفظ کافروں کے اعمال کی ناپختگی اور ہوا میں غبار کی طرح اڑ جانے کے بالمقابل لایا گیا ہے اور دوپہر کا آرام اور سکون مقابل ہے۔ اہل کفر کے جزع و فزع کا' کہ وہ بے اختیار ہو کر اب خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور کہتے ہیں حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵ : ۲۲) کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اللہ ان کے سامنے بادلوں کے سایہ میں آئے اور فرشتے آپ کے ساتھ ہوں۔ یہ مطالبے وہ بنی اسرائیل کی کہانیاں سن کر کرتے تھے کہ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائے میں اتر رہا ہے۔ یا ایک آگ کے عمودی شعلے کی شکل میں۔ چنانچہ قرآن کریم ایک دوسرے انداز میں قیامت کے دن ان کے مطالبے کے پورا ہونے کا ایک منظر پیش کرتا ہے جس دن فرشتے اتریں گے۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا (۲۵ : ۲۵) اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (۲۵ : ۲۶) "اس روز ایک بادل آسمان کو چیرتا ہوا نمودار ہو گا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اتار دیئے جائیں گے۔ اس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمن کی ہو گی۔ اور وہ منکرین کے لیے سخت دن ہو گا"۔ یہ آیت اور قرآن کریم کی بے شمار دوسری آیت یہ بتلاتی ہیں کہ اس دن نہایت ہی بڑے فلکیاتی واقعات و حادثات ہوں گے۔ اور تمام ایسی آیات کا اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں نظر آتی ہے اور اس کا یہ نظام جو ہمیں نظر آتا ہے' یہ سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے تمام افلاک' کواکب اور ستارے باہم ٹکرا جائیں گے۔ اس کائنات کے نظام' اشیاء کے باہم روابط' اور ہر چیز کی موجودہ شکل بدل جائے گی اور یہ حادثہ اس دنیا کا اختتام ہو گا۔ یہ کائناتی انقلاب صرف زمین تک محدود نہ ہو گا۔ اس کی زد میں تمام ستارے' تمام آسمان اور تمام کواکب آئیں گے۔ یہاں مناسب ہے کہ یہاں اس انقلاب کے بعض مناظر پیش کر دیئے جائیں جو متعدد سورتوں میں آئے ہیں۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳) ---- وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶) (۸۱ : ۱ تا ۳ و ۶) "جب

سورج لپیٹ دیا جائے گا جب تارے بکھر جائیں گے' جب پہاڑ چلائے جائیں گے ------ اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے"۔

إِذَا السَّمَآءُ انفَطَرَتْ (١) وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ (٢) وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (٣) وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ (٤) (٨٢ : ١ تا ٤) "جب آسمان پھٹ جائے گا' جب تارے بکھر جائیں گے اور سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی"۔

إِذَا السَّمَآءُ انشَقَّتْ (١) وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٢) وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ (٣) وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٥) (٨٤ : ١ تا ٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے' اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)

إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا (٤) وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنبَثًّا (٦) (٥٦ : ٤ تا ٦) "جب زمین یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ بن کر رہ جائیں گے"۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ (١٣) وَّحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (١٤) فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١٥) وَانشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) (٦٩ : ١٣ تا ١٦) "پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا"۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (٨) وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (٩) (٧٠ : ٨ - ٩) "جس دن آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے"۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا (١) وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (٢) (٩٩ . ١ - ٢) "جب زمین اپنی پوری قوت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے بوجھ باہر نکال دے گی"۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (٤) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (٥) (١٠١ : ٤ — ٥) "وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنے ہوئے اون کی طرح ہوں گے"۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (١٠) يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (١١)(٤٤ : ١٠ — ١١) "اچھا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لائے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔یہ ہے دردناک سزا"۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (٧٣ : ١٤) "جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں"۔

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ (٧٣ : ١٨) "آسمان پھٹا جا رہا ہو گا اس دن"۔

كَلَّا اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا (٨٩ : ٢١) "ہرگز نہیں جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی"۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (٧) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (٧) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (٩) (٧٥ . ٧ تا ٩) "پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے"۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (٨) وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (٩) وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (١٠) (٧٧ . ٨ تا ١٠) "پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے"۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (١٠٥) فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا (١٠٦) لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (١٠٧) (٢٠ : ١٠٥ تا ١٠٧) "یہ اگر آپ سے پوچھتے ہیں کہ اس دن پہاڑ کہاں چلے جائیں گے۔کہو میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں کوئی بھی کجی اور سلوٹ نہ دیکھو گے"۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ——— (٢٧ : ٨٨)

"آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب ہوئے ہیں مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے"۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً (۱۸ : ٤٧) "جب ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے"۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (١٤ : ٤٨) "اس روز جبکہ زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے"۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (٢١ : ١٠٤) "وہ دن جبکہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں"۔ یہ تمام آیات بتاتی ہیں کہ ہماری اس دنیا کا انجام نہایت ہی خوفناک ہو گا۔ اس میں اس زمین کو ہلا مارا جائے گا اور اجسام عظیمہ ایک دوسرے کے ساتھ دھماکے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ جائیں گے۔ سمندر پھٹ جائیں گے یعنی کرۂ ارض کے اضطرابات کی وجہ سے یا سمندروں کے ذرات پھٹ جائیں گے اور تابکاری سے پانیوں میں آگ لگ جائے گی۔ چمکدار ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گا۔ کواکب ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو جائیں گے۔ تمام آسمانی دوریاں ختم ہو جائیں گی۔ شمس و قمر ایک ہو جائیں گے۔ آسمان کبھی سیاہ دھوئیں کی طرح ہو گا اور کبھی آگ کے شعلے کی طرح ہو گا۔ غرض یہ ایک ہولناک گھڑی ہو گی اور اس میں انسان سخت خوفزدہ ہو گا۔

غرض اس سورت میں اللہ تعالیٰ مشرکین کو اس بات سے ڈراتا ہے ہیں کہ اس روز آسمان کو چیرتا ایک بادل نمودار ہوں گے اور اس دن فرشتوں کے پرے کافرین پر نازل ہوں گے' جیسا کہ ان کا مطالبہ تھا۔ یہ مطالبہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لیے نہ کرتے تھے یہ فرشتے اللہ کے حکم سے اللہ کا عذاب لے کر آئیں گے۔

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (٢٥ : ٢٦) "اور منکرین کے لیے یہ بڑا سخت دن ہو گا"۔ کیونکہ اس دن میں سخت عذاب سامنے ہو گا اس لیے وہ ایک ہولناک دن ہو گا۔ یہ لوگ کم عقلی سے نزول ملائکہ کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ ملائکہ عذاب لے کر آتے ہیں۔

اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر لیا جاتا ہے۔ اس میں یہ گمراہ اور ظالم بہت زیادہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ منظر بہت ہی طویل ہے۔ اس قدر طویل کہ ناظرین یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ منظر چلتا ہی رہے گا۔ یہ ظالم نہایت ندامت اور حسرت کی وجہ سے ہاتھ کاٹ رہا ہے' خود اپنے ہاتھ۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (٢٥ : ٢٧) يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (٢٥ : ٢٨) لَقَدْ اَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ

اِذْ جَآءَنِيْ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵ : ۲۹) "ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا" کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی' کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی' شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"۔ یہ شخص اس گہرے تاسف کا اظہار کر رہا ہے اور اس کے ماحول پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ یہ شخص اپنی حسرتناک آواز کو بلند کرتے چلا جاتا ہے۔ اس کی چیخیں اس قدر دلدوز ہیں اور ان کا اثر اس قدر طویل ہے کہ یہ محفل طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اثرات عمیق ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک آج بھی ان آیات کا پڑھنے والا گہرا تاسف لے لیتا ہے۔ منظر کو دیکھنے والے شریک غم ہو جاتے ہیں۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰي يَدَيْهِ (۲۵ : ۲۷) "اس دن یہ ظالم اپنے ہاتھ چبائے گا"۔ یہ صرف ایک ہاتھ کو نہ چبائے گا بلکہ دونوں ہاتھوں کو چبائے گا۔ کبھی اس کو کبھی اس کو۔ یہ شدت غم کی وجہ سے اپنے ہاتھوں پر اپنا غصہ اتارے گا۔ ہاتھوں کو چبانا اشارہ اس طرف ہے کہ اس دن ظالم کی نفسیاتی حالت کیا ہو گی۔ اس کے غم اور اندوہ کو نہایت ہی مجسم فعل اور حرکت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے یعنی غم کو یہ برداشت نہ کر سکے گا۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (۲۵ : ۲۷) "کہے گا کاش میں نے رسول اللہ کا ساتھ دیا ہوتا"۔ رسول کے طریقے پر چلا ہوتا۔ رسول سے علیحدہ نہ ہوا ہوتا۔ گمراہ نہ ہوا ہوتا۔ وہ رسول جس کی رسالت کا وہ منکر تھا' اس لیے کہ یہ رسول بشر کیوں ہے۔

يٰوَيْلَتٰي لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (۲۵ : ۲۸) "میری کم بختی! کاش میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا"۔ فلاں کو عام کر دیا ہے۔ کسی کا نام نہیں لیا تاکہ اس میں تمام گمراہ کنندگان شامل ہو جائیں۔ تمام دوست جو دوستوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں لیکن روایات میں آتا ہے کہ ان آیات کا سبب نزول عقبہ ابن ابی معیط ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت ہی بیٹھتا اٹھتا تھا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ضیافت کے لیے بلایا تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہاری دعوت اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تک تم دو باتوں کی شہادت نہ دو۔ چنانچہ اس نے ایسا کیا۔ ابی ابن خلف بھی اس کا دوست تھا۔ اس نے اسے بہت ہی شرمندہ کیا۔ اور کہا تو بے دین ہو گیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں نے محمدؐ کے دین کو قبول نہیں کیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں تمہاری دعوت اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تم کلمہ شہادت ادا نہ کرو۔ حالانکہ وہ میرے گھر میں تھے اور میرا کھانا نہ کھاتے تھے۔ مجھے اس سے بڑی شرم آئی کہ وہ میرا کھانا نہ کھائے۔ اس لیے میں نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ تو ابی ابن خلف نے کہا خدا کی قسم میں تم سے تب راضی ہوں گا کہ تم اس کی گردن دبا کر اس کے منہ پر تھوکو۔ حضورؐ اسے دارالندوہ میں سجدہ کرتے ہوئے مل گئے۔ اور اس (بدبخت) نے ایسا ہی کیا۔ اسے حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مکہ سے باہر تم جب بھی مجھے ملو گے میں تمہارا سر اڑا دوں گا۔ یہ شخص بدر کے دن گرفتار ہوا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ (۲۵:۲۹) "اس کے بہکاوے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی" ۔ یہ دراصل شیطان تھا جو گمراہ کر رہا تھا یا شیطان کا مددگار تھا۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵:۲۹) "اور شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا" ۔ وہ انسان کو شرمندگی کے انجام تک پہنچاتا ہے ۔ اور جب سچائی کا وقت آتا ہے کہ ہمیشہ شیطان بھاگ جایا کرتے ہیں ۔ خصوصاً ہولناک اور کربناک مناظر و مواقع میں ۔

یوں قرآن کریم نے ان لوگوں کے دلوں کو جھنجھوڑا ۔ ان کے سامنے ان کے انجام کو کپکپا دینے والے مناظر کی شکل میں پیش کیا ۔ اس طرح کہ گویا وہ ایک واقعہ ہے جسے دیکھا جا رہا ہے ۔ حالانکہ وہ لوگ ابھی اس زمین پر ہی ہیں جو اللہ کی تکذیب کر رہے ہیں اور اللہ کے سامنے پیش ہونے کا بڑی حقارت کے ساتھ انکار کر رہے ہیں اور ایسے مطالبات کر رہے ہیں جو بیہودہ ہیں ۔ حالانکہ وہاں نہایت ہی خوفناک صورت حال سے دوچار ہونے والے ہیں اور نہایت ہی شرمساری اور ندامت سے دوچار ہوں گے لیکن اس وقت ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہو گا ۔

اب روئے سخن مناظر قیامت سے اس دنیا کی طرف آجاتا ہے ۔ رسول اللہؐ کے حوالے سے انہوں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے اس پر بات ہوتی ہے ۔ اب ان کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید سب کا سب ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں ہو گیا ۔ موجودہ انداز نزول قرآن قابل اعتراض ہے ۔ اس سوال و جواب کا خاتمہ بھی قیامت کے منظر پر ہوتا ہے کہ جس طرح ان کا اعتراض الٹا ہے ' اسی طرح وہ جہنم میں الٹے ڈالے جائیں گے ۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

"اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب ' میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا ۔ اے نبیؐ ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے ۔ منکرین کہتے ہیں اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟" ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح

ہم تمہارے ذہن نشین کرتے ہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے' اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔ جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں' ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط"۔

انہوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا جو اللہ نے اپنے بندے پر نازل کیا تھا تاکہ ان کو ڈرائے۔ اور ان کو بصیرت عطا کرے۔ انہوں نے قرآن کو اس طرح چھوڑا کہ اسے سننے سے بھی دور بھاگے' مارے اس خوف کے کہ اگر انہوں نے سن لیا تو وہ اپنی بے پناہ تاثیر سے ان کو متاثر کرے گا۔ اور وہ اس کے اثرات کو مسترد نہ کر سکیں گے۔ انہوں نے اگر سنا بھی تو اس کے مضامین پر غور و فکر نہ کیا تاکہ وہ سچائی کو پا سکیں اور اس کی راہ پر چلیں۔ انہوں نے اسے اس طرح چھوڑا کہ اسے اپنا دستور حیات نہ بنایا۔ حالانکہ وہ نازل اسی لیے کیا گیا تھا کہ وہ اسے نظام حیات بنائیں۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵: ۳۰) "اور رسول کہے گا اے میرے رب' میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا"۔ اور رب تعالیٰ تو جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے لیکن یہ فریاد اور انابت الی اللہ کے طور پر دعا ہے اور اللہ کو بھی معلوم ہے اور اللہ اس کی شہادت دے رہا ہے کہ رسول نے اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے لیکن یہ قوم کا قصور ہے کہ اس نے اس قرآن کو نہ سنا اور نہ اس پر غور کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتا ہے کہ یہ تو تمام نبیوں کو پیش آنے والا ایک عام طرز عمل ہے۔ یہ سنت جاریہ ہے اور تمام رسولوں نے ایسی ہی صورت حالات کا مقابلہ کیا۔ تمام انبیاء کو ایسے حالات پیش آئے کہ ان کی اقوام نے قرآن کریم اور ان کی دعوت کے ساتھ مذاق کیا اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا لیکن اللہ کی مدد اپنے رسولوں کے ساتھ شامل رہی اور اللہ نے اپنے رسولوں کو ایسے راستے بتائے کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہو کر رہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا

(۲۵: ۳۱) "اے نبی' ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی راہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے"۔ اللہ کی حکمت اچھے انجام تک پہنچنے والی ہے۔ کسی اسلامی تحریک کے مقابلے میں جب مجرم اٹھ کھڑے ہوں اور مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں تو اس سے تحریک کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس طرح تحریک سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ ایک سچی دعوت اور جھوٹی دعوت کے درمیان فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ سچی دعوت کے مقابلے میں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک سچی دعوت کے حاملین کو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اور یہ کشمکش ہی دعوت حق کو باطل دعوتوں سے ممیز کرتی ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں سچے پیروکار چمٹ کر جم جاتے ہیں اور باطل کے حاملین بھاگ جاتے ہیں۔ دعوت کی پشت پر وہی لوگ رہ جاتے ہیں جو خالص اور مخلص ہوں جو مفادات کے بندے نہیں ہوتے۔ صرف اور صرف دعوت اسلامی ہی ان کا نصب العین ہوتی ہے۔ اور وہ صرف رضائے الٰہی چاہنے والے ہوتے ہیں۔

اگر دعوت اسلامی کا کام آسان ہوتا اور اس کے سامنے ردعمل واہ واہ کا ہوتا اور داعی کی راہ پر پھول بچھائے جاتے

اور کوئی دشمن اور ناقد نہ ہوتا تو ہر کہ و مہ دعوت اسلامی کا حامل ہو جاتا۔ کیونکہ نہ کوئی عناد کرنے والا ہوتا اور نہ کوئی جھٹلانے والا اور پھر دعوت حق اور دعوت باطل کے درمیان کوئی فرق بھی نہ ہوتا اور دنیا میں انتشار اور فتنہ برپا ہو جاتا۔ لیکن ہر سچی دعوت کے مقابلے میں اللہ نے دشمن اور مدعی پیدا کر دیئے اور اللہ نے داعیوں کے لیے جدوجہد کرنا اور مقابلہ کرنا ضروری قرار دیا اور راہ حق میں قربانی دینا اور مشکلات برداشت کرنا زاد راہ قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد وہی کرتا ہے جو سچا ہو۔ مشکلات اور قربانیوں کو وہی شخص برداشت کرتا ہے جو سچا مومن ہو۔ ایسے لوگ جو اپنے آرام اور عیش و عشرت کو دعوت حق کی راہ میں قربان کرتے ہیں۔ اور حیات دنیا کی لذتوں کو خیر باد کہتے ہیں بلکہ وہ اس راہ میں جان تک دے دیتے ہیں اگر دعوت کا تقاضا ہو کہ اب جان دینے کا وقت آگیا ہے۔ اس عظیم جدوجہد کے لیے وہی لوگ تیار ہوتے ہیں جو مضبوط اور ثابت قدم ہوں جو پکے مومن ہوں۔ پختہ ایمان رکھتے ہوں۔ وہ اس اجر کے زیادہ مشتاق ہوں جو اللہ کے ہاں ہے بجائے اس اجر کے جو لوگوں کے پاس ہے۔ جب یہ صورت حالات پیش آجائے تو پھر سچی دعوت اور جھوٹی دعوت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں دعوت اسلامی کی صفوں کی تطہیر ہو جاتی ہے اور مضبوط قوی اور ثابت قدم لوگ چھٹ کر جدا ہو جاتے ہیں اور کمزور لوگ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر دعوت اسلامی ان لوگوں کو لے کر آگے بڑھتی ہے جنہوں نے ثابت قدمی کا امتحان پاس کر لیا ہوتا ہے۔ اور یہی لوگ پھر اس دعوت کے امین اور لیڈر ہوتے ہیں اور یہی اس کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ بھاری قیمت ادا کر کے اس مقام تک پہنچتے ہیں۔ یہ لوگ سچائی کے ساتھ اس دعوت کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ پختہ ایمان کے ساتھ' تجربے اور آزمائشوں نے ان کو بتا دیا ہوتا ہے کہ اس دعوت کو مشکل سے مشکل حالات میں انہوں نے کس طرح لے کر چلنا ہے۔ شدائد اور مشکلات نے ان کی پوری قوت کو حساس بنا لیا ہوتا ہے اور ان کی قوت کا سرچشمہ اور طاقت کا ذخیرہ بڑھ جاتا ہے اور وہ مشکل سے مشکل صورت حالات میں دعوت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس دنیا میں عموماً یوں ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کے حاملین اور ان کے مخالفین کے درمیان جو کشمکش برپا ہوتی ہے۔ لوگوں کی ایک عظیم تعداد اس میں غیر جانبدار ہو کر تماشا دیکھتی ہے۔ یہ تماشا بین آبادی جب دیکھتی ہے کہ دعوت اسلامی کے حاملین اپنے نظریہ اور مقصد کی خاطر عظیم قربانیاں دے رہے ہیں اور بے حد و حساب مشکلات برداشت کر رہے ہیں اور بڑی ثابت قدمی اور یکسوئی کے ساتھ اپنی راہ پر جا رہے ہیں تو پھر یہ تماشا بین عوام الناس سوچنے لگتے ہیں کہ دعوت اسلامی کے حاملین آخر کیوں اس قدر قربانیاں دے رہے ہیں اور مشکلات برداشت کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد بہت ہی مفید' بہت ہی قیمتی ہوں گے اور وہ جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی دے رہے ہیں شاید ان چیزوں سے وہ مقاصد زیادہ قیمتی ہوں۔ اب یہ لوگ دعوت اسلامی کی اصل قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بات عامۃ الناس کی سمجھ میں آجاتی ہے تو وہ پھر فوج در فوج دعوت اسلامی میں داخل ہوتے ہیں اور وہ تماشا دیکھنے کے بجائے اب خود تماشا بن جاتے ہیں۔

یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اللہ نے ہر نبی کے لیے مجرمین میں سے ایک دشمن پیدا کیا۔ یہ مجرمین دعوت اسلامی کی راہ روکنے کی سعی کرتے ہیں۔ پھر نبی اور ان کے بعد ہر حامل حق ان مجرمین کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کو مشکلات درپیش آتی ہیں اور وہ اپنی راہ میں چلتے ہی جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے لیے کامیابی مقدر ہوتی ہے۔ اور ان کو اچھی طرح علم ہوتا

ہے کہ آخر کار وہ اس انجام تک پہنچیں گے ۔ آخر میں ان کو ہدایت اور نصرت مل جاتی ہے ۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵ : ۳۱) "اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی راہنمائی اور مدد کو کافی ہے"۔ انبیاء کے راستے میں مجرمین کا نمودار ہونا ایک طبیعی امر ہے ۔ اس لیے کہ دعوت حق ہمیشہ اپنے مناسب اور مقرر وقت پر نمودار ہوتی ہے جبکہ کوئی مخصوص سوسائٹی فساد پذیر ہو جاتی ہے یا پوری انسانیت فساد کا شکار ہو جاتی ہے ۔ لوگوں کے قلب و نظر فساد کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ دنیا کا نظام بگڑ جاتا ہے ۔ لوگوں کے باہم روابط بگڑ جاتے ہیں ۔ اس فساد اور بگاڑ کی پشت پر مجرم لوگ ہوتے ہیں ' جو ایک طرف فساد کرتے ہیں پھر وہ اس فساد اور بگاڑ سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ وہ اس فساد کے ہم مسلک اور ہم مشرب ہوتے ہیں ۔ ان کی خواہشات اسی فساد زدہ معاشرے میں پوری ہوتی ہیں ۔ اور ان کے وجود میں جو فساد اور بگاڑ ہوتا ہے اس کے لیے وجہ جواز وہ معاشرے سے نکالتے ہیں کہ بس معاشرہ ہی ایسا ہے ۔ اس لیے یہ بالکل طبیعی بات ہے کہ ایسے لوگ انبیاء کی راہ روک کر کھڑے ہو جائیں اور انبیاء کے دور کے بعد ان لوگوں کی راہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو انبیاء کی دعوت کو لے کر رکھتے ہیں کیونکہ یہ مجرم دراصل ان کے بگڑے ہوئے وجود کا دفاع ہوتا ہے ' اس لیے کہ حشرات میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو پاک و صاف اور خوشبودار اور شفاف ماحول میں زندہ ہی نہیں رہتے ' فوراً مر جاتے ہیں اس لئے کہ یہ گندے ماحول میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ بعض کیڑے ایسے ہوتے ہیں جو صاف پانی میں مر جاتے ہیں کیونکہ وہ صرف گندے اور سڑے ہوئے پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں ۔ یہی حال ان مجرموں کا ہوتا ہے لہٰذا یہ طبیعی امر ہے کہ وہ دعوت حق کے دشمن ہوں اور اس کے مقابلے میں جان دینے کے لیے تیار ہوں اور یہ بھی بالکل طبیعی امر ہے کہ آخر میں دعوت اسلامی کو کامیابی ہو کیونکہ دعوت اسلامی زندگی کی ترقی پذیر لائنوں پر چلنے والی ہوتی ہے ۔ اور اس طرح دعوت اسلامی کو وہ عروج نصیب ہوتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا ہوتا ہے ۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵ : ۳۱) "اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی راہنمائی اور مدد کو کافی ہے"۔ اس کے بعد اب کفار کے اعتراضات بابت طریقہ نزول قرآن نقل کیے جاتے ہیں اور ان کی تردید کی جاتی ہے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۲۵ : ۳۲) "منکرین کہتے ہیں اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟" --- ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے ہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے"۔

قرآن کریم نازل ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعے ایک امت کی تربیت کی جائے ۔ ایک نیا معاشرہ وجود میں لایا جائے ۔ اس معاشرے میں ایک نیا نظام وجود میں لایا جائے ۔ اور تربیت اس بات کی محتاج ہے کہ انسان کو بار بار تلقین کی جائے اور وہ متاثر ہوتا جائے ۔ اور یہ تاثیر اور تاثر ایک مسلسل حرکت کے ذریعہ جاری رہے کیونکہ انقلاب انسانوں کے اندر پیدا کرنا مطلوب ہوتا ہے اور انسان ایک ایسی ذات ہے کہ اسے صرف ایک شب و روز میں تربیت نہیں دی جا سکتی کہ

بس اس کے ہاتھ میں ایک نئے نظام پر مشتمل ایک کتاب پکڑا دی جائے ۔ اور اس میں جدید معاشرے کے مکمل خدوخال ہوں بلکہ انسانوں کی تربیت یوں ہوتی ہے کہ اسے تدریج کے ساتھ ایک طویل عرصے کے بعد بدلا جاتا ہے ۔ اور یہ تبدیلی اس کے اندر آہستہ آہستہ آتی رہتی ہے ۔ ہر دن کی غذا کے بعد دوسرے دن وہ زیادہ غذا کے لیے تیار ہوتا ہے اور دوسرے دن کی خوراک وہ پھر بڑی خوشی سے لیتا ہے اور بڑے مزے سے قبول کرتا ہے ۔

قرآن کریم زندگی کا ایک مکمل نظام لے کر آیا ہے اور قرآن کریم نے انسانوں کی تربیت کے لیے بھی ایک فطری منہاج اختیار کیا ۔ یہ منہاج اس ذات کی طرف سے تھا جس نے انسان کو پیدا کیا تھا اس لیے قرآن کریم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کیا گیا تاکہ وہ جماعت مسلمہ کی حقیقی اور زندہ موجود ضروریات کو پورا کرتا چلا جائے ۔ کیونکہ یہ جماعت آہستہ آہستہ تعمیر ہو رہی تھی ۔ وہ اپنی استعداد کے مطابق' اپنی قوت کے مطابق ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی ۔ ٹھیک ٹھیک اللہ کے حقیقی منہاج تربیت کے مطابق ۔ چنانچہ قرآن مجید کو بیک وقت منہاج تربیت اور نظام زندگی کی تشکیل کے لیے اتارا گیا ۔ اس لیے اس کا متفرق نزول لازمی تھا ۔ یہ محض کوئی علمی ثقافتی اور ادبی کتاب نہ تھی کہ مکمل شکل میں اسے تصنیف کر کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا ۔ اور لوگ اسے پڑھتے رہتے اور مزے لیتے رہتے ۔ اور بس اس پر عمل کی ضرورت نہ ہوتی ۔ بلکہ یہ تو حرف حرف' کلمہ اور ایک ایک حکم کے طور پر آیا ۔ اس کی ہر آیت حکم الیوم (آرڈر آف دی ڈے) کے طور پر آئی ۔ مسلمان حکم پاتے اور ان پر عمل کرتے ۔ جیسا کہ ایک فوجی احکام لیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے ۔ وہ اس حکم کو لیتا ہے' سمجھتا ہے اور نافذ کر دیتا ہے ۔ خود بھی اس کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے اور معاشرے کو اس میں غرق کر دیتا ہے ۔

یہی وجہ تھی کہ قرآن متفرق طور پر نازل ہوا ہے' تاکہ رسول کے قلب کے اندر اچھی طرح جاگزیں ہو ۔ حضورؐ سے پہلے خود اس پر ثابت قدم ہو جائیں اور ایک ایک جز کے بعد اس کا دوسرا جز آئے اور اس پر عمل ہوتا رہے ۔

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۲۵ : ۳۲) "ہاں ایسا ہی کیا گیا تاکہ ہم اس کو اچھی طرح ہمارے ذہن نشین کرتے رہیں اور ہم نے اسے ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی" ۔ ترتیل کا مفہوم یہاں اللہ کی حکمت کے مطابق آگے پیچھے نازل کرنا ہے' اللہ کے علم کے مطابق اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق اور اللہ کی اس حکمت کے مطابق جس کی رو سے اللہ جانتے تھے کہ لوگوں کے اندر کس قدر احکام و ہدایات قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی ہے ۔

قرآن کریم نے اپنے پے در پے منہاج نزول کے ذریعہ ان لوگوں کی تربیت کے میدان میں معجزات دکھائے ۔ لوگ اس کے نزول سے دن بدن تاثرات لیتے رہے ۔ اور ان کے اخلاق کی تشکیل آہستہ آہستہ ہوتی رہی ۔ جب مسلمانوں نے قرآن مجید کا منہاج تربیت فراموش کر دیا اور قرآن مجید کو انہوں نے محض علم و ثقافت کے طور پر پڑھنا شروع کر دیا اور قرآن کو ایک ایسی کتاب تصور کر لیا جسے فقط پڑھا جاتا ہے' اس کے مطابق معاشرے کو ڈھالنا ضروری نہیں ہے' اس کی کیفیات میں ڈوبنا ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے مطابق نظام زندگی قائم کرنا ضروری ہے تو مسلمانوں نے اس قرآن سے نفع لینا ترک کر دیا اور قرآن نے ان کو نفع دینا چھوڑ دیا کیونکہ مسلمانوں نے وہ منہاج تربیت ہی ترک کر دیا جو ان کے

لیے علیم و خبیر نے قرآن میں منضبط کیا تھا۔ یعنی یہ کہ اسے ایک ایک کر کے عمل میں لایا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جو نکتہ اعتراض اٹھاتے تھے۔ جو نئے نئے اعتراضات کرتے تھے جو مطالبات کرتے تھے۔ یہ قرآن اپنے منہاج نزول متفرق کے ذریعے ایک ایک کا تشفی بخش جواب دے دیتا تھا۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَٰكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (۲۵ : ۳۳) "اور جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات لے کر آئے اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی"۔ یہ لوگ باطل طریقے سے مجادلہ کرتے تھے اور اللہ ان کے جواب میں حق اتارتا تھا جو باطل کا سر کچل کر رکھ دیتا تھا۔ کیونکہ قرآن مجید کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ دنیا میں حق جم جائے۔ محض بحث و مباحثے میں کامیابی مقصود نہ تھی بلکہ حق کو دنیا میں قوت دینا، واضح کرنا اور غالب کرنا مقصود تھا۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ آپ کے اور آپ کی قوم کے درمیان ہر قسم کے مجادلے میں آپ کی مدد کرے گا۔ کیونکہ آپ حق پر ہیں اور حق کے ساتھ اللہ آپ کی امداد کرتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے۔ تو اللہ کی بتائی ہوئی حجت بالغہ کے مقابلے میں ان کا مجادلہ اور مباحثہ کس طرح ٹھہر سکتا تھا کیونکہ آپ کے پاس رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی سچائی تھی جو ایک گولے کی طرح باطل کے سر پر لگتی تھی اور اسے کچل کر رکھ دیتی تھی۔

یہ بات اب اس مضمون پر ختم ہوتی ہے کہ کس طرح وہ قیامت کے دن جہنم رسید کیے جائیں گے۔ کیونکہ وہ حق کا انکار کرتے تھے اور اسلام کے خلاف مجادلے میں اور مقابلے میں وہ الٹی منطق استعمال کرتے تھے، اس لیے قیامت میں بھی انہیں منہ کے بل الٹا کر دیا جائے گا۔

الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا

(۲۵ : ۳۴) "جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں، ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط"۔ حشر کے دن ان کی حالت کو ذرا دیکھئے، منہ کے بل اٹھیں گے نہایت ہی توہین آمیز انداز میں۔ اس لیے کہ دنیا میں یہ تکبر کی وجہ سے منہ پھیرتے تھے۔ ان کا یہ منظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ آپ کو تسلی ہو کہ یہ لوگ اس وقت آپ کو اذیت دیتے ہیں لیکن ان کا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ اور اس کا ایک منظر آپ کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ مجرد یہ منظر ہی ان کی اکڑ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور یہ لوگ ایسے مناظر سے ڈر کر متاثر بھی ہوتے تھے مگر پھر بھی ہٹ کر کے اپنے اوپر اس برے انجام کو لازم کرتے تھے اور اس عناد کی وجہ سے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

--- ○○○---

اب روئے سخن ان سابق اقوام کی طرف پھر جاتا ہے جنہوں نے تکذیب کی اور ہلاک کر دیئے گئے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا ﴿٣٥﴾

فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿ۚۖ۳۷﴾ وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

”ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو مددگار کے طور پر لگایا اور ان سے کہا کہ جاؤ اس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ آخر کار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حال قوم نوح کا ہوا۔ جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ ہم نے ان کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک نشان عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیا کر رکھا ہے۔ اسی طرح عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کی) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخر کار ہر ایک کو غارت کر دیا اور اس بستی پر تو ان کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی۔ کیا انہوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہو گا؟ مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے“۔

یہ چند مثالیں سرسری مثالیں ہیں جن میں مکذبین کا انجام دکھایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جاتی ہے ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور امدادی رسول بنایا جاتا ہے اور ان کو اس قوم کے مقابلے میں بھیجا جاتا ہے جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا۔

الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (۲۵ : ۳۶) یہ تھے فرعون اور اس کے سردار جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ آیات الہیہ کا انکار حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو منصب رسالت عطا کیے جانے سے پہلے بھی کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ کی آیات تو قائم و دائم ہیں۔ اس کائنات میں بھی ہیں اور انفس میں بھی ہیں، رسولوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ابھی دوسری آیت ختم نہیں ہوئی کہ بڑی سختی سے انجام بتا دیا جاتا ہے۔

فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا (۲۵ : ۳۶) ”آخر کار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے“۔

اس کے بعد قوم نوح کا حال

كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ (۲۵ : ۳۷) ”انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو غرق کر دیا“۔

قوم نوح نے تو صرف ایک رسول حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت نوح نے جو عقیدہ ان

کے سامنے پیش کیا تھا وہ تمام نبیوں کا عقیدہ تھا۔ جب انہوں نے حضرت نوح کو جھٹلایا تو گویا تمام رسولوں کو جھٹلا دیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً (۲۵: ۳۷) "اور ان کو دنیا بھر کے لوگوں کے لیے نشان عبرت بنا دیا"۔ کیونکہ طوفان کا معجزہ کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ جو شخص بھی طوفان کے اس واقعہ پر غور کرے گا اسے عبرت حاصل ہوگی۔

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۲۵: ۳۷) "اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے"۔ یہ عذاب حاضر و موجود ہے۔ کسی تیاری کی ضرورت نہ ہوگی۔ ظالمین کا لفظ ضمیر کی جگہ استعمال کیا گیا تاکہ یہ ان کا دائمی لقب ہو اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ عذاب ان کو ان کے ظلم کی وجہ سے دیا جائے گا۔ پھر عاد ثمود اور اصحاب الرس (وہ لوگ جن کے کنوئیں کی دیواریں نہ اٹھائی گئی تھیں' یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ یمامہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے اور انہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا۔ ابن جریر نے تو کہا ہے کہ یہ اصحاب الاخدود ہیں جنہوں نے مومنین کو جلا دیا تھا۔ جس کا ذکر سورہ بروج میں آیا ہے)۔ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ جو بعد کے ادوار میں آتے رہے سب کو اللہ نے ہلاک کر کے نشان عبرت بنایا۔ انہوں نے پیغمبروں کی دعوت پر غور نہ کیا اور ہلاکت سے نہ بچ سکے۔

یہ تمام مثالیں' قوم موسیٰ' نوح' عاد' ثمود' اصحاب الرس' درمیان زمانوں کی اقوام اور وہ قوم (لوط) جس پر بری بارش کی گئی۔ یہ سب اقوام ایک ہی راہ اور ایک ہی انجام تک پہنچیں۔ اور سب کو اللہ نے نشانہ عبرت بنایا۔

وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا (۲۵: ۴۰) "سب کو ہم نے ہلاک کر دیا بے دردی سے"۔ کیونکہ انہوں نے نبیوں کی تکذیب کی اور جو اقوام نبیوں کی تکذیب کرتی ہیں وہ ٹوٹ پھوٹ اور ہلاکت کے انجام سے دوچار ہوتی ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ ان ساری اقوام کے المناک انجام پر نہایت ہی سرسری نظر ڈالتا ہے اور یہ سریع الحرکت بیان آکر حضرت لوط کی قوم کے بیان پر ختم ہوتا ہے جو ان کے اسفار شتاء وصیف میں شاہراہ عام پر ان کو خوب نظر آتا ہے۔ اللہ نے اس قوم کو آتش فشانی کے عمل کے ذریعہ ہلاک کیا۔ ان پر پتھروں کی بارش کر دی گئی۔ اور اس طرح ان کو پوری طرح ہلاک کر دیا گیا۔ تعجب ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے یہ لوگ پھر بھی مکذبین کے انجام سے کوئی عبرت نہیں لیتے۔ یہ قیامت کا خوف اپنے دل میں نہیں رکھتے۔ اللہ کے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل پتھر بن گئے ہیں' مسخ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں انہوں نے کینہ' عناد' استکبار اور مذاق کا رویہ اختیار کیا ہے اور قرآن پر یہ طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

اقوام مکذبہ پر اس سرسری نظر کے بعد روئے سخن اب ان لوگوں کے مزاحیہ انداز کی طرف پھر جاتا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے اللہ کی شان میں بھی ایسی ہی گستاخی کی تھی۔ اور کہا تھا کہ یہ قرآن موجودہ انداز سے کیوں نازل ہو رہا ہے۔

تعجب ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے یہ لوگ پھر بھی مکذبین کے انجام سے کوئی عبرت نہیں لیتے۔ یہ قیامت کا خوف اپنے دل میں نہیں رکھتے۔ اللہ کے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل پتھر بن گئے ہیں' مسخ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں انہوں نے کینہ' عناد' استکبار اور

وَإِذَا رَأَوْكَ إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا ۖ أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ﴿٤١﴾ إِن كَادَ
لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٢﴾ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ
عَلَيْهِ وَكِيلًا ﴿٤٣﴾ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ
بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٤﴾ ع ۱۰

۴ "یہ لوگ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں (کہتے ہیں) "کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا۔ اگر ہم ان کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے"۔ اچھا' وہ وقت دور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دور نکل گیا تھا۔ کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو۔ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں' بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں دیکھے سنے ہوئے تھے۔ قبل بعثت آپ ان کے ہاں اک نہایت معتبر شخص تھے۔ آپ بنی ہاشم کے ایک چوٹی کے فرد تھے جو قریش کے چوٹی کے لوگ تھے۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے بھی آپ بڑے مرتبے اور مقام کی شخصیت تھے اور بعثت سے قبل صادق اور امین مشہور تھے۔ جب تعمیر خانہ کعبہ کے وقت حجر اسود رکھنے کے مسئلے پر قریش کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے تو تمام لوگ اس بات پر تیار ہو گئے کہ آپ اس پتھر کو نصب کر دیں اور جب آپ نے ان کو صفا پر بلایا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے اس طرف ایک فوج آپ لوگوں پر حملہ آور ہو رہی ہے تو کیا آپ میری بات کو تسلیم کریں گے تو سب نے کہا' ہاں آپ ہمارے ہاں متہم نہیں ہیں۔

لیکن بعثت کے بعد قرآنی دعوت پیش کرنے کے بعد وہی تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا (۲۵ : ۴۱) "کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے"۔ یہ فقرہ وہ بطور مذاق کہتے تھے۔ کیا یہ بات تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے وہ مذاق کرنا چاہتے تھے یا قرآن کریم میں کوئی ایسی بات تھی جس کے ساتھ مذاق کیا جا سکتا تھا۔ نہیں' یہ دونوں باتیں نہ تھیں بلکہ یہ بات وہ کبرائے قریش کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہتے تھے۔ اس طرح وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت کی کردار کشی کرنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح وہ قرآن کریم کے بے پناہ اثرات کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔ یہ انہوں نے اس جدید دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک تدبیر الخفیہ کی تھی کیونکہ سابقہ معاشرے میں ان کو جو مقام اور مرتبہ

حاصل تھا' اس کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ نیز ان کے بعض اقتصادی مفادات سابقہ نظام جاہلیت سے وابستہ تھے۔ یہ علمی اور اقتصادی حیثیت ان کو ان نظریاتی خرافات کی وجہ سے حاصل تھی جو عربی معاشرے پر چھائے ہوئے تھے اور قرآن ان خرافات لایعنی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا۔

یہ لوگ جدید دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی بڑی مجلسیں کرتے تھے۔ ان مجالس میں یہ لوگ اس قسم کے غلط پروپیگنڈے اور جھوٹے کردارکشی کے فیصلے کرتے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ یہ سب کچھ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ ایک بار ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بڑا معمر اور دانشور شخص تھا۔ موسم حج قریب تھا۔ اس نے ان قریشیوں سے کہا کہ موسم حج آنے والا ہے۔ تمام عالم عرب سے وفود مکہ آئیں گے۔ انہوں نے تمہارے اس آدمی کے بارے میں تو سن رکھا ہے۔ لہذا مناسب ہے کہ اس کے بارے میں تم اپنی رائے ایک کر لو۔ یہ نہ ہو کہ تم مختلف باتیں کرو۔ اور ایک دوسرے کی تکذیب کرتے پھرو۔ انہوں نے کہا عبدالشمس کے باپ بس تم ہی بتا دو تم ایک رائے قائم کر کے ہمیں کہو ہم سب وہی بات کریں گے' یہ سن کر اس نے کہا کہ پہلے تم بتاؤ کہ تم کیا کہو گے۔ میں دیکھوں کہ تم کیا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم اس کے بارے میں کہیں گے کہ یہ ایک کاہن ہے۔ اس نے کہا' خدا کی قسم یہ بات غلط ہے۔ یہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ یہ نہ ان کی طرح گنگناتا ہے اور نہ ان کی طرح سجع بندی کے ذریعے بات کرتا ہے۔ انہوں نے کہا: تو پھر ہم کہیں گے کہ یہ مجنوں ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ مجنوں بھی نہیں ہے۔ ہم مجنونوں کو اچھی طرح دیکھتے اور جانتے ہیں۔ نہ مجنوں کی طرح اس کا گلا گھٹتا ہے نہ اسے کوئی خلجان ہے اور نہ کوئی وسوسہ ہے۔ تو انہوں نے کہا تو پھر ہم کہیں گے یہ ایک شاعر ہے۔ تو اس نے کہا وہ تو شاعر نہیں ہے۔ شعر کی اقسام اور اوزان' رجز' ہزج' قریض' مقبوض اور مبسوط کو ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا تو ہم پھر کہیں گے کہ یہ جادوگر ہے تو اس نے کہا وہ تو جادوگر نہیں ہے۔ ہم نے جادوگروں کے جادو کو دیکھا ہے۔ نہ وہ ان کی طرح پھونکتا ہے' نہ گرہیں ڈالتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ عبدالشمس کے باپ تم ہی بتاؤ کہ پھر ہم کیا کہیں؟ اس نے کہا خدا کی قسم اس' کا کلام بہت میٹھا ہے۔ اس کی اساس ایک موٹے تنے پر ہے اور اس کی شاخیں تازہ پھول کی طرح ہیں۔ ان باتوں میں سے تم جو بات بھی کہو گے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غلط بات کی جا رہی ہے۔ بہرحال سب سے مناسب بات جو تم کہہ سکتے ہو وہ یہ ہے کہ وہ ساحر ہے اور اس کا کلام اس قدر جادو بھرا ہے کہ ایک شخص اور اس کے باپ' اس کے بھائی' اس کی بیوی اور اس کے خاندان کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ یہ بات لے کر وہ اس کے پاس سے چلے گئے۔ جب حج کا موسم آتا تو یہ لوگ راستوں میں بیٹھ جاتے' جو شخص بھی ان پر سے گزرتا اسے ڈراتے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتاتے رہتے۔

یہ ہے مثال ان کی گہری سازش اور تدبیر کی جو وہ حضورؐ کے خلاف کرتے تھے اور یہ سازش وہ جانتے ہوئے کرتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ اس لیے یہ جو وہ کہتے تھے "کیا اس شخص کو اللہ کا رسول بنا کر بھیجا ہے" یہ بطور تمسخر نہ کہتے تھے' بلکہ یہ وہ گہری سازش کے تحت محض کردارکشی کے لیے کہتے تھے حالانکہ ان کا شعور گواہ تھا کہ وہ حضورؐ کو حق پر سمجھتے تھے۔ یہ باتیں کہہ کر وہ عوام کی نظروں میں حضورؐ کی شان گراتے تھے تاکہ سابقہ نظام میں ان کو جو عزت اور مرتبہ کا مقام حاصل تھا وہ باقی رہے اور جو مالی مفادات ان کو حاصل ہوتے تھے وہ ان کو حاصل ہوتے رہیں۔

قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو رویہ اختیار کیا' ہر زمان و مکان میں دعوت حق کے ساتھ مفاد پرست لوگ یہی سلوک کرتے ہیں۔

زبانی طور پر تو وہ مذاق کے انداز میں پروپیگنڈے کرتے تھے اور آپ کی کردار کشی کرتے تھے لیکن خود ان کی باتوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ یہ لوگ حضور اکرمؐ کی دعوت سے کس قدر گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ قرآن کریم کے اٹل دلائل کے بارے میں یہ تبصرہ بھی کرتے تھے۔

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (۲۵: ۴۲) "اس نے ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ کر ہی دیا ہوتا اگر ہم ان کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے"۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ذہنی دنیا میں ایک قسم کا بھونچال آ گیا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے الہوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں لیکن وہ بڑی استقامت سے اپنے الہوں پر جم گئے۔ اپنے دین اور اس کے ساتھ وابستہ مناصب و مفادات کو بچاتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے یعنی مقابلہ کر کے صبر اور مصابرت سے کام نہ لیتے تو وہ بھی اپنے الہوں کو ترک کر چکے ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ اپنی ہٹ دھرمی اور مفادات کی وجہ سے یہ لوگ ہدایت کو ضلالت کہتے۔ یہی تو ان کی ضلالت تھی کہ خرد کا نام جنوں رکھ رہے تھے لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے ان کے ایوانوں میں جو زلزلہ برپا کر دیا تھا اس کو وہ چھپا نہ سکے۔ اگرچہ غایت درجہ ہٹ دھرمی اور اصرار کی وجہ سے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور قرآن پر حرف گیری کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ بھی انہیں خبردار فرماتا ہے کہ بہت جلد وہ اپنے انجام تک پہنچ جائیں گے۔

وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵: ۴۲) "وہ وقت دور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دور نکل گیا ہے"۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ حضرت محمدؐ جو دعوت لے کر آئے تھے وہ تو ہدایت تھی اور جس پر وہ قائم تھے وہ ضلالت تھی۔ لیکن جب وقت چلا جاتا ہے تو پھر علم کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اس وقت تو وہ عذاب دیکھ لیں گے۔ خواہ یہ عذاب دنیا کا ہو' جس طرح بدر کے دن انہوں نے خوب چکھا' یا آخرت کا ہو جسے وہ یوم الحساب میں دیکھیں گے' جائیں گے اور چکھیں گے۔

اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو ان کے عناد ہٹ دھرمی اور استہزا پر تسلی دی جاتی ہے کہ آپ نے تو دعوت پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ آپ نے پورے پورے دلائل سنا دیئے اور مناسب نہ تھا کہ ان کا ردعمل وہ ہوتا جو ہوا ہے۔ قصور صرف ان کا ہے۔ انہوں نے دراصل اپنی خواہشات نفسانیہ کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔ اور وہ کسی حجت اور برہان کی طرف توجہ کرنے والے نہیں ہیں۔ اگر لوگ نہیں مانتے تو رسول کیا کر سکتا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۲۵: ۴۳) "کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا' کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لے آنے کا ذمہ لے سکتے ہو"۔ یہ عجیب انداز بیان ہے۔ اس سے ان کی عجیب نفسیاتی حالت کا اظہار ہوتا ہے کہ کسی شخص کا نفس تمام طے شدہ معیار' تمام مسلمہ استدلال' تمام طے شدہ اقدار کو چھوڑ کر صرف اپنی خواہش نفس' اپنی پسند اور اپنی ضد کی بندگی شروع کر دے۔ کسی استدلال' کسی برہان' کسی منطق اور کسی سنجیدہ بات پر کان نہ دھرے۔ بس صرف اپنی

خواہش کو الٰہ بنا کر پوجے۔

اللہ جل شانہ اپنے بندے کو نہایت ہی نرمی، محبت، انس اور گہرے تعلق کے انداز میں پکارتا ہے۔ ارءیت کیا کبھی تم نے غور کیا ہے، کیا تمہیں معلوم ہے۔ ایسے شخص کی تصویر کشی کی جا رہی ہے جس کے سامنے کوئی معقول بات پیش کرنا فضول ہے۔ وہ حجت، حقیقت اور غور و فکر کو جانتا ہی نہیں ہے۔ ان چیزوں کی اس کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص ہدایت کے قابل ہی نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کے ذمہ ایسے شخص کی ہدایت نہیں لگائی جا سکتی اور نہ آپ ایسے شخص کے وکیل ہو سکتے ہیں۔ اور نہ ایسے لوگ ہدایت تک پہنچ سکتے ہیں۔

اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۲۵: ۴۳) "کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟" یہ لوگ جنہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود اور الٰہ بنا رکھا ہے، ان کی اصل حیثیت اور ان کا اصل مقام بھی یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی حقیر لوگ ہیں۔ یہ محض اپنی خواہشات اور مفادات کے بندے ہیں۔ یہ حجت اور حقیقت کے آگے جھکنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ خواہشات اور مفادات کے آگے سجدہ ریز ہونے والے ہیں۔ بلکہ ان کو اس سے بھی زیادہ گرا ہوا مقام دیا جاتا ہے کہ مقام انسانیت سے گر کر مقام حیوانیت خالصہ میں داخل ہو گئے ہیں بلکہ اس سے بھی نیچے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵: ۴۴) "کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی محتاط انداز کلام اختیار فرمایا ہے۔ یہ کہا ہے اَكْثَرَهُمْ سب نہیں بلکہ ان کی اکثریت ایسی ہے۔ کیونکہ اہل مکہ کی ایک قلیل تعداد تو ابتداء ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھی۔ یا ان میں سے اکثر اس پر غور کرتے تھے۔ البتہ اکثریت ایسی تھی جو محض خواہش نفسی اور مفادات کی خاطر نہ مانتی تھی۔ ان کے کانوں پر دلائل پڑتے تھے۔ ان کی عقل اسے مانتی تھی لیکن پھر بھی ضد کرتے تھے۔ یہ گویا جانور محض تھے۔ انسان اور جانور میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان غور و فکر کرتا ہے اور پھر انسان اپنے غور و فکر کے مطابق اچھا طرز عمل بھی اختیار کرتا ہے۔ بصیرت اور قصد و ارادے سے حقائق کو اپناتا ہے۔ حجت اور دلیل سے بات کرتا ہے اور سنتا ہے۔ اور اگر انسان اپنے ان خصائص کو چھوڑ دے تو وہ بہائم سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بہائم کو اللہ نے جو شعور دیا ہے وہ تو اس سے استفادہ کرتے ہیں اور انسان کو جو عقل و دانش دی گئی ہے وہ اس سے استفادہ نہیں کرتا۔ حیوانات اپنے فرائض منصبی صحیح طرح ادا کرتے ہیں لیکن انسان ادا نہیں کرتا۔ حیوانات اپنے شعور سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ اپنے تدبر سے کام نہیں لیتا۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵: ۴۴) "یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے گمراہ"۔ یہ ہے جواب ان کے استہزاء کا۔ یعنی تم انسان ہی نہیں ہو، حیوانوں سے بدتر ہو۔ اس لیے تم سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ یوں اس سبق کا خاتمہ، جواب آں غزل پر ہوتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۵۹ ایک نظر میں

اس سبق میں مشرکین کے اعتراضات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے بحث و جدل کے موضوع کو چھوڑ کر اس کائنات کے مشاہد و مناظر کی سیر کرائی جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل اور آپ کے احساسات کو اس کائنات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ مشرکین کے لایعنی اعتراضات کی وجہ سے پیدا ہونے والے غبار خاطر کو دور کرنے کے لیے' مناظر کائنات کے ساتھ یہ اتصال اور ان کی طرف یہ توجہ کافی ہے۔ کائنات کی وسعتوں کی یہ سیر آپ کے دل کے سکون اور شرح صدر کے لیے ایک وسیع میدان ہے جس کے مقابلے میں سازشیں کرنے والوں کی چھوٹی چھوٹی سازشیں اور دشمنی کرنے والوں کی بے مقصد دشمنیاں نہایت ہی حقیر نظر آتی ہیں۔

قرآن کریم انسانوں کے دل و دماغ کو ہمیشہ اس کائنات کے مشاہد و حقائق پر غور کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انسانی سوچ اور انسانی تدبر اور مشاہدات قدرت کے درمیان ربط پیدا کیا جاتا ہے۔ اور انسان کے ذرائع شعور و ادراک کو جگا کر اس بات کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ ان کے مشاہد اور مناظر کو بالکل ایک جدید احساس کے ساتھ دیکھیں۔ اور مشاہد قدرت اور فطرت کے عجوبوں کی پکار کو سنیں اور ان کی پکار پر لبیک کہیں۔ قرآن انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کی سیر کرے اور اس کے اندر بکھرے ہوئے دلائل قدرت اور آیات فطرت کو اخذ کرے۔ کیونکہ یہ کائنات دراصل ایک کھلی کتاب ہے اور اس کے صفحات میں صانع کائنات کی کاریگریاں اور صنعت کاریاں ہمارے تدبر کے لیے چشم براہ ہیں۔ قرآن کریم انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ دست قدرت کے ان آثار کو پانے کی کوشش کرے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی آنکھ کو بینا' احساس کو تیز اور کانوں کو کھلا رکھے اور اپنے ان ذرائع ادراک کے ذریعے غور و تدبر کے موضوعات تلاش کرے۔ اس طرح وہ اتصال باللہ حاصل کرے یعنی اللہ کی صنعت کاریوں کے ذریعے اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کرے۔

جب انسان اس کائنات میں کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے زندگی بسر کرے' اس کی روح اور اس کا احساس جاگ رہا ہو۔ اس کی فکر اور اس کی سوچ مربوط ہو' تو اس پر دنیا کی معمولی وابستگیوں سے ذرا بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس کا تصور حیات بلند ہو جاتا ہے اور اس کا احساس بہت تیز ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس محدود دنیا کے مقابلے میں کائنات کے آفاق بہت ہی وسیع ہیں۔ پھر اس کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے' یہ فقط ایک ہی ارادے کے نتیجے میں موجود ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک ہی ناموس حیات کے اندر بندھی ہوئی ہیں۔ پھر اپنی حرکت میں یہ تمام چیزیں ایک ہی خالق کی طرف متوجہ ہیں۔ اور خود انسان بھی اس کائنات کی مخلوقات میں سے ایک ہے اور یہ بھی دست قدرت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اس کا پورا ماحول دست قدرت میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے اور جو کچھ چھو رہا ہے وہ قدرت کی صنعت کاریاں ہیں۔

اس تصور سے انسان کے پردۂ احساس پر شعور تقویٰ' شعور محبت اور شعور اعتماد کی ایک امتزاجی کیفیت نمودار ہوتی

ہے۔جس سے انسان کی روح سرشار ہوتی ہے اور اس کی دنیا معنویت سے بھر جاتی ہے اور انسان کو ایک خاص اندرونی تطہیر' اطمینان اور انس و محبت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس روح' اس مفہوم اور اس تصور کے ساتھ انسان اس کرۂ ارض پر چلتا پھرتا ہے اور آخرکار وہ اللہ کے ساتھ مل جاتا ہے۔اس طرح انسان کی یہ زندگی نہایت ہی خوشگوار تفریحی سفر بن جاتی ہے۔وہ اللہ کی صنعت کاریوں کی ایک نمائش اور ایک میلے میں گم ہوتا ہے اور وہ ہروقت اللہ کی اس خوبصورت کائنات کے ایسے دسترخوان پر ہوتا ہے جس پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی ہیں۔

اس سبق کا آغاز سایہ کی تصویرکشی سے ہوتا ہے۔ دست قدرت اس سائے کو طویل تر کر دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اسے سکڑا جاتا ہے۔قبض و بسط کا یہ عمل نہایت ہی نرمی اور لطف اور غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے۔پھر ہم رات کے اندھیرے میں اپنی اپنی آرام گاہ کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ پوری کائنات پر سکون اور خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔پھر ہم دن میں داخل ہوتے ہیں اور نہایت ہی ترتیب سے زندگی کی تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔پھر رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں' بادل لاتی ہیں اور بارش برساتی ہیں۔پھر ہم سمندر میں ہیں' ساتھ ساتھ میٹھے پانی اور کھارے پانی باہم ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان ایک پردۂ حائل ہے جو دست قدرت کی صنعت کاری ہے۔یہ دونوں سمندر اور دونوں پانی آپس میں مل نہیں پاتے۔پھر عام پانیوں سے ہم مرد کے ساغر حیات کی طرف آ جاتے ہیں۔یہ نطفے کی ایک بوند ہوتی ہے۔اچانک یہ ایک زندہ انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔پھر ایک منظر پر ہم دیکھتے ہیں کہ پوری زمین و آسمان کی تخلیق چھ دنوں میں ہے۔ زمین و آسمان کے اندر بروج ہیں۔ سراج منیر اور قمر منیر ہیں۔پھر رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آ رہے ہیں اور زمانے گزر جاتے ہیں۔

کائنات کی اس سیر کے اندر ہمارا دل زندہ ہو جاتا ہے اور ہماری سوچ مدبر کائنات کی صنعت کاریوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اور انسان کے دل میں اللہ کی قدرت اور تدبیر کے نظارے میں تازہ ہوجاتے ہیں۔پھر انسان سوچتا ہے کہ مشرکین کس قدر احمق ہیں کہ وہ اس رب کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں اور ایسے چیزوں کی بندگی کرتے جو ان کو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ضرر دے سکتی ہیں۔انسان سوچتا ہے کہ رب تعالیٰ کے بارے میں یہ لوگ کس قدر جاہل ہیں اور اللہ کی ذات پر کس قدر جرات کرتے ہیں اور کفر و انکار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس کائنات کے اندر موجود دلائل اور آیات اور شواہد و نشانات کے ان عجوبوں کے ہوتے ہوئے مشرکین کا رویہ نہایت ہی عجیب لگتا ہے۔اس کائنات کے یہ مناظر اور اللہ کی تخلیق کے یہ نمونے انسانی ہدایت کے لیے کافی و شافی ہیں۔

آیئے ذرا دست قدرت کی ان صنعت کاریوں کی سیر کریں جس کا ہر پہلو ہمیں واصل باللہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور جس کی صرف ایک وادی کی سیر ہی ہماری پوری زندگی کے لیے کافی ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۱۵۹ تشریح آیات

۴۵ --- تا --- ۶۲

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا ﴿٤٦﴾

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا' پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں"۔

کشادہ اور لطیف سائے کا تصور ہی ایک کبیدہ خاطر اور تھکے ہوئے انسان کے لیے فرحت بخش ہوتا ہے۔ایسے سائے میں انسان اپنے آپ کو نہایت ہی پرسکون تصور کرتا ہے۔انسان کو یوں لگتا ہے کہ ایک نہایت ہی رحیم وکریم دست شفقت انسان کی روح اور جسم کو چھو رہا ہے اور زندگی کے آرام اور زخموں پر نہایت ہی آرام دہ مرہم پٹی ہو رہی ہے۔تھکے ہارے دلوں کو قدرت کا یہ ماحول دست شفقت فراہم کرتا ہے۔کیا اللہ یہی چاہتا کہ اس کے بندے پر طرح طرح کے الزام لگا کر' اس کے ساتھ مذاق کر کے' اس کے دل کو دکھایا گیا ہے' لہٰذا اسے قدرتی شفقت کا یہ ماحول فراہم کیا جائے۔اسے تھوڑی دیر کے لیے اس جاں گسل کشاکش کے ماحول سے نکال کر قدرتی سکون کا ماحول فراہم کیا جائے اور اس زبردست معرکہ آرائی میں آپؐ کے دکھے ہوئے دل کو سکون فراہم کیا جائے۔یاد رہے کہ یہ مکی دور ہے اور آپ کو مشرکین مکہ کے جحود و انکار' کبر و عناد اور مکر و فریب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک طویل زمانہ گزر گیا ہے۔آپ کے ساتھی کم ہیں' مشرکین ہر طرف سے پھیلے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ اور اہل ایمان کو اس اذیت استہزاء اور دست درازیوں کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسے مشکل حالات میں آپ کے دل پر قرآن کریم کا جو ٹکڑا نازل ہوتا تھا وہ بہت ہی آرام دہ مرہم کا کام دیتا تھا۔یہ دراصل تھکے ماندے مسافر کے لیے وسیع اور گہرا سایہ ہوتا تھا۔اور کفر و جحود اور عناد اور عصبیت کی گرم لو میں ٹھنڈی اور خوشگوار چھاؤں ہوتی تھی۔سایہ خصوصاً ایک تپتے ہوئے صحراء میں' اس سورت کی روح' موضوع' مضمون اور جدل وجدال کے گرم ماحول میں امن و سکون اور ملجاو ماویٰ فراہم کرتا ہے۔

قرآن کریم اس سایہ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ دست قدرت اسے لمبا کرتا جاتا ہے۔یہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر لمبا ہوتا جاتا ہے۔پھر نہایت ہی نرمی اور غیر محسوس طور پر اسے لپیٹا جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ (۲۵:۴۵) "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے" - اور

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۲۵:۴۶) "پھر ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف لپیٹتے چلے جاتے ہیں" - سایہ کیا چیز ہے - کوئی جسم جب سورج کی شعاعوں کے سامنے حائل ہوتا ہے تو وہ ایک خفیف قسم کا اندھیرا پیدا کرتا ہے - جوں جوں زمین سورج کے سامنے حرکت کرتی ہے - یہ سایہ بھی حرکت کرتا رہتا ہے - اس کی وضع اور اس کی شکل بدلتی رہتی ہے - اس کی شکل و صورت کو سورج کی شعاعیں روشنی اور حرارت سے متعین کرتی ہیں - جن کی وجہ سے یہ سکڑتا اور پھیلتا ہے - اس وجہ سے انسان کو خوشی اور تازگی حاصل ہوتی ہے - اس کی روح کے اندر لطیف و شفاف بیداری پیدا ہوتی ہے اور نفس انسانی دست قدرت کی لطیف صنعت کاری کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے - سورج اور سائے کا یہ منظر جب غائب ہونے پر آتا ہے تو یہ سایہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے - جب یہ طوالت کی آخری حد تک پہنچتا ہے تو یہ سایہ سورج کے غروب کے ساتھ ہی غائب ہو جاتا ہے - یہ کہاں چلا گیا یکایک - یہ دست قدرت ہے جس نے اسے لپیٹ اور سمیٹ لیا - ایک ہمہ گیر سایہ چھا گیا اور اس کے اندر آہستہ آہستہ اب رات کی تاریکی نمودار ہونا شروع ہو گئی - یہ ہے صنعت دست قدرت کی - انسان ہے کہ قدرت کے ان آثار و علامات کے اندر ڈوبا ہوا ہے - اس کے اردگرد قدرت کے شواہد پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس کی کند عقل ان آثار کو نہیں پا رہی ہے -

وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا (۲۵:۴۵) "اگر اللہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا" - لیکن اللہ نے ایسا نہ چاہا - کیونکہ اس کائنات کی تنظیم ہی اس طرح کی گئی ہے - اس نظم و نسق کا تقاضا ہے کہ ہم روز اس سائے کو یوں دیکھتے رہیں کہ اس کا مدوجزر یوں ہی جاری رہے - اگر اس کے اندر ذرا بھی تبدیلی کر دی جائے اور اس سایہ کو ساکن بنا دیا جائے تو اس پوری کائنات کے آثار ہی بدل جائیں - اگر زمین ایک جگہ رکی ہوئی ہوتی تو یہ سایہ بھی رکا ہوتا - اس کا مدوجزر تو ختم ہو جاتا - اگر زمین کی یہ حرکت نرم ہوتی تو اس سائے کے آثار بھی سست رفتار ہوتے اور اگر زمین کی حرکت تیز ہوتی تو سایوں کا مدوجزر بھی تیز ہو جاتا - یہ زمین کی ایک متعین حرکت ہے جو سایوں کو یہ منظر عطا کرتی ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور وہ آثار پیدا کرتی ہے جو ہمارے لیے مفید ہیں - اور جن کے خواص کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں -

یہ گردش زمین اور گردش ظلال اور ان کا مدوجزر تو ہم رات دن دیکھتے ہیں اور غفلت میں گزر جاتے ہیں - اللہ تعالیٰ ہمیں از سر نو اس طرف متوجہ فرماتا ہے - یہ قرآن کریم کے انداز بیان کا ایک مخصوص طریقہ ہے کہ وہ انسانی ضمیر کے اندر ایک مردہ تاثر کو زندہ کر دیتا ہے - ہمارے اندر انفعالیت جگاتا ہے - اور ہمیں اپنے ماحول کے ساتھ مربوط کرتا ہے - ہمارے احساسات کو جگاتا ہے، ہمارے شعور کو تیز کرتا ہے تاکہ ہم ان مشاہد اور آیات بینات کی تہ پر غور کریں - یوں ہمارے دل اس کائنات میں تدبر کے عادی ہو جائیں کیونکہ یہ کائنات بہت ہی عظیم اور عجیب ہے -

سائے کا یہ منظر رات پر آکر ختم ہوتا ہے - جب سائے طویل ہوتے ہیں تو رات چھا جاتی ہے - رات کے پس پردہ انسانیت آرام و سکون حاصل کرتی ہے اور پھر دن جس میں لوگ زندگی کی تگ و دو میں داخل ہوتے ہیں -

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا۝

"اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے لباس 'اور نیند کو سکون موت 'اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا"۔

رات تمام چیزوں اور تمام زندہ مخلوق کو ڈھانپ لیتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہر چیز نے رات کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ لوگ رات کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔ یوں رات ان کے لیے لباس ہو جاتی ہے۔ رات میں مکمل سکون ہوتا ہے۔ ہر چیز کی حرکت رک جاتی ہے۔ انسان حیوانات اور پرندے تک سو جاتے ہیں۔ پھر مزید یہ کہ سونے کے بعد اس دنیا کے ساتھ انسان کا وہ احساس قائم نہیں رہتا جو جاگتے میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اسے سبات یعنی موت جیسے سکون سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد صبح نمودار ہوتی ہے اور زمین کے اوپر پھر حرکت شروع ہوتی ہے۔ اس طرح گویا مرنے کے بعد ہر چیز دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ اس لیے اسے نشورا سے تعبیر کیا گیا۔ گویا چوبیں گھنٹے کے اس زمنی دورے میں انسان موت و حیات کا ایک مختصر نمونہ پیش کرتا ہے اور جب سے اللہ نے زمین 'آسمان کو پیدا کیا ہے' زمین کا یہ دور اپنے محور کے گرد جاری ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آیا۔ یہ زمین انسانوں کو لے کر چلتی ہی رہتی ہے 'لیکن انسان ہیں کہ غافل ہیں اور وہ زمین کی اس حرکت کے بارے میں سوچتے ہی نہیں جبکہ اللہ کی جو شان اس زمین کو چلاتی ہے وہ ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اللہ کو نیند آتی ہے۔

اب ذرا دوسرا منظر۔ یہ ہوائیں جو بارش کی خوشخبری لے کر آتی ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۝ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا۝

"اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر آسمان سے پاک پانی نازل کرتا ہے تا کہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے"۔

اس دنیا کی ہر زندگی پانی پر قائم ہے یا بارش کا پانی ہے اور یا دریاؤں اور ندی نالوں پر نہریں قائم کر کے سطح زمین کو پانی دیا جاتا ہے۔ پھر ان پانیوں میں سے جو زمین کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ وہ چشموں کی صورت میں نکلتا ہے یا کنوؤں کی صورت میں نکالا جاتا ہے۔ لیکن ہے یہ بھی بارش کا پانی۔ لیکن جن لوگوں کی سیرابی کا تعلق صرف بارش ہی پر ہے۔ وہ اللہ کی اس رحمت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو بارش کی شکل میں برستی ہے۔ وہ تو رات اور دن بارش پر آس لگائے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی بارش پر قائم ہوتی ہے۔ وہ ان ہواؤں کے انتظار میں ہوتے ہیں جو رحمت بھرے بادل چلا کر لاتی ہیں۔ جب یہ ہوائیں آتی ہیں تو ان کے لیے یہ بشارت ہوتی ہیں۔ ان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ بارشیں اللہ کی رحمت ہیں۔ ایسے لوگوں کا دل اگر اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہوتا ہے تو وہ اللہ کی اس رحمت کا بہت زیادہ احساس کرتے ہیں۔

یہاں پانی کے ساتھ طہارت اور طہور کے مفہوم کو نمایاں کیا گیا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (۲۵ : ۴۸) "پھر ہم نے آسمانوں سے پاک پانی نازل کیا"۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے اندر راز حیات ہے۔

لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا (۲۵ : ۴۹) "تاکہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعہ زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے"۔ یہاں زندگی پر طہارت کا ایک پرتو پڑتا ہے۔ کیونکہ اللہ کی منشا ہی یہ ہے کہ انسانی زندگی پاک و صاف ہو' اور پھر یہ بارش زمین کے چہرے کو بھی دھلا کر صاف کر دیتی ہے اور اسی ماء طہور سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور انسانوں' حیوانوں اور تمام زندہ چیزوں کی حیات قائم ہے۔

---ooo---

نزول ماء کے ساتھ نزول قرآن پر بھی ایک تبصرہ۔ پانی کے نزول سے زمین کے چہرہ کی صفائی مطلوب ہے اور قرآن کے نزول سے انسانی روح کی صفائی اور کمال مطلوب ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ جسم و جان کے تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے تو یہ لوگ نزول بارش کا انکار کرتے ہیں لیکن روحانی تطہیر کے لیے نزول قرآن کو یہ برداشت نہیں کرتے۔ اور اس کے لیے وہ ایک دوسرے کو بشارت نہیں دیتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ﴿۵۲﴾

"قرآن کو ہم بار بار ان کے سامنے لاتے ہیں تاکہ وہ کچھ سبق لیں' مگر اکثر لوگ کفر اور ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے۔ پس اے نبی' کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا (۲۵ : ۵۰) "اس قرآن کو ہم پھیر پھیر کر ان کے سامنے لاتے ہیں تاکہ وہ سبق لیں"۔ مختلف سورتوں کی شکل میں۔ متعدد اور متنوع اسالیب بیان میں۔ متعدد قطعات کی شکل میں اور اسی کے ذریعہ ہم نے ان کے شعور اور ان کی قوت مدرکہ کو مخاطب کیا۔ ان کی روح اور ان کے اذہان کو مخاطب کیا۔ اور ان کے نفوس کے اندر اسے ہر طرح داخل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے ابلاغ کا ہر حربہ استعمال کیا تاکہ یہ لوگ نصیحت قبول کرلیں۔ یہاں تو صرف یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ وہ حقیقت اور سچائی کا شعور تو خود ان کے نفوس اور ان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اور انہوں نے حقیقت کے اس شعور کو اس لیے دبا دیا ہے کہ خواہشات نفسانیہ کو انہوں نے

اللہ بنا دیا ہے۔ اس لیے اب ان کا رویہ یہ ہو گیا ہے۔

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۲۵: ۵۰) "مگر اکثر لوگ کفر اور ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں"۔ حضور اکرمؐ کی ذمہ داری تو ایک بھاری ذمہ داری ہے آپؐ نے پوری انسانیت کو درست کرنا ہے جبکہ انسانوں کی اکثریت ذاتی خواہشات کی بندہ بن گئی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ دلائل ایمان ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ اس نے کفر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا (۲۵: ۵۱) "اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے"۔ اس طرح مشقت بٹ جاتی۔ ذمہ داریاں کم ہو جائیں لیکن اللہ نے تمام کائنات کی ہدایت کے لیے ایک ہی بندے کو بھیجا۔ آپؐ خاتم الرسل ہیں اور آپؐ کے ذمہ یہ کام لگایا گیا ہے کہ آپؐ تمام لوگوں اور تمام بستیوں کو خبردار کریں۔ اور ان کو اللہ کی آخری رسالت کی طرف متوجہ کریں اور یوں اللہ نے یہ چاہا کہ تمام انسانیت اس آخری رسالت پر جمع ہو جائے۔ اور لوگ مختلف رسولوں کی باتیں سن کر اختلاف کا شکار نہ ہو جائیں اور اس کے بعد نبی آخر الزمان کو قرآن دیا تاکہ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے جدوجہد کریں۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۲۵: ۵۲) "پس اے نبیؐ تم کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔ اس قرآن کے اندر بڑی قوت اور گرفت ہے۔ گہری تاثیر ہے۔ اس قدر جاذبیت ہے کہ جس کا کوئی سننے والا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی یہ کشش دلوں کو جھنجوڑ دیتی ہے۔ انسانی روح اور شعور کے اندر زلزلہ برپا ہو جاتا ہے۔ لوگ قرآن کریم کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے تمام تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔

قریش کے سردار عوام الناس کو کہتے تھے۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کو نہ سنو اور جہاں یہ پڑھا جا رہا ہو وہاں شور مچاؤ شاید کہ اس طرح تم غالب ہو جاؤ"۔ ان کے اس قول سے قریش اور ان کے متبعین کی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ قرآن کریم کی اثر آفرینیوں سے بہت پریشان تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کے متبعین صبح و شام قرآن کریم سے سحر زدہ ہو جاتے تھے۔ ایک ایک آیت' دو دو آیات یا دو دو سورتیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے۔ لوگوں کے دل ان کی طرف کھیچ جاتے تھے اور ان کا دماغ مسحور ہو جاتا تھا۔

روساء قریش جو اپنے متبعین کو یہ حکم دیتے تھے' کیا وہ خود قرآن کی تاثیر سے محفوظ تھے۔ اگر خود انہوں نے قرآن مجید کی بے پناہ تاثیر کو محسوس نہ کیا ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کہتے اور نہ وہ اپنی صفوں میں اس قدر خوف پھیلاتے۔ ان کی اس ہدایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تاثیر کا کیا عالم تھا۔

ابن اسحاق' محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں کہ ان تک یہ روایت پہنچی ہے کہ ابوسفیان ابن

ابوجہل ابن ہشام اور اخنس ابن شریق ' ابن عمر ابن وھب ثقفی بنی زہرہ کے حلیف ایک رات نکلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنیں ۔ حضور اکرمؐ رات کے وقت اپنے گھر پر نماز پڑھا کرتے تھے ۔ ان میں سے ہر شخص اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور قرآن کریم سنتا رہا۔ ہر شخص دوسرے کے بارے میں نہ جانتا تھا۔ وہ رات گئے تک قرآن کریم سنتے رہے ۔ جب صبح طلوع ہوئی تو یہ لوگ لوٹنے لگے ۔ راستے میں ایک دوسرے سے ملاقات ہوگئی ۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کیا ۔ اور ایک دوسرے سے کہا۔ یہ حرکت دوبارہ نہ کرو ۔ اگر تمہیں تمہارے نادانوں نے دیکھ لیا تو تم خود ان کے دلوں میں بات ڈال دو گے ۔ پھر یہ لوگ چلے گئے جب دوسری رات آئی تو ان میں سے ہر شخص پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ پھر یہ لوگ رات کو کلام الٰہی سنتے رہے ۔ صبح فجر نمودار ہوئی تو پھر بکھر گئے ۔ راستے میں پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو وہی کہا جو اگلی رات انہوں نے کہا تھا ۔ اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ۔ جب تیسری رات ہوئی تو پھر تینوں اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے ۔ ساری رات سنتے رہے ۔ جب فجر نمودار ہوئی تو پھر یہ لوگ بکھر گئے لیکن راستے میں پھر ان کی ملاقات ہوگئی ۔ اب انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اب تو پختہ عہد کرنا ہوگا کہ پھر ہم یہ حرکت نہ کریں گے ۔ چنانچہ عہد کے بعد یہ لوگ جدا ہوئے ۔ دوسرے دن صبح اخنس ابن شریق نے اپنی عصا لی ۔ وہ سب سے پہلے ابوسفیان کو اس کے گھر میں ملا ۔ اس نے اسے کہا ابوحنظلہ بتاؤ' تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کلام سنا اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ۔ اس نے کہا ابوثعلبہ! خدا کی قسم میں نے بھی ان سے بعض ایسی چیزیں سنیں ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں ۔ بعض ایسی باتیں بھی سنیں ہیں جن کا مفہوم میں نہیں سمجھتا اور نہ میں یہ سمجھا ہوں کہ ان کا مقصد کیا ہے ۔ اخنس نے کہا میری رائے بھی وہی ہے جس پر تم نے حلف اٹھایا ہے ۔ وہاں سے نکل کر یہ شخص ابوجہل کے پاس آیا ۔ اس کے گھر میں داخل ہوا ۔ اور کہا ابوالحکم بتاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تم نے جو کچھ سنا' اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے ۔ ابوجہل نے کہا میں نے کیا سنا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہمارا اور بنی عبد مناف کے درمیان عزت اور شرف پر جھگڑا رہا۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا تو ہم نے بھی مقابلے میں دستر خوان بچھائے ۔ انہوں نے لوگوں کو تحفے دیئے اور ہم نے بار بار تحفے دیئے ۔ انہوں نے داد و دہش کی تو ہم نے بھی داد و دہش کی ۔ یہاں تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ کاندھے ملا کر یوں چلے کہ جس طرح دو مقابل کے گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں ۔ اب انہوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہم سے نبی آگیا ہے ۔ اس پر آسمان سے وحی آتی ہے' ان کے مقابلے میں ہم نبی کہاں سے لائیں ۔ خدا کی قسم' ہم اس پر کبھی بھی ایمان نہ لائیں گے ۔ اور ہرگز ہم اس کی تصدیق نہ کریں گے ۔ اس پر اخنس ابن شریق اسے چھوڑ کر چلے گئے ۔

یہ تھا عالم قرآن کریم کے اثرات کا ۔ یہ لوگ ان اثرات کا مقابلہ کر رہے تھے ۔ ایک دوسرے کے ساتھ پختہ عہد کرتے تھے کہ آئندہ مت سنو ورنہ لیڈرشپ کو خطرہ ہے ۔ اگر عوام کو پتہ چل گیا کہ ہم لوگ کلام الٰہی سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو لوگ ٹوٹ پڑیں گے ان پر تو جادو جیسا اثر ہوتا ہے ۔

قرآن کریم درحقیقت نہایت ہی سادہ فطری حقائق بیان کر رہا تھا ۔ یہ سچائی تیر کی طرح دل میں اترتی تھی ۔ جب انسانی دل و دماغ اس اصلی سرچشمے تک پہنچ جاتے تھے تو اس سرچشمے کا جوش پھر تھمتا نہ تھا ۔ اثرات کے فوارے چھوٹ جاتے تھے اس میں قیامت کے مناظر' عبرت آموز قصص ' اس کائنات کے مشاہد' ہلاک شدہ اقوام کی عبرت آموز

داستانیں اور ان کے کھنڈرات کے مناظر' قرآن کے تشخص مفہومات اور تمثیل واقعات اور دلائل و آیات تھے' ان سے دل دہل جاتے تھے۔ بعض اوقات صرف ایک سورت پڑھنے سے انسانی شخصیت کے اندر تزلزل پیدا ہو جاتا۔ اور ایسے انسانی نفوس اس سے مفتوح ہوتے چلے جاتے تھے جو چٹان کی طرح مضبوط ہوتے تھے۔ اگر قرآن کے سوا لشکر جرار بھی ایسے نفوس کو فتح کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

اس لیے یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہے کہ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے کہ آپ کافروں کی اطاعت نہ کریں اور دعوت اسلامی کے حوالے سے آپ کے قدم نہ ڈگمگائیں اور اس قرآن کو لے کر کفار کے مقابلے میں عظیم جدوجہد کریں۔ کیونکہ آپ کے پاس قرآن کریم کی وہ قوت ہے جس کے مقابلے میں طاقتور سے طاقتور انسان نہیں ٹھہر سکتا۔ جس کے خلاف کوئی مجادلہ کارگر نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے خلاف کوئی قوت کارگر ہو سکتی ہے۔

---ООО---

اس کے بعد روئے سخن اس کائنات کے مناظر کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ ہواؤں کے منظر' پاک وصاف پانی کے منظر' سمندروں میں میٹھے اور کھارے پانی اور ان کے درمیان پائے جانے والے قدرتی پردے کے مناظر بیان کیے جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٥٣﴾

"اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں' دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے"۔

یعنی وہ ذات جس نے دو سمندروں کو چلا رکھا ہے' ایک میٹھا ہے اور دوسرا نمکین اور کھارا ہے' دونوں ایک جگہ باہم ملے ہوئے ہیں لیکن وہ باہم مخلوط نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان قدرت نے ایک پردہ قائل کر دیا ہے۔ دونوں کی فطرت ایسی بنا دی ہے کہ وہ باہم مل ہی نہیں سکتے۔ کڑوے سمندروں کے اوپر میٹھے پانی کی نہریں ہیں۔ میٹھے پانی کی ایک نہر سطح سمندر کے اوپر چلتی ہے۔ اس کے برعکس کم ہی ہوتا ہے۔ یعنی میٹھے سمندر پر کڑوے پانی کی نہر نہیں بہتی۔ اس دقیق انتظام کی وجہ سے سمندر کا کڑوا پانی صاف اور میٹھے پانی کے اوپر نہیں آتا۔ حالانکہ کڑوا سمندر بہت بڑا اور گہرا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں میٹھی نہر چھوٹی ہوتی ہے لیکن اس میٹھی نہر سے انسانوں' جانوروں اور نباتات کی زندگی قائم ہوتی ہے۔ میٹھے اور کڑوے پانیوں کی یہ جولانی محض اتفاق سے نہیں ہوتی بلکہ خالق کائنات نے بوقت تخلیق ان کو اس طرح پیدا کیا اور اس سے خالق کے پیش نظر کچھ مقاصد تھے۔ اللہ نے قوانین قدرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ کڑوے پانی' ان نہروں کی راہ نہ روکیں اور نہ یہ سمندر خشکی پر چڑھ آئیں۔ یہاں تک کہ سمندر کے حالات مدوجزر میں بھی یہ میٹھا پانی اور کڑوے سمندر ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں حالانکہ مدوجزر میں سمندر کا پانی بہت ہی اونچا ہو جاتا ہے۔

کتاب "سائنس دعوت ایمان دیتی ہے" کے مصنف کہتے ہیں: "چاند ہم سے دو صد چالیس ہزار میل دور ہے۔ مد

جو دو مرتبہ پیدا ہوتا ہے ہمیں چاند کے وجود کا لطیف احساس دلاتا ہے ۔مد کی وجہ سے بعض مقامات پر سطح سمندر ساٹھ قدم بلند ہو جاتی ہے بلکہ زمین کی بالائی سطح بھی دو مرتبہ باہر کی طرف چاند کی اس کشش کی وجہ سے کئی انچ باہر نکلتی ہے لیکن ہمیں تمام چیزیں ایسی منظم نظر آتی ہیں کہ ہمیں اس قوت کا ادراک ہی نہیں ہوتا۔جس نے اس عظیم سمندر کو کئی قدم بلند کر دیا ہے اور زمین کی سطح جو ہمیں بہت مضبوط نظر آتی تو اسے بھی کئی انچ وہر اکر دیا ہے"۔

"سیارہ مریخ کا ایک اپنا چاند ہے ۔یہ چھوٹا چاند ہے ۔یہ مریخ سے چھ ہزار میل دور ہے ۔اگر ہمارا یہ چاند ہم سے پچاس ہزار میل دور ہوتا بمقابلہ اس بعید دوری کے جو اس وقت ہم سے ہے 'تو مدوجزر کا عمل اس قدر شدید ہوتا کہ سمندر کے نیچے جو زمین ہے وہ دن میں دو مرتبہ اس مدوجزر کے عمل سے دوچار ہو کر اپنے تمام پہاڑوں کو اپنی جگہ سے زائل کر دیتی ۔یہ عمل اسی طرح جاری رہنے سے دنیا میں سے تمام خشکی ختم ہو جاتی اور زمیں پر ایک عظیم اضطراب ہمیشہ رہتا۔نیز ہوا کے اندر مدوجزر کے عمل کے نتیجے میں سخت آندھیاں آتی رہتیں ۔اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ پانی کا یہ مدوجزر خشکی کو دھولے گیا ہے تو پھر ہمیں یہ فرض کرنا ہو گا کہ اب پوری زمین کے اوپر پانی ڈیڑھ میل تک چڑھ گیا ہے ۔اس صورت میں زندگی کا اگر کوئی امکان ہوتا تو وہ سمندر کی گہرائیوں میں ہوتا اور یہ بھی محض وجود حیات کا احتمال ہے"۔

لیکن اس کائنات کو ایک مدبر کائنات نے اس طرح بنایا ہے کہ سمندر کے اندر بھی میٹھا اور کھارا پانی ایک دوسرے پر دست درازی نہیں کر سکتے ۔اور ان کے طبیعی مزاج اور ان کی ساخت کے اندر یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں ۔یہ ہے کام صانع حکیم کا جس نے اس کائنات کو منظم کیا ہے 'ایک خاص قانون قدرت کے مطابق چلایا ہے ۔

--- ○○○ ---

اب سمندر اور نہروں کے پانیوں سے روئے سخن ماء حیات کی طرف ۔ذرا اس نطفے کا مطالعہ کرو جس سے انسان پیدا ہوتا ہے ۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾

"اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا' پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے ۔تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے"۔

اس پانی ہی سے جنین پیدا ہوتے ہیں ۔اگر جنین مرد ہوں تو وہ نسب ہوں گے اور اگر مادہ ہوں تو سسرال ہوں گے ۔ مادہ کو صہر اس لیے کہا گیا کہ قرابت کی جگہ عورت ہوتی ہے (یعنی عورت کے ذریعہ قرابت داری پیدا ہوتی ہے) آسمان کے پانی سے جو مخلوقات پیدا ہوتی ہے اس کے مقابلے میں یہ انسانی مخلوق بہت ہی عجیب ہے ۔کیونکہ مرد کے پانی کے ایک قطرے کے اندر جو ہزار ہا خلیے ہوتے ہیں ان میں سے ایک کے ساتھ رحم مادر کے اندر پایا جانے والا چھوٹا سا انڈا متحد ہو جاتا ہے اور اس سے پھر یہ پیچیدہ مخلوق پیدا ہوتی ہے جس کا نام انسان ہے ۔جس قدر زندہ کائنات اور مخلوقات ہے ان میں سے یہ مخلوق عجیب ترین مخلوق ہے ۔

یہ انڈے اور یہ خلیے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن پھر عجیب طریقے سے یہ نر اور مادہ بن جاتے ہیں ۔اس کا راز

بھی انسان ابھی تک معلوم نہیں کر سکا۔ نہ آج تک ہمارا علم اس کو پا سکا ہے کہ نر اور مادہ بننے کے اسباب کیا ہیں کیونکہ ہزار ہا خلیوں کے درمیان کسی ایسے خلیے کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکا اور نہ اس میں ایسی خصوصیات دریافت کی جا سکی ہیں کہ وہ مرد ہو گا یا عورت ہو گی۔ اور نہ عورت کے انڈے کے اندر کوئی ایسی خصوصیت دریافت کی جا سکی ہیں کہ فلاں خصوصیات ہوں تو مرد ہو گا۔ اور فلاں خصوصیات ہوں تو عورت پیدا ہو گی۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا (۲۵ : ۵۴) "اور تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے"۔ یہ ہے اللہ کی قدرت جس کے بعض پہلوؤں کا انکشاف دور جدید میں ہو چکا ہے جس سے مزید عجائبات آشکار ہوتے ہیں۔

اگر انسان اس پانی کے بارے میں تحقیقات کرتا چلا گیا جس سے انسان کی تخلیق ہوئی تو اس کا سر چکرا جائے گا۔ جب وہ دیکھے گا کہ اس پانی کے اندر پائے جانے والے یہ جرثومے جو نہایت درجہ چھوٹے اور باریک ہیں۔ یہ ہر جنس کی مکمل ترین خصوصیات اپنے اندر لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر والدین اور ان کے خاندان کے قریبی لوگوں کے خواص بھی پوری طرح موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ خصوصیات مذکر جنین اور مونث جنین کی طرف اس طرح خود بخود منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح دست قدرت نے ان کے لیے منصوبہ بندی کر لی ہوتی ہے۔ تخلیقی اعتبار سے بھی 'اپنے رجحان کے اعتبار سے بھی اور اپنی طرز زندگی کے اعتبار سے بھی۔ کتاب "یہ انسان اکیلا نہیں کھڑا ہے" کا تھوڑی دیر کے لیے مطالعہ کیجئے۔ مصنف ان نہایت ہی چھوٹے ذروں کے اندر پائے جانے والے موروثی جینز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہر خلیہ خواہ مذکر ہو یا مونث 'وہ کروموزومز اور جینز پر مشتمل ہوتا ہے۔ کروموزوم عضوی مادے کا ابتدائی یونٹ ہوتا ہے اور یہ جینز کو نقل کرنے کا کام کرتا ہے جبکہ جینز موروثی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ کروموزم ایک گٹھلی ہوتے ہیں' جس کے اندر تمام جینز موجود ہوتے ہیں۔ جینز ہی وہ فیکٹر ہیں جو وجود میں آنے والے اس انسان کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ سیٹوپلازم وہ عجیب کیمیاوی مرکب ہے جو ان دونوں پر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سیٹوپلازم پروٹوپلازم مادہ ہوتا ہے جو خلیے کی گٹھلی کے اوپر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جینز اس قدر باریک اور اس قدر جامع ہوتے ہیں کہ ان کے اندر تمام انسانوں کے انفرادی خصائص' نفسیاتی حالات' ان کے رنگ اور ان کی جنس کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ اس قدر باریک ہوتی ہیں کہ اگر تمام دنیا کے انسانوں کے جینز کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور اسے ایک جگہ رکھ دیا جائے تو حجم میں ایک "انگشتانہ" کے برابر ہو گا"۔

"مائیکروسکوپ میں نظر آنے والے یہ نہایت ہی باریک جینز ہی دراصل تمام انسانوں' حیوانوں اور نباتات کی کنجی ہیں اور ان کو کنٹرول کرتے ہیں۔ انگشتانہ جس کے اندر کئی بلین افراد کے جینز سماتے ہیں یقیناً ایک مختصر جگہ ہے لیکن یہ طے شدہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے"۔

ایک جنین 'اپنے تغیر و تبدل کی مختلف صورتوں میں سے گزر کر جب نطفے سے کسی ایک جنس کی مشابہ شکل اختیار کرتا ہے تو اس کے اندر ایک طویل تاریخ کی کہانی پنہاں ہوتی ہے۔ یہ کہانی جینز 'سیٹوپلازم کے ذرات کے ملاحظے سے قلم بند ہو چکی ہے۔

"سائنس دانوں کے ہاں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جینز وہ چھوٹے سے چھوٹے ذرات ہیں جو مائیکروسکوپ کے ذریعے دیکھے جا سکتے ہیں اور یہ تمام زندہ مخلوقات کے خلیوں کے اندر موجود ہوتے ہیں' ان کے اندر اس مخلوق کی تصویر' اس کا ڈھانچہ 'اور سب خصوصیات درج ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی پودے کے خلیے کے اندر اس کی جڑیں' اس کا تنا' اس کے

پتے' اس کے تمام پھول' اس کے تمام پھل سب کے سب موجود ہوتے ہیں - ہر حیوان کی شکل 'کھال' بال اور پر سب شامل ہوتے ہیں اور اس میں انسان بھی شامل ہے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے عجائبات کے بارے میں اسی قدر جاننا بھی کافی ہے کہ خالق کائنات نے کس قدر خصوصیات ودیعت فرمائی ہیں۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا (۲۵: ۵٤) "اور تیرا رب بڑی قدرت والا ہے"۔

--- ○○○---

اس فضائے تخلیق اور تخلیق کے اندر پھر تقدیر اور اس منظر کے سامنے کہ آسمانوں سے پانی برستا ہے اور اس سے اور پھر انسانی نطفے کے پانی سے کیا کچھ پیدا ہوتا ہے اور کیا کیا خصوصیات کن کن جینز میں رکھی گئی ہیں کہ ایک خلیے سے ایک مرد تشکیل پاتا ہے اپنے تمام موروثی خصائص کے ساتھ' اور پھر ایسے ہی ایک خلیے سے ایک عورت پیدا ہوتی ہے اپنے تمام خصائص کے ساتھ۔ ایسے قادر مطلق کی قدرت کی بوقلمونیوں کو دیکھتے ہوئے بھی جو لوگ غیراللہ کی بندگی کرتے ہیں وہ نہایت ہی عجیب و غریب ہیں۔فطرت سلیمہ اس بات سے ابا کرتی ہے کہ ایسا فعل کوئی معقول انسان کر سکتا ہے۔چنانچہ اس مسئلے کو یہاں لیا جاتا ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾

"اس خدا کو چھوڑ کر لوگ ان کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں' نہ نقصان اور اس سے مزید یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے"۔

"یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں' ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے"۔یعنی تمام کافر جن میں مشرکین مکہ بھی شامل ہیں' وہ اپنے اس رب کے خلاف محاذ میں شامل ہو کر بر سرپیکار ہیں جبکہ اللہ نے ان کو اور تمام دوسرے کافروں کو پیدا کیا ہے۔یہ کس طرح اللہ کے خلاف' محاذ میں شامل ہو کر اللہ کے ساتھ جنگ کر سکتے ہیں؟ انسان' یہ کمزور مخلوق خالق کائنات کے خلاف کس طرح جنگ کر سکتا ہے؟ یا اللہ کے خلاف محاذ آرائی کس طرح کر سکتا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ یہ کافر اللہ کے دین کے خلاف بر سرپیکار ہیں۔اللہ نے جو منہاج حیات دیا ہے وہ اس کے خلاف بر سرجنگ ہیں۔البتہ انداز بیاں یوں اختیار کیا ہے کہ ان کافروں کی یہ جنگ اور محاذ آرائی نہایت ہی مکروہ نظر آئے۔یوں کہ دیکھو فلاں اپنے مالک آقا اور خالق کے خلاف لڑ رہا ہے۔

اور وہ جب اللہ کے رسول' آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں' تو وہ گویا اللہ کا انکار کرتے ہیں۔لہذا ان کی جنگ بھی اللہ کے خلاف ہے۔یوں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو مطمئن فرماتا ہے اور ان کے بار خاطر کو کم کرتا ہے' غبار خاطر کو دور کرتا ہے اور حضور اکرم کو یہ احساس اور شعور دلاتا ہے کہ آپ فقط تبلیغ رسالت کے سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کریں اور اس

سلسلے میں کافر جو دشمنی اور جو عناد کرتے ہیں' اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ اللہ پر توکل کریں' اللہ خود ان کفار سے نمٹ لے گا۔ یہ دراصل اللہ کے دشمن ہیں اور اللہ اپنے بندوں کے جرائم سے اچھی طرح واقف ہے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ قُلْ مَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَن شَآءَ أَن يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِۦ سَبِيلًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى ٱلْحَىِّ ٱلَّذِى لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِۦ ۚ وَكَفَىٰ بِهِۦ بِذُنُوبِ عِبَادِهِۦ خَبِيرًا ۝ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ ٱسْتَوَىٰ عَلَى ٱلْعَرْشِ ۚ ٱلرَّحْمَٰنُ فَسْـَٔلْ بِهِۦ خَبِيرًا ۝

"اے نبیؐ' تم کو تو ہم نے بس ایک بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے' ان سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا' میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔ اے نبیؐ' اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔ وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں' پھر آپ ہی "عرش" پر جلوہ فرما ہوا۔ رحمٰن ہے وہ۔ اس سے پوچھو کہ وہ جاننے والا ہے"۔

یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہ آپؐ خوشخبری سنانے والے اور انجام بد سے ڈرانے والے ہیں فقط۔ اور مکہ میں آپؐ کو یہ حکم نہ دیا گیا تھا کہ آپ لوگوں کے ساتھ جنگ کریں' کیونکہ مکہ میں تبلیغ دین کی پوری آزادی تھی لیکن بعد میں جب مسلمان مدینہ کو منتقل ہوئے تو اللہ نے قتال کا حکم دے دیا۔ مکہ میں اللہ نے حکم نہ دیا اور مدینہ میں قتال کا حکم دیا۔ اس کی حقیقی حکمت اللہ ہی جانتا ہے۔ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان لوگوں کو تربیت دی جا رہی تھی' جن پر اس نظریہ حیات کا دارومدار تھا' جن کے دلوں میں یہ عقیدہ اچھی طرح بیٹھ گیا تھا اور جن کی زندگی اس عقیدے کی ترجمان تھی۔ یہ عقیدہ ان کے طرز عمل اور ان کی طرز زندگی کے اندر بیٹھ گیا تھا تاکہ اس تربیت کے بعد آئندہ جس معاشرے پر اسلامی حکومت قائم ہو یہ لوگ اس معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن جائیں اور دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر مکہ میں جنگ شروع کر دی جاتی تو ان خونی دشمنیوں کی وجہ سے قریش ہمیشہ کے لیے اس عقیدے سے محروم ہو جاتے۔ اور ان کے اور اسلام کے درمیان ایک مستقل خلیج واقع ہو جاتی۔ جبکہ حکمت الٰہی اور تقدیر الٰہی میں مقدر یہ تھا کہ ہجرت کے بعد اور پھر فتح مکہ کے بعد سب کے سب قریش کو اسلام میں داخل ہونا تھا اور پھر ان میں سے جو لوگ نکلنے تھے' انہیں بعد کے ادوار میں پورے عالم میں اسلام کے پھیلاؤ کے لیے بنیاد کا کام سرانجام دینا تھا۔

لیکن مدینہ میں آغاز جہاد کے باوجود رسالت کی اصل ماہیت اور اس کا خلاصہ یہی تھا کہ رسول نے "انذار و تبشیر" کا کام کرنا تھا۔ جہاں تک قتال کا تعلق ہے وہ تو اس لیے جائز رکھا گیا ہے کہ دعوت اسلامی اور انذار اور تبشیر کی راہ میں اگر دنیا کے کسی خطے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہے تو اسے دور کر دیا جائے۔ اسلام میں جنگ محض اس لیے کی جاتی ہے کہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو اسے دور کر دیا جائے۔ لہٰذا یہ آیت کہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۲۵:۵۶) "اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر صرف مبشر اور نذیر کے طور پر"۔ جس طرح مکہ میں درست ہے اسی طرح مدینہ کے حالات پر بھی منطبق ہے۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰي رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۵:۵۷)

"ان سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا' میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے"۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے کہ لوگ اسلام قبول کر لیں۔ نہ وہ کسی سے فیس کے طلبگار ہیں' نہ نذر و نیاز اور قربانیوں کی آمدن کے رسول طلبگار ہوتے ہیں۔ اسلام میں داخلہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیس مقرر نہ کر رکھی تھی۔ بس چند کلمات ایک شخص ادا کرتا اور دل سے ان پر یقین کرتا۔ یہی اسلام تھا کیونکہ اسلام میں کوئی کاہن نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو مقدس کرنے کی کوئی فیس لیتا ہو۔ نہ وہ اللہ اور لوگوں کے درمیان کوئی دلال ہوتا ہے جو اپنی دلالی کا کمیشن لیتا ہو۔ اسلام میں دخول کے لیے کوئی رسم ہے' نہ کوئی راز ہے۔ اور نہ دخول کے وقت کسی کو کوئی خاص رسم ادا کرنی ہوتی ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ دین اسلام کس قدر سادہ' قدرتی اور فطری دین ہے۔ بس ایک عقیدہ ہے جو دل میں داخل ہو جائے۔ انسانی دل اور عقیدۂ اسلام کے درمیان کوئی رسمی واسطہ نہیں ہے۔ نہ کوئی کاہن' نہ کوئی پیر و فقیر۔ رسول کا اجر بس یہی ہے کہ دین حق کسی کے دل میں داخل ہو جائے اور کوئی بندہ اپنے حقیقی رب کے قریب ہو جائے۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰي رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۵:۵۷) "بس یہی اجر ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے"۔ صرف یہی اجر ہے رسول کا۔ رسول کا پاک دل اور رسول کا پاک شعور صرف اسی اجر پر راضی ہوتا ہے کہ ایک بندۂ گم کردہ راہ' اپنے رب کی طرف راہ پالے۔ رب راضی ہو جائے اور وہ رب کے طریقے پر چل پڑے اور پوری زندگی میں اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَي الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ (۲۵:۵۸) "اور اے نبی اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں' اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو"۔ اللہ کے سوا جتنی بھی مخلوق ہے وہ مرنے والی ہے کیونکہ یہ تمام مخلوق رات دن موت کی طرف رواں ہے۔ باقی رہنے والا صرف اللہ ہے وہ ایسا زندہ ہے جو کبھی مرنے والا نہیں ہے۔ اور کسی ایسے زندہ شخص پر بھروسہ کرنا جس نے ایک دن مرنا ہے طویل عمر کے بعد یا قصیر کے بعد' ایک ایسی ذات پر بھروسہ کرنا ہے جس نے ایک دن گرنا ہے۔ ایک ایسے سایہ کے پیچھے آنا ہے جس نے کسی

وقت زوال پاتا ہے۔ توکل تو اس حی اور زندہ پر کرنا چاہئے جس نے کبھی نہیں مرنا۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور پاکی بیان کرو۔ حمد اور تعریف بھی صرف اللہ کی کرنا چاہیے جو منعم حقیقی اور وہاب حقیقی ہے اور اے پیغمبر آپ ان کفار کی پرواہ نہ کریں جن پر انذار اور تبشیر کا اثر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا ہے۔

وَ كَفٰي بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا (۲۵:۵۸) "اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اسی کا باخبر ہونا کافی ہے"۔ وہ اللہ اپنے بندوں کے حالات سے خوب باخبر ہے اس لیے جزاء و سزا دے سکتا ہے اور وہ اس کی طاقت بھی رکھتا ہے کہ اس نے زمین آسمان کو پیدا کیا ہے اور وہ مسلسل بادشاہت کی کرسی عرش پر متمکن ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰي عَلَي الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا (۲۵:۵۹) "وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی "عرش" پر جلوہ فرما ہوا۔ رحمٰن ہے وہ۔ اس سے پوچھو کہ وہ جاننے والا ہے"۔ وہ ایام جن میں اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، وہ ہمارے زمینی دنوں سے مختلف تھے کیونکہ یہ دن تو نظام شمسی کی تشکیل کے بعد شروع ہوئے۔ یعنی زمین و آسمانوں کی پیدائش کے بعد جب اللہ نے زمین کا سورج کے ارد گرد چکر مقرر کیا اور خود زمین کا اپنے محور کے ارد گرد چکر شروع ہوا تو اس کے نتیجے میں ہمارے ایام شروع ہوئے۔ اللہ کی تخلیق تو صرف لفظ کن سے ہوتی ہے یعنی اللہ کا حکم ہو جائے تو ہر چیز ہو جاتی ہے۔ رہے یہ چھ دن تو ان کی حقیقت اور مقدار صرف اللہ جانتا ہے۔ یہ بہت ہی طویل دن ہوں گے اور ان دنوں میں زمین و آسمان مختلف ادوار اور اطوار سے گزر کر موجودہ شکل میں آکر ٹکے ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ اللہ عرش پر کیسے متمکن ہوا تو اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اس کائنات پر اللہ کی حکومت اور اقتدار ہے۔ یہاں لفظ (ثُمَّ) سے مراد زمانی ترتیب نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے تخلیق ہوئی اور بعد میں تمکین علی العرش ہوئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ثم یہاں علوشان اور مرتبہ بلند کے معنی میں ہے۔

اللہ کی اس علوشان اور اقتدار عظیم الشان کے بعد پھر اللہ الرحمٰن بھی ہے اور تم نے جو کچھ پوچھنا ہے اس سے پوچھو، جب تم اس سے پوچھو گے تو ایک نہایت ہی خبردار سے پوچھو گے کہ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩

"ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں "رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا بس جسے تو کہہ دے اسی کو ہم سجدہ کرتے پھریں؟" یہ دعوت ان کی نفرت میں الٹا اور اضافہ کر دیتی ہے"۔

یہ بر خود غلط لوگوں کو جب رحمٰن کی بندگی کی طرف بلایا جاتا ہے تو یہ لوگ نہایت ہی حقارت، جھنجلاہٹ کے ساتھ

پوچھتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے؟

یہ کفر و سرکشی کی بدترین اور مکروہ ترین تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کس قدر جری اور گستاخ ہو گئے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں اپنے رب کی توہین کے لیے بھی تیار تھے۔ اللہ کے بارے میں بھی وہ یہ انداز گفتگو اختیار کرتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برے الفاظ استعمال کرتے تھے تو ان سے کوئی بعید نہ تھا۔ وہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم کا یوں انکار کرتے تھے۔ یوں ظاہر کرتے تھے کہ وہ تو رحمٰن کو نہیں جانتے۔ وہ کون ہوتا ہے۔

وَمَا الرَّحْمٰنُ (۲۵ : ۶۰) "رحمن کیا ہوتا ہے"۔ وہ نہایت بے باکی سے کہتے کہ رحمٰن کو ہم اس کے سوا نہیں جانتے جو یمامہ میں ہے۔ وہ مسیلمہ کذاب کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

ان کی اس بے باکی کا جواب اس انداز میں دیا جاتا ہے کہ اللہ وہ بابرکت ذات ہے کہ اس کی بڑائی ' اس کی برکات اور اس کی عظمتوں پر تو یہ کائنات گواہ ہے۔ اس عظیم کائنات کے ایک ہی منظر پر ذرا غور کرو۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

"بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے ' یا شکر گزار ہونا چاہے"۔

بروج کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ اس سے سیاروں کے مدار مراد ہیں۔ وہ عظیم فلکیاتی مدار جو بہت ہی دور رس اثرات اور دور رس اعمال کا مظہر ہیں۔ کائنات کا یہ عظیم ترین منظر اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس فقرے کے جواب میں پیش فرمایا ہے کہ (رحمٰن کیا ہوتا ہے) ان کو بتایا جاتا ہے کہ تم رحمٰن کو کیا سمجھتے ہو۔ ذرا رحمٰن کی اس مخلوق کو سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہارا سر چکرا جائے۔ جو فی الحقیقت عظیم ہے۔ انہی بروج کے اندر شمس بھی سرگرداں ہے جو ایک چراغ ہے کیونکہ اسی کی روشنی سے زمین منور ہے۔ اور اسی کی روشنی سے قمر بھی منیر ہے۔ جس کی روشنی لطیف اور خوشگوار ہے۔

یہاں گردش لیل و نہار کے تسلسل کو انسانی مشاہدے کے لیے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ یہ دو ایسے مظہر اور معجزات ہیں جو مسلسل ہمارے سامنے دہرائے جا رہے ہیں اور صرف انہی پر اگر انسان غور کرے تو اس کی ہدایت کے لیے یہ کافی و شافی ہیں۔

لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (۲۵ : ۶۲) "اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے"۔ اگر گردش لیل و نہار کا یہ نظام اس طرح آگے پیچھے نہ ہوتا تو اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کی بقا ممکن ہی نہ ہوتی۔ نہ انسان ہوتے ' نہ حیوانات ہوتے اور نہ نباتات ہوتے۔ اگر رات اور دن کی موجودہ چوبیس گھنٹے کی

مدت میں بھی طوالت کر دی جائے تو پھر بھی زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔

کتاب "سائنس دعوت ایمان دے رہا ہے" میں ہے:

"یہ کرۂ ارض یعنی زمین اپنے محور کے ارد گرد چوبیس گھنٹوں میں گھومتی ہے۔ اس کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ صرف سو میل فی گھنٹہ کے حساب سے گردش کرے گی تو ہمارے دن اور رات کا وقت دس گنا زیادہ ہو جائے گا۔ اس حالت میں جس حصے پر سورج چمک رہا ہو گا۔ سورج سب کچھ جلا کر رکھ دے گا۔ اور رات کے وقت زمین پر جو کچھ ہو گا وہ جم کر رہ جائے گا"۔

لہٰذا بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو صحیح اندازے کے مطابق بنایا۔ اور بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں بروج بنائے اور ایک چراغ اور قمر منیر بنایا۔ اور جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔ اس میں عبرت ہے اس شخص کے لیے جو نصیحت پکڑنا یا شکر ادا کرنا چاہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۶۰ ایک نظر میں

اس سورت کے اس درس چہارم میں عباد الرحمٰن کو ان کے امتیازی اوصاف کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ان کے کردار کے بنیادی نقوش کیا ہوتے ہیں ۔ گو وہ انسانیت کا خلاصہ ہیں اور زمین کا نمک ہیں ۔ اور تمام قافلہ رسل کی کشمکش حق و باطل اور انسانی تاریخ کا منتہائے مقصود ہیں ۔ گویا وہ باغ انسانیت کا پکا ہوا پھل ہیں ۔ کفر' ناشکری اور اعراض و نافرمانی کے خلاف اہل ہدایت کی طویل جدوجہد کا وہ حاصل ہیں ۔

درس سابق کے آخر میں اہل کفر نے رحمٰن کو پہچاننے سے انکار کیا تھا ۔ تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا تھا تو یہاں بتایا جاتا ہے کہ تم تو رحمٰن کو نہیں مانتے مگر رحمٰن کے بندوں کو تم دیکھ رہے ہو ۔ یہ ہیں وہ لوگ جو رحمٰن کو پہچانتے ہیں ۔ یہ ہیں اس ٹائٹل کے مستحق کہ ان کو رحمٰن کا بندہ کہا جا سکے ۔ ملاحظہ کرو ذرا ان کی صفات ' دیکھو ان کا کردار ' ان کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے ' اسے پڑھو ۔ یہ زندہ مثال کی شکل میں عملاً تمہارے سامنے موجود ہیں ۔ ایسی جماعت اور ایسی ہی سوسائٹی ' اسلام وجود میں لانا چاہتا ہے ۔ ایسے ہی نفوس اسلام اپنے منہاج تربیت کے ذریعے پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ اور یہی لوگ ہیں جن کو اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ اہمیت دیتا ہے ۔ ایسے ہی لوگوں پر اللہ کی عنایات ہوتی ہیں ۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اللہ کو تمام انسانوں کی کوئی پرواہ نہ تھی ۔ یہ تو ایسے ہی لوگوں کی دعاؤں کی برکت ہے جس سے یہ کائنات قائم ہے ۔

---()()---

درس نمبر ۱۶۰ تشریح آیات

۶۳---تا--- ۷۷

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

"رحمن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ اللہ کے بندوں کی صفات و علامات میں سے یہ پہلی صفت ہے کہ وہ زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔ جن کی چال میں کوئی تکلف اور تصنع نہیں ہوتا۔ نہ کوئی تکبر' نہ کوئی غرور ہوتا ہے اور نہ ہی سستی اور ڈھیلا پن ہوتا ہے۔ یعنی ان کی چال پروقار ہوتی ہے۔ یہاں چال سے مراد ان کی مجموعی شخصیت ہے' جس میں انسان کا شعور اور اس کی شخصیت معتدل کا اعتدال شامل ہے' جس کی وجہ سے انسان کی تمام صفات اور اس کے تمام افعال کے اندر' اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور ان معتدل صفات کی وجہ سے پھر اس شخص کی روش میں بھی ایک اعتدال اور وقار آ جاتا ہے۔ یہ شخص مطمئن اور پروقار ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کے حالات میں اس کے اندر ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے۔

يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵: ۶۳) کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ زمین پر مردوں کی طرح سر جھکائے ہوئے چلتے ہیں۔ اعضائے جسم کو لٹکائے ہوئے اس طرح چلتے ہیں کہ بس ابھی یہ صاحب زمین پر گرنے والے ہیں۔ بعض لوگ اظہار تقویٰ کی خاطر زمین پر اس طرح چلتے ہیں۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو لڑکھڑا کر چلتے تھے۔ آپ تمام لوگوں سے تیز چلتے تھے۔ آپ کی چال بہت خوبصورت اور سکون کے ساتھ ہوتی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں دیکھی۔ گویا سورج آپ کے چہرۂ مبارک پر چلتا ہے۔ اور میں نے کوئی شخص رسول اللہؐ سے تیز رفتار نہیں دیکھا۔ گویا آپ کے لیے زمین کو لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ہم تو ہر معاملے میں پریشان ہوتے تھے لیکن آپ کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر ابن الخطاب فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑکھڑا کر چلتے تھے۔ یوں نظر آتا تھا کہ شاید آپ کسی نشیبی جگہ پر اتر رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ آپ اس طرح چلتے تھے جس طرح کوئی شخص اترتا ہے اور چڑھنے والے کی چال بھی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح اترنے والے کی چال ہوتی ہے

اور اس قسم کی چال وہ لوگ چلتے ہیں جو اولوالعزم' عالی ہمت اور بہادر ہوتے ہیں (زاد المعاد' ابن القیم)

یہ لوگ چونکہ سنجیدہ' پروقار اور راست رو ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر چونکہ ہمیشہ بلند مقاصد ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ احمقوں' نادانوں اور بے وقوفوں کی حماقتوں اور نادانیوں میں اپنے آپ کو نہیں الجھاتے۔ اس لیے وہ ایسے لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثے اور بدکلامی میں حصہ نہیں لیتے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ پیش آ جائے تو وہ نہایت ہی خوبصورتی سے اپنے آپ کو چھڑا لیتے ہیں۔

وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵ : ۶۳) "اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ یہ بات وہ نہ کسی کمزوری کی وجہ سے اور نہ تکبر کی وجہ سے کرتے ہیں۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز ہیں۔ بلکہ ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بلند رکھتے ہیں۔ وہ اپنے قیمتی اوقات کو ایسے کاموں میں صرف نہیں کرتے۔ جو شرفاء کے لائق نہیں ہیں۔ وہ فحش گوئی اور بدکلامی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور اپنے اوقات کو اچھے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

یہ تو تھا ان کا دن لوگوں کے ساتھ۔ وہ اس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ رہی ان کی رات تو اس میں وہ خدا کا خوف کرتے اور اللہ سے ڈرتے رہتے تھے۔ اللہ کی بڑائی کا شعور ان کو ہوتا تھا۔ اور اللہ کے عذاب سے وہ ڈرتے تھے۔

وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿٦٤﴾ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿٦٦﴾

"جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں جو دعائیں کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! جہنم کے عذاب سے ہم کو بچا لے' اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے' وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے"۔

اللہ کے بندوں کی نمازوں کی تعبیر یہاں ارکان نماز سجود و قیام سے کی گئی تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کی سرگرمیاں کیا تھیں۔ راتوں کو جب تمام مخلوق سوتی ہے تو وہ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ وہ صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور صرف اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ صرف اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور راتوں کو وہ فرحت بخش اور لذیذ نیند ترک کرتے ہیں کیونکہ ان کو اس میٹھی اور لذیذ نیند سے اللہ کے سامنے قیام و سجود میں زیادہ لذت آتی ہے۔ ان کا جسم ان کی روح اور ان کی سوچ اللہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے لوگ غفلت کی نیند سوتے ہیں اور وہ رکوع و سجود میں مشغول ہیں۔ لوگ زمین پر لیٹے ہیں اور وہ آسمان اور بلندیوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور ذوالجلال والاکرام کے ساتھ لو لگائے ہوئے ہیں۔

لیکن انہوں نے قیام و سجود کی محض صورت اور شکل ہی نہیں بنائی ہوئی ہوتی' اس قیام اور سجود اور عالم بالا کی طرف

اپنی سوچ متوجہ کرنے ساتھ ساتھ ان کے دل میں خدا کا خوف اور تقویٰ بھی پایا جاتا ہے۔ان کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ کسی طرح وہ عذاب جہنم سے نجات پالیں۔وہ ہروقت دعا کرتے ہیں۔

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵:۶۵) اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵:۶۶) "اے ہمارے رب جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے' اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے' وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے"۔انہوں نے جہنم کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جہنم کے وجود پر ایمان لائے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے جہنم کی جو تصویر کھینچی ہے انہیں اس پر پورا پورا یقین ہے۔اس لیے ان کو جو خوف لاحق ہے اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ جہنم بہت برا ٹھکانا ہے' یہ ان کے پختہ یقین کا ثبوت ہے اور ان کے گہرے تصدیق کی وجہ سے ہے۔

وہ اپنے رب کی طرف نہایت ہی خضوع اور خشوع کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں' تاکہ رب کریم مہربانی کر کے جہنم کے عذاب کو ان سے پھیر دے۔صرف عبادت اور قیام و سجود ہی سے وہ مطمئن نہیں ہو جاتے۔وہ اس قدر حساس متقی ہیں کہ اپنی عبادت پر تکیہ نہیں کرتے۔وہ عبادت کو قلیل سمجھتے ہیں۔اس لیے نجات کے لیے اسے پورا ضامن نہیں سمجھتے۔چنانچہ وہ اس عبادت کے ساتھ ساتھ اللہ کے فضل وکرم کے بھی طلبگار ہیں کہ اللہ کے فضل وکرم ہی سے عذاب الٰہی ٹل سکتا ہے۔

انداز کلام سے جہنم کی نقشہ کشی یوں ہوتی ہے کہ وہ ایک زندہ بلا ہے۔ہر شخص اس کے منہ میں ہے۔ہر شخص کو وہ پکار رہی ہے' ہر شخص کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے' ہاتھ آگے بڑھا بڑھا کر لوگوں کو اپنے قبضے میں لیتی جاتی ہے۔دور اور قریب سب اس کی پہنچ میں ہیں اور اس کے خوف کے مارے اللہ کے یہ بندے رات دن اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔اس سے ڈر ڈر کر اللہ سے پناہ مانگتے ہیں' عاجزی کرتے ہیں اور درخواستیں اور فریادیں کرتے ہیں کہ اے اللہ بچاؤ' یہ تو کھائے جا رہی ہے۔

جب وہ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر' نہایت ہی خوف سے اور نہایت ہی گھبراہٹ سے دعا کرتے ہیں تو انداز کلام ماحول کے اندر ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵:۶۵) "بے شک اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے"۔یعنی ایسا عذاب ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔پھر کبھی چھوڑتا نہیں۔نہ کم ہوتا ہے اور نہ ختم ہونے کا نام لیتا ہے۔یہی وصف ہے جہنم کا جو ان بندوں کو خائف کر رہا ہے اور وہ ہروقت اس سے ڈرے سہمے رہتے ہیں۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵:۶۶) "وہ تو بڑا ہی برا مستقر و مقام ہے"۔

---ooo---

پھر یہ بندے اعتدال و میانہ روی کا نمونہ ہیں۔ان کی زندگی نہایت ہی متوازن ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

"جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل 'بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے"۔یہ اسلام کی بنیادی خصوصیت ہے 'جسے وہ ایک مسلم فرد اور ایک مسلم جماعت کی زندگی کے اندر ایک حقیقت کی شکل میں پیدا کرتا ہے۔اسلام اس خصوصیت کو اپنے نظام تربیت و اخلاق اور نظام معیشت و قانون دونوں میں پیش نظر رکھتا ہے۔چنانچہ اسلامی نظام کے ہر جز کا مدار توازن اور اعتدال پر ہے۔

باوجود اس کے کہ اسلام ایک فرد کو انفرادی مخصوص ملکیت رکھنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسلام 'ایک مسلم فرد کو کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ "اپنی" دولت کو جس طرح چاہے خرچ کرے۔جبکہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں ایک فرد کو مکمل آزادی ہے کہ وہ اپنی انفرادی دولت کو جس طرح چاہے خرچ کر دے۔اسی طرح تمام غیر مسلم اقوام کے ہاں بھی یہی اصول ہے کہ ایک شخص اپنی انفرادی ملکیت کو جس طرح چاہے 'خرچ کر دے۔اس پر کوئی تدغن نہیں ہے۔لیکن ایک مسلمان انفرادی دولت خرچ کرنے میں بھی اس بات کا پابند ہے کہ اسراف اور کنجوسی کے درمیان حد اعتدال پر قائم رہے۔اسراف کی وجہ سے جان' مال اور معاشرے سب کی تباہی ہے۔اور کنجوسی بھی اسی طرح جان' مال اور معاشرے کا نقصان ہے کہ ایک شخص اپنے مال سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔کیونکہ اگر کوئی مال سے نفع اٹھاتا ہے اور خرچ کرتا ہے تو اس سے دوسرے کی آمدن ہوتی ہے اس لئے کہ مال تو ایک اجتماعی ذریعہ ہے جس سے پوری سوسائٹی کو فائدہ ملتا ہے اور اسراف اور کنجوسی دونوں سے معاشرے اور اجتماعی اقتصادیات کو نقصان پہنچتا ہے۔اگر مال کو روک دیا جائے تو کساد بازاری پیدا ہوتی ہے اور اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے تو دوسروں کی قوت خرید متاثر ہوتی ہے اور پھر اس سے اخلاقی فساد بھی پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ اسلام سوسائٹی کے اس پہلو کی بھی اصلاح کرتا ہے اور اعتدال اور توازن کو ایک مسلم شخصیت کا حصہ بنا دیتا ہے۔اور اس کا تعلق ایمان سے جوڑ دیتا ہے۔

وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (۲۵:۶۷) "بلکہ اس کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے"۔

---ooo---

اور پھر عباد الرحمن کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور کسی زندہ جان کو قتل نہیں کرتے۔وہ زنا نہیں کرتے۔شرک 'قتل اور زنا اسلام میں اکبر الکبائر گناہ اور جرائم ہیں۔جو شخص یہ گناہ کرے گا وہ ضرور سزا کا مستوجب ہو گا۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا

رَّحِيمًا ﴿۷۰﴾ وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

"جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے' اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے' اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا' قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے"۔

خدا کو وحدہ لاشریک جاننا اسلامی نظریہ حیات کی اساس ہے۔ عقیدہ توحید نہایت واضح' سیدھا اور سادہ عقیدہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں جس قدر عقائد ہیں وہ پیچیدہ' ٹیڑھے اور ناقابل فہم عقیدے ہیں۔ اسلامی نظریہ حیات پر جس طرح ایک صحیح نظام زندگی قائم ہوتا ہے اسی طرح دوسرے عقائد پر کوئی سیدھا اور صالح نظام زندگی قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

کسی جاندار کو ناحق نہ قتل کرنا اور سوسائٹی کی اجتماعی زندگی کو پر سکون' پر امن اور مطمئن بنانا اسلامی اور انسانی زندگی کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے' جبکہ قتل و غارت اور لوٹ مار جنگل کی زندگی کا خاصہ ہوتا ہے اور کوئی ایسی سوسائٹی جس میں ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو اور لوٹ مار عام ہو' اسے نہ انسانی سوسائٹی کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ ایسی سوسائٹی میں کوئی ترقیاتی کام ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسلام قتل نفس کو بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے۔

اسی طرح اسلام زنا کو گناہ کا جرم قرار دیتا ہے اور اسے جرم قرار دے کر ہی دو قسم کی زندگیوں کے راستے جدا کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ایسی زندگی ہے جس میں ایک شخص اپنے آپ کو ایک حیوان جیسی غلیظ جنسی خواہش سے ذرا بلند کر دیتا ہے اور وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ جنس آخر سے اس کے ملاپ کا ایک اعلیٰ و ارفع مقصد مقرر کیا گیا ہے۔ یہ محض لذت کوشی اور گری ہوئی غلیظ حیوانی زندگی کا ملاپ نہیں ہے' جو ایک نر اور مادے کے درمیان ہوتا ہے۔ اور جس کے اندر محض جسمانی تقاضے پورے ہوتے ہیں۔

غرض یہ تین صفات وہ صفات ہیں جو ایک انسانی اور شریفانہ زندگی اور ایک عام حیوانی اور گری ہوئی وحشیانہ زندگی کے درمیان حدود امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے عباد الرحمن کی صفات و نشانات کے اندر ان تینوں صفات کو داخل کیا ہے۔ کیونکہ عباد الرحمن اللہ کے نزدیک اعلیٰ و ارفع مخلوق ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ نہایت ہی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان صفات کے بعد یہ تہدید آئی ہے۔

وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (۲۵:۶۸) "یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہوں کا بدلہ پائے گا"۔ اثام کا مفہوم یہاں عذاب ہے۔ اس عذاب کی تشریح پھر یوں کی گئی ہے۔

يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا (۲۵:۶۹) "قیامت کے روز اس کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور اس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ رہے گا"۔ یعنی نہ صرف یہ ہو گا کہ اس کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا بلکہ وہ توہین آمیز بھی ہو گا۔ اور اس طرح یہ عذاب زیادہ شدید اور زیادہ تکلیف دہ بن جائے گا۔

ہاں یہ نہیں ہے کہ جس نے ان گناہوں کا ارتکاب ایک بار کر لیا تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ توبہ اور عمل صالح کے ذریعے اس عذاب سے بچ سکتا ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (۲۵: ۷۰) "الا یہ کہ کوئی ان گناہوں کے بعد توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو"۔ ان کے ساتھ وعدہ یہ ہے کہ انہوں نے ایمان، توبہ اور عمل صالح سے قبل جو برے کام کیے ان کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (۲۵: ۷۰) "ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا"۔ یہ تو اللہ کا فیضان رحمت ہے۔ اور محض اللہ کا جود و کرم ہے جس کے بدلے میں انسان کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ بس یہ انعام ہے اس شخص کے لیے جو راہ بد چھوڑ کر راہ ہدایت پر چل نکلتا ہے۔ اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے اور بد عملی اور سرکشی کو ترک کر دیتا ہے۔

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۵: ۷۰) "اور اللہ بڑا غفور و رحیم ہے"۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے جس کا ضمیر جس وقت بھی جاگ اٹھے، اور جس مقام سے بھی کوئی واپس ہونا چاہے، واپس آسکتا ہے۔ اسلام اس کی راہ نہیں روکتا۔ اور اسلام کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہے۔ جو بھی ہو، جس قدر گنہگار بھی ہو، صد بار اگر توبہ شکستی باز آ"۔

طبرانی نے ابو المغیرہ، صفوان ابن عمر، عبد الرحمن ابن جبیر، ابو فروہ سے روایت کی ہے۔ یہ صاحب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: حضورؐ ایک شخص نے تمام گناہ کیے۔ اس نے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا اور نہ کوئی بڑا گناہ۔ کیا اس کے لیے بھی توبہ ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کیا تو ایمان لایا ہے اس نے کہا ہاں میں اسلام لایا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا نیکیاں کرتے جاؤ اور برائیاں چھوڑتے جاؤ۔ ان برائیوں کو بھی اللہ تمہارے لیے نیکیاں کر دے گا اس نے پھر کہا "اور میرا فسق و فجور بھی"۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں"۔ یہ شخص اللہ اکبر، اللہ اکبر کہتے ہوئے لوٹا یہاں تک کہ غائب ہو گیا۔

لیکن توبہ کا قاعدہ بھی وضع کر دیا جاتا ہے۔

وَ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (۲۵: ۷۱) "جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے"۔ توبہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ کسی گنہگار کو ندامت آ جائے اور پھر وہ معصیت کو چھوڑ دے۔ اور اس کے بعد وہ نیکیوں پر عمل پیرا ہو جائے تو ثابت ہو گا کہ اس شخص کی توبہ صحیح ہے۔ اور یہ شخص سچا ہے۔ یعنی اس نے برائیوں کو ترک کر کے مثبت پیش رفت شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ معصیت دراصل زندگی کا ایک عمل اور تحریک ہوتی ہے جو شخص ان معاصی کو ترک کرے گا بے شک اس کی زندگی معاصی سے خالی ہو گی لیکن اس کی زندگی کے اس خلا کو مثبت اعمال صالح سے بھرنا بھی ضروری ہے۔ یہ ہے اسلامی نظام تربیت کا وہ خاص پوائنٹ جس پر آکر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور وہ انسان کے حالات نفس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اس لیے اس نے ہدایت فرمائی کہ اس نفسیاتی خلا کو اعمال صالحہ کے ساتھ بھر دو ورنہ .....:

---()()()---

اس جملہ معترضہ کے بعد پھر روئے سخن صفات عباد الرحمٰن کی طرف پھر جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

"(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرف گزر جاتے ہیں"۔

جھوٹی شہادت نہ دینے کا قریبی اور اصطلاحی مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی عدالت میں جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور ظلم پر اعانت کا جرم واقع ہوتا ہے۔ اور اس سے حقیقی شہادت بھی مراد ہو سکتی ہے یعنی کسی مجلس، کسی سوسائٹی یا کسی جگہ میں جھوٹ اور برائی کا ارتکاب ہو رہا ہو تو یہ لوگ وہاں حاضر نہیں ہوتے یعنی ایسی سوسائٹی سے دور رہتے ہیں، جس میں برائی کا ارتکاب ہوتا ہے اور یہ زیادہ بلیغ اور دل لگتی تفسیر ہے۔ اسی طرح وہ لغو اور بیہودہ محافل یا مقامات سے بھی اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵: ۷۲) "اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں"۔ وہ اپنے آپ کو اس میں مشغول نہیں کرتے، نہ وہ ان برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں بلکہ وہ ایک مکرم اور معزز شخص کی طرح وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی مومن کے کاسہ حیات میں کوئی خالی جگہ ہی نہیں ہوتی کہ اس میں لغو اور بیہودگی بھی سما سکے۔ وہ اپنے عقیدہ و ایمان اور دعوت اسلامی اور اس کے تقاضوں سے فارغ کب ہوتا ہے۔ وہ تو ہر وقت اپنی اور معاشرے کی اصلاح میں لگا ہوا ہوتا ہے۔

---()()()---

اور ایک صفت عباد الرحمٰن کی یہ بھی ہے کہ جب ان کو یاد دہانی اور نصیحت کی جائے تو وہ سبق اور نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ بات پر یقین کرتے ہیں، ان کے دل قبول حق کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ ذہن رسا رکھتے ہیں اور قلب منیب کے مالک ہوتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾

"جنہیں اگر ان کے رب کی آیت سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے"۔

اس آیت میں مشرکین مکہ پر ایک لطیف طنز بھی ہے کہ وہ اندھے اور بہرے ہو کر اپنے بتوں کی عبادت میں لگے ہوئے تھے اور اندھا دھند اور باطل عقائد کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ نہ وہ کوئی عقل کی بات سننا چاہتے تھے اور نہ کھلے حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ نہ وہ کھلی روشنی کو دیکھتے تھے اور نہ سیدھی راہ کو دیکھتے ہوئے اس پر چلتے تھے۔ اندھے

منہ اندھا اور بہرا ہو کر چلنا' بغیر سوچے سمجھے اور عقل و تدبر کرتے ہوئے چلنا۔ یہ محاورہ ایک ایسی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے جس سے غفلت اور کم عقلی کی انتہائی حالت کا اظہار ہوتا ہے' جس میں کوئی غور و تدبر نہ ہو۔ رب اللہ کے بندے اور رحمٰن کے بندے تو وہ ہر معاملے کو نہایت سوچ اور سمجھ کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان عقائد میں سچائی کیا ہے۔ وہ اس بات کو پاتے ہیں کہ فلاں فلاں دلائل و شواہد سچائی کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کا ایمان علی وجہ البصیرت ہوتا ہے۔ اس لیے وہ جاہلوں کی طرح کسی بات پر اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ ان کے اندر اگر اپنے عقائد کے بارے میں جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ تو وہ علی وجہ البصیرت پایا جاتا ہے۔ علی وجہ الجہالت نہیں پایا جاتا۔ وہ عارف ذی بصیرت ہوتے ہیں۔

---()()()---

آخر میں یہ کہ وہ صرف رب کے سامنے سجدے اور قیام پر ہی اکتفاء نہیں کرتے' اور ان دوسری عظیم صفات کو اپنے اندر جمع کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے بعد ایسی اولاد کی بھی امید کرتے ہیں جو ان کے طریقے پر چلنے والی ہو۔ ان کی بیویاں بھی ان ہی جیسی ہوں۔ ان کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ ان کے دل ان کے بارے میں مطمئن ہوں۔ اور اس طرح ان کی بیویوں اور بچوں کے ذریعے عباد الرحمٰن کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اور وہ یہ امید بھی کرتے ہیں کہ وہ دوسرے نیک بندوں کے لیے بھی اچھا نمونہ ہوں۔

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

"مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا"۔

یہ گہرا فطری اور ایمانی شعور ہے' یہ کہ ہر مومن صادق یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کے ساتھی زیادہ ہوں اور سب لوگ اللہ کی طرف چل پڑیں۔ اور دوسروں سے پہلے انسان اپنی بیویوں اور اولاد کے بارے میں یہ سوچتا ہے کہ وہ اس کی لائن پر آجائیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ کسی کی اولاد اس کی اطاعت پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ کوئی شخص اپنی اولاد اور اہل و عیال کے بارے میں مسئول ہو سکتا ہے۔ پھر کسی بھی مومن میں یہ فطری خواہش ہوتی ہے اور ہونا چاہئے۔ کہ وہ بھلائی کا نمونہ اور قائد ہو۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے اس کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ اہل ایمان کے لیے نمونہ اور اہل ایمان کا سرخیل ہونے کی تمنا کوئی بڑائی اور برتری کا جذبہ نہیں بلکہ بھلائی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے ورنہ تو سب مومن ایک ہی راہ کے مسافر ہوتے ہیں۔

---()()()---

اب یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ایسے بندگان رحمٰن کا انجام و انعام کیا ہو گا؟

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً

وَسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾

"یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہو گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام"۔

غرفہ کا مفہوم منزل بلند ہے' جس سے جنت مراد ہے۔ یا یہ جنت کا کوئی خاص مقام ہو گا۔ جیسا کہ بالاخانہ عام اکارہ مکان کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے۔ ہر شخص مہمانوں کو بالاخانوں میں بٹھاتا ہے۔ اور یہ لوگ بھی چونکہ اللہ کے معزز اور مکرم بندے ہیں اور ان کے لیے عباد الرحمٰن کا ٹائیٹل استعمال ہوا ہے اور ان کی صفات بھی گنوائی گئی ہیں لہٰذا ان کا اس خاص مقام میں تحیہ اور مبارک و سلامت سے استقبال ہو گا۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں صبر کیا۔ اور ان صفات پر رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عباد الرحمٰن کی ان صفات و علامات پر چلنا کارے دارد۔ بڑے صبر اور مصابرت کی ضرورت ہے۔ زندگی کی راہ پر دھوکہ دینے والی مرغوبات ہر طرف سے دامن کش رہتی ہیں۔ اس راہ پر گرنے اور پھسلنے کے مقامات جگہ جگہ موجود ہیں۔ زندگی کی اس طویل شاہراہ پر سیدھا چلنے کے لیے عزم و مصابرت کی ضرورت ہے۔ اس لیے اللہ نے یہاں بِمَا صَبَرُوْا (۲۵: ۷۵) کا ذکر فرمایا۔

اور اس جہنم کے بالمقابل جس سے وہ بچنے کی دعا ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور جو بہت ہی برا مقام ہے' ان کے لیے ایک ایسا مقام ہو گا۔ یعنی جنت جو نہایت اچھا مقام ہو گا اور جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵: ۷۶) "یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور مستقر و مقام کے طور پر وہ بہترین جگہ ہو گی"۔ یہاں سے انہیں نکلنے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی وہ نہایت سکون و قرار سے وہاں رہیں گے۔

---O()()---

عباد الرحمٰن کی تصویر کشی تو ہو چکی۔ بشریت کے نمک اور خلاصہ کی صفات کی تفصیلات تو دے دی گئیں۔ اب یہاں ان لوگوں کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے کہ اگر اللہ کے یہ بندے نہ ہوں تو اللہ کے نزدیک پوری انسانیت پر کاہ کے اہمیت بھی نہیں رکھتی۔ رہے مکذبین تو ان کے لیے تو عذاب جہنم کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ الربع

"اے نبی" لوگوں سے کہو" میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے' عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہو گی"۔

یہ ایک خاتمہ کلام ہے جو پوری سورت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس پوری سورت کا محور یہ ہے کہ اس میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ لوگوں کے انکار اور منہ موڑنے کی وجہ سے آپ ؐ کے دل پر جو غبار تھا' اسے دور کرنا اس سورت کا ہدف ہے کیونکہ وہ لوگ مقام محمدی ؐ کو جانتے ہوئے انکار پر تل گئے تھے اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جو زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اس لئے یہاں بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی حیثیت کیا ہے؟ یہ پوری انسانیت اللہ کے نزدیک پرکاہ کے برابر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں انسانیت کا احترام اور رعایت تو اللہ کے ایسے بندوں کی وجہ سے ہے جن کی صفات گنوائی گئیں۔ جو ہر وقت اللہ کو پکارتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟ بلکہ پوری انسانی آبادی کی کیا حیثیت ہے؟ اور پھر اس پوری زمین کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ کی کائنات میں تو یہ ایک ذرے کے برابر ہے اور انسانیت ایسی ہی ہے جس طرح اس دنیا میں کوئی زندہ مخلوق (مثلاً مچھر)۔ رہی اس زمین کی اقوام میں سے کوئی ایک قوم تو اس کی گزشتہ رفتہ نسلیں اور آنے والی سب نسلیں کیا ہیں؟ بس اللہ کی کتاب کائنات کے چند صفحات اور اس کتاب کائنات کے باقی صفحات تو ان کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

اور انسان' اپنی اس بے بضاعتی اور اپنی اس بے قدری کے باوجود پھولتا ہے اور پھولتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو بڑی شے سمجھتا ہے۔ پھر یہ سرکش ہو جاتا ہے۔ پھر اس قدر سرکش کہ یہ اپنے خالق کی جناب میں گستاخی کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے' اللہ کے مقابلے میں ضعیف تر اور پر تقصیرات۔ ہاں اس کی قوت کا سرچشمہ صرف اللہ ہے۔ اللہ سے جڑ کر انسان کچھ چیز بن سکتا ہے اور شمار میں آسکتا ہے۔ راہ ہدایت بھی پاسکتا ہے۔ یہ راہ ہدایت پالے اور اللہ سے جڑ جائے تو پھر اللہ کے ترازو میں اس کا وزن ہو جاتا ہے۔ بلکہ اللہ کے ترازو میں فرشتوں سے بھی بھاری ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو جو خصلت دی' فرشتوں کو جو حکم دیا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ' یہ اس لیے کہ انسان اللہ کو پہچان لے' اس تک رسائی حاصل کرے' اس کا بندہ بن جائے' صرف اسی طرح وہ اپنے خصائص و صفات اور علامات و نشانات کو قائم رکھ سکتا ہے جن کی وجہ سے اسے فرشتوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے فرشتوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا تھا ورنہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بغیر اگر پوری انسانیت کو اللہ کے ترازو میں رکھ دیا جائے تو وہ ایک مچھر کے برابر بھی نہ ہوگی۔ اللہ کے ترازو اور میزان میں' یہ زمین تو ایک ذرہ ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (۲۵: ۷۷) "اے نبی ؐ لوگوں سے کہو' میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو"۔ یہ انداز کلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔ کہا جاتا ہے لوگو' اگر تم نہیں مانتے ہو تو تمہاری کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور اگر تم اللہ کے بندوں میں شامل نہیں ہوتے تو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تم تو جہنم کا ایندھن ہو گے۔

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (۲۵: ۷۷) "اب جبکہ تم نے جھٹلا دیا ہے تو عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی"۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ---- چہارم

پارہ ----- ۱۹

سورۃ الشعراء ۔ ۲۶

آیات ۱--- تا--- ۲۷

سورۃ الشعراء ایک نظر میں

اس سورت کا موضوع بھی وہی ہے جو عام مکی سورتوں کا ہے یعنی اسلامی نظریہ حیات جس کے بنیادی عناصر کا خلاصہ یہ ہے :

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ (۲۶:۲۱۳) "پس نہ پکارو اللہ کے سوا کسی الہ کو ورنہ تم ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جن کو عذاب دیا جائے گا" ۔ نیز آخرت کی جوابدہی کا احساس ۔

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ (۲۶:۸۷) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶:۸۸)

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۲۶:۸۹) "اور مجھے اس دن رسوا نہ کرو جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ اولاد' بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو" ۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان و تصدیق ۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶:۱۹۲) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۲۶:۱۹۳)

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (۲۶:۱۹۴) "یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو (جو خدا کی طرف سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں" ۔ اور پھر لوگوں کو ڈرایا گیا ہے کہ تکذیب کے نتائج بہت ہی برے ہوں گے' یا تو دنیا میں عذاب الٰہی نازل ہو گا اور تمہیں ایام سابقہ کے مکذبین کی طرح ہلاک کر دیا جائے گا یا پھر آخرت کا عذاب ہو گا جو کافروں کے انتظار میں ہے ۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶:۶) "اب جب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہتے ہیں" ۔ اور

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶:۲۲۷) "اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں" ۔ نیز اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دلاسے اور تسلی کے مضامین بھی ہیں کہ مشرکین آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے ۔ ارشاد الٰہی ہے کہ آپ پرواہ نہ کریں ۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲۶:۳) "شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ اور اہل ایمان کو بھی یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ مشرکین کی جانب سے ہٹ دھرمی اور عناد کے مظاہرے پر صبر کریں اور اپنے پروگراموں اور نظریہ حیات پر ثابت قدمی سے آگے بڑھتے ہیں خواہ اس راہ میں ان کو جس قدر اذیتیں پہنچیں جس طرح انبیاء کی تاریخ میں تمام اہل ایمان ثابت قدمی دکھاتے رہے ہیں' وہ بھی ایسی ہی ثابت قدمی دکھائیں۔

اس سورت کے مضامین کا بڑا حصہ قصص القرآن پر مشتمل ہے۔ سورت کی کل ۲۲۷ آیات میں سے ۱۸۰ آیات میں تو قصص القرآن ہیں۔ پوری سورت میں ایک مقدمہ ہے' پھر یہ قصص ہیں اور آخر میں تبصرہ ہے جبکہ مقدمہ اور آخری تبصرے کا مضمون ایک ہے۔ ان میں سورت کے موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے قصص کے اندر مختلف اسالیب سے' اس موضوع پر کلام کیا گیا ہے۔ انداز گفتگو سے ظاہر ہے کہ پوری سورت کے سامنے صرف ایک ہی ہدف ہے۔ اس لیے تمام قصص کے وہی حلقے اور کڑیاں پیش کی جاتی ہیں جن کا موضوع زیر بحث کے ساتھ تعلق ہے۔ باقی قصے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

پوری سورت پر ڈراوے کی فضا ہے جبکہ مکذبین کی طرف سے مسلسل تکذیب ہے اور نتیجۃ عذاب الہی کا نزول۔ مقصد یہ ہے کہ اہل مکہ جو مسلسل تکذیب کر رہے ہیں اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے منہ موڑ رہے ہیں' یہ ان کے لیے خطرناک فعل ہے۔ ڈرانے والوں کے ساتھ یہ مذاق' اللہ کی آیات کی یہ مسلسل تکذیب اور پھر سرکشی میں یہ انتہا کہ رسولوں کو بار بار کہنا کہ لاؤ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو' قرآن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنا کہ یہ سحر ہے۔ یہ اشعار ہیں اور روح الامین نہیں' شیاطین اسے اتارتے ہیں۔

پوری کی پوری سورت دراصل ایک ہی مضمون اور ایک ہی سبق ہے۔ مقدمہ قصص اور تبصرہ لہٰذا ہم نے اسے چند پیراگرافوں میں تقسیم کر دیا ہے' اس کی ترتیب مضامین کے مطابق۔ آغاز ہم مقدمہ سے کرتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۶۱ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۹

سورۃ الشعراء (۲۶) مکیۃ (۴۷) آیاتہا ۲۲۷ رکوعاتہا ۱۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طٰسٓمٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ط - س - م یہ کتاب مبین کی آیات ہیں"۔

حروف تہجی سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب مبین اور یہ سورت انہی حروف سے بنائی گئی ہے اور جو لوگ تکذیب پر اصرار کرتے ہیں یہ حروف ان کے علم میں ہیں اور ان سے مرکب کلمات وہ بولتے ہیں لیکن وہ ایسی کتاب مبین پیش نہیں کر سکتے۔ اس کتاب کے بارے میں اس سورت میں بہت سی باتوں پر بحث کی گئی ہے۔ مقدمے میں بھی اور آخری نتائج میں بھی۔ اور یہ انداز ان تمام سورتوں کا ہوتا ہے جن کے آغاز میں حروف مقطعات لائے گئے ہوتے ہیں۔

اس تنبیہہ کے بعد حضورؐ کو براہ راست مخاطب کیا جاتا ہے کیونکہ حضور مشرکین کے مقابلے میں ایک انتھک جدوجہد کر رہے تھے اور ان کی مسلسل تکذیب سے آپ کو دکھ پہنچ رہا تھا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں تسلی دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ آپ اس کام کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ آپ بہت کچھ برداشت کر رہے ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اگر ہم چاہیں تو چشم زدن میں ان کی گردنیں جھکا دیں لیکن اللہ کی ایک اسکیم ہے۔ ذرا انتظار کریں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝

"اے نبیؐ! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں"۔

انداز کلام ایسا ہے کہ گویا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اپنی جان کو اس وجہ سے خطرے میں ڈال رہے ہیں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (۲٦ : ۳) "اے نبیؐ! شاید آپ اس غم میں اپنی جان کھو دو گے"۔ بخع النفس کے معنی قتل النفس ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ کفار قریش کے عدم ایمان پر کس قدر دل گیر تھے ۔ کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ اگر یہ ایمان نہ لائے تو دوسری اقوام کی طرح کہیں یہ بھی نیست و نابود نہ کر دیئے جائیں ۔ یوں آپ اپنے آپ کو اس غم میں گھول رہے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ آپ کے رشتہ دار 'اہل خاندان اور اہل قوم تھے ۔ اس کی وجہ سے آپ زیادہ پریشان تھے ۔ لیکن رب تعالیٰ کو آپ سے زیادہ ہمدردی تھی ۔ اللہ نے آپ کو اس تباہ کن دل گرفتگی سے منع کر دیا ۔ فرمایا کہ آپ ذرا آرام اور سکون سے کام جاری رکھیں ۔ آپ کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ لوگ ایمان لائیں 'اگر محض لوگوں کا ایمان ہی مطلوب ہوتا تو ہم ایک ہی حکم سے ان کی گردنیں جھکا سکتے تھے ۔ آسمان سے ہم ایسا معجزہ نازل کرتے کہ یہ لوگ سر جھکا دیتے اور نہ ماننے کی کوئی صورت نہ رہتی ۔ اور نہ یہ لوگ ایمان سے منہ نہ موڑ سکتے ۔ اور یکدم دبک کر رہ جاتے ۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۲٦ : ٤) "ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں"۔ یہ لوگ گردنیں جھکا کر اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ گویا باندھے ہوئے ہیں اور اپنی جگہ سے یہ حرکت ہی نہیں کر سکتے ۔ دست بستہ کھڑے ہو جاتے ۔

لیکن اللہ کی مشیت یہ نہ تھی کہ اپنی اس آخری رسالت کو ان لوگوں سے زبردستی منوایا جائے ۔ اس رسالت کو صرف ایک ہی معجزہ دیا گیا اور وہ معجزہ قرآن تھا ۔ یہ قرآن زندگی کا ایک مکمل نظام دیتا ہے اور یہ ہر پہلو کے اعتبار سے معجز ہے ۔ بس اس کو آگے بڑھ کر قبول کریں ۔

یہ قرآن انداز تعبیر اور فنی نظم و نسق کے اعتبار سے بھی معجز ہے ۔ پورے قرآن میں یہ کلام اپنے اعلیٰ معیار اور بلند سطح کو برقرار رکھے ہوئے ہے ۔ فنی اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہے ۔ یعنی کسی جگہ کلام اپنے معیار سے گرا ہوا نہیں ہے ۔ کسی جگہ اس نے اپنی خصوصیات کو نہیں چھوڑا ۔ ایسا نہیں ہے جس طرح انسانی کلام ہوتا ہے ۔ جس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں ۔ کسی جگہ اونچا کسی جگہ درمیانہ اور کسی جگہ صاف ہی گرا ہوا ۔ کسی جگہ پر شوکت اور کسی جگہ جھول دار ۔ مثلاً ایک ہی مصنف ایک جگہ ایک طرح کی بات کرتا ہے اور دوسری جگہ انداز بدل جاتا ہے ۔ لیکن قرآن ہے کہ آغاز سے انجام تک جوئے رواں ہے ۔ ایک ہی سطح پر ۔ ایک ہی رفتار سے اور ایک ہی معیار پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے ۔

پھر اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے بھی یہ معجز ہے ۔ اس کے فکری اجزاء باہم مربوط ہیں ۔ اس میں کوئی ایک بات نہیں ہے جو اس کے مجموعی فریم سے بیگانہ کھاتی ہو ۔ نہ کوئی اتفاقی بات ہے ۔ تمام ہدایات 'اور تمام ضابطہ بندیاں ایک ہی

ضابطے کے مطابق متناسق اور متماثل ہیں۔ یہ تعلیمات انسان کی پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ زندگی کے مسائل کا پورا استیعاب ہے۔ اور پوری انسانی زندگی کے مسائل کا جواب شافی اس میں موجود ہے۔ اس کا ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں ہے جو قرآن کریم کے تمام دوسرے جزئیات کے مخالف اور متضاد ہو۔ پھر یہ پورا فکری نظام 'نظام فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ تمام اجزاء فکر ایک ہی محور کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ ایک ہی رسی میں سب کچھ بندھا ہوا ہے۔ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ۔ انسان اپنی محدود مہارت کے ساتھ کوئی ایسا مربوط نظام فکر و عمل پیش کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ لہذا یہ ماہر مطلق کا ارسال کردہ نظام ہے اور یہ زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ غرض قرآن کا یہ نظام اس قدر جامعیت لیے ہوئے ہے۔ اس کی فکری اور عملی تنظیم حیرت انگیز ہے۔

پھر اس کے اندر ایک اور اعجاز بھی ہے 'اس کی آواز سنتے ہی دلوں میں اتر جاتی ہے' یہ دلوں کی کنجیاں رکھتا ہے۔ اس کو سنتے ہی دل کھل جاتے ہیں اور انسان کے اندر تاثر قبول کرنے والی پنہاں قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اور اس کی آواز پر لبیک کہتی ہیں۔ یہ الجھے ہوئے دینی مسائل کو اس قدر سادگی اور آسانی کے ساتھ حل کر دیتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ بغیر کسی مشکل اور پیچیدگی اور زیادہ محنت کے۔ محض ایک لچ کے ساتھ دلوں کی دنیا کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ قرآن کریم کو اپنی اس آخری رسالت کے لیے ایک معجزہ قرار دے۔ اور اللہ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ کوئی مادی اور طبیعی معجزہ نازل کرے 'جس کو دیکھ کر لوگوں کی گردنیں جھک جائیں اور وہ بامر مجبوری اسے تسلیم کر لیں۔ یہ اس لیے کہ یہ آخری بعثت تمام انسانوں کے لیے ایک عام اور کھلی رسالت تھی۔ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے قیامت تک یہی ہدایت تھی اور یہ کسی ایک قوم تک محدود اور کسی محدود وقت کے ساتھ مقید اور موقوف رسالت نہ تھی۔ اس لیے اللہ نے اس رسالت کو ایک ایسا معجزہ دیا جو اقوام قریب و بعید دونوں کے لیے عام ہو۔ ہر قوم اور ہر نسل کے لیے ہو۔ جہاں تک مادی معجزات کا تعلق ہے ان کے سامنے تو صرف وہ لوگ جھکتے ہیں جو اسے دیکھتے ہیں۔ اور ان اقوام کے بعد تو وہ واقعات قصص و روایات بن جاتے ہیں۔ وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشاہد نہیں ہوتے۔

رہا قرآن مجید تو وہ چودہ سو سال سے ایک معجزہ ہے۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے' ایک زبردست نظام زندگی ہے۔ اگر اس کو کسی بھی زمانے کے لوگ اپنا راہنما اور امام بنا لیں۔ تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ ان کی زندگی کے پورے مسائل حل کر سکتا ہے۔ اور ان کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے بلکہ وہ ان کو ایک نہایت ہی اعلیٰ افق پر 'افضل زندگی اور بہترین نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے کہ آج ہم نے اپنے دور میں اس سے جو کچھ معلوم نہیں کیا' آنے والی نسلیں اس سے معلوم کر لیں گی۔ یہ ہر سائل کو اس کے سوال کے مطابق دیتا ہے اور جھولی بھر کے دیتا ہے اور اس کے خزانے ختم نہیں ہوتے بلکہ از سرنو نئے نئے ذخیرے ملتے ہیں۔ لیکن لوگ ہیں کہ اس قرآن کے عظیم خزانوں اور حکمتوں کو پا نہیں رہے اور اعراض کرتے ہیں۔ جوں جوں قرآن کی کوئی نئی آیت نازل ہوتی تو وہ کہتے :

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ﴿٥﴾

"جن لوگوں کے پاس رحمن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے' یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں"۔

یہاں اللہ کے ناموں میں سے رحمٰن کو لایا گیا ہے' اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کتاب اور یہ نصیحت نازل کر کے اللہ نے مخلوق پر بہت بڑی رحمت کی ہے اور اس رحمت سے وہ منہ موڑ رہے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کا یہ فعل بہت ہی قبیح اور شنیع ہے۔ آسمانوں سے ان پر رحمت کا نزول ہو رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کی چیز سے محروم کر رہے ہیں جس کے وہ فی الحقیقت بہت ہی محتاج ہیں۔

اس لیے ان کے اس اعراض پر اللہ کی طرف سے بہت ہی سخت تہدید نازل ہوتی ہے کہ اللہ کا عذاب ان کے لیے منتظر ہے۔ بہت جلد یہ لوگ اس سے دوچار ہوں گے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

"اب جب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں' عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت (مختلف طریقوں سے) معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔

اور یہ تہدید نہایت خفیہ اور مجمل ہے اور عذاب مجہول ہے۔ یہ لوگ چونکہ ان دھمکیوں کو ایک مذاق سمجھتے تھے' اس لیے اللہ نے دھمکی کا انداز بیان بھی استہزائیہ کر دیا۔

فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶ : ۶) "عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔ یعنی اس عذاب کی خبریں ان تک پہنچ جائیں گی۔ جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں۔ ان لوگوں تک اس عذاب کی صرف خبریں ہی نہ پہنچیں گی بلکہ یہ لوگ عذاب چکھیں گے بھی اور یہ بذات خود خبر بن جائیں گے۔ اور ان پر جو مصیبت آئے گی لوگ گلی کوچوں میں اس کی داستانیں ایک دوسرے کو سناتے رہیں گے۔ یہ چونکہ مذاق اڑاتے تھے' اس لیے اس تہدید میں بھی مذاقیہ اسلوب دیا گیا۔ لیکن یہ مذاق تہدید سے بھرا ہوا ہے۔

یہ لوگ ایک خارق عادت طبیعی معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اللہ کی ان روشن اور روشن اور چمکدار آیات و معجزات کا نوٹس نہیں لیتے جو ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان آیات و نشانات کے ہوتے ہوئے کسی قلب مفتوح اور کسی حساس بصیرت کو تو مزید کسی دلیل اور برہان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کائنات کا صفحہ اس قدر عجیب ہے کہ انسانی دل و دماغ اس کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

"اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے' مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔

اس مردہ زمین سے ایک گونہ زندہ نباتات کا نکالنا کیا کم معجزہ ہے - پھر ان نباتات سے نر اور مادہ بنانا - بعض انواع میں یہ نر اور مادہ علیحدہ علیحدہ پودوں میں ہوتے ہیں اور یہ پھر ایک ہی پودے میں نر اور مادہ پھول ہوتے ہیں جیسا کہ اکثر نباتات میں ہوتا ہے یعنی ایک ہی شاخ میں نر اور مادہ اجزا ہوتے ہیں - اور یہ معجزہ ان کے ماحول میں رات دن رونما ہوتا رہتا ہے -

اَوَلَمْ يَرَوْا (۲۶ : ۷) "کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہے" - یہ ایسے معجزات ہیں کہ جن کے صرف ایک ہی مشاہدے کی ضرورت ہے -

قرآن کے نظام تربیت کا یہ خاص انداز ہے کہ قرآن انسانی دل و دماغ کو اس کائنات کے مشاہد پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے - قرآن بجھے ہوئے احساس کو جگاتا ہے 'کند ذہن کو تیز کرتا ہے اور بند قوائے مدرکہ کو آزاد کرتا ہے اور ان کو اس کائنات میں پائے جانے والے ان معجزات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں تاکہ انسان ایک زندہ دل و دماغ کے ساتھ اس کائنات کو دیکھے - اللہ کی عجیب و غریب مصنوعات کو دیکھے - اور اسے اللہ کا شعور حاصل ہو - اور وہ اللہ کی معرفت 'اللہ کے عجائب مخلوقات کے ذریعے حاصل کرے - اور وہ اللہ سے ہروقت ڈرتا رہے اور اسے یہ شعور ہو کہ اللہ دیکھ رہا ہے - پھر ہر انسان کو یہ شعور ہو کہ اللہ کی مخلوقات میں سے صرف وہی ہے جو یہ شعور رکھتا ہے - اور اللہ کی مخلوقات سے بھی وابستہ ہے - اور اللہ کے اس ناموس فطرت کے ساتھ بھی پیوستہ ہے - جس کو اللہ نے اس کائنات کے اندر جاری و ساری کر رکھا ہے - پھر اسے یہ بھی شعور ہو کہ اس کائنات میں اس نے ایک خاص کردار ادا کرتا ہے - خصوصا اس کرۂ ارض کے حوالے سے تو اس کے کاندھوں پر ایک خاص ذمہ داری ڈالی گئی ہے -

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۲۶ : ۷) "کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں" - یہ نہایت ہی عمدہ ہیں 'اس لیے کہ ان کے اندر زندگی ہے اور یہ زندگی رب کریم نے ان کے اندر پیدا کی ہے - لفظ کریم سے اللہ یہ تاثر دیتا ہے کہ اللہ کی صنعت کاریوں کو نہایت ہی توجہ 'اہمیت اور تکریم کی نگاہوں سے دیکھنا چاہئے - یہ کوئی معمولی حقائق نہیں ہیں کہ ان پر سے محض ایک نادان اور غافل کی طرح گزر جائے -

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً (۲۶ : ۸) "ان میں تو یقیناً ایک نشانی ہے" - ان کے علاوہ مزید نشانیاں طلب کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے - حالانکہ یہ لوگ ان پیش پا افتادہ نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے -

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۶ : ۸) "مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں" - سورت کا یہ دیباچہ ایک ایسے سبق آموز فقرے پر ختم ہوتا ہے - جو اس سورت میں بار بار دہرایا گیا ہے -

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ع ۹ ۵

"اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی" - یعنی وہ زبردست ہے اور قسم قسم کی معجزانہ

مخلوق کی پیدائش، قسم قسم کے معجزات دکھانے اور مکذبین اور منکرین کو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ اور وہ الرحیم بھی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اپنی مخلوقات میں سے۔ ان عجائب و غرائب کی کو پیش کرتا ہے اور دلائل و معجزات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اس طرح جن کا دل مائل بہ ہدایت ہوتا ہے وہ ایمان لے آتے ہیں اور پھر وہ مکذبین کو بھی مہلت دیتا ہے اور جب تک ان کے پاس کوئی واضح پیغام دینے والا نہیں بھیجتا۔ اس وقت تک سزا بھی نہیں دیتا۔ حالانکہ اس کائنات کے نشانات میں بہت ہی وافر مقدار میں چیزیں موجود ہیں۔ مزید کسی دلیل و برہان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ لوگوں کے ضمیر کو روشن کرنے کے لیے، ان کو بصیرت فراہم کرنے کے لیے اور ان کو اچھے انجام کی بشارت دینے کے لیے اور برے انجام سے خبردار کرنے کے لیے رسول بھی بھیجتا ہے اس لیے وہ رحیم ہے، کریم ہے۔

---000---

درس نمبر ۱۶۲ ایک نظر میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا یہ حصہ' اس سورت کے موضوع اور محور کے ساتھ بہت ہی ہم آہنگ ہے۔ اس سورت میں مدار کلام زیدہ تر اس پر ہے کہ مکذبین کا انجام کیسا ہوا کرتا ہے۔ پھر اس سورت میں بھی حضور اکرم صلی للہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور مشرکین کی جانب سے روگردانی اور تکذیب کے نتیجے میں آپ کو جو مشکلات درپیش تھیں۔ ان پر آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی اس سورت کا موضوع سخن ہے۔ پھر اس سورت میں اس بات کی یقین دہانی بھی ہے کہ اس دعوت اور اس کی حامل تحریک کا حامی و مددگار اور محافظ اللہ ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کمزور ہیں اور ان کے مخالفین زاد و عتاد یعنی ساز و سامان سے لیس ہیں۔ اہل قوت اور جبار ہیں اور ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ کیونکہ اس سورت کے نزول کے وقت مکہ میں تحریک اسلامی کچھ ایسے ہی حالات سے گزر رہی تھی۔ انبیائے سابقین کے قصص قرآن کے منہاج تربیت میں ایک اہم مواد اور وسائل تربیت ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ اسلام کے قصے کی بعض کڑیاں سورت بقرہ' سورت مائدہ' سورت اعراف' سورت یونس' سورت اسراء' سورت کہف اور سورت طٰہٰ میں گزر چکی ہیں۔ جبکہ بعض دوسری سورتوں میں بھی حیات موسیٰ علیہ اسلام کی طرف مجمل سے اشارات موجود ہیں۔

جہاں جہاں بھی اس قصے کی کڑی کی طرف کوئی اشارہ آیا ہے یا کوئی کڑی تفصیل کے ساتھ دی گئی ہے وہاں موضوع سخن کے ساتھ وہ کڑی اور وہ حصہ نہایت ہی موزوں رہا ہے۔ ہر جگہ سیاق کلام کے ساتھ مناسب حصہ لایا گیا ہے۔ جس طرح اس قصے میں جو کڑیاں ہیں وہ اس سورت کے موضوع کے ساتھ متناسب ہیں۔ اور اسی مقصد کو واضح کرتی ہیں۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے فی ظلال پارہ ششم)

یہاں جو حلقہ دیا گیا ہے وہ رسالت اور اس کی تکذیب کے ساتھ متعلق ہے اور تکذیب نیز حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف سازش کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کی غرقابی کے واقعات دیئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھی ظالموں کے چنگل سے رہائی پا گئے۔ چنانچہ یہ پوری کڑی اس آیت کی تصدیق ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْآ اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶: ۲۲۷) "اور عنقریب جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا کہ وہ کس انجام تک پہنچتے ہیں"۔ اور اللہ کے اس قول کی بھی تصدیق ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶: ۶) "اب جبکہ انہوں نے جھٹلا دیا تو عنقریب پہنچ جائیں گی ان تک خبریں اس چیز کی جس کے ساتھ وہ مذاق کرتے تھے"۔ حضرت موسیٰ کے قصے کا یہ حصہ چند مناظر پر مشتمل ہے جن کو دکھانا ضروری تھا۔ ان مناظر کے درمیان گیپ اور وقفے ہیں جن کے اندر منظر پر پردہ گر جاتا ہے اور اس کے بعد جب پردہ اٹھتا ہے تو دوسرا منظر نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو پورے قرآن کریم میں قصص کے پیش کرتے وقت ملحوظ رہتی ہے۔

اس کڑی میں سات مشاہد ہیں۔ پہلے منظر میں اللہ کی جانب سے ندا آتی ہے۔ حضرت موسیٰ رب سے ہمکلام ہوتے

ہیں اور ان کو منصب نبوت سے سرفراز کیا جاتا ہے اور ان پر وحی آتی ہے۔ دوسرے منظر میں کلیم اور فرعون کو آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں فرعون کے درباری بھی موجود ہیں۔ حضرت موسیٰ رسالت پیش فرماتے ہیں اور عصا اور ید بیضا کے معجزے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ تیسرے منظر میں موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جادوگروں کو لایا جاتا ہے۔ ایک وسیع میدان میں لوگ جمع ہو کر مقابلے کی تدابیر پر بحث ہوتی ہے۔ چوتھے منظر میں جادوگر فرعون کے دربار میں جمع ہیں اور انعام و اکرام کے پکے وعدے لے رہے ہیں۔ اگر وہ میدان مار لیں۔ پانچواں منظر مقابلے کا منظر ہے' مقابلہ ہوتا ہے' جادوگر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔ چھٹے منظر میں دونوں کیمپوں کی جھلکیاں ہیں ایک طرف وحی الہی کا منظر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ تم تیاری کرو اور میرے بندوں کو لے کر رات کے وقت نکل جاؤ۔ اور دوسری طرف فرعون تمام علاقوں میں اپنے کارندے بھیجتا ہے اور فوجیں جمع ہوتی ہیں۔ ساتویں منظر میں یہ تعاقب کرنے والی افواج اور بھاگنے والے مسلمان ایک سمندر کے سامنے ہیں۔ سمندر پھٹ جاتا ہے اور ان آبی راستوں سے یہ مظلوم پار ہو جاتے ہیں اور ظالم غرق ہو جاتے ہیں۔

یہی مناظر سورت اعراف 'سورت یونس اور سورت طٰہٰ میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ہر جگہ انداز اور قصے کا رنگ مختلف ہے۔ اور بات جس رخ پر جارہی ہوتی ہے' قصے کو بھی اسی انداز پر لایا جاتا ہے۔ چنانچہ قصے کا وہ پہلو اجاگر کیا جاتا ہے جو زیر بحث موضوع کے ساتھ متعلق ہو۔

اعراف میں قصے کا آغاز ہی کلیم اور فرعون کے مختصر مکالمے سے ہوا ہے۔ پھر جادوگروں کے ساتھ مقابلے کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جبکہ فرعون اور اس کے سرداروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو اچھی طرح تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اور جادوگروں کے مقابلے اور لشکر فرعون کی غرقابی کے درمیان مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں معجزات دکھاتے ہوئے منظر پر لایا گیا ہے۔ پھر جب یہ لشکر کامیابی کے ساتھ سمندر سے گزر جاتا ہے تو پھر ہجرت کی زندگی کے کئی حلقے پیش کیے گئے ہیں' جبکہ یہاں اس سورت میں یہ کڑیاں حذف کر دی گئی ہیں اور حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان توحید کے موضوع پر مکالمہ طوالت کے ساتھ دیا گیا ہے کیونکہ یہ اس سورت کا موضوع ہے اور مشرکین مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان یہی مکالمہ زوروں پر ہے۔ اور سورت یونس میں مختصر مکالمہ کلیم و فرعون سے آغاز ہوتا ہے اور عصا اور ید بیضا کے معجزات بھی نہیں دکھائے جاتے اور جادوگروں کے ساتھ مکالمے کی تفصیلات بھی حذف کر دی گئی ہیں جبکہ یہاں ان دونوں کو مفصل لایا گیا ہے۔ اور طٰہٰ میں حضرت موسیٰ اور رب تعالیٰ کے درمیان مناجات کو مفصل لایا گیا ہے۔ پھر موسیٰ اور فرعون کا سامنا' جادوگروں کا مقابلہ سرسری طور پر اور بنی اسرائیل کا سفر ہجرت مفصل ہے۔ یہاں فرعون کی غرقابی پر قصہ کے مناظر ختم کر دیئے جاتے ہیں۔

اس طرح جب ہم اس قصے کو قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں بار بار پاتے ہیں تو قرآن کے اسلوب بیان کا یہ کمال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کسی جگہ بھی نہیں یہ نظر نہیں آتا کہ یہ وہی قصہ ہے جو دہرایا جارہا ہے کیونکہ ہر جگہ مختلف کڑیاں دکھائی گئی ہیں۔ مختلف مناظر ہیں۔ قصے کا ایک مخصوص پہلو کھول کر بیان کیا جاتا ہے اور انداز بیان تو ہر جگہ نیا ہوتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات قصے کو ہر جگہ نیا بنا دیتی ہیں۔ اور ہر جگہ قصہ اپنے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہوتا ہے۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۱۶۲ تشریح آیات

۱۰ --- تا --- ۶۸

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾

”انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب کہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا“ ”ظالم قوم کے پاس جا فرعون کی قوم کے پاس کیا وہ نہیں ڈرتے؟“ اس نے عرض کیا ”اے میرے رب ' مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی ۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے ' اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے“۔ فرمایا ”ہرگز نہیں ' تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر ' ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے ۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو ' ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے“۔

اس سورت میں جو قصے لائے گئے ان کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے ۔ ذرا سورت کے آغاز کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں ۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۳) اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ (۴) وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِیْنَ (۵) فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَیَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ

(٦)(٢٦: ٣ تا ٦) "اے نبیؐ شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں' اب جبکہ یہ جھٹلا چکے ہیں۔ عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں"۔ اس تمہید کے بعد یہ تمام قصص لائے گئے ہیں اور ان میں بیان شدہ حصوں کا بنیادی مقصد مکذبین اور مستہزئین کا انجام بتانا ہے۔

وَ اِذْ نَادٰي رَبُّكَ مُوْسٰۤي اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (٢٦: ١٠) قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ (٢٦: ١١) "انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب کہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا" "ظالم قوم کے پاس جا فرعون کی قوم کے پاس - کیا وہ نہیں ڈرتے؟" یہ ہے یہاں اس قصے کا پہلا منظر' اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب رسالت عطا کر کے ایک مشن دے دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ تم نے ایک ظالم قوم کے پاس جانا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی ذات پر ظلم کیا ہے کہ کفر و گمراہی میں مبتلا ہیں۔ پھر انہوں نے بنی اسرائیل پر ظلم کیا ہے کہ یہ ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے ہیں اور مردوں کو ذبح کرتے ہیں اور ان کے ساتھ جگہ جگہ مذاق کرتے ہیں اور طرح طرح کی سزائیں دیتے ہیں۔ اس قوم کی صفات پہلے بیان کرنے کے بعد اب ان کا نام لیا جاتا ہے۔ قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ حضرت موسیٰ اور تمام انسان تعجب کرتے ہیں کہ کیا یہ ظالم قوم اپنے برے انجام سے نہیں ڈرتی۔ کیا ان کو خدا کا خوف نہیں ہے۔ کیا اپنے ان مظالم کا انجام انہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر گھناؤنے جرائم کے بعد بھی باز نہیں آتے۔ ان کا معاملہ تو عجیب ہے اور تعجب انگیز ہے۔ اور اسی طرح تمام ایسی اقوام کا معاملہ ہے جو حد سے گزر جاتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرعون اور اس کی قوم کا معاملہ کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ تو ان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ فرعون کے ظلم' اس کے جبر اور اس کی سرکشی سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اور اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ تو ایک عظیم اور مشکل مشن ہے جو ان کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے اپنی کمزوریاں رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس دعوت سے پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں اور مستقلاً معذرت کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس مشن کے لیے مزید ضروری امداد اور معاونت کے طلبگار ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (٢٦: ١٢) وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰي هٰرُوْنَ (٢٦: ١٣) وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (٢٦: ١٤) اس نے عرض کیا "اے میرے رب' مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے' اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو بات نقل کی گئی ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے وہ محض تکذیب کے خوف

سے یہ فرماتے ہیں بلکہ ان کو رسالت ایسے حالات میں دی جارہی ہے کہ ان کے دل کے اندر تنگی پائی جاتی ہے۔ اور ان کو طلاقت لسانی کا ملکہ حاصل نہیں ہے۔ رسالت کے سلسلے میں ان کو ہر کسی سے مباحثہ اور گفتگو کرنی ہوگی اور ان کی حالت یہ ہے کہ ان کی زبان میں لکنت ہے اور اس کے بارے میں سورت طٰہٰ میں انہوں نے تصریح فرمائی ہے۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي "اور میری زبان میں جو گرہ ہے اسے کھول دے تاکہ وہ میری بات کو سمجھیں"۔ جب انسان کی زبان میں لکنت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے سینہ میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تنگی اس وقت سخت تکلیف دہ ہوتی ہے کہ انسان بات کرنا چاہتا ہے اور جذبات کے ساتھ دلائل کا اظہار چاہتا ہے اور زبان اس وقت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جوں جوں خیالات اور جذبات کا سیلاب رواں ہوتا ہے' زباں بند ہوتی ہے اور دل تنگ ہو جاتا ہے۔ اور انسان کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ یہ صورت حال ہر کسی کی دیکھی ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پریشان ہیں کہ اگر ایسے حالات میں ان کی زبان کو گرہ لگ جائے تو بڑی عجیب پوزیشن ہوگی۔ خصوصاً جبکہ مقابلہ فرعون جیسے قہار و جبار کے ساتھ ہو۔ چنانچہ حضرت نے اپنی کمزوری اپنے رب کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ حضرت ہارون کو بھی مقام رسالت عطا کر دیا جائے۔ ان کو بھی اس منصب میں شریک کر دیا جائے تاکہ وہ دونوں مل کر اس عظیم فریضے کو ادا کریں۔ مقصد یہ نہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس منصب کو قبول کرنے سے ہچکچا رہے ہیں یا پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں۔ اور حضرت ہارون چونکہ حضرت موسیٰ سے زیادہ فصیح اللسان تھے اور جذباتی اعتبار سے وہ ٹھنڈے دل دماغ کے مالک تھے۔ جب دوران کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زباں کو اگر گرہ لگ گئی تو حضرت ہارون ساتھ موجود ہوں گے وہ استدلال اور مکالمے کو آگے بڑھائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس لکنت کو دور کرنے کے لیے خصوصی دعا بھی فرمائی جس طرح سورت طٰہٰ میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اسے دور بھی کر دیا ہو لیکن آپ نے پھر بھی حضرت ہارون کو شریک منصب کرنے کے لیے دعا فرمائی۔ اور فرمایا کہ انہیں ان کے لیے وزیر مقرر فرمایا جائے۔

اسی طرح حضرت نے فرمایا۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ (۲۶: ۱۴) "اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے مقابلہ کرنے سے نہیں ڈرتے تھے اور نہ وہ ادائیگی فرض سے پہلوتہی چاہتے تھے بلکہ آپ حضرت ہارون کو وزیر اور شریک کار مقرر کروانا چاہتے تھے کہ اگر یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جرم قتل میں سزائے موت دے دیں تو ان کے بعد رسالت کا کام حضرت ہارون جاری رکھیں۔ اور اس طرح فریضہ رسالت ادا ہوتا رہے جس طرح اللہ کا حکم تھا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ احتیاطی تدابیر دعوت اسلامی اور رسالت کی خاطر اختیار کیں۔ داعی کی ذات کے لیے کچھ زیادہ فکر نہ تھی۔ یعنی اگر حضرت موسیٰ کی زبان کو گرہ لگ جائے اور آپ تقریر نہ کر سکیں تو حضرت ہارون تیار ہوں' یہ نہ ہو کہ نیا آنے والا نبی لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے اور اچانک اس کی بات ہی رک جائے۔ اور اس طرح دعوت اسلامی کو ایک کمزوری کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر ان کو قتل ہی کر دیا جائے تو دعوت کا کام ہی رک

جائے - حالانکہ دعوت کا کام جاری رہنا ضروری ہے - اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ سوچ بالکل فطری تھی - اس لیے کہ اللہ نے ان کو منتخب ہی اسی کام کے لیے کیا تھا - اور اللہ نے اپنی نگرانی میں ان کی تربیت ہی اسی مقصد کے لیے فرمائی تھی - اور ان کو اللہ نے اپنے کام کے لیے ہی بنایا تھا۔

جب حضرت موسیٰ نے اپنی اس دلچسپی کا اظہار کیا' دعوت کے بارے میں اپنے خدشات اور احتیاطی تدابیر کا اظہار کیا تو اللہ نے ان کی درخواست قبول کر لی - اور آپ کو تسلی دے دی کہ آپ ڈریں نہیں' یہاں قبولیت دعا کا مرحلہ نہایت ہی مختصر ہے - ہارون علیہ السلام کو نبی بنانا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصر میں پہنچنا' ہارون علیہ السلام سے ملنا' تمام واقعات کو حذف کر کے صرف یہ دکھایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں اپنے رب کے احکام لے کر فرعون کے ساتھ ہمکلام ہونے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن حضرت موسیٰ کے خدشات کو صرف ایک ہی سخت لفظ سے روکا جاتا ہے جو نفی کے معنی میں آتا ہے اور جو تنبیہہ کے لیے ہے کَلَّا "ہرگز نہیں"۔

قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ (۱۵) فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶) اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۱۷) (۲۶ : ۱۵ تا ۱۷)

"فرمایا "ہرگز نہیں' تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر' ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے - فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو' ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے"۔ ہرگز نہیں' نہ تمہارا دل تنگ ہو گا اور نہ تمہاری زبان میں لکنت ہو گی - اور وہ ہرگز تمہیں قتل نہ کر سکیں گے - یہ سب خدشات آپ اپنے دل سے نکال دیں - تم اور تمہارا بھائی دونوں جاؤ۔

فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ (۲۶ : ۱۵) "جاؤ ہماری نشانیاں لے کر"۔ ان نشانیوں میں سے عصا اور ید بیضا کی نشانی تو حضرت موسیٰ نے دیکھی ہوئی تھی - یہاں ان سب باتوں کو مختصر کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس سورت میں پیش نظر فرعون کے سامنے رسالت کا پیش کرنا' جادوگروں کے کرتب دکھانا اور فرعون کی غرقابی کی منظرکشی کرنا ہے - جاؤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ (۲۶ : ۱۵) "ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے"۔ نہایت ہی زوردار اور تاکیدی الفاظ میں کہا جاتا ہے' جاؤ - تمہیں اللہ کی حمایت یا رعایت اور تحفظ حاصل ہے - اللہ تمہارے ساتھ ہے جس طرح وہ ہروقت' ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے لیکن یہاں اللہ کی موجودگی کا مقصد یہ ہے کہ ہم تمہاری مدد اور تائید کے لیے حاضر ہیں۔

یہاں نصرت و تائید کا یقین یوں دلایا گیا ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں' سن رہے ہیں یعنی حضوری اور توجہ انسانوں کے نزدیک اپنے عروج پر ہوتی ہے جب انسان سنتا ہے اس لیے ان کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ میری امداد اور نصرت ہروقت حاضر ہے - یہ ہے قرآن کریم کا انداز کہ وہ ہر چیز کو ایک مشخص اور مجسم صورت میں پیش کرتا ہے - اِذْهَبَا "جاؤ"

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ "فرعون کے پاس جاؤ"۔ اور اس کو اپنی مہم سے آگاہ کر دو - اور بغیر کسی خوف کے اس کے سامنے اپنا مطلب صاف صاف بیان کر دو۔

فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶:۱۶) ”کہ ہم رب العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں“۔ یہ تو دو ہیں لیکن چونکہ ہم ایک ہیں' رسالت ایک ہے' اس لیے دونوں ایک رسول ہیں۔ یہ اس فرعون کے سامنے کھڑے ہیں جو الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنی قوم کو یوں باور کراتا تھا۔

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ”میں تمہارے لیے اپنے سوا کسی دوسرے الٰہ کو نہیں جانتا“۔ یوں اس فرعون کے سامنے سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہم دونوں رب العالمین کے فرستادہ ہیں یعنی وہ عالمین کا رب ہے اور وہی عالمین کا رب ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس میں کوئی مداہنت اور لیپا پوتی نہیں ہو سکتی۔

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶:۱۶) اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

(۲۶:۱۷) ”ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے“۔ قصہ موسیٰ کے ان اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون کے پاس اس لیے رسول بنا کر نہ بھیجا تھا کہ حضرت موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کو دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیں اور اسلام کے دین کو قبول کریں بلکہ ان کے پاس صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ فرعون اور اس کی قوم سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کر دیں۔ وہ اس کی غلامی سے آزاد ہو جائیں اور پھر جس طرح چاہیں اپنے رب کی بندگی کریں۔ وہ تو پہلے سے دین اسلام کے پیروکار تھے۔ حضرت یعقوب" حضرت یوسف کے دین کو مانتے تھے البتہ ان کے نظریات اور ان کے ذہن میں انحراف ہو گیا تھا ان کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اس لیے اللہ نے ان کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو دوبارہ ارسال کیا کہ وہ ان کے عقائد بھی درست کر دیں اور ان کو فرعون کی غلامی سے بھی نجات دلائیں اور ان کو اچھی تربیت دے کر دوبارہ عقیدۂ توحید پر قائم کر دیں۔

---○○○---

یہاں تک تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو نبوت عطا ہوئی' ان پر وحی آئی اور ان کو دعوت اسلامی کا مشن عطا ہوا۔ اب پردہ گرتا ہے اور دوسرے منظر میں پھر ہم فرعون کے دربار میں کھڑے ہیں۔ ان دونوں مناظر کے درمیان جو غیر ضروری افعال و حرکات ہیں ان کو کاٹ دیا جاتا ہے اور یہ قرآن کریم کا ایک مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ مناظر و مشاہد کے درمیان سے غیر ضروری حصے کاٹ دیتا ہے یا مختصر کر دیتا ہے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّ لَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۱﴾ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۲﴾

فرعون نے کہا "کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے 'اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کر گیا 'تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے"۔ موسیٰ نے جواب دیا "اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔ پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرما لیا۔ رہا تیرا احسان 'جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا"۔

فرعون کو سخت تعجب ہوتا ہے۔ وہ یہ یقین نہیں کر سکتا کہ موسیٰ اس قدر عظیم دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ میں (رسول رب العالمین) ہوں اور پھر وہ فرعون سے اس قدر عظیم مطالبہ کرتے ہیں۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶:۱۷) "کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو"۔ کیونکہ انہوں نے جب موسیٰ کو آخری بار دیکھا تھا تو وہ ان کے گھر میں ان کا پروردہ تھا 'جس کے صندوق کو انہوں نے دریا سے اٹھا لیا تھا۔ اور پھر ایک قبطی کے قتل کے بعد بھاگ گیا تھا۔ وہ قبطی جو ایک اسرائیلی کے ساتھ ناحق الجھ رہا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ قبطی فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام دس سال تک غائب رہے اور اب آئے تو اس عظیم اور ناقابل تصور مطالبے کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون بات کا آغاز نہایت تعجب 'حقارت اور مزاحیہ انداز سے کرتا ہے کہ تم وہی تو ہو جس نے یہ یہ کام کیے اور اب :

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ (۲۶:۱۸) وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶:۱۹) "فرعون نے کہا "کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے 'اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کر گیا 'تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے"۔ کیا اس پرورش اور عزت کا یہ صلہ ہے جو تو ہمیں دے رہا ہے؟ اب تو آیا ہے اور ہم جس نظام زندگی کے مطابق اپنا نظام چلا رہے ہیں تو اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ تاکہ تو اس بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دے جس کے گھر میں پلا ہے اور میرے سوا تو کسی اور الٰہ اور رب اور حاکم کی بات کرتا ہے۔ تو ایک عرصہ تک ہمارے اندر رہ چکا ہے 'اس وقت تو تو نے بھی ایسا کوئی پروگرام نہیں بتایا۔ نہ ایسے دعوے کیے جو اب کر رہا ہے۔ اس عظیم پروگرام سے تو 'تو نے ہمیں خبردار نہیں کیا۔

اور فرعون قبطی کے قتل کے واقعہ کو نہایت مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے اور دھمکی آمیز انداز میں یاد دلاتا ہے۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ (۲۶:۱۹) "اور تو نے وہ اپنا کام کیا جو تو نے کیا"۔ یعنی بہت ہی برا کام 'اس قدر برا کہ اس کو صراحت کے ساتھ منہ پر لانا ہی اچھا نہیں ہے۔ تو نے اس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کیا۔

وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶:۱۹) "اس طرح تو رب العالمین کا منکر بن گیا"۔ اور اب تو اسی رب العالمین کی باتیں کرتا ہے۔ اس وقت تو تو رب العالمین کی بات نہ کرتا تھا۔

یوں فرعون نے حضرت موسیٰ کی تردید میں تمام مسکت دلائل گنوا دیئے اور اس نے یہ خیال کیا کہ شاید موسیٰ علیہ السلام ان دلائل کے بعد لاجواب ہو جائیں گے۔ کوئی مقابلہ نہ کر سکیں گے 'خصوصاً اس نے ایک سابق مقدمہ قتل کی

طرف بھی اشارہ کر دیا اور بالواسطہ دھمکی دے دی ہے کہ تمہارے خلاف اس مقدمہ کی کاروائی بھی ہو سکتی ہے اور سزائے قصاص تم پر نافذ ہو سکتی ہے۔

لیکن حضرت موسیٰ کی تو دعا قبول ہو چکی تھی۔اب ان کی زبان میں کوئی گرہ نہ تھی۔وہ بڑی روانی سے کہہ رہے تھے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (٢٦: ٢٠) فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّ جَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (٢٦: ٢١) وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِي اِسْرَآءِيْلَ (٢٦: ٢٢) "موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا" اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرمالیا۔رہا تیرا احسان' جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا"۔میں نے جو قتل کا ارتکاب کیا تو اس وقت میں نادان تھا۔اس وقت میں نے اپنی مظلوم قوم کی حمایت کی بنا پر یہ فعل کیا تھا۔یہ کام میں اپنے اس نظریہ حیات کی حمایت میں نہ کیا تھا جو اللہ نے اب مجھے بطور حکمت عطا کیا ہے۔

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ (٢٦: ٢١) "پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا"۔کیونکہ مجھے جان کا ڈر تھا۔اللہ کو میری خیریت مطلوب تھی۔اس نے مجھے یہ حکمت عطا کرنی تھی۔

وَّ جَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (٢٦: ٢١) "اور مجھے رسولوں میں شامل کر لیا"۔میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں۔میں جماعت رسل میں سے ایک ہوں۔

اب حضرت موسیٰ اس شخص کی طنز کا جواب طنزیہ انداز میں دیتے ہیں۔

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِي اِسْرَآءِيْلَ (٢٦: ٢٢) "یہ احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل غلام بنا لیا تھا"۔میں تمہارے گھر میں بامر مجبوری پلا' کیونکہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔تو ان کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا' اس وجہ سے میری ماں مجبور ہوئی کہ مجھے صندوق میں بند کر کے موجوں کے حوالے کر دے۔اس طرح تم لوگوں نے صندوق کو پکڑ لیا اور اس طرح میں تمہارے گھر میں پلا۔اور والدین کے گھر میں پلنے سے محروم رہا۔تو کیا یہ ہے وہ احسان جو تم جتلاتے ہو اور کیا یہ تمہاری مہربانیاں ہیں؟

اب فرعون اپنی بات بدل دیتا ہے۔اس موضوع کو چھوڑ کر اب وہ اصل بات پر آ جاتا ہے لیکن یہاں بھی وہ متکبرین کی طرح تجاہل عارفانہ کے انداز میں بات کرتا ہے۔مزاحیہ اور گستاخانہ انداز اور گستاخی بھی رب العالمین کے جناب میں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾

فرعون نے کہا "اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟" اس کا خانہ خراب ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہتا ہے کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے۔ جس کی طرف سے تم کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ اس انداز کا سوال ہے کہ گویا وہ رب العالمین کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں لیکن یہ غرور کا ایک انداز ہے۔ وہ گویا حضرت موسیٰ کے دعویٰ کو ایک عجیب و غریب دعویٰ تصور کر کے اسے ناممکن الوقوع تصور کرتا ہے اور یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ ایسے دعویٰ پر تو بات کرنا بھی فضول ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اس طرح جواب دیتے ہیں کہ رب العالمین وہ ہے جس کی الوہیت تمام دکھائی دینے والی کائنات پر مشتمل ہے۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾

موسیٰ نے جواب دیا "آسمانوں اور زمین کا رب' اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں' اگر تم یقین لانے والے ہو"۔

یہ جواب اس کے تجاہل عارفانہ کے انداز کے سوال کا شافی جواب ہے یعنی اے فرعون رب العالمین اس پوری کائنات مشہود و غیر مشہود کا رب ہے۔ اور اس کی بادشاہت اور اقتدار تک تمہاری بادشاہت نہیں پہنچ سکتی۔ نہ اللہ کے علم تک تمہارا علم پہنچ سکتا ہے۔ فرعون کا دعویٰ تو صرف یہ تھا کہ وہ مصری قوم کا الٰہ اور حاکم ہے' صرف وادی نیل کا فرمان روا ہے۔ رب العالمین کے مقابلے میں یہ کیا ربوبیت ہے۔ اس قدر حقیر جس طرح اس عظیم کائنات کے اندر ایک ذرہ ہوتا ہے۔

اس جواب کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام اس کی توجہ اس عظیم کائنات کی طرف مبذول کراتے ہیں اور وہ خود جس ربوبیت کا دعویدار تھا اس کو حقیر اور باطل قرار دیتے ہیں اور اسے دعوت دیتے ہیں کہ اس کائنات میں تدبر کر کے ذرا اپنے ذہن کو کھول دیں اور رب العالمین کی حاکمیت کے وسیع دائرے کو دیکھیں اور اس کے بعد مختصر تبصرہ بھی فرما دیتے ہیں کہ تدبر تم تب کر سکتے ہو جب

اِنْ كُنْتُمْ مُوْمِنِيْنَ (۲۶ : ۲٤) "اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو"۔ اگر تم یقین کرنا چاہو تو پھر رب العالمین ہی یقین کرنے کے لائق ہے۔

اب فرعون اپنے درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر ان سے پوچھتا ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

"فرعون نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کہا "سنتے ہو"۔ کیا تم اس شخص کی عجیب باتیں نہیں سنتے؟ یہ باتیں تو ہمارے سامنے کسی نے نہیں کیں اور نہ ہم نے کبھی سنی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بغیر توقف کے ایک دوسرا وار کیا۔ اور رب العالمین کا مزید تعارف کرایا۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

"موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباؤاجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں"۔ یہ بات فرعون نے بہت زیادہ محسوس کی کیونکہ اس کی زد فرعون کے دعووں اور اس کے طرز عمل پر پڑتی تھی۔ اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ وہ رب العالمین تو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے آباء کا بھی رب ہے اور اے فرعون تم بھی تو بندگان رب العالمین میں سے ایک حقیر بندے ہو اور یہ کہ تم کسی کے رب نہیں ہو۔ جیسا کہ تم رب مصر ہونے کے مدعی ہو' لہٰذا تمہارا دعوائے الوہیت و ربوبیت اور حاکمیت ہی سرے سے غلط ہے۔ لہٰذا ہی رب العالمین ہے' تھا اور رہے گا۔

یہ فرعونی نظریات پر سخت تباہ کن بمباری تھی۔ اور اس سے خود اس کے حاشیہ نشینوں کے متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ اس لیے وہ صبر نہ کر سکا لہٰذا اس نے حضرت موسیٰ کے بارے میں وہی الزام دہرایا جو ہمیشہ مستکبرین دہراتے ہیں۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

"فرعون نے (حاضرین سے) کہا "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں' بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں"۔

یہ رسول جو بزعم خود تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ یہ شخص رسول خدا کے بارے میں یہ توہین آمیز ریمارکس اس لیے پاس کر رہا ہے کہ لوگوں پر اثر نہ ہو جائے اور یقین نہ کر لیں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت فی الواقعہ رسول بھیجے گئے۔ یہ بات وہ بطور مذاق کہتا ہے کہ یہ شخص جو باتیں کرتا ہے وہ تو ہمارے مستحکم نظام سے متصادم ہیں اور ہمارا نظام تو صدیوں سے چل رہا ہے جس کے مطابق ہم رب ہیں اور یہ کسی دوسرے رب العالمین کی طرف بلا رہا ہے اور پھر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ہمارے آباء کا بھی رب العالمین ہے۔

لیکن اس مذاق اور استہزاء کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا اثر ہو گا۔ وہ تو اس پیغمبرانہ اعتماد سے بات کرتے ہیں۔ جس کے مقابلے میں بڑے بڑے جباروں کی ذہنی دنیا میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

"موسیٰ نے کہا "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب' اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں"۔

مشرق و مغرب تو ہر دن انسانوں کو نظر آتے ہیں۔ اور اس دنیا میں ایک خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ منظر تو بڑا عبرت آموز ہے لیکن چونکہ یہ ۲۴ گھنٹوں میں مسلسل دہرایا جاتا ہے اس لیے لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں ان الفاظ سے جس طرح طلوع و غروب کا مفہوم ذہن میں آتا ہے' اسی طرح طلوع و غروب کے مقام کا مفہوم بھی ان میں ہے۔ یہ دو مناظر حضرت نے اس لیے پیش کیے کہ طلوع و غروب کے مظاہر کو اور مقامات و

طلوع اور مقامات غروب کو کوئی جابر بدل نہیں سکتا۔نہ ان دونوں مناظر کی اس خصوصیت کا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ آغاز تخلیق سے آج تک اس نظام کے اندر کوئی تبدیلی کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔کند ذہن سے کند ذہن شخص بھی اگر ان حقائق پر غور کرے تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔غافل سے غافل دل جاگ اٹھتے ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مکالمے میں ان کے ضمیروں کو جگانے کی بے حد کوشش کر رہے ہیں' دعوت دے رہے ہیں کہ غور و فکر کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۶ : ۲۸) "اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں"۔ سرکش حکمران دنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈرتے جس قدر وہ قوم کی بیداری سے ڈرتے ہیں۔ان کو دل و دماغ کی بیداری سے بہت ڈر لگتا ہے۔یہ سرکش حکمران ہمیشہ ان لوگوں کو سخت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو لوگوں میں بیداری پیدا کرتے ہیں۔اس لیے ایسے حکمران ہمیشہ ایسے لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ پر بہت غصہ آ جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت دل و دماغ کی پر سکون تاروں کو چھیڑ رہی ہے' اس لیے وہ اب جوش میں آ جاتا ہے۔دھمکی دیتا ہے' اور کھلے تشدد کی بات کرتا ہے۔اور جس وقت کسی شخص کے پاس دلائل کے ہتھیار ختم ہو جاتے ہیں تو وہ تشدد پر اتر آتا ہے۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝

"فرعون نے کہا "اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں"۔

یہ ہے سرکشوں کی دلیل اور حجت۔یہ کہ تمہیں جیل میں ڈال دیا جائے گا۔جیل تو تیار ہے اور دور بھی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔جب سرکش عاجز آ جاتے ہیں اور جب ان کو احساس ہو جاتا ہے کہ ان کا موقف تو سچائی کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا ہے کیونکہ سچائی ہمیشہ جارح ہوتی ہے تو پھر لاجواب سرکشوں کا قدیم زمانے سے یہ آخری ہتھیار ہوتا ہے۔اور آج تک یہ آخری ہتھیار استعمال ہوتا ہے۔

لیکن حضرت موسیٰ حوصلہ نہیں ہارتے۔آخر وہ رسول برحق ہیں۔ان کے اور ان کے بھائی کے ساتھ 'اللہ بھی کھڑا ہے اور دیکھ رہا ہے چنانچہ فرعون جس بحث کا سلسلہ ختم کرنا چاہتا تھا حضرت موسیٰ اس کا دوسرا باب کھول دیتے ہیں۔ آپ ایک نئے موضوع پر سوال کر دیتے ہیں۔ایک نیا استدلال۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۝

"موسیٰ نے کہا "اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی"۔یعنی اگر میں اپنی رسالت پر ایک صریح اور واضح دلیل بھی پیش کر دوں تو بھی میری یہی سزا ہے کہ جیل جاؤں۔حضرت موسیٰ اس طرح فرعون کو' اسکے سرداروں کے سامنے جو یہ تمام گفتگو سن رہے تھے' سخت مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔اگر وہ حضرت موسیٰ کی بات نہیں سنتا

تو ثابت ہو جاتا ہے کہ فرعون لاجواب ہو گیا حالانکہ وہ کہہ چکا ہے کہ یہ شخص تو مجنون ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے کہا اچھا لاؤ دلیل۔

قَالَ فَأْتِ بِهِۦٓ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٣١﴾

"فرعون نے کہا "اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے"۔ لاؤ اگر تمہارا دعویٰ سچا ہے۔ یہ یہ کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے پاس کوئی معجزانہ دلیل ہے' اس دعوی میں اگر تم سچے ہو' یہ شخص ابھی تک موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کے بارے میں شک کا اظہار کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کے اردگرد جو لوگ بیٹھے ہیں کہیں وہ متاثر نہ ہو جائیں۔

اب حضرت موسیٰ اپنے معجزات پیش فرماتے ہیں۔ فرعون کے ساتھ چیلنج اور جوابی چیلنج چونکہ انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ فرعون پر آخری وار کیا جائے۔

فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴿٣٣﴾ ع ۲

"(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اژدھا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا"۔

انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصا فی الحقیقت سانپ بن گیا تھا۔ زندہ ہو گیا اور زمین پر رینگنے لگا۔ اور جب انہوں نے اپنا ہاتھ بغل سے نکالا تو وہ فی الواقعہ سفید تھا اور یہ مفہوم (فَاِذَا هِیَ) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ محض نظربندی یا تخیل نہ تھا جس طرح جادوگر کرتے ہیں اور چیزیں اپنی حقیقت پر ہی رہتی ہیں۔ محض لوگوں کے حواس کے اندر خلل آ جاتا ہے۔ اشیاء کی حقیقت نہیں بدلتی۔

زندگی کا عظیم معجزہ' جو اس کرۂ ارض پر رواں ہے' اور یہ معجزہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ مانوس ہو گئے ہیں اور یہ معجزہ بار بار اس زمین پر دہرایا جاتا ہے یا لوگ زندگی کے ذریعہ رونما ہونے والی اس تبدیلی کا مشاہدہ نہیں کرتے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے یہ دونوں معجزے رکھے تو یہ ایک ایسا امر تھا کہ پہلی نظر میں اس نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

فرعون نے اب محسوس کیا کہ یہ معجزہ تو بہرحال بہت بڑا ہے اور اپنے اندر بڑی قوت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً اس معجزے کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اپنے دل میں تو وہ خود جانتا تھا کہ اس کا موقف غلط ہے۔ یہ بھی ممکن تھا اس کے حاشیہ نشین چاپلوسی کرتے ہوئے حقیقی صورت حال نہ بتائیں۔ اس لیے یہ شخص حضرت موسیٰ اور قوم موسیٰ کی طرف سے سامنے آنے والے خطرے کو خود حاشیہ نشینوں کے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ ان معجزات کے اثرات کو کم کر سکے۔

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُۥٓ إِنَّ هَٰذَا لَسَٰحِرٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ

أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴿٣٥﴾

"فرعون اپنے گردوپیش کے سرداروں سے بولا "یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو"۔

فرعون کے اس تبصرے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مانتا ہے کہ یہ معجزہ غیر معمولی معجزہ ہے۔ اگرچہ وہ اسے سحر بتاتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ ساحر علیم ہے۔ اس کی بوکھلاہٹ کا اظہار اسی سے ہوتا ہے کہ قوم بھی معجزے سے متاثر ہوگئی ہے۔

يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ (۲۶: ۳۵) "وہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اندر سے شکست کھا گیا ہے۔ اب یہ اپنی قوم کے ساتھ نہایت مہذب انداز میں گفتگو کرتا ہے حالانکہ ان لوگوں کو وہ یہ کہتا ہے کہ میں تمہارا الٰہ ہوں اور وہ اس کے سامنے سجدے کرتے تھے۔ اب یہ الٰہ صاحب خود ان سے مشورہ کرتے ہیں کہ بتاؤ اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے۔

اس دنیا میں تمام ڈکٹیٹروں کا یہی انداز ہوتا ہے کہ یہ بہت کروفر میں ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی یہ دیکھتے ہیں کہ زمین ان کے قدموں کے نیچے سے نکل رہی ہے تو مجبور ہو کر یہ برخورداروں کی طرح بات کرتے ہیں۔ پھر یہ عوام کے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ حالانکہ جب خطرے سے باہر تھے تو یہ ان عوام کو کچلتے تھے۔ بظاہر تو وہ یوں دکھاتے تھے کہ وہ شوریٰ ' مشورہ طلب کرتے ہیں لیکن دراصل ان کی حقیقت ایک بڑے ڈکٹیٹر کی ہوتی ہے۔ اور یہ نرمی بھی وہ صرف اس حد تک کرتے ہیں کہ خطرہ دور ہو جائے لیکن جونہی خطرہ دور ہوتا ہے یہ لوگ ایسے ہی جبار ہوتے ہیں اور ویسے ہی ظالم ہوتے ہیں۔

فرعون کے درباریوں نے مشورہ دیا کہ انہیں روک لو کیونکہ فرعون کی سازش سے وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے اور فرعون اور اس کے نظام باطل میں وہ برابر کے شریک بھی تھے اور فرعونی نظام کے علیٰ حالہ رہنے میں ان کا مفاد بھی تھا کیونکہ اس نظام ہی کی وجہ سے یہ لوگ مقربین فرعون تھے۔ ان کو خوف یہ تھا کہ اگر عوام بھی بنی اسرائیل کے ساتھ حضرت موسیٰ کی اطاعت شروع کر دیں تو یہ لوگ ان پر غالب آ سکتے ہیں۔ اگر عوام نے حضرت موسیٰ کے صرف یہ دو معجزے ہی دیکھے اور پھر حضرت موسیٰ کی باتیں سننے لگ گئے۔ تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ان کو روک لیں اور ان کے جادو کے مقابلے میں ایسے ہی جادو کا بندوبست کریں۔ تیاری کے بعد مقابلہ ہو۔

قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ﴿٣٦﴾ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ ﴿٣٧﴾

"انہوں نے کہا "اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیں اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں"۔

یعنی ان کو اور ان کے بھائی کو روک لیں اور مصر کے بڑے بڑے شہروں میں ہرکارے بھیج دیں۔ ماہر ترین جادوگروں کو جمع کر لیں اور حضرت موسیٰ اور جادوگروں کے درمیان کھلا مقابلہ ہو۔

یہاں پردہ گرتا ہے اور پھر جادوگروں کے گروہ نمودار ہوتے ہیں اور عوام الناس مقابلے کے لیے دوڑے آرہے ہیں۔ بادشاہ اور بادشاہ کے حامی عوام جادوگروں کے حق میں نعرے لگاتے آرہے ہیں۔ اب حق و باطل کے درمیان کھلا مقابلہ ہے۔ ایمان اور کفر کے درمیان رسہ کشی شروع ہوتی ہے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٨﴾ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ﴿٣٩﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿٤٠﴾

"چنانچہ ایک روز مقرر وقت پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا "تم اجتماع میں چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے"۔

فرعون کی ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جادوگروں کی حمایت میں لوگوں کے اندر زبردست جوش و خروش پیدا کر رہا ہے۔

هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ (۳۹) لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ (۴۰) "تم اجتماع میں چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین پر ہی رہ جائیں اگر وہ غالب رہے"۔ یعنی کیا تم مقابلے کے دن ضرور آؤ گے اور ہرگز پیچھے نہیں رہو گے۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ جادوگر یہ میدان کس طرح مارتے ہیں اور موسیٰ اسرائیلی کے مقابلے میں مصری کس طرح غالب ہوتے ہیں اور عوام الناس ہمیشہ ایسے معاملات میں جمع ہوا کرتے ہیں لیکن ان کو اصل حقیقت کا پتہ نہیں ہوتا ہے کہ حکمران عوام الناس کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور ان جماعتوں' اور جلسوں اور جلوسوں میں ان کو کس طرح کھلونا بناتے ہیں اور یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ عوام پر وہ جو مظالم ڈھارہے ہوتے ہیں اور جس طرح ان کی پسماندگی کے وہ ذمہ دار ہیں' ان کو ان باتوں پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ وہ موسیٰ اور جادوگروں کے مقابلے میں شغل میلا کریں۔

مقابلے سے قبل جادوگر فرعون کے دربار میں حاضر ہیں۔ وہ یہ یقین دہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں کامیابی حاصل ہوگئی تو ہمیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ یہ فرعون کی جانب سے ایک پختہ وعدہ حاصل کر لیتے ہیں کہ اگر کامیاب ہوئے تو ان کو معقول اجرت کے ساتھ ساتھ شاہی تخت و تاج کا قرب بھی حاصل ہوگا اور تم میرے مقربین میں سے ہو گے۔

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ﴿٤١﴾ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٢﴾

"جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا "ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟" اس نے کہا "ہاں' اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے"۔

یہ ہے پوزیشن کرایہ کے ان معاونین کی جو فرعون پورے ملک سے پیغمبر خدا کے مقابلے کے لیے جمع کر کے لایا ہے۔ اس نے ان کی خدمات چند ٹکوں کے عوض خریدی ہیں۔ان کے سامنے نہ کوئی قومی مسئلہ ہے اور نہ کوئی مقصد اور کوئی نظریہ ہے۔وہ تو صرف اجر اور مفادات کے بندے ہیں۔اور ہر زمان و مکان اور ہر دور میں ہمیشہ سرکش حکمران کرایہ کے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

اور یہ لوگ بھی اپنی چالاکی' شعبدہ بازی اور مہارت اور محنت کی قیمت چکاتے ہیں اور فرعون بھی اس مشکل گھڑی میں ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اجر اور انعامات کا وعدہ کرتا ہے۔وہ وعدہ کرتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ میرے مقرب ہوں گے اور اپنے آپ کو وہ بادشاہ اور الٰہ اور حاکم سمجھتا ہے۔

---ooo---

اب آیئے میدان مقابلہ کی طرف فریقین تیار ہیں اور عوام جمع ہیں۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾ فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾ فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿٤٨﴾ قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٩﴾ قَالُوا لَا ضَيْرَ ۖ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا أَن كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥١﴾

۳ ع ۱۸ ۷

"موسیٰ نے کہا "پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے"۔ انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے "فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے"۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ "مان گئے ہم رب العالمین کو موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کے رب کو"۔ فرعون نے کہا "تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا! ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے' میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا"۔ انہوں نے جواب دیا "کچھ پروا نہیں' ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں"۔

یہ منظر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اور پروقار انداز سے شروع ہوتا ہے ۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چونکہ سچائی اور خدائی ہے اس لیے وہ بالکل گھبرائے ہوئے نہیں ہیں ۔ فرعون نے پورے ملک کے ماہرین فن مکار جادوگروں کو بلایا ہوا ہے اور ان کے ساتھ گمراہ اور سادہ لوح عوام الناس کا ایک جم غفیر بھی جمع کر رکھا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سرکاری تیاریوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں کر رہے ۔ حضرت موسیٰ کے اطمینان کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ ان جادوگروں کو موقعہ دیتے ہیں کہ وہ پہلے اپنے کرتب دکھائیں ۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ (۲۶:۴۳) "موسیٰ نے ان سے کہا پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے"۔ حضرت موسیٰ کا انداز تعبیر ہی ایسا ہے کہ وہ ان کے کرتب کو اہمیت نہیں دے رہے ۔ پھینکو جو پھینکنا ہے ۔

اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ (۲۶:۴۳) آپ یہ بات لاپرواہی اور بغیر کسی اہتمام کے کہتے ہیں ۔ چنانچہ جادوگروں نے اپنی پوری مہارت' اپنی پوری استادی اور اپنی پوری مکاری کو کام میں لاکر اور فرعون کے نام کا ورد کر کے اپنی باری کا آغاز کیا۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ (۲۶:۴۴) "انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے' فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے" ۔ یہاں سیاق کلام میں ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی تفصیلات نہیں دی گئیں ۔ سورہ اعراف اور طٰہٰ میں تفصیلات بھی دی گئی ہیں ۔ اس لیے کہ یہاں سیاق کلام حضرت موسیٰ کے گہرے اطمینان کو قائم رکھنا چاہتا ہے ۔ یہاں فوراً حضرت موسیٰ کی پوری کارروائی دکھادی جاتی ہے کیونکہ غلبہ حق اس سورت کا محور اور مضمون ہے ۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (۲۶:۴۵) "پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جارہا تھا"۔ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے ۔ انہوں نے اپنی فن کاری کی آخری صلاحیتیں صرف کی تھیں ۔ انہوں نے ساری عمر اس شعبدہ بازی میں گزاری تھی اور اس میں پوری مہارت حاصل کی تھی ۔ انہوں نے وہ تمام کرتب پیش کر دیئے تھے جو ایک جادوگر کر سکتا ہے ۔ وہ تھے بھی بڑی تعداد میں ہر طرف سے گروہ در گروہ جمع ہو کر آئے تھے ۔ موسیٰ علیہ السلام یکہ و تنہا تھے ۔ ان کے پاس صرف اپنا عصا تھا ۔ یہ عصا ان کی تمام رسیوں اور لاٹھیوں کو ہڑپ کر گیا ۔ (لقف) کا لغوی مفہوم ہے ہڑپ کر لینا یعنی بڑی تیزی سے کسی چیز کو کھالینا ۔ جادوگروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جادو کے ذریعے کوئی عصا کسی چیز کو نگل نہیں سکتا ۔ اس میں تو صرف تخیل اور تنویم ہوتی ہے لیکن عصا نے تو درحقیقت تمام پھینکی ہوئی اشیاء کو کھالیا ۔ کسی چیز کا نام و نشان میدان میں نہ تھا ۔ اگر جادو ہوتا تو جادو کے اثر کے بعد تخیل کے عمل کے اختتام پر اشیاء کو موجود ہونا چاہئے تھا ۔ انہوں نے جب دیکھا کہ میدان میں عملاً کچھ نہیں ہے --- ان کو یقین ہوگیا کہ حضرت موسیٰ تو ہرگز جادوگر نہیں ہیں ۔ وہ پیغمبر برحق ہیں اور اس سچائی کو اس دنیا میں بہترین طور پر جاننے والے یہی جادوگر تھے ۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِينَ (٢٦ : ٤٦) قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ (٢٦ : ٤٧)

رَبِّ مُوسٰى وَهٰرُونَ (٢٦ : ٤٨) "اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین کو' موسیٰ اور ہارون کے رب کو"۔ ایک ہی لمحہ قبل وہ کرایہ کے لوگ تھے اور فرعون کے ساتھ وہ اپنی مہارت اور اجرت کا مول تول کر رہے تھے۔ نہ وہ کوئی نظریہ رکھتے تھے اور نہ ان کے پیش نظر کوئی نصب العین تھا۔ لیکن اب ان کے دلوں تک جو سچائی پہنچ گئی اس نے ان کو پوری طرح بدل دیا۔ اس واقعہ نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی دینی دنیا میں ایک زلزلہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے جو سچائی دیکھی وہ ان کے دلوں کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے ان کے دل پر تمام پردے زائل کر دیئے اور گمراہی کی جو تہیں ان کے دلوں پر جمی ہوئی تھیں' وہ صاف ہو گئیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر موسیٰ صرف جادوگر ہوتے تو ان کی رسیاں اور ڈنڈے کہیں بھی نہ جاتے۔ ان چیزوں کے اندر ان کے جادو سے ہلچل تو پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ غائب نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ ان کا دل صاف ہو گیا اور ان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بغیر ارادہ کے سجدے میں گر جائیں۔ ایمان کا اظہار کر دیں اور صاف صاف اظہار کر دیں۔

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ (٢٦ : ٤٧) رَبِّ مُوسٰى وَهٰرُونَ (٢٦ : ٤٨) "مان گئے ہم رب العالمین کو جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے"۔ انسانی دل کی دنیا بھی عجیب ہے۔ ایک لمحے میں اس کی دنیا بدل سکتی ہے۔ ایک نظر میں اس میں انقلاب آ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی سچ فرمایا۔ "جو دل بھی ہے وہ رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے' اگر اللہ چاہے تو اسے سیدھا رکھے اور اگر چاہے تو گمراہ کر دے (ٹیڑھا) کر دے"۔ یوں جادوگر جو اجر کے طلبگار اور کرایہ کے لوگ تھے وہ برگزیدہ مومن بن گئے۔ اور یہ فرعون اور اس کے جبار و قہار کے ساتھیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور فرعون کے جمع کردہ عوام الناس کے جم غفیر کا بھی انہوں نے کوئی لحاظ نہ رکھا۔ وہ ان نتائج کی پرواہ کیے بغیر ہی مسلمان ہو گئے جن کی توقع ان کو جابر و ظالم فرعون سے تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ پر ایمان لانا اور اس طرح علی الاعلان لانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کون کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

حالات نے اچانک جو پلٹا کھایا' ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کے سرداروں پر تو بجلی گر گئی۔ کیونکہ لوگ سب جمع تھے۔ ان کو خود فرعون اور اس کے اہلکاروں نے جمع کیا تھا تاکہ وہ موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ دیکھ لیں۔ انہوں نے عوام کے اندر یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ موسیٰ اسرائیلی ایک بہت بڑا جادو لے کر آیا ہے اور وہ جادو کے زور پر ہماری حکومت کو ختم کر کے اپنی قوم کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہ حکومت نے بڑے بڑے جادوگروں کو جمع کر کے اس کے مقابلے کا انتظام کیا ہے۔ ہمارے جادوگر اس پر غالب ہوں گے اور اس کا قلع قمع کر دیں گے۔ یہ لوگ جمع ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ موسیٰ اللہ کا نام لے کر آتا ہے اور جادوگر عزت فرعون کے عنوان سے میدان میں آتے ہیں۔ یہ شکست کھاتے ہیں اور اپنی شکست کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ وہ فوراً حضرت موسیٰ کی رسالت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے سچے نبی ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب کو مانتے ہیں۔ یہ فرعون کی بندگی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار

پھینکتے ہیں' جبکہ ایک لمحہ قبل وہ فرعون کے سپاہی اور خدمت گار تھے اور اس کی جانب سے انعام کے طلبگار تھے اور اپنا کام انہوں نے عزت فرعون کے عنوان سے شروع کیا تھا۔

حالات کے اندر یہ اچانک انقلاب فرعون کے اقتدار کے لیے خطرہ تھا کیونکہ اب وہ افسانہ ہی ختم ہو گیا جس کی اساس پر فرعون کا اقتدار قائم تھا یہ کہ فرعون الہ ہے بلیں معنی کہ وہ خدا کی اولاد میں سے ہے۔ اور یہ جادوگر دین فرعون کے مذہبی راہنما تھے کیونکہ اس دور میں تمام کاہن جادوگر ہوتے تھے اور یہ تمام جادوگر اسی رب العالمین پر ایمان لے آئے ہیں جو ہارون اور موسیٰ کا رب ہے' جہاں تک جمہور عوام کا تعلق ہے وہ ہمیشہ مذہبی راہنماؤں کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ عقائد انہی مذہبی راہنماؤں سے لیتے ہیں۔ اب فرعون کے اقتدار کے لیے وجہ جواز اور سہارا صرف قوت رہ گئی اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ محض قوت کے بل بوتے پر کسی اقتدار کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

ہمیں چاہئے کہ ہم ذرا اچھی طرح اندازہ کرلیں کہ اس صورت حال سے فرعون کس قدر بوکھلایا ہو گا اور اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے حاشیہ نشینوں کی حالت کیا ہو گئی ہو گی کہ جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ جادوگر ایمان لے آئے اور ایسا ایمان کہ ایمان لاتے ہی وہ رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اعتراف حق کر کے اللہ کی طرف یکسو ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس صورت حال کو دیکھ کر فرعون پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں اعلان کر دیتا ہے کہ تم سازشی ہو تمہیں سخت ترین سزا دی جائے گی۔ پہلے تو اس نے یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے لیے حصول اقتدار کی سازش کر رہے ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ

(۲۶: ۴۹) "فرعون نے کہا' تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا۔ ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا ابھی تمہیں معلوم ہو جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا۔ اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا"۔ تم میری اجازت کے بغیر میرے مشورے کے بغیر ہی موسیٰ کی بات مان کر سجدہ ریز بھی ہو گئے۔ یہاں اس نے یہ نہیں کہا اٰمَنْتُمْ بِهٖ "تم اس پر ایمان لائے"۔ بلکہ اس نے اٰمَنْتُمْ لَهٗ کہا یعنی تم نے اس کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا اور میری اجازت کے بغیر۔ جس طرح کوئی شخص جنگی چال چلتا ہے' اپنے ارادے کا مالک ہوتا ہے' وہ اپنے ہدف کو جانتا ہے۔ اور اپنے انجام کا اندازہ کرتا ہے۔ ایسا شخص جو ہر کام منصوبہ بندی سے کرتا ہے وہ اس قدرتی لمحے اور اس قدرتی ٹچ کو نہیں سمجھ سکتا جس کی گرفت میں جادوگروں کے دل آ گئے۔ سرکش حکمران ایسے لمحات کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ان کے دل پتھر ہو جاتے ہیں اور وہ ایسے روشن لمحات سے محروم ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرعون بڑی تیزی سے ان پر الزام لگاتا ہے اور عوام الناس کو لائن دیتا ہے کہ ان جادوگروں کے اندر کیوں اس قدر عظیم انقلاب آیا۔

إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (۲۶: ۴۹) "ضرور' یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا" ۔ فرعون نے یہ عجیب الزام لگایا ہے ۔ موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے' الا یہ کہ یہ جادوگر جب کاہن تھے اور موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر میں پل رہے تھے تو شاید اس زمانے میں کاہن موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دیتے ہوں گے ۔ یا موسیٰ علیہ السلام ان کی عبادت گاہوں میں جاتے ہوں گے ۔ اس تعلق کی بنا پر اس نے یہ الزام لگایا پھر بجائے اس کے کہ یہ ان کو کہتا کہ موسیٰ تمہارا شاگرد ہے اس نے یہ الزام لگا دیا کہ یہ تمہارا بڑا استاد ہے ۔ عوام الناس کے ذہن میں وہ موسیٰ علیہ السلام کو ملک کے لیے خطرہ ثابت کرنا چاہتا ہے ۔

اس کے بعد وہ صراحت کے ساتھ ان کو شدید عذاب کی دھمکی دیتا ہے کہ اچھا انتظار کرو' میری طرف سے سزا کا ۔

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ (۲۶: ۴۹) "اچھا ابھی تمہیں معلوم ہو جاتا ہے ۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا" ۔ یہ ہے وہ حماقت جس کا ارتکاب ہر سرکش ڈکٹیٹر کیا کرتا ہے ۔ اور یہ وہ اس وقت کرتا ہے جب اس کی کرسی اور اقتدار کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اور اس کی ذلت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ۔ اور اس میں وہ خود اپنے ضمیر کی ملامت کی بھی پرواہ نہیں کرتا ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سزا فرعون سنا رہا ہے جس کا یہ لفظ قانون ہے اور اسی وقت نافذ کر دیا جاتا ہے ۔ اب ذرا اس گروہ مومن کی بات بھی سن لیں جس نے روشنی کو دیکھ لیا ہے ۔

یہ اس دل کی بات ہے جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور اس معرفت کے بعد اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اب اس کا کیا ہوگا ۔ یہ ایسے دل کی بات ہے جس نے اللہ تک رسائی حاصل کر لی ہے اور ایمان کا ذائقہ چکھ لیا ہے ۔ اس لیے وہ ڈکٹیٹر اور سرکش حکمران کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور یہ ایک ایسے دل کی پکار ہے جو آخرت کا طلبگار ہے اور اس لیے اسے اس دنیا کے فائدے کی کوئی پرواہ نہیں رہتی ۔ خواہ قلیل ہو یا کثیر ۔

قَالُوا لَا ضَيْرَ إِنَّا إِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ (۲۶: ۵۰) إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا أَنْ كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶: ۵۱) "انہوں نے جواب دیا کچھ پروا نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں" ۔ کچھ پروا نہیں ہے ۔ ہمیں اس بات کی اب کوئی فکر نہیں ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں ۔ تشدد اور سولی کی سزا کی بھی کوئی پروا نہیں ہے ۔ موت اور شہادت سے ہم نہیں ڈرتے ۔ ہمیں تو ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے' اگر ہم مر گئے تو ہم اپنے رب کے پاس چلے جائیں گے ۔ آخر اس زمین کی زندگی میں رکھا کیا ہے؟ ہمارا مطمح نظر تو اب یہ ہے ۔

أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا (۲۶: ۵۱) "کہ ہمارا رب ہماری خطائیں معاف کر دے" ۔ اور یہ خطائیں اس اعزاز کی وجہ سے معاف کر دے کہ

اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶: ۵۱) "یہ کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بن گئے"۔ اب ہمیں سابقین اولین کا درجہ حاصل ہے۔

اے اللہ! کیا ہی شان ہے ایمان کی جب یہ ضمیر کی دنیا کو منور کر دے۔ جب اس کا فیضان روح پر ہو جائے۔ جب کاسہ قلب مومن ایمان سے بھر جائے تو مٹی کا یہ کالبد اعلیٰ علیین کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ دل غنی ہو جاتا ہے۔ دلوں کے اندر دولت ایمان جمع ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں کہ روئے زمین کی سب دولت ہیچ نظر آتی ہے۔

اب سیاق کلام میں پھر ایک بار پردہ گرتا ہے اور جادوگروں کے روشن ضمیر کا یہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ تاکہ ان سابقین اولین کا یہ گہرا اثر قاری کے دل میں بحال رہے۔ لوگ سوچیں کہ اہل مکہ اہل ایمان پر جو مظالم ڈھا رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں اہل ایمان اس قسم کے مظالم برداشت کرتے چلے آئے ہیں۔

اب اہل ایمان کے خلاف فرعون کی تدابیر کا ایک منظر اور اہل ایمان کے لیے اللہ کی راہنمائی کا ایک منظر:

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ۝ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ۝ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ۝ وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ۝

"ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ "راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ' تمہارا پیچھا کیا جائے گا"۔ اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں نقیب بھیج دیئے (اور کہلا بھیجا) کہ "یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں' اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے' اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے"۔

اب یہاں واقعات اور زمانے کے اعتبار سے ایک بڑا اور طویل خلا ہے۔ بیچ میں سے طویل زمانے اور واقعات کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ اس مقابلے کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام بھی مصر میں کام کرتے رہے۔ اور سورت اعراف میں جن دوسرے معجزات کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اس عرصہ میں رونما ہوئے اور آخر کار وہ وقت آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جائیں۔ لیکن اس سورت میں ان تمام واقعات کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے اور قصہ موسیٰ کے ان حصوں کو یہاں لے لیا جاتا ہے جو اس سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی اجازت دے دی کہ آپ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں۔ تمام بنی اسرائیل رات کو نکلیں۔ اس سفر کے لیے نہایت منظم خفیہ انتظامات کیے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع بھی کر دی گئی کہ فرعون ہر حال میں تمہارا پیچھا کرے گا۔ اور ساحل سمندر کی طرف نکل کھڑے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس جگہ ساحل سمندر تک پہنچے وہ خلیج سویز اور چھوٹے چھوٹے بحیروں کے موجودہ علاقے میں یہ واقع تھا۔

فرعون کو خفیہ طور پر اطلاعات مل گئیں کہ بنی اسرائیل نکلنے والے ہیں۔ تو اس نے بھی اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ جس وقت بھی خروج شروع ہو' پیچھا کرنے کے لیے افواج کو تیاری کی حالت میں رکھا جائے۔ تمام علاقوں میں اس نے اپنے ہرکارے بھیج دیئے کہ افواج کو تیار کیا جائے کہ یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے۔ یہ بچ نکلنے کی تدبیریں سوچ رہا ہے لیکن اسے پتہ نہ تھا کہ یہ خروج اللہ تعالیٰ کی طرف سے منظم کیا جا رہا ہے۔

فرعون کے لوگ فوجوں کو تیار کرتے رہے لیکن عوام کے اندر یہ بے چینی پیدا ہو سکتی تھی کہ آخر موسیٰ کے پاس کتنی بڑی طاقت ہے کہ اس کے مقابلے میں اس قدر وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں جبکہ فرعون اپنے آپ کو الٰہ بھی کہتا ہے اور پھر بھی ایک پبلک کے فرد کے مقابلے پر اس قدر جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر فرعون کو اس قسم اعلان کی ضرورت پیش آئی۔

اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ لَشِرْ ذِمَۃٌ قَلِیْلُوْنَ (۲۶ : ۵۴) "یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں"۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر ان کے خلاف اس قدر انتظام کیوں ہو رہا ہے اور فوجیں کیوں جمع کی جا رہی ہیں اگر وہ مٹھی بھر لوگ ہیں"۔

وَ اِنَّھُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ (۲۶ : ۵۵) "اور انہوں نے ہم کو بہت ہی ناراض کیا ہے"۔ یہ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو ہمارے سامنے کسی نے نہیں کیے' اس لیے ان کی وجہ سے ہم غیظ و غضب میں جتلا ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر جوش انتقام پیدا ہو گیا ہے۔

اگرچہ یہ لوگ نہایت ہی خطرناک ہیں اور ان کی تحریک ایک مضبوط تحریک ہے۔ لیکن سرکاری لوگ عوام سے یہی کہیں کہ حکومت نے مکمل احتیاطی تدابیر اختیار کی ہوئی ہیں اور ان پر نظر رکھی ہوئی ہے۔

وَ اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ (۲۶ : ۵۶) "اور ہم ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہمیشہ چوکنا رہنا ہے"۔ اور ہم ان کی سازشوں کے مقابلے میں بیدار ہیں۔ ان کے معاملات میں بڑی احتیاط برت رہے ہیں اور ان کو اچھی طرح کنٹرول کر رہے ہیں۔ جب بھی اہل باطل کا اہل ایمان سے مقابلہ ہوتا ہے تو اہل باطل اہل ایمان کے مقابلے میں اسی طرح حیران و پریشان ہوتے ہیں۔

---ooo---

قبل اس کے کہ آخری منظر پیش کیا جائے' یہاں قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ فرعونیوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان نعمتوں' ان باغات اور مکانات عالی شان اور اس عیش و عشرت سے نکال دیا اور یہ مقام اختیار و اقتدار بنی اسرائیل جیسے مستضعفین کو دے دیا۔

فَاَخْرَجْنٰھُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۵۸﴾
كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰھَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۵۹﴾

"اس طرح ہم انہیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے۔ یہ تو ہوا ان کے ساتھ ' اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا"۔

یہ لوگ تو اس لیے نکلے کہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کا تعاقب کریں اور انہیں گرفتار کریں مگر اپنے گھروں سے ان کا یہ خروج آخری خروج تھا۔ یہ دراصل اللہ کی اسکیم میں ان کے لیے ان انعامات اور عیاشیوں سے اخراج تھا' جن میں وہ تھے ' اعلیٰ سہولتوں' عزت کے مقامات اور خوشحالی اور باغات و محلات سے اخراج تھا۔ اس کے بعد یہ پھر ان مقامات کی طرف واپس نہ آئے اور یہ تھی ان کی سزا ان مظالم کی وجہ سے جو یہ غریبوں پر ڈھاتے تھے۔

وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲٦: ۵۹) "اور دوسری طرف ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث کر دیا"۔ تاریخ میں تو اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ یہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے بعد دوبارہ مصر میں داخل ہوئے تھے اور مصر کے باغ و راغ اور مال و منال پر قابض ہوگئے تھے۔ اس لیے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا مال و اقتدار ان کو دے دیا گیا جس طرح فرعونیوں کو دیا گیا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ ایک قوم کو زوال دیا اور دوسری کو عروج اور اس عروج میں وہ اگلی قوم کی وارث ہوگئی۔ پہلے مقام کریم اس کے پاس تھا اب اس کے پاس ہے۔

---000---

اور اس عمرانی سزا کے بعد اب ان کی جسمانی سزا اور آخری انجام کا ذکر آتا ہے۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾ وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٦﴾

"صبح ہوتے ہی یہ لوگ ان کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے کہ "ہم تو پکڑے گئے"۔ موسیٰ نے کہا "ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا"۔ ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ مار اپنا عصا سمندر پر"۔ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے 'ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندوں کو لے کر رات کے وقت نکل پڑے۔ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی اور ہدایت کے مطابق۔ صبح کے وقت جب فرعون نے دیکھا کہ بنی اسرائیل بھاگ گئے ہیں تو وہ اپنی فوجیں لے کر تعاقب میں نکلا۔ اس تعاقب کے لیے فرعون نے بڑی سخت تدابیر اختیار کر رکھی تھیں اور ان کو پکڑنے کا زبردست انتظام کیا تھا۔ اب یہ منظر اپنی انتہا

اور انجام کی طرف بڑھ رہا ہے - یہ معرکہ اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا - حضرت موسیٰ اور ان کی قوم ساحل پر پہنچ گئی ہے - وہاں کوئی کشتی نہیں ہے - بنی اسرائیل نہ سمندر عبور کر سکتے ہیں اور نہ فرعون کے ساتھ جنگ کے لیے کچھ سامان ہے - اور فرعون ان کا تعاقب نہایت سازوسامان سے کر رہا ہے اور انہیں گرفتار کرنے کی بے رحمانہ اسکیم اس نے تیار کی ہوئی ہے -

بظاہر حالات یہی بتاتے ہیں کہ اب ان کے بھاگ نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے - آگے سمندر ہے اور پیچھے سے دشمن بڑھا چلا آرہا ہے -

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰىٓ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (۲۶ : ۶۱) "موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے" - اہل ایمان کی بے چینی اب انتہا کو پہنچ گئی ہے - اب تو چند منٹوں کی بات ہے کہ لشکر فرعون انہیں قتل کرے یا گرفتار کرے - اور اس سے بظاہر چھوٹ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے -

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رابطہ تو عالم بالا سے قائم تھا - وحی مسلسل آرہی تھی - ان کا کاسہ دل اطمینان سے لبالب تھا - پوری طرح یقین تھا کہ اللہ کوئی صورت نکالنے والا ہے - مدد کی کوئی سبیل نکل آئے گی - اللہ کا وعدہ ہے کہ نجات ملے گی - اگرچہ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ بات کیا ہو گی - البتہ یقین تھا کہ نجات یقینی ہے - کیونکہ یہ سب منصوبہ اللہ کا تیار کردہ ہے -

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۲۶ : ۶۲) "موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے ' وہ ضرور میری راہنمائی فرمائے گا" - لفظ کلا ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے ' جہاں شدید تاکید کے ساتھ نفی مطلوب ہو - یعنی تم ہرگز نہ پکڑے جاؤ گے اور تم ہرگز کسی فتنے میں نہ پڑو گے - ہرگز اللہ تمہیں ضائع نہ کرے گا - میرے ساتھ میرا رب ہے ' وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا - حضرت موسیٰ بڑی تاکید ' اعتماد اور یقین کے ساتھ بات کرتے ہیں - مایوسی کے ان اندھیروں میں اچانک روشنی کی ایک کرن نمودار ہوتی ہے - نجات کی راہ اس طرف سے ملتی ہے جس طرف سے کوئی امید نہ تھی -

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰىٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶ : ۶۳) "ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ "مار اپنا عصا سمندر پر" - اب سیاق کلام میں آگے یہ نہیں کہا جاتا کہ انہوں نے اپنا عصا سمندر پر مارا بلکہ نتیجہ ہی جلدی سے ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے -

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (۲۶ : ۶۳) "یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی طرح ہو گیا" - یہ معجزہ واقع ہو گیا اور لوگ جس بات کو محال کہتے تھے ' وہ ہو گئی کیونکہ ان کا قیاس تو روز مرہ کے معمول کے واقعات پر تھا - اور یہ روز مرہ کے واقعات بھی تو اللہ کی قدرت کے پیدا کردہ اصولوں کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور یہ ان اصولوں کے مطابق تب تک چلتے ہیں جب تک اللہ چاہتا ہے - اللہ کا حکم یوں ہوا کہ پانی راستوں کے دونوں طرف تودوں کی طرح کھڑا ہو گیا - بنی اسرائیل گھس کر دریا پار کر گئے -

فرعون اپنی افواج کے ساتھ دوسری جانب ششدر کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے ساتھ یہ معجزہ دیکھا۔ لازم ہے کہ کچھ دیر کے لیے تو وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہو گا۔ وہ دیکھ رہا ہو گا کہ موسیٰ اور ان کی قوم وہ گئے اور پار ہو گئے۔ اس نے بہرحال اپنی افواج کو اس راستے میں گھس جانے سے قبل سوچا تو ہو گا کیونکہ یہ ایک عجیب عمل تھا۔

اللہ کی اس تدبیر سے بنی اسرائیل دوسری طرف نکل گئے۔ ابھی تک پانی دو ٹکڑے ہی تھا۔ اور فرعون اور اس کا لشکر پانی کے اندر ہی تھے کہ اللہ نے ان کا انجام قریب کر دیا۔

وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (٦٤) وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰي وَ مَنْ مَّعَهٗ اَجْمَعِيْنَ (٦٥) ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ (٦٦)(٢٦: ٦٤ تا ٦٦) "اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے 'ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا"۔ یہ معجزہ ایک عرصہ تک لوگوں کی زبان پر رہا۔ صدیوں تک وہ اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ کیا اس پر زیادہ لوگ ایمان لے آئے؟

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

"اس واقعہ میں ایک نشانی ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں"۔

اس لیے اگر خارق عادت معجزات کا صدور بھی ہو جائے تو نہ ماننے والے پھر بھی نہیں مانتے۔ اگرچہ بظاہر لوگ لاجواب ہو جائیں 'کیونکہ ایمان تو ایک ہدایت ہے اور ہدایت وہ ہوتی ہے جسے دل قبول کرے۔

۴
ع ۱۷
۸

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

"اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔ یہ پوری سورت کا سبق اور محور ہے کہ معجزات اور آیات پیش کرنے کے بعد 'اگر لوگ تکذیب پر اصرار کریں گے تو اللہ بھی عزیز ہے"۔

---ooo---

درس نمبر ۱۶۳ ایک نظر میں

حضرت موسیٰ' فرعون اور سرداران فرعون کی کہانی آپ لوگوں نے سنی اور اس کا انجام دیکھ لیا۔ اس قصہ میں مکہ میں رہنے والے کمزور اور مظلوم اہل ایمان کے لیے ایک قسم کی بشارت تھی 'کہ جس طرح بنی اسرائیل پر ظلم ہوا اسی طرح آج مکہ کی جماعت قلیلہ بھی مظلوم ہے۔ مشرکین مکہ کا رویہ بھی بعینہ اسی طرح ہے جس طرح فرعونیوں کا تھا اور ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جو فرعونیوں کا ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اب ذرا اور پیچھے جاکر حضرت ابراہیم اور ان کی قوم کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو یہاں لایا جاتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کے سامنے ذرا اس قصے کو پڑھو۔ اس لیے کہ اہل مکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جانشین اور پیروکار ہیں۔ یہ دین ابراہیم پر ہیں۔ حالانکہ کعبہ میں انہوں نے بت رکھے ہوئے ہیں اور بیت الحرام کے اندر جسے حضرت ابراہیم نے صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا۔ انہوں نے بت کھڑے کر رکھے ہیں' ذرا ان کو حضرت ابراہیم کے یہ افکار وعقائد بھی پڑھ کر سنائیں۔

اس سورت میں قصص تاریخی ترتیب کے مطابق نہیں ہیں۔ کیونکہ اس سورت میں قصص مختصر برائے عبرت آموزی لائے گئے ہیں جبکہ اس سے قبل سورت اعراف میں یہی قصص تاریخی ترتیب کے ساتھ لائے گئے تھے۔ وہاں موضوع سخن یہ تھا کہ زمین کی وراثت ہمیشہ اللہ کے صالح بندوں کو دی جاتی رہی ہے۔ اس لیے وہاں قصص کا تاریخی پہلو بھی پیش نظر تھا۔ یعنی آدم علیہ السلام کے نزول' زوجیت اور انسانیت کا تاریخی سفر اور اس میں سنت الہیہ کا کام۔

یہاں حضرت ابراہیم کے قصے کی وہی کڑی پیش کی جارہی ہے جس میں وہ اپنی قوم کے سامنے دعوت پیش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نظریاتی مکالمہ کرتے ہیں اور قوم کے لوگ جن الہوں کو مانتے ہیں آپ ان کا انکار کرتے ہیں اور ان کو یہ بتاتے ہیں کہ میری بندگی اور عبادت کا رخ تو صرف اللہ وحدہ کی طرف ہے۔ اور یہ کہ میں پوری زندگی میں قیامت کو پیش نظر رکھ کر عمل کرتا ہوں۔ اور اس موقعہ پر قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی پیش کر دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن ان بتوں اور الہوں کی بندگی کرنے والے لوگ الہوں کی مذمت کریں گے اور شرک کے ارتکاب پر سخت نادم ہوں گے۔ یہ منظر یوں نظر آتا ہے کہ گویا یہ لوگ عملاً قیامت میں ہیں۔ چنانچہ مشرکین مکہ کے لیے اس قصے میں سامان عبرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصے میں عقیدۂ توحید کو ورا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور عقیدۂ شرک کے فساد کو بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن ان مشرکین کا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ مقصد اور محور یہی ہے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہونے والا ہے' اس لیے قصے کے دوسرے واقعات جو دوسری سورتوں میں مفصل بیان ہوئے یہاں نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی بعض کڑیاں سورہ بقرہ' سورہ انعام' سورہ ہود' سورہ ابراہیم' سورہ

انجز' سورہ انبیاء اور سورہ حج میں دی گئی ہیں۔ ہر سورت میں یہ قصہ سیاق کلام کی مناسبت سے دیا گیا ہے اور سورت کی جو نصائح تھیں اور اس کے موضوع کے اعتبار سے جو سبق دینا مطلوب تھا وہ دیا گیا۔

سورہ بقرہ میں قصے کا وہ حصہ دیا گیا جس میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام خانہ کعبہ تعمیر کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ اس گھر کو پرامن بنا دے کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آئیں اور یہ کہ اس گھر کی وراثت اور امامت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو مسلمان ہوں گے۔ جو حضرت ابراہیم کی ملت کے پیرو ہوں گے۔ وہ لوگ وارث نہ ہوں گے جو محض نسبت کے اعتبار سے ابراہیمی ہوں گے اور یہ قصہ اس لیے لایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کی خلاف ورزیاں ان کو اللہ کی طرف سے سزائیں اور ملعون کیے جانے کے اسباب بتائے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ دنیا کی قیادت بنی اسرائیل سے لے کر کیوں مسلمانوں کو دی گئی۔

سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم اور وقت کے مشرک بادشاہ کے ساتھ آپ کا مناظرہ بھی نقل کیا گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت' حاکمیت اور تخلیق پر بحث کی گئی ہے اور حضرت ابراہیم نے اسے بتایا کہ تخلیق بذات خود معجزہ ہے جب وہ نہ سمجھا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا تو سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھاؤ تو تب وہ مبہوت الحواس ہو گیا۔

پھر' خود آپ نے رب سے درخواست کی کہ اے اللہ' ذرا معجزہ تخلیق کا عملی مشاہدہ کرائیں۔ چنانچہ چار پرندے ذبح ہوئے' ان کے گوشت کو پہاڑوں پر تقسیم کیا گیا۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور یہ پرندے اڑ کر آئے اور اس طرح اس بادشاہ اور کافر لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ ہیں معجزات الٰہیہ اور اللہ وہی ہے جو جلانے اور مارنے والا ہے۔

سورہ انعام میں ان کی جانب سے سورج اور چاند اور دوسرے پوجے جانے والے مظاہر پر غور کا قصہ لایا گیا ہے۔ یہ ستارے اور شمس و قمر بھی کیا الٰہ ہو سکتے ہیں؟ یہ کڑی اس سورت میں دی گئی جس کا موضوع عقیدۂ توحید اور نظریاتی مسائل ہیں۔ اور جس میں لوگوں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ یہ پوری کائنات اور اس کے مناظر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس کا پیدا کرنے والا وحدہ لاشریک ہے۔

سورت ہود میں حضرت اسحاق کی خوشخبری والا حصہ ہے' یہ قصہ لوط کے لیے تمہید کے طور پر لایا گیا ہے کیونکہ ملائکہ کا اصل ٹارگٹ قوم لوط تھی۔ راستے میں وہ حضرت ابراہیم کے پاس بھی ٹھہرے۔ اس قصے میں یہ بتانا مقصود تھا کہ اللہ اپنے سچے بندوں کی نگرانی اور نصرت کس طرح کرتا ہے۔

اور سورہ ابراہیم میں اولاد کو مکہ میں بسانے کے بعد ان کے لیے دعا کرنے کا حصہ لایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی اولاد کو وادی غیرذی ذرع میں بٹھا کر جا رہے ہیں۔ بڑھاپے میں اسحاق اور اسماعیل کی ولادت کا شکریہ یہ ہے کہ وہ دین کا کام کریں۔ اور یہ دعا ان کے لیے کی گئی کہ اے اللہ' میری اولاد نماز قائم کرنے والی ہو۔ اور یہ کہ اے اللہ اس دعا کو قبول فرما اور مجھے اور میرے والدین کو یوم الدین میں بخش دے۔ اس سورت میں انداز کلام یوں تھا کہ تمام رسول ایک امت ہیں۔ ایک جماعت ہیں اور ان کا مشن بھی ایک ہے یعنی عقیدۂ توحید۔ کام بھی ایک ہے اور انجام بھی ایک ہے۔ سب ایک صف میں کھڑے ہیں۔ ایک ہی بات کرتے ہیں۔ گویا کفر و انکار کے تپتے ہوئے صحرا میں صرف ایک ہی سایہ دار درخت ہے یعنی شجرۂ نبوت۔ اور لوگوں کو اگر آرام مل سکتا ہے تو اس درخت کے زیر سایہ مل سکتا ہے۔

سورہ حجر میں بھی وہی حصہ مذکور ہے جو ہود میں لایا گیا تھا۔ البتہ مجرمین کی قدرے تفصیلات ہیں اور اس میں یہ بتایا

گیا ہے کہ اللہ اپنے مومن بندوں پر رحمتوں کی بارش کرتا ہے اور مخالفین تحریک اسلامی اور مکذبین پر ہمیشہ اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

اور سورہ مریم میں وہ حصہ ہے جس میں آپ اپنے باپ کے ساتھ نہایت ہی نرمی سے پیش آتے ہیں جبکہ باپ ان پر سختی کرتا ہے۔ اور آپ نہایت ہی خوش اسلوبی سے قوم اور والد کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر اللہ آپ کو اسماعیل اور اسحاق دیتا ہے۔ اس پوری سورت کا مضمون بھی ایسا ہے کہ اللہ اپنے منتخب اور برگزیدہ بندوں کو نوازتا رہتا ہے اور ان کے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کرتا ہے۔

سورہ انبیاء میں قصے کا وہ حصہ پیش کیا گیا ہے جہاں آپ اپنے والد اور قوم کو دعوت دیتے ہیں۔ بتوں کے توڑنے کا واقع' آپ کو آگ میں پھینکے جانے کا واقعہ' اور آگ کا ٹھنڈا اور پرسکون ہونے کا واقعہ' اور آپ اور آپ کے بھتیجے کو ان لوگوں سے نجات دلا کر ارض برکت فلسطین کی طرف نکال لے جانے کا واقعہ۔ اور یہ سب بات تمام انبیاء کے اس مسلسل بیان کے ضمن میں ہے کہ اللہ نے گروہ انبیاء کی ہمیشہ نصرت کی اور تمام انبیاء نے اس اللہ کی عبادت کی جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جبکہ سورت حج میں یہ حکم دیا گیا کہ اس گھر کو یہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھو۔

---ooo---

درس نمبر ۱۶۳ تشریح آیات

۶۹---تا--- ۱۰۴

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٧٠﴾

"اور انہیں ابراہیم کا قصہ سناؤ جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ "یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو"۔

ان کے سامنے حضرت ابراہیم کا قصہ پیش کرو۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ابراہیم کے وارث ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ابراہیم کے والد بھی تو بت پرست تھے اور انہوں نے تو والد کے فعل بت پرستی پر سخت مواخذہ کیا تھا۔ پھر تم بت پرست کس طرح بن گئے۔ وہ تو بت پرستی اور شرک کے مسئلے پر ہی اپنے والد اور قوم سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے والد اور قوم کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ بت پرستی کھلی گمراہی ہے کس قدر سخت لہجے میں ما تعبدون (۲۶: ۷۰) "یہ کیا چیزیں ہیں جنہیں تم پوجتے ہو"۔

قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ﴿٧١﴾

"انہوں نے جواب دیا "کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں"۔ یہ لوگ اپنے بتوں کو الہ کہتے تھے لیکن قرآن کریم نے ان کی زبانی ان کے لیے اصنام کا لفظ بھی نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ یہ بت پتھروں سے گھڑے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ان بتوں کی عبادت اور تعظیم میں لگے ہوئے ہیں اور یہ ان کے عقائد کی ایک عام کمزوری تھی لیکن جب عقائد اور خیالات بگڑ جاتے ہیں، تو پھر جن لوگوں نے ان بگڑے ہوئے عقائد کو سینے سے لگا لیا ہوتا ہے وہ سمجھ نہیں سکتے کہ ان کا یہ رویہ ان کو کس قدر ذلتوں اور کس قدر پستیوں تک گرا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے غافل دلوں کو جگاتے ہیں، ان کی عقل سے اپیل کرتے ہیں کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ کس حد تک تم گر گئے ہو اور کیا کیا حماقتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہو۔ بغیر سوچے اور سمجھے کے۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾

"اس نے پوچھا "کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو' یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں"۔

کسی الٰہ کی کم از کم جو خاصیت ہونا چاہیے' کہ وہ سنے اور سوال و جواب کرے۔ کم از کم کوئی اپنے اس بندے جیسا تو ہونا چاہیے جو اس کی عبادت کر رہا ہے اور اس کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ یہ الٰہ تو نہ سنتے ہیں اور نہ گویا ہیں اور نہ ہی کوئی نفع و ضرر دے سکتے ہیں۔ اگر یہ سن ہی نہیں سکتے' بہرے ہیں تو پھر نفع و نقصان کیسے دیں گے۔ اس لیے ان کو کسی صورت میں پکارنا جائز نہیں ہے۔

لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوالات میں سے کسی کا جواب نہ دیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم ان کے ساتھ سخت مذاق کر رہے ہیں اور ان کے بتوں اور ان کی روش پر تنقید کر رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ ان کا جواب بس یہ تھا جو ہر شخص کا جواب ہوتا ہے جو بے سوچے سمجھے تقلید کرتا ہے۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

"انہوں نے جواب دیا "بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے"۔ بے شک یہ بت تو نہ نفع دیتے ہیں' نہ نقصان اور نہ سنتے ہیں لیکن ہمارے آباء و اجداد سے یہ عمل یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ ہم ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ تو نہایت ہی شرمسار کرنے والا جواب ہے لیکن مشرکین بڑی ڈھٹائی سے یہ جواب دیتے ہیں اور اسی طرح مکہ کے مشرکین بھی یہی کہتے تھے اور کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے بلکہ ان کے لیے ان کے آباء و اجداد کا فعل ہی کافی دلیل تھا۔ مزید بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان لوگوں کی یہ آباء پرستی ہی اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ کہ وہ آباء کے دین کو چھوڑ دیں' یوں وہ آباء و اجداد کی پیروی ترک کر دیں اور بالواسطہ یہ اقرار کر لیں کہ ہمارے آباء گمراہی پر تھے۔ لہٰذا گزرے ہوئے اجداد کے حق میں یہ بات درست نہیں ہے۔ یوں آباء و اجداد کا یہ احترام' بے حقیقت احترام' سچائی کو قبول کرنے کی راہ میں ہمیشہ ایک بڑی رکاوٹ رہا ہے۔ خصوصاً جب لوگ عقلی لحاظ سے جامد اور کورے ہو جاتے ہیں اور ایسے جمود اور وہم پرستی اور آباء پرستی سے لوگوں کو نکالنے کے لیے ان کو بڑا ذہنی جھٹکا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ لوگ آزادانہ غور و فکر سے کام لیں۔

اس جمود اور غفلت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو جگانے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت ابراہیم ان کو ایک سخت جھٹکا دیں حالانکہ حضرت ابراہیم اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت ہی نرم اور سنجیدہ تھے۔ چنانچہ آپ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اچھا میں تو ان کا دشمن ہوں اور ان تمام نظریات کا دشمن ہوں جو اس بت پرستی کی اساس پر اٹھائے گئے ہیں۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷٦﴾

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٧٧﴾

”اس پر ابراہیم نے کہا ”کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہے؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں، بجز ایک رب العالمین کے“۔

یوں انہوں نے اعلان کیا کہ میرا باپ اور میری قوم بھی ان کی پرستش کرتی ہے مگر میں ان عقائد کو نہ صرف ترک کرنے کا اعلان کرتا ہوں بلکہ ان کا دشمن ہوں۔ ان الہوں کا دشمن ہوں، آباء پرستی کا دشمن ہوں اور اپنی پرانی تاریخ اور قدیم سے قدیم ترین اجداد کا دشمن ہوں۔

یوں قرآن مجید اہل ایمان کو تعلیم دیتا ہے کہ سچائی کے مقابلے میں اگر باپ آجائے، قوم آجائے، آباؤ اجداد کی روایات آجائیں سب کو ٹھکرانا لازمی ہے کیونکہ اسلام کے بعد تمام انسانی رابطوں کو کاٹ کر صرف اسلامی رابطہ اور تعلق اپنانا فرض ہے۔ اسلام میں ایمان اور نظریہ کو اولیت حاصل ہے اور باقی سب چیزیں اس کے تابع ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام آباء و اجداد کی روایات کا انکار کرتے ہوئے صرف رب العالمین کی روایات کو مستثنیٰ کرتے ہیں۔

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَٰلَمِينَ (۲۶:۷۷) ”میرے تو یہ سب دشمن ہیں، بجز رب العالمین کے“۔ کیونکہ ان کے آبائے اقدمین میں ضرور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو صرف اللہ کی عبادت کرتے ہوں گے۔ تاریخ کے اس دور میں جب ان کے عقائد فساد کا شکار نہ ہوئے تھے اور ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے رب العالمین کے ساتھ دوسروں کی بندگی بھی کی ہو۔ اس لیے آپ نے غایت درجہ احتیاط کرتے ہوئے یہاں رب العالمین کو مستثنیٰ کر دیا اور یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے سنجیدہ شخص کے لائق تھی کیونکہ آپ یہاں ایمان اور نظریہ پر مکالمہ کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ایمان اور عقیدے اور نظریہ کی بات بڑی نازک ہوتی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام رب العالمین کی صفات بیان کر کے تعارف کراتے ہیں جس کے ساتھ آپ کا رابطہ ہر حال اور ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ وہ ہمارے قریب ہے۔ انسان کی ہر حرکت اور ہر سکون میں وہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کی تمام حاجات اور ضروریات وہ فراہم کرتا ہے۔

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿٧٩﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴿٨٢﴾

”جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ

میری خطا معاف فرما دے گا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنے رب کی جو حمد کی ہے اور اس میں وہ تفصیلات تک چلے گئے ہیں اور تصویر کشی کی ہے' اس سے ہمیں یہ شعور ملتا ہے کہ آپ' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ معرفت رب میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی پوری شخصیت کا خدا کے ساتھ رابطہ تھا۔ وہ نہایت ہی محبت سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور حضرت اپنے رب کی حمد اس طرح کرتے تھے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہے ہوں۔ اور وہ اپنے تمام احساسات' تمام شعور اور وجدان کے ساتھ اور اپنے تمام اعضاء کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم کو پا رہے تھے۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم اور رب العالمین کے تعلق کو جس قدر دھیمے نغمے کے ساتھ یہاں بیان کیا ہے اس سے اس تعلق کی فضا' اس کے آثار اور پرتو اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ میٹھا اور نرم نغمہ اور طویل اور وسیع اثرات۔

الَّذِيْ خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِيْنِ (۲۶:۷۸) "جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری راہنمائی فرماتا ہے"۔ اس نے مجھے پیدا کیا' وہی جانتا ہے اور میں نہیں جانتا کہ کہاں کہاں سے اجزائے جسم جمع ہوئے۔ میری ماہیت اور میری تشکیل سے وہی باخبر ہے۔ میرے فرائض اور میرے شعور کی باریکیوں سے بھی وہی باخبر ہے۔ میرے مال اور میرے مآل سے بھی وہی خبردار ہے۔ فَهُوَ يَهْدِيْنِ (۲۶:۷۸) "پھر وہی تو ہے جو میری راہنمائی فرماتا ہے"۔ اپنی طرف راہنمائی' جس راہ پر مجھے چلنا ہے اس کی نشاندہی' جس نظام کے مطابق مجھے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کی نشاندہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ احساس دے رہے ہیں کہ وہ اس طرح ہیں جس طرح پگھلا ہوا مادہ۔ اس سے صانع جو چاہتا' بنا لیتا ہے۔ جس شکل و صورت میں چاہتا ہے مصنوعات تیار کر لیتا ہے یہ ہے مکمل اطاعت' مکمل سپردگی' مکمل اطمینان' راحت' سکون اور اعتماد ذات باری پر۔

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ (۲۶:۷۹) وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ

(۲۶:۸۰) "جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے"۔ یہ براہ راست کفالت ہے' گہری شفقت ہے' ساتھ رہنے والی محبت ہے' اس کا احساس ابراہیم ہی کر سکتے ہیں۔ صحت میں اور مرض میں حضر میں اور سفر میں' ہر حال میں' بلند آداب نبوت کے ساتھ' جو جانتے ہیں کہ مرض بھی تو اللہ کی مشیت سے آتی ہے۔ نہیں' وہ اس کو اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے حالانکہ مرض و شفا دونوں اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (۲۶:۸۰) میں گہرا احترام ملحوظ ہے۔ کرم کا مقام يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ (۲۶:۷۹) اور يَشْفِيْنَ لیکن ابتلا میں فعل کا اسناد خود اپنی طرف کرتے ہیں۔ یہ ہے مقام ابراہیم۔

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ (۲۶:۸۱) "جو مجھے موت دے گا اور دوبارہ زندگی بخشے گا"۔ ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ موت کا فیصلہ اللہ کرتا ہے اور پھر ایک دن حساب و کتاب کے لیے اللہ ہی اٹھائے گا۔ لہٰذا یہ مکمل تسلیم و رضا کا اظہار ہے۔

وَالَّذِيْ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۲۶:۸۲) "اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزاء میں میری خطا معاف فرمائے گا"۔ حضرت ابراہیم جو نبی اور رسول ہیں ان کی منتہائے آرزو ہے کہ اللہ قیامت کے دن ان کی خطائیں معاف کر دے' حالانکہ وہ پوری طرح عارف باللہ ہیں۔ وہ اللہ کی ذات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور ان کے نفس کی گہرائیوں میں رب کی معرفت رچی بسی ہے۔ وہ اپنے نفس کو پاک و صاف تصور نہیں کرتے۔ اس معرفت اور قرب کے ساتھ پھر بھی ڈرتے ہیں کہ ان سے کوئی خطا ہوئی ہو' وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے نہ وہ اپنے اعمال کی اساس پر اپنے آپ کو مستحق نجات کہتے ہیں۔ وہ فضل ربی پر بھروسہ کرتے ہیں' اللہ کی رحمت کے طلبگار ہیں اور یہ رحمت خداوندی ہے جس کے وہ امیدوار ہیں کہ عفو و درگزر ہو گا اور تب ان کی نجات ہو گی۔

تقویٰ اور خدا خوفی کا یہ پیغمبرانہ شعور ہے' ادب و احترام پر مبنی شعور ہے' نہایت احتیاط کا انداز ہے۔ اللہ کی عظمتوں اور اللہ کے انعامات کا یہ حقیقی شعور ہے۔ اس شعور کے مطابق عمل کی قیمت بہت ہی کم ہے اور مغفرت کی قیمت زیادہ ہے۔

یوں ذات باری کے بارے میں حضرت ابراہیم اپنے عقائد کے بنیادی عناصر ترکیبی یہاں بیان کرتے ہیں کہ رب العالمین وحدہ لاشریک ہے' زمین پر انسان کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اللہ رب العالمین متصرف ہے۔ بعث بعد الموت اور حساب و کتاب میں صرف فضل الٰہی بندے کو بچا سکتا ہے۔ اعمال کے اعتبار سے بندہ پر تقصیر ہی ہوتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں کہ مشرکین اور ابراہیم کی قوم ان کی منکر ہے۔

حضرت ابراہیم جو نہایت ہی حلیم الطبع اور اللہ کے سامنے گریہ و بکا کرنے والے ہیں وہ نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ اپنی دعا کو آگے بڑھاتے ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَ اغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

ابراہیم نے دعا کی "اے میرے رب' مجھے حکم عطا کر۔ اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد' بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو"۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا پر ذرا غور فرمائیں کہ اس میں اس دنیا کے اغراض میں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں کہا کہ اے اللہ' مجھے صحت عطا کیجئے۔ یہ پوری دعا بلند مقاصد اور اعلیٰ اور پاکیزہ شعور کی تحریک ہے۔ یہ اس خدا رسیدہ دل کی دعا ہے جس کے پیش نظر اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے ہاں اللہ کے سوا ہر

چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور معرفت کے جس مقام تک یہ دل پہنچا ہے' اس کے آگے مزید کا طلبگار ہے اور ایک ایسے قلب سے نکلی ہوئی دعا ہیم ورجا کی حالت میں ہے کیونکہ اس نے اللہ کے کرم دیکھے ہوئے ہیں اور مزید کا امیدوار ہے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا (٢٦: ٨٣) "اے میرے رب' مجھے حکم عطا کر"۔ اے اللہ مجھے ایسی حکمت عطا کر جس کی روشنی میں کھری اور کھوٹی قدروں کے درمیان تمیز کر سکوں تاکہ میں ایسے طرز عمل پر قائم رہوں جو مجھے باقی رہنے والی قدروں تک پہنچائے۔

وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (٢٦: ٨٣) "اور مجھے صالحوں کے ساتھ ملا دے"۔ یہ حضرت ابراہیم کی دعا ہے جو نبی اور رسول ہیں اور گڑگڑانے والے اور نہایت ہی حلیم الطبع ہیں۔ اس عظیم المرتبہ ابو الانبیاء کی تواضع قابل دید ہے۔ ان کی احتیاط قابل ملاحظہ ہے۔ کس قدر خدا خوفی ان کی باتوں میں اور کس قدر اعتراف قصور ہے۔ وہ ہر وقت ڈرتے ہیں کہ انسان کا دل کسی بھی وقت برائی کی طرف مائل ہو سکتا ہے اس لیے وہ صالحین کی محفل اور ماحول کے طلبگار ہیں وہ اللہ کی توفیق سے عمل صالح کے لیے یا عمل صالح پر قائم رہنے کے آرزومند ہیں۔

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (٢٦: ٨٤) "اور بعد میں آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر"۔ آپ کی دعا یہ ہے کہ میری شروع کی ہوئی دعوت توحید قیامت تک رہے۔ وہ کثرت اولاد کے لیے دعا نہیں کرتے بلکہ آپ کی دعا آنے والی نسلوں میں آپ کے نقش قدم پر چلنے والے مداحوں کے لیے ہے کہ وہ آپ کی دعوت توحید کو قبول کریں۔ اور "دین حنیف" کو اپنائیں اور یہی دعا آپ نے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی کی ہے۔ اس وقت جب آپ اور آپ کے بیٹے اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (١٢٨) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (١٢٩) (٢: ١٢٨ - ١٢٩) "اے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب' ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو' جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے' تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی۔ آپ کی دعوت کو پھیلایا۔ اور آنے والے زمانوں میں ان کے لیے

تمام لوگ کلمہ خیر کہنے والے ہوئے - اور پھر آپ کی دعا کے مطابق نبی آخر الزمان پیدا ہوئے - اور ہزارہا سال کے بعد یہ دعا پوری ہوئی - لوگوں کے حساب میں تو دنیا کے ہزارہا سال بہت طویل ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے - اور اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ دعائے ابراہیمی اس قدر عرصہ کے بعد قبول ہو -

وَاجْعَلْنِي مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ (۲۶ : ۸۵) "اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما" - اس سے قبل آپ نے دعا فرمائی تھی کہ مجھے صالحین کے گروہ میں شامل فرما اور عمل صالح کی توفیق دے کہ میں صالحین کی صفوں میں چلوں اور پھر اس جنت میں داخل ہو جاؤں جس کی وراثت عباد صالحین کا حق ہے -

وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ (۲۶ : ۸۶) "اور میرے باپ کو معاف کر دے - بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے" - باوجود اس کے کہ حضرت ابراہیم کو ان کے والد نے سختی سے ڈانٹ اور تہدید آمیز گفتگو کی لیکن انہوں نے اس گفتگو کے وقت بھی وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے لیے دعا ہی کرتا رہوں گا - یہ اس وعدے کی وجہ سے والد کے حق میں دعا فرما رہے ہیں - بعد میں یہ بات قرآن نے بیان کر دی کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کرنا جائز نہیں ہے - اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں اور قرآن کریم نے اس بات کی بھی صراحت کر دی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت اس لیے کی تھی کہ انھوں نے باپ کے ساتھ اس کا وعدہ کیا تھا -

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ "جب اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے باپ سے برات کا اظہار کر دیا" - اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جان لیا کہ در رہ راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست - یہاں تو اخوت نظریاتی اخوت ہیں - اسلامی تربیت کے بنیادی عناصر میں سے ایک عنصر یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں پہلا آمیرہ اور رابطہ اور تعلق نظریاتی تعلق ہے - اور کسی انسان اور انسان کے درمیان مضبوط تعلق صرف نظریات کا ہو سکتا ہے جب یہ تعلق کٹ جائے تو تمام تعلقات کٹ جاتے ہیں - اور پھر انسان انسان سے دور ہو جاتا ہے - کوئی رابطہ اور تعلق نہیں رہتا -

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (۲۶ : ۸۷) يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (۲۶ : ۸۸)

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (۲۶ : ۸۹) "اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد ' بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو" - ابراہیم علیہ السلام کی اس بات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ قیامت کا دن کس قدر ہولناک ہو گا اور یہ کہ حضرت ابراہیم اللہ سے کس قدر حیا فرماتے ہیں ' اور اللہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے کس قدر خائف ہیں اور یہ خوف اپنی تقصیر کی وجہ سے ہے کہ وہ ایک معز زبی ہیں - نیز حضرت کی اس دعا سے "جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے نہ اولاد ' بجز اس کے کہ کوئی قلب سلیم لے کر اللہ کے حضور حاضر ہو" - معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوم قیامت کی ذمہ داریوں کو کس قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا تھا - نیز آپ نے دنیاوی اقدار اور اسلامی اقدار کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا - کیونکہ یوم القیامہ میں وہی کامیاب ہو گا جو اخلاص کے ساتھ آئے اور اس کا دل اللہ کے لیے ہو جائے - اور اس کے اندر دنیا

کا کوئی بت یا مقصد نہ ہو۔ ہر بیماری سے پاک ہو، ہر مفاد سے پاک ہو، ہر قسم کی خواہشات اور انحرافات سے پاک ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور الہ و معبود سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ ہے قلب کی سلامتی جس کا اسلام اور قیامت میں کوئی وزن ہو گا۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶ : ۸۸) "جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد"۔ دنیا کی کوئی قدر اور کوئی ترجیح اس دن مفید مطلب نہ ہوگی حالانکہ اس دنیا میں ان مطالب اور ترجیحات کے پیچھے انسان کتوں کی طرح دوڑتے ہیں لیکن آخرت کے ترازو میں یہ ترجیحات بے وزن ہیں۔

اب یہاں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر آتا ہے۔ وہ دن جس سے حضرت ابراہیم اس قدر خائف ہیں تو وہ دیکھو وہ دن نمودار ہوا۔ حضرت ابراہیم ابھی ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ منظر پر اس دن کا نقشہ نمودار ہوتا ہے۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۹۰﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ﴿۹۱﴾ وَ قِیْلَ لَهُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِیْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَ جُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَ هُمْ فِیْهَا یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ لَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۲﴾

"(اس روز) جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائے گی اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا کہ "اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟" پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ، اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اس میں اوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبودوں سے) کہیں گے کہ "خدا کی قسم، ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جب کہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے، اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں"۔

جنت کو ایسے لوگوں کے بالکل قریب کر دیا جائے گا جو خدا کے عذاب سے ڈرتے تھے۔ اور جہنم پر سے بھی پردہ اٹھا دیا جائے گا بہکے ہوئے سرکش گمراہوں کے لیے بالکل صاف صاف نظر آئے گی، وہ لوگ جنہوں نے راستہ گم کر دیا تھا اور اس دن کو جھٹلاتے تھے۔ اب وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں اب ان پر لعنت و ملامت ہوگی اور قبل اس

کے کہ انہیں اس میں اوپر نیچے گرا دیا جائے۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ جن معبودوں کی بندگی کرتے تھے' وہ کہاں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی مناسبت سے یہاں یہ سوال لایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ ایسا ہی مکالمہ کیا تھا کہ آیا یہ بت سنتے بھی ہیں یا نفع و نقصان ہی دے سکتے ہیں۔ اب قیامت میں ان سے کہا جائے گا۔

أَيْنَمَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ (٢٦: ٩٢) مِن دُونِ اللَّهِ (٢٦: ٩٣) "کہ اللہ کے سوا تم جن کی پوجا کرتے تھے وہ کہاں ہیں"۔

هَلْ يَنصُرُونَكُمْ أَوْ يَنتَصِرُونَ (٢٦: ٩٣) "کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں یا اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں"۔ اس کے بعد ان کا کوئی جواب سامنے نہیں آتا نہ ان کے جواب کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہاں تو محض سوال کرنا ہی مطلوب تھا' صرف سوال ہی سے سرکوبی اور ملامت مطلوب تھی۔

فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ (٢٦: ٩٤) وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ

(٢٦: ٩٥) "پھر وہ معبود' یہ بہکے ہوئے لوگ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اس میں اوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے"۔ لفظ کبکبوا کے تلفظ ہی سے اور اس کی صوتی شوکت سے ہی یہ تاثر ملتا ہے کس طرح انہیں دفع کیا جاتا ہے' کس طرح جہنم کے دھانے سے نیچے بے رحمی کے ساتھ گرایا جاتا ہے' بغیر کسی ترتیب اور رعایت کے یہ لوگ اوپر تلے گرتے ہیں اور اس پورے عمل سے ایک کبکبہ اور ایک غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ جس طرح دریا کا کوئی بلند کنارہ گرتا ہے اور اس کے گرنے کی ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے۔ کبکبوا ایسا ہی لفظ ہے جس کے تلفظ ہی سے مفہوم ذہن کی طرف دوڑتا ہے۔ یہ چونکہ گمراہ اور سرکش تھے اس لیے ان کے ساتھ سب سرکش گرائے گئے۔ اور شیطان کے لشکر کے لشکر لائے جاتے ہیں اور گرائے جاتے ہیں اور ان کے گرنے سے کبکبہ اور غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ یہاں مخصوص مجرمین کو پہلے خصوصیت کے ساتھ گرایا جائے گا اور بعد میں عام گرائی شروع ہوگی۔

اب یہ لوگ جہنم میں پڑے ہیں مگر مکالمہ بھی سنائی دیتا ہے۔ یہ اپنے بتوں اور الہوں کے بارے میں اب یوں تبصرے کرتے ہیں۔

تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (٢٦: ٩٧) إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ

(٢٦: ٩٨) "یہ بہکے ہوئے لوگ ان معبودوں سے کہیں گے خدا کی قسم ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے"۔ تمہاری عبادت بھی رب العالمین کی عبادت کی طرح کرتے تھے۔ یا تو رب العالمین کے ساتھ تمہاری عبادت کرتے تھے یا اس سے الگ۔ اب تو یہ لوگ جہنم میں یہ بات کہہ رہے ہیں لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ یہ تو سب ذمہ داری ان لوگوں پر ڈال رہے ہیں جنہوں نے ان کو گمراہ کیا تھا۔ جنہوں نے ان کو گمراہ کیا اور راہ راست کی طرف آنے سے روک دیا لیکن جب یہ جہنم میں قرار پکڑیں گے تو ہوش آئے گا کہ اب تو وقت گزر گیا

ہے ۔ اور یہ دلویلا بعد از وقت ہے ۔ اب اگر ہم ذمہ داریاں تقسیم بھی کر دیں تو فائدہ کیا ہو گا۔

فَمَالَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ (۲۶: ۱۰۰) وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ (۲۶: ۱۰۱) "اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست"۔ اب نہ الہ ہیں جو سفارش کریں ۔ نہ دوست ہیں جو کام آئیں ۔ اگر سفارش نہیں ہے تو کیا ہم دنیا کی طرف لوٹ نہیں سکتے کہ وہاں دوبارہ جاکر درست رویہ اختیار کریں ۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶: ۱۰۲) "کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقعہ مل جائے تو ہم مومن ہوں"۔ مگر یہ تو تمنا ہی تمنا ہوگی ۔ نہ واپسی ہوگی نہ سفارش ہوگی ۔ یہ ہو گا یوم الدین ۔ اب آخری تبصرہ!

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

"یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

یہ وہی تبصرہ ہے جو اس سورت میں قوم عاد' قوم ثمود اور قوم لوط کی تباہی کے واقعات کے بیان کے بعد آیا ہے ۔ نیز یہ تبصرہ ان تمام معجزات کے بعد بھی آیا ہے ۔ جو جھٹلانے والوں کو دکھائے گئے ۔ قیامت کے مناظر میں سے یہ منظر ان مکذبین کے منظر عبرت کے بالمقابل آیا ہے ۔ جن کا تذکرہ اس سورت میں آیا ہے اور جن کو اس جہاں میں نیست و نابود کیا گیا ۔ یہاں قوم ابراہیم اور ان مشرک اقوام کے انجام کی تصویر کشی کی گئی تھی ۔ اور اس سورت کے تمام قصص سے یہی سبق دینا مطلوب ہے ۔ قرآن کریم میں قیامت کے مناظر اسی طرح پیش کیے جاتے ہیں جس طرح گویا یہ افعال ہمارے سامنے واقع ہو رہے ہیں ۔ ہمیں نظر آ رہے ہیں ۔ اس انداز بیان سے وہ انسانی شعور کا جزء بن جاتے ہیں ۔ انسانی وجدان جاگ اٹھتا ہے جس طرح تاریخ میں انسانوں نے دیکھا کہ مکذبین کو مختلف عذابوں میں مبتلا کر کے نیست و نابود کیا گیا اور لوگ دیکھتے ہی رہے ۔ اسی طرح قیامت کے مناظر ہوں گے ۔

---○○○---

درس نمبر ۱۶۴ ایک نظر میں

جس طرح سابقہ قصے میں گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑایا گیا تھا اور روئے سخن قصہ موسیٰ سے پیچھے قصہ ابراہیم کی طرف چلا گیا تھا۔ یہاں بھی قصہ ابراہیم سے آپ مزید پیچھے قصہ نوح کی طرف ہم جا رہے ہیں۔ یہاں دراصل تاریخی ترتیب قصص ملحوظ نہیں ہے۔ مقصد شرکیہ عقائد کے خلاف جدوجہد کے چند نمونے دینے ہیں۔

قصہ نوح بھی قصہ موسیٰ اور قصہ ابراہیم کی طرح کئی سورتوں میں آیا ہے۔ یہ قصہ اس سے قبل سورہ اعراف میں آیا ہے۔ سورہ اعراف میں نزول آدم کے بعد اختصار کے ساتھ آیا تھا جس میں آپ نے قوم کو توحید کی طرف بلایا تھا اور قیامت کے دن کے عذاب عظیم سے ڈرایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ قوم نوح نے الٹا نوح علیہ السلام سے کہا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔ ان کو تعجب ہوا کہ اللہ ان کے طرف ان جیسا انسان کس طرح بھیج سکتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو ہدایت دے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے آپ کی قوم کو غرق کیا اور آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نجات دے دی۔

یہ قصہ سورہ یونس میں بھی اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے' یہ آپ کی رسالت کا آخری دور تھا' جب آپ نے اپنی قوم کو چیلنج کیا۔ انہوں نے ان کی تکذیب کی۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو کشتی کے ذریعے نجات ملی اور دوسرے فریق کو غرق کر دیا گیا۔

سورت ہود میں اس قصے کی تفصیلات دی گئی ہیں اس میں کشتی' طوفان اور اپنے بیٹے کے بارے میں حضرت نوح کی دعا جو غرق ہوا اور پھر طوفان کے بعد کے واقعات اور وہ واقعات جو طوفان سے پہلے تبلیغ کے دوران ان کو پیش آئے۔

سورت المومنون میں بھی یہ قصہ آیا ہے۔ وہاں حضرت نوح اپنی قوم کو رب واحد کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں جبکہ قوم یہ اعتراض کرتی ہے کہ تم تو ہم جیسے انسان ہو اور ہم پر فضیلت حاصل کرنے کے لیے یہ باتیں کرتے ہو۔ اگر اللہ کو کوئی نبی بھیجنا بھی تھا تو وہ فرشتے بھیج سکتا تھا۔ انہوں نے آپ پر مجنوں ہونے کا الزام عائد کیا۔ وہاں پھر حضرت نوح رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نصرت طلب کرتے ہیں اور وہاں پھر کشتی اور طوفان کی طرف ایک سرسری اشارہ ہوتا ہے۔

بالعموم قصہ نوح' قصص عاد' ثمود' لوط اور اہل مدین کے قصے کے ساتھ آتا ہے۔ اس سورت میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہاں اس قصے میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ قوم سے کہتے ہیں کہ خدا خوفی اختیار کرو' یہ کہ وہ ان سے کسی اجر کے طلبگار نہیں ہیں اور یہ کہ ان کی قوم کے کبراء ان سے جو مطالبہ کرتے تھے کہ تمہارے پاس جو غریب اہل ایمان چپکے ہوئے ہیں' ان کو دور کرو' جس سے حضرت نوح انکار فرماتے تھے اور بعینہ یہی مطالبہ حضور اکرمؐ سے بھی اہل مکہ کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت نوح دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ان کے اور ان کی قوم کے تنازعہ کا فیصلہ حق کے ساتھ فرما دے۔ اللہ ان کے اس سوال کو پورا کرتا ہے اور مکذبین کو ہلاک کرتا ہے اور اہل ایمان کو بچا لیتا ہے۔

درس نمبر ۱۶۴ تشریح آیات

۱۰۵ --- تا --- ۱۲۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾

"قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا"۔ یہ تو قصے کا انجام بتا دیا' قصے کا انجام پہلے بتا کر پھر تفصیلات دی جاتی ہیں تاکہ قاری کو معلوم ہو جائے کہ روئے سخن کدھر ہے۔

سوال یہ ہے کہ قوم نوح نے تو صرف نوح علیہ السلام کو جھٹلایا جبکہ قرآن کہتا ہے اس نے رسولوں کو جھٹلایا۔ رسالت اپنی حقیقت کے اعتبار سے دراصل ایک حقیقت ہے۔ تمام رسولوں کی دعوت یہی رہی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور صرف اسی کی بندگی کرنا چاہیے۔ جو شخص یا جو قوم ایک رسول کی تکذیب کرے وہ دراصل تمام رسولوں کی تکذیب کرتا ہے۔ قرآن کریم اس مفہوم اور حقیقت کو مختلف مقامات پر دہراتا ہے۔ اور مختلف انداز اور اسالیب میں اس بات کو دہرایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کا ایک مسلمہ اصول ہے تمام رسولوں کی دعوت میں یہ اصول مسلم رہے ہیں۔ اور اسی اصول پر انسانیت کی تقسیم ہوتی رہی ہے۔ یعنی رسولوں کو ماننے والے ایک طرف اور نہ ماننے والے دوسری طرف۔ تمام رسالتوں اور تمام زمانوں میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ایک مسلمان جب دیکھتا ہے تو ہر دین اور ہر عقیدے میں امت ایک ہی رہی ہے۔ ابتدائی تاریخ سے لے کر آج تک اور آخری دین توحید اسلام تک۔ ہر امت اور ہر دین میں صنف مخالف کافروں اور منکرین کی رہی ہے۔ اہل ایمان وہ ہیں جو رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور اہل کفر وہ ہیں جو انکار کرتے ہیں۔ اہل ایمان تمام رسولوں کا احترام کرتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ منصب رسالت کی نوعیت اور حقیقت ایک ہے۔

ایک مسلم کے اندازے کے مطابق انسانیت کی تقسیم رنگوں' علاقوں اور نسلوں کے مطابق نہیں کی جا سکتی۔ انسانیت کی تقسیم صرف اہل حق اور اہل باطل دو گروہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اور آغاز انسانیت سے لے کر یہی تقسیم رہی ہے۔ لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے تاریخ کے لیے ایک ہی معیار اور ایک ہی ترازو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم کی ذہنیت اور اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ وہ رنگ و نسل اور قوم و وطن سے بالا ہو کر سوچتا ہے۔ اس کے موجودہ روابط یا تاریخی روابط وہی ہوتے ہیں جو ایمانی اقدار پر مبنی ہوں۔ وہ ایمانی اقدار کے اصول پر سب کا محاسبہ کرتا ہے اور اپنی تمام اقدار اور افکار کو ایمان ہی کے معیار پر تولتا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾

"قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے ان سے کہا تھا"کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔

یہ تھی حضرت نوح کی قوم' جس نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ خود اپنی قوم نے ان کی تکذیب کی اور وہ خود ان کے بھائی تھے۔ حالانکہ اخوت کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ لوگ نوح کے ساتھ رواداری برتتے اور اطمینان سے ایمان لاتے اور تصدیق کرتے۔ لیکن ان کی قوم نے برادرانہ رواداری کا مظاہرہ بھی نہ کیا اور خود اپنے بھائی کی ہمدردانہ باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

الا تتقون (۲۶: ۱۰۶) "کیا تم ڈرتے نہیں ہو"۔ .... اور اس انجام سے نہیں ڈرتے ہو جو اس رویہ کا لازمی نتیجہ ہے جس پر تم ہو۔ اور تمہارے دل خوف اور خشیت محسوس نہیں کرتے۔ خدا خوفی کی طرف بڑھنا اسی سورت کا مخصوص مضمون ہے۔ یہی بات حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہی اور یہی بات نوح نے اپنی قوم سے کہی اور یہی بات ہر رسول نے اپنی اپنی قوم سے کہی۔

انی لکم رسول امین (۲۶: ۱۰۷) "میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں"۔ جو نہ خیانت کرتا ہے' نہ دھوکہ دیتا ہے اور نہ کوئی چیز چھپاتا ہے۔ نہ کوئی کمی کرتا ہے اور نہ بیشی اور مبالغہ کرتا ہے۔ بس جو کچھ اللہ نے حکم دیا وہ پہنچاتا ہے۔

فاتقوا اللہ و اطیعون (۲۶: ۱۰۸) "لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔ یوں حضرت نوح علیہ السلام ان کو خدا خوفی کی دعوت دیتے ہیں اور یہاں وہ ڈرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں اور اس طرح ان کو اطاعت اور تسلیم پر آمادہ کرتے ہیں۔

پھر حضرت نوح دنیا کے مقصد کی طرف سے ان کو اطمینان دلاتے ہیں۔ یہ کہ دعوت الی اللہ کی تحریک کے ساتھ ان کے کوئی مقاصد وابستہ نہیں ہیں۔ وہ ان سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے کہ تم اللہ کی طرف رجوع کرو گے تو مجھے یہ انعام بھی دو گے۔ میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے جس نے مجھے یہ دعوت دینے پر مامور کیا ہے۔ لوگوں سے یہ کہنا کہ میں تم سے کوئی دنیاوی اجر طلب نہیں کرتا' یہ بات ہر نبی نے کی ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں تحریک اسلامی کی دعوت دینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحریک کے ساتھ اپنے اغراض و مقاصد وابستہ نہ کریں کیونکہ ایک سچے داعی اور جھوٹے داعی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹا داعی مفادات کے لیے دعوت سے وابستہ ہوتا ہے۔ تمام انبیاء کے زمانے میں کاہن اور دوسرے مذہبی راہنما لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے تھے۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا تھا کہ مختلف طریقوں

اور حیلوں سے لوگوں کے من موڑنے کی کوشش کریں۔۔اس کے مقابلے میں داعیان حق ہمیشہ مخلص ہوتے تھے۔ وہ اس ہدایت پر کوئی فیس طلب نہ کرتے تے۔وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا اجر اللہ رب العالمین پر ہے۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

"میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

یہاں ان سے مکرر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو اور اطاعت اختیار کر لو' ہم تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے نہ مال کا حصول چاہتے ہیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

"پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو"۔ لیکن لوگ ان پر عجیب اعتراض کرتے ہیں اور انسانی تاریخ میں تمام رسولوں پر یہ اعتراض کیا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"انہوں نے جواب دیا"کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رزیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے"۔

یہاں اردلون سے مراد غرباء و فقراء ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو رسولوں کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔یہی لوگ ایمان لاتے اور استقامت " رکرتے ہیں۔اور ان غرباء کو راہ ہدایت اختیار کرنے سے یہی بے کار کبرا روکتے ہیں۔ اور یہ اس لیے روکتے ہیں کہ معاشرے میں ان کی پوزیشن اور ان کا مقام و مرتبہ کہیں آگے سے گر نہ جائے۔ غریب لوگ تو ہمیشہ دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور کبرا محروم رہتے ہیں ان کا مقام و مرتبہ انہیں حق سے دور رکھتا ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں' جھوٹے حالات اور وہمی روایات کے خول سے باہر نہیں آسکتے۔ پھر یہ کبرا اور معتبرین عقیدۂ توحید اختیار کر کے یہ پسند نہیں کرتے کہ عامۃ الناس اور جمہور کے ساتھ ان کا مقام اور مرتبہ برابر ہو جائے۔کیونکہ اسلام میں داخل ہو کر نہ وہ خصوصی مراعات کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور جھوٹے مرتبے کو قائم رکھ سکتے ہیں۔جبکہ اسلامی معاشرے میں ایک ہی قدر ہے "ایمان اور عمل صالح" یہی کسی کو اٹھاتی ہے اور کسی کو گراتی ہے اور اسلامی معاشرے میں ایک ہی میزان ہے "عقیدہ اور درست عمل"۔

چنانچہ حضرت نوح ان کو ایسا جواب دیتے ہیں جو ان ثابت شدہ قدروں کی تصدیق کرتا ہے۔یہ بتاتا ہے کہ رسول کا فریضہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔لوگ جو کچھ کرتے ہیں ان کا ذمہ دار رسول نہیں ہے۔حساب و کتاب لینے والا اللہ ہے۔

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى

رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

نوح نے کہا "میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں' ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے' کاش تم کچھ شعور سے کام لو۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں ان کو میں دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا آدمی ہوں"۔

یہ بڑے لوگ عوام کے بارے میں ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ان کے اخلاق و عادات اعلیٰ معیار کے نہیں ہوتے اور نہ ہی اعلیٰ طبقات میں برداشت کیے جاتے ہیں کیونکہ یہ اعلیٰ طبقات کے لوگ بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اور ذوق لطیف رکھتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام ان سے کہتے ہیں کہ میں تو لوگوں سے ایمان لانے کے سوا کچھ مطالبہ نہیں کرتا اور یہ غریب لوگ جب ایمان لے آئے ہیں تو میں ان سے اب اور کیا مطالبہ کروں۔ اس سے قبل ان کے جو اعمال تھے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا تعین اللہ کرے گا۔ اور اچھائیوں اور برائیوں پر جزا و سزا بھی اللہ دے گا۔ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمہاری حالت یہ ہے کہ وَمَا تَشْعُرُوْنَ "تم شعور نہیں رکھتے"۔ کہ اللہ کے ترازو میں کون وزن رکھتا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا فریضہ صرف کھلے انداز سے ڈرانا ہے۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے واضح دلائل اور سیدھی منطق پیش کی اور اب وہ اس بات سے عاجز آ گئے کہ حضرت نوح کے ساتھ مزید کوئی مکالمہ کر سکیں تو انہوں نے وہی ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دی جس کو سرکش اور ظالم اور جابر ہمیشہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی حجت اور برہان کے مقابلے میں ڈنڈا۔ ہر زمان و مکان میں لاجواب انسان کا یہی دستور ہوتا ہے کہ جب اس کے پاس دلیل کا توشہ ختم ہوتا ہے تو وہ ہتھیار نکالتا ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝

"انہوں نے کہا "اے نوح' اگر تو باز نہ آیا تو پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا"۔ اب سرکشی ننگی ہو کر سامنے آ گئی۔ گمراہی نے اپنے ذرائع اور اوچھے ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیئے اور حضرت نوح علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ سنگ دل کوئی نرمی قبول نہیں کرتے۔

اب حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنا آخری ہتھیار استعمال کرتے ہیں وہ اپنے والی اور مددگار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے سوا اہل ایمان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"نوح نے دعا کی "اے میرے رب' میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا۔ اب میرے اور ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں' ان کو نجات دے"۔

اور اللہ تعالیٰ کو تو خوب معلوم تھا کہ قوم نے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ لیکن ہمیشہ شکایت' استغاثہ اور دادرسی کی استدعا وہاں کی جاتی ہے جہاں اختیار ہوتا ہے۔

فَافْتَحْ بَيْنِي وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا (۲۶:۱۱۸) "میرے اور ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دے"۔ حد ہو چکی ہے اور یہ لوگ ہرگز مان کر نہیں دیتے۔

وَنَجِّنِي وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶:۱۱۸) "مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے"۔ اللہ نے اپنے نبی کا یہ استغاثہ قبول فرمایا۔ جن کو کفر نے دھمکی دی تھی کہ تمہیں رجم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ تم لوگوں کو نیک بنانے کی کوشش کرتے ہو۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کی دعوت دیتے ہو۔ اور پھر یہ کام بھی بہت ہی بے لوثی سے کرتے ہو۔ اور اس معاملے میں کوئی سودا بازی نہیں کرتے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

"آخر کار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا"۔

یوں نہایت ہی اختصار کے ساتھ حق اور باطل کی اس کشمکش کا انجام ہوا۔ اور یہ کشمکش بھی انسانیت کے نہایت ہی ابتدائی دور میں ہوئی۔ اور یہ کشمکش آخر تک اسی نہج پر چلتی رہی۔ جس طرح انسانی تاریخ طویل ہے اسی طرح حق و باطل کا یہ معرکہ بھی طویل ہے۔

اور اب وہی مانوس فقرہ' وہی عبرت آموز نتیجہ جو اس سورت میں مکرر آ رہا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

۶ ۱۸ع ۱۰

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

--- ooo ---

درس نمبر ۱۶۵ تشریح آیات

۱۲۳--- تا--- ۱۴۰

قوم ہود احقاف میں رہتی تھی ـ یہ حضرموت کے قریب یمن کی طرف ریت کے ٹیلے ہیں ـ یہ قوم نوح علیہ السلام کے بعد بڑی ترقی یافتہ قوم رہی ـ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں کرۂ ارض کو سرکشوں سے پاک کر دیا گیا تھا ' لیکن آپ کے بعد اپنی ترقی کی وجہ سے یہ لوگ سرکش ہو گئے ـ

سورت اعراف میں ان کا قصہ مفصلاً آیا ہے ـ سورت ہود میں بھی آیا ہے ـ سورت مومنین میں یہ قصہ حضرت ہود کے ذکر کے بغیر آیا ہے ـ اس میں ان کا نام عاد بھی نہیں لیا گیا ـ یہاں بھی اس قصے کو بڑے اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے ـ حضرت ہود اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں ـ قوم تکذیب کرتی ہے اور اللہ کی طرف سے مکذبین ہلاک کر دیے جاتے ہیں ـ اس کا آغاز بھی یوں ہوتا ہے جس طرح قصہ نوح کا آغاز ہوا تھا ـ

كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

" عاد نے رسولوں کو جھٹلایا ـ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا " کیا تم ڈرتے نہیں ؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ـ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ـ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ـ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے " ـ

ایک ہی بات ہے جسے تمام رسول دہراتے نظر آتے ہیں ـ اللہ کی طرف آ جاؤ ' خدا سے ڈرو اور رسول کی اطاعت کرو ' اور دنیا پرستی کو چھوڑ دو اور دنیا کا سازوسامان اور ترقی مومن کی منزل مقصود نہیں ہے ـ محض دنیا کے سازوسامان سے ذرا بلند ہو کر کام کرو ' اور اللہ کے نزدیک جو عظیم اجر موجود ہے اس پر نظریں گاڑے رہو ـ

اس کے بعد بعض اضافی باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس قوم کے مخصوص افعال تھے ـ بتایا جاتا ہے کہ تم بڑے بڑے مکانات بنانے میں سخت اسراف اور فضول خرچی سے کام لیتے ہو ' محض عظمت کے اظہار کے لیے ' دولت کی نمائش نے

لیے - بڑے بڑے پلازے اور ملٹی سٹوری بلڈنگز - مزید یہ کہ تم نے دنیا کی مادی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے اور اس پر نازاں ہو اور اللہ کی قوت سے غافل ہو جو تمہیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿۱۲۹﴾

"یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو' اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے"۔

ریع عربی میں بلند زمین کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اونچے مقامات پر مکانات بناتے تھے اور دور سے وہ مکانات یوں نظر آتے تھے جیسا کہ بڑا پہاڑ اور مقصود ان کا یہ دکھانا تھا کہ وہ بڑے ماہر فن اور بڑے صاحب مقدرت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس کے لیے عبث کا لفظ استعمال کیا' اگر یہ بڑے بڑے نشانات وہ مسافروں کی رہنمائی یا سمندری جہازوں کی راہنمائی کے لیے بناتے تو قرآن ان کے لیے عبث کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ اس سے یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ قوت اور مہارت اور دولت کو منفعت بخش امور میں خرچ کرنا ہے۔ محض نمائش ' زیبائش اور اظہار حسن و کمال کے لیے نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس تبصرے میں ایک معنی خیز فقرہ بھی استعمال کیا ہے۔

وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۲۶ : ۱۲۹) "تم بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو' گویا تم نے ہمیشہ رہنا ہے"۔ قوم عاد تہذیب و تمدن میں قابل ذکر حد تک ترقی کر گئے تھے۔ بڑے بڑے محلات بنانے اور پہاڑوں کو کاٹنے کے لیے انہوں نے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ایجاد کر لی تھی۔ بڑے بڑے مینارے بلند مقامات پر بناتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ شاید یہ بڑے بڑے محلات اور اونچی اونچی علامات اور مینارے وہ اس لیے بناتے تھے کہ انہیں اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ نہ اس دنیا کے طبعی حالات ان پر اثر انداز ہوں گے اور نہ کوئی دشمن ان پر فتح پا سکے گا۔

حضرت ہود اپنی تنقید جاری رکھتے ہیں :

وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿۱۳۰﴾

"اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو"۔ یہ لوگ بہت بڑے نافرمان اور سرکش تھے۔ جب کسی کو اپنی ظالمانہ گرفت میں لیتے تو حد سے گزر جاتے۔ ظلم اور سنگدلی ان کا شیوہ ہوتا۔ جس طرح اس دنیا میں مادی قوت رکھنے والے ہر جبار کا قانون ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت ہود ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ خدا سے ڈریں اور اس کے رسول کی اطاعت میں آ جائیں - تاکہ اللہ

اور رسول ان کو اس تخی سے روک دیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝۱۲۶

"پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔

حضرت ہود ان کو یاد دلاتے ہیں کہ تمہارے پاس جو مادی قوت ہے اور جس کے ذریعہ تم بڑے بڑے محلات بناتے ہو اور اپنی قوت کا رعب جماتے ہو۔ یہ تو سب اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اور اس نعمت کے بدلے مناسب تو یہ تھا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس بات سے ڈرتے کہ اللہ کہیں یہ نعمت تم سے چھین نہ لے اور مزید اس پر تمہیں سزا نہ دے دے کیونکہ تم تو اسراف کرتے ہو' بے فائدہ کام کرتے ہو اور ظلم و ستم ڈھاتے ہو۔

وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۲ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ۝۱۳۳ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝۱۳۴ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۳۵

"ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے' اولاد دی' باغ دیئے اور چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔

حضرت ان کو پہلے اجمالی نعمت یاد دلاتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کیا انعامات سے نوازا گیا۔ جو کچھ تم ہو' وہ تمہارے سامنے ہے۔ تم اس حال میں مست ہو لیکن بعض اہم چیزوں کا وہ نام بھی لیتے ہیں۔ تمہیں جانور دیئے' تمہیں اولاد دی' باغات دیئے اور پانی کے چشمے دیئے۔ اس دور کی ترقی میں یہی چیزیں اہم تھیں۔ جبکہ یہ چیز ہر دور کی ترقی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور آج بھی اہم ہیں۔ حضرت ان لوگوں کو ایک عظیم دن کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ کیونکہ جو روش انہوں نے اختیار کر لی تھی اس کی وجہ سے وہ عذاب کے مستحق ہو گئے تھے اور حضرت ہود چونکہ انہی کے بھائی تھے۔ اس لیے وہ بڑی شفقت سے انہیں ڈرا رہے تھے نہایت والہانہ انداز میں۔ کیونکہ عذاب ان کو بصیرت نبوت کے ذریعے یقینی نظر آ رہا تھا۔

لیکن ان کی یہ مشفقانہ نصیحت اور ڈراوا ان کے دلوں پر اثر نہ کر رہا تھا جو بہت ہی سخت ہو گئے تھے اور عناد اور سرکشی برتتے ہوئے تھے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝۱۳۶

انہوں نے جواب دیا "تو نصیحت کر یا نہ کر' ہمارے لیے سب یکساں ہے"۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہود صاحب آپ فضول لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے آپ کا وعظ کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ یہ جواب ان کی طرف سے سخت توہین

آمیز' سنگدلانہ اور انتہائی دینی جمود اور بلادت کا مظہر تھا۔یہ لوگ اپنے تقلیدی مذہب پر تلے ہوئے تھے' ہوئے تھے۔

إِنْ هَٰذَآ إِلَّا خُلُقُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿١٣٧﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿١٣٨﴾

"یہ باتیں تو یوں ہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں"۔

یعنی وہ جو کام کر رہے ہیں وہ تو اسی طرح ہوتے چلے آئے ہیں۔ہود علیہ السلام خواہ مخواہ گرفت کر رہے تھے وہ تو آباء و اجداد کی راہ پر جا رہے ہیں۔اور کوئی عذاب آنے کا ڈر نہیں ہے کیونکہ ہمارے آباء پر تو عذاب نہیں آیا۔

اب قرآن مجید اس مکالمے کے بقیہ حصوں کو چھوڑ دیتا ہے۔بس انجام بتا دیا جاتا ہے' اختصار کے ساتھ۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَٰهُمْ

"آخر کار انہوں نے اسے جھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا"۔

غرض صرف دو لفظوں میں ان کا انجام بتا دیا جاتا ہے۔دو لفظوں میں قصہ تمام "تکذیب" کی "ہلاک ہوئے"۔ وہ تمام محلات لپیٹ دیئے گئے۔وہ تمام انعامات و اکرامات واپس لے لیے گئے۔وہ تمام مویشی' تمام آبادی' تمام باغات اور تمام چشمے لپیٹے گئے۔

قوم عاد کے بعد کئی دوسری اقوام نے انسانی تاریخ میں عادیوں کی طرح سوچا' عادیوں کی طرح دھوکہ کھایا' اللہ سے دور ہو کر انہوں نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی' اور یہ سوچا کہ اب انسان اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ اسے خدا کی ضرورت نہیں ہے۔کئی اقوام نے دوسروں کے لیے ہلاکت کا سامان تیار کیا اور اپنے آپ کو بچایا۔اور یہ سوچتی رہیں کہ یہ سازو سامان اسے اپنے دشمنوں سے بچالے جائے گا لیکن ایسی اقوام کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے دائیں' اس کے بائیں' اس کے اوپر' اس کے پیچھے اور ہر طرف سے اس پر عذاب ٹوٹ پڑتا ہے۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٤٠﴾ ۱۸ع

۱۱

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۱۶۶ تشریح آیات

۱۴۱ --- تا --- ۱۵۹

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

"ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

وہی الفاظ اور وہی دعوت جسے ہر رسول پیش کر رہا ہے۔ اور قرآن کریم تمام رسولوں کی طرف سے مختلف زمان و مکان اور مختلف اقوام و لسان کے باوجود ایک جیسے الفاظ لاتا ہے۔ یہ جتانے کے لیے کہ تمام رسولوں کی رسالت کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی مضمون تھا۔ ایک فکر اور ایک منہاج تھا۔ وہ ایک ہی اصول اور نظریہ تھا جس پر یہ رسالتیں اور یہ دعوتیں بلند ہوئیں۔ اللہ پر ایمان' اس کی جوابدہی کا احساس اور ڈر' اور ہر رسول کی اطاعت۔

اس کے بعد قرآن مجید قوم ثمود کی مخصوص باتیں بیان کرتا ہے۔ جو اس وقت سورت کے مضمون کے ساتھ مناسب ہیں۔ ان کو بھی حضرت صالح یاد دلاتے ہیں کہ دیکھو تم پر اللہ کے کیا کیا انعامات ہیں۔ یہ لوگ شام اور حجاز کے درمیان علاقہ حجر میں رہائش پذیر تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ تبوک میں گئے تو اپنے صحابہ کرام کے ساتھ آپ نے ان کے علاقے اور گھروں کا عبرت ناک دورہ فرمایا۔ حضرت صالح فرماتے ہیں کہ تمہارے اعمال کے پیش نظر اللہ تم سے یہ انعامات چھین سکتا ہے' ذرا خدا کا خوف کرو۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

"کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان' جو یہاں ہیں' بس یونہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو"۔

یہ لوگ ایسے معاشی حالات میں رہتے تھے جس کی تصویر کشی ان کے لیے ان کے بھائی صالح کر رہے تھے۔ لیکن یہ لوگ نہایت غفلت سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس بات کی کوئی فکر نہیں کر رہے کہ یہ انعامات دینے والا کون ہے۔ ان انعامات کا سرچشمہ اور آنے کی جگہ کون سی ہے۔ یہ لوگ اس منعم حقیقی کا تصور بھی نہیں کرتے جس نے یہ انعامات عطا کیے ہیں۔ چنانچہ رسول وقت نے ان کو اس طرف متوجہ کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرو ورنہ واپس لی جا سکتی ہیں۔

حضرت صالح نے ان کو ایسے جھٹکے دیئے کہ ان کے غافل دل جاگ اٹھیں اور اللہ کا خوف کریں۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ (۲٦:۱٤٦) "کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں' بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے"۔ مطلب یہ کہ کیا تم جس خوشحالی' عیش و عشرت اور نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہو' ہمیشہ رہو گے تمہیں کہیں جواب نہیں دینا ہے' کہیں نہیں جانا ہے۔ کسی بالائی قوت سے تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے۔ ان کے زوال کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو کہ حالات بدل بھی سکتے ہیں۔

ان باغات اور چشموں میں' ان فصلوں اور میوہ جات میں تاکستانوں اور نخلستانوں میں اور ان خوشگوار اور خوش ذائقہ میوہ جات میں' زود ہضم پھلوں میں اور پہاڑوں میں تم جو مکانات بناتے ہو' یا اپنی عیاشیوں کے لیے تم پہاڑوں جیسے اونچے مکانات بناتے ہو۔ اور یہ سب کام عبث ہے کیونکہ یہ تمہاری رہائش کی ضرورت سے بہت ہی زیادہ ہے۔ محض مہارت حسن اور عیش کے اظہار کے لیے۔

یوں حضرت صالح ان غافل لوگوں کو سخت جھٹکے دے کر جگانے کے بعد ان کو دعوت دیتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور ان لوگوں کی مخالفت کرو جو ظالم سردار ہیں اور جو ہر وقت شر و فساد اور ظلم کی طرف مائل رہتے ہیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

"اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے"۔

لیکن جب کسی قوم کے دل خشک ہو جاتے ہیں اور ان سے غور و فکر ختم ہو جاتا ہے۔ تو ایسی درد بھری پکاریں ان کو سنائی نہیں دیتیں۔ وہ کسی بات پر کان نہیں دھرتے اور ان کے دل نرم نہیں ہوتے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

انہوں نے جواب دیا "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے؟ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے"۔

ان کا جواب یہ تھا کہ اے صالح تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے' اس لیے تو یہ باتیں بغیر سوچے سمجھے کر رہا ہے۔ ان کے خیالات کے مطابق خدا کی طرف دعوت دینے والے مجنون ہوتے ہیں۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۲۶ : ۱۵٤) "تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے"۔ جب بھی انسانوں کے کسی گروہ کے پاس کوئی رسول آیا ہے۔ انہوں نے یہی کہا ہے کہ تو تو ہم جیسا ہی ایک آدمی ہے۔ انسانوں نے ہمیشہ رسولوں کے بارے میں اور رسالت کے بارے میں کوتاہ بینی سے کام لیا۔ وہ اس بات کو کبھی نہ سمجھ سکے کہ رسول بشر کیوں ہوتا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ انسانوں میں سے کسی کو رسول بنا کر بھیجنا دراصل انسانیت کے لیے ایک عظیم تکریم ہے کہ انسانوں میں سے کوئی شخص عالم بالا سے مربوط ہو جاتا ہے اور رشد و ہدایت کے سرچشمے یعنی اللہ تعالیٰ کے دربار سے براہ راست ہدایت پاتا ہے۔

انسانوں نے ہمیشہ رسولوں کو ایک دوسری مخلوق سمجھا۔ یا لوگوں نے یہ سمجھا کہ ایسا ہونا چاہیے کہ رسول انسانوں سے کوئی بالا و برتر مخلوق ہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک انسان غیب کی خبریں دے۔ نظروں سے اوجھل دنیا کی بات کرے اور یہ انسان یہ بات اس لیے کرتے تھے کہ لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ نے انسان کو یہ شرف بخشا ہے۔ کہ اس زمین میں رہتے ہوئے بھی اس انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ عالم بالا سے رابطہ رکھ سکے جو اس دنیا میں رہے۔ کھائے پیے۔ شادی کرے' سوئے بازاروں میں پھرے اور وہ سب کام کرے جو بشر کرتے تھے۔ میلانات اور جذبات رکھنے والا ہو لیکن اس کے باوجود وہ اس سر اعظم کا مالک ہو۔ وحی الٰہی کا مہبط ہو۔

پھر ہر دور میں انسانوں نے رسولوں سے معجزہ طلب کیا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ حضور ایک سچے رسول ہیں۔

فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۶ : ۱۵٤) "لاؤ کوئی نشانی اگر تم سچے ہو"۔ تو ثمود نے بھی معجزہ طلب کیا اور حضرت صالح نے جواب دیا کہ ہاں یہ ہے معجزہ یہ ناقہ ہے' یہ ناقہ کیسی تھی؟ ہم یہاں اس کی تعریف میں وہ رطب و یابس کہانیاں لانا نہیں چاہتے جو مفسرین نے دی ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی کہانی صحیح اور مستند روایت سے منقول نہیں ہے۔ ہاں یہ ایک معجزاتی ناقہ تھی۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

صالح نے کہا "یہ اونٹنی ہے 'ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی پینے کا۔ اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا"۔

یہ معجزاتی اونٹنی اس شرط پر آئی کہ جو محدود آبنوشی کی سہولتیں انہیں حاصل تھیں وہ ایک دن کے لیے ناقہ کے لیے وقف ہوں گی۔ اور دوسرا دن ان کے لیے اور ان کے مویشیوں کے لیے ہو گا۔ ناقہ کے دن میں یہ دخل اندازی نہ کریں گے اور نہ ناقہ ان کے دن پانی پیے گی۔ دونوں دنوں کا پانی اکٹھا نہ ہو گا۔ نہ ان کا دن ناقہ کے دن سے ملے گا اور نہ ناقہ کا ان کے دن سے۔ تو صالح علیہ السلام نے ان کو ڈرایا کہ اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرو گے۔ ورنہ ایک عظیم عذاب تم پر نازل ہو جائے گا۔

ان سرکشوں کے لیے یہ معجزہ کوئی مفید ثابت نہ ہوا۔ ان کے دلوں کے اندر ایمان بھی نہ داخل ہوا' ان کی روحانی دنیا پر ظلمتیں چھائی رہیں لیکن پانی ان کے لیے نصف ہو گیا۔ باوجود تاکید و وصیت کے ان سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے وعدہ خلافی کر دی۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

"مگر انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے"۔ عقر کے معنی ذبح کرنے کے ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے یہ کام کیا' یہ وہی تھے جو زمین میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے۔ ان کو حضرت صالح نے خوب ڈرایا تھا مگر وہ حضرت صالح کی تنبیہات کو خاطر میں نہ لائے۔ اس جرم کا عذاب پوری قوم کو ملا۔ اور سب پکڑے گئے۔

یہ لوگ آخر کار عذاب دیکھ کر نادم ہو گئے تھے لیکن وقت کے بعد ندامت کا فائدہ ہی کیا ہوتا ہے۔ وقت کے بعد ایمان اور تصدیق کا کیا فائدہ۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ

"عذاب نے انہیں آلیا"۔ یہاں اس عذاب کی تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ اس سورت میں تمام قصص کو اختصار کے ساتھ لانا مقصود تھا۔

اور اب آخری سبق :

۸

۱۹ع اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

۱۲

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے 'مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

---()()()---

درس نمبر ۱۶۷ تشریح آیات

۱۶۰ --- تا --- ۱۷۵

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٦٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٦١﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٦٣﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٤﴾

"لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

قصہ لوط یہاں لایا گیا ہے حالانکہ تاریخی اعتبار سے اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ لیکن اس سورت میں قصص کی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہاں اصل بات یہ دکھانی مطلوب ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی رہی ہے۔ طریقہ کار بھی سب کا ایک ہی رہا ہے اور جھٹلانے والوں کا انجام بھی ایک ہی رہا ہے۔ مکذبین کو ہلاک کیا گیا اور مومنین کو عذاب سے بچایا گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام بھی دعوت کا آغاز اسی طرح کرتے ہیں جس طرح حضرت نوح' حضرت ہود اور حضرت صالح علیہ السلام کرتے ہیں۔ قوم کی سرکشی اور عیاشی پر گرفت کرتے ہیں۔ ان کو خدا خوفی' ایمان اور اطاعت رسول کی طرف بلاتے ہیں۔ اور یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ اس ہدایت اور راہنمائی پر وہ ان سے کوئی مالی معاوضہ نہیں مانگتے۔

اس کے بعد حضرت ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ تم جس بدی میں مبتلا ہو اس کا ارتکاب انسانی تاریخ میں نہیں کیا گیا۔

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٦﴾

"کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو' اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو"۔

قوم لوط وادی اردن کی کئی بستیوں میں آباد تھی۔ یہ لوگ جس جرم کے عادی تھے وہ عمل قوم لوط کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی مردوں کی ہم جنس پرستی۔ اور عورتوں سے جنسی تعلق کو ترک کرنا۔ یہ نہایت ہی مکروہ فطری بے راہ روی تھی۔ کیونکہ مرد اور عورت کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور ہر ایک کے اندر ایک دوسرے کے لیے جاذبیت رکھی ہے۔ یہ اللہ کا ایک تخلیقی راز ہے۔ اس طرح اللہ نے انسانی زندگی کے تسلسل کا انتظام کیا۔ نسل کشی کا یہ انتظام اللہ نے مرد اور عورت کے درمیان ملاپ کے ذریعہ سے جاری کیا۔ یہ نظام بھی اللہ کے اس نظام کا ایک حصہ ہے جو اس نے اس پوری کائنات میں جاری فرمایا ہے۔ جس نے اس کائنات کے ہر شخص اور ہر چیز کو باہم مربوط کر دیا ہے اور اس طرح اس کائنات کا ہر شخص اور ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ حالت تعاون میں ہے۔ رہی یہ حرکت کہ مرد' مرد کے ساتھ جنسی تعلق قائم کریں تو یہ تعلق بے مقصد اور غیر پیداواری ہو گا۔ اور اس سے کوئی مقصد پورا نہ ہو گا۔ اور یہ عمل فطرت کے قانون اور فطرت کے نظام دونوں کے خلاف ہو گا جن کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ بعض بے ذوق لوگوں کو اس عمل میں لذت ملتی ہے حالانکہ حقیقی لذت وہ ہوتی ہے جس میں مرد اور عورت کا التقاء ہو اور اس کے نتیجے میں مقاصد فطرت بھی پورے ہوں۔ لہٰذا عمل قوم لوط فطرت سے کھلا انحراف ہے۔ لہٰذا اس قوم کی سزا یہی تھی کہ یا تو وہ باز آجائیں یا ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ کیونکہ ایسے لوگ قافلہ انسانیت اور گروہ انسانیت سے نکل گئے ہیں اور اب انہوں نے وہ مقصد پورا کرنا چھوڑ دیا ہے جس کے لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا تھا۔ یہ کہ سابقہ لوگوں کے فطری عمل سے یہ پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے فطری عمل سے آنے والی اقوام کو پیدا کرنا تھا۔

جب حضرت لوط نے ان کو دعوت دی کہ وہ اس غیر فطری بے راہ روی کو ترک کر دیں اور اس بات پر انہوں نے ان کی سرزنش کی کہ انہوں نے اس راہ کو ترک کر دیا جو رب نے ان کے لیے پیدا کیا ہے۔ انہوں نے فطرت کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اللہ کی تخلیق فطرت کو رد کر دیا ہے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی اس روش کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اللہ کی سنت اور فطرت کی طرف لوٹنے کو تیار نہیں ہیں۔

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾

"اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا"۔

حضرت لوط ان لوگوں میں باہر سے آکر بس گئے تھے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عراق سے آئے تھے۔ جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے ملک کو بھی چھوڑ دیا اور دریائے اردن عبور کر کے اس کے اس پار آباد ہو گئے تھے۔ حضرت لوط ان لوگوں میں آکر آباد ہو گئے تھے اور بعد میں اللہ نے حضرت لوط کو انہی کی طرف نبی بنا کر بھیج دیا تھا تاکہ قوم لوط کے اندر جو برے کام راہ پا گئے تھے' اس کی اصلاح فرمائیں۔ اب جبکہ وہ حضرت کی بات نہیں مانتے تو یہ دھمکی دیتے ہیں کہ اگر وہ باز نہ آئے تو اسے ملک سے نکال دیں گے۔ یعنی وہ تو اس فعل سے باز

نہیں سکتے۔ لوط ہی دعوت کا کام بند کر دیں۔

چنانچہ حضرت لوط ان کی دھمکی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ وہ تمہارے عمل کو نہایت ہی مکروہ عمل سمجھتے ہیں۔ یہ بہت بڑی گندگی اور گراوٹ ہے۔

قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ ﴿۱۶۸﴾

"اس نے کہا "تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں' میں ان میں شامل ہوں"۔ القلی کے معنی ہوتے ہیں شدید نفرت۔ حضرت لوط علیہ السلام یوں اظہار نفرت کر کے ان کے منہ پر تھوکتے ہیں' اور اس کے بعد رب تعالیٰ کی طرف دست بدعا ہوتے ہیں۔ کہ اے اللہ مجھے ان لوگوں سے نجات دے۔

رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶۹﴾

"اے پروردگار' مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے"۔ حضرت جس قسم کے معاشرے میں فرائض سرانجام دے رہے تھے وہ ان کے لیے عذاب تھا' وہ ان لوگوں کے ساتھ نہ چل سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں کا عمل فطرتاً بھی مردود ہے۔ لیکن ادائیگی فرض کے لیے ان میں رہ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی کہ انہیں اس معاشرے سے نجات مل جائے۔

رب تعالیٰ نے دعا قبول کر لی۔

فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿۱۷۰﴾ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿۱۷۱﴾

"آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچالیا' بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی"۔

یہ بوڑھی عورت کون تھی۔ یہ ان کی بیوی تھی۔ دوسری سورتوں میں تصریح آئی ہے۔ یہ بھی بڑی مکروہ عورت تھی کہ یہ ان لوگوں کی حمایت میں تھی جو یہ مکروہ فعل کرتے تھے اور ان کی مددگار تھی۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿۱۷۲﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنذَرِينَ ﴿۱۷۳﴾

"پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر برسائی ایک برسات' بڑی ہی بری بارش تھی' جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی"۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے گاؤں دھنس گئے اور پانی کے نیچے آگئے۔ ان گاؤں میں سے ایک گاؤں "سدوم" بھی تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ گاؤں بحر مردار کے پانی کے نیچے موجود ہے۔

بعض علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ ہے کہ بحر مردار کے نیچے ایسے گاؤں کے کھنڈرات ہیں جو کسی وقت آبادی سے بھرے ہوئے تھے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس دریا کے پاس ایک قلعے کے آثار دریافت کیے ہیں اور اس قلعے کے قریب ہی ایک مذبح ہے جس کے اوپر قربانیاں دی جاتی تھیں۔

بہرحال قرآن کریم نے حضرت لوط کے گاؤں کی کہانی اسی طرح پیش فرمائی ہے اور سابقہ اقوام کی خبروں کے سلسلے میں قرآن کریم ہی حقیقی اور سچا ماخذ ہے۔ کیونکہ اللہ کی کتابوں میں سے یہی محفوظ ہے۔

آخر میں وہی تبصرہ انہی الفاظ میں جو ہر قصے کے بعد آیا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٧٥﴾

۹
۱۲ ع
۱۳

”یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی“۔

---()()---

درس نمبر ۱۶۸ تشریح آیات

۱۷۶ --- تا --- ۱۹۱

كَذَّبَ أَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَا أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

"اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ شعیب نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہاں یہ قصہ بھی دوسرے قصص کی طرح محض عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ اصحاب ایکہ غالباً اہل مدین ہی کا نام ہے ایکہ ایک گہرے سائے والے ایسے درخت کو کہتے ہیں جو دہرا ہو گیا ہو۔ اور مدین کے گاؤں کو شاید ایسے بڑے بڑے درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ مدین حجاز اور فلسطین کے درمیان خلیج عقبہ کے کنارے تھا۔

ان کے سامنے حضرت شعیب نے وہی نظریہ حیات پیش کیا جو ہر رسول پیش کرتا چلا آیا ہے کہ اللہ کو ایک سمجھو، میری دعوت قبول کرو، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اس اصل دعوت کے پیش کرنے کے بعد پھر اہل مدین کے لیے دعوت کا مخصوص حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

"ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو"۔

جس طرح سورت اعراف اور ہود میں تفصیلات دی گئی ہیں کہ یہ لوگ ناپ اور تول میں مطفف تھے - یہ لوگ لیتے وقت جبراً لوگوں سے زیادہ لیتے تھے اور دیتے وقت یہ جبراً انکل سے کم دیتے تھے - لیتے وقت کم قیمت دیتے تھے اور دیتے وقت بہت مہنگے داموں فروخت کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی بستی کسی ایسے تجارتی شاہراہ پر تھی - جہاں سے قافلے گزرتے تھے - یہ لوگ ان تجارتی قافلوں پر اپنی مرضی نافذ کرتے تھے - ان کے رسول ان کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ عدل اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرو' کیونکہ صاف اور ستھرے عقیدے کا لازمی تقاضا ہے کہ معاملات میں بھی اچھائی اختیار کرو - یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اچھا عقیدہ اچھا عمل اختیار کرنے کا حکم نہ دے - اور حق 'انصاف اور عدل کے بارے میں نظریہ خاموش ہو جائے -

اب حضرت شعیب علیہ السلام ان کے دلوں میں تقویٰ اور خدا خوفی کا جوش پیدا کرتے ہیں - وہ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ایک ذات ایسی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے - یہ ذات تمام نسلوں کی پیدا کرنے والی ہے -

وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٨٤﴾

"اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے" - اس بات کا تو ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا بس انہوں نے آسان الزام لگا دیا کہ آپ پر جادو چل گیا ہے - اس لیے آپ غلط سلط باتیں کرتے ہیں - اور واہیات کہہ رہے ہیں -

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٨٥﴾

"انہوں نے کہا "تو محض ایک سحرزدہ آدمی ہے" - اور اگر آپ سحرزدہ نہیں ہیں تو پھر بھی ہم تیری رسالت کو نہیں مانتے اس لیے کہ تو تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے - رسول کوئی بشر نہیں ہو سکتا' لہٰذا تو جھوٹا ہے -

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿١٨٦﴾

"اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا' اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں" -

ہاں اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ہروقت ڈراتے ہو وہ لے کر آؤ اور آسمان کا کوئی ٹکڑا اتار ا ہم پر لا کر گرا دو - یا آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور ہم پر گرا دو" -

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٨٧﴾

"اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے" - یہ ایک ایسے شخص کا چیلنج ہے جو نہایت ہی سرکش 'مغرور اور لاپرواہ ہے - مکہ مکرمہ میں مشرکین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی مطالبہ کرتے تھے -

قَالَ رَبِّيٓ أَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُونَ ﴿۱۸۸﴾

"شعیب علیہ السلام نے کہا "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔ اور اس کے بعد پھر سیاق کلام میں جلد ہی فیصلہ چکا دیا جاتا ہے۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمۡ عَذَابُ يَوۡمِ ٱلظُّلَّةِۚ إِنَّهُۥ كَانَ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۸۹﴾

"انہوں نے اسے جھٹلا دیا آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا' اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا"۔

ان کے بعد عذاب کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ اس قدر گرمی ہوئی کہ دم گھٹ کر مرنے لگے۔ اس کے بعد انہیں ایک بادل سا نظر آیا۔ اس کی طرف لپکے کہ سایہ لیں۔ تو وہ اس قدر ٹھنڈا تھا جس طرح برف۔ پھر یہ بادل ایک کڑک کی شکل اختیار کر گیا اور ان کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ اس حوالے سے ان کے عذاب کو بادل کے ٹکڑے کے دن سے تعبیر کیا گیا۔

اور اب وہی تبصرہ اور سبق آتا ہے جو تمام قصص کے بعد اس پوری سورت میں دہرایا گیا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَأٓيَةٗۖ وَمَا كَانَ أَكۡثَرُهُم مُّؤۡمِنِينَ ﴿۱۹۰﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ﴿۱۹۱﴾

۱۰
ع ۱۲
۱۴

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

یہاں آکر اس سورت کے قصص ختم ہو جاتے ہیں اور اگلا سبق اس پوری سورت کے مضامین پر ایک تبصرہ ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۶۹ ایک نظر میں

یہاں آکر قصص کا اختتام ہو گیا۔ یہ تمام قصص رسولوں اور ان کی رسالت کی مختصر کہانی پر مشتمل تھے۔ قوموں کی طرف سے رسولوں کی تکذیب ہوتی رہی' اقوام منہ موڑتی رہیں۔ انہوں نے چیلنج کیا۔ معجزات بھی آئے اور جب تکذیب پر تل گئے تو پھر اللہ کا عذاب آگیا۔

اس سورت کا پہلا سبق ایک افتتاحیہ تھا' اس میں مشرکین مکہ کے حوالے سے حضور اکرم ؐ کو کہا گیا تھا۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳) إِنْ نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (٤) وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ (٥) فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (٦) (۲٦: ۳ — ٦)

"اے محمدؐ شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ ان لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب یہ جھٹلا چکے ہیں۔ عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں"۔ اس کے بعد قصص پیش کیے گئے۔ اور یہ نمونہ تھے ان خبروں کے جن کے بارے میں مکذبین ہمیشہ مذاق کرتے چلے آئے تھے۔

جب قصص ختم ہوئے تو سیاق کلام پھر اپنے موضوع کی طرف آگیا۔ یعنی سورت کے محور کی طرف۔ یہ آخری سبق گویا پوری سورت پر تبصرہ ہے اس میں تاکید کی جاتی ہے کہ یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے ہے۔ ان قصص پر تو مدتیں گزر گئیں لیکن قرآن کریم میں ان واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے۔ بنی اسرائیل کے علماء رسول اللہ کو بھی جانتے ہیں اور رسول اللہ پر نازل ہونے والے قرآن کو بھی جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے کیونکہ یہ وہی واقعات اور وہی رسول ہے جس کا ذکر پہلے نبیوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن مشرکین مکہ واضح دلائل دیکھتے ہوئے بھی از روئے عناد تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سحر ہے یا یہ شعر ہے۔ اگر یہ قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا اور وہ ان کے سامنے ان کی زبان میں اسے پیش کرتا تو پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے کیونکہ یہ انکار اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے بلکہ محض عناد کی وجہ سے یہ ایمان سے محروم ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ اخبار کاہنوں کی طرف

شیطانی القا کی طرح نہیں ہیں۔ نہ یہ قرآن شعر کی کوئی قسم ہے کیونکہ اشعار کا ایک منہاج ہے شعرا اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور شعرا تو ایک ایسا طبقہ ہے جو ہر وادی میں گھومتا ہے۔ یہ کسی خیال کسی جذبے اور کسی بھی میلان کو موزوں کر دیتے ہیں۔ کبھی اچھا، کبھی برا۔ رہا یہ کلام تو یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ مشرکین عرب کی نصیحت کے لیے۔ اور یاد دہانی کے لیے کہ سنبھل جائیں قبل اس کے کہ کوئی عذاب ان کو آلے۔ اور قبل اس کے کہ وہ باتیں حقیقت ہو کر ان کے سامنے آ جائیں جن کا یہ مذاق اڑاتے ہیں۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُونَ (۲۶:۲۲۷) "اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"۔

---○○○---

درس نمبر ۱۶۹ تشریح آیات

۱۹۲ --- تا --- ۲۲۷

وَإِنَّهُۥ لَتَنزِيلُ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ ٱلرُّوحُ ٱلْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ ٱلْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾

"یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو' جو (خدا کی طرف سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں' صاف صاف عربی زبان میں"۔

روح الامین سے مراد حضرت جبرئیل ہیں۔ حضرت جبرئیل نے قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا۔ اور جبرئیل جو کلام اللہ کی طرف سے لاتے ہیں۔ اس میں وہ حفیظ اور امین ہیں۔ اس طرح حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلام براہ راست عالم بالا سے پایا اور براہ راست اسے سمجھا۔ اور آپ کے دل میں اسے واضح عربی یعنی عربی مبین میں بٹھا دیا گیا تاکہ آپ لوگوں کو ان کی زبان میں ڈرائیں اور سمجھائیں اور یہ کلام ان پر پڑھیں۔ جبکہ عرب اچھی طرح جانتے تھے کہ انسان کی قدرت میں اچھے سے اچھا اسلوب کیا ہے اور انسان کسی حد تک عربی مبین میں بیان کر سکتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے اور سمجھتے تھے کہ قرآن کریم نے جس معجز اسلوب کے اندر یہ کلام اور پیغام پیش کیا ہے وہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ قرآن عربی میں تھا' اپنے منہاج' اپنے معانی' اور اپنی بلاغت اور اپنی تناسق کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ اس کا منبع کوئی انسانی منبع اور مصدر نہیں ہے۔

پھر اس عربی مبین کی دلیل سے ذرا دوسری دلیل کی طرف قارئین کی توجہ کو مبذول کیا جاتا ہے۔

وَإِنَّهُۥ لَفِى زُبُرِ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ ءَايَةً أَن يَعْلَمَهُۥ عُلَمَٰٓؤُا۟ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ﴿١٩٧﴾

"اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے۔ کیا ان (اہل مکہ) کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اسے علماء

بنی اسرائیل جانتے ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ذکر اور جو عقیدۂ توحید اور نظریہ حیات آپ پیش فرماتے تھے۔ یہ دونوں امور کتاب سابقہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری رسالت کا انتظار علمائے بنی اسرائیل بڑی بے صبری سے کرتے تھے اور وہ "اس رسول" کا انتظار کرتے تھے۔ پھر ان میں سے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ "اس رسول" کا زمانہ آ گیا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس کے بارے میں بات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت سلمان فارسی، عبداللہ ابن سلام اور دوسرے علماء بنی اسرائیل کی زبانی یہ باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔

یہ مشرکین مکہ تو محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے نہیں مانتے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے سامنے دلائل پیش کرنے میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اگر کوئی عجمی یہ قرآن لے کر آتا اور ان پر عربی زبان میں پڑھتا تو بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے۔ نہ تصدیق کرتے اور نہ یہ تسلیم کرتے کہ یہ قرآن ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ اس قدر معجزانہ دلیل کو بھی وہ مان کر نہ دیتے۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

"(لیکن ان کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ) اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصیح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سناتا تب بھی یہ مان کر نہ دیتے"۔

ان الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک گونہ تسلی ہے کہ آپ کے کام میں اور ہمارے کلام میں کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ درحقیقت یہ لوگ سخت عناد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں۔ اس لیے یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ نہیں مانیں گے اور یہ فیصلہ ان کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ اپنے عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ مانیں گے۔ یہ قضا و قدر کا فیصلہ بن چکا ہے۔ یہ اس روش سے پھر نہیں سکتے۔ بس اب عذاب کا انتظار کریں کہ یہ غفلت میں ہوں اور مارے جائیں۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

"اسی طرح ہم نے اس (ذکر) کو مجرموں کے دلوں میں گزارا ہے۔ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ عذاب الیم نہ دیکھ لیں"۔

قرآن کریم ان کی جانب سے تکذیب کا نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ یہ تکذیب ان کے ساتھ چپکی رہے گی اور یہ لوگ اسی طرح تکذیب کی حالت میں رہیں گے اور قرآن کریم کا انکار کرتے رہیں گے۔ ان کے دلوں کے اندر سے تکذیب کی روگزار دی گئی ہے۔ تکذیب ان کے دل ہی میں جاری ہے۔ یہ ایسے ہی حالت میں ہوں گے کہ ان کو عذاب الیم پکڑے گا۔ یہ عذاب اچانک آئے گا۔ ان کو اس کا کوئی احساس نہ ہو گا۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہی حالت میں رہے کہ واصل

جنم ہوئے یا مارے گئے اور جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے ۔

فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

"پھر جب وہ بے خبری میں ان پر آپڑتا ہے اس وقت وہ کہتے ہیں کہ "کیا اب ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟"
یعنی کیا ہمیں دنیا میں ایک اور مہلت دے دی جائے گی تاکہ ہم اصلاح کر سکیں ۔ اے کاش کہ ایسا ہو جائے ۔
کفار مکہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ تم جو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو اور اس کے قصے سناتے ہو' لاؤ وہ عذاب کہ دیکھیں ۔ یہ مذہب کا مذاق اڑاتے تھے ۔ کیا یہ لوگ اس قدر بے باک اور مغرور ہو گئے ہیں اس لیے کہ یہ خوشحال ہیں ۔ عیاشیوں نے ان کو غبی بنا دیا ہے اور یہ خدا کے عذاب کو بعید الوقوع قرار دیتے ہیں ۔ ان کی حالت ہمیشہ کے کھاتے پیتے لوگوں کی سی ہے ۔ ایسے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے ۔ یہ حالات کے بدلنے کا تصور بھی نہیں کرتے ۔
یہاں ان کو ایسی غفلت سے جگایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی حالت ایسی ہو گی کہ یہ دنیا کا سب سازوسامان بے کار ہو جائے گا اور کوئی شے بھی ان کو فائدہ نہ دے سکے گی ۔

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾ أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾

"تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا' اگر ہم انہیں برسوں تک عیش کرنے کی مہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آجائے جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامان زیست جو ان کو ملا ہوا ہے' ان کے کس کام آئے گا؟"
ایک طرف ان کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس میں شتابی ہے اور دوسری جانب عذاب کا نزول ہے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ عیش و عشرت کی جو طویل زندگی وہ بسر کر رہے تھے وہ گویا تھی ہی نہیں ۔ اس پوری زندگی میں ان کے لیے کوئی فائدہ نہ ہو گا اور نہ اس میں کوئی ایسا عمل ہو گا جس کی وجہ سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف ہو ۔
ایک صحیح حدیث میں ہے "کافر کو لایا جائے گا اور آگ میں اسے ایک غوطہ دیا جائے گا ۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ تم نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بھلائی (اور آرام) دیکھا بھی ہے؟ کیا تم نے کوئی خوشحالی دیکھی ہے؟ وہ کہے گا نہیں' خدا کی قسم' پروردگار میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا ۔ اور پھر ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں بدترین حالات میں تھا اور اسے جنت کا ایک رنگ دکھایا جائے گا ۔ پھر اس سے کہا جائے گا ۔ کیا تو نے برے دن بھی کبھی دیکھے ہیں؟ تو وہ کہے گا خدا کی قسم اے رب ذوالجلال! مجھ پر تو برے دن کبھی آئے ہی نہیں ۔ (ابن کثیر)
اس کے بعد ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ یہ جو تمہیں خبردار کیا جا رہا ہے تو اس لیے کہ تم پر ہلاکت بڑی تیزی سے آ

رہی ہے اور اللہ کی رحمت کا تو یہ تقاضا ہے کہ کسی بستی کو اس وقت تک ہلاک نہ کرے جب تک رسول نہ آئے - یہ اللہ کی سنت ہے -

وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ۝ ذِكۡرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۝

"(دیکھو) ہم نے کبھی کسی بستی کو اس کے اہل ہلاک نہیں کیا کہ اس کے لیے خبردار کرنے والے حق نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے اور ہم ظالم نہ تھے"۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے یہ فطری عہد لیا ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کریں گے اور اسے وحدہ لاشریک سمجھیں گے - انسان کی فطرت از خود ایک خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کرتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر فساد اور انحراف پیدا نہ ہو جائے - (پارہ ۹، ص ----) اور پھر اللہ نے اس کائنات میں دلائل کا ڈھیر لگا دیا - یہ تمام دلائل اس بات کی طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق موجود ہے - اگر لوگ اس فطری عہد کو بھول جائیں اور دلائل ایمان پر غور نہ کریں تو پھر ان کے پاس ایک ڈرانے والا آتا ہے جو ان کو یہ فطری سبق یاد دلاتا ہے اور خواب غفلت سے ان کو جگاتا ہے - اس معنی میں رسالت ایک یاد دہانی اور سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے سے عبارت ہے - اور یہ اللہ کا رحم و کرم ہے کہ اللہ نے اپنے اوپر پیغمبر بھیجنا لازم کر دیا کہ ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیجیں - جب رسول آتا ہے اور لوگ پھر بھی نہیں مانتے، نہیں یاد کرتے اور نہیں جاگتے تو یہ ان کی ناکامی ہوتی ہے - اور وہ راہ ہدایت ترک کر دیتے ہیں - لہٰذا عذاب حق ہو جاتا ہے -

---()()()---

قرآن کریم کے بارے میں ایک جدید بحث :

وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ ۝ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهُمۡ وَمَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۝ اِنَّهُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ ۝

"اس (کتاب مبین) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں، نہ یہ کام ان کو سجتا ہے، اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں - وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں"۔

اس سے قبل قرآن کریم کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے اور اسے روح الامین لے کر آتے ہیں - اور اس کے بعد بات آگے نکل گئی کہ یہ لوگ تکذیب پر تل گئے ہیں اور اپنی نادانی سے عذاب کے آنے میں شتابی کر رہے ہیں - لیکن قرآن کے بارے میں وہ یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ یہ شیاطین کی طرف سے القاء ہوتا ہے - جس طرح کاہنوں پر شیاطین کچھ کلمات القا کرتے ہیں جن میں بعض خبریں غیب کی ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے وہ کہانت کی

دکان چمکاتے ہیں۔

لیکن یہاں اس کی تردید کی جاتی ہے کہ ہر مذہب و ملت جانتی ہے کہ شیطان کا کیا کام ہوتا ہے جبکہ قرآن تو اصلاح اور ہدایت کا کام کرتا ہے۔ اور شیطان ہر مذہب و ملت کے تصور کے مطابق برائی گمراہی اور ضلالت کی دعوت دیتا ہے۔

پھر شیطانی قوتوں کے اندر یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ قرآن نازل کر سکیں۔ اللہ کی جانب سے نزول وحی اور قرآن کا انتظام نہایت محفوظ ہے۔ اس کو تو روح الامین 'رب العالمین کے حکم سے نہایت حفاظت اور امانت و دیانت سے لاتے ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اب روئے سخن حضور اکرم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو شرک سے ڈرایا جاتا ہے حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کا وقوع ایک مستبعد امر ہے۔ دراصل حضورؐ کو کہ کراست کو ڈرایا جاتا ہے اور آپ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ اپنے قریبی لوگوں کو ڈرائیں۔ اللہ پر بھروسہ کریں۔ اللہ ہمیشہ آپ کی نگرانی اور نگہبانی کرتا ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِیْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۲۲۰﴾

"پس اے نبیؐ' اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو' ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ' اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں۔ ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ' لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں' تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' اس سے میں بری الذمہ ہوں اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جب تم اٹھتے ہو' اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے سوا کسی اور کو پکاریں تو وہ بھی معذبین میں سے ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ محال ہے اور اللہ نے سمجھانے کے لیے فرض کیا ہے۔ تو پھر اور لوگ کس باغ کی مولی ہیں۔ جو لوگ رات اور دن اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ کس طرح عذاب الٰہی سے بچ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں کوئی رو رعایت نہیں ہیں۔ رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر اس نے اس عظیم جرم کا ارتکاب کیا تو.... بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب سے ڈرانے کے بعد اب یہاں آپ کے رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے لوگ زیادہ ڈر جائیں' اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار (مثلاً ابوطالب) ایمان نہ لائے اور شرک پر مرے تو معذبین میں سے ہو گا تو اور لوگوں کے لیے جاننا چاہیے کہ کوئی رعایت نہ ہو گی۔

بخاری اور مسلم شریف میں منقول ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی تو آپ کوہ صفا پر چڑھے۔ اور پکارا "یاصباحاہ" تو

سب لوگ جمع ہوگئے۔ ہر شخص دوڑ کر آپ ؐ کے پاس پہنچ گیا یا اس نے اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا بنی عبدالمطلب یا بنی مرہ' یا بنی لوئی دیکھو! اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ پہاڑ کی اس طرف سے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو تم میری تصدیق کرو گے؟ تو انہوں نے کہا' ہاں۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ میں تمہارے لیے ڈرانے والا ہوں اور ایک شدید عذاب تمہارے انتظار میں ہے اس پر ابولہب نے کہا "تم پر ہلاکت ہو سارے دن کے لیے"۔ کیا تم نے صرف اس بات کے لیے ہمیں بلایا اور اسی موقعہ پر یہ سورت بھی نازل ہوگئی۔ تبت یدا ابی لہب و تب امام مسلم نے اپنی سند سے حضرت عائشہ ؓ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶: ۲۱۴) "اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ"۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور فرمایا "اے فاطمہ ؓ بنت محمد' اے صفیہ بنت عبدالمطلب' اے اولاد عبدالمطلب' میں تمہارے بارے میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ میرے مال کے بارے میں تم جو چاہتے ہو' مجھ سے لے سکتے ہو"۔

امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے یہ نقل فرمایا ہے۔ کہتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بلایا تو آپ ؐ نے عام بات بھی کی اور خاص بات بھی کی۔ فرمایا اے اہل قریش ' اپنے نفوس کو آگ سے بچاؤ' اے اولاد کعب اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' اے فاطمہ ؓ بنت محمد اپنے نفس کو آگ سے بچاؤ' خدا کی قسم میرے پاس تمہارے لیے خدا کے ہاں کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ میں تمہارا رشتہ دار ہوں۔

تو احادیث اور ان کے ساتھ دوسری احادیث ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو اس طرح لیا اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو کس طرح خبردار کیا اور آخرت کے معاملے میں ان کو اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ان کے سامنے صاف صاف کہہ دیا کہ میری قرابت کسی کو وہاں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اگر تمہارے لیے تمہارا عمل نافع نہ ہوا۔ اور یہ کہ تمہارے لیے میرے پاس اللہ کے ہاں کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ حالانکہ آپ اللہ کے رسول تھے۔ غرض یہ ہے اسلام اور اس کی صاف صاف تعلیم' بالکل واضح اور دو ٹوک بات اور اللہ اور بندے کے درمیان ہر قسم کے واسطوں کی نفی۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی واسطہ اور وسیلہ نہیں ہیں۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ جن مومنین نے تمہاری دعوت کو قبول کر لیا ہے ان کے ساتھ تمہارا معاملہ کیسا ہو گا۔

وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶: ۲۱۵) "اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ"۔ پروں کو ان کے لیے بچھانے سے مراد تواضع کرنا اور نرمی کرنا ہے۔ نہایت ہی مجسم اور حسی انداز میں بیان فرمایا کہ جب پرندہ اترتا ہے تو پروں کو پوری طرح بچھاتا ہے اور رفتار نرم کرتا ہے۔ حضور اکرم نے اپنی پوری زندگی میں اہل ایمان کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ کیونکہ آپ کے اخلاق بعینہ قرآن تھے آپ کی زندگی قرآن کریم کا عملی ترجمہ تھی۔

اور جو لوگ آپ کی نافرمانی کرتے ہیں ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں اور ان سے اپنی برات کا اعلان کر دیں۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۶ : ۲۱٦) "اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دیں کہ میں ان باتوں سے بری الذمہ ہوں جو تم کرتے ہو"۔ یہ روش مکہ میں تھی' اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی راہ میں لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ اب قرآن کریم آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یہ تسلی دیتا ہے کہ اللہ بروقت آپ کا نگران ہے اور بہت قریب سے دیکھ رہا ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۲۶ : ۲۱۷) الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (۲۶ : ۲۱۹) اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲۶ : ۲۲۰) "اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر وہ نگاہ رکھتا ہے' وہ سب کو سننے اور جاننے والا ہے"۔ ان کو' ان کی نافرمانیوں کے اندر چھوڑ دیں۔ اور ان کے اعمال سے اپنی برات کا اظہار کر دیں۔ اور اپنے رب پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوں اور ہر معاملے میں رب کریم سے استعانت طلب فرمائیں۔ یہاں اللہ کی دو صفات بیان کی گئی ہیں' جو اس سورت میں بار بار آتی ہیں یعنی صفت عزت اور صفت رحمت۔ اس کے بعد قلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انس اور محبت کا شعور دیا جاتا ہے کہ تمہارا رب تمہیں اس وقت بھی دیکھ رہا ہے جب تم اکیلے نماز میں ہوتے ہو اور اس وقت بھی دیکھ رہا ہے جب تم نمازیوں کے اندر ہوتے ہو۔ یعنی وحدت کی حالت میں بھی تمہیں دیکھ رہا ہے اور اجتماعی حالت میں بھی اس کی نظر تم پر ہے۔ یعنی جب تم ساجدین یعنی اہل ایمان کے اندر ہوتے ہو ان کی تربیت کرتے ہو' ان کی امامت کرتے اور انہیں خطبہ دیتے ہو' اللہ آپ کی حرکات و سکنات کی نگرانی کر رہا ہے اور آپ کے دعوتی کام اور درپیش خطرات کو بھی دیکھ رہا ہے وہ سمیع و علیم ہے۔

اس انداز تعبیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ شعور پیدا کرنا مطلوب ہے کہ اللہ آپ کے قریب ہے' دیکھ رہا ہے اور عنایات کر رہا ہے۔ یوں رسول اللہ یہ یقین رکھتے تھے کہ آپ اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ اللہ کے جوار رحمت میں ہیں۔ چنانچہ اس خوشگوار ماحول محبت میں آپ زندگی بسر کرتے تھے۔

---○○○---

اس سورت کا یہ آخری سبق زیادہ تر قرآن کے بارے میں ہے۔ اس کے بارے میں ایک تاکید تو یہ کی گئی کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ دوسری یہ کہ روح الامین اسے لے کر آئے تیسری یہ کہ اس کے نزول میں شیاطین کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں پھر تاکید کی جاتی ہے کہ شیاطین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے اتر سکتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو سچے' امین اور ایک پاک و صاف زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ شیاطین تو جھوٹوں' کذابوں' بدکرداروں اور دھوکہ باز کاہنوں پر اترتے ہیں۔ اور یہ تو کاہن اور گمراہ مذہبی پیشوا ہیں جو شیطانی باتیں لے کر اور ان میں رنگ بھر کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَٰذِبُونَ ﴿٢٢٣﴾

"لوگو' کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز' بدکار پر اترا کرتے ہیں ۔ سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں" ۔

عربوں میں کاہن ہوا کرتے تھے' ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جن انہیں غیب کی خبریں دیتے ہیں اور لوگ ان کے ہاں جاتے تھے ۔ اور ان کی پیش گوئیاں سنتے تھے ۔ ان کاہنوں میں سے اکثر جھوٹے ہوتے تھے ۔ ان کاہنوں کی تصدیق وہ لوگ کرتے تھے جو ہر قسم کے اوہام اور ہر قسم کے افسانوں پر یقین کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے لیکن یہ کاہن بہرحال لوگوں کو کسی بھلائی کی طرف نہ بلاتے تھے ۔ اور نہ لوگوں کی قیادت راہ ایمان کی طرف کرتے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال ان سے بہت مختلف تھا ۔ رسول اللہ تو قرآن کے ذریعہ ایک نہایت ہی ٹھوس نظام زندگی کی طرف بلاتے تھے ۔

یہ کاہن قرآن کے بارے میں بھی کہتے یہ شعر ہے ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے کہ آپ شاعر ہیں ۔ لیکن وہ حیران تھے کہ یہ قرآن بہرحال ایک بے مثال کلام ہے' لوگوں کے دلوں تک اتر جاتا ہے ۔ لوگوں کے اندر ایک نیا شعور پیدا کرتا ہے اور اس کے اس قدر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں کہ عوام اسے رد نہیں کر سکتے ۔

چنانچہ اس سورت میں اس نکتے کی وضاحت کر دی گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو نظام پیش کر رہے ہیں اور قرآن کریم جو نظام پیش کر رہا ہے' یہ کوئی شاعرانہ کلام اور سوچ نہیں ہے ۔ قرآن کریم ایک ہی نظریہ اور ایک ہی منہاج پر اول سے آخر تک چل رہا ہے ۔ اس کے سامنے ایک ہی متعین مقصد اور نصب العین ہے ۔ وہ اپنے نصب العین کی طرف سیدھا آگے بڑھ رہا ہے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہی منہاج ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ آپ آج ایک بات کریں اور کل اس کے برعکس بات کریں ۔ آپ کبھی بھی بدلتے ہوئے میلانات و رجحانات اور وقتی خواہشات کے پیچھے نہیں پھرتے ۔ ایک ہی دعوت ہے جسے آپ لے کر آئے ہیں اور وہی دے رہے ہیں ۔ ایک ہی عقیدہ ہے جو آپ پیش فرما رہے ہیں اور آپ ایک ایسے منہاج کے مطابق کام کر رہے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے ۔ جبکہ شعراء ایسے نہیں ہوتے ۔ شعراء بدلتے ہوئے تاثرات اور وقتی جذبات کے اسیر ہوتے ہیں ۔ ان پر ان کے شعور کی حکمرانی ہوتی ہے ۔ جس طرح شعور ہوتا ہے' اسی کا وہ اظہار کر دیتے ہیں ۔ ایک ہی وقت میں وہ ایک ہی حقیقت سیاہ دیکھتے ہیں تو اسے سیاہ کہہ دیتے ہیں ۔ اسی بات کو وہ اگلے لمحے میں سفید دیکھتے ہیں تو اسے سفید کہہ دیتے ہیں ۔ اگر کسی سے راضی ہوئے تو مدح کرتے ہیں اور اگر ناراض ہوئے تو مذمت کرتے ہیں ۔ پھر ہر شاعر کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اس کی اپنی شاعری ہوتی ہے ۔

پھر یہ شعراء اپنے لیے خود ایک جہاں پیدا کرتے ہیں اور اسی میں بہ گم گشتہ ہوتے ہیں ۔ یہ بعض افعال اور بعض اچھی نتائج تخلیق کرتے ہیں اور پھر ان کو حقائق مان کر خود ان سے متاثر ہوتے ہیں ۔ اس لیے یہ عملی لوگ نہیں ہوتے کیونکہ یہ اپنی خیالی دنیا میں گم رہتے ہیں ۔

لیکن جو شخص ایک متعین دعوت لے کر اٹھتا ہے اس کا مزاج شاعرانہ نہیں ہوتا ۔ متعین دعوت کا حامل تو اس دعوت کو عملاً دنیا میں قائم دیکھنا چاہتا ہے ۔ کسی بھی داعی کا ایک متعین ہدف اور نصب العین ہوتا ہے ۔ پھر ہر داعی نے اپنی دعوت کے قیام کے لیے ایک طریق کار متعین کر دیا ہوتا ہے ۔ وہ اس متعین راہ پر' ایک متعین سمت کی طرف جاتا ہے ۔

ادھر ادھر نہیں بھٹکتا۔ اس کی نظریں تیز ہوتی ہیں۔ عقل زندہ ہوتی ہے۔ وہ اوہام اور تخیلات کی دنیا میں زندہ نہیں رہتا۔ نہ وہ محض خیالی نقشہ پیش کر کے خوش ہوتا ہے۔ وہ اپنے نقشے پر عملی دنیا تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

لہذا رسولوں کے منہاج اور شعراء کے منہج کے درمیان جو بڑی فرق اور وجہ ہے۔ ان دونوں کے اندر یقیناً کوئی اشتراک نہیں ہے۔ اور یہ بات کوئی زیادہ پیچیدہ بھی نہیں ہے۔ کہ اسے نہ سمجھا جا سکے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾

"رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے تھے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں"۔

یہ لوگ چونکہ خواہشات نفس اور اپنے مزاج کے پیچھے چلتے ہیں لہذا اکثر بہکے ہوئے لوگ شعراء کے پیچھے چلتے ہیں کیونکہ اکثر بہکے ہوئے لوگ بھی ہوائے نفس کے بندے ہوتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کا کوئی متعین نصب العین نہیں ہوتا۔

یہ ذہنی شعور اور تخیل کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ تخیلات، تصورات اور اوہام کی وادیاں بہت ہی وسیع ہوتی ہیں، یہ اپنے تاثرات کے مطابق ان میں سے کسی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں، جس وقت ان کا دل جس وادی سے متاثر ہوئے، اس میں پھرنے لگتے ہیں۔

پھر یہ جو باتیں کرتے ہیں وہ غیر عملی ہوتی ہیں کیونکہ یہ ایسی دنیا میں زندہ ہوتے ہیں جو انہوں نے خود پیدا کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ تخیلات کی دنیا ہوتی ہے اور ان کے شعور میں ہوتی ہے۔ اس دنیا کو یہ کرۂ ارض پر عملی دنیا سے دور رکھتے ہیں کیونکہ عملی حقائق چونکہ تلخ ہوتے ہیں اس لیے وہ ان کو پسند نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ بہت سی باتیں بناتے ہیں لیکن ایسا کرتے نہیں۔ کیونکہ ان کی دنیا عمل کی نہیں بلکہ وہم و گمان کی دنیا ہوتی ہے۔ اب نظر آنے والی دنیا میں ان کی دنیا کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

اب اسلام کو دیکھو کہ وہ تو ایک عملی نظام زندگی ہے اور اس کے ہر حکم کے لیے حکم یہ ہے کہ اسے عملاً قائم کیا جائے۔ اسلام گویا ایک عظیم تحریک ہے جو ضمیر و وجدان کی دنیا میں بھی ہے۔ عقائد و تصورات کی دنیا میں بھی ہے اور پھر یہ تحریک عملی دنیا میں بھی ہے۔ لہذا اسلام کی دنیا شعراء کی دنیا سے بالکل مختلف ہے کیونکہ شاعر اپنے ذہن میں ایک سوچ کی تخلیق کرتا ہے اور اس میں گم ہو جاتا ہے جبکہ اسلام جو عقیدہ اپناتا ہے اسے عملی شکل دیتا ہے۔ گویا اسلام اعلیٰ تصورات کو عملی شکل دیتا ہے۔ اور اعلیٰ تصورات کو عمل اور اخلاق میں ظاہر کرتا ہے۔

اسلام لوگوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ عملی حقائق سے فرار اختیار نہ کرو اور موہوم خیالات کی طرف نہ بھاگو۔ اگر کوئی عملی حقیقت تمہیں پسند نہیں ہے تو اس سے بھاگ کر تخیلات کے قلعوں میں پناہ نہ لو۔ بلکہ اس پر حملہ آور ہو جاؤ اور حالات اور واقعات کو اپنی منشا کے مطابق بدل کر رکھ دو لیکن شاعر صاحب کا یہ کام نہیں ہوتا۔

اسلام انسانوں کی پوری قوت کو مجتمع کر کے اعلیٰ قدروں کی عملی دنیا تعمیر کرنے پر صرف کرتا ہے وہ اپنی کسی قوت کو بھی موہوم تخیلات کی دنیا میں رہ کر برباد نہیں کرتا۔ یہاں تک تو اسلام شعروفن کو رد کرتا ہے اگر وہ عملی نہ ہوں۔

لیکن اسلام شعروفن کا مطلقاً خلاف نہیں ہے۔ جو لوگ قرآن مجید کے ان الفاظ کو پڑھتے ہیں اور سرسری طور پر پڑھتے ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ قرآن شعروسخن کے مطلقاً خلاف ہے۔ دراصل قرآن کریم اس منہاج کے خلاف ہے جس پر ہمیشہ شعراور فن چل نکلتا ہے یعنی ایک تخیلاتی اور وہمی منہاج جس کے اندر عمل کی کوئی صورت نہ ہو۔ تخیل اور مبالغہ ہی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہم و خیال کی دنیا تو پھر بہت ہی وسیع ہے' انسان اس کے اندر غرق ہو جاتا ہے لیکن جب انسان کا شعور پختہ ہو جاتا ہے اور اس کے تاثرات شعروفن پختہ ہو جاتے ہیں تو وہ شعوری اور تخیلاتی دنیا میں بھی کام کرتے ہیں اور عملی دنیا میں بھی کام کرتے ہیں۔ ایسے عملی تخیلات پھر اخلاقی لحاظ سے بھی پاک ہوتے ہیں۔ اور جب کوئی صاحب فن اسلامی رنگ میں رنگا جاتا ہے تو وہ محض اوہام و تخیلات کی دنیا میں قید نہیں ہوتا وہ عمل اور حکمت کی دنیا میں آتا ہے اور اس کے خیالات پھر بہت ہی قیمتی' صاف اور روایتی شعراء سے مختلف ہوتے ہیں۔

جب کسی کی روح میں ایک مستقل منہاج رچ بس جاتا ہے۔ اس کا ایک اسلامی نصب العین قرار پاتا ہے۔ پھر وہ دنیا کو اسلام نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسلام کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اسلام کے زاویہ سے دیکھتا ہے تو اس کا فن شعرسخن بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ایسے معیار پر اسلام شعروسخن اور فن کے خلاف نہیں رہتا جیسا کہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ سے نظر آتا ہے۔

قرآن کریم نے تو خود انسانی عقل' سوچ اور خیال کو اس دنیا کے عجیب و غریب مظاہر اور حقائق کی طرف متوجہ کیا ہے۔ خود نفس انسانی کے اندر جو عجائبات ہیں' جن میں انسانی تخیلات اور تمام نفسیاتی انفعال شامل ہیں' پہ غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ شعروسخن کا مواد تو انسان کے نفسیاتی انفعال ہی سے بنتا ہے اور قرآن کے اندر جگہ جگہ اس کائنات کی عجیب تخلیق اور نفس انسانی کے عجیب انفعال پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور قرآن نے یہ دعوت اپنے اسلوب میں دی ہے کہ آج تک کوئی شاعر اس کمال اور بلندی تک نہیں پہنچ سکا۔ اپنی خوبصورتی' اپنی فصاحت اور قدرت تصور کے اعتبار سے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم سابقہ عمومی تبصرے کے اندر استثناء پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن مطلقاً شعروسخن اور فن کے خلاف نہیں ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴿٢٢٧﴾

"بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے' اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا۔ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"۔

لہٰذا اہل ایمان ان لوگوں میں داخل نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایمان لائے تو ان کے دل و دماغ اسلامی عقیدہ اور ایمان

سے بھر گئے۔ ان کی زندگی ایک منہاج پر رواں ہو گئی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں نیک عمل کرنا شروع کر دیا اور ان کی قوتیں اعمال صالحہ اور خوبصورت بھلائی کی راہ پر صرف ہونے لگیں۔ وہ صرف اوہام و تخیلات کی دنیا سے باہر آگئے۔ اور انہوں نے اپنے فن کو بھی اپنے نظریہ کے لیے استعمال کیا۔ یعنی کسی نے ان پر ظلم کیا تو انہوں نے بدلہ لے لیا۔ یعنی جس سچائی کو انہوں نے عملاً قبول کیا اس کی حمایت میں ان کا فن بھی میدان میں آگیا۔

ایسے ہی اہل فن میں، معرکہ توحید شرک کے ابتدائی دور میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت حسان ابن ثابت، کعب ابن مالک، عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہم شعراء انصار میں سے تھے اور عبداللہ ابن الزبعری ابوسفیان ابن الحارث ابن عبدالمطلب تھے۔ یہ دونوں ایام جاہلیت میں حضور اکرمؐ کی ہجو بھی کرتے تھے۔ جب مسلمان ہوئے اور خوب ہوئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں بھی خوب کمالات دکھائے۔ اور اسلام کی مدافعت کی۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان ابن ثابتؓ کو حکم دیا "ان کی ہجو کرو اور جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں"۔ عبدالرحمن ابن کعب نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے شعراء پر اشعار میں بھی نازل کیا ہے جو کچھ نازل کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی جہاد کرتا ہے، اس خدا کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جس چیز سے تم ان کو مارتے ہو وہ تیروں کی بارش ہے"۔ (امام احمد)

اسلامی شعر و فن کا تحقق مختلف اسالیب میں ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ ایک صورت جو ابتدائے اسلام میں وجود میں آئی اور اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی لیکن اسلامی تصور حیات کے مطابق شعر و سخن کے اور دائرے بھی بے شمار ہیں جن کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ اسلامی فن وہی ہو گا جو اسلام کے دفاع میں ہو۔ یا براہ راست اس میں دعوت اسلامی موجود ہو۔ یا جس میں اسلام کی تعریف ہو، پیغمبر اسلام کی تعریف ہو یا اکابر اسلام کی تعریف و تمجید ہو۔ یا اللہ کی حمد و ثنا؟ یہ ضروری نہیں ہے کہ شعر اگر ان موضوعات پر ہو تو اسلامی ہے اور اگر ان پر نہ ہو تو اسلامی نہیں ہے۔ گردش لیل و نہار پر ایک شاعرانہ نظر، اور مناظر کائنات پر ایک ایسی نظر جس کے ذریعے ایک مسلم کا شعور اور اس کا تخیل قدرت الہیہ کا احساس کرتا ہو، حقیقی اسلامی فن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک لمحہ جس میں انسان کے دل و دماغ پر اللہ کی حکمت روشن ہو جاتی ہے۔ اور جس کے اندر انسان اس کائنات کے عجوبات کا احساس کرتا ہے۔ ایسے لمحات ہی میں اسلامی ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔

اسلامی فن اور غیر اسلامی فن کے درمیان امتیاز اس سے ہوتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک تصور حیات ہے۔ اسلامی سوسائٹی کے اندر روابط کی ایک مخصوص شکل پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی فن اسلامی تصورات، اسلامی روابط کے اور اسلامی اخلاق کی اساس پر تخلیق ہوتا ہے تو وہ اسلامی ہے اور اسے اسلام پسند کرتا ہے ورنہ نہیں ہے۔

اور سورت کا خاتمہ اس دھمکی اور مجمل تہدید پر ہوتا ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶:۲۲۷) "اور ظلم کرنے والوں کو

عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"۔ اس پوری سورت کا مضمون یہ رہا اور اس میں مشرکین کے عناد اور ہٹ دھرمی کی تصویر کشی کی گئی۔ یہ بتایا گیا کہ وہ اللہ کی وعید کے مقابلے میں سرکشی کرتے رہے بلکہ الٹا عالم غرور میں عذاب کے جلدی نزول کا مطالبہ کرتے رہے۔ نیز اس سورت میں ایسے تمام لوگوں پر نازل ہونے والے عذابوں کی تصویر کشی بھی کی گئی اور مختلف رسولوں کے انجام دکھائے گئے۔

اس لیے سورت کے آخر میں مجملاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالف قوتوں کو بھی سمجھا دیا گیا کہ تم بھی ذرا اپنی خیر مناؤ کہ تمہارا انجام کیا ہونے والا ہے۔ گویا کفار مکہ ذہنی دنیا پر یہ آخری ضرب ہے۔ اور ایسے الفاظ میں ہے کہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے مطابق ہر شخص کا خیال اس سے معانی پہچان سکتا ہے۔ لہذا یہ مشرکین کے ایوان میں ایک زلزلہ ہے جو سورت کے آخر میں برپا کر دیا گیا۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ---- چہارم

پارہ ------ ۱۹

سورۃ النمل - ۲۷

۱ --- تا --- ۵۹

سورۃ النمل ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے اور یہ سورت شعرا کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ بھی سورت شعراء کے انداز میں چلتی ہے۔ ایک مقدمہ ہے۔ ایک تعقیب و تبصرہ ہے۔ اس میں سورت کا بنیادی موضوع اور محور بنایا گیا ہے۔ اور مقدمہ اور آخری تبصرے کے درمیان قصص ہیں جن سے موضوع کو ثابت کیا جاتا ہے۔ جابجا اس طرف اشارہ ہے کہ سابق انبیا کی دعوتوں کے مقابلے میں ردعمل اور موجودہ دعوت کے مقابلے میں آنے والا ردعمل ایک ہی جیسا ہے۔ یہ مسلمانوں کو یہ سبق سکھانے کے لیے کہ اللہ کی سنت بھی ایک ہے اور تمام رسالتوں اور تمام دعوتوں کے نشیب و فراز بھی ایک جیسے ہیں۔

اب یہ کہ اس سورت کا موضوع کیا ہے؟ تو موضوع تمام مکی سورتوں کی طرح اسلامی نظریہ ہے یعنی عقیدۂ توحید' اللہ وحدہ پر ایمان' اللہ وحدہ کی بندگی' آخرت کی جوابدہی پر یقین' ثواب و عتاب پر یقین' وحی اور غیب پر ایمان اور یہ کہ علم غیب کا جاننے والا اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ اللہ پر یہ ایمان کہ تمام کے لیے وہی خالق' رازق اور نعمتوں کا داتا ہے۔ لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا کہ وہ شکر نعمات ادا کریں۔ یہ ایمان کہ اللہ کے سوا کوئی نفع نقصان دینے والا نہیں۔ قوت کا سرچشمہ اللہ ہے اس لیے اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ان معانی کے ثبوت کے لیے قصص آتے ہیں۔ سابقہ مومنین اور سابقہ مکذبین کے حالات اور انجام۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی وہ کڑی جب آپ کوہ طور پر آگ دیکھتے ہیں' وہاں جاتے ہیں۔ اور پھر عالم بالا سے پکار پاتے ہیں اور آگ کے بجائے رسالت ملتی ہے۔ اور یہ ڈیوٹی دی جاتی ہے کہ فرعون کے پاس جاؤ۔ سردار ان فرعون کو دعوت دو' چنانچہ آپ جاتے ہیں۔ وہ آیات الہیہ کی تکذیب کرتے ہیں حالانکہ ان کو اچھی طرح یقین ہے کہ آپ سچے ہیں' تو ان کا جو انجام ہوا' وہ معروف ہے۔

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷ : ۱٤) "انھوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا۔ حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ اور یہی حال ہے مکہ کے کفار اور مکذبین کا۔ وہ بھی قرآن مبین کی آیات کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔

اس کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام پر ہونے والے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ پھر سلیمان اور چیونٹی کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ہدہد کا واقعہ ہے۔ ملکہ سبا اور اس کی قوم کے واقعات ہیں۔ پھر حضرت سلیمان اور حضرت داؤد پر انعامات اور ان کی جانب سے ان انعامات کا شکر نعمت علم' نعمت اقتدار و بادشاہت اور ان پر پھر نبوت

کا مقام اور پھر روحانی طاقت کے ذریعے جنوں اور پرندوں کی تسخیر کی قوت اور تمام واقعات کے اندر وہ اصولی عقائد کی تعلیم ہے جس کو ہر رسول لے کر آتا ہے۔ ان واقعات میں اس نکتے کی بڑی وضاحت کی گئی ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ سبا کے دربار میں پہنچتا ہے۔ وہ اس خط کو کس طرح لیتی ہے اور اس کے مقابلے میں اہل مکہ اللہ کی کتاب کو کس غیر سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس کتاب کی تکذیب کرتے ہیں اور انکار کرتے ہیں جبکہ ملکہ سبا اور اس کی قوم ایمان لے آتے ہیں۔ یہ اللہ ہی تھا جس نے سلیمان علیہ السلام کو یہ کمالات بخشے۔ اور اس کے لیے چیزوں کو مسخر کیا۔ یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور حضرت سلیمان کو اللہ نے جو علوم سکھائے تھے وہ تو علوم الٰہیہ میں سے ایک قطرہ از دریا تھے۔

اس کے بعد حضرت صالح اور ان کی قوم ثمود کا قصہ آتا ہے۔ اس قصے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم کے بعض مفسد ان پر اور ان کے اہل و عیال پر زیادتی کرتے تھے اور یہ لوگ حضرت صالح کو خفیہ طور پر قتل بھی کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کی تدابیر کو ناکام کر دیا اور حضرت صالح اور مومنین کو نجات دی اور سازش کرنے والوں کو ثمودیوں کے ساتھ تباہ کر کے رکھ دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا (۲۷ : ۵۲) "وہ ہیں ان کے گھر خالی پڑے ہوئے' اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے"۔ قریش بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی خفیہ طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ جس طرح ثمودی حضرت صالح اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کے قتل کی تدابیر کر رہے تھے۔

یہاں قصص کا اختتام قصہ لوط اور قوم لوط پر ہوتا ہے۔ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ حضرت لوط اور اہل ایمان کو اپنے گاؤں سے نکال دیں اور وہ دلیل یہ دیتے تھے کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ یہ ضرورت سے زیادہ اخلاقی تطہیر چاہتے ہیں۔ لیکن جب حضرت لوط اور اہل ایمان بستی سے نکل گئے۔ تو ان پر سخت تباہی آئی۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (۲۷ : ۵۸) "پھر برسائی ان لوگوں پر ایک برسات بہت ہی بری برسات تھی وہ ان لوگوں کے حق میں جو ڈرائے جا چکے تھے"۔ قریش نے بھی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ رسول اللہ کو شہر سے نکال دیں اور اس بارے میں انہوں نے آپ کی ہجرت سے قبل مشورہ بھی کر لیا تھا۔

جب قصص ختم ہوئے تو آخری تبصرہ اور اختتامیہ آیا اور اس کا آغاز یوں ہوا۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(۲۷ : ۵۹) "اے نبی' کہو' حمد اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔ اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟ بتاؤ"۔ اس کے بعد پھر قاری کو اس کائنات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اس کے نفس کی گہرائیوں تک پہنچایا جاتا ہے' اللہ خالق رازق اور صانع کائنات کے دست قدرت کی

کاریگریاں بتائی جاتی ہیں جو وحدہ عالم الغیب ہے اور سب لوگوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر بعض علامات قیامت بتائی جاتی ہیں اور قیامت کے بعض مناظر بھی لائے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ قیامت کے منکر ہیں۔ ان کے انتظار میں کتنا برا انجام ہے۔

اس سورت کا اختتام ایسے انداز میں ہوتا ہے جو اس سورت کی فضا سے ہم آہنگ ہے۔

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۲۷: ۹۱) وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ (۲۷: ۹۲) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲۷: ۹۳) "اے نبی' ان سے کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں۔ اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو' اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں۔ ان سے کہو تعریف اللہ کے لیے ہے عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لوگے اور میرا رب بے خبر نہیں ہے۔ ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"۔

اس پوری سورت کا مرکزی مضمون علم ہے۔ اللہ عالم ہے' ظاہر باطن سب کا اور تمام غیب اسی کے علم میں تھا جو اللہ نے داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو بخشا تھا۔ پھر سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی زبان سکھائی تھی۔ چنانچہ اس سورت کے آغاز ہی میں آتا ہے۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ (۲۷: ۶) "بے شک تو قرآن پا رہا ہے حکیم علیم ذات کی طرف سے"۔ اور اس کی تعقیب میں ہے۔

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۲۷: ۶۵) بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ (۲۷: ۶۶) "ان سے کہو' اللہ کے سوا آسمانوں اور زمینوں میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ تمہارے معبود تو نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے"۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ (۲۷: ۷۴) وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (۲۷: ۷۵) "بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ یہ

اپنے سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو"۔ اور آخر میں آتا ہے۔

سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا (۲۷: ۹۳) "عنقریب وہ اپنی نشانیاں تمہیں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے"۔ حضرت سلیمان کے قصے میں آتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۷: ۱۵) "اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا تھا۔ ان نے کہا تعریف ہے اس اللہ کی جس نے ہمیں اپنے مومن بندوں میں سے ایک کثیر تعداد پر فضیلت دی"۔ اور حضرت سلیمان کا یہ فرمان

يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ (۲۷: ۱۶) "اے لوگو! ہمیں پرندوں کی باتیں سکھائی گئی ہیں"۔ اور ہدہد نے کہا:

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ (۲۷: ۲۵) "وہ اس خدا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو"۔ اور جب حضرت سلیمان ملکہ سبا کے تخت کو حاضر کرنا چاہتے ہیں تو اسے جنوں کا ایک عفریت بھی نہیں لا سکتا ہے۔ اور اسے جو شخص لانے کی حامی بھرتا ہے اسے بھی یہ قدرت یوں ملی۔

الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ (۲۷: ۴۰) "جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا"۔ غرض پوری سورت کی فضا پر علم اور ٹیکنالوجی کی باتیں چھائی ہوئی ہیں۔ شروع سے آخر تک علم ہی علم ہے اور علم ہی کی دنیا میں بات چلتی ہے۔ اب ذرا اس کے مضامین پر تفصیلی بحث مناسب ہے۔

--- ooo ---

درس نمبر ۱۷۰ تشریح آیات

۱--- تا --- ۶

سُوْرَۃُ النَّمْلِ مَکِّیَّۃٌ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طٰسٓ تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ط - س - یہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی"۔

حروف مقطعات دراصل اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ یہ سورت اسی مواد پر مشتمل ہے جو ان حروف سے بنا ہے۔ پورا قرآن بھی اسی سے بنا ہے۔ یہ مواد عام عربی دانوں کے دسترس میں ہے لیکن وہ اس مواد سے ایسی کتاب تصنیف کرنے سے عاجز ہیں۔ باوجود بار بار کی تحدی اور چیلنج کے۔

یہاں کتاب سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ یہاں قرآن مجید پر کتاب (خط) کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کتاب اور قریش کی جانب سے اس کے حوالے سے ردعمل اور حضرت سلیمان کے خط اور ملکہ سبا کی جانب سے اس کے بارے میں ردعمل کے درمیان مقابلہ کیا جائے' حالانکہ سلیمان علیہ السلام اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھے۔

اس تمہید اور چیلنج کے بعد قرآن کریم کا ذکر اور اس کی تعریف یوں ہوتی ہے۔

هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

"ہدایت اور بشارت ان ایمان لانے والوں کے لیے"۔

یہ اسلوب اس سے زیادہ بلیغ ہے اگر کہا جاتا "اس میں ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و بشارت ہے"۔ قرآن جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کتاب کا مواد ہی بذات خود ہدایت و بشارت ہے۔ اس طرح

قرآن کریم اہل ایمان کو ان کی زندگی کے ہر نشیب و فراز میں ہدایت دیتا ہے۔ ہر پہلو سے ہدایت ہے اور انسان کی دنیاوی اور اخروی دونوں زندگیوں کے لیے یہ کتاب بشارت اور خوشخبری ہے۔

یہ کتاب صرف مومنین کے لیے ہدایت اور بشارت ہے؟ اس فقرے میں اللہ نے ایک عظیم اور گہری حقیقت کو سمو دیا ہے۔ یہ قرآن کوئی نظریاتی اور فلسفیانہ کتاب نہیں ہے کہ جو بھی اسے پڑھے اور اس کے مضامین کا انطباق کرے اور ان کو نافذ کر دے تو بس قرآن کا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ کتاب سب سے پہلے انسان کے قلب و نظر کو مخاطب کرتی ہے تاکہ وہ اسے ایمان' احترام اور یقین کے ساتھ قبول کرے۔ کھلے دل سے قبول کرے۔ پھر یہ کتاب اپنا نور' اپنا عطر اور اپنی حکمت اس کے دل میں ڈال دیتی ہے۔ اور جس قدر قاری کا دل ایمان کی تراوٹ رکھتا ہو گا اسی قدر وہ اس کے مٹھاس کو پائے گا۔ اس کے معانی اس پر کھلتے جائیں گے۔ اور اس کی توجہات اور تاویلات اس کی سمجھ میں آئیں گی۔ کسی سنگدل اور خشک دل و دماغ رکھنے والے انسان پر اس کتاب کے راز نہیں کھلتے۔ اسی طرح ایک مومن صادق کو اس سے وہ ہدایات ملتی ہیں جو منکر حق اور سخت دل کو نہیں ملتیں اور اس کے نور سے وہ شخص ہدایت پاتا ہے جو مومن ہو اور وہ نہیں پاتا جس کا دل و دماغ مسخ ہو چکے ہوں۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی آیت اور کسی سورت کو بار بار پڑھتا ہے۔ وہ غفلت اور جلدی میں گزر جاتا ہے۔ اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اچانک اس کے قلب میں روشنی کی ایک چمک اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن میں معانی کے جہان روشن ہو کر آ جاتے ہیں جن کے بارے میں کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ یوں اشراق کے ان اوقات میں اس کی زندگی میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ وہ ایک منہاج سے دوسرا منہاج اور ایک راستے سے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

غرض قرآن کے اندر جس نظام' جس قانون اور جن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اس کا دارومدار ایمان پر ہے۔ لہٰذا جس شخص کے دل میں ایمان نہیں ہے اور وہ اس قرآن کریم کو منجانب اللہ وحی نہیں سمجھتا ہے اور یہ یقین نہیں رکھتا کہ اس کے اندر جو کچھ آیا ہے وہ ایک نظام ہے جسے اللہ تعالیٰ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جو شخص قرآن کے بارے میں ایسا ایمان و یقین نہیں رکھتا وہ قرآن کریم سے کوئی ہدایت نہیں پا سکتا۔ نہ اس میں پھر اس کے لیے کوئی خوشخبری ہے اور نہ کوئی فائدہ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے اندر ہدایت و معرفت اور تحریک اور راہنمائی کے عظیم المقدار خزانے پڑے ہوئے ہیں لیکن ان خزانوں کے دروازے کھولنے کی چابی ایمان ہے۔ یہ خزانے اس چابی کے بغیر کھل نہیں سکتے۔ جو لوگ صحیح طرح ایمان لے آتے ہیں۔ ان ہاتھوں پر' اس قرآن کے ذریعے ایسے عظیم کارنامے صادر ہوتے ہیں جس طرح پیغمبروں کے معجزات لیکن اگر قرآن کی حیثیت یہ ہو جائے کہ اسے گانے والے ترنم سے گائیں تو اس صورت میں قرآن صرف کانوں کے پردوں سے ٹکراتا ہے' دلوں تک نہیں اترتا۔ اور اس صورت میں قرآن پھر کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔ اور اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہو گا اور اس کی حیثیت اس خزانے کی سی ہوئی' جس کی چابی نہ ہو۔

اس سورت میں ان مومنین کی تعریف بھی کی گئی جن کے ہاتھ میں قرآن کے خزانوں تک پہنچنے کی چابی ہوتی ہے' یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۝۳

"جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں' اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں"۔

وہ نماز قائم کرتے ہیں اور نماز کی ادائیگی اس طرح کرتے ہیں جس طرح اس کا حق ہے یوں کہ جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں تو ان کے دل جاگ رہے ہوں۔ اور اس وقت ان کو یہ شعور ہو کہ وہ ذوالجلال والاکرام کے دربار میں کھڑے ہیں۔ اس وقت ان کی توجہ اس بلند افق پر ہو' ان کے دل مناجات الٰہی میں مشغول ہوں' اسے پکار رہے ہوں اور اس کے عظیم دربار میں حاضر ہوں۔

وہ زکوٰۃ دیتے ہیں' اس طرح ان کے نفوس کنجوسی کی رذالت سے نجات پا جائیں۔ یوں ان کی روح مال کے فتنوں سے سربلند ہو جائے اور وہ بعض ان نادار بھائیوں کے ساتھ مربوط ہو جائیں اور ان تک رزق پہنچا دیں اور اس طرح اپنی اجتماعی ذمہ داریاں ادا کر دیں۔

وہ آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ ہر وقت ان کو احساس ہو کہ آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دینا ہے۔ ان کا دل امور آخرت میں مشغول ہو' ان کا دل خدا کے خوف سے بھرا ہوا ہو اور انسانی خواہشات ان کے دل پر اثر نہ کرتی ہوں۔ اللہ کی خشیت اور قیامت کے حساب و کتاب کا غم ان کو کھائے جا رہا ہو۔

یہ مومن' اللہ کو یاد کرنے والے' اس کے فرائض ادا کرنے والے' اس سے ڈرنے والے اصحاب خشیت' اللہ کے اجر اور ثواب کے امیدوار' یہ ہیں وہ لوگ جن کے دل قرآن کے لیے کھل جاتے ہیں' تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن ہدایت و بشارت بن جاتا ہے۔ وہ ان کی روح کا نور بن جاتا ہے' یہ ان کے خون کو گرم کر دیتا ہے اور ان کی زندگی کو متحرک بنا دیتا ہے اور یہ قرآن پھر ان کا زاد راہ بن جاتا ہے جس کے ذریعے وہ منزل مقصود کو پہنچتے ہیں اور اپنے رب سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

ذکر آخرت کے حوالے سے مزید تاکید کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ جو آخرت پر پختہ یقین نہیں رکھتے وہ اپنی گمراہی میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اچانک وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ﴿٤﴾

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے لیے ہم نے ان کے کرتوتوں کو خوشنما بنا دیا ہے' اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت پر ایمان وہ قوت ہے جو اس دنیا میں انسانی خواہشات' اس کے جذبات کو دباتی ہے اور ان کو اعتدال اور توازن بخشتی ہے۔ جو شخص ایمان نہیں رکھتا وہ اپنی کسی خواہش اور کسی میلان کو دبانے کی طاقت اور اخلاقی قوت ہی نہیں رکھتا وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست اور اس عالم میں زندگی بھی مختصر ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اگر ہم نے اس دنیا میں کوئی عیش اور کوئی لذت ترک کر دی یا ہم حاصل نہ کر سکے تو اس زندگی میں ایک منٹ کی توسیع ہو جائے۔ جب سوچ یہ ہو جائے تو کسی کو عیش و عشرت اور لذات و رغبات کے ہاتھوں کون چھڑا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہونے کا ایمان اپنے اندر پیدا کر دے۔ قیامت کے دن کے ثواب اور اجر کا امیدوار ہو اور آخرت کی سزا سے خائف ہو جہاں تمام لوگ کھڑے ہوں گے۔

لہٰذا جن لوگوں کا آخرت پر ایمان نہیں ہوتا ان کے لیے ہر قسم کی شہوات اور لذت کو خوبصورت بنا دیا جاتا ہے۔ وہ بلیر خوف خدا' بغیر خوف آخرت اور پھر بلا شرم و حیا ان کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ نفس کی فطرت اور پیدائش اس پر ہے کہ یہ لذت کا دلدادہ ہے۔ یہ حسن پرست اور جمال پر مٹنے والا ہے۔ الا یہ کہ اسے آیات الٰہیہ اور رسول ان کریم کی راہنمائی نصیب ہو جائے اور وہ اسے دائرہ ایمان کے اندر لے آئیں اور وہ سمجھ لے کہ یہ جہاں تو فانی ہے۔ جب کوئی نفس یہاں تک پہنچ جائے تو اس کے اعمال کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس کا عالم اشواق بدل جاتا ہے۔ اسے پھر اچھے کاموں میں اسی طرح لذت آتی ہے جس طرح مادی لذت ہوتی ہے بلکہ پیٹ اور جسم کی لذت پھر اسے نہایت ہی حقیر و قلیل نظر آنے لگتی ہے۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے۔ اسے اس قابل بنایا ہے کہ اگر اس کا دل ہدایت کے لیے کھل جائے تو وہ راہ ہدایت پا سکے۔ اور اگر اس کا دل بجھ جائے اور شمع ایمان گل کر دی جائے تو پھر وہ گمراہی کی راہ پر سرپٹ دوڑتا ہے۔ پھر اس انسانیت کی ہدایت و ضلالت کے لیے اس نے ایک سنت بھی جاری کر دی ہے۔ اور اس کے مطابق وہ ہدایت پاتا ہے یا راہ ضلالت اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم یہ صراحت کر دیتا ہے اور خدا اسے اپنا فعل بتاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔

زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (۲۷ : ۴) "ہم نے ان کے کرتوتوں کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا ہے' اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں"۔ چونکہ وہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے' اس لیے اس پر اللہ کی سنت کا نفاذ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ان کے اعمال اور ان کی لذات اور خواہشات ان کے لیے خوشنما بنا دی جاتی ہیں۔ یہاں تزئین اعمال یعنی اعمال کو مزین بنانے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اس طرح بھٹکتے ہیں کہ جس شر میں یہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں اسے شر نہیں سمجھتے۔ اس لیے یہ شر کے چکر میں رات دن پڑے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان کو اس کا شعور ہرگز نہیں ہوتا۔

اور جس شخص کے لیے شر کو مزین کر دیا گیا ہو اس کا انجام سب کو معلوم ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں"۔

چاہے یہ برا عذاب ان کو دنیا میں ملے یا آخرت میں۔ لیکن مکمل خسارہ آخرت کا خسارہ ہے۔ وہ انسان کے اعمال کے عین مطابق ہوتا ہے۔ جتنا کوئی برائی کی طرف مائل ہوتا ہے اسی قدر وہاں اس کی سزا سخت ہوتی ہے۔

اب اس سورت کی اس تمہید کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اے نبی' تم جس مصدر سے قرآن پا رہے ہو یہ تو علیم و حکیم کا سرچشمہ ہے۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝

"اور (اے نبیؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو"۔ تلقی کے لفظ میں یہ اشارہ ہے آپ کو علیم و حکیم ذات کی طرف سے براہ راست ہدایات دی جا رہی ہیں اور یہ ذات ہر چیز کو حکیمانہ انداز میں بنانے والی ہے۔ اور ہر معاملے کی تدبیر علم سے کرنے والی ہے۔ اور اس ذات کے علم و حکمت کا ایک نمونہ یہ قرآن ہے۔ اپنے منہاج کے اعتبار سے 'اپنے احکام و فرائض کے لحاظ سے' اپنی ہدایات اور طریقہ کار کے لحاظ سے' اپنی آیات و احکام کے نزول کے اعتبار سے' اپنے اجزاء کے تسلسل اور اپنے مضامین و موضوعات کے توازن اور ہم آہنگی کے اعتبار سے۔

اب قرآن کریم قصص کو لیتا ہے اور ان قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا علم' اللہ کی حکمت اور اللہ کی نہایت ہی خفیہ تدابیر اس کائنات میں اور اس قرآن میں کس قدر موثر ہیں۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۷۱ تشریح آیات

۷ --- تا --- ۱۴

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا یہ حلقہ نہایت اختصار اور تیزی سے اسکرین پر آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور سیاق کلام میں یہ آیت

وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۲۷ : ۶) "اے نبیؐ بلاشبہ آپ یہ قرآن ایک حکیم و علیم کی طرف سے پا رہے ہیں" کے بعد متصلاً آتا ہے۔ اب گویا بتایا جاتا ہے کہ نزول قرآن کا یہ عمل کوئی انوکھی بات نہیں ہے ' تمام انبیاء اللہ سے ہدایات اور کتب پاتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا حال بطور نمونہ پیش کریں کہ یہ فریضہ ان کو بھی سونپا گیا۔ وہ فرعون اور اس کے سرداروں اور قوم کے پاس گئے اور قوم نے تکذیب کی۔ جس طرح آج قریش تکذیب کر رہے ہیں۔ جس طرح قوم موسیٰ کو یقین تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو آیات و معجزات پیش کرتے ہیں وہ حق ہیں اور پھر بھی انکار کرتے تھے اور یہ انکار ظلم اور تکبر کی وجہ سے تھا' یہی روش آج قریش کی ہے لیکن

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷ : ۱۴) "دیکھ لیں کہ مفسدین کا انجام کیسا ہوا"۔ یہی انجام قریش کا بھی ہو گا۔ جو محض غرور کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝

"انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے' میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو"۔

سورۃ طٰہٰ میں بھی اس قصے کی یہ کڑی لائی گئی تھی۔ جب آپ مدین سے مصر کی طرف لوٹ رہے تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی بیوی' حضرت شعیب علیہ السلام کی دختر بھی رفیق تھیں۔ ایک اندھیری سیاہ اور سرد رات میں آپ سے راستہ گم ہو گیا تھا۔ حضرت کے الفاظ "میں تو ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں تاکہ تم گرم ہو سکو"۔ اس وقت حضرت موسیٰ کوہ طور کے ایک طرف تھے۔ اور اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ بلند ٹیلوں پر رات کے وقت آگ جلائی جاتی تھی۔ تاکہ اگر کوئی مسافر بھٹک جائے تو اس کی راہنمائی ہو۔ ایسی صورت میں جب کوئی مسافر آتا تو

اسے مہمان نوازی بھی ملتی اور وہ سردی میں اپنے آپ کو گرم بھی کرتا اور صحراء میں راستے کی راہنمائی بھی ہوتی۔

اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا (۲۷: ۷) "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے"۔ دور سے انہوں نے آگ کو دیکھا تو ان کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ اس آگ کے پاس جا کر انہیں کچھ نہ کچھ راہنمائی مل جائے گی یا وہ کوئی انگارا لے آئیں گے جس سے وہ آگ جلا کر اس صحراء میں اپنے آپ کو گرم کر سکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف آگے بڑھے جسے انہوں نے دیکھا تھا تاکہ وہ وہاں سے کوئی خبر لائیں۔ اچانک یہاں انہیں ایک نہایت ہی معزز اور شاہانہ آواز آتی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۸ یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۹

"وہاں جو پہنچا تو ندا آئی کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا پروردگار' اے موسیٰ' یہ میں ہوں اللہ' زبردست اور دانا"۔

یہ وہ پکار ہے جس کے ساتھ پوری کائنات ہمقدم ہے اور جس کے ساتھ تمام جہان اور تمام آسمان ہم آہنگ ہیں۔ تمام کائنات اس کے سامنے سہمی ہوئی ہے اور انسانی روح اور ضمیر اسے سن کر کانپ اٹھتا ہے۔ یہ وہ آواز ہے جس کے ساتھ زمین و آسمان کا اتصال ہے۔ اور انسان جو ایک چھوٹا سا ذرہ ہے وہ عظیم اور بلند ذات کی آواز کو پاتا ہے۔ اور ایک فانی اور ضعیف انسان ایک لافانی اور قوی ذات باری کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور یہ مقام اسے محض فضل رب تعالیٰ سے ملتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ (۲۷: ۸) "جب وہ وہاں پہنچے تو ندا آئی"۔ پکارا گیا' یہاں قرآن پکارنے والے کا نام نہیں لیتا' لیکن وہ معلوم ہے۔ یہ نام نہ لینا اور ماضی مجہول کا صیغہ احترام' تعظیم اور جلالت شان کبریائی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا (۲۷: ۸) "پکارا گیا کہ مبارک ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو اس کے ماحول میں ہے"۔ آگ میں کون تھا۔ اور آگ کے ماحول میں کون تھا؟ راجح تفسیر یہی ہے کہ یہ آگ ویسی آگ نہ تھی جسے ہم جلاتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی آگ تھی جس کا مصدر عالم بالا تھا۔ یہ وہ آگ تھی جسے پاک فرشتوں نے عظیم ہدایت کے لیے روشن کیا تھا اور یہ آگ کی طرح نظر آ رہی تھی اور یہ پاک روحیں اس میں تھیں لہٰذا یہ ندا کہ جو اس آگ میں ہے وہ مبارک ہے۔ یہ اعلان تھا کہ اس آگ اور اس کے ارد گرد جو پاک روحیں ہیں وہ بابرکت ہیں۔ اور اس آگ کے ماحول میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے اور پوری کائنات نے اس اعزاز کو ریکارڈ کر دیا کہ یہ خطہ زمین اس پوری کائنات میں بابرکت جگہ ہے' ایک مقدس مقام ہے اور اس میں اس پر اللہ ذوالجلال کی تجلیات اور برکات کا نزول ہوا ہے اور پھر اس جگہ کے تقدس اور برکت کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کو بھی ریکارڈ کر دیا گیا "کہ پاک ہے' اللہ سب جہان والوں کا پروردگار' اے موسیٰ! میں اللہ زبردست اور دانا"۔

وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ(۸:۲۷) يٰمُوْسٰۤي اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(۹:۲۷) اس آیت میں اللہ نے اپنی ذات کی پاکیزگی اور پورے جہان کے لیے اس کی ربوبیت کا اعلان کر دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ جو آواز آ رہی ہے وہ میں ہوں۔ جو عزیز و حکیم ہوں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات کے ذریعے پوری انسانیت کو یہ بلندی بخشی گئی اور وہ کائنات کے آسمان پر ایک چمکتا ہوا تارا بن گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس آگ کے پاس سے بہت بڑی خبر مل گئی جو انھوں نے دور سے دیکھی تھی لیکن یہ عظیم خبر ایک عظیم ذمہ داری تھی۔ آپ کو گرمانے والا انگارا بھی مل گیا مگر وہ عوام کو راہ ہدایت کی طرف لانے کی آگ تھی۔

یہ آواز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چننے کے لیے تھی۔ اور ان کے ذمہ فریضہ رسالت عائد کرنے کے لیے تھی اور پیغام بھی ان لوگوں تک پہنچانا تھا جو اس کرۂ ارض کے عظیم ترین سرکش تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کام کے لیے تیار فرماتا ہے اور تربیت دیتا ہے اور دلائل و معجزات کے ساتھ مسلح کرتا ہے۔

وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ

"تو ذرا اپنی لاٹھی اٹھا اور پھینک"۔ یہاں بات اختصار سے کی جاتی ہی اور سورہ طٰہٰ کی طرح طویل مناجات نہیں ہے۔ یہاں مقصد آواز دینا اور فریضہ عائد کرنا ہے"۔

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ

"جونہی کہ موسیٰ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا"۔

حضرت موسیٰ نے حکم کے مطابق عصا پھینکا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک سانپ ہے اور زمین پر رینگ رہا ہے۔ جیسا کہ چھوٹے اور سریع الحرکت سانپ تیزی سے دوڑتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انفعالی طبیعت کے مالک تھے۔ یہ اچانک منظر ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ حضرت اس سانپ سے دور بھاگ گئے اور واپس نہ دیکھا۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو غیر متوقع اور اچانک پیش آ جانے کی صورت میں ہر انسان سے صادر ہوتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزاج بھی ایسا تھا کہ وہ جلد متاثر ہوتے تھے۔

اب پھر عالم بالا سے آواز دی جاتی ہے۔ اطمینان عطا کرنے والی آواز۔ اعلان کیا جاتا ہے آپ کا منصب منصب رسالت ہے اور کسی رسول کے لیے ڈرنا مناسب نہیں ہے۔

يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ

"اے موسیٰ ڈرو نہیں۔ میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے"۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کے اسر رسالت کا منصب اور فرائض ہیں اور رسول اللہ کے دربار میں ہوتے ہیں اور وہاں، ان کے ڈرنے کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوٓءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۱﴾

"الا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو۔ پھر اگر برائی کے بعد اس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں"۔

ہمارے ہاں تو وہ لوگ ڈرتے ہیں جو ظالم ہیں الا یہ کہ ظلم کے بعد وہ نیک ہو جائیں تو بھی معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے ظلم ترک کر کے عدل اپنا لیا ہے۔ شرک کو چھوڑ کر توحید کا عقیدہ اپنا لیا ہوتا ہے۔ شر کو چھوڑ کر خیر کی راہ لے لی ہے۔ میری رحمت وسیع ہے اور میری مغفرت بہت بڑی ہے۔

اب حضرت موسیٰ کو اطمینان اور قرار نصیب ہو گیا۔ اب اللہ آپ کو دوسرا معجزہ عطا فرماتا ہے لیکن ابھی تک ان کو رسالت کی مہم نہیں بتائی گئی کہ جانا کہاں ہے۔

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ

"اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں تو ڈالو' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے"۔

یہ عمل بھی ایسا ہی ہوا حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے گریباں میں ڈالا اور جب نکالا تو وہ بغیر بیماری کے چمک رہا تھا۔ یہ کوئی مرض نہ تھی بلکہ معجزہ تھا اور اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا کہ اس قسم کی نو نشانیاں اور معجزات تمہیں دیئے جائیں گے جن میں سے دو کا مشاہدہ اور مظاہرہ تم نے دیکھ لیا۔ اب حضرت موسیٰ کے سامنے اس مہم کا انکشاف کیا جاتا ہے جو انہوں نے سر کرنی ہے اور جس کے لیے ان کو یوں تیار کیا گیا۔

فِي تِسْعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِۦٓ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ قَوْمًا فَٰسِقِينَ ﴿۱۲﴾

"یہ (دو نشانیاں) نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے) وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں"۔

یہاں باقی نشانیاں نہیں گنوائی گئیں جبکہ سورہ اعراف میں تفصیلات دی گئی ہیں جو یہ ہیں' خشک سالی' پیداوار کی کی طوفان' ٹڈی دل کا حملہ' جوئیں اور مینڈک اور خون۔ کیوں کہ سورہ اعراف میں موضوع سخن یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑی قوی نشانیاں دی گئی تھیں لیکن پھر بھی فرعون نے انکار کیا۔ بہرحال ان نشانیوں کی وضاحت کافی اور شافی ہونے کے باوجود قوم نے انکار کر دیا۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ ءَايَٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوا۟ بِهَا وَٱسْتَيْقَنَتْهَآ أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿۱۴﴾ ع ۱۶

"مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیاں ان لوگوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالاں کہ دل اس کے قائل ہو چکے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا"۔

یہ بے شمار نشانیاں 'حق کو باطل سے واضح کرنے والی نشانیاں' ایسی نشانیاں کہ جس کو اللہ نے دو آنکھیں دی ہیں وہ انہیں دیکھ سکتا ہے۔ جن کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نشانیاں مبصرہ ہیں یعنی وہ دیکھنے والی ہیں۔ دیکھ دیکھ کر لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف لانے والی ہیں۔ لیکن وہ لوگ ایسے ہٹ دھرم تھے کہ ان کو بھی انہوں نے کہا کہ سحر مبین ہے 'کھلا جادو ہے۔ یہ نہیں کہ وہ دل سے کہتے تھے یا وہ فی الواقعہ ایسا سمجھتے تھے یہ تو انہوں نے محض ظلم اور علو کی وجہ سے کہا' ان کے دل و دماغ تو اس پر مطمئن تھے کہ یہ حق ہے۔ بالکل ان کو کوئی شبہ نہ تھا۔

وَ اسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (۲۷ : ۱٤) "حالانکہ ان کے دل ان کے قائل ہو چکے تھے"۔ محض ہٹ دھرمی اور مکابرہ کی وجہ سے کیونکہ یہ ایمان لانا نہیں چاہتے تھے اور نہ کوئی دلیل وہ طلب کرنا چاہتے تھے۔ یہ اپنے آپ کو سچائی سے برتر سمجھتے تھے اور اپنے نفوس پر ظلم کر رہے تھے کیونکہ قبول حق میں خود ان کی بھلائی تھی۔

بعینہ یہی حال اکابرین قریش کا بھی تھا۔ یہ قرآن کریم کو سنتے تھے 'ان کو اچھی طرح یقین تھا کہ یہ حق ہے لیکن محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کرتے تھے حالانکہ یہ دعوت صرف اللہ وحدہ کی طرف تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ہر حال میں اپنے دین اور عقائد پر قائم رہنا چاہتے تھے کیونکہ اس دین میں ایسے اصول تھے جن کی وجہ سے ان کو مسند حاصل تھی۔ کچھ مفادات حاصل تھے 'اور یہ مسندیں اور مفادات ان عقائد باطلہ پر مبنی تھے۔ دعوت اسلامی سے ان کے لیے خطرہ ہی یہ تھا۔ اس کی کامیابی سے ان کے یہ مفادات ختم ہو جائیں گے اور ان کا مقام و مرتبہ جاتا رہے گا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے قدموں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے اور ان کے عقائد اور شعور کے اندر ایک زلزلہ برپا ہے اور قرآن کو "حق مبین" تھا اور اس کی کارگر ضربات ہر وقت ان پر لگتی رہتی ہیں۔

سچائی کا انکار ہمیشہ اس لیے نہیں ہوتا کہ لوگ اسے جانتے نہیں ہیں 'بلکہ سچائی کا انکار اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ ان کے نفوس اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر ان منکرین کو اپنی جان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے حالات اپنے مفادات اور اپنی مصلحتوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ حق کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ سچائی واضح اور مبین ہوتی ہے۔

فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ (۲۷ : ۱٤) "اب دیکھو کہ مفسدوں کا انجام کیسا ہوا"۔

فرعون اور اس کی قوم کا انجام کیا ہوا۔ قرآن نے دوسری جگہ اس کی پوری تفصیلات دی ہیں۔ یہاں صرف اشارہ کر دیا۔ شاید کہ انکار کرنے والوں میں سے کچھ عقلمند مان جائیں۔ قبل اس کے کہ ان کا وہ انجام ہو جو فرعون کا ہوا۔

---ooo---

درس نمبر ۱۷۲ ایک نظر میں

"یہاں حضرت داؤد کی طرف صرف ایک اشارہ ہے لیکن پورا قصہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے۔ اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک مختصر کڑی دی گئی ہے۔ یہ سب حضرات انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے اور اس سورت کے آغاز ہی میں قرآن کریم پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا۔

انَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

(۲۷ : ۷۶) "یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے ان بیشتر باتوں کی تفصیلات بیان کرتا ہے جس میں وہ مختلف الرائے ہیں"۔ اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے کی سب سورتوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں' یعنی جہاں جہاں حضرت سلیمان کا تذکرہ ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں ان کے حالات زندگی میں سے قصہ ہدہد اور ملکہ سبا کی تفصیلات ہیں۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام یہ اعلان فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو خصوصی طور پر پرندوں کی باتیں سکھائی ہیں اور ہر چیز عطا کی ہے اور اللہ نے ان پر جو فضل و کرم کیا ہے وہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک منظر آتا ہے جس میں حضرت سلیمان اپنے لاؤ لشکر سمیت چلتے نظر آتے ہیں۔ اس عظیم لشکر میں جن' انس اور پرندے سب شامل ہیں۔ جب یہ لشکر چلتا ہے تو ایک چھوٹی سی چیونٹی اپنی قوم کو خبردار کرتی ہے کہ ایک عظیم لشکر جرار اس علاقے کا رخ کر رہا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو بچاؤ۔ حضرت سلیمان یہ الفاظ سنتے ہیں اور اس پر بھی رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس بات کو پاتے ہیں کہ نعمت تو ابتلا ہے۔ اس لیے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ تو اس ابتلا میں مجھے شکر اور کامیابی کی توفیق عطا فرما۔

یہ قصہ اس سورت میں کیوں لایا گیا ہے۔ سورت کے آغاز ہی میں بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اور پھر اسی سورت میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے سامنے ان بیشتر موضوعات پر کلام کرتا ہے جن کے بارے میں ان کے اندر اختلاف رائے ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں اور حضرت موسیٰ' حضرت داؤد' اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے قصص تاریخ بنی اسرائیل کی اہم کڑیاں ہیں۔

یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے کی جو کڑی پیش کی گئی ہے اس کی اس سورت کے مضمون سے مناسبت کیا ہے۔ یہ کڑی کئی پہلوؤں کے اعتبار سے مناسبت رکھتی ہے۔

اس سورت کا مرکزی مضمون علم ہے جیسا کہ ہم نے اس سورت پر تبصرے میں کہا ہے۔ اور حضرت داؤد و سلیمان کے قصے میں سب سے پہلا اشارہ ہی اس طرف ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا (۲۷:۱۵) "ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا"۔ اور پھر سلیمان علیہ السلام نے اس کڑی میں منطق الطیر کے علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کی نعمت کا اعتراف کیا ہے۔

وَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷:۱۶) "لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں"۔ اور اس قصے کے درمیان ہدہد اپنی غیر حاضری کا عذر بیان کرتے ہوئے یہ کہتا ہے۔

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ (۲۷:۲۲) "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو تیرے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں"۔ اور پھر اس قصے میں ہے کہ جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا کہ میں ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکتے لاتا ہوں۔

سورت کے افتتاح میں تھا کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ایک کتاب مبین ہے۔ اور اس کو مشرکین مکہ کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ لیکن وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ پھر اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک خط کا ذکر ہے جو ملکہ سبا کے نام لکھا گیا۔ لیکن وہ جب معلوم کر لیتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سچائی کی دعوت دیتے ہیں تو وہ اور اس کی قوم اسے جلد ہی قبول کر کے مطیع فرمان ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جن و انس اور پرندوں کی قوتیں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور یہ اللہ ہی ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ قوتیں عطا کی ہیں۔ وہی ہے اقتدار اعلیٰ کا مالک۔

پھر اس سورت میں انسانوں پر اللہ کے انعامات کا بھی ذکر ہے۔ اس کائنات میں اس کے جو نشانات ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ پھر بھی اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ اور شکر نعمت بجا نہیں لاتے۔ اس قصے میں بھی ایک بندۂ شکر گزار کا ذکر ہے' جو اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں کہ اے اللہ مجھے یہ توفیق دے کہ میں تیری انعامات کا شکر بجا لاؤں۔ جو اللہ کی آیات پر غور کرتے ہیں اور ان سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے اور نہ وہ اللہ کے انعامات کی وجہ سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ نہ قوت کی وجہ سے وہ گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس قصے کی مضمون سورت کے ساتھ کئی ربط اور مناسبتیں ہیں اور سورت کے موضوع اور قصے کے اندر جابجا واضح اشارات موجود ہیں۔

حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی کہانی کو جس طرح قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ قرآن مجید قصص کو کس طرح لاتا ہے اور اس کا قصص کا فنی انداز بیان کیسا ہوتا ہے۔ اس قصے میں تگ و دو' جذبات و تاثرات' مختلف مناظر اور مشاہد پائے جاتے ہیں۔ پھر مختلف مناظر کے درمیان گیپ جن میں غیر ضروری حصوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ اور اس کے دوسرے فنی کمالات ہیں۔

اب ذرا آیات کی تفصیلات

---(۱۰)---

درس نمبر ۱۷۲ تشریح آیات

۱۵---تا--- ۴۴

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾

"(دوسری طرف) ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی"۔

یہ اشارہ ہے کہ اب قصے کا آغاز ہونے والا ہے اور یہ افتتاحی کلمات ہیں۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس قصے کے بڑے کرداروں کو ہم نے بڑے بڑے انعامات سے نوازا تھا اور سب سے بڑا اعزاز تو علم ہوتا ہے جو حضرت داؤد اور سلیمان علیہم السلام کو دیا گیا۔ حضرت داؤد کو جو علوم دیئے گئے تھے قرآن کریم کی دوسری سورتوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ یہ کہ زبور کی آیات کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا فن ان کو دیا گیا تھا' وہ اس فن میں اس قدر ماہر تھے کہ جب وہ زبور کی آیات پڑھتے تھے تو یہ پوری کائنات ان کے ساتھ گنگناتی تھی۔ پہاڑ کی گونج اور پرندوں کی چہچہاہٹ ان کے ساتھ زبور کو گاتے۔ کیونکہ آپ کی آواز بے حد میٹھی تھی۔ وہ سوز دل سے پڑھتے تھے اور اپنے رب کے ساتھ مناجات میں وہ غرق ہو جاتے تھے۔ پھر ان کو اللہ نے جنگی سازوسامان کی بنیادی ٹیکنالوجی دی تھی۔ وہ اچھی زرہیں بناتے تھے' دھاتوں کو پگھلانے میں مہارت رکھتے تھے اور ان سے ہر قسم کی چیزیں بناتے تھے۔ اور وہ ایک بہترین جج تھے اور اس کام میں حضرت سلیمان ان کے مشیر خاص تھے۔

رہے سلیمان علیہ السلام تو اس سورت میں وہ پوری تفصیلات دی گئی ہیں جو اللہ نے ان کو سکھائیں یعنی پرندوں کی بولیاں' اور جس طرح دوسری سورتوں میں ذکر ہے کہ وہ ایک بہترین جج تھے اور ان کے لیے ہواؤں کو بھی مسخر کر دیا گیا تھا۔ اور اس قصے کا آغاز بھی اسی اشارے سے ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا (۲۷: ۱۵) "یہ واقعہ ہے کہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا تھا"۔ لیکن آیت ختم ہونے سے پہلے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہم السلام کی جانب سے یہ بات آجاتی ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں اور علم کی نعمت کی ان کے ہاں بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس معاملے میں ان کو اپنے مومن بندوں کی ایک بڑی تعداد کے مقابلے میں ترجیح دی ہے۔ یوں وہ علم کی قدر و قیمت اور پھر اس عظیم احسان کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہاں اس علم کی نوعیت اور تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ اللہ کے ہاں مطلق علم ایک فضل الٰہی ہے۔ عام علم کو اللہ کی نعمت بتانا مقصود ہے۔ ہر قسم کا اور ہر نوع علم مطلوب مومن ہے۔ پھر ہر عالم کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے اس فضل کا شکر ادا کرے۔ اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد بیان کرتا رہے اور یہ دعا کرتا رہے کہ اے اللہ یہ علم میرے لیے نافع ہو۔ یہ نہ ہو کہ علم انسان کو اللہ سے دور کر دے' اللہ کو بھلانے کا سبب بنے حالانکہ علم دینے والا اللہ ہے۔

وہ علم جو قلب انسانی کو اللہ سے دور کرے' وہ فاسد علم ہے۔ وہ اپنے مقصد اور اپنے ہدف سے دور اور ایک طرف ہو گیا ہوتا ہے۔ ایسا علم صاحب علم کے لیے فلاح و نجات اور سعادت مندی کا باعث نہیں ہوتا۔ اور نہ ایسا علم انسانوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ ایسا علم انسانوں کے لیے مصیبت' بدبختی' خوف' قلق' بے چینی اور بالآخر ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ یہ علم اپنے مصدر و منبع سے کٹ گیا ہے' اس کی سمت غلط ہے اور اس نے اللہ تک پہنچنے کی راہ گم کر دی ہے۔

اس وقت انسانیت علم کے ایک اعلیٰ مرتبے تک پہنچ چکی ہے۔ خصوصاً ایٹم کے توڑنے کے بعد۔ اور پھر اسے مختلف مفید کاموں میں استعمال کرنے کے بعد۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ یہ ایٹمی علم آیا اور جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہ تھا۔ ان کے ہاتھوں انسانیت نے کس قدر کڑوا پھل چنا اور کھایا۔ یہ اس لیے کہ ان لوگوں کے دل میں خدا کا خوف' خدا کی تعریف' اور خدا کی طرف توجہ نہ تھی۔ چنانچہ اس علم نے اور ایسے علماء نے ہیروشیما کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ناگاساکی کی تباہی مچائی اور ان واقعات کے بعد اب شرق و غرب کے تمام انسان رات دن اس کرۂ ارض اور تمام انسانیت کی تباہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

اس تمہید کے بعد کہ حضرت داؤد اور سلیمان دونوں کو ہم نے علم سے نوازا اور انہوں نے اللہ کی حمد اور تعریف کی کہ اللہ نے ان پر احسان کیا اور علم کی قدر و قیمت کو محسوس کیا۔ اب صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝

"اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا اور اس نے کہا "لوگو' ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں' بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے"۔

حضرت داؤد کو نبوت اور علم کے ساتھ ساتھ حکومت بھی دی گئی تھی لیکن ان دونوں پر اللہ کے فضل و کرم کے بیان میں ان کے اقتدار کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف علم و حکمت کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ علم و حکمت کے مقابلے میں اقتدار ایک حقیر چیز ہے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ (۱۶:۲۷) "اور سلیمان نے داؤد کی وراثت پائی"۔ یہاں وراثت سے مراد بھی

علم کی وراثت ہے کیونکہ علم وحکمت ہی اس قابل ہے کہ اس میں کوئی پیغمبر دوسرے کا وارث بنے اور س بات کی تاکید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سیمان لوگوں میں یہ اعلان کرتے ہیں۔

وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (۲۷: ۱۶) "اے لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں"۔ تو علم کا ذکر کر دیا گیا اور باقی نعمتوں کا ذکر اس کے ضمن میں کر دیا گیا۔ گویا داؤد نے یہ چیزیں نہیں دی ہیں بلکہ دینے والا اللہ ہے جہاں سے علم آیا۔

وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (۲۷: ۱۶) "لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں"۔ ان باتوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام لوگوں میں اعلان کرتے ہیں۔ یہ اعلان وہ بطور تحدیث نعمت کرتے ہیں اور اللہ کے ہاں اپنے مقام فضیلت کے لیے کرتے ہیں بطور فخر و مباہات نہیں کرتے۔ نہ یہ کہ آپ لوگوں پر رعب جماتے تھے اور ایسی باتوں کا ذکر کرتے تھے جو ان میں نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ذکر ہوا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (۲۷: ۱۶) "بے شک یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے"۔ یعنی اللہ کا فضل ہے اپنے بندے پر۔ کیونکہ پرندوں کی بولیوں کی تعلیم پر صرف اللہ ہی قادر ہے۔ اور اس طرح حضرت داؤد و سلیمان کو علی العموم تمام انعامات دیئے گئے تھے۔ یہ بھی اللہ ہی دے سکتا ہے۔

پرندوں، حیوانوں اور حشرات الارض کو اللہ نے ایک دوسرے کو سمجھانے کے لیے وسائل دیئے تھے اور یہ ان کی زبان اور منطق ہے۔ اللہ ان تمام جہانوں کے خالق ہیں۔ فرماتے ہیں۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام : ۳۸) "زمین پر چلنے والے جتنے جانور ہیں اور اڑنے والے پرندے جو اپنے دو پروں کے ساتھ اڑتے ہیں وہ تمہاری طرح امتیں ہیں"۔ یہ چیزیں امت تب ہی بن سکتی ہیں جب ان کے درمیان اجتماعی روابط ہوں۔ جن کے مطابق وہ رہتے ہوں اور ایسے وسائل اور ذرائع ہوں، جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ بے شمار حشرات حیوانات اور پرندوں کے اندر یہ چیز نظر آتی ہے۔ حشرات الارض کی اقسام کے ماہرین نے اپنے اندازوں اور مشاہدوں کے ذریعے ان انواع کے ذرائع تفاہم کی بعض علامات دریافت بھی کی ہیں جو اگرچہ ظنی ہیں۔ رہا وہ علم جو حضرت سیمان علیہ السلام کو دیا گیا تھا وہ ان کے ساتھ خاص تھا۔ اور وہ معجزانہ انداز میں ان کو دیا گیا تھا وہ عام انسانوں کا عام مشاہدہ نہ تھا۔ نہ وہ ایسا علم تھا جس طرح ہمارے دور میں مشاہدہ اور تتبع سے بعض لوگوں نے بعض انواع کے بارے میں معلوم کی ہیں۔ یہ انسانی علوم ظن وتخمین ہیں۔ ان کی نوعیت اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم کی نوعیت مختلف ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ بطور تاکید مزید اس بات کی وضاحت کر دوں کیونکہ بعض جدید مفسرین کو سائنس کی علمی کامیابیوں نے اس قدر متاثر کر دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر جدید علمی انکشافات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان مفسرین نے حضرت

سلیمان علیہ السلام کے علم منطق الطیر کی ایسی ہی تشریح کی ہے کہ یہ ایسا ہی علم تھا جیسا کہ دور جدید کے بعض ماہرین نے حشرات الارض اور حیوانات کی بعض انواع و اجناس کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ ایسی کوششیں دراصل قرآنی معجزات کو اپنی حقیقی ماہیت سے نکال دیتی ہیں۔ یہ دراصل ایک شکست خوردہ انداز فکر ہے اور جدید سائنس کے سامنے غیر ضروری طور پر جھک جانا ہے۔ حالانکہ سائنس کی اکتشافات بہت ہی حقیر و قلیل ہیں جبکہ اللہ کے لیے یہ بات کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کو حیوانات، حشرات اور طیور و وحوش کے وہ تمام طریقہ اظہار اور مکالمہ سمجھا دے اور معجزانہ انداز میں سمجھا دے۔ بغیر سائنسی ریسرچ اور جہد کے اللہ کے لیے یہ اس طرح آسان ہے کہ اس نے انسانوں اور حیوانوں کے درمیان جو پردہ حائل کر دیا ہے بس صرف اسے ہٹانا ہے وہ تو تمام انواع کا خالق ہے۔

پھر یہ بات اس عظیم معجزے کا ایک پہلو تھا جو سلیمان علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ حضرت کے لیے جنوں اور پرندوں کی ایک بڑی تعداد کو مسخر کر دیا گیا تھا تاکہ وہ آپ کی حکومت کے ماتحت ہوں اور آپ کے لیے پوری طرح مطیع فرمان ہوں، جس طرح انسانوں کی جو افواج آپ نے بھرتی کر رکھی تھیں اور پرندوں میں سے جو گروہ آپ کے زیر نگیں کر دیا گیا تھا اسے اللہ نے ایک خاص قوت مدرکہ دی تھی۔ اور وہ قوت ان جیسے عام پرندوں میں نہ تھی۔

یہ بات ہدہد کے قصے سے معلوم ہوتی ہے جس نے ملکہ سبا کی مملکت کے حالات معلوم کیے اور اس نے ان کے حالات کو اس طرح سمجھا جس طرح کہ اعلیٰ درجے کا عقلمند اور متقی شخص سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی اس معجزے کا ایک حصہ تھا جو حضرت سلیمان کو دیا گیا تھا۔

اللہ کی یہ سنت ہے کہ اللہ کی مخلوق میں جو حیوانات پائے جاتے ہیں ان کے درمیاں عقلمندی کی سطح اونچی اور نیچی تو ہو سکتی ہے لیکن کسی حیوان کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا ہے کہ اس کی قوت مدرکہ انسان سے بڑھ جائے یا اس کے برابر ہو جائے۔ یہ حیوانات اور طیور کی خلقت میں سنت الہیہ نہیں ہے۔ اور نہ یہ سنت اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور سنت الہیہ کے تابع ہے۔ یہ سنت اول روز سے ایسی ہی چل رہی ہے۔

آج ہمارے ہاں جو ہدہد پایا جاتا ہے، ہزارہا ملین سال پہلے بھی ہدہد اسی نہج پر پیدا ہو رہا تھا۔ جب سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اللہ نے ہر حیوان کے اندر ایسے جینز پیدا کیے ہیں کہ آج کا ہدہد ہزارہا ملین سال پہلے پیدا کیے جانے والے ہدہد کی پوری کاپی ہے۔ اس کے اندر جو اور جس قدر تبدیلی بھی ہو وہ اپنی نوعیت کے دائرے سے نہیں نکل سکتا۔ یہ بھی سنت الہیہ کا ایک پہلو ہے اور اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

لیکن ان دونوں حقائق کے باوجود یہ نوامیس فطرت اور یہ سنت الہیہ اس بات سے مانع نہیں ہیں کہ اللہ اپنی قدرت کے اصولوں کے اندر استثنائی صورت پیدا کر دے۔ بعض اوقات یہ استثنائی حالت بھی دراصل ناموس عام اور سنت جاریہ ہی کا ایک حصہ ہوتی ہے لیکن ہم اس مخصوص پہلو سے خبردار نہیں ہوتے۔ اس جزئی ناموس اور استثنائی حالت کا علم دراصل صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بظاہر چلتے ہوئے اصول کو روک دیتا ہے۔ اس طرح سنت الہیہ میں بظاہر جو تبدیلی ہوتی ہے وہ بھی ایک برتر سنت ہوتی ہے۔ یہی تھی کہانی ہدہد اور سلیمان کی اور اللہ نے ان قوتوں کو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا تھا۔

اب ہم اس نکتے سے سلیمان علیہ السلام کے قصے کی طرف آتے ہیں کہ حضرت داؤد کی وراثت پا کر انہوں نے اللہ کی

طرف سے کیا کیا انعامات پائے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

"سلیمان کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے"۔

یہ تھا حضرت سلیمان کا لشکر۔ بہت بڑی تعداد میں ہر طرف سے اٹھایا ہوا۔ جن، انس اور پرندوں پر مشتمل۔ انسان تو معلوم ہیں، جن وہ مخلوق ہے جس کے بارے میں خود قرآن نے معلومات دی ہیں اور ان کی حقیقت کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ آگ کے شعلے سے پیدا شدہ ہیں۔ یعنی ایسے شعلے جو موجوں کی شکل میں اٹھتے ہیں۔ بشر ان کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ بشر کو دیکھ سکتے ہیں۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے مگر تم اسے نہیں دیکھتے"۔ یہ آیت اگرچہ ابلیس کے بارے میں ہے لیکن وہ جنوں میں سے تھا۔ پھر ان جنوں کے اندر یہ قوت ہے کہ یہ انسانوں کے دلوں میں برائی کے وسوسے ڈالتے ہیں اور پھر یہ انسانوں کو اللہ کی معصیت پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کی تفصیلی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اور جنوں کا ایک طائفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لایا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہیں دیکھا۔ نہ آپ نے ان کے ایمان کو سنا، یا دیکھا۔ البتہ اللہ نے اس بات کی اطلاع حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱)

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲) (۷۲ : ۱ - ۲) "اے پیغمبر کہہ دے، میری طرف یہ وحی کی گئی ہے۔ ایک گروہ جس نے کان لگا کر سنا اور پھر کہا ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو راہنمائی کرتا ہے عقلمندی کی راہ کی طرف تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے والے نہیں ہیں"۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ جنوں کا ایک گروہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر نگیں تھا۔ جو آپ کے لیے محرابیں، عمارات، تصویریں اور بڑے بڑے حوضوں جیسے کھانے کے لگن بناتا تھا اور یہ جن آپ کے لیے سمندر میں غوطے بھی لگاتے تھے۔ اور آپ کے دوسرے احکام بجالاتے تھے۔ اور یہ سب آپ کے لشکر میں انسانوں اور پرندوں کے ساتھ موجود تھے۔

اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں اور انسانوں کا ایک گروہ مسخر کر دیا تھا تو اس لیے کہ تمام روئے زمین کے جن و انس حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں شامل نہ تھے کیونکہ حضرت سلیمان کی حکومت کی حدود فلسطین، شام، عراق تک محدود تھیں۔ اسی طرح تمام جن اور تمام پرندے بھی آپ کے لیے مسخر نہ تھے۔ ان میں سے ایک گروہ آپ کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا۔

جن سب کے سب مسخر نہ تھے۔ اس لیے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا' اس کی ذریت بھی جن تھی جس طرح قرآن مجید میں ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ اور سورت الناس میں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور حضرت سلیمان کے زمانے میں بھی شیطان جنات لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے تھے' لوگوں کو گمراہ کرتے تھے اور تمام شر کے کاموں پر آمادہ کرتے تھے۔ لہذا تمام جن حضرت سلیمان کے لیے مسخر نہ تھے ورنہ ان کی تسخیر میں ہوتے ہوئے وہ کس طرح فسادی کام کرتے۔ کیونکہ حضرت سلیمان ایک نبی تھے اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاتے تھے لہذا صحیح بات یہ ہے کہ جنات کا ایک گروہ ان کے تابع تھا۔

پرندوں کے سلسلے میں بھی یہی استدلال ہے کہ جب پرندہ حاضر نہ پایا گیا' تو معلوم ہوا کہ تمام پرندے مسخر نہ تھے ورنہ ہزارہا پرندوں میں سے ایک کا ہونا نہ ہونا محسوس نہ ہوتا۔ جب ہدہد نہ پایا گیا تو آپ نے فرمایا

مَالِيَ لَآ اَرَي الْهُدْهُدَ (۲۷ : ۲۰) "یہ ہدہد کہاں گیا میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں"۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص ہدہد تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ہی ہدہد ہو۔ یا یہ کہ جو ہدہد ڈیوٹی پر تھا وہ موجود نہ تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس ہدہد یا مسخر ہدہدوں کو اللہ نے ادراک کی ذرا زیادہ قوت دے رکھی تھی جو اور ہدہدوں میں نہ تھی۔ اور یہ قوت مدرکہ صرف ان کے پرندوں کے لیے تھی جو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کیے گئے تھے۔ کیونکہ ان آیات سے ہدہد کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور نیک پرندہ تھا۔

غرض حضرت سلیمان کے لیے جن و انس اور وحوش و طیور کی ایک عظیم فوج اٹھائی گئی تھی۔ یہ ایک عظیم فوج تھی اور یہ سب کے سب بے حد منظم تھے۔ یہ غیر منظم بھیڑ کی شکل میں نہ تھی۔ اس لیے ان کو افواج کہا گیا ہے اور جنود کے لفظ سے دونوں مفہوم ظاہر ہوتے ہیں یعنی کثرت تعداد اور تنظیم۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

"(ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو' اپنے بلوں میں گھس جاؤ' کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی

نہ ہو"۔ سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا "اے میرے رب 'مجھے قابو میں رکھیں کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر"۔

یہ لشکر جب نکلا 'جس میں انسان 'جن اور طیور شامل تھے۔ نہایت تنظیم اور ترتیب کے ساتھ۔ اس کا اول اس کے آخری حصہ سے مربوط تھا۔ اس کی صفیں منظم تھیں۔ اور اس کی حرکت بھی منظم تھی۔ یہ لشکر ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بڑی تعداد میں تھیں۔ اس کثرت سے کہ اس وادی کا نام ہی وادی نمل تھا۔ تو ایک ایسی چیونٹی نے جو ان کی سربراہ تھی 'چیونٹیوں سے کہا

ادْخُلُوا مَسٰكِنَكُمْ (۲۷ : ۱۸) "اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ"۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ چیونٹیاں بھی شہد کی مکھیوں کی طرح بہت منظم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر ڈیوٹیاں تقسیم ہوتی ہیں اور یہ ایک عجیب نظام کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ایسے نظام کے ساتھ کہ خود انسانوں کے لیے اس قدر منظم زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ ان کو بڑی ترقی یافتہ عقل اور بلند قوت مدرکہ دی گئی ہے تو اس چیونٹی نے اپنی زبان میں کہا

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۷ : ۱۸) "کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو"۔ حضرت سلیمان نے چیونٹی کی بات کو سمجھ لیا۔ ان کا دل بہت خوش ہوا کہ چیونٹی کیا احکام دے رہی ہے۔ انہوں نے اس پر تعجب کیا کہ ایک چیونٹی حضرت سلیمان کی شان کو جانتی ہے۔ خطرہ محسوس کرتی ہے 'جبکہ ان کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ان کو اذیت دیں جس طرح ایک چھوٹا بڑے کی اذیت سے ڈرتا ہے۔ حضرت سلیمان کو خوشی اس پر ہوئی کہ اس قدر چھوٹی مخلوق بھی ان کے بارے میں ادراک رکھتی ہے۔ اور پھر تعجب بھی ہوا کہ ایک چیونٹی کی اطاعت اس کے ماتحت کیسے ہیں اور کرتے ہیں۔ ان کو اللہ کی مخلوقات اور عجائبات پر بڑا 'تعجب ہوا۔

جب حضرت سلیمان کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (۲۷ : ۱۹) "سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا"۔ لیکن اس مشاہدے نے ان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور ان کے دل کو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا۔ جس نے انہیں یہ خارق عادت علم سے نوازا۔ یوں انسانوں اور دوسری مخلوقات کے درمیان راز کے جو پردے حائل تھے وہ ہٹا دیے گئے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت عاجزی کے ساتھ رب کی طرف متوجہ ہوئے۔

وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ (۲۷ : ۱۹) اور کہا اے میرے رب 'مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے"۔

اے رب یہ براہ راست ایک خدا رسیدہ شخص کی دعا ہے۔ اَوْزِعْنِیْٓ یعنی مجھے جمع رکھ میرے شعور اور میرے اعضا جمع رکھ' میرے دل اور میری زبان کو قابو میں رکھ۔ میرے خیالات اور خلجانات کو منضبط کر دے اور میرے کلمات اور میری عبادات کو مجتمع کر دے۔ میرے اعمال اور میری سرگرمیوں کو منضبط کر دے۔ میری تمام طاقتوں کو مجتمع اور منضبط کر دے۔ میرے وجود کو اول سے آخر تک ایک کر دے۔ یہ سب مفہومات "اوزعنی" میں شامل ہیں۔ تاکہ میں پورے کا پورا مجسمہ شکر بن جاؤں۔ ان انعامات کے عوض جو مجھ پر اور میرے والدین پر کیے گئے۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قلب پر ان انعامات کا اثر تھا۔ ان پر جو اثر تھا اس کی نوعیت بھی اس سے ظاہر ہوتی ہے اور ان کا وجود اور ان کا وجدان اللہ کے فضل و کرم کی اس بارش سے سرشار تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر اور ان کے والدین پر اللہ کا دست شفقت ہر وقت نعمت' رحمت اور فضل و کرم کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔

"اے میرے رب' مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا"۔

وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ (۲۷ : ۱۹) "اور میں ایسا عمل کرتا رہوں جو تجھے پسند آئے"۔ عمل صالح بھی دراصل اللہ کا فضل و کرم ہوتا ہے اور یہ اس شخص پر ہوتا ہے۔ جو اللہ کا شکر گزار ہو اور سلیمان علیہ السلام ایسے شکر گزار ہیں کہ اس معاملے میں وہ اللہ کی استعانت طلب کرتے ہیں کہ شکر بھی اللہ کی امداد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور توفیق عمل بھی اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو اس نکتے کا اچھا شعور تھا۔

وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷ : ۱۹) "اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر"۔ حضرت جانتے ہیں کہ اللہ کے بندوں میں داخل ہو جانا اور ان کے ساتھ ہو لینا بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اس سے بھی انسان کی مدد ہوتی ہے۔ اور انسان کو اچھے کام کی توفیق ہو جاتی ہے۔ پھر وہ صالحین کے ساتھ چلتا ہے' اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں میں ہو جن پر تیرا رحم ہوتا ہے' جو تیری راہ کے سالک ہیں اور اس گروہ میں ہیں۔ حضرت سلیمان اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں حالانکہ وہ نبی ہیں انس' جن اور طیور ان کے لیے مسخر ہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا محتاج تصور کرتے ہیں' وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان سے عمل صالح کی شکر نعمت میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ غرض تیز احساس' ایسا ہی شعور' اللہ کا خوف و خشیت' اللہ کی رضا اور رحمت کی طلبگاری کے پختہ شعور کے لمحات ہی ہوتے جن میں اللہ کی نعمتیں اپنے خاص بندوں پر کھلی نازل ہوتی ہیں' جس طرح حضرت سلیمان پر نازل ہوئیں۔

اب یہاں ہمارے سامنے ایک نہیں' دو معجزات ہیں۔ ایک معجزہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم ہو گیا ہے اور دوسرا یہ کہ چیونٹی کو یہ علم ہو گیا ہے کہ یہ لشکر سلیمان علیہ السلام کا ہے۔ پہلا معجزہ تو یوں ہے کہ حضرت سلیمان کو اللہ نے تعلیم دی۔ وہ نبی تھے' انسان تھے اور انسان کے بارے میں ایک انسان بسہولت سمجھ سکتا ہے کہ اسے چیونٹی کے احکامات کا علم ہو گیا۔ لیکن دوسرا معجزہ جو چیونٹی کے قول میں ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چیونٹیوں کو معلوم ہو گیا کہ انسان ایک بڑی مخلوق ہے اور یہ ان کو روند ڈالیں گے۔ ہر زندہ مخلوق کے اندر زندگی بچانے کا داعیہ ہوتا ہے۔ اسی طرح چیونٹیوں میں بھی یہ شعور ہو گا۔ رہی یہ بات کہ ایک چیونٹی کو یہ علم کیسے ہو گیا کہ بڑی مخلوق کا یہ لاؤ لشکر سلیمان علیہ السلام

کا ہے - یہ بہرحال ایک معجزہ ہے - اور اسے معجزہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ نے اسے معجزانہ طور پر یہ بات سکھا دی تھی۔

اب آیئے سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کے واقعہ اور ملکہ سبا کے ساتھ معاملات کی طرف - اس قصے میں چھ اہم مناظر ہیں - ان مناظر کے درمیان خلا ہے - غیر ضروری واقعات کو چھوڑ دیا گیا ہے - درمیانی واقعات و مناظر دیکھنے کے بعد خود ذہن میں آجاتے ہیں - اس طرح قصے بیان کرنے میں ایک اعلیٰ فنی مظاہرہ ہوتا ہے اور ان مناظر کے درمیان بعض سبق آموز تبصرے بھی ہوتے ہیں جن میں انسانی شعور کو اس مقصد اور ہدف کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے - جس کے لیے یہ قصہ لایا گیا ہے - اس طرح قصہ لانے کا حقیقی مقصد پورا ہو جاتا ہے - یوں قصے کا فنی اسلوب اظہار کی خوبصورتی اور اخلاقی سبق اور دینی تعلیم دونوں مقاصد پورے ہو جاتے ہیں۔

سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بات شروع کرتے وقت ہی انس 'جن اور طیور کا ذکر ہو گیا تھا - جس میں سلیمان علیہ السلام پر اللہ کی نعمتوں میں سے نعمت علم کا اشارہ بھی تھا - لہٰذا اس قصے میں انسانوں 'جنوں اور طیور کا اہم رول ہر جگہ موجود ہے - اور ان کے سب کردار کا تعلق پر علم کے ساتھ ہے - اور اس سورت کے مقدمہ میں بھی ان اہم کرداروں کی طرف اشارہ تھا - اور یہ قرآنی قصوں کی اہم خصوصیت ہے۔

پھر اس قصے میں جو کردار ہیں ان کی شخصیت ان کی ممتاز صفات اور خصوصیات بھی قصے میں موجود ہیں - حضرت سلیمان کی شخصیت 'ملکہ سبا کی شخصیت 'ہدہد کی شخصیت 'ملکہ سبا کی حاشیہ نشینوں کی شخصیات اور ان شخصیات اور کرداروں کی نفسیات 'سوچ اور میلانات سب کے سب قصے میں موجود ہیں۔

---))( )---

پہلا منظر حضرت سلیمان علیہ السلام کی لشکر کشی کا ہے یا یہ سامان حرب کی سالانہ پریڈ ہے - یہ لشکر نکلتا ہے جس میں جن 'انس اور طیور ہیں اور یہ وادی نملہ سے گزرتا ہے - سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی گفتگو سنتے ہیں اور اللہ کی طرف متوجہ ہو کر شکر بجالاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللھم زد فزد -

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ ﴿٢٠﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَاْذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٢١﴾

"(ایک اور موقعہ پر) سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا "کیا بات ہے کہ میں فلاں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا 'ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی"۔

اس منظر میں حضرت سلیمان 'ایک نبی اپنے ایک عظیم و کثیر لشکر میں نظر آتے ہیں - جب وہ پرندوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہدہد کو غائب پاتے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص ہدہد تھا جسے اس لشکر میں ہونا چاہئے تھا - یہ کوئی عام ہدہد نہ تھا کہ جس طرح لاکھوں میں سے ایک غائب ہو - یا کرۂ ارض کے تمام ہدہدوں میں سے صرف ایک کم تھا - نیز اس سے

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخصوص ہدہد ایک خاص کردار رکھتا تھا اور مخصوص خصوصیت رکھتا تھا۔ یہ نہایت ہی بیدار مغز باریک بیں اور عقلمند ہدہد تھا۔ اور سلیمان علیہ السلام کی شخصیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اپنی اس عظیم الشان فوج پر بھی پوری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ فوج کو اول و آخر تک جانتے ہیں۔

وہ اس کے بارے میں ایک اعلیٰ کمانڈر انچیف کے بچے تلے جامع الفاظ میں پوچھتے ہیں۔

مَالِيَ لَآ اَرَي الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ (۲۷ : ۲۰) "کیا بات ہے میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا۔ کیا وہ غائب ہو گیا ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہدہد غائب ہے اور سب کو معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ اس کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ بغیر اجازت کے غائب ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو اب سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔ تاکہ فوج کے اندر افراتفری نہ ہو اور دوسرے لوگ بھی ادھر ادھر کھسکنا شروع نہ کر دیں۔ کیونکہ بادشاہ کی جانب سے اس انکوائری کے بعد بات تو راز نہ رہی تھی۔ اگر اس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تو یہ دوسرے فوجیوں کے لیے ایک بری مثال ہوگی۔ چنانچہ حضرت سلیمان اپنی فوج کے اس سپاہی کی غیر حاضری کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَآاذْبَحَنَّهٗ (۲۷ : ۲۱) "میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا"۔ لیکن بہرحال آپ نبی تھے ‘ ـــــــ جابر نہ تھے۔ ابھی تو آپ نے ہدہد کے عذرات نہیں سنے اسے نوٹس نہیں دیا گیا ‘ لہٰذا فیصلہ عذرات سننے کے بعد ہوگا۔ بغیر سنے فیصلہ اسلامی اصول عدل کے خلاف ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۲۷ : ۲۱) "یا اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی"۔ یعنی ایسی دلیل اور ایسا عذر جس کی وجہ سے وہ مواخذے سے بچ جائے اور عذر معقول ہو۔

اب پردہ گرتا ہے اس قصے کا یہ پہلا منظر ہے۔ سلیمان علیہ السلام دوسرے کاموں میں مشغول ہیں یا ہدہد ہی کی تلاش میں ہیں۔ بہرحال ہدہد آ جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک چونکا دینے والی خبر ہے۔ حضرت سیمان علیہ السلام کے لیے بھی حیران کن اور ہمارے لیے بھی حیران کن جو ہم آج اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدۃ

"کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے آکر کہا" میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمران ہے۔ اس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کی بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے"۔ شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیئے اور انہیں شاہراہ سے روک دیا' اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے۔ اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں' جو عرش عظیم کا مالک ہے"۔

یہ ہدہد بادشاہ کی دانشمندی اور بہترین تنظیمی صلاحیتوں سے باخبر تھا۔ اس لیے ہدہد نے پہلے ہی فقرے میں چونکا دینے والی خبر سے اپنی بات کا آغاز کیا تاکہ اس خبر کے بعد اس سے جواب طلبی کا موقعہ نہ رہے اور بادشاہ اس کی بات کو غور سے سنیں۔

اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ (۲۷ : ۲۲) "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے بارے میں یقینی معلومات لے کر آیا ہوں"۔ کون بادشاہ ایسا ہو گا اپنے کسی ملازم سے وہ باتیں نہ سنے جن کے بارے میں اسے علم نہیں۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے سننا شروع کیا تو اس نے تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔ مملکت سبا جنوب یمن میں واقعہ تھی۔ ہدہد کہتا ہے کہ اس قوم پر عورت حکمرانی کرتی ہے۔

وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (۲۷ : ۲۳) "اسے ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے"۔ یعنی اس کی مملکت عظیم اور مالدار ہے اور اس کے اندر خوشحالی اور تہذیب کے تمام اسباب موجود ہیں۔ قوت اور پیداوار

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ (۲۷ : ۲۳) "اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے"۔ یعنی جہاں ملکہ جلوس فرماتی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی مملکت بڑی ہے' مالدار ہے' خوشحال ہے اور اس کے اندر صنعت و حرفت کی ترقیات ہیں اور ان لوگوں کی نظریاتی حالت یہ ہے کہ

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۷ : ۲۴) "میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے"۔ یہاں ہدہد یہ تفصیل بھی بتاتا ہے کہ شیطان نے ان کے لیے ان کے ان برے اعمال کو مزین کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ لوگ اللہ وحدہ کی عبادت اور راہ ہدایت نہیں پاتے۔

الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۷ : ۲۵) "وہ اللہ جو آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے" خبء کا مفہوم وہ چیز ہے جو چھپی ہوئی ہو۔ یہ پوشیدہ چیز خواہ آسمانوں کی بارش ہو' زمین کے اندر سے نباتات ہوں یا زمین و آسمان کے دوسرے اسرار و رموز ہوں۔ یعنی پردہ غیب کے پیچھے پائے جانے والے عجائب و غرائب جو اللہ نے پیدا کیا' نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے عجائب غرض وہ سب چیزیں جو ظاہر ہیں یا باطن ہیں۔

یہاں تک تو ہدہد ایک مجرم کی حیثیت میں کھڑا ہے۔ ابھی تک شاہ سلیمان علیہ السلام نے اس کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا۔ چنانچہ انتظامی لحاظ سے تحت گیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے وہ اپنی بات کے آخر میں یہ اشارہ کرتا ہے

کہ اللہ جو جبار و قہار ہے اور سب کا رب ہے' صاحب عرش عظیم ہے۔ اس کے اقتدار اور انسانوں کے اقتدار کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہے تاکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کی اس برتری کے سامنے انسان کی بادشاہت کی تنگ دامنی کے بارے میں سوچ لیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۷ : ۲۶) السجدة "اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے"۔ یوں ہد ہد ملکہ سبا کی قوم پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اشارہ کرتا ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہد ہد بھی بڑا عجیب پرندہ ہے۔ یہ نہایت ذہین سمجھدار اور مومن پرندہ ہے۔ اور اس نے نہایت ہی خوبصورت' جامع اور مانع رپورٹ بھی پیش کر دی ہے۔ یہ حالات کو خوب جانتا ہے۔ اور حالات پر ماہرانہ رائے بھی دیتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ ملکہ ہے' یہ اس کی رعایا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ سورج پرست قوم ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا جائز نہیں ہے۔ وہ اللہ جس نے زمین و آسمان کی تمام ظاہری اور خفیہ چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ وہ رب عرش عظیم ہے۔ ہر ہد ہد تو ایسا علم نہیں رکھتا لہذا یہ کوئی مخصوص معجزاتی ہد ہد ہے۔ عام ہد ہد سے علیحدہ۔

اب حضرت سلیمان یوں نہیں کرتے کہ ہد ہد کی رپورٹ کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیں۔ وہ اس عظیم خبر پر اچھل نہیں پڑتے۔ چنانچہ وہ ایک تجربہ کار حکمران کی طرح اس کو تصدیق کے لیے لیتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ ساتھ ایک عادل نبی اور رسول بھی ہیں۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

سلیمان نے کہا "ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے' پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں"۔

اس منظر میں خط کا مضمون نہیں دکھایا جاتا۔ گویا یہ بند پیغام ہے تاکہ یہ مکتوب الیہ تک پہنچ جائے اور وہاں کھولا جائے تاکہ ہر نئی بات ناظرین کے سامنے اپنے صحیح وقت پر آئے۔

پردہ گرتا ہے۔ اب ہم ملکہ سبا کے دربار میں ہیں اور خط وہاں پہنچ گیا ہے اور کھولا جاتا ہے۔ ملکہ اب اپنی شوریٰ کے سامنے مضمون پیش کر کے مشورہ لیتی ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

۲
۱۷ع
۱۷

ملکہ بولی "اے اہل دربار ' میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے - وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ رحمن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے - مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ"۔

وہ اپنی شوریٰ کو بتاتی ہے کہ اس کے دربار میں یہ خط پھینکا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے معلوم نہیں ہے کہ یہ خط پھینکا کس نے ہے - اور کس طرح پھینکا ہے - اگر اسے معلوم ہوتا کہ اسے ہدہد نے پھینکا ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے تو وہ اس کا اعلان کر دیتی - کیونکہ یہ ایک اور عجیب بات ہوتی اور یہ بات روزانہ کے معجزات تو تھے نہیں کہ ہدہد خط پھینکتا تھا - چونکہ اس نے صیغہ مجہول استعمال کیا ہے اور اللہ نے نقل کیا ہے لہذا ہم کہتے ہیں کہ اسے معلوم نہ تھا کہ خط پھینکنے والا کون ہے -

ملکہ اسے ایک معزز خط "کتاب کریم" کہتی ہے - شاید اس خط کے انداز تحریر ' اس کی مہر اور اس کے طریقہ تلفیف کی وجہ سے اس نے معلوم کیا ہو کہ یہ کوئی غیر معمولی خط ہے - نیز جب اس کے مضمون سے اپنے مشیروں کو آگاہ کیا تو اس سے بھی اس کے دل میں اس خط کی مزید اہمیت بیٹھ گئی - جس کا مضمون یہ تھا -

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷ : ۳۰) اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۲۷ : ۳۱) "یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کیا گیا ہے اور مضمون یہ ہے "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ"۔ یہ مسلمان تو نہ تھی لیکن سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا شہرہ اس علاقے میں عام تھا - قرآن کریم نے اس خط کے الفاظ کو جس طرح نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو ٹوک اور نہایت ہی رعب دار اور خوفناک مضمون کا خط تھا - اسی وجہ سے اس نے اسے کتاب کریم کہا -

خط کا مضمون نہایت ہی سادہ ہے اور نہایت ہی پر تاثیر - آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہے اور مضمون صرف یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور میرے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے حاضر ہو جاؤ - میرے سامنے نہیں بلکہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اور مسلمان بن کر آجاؤ -

ملکہ نے یہ کتاب اور یہ خط اپنے اہل حل و عقد کے سامنے رکھا اور ان سے اس کے بارے میں مشورہ طلب کیا - وہ کہتی ہے کہ میں کسی معاملے میں بھی تمہارے مشورے سے قبل فیصلہ نہیں کرتی - تمہاری رضامندی سے اور تمہارے اتفاق رائے سے سب کچھ ہوتا ہے -

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝

" (خط سنا کر) ملکہ نے کہا "اے سرداران قوم ' میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو ' میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ سبا کس قدر ہوشیار عورت ہے اس نے اس خط کو لیا جبکہ اس کے پھینکنے والے کا کوئی پتہ نہیں ہے - خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو ٹوک ہے اور جس نے لکھا ہے وہ کوئی سپر طاقت ہے - یہ تاثر اس نے

اپنے اہل حل و عقد کے ذہنوں میں یوں منتقل کیا کہ اس نے اسے ایک اہم خط اور کتاب کریم کہا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ملکہ مقابلہ کرنا نہیں چاہتی لیکن وہ بصراحت اس کا اظہار بھی نہیں کرتی۔ بطور تمہید کہہ دیتی ہے۔ پھر رائے طلب کرتی ہے اور حاشیہ نشینوں کا جواب آتا ہے۔ وہ حسب عادت یہی کہتے ہیں کہ حکم کیجئے ہم تیار ہیں۔ طاقتور ہیں لیکن بہرحال فیصلہ بدست حضور ہے!

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ﴀ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

"انہوں نے جواب دیا "ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے"۔

اب یہاں اس عورت کی اصل شخصیت سامنے آئی ہے۔ یہ ملکہ سبا کی صورت میں ہے۔ ہر عورت تباہی اور بربادی کو فطرتاً ناپسند کرتی ہے۔ چنانچہ وہ سیاست اور تدبیر کے ہتھیار کو جنگی ساز و سامان سے پہلے آزمانا چاہتی ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

ملکہ نے کہا کہ "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں"۔

وہ جانتی ہے کہ بادشاہ جب کسی بستی پر قابض ہوتے ہیں تو وہ اسے برباد کر دیتے ہیں۔ (لفظ قریہ عربی میں بڑے شہر پر بھی بولا جاتا ہے)۔ لوگوں کی عزت و آبرو کو خراب کر دیتے ہیں، خونریزی کرتے ہیں اور مقامی لوگوں کی قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے موجود رؤساء اور بااثر طبقات کو ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو مقابلہ اور مدافعت کرتے ہیں۔ یہ ان کا تاریخی طرز عمل ہے۔

ہدیہ انسان کے دل کو نرم کر دیتا ہے اور محبت پیدا کرتا ہے۔ بسا اوقات معمولی ہدیہ سے ایک بہت بڑی جنگ ٹل جاتی ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے۔ اگر حضرت سلیمان ہدیہ قبول کر لیں تو یہ ایک دنیاوی معاملہ ہو گا اور دنیا میں ایسے ہی وسائل کارگر ہوتے ہیں اور فائدہ دیتے ہیں۔ اور اگر وہ قبول نہیں کرتے تو یہ ایک نظریاتی معاملہ ہو گا اور نظریاتی تحریکوں کو پیسے کے

ذریعے نہیں روکا جا سکتا۔ نہ اس دنیا کے کوئی ہتھکنڈے انہیں روک سکتے ہیں۔

اب یہاں پھر پردہ گرتا ہے۔ اب اگلے منظر میں ملکہ سبا کے کارندے حضرت سلیمان کے دربار میں ہدایا پیش کرتے ہیں اور حضرت سلیمان ان کی اس حرکت کو ناپسند کرتے ہیں کہ وہ انہیں مال و دولت کے ذریعہ خریدنا چاہتے ہیں اور دعوت اسلامی کو چند ٹکوں کے عوض خریدنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان ان کو سخت تنبیہ کرتے ہیں اور سخت دھمکی دیتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تم ہی کو مبارک رہے (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔

ان لوگوں کے ہدایا کو رد کرتے وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے دولت کی حقارت کا اظہار بھی کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ دولت کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن نظریات اور ایمانیات کے مقابلہ میں دولت ایک حقیر چیز ہوتی ہے۔

اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ (۲۷ : ۳۶) "کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو"۔ کیا تم یہ حقیر چیز میرے سامنے پیش کرتے ہو اور میری اس قدر کم قیمت لگاتے ہو۔

فَمَآ اٰتٰىنِ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ (۲۷ : ۳۶) "جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے"۔ مجھے مال بھی تم سے زیادہ دیا ہے اور منصب نبوت بھی دیا ہے جو جنس مال سے خیر ہے۔ علم نبوت جو بڑی دولت ہے۔ انسانوں، جنوں اور طیور کی تسخیر جو روپے کے ذریعے نہیں کی جا سکتی۔ لہذا اس زمین کی کوئی چیز مجھے خوش نہیں کر سکتی۔

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۲۷ : ۳۶) "تمہارا یہ ہدیہ تمہیں مبارک ہو"۔ تم دنیا پرست لوگ ایسی چیزوں پر خوش ہوتے ہو، لیکن ہمارے نزدیک ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہم تو اللہ سے لو لگائے ہوئے ہیں اور اللہ کے ہدایا قبول کرتے ہیں۔

اس کے بعد انہیں سخت تہدید آمیز جواب دیا جاتا ہے۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ (۲۷ : ۳۷) "واپس جا اپنے بھیجنے والے کی طرف"۔ یہ ہدایا ان کو دو اور عبرت آمیز

انجام کا انتظار کرو۔

فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا (۲۷ : ۳۷) "ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے"۔ یہ ایسی افواج ہیں جو دنیا کے کسی انسان کے پاس نہیں ہیں۔ اور ملکہ سبا اور اس کی قوم ہماری افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۷ : ۳۷) "اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔ اب یہاں پردہ گرتا ہے اور یہ چیلنج اور تہدید کا منظر ختم ہو جاتا ہے۔ سفارت واپس ہو جاتی ہے۔ اب سیاق کلام یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اگلے اقدام کے بارے میں یہاں ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا۔

حضرت سلیمان یہ جانتے ہیں کہ ملکہ کے ساتھ معاملہ ختم ہو گیا' وہ نہ مقابلہ کر سکتی ہے۔ نہ دشمنی چاہتی ہے۔ کیونکہ ہدایا کے ساتھ سفارت بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا۔ حضرت سلیمان جان گئے کہ یہ ملکہ مطابق حکم سلیمان دعوت قبول کرے گی اور اطاعت کرے گی جیسا کہ بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔

لیکن سیاق کلام میں یہ بات نہیں ہے کہ یہ سفارت واپس ہوئی۔ اس نے ملکہ کے سامنے یہ یہ رپورٹ پیش کی۔ نہ سیاق کلام میں ملکہ کے اگلے ارادے کا ذکر ہے۔ یہ سب خود بخود معلوم ہو جائیں گے جب ملکہ کا دورۂ دار الخلافہ معلوم ہو گا اب حضرت سلیمان علیہ السلام یہ حکم دیتے ہیں کہ کون ہے جو ملکہ کے پہنچنے سے قبل ہی اس کے عرش کو لے کر آ جائے اور پھر اس عرش اور تخت کو اس کے سامنے ذرا انجان ہو کر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عرش وہ اپنے علاقے میں چھوڑ کر آئی ہے اور یہ وہاں اس کے دار الخلافہ میں محفوظ و مامون ہے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ

سلیمان نے کہا "اے اہل دربار' تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں"۔

آپ کو معلوم ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کے تخت کو اس کی جانب سے اطاعت قبول کرنے سے قبل کس غرض کے لیے منگوایا؟ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام اس لیے کیا کہ وہ ملکہ سبا کو دکھائیں کہ کائنات کی معجزانہ قوتیں ان کی تائید کر رہی ہیں تاکہ ملکہ سبا ان سے متاثر ہو جائے اور ظاہری انقیاد کے ساتھ ساتھ اس

کے ایمان لانے کی راہ بھی ہموار ہو جائے۔

جنوں میں سے ایک دیوہیکل جن نے یہ پیش کش کی کہ وہ یہ تخت اس وقت تک حاضر کر دے گا جب تک یہ اجلاس جاری ہے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انتظامی اور عدالتی فیصلے کرنے کے لیے صبح سے ظہر تک بیٹھتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس عرصے کو طویل سمجھے۔ یہ کہا کہ اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص جس کے پاس علم کتاب تھا۔

الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ (۲۷ : ۴۰) "جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا"۔ اس نے کہا کہ پلک جھپکنے سے پہلے میں اسے لائے دیتا ہوں۔ یہاں اس شخص کا نام نہیں لیا گیا کہ وہ کون تھا۔ اور نہ اس کتاب کا ذکر ہے جس کا علم اس کے پاس تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مومن شخص تھا' اللہ کے ساتھ اس کا اتصال تھا' خدا رسیدہ شخص تھا۔ اور وہ اللہ کی جانب سے ایسی قوتوں کے مالک تھے جن کے لیے غیب کے پردے اور دوریاں ختم ہو جاتی ہیں اور یہ ایسے امور اور کرامات ہیں جن کا صدور بعض اوقات خدا رسیدہ لوگوں سے ہوتا ہے اور جس کے اسرار و رموز سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے۔ کیونکہ عام انسان جس دنیا میں رہتے ہیں اور جن اسباب کے تحت وہ زندگی بسر کرتے ہیں اس سے یہ مختلف زندگی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قصے کہانیوں اور داستانوں اور خرافات سے نکلنے کے لیے بس اس مقام پر یہی کہا جا سکتا ہے۔

بعض مفسرین اس شخص کے پیچھے پڑے ہیں کہ یہ شخص کون تھا؟ اور کتاب کون سی تھی۔ کتاب کے بارے میں کہا کہ وہ تورات تھی۔ اور بعض نے کہا کہ یہ شخص اسم اعظم کو جانتا تھا اور بعض مفسرین نے اور اقوال اختیار کیے ہیں۔ تمام اقوال کی پشت پر کوئی مستند دلیل نہیں ہے۔ اگر واقعیت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ معاملہ بہت آسان ہے۔ اس کائنات کے ہزارہا ایسے راز ہیں جن کو ہم نہیں جانتے۔ بے شمار ایسی قوتیں ہیں جن کو ابھی تک ہم کام میں نہیں لا سکے۔ خود نفس انسانی کے اندر ایسے راز موجود ہیں جن تک ابھی ہماری رسائی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی ایک انسان کو ان اسرار سے واقف کر دیتا ہے تو پھر دوسروں کے لیے ایک معجزہ صادر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ معجزہ عام انسانوں کی طبیعی زندگی کے خلاف ہوتا ہے جبکہ یہ خارق عادت معجزہ بھی اللہ ہی کی قوتوں میں سے کسی قوت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اللہ اس خارق عادت بات کو جس کے ہاتھ پر چاہتا ہے چلا دیتا ہے۔ (اس طرح وہ معجزہ اور کرامت ہوتی ہے)

یہ شخص جس کے پاس علم کتاب تھا' اس علم کی وجہ سے اس کا نفس اس کام کے لیے تیار تھا۔ اللہ نے بعض کائناتی راز اس شخص پر منکشف کر دیئے تھے اور یوں یہ کرامت اس کے ہاتھ سے ظاہر ہو گئی کیونکہ علم کتاب کی وجہ سے یہ شخص خدا رسیدہ شخص تھا۔ اور وہ روحانی طور پر اس کے لیے تیار تھا کہ اس پر بعض اسرار کھول دیئے جائیں۔

بعض مفسرین نے کہا یہ شخص خود سلیمان علیہ السلام تھے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شخص حضرت سلیمان نہ تھے۔ ورنہ پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ضرورت کیا تھی۔ قصہ خود ان کا چل رہا تھا اور قصہ بھی ایسا کوئی نہ تھا کہ حضرت کا نام مخفی رکھا جائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا نام آصف ابن برقیا تھا۔ اس پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ

اَمۡ اَکۡفُرُ ؕ وَ مَنۡ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیۡ غَنِیٌّ کَرِیۡمٌ ﴿۴۰﴾

"جونہی کہ سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا' وہ پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے' ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے"۔

تخت کی اچانک اور برق رفتار حاضری کا سلیمان علیہ اسلام پر بے حد اثر ہوا۔ وہ ڈر گئے کہ اللہ نے کس طرح معجزانہ انداز میں ان کا مقصد پورا کر دیا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ یہ ایک عظیم نعمت خداوندی ہے اور اس کا فضل و کرم ہے۔ اور اس قدر عظیم کرم دراصل ایک عظیم ابتلا ہے۔ ایک خوفناک ابتلا ہے۔ اس لیے اس ابتلا سے وہ کامیابی کے ساتھ تب ہی گزر سکتے ہیں جب وہ ہروقت بیدار رہیں۔ اور اس آزمائش میں بھی کامیابی کے لیے اللہ کی مدد درکار ہے۔ اسے خداخوفی کی ضرورت ہے' نعمت خداوندی کا احساس کرنا ضروری ہے۔ اور اللہ کے اس فضل پر شکر بجالانا ضروری ہے۔ تاکہ اللہ پر ثابت ہو جائے کہ میں شکرگزار ہوں جبکہ اللہ کو کسی کی جانب سے کسی شکر کی ضرورت نہیں ہے جو کوئی شکر کرتا ہے۔ وہ خود اپنے لیے کرتا ہے اور شکر سے زیادہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور ابتلائے نعمت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی شکر نہیں کرتا' ناشکری کرتا ہے تو اللہ تو عالم اور عالم والوں سے مستغنی ہے۔ وہ تو کریم ہے۔ بغیر کسی احتیاج کے شکر کرنے والوں کو بخشتا ہے۔

شکر نعمت اور شکر کو ایک آزمائش تصور کرنے کے بعد حضرت سلیمان ملکہ کو حیران کن صورت حال سے دوچار کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

قَالَ نَکِّرُوۡا لَہَا عَرۡشَہَا نَنۡظُرۡ اَتَہۡتَدِیۡۤ اَمۡ تَکُوۡنُ مِنَ الَّذِیۡنَ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۴۱﴾

سلیمان نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو' دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے"۔ یعنی اس تخت کی امتیازی خصوصیات کو ختم کر دو تاکہ دیکھا جائے کہ وہ اس تخت کو اپنی فراست اور ذہانت سے پہچانتی ہے یا نہیں۔ یا اس معمولی تبدیلی سے اس کے لیے اس کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

شاید یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اس کی ذہانت اور فراست کا امتحان تھا۔ تخت کے بارے میں اس اچانک اور ناقابل توقع صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد اب حضرت سلیمان اور ملکہ کی ملاقات ہوتی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتۡ قِیۡلَ اَہٰکَذَا عَرۡشُکِ ؕ قَالَتۡ کَاَنَّہٗ ہُوَ ۚ

"ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی "یہ تو گویا وہی ہے"۔

یہ اس کے لیے ایک انوکھی اور غیر متوقع بات تھی۔ اس کی مملکت کہاں اور تخت کہاں۔ اور وہ دیکھ رہی ہے۔ آخر محفوظ مقامات کے اندر زیر حراست تخت یہاں کس طرح آ گیا۔ جنوب یمن اور بیت المقدس کا فاصلہ یہ کیسے آ گیا اور

کون اسے لایا ہے۔

لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے باوجود تخت تو اسی کا ہے لیکن وہ غیر متوقع ہونے ' حالاتی شہادت خلاف ہونے کی وجہ سے اور زیادہ تر علامات اصلی باقی رہنے کی وجہ سے وہ یوں کہتی ہے کہ "گویا یہ وہی ہے"۔ اس نے نہایت فراست اور عقلمندی سے یہ جواب دیا۔ جس میں نہ اس تخت کا اقرار ہے اور نہ انکار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان غیر متوقع حالات میں بھی دھوکہ نہیں کھاتی اور اعلیٰ درجے کی سفارتی زبان استعمال کرتی ہے۔

اب یہاں سیاق کلام میں ایک خلا ہے۔ گویا اسے حضرت سلیمان نے اطلاع کر دی کہ یہ قوت ہے جس کے ذریعے ہم تمہارا تخت تم سے بھی پہلے لے آئے۔ تو اس کا جواب وہ دیتی ہے کہ ہم نے خود اپنے ہاں حالات کا جائزہ لے لیا تھا اور یہ عزم کر لیا تھا کہ ہم سلیمان کی اطاعت قبول کریں گے جب ہمارے ہدایا رد کر دیے گئے تھے۔

وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ﴿٤٢﴾

"ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا"۔ اب قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ ملکہ سبا اپنی اس دانشمندی کے باوجود پھر حضرت سلیمان کے پہلے خط پر ایمان کیوں نہیں لائی۔ یہ اس لیے کہ یہ ایک کافر سوسائٹی میں پیدا ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ بھی عام رواج کے مطابق اللہ کی بندگی کے بجائے سورج کی بندگی کرتی رہی۔ جیسا کہ ہدہد کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٤٣﴾

"اس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی"۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو مرعوب کرنے کے لیے ایک دوسری غیر متوقع امتحان گاہ بھی اس کے لیے تیار کی تھی۔ یہ امتحان اس قدر اچانک ہے کہ یہاں بھی بیان قصہ کے وقت بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ پہلے تخت کے سلسلے میں تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو بتا دیا کہ یہ تخت یوں معجزانہ انداز میں لایا گیا ہے۔ یہاں قرآن کریم کی طرز ادا بھی نہایت ہی بلیغانہ ہے۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَن سَاقَيْهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٤﴾

۳
ع ۱۳
18

"اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لیے اس نے

اپنے پائنچے اٹھا لیے ۔ سلیمان نے کہا "یہ شیشے کا چکنا فرش ہے"۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی' اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی"۔

یہ غیر متوقع امتحان یوں تھا کہ حضرت سلیمان نے ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا تھا۔ یہ شیش محل تھا۔ اس کے فرش کے نیچے سے پانی گزارا گیا تھا۔ اور فرش شیشے کا بھی ۔ اب فرش یوں نظر آ رہا تھا کہ گویا پانی کی لہر ہے ۔ جب ملکہ کو کہا گیا کہ آپ اس محل میں داخل ہوں تو اس نے سمجھا کہ اسے پانی سے چل کر گزرنا ہے ۔ اس پر اس نے شلوار کے پائنچے اٹھا دیئے ۔ اس کی ٹانگیں کھل گئیں ۔ اس واقعہ کے بعد حضرت سلیمان نے اسے بتایا۔

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (۲۷ : ۴۴) "انہوں نے کہا کہ یہ شیشے کا چکنا فرش ہے"۔
یہاں ملکہ حیران رہ گئی کہ حضرت سلیمان کے پاس تو حیران کن عجائبات ہیں اور یقیناً یہ قوتیں فوق الفطرت ہیں ۔ یوں اس نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ اور اللہ کو پکار اٹھی کہ اس نے اس سے قبل جو غیراللہ کی عبادت کی ہے وہ اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے ۔ چنانچہ اس نے سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا کہ میں اب سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کرتی ہوں۔

اس نے سوچ لیا کہ اسلامی نظام زندگی کیا چیز ہے ۔ یہ کہ اس میں کوئی انسان کسی انسان کے آگے نہیں جھکتا۔ بلکہ سب انسان اللہ کے آگے جھکتے ہیں ۔ سلیمان اگرچہ نبی ہیں لیکن وہ کہتی ہے کہ میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین کی طاعت قبول کرتی ہوں یعنی سلیمان کی معیت تو ہے جس طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمانوں کا ساتھی ہوتا ہے لیکن اطاعت رب العالمین کی ہوتی ہے ۔

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۷ : ۴۴) قرآن کریم نے یہاں اس بات کو خصوصی طور پر ریکارڈ کیا ہوا ہے کہ اسلام اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اسلام قبول کرنے سے ایک انسان ایک لمبی صف میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے جو مقتدر اعلیٰ ہوتی ہے بلکہ اسلام میں آکر غالب اور مغلوب اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ دونوں بھائی ہوتے ہیں کوئی غالب و مغلوب نہیں ہوتا۔ سب مساوی طور پر رب العالمین کے آگے جھکتے ہیں ۔

اہل قریش اسلام کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتے تھے حالانکہ رسول اللہ انہیں اسلام اور رب العالمین کی اطاعت کی طرف بلاتے تھے ۔ محمد ابن عبداللہ کی اطاعت کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک سربراہ مملکت بن جائیں ۔ قریش کو ملکہ سبا یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی نبی کی دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اس نبی کی معیت میں اللہ رب العالمین کا مطیع ہو جاتا ہے ۔ داعی اور مدعو برابر ہو جاتے ہیں ۔ اگر وہ اسلام قبول کریں تو رسول اللہ کے ساتھ وہ رب العالمین کے مطیع ہوں گے ۔

درس نمبر ۱۷۳ تشریح آیات

۴۵ --- تا --- ۵۳

قرآن کریم میں حضرت صالح اور قوم ثمود کا قصہ بالعموم حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کے قصص کے ساتھ آتا ہے۔ ان قصص کے ساتھ حضرت ابراہیم کا قصہ کبھی آتا ہے اور کبھی نہیں آتا۔ اس سورہ میں بھی بنی اسرائیل کے قصص آئے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے قصے گزر گئے ہیں۔ یہاں بھی حضرت ہود اور حضرت شعیب کا قصہ مختصرا آیا ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ نہیں آیا۔

حضرت صالح کے قصے میں ناقہ والی کڑی نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے ۹ مفسدین کا ذکر ہے جو حضرت صالح کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ حضرت صالح کو ان کی مکاریوں کا علم نہ تھا۔ ان کی ان سازشوں کے جواب میں اللہ نے ان کے خلاف ایسی تدبیر اختیار کی جس کا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ یہ کہ ان سب مفسدوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اور حضرت صالح اور اہل ایمان کو نجات دے دی۔ مشرکین مکہ کو کہا جاتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے ان کے مکانات کو دیکھتے ہو مگر عبرت نہیں پکڑتے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ۝۴۵

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو' تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے"۔

حضرت صالح کی رسالت کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "صرف اللہ کی بندگی کرو"۔ ہر دور میں انسانوں کو جو سماوی ہدایت دی گئی ہے اس کا خلاصہ یہی رہا ہے کہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرو' ہر رسول اور ہر قوم کو یہی تعلیم دی گئی جبکہ اس کائنات میں انسانوں کے اردگرد پائی جانے والی کائنات میں اور خود انسانوں کے نفوس کے اندر بھی وجدانی دلائل موجود ہیں جو یہی حقیقت بتاتے ہیں کہ اس کائنات کا معبود ایک ہی ہے۔ لیکن انسان ہے کہ وہ اس سادہ حقیقت کا انکار کرتا ہے۔ نہ صرف انکار بلکہ وہ اس دعوت کے ساتھ مذاق بھی کرتا ہے۔ اور حقارت آمیز انداز میں اسے ٹھکراتا ہے۔ اور آج تک انسان بھٹک رہا ہے۔ مختلف راستوں پہ چلتا ہے' ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن صراط مستقیم کی طرف نہیں آتا۔

یہاں قرآن کریم نے حضرت صالح کی دعوت کا صرف یہ اثر بتایا ہے کہ قوم دو ٹکڑے ہو گئی اور ان کے درمیان خاصمت شروع ہو گئی۔ایک فریق نے دعوت قبول کر لی اور دوسرا مخالف ہو گیا۔فریق مخالف 'تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری سورتوں سے ظاہر ہے۔

یہاں قصے کے اختصار کی وجہ سے خلا ہے۔اس میں قوم نے حضرت صالح سے مطالبہ کیا ہے کہ تم ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہو' لے آؤ۔منکرین کا ہمیشہ یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ہدایت و رحمت طلب کرنے کی بجائے اللہ کا عذاب طلب کرتے ہیں جس طرح مشرکین قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے۔حضرت صالح نے انہیں تنبیہہ کی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم رحمت و ہدایت طلب کرنے کی بجائے خدا کا عذاب طلب کرتے ہو۔وہ ان کو مشورہ دیتے ہیں اللہ سے مغفرت طلب کرو وہ تم پر رحم کر دے گا۔

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

صالح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے"۔

لوگوں کے دماغ اس قدر بگڑ گئے تھے کہ سچائی کو جھٹلانے والے کہنے لگے تھے۔ اے اللہ 'اگر یہ شخص تیری طرف سے رسول ہے اور سچائی پر ہے تو 'تو ہم پر پتھروں کی بارش کر دے اور دردناک عذاب نازل کر دے"۔حالانکہ ان کو کہنا یوں چاہئے تھا "اے اللہ 'اگر یہ شخص تیری طرف سے آیا ہوا ہے اور سچا ہے تو 'تو ہمیں توفیق دے کہ ہم ایمان لے آئیں اور اس کی تصدیق کر دیں"۔

یہی حال قوم صالح کا ہو گیا تھا۔ان کا رسول ان کو رحمت 'توبہ اور استغفار کی راہ کی طرف بلاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں 'یہ لوگ اس بات کا اظہار کرتے ہیں ہم تو صالح اور ان لوگوں سے تنگ آ گئے ہیں جو اس کے ساتھ ہو گئے تھے کیونکہ یہ لوگ ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔اور ہمیں خطرہ ہے کہ یہ لوگ ہم پر کوئی بڑی مصیبت لے آئیں گے۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ

انہوں نے کہا "ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے'۔

تطیر کے معنی بدشگونی کے ہیں۔یہ لفظ اقوام جاہلہ کی وہم پرستیوں اور خرافات سے نکلا ہے۔وہ اوہام جن سے کوئی شخص صرف سیدھے اور صاف ایمان کے ذریعے نکل سکتا ہے۔ایام جاہلیت میں اگر کوئی کسی کام کے لیے نکلنے کا ارادہ کرتا

تو وہ نیک شگون یا بد شگون معلوم کرنے کے لیے کسی پرندے سے فال گیری کرتا۔ وہ کسی جگہ بیٹھے ہوئے پرندے کو اڑاتا۔ اگر یہ پرندہ اس کے دائیں جانب سے بائیں جانب جاتا تو یہ خوش ہوتا اور وہ کام کر گزرتا۔ اور اگر یہ پرندہ بائیں جانب سے دائیں جانب کی طرف جاتا تو یہ شخص بد شگونی کرتے ہوئے یہ سمجھتا کہ یہ معاملہ خطرناک ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی پرندے کو کیا معلوم ہے کہ وہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ نیز کسی پرندے کی اتفاقی حرکت سے غیبی باتیں کس طرح معلوم ہو سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی اپنے معاملات ہمیشہ کسی غیبی قوت کے حوالے کرتا ہے۔ اگر کوئی اپنا غیب اور مستقبل اللہ علام الغیوب کے حوالے نہیں کرتا۔ اور اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا تو پھر وہ ایسے ہی اوہام و خرافات کا شکار ہوتا ہے۔ پھر وہ اوہام و خرافات کسی حد پر جا کر رکتے نہیں۔ نہ عقل کی حدود میں رہتے ہیں۔ نہ ان سے کوئی یقین و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

آج صورت حال ایسی ہے جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور عالم غیب کے پوشیدہ امور کو اللہ کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جن کا زعم یہ ہے کہ انہوں نے اس قدر علمی ترقی حاصل کر لی ہے کہ دین و مذاہب کے خرافات پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں' نہ دین اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ غیب پر ایمان لاتے ہیں' لیکن ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی وہم پرستی کا حال یہ ہے کہ یہ لوگ بھی عدد ۱۳ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور جب یہ لوگ جا رہے ہوں اور کوئی سیاہ بلی ان کے راستے سے گزر جائے تو اس کو بھی نہایت ہی اہم واقعہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً دیا سلائی کی ایک تیلی سے دو سے زیادہ سگرٹ جلانا اور اس قسم کے دوسرے خرافات پر یہ لوگ بڑا یقین رکھتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ اس قسم کے لوگ دراصل فطرت سے عناد کرتے ہیں حالانکہ فطرت سلیمہ کے اندر ایمان باللہ کی پیاس ہوتی ہے۔ وہ اللہ سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہوتی۔

اس دنیا کے حقائق میں اسے عالم غیب کا سہارا لینا پڑتا ہے' جن تک انسانی علم و معرفت کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور بعض حقائق تو ایسے ہیں کہ ان تک انسانی علم کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ یہ حقائق انسان کی قوت مدرکہ کی حدود طاقت ہی سے ماوراء ہیں۔ اور جو انسان کے مخصوص مقصد پیدائش اور خلافت فی الارض کے منصب کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہیں۔ اس لیے انسان کو ان کے علم کی طاقت ہی نہیں دی گئی۔ انسانی قوتیں اس کے منصب تک محدود رہیں۔

جب قوم صالح نے اپنی وہی بدویانہ اور گمراہانہ بات کی' جو اوہام و خرافات کے اندر ڈوبی ہوئی تھی تو حضرت صالح نے ان کو یقین کی روشنی کی طرف موڑ دیا اور ایک واضح حقیقت کی دعوت دی جس کے اندر کوئی پیچیدگی اور کوئی تاریک گوشہ نہ تھا۔

قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

صالح نے جواب دیا "تمہارے نیک و بد شگون کا سررشتہ تو اللہ کے پاس ہے"۔ تمہارا نیک و بد اور تمہارا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے اس کائنات کے لیے ایک سنت جاری کی ہے اور پھر لوگوں کو کچھ احکام دیے ہیں۔ اور لوگوں کے لیے ایک نہایت ہی سیدھی راہ تجویز کی ہے۔ پس جس نے سنن الہیہ کا اتباع کیا' اللہ کی ہدایات پر چلا تو اس کا انجام اچھا ہو گا اور اسے پرندے اڑانے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ اور جو شخص سنن الہیہ سے سرتابی کرے گا اور صحیح راستے سے ادھر ادھر ہو

جائے گا وہ ایک عظیم شر سے دوچار ہو گا۔ اسے پھر پرندوں سے نیک شگون اور بد شگون لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے"۔ اللہ نے تم پر جو انعامات کیے ہوئے ہیں۔ یہ تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور جو خیر و شر تمہیں پیش آ رہا ہے۔ وہ تمہارے لیے آزمائش ہے۔ لہٰذا بیداری' اللہ کے قوانین فطرت کے مطابق تدبیر اور واقعات و حادثات کو سمجھنا اور ان کے اندر جو آزمائش اور ابتلا ہوتی ہے' اس کا ادراک کرنا اور شعور رکھنا ہی اچھے انجام کا ضامن ہے۔ یہ جو تم پرندوں کو اڑا کر شگون یا بد شگون معلوم کرتے ہو' اس کا واقعات کے انجام پر کوئی اثر نہیں ہوتا' یہ محض تمہارے اوہام ہیں۔

ایک صحیح نظریہ اور عقیدہ لوگوں کو ذہنی روشنی اور استقامت عطا کرتا ہے اور انسان معاملات کی صحیح قدر معلوم کر لیتا ہے۔ انسان کا دل بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنے ماحول پر اچھی نظر رکھتا ہے اور غور و فکر کرتا ہے۔ انسان کو یہ شعور ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے دست قدرت اس میں موثر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں یہ واقعات یونہی اتفاقاً واقع نہیں ہوتے' نہ یہ زندگی ایک عبث عمل ہے بلکہ انسان کی زندگی بامقصد ہوتی ہے' وہ ایک قیمت رکھتی ہے۔ لوگوں کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اور یوں یہ چھوٹا سا انسان اس کرۂ ارض پر ایک بامقصد سفر کرتا ہے۔ وہ اللہ سے بھی مربوط ہوتا ہے اور اللہ کی اس کائنات کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہوتا ہے اور ان قوانین کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہوتا ہے۔ جو خالق نے اس کائنات کے لیے وضع کیے ہیں۔ اور جن کے مطابق یہ کائنات بحفاظت چل رہی ہے۔

لیکن یہ سادہ سا استدلال ان لوگوں پر کیا اثر کرتا جن کے قلوب بگڑ چکے ہوں۔ ان کے دل اس قدر فساد میں مبتلا ہوئے ہوں جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔ اصلاح کا کوئی امکان نہ رہا ہو۔ قوم صالح بگاڑ کے اس مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ ان میں ۹ افراد ایسے تھے جو پوری بگاڑ کے ذمہ دار تھے۔ یہ لوگ فساد کی آخری سرحدوں کو چھو رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے ایسی سازش تیار کی جس پر رات کے اندھیروں میں عمل کیا جانا تھا۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

"اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے' ہم بالکل سچ کہتے ہیں"۔

یہ نو افراد ایسے تھے جن کی اصلاح ناممکن ہو گئی تھی' یہ ہر وقت فساد اور سرکشی پر آمادہ رہتے تھے۔ یہ لوگ حضرت صالح کی دعوت سے اس قدر تنگ آگئے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رات کو ایک خفیہ معاہدہ کیا اور اس عہد پر اللہ کے نام سے قسم بھی اٹھائی کہ اس پر عمل کریں گے' حضرت صالح کو قتل کر دیں گے۔ حالانکہ حضرت صالح تو ان کو صرف اللہ ہی کی طرف بلاتے تھے۔

یہاں عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے اس سازش پر بھی اللہ ہی کو گواہ ٹھہرایا۔

تَقَاسَمُوْا بِاللّٰہِ لَنُبَیِّتَنَّہٗ وَ اَھْلَہٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّہٖ مَا شَھِدْنَا مَھْلِکَ اَھْلِہٖ (۲۷ : ۴۹)

"خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے"۔ نہ ہم نے قتل کیا ہے نہ موجود تھے۔

وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۲۷ : ۴۹) "اور ہم بالکل سچے ہیں"۔ اس لیے کہ یہ قتل رات کے اندھیرے میں ہو گا کوئی دیکھنے والا نہ ہو گا۔

ان لوگوں کی یہ تدبیر بھی نہایت سطحی اور سادہ تدبیر تھی لیکن بہرحال یہ تدبیر کر کے وہ اپنے آپ کو مطمئن کر رہے تھے۔ اور ان لوگوں کے نزدیک خدا کے نام پر یہ جھوٹ بالکل جائز تھا۔ اور پھر یہ اپنی اس اسکیم کے مطابق اپنے آپ کو بالکل سچا بھی ثابت کرتے ہیں۔ انسانی سوچ بھی عجیب پیچیدہ اور سطحی ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ انسان کا دل نور ایمان سے خالی ہو کیونکہ سیدھا راستہ تو ایمان ہی بتاتا ہے۔

یہ تھی ان کی تدبیر اور ان کی سوچ۔ لیکن اللہ بزرگ و برتر تو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور یہ لوگ اللہ کو نہیں دیکھ رہے۔ اللہ کے علم میں ان کی پوری سازش ہے' لیکن اپنے خیال میں یہ سازش بھی اندھیرے میں کر رہے ہیں اور عمل بھی اندھیرے میں ہو گا۔ لیکن ہیں خود اندھیرے میں۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی"۔ دیکھئے ان کی تدبیر کیا ہے۔ ان کی سازش بمقابلہ امر الہی۔ اللہ کی قوت کے مقابلے میں یہ شرپسند کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں جھوٹے جبار و قہار جو تھوڑی بہت قوت کے مالک بن جاتے ہیں وہ اپنی اس قوت میں اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ اوپر دیکھنے والی آنکھ سے غافل ہو جاتے ہیں۔ وہ اس قوت سے بالکل غافل ہوتے ہیں کہ جو اچانک ان کو پکڑ لے گی اور ان کو توقع ہی نہ ہو گی۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۭ

"اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر

خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے"۔

ایک لمحے کے اندر ان کو برباد کر کے رکھ دیا گیا۔ اگلے لمحے میں ان کے محلات ان پر الٹ دیئے گئے۔ گھر خالی رہ گئے۔ ایک لحظہ پہلے وہ تو اہل ایمان کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور ان کو پورا یقین تھا کہ وہ اپنی سازشوں پر عمل کر سکیں گے۔

سیاق کلام میں یہ مشابہی 'کہ ادھر سازش ہوئی' ادھر وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ اس اچانک اور فیصلہ کن گرفت سے ڈرانا مقصود ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت آ جاتی ہے۔ وہ مغرور نہ ہوں اور غرے میں نہ آ جائیں۔ اللہ ایسے لوگوں کو اسی طرح اچانک گرفت میں لے سکتا ہے اور ان کو ان کی مکاریوں اور تدابیر کے ساتھ ہلاک کر سکتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥٢﴾

"اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ اور اس پوری سورت میں علم اور ٹیکنالوجی مرکزی مضمون ہے۔ اس کے حادثات' واقعات اور قصص علم کے محور کے گرد گھومتے ہیں۔

وَأَنجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٣﴾

"اور بچا لیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے"۔ کفار کی اچانک ہلاکت کے بعد اب بتا دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو نجات دے دی گئی۔ اس لیے کہ وہ دنیا کی قوتوں کی بجائے صرف اللہ سے ڈرتے تھے۔ اور کسی مومن کے دل میں اللہ کے ڈر کے ساتھ دوسرا کوئی ڈر جمع نہیں ہو سکتا۔

---○○○---

درس نمبر ۱۷۴ ایک نظر میں

حضرت لوط علیہ السلام کے قصے کا یہ مختصر ترین حلقہ 'مختصر اور شوٹنگ کے انداز میں ہے۔ قوم لوط حضرت لوط کو ملک بدر کرنا چاہتی ہے اور جرم کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ اخلاقی تطہیر اور پاکیزگی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کو اس اخلاقی گندگی سے نکالنا چاہتے تھے جس میں یہ لوگ علانیہ اور اجتماعی طور پر مبتلا تھے۔ ہم جنس پرستی یعنی مردوں کا مردوں کے ساتھ جنسی ملاپ اور عورتوں کے قریب نہ آنا' یہ انتہائی گندگی' غلاظت اور خلاف فطرت عمل تھا۔

انسانی تاریخ میں یہ جنسی بے راہ روی کبھی کبھی اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض اوقات بعض افراد تو اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ان کے لیے ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں مثلاً فوجی چھاؤنیوں میں لوگ خلاف فطرت جنسی عمل میں مبتلا ہو جاتے ہیں' جہاں انہیں فوجی کیمپوں میں عورتیں نہیں ملتیں۔ پھر قید خانوں اور جیلوں میں بھی یہ بیماری پھیل سکتی ہے۔ جہاں ایک طویل عرصے تک قیدیوں کو جنسی ملاپ سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان پر جنسی ملاپ کا سخت دباؤ ہوتا ہے۔ اور عورتوں سے وہ دور ہوتے ہیں۔ رہی یہ صورت حال کہ کسی بستی میں یہ جنسی بے راہ روی اور ایک عام مسلمہ قاعدہ بن جائے' عورتیں موجود ہوں' نکاح ہو سکتے ہوں تو حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں فی الواقعہ' یہ ایک عجیب واقعہ ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی فطرت ایسی بنائی ہے اس میں نر اور مادہ ہیں اور فطرتاً نر اور مادہ کے درمیان ملاپ کا داعیہ رکھا ہے۔ تمام زندہ مخلوقات کی یہ فطرت ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶ : ۳۶) "پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں"۔ تو اللہ نے تمام زندہ اشیاء کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ خواہ زمین کی نباتات ہوں یا انسان ہوں یا دوسرے حیوان ہوں' خواہ ان کو انسان جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ اللہ کی مخلوقات میں سے بے شمار ایسی مخلوق اب بھی ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ لہذا نر و مادہ یا مخالف جوڑا اس پوری کائنات کی تخلیق میں اصل الاصول ہے۔ زندہ چیزوں کے علاوہ دوسری نامعلوم مخلوقات میں بھی۔ ایٹم' کائنات کا صغیر ترین ٹکڑا بھی الیکٹرون سے پیدا شدہ ہے جس میں مثبت اور منفی چارج ہوتے ہیں' گویا کائنات کے ہر ایٹم کے اندر جوڑا موجود ہے۔

(۱) مصنف جس وقت لکھ رہے تھے اس وقت یورپ کے ملکوں نے اس فعل کو قانوناً جائز نہ کیا تھا (مترجم)۔

جہاں تک زندہ مخلوقات کا تعلق ہے ان کے اندر نر و مادہ کا ہونا تو ایک لازمی امر ہے اور معلوم ہے یہاں تک کہ جن زندہ چیزوں میں نر اور مادہ نہیں ہوتے خود ان کے اندر نر اور مادہ کے خلیے ہوتے ہیں اور ان خلیوں کے اجتماع کی وجہ سے ان کے اندر پیداواری عمل جاری رہتا ہے۔

چونکہ نر اور مادہ کا ہونا اور تمام زندہ مخلوقات کا جوڑا جوڑا ہونا ناموس فطرت ہے۔اس لیے اللہ نے فطرتاً نر اور مادہ کے درمیان ایک کشش رکھی ہے۔ ایسی کشش جسے کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ کسی غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ اس لیے کہ اللہ نے زندگی کو اس کی صحیح راہ پر چلانا تھا۔اور اس راستے پر چلنے کا داعیہ بھی فطرتاً رکھا گیا اور اس کے لیے تعلیم و ترغیب کی ضرورت ہی نہ رکھی گئی۔لوگوں کے لیے دواعی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا باعث لذت بنایا۔اس طرح دست قدرت بغیر تعلیم اور ترغیب کے لوگوں سے یہ فطری کام لیتی ہے۔اللہ نے نر اور مادہ کے مقامات نسانی کے اندر اس فطری ملاپ کا میلان رکھ دیا ہے اور یہ میلان اور لذت اللہ نے دو مردوں کے اعضاء کے اندر نہیں رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ فطرت کا یہ اجتماعی بگاڑ' جو قوم لوط کے اندر ہوا' عجیب لگتا ہے کیونکہ یہ تقاضائے فطرت کے خلاف ہے۔چنانچہ حضرت لوط ان لوگوں کے اس فطری بگاڑ کی اصلاح کرنے لگے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۷۴ تشریح آیات

۵۴ --- تا --- ۵۹

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾

"اور لوط کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟ کیا تمہارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو"۔

پہلے فقرے میں اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ تم جس بگاڑ میں مبتلا ہو یہ نہایت ہی عجیب و غریب ہے' تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمام زندہ مخلوقات کی فطرت کیا ہے۔ تم تو اچھی طرح دیکھتے ہو کہ حیات انسانی و حیوانی کے اندر قانون فطرت کیا ہے۔ تمام زندہ مخلوق میں سے صرف تم ایسے ہو کہ خلاف فطرت روش میں مبتلا ہو۔ اور دوسرے فقرے میں اس بات کی وضاحت کر دی کہ تمہارا یہ فعل انسانیت کے خلاف ہے کہ تم اپنی جنسی ضرورت عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے پوری کرتے ہو۔ محض یہ بیان کہ وہ ایسا کرتے تھے' اس بات کے لیے کافی ہے کہ یہ فعل غیر فطری اور عجیب ہے۔ اور پوری حیوانی نباتاتی بلکہ کائناتی فطرت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد ان پر تنقید کی کہ تم بہت ہی جاہل ہو۔ اس مفہوم میں بھی جاہل ہو کہ تمہیں فطرت کائنات اور ناموس کائنات کا علم نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی جاہل اور احمق ہو کہ تم ایسے برے افعال کا ارتکاب کرتے ہو کیونکہ جو شخص فطرت کے تقاضوں سے نابلد ہو' وہ جاہل ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بے وقوف اور احمق بھی ہوتا ہے۔

اب آپ کی قوم کا جواب کیا تھا؟ ان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ ایسی جہالت اور حماقت کو چھوڑ کر اصل راہ فطرت کی طرف آجاؤ جس کے مطابق تم پیدا ہوئے ہو' تو ان کا جواب یہی تھا جو ہر جاہل کا ہوتا ہے یعنی یہ کہ تم بہت پاک لوگ ہو' نکلو ہمارے گاؤں سے"۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

''مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا'' نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے' یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں''۔

انہوں نے بطور مزاح حضرت لوط اور مومنین کو ''پاکباز'' کہا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا یہ فعل گندا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ الٹا ان پاکبازوں کو گندے لوگ سمجھتے ہیں اور ان کو یہ بات بری لگتی ہو کہ مسلمان اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کی فطرت کے اندر اس قدر انحراف پیدا ہو گیا تھا کہ اس فعل کو گندگی نہ سمجھ رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس فعل کو چھوڑنا وہ اپنے لیے گندہ فعل سمجھ رہے ہوں۔

بہرحال ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ حضرت لوط کو ملک بدر کر دیں لیکن اللہ کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اللہ نے ان کو دنیا بدر کر دیا۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝

''آخر کار ہم نے بچالیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو' بجز اس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا' اور برسائی ان لوگوں پر ایک برسات' بہت ہی بری برسات تھی۔ وہ ان لوگوں کے حق میں جو متنبہ کیے جا چکے تھے''۔

یہاں اس بارش کی تفصیلات نہیں دی گئیں جس طرح دوسری سورتوں میں دی گئی ہیں۔ لہذا ہم بھی سیاق کلام کے مطابق بس اس آیت کو اسی طرح مجمل چھوڑتے ہیں لیکن اس قوم کو پانی سے ہلاک کیا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ لوگ ماء حیات کو غلط جگہ گراتے تھے' جو فعل خلاف فطرت تھا۔ اس سے کوئی انسانی فعل مطلوب نہ تھا' اس لیے اللہ نے بھی ان کو پانی کے ذریعے ہلاک کیا حالانکہ پانی سے اللہ نے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا ہے۔ یہ ان کے ساتھ ایک لطیف مذاق بھی تھا۔ واللہ اعلم! یہ میری رائے ہے ورنہ اللہ خوب جانتا ہے کہ اس کی سنت کس طرح اور کیوں کام کرتی ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

''کہہ دو' تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چن لیا' کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟''